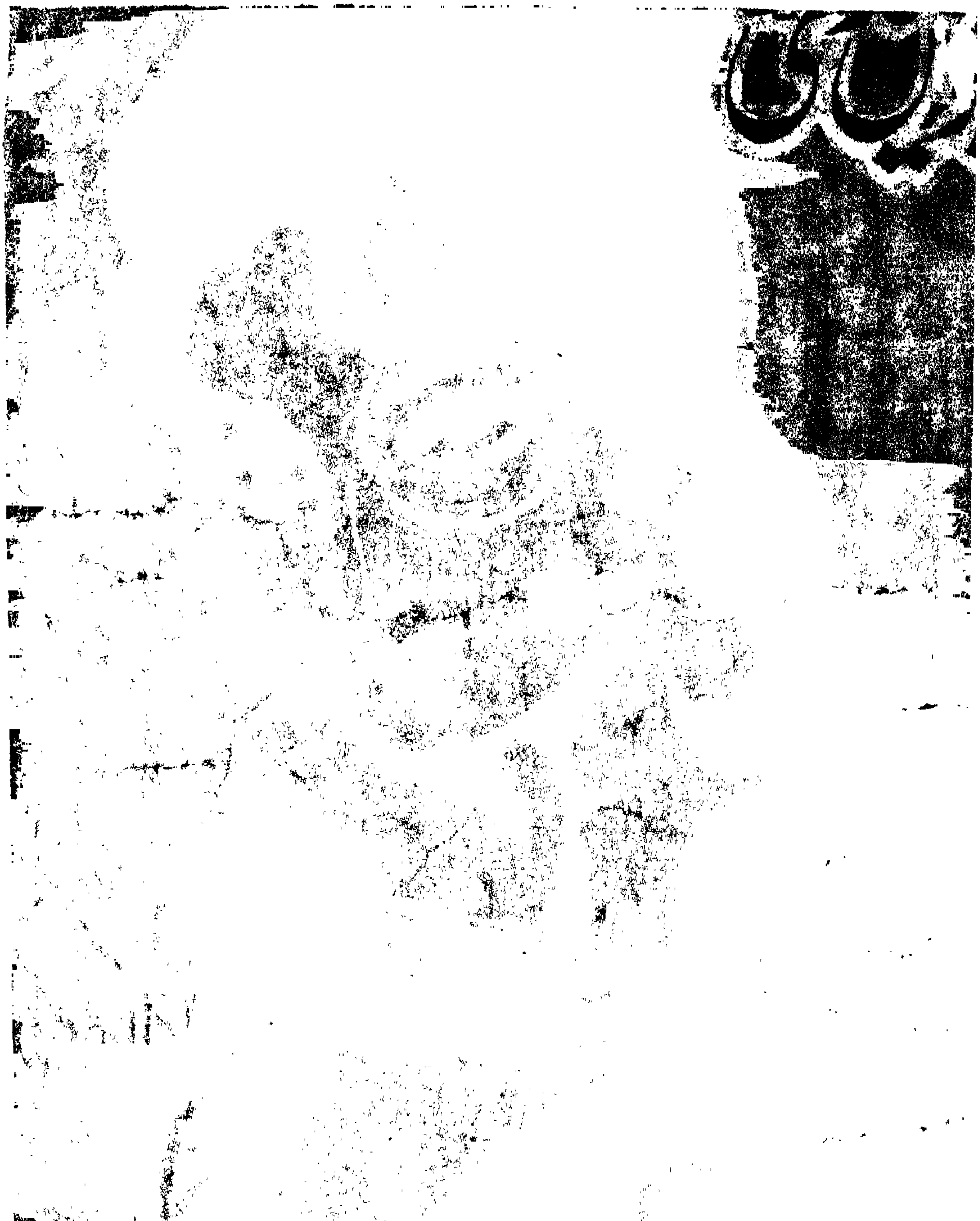
DUE DATE

Cl No. Acc. No.

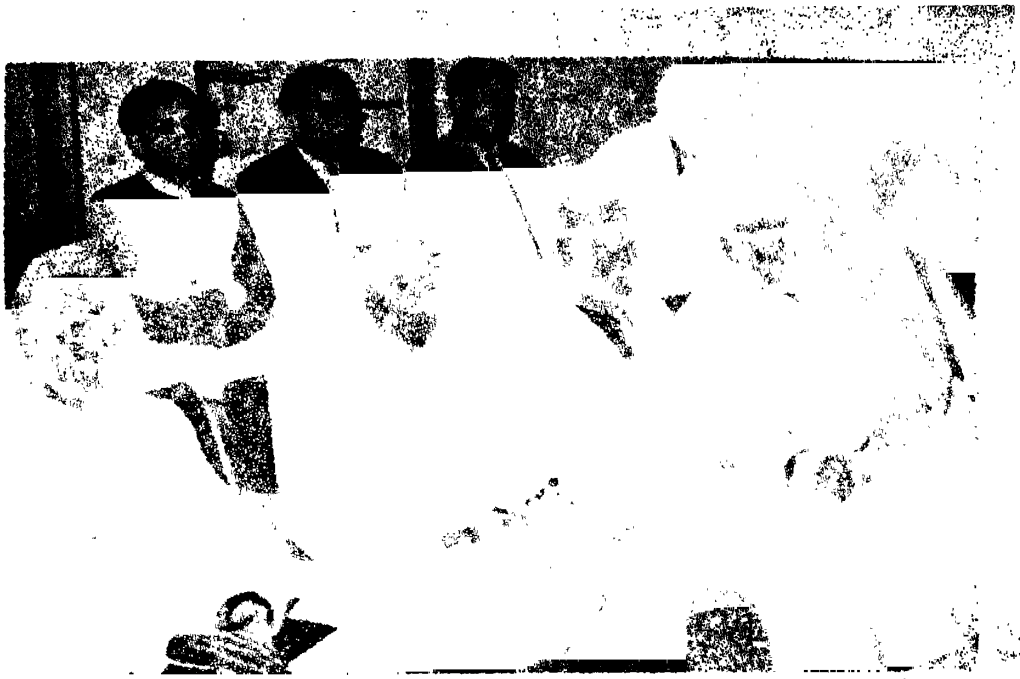
Late Fine Ordinary books 25 Paise per day. Text Book Re. 1/- per day. Over Night book Re. 1/- per day.





شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس

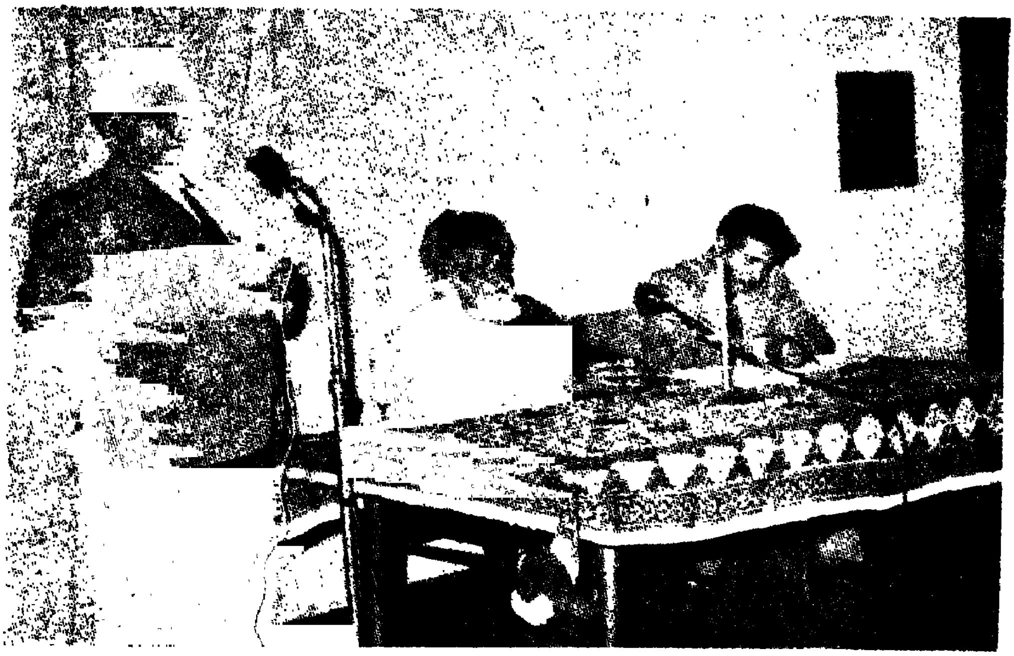
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں ——— فراق گورکھپوری



حذ موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے ـــــ کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں انجمن ترقیٔ اُردو دہلی کی طرف سے آنجہانی تلوک چند محروم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اُردو شاعروں، صحافیوں اور ادیبوں کا اجتماع۔ ان سوگوار صورتوں میں شمشیر سنگھ نرولہ، خوشتر گرامی، ضیا فتح آبادی، عبدالوحید صدیقی، گوپی ناتھ امن، جگن ناتھ آزاد اور بہار برنی کے چہرے بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔



سدا بہار صحافی بہار برنی نے سراپا غم ہوکر ماتمی قرارداد پیش کی، جسے حاضرین نے خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوکر منظور کیا۔ اُردو کے مشہور



ع ہم نہ ہوں گے تو بہت یاد کرے گی دُنیا

محروم صاحب ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بلند مرتبہ انسان بھی تھے۔ اُن کے کلامِ بلاغت نظام سے یکے بعد دیگرے تین نسلوں نے استفادہ کیا ہے ؎

علی جواد زیدی



محروم صاحب نے ہندو اور مسلمانوں کی نئی نسل کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کی۔ اِس وقت جبکہ اُردو زبان کو محروم صاحب جیسی عظیم شخصیت کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے، محروم صاحب سے اُردو کا محروم ہونا یقیناً ناقابلِ تلافی نقصان ہے ؎

ساغر نظامی



بہت سے بے تکلف دوستوں سے عید ملنے کے بعد خوشتر گرامی اپنے دیرینہ کرم فرما اور نامور افسانہ نگار کوثر چاندپوری کے گلے میں بازو حمائل کئے ہوئے۔ دل تو پہلے ہی ملے ہوئے ہیں، اس مبارک موقع پر گلے بھی مل گئے۔ پس منظر میں مظہر امام اور رش مظفرپوری!



عید کے موقع پر اردو کے چار درویشوں کی "درویش نوازی" ——— جمنا داس اختر، نریش کمار شاد، بہار برنی اور خوشتر گرامی



اُردو کے نامور شگفتہ کلام شاعر جناب ساغر نظامی کا جشنِ صحت منایا گیا۔ دہلی کے بہت سے صحافیوں، برگزیدہ شاعروں اور ادیبوں نے دلی مسکراہٹوں کے پھول ساغر صاحب پر نچھاور کئے لیکن بے شمار پھولوں میں یہ چند پھول تھے جو کیمرے کی آنکھ سے نہ بچ سکے۔



ساغر صاحب اپنی سرسبز و شاداب زندگی کا ثبوت دیتے ہوئے نغمہ سرا ہیں ؎

عشق نے سو گماں کئے پیدا — حُسن کے ذوقِ بدگمانی سے
اک جہاں مجھ پہ مہرباں ہوا — اُس نے دیکھا جو مہربانی سے
میرے فن پر نکھار آیا ہے — اک حسیں کی قصیدہ خوانی سے

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

خبر و نظر

خوشتر گرامی

"[illegible] ہوگی : ایک خبر ـــــ اور شری سمپورنانند کی [illegible]

"ترکی اور ہندوستان کے تعلقات مستحکم ہوں گے : ادے لنگی ـــــ اس لئے کہ آج کل ہندوستان خود بھی تو ترکی (ٹرکی) ہے۔

"اگر کوئی سو پچاس فیصدی ٹیکس لگا دے تو میں سو فیصدی کو توڑ دوں گا : ماہر ـــــ چوری کو پچاس فیصدی کو توڑ دیں گے۔

"پنجاب ودھان سبھا میں مچھلی مارکیٹ کے نظارے : ایک خبر ـــــ مچھلی پالن اور مرغی پالن پر زور دینے کا نتیجہ۔

"سرکاری ملازمین کی مجبوری : گورنر آریہ ـــــ گورنر یہاں سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لئے کہ وہ سرکاری ملازم نہیں خود سرکار ہیں۔

"کلکتہ میں بھوک کے ہجوم پر لاٹھی چارج : ایک خبر ـــــ روٹی نہ کھا سکے تو لاٹھیاں کھا لیں۔

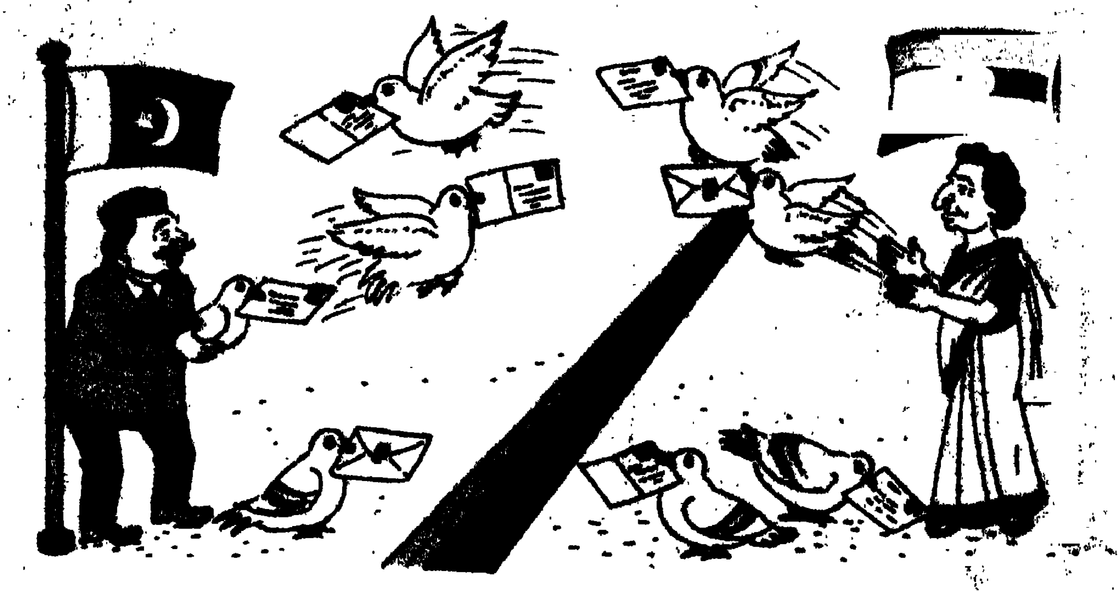
"تبت پر کنٹرول جاری رہے گا : ایک خبر ـــــ جب تک چینی نیتا اور ان کا حلقہ ختم نہ کر دیں گے۔

"نیپال میں بھرشٹاچار کا پھیلاؤ : ایک خبر ـــــ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ہندوستان کے پڑوسی ہونے کا نتیجہ۔

"نئے ٹیکس۔ زخموں پر نمک پاشی : ایک عنوان ـــــ زخموں کے علاج کا سوشلسٹ طریقہ۔



"ملک میں سوشلزم کا مستقبل روشن ہے" : شری گلزاری لال نندہ



ہند اور پاکستان کے درمیان ڈاک کی آمدورفت شروع ہوگئی۔

"پنجاب میں پنجابی کی مخالفت" ایک عنوان ——— اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

"وزیروں کی غیر حاضری" ایک عنوان ——— جہاں تک قانون ساز ادارے کا تعلق ہے، لیکن استقبالیہ جلسوں سے نہیں۔

"یو۔پی گورنمنٹ نے 'زیادہ اگاؤ' لٹریچر انگریزی میں چھاپنے پر ستر ہزار روپیہ برباد کیا" ایک خبر ——— کیوں صاحب کیسے برباد کیا؟ وہ لٹریچر امریکی کسانوں میں تقسیم کیا گیا تاکہ وہ اُسے پڑھیں اور زیادہ پیدا کریں، اور ہمارا پیٹ بھریں۔

"دِلّی میں شراب کی کھپت" ایک عنوان ——— نشہ اقتدار عام ہونے کے باعث کم ہے۔

"غنڈے اور لیڈر" ایک عنوان ——— چولی اور دامن کا ساتھ۔

"پڑھی لکھی عورتیں گھر کا بھی خیال رکھیں" ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ کی تقریر ——— کہاں سب کی سب وزارتوں، سفارتوں اور ممبریوں کے خواب دیکھتی ہیں۔

"حکومت یو۔پی کی طرف سے امداد باہمی کے تحت کوئی صنعت نہیں چلائی جا رہی" ایک خبر ——— اِس لئے کہ حکومت یو۔پی کافی عرصے سے افتراق باہمی کی صنعت میں مصروف ہے۔

"کشمیر کے پیچیدہ مسئلے کے تصفیہ کے لئے ابھی فضا یا ماحول موجود نہیں" جے پرکاش نرائن ——— اور جن کی دوکان اِسی مسئلے کے سہارے چلتی ہے وہ پیدا بھی نہیں ہونے دینا چاہتے۔

"ہندوستان میں سیکولرازم" ایک عنوان ——— برہمنوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔

• "شرنارتھیوں کا مسئلہ حل نہ کرنے پر حکومت ہم مستعفی ہو گئی" ایک خبر ——— بڑی بزدل نکلی۔ ہماری حکومت سے سبق لے جو برسوں کے مسئلے حل نہ کرنے پر بھی مستعفی نہیں ہوتی۔

• "ہم پاکستان کے ساتھ تعلقات کو تیزی سے معمول پر لانے کی کوشش کریں گے" سردار سورن سنگھ ——— سردار صاحب! کیا آپ بالکل اس پر تُل گئے ہیں کہ ہند اور پاکستان میں نفرت کی آگ بھڑکا کر سیاست کی دکان چمکانے والوں کا دیوالہ نکل جائے۔

• "مریض نے ہسپتال کی بالائی منزل سے چھلانگ لگا دی" ایک خبر ——— اور ابدی راحت پالی۔

• "ہندوستان کو ترقی دینے کے لئے مولانا آزاد کے راستے پر چلنا ہوگا" مولانا آزاد کو اندرا گاندھی کا خراجِ عقیدت ——— گرد گول دالکر کے راستے پر نہیں۔

• "پنجابی صوبے کا مطالبہ" ایک عنوان ——— اور پنجاب ہی میں رہتے ہوئے۔ سبحان تیری قدرت۔

• "عوام کے نمائندے" ایک عنوان ——— ووٹ لینے سے پہلے اور عوام کے حاکم ووٹ ملنے کے بعد۔

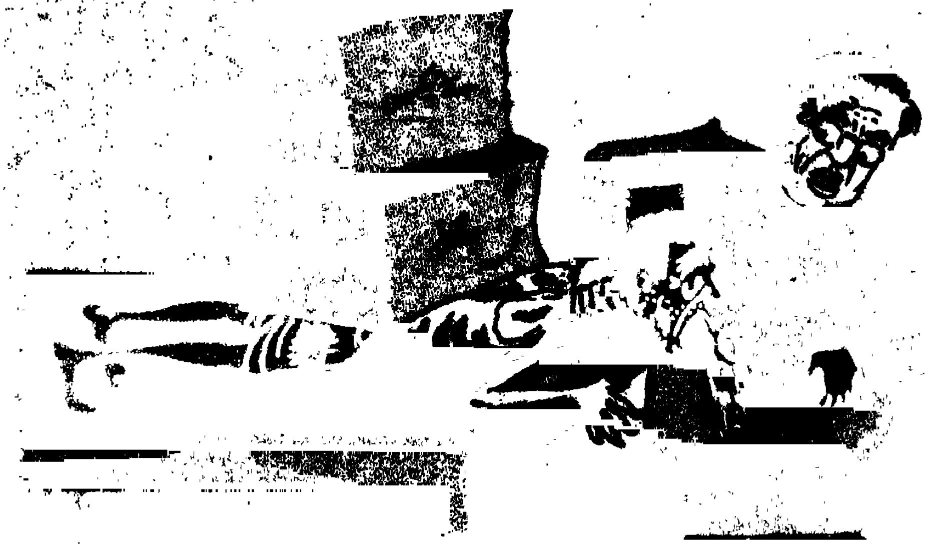
• "تین بلوں کی منظوری" ایک خبر ——— جنتا کے رہنے کے لئے۔ وزیروں کا معاملہ ہوتا تو کوٹھیاں منظور ہوتیں بل نہیں۔

• "کانگریس پارٹی میں ہر قسم کے لوگ شامل ہیں" ایک تبصرہ ——— یوں کہئے کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

• "پنجاب ودھان سبھا میں زبردست ہنگامہ" ایک خبر ——— پنجاب کی جمہوری زندگی کا ایک ثبوت ہے۔



• مسلمان کانگریسیوں کی فرقہ پرستوں کے خلاف لڑنے کی اپیل" ایک عنوان



ؔ ٹیکس پر ٹیکس لگاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے

"کامریڈ رام کشن نے ودھان سبھا کے سنٹرل ہال میں پارٹی میٹنگ والی جگہ پر شیشے لگوا دیے" ایک خبر —— مگر اس شیش محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر پھینکنے کے انجام سے خبردار رہنا چاہیے۔

"چین میں حکمران پارٹی میں پھوٹ" ایک خبر —— ہندوستان کی حکمران پارٹی کے نقشِ قدم پر۔

"فوڈ زونوں کا خاتمہ کوئی آسان کام نہیں" شری کامراج —— یہ کام وہ ہے کہ رستم سے نہ ہو سکا۔

"کانگریس ایک انقلابی موڑ پر" ایک عنوان —— پہلے اس نے انقلاب برپا کیا تھا اب اسے خود انقلاب کا سامنا ہے۔

"چاول نہیں کھائیں گے" ایک عنوان —— بلکہ ہوا کھائیں گے۔

"ایک اوورسیر کو دلچسپ سزا" ایک خبر —— کیا الّو بنا دیا۔

"قیمتوں کی روک تھام کی تجاویز زیر غور ہیں" وزیر خزانہ کا اعلان —— دوسرا مصرعہ عرض ہے ؎

زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

"بلیک مارکیٹ کا خاتمہ صرف قانون سے نہیں ہو سکتا" ایک اعلان —— بلکہ اس مارکیٹ پر راکٹوں کے ذریعے بم ورشا کرنی ہوگی

"برطانوی اخبارات میں ہندوستان کی قحط سالی کی خبریں" ایک اعتراض —— خواہ مخواہ شری سبرامنیم کو بدنام کرنے کی سازش ہے۔

"کانگریس کا اندرونی انتشار" ایک عنوان —— پرانی بات ہے کوئی افسانہ نیا نہیں ہمنشیں۔

• مسٹر [illegible] کے استعفیٰ کے اسباب: ایک عنوان ——— کم نہیں [illegible] کا چکر۔

• حوالات سے ملزم غائب: ایک خبر ——— شکر ہے حوالات وہیں چھوڑ گیا۔

• تمام برائیوں کی جڑ ذات پات ہے: ایک عنوان ——— اسی لئے ہم نے بہت سی برائیوں میں پڑنے کی بجائے اسی برائی میں پڑنا پسند کیا۔

• بھارت میں قحط کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹلی بھر میں غذا کی فراہمی: ایک خبر ——— شری سبرامنیم کے لئے شاید باعثِ فخر و مسرت ہو، ہماری تو گردن جھک گئی۔

• بمبئی میں اسکول کی عمارت گر گئی: ایک خبر ——— چلو چھٹی۔

• عوامی خدمت کے ادارے: ایک عنوان ——— جن میں بالائی آمدنی کے امکانات زیادہ ہوں اور عوام کے ساتھ اپنی بھی خدمت ہو سکے۔

• نظامِ تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے: ایک عنوان ——— کسے؟

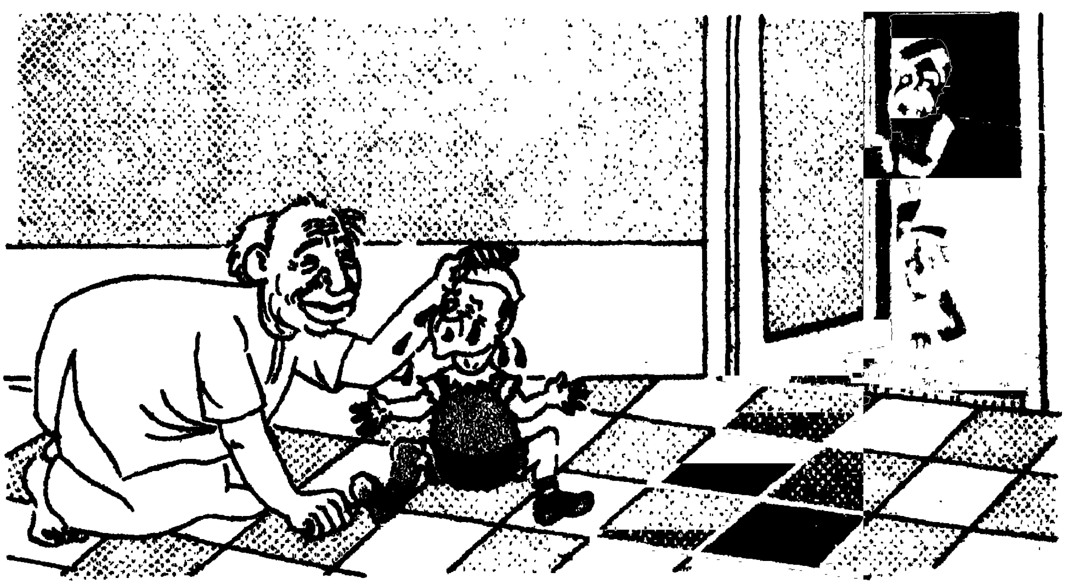
استاد کو؟

یا طالب علم کو؟

یا پھر وزیرِ تعلیم کو؟

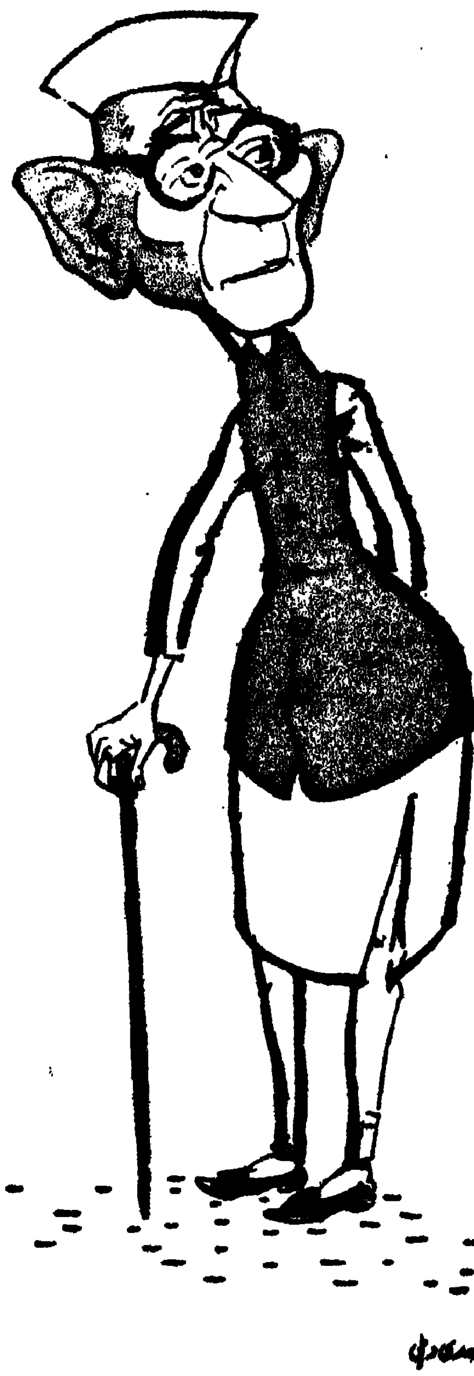
• بجنور کے طالب علموں نے ٹرین کو روک دیا: ایک خبر ——— کمہار پر بس نہ چلا، گدھی کے کان اینٹھ دیے۔

• فریبی گرفتار: ایک خبر ——— یہ بھی فریب ہوا اگر؟



"پنجاب میں وزیرِ اعلیٰ کی تبدیلی کا کوئی سوال نہیں": کامراج

شری مرار جی ڈیسائی



مناقد، کتابی چہرہ، لمبی ناک، بڑے بڑے کان جو دوسروں کی کم سنتے ہیں۔ بڑی بڑی آنکھیں جو چشمہ لگ جانے سے ڈبل ہارس پاور کا کام کرتی ہیں گندمی رنگ، کھدر کا کرتہ، چوڑی دار پاجامہ، کبھی جواہر کٹ اور کبھی شیروانی۔ یہ ہے حلیہ ——— اُس ذاتِ شریف کا جس نے دو بار ہندوستان کا وزیرِ اعظم بننے کے خواب دیکھے اور جن کا نام ہے

بمبئی کی وزارتِ عظمیٰ کی لاٹری ان کے نام نکلی تھی مگر کچھ ایسے گل کھلائے کہ پہلی ہی انتخابی کشتی میں چت آئے لیکن پارٹی کے بل بوتے پر پھر کونسل کے راستے سے اسی گدی پر پہنچ گئے لیکن حالات سازگار نہ ہو سکے چنانچہ بمبئی سے دلی کا راستہ لیا۔ یہاں پنڈت نہرو کی کرپا سے پھر وزارت ہاتھ آئی۔ وزارتِ صنعت و تجارت اور وزارتِ خزانہ کی کرسیوں پر رونق افروز رہنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں کامراج پلان میں کام آئے اور وزارت سے محروم ہو گئے ——— مگر

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اور چھٹ جائے تو اس کی یاد ستاتی اور ان گلیوں کے چکر لگاتی ہے۔ پھر اگر آدمی ضدی اور دھن کا پکا ہو تو وہ وزارتِ عظمیٰ کے نام پر بھی ڈورے ڈالتا ہے۔ شاستری جی کی وفات کے بعد وزارتِ عظمیٰ کی گدی خالی ہوئی تو خم ٹھونک کر ڈٹ گئے اور الیکشن لڑ کر رہے۔ الیکشن کی ناکامی پر آپ نے یہ کہہ کر حوصلہ بڑھایا کہ

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ان گنت ٹیکسوں سے ان کا نامۂ اعمال سیاہ ہے۔ سونا قانون (گولڈ کنٹرول) اسکیم کے خالق ہیں۔ لازمی بچت اسکیم بھی آپ کی دماغی اپج کا نتیجہ تھی مگر وہ تو آپ کے وزارت چھوڑنے کا غم برداشت نہ کر سکی اور چند ہی دن بعد راہیِ ملکِ عدم ہو گئی۔ آج کل ایڈمنسٹریٹو ریفارمز کمیٹی کے چیئرمین ہیں اس کی پہلی ریفارم یعنی درجہ بندی کرانے میں آپ ناکام ہو چکے ہیں کہ

افسانہ

رازِ دل

پُشکرناتھ۔ بی، اے

معرفت ہیڈ کیشئر، اسٹیٹ بنک آف انڈیا۔ جموں (توی)

۲۳ر دسمبر ۱۹۶۵ء برادر محترم! آداب و نیاز

... آپ کے محبت نامہ کا جواب ایک "حسین و جمیل" افسانہ ہی ہو سکتا ہے۔ لیجئے! "رازِ دل" حاضر ہے ——— افسانہ پڑھنے کے بعد آپ کے مُنہ سے 'واہ' نہ نکلے تو بغیر کسی تامّل کے لَوٹا دیجئے (یہ خود اعتمادی آپ ہی کی بخشی ہوئی ہے)۔ ——— یہ افسانہ میری طویل غیرحاضری کی تلافی نہیں ہے۔ ابھی مجھے دن رات محنت کر کے آپ کی اور قارئین "بیسویں صدی" کی محبت کا حق ادا کرنا ہے۔ ہائے! اِس بے پناہ محبت کا جواب کیسے دوں؟ خیراندیش ——— پُشکرناتھ

سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ ابھی پلک جھپکتے ہی میں۔ میں دیکھ ہی رہا تھا کہ کمان کا تناؤ ٹوٹ گیا۔ اب کوئی کشش محسوس نہ ہوگی، کوئی خنجر پہلو میں باقی نہ رہے گا، کوئی آگ سینے میں نہ جلے گی۔ بھیانک اور گہرے اندھیرے کا کوئی احساس دل میں ہراس نہ جگائے گا۔ اب تو صرف سنّاٹا ہے۔ گہرا سنّاٹا!

جیسے رات بھر کسی بیمار نے ... میں تڑپ تڑپ کر، مچل مچل کر، چیخ چیخ کر صبح ہوتے ہوتے دم توڑ دیا ہو۔

آگے کیا ہوگا ——— کیا ہوگا؟

وہ ہلکے نیلے رنگ کے کاغذ کا پُرزہ ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے بہت دُور چلا گیا ہے۔ اِتنا دُور نہیں کہ میں دیکھ ہی نہ سکوں لیکن اِتنا دُور ضرور ہو گیا ہے کہ میں اُسے چھو نہ سکوں۔ نہ جانے یہ کیسا بے حسی کا عالم ہے کہ اُٹھا نہ جا سکے گا۔ کوئی انگ ہلایا نہ جا سکے گا۔ صرف آنکھیں ہیں جو دیکھ رہی ہیں۔ دماغ ہے جو سوچ رہا ہے۔ نہ جانے کیا سوچ رہا ہے۔ اب اِس سوچ کی کوئی منزل نہیں ہے۔ منزل تو پہلے بھی نہ تھی لیکن منزل کا احساس تو تھا۔ اب یہ احساس بھی چھن گیا ہے۔ کیا یہ سوچ نہ چھن جائے گی؟

ایک ایک لمحے، ایک ایک پل کو یہ کُرید کُرید کر اُبھار رہی ہے۔ اب یہ کُرید کیسی؟ کونسا آشیانہ بنانا ہے؟ سارے آشیانے تو ابھی ابھی اُجڑ گئے ہیں۔ بس! اِسی ایک لمحے میں، ایک پل میں سب کچھ ہو گیا۔ اُف! یہ ایک لمحے کا جادو!! میں نے کبھی اِس جادو کو نہیں جگایا تھا ——— ایک سہما سہما سا، بُجھا بُجھا سا انسان، وقت کی کڑی سے کڑی ملاتا ہوا، زندگی کے ابدی و ازلی پہیے کو چلاتا ہوا، بھلا یہ انسان کوئی جادو کیسے جگائے گا ——— ایک چھوٹا سا محور، چھوٹا سا آنگن، چھوٹا سا آسمان، چھوٹی سی دُنیا! کوئی ارمان نہیں، کوئی خواہش نہیں، کوئی دُکھ نہیں، کوئی خوشی نہیں، کوئی جلن نہیں، کوئی اَنا نہیں ——— اِسی بے رنگ و بُو دُنیا کا باسی، بھلا میں وقت کے ساتھ کیا اُلجھتا؟

صبح دس بجے کالج جاتا تھا۔ شام کو چار بجے آخری کلاس لینے کے بعد گھر واپس آتا تھا۔ بہت ہوا تو چھٹی کے دن سنیما دیکھنے چلا گیا۔ رُکمنی کے سوا کوئی مونس نہیں، غمخوار نہیں۔ کوئی دوست نہیں۔ جس نے ساری عمر نوکرانی کے بھیس میں بِتائی تھی۔ میری نوکرانی نہیں، اُس کی نوکرانی ——— وہ مالکن تھی۔ رُکمنی کی بھی اور میرے اِس چھوٹے سے فلیٹ کی بھی۔ کہنے کو تو میں نے فلیٹ کہہ دیا لیکن اصل میں یہ اِس حویلی ہی کا ایک حصّہ ہے۔ تھوڑا سا ادل بدل کر کے اِسے فلیٹ کی سی شکل دے دی گئی ہے۔ کیونکہ حویلیوں کا رواج اب نہیں رہا۔ بیچ میں ایک لمبا چوڑا دالان ہے۔ اُس سے ذرا ہٹ کر حویلی کا مرکزی حصّہ ہے، جس میں رُکمنی اور اُس کی مالکن کا گھر ہے۔ دائیں اور بائیں حصّے میں کچھ کمرے کرایہ پر اُٹھائے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ایک اصطبل ہے۔ کبھی تھا۔ اب تو اِسے تبدیل کر کے گیرج بنا دیا گیا ہے اور جس میں وہ ہلکے آسمانی رنگ کی شیورلٹ کار رہتی ہے، جو ظاہری خوبصورتی کے باعث نئی معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت پُرانا ماڈل ہے۔ اُس کے ساتھ ہی دو کمرے ہیں جن میں ڈرائیور اور اُس کا کنبہ رہتا ہے۔ اِن کمروں سے ذرا ہٹ کر باورچی کا کمرہ ہے جس میں وہ اپنی بہو اور بیٹے کے ساتھ رہتا ہے۔ اِس کمرے کے بعد وہ پچاس کنال زمین پر پھیلا ہوا باغ ہے، جس میں کہتے ہیں کبھی نہر

بیجی تھی اور فوارے تھے۔ اب تو نہ پھولوں کی قطاریں نظر نہیں آتیں ـــــ شلغم، گوبھی اور آلو وغیرہ کی کیاریاں ہیں۔ البتہ وہ فصیل جو اس باغ کے گرد بنی ہے، اب بھی اُسی طرح کھڑی ہے اور وہ ڈیوڑھی بھی کھڑی ہے، جس کے دونوں طرف، کہتے ہیں، دو باوردی سپاہی ہمیشہ کھڑے رہتے تھے لیکن اب صرف ڈیوڑھی ہی ڈیوڑھی ہے۔ اونچی، کنندہ پر محراب تھامے، باوقار نہ جانے کس حشمت، دبدبے اور کن رازوں کی پاسبان!

کچھ چیزیں تو پلک جھپکتے میں بدل جاتی ہیں لیکن اس حویلی کی تاریخ دھیرے دھیرے منزل بہ منزل بدلی تھی۔ پہلے جاگیریں گئیں، پھر زمینیں گئیں، پھر کارندے، منشی، نوکر چاکر چوکیدار گئے، پھر اصطبل کے گھوڑے گئے، پھر چاندی کے برتن گئے، پھر بڑے بڑے قالین اور فاضل فرنیچر گیا۔ چودہ پندرہ برس میں یہ تبدیلیاں آئیں۔ اب بھی بہت کچھ باقی ہے۔ تھوڑی بہت زمینیں بچی ہیں، بگھی گھوڑے کی جگہ کار آگئی ہے۔ نوکروں کی تعداد میں بہت کمی کر دی گئی ہے۔ چند چیزوں کو نئے سانچوں میں ڈھالا گیا ہے۔ جیسے حویلی ـــــ اس کا ایک حصہ چھوڑ کر باقی حصوں کو کرایہ پر دینے کے قابل بنایا گیا ہے۔ اُس ایک حصے میں وہی پرانی شان برقرار ہے۔ جھاڑ اور فانوس لگے ہوئے ہیں۔ خاندان کے تمام راناؤں کی قدِ آدم تصویریں، سنہری فریموں میں جڑی، گول کمرے میں اب بھی لگی ہیں۔ ایک پوری دیوار پر تلواریں، بندوقیں، خنجر اور دوسرے اسلحے اُسی شان سے موجود ہیں۔ چند مخملی کرسیاں اب بھی باقی ہیں۔ ہاتھی مر تو گیا ہے لیکن اب بھی سوا لاکھ کا ہے!

رانا رتن سنگھ اس حویلی کا آخری وارث تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں اُس کی سگائی پاس کے علاقے کے زمیندار کی اکلوتی بیٹی سے ہوئی تھی ـــــ اٹھارہ سال کی عمر تک رانا کی تربیت ہوتی رہی۔ اُسے شکار کھیلنا سکھایا گیا، گھوڑ سواری کے کرتب سکھائے گئے، راج نیتی کے گُر سمجھائے گئے۔ سرکار کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کے رموز بتائے گئے۔ حویلی اور اس سے متعلق دوسری چیزوں کی اونچ نیچ بتائی گئی اور اٹھارہ سال کی عمر میں اُس کی شادی طے کی گئی۔ تاریخ مقرر ہو گئی، تیاریوں کا حکم دیا گیا۔ ساری منڈی اور اس سے ملحق علاقوں میں سات دن کا جشن منانے کا اعلان کیا گیا۔ سات دن کے بعد رانا کو برات لے کر زمیندار ٹھاکر جے گوپال سنگھ کے ہاں جانا تھا اور چندر مُکھی کو بیاہ کر لانا تھا۔ سات دن گزر گئے۔ برات روانہ ہو گئی۔ زمیندار کے ہاں پہنچی بھی ـــــ لیکن جب وہاں سے واپس ہوئی تو اُسی ڈولی میں چندر مُکھی دُلہن نہیں تھی ـــــ چندر مُکھی بیوہ تھی! تقدیر کا کتنا بڑا مذاق! ایک لمحہ پہلے چندر مُکھی دُلہن بن کر سولہ سنگار کئے سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی چہک رہی تھی اور دوسرے لمحے ایک نوکر ہانپتا کانپتا، لڑکھڑاتا، تھر تھراتا ہوا آیا اور خبر سُنا گیا ـــــ رانا جی پر گولی چلائی گئی۔ بارہ دری میں بیٹھے تھے۔ دو گولیاں چلیں اور رانا جی کے دل میں اُتر گئیں۔ ایک لمحہ یونہی پلک جھپکنے میں بیت گیا اور چندر مُکھی بیوہ ہو گئی!

اور بیوہ کو اُسی ڈولی میں بٹھا کر لایا گیا۔ کیونکہ ٹھاکر جے گوپال سنگھ کی یہی مرضی تھی اور رانا رتن سنگھ کے بوڑھے ماموں کی بھی مرضی تھی۔ حویلی میں رانا نہ ہو لیکن حویلی رانی سے بھی محروم رکھی جائے گی۔

سال دو سال تک پولیس خونی کو تلاش کرتی رہی، قتل کا معمہ سلجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ خاندانی رقابت سے لے کر محبت کی رقابت تک سبھی پہلو کھنگالے گئے لیکن بے سود! رفتہ رفتہ رانی چندر مُکھی کے دل میں چتا کے شعلے ماند پڑ گئے، پھر ان شعلوں کی جگہ ایک گہرے بھیانک زخم نے لے لی، جو روح کی طرح گہرا اور موت کی طرح بے کراں تھا۔ حویلی میں رانی نے سب چیزیں تج دیں۔ بناؤ سنگھار، چاندی کے برتن اور سونے کے پچھے مخملی بستر اور کمخواب کے پردے۔ بیش قیمت ساڑیاں اور ڈھیروں گہنے اور ان چیزوں کے بدلے گیتا کو اپنا لیا۔ روز اٹھارہ کے اٹھارہ ادھیایوں کا پاٹھ کرتی۔ حویلی کے اندر بنے ہوئے ٹھاکر دوارے میں اپنی بیوگی کی گھڑیاں بتاتی۔ صرف ایک نوکرانی رُکمنی کو سامنے آنے کی اجازت تھی۔ یہ رنگ اُس وقت بھی رہا جب حویلی سے حکم نامے جاری ہوتے تھے اور یہی رنگ جب بھی برقرار رہا، جب سرکار کے حکم نامے حویلی میں آنے لگے۔

نہ جانے رُکمنی کو میرے ساتھ محبت کیوں ہو گئی تھی۔ ورنہ یہ سب باتیں میں کیسے جانتا۔ ان حویلیوں کی باتیں اور یہاں کے راز ڈیوڑھی سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ایک دن، جب مجھے اس حویلی میں رہتے ہوئے پانچ برس ہو چکے تھے، میں نے رُکمنی سے کہا:

"موسی! مجھے ایک بار رانی جی کے درشن کرا دو۔"

میری بات سُن کر جیسے رُکمنی کو سانپ سونگھ گیا۔ اُس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔

"کیسی بات کرتے ہو بیٹا؟ اس بڑھاپے میں مجھے ذلیل کرواؤ گے؟"

"کیوں؟ اتنی بے رحم ہے یہ تیری رانی؟"

"نہیں بیٹا! ایسا نہ کہو۔ پر سوچو، جس عورت نے چودہ برس تک کسی بھی مرد کو اپنی چھایا تک نہ دکھائی ہو، اُسے میں کیسے کہوں کہ ـــــ"

"چودہ برس؟ چودہ برس تو بہت ہوتے ہیں موسی! رام جی کا بن باس بھی تو چودہ ہی برس کا تھا ـــــ!"

"ہاں بیٹا! چودہ برس بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے اور رانی جی نے ان چودہ برسوں میں کبھی اپنے پتا تک کو پاس نہیں آنے دیا۔ وہ تو بہت پہلے ہی سورگباش ہو گئے تھے۔ ایک میں بڑھیا رہ گئی ہوں۔ نہ کبھی بیاہ رچایا، نہ گھر گرہستی دیکھی، نہ اولاد دیکھی۔ عمر ہو گئی نوکرانی کا کام کرتے۔ اسی حویلی میں پیدا ہوئی، یہیں کسی دن مر جاؤں گی لیکن یہ زندگی کیا، ہزار زندگیاں رانی جی پر نچھاور کر سکتی ہوں۔"

"ارے موسی! تم تو رونے لگی ہو سچ مچ؟"

"بیٹا کیا بتاؤں تجھے۔ کبھی کوئی بات نہیں کرتی۔ کبھی کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ جو ملا کھا لیا۔ نہ ملا تو نہ سہی۔ بس جئے جا رہی ہے ـــــ تیس برس کی اگلے سال ہو جائے گی۔"

"موسی! بہت خوبصورت ہے کیا؟"

"خوبصورت؟ تم خوبصورت کہتے ہو؟ میں کہتی ہوں، کوہ قاف کی پری سامنے آجائے تو پانی بھرے ——!"

اُس دن پہلی بار مجھے رانی کو دیکھنے کا شوق ہوا لیکن کہاں دیکھوں؟ کیسے دیکھوں؟ کبھی باہر نہیں آتی۔ کبھی دالان میں قدم نہیں رکھتی۔ کبھی برآمدے میں نہیں گزرتی۔ کبھی کھڑکی کے پاس نظر نہیں آتی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن رانی کی جھلک تک نہ دیکھ سکا۔ نہ جانے کیوں یہ شوق چرایا تھا مجھے؟ پاگل پن! ہاں رفتہ رفتہ یہ شوق پاگل پن ہی بن گیا۔ یہاں تک کہ ایک برس بیت گیا —— اور پھر اچانک، بے خبری میں، بغیر کسی آہٹ کے ایک دن میں نے رانی کو دیکھ لیا۔ رکمنی ساتھ تھی۔ ہاتھ میں ایک ہلکی سی ٹوکری پھولوں سے لدی ہوئی، سیاہ رنگ کی شال میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی، نظریں جھکائے، ماتھے پر کوئی شکن نہیں، چہرے پر کوئی تاثر نہیں۔ صرف ایک نور کا ہیولیٰ تھا۔ اُس نے آہستہ سے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ اِن نظروں میں کوئی خفگی نہیں تھی، کوئی وحشت نہیں تھی، کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بس نظریں تھیں۔ دیوی کی مورتی کی نظریں۔ پتھرائی ہوئی سی لیکن زندۂ جاوید —— میں مزید تاب نہ لاکر بھاگ گیا۔

شام کو رکمنی آئی۔

"بڑے شریر ہو۔ دیکھ لیا نا رانی جی کو ——؟"

"ہاں موسی! بہت ناراض ہوئی ہوگی۔ تم سے کیا کہا؟"

"کہنے لگیں، کون تھا؟ میں نے کہا پروفیسر صاحب تھے۔ ڈیوڑھی کے کرایہ دار۔"

اُس رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ سُرمگیں پلکوں والا خواب۔ بھیگے بالوں والا خواب۔ چھم چھم مینہ برستا ہوا۔ میرے اندر کے آئینے پر بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرے اور آئینے دھندلا گئے۔

چودہ برس کی تپسیا کے بعد جب رانی نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک بے سروسامان انسان کھڑا تھا۔ تھر تھر کانپتا ہوا اور اِن نظروں کی تاب نہ لاکر وہ انسان بھسم ہوگیا —— وہ انسان میں تھا۔

نہ جانے یہ کون سی منزل ہوتی ہے، جب عقل تج دی جاتی ہے۔ جب شعور کی سرزنش کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب سوچوں کے بہاؤ کو روک دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اِس منزل پر پہنچ کر جو بھٹک گیا، وہ بھٹکتا ہی رہتا ہے۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ یہ چپ کیوں لگ گئی ہے۔ یہ چہرہ کیوں زرد ہوگیا ہے تمہارا ——؟"

اِتنے دنوں کے بعد آخر رکمنی سے نہ رہا گیا۔ پوچھ ہی بیٹھی۔

"کچھ نہیں موسی! ٹھیک تو ہوں۔ تمہارا وہم ہے۔"

رکمنی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ دیر تک ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کو دیکھتی رہی۔

"ہاں! مجھ سے کیوں کہو گے؟ سوچتی ہوں اگر بیاہ کیا ہوتا اور گھر بسایا ہوتا تو تمہارے ہی جیسا ایک بیٹا میرا بھی ہوتا۔ میں اُس سے پوچھتی، بیٹا! کیا دُکھ ہے تجھے؟ تو —— تو ——" رکمنی کی ہچکی بندھ گئی۔

"یہ تم سے کس نے کہا موسی کہ مجھے کوئی دُکھ ہے؟"

"تمہاری حالت نے۔ یہ شیو کیوں نہیں کرتے۔ یہ اتنی میلی قمیص پہنے تمہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ —— یہ اُترا ہوا چہرہ تو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ رات رات بھر بجلی جگائے کمرے میں ٹہلتے رہتے ہو۔"

رکمنی کے آنسو بجلی کی روشنی میں موتیوں کی طرح دمکنے لگے۔ میں دل ہی دل میں اُن موتیوں کو اپنی پلکوں سے چنتا رہا لیکن رکمنی سے کچھ نہ کہہ سکا۔ کیا کہتا؟ کیسے کہتا ——؟

رفتہ رفتہ ساری چیزیں دھندلا گئیں۔ کوئی چاند نہ رہا۔ سورج کی روشنی نہ رہی۔ درختوں کی ہریالی اور پھولوں کے رنگ نہ رہے۔ صرف ایک شے باقی تھی لیکن اُسے بھی کسی اَن کہے ارمان کی طرح زمانے سے چھپاتے چھپاتے رکھنا پڑا۔ ایک خنجر پہلو میں پیوست تھا جسے رکھا نہیں جا سکتا تھا اور نکالے بھی نہ بنتی تھی۔ ایک آگ تھی دل میں جسے نہ سنبھالے بنتی تھی نہ بجھائے بنتی تھی۔ جلا دو! میرے روم روم اور انگ انگ کو راکھ کر دو۔ ہائے! اِس جلنے میں کتنی راحت تھی۔ کتنا سکون تھا۔

اُس دن رکمنی جو آئی تو میں حسبِ معمول آنکھیں بند کئے صوفے میں بیٹھا تھا۔

"بیٹا! کیوں ستاتے ہو مجھے؟ دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔ مجھ سے کہو کیا بات ہے۔ کون ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے۔ میں اُسے ان سفید بالوں کا واسطہ دوں گی۔ اُس کے آگے ہاتھ جوڑوں گی، اُس کے پاؤں ——"

"موسی ——!"

"ایسا نہ کہو موسی! ایسا نہ کہو۔ میں اِس قابل نہیں ہوں۔"

"اچھا! اگر تو نہ بتائے گا، تو میں جا کے ابھی ہیرا چاٹ لوں گی!"

میں رکمنی کی آواز سُن کر لرز گیا۔ اُس کی آواز میں اٹل ارادہ تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں سُن پاؤ گی۔"

"تم بتا کے تو دیکھو بیٹا۔"

"چندر رکھی۔"

اچانک رکمنی کی آنکھیں بجھ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اُن آنکھوں میں حیرت اور خوف کا سایہ سا تیر گیا۔ پھر اُن میں سُرخی چھانے لگی۔ شدید غصّے کی سُرخی! پھر اُس کی آنکھیں

غضبناک ہوگئیں اور دوسرے لمحے رُکمنی بھاگ کر کمرے سے چلی گئی۔

بہت دن بیت گئے۔ رُکمنی پھر کبھی میرے پاس نہ آئی۔ مجھے انتظار بھی نہ رہا۔ کس کا انتظار؟ ایک ہلکا ہلکا سا، دھیما دھیما سا درد اسی طرح قائم رہا۔ بہت کرکہ دیتے اپنے آپ کو۔ کبھی اذیتوں سے گزرا۔ آخر ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ میں چلا جاؤں گا۔ یوں کسی کی تپسیا بھنگ کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں ـــــ اور اسی دن شام کو رُکمنی سات مہینے کے بعد میرے پاس آئی۔ بیٹھتے ہی اُس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

"کیا بات ہے موسی؟"

رُکمنی کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دیر تک اُس کی ہچکیاں کمرے کی بوجھل فضا میں تیرتی رہیں۔

"بیٹا! رانی جی کی طبیعت بہت خراب ہے!"

"کیوں؟ کیا ہوا ہے اُن کو؟"

"نہ جانے کیا ہوا ہے۔ ساری ساری رات جاگتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی چھم چھم آنسو بہانے لگتی ہیں۔ پرسوں کہا، میرے سارے کپڑے نکال دو۔ سارے زیورات نکال دو۔ پھر باری باری اُن کپڑوں کو پہننے لگی۔ زیوروں کو پہن پہن کر اُتارتی رہی۔ ساری رات یہی ہوتا رہا۔ کوئی سایہ ہو گیا ہے شاید۔ کبھی رات کو اُٹھ کر سنگار کرنے لگتی ہے۔ پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اوندھے منہ بستر پر گر کر رونے لگتی ہے۔ مجھ سے اُن کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ کل رات اچانک سارے کپڑے پھاڑ دئے۔ کہنے لگی دم گھٹ رہا ہے۔"

"کسی ڈاکٹر کو بلانا تھا؟"

"کیسے بلاتی بیٹا! وہ مانے تب نا۔ کہتی ہے مجھے کچھ نہیں ہوا ہے ـــــ تم ہی بتاؤ کیا کروں بیٹا! بہت پریشان ہوں۔ اب تمہارے پاس آئی ہوں۔"

"میں تو جا رہا ہوں موسی!" میں نے جواب دیا۔

رُکمنی ایک لمحے کے لئے جیسے ٹھہر سی گئی۔ جیسے اچانک اُسے کچھ یاد آگیا۔

"چلے جاؤ گے؟ ٹھیک ہے، چلے جاؤ۔" اُس نے بجھی سی آواز میں کہا۔

"موسی! میرے پاگل پن کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ بھول جانا مجھے اور ـــــ"

"ہاں بیٹا! ضرور بھول جاؤں گی۔ اُس دن مجھ پر پاگل پن سوار ہو گیا تھا۔ میں روتی ہوئی رانی جی کے پاس گئی اور سب کچھ رانی جی سے کہہ دیا۔"

"موسی!!" میں چیخا۔ "موسی! تم نے بہت بُرا کیا ہے۔ اُف! اب میں زندہ کیسے رہوں گا؟"

"چھما کرنا بیٹا! تم نہیں جانتے، میں رانی جی سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ میرا باپ، میرا پتی، میرا بیٹا سب کچھ وہی ہے۔ کیسے نہ کہتی اُس سے؟ بس! اُن کے ہلکے سے مُسکرائی اور کہا۔ رُکمنی! بھول جاؤ اِس بات کو ـــــ"

ہائے! رُکمنی تم نے یہ کیا کیا۔ مجھے بیچ میدان ننگا کر دیا۔ اب میں کیا کروں؟ میں کل صبح آئینے میں اپنا چہرہ کیسے دیکھوں گا۔ پھر بھی کوشش ہو رہی کہ [illegible] جلدی جلدی اپنا سارا سامان باندھنے لگا۔ اب اِس شہر میں میرے لئے کوئی [illegible] کرسی میں ڈھیر ہو گیا ـــــ باہر رات ہولے ہولے سنسان ہو رہی تھی۔ [illegible] تھا اور ایسی اذیت ناک لمحے میں میری آنکھ لگ گئی۔

صبح یکایک میں بیدار ہو گیا۔ جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگایا ہو۔ باہر [illegible] شنکھ زور زور سے بج رہے تھے۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ [illegible] میں کوئی آدمی چیخ رہا تھا۔

"رانی جی مر گئیں!!"

یکلخت میرے کانوں پر پردے گر گئے۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ در و دیوار ساکت ہو گئے۔ کہو! یہ مجھ سے اُٹھا کیوں نہیں جاتا۔ یہ میرے ہاتھ پاؤں شل کیوں ہو گئے ہیں؟ یہ میری آنکھوں سے آبشار کیوں اُمڈ پڑے ہیں؟

"مجھے رانی جی کے انتم درشن کرنے دو۔"

کسی مرد نے روتے روتے پکارا۔

"نہیں ـــــ!" کسی نسوانی آواز نے روتے روتے کہا ـــــ سامنے دیوار پر سورج کی روشنی بہت تیز ہے۔ اب یہ روشنی نیچے کھسکنے لگی ہے۔

"اُسے راستہ دو۔ ارتھی آ رہی ہے۔" کوئی پکار رہا ہے۔ روتی آوازیں ڈیوڑھی تک آگئی ہیں۔ اب یہ آوازیں ڈیوڑھی کے باہر آگئی ہیں۔ اب گہرا سناٹا ہے۔ سورج کی روشنی دھیرے دھیرے مدھم پڑنے لگی ہے۔ مدھم اور مدھم۔ اب اندھیرا ہے۔ گہرا اندھیرا!

یہ ایک ساتھ ساری چیزیں کیسے تھم گئی ہیں؟ یہ ـــــ یہ بے حسی کا عالم۔ اِس عالم کو کیا کہتے! کوئی انگ ہلایا نہ جا سکے، کوئی آواز نہ سُنی جا سکے۔ کیا سارے احساس ڈوب گئے ہیں؟ وہ رُکمنی دروازے میں کھڑی ہے۔ کچھ کہہ رہی ہے شاید۔ کیا کہہ رہی ہو موسی؟

ارے! یہ بجلی جلا دی تم نے۔ پگلی! یہ چھوٹا سا بلب اتنے گہرے اندھیرے کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ اِس لفافے میں کیا لائی ہو؟ دیکھوں؟ آہ! کیسے پکڑوں؟ ہاتھ ہلایا بھی تو جائے۔ تم کچھ کہتیں کیوں نہیں موسی؟ کوئی انگ ہلایا نہیں جاتا۔ نہ جانے کیا کہہ رہی ہو۔ میری بات کا جواب تو نہیں دے رہی ہو۔ اُسے! یہ تم چھاتی کیوں پیٹ رہی ہو۔ ہاں! یہ تم نے اچھا کیا جو لفافے میں سے یہ کاغذ کا پرزہ نکال لیا۔ قریب لاؤ۔ تھوڑا اور قریب ـــــ

"بہت دنوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ قدم ڈگمگانے لگے ہیں۔ سہارا اب مر جانا چاہئے۔ رُکمنی کا خیال رکھئے گا ـــــ چندر لیکھا"

نہ جانے اِتنا پانی کہاں سے لائے یہ آبشار ـــــ رُکمنی چلی گئی۔ وہ بجلی [illegible] کاغذ کا پرزہ پھڑپھڑاتا ہوا دُور چلا گیا ہے ـــــ خدا کے لئے اِس کاغذ کے پرزے کو روک لو کہیں یہ اِس ڈیوڑھی سے باہر نہ چلا جائے!!

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری، ایم۔ اے

بیانِ شوق میں نازک مقاموں سے گزرنا ہے
مجھے تیرے سکوتِ ناز سے کچھ عرض کرنا ہے

نہ جینے کی طرح جینا، نہ مرنے کی طرح مرنا
یہ جینا کوئی جینا ہے، یہ مرنا کوئی مرنا ہے

اٹھاؤ عشق کے بیڑے کے لنگر شوق سے لیکن
ذرا سنبھلے ہوئے بحرِ فنا سے بھی گزرنا ہے

حسابِ کاروبارِ عشق کب ہے اپنے ہاتھوں میں
نہ کرنا ہے، نہ دھرنا ہے، نہ مرنا ہے، نہ بھرنا ہے

نہ سمجھیں حرفِ آخر آج کے دَورِ تمدن کو
بہت کچھ نظمِ انسانی کو بننا ہے، سنورنا ہے

جو ڈرنا ہی ہے تو [illegible] اپنے آپ سے ڈرنا
ارے اللہ سے ڈرنا! کوئی ڈرنے میں ڈرنا ہے

لبِ اعجاز اپنی رَو میں محوِ عہد و پیماں ہیں
نگاہِ ناز کہتی ہے، بہ ہر صورت مُکرنا ہے

نہ اس میں کچھ خطا میری، نہ غیروں کا قصور اے دل
مجھے بدنام ہونا ہے، انھیں بدنام کرنا ہے

مگر وہ بات کیا ہے؟ عمر بھر کھُلنے نہیں پایا
یہی سوچا کیا، تجھ سے مجھے کچھ بات کرنا ہے

گنہگارانِ عشق اے واعظِ ناداں نہیں ڈرتے
انھیں بے خوف جینا ہے، انھیں بے خوف مرنا ہے

یہ مانا زندگی ہے نام آگے بڑھتے رہنے کا
اسی ہلچل میں مجھ کو، تجھ سے دو اک بات کرنا ہے

عمل کے بھی علاوہ زندگی کے کچھ تقاضے ہیں
وہ احمق ہیں جو کہتے ہیں کہ بس کچھ کر گزرنا ہے

عبارت ہے یہ دنیا کچھ لکیروں، کچھ صداؤں سے
یہاں کچھ رنگ بھرنا ہے، وہاں کچھ درد بھرنا ہے

غنیمت ہے یہ وقفہ ماندگی کا اس مسافت میں
گزرگاہِ جہاں میں ساتھیو! دم بھر ٹھہرنا ہے

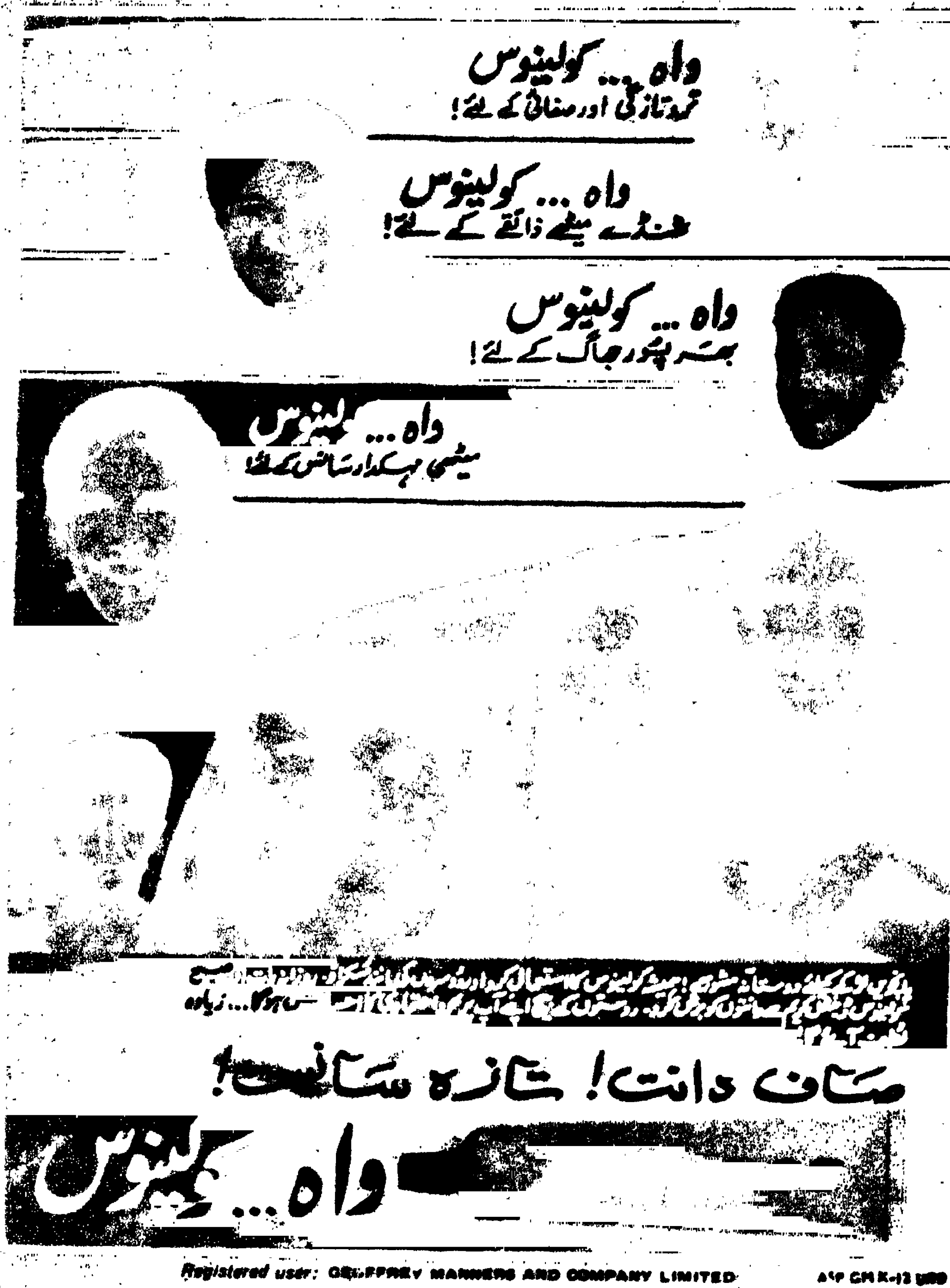
شہادت گاہ سمجھو باغ کو یا خلوتِ تزئیں
نہا کر اپنے خوں میں ہر گُلِ تر کو نکھرنا ہے

طلوعِ مہر کو دیکھو، غروبِ مہر کو سوچو
اسی کا نام جینا ہے، اسی کا نام مرنا ہے

خیالِ مرگ جانِ زندگی ہے، بھول مت اس کو
کبھی یہ بھی تو سوچ اے زندگی! اک روز مرنا ہے

مرے اشعار تپ پیما ہیں اس بیمار دنیا کے
نظامِ زندگانی کا چڑھا پارا اُترنا ہے

فراقؔ اوروں کو سطحِ زندگی سے کھیل لینے دو
ہماری شاعری کو اور ہی کچھ کام کرنا ہے


واہ ... کولینوس
تر و تازگی اور صفائی کے لئے!
واہ ... کولینوس
ٹھنڈے میٹھے ذائقے کے لئے!
واہ ... کولینوس
بہتر پیور جھاگ کے لئے!
واہ ... کولینوس
صاف دانت! تازہ سانس!
واہ ... کولینوس
Registered user: GEOFFREY MANNERS AND COMPANY LIMITED

افسانہ

کانچ کی گڑیا

اکرام جاوید۔ بی۔کام (عثمانیہ)

معرفت ٹاؤن انسپکٹر آف پوسٹ آفسز، بیگم بازار، حیدرآباد۔ ۱۲ (آندھرا پردیش)

۳۰ دسمبر ۱۹۶۵ء محترم خوشتر بھائی! تسلیم

سالِ نو کا نادر ادبی تحفہ، پُرکشش، خوبصورت سالنامہ نظر نواز ہو کر روحانی مسرت کا باعث ہوا —
آپ تو میرے قلب و جگر ہیں! آپ کو "شکریہ" اور "مبارکباد" جیسے رسمی الفاظ کیا لکھوں۔ ساری اُردو دُنیا ہی آپ کی انتھک محنت، بلند ذوق، قابلِ رشک صلاحیتوں اور ناقابلِ فراموش ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کرے گی۔ اُردو زبان اور اُردو ادب کی بقا اور ترقی کے لئے خدا آپ کو صدیوں تک زندہ و سلامت رکھے۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں —— مجھے خود احساس ہے اور ادب دوست احباب کے خطوط اس احساس کو اور شدید بناتے رہے ہیں کہ میں ۶۲ء سے "بیسویں صدی" کی بزم سے غیر حاضر ہوں۔ میری غیر حاضری کی وجہ حالات کی ناہمواریوں اور میری مجبوریوں کی ایک طویل روداد ہے۔ اسے چھوڑیے اور ۶۶ء کے لئے ایک تازہ افسانہ قبول فرمائیے۔ مجھے یقین ہے، یہ افسانہ جو قدرے طویل ہو گیا ہے، میری تین سالہ طویل غیر حاضری کی تلافی کر سکے گا . . .

آپ کا اپنا —— اکرام جاوید

فرزانہ کے آنے سے پہلے اُس اُجاڑ اور ویران گاؤں میں کوئی حُسن تھا اور نہ ترقیاتی بلاک کے کام میں کوئی دلکشی تھی۔ شہر سے میلوں دُور اِس انتہائی پسماندہ گاؤں میں مکان کم اور کھنڈر زیادہ تھے۔ قدیم زمانے میں یہ گاؤں کسی راجہ کا پایۂ تخت تھا لیکن اب سیاہ پتھر کی سربفلک شکستہ اور ڈراؤنی فصیلوں سے محصور قلعہ اور پُرانی عمارتوں کے کھنڈر ہی اُس زمانے کی یادگار رہ گئے تھے۔ کچی ناہموار سڑکیں، ٹیڑھی میڑھی گلیاں، مٹی کی دیواروں اور پھونس کی چھتوں کے تنگ و تاریک مکان! دو چار گرد و غبار میں اَٹی ہوئی دکانیں، مختصر سا پوسٹ آفس، میلے کچیلے مفلوک الحال لوگ اور چاروں طرف صدیوں پُرانی عمارتوں کے کھنڈر —— قبرستان کی طرح خاموش، ویران اور اُداس گاؤں جہاں زندگی کا تصور تک مشکل تھا۔ گاؤں کے آخری حصّے میں، البتہ پُرانے زمانے کے راجہ کے ورثا کا ایک عالیشان محل اب بھی باقی تھا جس کا بڑا حصّہ کھنڈر ہو چکا تھا اور جو حصہ محفوظ تھا اُس میں ترقیاتی بلاک کا دفتر قائم کیا گیا تھا۔ محل کا یہ حصّہ ایک پُرانے طرز کی مستطیل وضع کی دو منزلہ عمارت تھا جس کی نچلی منزل میں چار بڑے بڑے کمرے اور دو وسیع و عریض دالان تھے اور بالائی منزل دس بارہ کمروں اور ایک بڑے بند ہال پر مشتمل تھی جس میں تقریباً تمام کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ بالائی منزل کو جانے کے لئے سیاہ پتھر کے زینے طے کرنے پڑتے تھے جن کی حالت مخدوش تھی۔

گاؤں میں پینے کے پانی سے لے کر مکانوں تک ہر شئے کی قلت تھی۔ اِس لئے ترقیاتی بلاک کے دفتر کے عملے کو بالائی منزل میں سکونت اختیار کرنی پڑی تھی اور نچلی منزل دفتر کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ گاؤں میں ترقیاتی بلاک کا افتتاح چند دن پہلے ہوا تھا، اِس لئے دفتر کا پورا عملہ ابھی کام پر حاضر نہیں ہوا تھا اور جو لوگ آ گئے تھے اُن میں ادھیڑ عمر پستہ قد سانولے رنگ کے ہنس مکھ شیام راؤ بلاک ڈویلپمنٹ آفیسر تھے۔ دُبلا پتلا نوعمر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر جمیل تھا۔ ایک زندہ دل اور خوش مزاج نوجوان جو معاشیات کا گریجویٹ تھا۔ ایک اکاؤنٹنٹ، ایک ٹائپسٹ، دس گرام سیوک اور چار چپراسی! ابھی باقی لوگ آنے والے تھے۔

اکاؤنٹنٹ نیاز کی شخصیت نہایت پُرکشش اور سنجیدہ تھی۔ وہ گندمی رنگ کا

دراز قد اور صحت مند نوجوان تھا۔ اُس کے بیضوی چہرے پر مرعوب کر دینے والی سنجیدگی چھائی رہتی تھی اور بڑی بڑی سیاہ اور روشن بادامی آنکھیں ہمیشہ گہری سوچ میں ڈوبی رہتی تھیں۔ اُسے کھُل کر قہقہہ لگاتے ہوئے کم دیکھا جاتا تھا۔ کسی بات پر اُسے کبھی ہنسی آتی تو صرف پتلے پتلے ہونٹوں پر تھرک کر غائب ہو جاتی تھی۔ اُس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان تھی اور شیام راؤ ڈولپمنٹ آفیسر کی طرح وہ بھی کامرس کا گریجویٹ تھا۔ نیاز خاموش اور سنجیدہ رہتا تھا اور ایک حد تک خلوت پسند تھا لیکن وہ چڑچڑا یا بد مزاج ہرگز نہ تھا۔ وہ دفتر کے سارے ساتھیوں میں (جو شیام راؤ بی۔ڈی۔او کے سوا سارے کے سارے کنوارے تھے) اُٹھتا بیٹھتا، اُن کی گفتگو اور کھیل تماشوں میں بھی شریک ہوتا، پھر بھی خود کو اکیلا اور اجنبی محسوس کرتا تھا۔ اُس کے اور عام لوگوں کے درمیان ایک خلیج سی ہمیشہ حائل رہتی تھی۔ وہ عام سطح سے بلند تھا اور مشکل یہی تھی کہ کوئی بھی اُسے اُس کی سطح پر آکر جان پہچان اور سمجھ نہیں سکتا تھا۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ فکرِ معاش کی دو دھاری تلوار نے اُسے دو حصّوں میں کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ کامرس کے گریجویٹ اور اکاؤنٹنٹ نیاز سے سب ہی واقف تھے اور پیاسی اور ناآسودہ روح، زخمی دل والے ذہین اور حساس فنکار نیاز سے کوئی واقف نہ تھا۔ ترقیاتی بلاک کے اکاؤنٹنٹ اور شائستہ فکر افسانہ نگار نیاز میں ایک کشمکش سی جاری تھی۔ وہ حالات سے کوئی سمجھوتہ نہ کر سکا تھا اور اپنے مقسوم کے زہر کا قطرہ قطرہ پی رہا تھا۔ تشنہ لب، ناآسودہ، غیر مطمئن اور بے چین! آتش بہ دل اور بظاہر مطمئن اور پُرسکون!

ایک ایک کر کے دفتر کا سارا عملہ آگیا اور ایک دن فرزانہ بھی آگئی۔ چھریرے بدن کی گوری گلابی رنگت والی خوبصورت فرزانہ نے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی حیثیت سے چارج لیا تو دفتر کی زندگی میں انقلاب سا آگیا۔ اُجاڑ اور ویران گاؤں خوابوں کی حسین بستی بن گیا۔ ویرانوں میں جیسے بہار آگئی۔ قدم قدم، رنگین رنگین پھول کھل گئے۔ وقت کے بال و پر کھُل گئے اور سہمی سہمی خاموش اور اداس فضاؤں میں تعمیر و ترقی کے نغمے گونج اُٹھے۔ زندگی ایک مستی بھرا گیت بن گئی۔ فرزانہ دیکھنے اور بس دیکھتے ہی رہنے کے لائق تھی۔ زُلفیں ساون کی گھٹا، قد جسے دیکھ سرو بھی شرماتے، چہرہ پُونم کا چاند اور آنکھیں شراب خانہ! جسم جوانی کی مئے ناب سے لبریز ایک خوبصورت پیمانہ! الفاظ اُس کے حُسن کو بیان نہیں کر سکتے تھے۔ حُسن جو ظاہر تھا، حُسن جو نہاں تھا۔ حُسن جو اُس کے جسم، چہرے اور خد و خال میں تھا، حُسن جو اُس کی رفتار اور گفتار میں تھا، اُس کی روح میں تھا۔ وہ حُسن کی دیوی تھی، مجسّم چاندنی تھی جو آسمانوں سے زمین پر اُتر آئی تھی۔ زمین کو رشکِ جنّت بنانے کے لئے۔

اِتنے سارے مردوں میں وہ اکیلی عورت تھی۔ پھر بھی اُس میں اِتنی خود اعتمادی تھی کہ اُسے کسی سے بھی خوف نہ آتا تھا۔ گاؤں میں کوئی مکان نہیں مل سکتا تھا۔ اِس لئے اُسے بھی دفتر کی بالائی منزل میں ایک کمرہ لینا پڑا۔ اُس کے آتے ہی بالائی منزل کی کایا پلٹ ہو گئی۔ بے ترتیبی اور پھوہڑپن کی جگہ ترتیب اور سلیقے نے لے لی۔ سب کے لئے ملازم کھانا پکاتے تھے۔ فرزانہ کی نگرانی میں جب کھانا پکنے لگا تو لوگ بھول گئے کہ وہ اپنے گھر سے میلوں دُور ایک اُجاڑ اور پسماندہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ عورت کے بغیر گھر گھر نہیں ہوتا۔ عورت نہ ہو تو جنّت بھی جہنم بن جاتی ہے۔ تیلے چلنے والوں چپراسی سے لے کر بی۔ ڈی۔ او شیام راؤ تک ہر شخص اِسی انداز میں سوچنے لگا تھا۔ ہر شخص فرزانہ سے متاثر ہوا تھا اور ہر ایک اپنے آپ کو فرزانہ کے آگے نمایاں کرنے کی فکر میں تھا۔

بلاک کے دفتر کا کام زور و شور سے ہو رہا تھا۔ اکاؤنٹنٹ نیاز فرزانہ سے بے نیاز سا تھا۔ وہ دن دن بھر کام کرتا اور اکثر راتوں میں بھی دیر تک بیٹھا پٹرومیکس کی روشنی میں کام کرتا رہتا تھا۔ فرزانہ اپنے ساتھی ایس۔ ای۔ او جمیل کے ساتھ گاؤں گاؤں پھر کر تعلیم اور ترقی کے اُجالے تقسیم کرتی تھی۔ راتوں میں جب وہ لمبے دورے سے واپس آتی اور نیاز کو دفتر میں اکیلا بیٹھا ہوا پاتی تو چُپکے سے اُس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

"لاؤ! مجھے بھی کچھ کام دو۔ مجھے فرصت ہے۔"

اور نیاز چونک کر کہتا: "تم یہ کام نہ کر سکو گی!"

"کیا مجھے اِس قدر جاہل سمجھتے ہو؟" وہ شوخی سے کہتی "جناب من! میں نے بھی آپ ہی کی یونیورسٹی سے ڈگری لی ہے۔"

"نہیں فرزانہ! یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔" نیاز قدرے شگفتگی سے کہتا "تم ایک نازک سی کانچ کی گڑیا ہو!"

"پھر وہی بکواس؟" وہ چڑ کر کہتی: "آخر تم لوگ عورت کو بے بس اور کمزور کیوں سمجھتے ہو؟ اِتنے روشن اور ترقی یافتہ زمانے میں بھی تم مردوں کی سوچ اِتنی تاریک کیوں ہے؟"

نیاز کو محسوس ہوتا جیسے فرزانہ کی آواز میں اَن گنت صدیوں کی مجبور، محکوم اور حقوق سے محروم عورت کی صدائے احتجاج بلند ہے۔ وہ کانپ جاتا اور پھر خاموشی سے اپنے کام کا کچھ حصّہ فرزانہ کے حوالے کر دیتا۔ کام ختم ہونے کے بعد فرزانہ اُسے اپنے دن بھر کے کاموں کی تفصیلات سُناتی اور نیاز حسرت سے کہتا۔

"مجھے یہ ملازمت پسند نہیں ہے فرزانہ! میں صرف افسانہ نگاری کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ تم جب میرے آگے فطرت کے حُسن کی باتیں کرتی ہو تو میری روح تڑپ اُٹھتی ہے۔ میں فطرت کے حُسن کو، دُنیا اور زندگی کو اپنی آنکھوں سے پُوری آزادی کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں لیکن دفتر کی اِس کھڑکی سے مجھے ویران گلی کے کھنڈر اور آسمان کے ایک مختصر سے حصّے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز لرز جاتی: "میں بہت

ور تنہا ہوتا ہوں فرزانہ! میرے ملنے والے بہت سے انسان ہیں مگر میری بدقسمتی کہ
لوں اور دفتر کے اس کمرے میں قید ہو کر رہ گیا ہوں " وہ یکدم خاموش ہو جاتا اور
یانہ ہمیشہ موقع پر اس کی دلجوئی کرتی۔ اُسے احساس ولاتی کہ وہ اب بھی آزاد ہے۔ اب
بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ حالات چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں اس کے اندر کا فنکار کبھی
نہیں مر سکتا لیکن نیاز پر اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اسی طرح خاموش
ہی رہتا۔

برسات کا موسم ختم ہو رہا تھا اور سرما کے آغاز کا زمانہ تھا۔ نیلے آسمان پر
بے شمار تاروں کے پھول کھلے ہوئے تھے اور سولھویں تاریخ کا متوالا چاند دُور سُرمئی
پہاڑیوں کی اوٹ سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ گاؤں کی آبادی سے دُور کھلے میدان میں
جامن کے جھنڈ کے قریب ٹھنڈی ریت کے فرش پر نیم دراز وہ دونوں خاموشی سے
روشن آسمان کی نیلی نشیلی گہرائیوں میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ سُرمئی پہاڑیوں کی اوٹ سے
ابھرتا ہوا چاند دلوں میں ایک آتشِ خاموش کو ہوا دے رہا تھا اور نیاز کا ذہن غمِ ذات
کا طواف کر رہا تھا۔ وہ خیالوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر بڑبڑایا۔

" دُنیا میں یہ رشتے ناطے کتنے عجیب ہیں۔ ذمّہ داریوں کا احساس کس قدر قاتل
ہے۔ زندگی قدم قدم پر قربانی کی طلب گار ہوتی ہے اور میں نے دل و جان کے سارے
ارمان قربان کر دیئے۔ سب کچھ لُٹا دیا، سب کچھ ــــــ" وہ خاموش ہو گیا اور افسردگی
سے چاند کو دیکھنے لگا۔

" شہر میں میری ماں ہے۔ بوڑھی، بیوہ ماں! چھوٹے بھائی بہن اور کوئی نہیں
ہے ــــــ اور کوئی نہیں، جس کا نام لے سکوں، جسے ڈھونڈ اور پا سکوں... چند نقشِ قدم
ہیں، مٹے مٹے سے، مدّھم مدّھم اور کچھ گردِ راہ! بس ــــــ حاصلِ سفر یہی ہے۔ یہی ہے میری
تنہائی، میرا اکیلا پن اور کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ــــــ"

فرزانہ نے محبت بھری ہمدرد نگاہوں سے اُسے دیکھا تو وہ پھر خاموش ہو گیا لیکن
اس کی بُجھی بُجھی سی اُداس آنکھیں کہتی رہیں " مجھے اس کا غم نہیں کہ وہ میری نہ ہو سکی۔ غم ہے تو یہی کہ
ایک باشعور اور اتنے خوبصورت دل والی حسین لڑکی لوہے اور فولاد کے ایک سخت دل اور جاہل تاجر
کی بیوی بنا دی گئی۔ لوہے کا خنجر ایک ایسے دل میں پیوست ہو گیا جو مجھے جانتا اور پہچانتا تھا۔ اب
میری دُنیا میں مجھے جاننے پہچاننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں، تنہا اور اجنبی!

عین اُسی وقت خاموش فضائیں نغمہ بار ہو گئیں۔

" دیوتا! تم ہو میرا سہارا... میں نے تھاما ہے دامن تمھارا!"

نیاز افسردہ خیالوں کے ہجوم سے باہر نکل آیا۔ نیلے آسمان پر چاند کافی بلند ہو چکا تھا۔ سفید
لباس میں ملبوس آسمانی مخلوق فرزانہ بے خودی کے عالم میں آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

" دیوتا! تم ہو میرا سہارا..."

نیاز اُس کی جادو بھری آواز میں کھو سا گیا۔ اُس نے جمیل اور دوسرے لوگوں سے فرزانہ
کے گانے کی تعریف سُنی تھی لیکن اب تک فرزانہ کو گاتے ہوئے نہیں سُنا تھا۔

" میں نے تھاما ہے دامن تمھارا... دیوتا! تم ہو میرا سہارا!"

اُوپر بے ابر نیلگوں آسمان! آسمان پر چاند ستارے، نیچے ریت کا ٹھنڈا فرش اور
چاندنی کے نُور میں ڈُوبے ہوئے نظارے۔ زمین اور آسمان کے درمیان سرسراتے ہوئے ٹھنڈی
ہواؤں کے نرم و نازک جھونکے جو فرزانہ کے آنچل کو کبھی اُڑا رہے تھے تو کبھی اُس کے ماتھے پر جھُولنے
والی بالوں کی دلکش لٹ کو چھیڑ رہے تھے اور فرزانہ محویت کے عالم میں گا رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں خلا
میں کسی نظر نہ آنے والے نقطہ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بے خودی کے عالم میں گا رہی تھی۔

" دیوتا! تم ہو میرا سہارا... میں نے تھاما ہے دامن تمھارا!"

ایک لمحے کے لئے نیاز کو محسوس ہوا، جیسے وہ وہی دیوتا ہے جسے فرزانہ آوازیں دے رہی ہے۔
اس احساس سے نیاز کا دل کانپ کانپ گیا۔ ایک آتشیں طوفان تھا جو اُس کے سینے سے اُٹھ رہا تھا۔
وہ انجانے میں کسی خطرناک آگ سے کھیلتا رہا ہے۔ وہ آگ اب اُسے اپنے گھیرے میں لے چکی ہے۔ وہ
فرزانہ سے محبت کرنے لگا ہے۔ بے پناہ اور ناقابلِ بیان محبت! وہ لڑکی جو اُسے پہچانتی تھی اور جو
لوہے اور فولاد کے شکنجے میں زبردستی کس دی گئی تھی۔ وہ لڑکی اب فرزانہ کے رُوپ میں پھر اُس کے
پاس آئی ہے۔ اُس کی بے خواب راتوں کی نیند، اُس کے مضطرب دل کا چین بن کر۔ اُس کے درد کا
مداوا کرنے آئی ہے۔ نیاز کے جی میں آیا، بے اختیار فرزانہ سے کہہ دے۔

" مجھے تم سے محبت ہے، مجھے سہارا دو۔ مجھے سنبھال لو فرزانہ!"

لیکن اُس نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور گانا ختم کرتے ہی فرزانہ کی بڑی بڑی خوبصورت
آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھے۔ وہ انتہائی اُداس اور غمگین ہو گئی تھی۔ نیاز اپنے وجود کے اندر اُٹھنے والے
طوفانوں میں گھِرا ہوا تھا اور فرزانہ کسی گہری سوچ میں ڈُوب گئی تھی۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے
رہے۔ پھر فرزانہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور اُٹھ کر بوجھل آواز میں بولی۔

" آؤ۔ اب چلیں!"

اور نیاز چُپ چاپ اُٹھ کر اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ راستے میں دونوں خاموش رہے اور دفتر
کی بالائی منزل پر پہنچ کر فرزانہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور نیاز اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
رات کا باقی حصّہ نیاز نے جاگ کر کاٹا۔ دوسرے دن وہ صبح سے شام تک بس فرزانہ
کے خیالوں میں کھویا رہا۔ جاگتے میں خواب دیکھتا رہا ــــ اور فرزانہ کے خواب دیکھنا اُس کی عادت بن گیا۔
فرزانہ کے ساتھ گُزارا ہوا ہر لمحہ اُس کے ذہن کے اُفق پر ستارہ بن کر چمک اُٹھتا تھا اور
اُس کے خیالوں میں اَن گنت ستارے روشن ہو اُٹھتے تھے۔

موسمِ سرما شروع ہوتے ابھی پُورا ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ دُبلا پتلا زرد رُو جمیل

دراز قد اور صحت مند نوجوان تھا۔ اُس کے بیضوی چہرے پر مرعوب کر دینے والی سنجیدگی چھائی رہتی تھی اور بڑی بڑی سیاہ اور روشن بادامی آنکھیں ہمیشہ گہری سوچ میں ڈوبی رہتی تھیں۔ اُسے کھل کر قہقہہ لگاتے ہوئے کم دیکھا جاتا تھا۔ کسی بات پر اُسے کبھی ہنسی آتی تو مدت پتلے پتلے ہونٹوں پر تھرک کر غائب ہو جاتی تھی۔ اُس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان تھی اور شیام راؤ ڈولپمنٹ آفیسر کی طرح وہ بھی کامرس کا گریجویٹ تھا۔ نیاز خاموش اور سنجیدہ رہتا تھا اور ایک حد تک خلوت پسند تھا لیکن وہ چڑچڑا یا بد مزاج ہرگز نہ تھا۔ وہ دفتر کے سارے ساتھیوں میں (جو شیام راؤ بی۔ ڈی۔ او کے سوا سارے کے سارے کنوارے تھے) اُٹھتا بیٹھتا، اُن کی گفتگو اور کھیل تماشوں میں بھی شریک ہوتا، پھر بھی خود کو اکیلا اور اجنبی محسوس کرتا تھا۔ اُس کے اور عام لوگوں کے درمیان ایک خلیج سی ہمیشہ حائل رہتی تھی۔ وہ عام سطح سے بلند تھا اور مشکل یہی تھی کہ کوئی بھی اُسے اُس کی سطح پر آکر جان پہچان اور سمجھ نہیں سکتا تھا۔ بہت کم لوگ جانتے تھے کہ فکرِ معاش کی دو دھاری تلوار نے اُسے دو حصّوں میں کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ کامرس کے گریجویٹ اور اکاؤنٹنٹ نیاز سے سب ہی واقف تھے اور پیاسی اور ناآسودہ روح، زخمی دل والے ذہین اور حسّاس فنکار نیاز سے کوئی واقف نہ تھا۔ ترقیاتی بلاک کے اکاؤنٹنٹ اور شائستہ فکر افسانہ نگار نیاز میں ایک کشمکش سی جاری تھی۔ وہ حالات سے کوئی سمجھوتہ نہ کر سکا تھا اور اپنے مقسوم کے زہر کا قطرہ قطرہ پی رہا تھا۔ تشنہ لب، ناآسودہ، غیر مطمئن اور بے چین! آتش بہ دل اور بظاہر مطمئن اور پُرسکون!

ایک ایک کر کے دفتر کا سارا عملہ آگیا اور ایک دن فرزانہ بھی آگئی۔ چھریرے بدن کی گوری گلابی رنگت والی خوبصورت فرزانہ نے سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کی حیثیت سے چارج لیا تو دفتر کی زندگی میں انقلاب سا آگیا۔ اُجاڑ اور ویران گاؤں خوابوں کی حسین بستی بن گیا۔ ویرانوں میں جیسے بہار آگئی۔ قدم قدم، رنگین رنگین پھول کھل گئے۔ وقت کے بال و پر کھل گئے اور سہمی سہمی خاموش اور اُداس فضاؤں میں تعمیر و ترقی کے نغمے گونج اُٹھے۔ زندگی ایک مستی بھرا گیت بن گئی۔ فرزانہ دیکھنے اور بس دیکھتے ہی رہنے کے لائق تھی۔ زلفیں ساون کی گھٹا، قد جسے دیکھ سرو بھی شرمائے، چہرہ پونم کا چاند اور آنکھیں شراب خانہ! جسم جوانی کی مئے ناب سے لبریز ایک خوبصورت پیمانہ! الفاظ اُس کے حُسن کو بیان نہیں کر سکتے تھے۔ حُسن جو ظاہر تھا، حُسن جو نہاں تھا۔ حُسن جو اُس کے جسم، چہرے اور خد و خال میں تھا، حُسن جو اُس کی رفتار اور گفتار میں تھا، اُس کی روح میں تھا۔ وہ حُسن کی دیوی تھی، مجسّم چاندنی تھی جو آسمانوں سے زمین پر اُتر آئی تھی۔ زمین کو رشکِ جنّت بنانے کے لئے۔

اِتنے سارے مردوں میں وہ اکیلی عورت تھی۔ پھر بھی اُس میں اِتنی خود اعتمادی تھی کہ اُسے کسی سے بھی خوف نہ آتا تھا۔ گاؤں میں کوئی مکان نہیں مل سکتا تھا۔ اِس لئے اُسے بھی دفتر کی بالائی منزل میں ایک کمرہ لینا پڑا۔ اُس کے آتے ہی بالائی منزل کی کایا پلٹ ہو گئی۔ بے ترتیبی اور پھوہڑپن کی جگہ ترتیب اور سلیقے نے لے لی۔ ایک سب کے لئے ملازم کھانا پکاتے تھے۔ فرزانہ کی نگرانی میں جب کھانا پکنے لگا تو لوگ انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ وہ اپنے گھر سے میلوں دُور ایک اُجاڑ اور پسماندہ گاؤں میں پہنچ گئے تھے۔ عورت کے بغیر گھر گھر نہیں ہوتا۔ عورت نہ ہو تو جنّت بھی جہنم بن جائے۔ تب چپڑاسی، ڈرائیور اور کلرک سے لے کر بی۔ ڈی۔ او شیام راؤ تک ہر شخص اِسی انداز میں سوچنے لگا تھا۔ ہر شخص فرزانہ سے متاثر ہوا تھا اور ہر ایک اپنے آپ کو فرزانہ کے آگے نمایاں کرنے کی فکر میں تھا۔

بلاک کے دفتر کا کام زور و شور سے ہو رہا تھا۔ اکاؤنٹنٹ نیاز فرزانہ سے بے نیاز سا تھا۔ وہ دن دن بھر کام کرتا اور اکثر راتوں میں بھی دیر تک بیٹھا پٹرومیکس کی روشنی میں کام کرتا رہتا تھا۔ فرزانہ اپنے ساتھی ایس۔ ای۔ او جمیل کے ساتھ گاؤں گاؤں پھر کر تعلیم اور ترقی کے اُجالے تقسیم کرتی تھی۔ راتوں میں جب وہ اپنے دورے سے واپس آتی اور نیاز کو دفتر میں اکیلا بیٹھا ہوا پاتی تو چپکے سے اُس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔

"لاؤ! مجھے بھی کچھ کام دو۔ مجھے فرصت ہے۔"

اور نیاز چونک کر کہتا: "تم یہ کام نہ کر سکو گی!"

"کیا مجھے اِس قدر جاہل سمجھتے ہو؟" وہ شوخی سے کہتی: "جناب میں نے بھی آپ ہی کی یونیورسٹی سے ڈگری لی ہے۔"

"نہیں فرزانہ! یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔" نیاز قدرے شگفتگی سے کہتا: "تم ایک نازک سی کانچ کی گڑیا ہو!"

"پھر وہی بکواس!" وہ چڑ کر کہتی: "آخر تم لوگ عورت کو بے بس اور کمزور کیوں سمجھتے ہو؟ اِتنے روشن اور ترقی یافتہ زمانے میں بھی تم مردوں کی سوچ اِتنی تاریک کیوں ہے؟"

نیاز کو محسوس ہوتا جیسے فرزانہ کی آواز میں اَن گنت صدیوں کی مجبور، محکوم اور حقوق سے محروم عورت کی صدائے احتجاج بلند ہے۔ وہ کانپ جاتا اور پھر خاموشی سے اپنے کام کا کچھ حصّہ فرزانہ کے حوالے کر دیتا۔ کام ختم ہونے کے بعد فرزانہ اُسے اپنے دن بھر کے کاموں کی تفصیلات سناتی اور نیاز حسرت سے کہتا۔

"مجھے یہ ملازمت پسند نہیں ہے فرزانہ! میں صرف افسانہ نگاری کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ تم جب میرے آگے فطرت کے حُسن کی باتیں کرتی ہو تو میری روح تڑپ اُٹھتی ہے۔ میں فطرت کے حُسن کو، دُنیا اور زندگی کو اپنی آنکھوں سے پوری آزادی کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں لیکن دفتر کی اِس کھڑکی سے مجھے ویران محل کے کھنڈر اور آسمان کے ایک مختصر سے حصّے کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔" یہ کہتے ہوئے اُس کی آواز لرز جاتی: "میں بہت

[کر]نا چاہتا ہوں فرزانہ! میرے ملنے والوں میں بھی بہت سے ایسے ہیں لیکن میری بد قسمتی کہ [خیا]لوں اور جذبوں کے اِس کمرے میں قید ہوکر رہ گیا ہوں۔" وہ ایکدم خاموش ہوجاتا اور [فرز]انہ ہر ایسے موقع پر اُس کی دلجوئی کرتی۔ اُسے احساس دلاتی کہ وہ اب بھی آزاد ہے۔ اب [بھی] بہت کچھ کرسکتا ہے۔ حالات چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں اُس کے اندر کا فن کار کبھی نہیں مرسکتا لیکن نیاز پر اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اُسی طرح خاموش ہی رہتا۔

برسات کا موسم ختم ہو رہا تھا اور سرما کے آغاز کا زمانہ تھا۔ نیلے آسمان پر بے شمار تاروں کے گچھوں کھلے ہوئے تھے اور سولھویں تاریخ کا متوالا چاند دُور سُرمئی پہاڑیوں کی اوٹ سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ گاؤں کی آبادی سے دُور کھُلے میدان میں جامن کے جھنڈ کے قریب ٹھنڈی ریت کے فرش پر نیم دراز وہ دونوں خاموشی سے روشن آسمان کی نیلی نیلی گہرائیوں میں کچھ دیکھ رہے تھے۔ سُرمئی پہاڑیوں کی اوٹ سے اُبھرتا ہوا چاند دلوں میں ایک آتشِ خاموش کو ہوا دے رہا تھا اور نیاز کا ذہن غمِ ذات کا طواف کر رہا تھا۔ وہ خیالوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر بڑبڑایا۔

"دُنیا میں یہ رشتے ناطے کتنے عجیب ہیں۔ ذمّہ داریوں کا احساس کس قدر قاتل ہے۔ زندگی قدم قدم پہ قربانی کی طلب گار ہوتی ہے اور میں نے دل وجان کے سارے ارمانے قربان کردیئے۔ سب کچھ لُٹا دیا، سب کچھ ـــــ" وہ خاموش ہوگیا اور افسردگی سے چاند کو دیکھنے لگا۔

"شہر میں میری ماں ہے۔ بوڑھی، بیوہ ماں! چھوٹے بھائی بہن اور کوئی نہیں ہے ـــــ اور کوئی نہیں، جس کا نام لے سکوں، جسے ڈھونڈ اور پاسکوں۔۔ چند نقشِ قدم ہیں، مٹے مٹے سے، مدّھم مدّھم اور کچھ گردِ راہ! بس ـــــ حاصلِ سفر یہی ہے۔ یہی ہے میری تنہائی، میرا اکیلا پن اور کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ـــــ"

فرزانہ نے محبت بھری ہمدرد نگاہوں سے اُسے دیکھا تو وہ پھر خاموش ہوگیا لیکن اُس کی بُجھی بُجھی سی اُداس آنکھیں کہتی رہیں۔ "مجھے اِس کا غم نہیں کہ وہ میری نہ ہوسکی۔ غم ہے تو یہی کہ ایسی باشعور اور ایسی خوبصورت دل والی حسین لڑکی لوہے اور فولاد کے ایک سخت دل اور جاہل تاجر کی بیوی بنادی گئی۔ لوہے کا خنجر ایک ایسے دل میں پیوست ہوگیا جو مجھے جانتا اور پہچانتا تھا۔ اب میری دُنیا میں مجھے جاننے پہچاننے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں، تنہا اور اجنبی!

عین اُسی وقت خاموش فضائیں نغمہ بار ہوگئیں۔

"دیوتا! تم ہو میرا سہارا۔۔۔ میں نے تھاما ہے دامن تمھارا!"

نیاز افسردہ خیالوں کے ہجوم سے باہر نکل آیا۔ نیلے آسمان پر چاند کافی بلند ہوچکا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس آسمانی مخلوق فرزانہ بے خودی کے عالم میں آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

"دیوتا! تم ہو میرا سہارا۔۔"

نیاز اُس کی جادو بھری آواز میں کھو سا گیا۔ اُس نے جمیل اور دوسرے لوگوں سے فرزانہ کے گانے کی تعریف سُنی تھی لیکن اب تک فرزانہ کو گاتے ہوئے نہیں سُنا تھا۔

"میں نے تھاما ہے دامن تمھارا۔۔۔ دیوتا! تم ہو میرا سہارا!"

اُوپر ابرِ نیلگوں آسمان! آسمان پر چاند ستارے، نیچے ریت کا ٹھنڈا فرش اور چاندنی کے نور میں ڈوبے ہوئے نظارے۔ زمین اور آسمان کے درمیان سرسراتے ہوئے ٹھنڈی ہواؤں کے نرم و نازک جھونکے جو فرزانہ کے آنچل کو کبھی اُڑا رہے تھے تو کبھی اُس کے ماتھے پر جھُولنے والی بالوں کی دلکش لٹ کو چھیڑ رہے تھے اور فرزانہ محویت کے عالم میں گا رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں خلا میں کسی نظر نہ آنے والے نقطہ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ بے خودی کے عالم میں گا رہی تھی۔

"دیوتا! تم ہو میرا سہارا۔۔۔ میں نے تھاما ہے دامن تمھارا!"

ایک لمحے کے لئے نیاز کو محسوس ہوا، جیسے وہ وہی دیوتا ہے جسے فرزانہ آوازیں دے رہی ہے۔ اِس احساس سے نیاز کا دل کانپ کانپ گیا۔ ایک آتشیں طوفان تھا جو اُس کے سینے سے اُٹھ رہا تھا۔ وہ انجانے میں کسی خطرناک آگ سے کھیلتا رہا ہے۔ وہ آگ اب اُسے اپنے گھیرے میں لے چکی ہے۔ وہ فرزانہ سے محبت کرنے لگا ہے۔ بے پناہ اور ناقابلِ بیان محبت! وہ لڑکی جو اُسے پہچانتی تھی اور جو لوہے اور فولاد کے شکنجے میں زبردستی کس دی گئی تھی۔ وہ لڑکی اب فرزانہ کے رُوپ میں پھر اُس کے پاس آئی ہے۔ اُس کی بے خواب راتوں کی نیند، اُس کے مضطرب دل کا چین بن کر۔ اُس کے درد کا مداوا کرنے آئی ہے۔ نیاز کے جی میں آیا، بے اختیار فرزانہ سے کہہ دے۔

"مجھے تم سے محبت ہے، مجھے سہارا دو۔ مجھے سنبھال لو فرزانہ!"

لیکن اُس نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور گانا ختم کرتے ہی فرزانہ کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک اُٹھے۔ وہ انتہائی اُداس اور غمگین ہوگئی تھی۔ نیاز اپنے وجود کے اندر اُٹھنے والے طوفانوں میں گھرا ہوا تھا اور فرزانہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر فرزانہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور اُٹھ کر بوجھل آواز میں بولی۔

"آؤ۔ اب چلیں!"

اور نیاز چُپ چاپ اُٹھ کر اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ راستے میں دونوں خاموش رہے اور دفتر کی بالائی منزل پر پہنچ کر فرزانہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور نیاز اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

رات کا باقی حصّہ نیاز نے جاگ کر کاٹا۔ دوسرے دن وہ صبح سے شام تک بس فرزانہ کے خیالوں میں کھویا رہا۔ جاگتے میں خواب دیکھتا رہا ـــ اور فرزانہ کے خواب دیکھنا اُس کی عادت بن گیا۔ فرزانہ کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ اُس کے ذہن کے اُفق پر ستارہ بن کر چمک اُٹھتا تھا اور اُس کے خیالوں میں اَن گنت ستارے روشن ہو اُٹھے تھے۔

موسمِ سرما شروع ہوتے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ دُبلا پتلا زرد رُو جمیل

سخت بخار میں مبتلا ہوگیا۔ فرزانہ اپنے ساتھی اس کی لوکی حالت سے بُری طرح بدحواس ہوگئی۔ قصبے سے ڈاکٹر کو بُلایا گیا۔ ڈاکٹر نے اطمینان بھی دلایا۔ پھر بھی فرزانہ پریشان رہی۔ جمیل کے قہقہوں اور لطیفوں کے بغیر دیران کھنڈروں سے مطعود محل کے اِس حصے میں غم کی سیاہ گھٹا سی چھاگئی۔ گزشتہ دو دن سے جمیل کو تیز بخار تھا۔ دفتر کے دوسرے لوگ بھی جمیل کی تیمارداری میں ہاتھ بٹاتے تھے لیکن نیاز اور فرزانہ کے سوا کوئی بھی رات رات بھر جاگ نہ سکا۔ پہلی رات تو جمیل صرف کراہتا رہا لیکن دوسری رات وہ تیز بخار کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"تم کہاں جارہی ہو فرزانہ! اِدھر آؤ۔ بیٹھو... میرے قریب آجاؤ۔ سُنو! تم میری زندگی ہو! میری محبت کو سمجھو فرزانہ ــــ میں جل رہا ہوں..."

نیاز کے دل پر تیز آبدار خنجر سے چل گئے۔ فرزانہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اُس نے جلدی سے ٹھنڈے پانی کی پٹی جمیل کے دہکتے ہوئے ماتھے پر چڑھائی اور آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے سیلاب کو چھپانے کے لئے نیاز کی طرف سے مُنہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ نیاز کے دل میں بیک وقت ہزاروں شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔ وہ بُری طرح چکرا گیا تھا۔ جمیل سے اُسے ایسی توقع نہ تھی۔ اِتنا زندہ دل اور نیک دوست یوں اچانک اُس کا رقیب بن جائے گا، وہ سوچ تک نہ سکتا تھا۔ اُس کے جی میں آیا، اُس مُنہ پھٹے زرد رُو جمیل کا گلا گھونٹ دے۔ اُس کی نحیف لیکن ظالم آواز کو ختم کر دے جو فرزانہ کے نام کو بار بار دیوانہ وار دُہرا رہی تھی لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ کہیں اُس نے دھوکا تو نہیں کھایا ہے۔ کون جانے فرزانہ کے دل میں کون رہتا ہے۔ وہ یا جمیل ــــ جمیل اور فرزانہ ــــ پھر تو وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔ زندہ نہ رہ سکے گا!!

ساری رات جمیل بڑبڑاتا رہا۔ ساری رات نیاز جہنم کی آگ میں جلتا رہا اور فرزانہ پر مُسلسل ایک سنگین خاموشی طاری تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں ساون کی گھٹائیں تھم کر رہ گئی تھیں۔

دوسرے دن صبح سورج کی روشنی میں فرزانہ برسوں کی بیمار معلوم ہو رہی تھی۔ صبح کے قریب جمیل کا بخار ذرا کم ہوگیا تھا لیکن اُسی دن شہر سے اُس کا بڑا بھائی آیا اور اُسے اپنے ساتھ شہر لے گیا۔

جمیل چلا گیا تو نیاز کے دل پر سے منوں وزنی بوجھ ہلکا ہوا لیکن ابھی دل پر منوں بوجھ لدا ہوا تھا۔ ایک کانٹا تھا جو بار بار احساس میں کھٹکتا تھا۔ جب سے جمیل گیا تھا فرزانہ کا رویّہ نہایت پُراسرار ہوگیا تھا۔ وہ خاموش اور گُم سُم سی رہنے لگی تھی۔ نیاز کا ذہن سوچتے سوچتے ماؤف سا ہوگیا تھا۔

اُس شام نیاز کے اصرار پر وہ جمیل قدمی کے لئے نکلی تو کافی اُداس اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ گاؤں سے دُور کھلے میدان میں جامن کے جُھنڈ کے قریب ٹھنڈی ریت کے فرش پر وہ دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے اور آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کو دیکھنے لگے جن سے شفق کی آگ ابھی روشن تھی۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، فرزانہ نے عجیب سے

لہجے میں کہا:

"تم افسانے لکھتے ہو نا؟ میری کہانی کیسا افسانہ بن سکتی ہے؟"

"فرزانہ!"

اُس کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ جھجک جھجک کر کہتی گئی۔ "پہلے میں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب ضروری ہوگیا ہے کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں۔"

نیاز بُری طرح چونک گیا اور فرزانہ پُرسکون لہجے میں اپنی سرگزشت سنانے لگی۔

"ایک خوبصورت سی جوان لڑکی جس نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا تھا۔ آغازِ شباب کی ابتدائی منزل پر اپنے خاندان کے ایک ذہین اور غریب نوجوان سے عشق ہو کر اُس کی پرستش کرنے لگتی ہے۔ اُس سے وہ ابھی شادی نہیں کر پاتی کہ اچانک اُس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ بہت مشکل سے وہ بی۔ اے کرتی ہے اور بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی بہنوں کی زندگی کے لئے ملازم ہو جاتی ہے۔ اُس کا محبوب اُس کے مستقبل سے منسلک ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے مایوس ہو جاتا ہے۔ اُسے اُس کا ملازم ہونا پسند نہیں آتا۔ وہ اُس کے کردار پر شک کرتا ہے اور اُسے بدنام کر کے ایک دولت مند گھرانے میں شادی رچا لیتا ہے۔

دوسری کہانیوں کی طرح اِس کہانی کو یہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا۔" وہ نیاز کو دیکھتے ہوئے بولی: "لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میرے دل میں محبت کی جو آگ روشن ہوئی تھی وہ برابر روشن رہی اور اب بھی روشن ہے۔ میں نے اُس ایک انسان کی بجائے کُل عالمِ انسانیت کو اپنی محبت کا مرکز مان لیا اور انسان کے دل کی سلامتی، خوشی اور آسودگی کے لئے خود کو وقف کر دیا اور زندہ ہوں۔ اب اگر جمیل مجھے غلط سمجھتا ہے تو میں کیا کروں۔ دُنیا مجھے نہیں سمجھ سکتی تو اِس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ درد بھری آواز میں کہنے لگی: "لیکن تم مجھے غلط نہ سمجھنا نیاز! تم سے میری یہی التجا ہے۔" اُس کی آواز لرز کر رہ گئی اور خوبصورت آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ وہ سِسک سِسک کر رونے لگی۔

نیاز کے دل میں ایک تیز شعلہ سا بلند ہوا اور دوسرے ہی لمحے اُس کا سارا جذباتی وجود کافور کی طرح جل گیا۔ گرجتے گرجتے طوفان ایک گہرے سنّاٹے میں ڈوب کر رہ گئے۔ پھر وہ نادم اور پشیمان نظروں سے فرزانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ کمزور سی ایک نازک سی گڑیا، ایک کمزور خوبصورت لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے کتنی بلند ہوگئی تھی اُس کی اپنی سطح سے بلند!! فضائے نیلگوں کی لامحدود بلندیوں پر چمکنے والا ستارہ ــــ ستارۂ آخرِ شب ــــ!!

غزلیں

مشیر جھنجھانوی

مسافر کی نظر میں دشتِ غربت اور ہی کچھ ہے
مشیر اس بزمِ امکاں کی حقیقت اور ہی کچھ ہے

صنم خانے میں رنگِ حسنِ کثرت اور ہی کچھ ہے
حرم کی زندگی میں نورِ وحدت اور ہی کچھ ہے

نگاہِ اہلِ دل میں حسنِ صورت اور ہی کچھ ہے
طریقِ عشق میں طرزِ عبادت اور ہی کچھ ہے

مجھے انکار کب ہے شیشۂ دل کی نزاکت سے
مگر ٹوٹے ہوئے دل کی نزاکت اور ہی کچھ ہے

جبینِ در کی نسبت ایک رسمِ عام ہے لیکن
دلِ غم آشنا کی تجھ سے نسبت اور ہی کچھ ہے

یہاں کوئی نظر محدودِ جلوہ ہو نہیں سکتی
یہاں اندازۂ حسنِ مشیت اور ہی کچھ ہے

قیودِ بندگی سے روح گھبراتی ہے اے واعظ!
محبت کرنے والوں کی عبادت اور ہی کچھ ہے

یہ مانا اشکِ غم تاثیر سے خالی نہیں ہوتا
مگر اے چشمِ نم! اشکِ ندامت اور ہی کچھ ہے

تماشہ بن کے خود محوِ تماشا ہو تو کیوں کر ہو
تری محفل میں آ کر دل کی حالت اور ہی کچھ ہے

سکوتِ بحر میں طوفاں کی وسعت آ نہیں سکتی
شریعت قیدِ ظاہر ہے، طریقت اور ہی کچھ ہے

جنھیں دستِ جنوں پاسِ ادب سے چھو نہیں سکتا
مشیر ایسے گریبانوں کی قسمت اور ہی کچھ ہے

رشتی پٹیالوی

کس کو تھا معلوم خاموشی زباں ہو جائے گی
جو نہ لب تک آئے گی، وہ بھی بیاں ہو جائے گی

رُت بدلتے، رُخ پلٹتے دیر کچھ لگتی نہیں
ہوتے ہوتے یہ زمیں بھی آسماں ہو جائے گی

وہ بھی دن آ جائے گا اے ناز فرمائے جہاں
"ناز فرمائی" نشانِ بے نشاں ہو جائے گی

ماجرائے دردِ اُلفت خود عیاں ہو جائے گا
اہلِ دل کی بے زبانی بھی زباں ہو جائے گی

کیا حقیقت، کیا صداقت، کیا شعور و آگہی
ہر صداقت، ہر حقیقت داستاں ہو جائے گی

تیری یادوں کے دیئے ہو جائیں گے روشن وہاں
رات ہم اختر شماروں کو جہاں ہو جائے گی

اُن سے اب اپنی وفاؤں کا صلہ کیا مانگئے
زندگی بھر کی کمائی رائیگاں ہو جائے گی

کیا خبر تھی جب کبھی ہوگا تمہارا سامنا
ایک دیوارِ تحیر درمیاں ہو جائے گی

یاد رکھے گا زمانہ یاد رکھنے کی طرح
اپنی رودادِ محبت داستاں ہو جائے گی

تیرگی کا غم نہ کر اے طائرِ حرماں نصیب
کوندتی بجلی چراغِ آشیاں ہو جائے گی

عرصۂ ہستی بہر پہلو شکست انجام ہے
کامرانی بھی رشتی ناکامراں ہو جائے گی



جنم جنم کے رشتے

عمر عادل مارہروی

جامع مسجد قلعہ بریلی

۲۲ دسمبر ۶۵ء

خوشتر بھائی! آداب

جگرؔ مرحوم نے کہا تھا ؎

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے عشق ہے کارِ شیشہ و آہن

پیشِ نظر کہانی کے مرکزی کردار اسی کارِ شیشہ و آہن کے حامل ہیں۔ کہانی جب اپنے انجام کو پہنچتی ہے تو سلمیٰ کا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے اور بلاشبہ اُس کا فعل اُس کے جذبات کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے اور اُس کے آگے سر جھکانے کو جی چاہتا ہے۔ اُس نے جو کیا وہ اُس کے جذبات کی گہرائی، شدت اور سچائی کا تقاضہ تھا اور فطرت کے عین مطابق بھی' اور کیوں نہ ہو جبکہ — عشق ہے کارِ شیشہ و آہن! — امید ہے کہانی آپ کو پسند آئے گی اور میری طرح آپ اور پڑھنے والے بھی کہانی کے انجام کی 'سختی' کے پیچھے سلمیٰ کے جذبات کی نرمی کو محسوس کر کے اُس سے ہمدردی ہی کریں گے..

آپ کا — عمر عادل

انتظار ریت کے ذرّوں کی طرح سلمیٰ کی آنکھوں میں چبھنے لگا

اُسے محسوس ہوا جیسے باغ کے اِس نیم تاریک اور خاموش ماحول میں اُس نے اِسی انتظار میں زندگی کی پہلی سانس لی تھی۔ آنکھیں کھولتے ہی آصف کی راہ دیکھی تھی — اور اب زندگی کی آخری سانسیں ہیں، آخری لمحے ہیں۔ سرو کے اِس اُجاڑ پیڑ کے نیچے، پتھر کی اِس بنچ پر بیٹھے بیٹھے زندگی کی تمام صبحیں اور راتیں گزر چکی ہیں اور یہ آخری سانس ہے — وہ یونہی بیٹھی رہے گی۔ یہاں تک کہ اُس کا وجود خس و خاشاک کا ایک ڈھیر ہو کر رہ جائے گا۔

بازو کو بنچ کے ہتّے پر پھیلا کر سلمیٰ نے چہرہ اُس میں چھپا لیا اور سوجی ہوئی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر بازو پر پھیل گئے اور خزاں رسیدہ پتّوں کے کھڑکنے کی آواز کو آصف کے قدموں کی آہٹ سمجھ کر بھڑک اُٹھنے والے انتظار کے چراغوں کی لَو مدّھم ہو گئی۔

اور تب کسی نے آہستہ سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"سلمیٰ!"

"ہوں" وہ جیسے خواب سے چونک اُٹھی۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ساڑی کے پلّو سے خشک کر کے اُس نے شکوہ کیا "تم نے بہت دیر کر دی۔ میں تھک گئی انتظار کرتے کرتے۔ میں تو سمجھی تھی اب تم نہ آؤ گے"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا" آصف نے کہا۔ سلمیٰ اُس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اُس نے آصف کے لہجے کے درد کو محسوس کیا، اُن آنکھوں کو دیکھا جو سوجی ہوئی تھیں، سُرخ تھیں، ویران تھیں۔

"میری طرح تم بھی روتے ہو۔ تمہیں بھی نیند نہیں آتی" سلمیٰ کی آواز آصف کی روح میں اُتر گئی۔

"آؤ چلیں" آصف نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں چلنے لگے۔ اِس طرح جیسے طویل سفر کے بعد تھک گئے ہوں اور اب کسی ایسی منزل کی طرف جا رہے ہوں جو کہیں نہیں ہے۔ پارک کی روش پر بکھرے ہوئے خزاں رسیدہ سوکھے ہوئے پتّے اُن کے قدموں تلے چٹخنے لگے۔

"یہ آخری ملاقات ہے" سلمیٰ کی آواز میں مایوسی کا درد تھا۔ آصف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ سلمیٰ کے ہاتھ پر اُس کا ہاتھ لرز اُٹھا اور گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"شاید یہ آخری ملاقات تمہارے لئے بہت زحمت کا باعث ہوئی" سلمیٰ نے کہا۔

ٹیک لے کر آہمت کے قدم ٹھہرے۔ اُس نے سلمیٰ کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن صرف اپنے آنسو پونچھ کر رہ گیا۔

"ایسی کوئی بات نہ کرو سلمیٰ! یقین کرو میں بھی بہت دُکھی ہوں۔ آج تک تم نے میرے ہر غم میں میرا ساتھ دیا ہے۔ آج کوئی ایسی بات نہ کہو جو مجھے طنز محسوس ہو" آہمت کے لہجے میں التجا تھی۔

"مجھے معاف کر دو" سلمیٰ ٹھہر گئی۔ آہمت کے بازوؤں کو تھام کر اُس نے چہرہ آہمت کے سینے پر رکھ دیا۔

چند لمحے گزر گئے۔ قدم پھر اُٹھنے لگے۔ پتے چٹخنے لگے۔

"میرا دل کہتا ہے یوں مل کر ہم کوئی اخلاقی جرم نہیں کر رہے ہیں۔ ہم نے ... "

"جرم ہم نے پہلے بھی کوئی نہیں کیا تھا لیکن جاؤ جا کر لوگوں سے پوچھو وہ تمھیں بتائیں گے کہ ہم بہت سنگین جرم کرتے رہے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو چاہا۔ ساری زندگی ساتھ رہنے کے خواب دیکھے۔ اِس سے بڑھ کر جرم اور کیا ہو سکتا ہے ـــــ؟" سلمیٰ کہتی رہی۔ "لوگوں نے اُس جرم کو معاف نہیں کیا لیکن شاید یہ جرم معاف کر دیں گے۔ یہ آخری جرم ہے۔ اِس کے بعد کوئی جرم نہ ہوگا۔ کوئی گناہ نہ ہوگا۔ لوگوں کو خبر ہو جائے تو شاید وہ سمجھیں گے کہ ہمیں اِس کا حق تھا۔"

"ہاں! ہمیں حق ہے" آہمت بولا۔

"اِس یقین کے ساتھ کہ ہم کبھی جُدا نہ ہوں گے۔ برسوں ایک راستے پر ساتھ ساتھ چلنے والے اگر اچانک اُس موڑ پر پہنچ جائیں جس کے لئے اُنھوں نے سوچا بھی نہ ہو۔ جہاں سے اُنھیں ہمیشہ کے لئے جُدا ہونا ہو تو اُنھیں کم از کم اِتنا حق تو ہوگا کہ اُس موڑ پر کچھ دیر ٹھہر کر وہ اپنے آنسو ایک دوسرے کے دامن میں چھپا دیں۔ خواب اور وعدے واپس کر دیں۔ یہ حق ہونا چاہئے یا نہیں؟" سلمیٰ کی آواز اچانک تیز ہو گئی۔

آہمت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلمیٰ کے ہاتھ پر اُس کی گرفت سخت ہو گئی اور قدم آہستہ اُٹھنے لگے۔ کچھ دیر وہ خاموش چلتے رہے۔

"آج کے بعد ہم کبھی نہ ملیں گے ـــــ کبھی نہیں!" سلمیٰ کی آواز بھرا گئی۔

"کبھی نہیں؟" آہمت کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں کبھی نہیں ـــــ ابھی سب سے اچھا راستہ رہ گیا ہے" سلمیٰ کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ اُس میں سختی تھی لیکن یہ کہتے ہوئے اُس کا گلا رُندھ گیا اور دل کا درد آنسو بن کر اُبل پڑا۔

آہمت ٹھہر گیا۔ جیب سے رومال نکال کر اُس نے سلمیٰ کے آنسو پونچھے اور ساڑی کا پلو جو شانے سے ڈھلک گیا تھا، اُس کے سر پر پھیلا دیا۔

"اِس طرح روؤ گی تو میں کبھی سکون نہ پا سکوں گا" آہمت کہنے لگا۔ "اِن آخری لمحوں میں اگر تم یہ سوچ لو کہ ہم نے جو کچھ کیا اُس کے لئے ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے کا خیال رہے گا ـــــ اپنے آنسوؤں کو پونچھ سکتا ہوں۔ تمھیں تسلی دے سکتا ہوں لیکن دُکھ کو میں کیا کر سکتا ہوں جو تمھیں ہے کیا آگے ہے گی، تم اِس کا اندازہ نہیں کر سکتیں ـــــ جیتی رہ سکتی ہو"

"ایسا کچھ نہ ہوگا" سلمیٰ نے بہت اطمینان سے کہا۔ "تم بہت خوش رہو گے اور تم بھی خوش رہو گے"

"تم بھی ہو شادی کے بعد میری سب کچھ بن جاؤ گی" سلمیٰ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

"اپنی شادی کا ذکر نہ کرو۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تمھارے گھر کے در و دیوار کی روشنیاں میرے کمرے پر پڑتی ہیں، تمھاری شادی کے گیت مجھے سنائی دیتے ہیں یہ سب میرے لئے بہت گراں ہے۔ تم اِسے روک نہیں سکتے لیکن یہ تو کر سکتے ہو کہ خود مجھ سے کوئی ذکر نہ کرو۔"

"مجھ سے غلطی ہو گئی!" آہمت شرمندہ ہو گیا۔

"سوچو آہمت! سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری بات کا بُرا مت مانو" سلمیٰ خود بھی شرمندہ ہو گئی۔ "میں ملاقات کے اِس آخری موقع کے درد انگیز لمحوں کو برداشت کر سکتی ہوں لیکن تمھارے ساتھ کسی دوسری لڑکی کا تصور بھی میرے لئے بہت گراں ہے۔ میں تم سے ہمیشہ کی جُدائی گوارا کر رہی ہوں لیکن تمھاری ذات سے کسی اور کی وابستگی کا تصور بھی برداشت نہ ہوگا۔ میں یہ سوچنا بھی نہیں چاہتی کہ جو خواب میں نے دیکھے اُن کی تعبیر کوئی اور کیسے تمھارے ساتھ جی۔ زندگی کی آرزوئیں جو میں نے کی تھیں، وہ زندگی کسی اور نے پالی اور ... ؟"

"سلمیٰ ـــــ!" آہمت جیسے کراہ اُٹھا۔

"مجھ سے برداشت نہ ہوگا کہ تمھیں کوئی دوسرا اپنا کہے، اپنا کہے لیکن میں جانتی ہوں کہ مجھے برداشت کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہم حالات سے شکست کھا چکے ہیں۔ تم مجبور ہو لیکن اِتنا تو کر سکتے ہو کہ اِن آخری لمحوں میں کسی شک کا گزر نہ کرو۔ اِس وقت آخری بار مجھے یہ محسوس کر لینے دو کہ تم میرے ہو ـــــ صرف میرے ہو ـــــ تم میرے تھے اور میرے رہو گے! ہم ساری زندگی یونہی ساتھ رہیں گے۔ یہ روشنیاں، یہ گیت صرف ایک ٹوٹا ہوا خواب ہے۔ یہ خود غرضی ہے لیکن اِس میں بہت سکون ہے؟"

"سلمیٰ!" جذبات سے بوجھل آواز میں آہمت نے کہا ـــــ قدم ٹھہر گئے۔ آہمت کے بازو سلمیٰ کی پُشت پر پھیل گئے اور سلمیٰ کے آنسو اُس کے کوٹ کے کالر میں جذب ہونے لگے۔

سورج اپنی آخری شعاعوں کو سمیٹنے لگا۔

پارک کے ایک حصے میں درختوں کی روشنیاں جگمگانے لگیں ـــــ پہلے

پڑی تھیں۔ کتنا اُداس کر دینے والا منظر ہے۔ درختوں کے قریب بیٹھے پرندوں پر پتیاں کتنی کم رہ گئی تھیں۔ سرگوشیاں تھیں، قہقہے تھے اور ریسٹورنٹ کے ریڈیو گرام پر انگریزی موسیقی کی دھن اُبھر رہی تھی۔

وہ ہنگامے سے الگ تھلگ آخری سرے پر جوہی کے کُنج کے قریب پڑی ہوئی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ آصف نے سلمیٰ کی آنکھوں میں جھانکا جو سُرخ اور سُوجی ہوئی تھیں۔ اُن بالوں کو دیکھا جن کے پیچ و خم خشک تھے۔ اُلجھے ہوئے تھے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" سلمیٰ نے مُسکرانے کی کوشش کی "اِن آنکھوں کو کیا دیکھ رہے ہو۔ تم کہا کرتے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے، اماوس کی رات کاجل کی سیاہی میں لپٹ کر اِن آنکھوں میں سو گئی ہے ــــــ دیکھو آج اِن میں کتنی راتوں کا خون ہے، ویرانی اور بیداری ہے۔ اِن بالوں کے پیچ و خم کو تم اپنی تقدیر سے تشبیہ دیتے تھے، کیسی خوبصورت شاعری تھی!" سلمیٰ ہنسی "تمھاری تقدیر تو سلجھ گئی لیکن یہ اور اُلجھ گئے۔"

"سلمیٰ! خدا را بس کرو!!" آصف تڑپ اُٹھا۔

"اِنھیں سنوار سکتے ہو تم۔ بولو! اِن آنکھوں کی نیندیں لَوٹا سکتے ہو ـــــ؟" سلمیٰ چیخ اُٹھی اور آصف نے سر کو ہاتھوں میں تھام کر میز سے ٹیک دیا۔

"میں بہت مجبور ہوں ـــــ بہت مجبور ہوں!"

"میں جانتی ہوں" سلمیٰ شرمندہ ہو گئی "جبھی تو مجھے تم سے نفرت نہیں ہوئی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"سلمیٰ!" آصف نے اپنے خالی ہاتھ سلمیٰ کے سامنے میز پر پھیلا دیے۔ سلمیٰ کی آنکھیں چھلک اُٹھیں۔ اُس نے اپنے ہاتھ اُس کے ہاتھوں میں رکھ دیے اور آصف نے اُس کے ہاتھوں پر اپنی آنکھیں رکھ دیں۔

بیرا چائے لے آیا تو سلمیٰ نے ہاتھ کھینچ لیے جو آصف کے آنسوؤں سے نم ہو گئے تھے۔

سلمیٰ چائے بنانے لگی اور آصف درختوں کی بے برگ و گُل شاخوں کو دیکھنے لگا۔

یکایک قریب کے ایک پیڑ پر کوئی پرندہ پھڑپھڑایا اور پھر سکوت چھا گیا۔ چائے کی پیالی آصف کی طرف بڑھا کر سلمیٰ پیڑ کی شاخ پر گھونسلے میں بیٹھی ہوئی فاختاؤں کو دیکھنے لگی جن کے پروں کے نیچے سے دو بچے سر نکالے روشنیوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ کتنے پُرسکون ہیں" سلمیٰ جیسے خواب میں بڑبڑائی۔

"کون؟" آصف نے چونک کر پوچھا۔

"یہ!" سلمیٰ نے پیڑ کی طرف اشارہ کیا "کتنے پُرسکون ہیں۔ ایک گھر ہے۔ بچے ہیں۔ ساتھی ہے" پھر اُس نے آصف کی طرف دیکھا "ایسی ہی زندگی کا خواب میں نے بھی دیکھا تھا۔ کوئی جُرم تو نہیں کیا تھا۔ ہر لڑکی دیکھتی ہے ـــــ برسوں میں خواب دیکھتی رہی۔ اُس گھر کا خواب، جہاں ہم ہوتے، جہاں میں تمھارے لیے کھانا پکاتی، تمھارا بستر بچھاتی، تمھارا گھر صاف کرتی، تمھارے کپڑے سیتی، جس کے آنگن میں میں جھاڑو دیتی، جس کے دروازے پر میں تمھاری واپسی کا انتظار کرتی۔ جہاں . . ."

"سلمیٰ! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ!" آصف نے سلمیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں کھینچ لیا۔

"برسوں میں یہ خواب دیکھتی رہی۔ میں اُس گھر کی طرف تمھارے ساتھ چلتی رہی۔ تمھارے قدم سے قدم ملا کر۔ تمھارے ہر دُکھ سُکھ کو میں نے اپنا سمجھا۔ تم اُداس ہوتے تو میں رو دی۔ تم مُسکرائے تو میں نے خوشی سے قہقہے لگائے۔ تمھاری ہر خواہش کو میں نے اپنا فرض سمجھا لیکن یہ سب میری خطا بن گیا۔ جُرم ہو گیا۔ گُناہ ہو گیا" سلمیٰ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"سلمیٰ! میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اگر یہ سب کہہ کر تمھارا غم ہلکا ہو سکتا ہے تو کہہ لو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اُن خوابوں کا ذکر مت کرو جو میری سب سے بڑی شکست بن گئے۔ میرے ضمیر کا بوجھ بن گئے اور . . ."

"نہیں" سلمیٰ تڑپ اُٹھی "ضمیر کا بوجھ نہیں۔ میں جانتی ہوں تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ تم مجبور ہو گئے ہو۔ حالات تمھارے پیروں میں زنجیر بن گئے اور تم میں اِتنی طاقت نہیں کہ اِن زنجیروں کو توڑ سکو۔ اِسی لیے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، کوئی گِلہ نہیں" سلمیٰ نے آصف کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔

سورج ڈوب چکا تھا۔

"آؤ! ـــــ واپس چلیں" آصف بولا "مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی شے میرے دل کو دبا رہی ہے۔"

"آخری ملاقات کا یہ احساس بہت بھاری ہے آصف! آؤ اِسے مختصر کر دیں" سلمیٰ کھڑی ہو گئی "چلو واپس چلیں رات ہو گئی۔"

"تم گھر کیا کہہ کر آئی تھیں" آصف نے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"خالدہ آپا کے یہاں کا بہانہ کر کے آئی تھی" سلمیٰ مطمئن تھی۔

"تمھیں بہت دیر ہو گئی" آصف نے سلمیٰ کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم فکرمند نہ ہو۔ یہ آخری ملاقات کسی بھی رُسوائی سے زیادہ اہم ہے" سلمیٰ نے کہا اور اُس کے ہاتھ پر آصف کے ہاتھ کی گرفت سخت ہو گئی۔

خزاں رسیدہ پتّے اُن کے پیروں تلے چٹخنے لگے۔

پارک سے نکل کر وہ کُھلی سڑک پر آ گئے۔

"اسکوٹر کر لیں، دیر ہو گئی ہے" آصف نے سامنے سے آتے ہوئے اسکوٹر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! ــــ اِن آخری لمحوں کو تیز رفتار نہ کرو تھوڑی ہی دیر کا ساتھ رہ گیا ہے!"
سلمیٰ نے کہا۔

سڑک پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں کے بلب مدھم تھے۔

"آج روشنی کم آرہی ہے" آصف بولا۔

"ساری برقی قوت تو تمہارے گھر کی سجاوٹ میں کام آگئی!" سلمیٰ مُسکرائی۔

"بہت خوبصورت روشنی کی گئی ہے لیکن مجھے شکایت ہے کہ رات . . ."

"کیا ہوا؟" آصف ٹھہر گیا۔

"رات میں چھت پر لیٹی تھی۔ اِتنی تیز روشنی تمہارے در و بام پر تھی کہ میری آنکھوں میں درد ہونے لگا" سلمیٰ بولی۔

"کاش میں اُن روشنیوں کو بُجھا سکتا!!" آصف کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"نہیں ایسا نہ کہو" سلمیٰ کا لہجہ اُداس تھا "کون جانے پھر ایسی روشنی کبھی ملے یا نہ ملے۔ شادی کے ــــ شادی کے ــــ گیت پھر کبھی ــــ کبھی سُنائی دیں ــــ یا نہیں ــــ یہ گیت کتنے ــــ" سلمیٰ کی آواز ہچکیوں میں ٹوٹ گئی۔

"تمہیں ہچکیاں آرہی ہیں۔ تھوڑی دُور پر نل لگا ہے پانی پی لینا" آصف نے کہا۔

"پہلے ہچکیاں آتی تھیں ــــ تو ــــ تو میں سوچتی ــــ سوچتی تھی کہ تم مجھے ــــ تم مجھے یاد کر رہے ہو لیکن اِس وقت تو ــــ تم میرے ہی ــــ پاس ہو" سلمیٰ کے قدم آہستہ ہوگئے۔

"پھر کون یاد کر رہا ہے؟" آصف مُسکرایا۔

"آسمانوں میں کوئی یاد کرتا ہوگا!" سلمیٰ ہنسی اور آصف جیسے چیخ اُٹھا۔

"سلمیٰ ایسی بات مت کہو!!"

"نل کتنی دُور ہے؟" سلمیٰ کے قدم تیز ہوگئے۔

"وہ سامنے ــــ وہ!" آصف نے اشارہ کیا "مجھے بھی پیاس لگ رہی ہے۔ رات کو جاگنے سے ویسے بھی خُشکی ہو جاتی ہے، پھر چائے بھی کچھ تیز تھی اور خشکی بڑھ گئی۔"

سڑک کے کنارے لگے ہوئے نل سے پانی پی کر دونوں پھر چلنے لگے۔

"گھر قریب آرہا ہے" آصف نے کہا۔

"ہاں! دیکھو تمہارے گھر کی روشنیاں نظر آنے لگیں" ڈھولک پر گیتوں کی آواز آنے لگی۔ سلمیٰ کے لہجے میں حسرت تھی۔

آصف خاموش رہا پھر اُس نے کہا۔

"سلمیٰ! میں چاہتا ہوں تم بھی شادی کر لو۔ تنہا رہ کر تم ماضی کو نہ بھول سکو گی"

"اِسی لئے تم شادی کر رہے ہو" سلمیٰ مُسکرائی۔

"نہیں ــــ یہ ایک مجبوری ہے لیکن میں چاہتا ہوں تم اِسی مقصد سے شادی کر لو" آصف بولا۔

"گھر قریب آگیا" سلمیٰ نے اُس کی بات نظر انداز کر دی۔

"گلی میں ہو کر چلیں گے۔ تم پہلے چلی جانا"

"ہاں! ــــ آخری لمحوں کو جتنا ہو سکے طویل کر لو"

"تم مجھے بھول جانا سلمیٰ! ایک خواب کی طرح جو . . ." آصف کی آواز رُندھ گئی۔

سلمیٰ نے اپنے آنسو ساڑی کے پلّو میں جذب کر لئے۔

کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہوگئے ــــ قدم اُٹھتے رہے ــــ پھر گلی آگئی۔

"کل تو نہیں ــــ پرسوں ہم پھر مل سکتے ہیں ــــ بولو ملو گی؟" آصف کے لہجے میں التجا تھی۔

سلمیٰ نے کچھ سوچا، پھر بولی۔

"ملیں گے! ایسے ہی کسی تنہا جگہ پر، جہاں ہم اکیلے . . ."

"سلّو!" آصف نے سلمیٰ کا ہاتھ چوم لیا۔

دونوں گلی میں داخل ہوگئے۔

"آصف! میری ہر اُس بات کے لئے مجھے معاف کر دو جس سے کبھی تمہیں تکلیف پہنچی ہو اور . . ."

"ایسی بات مت کرو سلمیٰ!" آصف بے چین ہوگیا۔

"کبھی کبھی انسان کسی اچھے جذبے سے مجبور ہو کر بھی کوئی بُرا فعل کرتا ہے ــــ نادانستہ طور پر بھی تکلیف پہنچاتا . . ."

آصف نے سلمیٰ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سلمیٰ سسکنے لگی اور آصف ٹکٹکی باندھ کر یوں خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا جیسے قوتِ گویائی ختم ہو چکی ہو، آنسو پونچھنے کی بھی طاقت نہ ہو۔

میونسپل بورڈ کی لالٹین کی مدھم روشنی میں گلی نیم تاریک تھی سُنسان تھی اور اُس سکوت میں دونوں اِس طرح قدم اُٹھا رہے تھے جیسے موت کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ دیواروں پر دو سائے بڑھ رہے تھے۔ خاموش ــــ آہستہ آہستہ۔

گلی کے خاتمے کے قریب سائے ٹھہر گئے۔ چند لمحے گزرے۔ سسکیاں اُبھریں، سائے قریب آئے۔ پھر دو سائے ایک سایہ ہوگئے ــــ ایک وجود کا سایہ! چند لمحے گزر گئے اور ہچکیاں اُبھریں۔ پھر دو سائے ہوگئے۔ ایک سایہ آگے بڑھنے لگا اور دوسرا ساکت رہ گیا۔

پھر گلی میں صرف ایک سایہ رہ گیا ——— کچھ دیر کو تڑ گئی۔

نکہت نے جیب سے رومال نکالا اور آنسوؤں کو اس میں جذب کر کے بے حیائی قدموں سے چلنے لگا۔ تنہا تنہا! خاموش! کھویا کھویا ——— اُس مکان کی طرف جس کے در و بام رنگ رنگ کی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے اور گیتوں سے گونج رہے تھے۔

گھر کے دروازے پر ٹھہر کر اُس نے سامنے کے مکان کی بالائی منزل کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو سلمیٰ نظر آئی اور پھر چھپ گئی۔

اگلے روز دن چڑھے گلی سے دو جنازے ایک ساتھ نکلے۔

نکہت اور سلمیٰ کے جنازے ———!!

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق نکہت اور سلمیٰ کی موت زہر کھانے سے واقع ہوئی تھی۔ رپورٹ کی تصدیق سلمیٰ کے اُس خط سے بھی ہو گئی جو اُس کے سرہانے سے ملا تھا۔ مختصر سا خط ———

"میں نے نکہت کو زہر دے دیا کیونکہ اُس کی ذات سے اپنے سوا کسی اور کی وابستگی میں برداشت نہیں کر سکتی تھی ———
اور میں نے زہر کھا لیا ہے کیونکہ نکہت کی موت میں برداشت نہیں کر سکتی تھی ———"
سلمیٰ

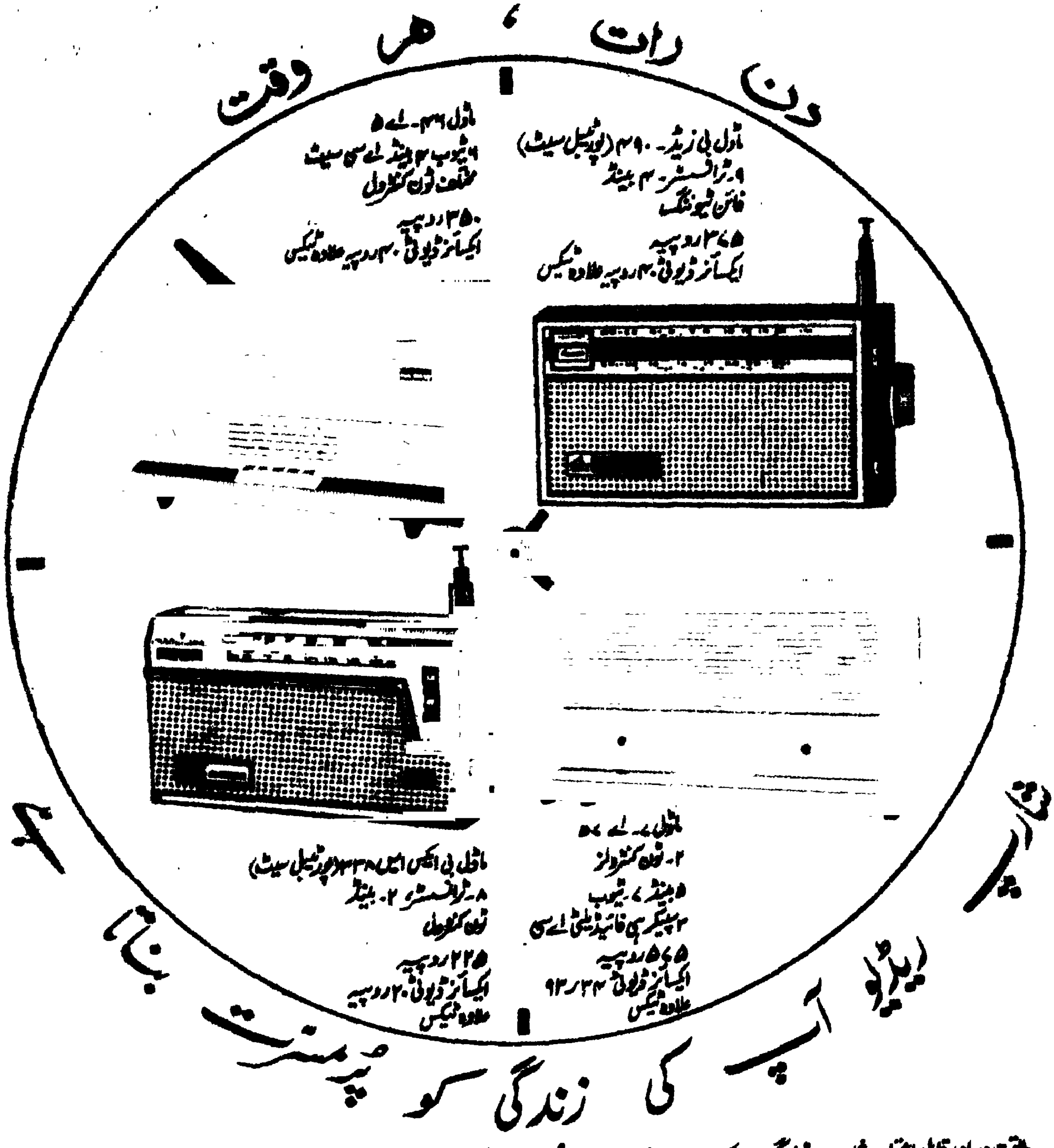
غزلیں

شباب للت ایم۔ اے

گزرنا ہے نہ جانے اور اسے کن کن مراحل سے — بھٹکتا ہے ابھی انسان کوسوں دور منزل سے
غرورِ حُسن پر حالت جو گزری دیکھتا کوئی — نظر نیچی کئے جب ہم گزر آئے مقابل سے
پھرو گے ڈھونڈتے تم ایک دن دیوانہ وار اُن کو — نکالا ہے جنھیں ٹھکرا کے تم نے اپنی محفل سے
یہی دستور ہے زمانہ رہا تو کیا خبر کیا ہو — پریشاں ہیں بہت اربابِ محفل تنگیٔ محفل سے
انھیں راہوں میں مجھ کو عمر بھر اب خاک اُڑانے دو — کہیں ٹھکرا کے منزل کو پلٹ آیا ہوں منزل سے
گرج کر اُن کو بھی اے موجۂ طوفاں جگا دینا — لپٹ کر سو رہے ہیں جو ابھی دامانِ ساحل سے
زمانہ آج اُن کو بھی سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے — جنھیں وابستگی کچھ دن رہی ہے تیری محفل سے
جفا کے دور میں اُف اے شباب انساں کی مجبوری — مسیحا کہہ دیا قاتل کو ڈر کر ہم نے قاتل سے

مظفر حنفی

دیوانۂ بہار بنا چاہتے ہیں ہم — اُس زلفِ نارسا کی ہوا چاہتے ہیں ہم
ہر لحظہ ایک طرفہ جفا چاہیے ہمیں — اُس کو گمان ہے کہ وفا چاہتے ہیں ہم
تقصیرِ عرضِ حال ہوئی ہے ترے حضور — اے تاجدارِ حُسن! سزا چاہتے ہیں ہم
جب بھی ہوا سوال کہ غم چاہیے کیسے — ہم نے بصد خلوص کہا چاہتے ہیں ہم
ہیں سجدہ ہائے شوق کچھ اس درجہ مضطرب — ہر گام پر خدا ہی خدا چاہتے ہیں ہم
تم سے اگر سوال کریں بھی تو کیا کریں — یہ بھی خبر نہیں ہے کہ کیا چاہتے ہیں ہم
مایوس کر گئی وہ نگاہِ ستم شعار — ہر آرزو کا خون کیا چاہتے ہیں ہم
کتنی مٹھاس ہے کہ مظفر ترا کلام — سُن کر ہزار بار سُنا چاہتے ہیں ہم



طاقتور اور قابل اعتماد، شارپ ریڈیو گھروں کے پسندیدہ ہیں۔ ہر سمجھدار سننے والے کے پسندیدہ ہیں۔
مناسب قیمتوں میں عالیشان اسٹائل کے باعث یہ اُن احباب کی قدرتی پسند ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کارکردگی بھی چاہتے ہیں۔
یاد رکھیں! شارپ جھنکار ریڈیو جاپان کی ہایاکاوا الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ کی تکنیکی تال میل کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں جو بہترین کوالٹی کا مال تیار کرنے میں دُنیا بھر میں مشہور ہے۔

SHARP RADIO

انڈین پلاسٹکس لمیٹڈ۔ ڈیلس ہاؤس۔ بمبئی ۱

جیسوین ہمدری دہلی

سپنوں کی رہگذر میں

ایک پُراسرار، دلچسپ رومانی ناول

کرشن چندر۔ ایم اے

میرا نام موتی لال ناگر ہے۔ میرے باپ رائے بہادر چاہے لال ناگر انگریزوں کے زمانے میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اُن کے منظورِ نظر بھی تھے۔ وہ تو اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے سے بھی بڑا حاکم بنانا چاہتے تھے لیکن میں نے پڑھ کے نہیں دیا۔ جوں توں کرکے انٹرینس پاس کیا۔ کالج میں آیا۔ تو دو سال ایف۔ اے میں فیل ہوا۔ تین سال بی۔ اے میں۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا اور گھر بیٹھ گیا۔ جیسے ہوائیں پیکے میں بیٹھ جاتی ہیں۔

لیکن میرے باپ نے ہار نہیں مانی۔ کبھی تو انھوں نے مجھے تحصیل داری میں دھکیلنا چاہا۔ کبھی نائب تحصیل داری میں۔ کبھی پولس میں، کیونکہ مجھے ایک عرصہ تک شکار کا بہت شوق رہا تھا۔ دیکھنے میں خاصہ وجیہہ لگتا ہوں۔ اونچا پورا قد، تندرست جسم، بھرے ڈیل ڈول والا۔ رنگ کھلتا ہوا اور آنکھیں بڑی بڑی لیکن میرے دماغ میں بھوسا بھرا تھا۔ قانون کی بات اور پولس والوں کی گھات کسی طرح پلے نہ پڑی اور ہر امتحان میں بہت شاندار طور پر فیل ہوا۔

مجھے حاکمیت اور اس کے انتظامیہ امور سے کبھی دلچسپی نہ رہی۔ مجھے رنگ پسند ہیں اور رات کے سناٹے میں بجنے والے جھرنوں کا مدھم سنگیت اور آسمان کے لاجوردی نقوش پر چلتے ہوئے قدم رکھتی ہوئی نازک بدلیاں جو سفید شفاف اوڑھنیاں اوڑھے جانے کس مندر کو جاتی ہیں؟ اور جب سب سو جاتے ہیں تو رات میرے سرہانے کھڑی ہو کر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے اور میں اکثر بیاکل ہو کر اپنے قصبے کے پرانے آبائی گھر سے نکل کر جنگل کی طرف چلا جاتا ہوں اور ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ کر عجیب عجیب آوازیں سنتا ہوں۔ ایسی آوازیں جو انگلیوں کی طرح میرے دل کو ٹٹولتی ہیں اور میرا دل ایک عجیب و غریب ساز کی طرح بجنے لگتا ہے۔ میں ایک چھوٹا سا آدمی ایک بہت بڑی انجانی اَن دیکھی دنیا کی طرح کھلنے لگتا ہوں۔ چاندنی کی طرح ہلکا محسوس کرنے لگتا ہوں اور غم کی طرح رقیق، کائنات کی طرح مبہم اور پُراسرار۔ چاندنی ندی کی طرح بہتی ہے اور میں اس کے ساتھ ساتھ بہتا ہوں۔ مور پنکھ کھول کے ناچتا ہے اور میں اس کے ساتھ ناچتا ہوں۔ مجھے چاندنی کی سطح پر چلتے ہوئے کسی کے گلابی چرن کنول نظر آتے ہیں۔ دو پاؤں، رشکِ نازکِ غزل کے دو مصرعوں کی طرح آگے پیچھے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اور کسی کی سفید ساڑی کا کالا کنارا نظر آتا ہے اور میں اور جنگل کا مور گھنٹوں چاندنی میں اُن دو چلتے ہوئے گلابی پاؤں کو دیکھ دیکھ کر مبہوت سے ہو جاتے ہیں۔

رات چاندنی کے فرش پر اپنا کالا لبادہ اوڑھے ایک برہن کی طرح بیٹھی ہے اور محو انتظار ہے! میں، مور اور رات تینوں منتظر ہیں۔ نہ جانے کس کے؟ نہ جانے میرے دماغ میں تجسس بھرا ہے یا خواب بھرے ہیں یا سپید سپید دھندلی گھٹائیں بھری ہیں کہ اس دنیا کی کوئی حقیقت ہاتھ نہیں آتی۔ ہر وقت دل دُکھتا رہتا ہے۔ نہ جانے کس کے لئے ____؟ اور ہاتھ کسی کے چہرے کو ٹٹولنے کے لئے بے چین رہتے ہیں اور یہ دنیا جتنی سمجھ میں آتی ہے اُس سے کہیں زیادہ پُراسرار دکھائی دیتی ہے۔ یا ایسا معلوم ہوتا ہے اس دنیا سے پرے بھی کوئی دنیا ہے۔ یا اس دنیا کے اندر ایک اور دنیا ہے۔ ان رنگوں سے پرے بھی کئی رنگ ہیں، جنہیں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان آوازوں سے آگے کئی ایسی اَن سنی آوازیں ہیں جنھیں میرے کان ہر آن سننے کے لئے بے تاب ہیں۔ اس کا دنیا میں یہ کھیت ہے، یہ جنگل ہے، یہ گھر ہے، یہ وزن ہے، یہ فاصلہ ہے، یہ کشش ہے، یہ نفرت ہے۔ یہ انسان ہے، یہ جانور ہے، یہ رات ہے، یہ صبح ہے۔ لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے وزن مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ فاصلہ محسوس نہیں ہوتا۔ رات میرے لئے ایک لمبے سفر کا بلاوا معلوم ہوتی ہے اور ہر صبح کو میں سوچتا ہوں، آج میں اُفق کے کنارے سے سورج کی بجائے کسی کے گلابی چرن اُبھرتے ہوئے دیکھوں گا اور جب نہیں دیکھتا تو دل مایوسی سے بھینچنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے اُفق کا کنارا اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالوں اور اُن قدموں کو دیکھ لوں جو کرنوں کی سنہری پائل پہنے مجھ سے دور کہیں ناچتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں اپنے احساس کی شدت سے بیدم سا ہو جاتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے میں پاگل ہوں یا کسی دوسری دنیا سے آیا ہوں اور اپنے باپ سے اور ماں سے میرا کوئی رشتہ ناطہ نہیں ہے۔ ایک بدلی کی طرح کہیں سے آیا ہوں۔ اس ٹیلے پر آن ٹکا ہوں۔ دوسرے لمحے میں اُڑ کر کہیں چلا جاؤں گا!

میرے باپ کی موروثی جائیداد بہت تھی اور بہت کمائی بھی کی تھی انھوں نے۔

گھر میں ہر طرح سے فراغت تھی۔ میرے والد نے مجھے جائیداد سنبھالنے کے کام میں لگانا چاہا۔ لیکن میرا دل اُس میں بھی نہ لگا۔ پھر میں نے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی لیکن ہر راگ، راگنی کے اصول میرے ذہن میں بیڑیاں بن کر جم گئے۔ پھر میں نے عورتوں سے پیار کرنا چاہا۔ لیکن ہر لڑکی کا چہرہ بہت مانوس اور پُرانا سا معلوم ہوا جیسے میں صدیوں سے اُس کی ہر خواہش اور دل کے ہر راز کو جانتا ہوں۔ کہیں مجھے وہ اجنبیت نہ ملی جو مجھے پُر اسرار راہوں پر لے جاتی۔ پھر میں نے کتابوں میں دل لگانا چاہا اور اپنے والد کی وسیع لائبریری میں سینکڑوں ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہر کتاب ایک پُر اعتماد مرد کی طرح اپنے آپ میں مکمل اور پُر غرور دکھائی دی۔ ہر کتاب کسی شہری حسینہ کی طرح بہترین میک اَپ سے آراستہ بہترین ملبوس میں جگمگاتی ہوئی ہزار عشوے دکھاتی ہوئی معلوم ہوتی۔ معلوم ہوتا تھا، ہر کتاب ہاتھ میں جھاڑو لئے کھڑی ہے اور زبردستی میرے دماغ کے ہر جالے کو صاف کر دے گی۔ میں کتابوں سے بھاگ نکلا اور پہلے سے بھی زیادہ اپنے خوابوں میں پناہ لینے لگا۔

پھر مجھے رنگ مِل گئے ——— !

اور جب مجھے رنگ ملے تو میری دُنیا ہی بدل گئی۔ کاغذ کی سطح یکایک ازل سے غائب ہو گئی اور رنگ ہی رنگ رہ گئے۔ رنگ جو آپس میں جب مل جاتے تھے تو اور ہی رنگ پیدا کر دیتے تھے۔ میں کاغذ پر اپنی دُنیا کو ایک نقطے کی طرح چھوٹا کر سکتا تھا اور کائنات کی طرح وسیع! یہ رنگ جو دو گلابی چرن کملوں کی طرح ناچتے تھے اور مجھے مسحور کرتے تھے۔ یہ رنگ جو کبھی پھولوں کی طرح مہکتے تھے اور کبھی کسی انجانی راگنی کی طرح سُنائی دینے لگتے تھے۔ اِن رنگوں کی دُنیا بہت پُر اسرار اور اجنبی تھی اور اِس راستے پر ہر اگلا قدم پہلے سے مختلف تھا ——— ہر موڑ الگ اور ہر صورت دیکھی ہوئی صورتوں سے الگ، اِن رنگوں کے اندر میں جتنا اُترتا گیا، اتنی ہی گہرائی مجھے اور ملتی گئی ——— میں رنگوں میں ڈوب گیا!

میرا باپ میری تصویروں کو سمجھ نہ سکا کیونکہ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ وہ حقیقت کے شیشے کے شفاف فانوس کی چکنی سطح پر اپنے پر پھیلائے لیٹا تھا۔ اُس نے فانوس کے اندر جا کر جلتی ہوئی روشنی سے کبھی اپنے پر جلائے نہ تھے اور وہ وہی آرام دہ قسمت اپنے بیٹے کو عطا کرنا چاہتا تھا۔ اِس میں اُس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ کوئی دوسری زندگی جانتا ہی نہ تھا اور جو سکون اور خوشی وہ جانتا تھا، وہی اپنے بیٹے کو دینا چاہتا تھا۔ اُسی کی نیت اچھی تھی اور اِسی طرح تمام اچھی نیتوں کے دروازے جہنم میں کھلتے ہیں۔

میرے پتا جی نے میرا رجحان دیکھ کر مجھے محکمۂ آثارِ قدیمہ میں ملازمت دلوا دی۔ میرا کام پُرانے آثار کی دیکھ بھال کے علاوہ اُن کی تصویریں بنانا بھی تھا۔ اُن کے مختلف حصوں کی اور اُن جگہوں کی بھی، جہاں جہاں پُرانی گلکاری یا مینا کاری کے نمونے ملتے تھے۔ پُرانے استانوں کی تصویریں دیواروں پر کندہ تھیں اور جو اب رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ اِس کام میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی اور میں اِن تصویروں کا عکس لینے میں لگ گیا۔ رفتہ رفتہ پُرانے آثار سے مجھے گہری دلچسپی محسوس ہونے لگی اور میرے وقت کا زیادہ حصہ اُنہی کی دیکھ بھال، مصوری اور خاکہ نویسی میں گزرنے لگا۔ میرے لئے اِردگرد کی دُنیا نامانوس ہوتی گئی اور ماضی کے نقش زیادہ مانوس اور جانے پہچانے نظر آنے لگے اور میں پہلے سے بھی زیادہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ماضی کے نقش میرے لئے ہردم زندہ اور متحرک ہو کر سامنے آنے لگے۔ میرے والد نے مجھے زمانۂ حال میں کھینچنے کی بہت کوشش کی۔ دو تین جگہ میری شادی کی بات بھی چلائی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میرے ماں باپ تھک ہار کر چُپ ہو گئے۔ اُنھوں نے اُمید تو نہیں چھوڑی۔ ہاں اِتنی تسلی اُنھیں ضرور تھی کہ لڑکا کام سے لگ گیا ہے۔ نوکری کرتا ہے۔ دن رات اپنے کام میں منہمک رہتا ہے۔ اُس کے افسر اُس سے بے حد خوش ہیں۔ اِن پانچ سالوں میں اُسے دو بار ترقی مل چکی ہے اور وہ اپنی غیر معمولی استعداد اور کارکردگی سے اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ لا کر اپنی ماں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کسی طرح کی آوارگی یا بد چلنی کے آثار اُس میں نہیں پائے جاتے۔ تسلی کے لئے یہ بہت تھا۔

۱۹۵۸ء کے جون کے پہلے ہفتے میں مجھے محکمے کی طرف سے بیدرواہ جانے کا حکم ملا۔ بیدرواہ کی ہمالیائی وادی میں محکمہ نے کچھ نئے غار دریافت کئے تھے جن میں کانگڑہ اسکول کی مصوری کے کچھ نادر نمونے ملے تھے۔ محکمے نے مجھے اُن ساری تصویروں کی رنگین نقلیں اُتارنے کے لئے بھیجا۔ کام بے حد اہم تھا لیکن میرے شوق کے عین مطابق تھا۔ محکمے کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی۔ اِس سے میں بھی خوش تھا میرے گھر والے بھی۔ بہت جلد ضروری ساز و سامان سے لیس ہو کر مجھے روانہ کر دیا گیا۔ چلتے وقت ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ کیونکہ راستہ پہاڑی اور دشوار گزار تھا اور مجھے کئی ماہ گھر سے باہر رہنا تھا۔

اُدھم پور تک ریل جاتی ہے۔ اُدھم پور سے تیراہ تک بس جاتی ہے۔ آگے بس بھی نہیں جاتی! تیراہ کے قصبے میں آخری پولس چوکی اور ڈاک خانہ ہے۔ تیراہ سے بیدرواہ کا گاؤں بیس میل کی دوری پر ہے۔ دشوار گزار گھاٹیوں پر گھنے جنگل کھڑے ہیں اور پُرشور تیز رفتار کوہستانی ندیوں کو پیدل چل کر عبور کرنا پڑتا ہے۔ راستے میں نہ کوئی پُل ہے، نہ سڑک۔ بس جنگلی راستے میں گڈریوں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں ہیں جن پر خچر بھی مشکل ہی سے باربرداری کے کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ میں نے تیراہ کے قصبے سے دو مزدوروں پر سامان لادا۔ دو مزدور ایک چارگی اور ایک مقامی باشندے کو بطور گائیڈ اپنے ساتھ لیا اور بیدرواہ کی گھاٹی کا سفر پیدل اختیار کیا۔

پہلی رات تیراوس سے سات میل دُور گرگون کے پہاڑ کی چوٹی کے قریب کاٹی جہاں جنگل ختم ہوتا ہے اور گرگون کی برف پوش چوٹی کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ وہاں بھرے بھرے دیوداروں کے کُنج میں ایک قدرتی پہاڑی کھوہ ہے۔ جس کے اندر سے ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایک چشمہ اُبلتا ہے۔ چشمے کے کنارے کھوہ کے اندر ہی جگہ اتنی وسیع ہو کہ اُس میں ہمارا قافلہ بخوبی سما سکتا تھا۔ یہاں پر اندر کی دو چٹانوں کے جُڑ جانے سے ایک طرف ایک قدرتی چولھا سا بن گیا تھا جس کے اندر جلی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے ابھی تک پڑے تھے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس کھوہ کو بیدر واہ کی وادی کی جانب جانے والے لوگ اکثر کام میں لاتے ہیں۔ جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرکے قُلیوں نے کھانا پکایا پھر کھوہ کے فرش پر بستر بچھاکر سب سو گئے۔

رات کو دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ جنگل کا سناٹا کبھی تو اتنا گہرا ہوجاتا کہ ایک بوجھ بن کر سینے پر برف کی طرح جمنے لگتا۔ کبھی اِس کالے سناٹے میں تاریک لبادے اوڑھے ہوئے چند مبہم پُراسرار دُھندلی صورتیں کھوہ سے باہر سر جوڑ کر میری طرف دیکھ دیکھ کر سرگوشیاں کرتی نظر آتیں۔ کبھی جنگل کی ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی دھیرے دھیرے کراہتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ کبھی ہوا کا شور اتنا بڑھ جاتا کہ وہ جنگلی درندوں کی طرح درختوں اور چٹانوں سے جھگڑتی ہوئی معلوم ہوتی۔

رات کو مجھے معلوم نہیں کب میری آنکھ کھلی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کے ٹھنڈے ٹھنڈے نتھنے میرے ماتھے سے مس ہو رہے ہیں۔ کوئی تیز تیز سانسوں سے مجھے سُونگھ رہا ہے۔ کسی کی دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں گہری چمکتی ہوئی مجھے دکھائی دیں لیکن نیند اتنی گہری تھی کہ میں پُورے طور پر جاگ نہ سکا۔ جیسے نیم غنودگی میں یا کسی سپنے میں میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہو۔ صبح اُٹھا تو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ ہاں! جب صبح دَم تیار ہوکر ہمارا قافلہ کوچ کرنے لگا تو مقامی باشندے اور گائیڈ نے جس کا نام متیا تھا، مجھے بتایا کہ پھلوں کی ٹوکری غائب ہے۔ جس میں سیب، بادام اور اخروٹ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے رات کا واقعہ یاد آیا۔ کھوہ کے باہر پنجوں کے نشان بھی ملے جنھیں پہچان کر متیا نے کہا کہ جنگلی ریچھ آیا تھا۔ اِس پر ایک قُلی کو کچھ یاد آیا کہ رات کو کسی وقت مچھروں نے بہت بے چین دکھائی تھی۔ غالباً اُسی وقت ریچھ اندر آیا ہوگا اور پھلوں کی ٹوکری لے گیا ہوگا۔ خیر گزری ریچھ نے کسی پر حملہ نہیں کیا۔ میں چشمِ تصوّر سے اُس ریچھ کو مزے سے سیب کھاتے اور دانتوں سے اخروٹ اور بادام توڑ کر گری نکال کر پھانکتے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بہت چمکدار اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اِس وقت بے حد خوش ہو رہا تھا۔ مجھے یکدم وہ ریچھ بہت پسند آنے لگا۔ اگر مل جاتا تو یقیناً میں اُس سے ہاتھ ملاتا اور ہم دونوں دو پُرانے دوستوں کی طرح بادام اور اخروٹ کی مختلف قسموں پر باتیں کرسکتے تھے۔

دوسری رات مان سہرہ ندی کے کنارے بسر ہوئی۔ گرگون پہاڑ کی دوسری طرف خطرناک اُترائیوں کے بعد مان سہرہ ندی کا چھوٹا سا نیلا پاٹ دکھائی دیتا ہے۔ اِس ندی کے دوسرے کنارے سے بیدر واہ کا پہاڑ شروع ہوتا ہے، جس کے دوسری طرف بیدر واہ کی وادی ہے۔ مان سہرہ ندی کے دونوں جانب گرگون اور بیدر واہ کے جنگل خطرناک گھاٹیوں پر کھڑے ہیں۔ یہاں دن کو بھی شام کی سی کیفیت رہتی ہے۔ گھنے جنگلوں میں دھوپ بھی مُنہ چھپاتی پھرتی ہے اور مان سہرہ ندی اِن دو پہاڑوں کے بیچ میں پگھلی ہوئی برف کا نیلا پیرہن پہنے ہوئے کسی وحشی گوالن کی طرح شور مچاتی ہوئی، گیت گاتی ہوئی، نیچے کی کسی گھاٹی کی طرف گزر جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مان سہرہ ندی کو کسی نے رام نہیں کیا۔ اُس کے کنارے نہ دھان کے کھیت ہیں نہ مکئی کے۔ دونوں کناروں پر دو پہاڑ کھڑے ہوگئے ہیں اور دو خونخوار رقیبوں کی طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں اور اُن دونوں کے بیچ میں مان سہرہ ندی کسی شریر چنچل پہاڑی دوشیزہ کی طرح ہنستی ہوئی، اِٹھلاتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اَن چھوئی کنواری ندی ہے۔ کسانوں نے اِس سے پانی نہیں لیا۔ کھیتوں نے اپنی پیاس نہیں بجھائی۔ اُس کے کنارے کوئی پن چکی بھی نہیں ہے، کوئی گاؤں بھی نہیں ہے۔ دُور نیچے جاکر شاید وہ کہیں بڑی ہوجائے گی۔ یکایک جوان ہوجائے گی۔ جوان کسان اُس سے محبت کریں گے۔ اُس کے ماتھے پر دھان کی بالیوں کا تاج سجائیں گے۔ عورتیں اُس کے کنارے گیت گائیں گی۔ دیئے جلائیں گی۔ پھول نچھاور کریں گی اور مٹّی کی ڈولی میں بٹھاکر اپنے کھیتوں اور گھروں میں لے جائیں گی۔ ابھی تو وہ کنواری ہے!

مان سہرہ ندی کے کنارے گڈریوں کا ایک قافلہ آکے رُکا تھا۔ وہ ہمیں نہیں جانتے تھے۔ ہم انھیں نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی جو کچھ ہمارے پاس تھا ہم نے انھیں دیا۔ جو کچھ اُن کے پاس تھا، اُنھوں نے ہمیں دیا۔ شاید ایک رات کا ملاپ زندگی کے ملاپ سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ کیونکہ کل صبح دونوں اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔ جب جُدائی یقینی ہو تو محبت بڑھ جاتی ہے۔ ایک ایک پل قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ اُس رات سرما اور تامنی نے کھانا پکایا تھا۔ لاڈو اور جمنی نے گیت گائے تھے۔ وہ بڈھا گڈریا جو بانسری بجاتا تھا، مان سہرہ ندی کا باپ معلوم ہوتا تھا۔ پہاڑی گیت میری سمجھ میں نہ آیا تھا لیکن کیا گیتوں کو صرف لفظوں ہی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ تان بھی تو کچھ کہتی ہے۔ وہ شریلی سسکی جو گلے میں ایک ندی کی طرح بہتی ہے ـــــ وہ آنکھیں جو صدیوں پُرانی کہانی کہتی ہیں، جب مرد اور عورت کے درمیان صرف ایک پاک جذبہ ہوتا تھا اور بیچ میں کوئی بینک نہ ہوتا تھا، کوئی جہیز نہ ہوتا تھا، کوئی کسی سے یہ نہ پوچھتا تھا کہ میں نے تجھے کیا دیا اور تُو نے مجھ سے کیا لیا ـــــ؟ اُن کے ساتھ گیت گاتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کبھی گہرے پاتال میں اُترتے ہوئے مجھے عجیب سی قُربت کا احساس ہوا۔ ہمیشہ مجھے اجنبیوں کے ساتھ ایسی گہری قُربت کا احساس کیوں

گھر میں ہر طرح سے فراغت تھی۔ میرے والد نے مجھے جائیداد سنبھالنے کے کام میں لگانا چاہا۔ لیکن میرا دل اُس میں بھی نہ لگا۔ پھر میں نے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی لیکن ہر راگ، راگنی کے اصول میرے ذہن میں بیڑیاں بن کر جم گئے۔ پھر میں نے عورتوں سے پیار کرنا چاہا۔ لیکن ہر لڑکی کا چہرہ بہت مانوس اور پُرانا سا معلوم ہوا جیسے برسوں سے میں اُس کی ہر خواہش اور دل کے ہر راز کو جانتا ہوں۔ کہیں مجھے وہ اجنبیت نہ ملی جو مجھے پُراسرار راہوں پہ لے جاتی۔ پھر میں نے کتابوں میں دل لگانا چاہا اور اپنے والد کی وسیع لائبریری میں سینکڑوں ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ہر کتاب ایک پُراعتماد مرد کی طرح اپنے آپ میں مکمل اور پُرغرور دکھائی دی۔ ہر کتاب کسی شہری حسینہ کی طرح بہترین میک اپ سے آراستہ بہترین ملبوس میں جگمگاتی ہوئی ہزار عشوے دکھاتی ہوئی معلوم ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا، ہر کتاب ہاتھ میں جھاڑو لئے کھڑی ہے اور زبردستی میرے دماغ کے ہر جالے کو صاف کرے گی۔ میں کتابوں سے بھاگ نکلا اور پہلے سے بھی زیادہ اپنے خوابوں میں پناہ لینے لگا۔

پھر مجھے رنگ مل گئے ——!

اور جب مجھے رنگ ملے تو میری دُنیا ہی بدل گئی۔ کاغذ کی سطح یکایک ایزل سے غائب ہو گئی اور رنگ ہی رنگ رہ گئے۔ رنگ جو آپس میں جب مل جاتے تھے تو اور ہی رنگ پیدا کر دیتے تھے۔ میں کاغذ پر اپنی دُنیا کو ایک نقطے کی طرح چھوٹا کر سکتا تھا اور کائنات کی طرح وسیع! یہ رنگ جو دو گلابی چرن کملوں کی طرح ناچتے تھے اور مجھے مسحور کرتے تھے۔ یہ رنگ جو کبھی پھولوں کی طرح مہکتے تھے اور کبھی کسی انجانی راگنی کی طرح سُنائی دینے لگتے تھے۔ اِن رنگوں کی دُنیا بہت پُراسرار اور اجنبی تھی اور اِس راستے پر ہر اگلا قدم پہلے سے مختلف تھا —— ہر موڑ الگ اور ہر صورت دیکھی ہوئی صورتوں سے الگ، اِن رنگوں کے اندر میں جتنا اُترتا گیا، اُتنی ہی گہرائی مجھے اور ملتی گئی —— میں رنگوں میں ڈوب گیا!

میرا باپ میری تصویروں کو سمجھ نہ سکا کیونکہ وہ ایک عملی آدمی تھا۔ وہ حقیقت کے شیشے کے شفاف فانوس کی چکنی سطح پر اپنے پر پھیلائے لیٹا تھا۔ اُس نے فانوس کے اندر جا کر جلتی ہوئی روشنی سے کبھی اپنے پر جلائے نہ تھے اور وہ وہی آرام دہ قسمت اپنے بیٹے کو عطا کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ کوئی دوسری زندگی جانتا ہی نہ تھا اور جو سکون اور خوشی وہ جانتا تھا، وہی اپنے بیٹے کو دینا چاہتا تھا۔ اُس کی نیت اچھی تھی اور اسی طرح تمام اچھی نیتوں کے دروازے جہنم میں کھلتے ہیں۔

میرے پتا جی نے میرا رجحان دیکھ کر مجھے محکمۂ آثارِ قدیمہ میں ملازمت دلوا دی۔ میرا کام پُرانے آثار کی دیکھ بھال کے علاوہ اُن کی تصویریں بنانا بھی تھا اُن کے مختلف حصّوں کی اور اُن جگہوں کی بھی، جہاں جہاں پُرانی گلکاری، چتّرکاری کے نمونے ملتے تھے، پُرانے اسٹائل کی تصویریں دیواروں پر کندہ تھیں اور جو اب امتدادِ زمانہ سے معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ اِس کام میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی اور میرا شوق اس کام کے لئے کافی ہو گیا۔ رفتہ رفتہ پُرانے آثار سے مجھے گہری دلچسپی محسوس ہونے لگی اور میرے وقت کا زیادہ حصّہ اُنہی کی دیکھ بھال، مصوری اور خاک زمین میں گُزرنے لگا۔ میرے لئے ارد گرد کی دُنیا نامانوس ہوتی گئی اور ماضی کے نقش زیادہ مانوس اور جانے پہچانے نظر آنے لگے اور میں پہلے سے بھی زیادہ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ماضی کے نقش میرے لئے ہر دم زندہ اور متحرک ہو کر سامنے آنے لگے۔ میرے والد نے مجھے رِشتۂ ازدواج میں باندھنے کی بہت کوشش کی۔ دو تین جگہ میری شادی کی بات بھی چلائی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میرے ماں باپ تھک ہار کر چُپ ہو گئے۔ اُنھوں نے اُمید تو نہیں چھوڑی۔ ہاں اِتنی تسلّی اُنھیں ضرور تھی کہ لڑکا کام سے لگ گیا ہے۔ نوکری کرتا ہے۔ دن رات اپنے کام میں منہمک رہتا ہے۔ اُس کے افسر اُس سے بے حد خوش ہیں۔ اِن پانچ سالوں میں اُسے دو بار ترقّی مل چکی ہے اور وہ اپنی غیر معمولی استعداد اور کارکردگی سے اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ لا کر اپنی ماں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ کسی طرح کی آوارگی یا بدچلنی کے آثار اُس میں نہیں پائے جاتے۔ تسلّی کے لئے یہ بہت تھا۔

۱۹۵۸ء کے جون کے پہلے ہفتے میں مجھے محکمے کی طرف سے بیدرواہ جانے کا حکم ملا۔ بیدرواہ کی ہمالیائی وادی میں محکمہ نے کچھ نئے آثار دریافت کئے تھے جن میں کانگڑہ اسکول کی مصوری کے کچھ نادر نمونے ملے تھے۔ محکمے نے مجھے اُن نئی تصویروں کی رنگین نقلیں اُتارنے کے لئے بھیجا۔ کام بے حد اہم تھا لیکن میرے شوق کے عین مطابق تھا۔ محکمے کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی۔ اِس سے میں بھی خوش تھا، میرے گھر والے بھی۔ بہت جلد ضروری ساز و سامان سے لیس ہو کر مجھے روانہ کر دیا گیا۔ چلتے وقت ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ کیونکہ راستہ پہاڑی اور دُشوار گُزار تھا اور مجھے کئی ماہ گھر سے باہر رہنا تھا۔

اودھم پور تک ریل جاتی ہے۔ اودھم پور سے تیراہ تک بس جاتی ہے۔ آگے بس بھی نہیں جاتی! تیراہ کے قصبے میں آخری پولس چوکی اور ڈاک خانہ ہے۔ تیراہ سے بیدرواہ کا گاؤں بیس میل کی دُوری پر ہے۔ دُشوار گُزار گھاٹیوں پر گھنے جنگل کھڑے ہیں اور پُرشور تیز رفتار کہستانی ندیوں کو پیدل چل کر عبور کرنا پڑتا ہے۔ راستے میں نہ کوئی پُل ہے، نہ سڑک۔ بس جنگلی راستے میں گڈریوں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں ہیں، جن پر خچر بھی مشکل ہی سے باربرداری کے کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ میں نے تیراہ کے قصبے سے دو خچروں پر سامان لادا۔ دو مزدور ساتھ تھے اور ایک مقامی باشندے کو بطور گائیڈ اپنے ساتھ لیا اور بیدرواہ کی گھاٹی کا سفر پیدل اختیار کیا۔

پہلی رات تہراوا سے ساٹھ میل دُور گرٹون کے پہاڑ کی چوٹی کے قریب کاٹی جہاں جنگل ختم ہو چکا ہے اور گرٹون کی برف پوش چوٹی کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ وہاں ہرے ہرے دیوداروں کے گھنے جنگل میں ایک قدرتی پہاڑی کھوہ ہے۔ جس کے اندر سے ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایک چشمہ اُبلتا ہے۔ چشمے کے کنارے کھوہ کے اندر ہی جگہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں ہمارا قافلہ بخوبی سما سکتا تھا۔ یہاں پر اندر کی دو چٹانوں کے جُڑ جانے سے ایک طرف ایک قدرتی چولھا سا بن گیا تھا جس کے اندر جلی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے ابھی تک پڑے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کھوہ کو بیدر واہ کی وادی کی جانب جانے والے لوگ اکثر کام میں لاتے ہیں۔ جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے قلیوں نے کھانا پکایا پھر کھوہ کے فرش پر بستر بچھا کر سب سو گئے۔

رات کو دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ جنگل کا سناٹا کبھی تو اتنا گہرا ہو جاتا کہ ایک بوجھ بن کر سینے پر برف کی طرح جمنے لگتا۔ کبھی اس کالے سناٹے میں تاریک لبادے اوڑھے ہوئے چند مبہم پُراسرار دُھندلی دُھندلی صورتیں کھوہ سے باہر سر جوڑ کر میری طرف دیکھ دیکھ کر سرگوشیاں کرتی نظر آتیں۔ کبھی جنگل کی ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی دھیرے دھیرے کراہتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ کبھی ہوا کا شور اتنا بڑھ جاتا کہ وہ جنگلی درندوں کی طرح درختوں اور چٹانوں سے جھگڑتی ہوئی معلوم ہوتی۔

رات کو مجھے معلوم نہیں کب میری آنکھ کھلی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی کے ٹھنڈے ٹھنڈے نتھنے میرے ماتھے سے مس ہو رہے ہیں۔ کوئی تیز تیز سانسوں سے مجھے سونگھ رہا ہے۔ کسی کی دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں گہری چمکتی ہوئی مجھے دکھائی دیں لیکن نیند اتنی گہری تھی کہ میں پورے طور پر جاگ نہ سکا۔ جیسے نیم غنودگی میں یا کسی سپنے میں میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہو۔ صبح اٹھا تو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ ہاں! جب صبح دم تیار ہو کر ہمارا قافلہ کوچ کرنے لگا تو مقامی باشندے اور گائیڈ نے جس کا نام متیا تھا، مجھے بتایا کہ پھلوں کی ٹوکری غائب ہے جس میں سیب، بادام اور اخروٹ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے رات کا واقعہ یاد آیا۔ کھوہ کے باہر پنجوں کے نشان بھی تھے جنھیں پہچان کر متیا نے کہا کہ جنگلی ریچھ آیا تھا۔ اس پر ایک قلی کو کچھ یاد آیا کہ رات کو کسی وقت ٹٹوؤں نے بہت بے چینی دکھائی تھی۔ غالباً اسی وقت ریچھ اندر آیا ہوگا اور پھلوں کی ٹوکری لے گیا ہوگا۔ خیر گزری ریچھ نے کسی پر حملہ نہیں کیا۔ میں چشمِ تصور سے اس ریچھ کو مزے سے سیب کھاتے اور دانتوں سے اخروٹ اور بادام توڑ کر گری نکال کر پھانکتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت چمکدار اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اس وقت بے حد خوش ہو رہا تھا۔ مجھے یکدم وہ ریچھ بہت پسند آنے لگا۔ اگر مل جاتا تو یقیناً میں اس سے ہاتھ ملاتا اور ہم دونوں دو پرانے دوستوں کی طرح بادام اور اخروٹ کی مختلف قسموں پر باتیں کر سکتے تھے۔

دوسری رات مان سہرہ ندی کے کنارے بسر ہوئی۔ گرٹون پہاڑ کی دوسری طرف خطرناک اُترائیوں کے بعد مان سہرہ ندی کا چھوٹا سا نیلا پاٹ دکھائی دیتا ہے۔ اس ندی کے دوسرے کنارے سے بیدر واہ کا پہاڑ شروع ہوتا ہے، جس کے دوسری طرف بیدر واہ کی وادی ہے۔ مان سہرہ ندی کے دونوں جانب گرٹون اور بیدر واہ کے جنگل خطرناک گھاٹیوں پر کھڑے ہیں۔ یہاں دن کو بھی شام کی سی کیفیت رہتی ہے۔ گھنے جنگلوں میں دھوپ کبھی منہ چھپاتی پھرتی ہے اور مان سہرہ ندی ان دو پہاڑوں کے بیچ میں پگھلی ہوئی برف کا نیلا پیرہن پہنے ہوئے کسی وحشی غزالن کی طرح شور مچاتی ہوئی، گیت گاتی ہوئی، نیچے کی کسی گھاٹی کی طرف گزر جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مان سہرہ ندی کو کسی نے رام نہیں کیا۔ اس کے کنارے نہ دھان کے کھیت ہیں نہ مکئی کے۔ دونوں کناروں پر دو پہاڑ کھڑے ہوگئے ہیں اور دو خونخوار رقیبوں کی طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں مان سہرہ ندی کسی شریر چنچل پہاڑی دوشیزہ کی طرح ہنستی ہوئی، اٹھلاتی ہوئی گزر رہی ہے۔ ان چھوئی کنواری ندی ہے۔ کسانوں نے اس سے پانی نہیں لیا۔ کھیتوں نے اپنی پیاس نہیں بجھائی۔ اس کے کنارے کوئی پن چکی بھی نہیں ہے، کوئی گاؤں بھی نہیں ہے۔ دُور نیچے جا کر شاید وہ کہیں بڑی ہو جائے گی۔ یکایک جوان ہو جائے گی۔ جوان کسان اس سے محبت کریں گے۔ اس کے ماتھے پر دھان کی بالیوں کا تاج سجائیں گے۔ عورتیں اس کے کنارے گیت گائیں گی۔ دیئے جلائیں گی۔ پھول تیرائیں گی اور مٹی کی ڈولی میں بٹھا کر اپنے کھیتوں اور گھروں میں لے جائیں گی۔ ابھی تو وہ کنواری ہے!

مان سہرہ ندی کے کنارے گڈریوں کا ایک قافلہ آ کے رُکا تھا۔ وہ ہمیں نہیں جانتے تھے۔ ہم انھیں نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی جو کچھ ہمارے پاس تھا ہم نے انھیں دیا۔ جو کچھ ان کے پاس تھا، انھوں نے ہمیں دیا۔ شاید ایک رات کا ملاپ زندگی کے ملاپ سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ کیونکہ کل صبح دونوں اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔ جب جدائی یقینی ہو تو محبت بڑھ جاتی ہے۔ ایک ایک پل قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ اس رات سرمیا اور تامسی نے کھانا پکایا تھا۔ لاڈو اور چمپی نے گیت گائے تھے۔ وہ بڈھا گڈریا جو بانسری بجاتا تھا، مان سہرہ ندی کا باپ معلوم ہوتا تھا۔ پہاڑی گیت میری سمجھ میں نہ آیا تھا لیکن کیا گیتوں کو صرف لفظوں ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ تان بھی تو کچھ کہتی ہے۔ وہ سُریلی سسکی جو گلے میں ایک ندی کی طرح بہتی ہے ـــــ وہ آنکھیں جو صدیوں پرانی کہانی کہتی ہیں، جب مرد اور عورت کے درمیان صرف ایک پاک جذبہ ہوتا تھا اور بیچ میں کوئی بینک نہ ہوتا تھا، کوئی جہیز نہ ہوتا تھا، کوئی کسی سے یہ نہ پوچھتا تھا کہ میں نے تجھے کیا دیا اور تو نے مجھ سے کیا لیا ـــــ؟ ان کے ساتھ گیت گاتے ہوئے، کھانا کھاتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی گہرے پاتال میں اُترتے ہوئے مجھے عجیب سی قربت کا احساس ہوا۔ ہمیشہ مجھے اجنبیوں کے ساتھ ایسی گہری قربت کا احساس کیوں

ہوتا ہے۔ اُن سانولیوں کی ہنسی میرے اتنے نزدیک کیسے ہوگئی تھی۔ اچھا ہوا صبح سویرے میرے جاگنے سے پہلے ہی اُن کا قافلہ اُٹھ کر چلا گیا اور میرے لئے ایک رات کی ایسی یاد چھوڑ گیا جو شاید میں نے کسی دوسری زندگی میں انجان جزیرے پر گزاری تھی۔ ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے، جیسے میرا اُن کا کوئی گہرا سمبندھ تھا، جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ناممکن ہے!

دوسرے دن ہم بیدرواہ پہاڑ کی دوسری طرف اپنی منزل کے لئے روانہ ہوئے لیکن دل رہ رہ کر مان سہرو کی اُسی ندی کے کنارے پہنچ جاتا تھا، جسے ہم اب بہت دُور نیچے چھوڑ آئے تھے۔ بیدرواہ کے اطراف کا جنگل بہت گھنا ہے اور بہت پُرانا بھی اور انسانوں کی روزمرّہ کی آمد و رفت سے بہت دُور بھی معلوم ہوتا ہے۔ جن بے خوف نگاہوں سے جنگل کے جانور ہمیں دیکھتے تھے، وہ نگاہیں ہمیں یہ بتا دینے کے لئے کافی تھیں کہ اِس جنگل میں سرکار کی طرف سے شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ یہ نظر میں انسان کی درندگی سے ابھی تک ناآشنا تھیں۔ دل کو ایک عجیب طرح کا سکون سا محسوس ہوا۔

خیال تھا کہ دوپہر تک ہم اپنی منزل تک جا پہنچیں گے لیکن جنگل اِتنا گھنا اور راستہ اِتنا دشوار گزار تھا کہ دوپہر تک بہت مشکل سے بیدرواہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ سکے۔ چوٹی پر پہنچ کر بیدرواہ کی وادی کا حسین منظر دکھائی دیا۔ یہاں آکر پہاڑوں کی مٹھی کھل سی گئی تھی اور اُن پہاڑوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی وادی ہتھیلی کی طرح کھلی نظر آتی تھی۔ اِس ہتھیلی میں دو پتلی پتلی ندیاں قسمت کی لکیروں کی طرح دھان کے کھیتوں میں پھیلتی ہوئی شمال سے آکر جنوبی کنارے سے مل جاتی تھیں۔ دو جگہ ملتی تھیں۔ ایک تو وادی کے بیچ میں جہاں ایک اونچا ٹیلہ تھا اور اُس ٹیلے پر ایک پُرانا راجپوتی وضع کا قلعہ نظر آ رہا تھا۔ دونوں ندیاں اِس ٹیلے کے گرد طواف کرتی ہوئی مِل جاتی تھیں اور مِل کر پھر الگ ہو کر دھان کے کھیتوں میں بکھر جاتی تھیں۔ پھر جنوب کی جانب ملتی تھیں۔ یہاں پر دونوں ندیوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا جزیرہ بن گیا تھا۔ جس کے اندر درختوں سے گھرا ہوا ایک پُرانا مندر نظر آتا تھا۔ اِس وقت دھوپ میں اُس کا پیتل کا کلس سونے کی طرح جگمگا رہا تھا۔ دھان کے کھیتوں کے پار گھاٹی پر بیدرواہ کا چھوٹا سا گاؤں آباد تھا اور اُس کے شمالی جانب پہاڑی سلسلے کے اندر کالے کالے دھبوں کی طرح غار معلوم ہو رہے تھے۔ یہ غالباً وہی غار تھے جن کی رنگین نقلیں لینے کے لئے مجھے تہذیب اور ترقّی کے جدید ٹھکانوں سے اِتنی دُور بھیجا گیا تھا۔ اِن غاروں کے متعلق متیا سے پُوچھنے پر میرا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔

لیکن اِتنی دُوری اور بلندی سے دیکھنے پر مجھے سب سے قابلِ دید جگہ وہی محسوس ہوئی، جہاں ایک اونچے ٹیلے پر وہ راجپوتی قلعہ کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ قلعہ پُوری وادی کے ماحول پر چھایا ہوا ہے۔ قلعے کی دیواریں بہت پرانی معلوم ہوتی تھیں۔ جن پر گہری کائی جمی ہوئی تھی جس سے قلعے کی رنگت پتھریلی دکھائی دینے کی بجائے سیاہی مائل سبز دکھائی دیتی تھی۔ جیسے یہ قلعہ کسی پہاڑ جھاڑ کی طرح درختوں، پودوں اور انگور کی لٹکتی ہوئی بیلوں کے ساتھ ساتھ قدرتی طور پر ٹیلے کی کوکھ سے اُبھر آیا ہو اور جیسے اُس کی تخلیق میں کسی انسانی ہاتھ یا اُس کے ذہن کا شائبہ تک نہیں۔ یہ قلعہ اِتنی دُور سے دیکھنے پر بھی دل میں ایک عجیب سحر آمیز کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

میرے پُوچھنے پر متیا نے بتایا۔

"یہ بہت پُرانا قلعہ ہے صاحب! آدھے سے زیادہ گر چکا ہے۔ کہتے ہیں، مغلوں کے زمانے میں پرماروں کے خاندان کی ایک شاخ کے سربراہ نے بھاگ کر اِسی وادی میں پناہ لی تھی اور اُس نے یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اب اُس خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں ہے۔ انگریزوں کے وقت میں اِس قلعہ کی مرمّت ہوتی رہتی تھی کیونکہ کئی من چلے انگریز شکار کے شوق میں اِدھر آنکلتے تھے۔ وہ لوگ اکثر قلعے ہی میں آکر ٹھہرا کرتے تھے۔ لیکن آزادی کے بعد کسی کو اُس کی مرمّت کا خیال نہیں آیا۔ چند سالوں سے سرکار نے اِدھر توجہ دی ہے اور قلعے کا جو حصّہ گرنے سے بچ گیا ہے، اب اُس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے لیکن وہ پہلی سی بات اب کہاں؟ جب گھر کا مالک ہی نہ رہے تو گھر کب تک چلے گا سرکار۔ جو ہے، دھیرے دھیرے وہ بھی ڈھ جائے گا لیکن گرتے گرتے بھی اِسے ابھی سو ڈیڑھ سو سال تو لگیں گے!

دوپہر شباب پر تھی۔ ساری وادی میں دُھوپ کا سنہرا رنگ چمک رہا تھا۔ وادی ایک حسین مرغزار کی طرح امن اور سکون کے ماحول میں رچی بسی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں بیدرواہ کو پسند کر لیا۔ پھر متیا نے مرقبانوں اور قلیوں کو اشارہ کیا اور ہمارا قافلہ نیچے وادی کی طرف چل نکلا۔

سورج ڈوبتے ڈوبتے ہم وادی میں داخل ہو گئے۔ دھان کا سبزہ آنکھوں میں گھبا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ درختوں کے گنج آدمیوں کی ٹولیوں کی طرح سر جوڑے کھڑے تھے اور اجنبی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ قلعے میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں لکڑی کے ایک چھوٹے سے پُل پر چلنا پڑا۔ پُل پار کر کے ایک اُبھری ہوئی چٹان کی بڑی اوٹ کے پیچھے قلعے کا دروازہ تھا۔ جب ہم قلعے کے اندر گئے تو ایک دم باہر کی دُنیا غائب ہو گئی۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا چھا گیا اور پُرانے مکانوں کی ایک عجیب سی بُو میرے نتھنوں میں آنے لگی۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ پھر جب چند ثانیوں کے بعد کھلیں تو معلوم ہوا کہ ہم قلعے کے ایک بہت بڑے ہال میں کھڑے ہیں۔ جس کی دیواروں پر جگہ جگہ شیر، چیتے، بارہ سنگھے کے سر آویزاں ہیں۔ ہال کے مرکز میں

لکڑی کا ایک بہت بڑا ستون کھڑا تھا اور جب چھت پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا پتھر کی چھت کے اندر کسی مضبوط لکڑی کی ایک اور چوبی چھت کی تہہ جمائی گئی ہے، جس کے دُھندلے دُھندلے جالوں کے اندر پُرانی چوبکاری کے نقش معدوم سے ہوتے نظر آتے ہیں۔

میں ابھی اِتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ سامنے سے ہال کی سیڑھیوں پر جو اوپر کی منزل کو جاتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، ایک آدمی ہاتھ میں لالٹین لئے نمودار ہوا۔ ہمیں دیکھ کر چند لموں کے لئے رُکا۔ پھر متیا کو پہچان کر جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ یہ قلعے کا رکھوالا۔ باورچی، اردلی اور بیرا سبھی کچھ تھا۔ عمر پینتالیس برس کے قریب تھی۔ پہلی نظر میں جب وہ مجھے زینے کے اوپر کھڑا ہوا نظر آیا تھا تو مجھے اُس کی گھنی بھوؤں کے نیچے اُس کی آنکھیں بے چین دکھائی دی تھیں اور شانے چوڑے اور سینہ مضبوط! کسی جنگلی گوریلے کی طرح" لیکن نہ جانے مجھ پر یہ تاثر کیوں کر ہوا۔ جب وہ قریب آیا تو دوسری ہی نظر میں سب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ اُس کے شانے جُھکے ہوئے تھے۔ اِتنے جُھکے ہوئے کہ اُس کے سینے کی مضبوطی کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا اور اُس کی مونچھوں کے نیچے اور جُھکے ہوئے کونوں سے برسوں کی پُرانی عاجزی، اور وفاداری اور جی حضوری کا اظہار ہوتا تھا! اور جب متیا نے اُسے بتایا کہ میں کون ہوں اور کس کام سے آیا ہوں تو اُس نے لالٹین فرش پر رکھ کر اور خود جُھک کر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر مجھے بہت عاجزی سے سلام کیا۔ اور میرے لئے غُسل کا پانی گرم کرنے کے لئے چلا گیا۔

اُس کے جانے کے بعد متیا نے مجھے بتایا "یہ شنکر ہے۔ بہت پُرانا بیرا ہے۔ انگریزوں کے زمانے سے کام کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں بیس پچیس برس ہو گئے ہیں، اِسے یہاں کام کرتے ہوئے۔ اپنا کام خوب جانتا ہے۔ صاحب لوگ اِس سے بہت خوش رہتے تھے ——— پر تھوڑا لالچی ہے!"

"تھوڑا سا لالچی تو ہر ایک کو ہونا چاہئے!" میں نے کہا۔

پھر میں بات کا رُخ بدل کر متیا اور قلیوں اور مرقبانوں کا حساب کرنے لگا۔ حساب چکانے کے بعد میں نے متیا کو پانچ روپے اور سب کو دو دو روپے بخشش دی۔ اُس کے بعد سب نے مجھے سلام کیا اور مُڑ کر قلعے کے باہر جانے کے لئے قدم بڑھانے لگے۔

اندھیرا گہرا ہو چلا تھا۔ میں نے متیا کو آواز دی "رات بڑھ رہی ہے۔ اِس وقت کہاں جاؤ گے۔ یہیں سو جاؤ۔ قلیوں اور مرقبانوں سے بھی کہہ دو۔"

وہ میری بات سُن کے چونکے۔ ایک دوسرے کی طرف چُپ چاپ دیکھنے لگے۔ متیا کچھ گھبرا کر کچھ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"نہیں صاحب! اب ہم جائیں گے!"

"لیکن کہاں جاؤ گے اِس وقت؟"

"نیچے گاؤں میں!" ایک قلی بولا۔

"تو نیچے گاؤں میں جانے کی بجائے یہیں سو رہو۔ کھانا بھی ملے گا" میں نے کہا۔

میں نے دیکھا، کھانے کے ذکر سے قلی لوگ تھوڑے سے ڈگمگائے لیکن پھر گھبرا کر اُنھوں نے اور متیا نے اور مرقبانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر اُن سب نے ایک ساتھ انکار میں سر ہلا دیا۔

"اب ہم کو چھٹی دو صاحب!" متیا بہت عاجزی سے بولا۔

"اچھا۔ جیسی تمھاری مرضی" میں نے اُن کا ارادہ دیکھ کر اُنھیں اجازت دے دی۔ وہ لوگ جلدی جلدی "سلام صاحب، رام رام صاحب!" کہہ کر رخصت ہوتے گئے اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے قلعے کے ہال سے باہر نکل گئے۔ سب سے آخر میں متیا رہ گیا اور مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن پھر جیسے دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور مجھ سے کچھ اور کہے بغیر وہ بھی "رام رام" کہہ کر چلا گیا، اور میں اُس پُرانے قلعے کے سُونے ہال میں اکیلا رہ گیا۔

اُن کے جانے کے بعد مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لوگ جلد سے جلد اِس قلعے سے باہر نکلنے کے لئے بے تاب تھے لیکن اُن کی گھبراہٹ اور بے تابی میری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ تین دن تک ہم لوگوں کا ساتھ رہا تھا اور اِس وقت میں نے جو اُن لوگوں کو یہاں رُک جانے کے لئے کہا تھا تو رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی، سردی اور جنگل کی قُربت کو دیکھتے ہوئے ازراہِ انسانیت کہا تھا ورنہ اُنھیں ایک رات کے لئے قلعے میں رکھنے اور اپنی جیب سے کھانا کھلانے میں میرا کیا فائدہ تھا؟ لیکن یہ پہاڑی لوگ کچھ عجیب سے ہوتے ہیں ——— خیر ٹھیک ہے۔ چھوڑو ———!

اِتنا سوچ کر میں نے اپنے سامان کی طرف توجہ کی۔ دیکھ لوں، سب ٹھیک ہے۔ کسی خچر والے مرقبان یا قلی نے کچھ مار تو نہیں لیا؟ ——— سب سامان ٹھیک تھا۔ اِدھر سے اطمینان کرنے کے بعد میں نے ہال میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ اِتنے بڑے ہال میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ میرے سامنے پتھر کی سیڑھیوں کا ایک زینہ تھا۔ جو گھوم کر شاید قلعہ کی پہلی منزل کو جاتا تھا۔ میں ایک سیڑھی پر اوپر کی منزل کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا تاکہ نظر سامنے قلعہ کے دروازے اور ہال میں پڑے ہوئے سامان پر رہے۔

مجھے اکیلے پن سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ اندھیرا اور سناٹا دونوں ایک دوسرے کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی اِس قلعہ کے ماحول میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جو میرے دل میں بیزاری پیدا کر رہی تھی۔ ہر عمارت کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ یہ عمارتیں انسانی ہاتھوں ہی کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں لیکن جب بن جاتی ہیں تو اپنی ایک الگ شخصیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جانداروں کی طرح اُن کا اپنا ایک منفرد اور الگ تاثر ہوتا ہے جو دل و دماغ

پر غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کبھی یہ تاثر اچھا مرتب ہوتا ہے کبھی بُرا۔ پہلے تاثرات جو اس قلعے کے ماحول نے مرتب کئے، وہ ایک عجیب طرح کی ناپسند اور بیزاری کے تھے۔ حالانکہ میں نے ابھی قلعہ کا ایک ہی ہال دیکھا تھا اور میں اس کے دوسرے حصوں سے ناواقف تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا ایسا کیوں ہے؟ لیکن اس وقت میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ طویل سفر کی بیزار کن پریشانی اور تھکن سے ہو۔ پہلی بار کسی اجنبی ماحول میں آنے سے ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ میں نے اس خیال کو جھٹک دیا اور اپنی نگاہیں سامنے کی دیوار پر جما دیں۔ جہاں کی تاریکی میں مجھے بارہ سنگھے کا ایک بڑا سر اپنے لمبے لمبے سینگ اٹھائے ہوئے مبہم اور تاریک آنکھیں کھولے مدھم مدھم سا نظر آ رہا تھا۔

یکایک جیسے اس بارہ سنگھے کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی اور وہ بڑی بڑی آنکھیں آہستہ آہستہ روشن ہو کر شعلے کی طرح چمکنے لگیں۔ میں چونک گیا اور غور سے اس بارہ سنگھے کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اُن آنکھوں میں واقعی روشنی پیدا ہو رہی تھی اور وہ مُردہ بے جان آنکھیں بتدریج سُرخ ہوتی جا رہی تھیں!

میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا جے سکا جارہ گیا۔ آنکھیں بارہ سنگھے کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔ اتنے میں میرے پیچھے آہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور میں گھبرا کر سیڑھیوں سے اُٹھ کر جو مُڑا تو ایک تیز ٹارچ کی شعاع نے میری آنکھوں کو چُندھیا دیا۔ پھر میرے کانوں میں جیسے کسی گہرے کنویں میں ڈوبتی ہوئی آواز آئی۔

"غُسل کا پانی تیار ہے صاحب!"

یہ شنکر تھا، جو زینے کی سب سے اوپر کی سیڑھی پر ٹارچ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

بہت مشکل سے چیخ میں نے اپنے حلق میں روکی۔ شنکر میرے سامنے قلعہ کے دروازے سے باہر گیا تھا۔ یہ میرے پیچھے کدھر سے آنکلا؟ میری حیرت بڑھ گئی لیکن میں نے اپنی حیرت اور گھبراہٹ پر فوراً قابو پالیا اور کچھ کہے سُنے بغیر اوپر کی منزل کو جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر چڑھ کر، گھوم کر نیچے ہال میں دیکھا تو گُھپ اندھیرا تھا۔ بارہ سنگھے کی آنکھیں بے جان، مُردہ اور تاریکی میں کھوئی ہوئی تھیں۔ غالباً ٹارچ کی روشنی اُن آنکھوں میں پڑی تھی جس سے معاً وہ آنکھیں مجھے چند لمحوں کے لئے زندہ اور سُرخ ہوتی نظر آئی تھیں۔ یہ سوچ کر میرے دل کو اطمینان ہوا اور میں خاموشی سے شنکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

زینے سے گزر کر ہم ایک چوبی غلام گردش میں سے گزرنے لگے۔ رات کے سناٹے میں لکڑی کے تختوں پر ہمارے قدموں کی آواز کی گونج بے حد گمبھیر، عجیب اور ہولناک معلوم ہو رہی تھی۔ پھر غلام گردش دائیں کو گھوم گئی، ہم بھی گھوم گئے۔ پھر غلام گردش بائیں کو گھوم گئی، ہم بھی گھوم گئے۔ چلتے چلتے ایک کمرے کے قریب جا کر شنکر رُکا۔ پٹ کھلا تھا اور اندر سے لالٹین کی روشنی جھانک رہی تھی۔

لالٹین کی لرزتی ہوئی جھلملاتی ہوئی روشنی میں میں نے اس کمرے کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ چھت منقش لکڑی کی تھی۔ فرش بھی لکڑی کا تھا [illegible] نصف حصے تک ساگون کے چوبی تختے جڑے ہوئے تھے جن کا [illegible] پالش اب سیاہ ہو چلا تھا۔ ایک کونے میں ساگون کا بڑا پلنگ تھا۔ ایک کمرے [illegible]۔ دو آرام کرسیاں، ایک لمبی تپائی جس پر چینی کا ایک گلدان پڑا تھا۔ مغربی جانب ایک کھڑکی تھی جس پر گہرے مٹیالے رنگ کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف سامان رکھنے کا چوبی ریک تھا۔ جنوبی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو باتھ روم میں کھلتا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے مُدت سے جھاڑا پونچھا نہیں گیا ہے۔

شنکر نے معذرت کرتے ہوئے کہا "صاحب کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی ورنہ آپ کو سب ٹھیک ٹھاک ملتا۔ میں نے غسل خانے میں گرم پانی رکھ دیا ہے اور ٹھنڈا پانی بھی۔ دو بالٹیاں کافی ہوں گی ——؟"

"کافی ہوں گی!" میں نے کہا۔

"صاحب غُسل سے فارغ ہو لیں۔ جب تک میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

شنکر یہ کہہ کر چُپ ہو گیا۔ پھر ایک تیز نگاہ مجھ پر ڈالی۔ جیسے میرا عندیہ معلوم کرنا چاہتا ہو۔ پھر بولا۔

"صاحب کیا ڈنر لیں گے۔ ویجی ٹیرین یا نان ویجی ٹیرین ——؟"

"میں سب کچھ کھاتا ہوں۔ جو کچھ آسانی سے مل سکے کھلا دو۔"

"بہت اچھا سرکار!" کہہ کر شنکر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں میرا سامان اُٹھا کر لایا۔ پھر ڈنر تیار کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے اپنا سامان کھولا۔ نہانے کا سامان نکالا پھر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باتھ روم کی طرف چلا۔ نیا تولیہ، قمیص، پائجامہ باتھ روم کے اندر والے باتھ اسٹینڈ پر رکھا اور ٹب میں بیٹھ کر نہانے لگا۔ دیوار پر میرے سامنے میرا لمبا بے ڈھنگا تاریک سایہ بھی بڑے مضحکہ خیز انداز سے نہاتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور میری ہر حرکت کی نقل کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جب میں جگ اُٹھاتا، وہ بھی اُٹھاتا۔ میں ہاتھ روک دیتا، وہ بھی روک دیتا۔ میں سر پر پانی ڈالتا وہ بھی ڈالتا۔ میں جسم کو رگڑ کے جھانویں سے ملنے لگتا، وہ بھی ملنے لگتا۔ میں اس کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے معاً رُک گیا، وہ بھی رُک گیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا، فوراً کوئی ایسی حرکت کر کے پیش قدمی کر جاؤں جو یہ سایہ اُسی لمحے نہ کر سکے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میری ذرا سی حرکت پر وہ بھی ہلنے لگتا۔ جیسے وہ بھی ہر پیش بندی کے لئے تیار ہو۔ آدمی چاند کو فتح کر سکتا ہے لیکن اپنے سائے کو شکست نہیں دے سکتا!

نہا دھو کر بالوں میں کنگھی کر کے شب خوابی کے کپڑے پہن کر میں ڈنر کے لئے تیار ہو گیا۔ غسل کرنے سے بدن تو ہلکا ہو گیا تھا لیکن آنکھیں غنودگی کے بارے بھاری ہونے لگی تھیں۔ پپوٹوں پر نیند کا بوجھ پڑنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا، جلدی سے کھانا کھا کے بستر میں گھس کے سو جاؤں۔ تین دن کے سفر کی تھکان تھی!

میں کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوشش کرتا تو حروف صاف دکھائی دیتے۔ ذرا اپنے ذہن کو ڈھیلا چھوڑ دیتا تو حروف آنکھوں کے آگے شریر بچوں کی طرح ناچنے لگتے اور ان کی بے جا اچھل کود میں معنی اور مطالب کی پوری تفہیم غائب ہو جاتی۔ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد جب شنکر "کھانا تیار ہے صاحب!" کہنے کے لئے آیا تو میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے کا کمرہ زیادہ دور نہ تھا۔ بائیں طرف ایک کمرہ بند تھا۔ اس سے اگلے کمرے میں تھا۔

مہاگنی کی چھت سے پرانی وضع کا ایک پرتگیزی لیمپ لٹک رہا تھا گول مضبوط میز تھی جس پر بیک وقت آٹھ آدمی کھانا کھا سکتے تھے۔ اس وقت صرف ایک آدمی کا کھانا لگایا گیا تھا۔ عمدہ ٹماٹو سوپ تھا، چکن کا قورمہ، پراٹھے، دال اور چاول۔ ڈٹ کے کھایا۔ پہلے معلوم ہوتا تھا، نیند زیادہ ہے۔ اب معلوم ہوا بھوک زیادہ ہے اور جب کھانا کھا چکا تو نیند کا غلبہ یکدم گہرا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے شنکر کی باورچی گیری کی تعریف کی۔ اُسے ایک روپیہ ٹپ میں دیا تاکہ پہلے ہی دن میرا رعب پڑ جائے۔ پھر اُس سے جلدی سے اپنے کمرے کے پلنگ پر بستر بچھانے کو کہا۔ اِس وقت تک میں کھانا کھانے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں واپس آ چکا تھا۔

"صاحب یہیں سوئیں گے؟" شنکر نے حیرت سے مجھ سے کہا۔

"ہاں!"

"اِس کمرے میں؟"

"ہاں اِس کمرے میں یا کسی اور کمرے میں۔ اگر وہ اِس سے بہتر ہو"

"سب سے اچھا کمرہ تو یہی ہے صاحب! مگر ـــــــ" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"مگر کیا ـــــ؟"

"اِس قلعے کے نیچے ٹیلے کے قدموں میں ندی کے کنارے سرکار نے ایک نیا ڈاک بنگلہ بنایا ہے۔ صاحب اُس میں چل کے سوئیں۔ صبح کو یہاں آجائیں" شنکر نے تجویز پیش کی۔

"کیوں؟"

"اِس قلعے میں رات کو کوئی سوتا نہیں ہے۔ بہت بڑا قلعہ ہے۔ رات کو آپ کو ڈر لگے گا!"

"کیا تم رات کو یہاں نہیں سوتے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں جناب! میں تو نیچے ڈاک بنگلے میں سوتا ہوں"

"تو آج رات یہاں سو جاؤ!"

"نہیں جناب!" وہ گھبرا کر بولا "میں تو وہیں سوؤں گا اور میری گزارش یہ ہے کہ حضور بھی رات کو وہیں قیام فرمائیں۔ صبح پھر اِدھر تشریف لا سکتے ہیں"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھنے پر اصرار کیا۔

"صاحب!" شنکر پس و پیش کرتے ہوئے بولا "اِدھر اِس قلعہ میں رات کو نو دس سال سے کوئی نہیں سوتا ہے!"

"کیوں نہیں سوتا؟" میں نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"صاحب! لوگ کہتے ہیں، اِس قلعہ میں بھوت رہتے ہیں"

"بھوت ـــــ؟"

شنکر نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تب تو میں ضرور یہاں سوؤں گا!" میں نے فیصلہ کُن لہجہ میں اُسے جواب دیا "مجھے بھوتوں سے کوئی ڈر نہیں لگتا!"

شنکر نے ہاتھ جوڑ کر بہت پریشان اور ہراساں لہجے میں کہا "صاحب! ضد نہ کریں! میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ نیچے نئے ڈاک بنگلے میں چل کر سوئیں۔ یہ میری عرض ہے۔ آج سے سات سال پہلے ایک انجینئر صاحب نے اِسی طرح ضد کی تھی۔ بس وہ تین دن تک اُس کمرے میں سو پائے تھے۔ چوتھے دن اُس کمرے میں بستر پر اُن کی لاش پائی گئی!"

"بھوتوں نے مار ڈالا ـــــ؟"

"ایسا ہم پہاڑی لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر تیراہ کا ڈاکٹر بولا، ہارٹ فیل سے مر گیا"

"ڈاکٹر نے ٹھیک کہا ہوگا!"

"میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ حضور رات کو یہاں نہ سوئیں!"

"اب تو یہیں سوئیں گے شنکر!" میں نے اُس سے کہا "آج تک زندگی میں کسی بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی اور ملاقات کرنے کا بہت شوق ہے۔ اِسی بہانے یہ شوق پورا ہو جائے گا۔ تم جاؤ صبح آجانا"

جب میں کسی طرح نہ مانا تو شنکر مجھے قلعہ کے دروازے کے اندر کا تالا اور چابی دے گیا۔ لالٹین لے کر میں اُسے قلعہ کے باہر تک چھوڑنے گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے اُسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ بڑا دروازہ اندر سے بند کیا۔ دروازہ بند کر کے لکڑی کے دو بھاری صلیب نما ڈنڈے آر پار آہنی کھونٹوں میں پھنسا کر تالا لگایا۔ چابی جیب میں ڈالی۔ واپس آکر بارہ سنگھے کے سر کو غور سے دیکھا اور پھر اپنی حماقت پر ہنس کر وہاں سے چل دیا۔

پر غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کبھی یہ تاثر اچھا مرتب ہوتا ہے، کبھی بُرا۔ پہلے تاثرات جو اس قلعے کے ماحول نے مرتب کئے، وہ ایک عجیب طرح کی ناپسند اور بیزاری کے تھے۔ حالانکہ میں نے ابھی قلعہ کا ایک ہی ہال دیکھا تھا اور میں اُس کے دوسرے حصّوں سے ناواقف تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا ایسا کیوں ہے؟ لیکن اُس وقت میں نے اِسے کوئی اہمیت نہ دی۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ طویل سفر کی بیزار کن پریشانی اور تھکن سے ہو۔ پہلی بار کسی اجنبی ماحول میں آنے سے ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ میں نے اِس خیال کو جھٹک دیا اور اپنی نگاہیں سامنے کی دیوار پر جمادیں۔ جہاں کی تاریکی میں مجھے بارہ سنگھے کا ایک بڑا سر اپنے لمبے سینگ اُٹھائے ہوئے مبہم اور تاریک آنکھیں کھولے مدّھم مدّھم سا نظر آرہا تھا۔

یکایک جیسے اُس بارہ سنگھے کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آئی اور وہ بڑی بڑی آنکھیں آہستہ آہستہ روشن ہو کر شعلے کی طرح چمکنے لگیں۔ میں چونک گیا اور غور سے اُس بارہ سنگھے کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اُن آنکھوں میں واقعی روشنی پیدا ہو رہی تھی اور وہ مُردہ بے جان آنکھیں بتدریج سُرخ ہوتی جارہی تھیں!

میرے سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھا جمے کا جما رہ گیا۔ آنکھیں بارہ سنگھے کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔ اِتنے میں میرے پیچھے آہٹ کی آواز پیدا ہوئی اور میں گھبرا کر سیڑھیوں سے اُٹھ کر جو مُڑا تو ایک تیز ٹارچ کی شعاع نے میری آنکھوں کو چُندھیا دیا۔ پھر میرے کانوں میں جیسے کسی گہرے کنوئیں میں ڈُوبتی ہوئی آواز آئی۔

"غُسل کا پانی تیار ہے صاحب!"

یہ شنکر تھا، جو زینے کی سب سے اوپر کی سیڑھی پر ٹارچ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

بہت مشکل سے چیخ میں نے اپنے حلق میں روکی۔ شنکر میرے سامنے قلعہ کے دروازے سے باہر گیا تھا۔ یہ میرے پیچھے کدھر سے آنکلا؟ میری حیرت بڑھ گئی لیکن میں نے اپنی حیرت اور گھبراہٹ پر فوراً قابو پالیا اور کچھ کہے سُنے بغیر اوپر کی منزل کو جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر چڑھ کر، گھوم کر نیچے ہال میں دیکھا تو گھُپ اندھیرا تھا۔ بارہ سنگھے کی آنکھیں بے جان، مُردہ اور تاریکی میں کھوئی ہوئی تھیں۔ غالباً ٹارچ کی روشنی اُن آنکھوں میں پڑی تھی جس سے معاً وہ آنکھیں مجھے چند لمحوں کے لئے زندہ اور سُرخ ہوتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ یہ سوچ کر میرے دل کو اطمینان ہوا اور میں خاموشی سے شنکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

زینے سے گُزر کر ہم ایک چوبی غلام گردش میں سے گُزرنے لگے۔ رات کے سنّاٹے میں لکڑی کے تختوں پر ہمارے قدموں کی آواز کی گُونج بے حد گمبھیر، عجیب اور ہولناک معلوم ہو رہی تھی۔ پھر غلام گردش دائیں کو گھُوم گئی، ہم بھی گھوم گئے۔ پھر غلام گردش بائیں کو گھُوم گئی، ہم بھی گھُوم گئے۔ چلتے چلتے ایک کمرے کے قریب جاکر شنکر رُکا۔ پٹ کھُلا تھا اور اندر سے لالٹین کی روشنی جھانک رہی تھی۔

لالٹین کی لرزتی ہوئی جھلملاتی ہوئی روشنی میں میں نے اُس کمرے کا ایک سرسری سا جائزہ لیا۔ چھت منقّش لکڑی کی تھی۔ فرش بھی لکڑی کا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر نصف حصّے تک مہاگنی کے چوبی تختے جڑے ہوئے تھے جن کا گہرا بھورا رنگ اب سیاہ ہو چلا تھا۔ ایک کونے میں مہاگنی کا بڑا پلنگ تھا۔ ایک کونے میں ریشمی گدّیاں۔ دو آرام کرسیاں، ایک لمبی تپائی جس پر چینی کا ایک گلدان پڑا تھا۔ سنگھار میز، ایک کھڑکی تھی جس پر گہرے مٹیالے رنگ کے دبیز ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف سامان رکھنے کا چوبی ریک تھا۔ جنوبی دیوار میں ایک دروازہ تھا جو باتھ روم میں کھُلتا تھا۔ کمرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اِسے مُدّت سے جھاڑا پونچھا نہیں گیا ہے۔

شنکر نے معذرت کرتے ہوئے کہا "صاحب کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی ورنہ آپ کو سب ٹھیک ٹھاک ملتا۔ میں نے غسل خانے میں گرم پانی رکھ دیا ہے اور ٹھنڈا پانی بھی۔ دو بالٹیاں کافی ہوں گی ——؟"

"کافی ہوں گی!" میں نے کہا۔

"صاحب غُسل سے فارغ ہو لیں۔ جب تک میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

شنکر یہ کہہ کر چُپ ہوگیا۔ پھر ایک تیز نگاہ مجھ پر ڈالی۔ جیسے میرا عندیہ معلوم کرنا چاہتا ہو۔ پھر بولا۔

"صاحب کیسا ڈنر لیں گے۔ ویجی ٹیرین یا نان ویجی ٹیرین ——؟"

"میں سب کچھ کھاتا ہوں۔ جو کچھ آسانی سے مل سکے کھلا دو۔"

"بہت اچھا سرکار!" کہہ کر شنکر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں میرا سامان اُٹھا کر لایا۔ پھر ڈنر تیار کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے اپنا سامان کھولا۔ نہانے کا سامان نکالا پھر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کرکے باتھ روم کی طرف چلا۔ نیا تولیہ، قمیص، پاجامہ باتھ روم کے اندر والے باتھ اسٹینڈ پر رکھا اور ٹب میں بیٹھ کر نہانے لگا۔ دیوار پر میرے سامنے میرا لمبا بے ڈھنگا تاریک سایہ بھی بڑے مضحکہ خیز انداز سے نہاتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور میری ہر حرکت کی نقل کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جب میں جگ اُٹھاتا، وہ بھی اُٹھاتا۔ میں ہاتھ روک دیتا، وہ بھی روک دیتا۔ میں سر پر پانی ڈالتا، وہ بھی ڈالتا۔ میں جسم کو ربر کے جانوں سے ملنے لگتا، وہ بھی ملنے لگتا۔ میں اُس کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے معاً رُک گیا، وہ بھی رُک گیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا، فوراً کوئی ایسی حرکت کرکے پیش قدمی کر جاؤں جو یہ سایہ اُسی لمحے نہ کر سکے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میری ذرا سی حرکت پر وہ بھی ہلنے لگتا جیسے وہ بھی ہر پیش بندی کے لئے تیار ہو۔ آدمی چاند کو فتح کر سکتا ہے لیکن اپنے سائے کو شکست نہیں دے سکتا!

نہا دھو کر بالوں میں کنگھی کر کے شب خوابی کے کپڑے پہن کر میں ڈنر کے لئے تیار ہو گیا۔ غسل کرنے سے بدن تو ہلکا ہو گیا تھا لیکن آنکھیں غنودگی کے باعث بھاری ہونے لگی تھیں۔ پپوٹوں پر نیند کا بوجھ پڑنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا، جلدی سے کھانا کھا کے بستر میں گھس کے سو جاؤں۔ تین دن کے سفر کی تھکان تھی!

میں کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کوشش کرتا تو حرف صاف دکھائی دیتے۔ ذرا اپنے ذہن کو ڈھیلا چھوڑ دیتا تو حرف آنکھوں کے آگے شریر بچوں کی طرح ناچنے لگتے اور ان کی بے جا اُچھل کود میں معنی اور مطالب کی پوری تفہیم غائب ہو جاتی۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد جب شنکر "کھانا تیار ہے صاحب!" کہنے کے لئے آیا تو میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے کا کمرہ زیادہ دُور نہ تھا۔ بائیں طرف ایک کمرہ بند تھا۔ اُس سے اگلے کمرے میں تھا۔

مہاگنی کی چھت سے پرانی وضع کا ایک پرتگیزی لیمپ لٹک رہا تھا۔ گول مضبوط میز تھی۔ جس پر بیک وقت آٹھ آدمی کھانا کھا سکتے تھے۔ اُس وقت صرف ایک آدمی کا کھانا لگایا گیا تھا۔ عمدہ ٹماٹو سوپ تھا، چکن کا قورمہ، پراٹھے، دال اور چاول۔ ڈٹ کے کھایا۔ پہلے معلوم ہوتا تھا، نیند زیادہ ہے۔ اب معلوم ہوا بھوک زیادہ ہے اور جب کھانا کھا چکا تو نیند کا غلبہ یکدم گہرا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کھانے کی میز سے اُٹھتے ہوئے شنکر کی باورچی گیری کی تعریف کی۔ اُسے ایک روپیہ ٹپ میں دیا تاکہ پہلے ہی دن میرا رعب پڑ جائے۔ پھر اُس سے جلدی سے اپنے کمرے کے پلنگ پر بستر بچھانے کو کہا۔ اِس وقت تک میں کھانا کھانے کی میز سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں واپس آ چکا تھا۔

"صاحب یہیں سوئیں گے؟" شنکر نے حیرت سے مجھ سے کہا۔

"ہاں!"

"اِس کمرے میں؟"

"ہاں اِس کمرے میں یا کسی اور کمرے میں۔ اگر وہ اِس سے بہتر ہو۔"

"سب سے اچھا کمرہ تو یہی ہے صاحب! مگر ———" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"مگر کیا ———؟"

"اِس قلعے کے نیچے ٹیلے کے قدموں میں ندی کے کنارے سرکار نے ایک نیا ڈاک بنگلہ بنایا ہے۔ صاحب اُس میں چل کے سوئیں۔ صبح کو یہاں آ جائیں۔" شنکر نے تجویز پیش کی۔

"کیوں؟"

"اِس قلعے میں رات کو کوئی سوتا نہیں ہے۔ بہت بڑا قلعہ ہے۔ رات کو آپ کو ڈر لگے گا!"

"کیا تم رات کو یہاں نہیں سوتے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"نہیں جناب! میں تو نیچے ڈاک بنگلے میں سوتا ہوں۔"

"تو آج رات یہاں سو جاؤ!"

"نہیں جناب!" وہ گھبرا کر بولا۔ "میں تو وہیں سوؤں گا اور میری گزارش یہ ہے کہ حضور بھی رات کو وہیں قیام فرمائیں۔ صبح پھر اِدھر تشریف لا سکتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟" میں نے پوچھنے پر اصرار کیا۔

"صاحب!" شنکر پس و پیش کرتے ہوئے بولا۔ "اِدھر اِس قلعہ میں رات کو تو دس سال سے کوئی نہیں سوتا ہے!"

"کیوں نہیں سوتا؟" میں نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"صاحب! لوگ کہتے ہیں، اِس قلعہ میں بھوت رہتے ہیں۔"

"بھوت ———؟"

شنکر نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تب تو میں ضرور یہاں سوؤں گا!" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں اُسے جواب دیا۔ "مجھے بھوتوں سے کوئی ڈر نہیں لگتا!"

شنکر نے ہاتھ جوڑ کر بہت پریشان اور ہراساں لہجے میں کہا۔ "صاحب! ضد نہ کریں! میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔ نیچے نئے ڈاک بنگلے میں چل کر سوئیں۔ یہ میری عرض ہے۔ آج سے سات سال پہلے ایک انجینئر صاحب نے اِسی طرح ضد کی تھی۔ بس وہ تین دن تک اُس کمرے میں سو پائے تھے۔ چوتھے دن اُس کمرے میں بستر پر اُن کی لاش پائی گئی!"

"بھوتوں نے مار ڈالا ———؟"

"ایسا ہم پہاڑی لوگ سمجھتے ہیں۔ مگر تیراہ کا ڈاکٹر بولا، ہارٹ فیل سے مر گیا!"

"ڈاکٹر نے ٹھیک کہا ہوگا!"

"میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔ حضور رات کو یہاں نہ سوئیں!"

"اب تو یہیں سوئیں گے شنکر!" میں نے اُس سے کہا۔ "آج تک زندگی میں کسی بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی اور ملاقات کرنے کا بہت شوق ہے۔ اِسی بہانے یہ شوق پورا ہو جائے گا۔ تم جاؤ صبح آ جانا۔"

جب میں کسی طرح نہ مانا تو شنکر مجھے قلعہ کے دروازے کے اندر کا تالا اور چابی دے گیا۔ لالٹین لے کر میں اُسے قلعہ کے باہر تک چھوڑنے گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے اُسے تسلی دے کر رخصت کیا۔ بڑا دروازہ اندر سے بند کیا۔ دروازہ بند کر کے لکڑی کے دو بھاری صلیب نما ڈانڈے آر پار آہنی کڑوں میں پھنسا کر تالا لگایا۔ چابی جیب میں ڈالی۔ واپس آ کر بارہ سنگھے کے سر کو غور سے دیکھا اور پھر اپنی حماقت پر ہنس کر وہاں سے چل دیا۔

نیچے چھوڑ کر غلام گردش میں پہنچا۔ غلام گردش گھوم کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ ساتھ والے کمرے کو غور سے دیکھا، جس پر باہر سے ایک مضبوط آہنی قفل لگا تھا پھر واپس اپنے کمرے میں آیا۔ کمرہ اندر سے دیکھ بھال کر بند کیا۔ دونوں چٹخنیاں چڑھا دیں، کُنڈی لگا دی۔ کُنڈی میں تالا لگایا پھر اطمینان کرکے باتھ روم گیا۔ باتھ روم کا ایک دروازہ میرے کمرے میں، دوسرا ساتھ والے کمرے میں کُھلتا تھا۔ وہ باہر سے مقفل تھا۔ غالباً یہ باتھ روم دونوں کمروں کے بیچ میں دونوں کمروں کے رہنے والوں کے استعمال کے لئے بنایا گیا تھا۔ باتھ روم کا دوسرا دروازہ اُدھر سے بند تھا۔ اُدھر کوئی چٹخنی نہ تھی۔ ایک کھڑکی مغربی جانب تھی، وہ بھی بند تھی۔ اوپر نیچے دونوں چٹخنیاں لگی تھیں۔ میں اچھی طرح اطمینان کرکے باتھ روم سے باہر آگیا۔ باتھ روم کا دروازہ میرے کمرے کی جانب سے بند نہ ہوتا تھا۔ اِس لئے اُسے محض بھیڑ دیا اور پھر اپنے پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے لگا۔

نیند جانے کہاں چلی گئی تھی۔ بار بار کسی نامعلوم خوف سے بانہوں کے بال کھڑے ہو جاتے اور جسم میں ایک جھرجھری سی آجاتی۔ عجیب طرح کا اشتیاق بھی تھا اور ڈر بھی۔ بہت دیر تک پڑھتا رہا۔ بیچ بیچ میں نیند دستک دیتی تو اچانک چونک کر ہوشیار ہو جاتا۔ کوئی دو بجے تک اپنی نیند سے لڑتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کب کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں بستر پہ اکڑوں کروٹ لے کر لیٹے لیٹے کتاب پہ سر رکھ کر سو گیا۔

یکایک گھپ اندھیرے میں آنکھ کھلی۔ لیمپ کی بتی جل کر بجھ چکی تھی، غالباً تیل ختم ہو گیا تھا ——— دروازے کے باہر آہٹ ہونے لگی تھی۔

کوئی دبے پاؤں میرے کمرے کی طرف آرہا تھا۔۔۔!

باقی آئندہ

غزل

پروفیسر عبدالرب عرفان ایم۔ اے

عشق راحت بھی، آزار بھی — ایک شے پھول بھی، خار بھی

مست و بیخود بھی، ہُشیار بھی — مُجھ سا ہوگا نہ میخوار بھی

طاقتِ ضبطِ غم بھی نہیں — عرضِ حال اُن سے دُشوار بھی

دشتِ غم میں بقدرِ جنوں — راہ آساں بھی، دُشوار بھی

وہ نگاہیں، خدا کی پناہ! — جن میں نفرت بھی ہے، پیار بھی

خود پرستی ہی سب کچھ نہیں — ہے کوئی چیز ایثار بھی

پوچھ لے کوئی عرفان سے
کیا خوشی ہے غمِ یار بھی

غزل

کرشن موہن ایم۔ اے

کمتریں کو کمتریں سمجھے ہیں آپ! — کرشن موہن کو نہیں سمجھے ہیں آپ

خود کو دُنیا سے حسیں سمجھے ہیں آپ — جانے کیا اپنے تئیں سمجھے ہیں آپ

حُسن کو حُسنِ نظر سمجھا ہوں میں — عشق کو حُسنِ یقیں سمجھے ہیں آپ

میں ہوں اِک نقّادِ نکتہ آفریں — حیف مجھ کو نکتہ چیں سمجھے ہیں آپ

ایک مُدت سے فلک پیما رہے — کیا کبھی رازِ زمیں سمجھے ہیں آپ

اپنی عظمت کے خیالِ خام کو — حاصلِ دنیا و دیں سمجھے ہیں آپ

اہلِ دل کے دردِ عالمتاب کو
ایک دردِ تہ نشیں سمجھے ہیں آپ

افسانہ

شکنتلا

ـــــــــــــــــــ نور پرکار، بی، اے

پلاٹ نمبر ۵، اپوزٹ ٹلسی باغ، ماڈرن پلاور روڈ، بوریولی (ویسٹ) بمبئی ۶۶

۳۰، دسمبر ۶۵ء   محترمی خوشتر گرامی صاحب! آداب

... ایک نئی تخلیق "شکنتلا" بیسویں صدی کے لئے ارسالِ خدمت ہے۔ اِس یقین کے ساتھ کہ دوسری اچھی تخلیقات کی طرح یہ بھی شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔ اِس کہانی میں آپ ایک نیا انداز پائیں گے۔ انوکھا پن دیکھیں گے...

نیاز مند ـــــــــ نور پرکار

ہیمن مہتہ جس وقت مرا، اُسے شمشان بھومی تک پہنچانے کے لئے ہزاروں لوگ جمع ہوگئے تھے۔ دُور دُور تک ساری دُکانیں بند کر دی گئی تھیں۔ رات کے دس بجے جب اُس کی لاش اُٹھائی گئی تو صرف سفید چادر اور گُلال نظر آتا تھا۔ اِس سرے سے اُس سرے تک آدمی ہی آدمی تھے۔ کاروبار میں اُس کا سکّہ چلتا تھا اور لوگوں کی جیبوں کا سکّہ اُس کی دُکان میں جمع ہوجاتا تھا۔ وہ بہت میٹھی باتیں کرتا تھا اور بزنس کے اِس اصول سے بخوبی واقف تھا۔ اِسی لئے جس وقت وہ مرا تو اُسے شمشان بھومی تک پہنچانے کے لئے اُس کے کاروباری دوست، احباب، عزیز، برادر سبھی جمع ہوگئے۔ اِس سے پہلے کسی کی موت پر اتنے لوگ جمع نہیں ہوئے تھے۔ رات کی خاموشی میں چھن چھن تال بجتے جاتے تھے اور اُس کی بیوی کی آنکھوں سے آنسو بہے جاتے تھے۔ شکنتلا کی اس کہانی سے ہیمن مہتہ کا تعلق بہت ہی کم ہے۔ اُس کی کہانی تو وہیں ختم ہوگئی جب اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ سچ کہا جائے تو ہر انسان کی کہانی اُس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اُس کی سانس چلتی رہتی ہے۔ سانس اُکھڑ جاتی ہے تو سارے فسانے ختم ہوجاتے ہیں۔ یہی دُنیا کی ریت ہے۔ بہت ہی کم ایسے خوش نصیب ہوں گے جن کی موت کے بعد بھی اُنھیں یاد کیا جاتا ہے۔ اِسی لئے ہیمن مہتہ کی کہانی بہت جلد ختم ہوگئی۔ دُکانداری میں اُس کی جگہ اُس کے بھائی کبیر نے لے لی۔ کم بخت موٹا تازہ خوب ڈٹ کر کھاتا۔ دن پر دن موٹا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ مادھو کے ہوٹل کا پچھواڑا کباڑ خانہ کہلاتا ہے۔ یہاں کوئی بھی آسکتا ہے، سنگل کپ چائے پی کر گاؤں کی خبریں سُنا سکتا ہے اور بیٹھے بٹھائے اوروں کی سُن سکتا ہے۔ پہلے یہ جگہ کافی مشہور تھی، پتہ نہیں اب اُس جگہ کا کیا حال ہے؟ جیسے ہی شکنتلا کی کہانی ختم ہوئی میں نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا لیکن اُس وقت یہی وہ جگہ تھی جہاں گاؤں کا قاضی بھی آتا تھا اور حجام بھی۔ بھانت بھانت کے لوگ آتے تھے اور اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپتے تھے۔ اُنھیں دنوں گاؤں کے مغرب میں ابوکیشے کا ہوٹل بھی افواہ خانہ بن گیا تھا۔ یہاں سے سبھی طرح کی افواہیں اُٹھتی تھیں اور سارے گاؤں میں پھیل جاتی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے کبیر کو بھی نظرِ بد کھا گئی اور اُس کا گول مٹول جسم بے جان ہوگیا اور جب اُس کی لاش اُٹھائی گئی، اُس کے جسم کا کوئی حصّہ نظر نہ آتا تھا۔ صرف پھولا ہوا پیٹ بہت دُور تک دکھائی دیتا تھا۔ انسان کا پیٹ کہیں سے بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خود اپنے آپ کو دکھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ گہرا کنواں جس طرح کبھی بھرتا نہیں، اُسی طرح یہ کبھی خالی بھی نہیں رہ سکتا۔ جس دن کبیر اپنا اُبھرا ہوا پیٹ لے کر موت کی آغوش میں چھپ گیا، اُسی دن دُکان کا دیوالہ شروع ہوگیا۔ اُس کی جگہ ڈونگر بھائی نے لی۔ یہ ڈونگر بھائی بھی عجیب شخصیت ہے۔ نام ڈونگر ہے اور زمین سے اوپر دکھائی نہیں دیتا۔ رہا اِن کا چھوٹا بھائی رتن اور چھوٹی بہن شکنتلا ـــــ یہ دونوں بہت چھوٹے تھے ہیمن مہتہ اور کبیر کی موت کے وقت!

شکنتلا بھی دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوگئی۔ پستہ قد کی یہ چنچل لڑکی گاؤں بھر میں مشہور تھی۔ مادھو کے ہوٹل سے ملی ہوئی اِس کی دُکان تھی۔ لونڈے دُکان سے ہوٹل تک کے چکر کاٹتے رہتے تھے۔ ہوٹل کے پیچھے آکر اُس کی تعریف میں پُل باندھا کرتے اور ہوائی قلعے بنایا کرتے، پر وہ کسی کو مُنہ نہ لگاتی۔ سارا دن کام میں لگی رہتی اور فرصت کے لمحات میں نکموں کے خلاف کُڑھتی رہتی اور شام ہوتے ہی اپنے آپ کو گھر میں بند کر لیتی، جیسے

حدیثِ دل

کیجے دعا کہ ختم تو کرے دردمندِ عشق
اوّل تو دل کی چوٹ ، پھر اپنی دُکھی ہوئی ——————— فانی بدایونی

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا دیتے ہیں ——————— میر تقی میر

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم ——————— مومن

لطفِ بہار کچھ نہیں ، گو ہے وہی بہار
دل کیا اُجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا ——————— آرزو لکھنوی

ایسے رہ رہ کے تڑپتا ہے تری یاد میں دل
جیسے بچّے کا کھلونا کہیں کھو جاتا ہے ——————— نامعلوم

مرسلہ :- ایس ۔ ایس ہنکاری ، ایم ۔ اے ، کلکتہ

مرغی کے بچّے ماں کے پروں میں اپنے آپ کو چُھپا لیتے ہیں۔

میں اُن دنوں ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور داپولی میں پڑھا کرتا تھا. سال بھر کی ساری چھٹیاں وہیں گزار دیتا ، پھر گرمی کی لمبی چھٹیوں میں گھر آنا ہی پڑتا۔ یہی تین مہینے ہوتے ہیں جب ہم خوب محنت کرتے ہیں اور اُسی محنت کا پھل سال بھر کھاتے ہیں ۔ ہماری گزر صرف آموں کے بیوپار پر ہوتی ہے ۔ ہماری ہی کیا ، گاؤں کے ہر آدمی کی . سردی کے موسم میں جب درختوں پر بور آنے لگتا ہے تو گاؤں میں آموں کے دیوتا کی بڑی پُوجا ہوتی ہے ۔ پھول چڑھائے جاتے ہیں اور قُربانیاں دی جاتی ہیں ، تاکہ اچھے پھل لگیں اور فصل خوب سے خوب تر ہو ۔ رات بھر بھجن گائے جاتے ہیں ۔ یہی وہ ایک دن ہے جب ہم بھجن گاتے وقت شراب نہیں پیتے ۔ ورنہ باٹلی بائی کا سدا ساتھ رہتا ہے ۔ آم کے اِس موسم میں دن بھر کے تھکے ماندے جب تک دو گھونٹ حلق سے نہیں اُتارتے ، جسم کا درد کم نہیں ہوتا ۔ یہ وہ دن ہوتے ہیں جب گاؤں میں پانی کی بھی قلّت رہتی ہے ۔ میں رات کے دس بجے نل کنویں میں چھوڑ آتا ہوں تاکہ صبح تک خوب پانی جمع ہو سکے اور لوگوں کو زیادہ تکلیفوں کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔

میں اِس دَوران میں بہت مصروف رہا ۔ غمِ روزگار نے اِتنی مہلت نہ دی کہ سر اُٹھا کر دیکھوں کہ آسمان کتنا صاف ہے اور چاند کتنا خوبصورت ہے اور ہوا میں رات رانی کی خوشبو پھیل گئی ہے ، خزاں بہت دُور پیچھے رہ گئی ہے اور بہار آگئی ہے ۔

وقت کی رفتار کچھ دیر کے لئے تو رُک جاتے تاکہ میں اِن باتوں کا جائزہ لے سکوں ، اور کچھ نہیں تو اِس کا احساس ہی نرم مُٹھی میں بند کرکے بہتے ہوئے پانی کی سطح پر چھوڑ کر چند لمحوں کے لئے سکون کا سانس لے سکوں ۔ جیسے بچّے بارش کے دنوں میں آنگن کے پانی میں کاغذ کی ناؤ بہاتے رہتے ہیں اور اُسے ڈوب کر ہی سُکھ کی سانس لیتے ہیں ۔

لیکن اُس دن مجھے اِس بات کا اندازہ ہوا کہ میری اِن مصروفیتوں کا کوئی جائزہ لیتا رہا ہے ۔ میرے سُونے آنگن میں دبے پاؤں ایک پھُول نے اپنا سر اُٹھا کر کہا کہ میں کھِل گیا ہوں ۔ رات کو جب میں ہر روز کی طرح نل کنویں میں چھوڑ کر واپس ہو رہا تھا وہ تیز تیز قدموں سے میرے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی ۔ میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا ، وہ شکنتلا تھی !

میرے گھر سے کنویں کی طرف جو راستہ جاتا ہے ، وہ شکنتلا کے گھر سے ہو کر گزرتا ہے ۔ اور رات نو بجے کے بعد چاروں طرف ہُو کا عالم طاری ہو جاتا ہے ۔ دن بھر کے محنت کش اپنے آپ کو نئی صبح کی اُمید میں نیند کی آغوش میں ڈال دیتے ہیں ۔ صرف چند کُتّے اپنا سر اُٹھائے اِدھر اُدھر بھونکتے دکھائی دیتے ہیں اور باقی اپنے مالک کی چوکھٹ سے لگے ہر آہٹ کی کھوج میں کھوئے دکھائی دیتے ہیں ۔

میں نے پُوچھا : "تم ابھی تک سوئیں نہیں ؟"

" نہیں ۔ روز ہی جاگتی رہتی ہوں "

" کیوں ؟ "

" یونہی ۔ جب تک تم یہاں سے گزرتے نہیں ، نیند ہی نہیں آتی "

" اب یہاں کیوں آئی ہو ؟ "

" صرف یہ پُوچھنے کے لئے کہ کل رات تم کہاں تھے ؟ "

" ہاں ! واقعی کل رات میں کنویں پر نہیں جا سکا تھا ۔ بھیّا کی طبیعت اچھی نہیں تھی "

" اب کیسی ہے ؟ "

" اچھی ہے "

دوسرے لمحے میں نے دیکھا ، وہ دُکان کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اندر غائب ہو گئی ۔ دل کے سارے تار جھنجھنا اُٹھے ۔ ساری رات شکنتلا خواب میں پُوچھتی رہی ——

" کل رات تم کنویں پر کیوں نہیں آئے تھے ؟ "

" کل رات تم کہاں تھے ؟ "

" کل رات کیوں نہیں آئے ؟ "

" اب روز کیا کروں گا شکنتلا ! —— مجھے کیا پتہ تھا تمہیں میرا انتظار رہتا ہے "

دوسری صبح مجھے محسوس ہوا کہ بہار آگئی ہے اور سُرخ سُرخ پھُول میرے

آنگن میں مسکرانے لگے ہیں!

بات بہت چھوٹی تھی لیکن ابو گھٹے کے ہوٹل سے اٹھی اور گاؤں بھر میں پھیل گئی۔

تب مجھے اندازہ ہوا، یہ چھوٹی نہیں بہت بڑی بات ہے! آگ سے بھی زیادہ بھیانک ہے: ہوا سے بھی زیادہ تیز ہے اور اس میں تھمنے کا نام کو نہیں۔ شکنتلا اپنی جگہ جمی رہی اور سبھی حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں۔ اب مجھے واپس جانا تھا۔ میں واپس چلا گیا لیکن باتیں ختم نہ ہوئیں۔ کہانی ختم نہ ہوئی ——— بہتی رہی، کبھی آہستہ، کبھی تیز اور اگر رک جاتی تو . . . ! کہانی رکنے کے لئے شروع ہوئی تھی اور نہ ختم ہی ہونے کے لئے۔ وہ کہانی ہی کیا جو ختم ہو جائے . . . وہ جاری رہی اور حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ کبھی شکست کھاتی رہی، کبھی شکست دیتی رہی اور شکنتلا کہانی کی تفصیلات اپنے خطوط میں لکھتی رہی۔ میں چھٹیوں میں گھر آجاتا۔ وہ سیدھی میرے گھر چلی آتی۔ اب وہ پہلے کی نسبت بہت بیباک ہوگئی تھی۔ کسی سے نہ ڈرتی تھی۔ آتے ہی میری غیر حاضری میں جتنے بھی قصے گھڑے جاتے انھیں سناتی۔ پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی اور پوچھتی ——— "کب بند کرو گے ان کتوں کا بھونکنا؟"

میرے کانوں میں شہنائیاں بج اٹھتیں۔

شکنتلا کی آنکھیں بارات دیکھتی رہ جاتیں۔

"یہ بھونکتے رہیں گے!"

"چار سال اور ——— مجھے بی۔ اے کر لینے دو شکنتلا!"

وہ مان جاتی اور میری ڈھارس بندھاتی۔

میں رات کو جب تک کنویں سے واپس نہ آتا، دروازے پر کھڑی میری راہ دیکھا کرتی۔ منچلے آوازیں کسا کرتے لیکن وہ کان نہ دھرتی۔ ابو گھٹے کا ہوٹل میری اور شکنتلا کی آوازوں سے گونجتا رہتا۔ مادھو کا ہوٹل کافی چل نکلا تھا لیکن شکنتلا کی دکان دن پر دن بیٹھتی ہی جارہی تھی۔ اس کے بھائی زمن پر ویلاس کی کوئی لڑکی ڈورے ڈال رہی تھی۔ جو بہت سارا سامان ہضم کر چکی تھی۔ اس بات پر ڈونگر بھائی گھر میں جھگڑا کیا کرتے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے مزاج میں چڑچڑا پن آگیا تھا۔ شکنتلا وقت کا انتظار کرتی رہی اور میرے لئے سامان تیار کرتی رہی۔ اپنے نئے سفر کے لئے تکیے پر پھول کاڑھتی رہی۔

دو سال اور بیت گئے۔ جوں جوں دن گزرتے رہے، ہم میں پائداری آتی چلی گئی۔ طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں اور شکنتلا مجھ تک خبریں پہنچاتی رہی۔ آج کا شکوہ جو یاد کھو، جب وہ ماضی کے پتھروں پر گھسا جاتا ہے تو اس کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ زبانیں

فسانۂ ہجر

الٰہی! تنگ یہ کب تک رہے گا ہجرِ جاناں میں
کہ روزِ بے دلی گزرا تو شامِ انتظار آئی ——— حسرت موہانی

اشک بھر لائے کسی نے جو لیا نام ترا
اور کیا ہجر میں ہوتا ترے بیماروں سے ——— فراق گورکھپوری

ہجر سے شاد، وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے ——— جگر مرادآبادی

زندگی نام ہے جدائی کا
آپ آئے تو مجھ کو یاد آیا ——— نریش کمار شاد

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو ——— فیض احمد فیض

مرسلہ: ایس۔ ایس ہنکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

چپ ہوگئی تھیں اور لب ان کی نظریں بہت دور انجام پر آکر ٹک گئی تھیں لیکن ایک بار پھر نہ جانے کون سی ہوا چلی کہ میرے دوستوں نے مجھے لکھ بھیجا کہ "شکنتلا اب تمہیں بھولتی جارہی ہے۔ تمہاری جگہ کسٹم کے ایک کلرک "بھولے" نے لے لی ہے۔" میں نے باور نہ کیا۔ یقین کرنے والی بات ہی نہیں تھی۔ میں اسے خوب جانتا ہوں وہ کتنی بے باک اور نڈر ہے اور اپنے پیار میں کتنی ثابت قدم! اسے کوئی ہوا نہیں چھو سکتی۔ کیسی کیسی تکلیفیں اٹھائی ہیں اس نے میرے لئے! کتنے وار سہے اور خاموش رہی ——— صرف روتی رہی، سسکتی رہی لیکن شکایت کا ایک حرف تک زبان پر نہ آیا! مجھے اس کے خطوں کی ساری تحریریں یاد ہیں۔ ایک ایک لفظ گونجتا ہے میرے دماغ میں۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے، وہ میرے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی ہے اور پوچھ رہی ہے "کل رات کہاں تھے تم؟"

"میں تمہارے بہت قریب رہتا ہوں شکنتلا اور تم بھی تو میرے ہی پاس رہتی ہو۔ ہمیشہ، ایک لمحہ بھی تمہاری یاد سے خالی نہیں جاتا ———"

مجھے خوب یاد ہے۔ ایک بار اس نے لکھا تھا "اب راتیں بہت کالی ہوگئی ہیں اور مجھے ڈستی رہتی ہیں۔ اب جلد آؤ مجھ سے زیادہ انتظار نہیں ہوگا۔"

لیکن اس کے دوسرے ہی دن اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے خط میں لکھ بھیجا "کئی سال بیت گئے۔ اب ایک ہی سال کی بات ہے پڑھائی جی لگا کر کرنا۔ ایک ہی سال کیا میں اور کتنی سالوں تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں!" جب

میں چھٹیوں میں اپنے گھر لَوٹا تو دیکھا واقعی وہ بالکل پہلے کی طرح تھی۔ اُس میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ سمجھنے کی بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ تو صرف مجھے بہکانے کے لئے لکھی گئی تھی۔ البتہ اِس بار شکنتلا پہلے کی بہ نسبت بہت کمزور ہوگئی تھی۔ راتوں میں برابر جاگتے رہنے سے اُس کی آنکھوں پر بھی اثر پڑا تھا۔ مجھے اِس بات کا شدت سے احساس ہوا لیکن میرا بی۔ اے کا آخری سال تھا اِسی لئے خاموش ہو جانا پڑا۔ آموں کے بور کی بڑی پُوجا ختم ہو چکی تھی اور درخت کیریوں سے بھر گئے تھے۔ مچھیرنیں بریل اور جھینگا سُکھانے میں مصروف تھیں۔ یہ مچھلی جس وقت تازہ رہتی ہے اِس کے بہت ہی کم دام لگتے ہیں لیکن جب سُکھائی جاتی ہے تو پہلے کی بہ نسبت چوگنا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ شکنتلا کو دیکھتے ہی مجھے واگلا مچھلی یاد آگئی۔ جس کا کانٹا بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کہتے ہیں، اُس کا کانٹا اگر ہرے بھرے درخت کے تنے میں گاڑ دیا جائے تو چند ہی دنوں میں درخت سُوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے اور دھیرے دھیرے اپنی توانائی کھو کر کمزور ہو جاتا ہے اور زمین پر آگرتا ہے۔ ہر چیز زمین کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور اِسی پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے شکنتلا کو بھی میری جُدائی کا کانٹا لگ گیا تھا۔ اِسی لئے وہ دن پر دن سُوکھتی ہی جا رہی تھی۔ مجھ پر جیسے سکتہ سا چھا گیا۔۔۔۔ اگر وہ سُوکھ سُوکھ کر درخت کی مانند گِر جائے تو۔۔۔!

لیکن نہیں، اُسے گِرنا نہیں چاہئے۔ اگر وہ خاموش ہوگئی تو میری کہانی بھی ختم ہو جائے گی۔ میری کہانی اُسی کے سہارے جاری تھی۔ اِسی لئے میں نے سینے پر پتھر رکھ کر اُسے ہمّت دلائی۔ وہ مُسکرائی اور کہہ اُٹھی "تم بھی عجیب وہمی ہو۔ اِتنی تعلیم حاصل کرکے بھی وہم سے اپنے آپ کو نہ بچا سکے۔ اگر یہ وہم مجھے ہو جاتا تو کوئی بات بھی تھی لیکن یہاں تو حساب ہی اُلٹا ہے"

شکنتلا کے اِن جملوں سے میرے دل کا سارا بوجھ اُتر گیا اور میں بی۔ اے فائنل کے لئے بمبئی چلا آیا۔

شکنتلا کے خطوط آتے رہے۔ اُس کے کانوں میں سہاگ کے گیت گُونجتے رہے۔

میری آنکھیں زندگی کے نئے سفر کی راہ پر آکر جم جاتیں اور پہروں اُسی خواب کو دیکھا کرتیں۔ اب شکنتلا کے خطوط دن پر دن کم آنے لگے تھے۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے اُس نے یہ سوچ کر لکھنا کم کر دیا ہو کہ میری پڑھائی میں کوئی حرج نہ آنے پائے۔ امتحان سے ایک مہینہ پہلے اُس کا ایک خط ملا۔۔۔۔ شکستہ سی تحریر کو میں پہچان نہ سکا کہ یہ شکنتلا ہی کی تحریر ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو دلاسا دیا۔۔۔۔ ہو سکتا ہے اب وہ پہلے سے زیادہ مصروف ہوگئی ہو۔ میری واپسی میں اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔

امتحانات ختم ہوگئے۔ آموں کے باغ پھلوں سے لد گئے اور شاخیں زمین کی طرف جُھکنے لگیں۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ لانچ سے اُترنے کے بعد شکنتلا کا گھر پہلے پڑتا تھا، پھر میرا۔ راستے میں کئی جانے پہچانے چہرے ملے۔ ابوکیشٹے کے ہوٹل کے سامنے بھی ایک ہجوم تھا۔ میں اُس ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مادھو کے ہوٹل کے پیچھے آج بھی خبریں سُنانے والے اور سُننے والے موجود تھے لیکن میں نے کسی کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور شکنتلا کے گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مکان کا اگلا دروازہ بند تھا۔ اِس لئے میں نے پچھلا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن پچھلا دروازہ بھی بند تھا۔ مادھو اپنے ہوٹل کے کاؤنٹر سے اُٹھ کر میرے قریب آگیا۔۔۔۔ اُس نے کہا: "بابو! وہ لوگ کل ہی اپنے دیس چلے گئے"

"کہاں؟"

"گجرات۔۔ وہ لوگ گجرات ہی سے تو آئے تھے۔ دُکانداری میں گھاٹا رہا، اِسی لئے وہ اپنے دیس واپس چلے گئے۔ محنت کرتے تھے لیکن اب کے اُن کی روزی بہت کم ہوگئی تھی۔ پرائے دیس میں مانگ کر زندگی گزارنے کی بجائے اپنے دیس میں بھوکوں مرنا اچھا ہوتا ہے"

"اور شکنتلا؟"

اُس نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا: "آٹھ روز ہوئے پرلوک سدھار گئی"

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسی وقت جامع مسجد کا موذن حسن میاں چلّا اُٹھا "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔۔"

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"بھگوان تیری لیلا اپرم پار ہے"

مادھو نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ میرا گلا رُندھ گیا تھا۔ پاؤں چلنے سے جواب دے چکے تھے۔ مادھو نے کہا: "بابو! گھر جاؤ، ماں انتظار کر رہی ہوگی شکنتلا ہی نے کہا تھا، اُنھیں میری بیماری کی خبر نہ ہونے پائے اور نہ میری موت ہی کی۔ ورنہ وہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر چلے آئیں گے اور اُن کی تعلیم پھر کبھی پُوری نہ ہو سکے گی"

میں آگے کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے شکنتلا میرے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی ہے اور پُوچھ رہی ہے۔۔۔۔

"کیسے ہو؟۔۔۔ کل رات کہاں تھے تم؟"

میں نے دیکھا کہانی کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ کئی سالوں سے اِس کہانی کی آنکھیں بند ہیں۔ اُن سُونی آنکھوں کے کتنے خواب آج بھی ادھورے ہیں۔ نہ جانے صدیوں سے اُن آنکھوں میں کس کا انتظار ہے۔ کون ہے جو اُس مُردہ سمندر میں نئی جان ڈال سکتا ہے؟ بیداری کی نئی روح پھونک سکتا ہے؟

ماں نے کہا: "تیری شکنتلا چل بسی۔ سانس اُکھڑنے تک بھی اُس کی زبان پر تیرا ہی نام تھا۔ اُس کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر بس تیری ہی

ماں دیکھ بھال کرتی تھی۔ آخری دنوں میں بہت کمزور ہوگئی تھی لیکن اُس نے مجھے کچھ لکھنے سے منع کر رکھا تھا۔

اُس وقت مجھے معلوم ہوا سب کہانیاں مر سکتی ہیں لیکن پیار کی کوئی کہانی نہیں مر سکتی۔ یہ ہر وقت، ہر دور، ہر صدی میں زندہ رہتی ہے۔ اُس سال آموں کی فصل بھی کمزور ہوگئی تھی۔ میں نے فصل بیچ دی اور ماں کے ساتھ بمبئی چلا آیا۔

پچھلے کئی سالوں سے میں اپنے گاؤں نہیں گیا ہوں۔ گجرات سے شکنتلا کے بھائی کا خط آتا ہے جس میں وہ اپنی خیریت لکھتا ہے اور میری خیریت پوچھا کرتا ہے۔ ڈونگر بھائی کی بیوی ابھی تک بانجھ ہے۔ گاؤں میں ابھی مہتہ اور گمبھیر کی کہانی کی طرح شکنتلا کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ برابر جاری ہے۔ اِس لئے کہ ابھی تک میری سانسیں باقی ہیں اور جب تک میری کہانی جاری رہے گی شکنتلا کی کہانی کوئی نہیں بھول سکتا۔ کبھی کبھی میرے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں اور میں بھی تھک ہار کر آسمان کی طرف دیکھ کر دبے دبے سُروں میں اپنی موت کو آواز دیتا ہوں لیکن نہیں مجھے زندہ رہنا چاہئے ——— اپنے لئے، شکنتلا کے لئے، اُس کی کہانی کے لئے!! عورت کی آنکھیں جب تک زندہ رہتی ہیں کئی کہانیاں جنم لیتی ہیں لیکن جب وہ پتھرا جاتی ہیں تب بھی کہانیاں ختم نہیں ہوتیں ——— پانی کی بھی کہانی ہوتی ہے اور پتھر کی بھی، روٹی کی بھی اور بھوک کی بھی، نفرت کی بھی اور پیار کی بھی، زندگی کی بھی اور موت کی بھی۔۔۔ پتہ نہیں کہانی کے اِس وسیع خلا کو کوئی بھر بھی سکے گا یا نہیں۔۔۔؟؟

غزلیں

——— مہندی پرتاب گڈھی ———

مِٹ گیا عہدِ وفا گردشِ ایّام کے ساتھ
پھر بھی اِک ربط سا باقی ہے ترے نام کے ساتھ

یہ نوازش بھی بڑی چیز ہے اَے جانِ بہار
آ تو جاتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ

مُدّتیں بیت گئیں ترکِ تعلّق کو مگر
دل دھڑک اُٹھتا ہے کیوں اب بھی ترے نام کے ساتھ

آرزوؤں نے کیا ترکِ تعلق جب سے
زندگی بیت رہی ہے بڑے آرام کے ساتھ

ڈوبتا جائے ہے آغوش میں غم کی مہندیؔ
دل کو نسبت سی ہے کچھ تیرگیٔ شام کے ساتھ

——— چندر پرکاش جوہر بجنوری ———

لذّتِ عشق ملی تلخیٔ آلام کے بعد
اب کسی جام کی حسرت نہیں اِس جام کے بعد

ہے یہی حاصلِ معراجِ محبت شاید
اب کوئی نام نہیں لب پہ ترے نام کے بعد

میں خطاکارِ محبت سہی لیکن اے دوست!
زندگی اور نکھر آئی ہر الزام کے بعد

مجھ کو اکثر ہوا آدابِ جُنوں کا احساس
کبھی آغاز سے پہلے، کبھی انجام کے بعد

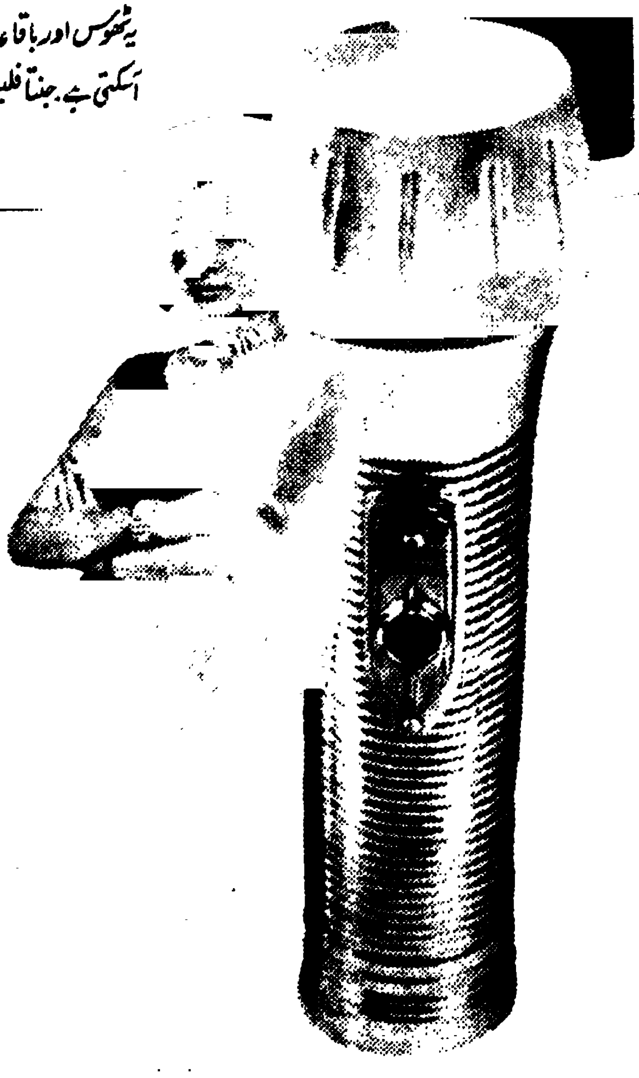
بادۂ عشق میں کتنا تھا سرُور اے جوہرؔ
عُمر بھر ہوش نہ آیا مجھے اِک جام کے بعد

بھروسہ کے لائق
فلیش لائٹ

لیجئے ایک ایسی فلیش لائٹ جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ہمیشہ کارآمد ہونے نے اسے ہر جگہ ایک مثالی ساتھی بنا دیا ہے۔ یہ ٹھوس اور باقاعدہ ہے۔ اور آپ کے آرائشی بیگ میں بہ آسانی آسکتی ہے۔ جنتا فلیش لائٹ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔

JANTA

ایک جیپ پروڈکٹ



جیپ فلیش لائٹ
انڈسٹریز لمیٹیڈ
۲۸۔ ساؤتھ روڈ۔ الہ آباد۔ ۱

STERLING-GF-492

انتقام

ڈاکٹر کیول دھیر

میڈیکل آفیسر، جیتو منڈی، ضلع بھٹنڈہ (پنجاب)

۳۰ نومبر ۶۵ء   جنابِ محترم خوشتر صاحب! آداب

"بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین کے لئے ایک تخلیق "انتقام" حاضر ہے۔ یہ تاریخی افسانہ ہے۔ سکندرِ اعظم کی رومانی زندگی کا ایک ورق! ایک حقیقت۔ جس سے اُس حسین عورت کے جذبات وابستہ ہیں جس نے اپنی بے حرمتی کا انتقام لینے کے لئے ہزاروں لاکھوں ابرانی زندگیوں کو تباہ کرا دیا۔ شاہانِ عجم کی بے بہا دولت، عظیم الشان محلوں اور ایوانوں کو نذرِ آتش کرا دیا اور اس طرح خون کی سُرخی اور آگ کے شعلوں سے اپنے جذبۂ انتقام کو سرد کیا۔ تمام عالم پر اپنی شجاعت و بہادری کا سکہ جمانے والا اسکندرِ اعظم اُس عورت کے آگے ایک حقیر انسان بن کر رہ گیا ——— چند ماہ پہلے راجہ بھائی (راجہ مہدی علی خاں) کی ایک کتاب (جس کا نام شاید "ملکاؤں کے رومان" ہے) میں یہ داستان پڑھی تھی۔ جسے افسانے کی شکل میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میری ادبی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے جبکہ میں نے ایک تاریخی واقعہ کو افسانہ کا رُوپ دیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا، اِس نئے انداز میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔ اِس بات کا فیصلہ آپ اور "بیسویں صدی" کے قارئین پر چھوڑتا ہوں ——— نومبر کے شمارے میں آنے والے اپنے افسانے "پیاسی روحیں" کا ذکر کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ موجودہ گمراہ کن دَور میں بھی، جبکہ اُردو زبان کے گرد "سیاسی جال" پھیلانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی گئی، اگر اُردو زبان زندگی کی صحت مند سانسیں لے رہی ہے تو یہ صرف آپ ہی جیسے لوگوں کے دم سے ہے اور اُن سب میں آپ کا کردار چاند کی چاندنی جیسا نظر آتا ہے ——— "بیسویں صدی" (آپ اور "بیسویں صدی" ایک ہی روشنی کے دو نام ہیں) اُردو ادب کی بقا کے لئے، اِسے زندۂ جاوید بنائے رکھنے میں آج نہایت اہم رول ادا کر رہا ہے اور آپ صحیح معنوں میں اُردو ادب کو بلند ترین مقام بخشنے میں اپنی تمام تر کوششوں کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں۔ کبھی جس طرح حُسن کار ہاتھوں نے "تاج محل" کو لازوال حُسن بخشا تھا، اُسی طرح آپ نے بھی "بیسویں صدی" کو فنی و ادبی حُسن سے سجایا، سنوارا ہے۔ یقیناً "بیسویں صدی" ادبی دُنیا میں "تاج محل" کی حیثیت رکھتا ہے! ——— اور اِس کا ثبوت وہ بے شمار خطوط ہیں جو قارئین نے "پیاسی روحیں" کے بارے میں لکھے ہیں۔ میں اُن سب سے کہنا چاہتا ہوں کہ مبارکباد کے مستحق تو خوشتر صاحب ہیں، میں نہیں!...

خاکسار ——— کیول دھیر

مقدونیہ کا دربار رعنائیوں اور جلوہ ریزیوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف عیش و طرب کا سماں تھا۔ سکندرِ اعظم کی نشے میں غرق نگاہیں جیسے کسی حسین خواب سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ ذہن جیسے کسی مسرت رنگین تصور میں اُلجھ گیا تھا ——— ایک لمحہ کے لئے پلکیں جھک گئیں۔ پھر ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے جیسے آنکھوں کی خمار آلود چمک ———

بڑھ گئی اور جلد سے ہی لوسکندر کی نشے میں لڑکھڑاتی آواز ماحول میں گونج گئی ——
" مقدونیہ کا دربار آج تک اس بے مثال حُسن سے محروم کیوں ہے؟ فوراً اُسے ہمارے حضور میں پیش کیا جائے۔"

اور جب تائیس کو سکندر کے روبرو پیش کیا گیا تو وہ چونک اُٹھا۔ اتنی حسین کافر ادا کنیز آج تک اس کی نظروں کے سامنے سے نہیں گزری تھی۔ اُس کے حُسنِ ملیح کی ہوش رُبا تجلّیوں کے آگے سلطنتِ مقدونیہ کا بادشاہ سکندرِ اعظم اپنے آپ کو غلام محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا سروِ آسا قد، انار کی کلیوں کی مانند سُرخ ارغوانی لب اور سنبل کے مانند گیسو، سکندر کے دل کی دھڑکنوں کو تیز تر کر چکے تھے اور وہ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

" تخلیہ!" —— اور چند لمحوں کے بعد وہاں صرف سکندر تھا اور اُس کے پہلو میں تھی تائیس!

- بدی کا بیج بو کر نیکی کا پھل کاٹنا چاہتے ہو۔ اِس سے بڑھ کر حماقت کیا ہوگی۔
  (سوامی سارشدانند جی)
- زندگی سب کو ملتی ہے لیکن کامیاب زندگی وہ نہیں ہے، جس سے صرف اپنا بھلا ہو۔ بلکہ وہ ہے جس سے اپنے پرائے سب فائدہ اُٹھائیں۔ (بھرتری ہری)
- جہاں کرم ہے وہاں ایمان ہے۔ جہاں حرص ہے، وہاں معصیت ہے۔ جہاں غصّہ ہے وہاں تباہی ہے۔ (ہندی ادب)
- دوست وہ ہے جو ڈھال کی مانند ہو۔ سلامتی میں پیچھے رہے اور مصیبت میں آگے۔ (ہندی ادب)

سکندر ابھی، سکندرِ اعظم نہیں بنا تھا۔ اپنے باپ بادشاہ فیلقوس کی وفات کے بعد ابھی اُس نے عنانِ حکومت سنبھالی ہی تھی۔ اُس کے دل میں ساری دُنیا کو فتح کرنے کی خواہش پیدا ہو چکی تھی لیکن ایک دوسری دُنیا بھی اُس کی آنکھوں کے سامنے رقص کر رہی تھی —— عیش و عشرت کی دُنیا! کیونکہ ابھی شباب کا آغاز تھا اور یونانی روایات اُس کے جذبات میں ہیجان بپا کرنے کا باعث تھیں، اِس لئے دوسری دُنیا میں وہ غرق ہو چکا تھا۔ اُمراء و وزراء اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے اکثر اوقات حسین و جمیل کنیزیں اُس کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ تائیس کے حُسن کی شہرت جب مقدونیہ کے دربار میں پہنچی تو سکندر کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

سکندر کا زیادہ تر وقت اب تائیس کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ تائیس خوبصورت ہی نہ تھی، بے حد ہوشیار اور چالاک بھی تھی۔ اُس نے سکندر کو اپنی دلفریب اداؤں سے اِس قدر فریفتہ کر لیا تھا کہ وہ ایک ایک لمحہ تائیس کے قرب ہی میں گزارنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سکندر اُسے ہر جگہ، ہر لمحہ اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ وہ ہر وقت تائیس کی محبت میں غرق رہتا۔ اِسی طرح وقت آگے بڑھتا رہا۔

اچانک ایک دن سکندر کے دل میں پھر اُسی جذبے نے سر اُٹھایا —— ساری دُنیا کو فتح کرنے کا جذبہ بیدار ہو اُٹھا۔ عیش و عشرت کی زندگی سے باہر آ کر اُس نے نہایت سنجیدگی سے اپنے اِس جذبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر غور کیا اور چند ہی لمحوں بعد وہ تائیس کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ تائیس آئینے کے سامنے بیٹھی بن سنور رہی تھی۔ آئینے ہی میں اُس نے سکندر کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ سکندر کا چہرہ شاداب تھا، آنکھوں میں عزم کی جھلک نمایاں تھی۔ قریب پہنچتے ہی سکندر نے پیار سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُس سے مخاطب ہوا۔

" تائیس! میں نے ساری دُنیا پر فتح حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ سب سے پہلے میں ایران کے بادشاہ دارا پر فتح حاصل کروں گا۔ میں تمہیں کسی بھی حالت میں خود سے الگ نہیں کر سکتا۔ میری یہ خواہش ہے کہ تم بھی میرے ساتھ رہو۔"

تائیس یک بیک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں جیسے انگارے دہک رہے ہوں اور پھر اُس نے سکندر کی طرف دیکھا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کی سُرخی بڑھ رہی تھی اور اعصاب کا تناؤ شدّت اختیار کر چکا تھا۔ اپنی دونوں مُٹھیاں بھینچ کر تائیس صرف اِتنا ہی کہہ سکی: " اگر آپ سلطنتِ ایران پر فتح حاصل کرنے جا رہے ہیں تو یقیناً میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ ایرانیوں کی شکست میں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

سکندر چلا گیا تو تائیس اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ ململ بستر میں کروٹیں بدلتی رہی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی تصویریں رقص کر رہی تھیں۔ جتنی شدّت کے ساتھ اُس کے جذبات اُمڈ رہے تھے، وہ محسوس کر رہی تھی کہ گھٹن بڑھ رہی ہے۔

تائیس نے اپنے ذہن میں ایران کے دریائے پلوار کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی کی جھلک دیکھی۔ اُس نے دیکھا کہ اِس بستی کے مشرق میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے، جہاں اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ اُس نے بچپن گزارا ہے۔ جہاں کی ہر شے اُسے مانوس سی نظر آئی —— ماں، باپ، بہن، بھائی اور قبیلے کے دوسرے لوگ ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے اور . . .

اور بے اختیار وہ رو پڑی۔ سسک سسک کر روتی رہی۔ کئی سال گزر جانے کے بعد آج پہلی بار اُس نے اپنی غمناک زندگی کی پُرنم داستان پر آنسو بہائے تھے، سسکیاں بھری تھیں۔

دیرینہ پلوانکے کنارے واقع اِس بستی میں زیادہ تر ایرانی قبیلے آباد تھے۔ یہاں ان کے علاوہ ایک یونانی قبیلہ بھی آباد تھا جو اپنے ملک سے جلاوطن ہونے کے بعد یہاں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ اِس قبیلے کے مرد جنگجو اور جفاکش تھے اور عورتیں نہایت نازک اور حُسن و جمال میں لاثانی تھیں۔ ایران کے کئی قبیلوں کے سرداروں نے بارہا یہ کوشش کی تھی کہ وہ اِس قبیلے کی خوبصورت عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر لیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ نزدیک کی 'شاہپ' نامی ایک ایرانی بستی کے سردار گزدار نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی اور جب اُسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اُس یونانی قبیلے کا دشمن ہو گیا۔ ہر وقت وہ کسی ایسے موقع کی تاک میں رہتا جب اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔ ہر لمحہ انتقام کی آگ اُس کے سینے میں تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

اور ایک روز گزدار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

آسمان شفق کی تجلّیوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ پہاڑ کے دامن میں شفّاف پانی کا چشمہ رواں تھا۔ سرسبز و شاداب پیڑ پودوں اور درختوں نے جیسے چشمے کو اپنے آنچل میں سمیٹ رکھا تھا۔ ماحول میں ایک ایسا سکوت طاری تھا جو روح کو تسکین بخشتا ہے۔ اِس سکوت کو یا تو پرندوں کے چہچہانے کی سُریلی آوازیں توڑ رہی تھیں یا چشمے کا پانی چھوٹے بڑے پتھّروں کے سینے سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہا تھا۔ نہایت دلکش و مسرور کُن منظر تھا۔ یونانی قبیلے کی دو نوجوان دوشیزائیں ——— تائیس اور بختر، اِس چشمے سے پانی بھرنے کے لئے آئی تھیں لیکن ایک بڑے سے پتھّر پر ساتھ ساتھ بیٹھی نہ جانے حسین خوابوں کی کس دُنیا میں پہنچ گئی تھیں۔ محویت کے عالم میں بیٹھی دونوں دوشیزاؤں کی دھڑکنیں اُن کے دلی تلاطم کی آئینہ دار تھیں۔ شباب انگڑائیاں لے رہا تھا۔

اور جبھی ایک اجنبی نوجوان کو وہاں موجود پا کر وہ دونوں چونک گئیں۔ یہ نوجوان ایرانی قبیلے کا سردار گزدار ہی تھا جو تائیس اور بختر کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت دیر سے ایک درخت کی آڑ لے کر اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ اُنھیں عالمِ محویت میں دیکھ کر گزدار جب درخت کی اوٹ سے باہر آیا تو اچانک ہی دونوں کی نظریں اُس پر پڑیں۔ تائیس چیخ مار کر ایک طرف بھاگی لیکن گزدار نے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو دیکھ کر بختر جہاں تھی وہیں پتھّر سی ہو کر رہ گئی۔ گزدار کا قہقہہ ماحول کے سکوت کو توڑتا ہوا اِس ویران وادی کے اطراف میں پھیل گیا۔ تائیس اب گزدار کی مضبوط گرفت میں تھی اور بختر ایک پتھّر پر لُڑھکی سی کانپ رہی تھی۔ گزدار نے بختر کی طرف پُر ہوس نگاہیں پھینکیں اور اُس سے مخاطب ہوا: "ایک مُدت سے میرے سینے میں انتقام کی آگ جل رہی ہے۔ آج تم دونوں کو پا کر اُسے ٹھنڈی کروں گا۔ آج اُس بے عزتی کا بدلہ لوں گا جب تمھارے قبیلے کے سردار نے میری درخواست پر ٹھوک دیا تھا۔"

گزدار کا ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔ تائیس اور بختر کے جسم لرز گئے۔ گزدار نے تائیس کو اپنے کندھے پر ڈال لیا اور گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھتا ہوا بختر سے مخاطب ہوا: "لڑکی! اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو کچھ ہی فاصلے پر کھڑے میرے آدمی تمھاری بوٹی بوٹی نوچ ڈالیں گے!" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ بختر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور خوف سے اُس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ گزدار جب وہاں سے رخصت ہوا تو تائیس اور بختر سے اُس نے کہا: "میں نے تم دونوں سے ایرانی سردار کی توہین کا بدلہ لیا ہے!"

رات کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ سکوت اور بھی گہرا اور خوفناک ہو گیا تھا۔ تائیس اور بختر کے چہرے زرد تھے۔ جیسے خون کی ایک بھی بوند جسم میں نہ ہو۔ دونوں سسک

- جس کے ہمسائے اُس کی ایذا دہی سے محفوظ نہ ہوں وہ بہشت میں نہ جائے گا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- اگر میری موت اِس حالت میں آئے کہ سعی و محنت سے اپنی روزی تلاش کر رہا ہوں تو یہ مجھے اِس سے زیادہ پسند ہے کہ خدا کی راہ میں غازی بن کر مروں۔ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)
- سچائی میں گو خوف و خطر ہو لیکن وہ باعثِ نجات ہے۔ جھوٹ میں گو بظاہر عافیت نظر آئے گی لیکن وہ موجبِ ہلاکت ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- تم اگر کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرتے تو شائستہ انداز سے اُسے اُس کی برائیوں ہی سے آگاہ کرتے رہو کہ یہ بھی اُس کے ساتھ نیکی ہوگی۔ (سقراط)

سسک کر رو رہی تھیں ——— گزدار نے اُنھیں پا کر آج اپنا انتقام لے لیا!

تائیس اور بختر نے جب تمام داستان اپنے قبیلے کے سردار کو سُنائی تو قبیلے کے تمام لوگوں کا خون اُبل اُٹھا۔ اُنھوں نے اِسے اپنے قبیلے کی عورتوں کی بے حرمتی ہی نہیں بلکہ اِسے یونان کی غیرت پر حملہ تصوّر کیا اور اُسی روز اُنھوں نے گزدار کی بستی شاہپ پر حملہ کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُنھوں نے خون کی ندیاں بہا دیں لیکن جیسے ہی یہ خبر علاقہ میں پھیلی فوراً ہی دوسرے ایرانی قبیلوں کی طرف سے گزدار کو کمک پہنچ گئی اور اِس ایک یونانی قبیلے پر کئی ایرانی قبیلوں نے حملہ کر دیا۔ یونانی قبیلے کے خیمے جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ ایک ایک مرد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور عورتوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ گزدار اور دوسرے ایرانی قبیلوں نے بہت سی خوبصورت عورتوں کو اپنے پاس رکھ لیا اور باقی

تمام ایک یونانی سوداگر کے ہاں فروخت کردی گئیں۔

تائیس اور بختر یونانی سوداگر کو ملیں۔ کسی طرح وہ ایرانی قبیلوں کے سرداروں کی نظر سے بچا کر اُن عورتوں کے ساتھ جا ملی تھیں جنہیں فروخت کر دیا تھا۔ یونانی سوداگر کئی ممالک سے ہوتا ہوا یونان کی طرف روانہ ہوگیا۔ جب وہ یونان پہنچا تو اُس کے پاس تائیس اور بختر ہی رہ گئی تھیں۔ کیونکہ یہ دونوں دوشیزائیں نہایت خوبصورت تھیں۔ اس لئے سوداگر ان کی بڑی سے بڑی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔

ایک دن ایتھنز کے بارونق بازار میں یونانی سوداگر نے تائیس اور بختر کو بھی فروخت کر دیا۔ اُسے مُنہ مانگی قیمت مل گئی تھی۔ بختر کو ایک ارمنی رئیس نے خریدا تھا۔ اور تائیس کو ازکوبی نامی ایک یونانی طوائف نے حاصل کر لیا تھا۔

ازکوبی یونان کی ایک مشہور طوائف تھی اور مقدونیہ کے دربار تک اُس کی رسائی تھی۔ تائیس کے عوض بہت بڑی رقم دینے کا اُسے کوئی افسوس نہ تھا کیونکہ اُس کی حُسن شناس نگاہوں نے ایک ہی نظر میں تائیس کے بے مثال حُسن کی قیمت و اہمیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ تائیس کی بدولت وہ بے پناہ شہرت و دولت حاصل کر سکے گی۔

اور ہوا بھی یہی۔ ازکوبی نے تائیس پر دل و جان سے محنت کی اور اپنے فن کے سارے گُر اُسے سکھائے۔ تائیس تو قدرتی ہی طور پر نہایت خوبصورت تھی، بناؤ سنگھار نے اُس کے حُسن کو دوبالا کر دیا۔ اب حُسن کی جلوہ گری اور ناز آفرینی میں تائیس کا جواب نہ تھا۔ ازکوبی کو اسی دن کا انتظار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے یونان میں تائیس کی شہرت پھیل گئی۔ اُس کے یہاں یونان کے مشہور فوجی جرنیل، مدبر، رؤسا و اُمراء آنے لگے اور تائیس اِس نئی زندگی میں اپنے آپ کو مطمئن سی محسوس کرنے لگی۔ ایک طرح سے سارا یونان اُس کا گرویدہ ہو چکا تھا۔

اور جب مقدونیہ کے دربار میں تائیس کے حُسن کی شہرت گونجی تو سکندر بے اختیار ہو اُٹھا اور... اب تائیس صرف سکندر ہی کی ہو کر رہ گئی! وہ جب بھی تائیس کا قرب حاصل کرتا، اُس کی نشیلی آنکھوں میں جھانک کر کہتا "تائیس! نہ جانے تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے کہ دلِ مضطرب کو تمہارے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی قرار حاصل نہیں!" —— اور تائیس کا فراوا کے ساتھ مُسکرا دیتی —— دلآویز مُسکراہٹ ہی سکندر کے سوال کا جواب ہوتی! اِس طرح تائیس اپنی زندگی میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی اُس مقام تک پہنچ چکی تھی، جس کا اُس نے کبھی تصوّر نہیں کیا تھا۔ وہ سکندر کی صرف منظورِ نظر کنیز ہی نہ تھی اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر وہ خاص مقام حاصل کر چکی تھی۔ جو صرف ایک محبوبہ ہی کو حاصل ہوتا ہے۔

نرم و گداز مخملی پلنگ پر کروٹیں بدلتی ہوئی تائیس اپنے ماضی کے جھروکوں میں جھانک رہی تھی۔ جب سے اُس نے سکندر کی زبان سے یہ سُنا تھا کہ وہ ایران کے بادشاہ دارا کی سرکوبی کے لئے روانہ ہو رہا ہے اور اُسے [illegible] جذباتی ہو گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر رقصاں تھا جب ایرانی سردار گزدار نے اُسے اور بختر کو اپنی ہوس کا شکار بنایا تھا۔ وہ اپنے تعلقے کی کھڑکی میں وہ منظر دیکھ رہی تھی جب گزدار اور دوسرے ایرانی قبیلوں نے اُن کے قبیلے کے لوگوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ معصوم بچّوں کے جسموں کو نیزوں کی نوک سے چھلنی کر دیا تھا، جہاں عورتوں کی بے حرمتی کی تھی اور قبیلے کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح فروخت کر دیا تھا۔ دوجانے اُن کا کیا حشر ہوا ہوگا؟ بختر —— اور بختر کی یاد آتے ہی تائیس فرطِ بیقراری سے تڑپ تڑپ اُٹھی۔ وہ کہاں ہوگی ——؟ کس حال میں ہوگی ——؟ ایسے ہی سوالات اُس کے ذہن پر کاری ضرب لگانے لگے اور...

اور تائیس یکبارگی بے پناہ جوش سے بھر اُٹھی۔ اُس کا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ لرز اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا، چہرہ تمتمانے لگا اور دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔ اُس کے ذہن کا تناؤ شدّت اختیار کرتا گیا۔ اِس وقت وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کانوں میں صرف یہی ایک آواز گونجتی محسوس کر رہی تھی —— "ظالم ایرانیوں سے انتقام لینے کا یہی وقت ہے... انتقام!!... انتقام... انتقام؟"

اور دوسری صبح کو سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی سکندر اپنی فوج کے ساتھ ایران کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تائیس اُس کے ہمراہ تھی۔

سکندر کی فوجوں نے جدھر بھی رُخ کیا، اُسی طرف فتوحات اُس کے قدم چومنے کے لئے بے چین نظر آئیں۔ ایران کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتی ہوئی سکندر کی فوجیں ایران کی جانب پیش قدمی کرتی گئیں۔ سکندر نے اربیل اور شام پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شوستر پر بھی سکندرِ اعظم کا قبضہ ہو گیا اور 'پارس' میں جو فیصلہ کُن جنگ ہوئی اُس میں یونانیوں نے ہمیشہ کے لئے ایران کی سلطنت کو کمزور بنا دیا۔

تائیس جنگ کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور تلف ہونے والی ہر ایرانی زندگی اُس کی روح کو تسکین عطا کرتی۔ اُس کا جذبۂ انتقام تسکین محسوس کرتا اور پُر وقار انداز میں ایرانی لاشوں کے انباروں پر یوں نظر پھینکتی ہوئی آگے بڑھ جاتی جیسے یہ زندگیاں موسمِ خزاں میں درختوں سے الگ ہوئے خشک پتّے ہوں!

سلطنتِ ایران پر اپنی قوت و عظمت کا سکّہ جمانے کے بعد سکندرِ اعظم نے اپنے قیام کے دَوران ایرانی زندگی اور حُسن و شباب کے چمن سے خوشہ چینی کی —— یونانی فوج بھی سکندر سے پیچھے نہیں رہی۔ یہ سب تائیس کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ایک عورت کی موجودگی میں ہزاروں عورتوں کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ بے شمار زندگیاں موت کا شکار ہو رہی تھیں اور تائیس اِس سے اپنے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

اُس رات ایرانیوں کے قصرِ صدستون میں سکندرِ اعظم نے جشنِ طرب منعقد کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ جشن میں بے شمار ایرانی لڑکیوں کو نیم برہنہ رقص کے لئے مجبور کیا گیا۔ قصر میں چاروں طرف عیش و طرب کا دَور دورہ تھا۔ تائیس بھی سکندرِ اعظم کے قریب ہی جلوہ افروز تھی۔ امراء و وزراء شرابِ ارغوانی کے جام نوش کر رہے تھے اور نشے کے عالم میں اُن سے عجیب و غریب بدحواسیاں ہو رہی تھیں۔ اِس وقت سکندرِ اعظم بھی بھرپور نشے میں تھا اور اُس کی نگاہیں، اُس کے ہاتھ اِدھر اُدھر بہک رہے تھے تائیس یہ سب دیکھ رہی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں شراب کی سی مستی نہیں تھی۔ اب بھی انتقام کی آگ کے شعلے لپکتے محسوس ہو رہے تھے۔ سکندرِ اعظم کی نشیلی نگاہوں نے جب تائیس کا جائزہ لیا تو اُس نے محسوس کیا کہ تائیس کا حُسن اور بھی نکھر گیا ہے۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اور بڑھ کر اُس نے تائیس کو گرفت میں لے لینا چاہا۔ اُسے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ یہاں اور لوگ بھی موجود ہیں۔ تائیس ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔ اور سکندر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اُس نے تحکمانہ لہجہ میں کہا: "ہوش میں آؤ! دوسرے لوگوں کی موجودگی میں سکندرِ اعظم کو ایسی حرکت زیب نہیں دیتی!" لیکن سکندر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اِس وقت وہ سکندرِ اعظم نہیں، ایک عام انسان ہی کر رہ گیا تھا۔ شراب میں اُس کی عظمت، تحلیل ہو چکی تھی۔ بے بس ہو کر تائیس نے کہا: "میں تخلیہ چاہتی ہوں!"

اور دوسرے ہی لمحہ قصر خالی ہو چکا تھا۔ وہاں صرف سکندر اور تائیس ہی رہ گئے تھے۔ سکندر اب بھی جذبات کے نشے میں سرشار تھا ـــــ اچانک ہی تائیس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور اُس کے رویّے میں یک بیک تبدیلی آگئی۔ اب وہ اپنی ہر ادا سے اُسے مسحور کرنے لگی اور اُس کے جذبات میں ایک طوفان بپا کر دیا، ایک ہلچل پیدا کر دی۔ تائیس نے دیکھا کہ سکندرِ اعظم کے جذبات اِس وقت شدّت اختیار کر چکے ہیں اور پُورے طور پر وہ اُس کے زیرِ اثر ہے۔ اپنے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کا یہ سُنہرا موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ سکندر کی گردن کے گرد اپنے دونوں بازو حمائل کرتے ہوئے اُس نے پیار بھری ایک مُسکان اُس پر پھینکی اور بولی۔

"میری ایک خواہش ہے۔ کیا تم اِسے پُورا نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں؟ صرف تمہارے حکم کی دیر ہے!" سکندر نے لڑکھڑائی سی آواز میں جواب دیا۔

"تو میں خشیارش کے بناتے ہوئے اِن عظیم الشان و خوبصورت ایوانوں کو آگ کے سُرخ شعلوں میں نہاتے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"بس؟" سکندر نے کہا۔

"نہیں!" تائیس نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: "میری یہ خواہش ہے کہ تمام ایرانی قیدیوں کو میری نظروں کے سامنے تہِ تیغ کر دیا جائے۔"

"اور کوئی خواہش؟" سکندر نے پُوچھا۔

"ہاں! ایک خواہش اور ہے۔ اِن لاشوں کو دفنایا نہ جائے۔ خشیارش کے جلتے ہوئے ایوانوں ہی میں اِنھیں پھینک دیا جائے تاکہ رُوئے زمین پر ایرانیوں کا نام و نشان باقی نہ رہے!"

اور دوسرے ہی لمحہ سکندرِ اعظم نے تائیس کی خواہش کے مطابق حکم دیا کہ تائیس کی موجودگی میں تمام ایرانی قیدیوں کا سر قلم کر دیا جائے۔ خشیارش کے تمام ایوانوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے اور ایرانی قیدیوں کی لاشوں کو جلتے ہوئے ایوانوں میں سے لپکتے شعلوں کی نذر کر دیا جائے!

تائیس کے روبرو ہزاروں انسانی زندگیاں تہِ تیغ کر دی گئیں اور انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے ایک عورت کے جذبات تسکین حاصل کرتے رہے ـــــ صدہا سالوں کی شاہانِ عجم کی بے بہا دولت، خشیارش کے عظیم الشان و خوبصورت ایوان جل رہے تھے۔ اُن میں سے سُرخ شعلے لپک رہے تھے اور ایک عورت کے جذبۂ انتقام کی گرمی اُن شعلوں سے ٹھنڈی ہو رہی تھی ـــــ اُن جلتے ہوئے ایوانوں میں انسانی جسم بے رحمی سے پھینکے جا رہے تھے اور انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی ایک عورت کا دل ایک لمحہ کے لئے بھی نہ تڑپا ـــــ اور قوی ارادے والا، تمام عالم پر اپنی قوت و شجاعت کا سکہ جمانے والا سکندرِ اعظم اپنی محبوبہ کے آگے ـــــ ایک عورت کے آگے، ایک حقیر انسان کی طرح اُس کا حکم بجا رہا تھا!!

غزلیں

ساغر عابدی وارثی

میں خوب سمجھتا ہوں تری چشمِ کرم کو
ایمائے کرم اور ہے ، اندازِ کرم اور

ہر حادثہ دیتا ہے مجھے عزمِ سفر کا
ملتا ہے سہارا تو بہکتے ہیں قدم اور

اِک تیری محبت ہی نہیں ہے غمِ آخر
باقی ہیں ابھی زیست میں کچھ رنج و الم اور

ہم کشتۂ حالات انہیں جی بھر کے ستالو
باقی نہ رہے دل میں تمنائے ستم اور

واقف نہیں اَسرارِ محبت سے ابھی تم
تم ہم کو بھلاؤ گے تو یاد آئیں گے ہم اور

خوگر ہے ستم کا دلِ بربادِ تمنا
اے دشمنِ اربابِ وفا! کوئی ستم اور

یہ دَور، یہ حالات بدل جائیں گے ساغر
یہ تلخیٔ پیہم، یہ خلش ہے کوئی دم اور

زیب بریلوی

نگاہیں مسکراتی ہیں مرے افکار کی خاطر
غزل ہوتی ہے لب ہائے تبسم بار کی خاطر

گدازِ فکر کی خاطر، شکستہ تار کی خاطر
محبت گیت گاتی ہے دلِ فنکار کی خاطر

خموشی جھوم جاتی ہے لبِ اظہار کی خاطر
یہ دھڑکن گنگناتی ہے تمہارے پیار کی خاطر

گزرگاہِ وفا میں ہر قدم، ہر گام و منزل پر
یہ آنکھیں جھک گئی ہیں احترامِ یار کی خاطر

فضائے رنگ و بو نے احتراماً گل بکھیرے ہیں
شفق زارِ محبت میں خرامِ یار کی خاطر

سرِ میخانہ ساقی یہ بھی سوچا ہے کبھی تو نے
کہ دورِ جام و پیمانہ ہے بادہ خوار کی خاطر

مچلتا ہے دلِ دیوانہ وہ جب دیکھ لیتے ہیں
مگر خاموش رہتا ہے مزاجِ یار کی خاطر

کیف احمد صدیقی

مری آنکھ اشکوں سے تر بھی نہیں
اب احساسِ دردِ جگر بھی نہیں

کچھ ایسا ہوں مانوسِ شامِ الم
مجھے انتظارِ سحر بھی نہیں

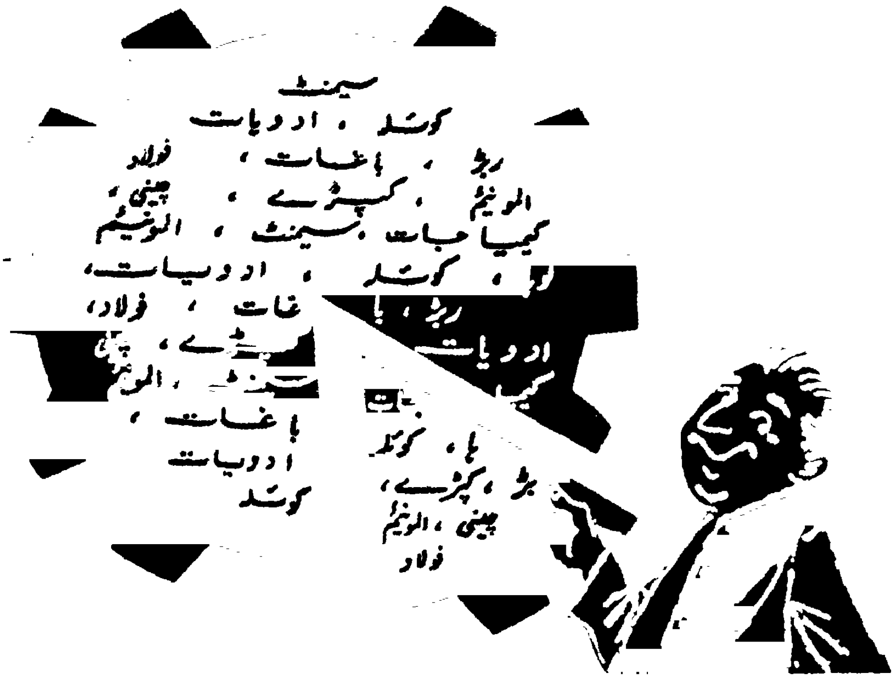
تری یاد سے بے خبر بھی ہے دل
تری یاد سے بے خبر بھی نہیں

وہ کیا دیکھتے تیرے جلوے بھلا
جنھیں اعتبارِ نظر بھی نہیں

وہی آج ہیں رہبرِ کارواں
کہ جن کو شعورِ سفر بھی نہیں

رہا کب کیا مجھ کو صیاد نے
کہ جب طاقتِ بال و پر بھی نہیں

وہ کیا شعر جس میں نہ ہو کیفِ غم
وہ کیا آہ جس میں اثر بھی نہیں



آپ ۲۵۰ سے زیادہ کمپنیوں میں حصہ دار کیسے ہو سکتے ہیں؟

جب آپ یونٹ خریدتے ہیں تو آپ کا روپیہ المونیم، سیمنٹ، کیمیاجات، ادویات، کوئلہ، لوہا اور فولاد، باغات، ربڑ، جہاز سازی، چینی اور کپڑے کے کارخانوں جیسی ۲۵۰ سے زیادہ کمپنیوں میں لگایا جاتا ہے۔

یونٹ میں لگا روپیہ محفوظ رہتا ہے اور آپ جب چاہیں اُسے واپس لے سکتے ہیں۔ آپ کو اچھا خاصا منافع بھی ملتا ہے (پچھلے سال سرمایہ لگانے والوں کو سو روپے پر چھ روپے دس پیسے کا منافع دیا گیا تھا) آپ کو ٹیکسوں میں رعایت بھی ملتی ہے۔ یونٹ کو کسی بھی وقت بھنایا جا سکتا ہے۔

یونٹ خریدنے کا یہ موزوں ترین وقت ہے۔ ایک یونٹ کے دام دس روپے ہیں۔ آپ انہیں دس دس کی تعداد ہی میں خرید سکتے ہیں — ایک سو روپے سے کم کے یونٹ نہیں خریدے جا سکتے۔ آپ انہیں اپنے بینک یا اسٹاک ایکسچینج کے رجسٹر شدہ دلالوں سے خرید سکتے ہیں۔ ٹرسٹ یونٹ کے خریدنے اور بیچنے کی قیمتیں ہر روز مقرر کرتا اور ان کا اعلان کرتا ہے۔

یونٹ خریدیں

یہ سرمایہ لگانے کا بہترین ذریعہ ہے

یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

صدر دفتر : بمبئی — بمبئی وقف بلڈنگ، ۵۰، سر ویر نریمان روڈ،
پوسٹ بکس نمبر ۲۰۰
شاخیں :
کلکتہ — ریزرو بینک آف انڈیا اینکسی، ۴ نیتاجی سبھاش روڈ، پوسٹ بکس نمبر ۵۵۲
مدراس — ریزرو بینک بلڈنگ، فورٹ گلیسس، ساؤتھ بیچ روڈ

افسانہ

کالی جنّت

سیّد شمیم اشرف

کشنہری۔ پوسٹ آفس رام سنیہی گھاٹ۔ بارہ بنکی

۱۵ دسمبر ۶۵ء　　　　محترم خوشتر صاحب! آداب

. . . دلّی میں پھول والوں کی سیر کے بعد ذرا اس 'کالی جنّت' میں بھی جھانک لیجئے۔ یہ کہانی فٹ پاتھ کی زندگی سے متعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ کہانی تشنہ اور اشاراتی ہے لیکن اِس سے زیادہ وہ کردار مُبہم اور اشاراتی ہیں جو کسی اور کے قلم نے نہیں، معاشرے نے تخلیق کئے ہیں . . .

آپ کا اپنا ——— سیّد شمیم اشرف

یہ اُن لوگوں کی کہانی ہے، جن کے سیاہ بدن کی تپتی ہوئی رنگت بدن سے ڈھلکی ہوئی چونٹیوں کو چومتی ہوئی قوسِ قزح سے زیادہ حسین ہے۔ اُن کے رخساروں پر کانپتی ہوئی پسینہ کی گرم گرم بوندیں اجنتائی اپسراؤں کے تیکھے خد و خال سے زیادہ دلکش ہیں۔ یہ زندگی کا زہر واڈکا کی بوتلوں میں رکھ کر پیتے ہیں ——— نقشِ پا کی خونچکاں دُھندلاہٹوں میں بے برس و بے مقصود نشانِ منزل کی تلاش میں سرگرداں!

ہیہات ——— !!

راجو نائی ہے لیکن اُس کے کراہتے ہوئے زخمی خوابوں میں دلیپ کمار اور دیو آنند کبھی نہ آئے۔ وہ تو چند بے ہنگم اور غیر رُومانی کھوپڑیوں میں تجریدی آرٹ کے غیر فانی نمونے پیش کرتا ہے! اُنھیں شہیدِ مصفّٰی میں پرورش کرتا ہے۔ اُن کھوپڑیوں کے اندر کی دُنیا میں جھانکنے کی کوشش اُس نے کبھی نہیں کی۔ اُن کی تحلیلِ نفسی اور اخلاقی درجہ بندی سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جہل سے پیدا ہوا ہے اِس لئے اُس کے نزدیک دُنیا کا تصور ایک عظیم ہیئر ڈریسنگ سیلون ہے اور وہ شبراتی نانبائی سے لے کر ماوزے تنگ اور فیدل کاسترو تک سب کو ایک ہی اُسترے سے مُونڈ رہا ہے!

گھسیٹا تیل مالش کرتا ہے۔ وہ بہت فخر کے ساتھ اپنے کو ہائی برَو اور لو برَو قسم کی کھوپڑیوں کا اسپیشلسٹ سمجھتا ہے۔ اِن کھوپڑیوں میں جھوٹ، فریب، بیماری اور جہالت کے گھناؤنے کیڑے رینگ رہے ہیں۔ اُس کا یہی خیال ہے۔ جینے کی بیکراں خواہش اُس کے دل میں گیلی لکڑی کی طرح سُلگ رہی ہے۔ اُس کے خواب زخمی ہیں۔ آرزو کراہتی ہے۔ ہونٹ پیلے ہیں۔ اُس کی تھکی تھکی آنکھیں اُس کے اپنے وجود کی جھلسی ہوئی ویرانی میں گیہوں کی سُنہری بالیوں کے خوبصورت سائے تلاش کر رہی ہیں۔ روٹی اور حُسن ——— قحط اور عورت!

اُس کی قوتِ فیصلہ جواب دے رہی ہے۔

بے چارہ ——— !!

فیضو بُوٹ پالش کرتا ہے۔ اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کا بُجھا بُجھا قحط زدہ جسم ایک بڑے جوتے کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہو اور وہ سفید دھات کے کراہتے ہوئے سکّوں اور کاغذ کے مستطیل نما قوسِ قزحی ٹکڑوں کی جانگداز آہوں میں پناہ تلاش کرنے کی بجائے خود اپنے وجود کی گندی اور بدبُودار گلیوں میں آوارہ پھر رہا ہو!

وہ ایف۔ اے پاس ہے لیکن اُس نے اُن سُرخ و سپید رنگت والی خوبصورت کتابوں سے کبھی احتجاج نہیں کیا جو بیکاری کے غیر متوازن اور بدہیئت کھلونے تیار کرتی ہیں۔ سپر فٹ پاتھ پر بکھری ہوئی بجلی کی دُودھیا روشنی سے موت کی تاریک آغوش تک۔ اِن کھلونوں کی کہانی عبدالحمید کی قومی داستان نہیں بن سکتی ورنہ اُس کا عقیدہ ہے کہ جُوتا دُنیا کی عظیم ترین طاقت ہے!

برش اور طوطا مارکہ پالش کی ڈبیہ کا مسئلہ بمباروں اور پیٹن ٹینکوں سے کم خوفناک نہیں!

بمباروں کی تھوکی ہوئی بارود تاریخ کے سُنہرے اوراق میں جذب ہو جائے گی۔ پیٹن ٹینکوں کی لال زبان گنگ و جمن کی لہروں میں تہہ نشیں ہو جائے گی۔

لیکن پالش کی ڈبیہ باقی رہے گی!

فیضو کا یہی خیال ہے۔

اور اِس خیال کی کوئی منطقی یا اخلاقی بُنیاد ہو یا نہ ہو وہ اِسی انداز سے سوچتا رہا ہے۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کو یہی بات باور کرانے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ

تمہارے اُسترے کی دھار کبھی کُند نہ ہوگی!

تمہاری تیل مالش برسوں چلے گی۔

اور خود اُس کی زندگی جُوتے، برش اور پالش کی ڈبیوں کے مدار پر گردش کرتی رہے گی۔

دُنیا کے دوسرے مردوں کی طرح وہ بھی اپنی زندگی کے زہریلے اندھیروں میں محبت کے نرم رو چشموں کی نم آلود موسیقی تلاش کر رہا ہے۔

کسی ماہ وش حسینہ کے غنچۂ لب کی سحر کار مُسکراہٹیں!

رخساروں کے اُفق پر انگڑائیاں لیتی ہوئی کشمیر کی صبحیں!

سیاہ گیسوؤں کی مشک بار راتیں!

قُرب کے وہ اجنبی لمحات جو دل کی سوئی ہوئی وادیوں میں سمندر کی سرکش لہروں کا جادو چھڑک دیتے ہیں!

فیضو کا ذہن چیخ اُٹھتا۔

اُس کا وجود ایک دُکھتا ہوا پھوڑا بن جاتا..

کیونکہ یہاں تصورات کے اطلس و سنجاب میں لپٹی ہوئی زندگی کی معطر سانسوں سے دور زندگی کا وہ کرب انگیز تخیّل تھا جہاں گلاب کراہتے ہیں، کلیاں خون تھوکتی ہیں اور نانِ شبینہ کا ایک خشک ٹکڑا کسی قتالۂ عالم کے ہلالِ ابرو سے زیادہ حسین اور شعلہ رخسار حسینوں کے ہونٹوں میں مچلتے ہوئے شہد کے چشموں سے زیادہ شیریں ہے۔

یہ جینے کی بیکراں آرزو کا اعجاز ہے۔ جیسے شارک کے بچے سمندر کی خوفناک لہروں میں اپنا رزق تلاش کرتے ہیں۔

"میرے خدا!" فیضو زیرِ لب بڑبڑایا۔ "یہ جھیل کب تک پیاسی رہے گی؟"

اُس نے قمیص کی جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سُلگایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ دھوئیں کے ننھے ننھے دائروں میں میری گو راؤنڈ Merry go Round کی طرح بوقلموں جُوتے رقص کر رہے تھے۔

خوبصورت جُوتے ــــــ دیبا و حریر کی طرح ملائم! غرور و نخوت کی آتشِ سیال پی کر ٹکراتی ہوئی زندگی کے ناز و نعمت ہوئے سیم تن اور گُل اندام جوتے!!!

زندگی ایک پری تمثال حسینہ ہے لیکن اُس کے رسیلے ہونٹوں میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ اُس کی نشیلی آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی رنگوں کی حلاوت ایک سراب ہے۔ اُس کے نازک ماہتابی جسم کے اندر کی دُنیا میں کتنی تاریکی ہے۔ کتنی ویرانی!

فیضو کا ذہن ایک بار پھر کانٹوں میں اُلجھ گیا۔

وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتا رہا ــــــ اور سوچتا رہا۔

وہ تو اُس لڑکی کو دیکھ کر چونکا تھا جو اپنا پلاسٹک رنگ کا اسکوٹر پارک کر کے اُس کی طرف آ رہی تھی۔ سفید بے داغ بلاؤز اور نیکلی کلر اسکرٹ میں وہ بہت حسین نظر آ رہی تھی۔

اور ــــــ اِن ریڈیو ایکٹیو برگیڈ بارود توپوں، اور صوفی نورانوں پر سب جو نہ کش عداوت کا کیا اثر ہوگا جو اپنے جسم میں آگری بیشن ازم کے جراثیم لے کر اپنے حُسن کی تابکار شعاعوں کا جال کافی ہاؤسوں اور نائٹ کلبوں میں پھینکتی ہوئی نظر آتی ہیں اور پھر بن دس سال کے اُس حصّہ میں جہاں عورت چاہے جانے کی بیکراں خواہش میں سُلگتی رہتی ہے اپنی نشیلی آنکھوں کی قیمت مانگتی ہے۔ رخساروں میں انگڑائیاں لیتی ہوئی مسیح کی تازگی کا سودا کرنا چاہتی ہے۔

ہونٹوں کا آبِ حیات ــــــ صراحی دار گردن سے چھلکتی ہوئی نور کی شراب!

بتاؤ ــــــ کیا خرید وگے؟

وہ اُس کے جسم کی خوشبو تھی یا ایوننگ اِن پیرس کی! فیضو کے لاشعور میں گلاب کی کلیاں مُسکرانے لگی تھیں۔

"پالش!" لڑکی کی آواز میں روک اینڈ رول تھا۔ فیضو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُستاد علی اکبر خاں کے سرود کی کوئی تان ٹوٹ کر اُس کی روح میں جذب ہو گئی ہو۔

گھسیٹا نے کنگھا نکال کر پیشانی پر اُبھرے ہوئے بالوں کے ناہموار ننھے ننھے ٹیلوں پر ہندوستان کا نقشہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ راجو قینچی اُٹھا کر اپنی خوردبینی مونچھوں پر کشتیِ نوح بنانے لگا تھا۔

اور ــــــ جب لڑکی اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو فیضو اپنے تصور کی خوبصورت محرابوں کو بڑی بڑی حسین آنکھوں اور عطر بیز گیسوؤں سے سجا رہا تھا۔

"مائی ڈارلنگ مجنوں!" گھسیٹا اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر بولا ــــــ "وہ گئی چلی گئی!"

فیضو معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"اُٹھو۔ بہت دیر سے چائے نہیں پی ہے؟"

"چائے ــــــ! مجھے خونابۂ غم ہی پینے دو!"

"کھونا بۂ گم؟ واہ بیٹے کمال! یہ کون سی برانڈ کی چائے ہے؟"

فیضو صرف مُسکرا کر رہ گیا لیکن اُس کی آنکھوں سے غم جھانک رہا تھا۔

"زندگی کتنی بدصورت خستہ اور گھٹیا ہے!" وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور جیب میں چار مینار سگریٹ کا پیکٹ تلاش کرنے لگا۔

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵ ایسٹ۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۱۷ دسمبر ۶۵ء   محترم خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

آئندہ شمارہ کے لئے "شانِ نزول" کی نئی قسط ملاحظہ فرمایئے ــــــ سالنامہ حسبِ سابق اور حسبِ توقع بہت خوب ہے۔ قرۃ العین حیدر اور اقبال صدیقی کے افسانے تو بہت ہی خوب! مضامین نظم و نثر کی ترتیب و تدوین میں آپ نے ہمیشہ کی طرح جس نفاست اور خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ آپ یقیناً اس فن میں طاق اور لاثانی ہیں اور شاد عظیم آبادی کے اس مصرعے کو اپنے اوپر منطبق کرنے کا آپ کو پورا حق حاصل ہے ؎

ڈھونڈوگے ہمیں ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

میری چھوٹی سی ادبی زندگی بڑے بڑے حادثوں کی طویل داستان ہے، جسے کھل کر بیان کرنے لگوں تو نہ جانے کتنے عظیم الشان لوگوں کی عظمت کے ایوان برموں کی طرح کانپنے لگیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں کسی حادثے سے بھی دل شکستگی اور بے دلی کا شکار نہیں ہوا بلکہ ہر حادثے نے میرے تخلیقی شعور میں زیادہ تیکھاپن پیدا کیا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اپنی زندگی میں حاسد کبھی نہیں رہا ہمیشہ محسود رہا ہوں۔ اگرچہ مجھے اپنی ہیچمدانی کا بخوبی احساس ہے اور اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کہیں کا دانا اور کسی ہنر میں یکتا نہیں ہوں ــــــ خودستائی کی غرض سے نہیں بلکہ یہ سب کچھ اس لئے تحریر کر رہا ہوں کہ میرے بہت سے ایسے گندم نما جو فروش مہربان ہیں جو میرے معاملے میں بظاہر نہایت مسکین نظر آتے ہیں اور جن کی ظاہری مسکینی دیکھ کر مجھے بے اختیار یاسؔ یگانہ کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

دلِ طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا سو اب بھی ہے   بہت طوفان ٹھنڈے پڑ چکے ٹکرا کے ساحل سے

یہ لوگ میرے متعدد کرم فرماؤں اور حقیقی بہی خواہوں کو مجھ سے بدظن کرنے کے لئے اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ فرماتے رہے ہیں لیکن آپ یقین کیجئے کہ میں پہلے کی طرح اب بھی آپ کا نیاز مند ہوں اور مجھے آپ کی ذاتِ گرامی سے آج بھی اتنی ہی عقیدت ہے جتنی پہلے تھی۔ خدا کے فضل سے ہم دونوں انسان ہیں، فرشتے نہیں۔ غلطیاں ہم سے سرزد ہو سکتی ہیں اور ایک دوسرے سے شکایت بھی ہو سکتی ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے کبھی آپ سے کوئی شکایت ہوئی بھی تو اس کا اظہار براہِ راست آپ سے کرنے کی جرأت انشاء اللہ مجھ میں کبھی مفقود نہ ہوگی۔

آپ کا اپنا ــــــ نریش کمار شاد

داغؔ دہلوی نے اپنی وہ مشہور غزل، جس کا مقطع ہے ؎

ہرچند داغؔ ایک ہی عیّار ہے مگر
دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہاں کے ہیں

مشاعرے میں سنائی تو اس مشاعرے میں امیرؔ اور جلالؔ بھی موجود تھے۔ داغؔ نے مقطع پڑھتے ہوئے اِن دونوں حضرات کی طرف اشارا کرکے دوسرے مصرعے کو اس ترمیم کے ساتھ پڑھ دیا ؎

ہر چند داغ ایک ہی عیار ہے مگر
دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہاں کے ہیں

دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی چار سال کی نظر بندی کے بعد رہا ہوئے تو امرتسر میں کانگریس نے ان دونوں کے اعزاز میں ایک تاریخی جلسہ منعقد کیا۔ علامہ اقبال نے بھی اس میں شرکت فرمائی اور لاہور سے امرتسر جاتے ہوئے خاص اس موقع کے لئے یہ شعر لکھے اور امرتسر پہنچ کر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو مخاطب کرتے ہوئے جلسے میں پڑھے ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے، اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

ایک بار عزیز لکھنوی ایک محفلِ طعام میں مدعو تھے۔ کھانا کھاتے ہوئے اتفاق سے ایک بن رسیدہ مہمان کا دانت ٹوٹ گیا۔ عزیز نے یہ منظر دیکھ کر اُسی وقت یہ قطعہ کہہ دیا ؎

طفلی تھی یا کہ عہدِ مسرت کا ایک خواب
سمجھا نہیں کہ نیند کا جھونکا تھا یا شباب
ناپائیدار زیست کی اب کیا اُمید ہو
پیری نے بھی دیا مجھے دنداں شکن جواب

کسی طبیب نے خواجہ عشرت لکھنوی سے کہا کہ غذا بدن میں داخل ہو کر جزوِ بدن بن جاتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اس حقیقت سے انحراف کیا اور اپنی بات کے ثبوت میں اُسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا ؎

حکما کہتے ہیں ہوتی ہے، غذا جزوِ بدن
ہم تو تحلیل ہوتے جاتے ہیں غم کھانے سے

بسمل سعیدی سے اُن کے کسی بے تکلف دوست نے جب اُن کے کسی محبوب کے متعلق دریافت کیا تو بسمل صاحب چند لمحوں کے لئے کھو سے گئے۔ بڑی مشکل سے جب ذہن میں اُس محبوب کے خد و خال اُجاگر ہوئے تو بسمل صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور زبان سے بے اختیار یہ شعر ادا ہو گیا ؎

اُن کی صورت کا تصور ہے اب اتنا مبہم
جیسے دیکھا نہ ہو آنکھوں نے سُنا ہو اُن کو

برسات کا موسم تھا۔ بارش ہو رہی تھی لیکن اتوار کی وجہ سے بنک بند تھے اور قبلۂ رندانِ جہاں حضرت جوش ملیح آبادی کو پیسوں کی فوری طور پر اشد ضرورت تھی چنانچہ اُنھوں نے ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر عرش ملسیانی کو بھیج دیا ؎

غمِ دوراں کو پست کر دیجے
ساغر کا بندوبست کر دیجے

میرزا محمد رفیع سودا سے جب اِس مصرعے پر مصرع لگانے کی فرمائش کی گئی ؂

اے سنگ! نازکی میں تُو کامل نہ ہو سکا

تو میرزا نے اِس فرمائش کو اُسی وقت یوں پُورا کر دیا ؂

شیشہ گداز ہو کے نیا دل نہ ہو سکا

شاہ عالم کے فرزند شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار میں ایک بار شیخ مصحفی نے اپنی ایک غزل سُنائی، جس کا مقطع تھا ؎

تھا مصحفی قائلِ گریہ کہ پس از مرگ
تھی اُس کی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

مصحفی کے وہاں سے جانے کے بعد شہزادے کی فرمایش پر سید انشا نے اِس غزل کے اشعار کا خاکہ اُڑانا شروع کیا اور مقطع کا حلیہ اِس طرح بگاڑا ؎

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پسِ مرگ
رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں اُنگلی

ایک بار میرزا غالب اپنی شراب نوشی کے اخراجات کی وجہ سے بہت زیادہ مقروض ہو گئے اور قرض خواہوں نے اُن پر نالش کر دی۔ غالب کو ایک ملزم کی حیثیت سے جواب دہی کے لئے مفتی صدر الدین احمد خاں کی عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ اُس وقت

غالب نے جواب دعویٰ کے طور پر یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر پڑھ دیا ؂

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں !
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب غالب کے معتقد تھے۔ انھوں نے قرض کی رقم اپنی گرہ سے ادا کرکے غالب کی خلاصی کی۔

میر ببر علی انیس نے اپنی ایک رباعی میں کہا ؂

روتے ہیں ریا سے جو کہ مجلس میں انیس
اشک اُن کے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں

تو مرزا سلامت علی دبیر نے اس کا جواب اس طرح دیا ؂

یاں اشکِ ریائی کا بھی ہے مول بہشت
موتی سچے ہیں، جوہری جھوٹے ہیں

برج نارائن چکبست کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور وکیل بھی تھے لیکن عدالتِ خفیفہ کے ایک منصرم پیارے لال اُن کے شاعرانہ کمال کے قائل نہ تھے۔
ایک بار پیارے لال نے چکبست کو یہ مصرع بھیجا ؏

رگِ گُل سے بُلبُل کے پر باندھتے ہیں

اور اس پر گرہ لگانے کی فرمائش کی۔ چکبست نے مسکراتے ہوئے شعر اس طرح مکمل کر دیا ؂

خفیفہ عدالت میں اُلّو کے پٹھے
رگِ گُل سے بُلبُل کے پر باندھتے ہیں

۱۹۵۷ء میں جوش ملسیانی کو اُن کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات کے پیشِ نظر دہلی میں ابھینندن گرنتھ پیش کرنے کے لئے مرحوم گووند ولبھ پنت وزیرِ داخلہ کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جلسے کی کارروائی کے آخر میں جوش صاحب نے فی البدیہہ دو شعر کہہ کر پنڈت پنت کی نذر کرتے ؂

پوچھا کسی نے مجھ سے کہ یہ شاعری کی قدر
مسندِ امام کی ہے کہ گدی مہنت کی
میں نے کہا یہ دونوں ہی باتیں ہیں نا درست
جو کچھ بھی قدر ہے وہ عنایت ہے پنت کی

جن دنوں سلام مچھلی شہری بیک وقت غمِ جاناں اور غمِ خانداں کا شکار تھے، انھیں دنوں ایک ایڈیٹر نے اپنے پرچے کے لئے اُن سے نظم کا مطالبہ کیا۔ اس پر سلام صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ شعر ادا ہو گیا ؂

دُنیا نے میرے سازِ تخیّل کو توڑ کر
پھولوں کے حُسن، چاند کے جلوے کو ڈس لیا

ماتی جائسی دِلّی کے ایک مشاعرے میں اپنی غزل سُنا رہے تھے ؏

مجھ کو اِس عشق کے مفہوم پہ رحم آتا ہے

غزل کی غیر معمولی طوالت سے دل تنگ ہو کر، غزل سُنتے سُنتے گوپال مِتّل نے اِسی زمین میں یہ شعر کہہ دیا ؂

سُننے والوں پہ تجھے رحم نہ آیا ماتی
تُو تو کہتا تھا کہ مظلوم پہ رحم آتا ہے

دہلی کے ایک کالج کے چند طالب العلموں نے مجھے اپنے کالج کی بزمِ ادب کی طرف سے مدعو کیا اور میرے شعر سُننے کے بعد میری شاعری کے بارے میں کچھ سوالات بھی کئے۔ ایک نوجوان نے پوچھا کیا آپ شراب پی کر شعر کہتے ہیں؟ جواب میں میں نے چند ہی لمحوں میں یہ قطعہ کہہ کر اسٹیج پر پڑھ دیا ؂

شعر کو کیا شراب سے نسبت
میکشی محض میری عادت ہے
لیکن اے دوست شاعری میری
میرے احساس کی عبادت ہے

ایک طرحی مشاعرے میں دوسرے شعراء کے علاوہ پنڈت ونستہ پرشاد فدا مرحوم بھی مدعو تھے۔ طرح میں 'خفا' اور 'خدا' وغیرہ قوافی تھے اور 'ہو کر' ردیف۔
فدا صاحب نے جب دردؔ نکودری سے کہا کہ درد صاحب غزل تو کہہ چکا ہوں لیکن مقطع نہیں ہو رہا تو درد صاحب نے کچھ تامل کے بعد جواب دیا کہ اگر آپ گستاخی نہ سمجھیں تو اس شعر کو رکھ لیجئے ؂

محبت کا مزا کچھ تجربے کے بعد ملتا ہے
فدا صاحب کسی پر دیکھ لینا تھا فدا ہو کر

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)



ہندوستان کو اپنے طالب علموں پر بڑا فخر ہے۔ وہ جانتے ہیں ملک ایک آزمائش سے گزر رہا ہے۔ اِس آزمائش میں جو فرض اُن پر واجب ہے، اُسے ادا کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ نیشنل کیڈٹ کور میں بھرتی ہو کر، اپنا خون دیکر، شہری بچاؤ کے کام میں ہاتھ بٹا کر اور چندہ اکٹھا کر کے وہ بڑا کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی پڑھائی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں پڑھائی پوری کر کے وہ ملک کے اور زیادہ کام آسکیں گے۔ ہمارے طالب علم ملک کی خدمت میں جُٹے ہوئے ہیں۔

سوچیں تو! آپ ملک کے لئے کیا کر رہے ہیں؟

ایک — عظیم ملک — ہمارا
ایک — عظیم قوم

[illegible]

فریب

شیب ردولوی۔ ایم اے

لائبریرین، سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ رڑکی (یو۔پی)

۵ر نومبر ۱۹۶۵ء   پیارے بھائی اخلاص و نیاز

... اِس بار ایک اور مختصر کہانی "فریب" بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے اِسے بھی آپ کی محبوب بزم میں جگہ ملے گی۔ "فریب"، زندگی کی حقیقتوں سے بہت قریب ہو کر لکھی گئی ہے۔ پھر بھی یہ ایک کہانی ہے۔ کہانی کے ہر کردار کے نفسیاتی پہلو پر خاص دھیان دیا گیا ہے۔ یقین ہے، آپ پسند فرمائیں گے ——— "شعلۂ غم" کی پسندیدگی کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک خطوط کا سلسلہ جاری ہے۔ حیدرآباد سے ایک کرم فرما "بیسویں صدی" میں شائع ہونے والی میری کہانیوں کو تامل زبان میں ترجمہ کر کے شائع کرانا چاہتے ہیں۔ میں نے کل ہی اُنھیں لکھ دیا ہے کہ وہ آپ سے رجوع کریں ——— "بیسویں صدی" کی مقبولیت انتہائی عروج پر ہے، یہ آپ کی محنت اور خلوص کا کارنامہ ہے ——— میں گزشتہ دنوں کشمیر گیا تھا، آپ کے لئے بہت ساری سرسبز و شاداب کہانیاں لایا ہوں جنھیں جلد ہی نذر کروں گا ...

نیازمند ——— شیب ردولوی

نجم سے کتنے ڈرامائی انداز میں ملاقات ہوئی۔ چوتھا پیریڈ خالی تھا۔ میں اور شبنم کافی ہاؤس میں چائے پینے جا رہے تھے۔ شبنم کو ایک کتاب لینے کے لئے ٹیگور لائبریری جانا پڑا۔ میرا ذہن اِتنا تھک چکا تھا کہ لائبریری کا رُخ کرنے کو دل ہی نہ چاہا۔ میں نے شبنم سے کہہ دیا، میں کافی ہاؤس میں اُس کا انتظار کر رہی ہوں۔ کافی ہاؤس لڑکوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ جوانی کی جولانیاں عروج پر تھیں۔ ہلکے پھلکے قہقہے اور پیالیوں کی کھنک ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ کافی ہاؤس کا وسیع ہال سگریٹ کے دھوئیں کی ہلکی سی تہہ میں لپٹ کر طلسمی ماحول کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے پُورے ہال پر ایک اُچٹتی نگاہ ڈالی۔ ہال کے آخری سرے کی صرف ایک میز خالی تھی ورنہ ساری میزوں کے گرد اُن کے پرستار جمع تھے۔ خالی میز پر قبضہ کرنے کے بعد نہ جانے میں کہاں کھو گئی کہ غیر متوقع آواز کی کشش مجھے خیالات کی دُور دراز وادیوں سے کھینچ لائی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

نجم بیٹھنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

میں اِس غیر متوقع سوال پر سٹپٹا گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ شبنم ابھی لائبریری سے آ رہی ہوگی، میری زبان سے نکل گیا۔

"جی ہاں! تشریف رکھئے۔"

میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"شکریہ ———"

وہ نہایت خاموشی سے بیٹھ گیا۔

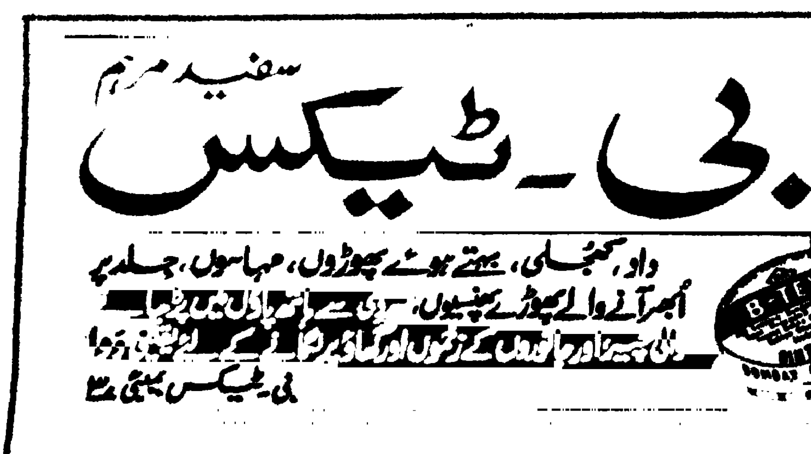
میں شبنم کا انتظار کر رہی تھی۔ اِسی لئے کسی چیز کا آرڈر نہ دیا تھا۔ میری نگاہیں کاپی کی ورق گردانی میں مصروف تھیں لیکن دماغ نجم کی طرف تھا۔ میں اُسی کے متعلق سوچتی رہی۔ میں نے بہت ہمت کر کے چپکے سے نجم کی طرف دیکھنے کے لئے اپنی پلکوں کو جنبش دی۔ اُس کی نگاہیں دوسری طرف بیرے کی منتظر تھیں۔ بیرے کے آجانے پر نجم نے اُکتا دینے والی خاموشی توڑی۔

"آپ کیا پئیں گی۔ کافی یا چائے؟"

نجم مجھ سے مخاطب تھا۔

"شکریہ! آپ پیجئے!"

ملک کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں۔
"آپ تکلف سے کام لے رہی ہیں؟"
اُس نے اِصرار کیا۔
"جی نہیں! ــــــ دراصل میں شبنم کی منتظر ہوں۔"
میں نے وضاحت کی۔
"کوئی بات نہیں، اُن کے آنے پر دوسرا دَور ہو جائے گا۔"
اُس نے کافی کا آرڈر دے دیا۔
"ہم دونوں کے ہوتے ہوئے بھی میز پر قبرستان کا سناٹا ہے۔ کچھ زندگی کا ثبوت ملنا چاہئے۔"
نجم نے بات کرنے کی ابتدا کی۔
میں ہنس کر پھر خاموش ہو گئی۔
"نہ جانے کس نے کہا ہے کہ لڑکیاں بہت باتونی ہوتی ہیں۔"
اُس نے میری خاموشی پر طنز کیا۔
"یہ ایٹمی دَور ہے، بہت سی پُرانی باتیں غلط ثابت ہو گئی ہیں۔"
میں نے اپنی ساری ہمت جمع کر کے طنز کا اُسی انداز میں جواب دیا۔
"آپ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔ میں تو آپ کا کلاس فیلو ہوں۔ آپ مجھے غیر کیوں سمجھتی ہیں؟"
اُس نے بے تکلف ہونا چاہا۔
'آپ مجھے غیر کیوں سمجھتی ہیں ــــــ؟'
'آپ مجھے غیر کیوں سمجھتی ہیں ــــــ؟؟'
یہ جملہ میرے ذہن میں بازگشت کرنے لگا۔ کتنی اپنایت تھی اِس جملہ میں، کتنا اپنا پن تھا اِن الفاظ میں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اِس جملے نے میری روح کو چھو لیا ہو۔ ایسے لمحوں کی آسودگی کا کتنا بھرپور احساس ہوا ــــــ میرے چہرہ پر چاند ستاروں کی روشنی پھیل گئی۔
"یقین کرو نجم! جب میں نے پہلی بار تمھیں دیکھا، نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ میری روح کو جس کی تلاش ایک مدت سے تھی، وہ تم ہی تھے۔ نہ جانے کتنی بار تم سے باتیں کرنے کو دل چاہا لیکن شرم و حیا حائل ہو گئی۔ تم نے بھی میری خاموشی پر سوچا ہوگا کہ کتنی مغرور ہوں میں! اِس میں تمھارا بھی کیا قصور۔ دُور رہ کر اندازے ہی لگ سکتے ہیں۔ میں تمھیں اپنا سمجھتی ہوں۔ تم میرے ہو نجم، میرے اپنے . . ." میرا ذہن خاموشی سے خیالات کے تانے بانے بُنتا رہا۔
"آیئے چلیں اب پیریڈ شروع ہونے کو ہے۔" میں چونک پڑی۔ اُس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میرا دل چاہتا تھا، ہم اِسی طرح زندگی کی طویل راہوں پر چلتے رہیں۔
اُس پہلی ملاقات کے بعد ہم اکثر ملتے رہے۔ کبھی کافی ہاؤس میں، کبھی پبلک بار میں، کبھی گنج کی کھلی فضاؤں میں اور کبھی سنیما ہال کے گہرے اندھیروں میں۔ میں اور نجم اپنی ذہانت کی وجہ سے کلاس میں سبھی کی توجہ کا مرکز تھے۔ کلاس کے ساتھیوں کی زبان پر میرا اور نجم کا نام ساتھ ساتھ آنے لگا۔ میں نجم سے بہت متاثر ہو چکی تھی۔ وہ میرے ذہن و احساس پر چھا گیا تھا۔ میری خاموش زندگی میں اب رومان پرور لہریں اُٹھنے لگی تھیں۔ میں جاگتے ہوئے بھی خواب دیکھتی رہتی۔ میری تنہائیاں ہمیشہ میرے پاس نجم کو کھینچ لاتیں۔ میں رات کو جب بھی پڑھنے بیٹھتی نجم کی تصویر کتابوں کے صفحے سے اُبھرتی نظر آتی۔ کتابوں کی دُنیا سے نکل کر میں نجم کے خیال میں کھو جاتی۔ کورس کی کتابیں حسرت و حیرت سے مجھے تکنے لگتیں ــــــ اپنی اِس کمزوری کا شدید احساس ہوتے ہوئے بھی میں اپنی مدد نہ کر سکی۔
یہ رنگین روز و شب پَر لگا کر اُڑتے رہے اور یہاں تک کہ امتحان کے بھیانک دن آ گئے۔ کلاس کے سبھی ساتھیوں میں سنجیدگی آ گئی تھی اور سبھی امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں اور نجم بھی صرف شام کو تھوڑی دیر کے لئے ملتے ورنہ دن رات اپنے اپنے مطالعہ میں غرق رہتے۔ کلاس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اِس بار گولڈ میڈل کے لئے میں اور نجم ہی میدان میں ہیں! ہم دونوں اِس بات پر مطمئن اور نازاں تھے کہ گولڈ میڈل ہم دونوں ہی کے درمیان رہے گا۔
امتحان سے ایک ہفتہ پہلے میرا کلاس فیلو



راشد میرے پاس آیا۔ وہ بہت سنجیدہ، مخلص اور ذہین تھا۔ اسی لئے میں اُس کی بہت قدر کرتی تھی۔ اُس نے مجھے ایسی خبر سنائی کہ میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ راشد کی بجائے کوئی اور یہی خبر دیتا تو میں اُس کا منہ نوچ لیتی، اُسے گالیوں سے نوازتی، لیکن راشد کو میں اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس کی بات کا یقین کرنا پڑا۔

"نجم نے آپ سے محبت اور چاہت کا ڈھونگ اس لئے رچایا ہے تاکہ آپ ذہنی طور پر اُلجھ جائیں اور مطالعہ نہ کر سکیں اور گولڈ میڈل اُسے مل جائے!" راشد نے میرے وجود پر بم پھینکتے ہوئے بتایا "آپ کو اِس انکشاف سے انتہائی تکلیف ہوگی لیکن مجھے جب اِس گِری ہوئی بات کی خبر ملی تو آپ کو بتا دینا اپنا فرض سمجھا۔"

یہ خوفناک بات بتا کر راشد خاموشی سے چلا گیا۔

میرے غم و غصہ کی حد نہ رہی۔ نجم صورت کا اِتنا پیارا اور دل کا اِتنا بُرا ہے!!

اُس کے کردار کے مکروہ رُخ کو دیکھ کر میں کانپ گئی۔ حسبِ معمول جب شام کو نجم میرے ہاں مجھ سے ملنے آیا تو نفرت سے میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ میں نے اُسے اس بُری طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ سٹپٹا گیا۔ وہ سارے حقارت آمیز جملے جو میرے ذہن میں کھول رہے تھے، میں نے اُسے سُنا دیے۔ وہ اِتنا جھوٹا اور فریب کار ثابت ہوا کہ اِس خبر کو جھٹلا رہا تھا۔ میں نے اُس کی ایک بات بھی نہ سُنی اور کمرہ کا دروازہ بند کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہہ دیا

"اِس دروازہ کو اب آپ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ پر بند سمجھئے۔ آئندہ کبھی یہاں آنے کی جرأت نہ کیجیے گا!" میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کے پٹ بند کر دیئے۔ میرے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں مسہری پر گر پڑی اور گھنٹوں روتی رہی۔ میں کئی روز تک بہت بُجھی بُجھی سی رہی۔

امتحان شروع ہو گئے اور اِس دوران مجھے نجم برابر یاد آتا رہا لیکن ہر بار دل ہی دل میں اُس کے خلاف نفرت آمیز جملے کہہ کر اپنے مجروح احساسات و جذبات پر مرہم رکھ دیتی لیکن یہ زخم ایسا لگا تھا کہ مندمل ہونے کے بعد بھی دل و دماغ پر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ امتحان ختم ہونے کے ایک ماہ بعد نتیجہ بھی نکل آیا۔ گولڈ میڈل اِس بار راشد کو ملا تھا۔ مجھے گولڈ میڈل نہ ملنے کا بے حد افسوس تھا۔ میرے حساس ذہن کو نہ جانے کتنے جھٹکے لگے لیکن یہ سوچ کر کہ نجم اپنے گِرے ہوئے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، میرے زخم خوردہ احساسات کو کچھ تقویت مل جاتی۔

ڈپارٹمنٹ میں راشد کا تقرر بحیثیت لکچرر ہو گیا۔ وہ مجھ سے ملاقات کرنے کبھی کبھی میرے یہاں آتا رہتا۔ چند ماہ میں اُس نے اپنی سنجیدگی اور شرافت سے مجھے اِتنا متاثر کیا کہ جب اُس کا پیغام میرے لئے آیا تو ابو اور امی انکار نہ کر سکے ——— اور ہماری شادی ہو گئی!

پہلی ملاقات ہی میں راشد نے مجھے بتایا کہ نجم سے متعلق اُس نے جو بات بتائی تھی، بالکل بے بنیاد بات تھی۔ وہ محض اُس کے ذہن کی اختراع تھی۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ میرے اور نجم کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں جس سے ذہنی طور پر ہم دونوں مفلوج ہو کر رہ جائیں اور گولڈ میڈل راشد کو مل جائے! ——— اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا!

وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنے ہونٹوں پر ناقابلِ برداشت جلن کا احساس ہوا۔ سارے درد ایک ایک کر کے جاگ اُٹھے!

نجم اور راشد کے چہرے میرے سامنے گھوم رہے تھے اور میں اِس خبر کو سُن کر بالکل خاموش تھی۔ ایک بُت کی طرح، ایک بے جان پتھر کی مانند!!

غزلیں

نسیم شاہجہاں پوری

ہنس دیئے زخم ستاروں کا خیال آتے ہی
کِھل اُٹھے پھول بہاروں کا خیال آتے ہی

ہوگئی اور فزوں کشمکشِ مرگ و حیات
ڈوبتے وقت کناروں کا خیال آتے ہی

گر گئی میری نگاہوں سے گُلستاں کی بہار
اُن کے عارض کی بہاروں کا خیال آتے ہی

چھوٹ جاتا ہے مرے ہاتھ سے جامِ صہبا
مست نظروں کے اشاروں کا خیال آتے ہی

خود بخود ہوگئے خاموش اُمیدوں کے چراغ
صبح دم ڈوبتے تاروں کا خیال آتے ہی

میری نظروں میں سمٹ آئی بہارِ فردوس
اُن کی محفل کے نظاروں کا خیال آتے ہی

گھیر لیتی ہے نسیم اور سوا مایوسی
بے سہاروں کو سہاروں کا خیال آتے ہی

جوہر ٹونکی

جنونِ شوق میں رکھا قدم جہاں میں نے
بنا دیا ہے زمیں کو بھی آسماں میں نے

قفس کے پاس سے گزرا جو کاروانِ بہار
تو چشمِ شوق پہ رکھ لیں ہتھیلیاں میں نے

مِلا کے خاک میں اشکوں کے چاند تاروں کو
بنا دیا ترے کوچے کو آسماں میں نے

ہنسا اور اتنا ہنسا میں کہ آ گئے آنسو
سُنی زمانے سے جب اپنی داستاں میں نے

وہی قفس کہ تصور سے جس کے دم گُھٹ جائے
رکھا ہے نام اُسی کا اب آشیاں میں نے

بنے ہیں اشکِ الم میری خود فریبی پر
جب اپنے آپ کو دی ہیں تسلیاں میں نے

بنی قفس بھی وہی سرزمیں مقدر سے
جہاں چُنا تھا کسی روز آشیاں میں نے

اخگر مشتاق رحیم آبادی

ہم نے تو ایک عُمر گزاری ہے جاگ کر
حسرت تھی جاگتا کبھی اپنا نصیب بھی

ناکامیِ نگاہ کا شکوہ نہیں مجھے
نظروں سے گر ہو دُور تو دل سے قریب بھی

احساسِ شامِ ہجر بھی دل کو نہ ہو سکا
کِس درجہ دل نواز ہے یادِ حبیب بھی

بربادیِ حیات کا دُنیا سے کیا گِلہ
ہے قابلِ گرفت دلِ بدنصیب بھی

یوں بن کے اب نہ پُوچھ کہ محفل میں ہم نے خود
دیکھی ہے تجھ سے شوخیِ چشمِ رقیب بھی

ناصح! ترا بیان حقیقت سہی، مگر!
کِس سے بنائے بن سکا اپنا نصیب بھی

اعجازِ تارہائے گریبانِ گُل نہ پُوچھ
دیکھا ہے چاک چاک دلِ عندلیب بھی

اخگر اب اُن کو غم سے کہاں فرصتِ نظر
سوہانِ رُوح ہے مجھے مرگِ رقیب بھی

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

[illegible]	خورشید پاشا ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م م راجندر ایم اے	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۷۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
داماد	"	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
پگلی	"	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۲۵ "
بادل چھٹے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ "
پہلی لڑکی	رازداں ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
[illegible]	فیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ "
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ "
ستم	"	چار روپے ۷۵ "
گھائل	"	تین روپے ۹۵ "
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ "
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ "
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	"	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
[illegible]	بیگم توقیر وارث حسین	تین روپے ۵۰ "
[illegible]	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
نغمہ ابد (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ "
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	ذکی انور	چھ روپے
[illegible]	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
سناٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ "
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ "
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
روگنہ	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہدہ	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمن	تین روپے
ٹالمر کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	[illegible]	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
نسرین	رئیس احمد جعفری	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دروازہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	"	دو روپے ۵۰ "
رادھا الزبتھ	"	دو روپے ۵۰ "
پاپی	"	چار روپے
سوناگاچی	"	چار روپے ۵۰ "
طوفانوں کی کہانی	"	چار روپے ۵۰ "
جوار بھاٹا	"	چار روپے ۵۰ "

قیامت	نکہت	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
سازش	"	دو روپے ۵۰ "
کانٹوں کی سیج	[illegible]	پانچ روپے
گمراہ	قیسی رامپوری	چار روپے ۵۰ نئے پیسے
ناگ دیوتا	[illegible]	دو روپے ۵۰ "
خون کے چھینٹے	"	دو روپے ۵۰ "
خوابگاہ میں	"	تین روپے ۵۰ "
فراق	نگین بھارتی	تین روپے ۵۰ "
پیاسا	"	تین روپے ۵۰ "
[illegible]	"	دو روپے
[illegible]	"	دو روپے
پیاس	[illegible]	تین روپے ۵۰ "
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مالوا	میکسم گورکی ترجمہ نریش کمار شاد	ایک روپیہ
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۷۵ "
[illegible]	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ "
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ "
[illegible]	اوم پرکاش ناتی	دو روپے ۵۰ "
خاموش نغمہ	"	چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال "	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) "	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) "	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں "	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد)		تین روپے ۵۰ "
زہر کا حسن	اشفاق احمد	[illegible]

ملنے کا پتہ — رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی

منزل

اکرم فاروقی۔ بی، اے۔ بی، ٹی

۶۴۔ چلہ۔ امروہہ۔ یوپی

۱۱ اکتوبر ۶۵ء   مخدومی خوشتر بھائی! آداب

... "ملک کے موجودہ حالات نے دل اور ذہن کو اِس قدر متاثر کر رکھا ہے کہ ہر وقت یہی موضوع مرکزِ غور و فکر ہے۔ محترم پوپ پال نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "بنی نوعِ انسان جنگ ختم کر دے ورنہ بنی نوعِ انسان کو جنگ ختم کر دے گی!" افسوس آج ہری بھری شاداب فصلیں تباہ کی جا رہی ہیں۔ شاید آج شاہ جہاں اور ممتاز کی روحیں تڑپ رہی ہوں گی۔ گوتم اور اشوک کی آتمائیں بے چین ہوں گی۔ نہ جانے یہ بے چینی یہ تڑپ کب ختم ہوگی؟ مجھے شدید احساس ہے کہ شبنم کے ارمانوں کی کلیاں جنگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی ہیں لیکن اُس نے اپنے روحانی سکون کے لئے ایک نئی "منزل" تلاش کر لی ہے۔ اُمید ہے میری گزشتہ کہانیوں کی طرح "منزل" جنابِ والا اور "بیسویں صدی" کے بلند نگاہ قارئین کی پسندیدہ منزل ہوگی...

تشنۂ کرم ——— اکرم فاروقی

ایک بار پھر سائرن کی آواز نے فضاؤں میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ میں نے گھبرا کر اپنے بدن پر چادر تان لی ہے۔ میرا وارڈ سنسان ہے۔ سارے ہسپتال پر گہری خاموشی چھا گئی ہے۔ ہوائیں رُک گئی ہیں۔ سانسیں ٹھہر گئی ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے اندھیرا ——— میری تقدیر کی طرح گہرا اندھیرا! دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ میرا ہی نہیں شاید ساری کائنات کا دل دھڑک رہا ہے۔ انسانیت کراہ رہی ہے کہ آج مقدس عبادت گاہوں کو شہید کر دیا گیا ہے۔ کتنی بہنوں کا سہاگ اُجڑ گیا ہے۔ کتنے معصوم بچے یتیم ہو گئے ہیں۔ کتنی مامتائیں جل گئی ہیں۔ زعفران کی شاداب کیاریوں سے شعلے اُبھر رہے ہیں۔ جھیلوں کا پانی سُرخ ہو گیا ہے۔ کتنے ہی غنچے بن کھلے مُرجھا گئے ہیں۔ اور میں بھی تو ایک غنچہ ہوں کہ میرے دل میں کتنی حسرتیں دفن ہیں۔ خدارا کوئی اِن دہکتے انگاروں کو ٹھنڈا کر دے۔ ورنہ میری زندگی راکھ بن جائے گی۔ میرے خواب بکھر جائیں گے۔

ابھی میں دُلہن نہیں بنی ہوں۔ میری مانگ ستاروں کی افشاں سے محروم ہے۔ ابھی میرے بدن سے خوشبوؤں کے کارواں نہیں پھوٹے ہیں۔ میرے ہونٹوں کی سطح پر کوئی مُسکان نہیں اُبھری ہے۔ میرے اللہ! کیا میرے نصیب کی کلیاں نہ کھلیں گی؟ میرے ہاتھوں پر مہندی نہ رچے گی؟ کیا میں بیاہ کا سُرخ جوڑا نہ پہنوں گی؟ ہائے اللہ! کیا میں پیا کے دیس نہ جاؤں گی؟

کچھ دیر بعد سائرن کی آواز پھر گونجی۔ خاموشی ٹوٹ گئی، روشنیاں بکھر گئیں، اور ڈاکٹر یزدانی کے قدموں کی آواز میرے بستر کے قریب آگئی ہے۔ ڈاکٹر یزدانی ——— ایک بھرے بھرے گداز جسم کا سنجیدہ سا نوجوان۔ جسے دیکھ کر میں جی اُٹھتی ہوں اور ایک بار پھر اپنی زندگی کی دعا کرتی ہوں۔ لیکن یزدانی ڈاکٹر ہے اور میں ایک مریضہ۔ صبح سے شام تک نہ جانے کتنی روگی نبضیں اُس کی صحت مند انگلیوں کی گرفت میں آتی ہیں اور چھوٹ جاتی ہیں۔ میرے خدا! میں کیسے بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں، جن کی کوئی تعبیر نہیں، کوئی حقیقت نہیں۔ ہائے! میں پیاسی تشنہ لب کن خیالوں کی جھیل میں کھو گئی ہوں۔ میرا دم گھٹ جائے گا، میں شاید مر جاؤں گی اور ساحل نہ پا سکوں گی، اپنی منزل نہ پا سکوں گی!

"کہئے شبنم مزاج کیسے ہیں؟" ڈاکٹر نے میری نبض پر انگلیاں رکھ دی ہیں۔

"مریض کا مزاج ڈاکٹر سے بہتر کون جان سکتا ہے؟" میرے لہجہ میں کتنی حسرتیں ہیں، کتنے خواب ہیں!!

"آج آپ کل سے بہتر ہیں" ڈاکٹر مسکرایا۔

"اور آنے والے کل ــــــ؟" میں سراپا سوال بن گئی ہوں۔

"کل بھی آپ ٹھیک رہیں گی" ڈاکٹر کے لہجہ میں یقین کا رس تھا۔

"کیا کل بھی سائرن بجے گا۔ یہ کیوں بجتا ہے ڈاکٹر؟" ــــــ میری آواز خوف آمیز ہے۔

"یہ خطرہ کا نشان ہے"

"آخر خطرات کب مٹیں گے ــــــ؟" میں بے چین ہوں۔

"جب جنگ رک جائے گی"

"ڈاکٹر! جنگ کب رکے گی؟"

"جب آدمی انسان بن جائیں گے" اس کے چہرے پر اوتاروں جیسا جلال

- ایک آدمی فوج کی ملازمت قبول نہیں کرتا تو کوئی جرم نہیں لیکن اگر سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں آتا اور پھر پیچھے ہٹتا ہے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ (مولانا ابوالکلام آزاد)
- زیادہ باتیں کرنا حمق اور دیوانگی کی علامت ہے خواہ وہ باتیں اچھی ہی ہوں۔ (ارسطو)
- جن کی ضرورتیں محدود ہوتی ہیں "اُنہیں" خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ (سقراط)
- وہی کام کرو جو کرنا چاہئے نہ کہ وہ کام جو تم کرنا چاہو۔ (فیثا غورث)
جب تک اہلِ مجلس کی گفتگو نہ سُن لو خود کبھی گفتگو نہ کرو۔ (حکیم لقمان)

چھا گیا ہے۔

"اور آدمی انسان کب بنیں گے ــــــ؟" مجھے احساس ہے کہ میں کیسی باتیں کر رہی ہوں۔

"جب دلوں میں وسعت، ذہنوں میں کشادگی اور عمل میں خلوص آجائے گا"

ڈاکٹر کا لہجہ پُر یقین ہے۔

اور پھر ڈاکٹر نے سرنج کی سوئی میرے بائیں بازو کی نس پر رکھ دی ہے۔ اس کی آنکھیں میری نحیف نظروں میں کھو گئی ہیں اور میں اس کی تابندہ آنکھوں میں ڈوب کر زندگی کی بہاریں تلاش کر رہی ہوں، امن اور شانتی کے نشان ڈھونڈ رہی ہوں!

"اچھا آرام کرو میں چلتا ہوں" ڈاکٹر چلا گیا اور میں اس کے نقشِ قدم دیکھ رہی ہوں۔ زندگی میں کتنے بار نہیں کئی بار ایسا اتفاق ہوا ہے لیکن میں کسی مرد کے نشانوں کو نہ پا سکی کہ وہ نشان ہی گرد تھے یا میری آنکھوں میں دم نہیں تھا۔

یکایک میری آنکھوں کے سامنے خاور کے نقوش اُبھر آتے ہیں۔

خاور! میرے خوابوں کا وہ کمسن شہزادہ جو زندگی کی اس معصوم شاہراہ پر ملا جب بہاروں میں تازگی تھی، کلیوں میں شگفتگی تھی اور خزاں کا کوئی مرجھایا ہوا تصور بھی نہ تھا وہ بڑی دھوم سے اپنے گڈے کی برات لایا کرتا تھا اور میں اپنی امی کے بوسیدہ دوپٹے کے آنچل میں اپنی سہیلی گڑیا کو مایوں بٹھا کر اس کے سر سے کھیلیں اور بتاشے نچھاور کرتی تھی۔ ننھے براتی منہ دکھائی میں ننھے پیسے دیتے اور ایک ایک پیسے میں کئی کئی بار میری معصوم گڑیا کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھاتے، اسے گدگداتے جیسے وہ مخمل کی گڑیا نہ ہو، گوشت پوست کی کوئی حسین لڑکی ہو۔ میں بہت شوق سے گڑیوں کا بیاہ رچاتی اور جب خاور کے گڈے کے ساتھ اسے رخصت کرتی تو نہ جانے کس انجانے جذبہ کے تحت میری پلکیں جھک جاتی تھیں اور میرا سارا بدن کسی انجانی خوشی سے ناچ اٹھتا تھا۔ میری سادی گڑیاں ایک ایک کرکے وداع ہو گئیں۔ وقت ماضی کی چھاتی پر اپنے سنگین قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خاور کے ساتھ بچپن میں لگائی ہوئی جوہی کی بیلیں جوان ہو گئیں، ان میں کلیاں آگئیں پھول چٹکنے لگے۔ میں اکثر رات کی ہلکی ہلکی فضاؤں میں اپنے مستقبل کے دریچوں میں جھانکتی اور ان میں چراغاں کرتی تھی لیکن یکایک میرے دل کے ایوانوں میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ میرے ارمانوں کی کلیاں ان کھلی رہ گئیں۔ اس لئے کہ خاور چھپ گیا تھا، نہ جانے کن سیاہ بادلوں کی اوٹ میں؟ میں نے رو رو کر اسے تلاش کیا۔ گوشے گوشے میں اسے ڈھونڈا لیکن وہ مجھے نہ ملا۔ کسی نے میری حالت پر رحم کھا کر مجھے منوں مٹی کے ڈھیر کے قریب لاکر چھوڑ دیا کہ وہ یہاں سو رہا ہے۔ ایسی نیند جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔

وقت ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ ایک زخم بھر گیا لیکن ایک داغ، داغِ جاوداں بن کر رہ گیا۔ یہ داغ جاوید نے بخشا تھا۔ بچپن کی دہلیز سے نکل کر جوانی کے صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ جاوید نے ہاتھ تھام لیا۔

"شبنم! میں تمہارے بغیر مر جاؤں گا!" اس کی آواز میں کرب تھا۔

"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے بے نیازی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"خدا کے لئے رحم کرو شبنم!" وہ سراپا التجا بن گیا۔

"پاگل نہ بنو جاوید!" میں نے اپنا رخ پھیر لیا لیکن دیر تک اس کے کول ہاتھ کا مدھر لمس محسوس کرتی رہی۔ دیر تک اس کے لہجہ کی مٹھاس میں ڈوبی رہی اور دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے انجانے جذبوں میں کھوئی رہی۔ کئی دن تک ایک میٹھا میٹھا سا درد، ایک ہلکی ہلکی سی چبھن میرے ذہن کی نرم نسوں میں پلتی رہی۔ میرا من اس کی یاد میں تپ رہا تھا۔ کچھ سوچتی تھی اور کھو جاتی تھی۔

اسی طرح کئی دن بیت گئے۔ کئی خیال اُبھ گئے لیکن کئی جذبے بکھر گئے اور

...پر شعلہ سا لپک جانے کے بعد چمک اُٹھے۔

'جاوید!' میں نے آہستگی سے پکارا۔

'ہوں!' وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔

'سنو ۔۔۔' میں نے التجا کی۔

'آخر کچھ کہو بھی کہ یوں ہی۔۔' جاوید کے لہجے میں ہلکی سی ترشی تھی۔

'آج وکٹوریہ گارڈن چلو گے ۔۔۔۔؟'

'میں تو روز ہی جاتا ہوں'

'لیکن آج میرے ساتھ۔۔' میں موم کی طرح پگھل رہی تھی۔

'تمہارے ساتھ جانے میں کیا فائدہ ۔۔۔؟' وہ بے اعتنائی سے بولا۔

'فائدہ ۔۔۔!؟ تو کیا پکنک میں بھی کوئی فائدہ ہوتا ہے ۔۔۔؟' میں نے

ل کیا۔

'میں فائدہ کے بغیر جینا ہی غلط سمجھتا ہوں۔ جس کام میں فائدہ نہ ہو اُسے

ڑ دینا اچھا'

جاوید کے لہجے میں فلسفیانہ انداز بھی تھا اور تاجرانہ بھی۔

'اچھا بابا مجھے معاف کرو' آخر میں نے مجبور ہو کر کہا۔

'خیر میں تمہارا دل نہ توڑوں گا۔ دل آزاری گناہ ہے'

اور پھر میں نے زندگی کی کتنی حسین شامیں وکٹوریہ گارڈن کی رومانی فضاؤں

ں گزاریں۔ دل کے ایوانوں میں چراغاں ہو گیا۔ میرے احساسات کے آکاش پر محبت

کے جگنو چمک اُٹھے۔ میری زندگی کے اُفق پر رنگ و نور کی ایک البیلی لہر چھا گئی۔ دھیرے

ے کونپلیں پھوٹیں، پھول مہکے، خوشبوئیں بکھریں، دُنیا مہکی اور یکبارگی میرے قدم

ان پر سنبھلے اور ٹھہر گئے کہ پاکیزگی جنت کا ثمر ہے اور جنت ایک نشاطِ ابدی

ہے۔

تب اپنے پاکیزہ قدم لے محبت کے مقدس حرم کی طرف خراماں بڑھ رہی

یکایک آندھیاں چلیں، غبار پھیلے، شعلے اُبھرے، دھواں اُمڈا اور میری آنکھیں

ند۔ میں نے گھبرا کر پلکیں مسلیں، اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے پیروں کی زمین نکل گئی۔ میرا

ہو گیا۔ آشاؤں کے چراغ بجھ گئے اور میں دیر تک کھڑکی سے لگی جاوید کو تکتی رہی، جو

بہار عشرت کی پالکی کے آگے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور میں صدیوں

سے تنہا ستارہ کی طرح لرزتی رہی، روتی رہی، سسکتی رہی۔ آخر میں نے آنسو

پونچھ ڈالے اور دل کو سمجھا لیا کہ دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بڑے باپ کے

بیٹے لڑکیوں سے محبت کا کھیل رچاتے ہیں۔ اُن کے معصوم، غریب ذہنوں میں اُن

اُن کو روشن کرتے ہیں جن میں آنچ تو ہوتی ہے لیکن روشنی نہیں ہوتی۔ وہ شگوفے

کھلاتے ہیں جن میں چمک تو ہوتی ہے لیکن خوشبو نہیں ہوتی۔ وہ محل تعمیر کرتے ہیں جن کی بلندی آسمان کو چھوتی ہے لیکن جن کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی ہیں۔ جاوید میرا قریبی عزیز تھا لیکن اُس کی امارت نے پست و بلند کی پتھریلی دیواریں کھڑی کر دیں۔ ایسی دیواریں جنھیں کوئی نہیں پار کر سکتا۔ میں خاموش ہو گئی اور صبر کر لیا کہ صبر کرنے والوں کے ساتھ خدا ہوتا ہے۔

ہائے اللہ! گیارہ بج گئے اور میں جاگ رہی ہوں! لیکن مجھے نیند ہی کب آ رہی ہے؟ میری پلکوں پر تو انگارے سُلگ رہے ہیں۔ میرے سارے بدن میں آگ دہک رہی ہے۔ میری آنکھوں میں نہ نیند ہے، نہ کوئی خواب۔ میرے خوابوں کو تو جنگ کے شعلے لپٹ گئے ہیں۔ میری آرزوؤں کی کلیاں دشمن کے انسانیت سوز برتاؤ نے جلا کر راکھ کر دی ہیں۔ اور اسی غم میں میری زندگی بجھ رہی ہے لیکن ڈاکٹر کہتا ہے میں جلد اچھی ہو جاؤں گی۔ اس

- تنگ دل آدمیوں اور تنگ گردن بوتلوں میں کوئی فرق نہیں۔ ان دونوں میں جتنی کوئی شے کم ہوگی، اسے باہر نکالتے وقت اُتنا ہی زیادہ شور کریں گے۔ (سوئفٹ)
- ہر انسان کی کامیابی اُس کی ناکامیوں کے زینوں سے ناپی جا سکتی ہے۔ (نپولین ہل)
- میں ہر روز اس طرح زندگی بسر کرتا ہوں جیسے یہ میری زندگی کا پہلا دن ہے اور یہی آخری دن ہوگا۔ (پروفیسر فلپس)
- حکمرانی کا حق اطاعت ہی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ (ایمرسن)
- ہر بے ہودگی کے محافظ ملتے ہیں۔ (گولڈسمتھ)

منحوس مرض سے بچ جاؤں گی۔ وہ کتنا وقت مجھے دیتا ہے۔ کتنا پیار ہے اُس کی آنکھوں میں۔ اُس کی شخصیت کتنی معصوم ہے، کتنی دلکش ہے۔ مسکراتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچے دودھ کی گاگریں بہہ گئی ہوں لیکن کبھی کبھی میں یہ محسوس کرتی ہوں جیسے ڈاکٹر کے رُوپ میں وسیم مسکرا رہا ہو۔

وسیم ایک یادِ گراں ۔۔۔ ایک خوابِ پریشاں ۔۔۔ ایک زخمِ جواں ۔۔۔!

یکایک زخم کا ایک ٹانکا اور کھل گیا ہے۔

'کیا تم میری بن سکو گی ۔۔۔؟' یہ سوال وسیم نے کیا تھا۔

میں چونکی، گھبرائی، شرمائی اور یکبارگی میری گردن جھک گئی تھی۔

وسیم سے پہلی ملاقات آسیہ کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی۔ جب وہ بابل کی دہلیز چھوڑ کر پیا کے دیس جا رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ غم کی تصویر بنے اسے رخصت

"آج آپ کل سے بہتر ہیں" ڈاکٹر نے مسکرایا۔
"اور آنے والے کل ــــــ؟" میں سراپا سوال بن گئی ہوں۔
"کل بھی آپ ٹھیک رہیں گی" ڈاکٹر کے لہجہ میں یقین کا رس تھا۔
"کیا کل بھی سائرن بجے گا۔ یہ کیوں بجتا ہے ڈاکٹر؟" ــــــ میری آواز خوف آمیز ہے۔
"یہ خطرہ کا نشان ہے"
"آخر خطرات کب مٹیں گے ــــــ؟" میں بے چین ہوں۔
"جب جنگ رک جائے گی"
"ڈاکٹر! جنگ کب رکے گی؟"
"جب آدمی انسان بن جائیں گے" اُس کے چہرے پر اوتاروں جیسا جلال

- ایک آدمی فوج کی ملازمت قبول نہیں کرتا تو کوئی جرم نہیں لیکن اگر سپاہی بن کر میدانِ جنگ میں آتا اور پھر پیچھے ہٹتا ہے تو اُس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ (مولانا ابوالکلام آزاد)
- زیادہ باتیں کرنا حمق اور دیوانگی کی علامت ہے خواہ وہ باتیں اچھی ہی ہوں۔ (ارسطو)
- جن کی ضرورتیں محدود ہوتی ہیں "انھیں" خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ (سقراط)
- وہی کام کرو جو کرنا چاہیے نہ کہ وہ کام جو تم کرنا چاہو۔ (فیثا غورث)
جب تک اہلِ مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود کبھی گفتگو نہ کرو۔ (حکیم لقمان)

چھا گیا ہے۔
"اور آدمی انسان کب بنیں گے ــــــ؟" مجھے احساس ہے کہ میں کیسی باتیں کر رہی ہوں۔
"جب دلوں میں وُسعت، ذہنوں میں کشادگی اور عمل میں خلوص آجائے گا"
ڈاکٹر کا لہجہ پُر یقین ہے۔
اور پھر ڈاکٹر نے سرنج کی سوئی میرے بائیں بازو کی نس پر رکھ دی ہے۔ اُس کی آنکھیں میری نحیف نبضوں میں کھو گئی ہیں اور میں اُس کی تابندہ آنکھوں میں ڈوب کر زندگی کی بہاریں تلاش کر رہی ہوں، امن اور شانتی کے نشان ڈھونڈ رہی ہوں!
"اچھا آرام کرو میں چلتا ہوں" ڈاکٹر چلا گیا اور میں اُس کے نقشِ قدم دیکھ رہی ہوں۔ زندگی میں جانے کتنی بار نہیں کئی بار ایسا اتفاق ہوا ہے لیکن میں کسی مرد کے نشانوں کو نہ پاسکی کہ وہ نشان ہی کمزور تھے یا میری آنکھوں میں دم نہیں تھا۔
یکایک میری آنکھوں کے سامنے خاور کے نقوش اُبھر آئے ہیں۔
خاور! میرے خوابوں کا وہ کمسن شہزادہ جو زندگی کی اُس معصوم شاہراہ پر ملا جب بہاروں میں تازگی تھی، کلیوں میں شگفتگی تھی اور خزاں کا کوئی مرجھایا ہوا تصور بھی نہ تھا۔ وہ بڑی دھوم سے اپنے گڈے کی برات لایا کرتا تھا اور میں اپنی امی کے بوسیدہ دوپٹے کے آنچل میں اپنی سہیلی گڑیا کو مایوں بٹھا کر اُس کے سر سے کھیلیں اور بتاشے نچھاور کرتی تھی۔ نھے براتی منہ دکھائی میں ننھے پیسے دیتے اور ایک ایک پیسے میں کئی کئی بار میری معصوم گڑیا کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھاتے، اُسے گدگداتے جیسے وہ مخمل کی گڑیا نہ ہو گوشت پوست کی کوئی حسین لڑکی ہو۔ میں بہت شوق سے گڑیوں کا بیاہ رچاتی اور جب خاور کے گڈے کے ساتھ اُسے رخصت کرتی تو نہ جانے کس انجانے جذبہ کے تحت میری پلکیں جھک جاتی تھیں اور میرا سارا بدن کسی انجانی خوشی سے ناچ اُٹھتا تھا۔ میری ساری گڑیاں ایک ایک کر کے وداع ہو گئیں۔ وقت ماضی کی چھاتی پر اپنے سنگین قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خاور کے ساتھ بچپن میں لگائی ہوئی جوہی کی بیلیں جوان ہو گئیں، اُن میں کلیاں آگئیں پھول مہکنے لگے۔ میں اکثر رات کی ہلکی ہلکی فضاؤں میں اپنے مستقبل کے دیپکوں میں جا لگتی اور اُن میں چراغاں کرتی تھی لیکن یکایک میرے دل کے ایوانوں میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ میرے ارمانوں کی کلیاں اَن کھلی رہ گئیں۔ اس لئے کہ خاور چھپ گیا تھا، نہ جانے کن سیاہ بادلوں کی اوٹ میں؟ میں نے دور دور کر اُسے تلاش کیا۔ گوشے گوشے میں اُسے ڈھونڈا لیکن وہ مجھے نہ ملا۔ کسی نے میری حالت پر رحم کھا کر مجھے منوں مٹی کے ڈھیر کے قریب لاکر چھوڑ دیا کہ وہ یہاں سو رہا ہے۔ ایسی نیند جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔
وقت ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ ایک زخم بھر گیا لیکن ایک داغ، داغِ جاوداں بن کر رہ گیا۔ یہ داغ جاوید نے بخشا تھا۔ بچپن کی دہلیز سے نکل کر جوانی کے صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ جاوید نے ہاتھ تھام لیا۔
"شبنم! میں تمھارے بغیر مر جاؤں گا!" اُس کی آواز میں کرب تھا۔
"تو پھر میں کیا کروں؟" میں نے بے نیازی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔
"خدا کے لئے رحم کرو شبنم!" وہ سراپا التجا بن گیا۔
"پاگل نہ بنو جاوید!" میں نے اپنا رُخ پھیر لیا لیکن دیر تک اُس کے کومل ہاتھ کا مدھر لمس محسوس کرتی رہی۔ دیر تک اُس کے لہجے کی مٹھاس میں ڈوبی رہی اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اُٹھنے والے انجانے جذبوں میں کھوئی رہی۔ کئی دن تک ایک میٹھا میٹھا سا درد، ایک ہلکی ہلکی سی چبھن میرے ذہن کی نرم نسوں میں مچلتی رہی۔ میرا بدن اُن دیکھی آنچ میں تپ رہا تھا۔ کچھ سوچتی تھی اور کھو جاتی تھی۔
اِسی طرح کئی دن بیت گئے۔ کئی خیال اُبھر گئے لیکن کئی جذبے بکھر گئے اور

یک سر سبز و شاداب پتے چمک اٹھے۔

"جاوید!" میں نے آہستگی سے پکارا۔

"بولو!" وہ بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔

"سنو ـــــ" میں نے التجا کی۔

"آخر کچھ کہو بھی کیوں ہو۔۔" جاوید کے لہجے میں ہلکی سی ترشی تھی۔

"آج وکٹوریہ گارڈن چلو گے ـــــ؟"

"میں تو روز ہی جاتا ہوں۔"

"لیکن آج میرے ساتھ۔۔" میں موم کی طرح پگھل رہی تھی۔

"تمہارے ساتھ جانے میں کیا فائدہ ـــــ؟" وہ بے اعتنائی سے بولا۔

"فائدہ ـــــ!؟ تو کیا پکنک میں بھی کوئی فائدہ ہوتا ہے ـــــ؟" میں نے سوال کیا۔

"میں فائدہ کے بغیر جینا ہی غلط سمجھتا ہوں۔ جس کام میں فائدہ نہ ہو اُسے چھوڑ دینا اچھا۔"

جاوید کے لہجے میں فلسفیانہ انداز بھی تھا اور تاجرانہ بھی۔

"اچھا بابا مجھے معاف کرو۔" آخر میں نے مجبور ہو کر کہا۔

"خیر میں تمہارا دل نہ توڑوں گا۔ دل آزاری گناہ ہے۔"

اور پھر میں نے زندگی کی کتنی حسین شامیں وکٹوریہ گارڈن کی رومانی فضاؤں میں گزاریں۔ دل کے ایوانوں میں چراغاں ہو گیا۔ میرے احساسات کے آکاش پر محبت کے جگنو چمک اُٹھے۔ میری زندگی کے اُفق پر رنگ و نور کی ایک البیلی لہر چھا گئی۔ دھیرے دھیرے کونپلیں پھوٹیں، پھول مہکے، خوشبوئیں بکھریں، دُنیا مہکی اور یکبارگی میرے قدم بہکے لیکن پھر سنبھلے اور ٹھہر گئے کہ پاکیزگی جنت کا ثمر ہے اور جنت ایک نشاط ابدی کا نام ہے۔

میں اپنے پاکیزہ قدم لئے محبت کے مقدس حرم کی طرف خراماں خراماں بڑھ رہی تھی۔ یکایک آندھیاں چلیں، غبار پھیلے، شعلے اُبھرے، دھواں اُمڈا اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے گھبرا کر پلکیں مسلیں، اِدھر اُدھر دیکھا۔ میرے پیروں کی زمین نکل گئی۔ میرا دل بجھ گیا۔ آشاؤں کے چراغ بجھ گئے اور میں دیر تک کھڑکی سے لگی جاوید کو تکتی رہی، جو دولت کی پالکی کے آگے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور میں صدیوں سے ایک تنہا ستارہ کی طرح لرزتی رہی، روتی رہی، سسکتی رہی۔ آخر میں نے آنسو پونچھے۔ وقت آگے بڑھا اور مجھے صبر آ گیا کہ دُنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بڑے باپ کے بیٹے غریب لڑکیوں سے محبت کا کھیل رچاتے ہیں۔ ان کے معصوم، غریب ذہنوں میں ان ارمانوں کو پروان چڑھاتے ہیں جن میں آنچ تو ہوتی ہے لیکن روشنی نہیں ہوتی۔ وہ شگوفے کھلاتے ہیں جن میں چمک تو ہوتی ہے لیکن خوشبو نہیں ہوتی۔ وہ محل تعمیر کرتے ہیں جن کی بلندی آسمان کو چھوتی ہے لیکن جن کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی ہیں۔ جاوید میرا قریبی عزیز تھا لیکن اُس کی امارت نے پست و بلند کی پتھریلی دیواریں کھڑی کر دیں۔ ایسی دیواریں جنہیں کوئی نہیں پار کر سکتا۔ میں خاموش ہو گئی اور صبر کر لیا کہ صبر کرنے والوں کے ساتھ خدا ہوتا ہے۔

ہائے اللہ! گیارہ بج گئے اور میں جاگ رہی ہوں! لیکن مجھے نیند ہی کب آ رہی ہے! میری پلکوں پر تو انگارے سُلگ رہے ہیں۔ میرے سارے بدن میں آگ دہک رہی ہے۔ میری آنکھوں میں نہ نیند ہے، نہ کوئی خواب۔ میرے خوابوں کو تو جنگ کے شعلے لپٹ گئے ہیں۔ میری آرزوؤں کی کلیاں دشمن کے انسانیت سوز برتاؤ نے جلا کر راکھ کر دی ہیں۔ اور اسی غم میں میری زندگی گھُل رہی ہے لیکن ڈاکٹر کہتا ہے میں جلد اچھی ہو جاؤں گی۔ اس

- تنگ دل آدمیوں اور تنگ گردن برتنوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ دونوں میں جتنی کوئی شے کم ہوگی یہ اُسے باہر نکالتے وقت اُتنا ہی زیادہ شور کریں گے۔ (سوفٹ)
- ہر انسان کی کامیابی اُس کی ناکامیوں کے ریشوں سے ناپی جا سکتی ہے۔ (نپولین ہل)
- میں ہر روز اس طرح زندگی بسر کرتا ہوں جیسے یہ میری زندگی کا پہلا دن ہے اور یہی آخری دن ہوگا۔ (پروفیسر فلپس)
- حکمرانی کا حق اطاعت ہی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ (ایمرسن)

ہر بے ہودگی کے محافظ ملتے ہیں۔ (گولڈ سمتھ)

منحوس مرض سے بچ جاؤں گی۔ وہ کتنا وقت مجھے دیتا ہے۔ کتنا پیار ہے اُس کی آنکھوں میں۔ اُس کی شخصیت کتنی معصوم ہے، کتنی دلکش ہے۔ مسکراتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کچے دودھ کی گاگریں بہہ گئی ہوں لیکن کبھی کبھی میں یہ محسوس کرتی ہوں جیسے ڈاکٹر کے روپ میں وسیم مسکرا رہا ہو۔

وسیم ایک یادِ گراں ـــــ ایک خواب پریشاں ـــــ ایک زخم جواں ـــــ!

یکایک زخم کا ایک ٹانکا اور کھل گیا ہے۔

"کیا تم میری بن سکو گی ـــــ؟" یہ سوال وسیم نے کیا تھا۔

میں چونکی، گھبرائی، شرمائی اور یکبارگی میری گردن جھک گئی تھی۔

وسیم سے پہلی ملاقات آسیہ کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی۔ جب وہ بابل کی دہلیز چھوڑ کر پیا کے دیس جا رہی تھی۔ گھر کے سب لوگ غم کی تصویر بنے اُسے رخصت

گئے تھے۔ میں رو رہی تھی۔ میری تقدیر آج مجھ سے بچھڑ رہی تھی۔ میں نے [illegible] کے شوروں میں [illegible] آنکھوں کی شوخ ڈوریاں چھپا رکھی تھیں۔ یکایک میں نے محسوس کیا اگر کسی کا نرم ہاتھ میرے شانے پر ہے۔

'خاموش ہو جاؤ شبنم؟' ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے اپنی نمناک پلکیں اٹھائیں۔ میری پلکوں کے سامنے ایک سجیلا سا نوجوان غم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ میں دیر تک حیرت میں ڈوبی اُسے دیکھتی رہی کہ یہ کون ہے؟ اور میرے نام سے کیسے واقف ہے۔ میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن آواز گلے میں پھنس گئی اور میں آسیہ کے ڈولے کی طرف بڑھ آئی تھی لیکن دل زور زور سے دھڑکتا رہا، گونجتا رہا۔ آسیہ رخصت ہو گئی۔ شادی کے ہنگامے ختم ہو گئے۔ مہمان چلے گئے لیکن وہ نوجوان موجود تھا۔ شاہینہ نے بتایا کہ وہ آسیہ کا خالہ زاد بھائی ہے، وسیم اختر نام ہے۔ کسی کالج میں پروفیسر ہے اور ایک اچھا شاعر ہے۔ میں وسیم کو جلد پہچان گئی۔ وہ میرا پسندیدہ شاعر تھا۔ میں نے اکثر اُس کے گیت گنگنائے تھے، اُس کی قومی نظمیں بہت شوق سے پڑھی تھیں لیکن کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں کچھ عجیب سی خلش ہوئی تھی میں اِس خلش کو پہچانتی تھی۔ اِس کے انجام سے واقف تھی۔ میں نے اپنے ذہن سے وسیم کے خیال کو جھٹک دیا لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اُس کی دل آویز شخصیت کے نقوش میرے دل کی گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے۔

اور ایک دن ڈوبتے سورج کی سنہری چھاؤں میں شامِ غزل منعقد ہوئی۔

'تو بولئے کون سا گیت پیش کروں؟' وسیم نے میری پسند جاننا چاہی۔

میں خاموش رہی۔ کس گیت کی فرمائش کرتی کہ اُس کا تو ہر گیت ہی شاہکار تھا۔ میں اپنی پسند کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اِس لئے کہ پسندیدہ شاہکار دلی جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

'بولئے کیا سناؤں؟' ایک بار پھر وسیم نے مجھے ہی مخاطب کیا۔

لیکن میں پتھر کی مورتی بنی چپ چاپ بیٹھی رہی۔

'وسیم بھائی! شبنم کی فرمائش کا انتظار ہے یا آپ کو ہماری خواہش کا احساس؟' شاہینہ نے ترشی سے کہا۔

شاہینہ کا تیر میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ اِس جملے کے لفظ لفظ سے اُس کی حاسد ذہنیت کا پتہ چل رہا تھا۔ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور میں نے جرأت مندی کے ساتھ کہا۔

'وسیم صاحب! آپ کی پسند میری پسند ہے' میری آواز دل کی گہرائیوں سے ابھری تھی۔

اور پھر وسیم نے مدھر ترنم سے کئی رسیلے گیت سنائے۔ ایسے گیت جن میں چاندنی کی چاندنی راتیں تھیں، برسات کے [illegible] کلیوں کی مہک تھی۔

میں پلکیں جھکائے اُس کے گیتوں کے جھرمٹ میں [illegible] ہمکنار ہو گئی جہاں دائمی مسرت کی جھنکار تھی، خوشیوں کی ابدی بہار تھی۔

'شبنم سو رہی ہو یا گیت سن رہی ہو؟' شاہینہ نے میرے [illegible]

میں نے چونک کر پلکیں اٹھائیں اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں کہکشاں کی راہوں سے پھسل کر نکیلے سنگ ریزوں میں [illegible]

لیکن وسیم نے میرا دامن تھام لیا۔

پل بیتے ــــ لمحے بیت گئے ــــ ماہ و سال گزرے

کلیاں چٹکیں ــــ پھول کھلے ــــ خوشبوئیں بکھریں۔

لیکن یکایک جنگ کے شعلوں نے میرے مقدس خوابی چمنوں کو پھونک دیا میرے ابا جان ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ میں یتیم ہو گئی۔ ماں کی مانگ سونی ہو گئی۔ انھوں نے بیوگی کا سفید دوپٹہ اوڑھ لیا لیکن انھوں نے ماتھے پر ذرا سا بھی میل نہ آنے دیا۔ انھوں نے میرے آنسو پونچھے اور کہا "بیٹی! خدا ہمارا محافظ ہے۔ سارا ملک ہمارا سرپرست ہے۔ ہمیں ناز ہے کہ ہمارے دیش کی آبرو بچ گئی" ماں نے اپنا سب کچھ دفاعی فنڈ میں دے دیا۔ میں نے خوشی خوشی اپنے کانوں کی بالیاں بھی دے دیں۔ میں چندہ جمع کرتی، سپاہیوں کے لئے سوئٹر بنتی، ہسپتال جا کر خون دیتی کہ میرے خون کو بھی یہ عزت حاصل ہو، وہ ملک کی خاطر لڑنے والے جیالے سپاہیوں کے کام آ جائے۔ میں یتیم تھی، غریب تھی، اور دنیا دولت و جہیز کی بھوکی ہے۔ وسیم بھی دولت کی طرف جھک گیا۔ شاہینہ چاندی کے چبوترے پر بیٹھی چمک رہی تھی اور میں یا حرم کا مقدس چراغ تھی۔ کسی محل کی شمع بننے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔ اِس لئے وسیم خود اپنا کی شاہینہ جدید رنگوں سے آراستہ تھی۔ اُس نے میری آرزوؤں کا جمال لوٹ لیا۔ میرے ہاتھوں کی مہندی چرا لی، میری مانگ کی افشاں نوچ لی۔ میرے تشنہ ہونٹوں کا تبسم چھین لیا اور میں اپنے خوابوں کا جنازہ لئے لوٹ آئی کہ بعض جنازے بھی زندگی کے امین ہوتے ہیں۔

ٹھنڈی ہوائیں میری کھڑکی پر دستک دے رہی ہیں۔ دبے دبے قدموں سے کوئی لہر آ کر میرے بستر میں چھپ گئی ہے اور میرے سامنے میدان پر ایک لطیف سی خنکی چھا گئی ہے۔ ایسی ہی خنکی ڈاکٹر کی ملائم انگلیوں سے میرے جسم پر چھا جاتی ہے اور میں خیالوں کی شیتل گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتا ہے [illegible] زیادہ نہ سوچا کروں۔ یہ سوچیں انسان کو پاگل بنا دیتی ہیں، صحت کو گلا دیتی ہیں اور میری صحت قوم کی امانت ہے۔ ڈاکٹر ٹھیک کہتا ہے۔ عورت قوم کی امانت ہے۔ عورت اپنی کوکھ سے اُن بہادروں کو جنم دیتی ہے جو ملک و قوم کا قابلِ فخر سرمایہ ہوتے ہیں۔ ماں ہی سب سے

بچے اپنے نونہالوں کو امن و صداقت کا درس دیتی ہو۔ ماں ہی حق کی حفاظت کے لئے قربانی کا سبق سکھاتی ہے۔ وہ اتنی قابل تعریف ہیں جنھوں نے آج دیش کے تحفظ کے سامنے اپنے بیٹوں کو سیسہ پگھلی ہوئی دیوار کی طرح محاذ پر کھڑا کر دیا ہے لیکن میں تو محروم ہوں۔ میرے آنگن میں تو کوئی پھول نہ مسکرائے گا۔ میں کیسے محاذ پر بھیج سکتی ہوں۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ کسی کی رگوں میں میرا لہو دوڑتا۔ کاش مجھے کوئی ماں کہتا۔ کون میرے پیروں کو چوم سکتا ہے۔ میرے پیروں کے نیچے کسی کی جنت نہیں۔ جنت تو باجی کے قدموں کے نیچے ہے۔ وہ روتی کی ماں ہے۔ جانے کتنے پیار سے وہ اسے گلے لگاتی ہیں۔ اس کے پاکیزہ ہونٹوں کو چومتی ہیں اور میں پیاسی صدیوں کی تشنہ لب انھیں تکا کرتی ہوں۔ میری پیاس کو بری باجی نے ضرور محسوس کیا ہوگا۔ جب وہ دولہا بھائی کے انتظار میں آنکھیں بچھائے راہ دیکھا کرتی تھیں تو میں انھیں کتنی حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتی۔ کبھی میں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف جاتی، آئینہ میں خود کو سنوارتی اور کبھی کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں سلیقے سے سجاتی۔ جیسے مجھے بھی کسی کا انتظار ہے۔ میں بھی کسی کی ٹائی کو اپنی انگلیوں میں الجھا کر پوچھنا چاہتی تھی کہ آج آپ بہت لیٹ ہو گئے!" دولہا بھائی آگئے۔ باجی کھل اٹھیں لیکن وہ نہ آئے جن کے لئے میں سراپا انتظار تھی۔

میں کس امید پر سانس لوں؟ کن سہاروں سے منزل کی طرف بڑھوں؟ میرا کوئی سہارا نہیں، میری کوئی منزل نہیں، میری زندگی میں کوئی پیار نہیں، کوئی خوشبو نہیں۔ کلی کا رنگ نہیں، پھول کا روپ نہیں۔ صبح کی روشنی، شام کی مہک نہیں۔ عمر کا کارواں اس منزل کے قریب آگیا ہے، جہاں آکر پاؤں تھک جاتے ہیں۔ سانسیں پھول جاتی ہیں اور جسم کا انگ انگ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اب شام ہو گئی ہے۔ پھول مرجھا گئے ہیں میں اب سرتی ہوں ان مرجھائے ہوئے پھولوں کی مالائیں کون بنائے گا؟ کوئی بھونرا ان پژمردہ روشوں سے گزرتا بھی ہے تو منہ پھیر لیتا ہے اور پھر میں ایک بار اداسیوں کے سیاہ ساگر میں ڈوب جاتی ہوں۔

ڈاکٹر نے کل میرے ناخنوں کو دیکھ کر کہا تھا: "دیکھو شبنم! اب ان میں کتنی سرخی آگئی ہے! کتنے چمکیلے ہو گئے ہیں! میری تصویر تمہارے ناخنوں کی سطح پر ابھر آئی ہے!" میں نے اپنی انگلیاں کھینچ لیں۔ یادوں کی گرہیں کھلنے لگی تھیں۔ یہ یادیں میری روح کا کفن ہیں۔ میری آرزوؤں کا جنازہ ہیں۔ میری تمناؤں کا مدفن ہیں۔ ان میں جاوید کے بچکانہ منصوبے، جاوید کے محبت آمیز ولولے اور وسیم کے شاعرانہ وعدے دفن ہیں!

ڈاکٹر کہتا ہے میں اپنے بالوں میں تیل لگایا کروں، پھلوں کا رس پیا کروں اور اپنے علاج پر زیادہ سے زیادہ پیسے خرچ کروں۔ میں ڈاکٹر سے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے اپنی صحت سے زیادہ ملک کا خیال ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ بچت کرنا چاہتی ہوں۔ بہت

ملک کا ایک اہم تقاضہ ہو۔ ہاں میں بالوں میں تیل تو لگا سکتی ہوں لیکن مانگ تو نہیں نکال سکتی۔ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں۔ مجھے کوئی حق نہیں۔ مانگ تو صرف بیاہی لڑکیاں نکال سکتی ہیں۔ کاش! یہ حق مجھے بھی حاصل ہوتا۔۔ کاش!

رات بھیگ چکی ہے۔ ماحول پر گہری خاموشی مسلط ہے اور میں جاگ رہی ہوں — اس وقت تک جاگتی رہوں گی، جب تک دیش میں شانتی نہ ہو جائے، امن نہ چھا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن ضرور دشمن دوست بن جائیں گے اور وہ دوستی بہت پائدار ہوگی۔ اس کے لئے عظیم قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ کاش میں بھی کوئی قربانی دے سکتی، کوئی ایثار کر سکتی کہ میرا بھی کوئی فرض ہے۔ خدا کرے میں جلد اچھی ہو جاؤں اور پھر میں مادرِ وطن کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو جاؤں کہ خدمت کلیدِ عظمت ہے۔

ہائے اللہ! یہ درد اچانک میرے دل میں کیوں اٹھنے لگا ہے؟ میرے بدن میں کھنچاؤ سا کیوں پیدا ہو گیا ہے؟ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا کیوں چھانے لگا ہے؟؟

ڈاکٹر! مجھے بچاؤ — میں مر جاؤں گی — ڈاکٹر! مجھے بچاؤ — میں کراہ رہی ہوں، چیخ رہی ہوں — میری درد بھری آوازیں فضا میں بکھر گئی ہیں۔ شاید کوئی آ رہا ہے۔

"شبنم! گھبراؤ نہیں میں آ گیا!" ڈاکٹر میرے قریب پہنچ گیا۔

"گھبراؤ نہیں تم اچھی ہو۔" ڈاکٹر کے لہجے میں یقین ہے۔

ڈاکٹر نے میری نبض پر انگلیاں رکھ دی ہیں۔ ہائے کتنا سکون ہے ان انگلیوں میں۔

"شبنم! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میری محبت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ تم میرے خوابوں کی تصویر ہو اور میں اس تصویر کو اپنی زندگی کے ایوان میں آویزاں کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کے لئے اپنا آنچل میرے ہاتھ میں دے دو کہ میں اس کے صندلی سائے میں سکون کی سانس لے سکوں؟"

میں حیرت زدہ آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے چہرے پر محبت اور جذبات کے کئی رنگ چھا گئے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے میں چیخ اٹھی ہوں۔

"ڈاکٹر! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میرا سارا بدن کانپ اٹھا ہے۔

"میں سچ کہتا ہوں شبنم! میں ڈاکٹر ضرور ہوں لیکن میرے سینے میں بھی ایک عام انسان کا دل ہے جو کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کا آرزومند ہے۔"

میری سانس پھول گئی ہے۔ میں زور زور سے کھانس رہی ہوں۔ میں نے ابھی خون تھوکا ہے۔ اس خون میں میری زندگی کی سیاہیاں بکھر گئی ہوں۔ میں خاموش ہوں۔ میرا ذہن دور راہوں پر بھٹک رہا ہے۔

"شبنم! میری بات کا جواب دو!" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔

کئی لمحوں تک میں الجھی بکھری سوچوں میں ڈوبی رہی۔ آخر میں نے جواب دے ہی دیا۔

"ڈاکٹر! تم نے بہت دیر کر دی۔ میں اپنا ارادہ بدل چکی ہوں۔ میں اب شادی نہیں کروں گی۔ میں اپنی باقی زندگی دیش کے محافظ جیالے سپاہیوں کے لئے وقف کر دینا چاہتی ہوں۔ یہی میری زندگی کی معراج ہوگی۔ میری آرزوؤں کی منزل ہوگی!!"

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

بھینسیں کیرل جائیں گی —— •

پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے ہندوستانی عوام کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ...وراک کی قلت کے پیشِ نظر اپنی کھانے پینے کی عادتوں میں تبدیلی پیدا کریں۔ چنانچہ افواہ ...ہے کہ عوام اِس مشورے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پنجاب کی ...یک اطلاع ہے کہ آیندہ پنجابی کسان چھاچھ پینا قطعی بند کر دیں گے اور پنجاب کی بھینسیں ...یرل بھیج دی جائیں گی۔ بنگالیوں نے عہد کیا ہے کہ وہ مکّی کی روٹی پر ساگ رکھ کر کھانے ...ی عادت پیدا کریں گے۔ مدھیہ پردیش کے لوگ مدراسی دوسہ کھا کر اپنا نیشنلزم دکھائیں ...گے اور یو۔پی والوں نے تو قربانی کی انتہا کر دی ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ...نہ کیا کریں گے بلکہ صرف آپس میں لڑ لڑا کر پیٹ بھر لیا کریں گے۔ کشمیری لوگ جو چاول کھانے ...کے عادی ہیں وہ گاجریں اور مولیاں کھانے کی مشق شروع کر رہے ہیں۔ راجستھان کے ...شندے چاول اور مچھلیاں کھا کر گندم بچایا کریں گے اور یہ گندم کیرل کی طرف روانہ ...کر دیا جائے گا تاکہ کیرل کے لوگ گندم کھانے کے جرم میں چاولوں کی جنّت سے باہر نکال ...دئے جائیں۔

اور دہلی چونکہ ایک کاسموپالٹین شہر ہے۔ اس لئے دہلی والوں نے عہد کیا ہے ...کہ وہ ہر چیز کھایا کریں گے۔ چاہے پکوڑے ملیں، چاہے انڈے۔ وہ انھیں ایک جیسی رغبت ...سے کھائیں گے۔ وہسکی سے یا تاڑی کشید کیا ہوا ٹھرا۔ وہ دونوں کو امرت سمجھ کر پیا کریں گے۔ ...سادہ پانی پر کوکا کولا کو ترجیح دیں گے۔ بھنگ پینے والے افیون گھول کر پئیں گے اور افیون نوش ...کرنے والے پانی میں دودھ ملا کر نشے میں بے ہوش ہو جایا کریں گے۔

...س کی لاٹھی ... —— •

افواہ ہے کہ اب پولیس کے لئے مجمع کو منتشر کرنا آسان ہو جائے گا۔

پولیس کا لاٹھی چارج بہت بدنام ہو چکا ہے۔ کیونکہ یہ غیر مہذّب اور وحشیانہ طریقہ ہے اور اس کے خلاف اکثر آواز اٹھائی جاتی رہی ہے کہ ہندوستان جو شاید اب مہذّب ہو چکا ہے، یہ وحشی پن برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہوم منسٹری کے اعلیٰ حلقوں میں یہ افواہ گشت لگا رہی ہے کہ مجمع کو مہذّب طریقہ سے منتشر کیا جائے گا۔ اِس سلسلہ میں اِن دنوں تجویز پر غور کیا جا رہا ہے کہ جب کوئی مجمع آمادۂ فساد ہو تو پولیس کا فرض ہے کہ مجمع کے لیڈر کو مقابلہ کے لئے للکارے۔ پھر پولیس اور مجمع دونوں کی طرف سے نو نو آدمیوں کی ایک لاٹھی ٹیم میدان میں اُتر آئے اور دونوں ٹیمیں کھلاڑی سپرٹ کے ساتھ ایک دوسرے پر باری باری لاٹھیاں چلائیں۔ ایک مقررہ وقت پر جو ٹیم ہار جائے وہ خود بخود مہذّب طریقہ سے منتشر ہو جائے۔ یعنی اگر پولیس ہار جائے تو پولیس چُپ چاپ منتشر ہو جائے اور اگر مجمع کی ٹیم ہار جائے تو وہ سر جھکا کر تتر بتر ہو جائے۔

اِس تجویز میں ایک اہم ترمیم زیرِ غور ہے کہ پُوری ٹیم کی بجائے دونوں اطراف کا صرف ایک ایک لیڈر ہی میدان میں مقابلہ پر اُترے اور جونہی وہ میدان سے بھاگے اُس کا مجمع بھی میدان سے بھاگ جائے۔

افواہاً عرض ہے کہ یہ ترمیم چونکہ زیادہ مہذّبانہ معلوم ہوتی ہے اس لئے پاس ہو جائے گی اور آیندہ لاٹھی چارج کا پُرانا وحشیانہ طریقہ ترک کر دیا جائے گا

چاند میں کمیونزم —— •

امریکہ میں آج کل ایک نئی تحریک چلائی جا رہی ہے۔ اِس تحریک کا بُنیادی نعرہ ہے۔

"چاند کو کمیونزم سے بچاؤ"

روسی راکٹ لونا۔۹ کے چاند پر اُترنے سے امریکہ کے ارب پتی سرمایہ داروں کے

چکے ہیں ہوگئے ہیں۔ چنانچہ وہ مسٹر جانسن پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ چاند کو کمیونزم سے بچانے کے لئے کچھ فوری اقدامات کریں۔ ورنہ امریکہ کی صدارتی گدی سے محروم ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔
چنانچہ اس سلسلہ میں اُن سرمایہ داروں نے امریکہ بھر میں ایک زور دار آندولن شروع کر دیا ہے۔ پوسٹروں، اخباروں، فلموں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے اداروں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ صدر جانسن اگر اپنی خیر چاہتے ہیں تو زمین کو چھوڑ کر چاند کی سُدھ لیں۔

افواہ ہے کہ اس دباؤ میں آکر صدر جانسن نے فیصلہ کیا ہے کہ ویت نام میں لڑائی بند کر دی جائے اور وہاں کی تمام امریکی فوج کو راکٹوں کے ذریعے چاند پر اُتارا جائے۔ چاند میں میزائل کے اڈے قائم کئے جائیں۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ چاند کے باشندوں کو قحط سے بچانے کے لئے امریکی پی، ایل، ۴۸۰ گندم کے جہاز بھیجے جائیں۔ امریکی روزنامہ "نیویارک ٹائمز" نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنا "چاند ایڈیشن" نکالا کرے گا اور چاند پر اپنا آفس قائم کرے گا اور اینٹی کمیونسٹ پروپیگنڈا کے لئے پہلے ہی سے میدان تیار کرے گا۔ پروپیگنڈے کے ماہرین کا ایک جتھا اس کام کے لئے روانہ کیا جا چکا ہے۔ جو روسی افواج کے اُترنے سے پہلے ہی چاند کے باشندوں کو بتائے گا کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی چاند کے لئے موزوں ہے۔ ورنہ کمیونزم پورے چاند کو نگل جائے گا اور چاند پر اماوس کی رات چھا جائے گی۔

جہاں تک روس کا تعلق ہے اِس امریکی منصوبے کے متعلق جب ایک روسی لیڈر سے استفسار کیا تو اُس نے ہندوستانی زبان میں مسکرا کر کہا: "ابھی مسجد کی بنیاد بھی نہیں رکھی گئی، مُلا صاحب پہلے ہی اذان دینے کے لئے پہنچ گئے۔" ایک اور ہندوستانی محاورہ بھی اُس کی زبان سے نکل گیا۔ جس کا مطلب کچھ اس طرح تھا کہ ابھی گاؤں بسا نہیں، لُٹیرے پہلے ہی آ گئے۔

پاکٹ سائز اخبار ——●

گزشتہ دنوں ہندوستان بھر کے اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹروں کی ایک میٹنگ ہوئی، جس میں کاغذ کی دردناک قلت پر غور و خوض کیا گیا۔

کاغذ کی قلت کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف تجاویز زیرِ بحث آئیں۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ اخباروں اور رسائل کا حجم کم کر دیا جائے اور سائز بھی۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ روزانہ اخبارات اب رسالے کے سائز پر چھاپے جائیں اور رسالے پاکٹ سائز کی ڈائری بنا دیئے جائیں۔ چونکہ اخبارات کی زیادہ تر جگہ لیڈروں کے بیانات اور تقریریں گھیر لیتی ہیں۔ اِس لئے انھیں قطعاً بند کر دیا جائے۔ اگر کوئی لیڈر میڈیکل سرٹیفکٹ دے کر یہ ثابت کر دے کہ اُس کی تقریر نہ چھپی تو اُس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا تو اُس لیڈر کی تقریر اور بیان کے صرف عنوانات ہی شائع کئے جائیں۔ مہینے میں ایک لیڈر کا صرف ایک فوٹو شائع کیا جائے جو دو سینٹی میٹر سے زیادہ بڑا نہ ہو۔ کبھی کبھی یہ بھی کر دیا جائے کہ اِس لیڈر کا فوٹو سابقہ اشاعت میں شائع ہو چکا ہے، وہیں سے دیکھ لیجئے۔
رسائل کے سلسلہ میں بھی چند زریں تجاویز پاس کی گئیں۔ مثلاً کوئی شاعر تین اشعار سے زیادہ کی غزل ارسال نہ کرے۔ افسانے پاکٹ سائز کی ڈائری کے تین صفحات سے زائد نہ ہوں۔ فلم ایکٹروں کے فوٹو بالکل شائع نہ کئے جائیں۔ البتہ عوام کے بلوے کے خوف سے فلم ایکٹریسوں کے فوٹو ضرور شائع کئے جائیں۔ اِن فوٹوؤں کا سائز بھی انگوٹھی کے ہیرے سے بڑا نہ ہو۔ فلم اور ڈرامہ کے ریویو اور ادبی تنقیدی مضامین کی اشاعت ممنوع قرار دے دی جائے۔ کیونکہ یہ نہ صرف تخلیقی آرٹ کے لئے فائدہ مند نہیں ہوتے بلکہ ضرر رساں ہوتے ہیں۔
ایک تجویز یہ بھی ہے کہ مختلف اخباروں کے مشترکہ ایڈیشن شائع کئے جائیں۔ مثلاً پہلے صفحہ پر اخبار "سٹیٹسمین" چھپا ہو تو اُس کی پشت پر "ٹائمز آف انڈیا" اور اگر نیشنل انٹگریشن مقصود ہو تو ایک صفحہ پر ہندی اخبار ہو، دوسرے صفحہ پر اُردو، تیسرے پر پنجابی اور چوتھے پر تامل۔

لیکن اِن آخری تجویزوں کو مذاق سمجھ کر مسترد کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اِس سے "ڈِس انٹگریشن" شروع ہو جائے گی اور کاغذ بچاتے بچاتے جانیں بچانے کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

انسان مرے گا نہیں ——●

ماسکو میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ ایک روسی سائنسدان نے دعویٰ کیا ہے کہ آئندہ انسان کبھی نہیں مرے گا۔

اُس سائنسدان نے ایک ایسا انسان بنا لیا ہے جو مختلف دھاتوں کی آمیزش سے تیار کیا گیا ہے۔ اُس کا سارا بیرونی ڈھانچہ، رنگ اور شکل و شباہت خدا کے بنائے ہوئے انسان سے ہو بہو ملتی ہے اور اُس کے اندر بے شمار تاروں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ سائنسدان کا دعویٰ ہے کہ اِس انسان کے اندر دماغ بھی موجود ہے، دل بھی، جگر بھی، معدہ بھی اور یہ فطری انسان کے اعضائے رئیسہ کی طرح کام کرتے ہیں۔ فرق اِتنا ہے کہ اِس سائنسی انسان کے جسم پر بے شمار سوئچ لگے ہوئے ہیں۔ جنھیں دبانے سے وہ بالکل وہی افعال انجام دینے لگتا ہے، جو فطری انسان سے سرزد ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک سوئچ ایسا ہے، جسے دبایا جائے تو اُس کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا جب اُسے رونا یا رُلانا مقصود ہو اُس کا اشک فشاں بٹن دبا دو۔ اِسی طرح مسکرانے کے لئے الگ بٹن ہے۔ غصّے کے لئے الگ۔ محبت کے لئے الگ۔ نفرت کے لئے الگ — فرض کہ وہ تمام انسانی جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ ہر جذبے کے لئے الگ بٹن لگا ہوا ہے۔ یہ انسان کھاتا بھی ہے، چلتا پھرتا بھی ہے، سوتا بھی ہے۔ آپ جب اُسے سُلانا چاہیں، نیند کا بٹن دبا دیجئے۔ اندر کی ساری مشینری بے حس و حرکت ہو جائے گی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ جگانا چاہو تو بیداری کا بٹن دباتے ہی اُس کا سارا جسم حرکت میں آ جائے گا اور سارے کل پرزے بیدار ہو کر کام کرنے لگیں گے۔ وہ انگڑائی لے سکتا ہے،

تھوڑ مار سکتا ہے، پیار سے ہاتھ پھیر سکتا ہے، آپ کو اُٹھا کر بالکونی سے نیچے پھینک سکتا ہے۔ اس کے اندر چند ٹیپ ریکارڈ رکھ دیجئے۔ بٹن دبانے پر وہ بولنے بھی لگتا ہے، گانے بھی گاتا ہے، رقص بھی کرنے لگتا ہے۔

سائنس داں مذکور نے دعویٰ کیا ہے کہ میرا بنایا ہوا انسان کبھی مر نہیں سکتا۔ بشرطیکہ اس کے کل پُرزوں کی باقاعدہ مرمّت کی جاتی رہے اور اُسے صحیح مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا رہے۔ جس سے اس کے کل پُرزوں کی انرجی بیکار ضائع نہ ہو۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ خدا کا بنایا ہوا انسان انتقال کر جاتا ہے لیکن میرا بنایا ہوا انسان موت کے خوف سے بلند ہے، بے نیاز ہے۔

مشینی انسان کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اُسے اپنے ہر جذبے، اور ہر فعل کے لئے فطری انسان کا سہارا لینا پڑتا ہے جو حسبِ ضرورت اُس کے بٹن دباتا ہے۔ فطری انسان کے بغیر وہ بالکل لوہے کا مادھو ہے۔

خدا پریشان ہے ———●

افواہ ہے کہ خدا بے حد پریشان ہے۔

اور خدا کی اس پریشانی کی وجہ انتہائی معقول ہے۔ کیونکہ اُس نے خدائی بناتے وقت ایک فارمولا فٹ کر دیا تھا جس کی رُو سے ایک انسان جو پیدا ہوتا تھا، مر بھی ضرور جاتا تھا۔ اس سے خدا کو یہ آسانی ہوتی تھی کہ جتنے انسان پیدا ہوتے تھے، اُتنے ہی مر بھی جاتے تھے اور خدائی چلتی رہتی تھی لیکن گزشتہ چند برسوں سے خدا نے محسوس کیا کہ انسان بہت کم تعداد میں مر رہے ہیں جبکہ پیدائش کے اعداد وہی ہیں جو پہلے تھے۔ خدا نے اِس کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا کہ یہ سب انسان کی کارستانی ہے۔ اِس سے پہلے موت و حیات کے سلسلہ کو قائم رکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ انسان ایک دوسرے سے جنگیں کرتے اور لڑ لڑ کر لاکھوں کی تعداد میں مر جاتے یا وبائی امراض پھوٹ پڑتے جس سے [redacted] کا صفایا ہو جاتا۔ قحط پڑ جاتا اور لوگ تڑپ تڑپ کر مر جاتے لیکن موت کے یہ تینوں آزمودہ اور مجرب طریقے کچھ برسوں سے ناکارہ ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ انسان نے اپنی عقل و فہم کی بدولت اِن پر قابو پا لیا ہے۔ اب کہیں بھی جنگ کا خطرہ پیدا ہوتا ہے تو یو۔ این۔ او میں شور مچ جاتا ہے اور سکریٹری جنرل فوراً اپنا امن مشن لے کر پہنچ جاتا ہے اور جنگ رُک جاتی ہے۔ اب ایٹمی ہتھیاروں کے خوف سے کوئی ملک جنگ چھیڑنے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا۔ دوسری طرف وبائیں پھوٹنے لگتی ہیں تو میڈیکل سائنس کی مدد سے وہیں دبا دی جاتی ہیں اور وہ پھیل نہیں پاتیں۔ کسی ملک میں خشک سالی کے باعث قحط پڑ جائے تو دوسرے ملک فوراً غلّہ کے جہاز بھر بھر کر وہاں بھیج دیتے ہیں اور قحط کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔

چنانچہ انسانی ذہن، تہذیب اور سائنس کی ترقی سے شرح اموات بے حد کم ہو گئی ہے جس سے دُنیا پر آبادی کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے اور جس سے خدا کو خدائی چلانے کے آزمودہ سسٹم میں بڑی رُکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اسی لئے خدا بے حد پریشان ہے۔

افواہ ہے کہ اگر انسان اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو خدا تنگ آکر انسان سے عقل واپس چھین لے گا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ۱۹۷۰ء تک ہم سبھی انسان عقل سے محروم کر دئے جائیں گے۔

ایک افواہ، ایک معمّہ ———●

دلّی میں یہ افواہ گہری دلچسپی پیدا کرنے کا موجب بنی ہوئی ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے سراغرسانوں کا ایک اسپیشل سکوئیڈ تیار کر کے مُلک کے مختلف حصّوں میں بھیج دیا ہے جو یہ پتہ لگائے گا کہ ہندوستان میں جیب کتروں، چوروں، غنڈوں، سمگلروں، رشوت خوروں، بلیک مارکیٹروں، جواریوں اور ڈاکوؤں کی تعداد کتنی ہے۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ سکوئیڈ کسی نیک مقصد کے لئے قائم کیا گیا ہے یا ہند سرکار صرف یہ معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے کہ اِن حضرات کی مردم شماری کے بعد ہندوستان میں کتنے شریف انسان باقی رہ جاتے ہیں اور کچھ باقی رہ بھی جاتے ہیں یا نہیں۔

ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اِس ہندوستان گیر تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ اِن پیشوں کو قانونی حیثیت دے دی جائے اور قانونی حیثیت دینے کے بعد اُن پر ٹیکس لگائے جائیں تاکہ اِس طرح ہند سرکار کے خزانے کو فائدہ پہنچے لیکن ایک سرکاری ترجمان نے افواہ کے اِس حصّہ کی پُرزور تردید کرتے ہوئے کہا کہ اِن پیشوں کو قانونی حیثیت دینے سے پولیس اور عدالتوں کے ادارے بالکل بیکار ہو جائیں گے اور سرکار اسے برداشت نہیں کرے گی کہ ایڈمنسٹریشن غیر ضروری ہو کر رہ جائے۔ اُس سرکاری ترجمان نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ اِس قسم کا کوئی سکوئیڈ بنایا بھی گیا ہے اور اُس کا حقیقی مقصد کیا ہے؟

بہرکیف یہ ایک معمّہ ہے، جو شاید پارلیمنٹ کے آئندہ سال کے سیشن تک کھل کر سامنے آجائے گا۔ فی الحال اِس افواہ سے جیب کترے، چور اور سمگلر وغیرہ بڑے چوکنے ہو گئے ہیں اور بڑے تذبذب میں ہیں کہ اپنا نام درج کرانے میں اُنھیں فائدہ ہے یا نقصان !!

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمہ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶)

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	〃	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	عرش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
پھوار	〃	دو روپے ۵۰ پیسے
للکار	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	〃	تین روپے
آیاتِ جنوں	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	〃	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
گنجِ معانی	〃	سات روپے ۵۰ پیسے
روپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
رمز و کنایات	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	〃	دو روپے ۷۵ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	〃	دو روپے ۷۵ پیسے
کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اوّل)	اکبر الہ آبادی	پانچ روپے
حصہ دوم	〃	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گلِ رعنا	جگی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	〃	چھ روپے

خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	〃	چار روپے
گلنار	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	〃	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	〃	تین روپے
روزن	〃	تین روپے
جلترنگ	〃	دو روپے ۲۵ پیسے
شگفتنی	مخمور سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	〃	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	〃	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	پرتاپ سنگھ ہنر	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	چار روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۴۸ صفحے ضخامت ۵۷۵ صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شباب للت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور اِن دھڑکنوں میں اُس نے سارے جہان کے دُکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں جس میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے ہر حصہ تقریباً تین سو صفحات کا ہے۔ یہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف ۱۰ روپے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہے۔ پندرہ صفحے کی تقریباً تین تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت [illegible] کا اس کتاب کی اہمیت [illegible] نشتروں کے ساتھ [illegible] قیمت چار روپے کلام ہے [illegible] [illegible] [illegible] روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

افسانہ

گہرائی

رامپال۔ بی۔ اے (آنرز)

۲۴۔ ایل، ماڈل ٹاؤن، ہوشیار پور (پنجاب)

یکم جنوری ۶۶ء

خوشتہ بھائی! تسلیم

... آپ "بیسویں صدی" کے خوبصورت صفحات میں "لہسن" کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور میں ایسی کہانیاں لکھتا ہوں۔ مجھے دونوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا کیونکہ دونوں کی ظاہری شکل و صورت کے پیچھے "بدبُودار افادیت" موجود ہے، جس سے قاری منکر نہیں ہوسکتا۔ اُسے کھاتے اور اِسے پڑھتے وقت ناک بھوں ضرور چڑھاتا ہے ——— زیرِ نظر کہانی ایک رہزن کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ عام طور پر زر، زمین، زن کو وجہِ جُرم قرار دیا جاتا ہے لیکن چھان بین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ وجوہات صرف مادّی ہیں۔ بعض اوقات پیار کا بھوکا، اعتماد کی کمی اور بھروسہ نہ ہونے کی وجہ سے نفرت کو اپنا لیتا ہے۔ لوگ باگ اُس کے موجودہ کردار سے دل ہی دل میں اُس کی گراوٹ اور غیر ذمّہ داری کو محسوس کر کے اُس سے مزید نفرت کرنے لگتے ہیں اور جب وہ نفرت کا جواب نفرت سے دیتا ہے تو لوگ اُسے ڈاکو، رہزن، بدکار کا نام دیتے ہیں۔ وہ اِن القاب کا کس حد تک حقدار ہے؟ اِس کا فیصلہ قاری ہی کر سکیں گے...

دعاگو ——— رامپال

مل سنگھ نے چائے کا آخری گھونٹ منہ ہی میں ٹھنڈا کیا اور اُس میں اپنا تھوک مِلا کر زور سے پیک پھینکی۔ جس کے چھینٹوں نے جیل کی بارک کے گندے دھول سے اٹے فرش پر نہایت بدنما داغ دھبے بنا دیے اور پھر ٹھوکر سے ڈھائی اینٹوں کے بنے ہوئے چولھے کو توڑ کر راکھ کو یوں بکھیرا جیسے بدصورتی میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی پُوری ہو جائے اور جب اُسے تسلّی ہو گئی کہ اور زیادہ گندگی کی گنجائش نہیں، تو وہ بہت اطمینان سے مُسکرایا جیسے مصوّر نے اپنا شاہکار مکمل کر لیا ہو۔

"اوئے مل کے بچے!" اُس کا ایک ساتھی چِلّایا اور اُس کی جھنجلاہٹ سے ذہنی حظ حاصل کر کے مل کی مُسکراہٹ اور نمایاں ہو گئی۔

"ایسی گندی جگہ پر کون کمبخت بیٹھ سکتا ہے!" دوسرے نے کہا۔

"تم تو پاتال کے کیڑے ہو۔ اِس جگہ کھانا پینا تو درکنار، بیٹھنا بھی مشکل ہے!"

"آخ... تھُو!" مل نے بلغم اُگلتے ہوئے کہا۔ "کمبختو! اگر خوبصورتی سے اِتنا ہی عشق تھا، تو جیل جیسی بدصورت جگہ پر کیوں آئے؟ گناہ کیوں کیا؟ ایک طرف شیطان کی ہم رکابی، دوسری جانب خدا کا تصوّر ——— واہ واہ!" اور ایک بھرپور طنزیہ قہقہہ فضا میں بکھر گیا۔

وہ سب مل سنگھ کی اِس عادت سے واقف تھے۔ اُسے بدصورتی سے عشق تھا گناہ سے نہیں لیکن گناہ کی اصلی ہیئت نہایت مکروہ ہے۔ اِس لئے اُس کا جُزِ لاینفک طور پر اُس کی فطرت میں شامل ہو گیا تھا لیکن وہ اِس کا استعمال اُس حد تک کرتا تھا جہاں تک یہ اُجلے پن کو دُھندلا کر سکے۔ جڑ سے اُکھاڑنے کا وہ عادی نہ تھا۔ صرف پھُول نوچنے اور شاخیں توڑنے پر اکتفا کرتا اور یہ عمل اُسے ذہنی تسکین بخشتا۔ جیسے وہ اپنی بدصورتی کا بدلہ ہر خوبصورت چیز سے لے رہا ہو اور اُن کے خدوخال بگاڑ کر ایک بدصورت برادری بنا رہا ہو۔ جس میں لوگ دوسرے کا مذاق اُڑانے سے پہلے اپنی صورت دیکھ لیں۔ وہ چاہتا تھا ہر آدمی شیشے کے محل میں رہے تاکہ دوسروں پر پتھر نہ پھینک سکے۔

اُس کی یہ حرکات جنون کی حد تک پہنچ گئی تھیں، توڑنا پھوڑنا، روندنا، پھونک دینا

کھیاں بکتا، گندگی میں آسودگی حاصل کرتا۔ دوسروں کی تلملاہٹ اور جھنجھلاہٹ میں اُسے تسکین ملتی تھی اور اسی وجہ سے وہ جیل میں تھا۔ اس کے اعمال نامہ میں بیسیوں ڈاکے، درجنوں رہزنی کے واقعات، سرپھٹول کے قصے، آتش زدگی، لوٹ کھسوٹ، مار پیٹ اور اسی طرح کی دوسری وارداتیں تھیں۔ جیل میں آنے سے پہلے وہ ایک ہوّا تھا جس سے دُنیا کانپتی تھی۔ قانون پریشان تھا۔ لوگ ہراساں تھے۔ علاقے میں انتشار تھا۔ تل سنگھ کا گروہ بذاتِ خود ایک خطرے کا علم تھا لیکن ایک بات ضروری تھی۔ قتل کی کوئی واردات سرزد اُس سے نہ ہوئی تھی۔

چھ فٹ سے نکلتا قد، ڈھائی من سے اوپر وزن، کالا بھجنگ، بہت بڑی بڑی لال سرخ ڈراونی آنکھیں، جن میں ہر وقت پئے یا بن پئے ایک عجیب سا خوفناک نشہ بھرا رہتا۔ کوئی حوصلے والا ہی اُس کی آنکھ سے آنکھ ملا سکتا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے ہاتھ اور بھدی کالی کالی موٹی اُنگلیوں کے پنجے میں اگر کوئی پھنس گیا تو خدا ہی بھلا کرے۔ چپٹی ناک اور اوپر کے باہر نکلے ہوئے دانت، اُس کی بدصورتی میں اور اضافہ کرتے تھے۔

اُسے اپنی بدصورتی کا احساس تھا۔ اپنی بدصورتی پر وہ خود قہقہے لگاتا تھا۔ خود اپنے پر پھبتیاں کستا تھا، فقرے چست کرتا تھا اور پھر کوشش کرتا کہ سارا ماحول اُسی کی طرح بدصورت ہو جائے۔ بدنما، بھیانک اور مکروہ! ایک ایسا حمام بن جائے جہاں سب ننگے ہوں! اور اُس نے آج تک جو بھی کیا تھا، ایسی ہی بھیانک دُنیا آباد کرنے کے لئے کیا تھا۔

جیل سے اُسے نفرت نہ تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ اُس کی بستی ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں کوئی چیز خوبصورت نہیں۔ نہ خوراک، نہ کپڑے، نہ بارک نہ قوانین، نہ افسران، نہ محافظ! اور اسی لئے اُس نے آج تک کبھی کوئی رعایت نہ مانگی تھی ــــ کبھی قید میں تخفیف کا سوال نہیں کیا تھا۔ بلکہ اِس کے برعکس اُس نے منت مانگی بھی تو یہ کہ اُسے الگ کوٹھری میں بند کیا جائے۔ جہاں کی تیرہ و تار فضا اُسے تسکین دے سکے۔ جہاں بدبُو اور سیلن زیادہ سے زیادہ ہو۔ جس کے گہرے اندھیروں میں ڈوب کر وہ اُبھر نہ سکے۔ جہاں سورج کا اُجالا اُسے پریشان نہ کر سکے۔ جس کی گہری گھٹن میں وہ گہری سانس لے سکے۔

اور اِس کمی کو اگر کوئی چیز پوری کرتی تھی تو وہ اُس کی فراخ دلی تھی۔ اُسے جیل کے نادار بھک منگے، لولے لنگڑے، اپاہج قیدی پسند تھے، جو اُس کے ٹکڑوں پر پلتے تھے، جنھیں باہر سے کچھ نہ مِل سکتا تھا۔ وہ تل سنگھ سے گھی، چینی، گُڑ، شکر، تیل، صابن اور چائے حاصل کرتے۔ جن کے جسم سے دُور سے بھی بدبُو آتی تھی۔ وہ اُس سے چمٹے رہتے۔ کریہہ، بدصورت، کمزور، مکروہ اور گھناؤنے لوگ اُس کے اِرد گِرد بھنبھناتے رہتے اور وہ حتی الامکان اُنھیں زندہ رکھنے میں مشغول رہتا۔ اُس کے علاوہ جیل کے دوسرے طرح باز، بیچارے اُنھیں کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ وہ تل سنگھ سے خوف کھاتے تھے۔ انھیں علم تھا کہ تل سنگھ کے ایک گھونسے کا مطلب ناک، ہاتھ یا ٹھوڑی پسلی سے ہاتھ دھونا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اُس سے کترا کے نکل جاتے اور تل سنگھ ان کے خوبصورت چہروں کی طرف دیکھ کر حقارت سے مُسکراتا۔ کبھی کبھی سفید دُھلے ہوئے کپڑوں کو ان کے گریبانوں میں دو اُنگلیاں ڈال کر تار تار کر دیتا۔ مٹی اُن کے مُنہ پر مَل دیتا اور اُس کے تمام کریہہ المنظر ساتھی کھلکھلا کر ہنستے جیسے اُس کا یہ فعل نہایت قابلِ تحسین ہو۔

تل سنگھ کا معمول تھا کہ وہ ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت کے نیچے کالا کمبل بچھا کر بیٹھ جاتا اور ایک لنگوٹ باندھ کر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیتا، جس پر اُس کے چیلے چانٹے تیل کی مالش کیا کرتے اور جب وہ ملتے ملتے ہانپنے لگتے، چہرے پر پسینہ پھوٹ آتا تو وہ انھیں پہلے ایک بہت غلیظ سی گالی دیتا۔ پھر کبھی گُڑ، کبھی بیڑیاں، کبھی سگریٹ، کبھی چائے اور موقع مل جائے تو بھنگ یا افیون بھی! جیل کے حکّام جانتے تھے کہ اس داد و دہش کے پیچھے تجارت کا جذبہ کارفرما نہیں۔ اِس لئے وہ بھی مصلحتاً یا دیدہ و دانستہ چشم پوشی کرتے۔ اور پچھلے سات آٹھ سال سے تل سنگھ جیل کی اس غیر مانوس فضا کا اِتنا مانوس جُز بن گیا تھا کہ اِس کی کسی عجیب و غریب حرکت پر اعتراض کرنا گویا جیل کے قانون کی خلاف ورزی کرنا تھا!

جب ہر آدمی اپنا اپنا حصہ پاکر تل سنگھ کو سلام کر کے رخصت ہو جاتا تو تل سنگھ آنکھیں بند کر کے کمبل پر لیٹ جاتا۔ گھنٹوں اِسی حالت میں رہتا اور نہ جانے کیا سوچا کرتا۔ اگر کبھی کسی نے بھولے سے پوچھ ہی لیا تو وہ ہنس کر ٹال دیتا کہ اُس کے پاس سوچنے کو رکھا ہی کیا ہے۔ اچھی بات تو وہ سوچنے سے رہا اور بُری بات کسی کو بتانے سے!

لیکن وہ بھی ایک انسان تھا۔ چاہے وہ بدصورتی کا رفیق ہی کیوں نہ ہو ــــ ظلمات کے دیوتا کا پُجاری! وہ اُن لمحات کا تصور ضرور کیا کرتا جب اُسے بھی خوبصورتی سے عشق تھا!

کہتے ہیں، اندھیرا اُجالے سے پیار کرتا ہے۔ گرمی سردی ایک دوسرے کا جُز ہیں۔ دُکھ کے بعد سُکھ آتا ہے۔ مثبت اور منفی دونوں ساتھی ہیں۔ نیکی بدی لازم و ملزوم ہیں۔ بدصورتی اور خوبصورتی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ثواب کی پہچان گناہ سے ہے۔ وہ جانتا تھا کہ رام کا نام راون کے سہارے زندہ ہے۔ کرشن کی بڑائی کنس کی کمینوں کی وجہ سے ہے۔ شہادتِ کربلا کی عظمت یزید کی مرہونِ منت ہے۔ یسوع مسیح اور صلیب ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ رہیں گے۔ اِس تضاد میں ایک خوفناک سچائی ہے۔ ایک تلخ حقیقت!

ق سنگھ کو نہ تاریخ سے دلچسپی تھی، نہ فلسفے سے واسطہ، نہ مذہب سے لگاؤ تھا، نہ ادب عالیہ کی پہچان! وہ تو ایک ان پڑھ گنوار تھا۔ جو شاید بچپن میں ایک آدھ سال سکول گیا ہو لیکن اب تو وہ یہ بھی بھول گیا تھا۔ وہ بھی کبھی بچہ تھا۔ اُسے بھی چاند ستارے بھاتے تھے۔ وہ بھی پریوں کی کہانیوں کا دلدادہ تھا۔ اُسے بھی پھول تتلیاں پسند تھیں۔ وہ بھی کبھی جوان ہوا تھا۔ اُس نے بھی مستی بھرے نغمے گنگنائے اور دُہرائے تھے۔ جوانیوں نے اُس کے دل میں گُدگُدیاں پیدا کی تھیں۔ اُس نے بھی کبھی تمنا کی تھی، اُس کی بھی آرزوؤں نے کبھی انگڑائیاں لی تھیں۔ لیکن جب جواب میں اُسے ہمیشہ طعن و تشنیع اور نفرت و کدورت ملی، بدصورتی کا احساس دلایا گیا تو اُس نے وہ مذہب قبول کر لیا جس سے وہ خود نفرت کرتا تھا۔ اُسے گناہ سے نفرت تھی۔ وہ لڑائی جھگڑے سے گریزاں تھا۔ اُس کی اس مکروہ، بدصورت شکل و صورت کے پیچھے ایک نہایت فراخ، وسیع اور خوبصورت دل تھا۔ جس کا احساس کسی کو نہ تھا۔ لوگ اِس بے دردی سے اُس کے ساتھ کھیلے کہ وہ صرف بدصورتی میں سمٹ کر رہ گیا اور تب اُسے ہر خوبصورت چیز سے نفرت ہو گئی!

ق سنگھ نے لیٹے لیٹے ایک آنکھ تھوڑی سی کھول کر ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھا تو اُس کے منہ سے ایک دبی سی آہ نکل گئی۔ اُس میں اور اِس درخت میں کتنی مشابہت ہے۔ کتنا تناور درخت ہے لیکن ٹہنیوں اور پتوں کے بغیر کتنا بدصورت ہے۔ نہ کبھی اس میں پھل لگے نہ پھول۔ کبھی کسی جانور نے اِس پر گھونسلہ نہیں بنایا۔ اگر کبھی کوئی تھکا ہارا پرندہ چند لمحوں کے لئے اِس پر سستایا بھی تو بیٹ کرکے اُڑ گیا۔ اُس نے اپنے کمبل پر اَن گنت بیٹوں کے نشان دیکھے۔ کبھی کبھار گِدھ اِس پر ضرور بسیرا کرتے تھے۔ مُردار خور گِدھ جنھیں خوبصورتی سے نفرت تھی۔ جو خود بدصورت تھے۔ وہ سوچنے لگا۔ خدا نے گِدھوں کو کیوں بنایا؟ شاید اُن کا کام بے مصرف، متعفن لاشوں سے فضا کو پاک کرنا ہو اور لوگ ہر اُس چیز سے نفرت کرتے ہیں جو اُن کی گندگی کو دُور کرتی ہے۔ جیسے بھنگی! لیکن بھنگی کا کام کرنے کو کوئی تیار نہیں۔ کیا گِدھ اور بھنگی کا گھناؤنا پن دُنیا کی خوبصورتی اُجاگر کرنے میں مدد نہیں دیتا؟ وہ کھو سا گیا۔

ق سنگھ سوچنے لگا وہ خود بھی اِس سماج کا ایک گِدھ ہے۔ اُس سے سبھی اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ اُس کی شکل و صورت قابلِ قبول نہیں۔ بچپن میں اُسے ماں کا پُورا پیار اِس لئے نہ مل سکا کہ اُس کا بڑا بھائی گورا چِٹا تھا۔ ماں اُسے بھوت کہتی تھی۔ اُس نے اپنے کانوں سے سُنا تھا کہ ماں کسی سے کہہ رہی تھی ——— "جب یہ پیٹ میں تھا تو کسی بدروح، جِن چڑیل کا سایہ اِس پر پڑ گیا تھا ———"۔ بچپن سے پھٹکار ہی اُس کے پلّے پڑی تھی۔ وہ تلملاتا، جھنجھلاتا، لڑتا، جھگڑتا لیکن کوئی اُسے پیار نہ کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے اپنے بھائی اور ماں سے نفرت ہو گئی۔

ماں اُسے ہمیشہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ باہر بھیجتی۔ اِس خیال سے نہیں کہ بڑا بیٹا اِس کی نگہداشت کرے۔ بلکہ اِس لئے کہ یہ ساتھ ہوگا تو اُسے نظر نہ لگے گی۔ جیسے وہ ایک کالی ہانڈی تھا جسے نئے مکان پر لٹکایا گیا تھا۔

دونوں بھائیوں میں ایک سال سے زیادہ فرق نہ تھا لیکن اُس کا بڑا بھائی سوہن سنگھ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اُس سے ممتاز سمجھتا تھا۔ عمر میں تو وہ بڑا تھا ہی، خوبصورتی کی بات بھی دُرست تھی لیکن طاقت میں ق سنگھ اُس سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ اپنے سے ڈیوڑھی عمر کے بچوں کو پچھاڑ دیتا۔ اپنے بھائی سے دوگنا کام کرتا۔ اکیلا ڈھور ڈنگر کو دیکھتا۔ باپ کا ہاتھ بٹاتا لیکن گھر میں قدر و منزلت ہوتی تو اُس سفید ہاتھی کی! جو یا تو پڑا پڑا اینڈتا رہتا یا ہر کسی سے لڑتا اور جب پٹنے کی نوبت آتی تو ق سنگھ کو آگے کر دیتا۔ جیسے وہ اُس کا بھائی نہیں صرف باڈی گارڈ ہو! ق سنگھ اِس پر بھی خوش رہتا کہ چلو کسی بہانے اُسے بھائی کی قُربت تو حاصل ہے۔

لیکن یہ بھرم بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ یہ کب تک ہوتا، ساری اچھائیاں بڑا سمیٹ لے اور بُرائیاں اِس کے پلّے پڑیں! ہمسائے کے بچے جب ق سنگھ کے ہاتھوں صرف اِس لئے پٹتے کہ اُنھوں نے اُس کے بڑے بھائی پر ہاتھ چھوڑا تو بچوں کی مائیں شکایت صرف ق سنگھ کی کرتیں۔ آخر کار ق سنگھ بھر پایا۔ ایک بار اُس نے بھائی کو پٹنے کے لئے چھوڑ دیا تو اِس پر اُس کی ماں نے اُسے پیٹا اور بُزدلی کا طعنہ دیا۔ یہ وہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے سوہن سنگھ سے جی بھر کر بدلہ لیا۔ بال نوچے، منہ پر خراشیں آئیں، ناک سے لہو بہا اور ایک دانت ٹوٹ گیا اور جب اُس نے بھائی کی یہ گت بنا ڈالی، تب اُسے خیال آیا کہ اِس حالت میں اُس کا بھائی بھی اُتنا ہی بدصورت ہے جتنا وہ! تب اُس نے ایک دم اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور نہ جانے کیوں اُسے خیال آیا کہ اُس کے بھائی کو چوٹ نہ لگی ہو، ہمدردی کی ضرورت ہے۔ ماں نے یہ منظر دیکھنے کے بعد ق سنگھ کی ہڈی پسلی ایک کرنے کی قسم کھائی تھی اور اگر اُس دن اُس کا باپ

گزشتہ آگے نہ جانے کیا ہوتا۔

اس کے بعد اُس کے بھائی سے اُس کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اُسے سکول بھیج گیا کیونکہ ماں کا خیال تھا کہ یہ غصے میں کہیں اپنے بھائی کو مار نہ دے۔ زمین کافی تھی اِس لئے سوہن سنگھ کو کونسا پٹواری بننا تھا یا نوکری کرنی تھی؟ اِس کے علاوہ ماں کا خیال تھا ماسٹر جی مارتے بھی ہیں۔ اِس لئے مل سنگھ کو قربانی کا بکرا بنایا گیا۔

پڑھنے لکھنے میں مل سنگھ بہت ذہین نہ تھا لیکن بالکل کند ذہن بھی نہ تھا۔ اپنی جماعت میں جب وہ کسی سوال کا جواب دینے یا پوچھنے کھڑا ہوتا تو غلط ہو یا صحیح، ساری جماعت اُسے دیکھ کر قہقہے لگانے لگتی۔ یہاں تک کہ ماسٹر جی بھی اُس کی ہیئت کذائی سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہتے لیکن اب وہ اپنے آپ سے اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ ان تیروں اور ان نشتروں کے لئے اُس نے اپنا سینہ "بلٹ پروف" بنا لیا تھا۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ ان کا تدارک جھنجلانا نہیں اپنے آپ پر ہنسنا ہے۔ اور جب لوگ اُسے اپنا مذاق خود اُڑاتے دیکھتے تو خاموش ہو جاتے۔ بلکہ اب تو وہ لوگوں کے ذہنی خوف اور وہم کا مذاق اُڑاتا۔ جب وہ کبھی کبھار اندھیرے میں اپنے لمبے لمبے بال کھول کر زور سے "ہو" کرتا تو بچے ڈر سے چیختے اور وہ اُن کی چیخوں پر قہقہے لگاتا، اُن کے رونے پر ہنستا۔ نہ معلوم ذہنی تسکین حاصل کرنے کا یہ کونسا طریقہ تھا لیکن یہ مل سنگھ کا محبوب مشغلہ تھا۔

سکول کے بڑے بچے اُس کی غیر معمولی طاقت سے ڈرتے۔ اُس کے ہم جماعت اُس کی بدصورتی سے گریزاں تھے اور چھوٹے بچے اُسے "ہوا" سمجھتے۔ اس لئے اِن سو ڈیڑھ سو بچوں میں بھی وہ اکیلا تھا! کمزور ریڑھنگے، ناتواں بچے جو بڑوں کی مار پیٹ سے بچنے کے لئے اُس کا سہارا لیا کرتے، وہی اُس کے ساتھی تھے۔ وہ خود کسی سے نہ لڑتا نہ جھگڑتا لیکن یہ برداشت نہ کر سکتا تھا کہ کوئی کسی کو پیٹے لیکن بچے یہ اُس کا فرض سمجھتے تھے، اُس کا احسان نہ مانتے۔ جیسے کمزور بچوں کو بچانا، غریب بچوں میں گھر سے لائے ہوئے گنّوں کو بانٹنا، گُڑ تقسیم کرنا اُس کی عادت تھی لیکن پھر بھی کوئی اُس کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے کو تیار نہ تھا۔ آنکھ مچولی میں اُسے شریک نہ کیا جاتا۔ کیوں؟ اُس کے پاس اِس سوال کا جواب نہ تھا۔ اُسے اپنے آپ سے چِڑ ہو گئی۔

یہ کب تک چلتا۔ آخر اُس نے سکول جانا چھوڑ دیا۔ دیہاتی ماحول میں جیسے پڑھنے والے گھر کے کام کاج کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں، یہ سانحہ ایسا نہ تھا جس پر غور کیا جاتا۔ باپ نے توجہ نہ دی۔ ماسٹر نے روز روز کی شکایتوں سے چھٹکارا پایا۔ سکول کے بچوں کو "آدم بو" سے نجات ملی۔ جن بچوں کے مل سنگھ نے لڑائی میں کان پھاڑے، ناک توڑی، زخم دئے، اُن کے ماں باپ نے خدا کا شکر ادا کیا اور سکول معمول پر آگیا لیکن ماں نے اپنے "سوہنے پُتر" کو بچانے کے لئے مل سنگھ سے صاف کہہ دیا کہ گاؤں میں اُس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ وہ باہر کھیتوں میں رہا کرے جہاں ڈھور ڈنگر باندھے جاتے ہیں۔ یعنی مل سنگھ بھی وہیں بندھے گا! اور مل سنگھ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔

اُس کے نئے ساتھیوں کو اُس سے نفرت نہ تھی۔ بھینس، گائے، بیل، اونٹ، گھوڑا، کتا سب اُس سے مانوس تھے۔ انھیں مل سنگھ کے کالے سیاہ رنگ کی فکر نہ تھی۔ اُنھیں اُس کی بڑی بڑی سُرخ آنکھوں سے ڈر نہ لگتا تھا۔ اُس کے بڑے بڑے کالے دانت اُنھیں کھانے کو نہ دوڑتے تھے۔ اِس کے برعکس مل سنگھ نے اپنا سارا پیار، ساری ہمدردی اُنھیں دے دی! مل سنگھ اُن کا ساتھی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں میں گھُڑ سواری میں اُس کے مقابلے کا کوئی نہ رہا۔ بیل گاڑی اُس کے برابر کوئی نہ دوڑا سکتا تھا۔ ہل جوتنے میں وہ سب سے آگے تھا۔ اونٹ پر وہ بیسوں میل بے تکان سفر کر سکتا تھا۔ لوگ اُسے بھی جانور کہتے لیکن نہ جانے کیوں وہ بُرا نہ مانتا کیونکہ لوگ اپنے جانوروں کی بیماری کا علاج اُسی سے کرواتے۔ جانوروں کے ساتھ رہتے رہتے اُسے اُن کی عادات و خصائل کا اتنا گہرا علم ہو گیا تھا کہ لوگ اُس کا سکہ مان گئے لیکن دُور ہی سے!

وقت کبھی کا انتظار نہیں کرتا۔ مل سنگھ کا بچپن بھی جوانی میں بدل گیا۔ نہ جانے کیوں مل سنگھ محسوس کرنے لگا کہ اِن جانوروں کے علاوہ اُسے کسی اور ساتھی کی بھی ضرورت ہے۔ اب وہ کبھی کبھی کنویں پر بھی جاتا لیکن جب وہ بڑے دانت نکال کر بھدے ہونٹ سکیڑ کر مسکراتا تو گاؤں کی گوریاں گھڑا چھوڑ کر بھاگ جاتیں۔ گاؤں کی کنواریاں چاندنی رات میں مل سنگھ کو آتا دیکھ کر "گِدّا" ڈالنا بھول جاتیں۔ اگر وہ کبھی پاٹ دار آواز میں دیہاتی لوک گیت کا کوئی رومانی نغمہ چھیڑتا یا ہیر وارث شاہ کے جذباتی المیہ کو گنگناتا تو راہ چلتے ٹھٹکتے تو ضرور، جوانیاں گدگدی تو محسوس کرتیں، بوڑھے اپنے ماضی کی یاد تو کرتے، جوان سُر میں سُر تو ملاتے لیکن جب اُنھیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ مل سنگھ کی آواز ہے تو جواب میں طنزیہ قہقہے گونجنے لگتے اور مل سنگھ اپنے آپ پر جھنجلاتا کہ اُسے کیا حق ہے کہ وہ دُنیا کی کسی خوبصورت چیز کو اپنائے۔ وہ قہقہہ کا جواب قہقہہ سے دینے کی کوشش کرتا لیکن اُس کے جواب میں بے پناہ درد، بے اندازہ کسک ہوتی۔ لوگ محسوس کرتے اور ایک ثانیہ کے لئے جو ہمدردی اُن کے دل میں پیدا ہوتی وہ مل سنگھ کی بدصورتی میں مدغم ہو کر نفرت بن جاتی۔

سوہن سنگھ کی شادی ہوئے تین برس ہونے کو آئے تھے اور اِن تین برسوں میں وہ مشکل ہی سے گھر گیا تھا۔ کیونکہ بھابی کا اپنے دیور سے مذاق کرنا تو بڑی بات تھی۔ اُسے اپنے شوہر کا بھائی سمجھنے سے بھی گریز تھا۔ دوسرے وہ برابر کا شریک تھا۔ پھر سوہن سنگھ سے اُس کے ذاتی تعلقات بچپن سے اب تک استوار نہ ہو پائے تھے۔

سوہن کے بچے کی پہلی لوہڑی پر بہت دھوم دھام ہوئی۔ نمبردار کا پہلا

پیا تھا۔ خوب پی، خوب پلائی۔ اُس دن مَل سنگھ بھی خوش تھا۔ شراب میں اور بُرائیاں ہوں تو ہوں، ایک خوبی ضرور ہے کہ شرابی مادّی دُنیا کی نفرت اور محبت کو چند ثانیے کے لئے بھول جاتا ہے۔

مَل سنگھ اُس دن خوب ناچا، خوب گایا۔ جیسے دریا کا بندھ ٹوٹ چکا تھا۔ یہاں تک کہ سوہن سنگھ بھی اپنے ماں جائے سے بغلگیر ہوا۔ جھنگڑہ، ڈھولا، گِدا، بولیاں، ہیر، سوہنی، مرزا صاحبان اور بھنگڑہ۔ پنجابی لوک گیت کی کوئی ایسی صنف نہ تھی جسے گایا، دہرایا یا گنگنایا نہ گیا ہو اور اُس روز ہنسی کی تقسیم میں مَل سنگھ کے زوردار قہقہے بھی سموتے گئے اور اُس وقت مَل سنگھ نے اپنے بھتیجے کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ کر ہلکا سا پیار کیا۔ بچہ چیخ پڑا۔ چچا نے آج تک نہ کسی کو پیار کیا تھا، نہ اُسے کسی نے۔ اُس کی بھابی نے خشمگیں ہو کر کہا۔

"یہ جانوروں کا رکھوالا آدمیوں میں رہنے کے قابل نہیں!"

مَل سنگھ کا نشہ ہرن ہو گیا۔ اُسے اپنی اصلیت کا احساس ہوا۔ وہ سر جھکا کر نیچے سے بھرے میلے سے کھسک گیا۔

چوٹ بھرپور اور گہری تھی اور تو شاید کسی نے اُس کی گہری افسردگی کو محسوس نہ کیا ہو لیکن مَل سنگھ کے باپ شام سنگھ نمبردار نے دُنیا دیکھی تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ مَل سنگھ جوان ہو چکا ہے اور اُسے جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ گائے، بھینس، گھوڑا، اونٹ، بیل، کتا، کھیت، رہٹ۔ فصل ساتھی ضرور ہیں لیکن جیون ساتھی نہیں!۔۔۔ اور تب نمبردار نے ساری برادری کے آگے جھولی پھیلائی۔ غریب کنواریوں کے ماں باپ نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھا۔ وہ جیتے جی اپنی لاڈلیوں کو جہنم میں کیسے جھونک دیں۔ روپیہ، پیسہ، لوبھ، لالچ، دھمکی سب بیکار ثابت ہوئی لیکن نمبردار ہمت نہ ہارا اور کہیں دُور پار سے نہ جانے کس خاندان کی لڑکی کا ہاتھ مَل سنگھ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

جیت کور اپنے خاوند کو دیکھ کر ٹھٹکی تو ضرور لیکن سنبھل گئی۔ اُس نے ایک نقاب پہن لیا۔ جس سے وہ ایک مشین بن گئی۔ ٹھنڈی، بے جان لیکن مَل سنگھ نے اُس کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ بھوری بھینس کا دودھ جیتو کے لئے وقف تھا۔ سرسوں کے ساگ کی نرم نرم بالیاں اور سُنہری مکی کا آٹا، مکھن کی ٹکیہ اور شُدھ گھی، تازہ گنّے کا رس اور اخروٹ میوے بادام والی گُڑ کی بھیلی۔ کاجل، مِسّی، مہندی، باغ پھلکاری، چھینٹ کی شلوار، باریک ململ کا دوپٹہ اور کاسنی پھول دار قمیص، اصلی تلّے دار جوتی، چھم چھم کرتے گھنگھرو اور چھن چھن کرتی پازیب۔ مَل سنگھ سب چیزیں لاتا۔ وہ زیرِ لب مسکراتی اور لکڑی کے صندوق میں رکھ دیتی۔ وہ پوچھتا، وہ ٹال جاتی اور تب ایک دن سوہن سنگھ بھی آیا۔ مَل سنگھ کے دل میں ملال نہ تھا۔ اُس نے بھائی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بھابی دوسرے بچے کے سلسلے میں اپنے مائیکے گئی ہوئی تھی اور

تب سوہن سنگھ برابر آنے لگا۔ جیسے پُرانی کدورت جیت کور نے اپنے حُسن کے صابن سے دھو ڈالی ہو اور پھر ایک دن جب مَل سنگھ کسی وجہ سے یکایک کھیتوں سے گھر آیا تو جیت کور کاجل، مِسّی، مہندی، کاسنی پھولدار قمیص، باریک ململ کا دوپٹہ، چھینٹ کی شلوار اور خالص تلّے دار جوتی پہنے تھی اور اُس کے نزدیک اُس کا ماں جایا اپنے گورے چٹے ہاتھ سے اُس کی سانولی سلونی ٹھوڑی اونچی کر کے کہہ رہا تھا: "بھگوان نے تمہاری ناک نہیں، تلوار بنائی ہے!" جیتو ہنس دی اور سوہن نے کہا: "دانت موتیوں کی لڑی!" تب جیتو بولی: "اور قسمت میں کالا دیو!" اور پھر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی: "کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں آپ کی! بھابی تو آپ کو دیکھتی ہی رہتی ہوگی اور مجھ ابھاگن کو دیکھنے کو ایسی بھیانک آنکھیں! جنھیں دیکھنے سے خوف آئے!"

اور تب مَل سنگھ کی آنکھیں واقعی خوفناک ہو گئیں! لاوا اُبل پڑا۔ وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اِس سے پہلے کہ دونوں سنبھلتے، اُس نے درانتی کے ایک بھرپور وار سے جیت کور کی تلوار سے زیادہ ستواں ناک اُڑا دی! سوہن سنگھ نے بھاگنا چاہا لیکن مَل سنگھ کے خوفناک قہقہے نے اُس کی قوت سلب کر دی۔ اُس نے اُسے گردن سے پکڑا اور خون سے رِستی ہوئی درانتی اُس کی ایک آنکھ میں گھونپ دی۔ دونوں بے ہوش ہو گئے لیکن مَل سنگھ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اُس نے پتھر اُٹھا کر دونوں کے موتیوں کے سے دانت توڑ دئے۔ یاقوتی ہونٹوں کا قیمہ کر دیا۔ اور تب قہقہہ لگا کر کہا: "اب ہم ایک جیسے ہیں! جب بھی کبھی غلطی سے شیشے میں شکل دیکھو گے تو مجھے ضرور یاد کرو گے!" اور دونوں کو سسکتے ہوئے چھوڑ کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔

گاؤں والوں نے سوچا۔ خس کم جہاں پاک! لیکن گاؤں سے خس ضرور کم ہو گیا لیکن گاؤں پاک نہیں ہوا تھا بلکہ کچھ اور پلید ہو گیا تھا۔ گُناہ گار گُناہ سے بچنے کے لئے گُناہ کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد جب پتہ لگا کہ مَل سنگھ کا گروہ غارتگری کا علمبردار ہے۔ مَل سنگھ ایک رہزن ہے، ڈاکو ہے، پولیس اُسے پکڑنے سے قاصر ہے، قانون اُسے گرفت میں لانے سے معذور ہے۔ وہ واقعی بھوت ہے، چھلاوہ ہے، ہوا ہے!! تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں کے دل میں ایک عقیدت مندانہ خوف پیدا ہو گیا۔ وہ اُسے فوق البشر سمجھنے لگے اور اِس کے ساتھ ساتھ کچھ واقعات اور بہت سی حکایات اُس کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ بہت سے ایسے حادثات جن کا شاید مَل سنگھ کو بھی علم نہ تھا، اُس کے نام کے ساتھ منسوب ہو گئے اور اُدھر مَل سنگھ کے سایۂ عاطفت میں وہ سارے محروم و ناکام جنھیں پیار نہ مل سکا تھا سکون ڈھونڈنے آ گئے۔ مکروہ، غلیظ، گھناؤنے، بدکردار، بدمعاش اُس کے چیلے چانٹے تھے اور مَل سنگھ کو اِس دُنیا میں ذہنی سکون تھا۔ وہ غارتگر ضرور تھا لیکن قاتل نہ تھا۔ نئے خوبصورت مکان کا چوبارہ توڑ دینا، ہرے بھرے باغ کے پھل پھول نوچ لینا، لہلہاتے کھیتوں کی

سنہری بالیاں کھسوٹ لینا، ڈاکہ ڈالنا لیکن اِس حد تک کہ مظلوم سِسکتا رہے، بربادی اِس حد تک کہ برباد کراہتا رہے۔ اور جب جلے ہوئے کھیت، ٹوٹے پھوٹے مکان، اپاہج انسان، بھوکے پیاسے ڈھور ڈنگر ایک ایسا گھناؤنا منظر پیش کرتے، جس سے کراہت آتی ہو تو وہ ہنستا، قہقہے لگاتا اور مالِ غنیمت اپنے حوالیوں موالیوں میں تقسیم کر کے خود اُس بھیانک منظر سے محظوظ ہوتا۔

اور پھر ایک دن اُس نے اپنے آبائی گاؤں کے پاس ڈاکہ ڈالا۔ سُنا تھا لالہ نوبت رائے نے اپنی اکلوتی لڑکی کی شادی کے لئے پوری تیاری کی ہے۔ کیا کچھ نہیں جو اُس نے جہیز کے لئے نہ اکٹھا کیا ہو۔

چند مہواتی ذاکروں سے پتہ لگ گیا کہ مَل سنگھ آگیا۔ جیالے دُبک گئے، جوانمرد کھسک گئے، بہادر سنپولئے بیٹھے۔ لالہ نوبت رائے اِس شیطانی گروہ کا مقابلہ کیا کرتے۔ ایک لاٹھی نے اُن کا دایاں ہاتھ مفلوج کر دیا جس سے وہ سُود کا روپیہ لیتے اور سلام کا جواب دیتے تھے۔ بات ختم ہو جاتی اگر ــــــــــ

اگر مالِ غنیمت سمیٹتے وقت ایک لڑکی کہیں اندھیرے میں سے نکل کر مَل سنگھ کا بازو پکڑ کر یہ نہ کہتی "ویرا! اِس جہیز کے سہارے ہی تو میں بیاہی جاؤں گی ورنہ مجھ ابھاگن کو۔۔۔"

اور یہ کہتے کہتے اُس نے مَل سنگھ اور خود اپنے آپ کو روشنی کے حوالے کر دیا۔ مَل سنگھ جو بدصورتی کا اوتار تھا، بدصورتی کی یہ مثال دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خدا نے اُس کی بدصورتی کو بھی فرصت کے وقت گھڑا تھا۔ جسم کا ایک بھی حصہ ایسا نہ تھا جو قابلِ قبول ہو۔ ہر حصہ بے ڈھنگا، سارے اعضاء بے ڈول۔ اُس کی اپنی بدصورتی اِس بدصورت لڑکی کے آگے ماند پڑ گئی اور تب ہمدردی کا سوتا پھوٹ اُٹھا۔ ایک اشارے کے ساتھ سب رُک گئے۔ شیطان لوٹنے کی حریص نگاہیں جو مالِ غنیمت پر مرکوز تھیں، مَل سنگھ کی بھیانک سُرخ آنکھوں کی تاب نہ لا سکیں اور گروہ خالی ہاتھ اپنے ٹھکانے پر واپس آگیا۔

لیکن مَل سنگھ کو چین نہ تھا۔ اُس کا دل بے چین تھا کہ وہ اُس لڑکی کو بار بار دیکھے ــــــ اور تب ایک رات وہ پھر چپکے سے اُس کے ہاں گیا اور جب دروازہ کھُلا تو لڑکی نے حیرت سے پوچھا "تم ــــــ؟" اور پھر کچھ دیر بعد سوچ کر بولی: "میرا خیال تھا کہ تم آؤ گے۔"

"کیوں؟" اُس نے ظاہری طور پر پوچھا حالانکہ اِس کا جواب اُسے معلوم تھا۔

"اِس لئے" لڑکی نے بہت اطمینان سے کہا "گھائل کی گت گھائل ہی جانتا ہے۔ میں نے اُس دن تمہاری شکل دیکھی اور تب میں نے سوچا کہ دُنیا میں میرے جیسے اور بھی ہیں اور اِسی بھروسے پر میں نے بلا جھجک تم سے درخواست کی۔"

اور تب مَل سنگھ اُس کی شادی پر گیا، اُس کے گونے پر گیا اور اُس نے اُس کے خاوند کے کان میں پھونک ماری کہ اگر اِسے ذرا بھی تکلیف ہوئی تو۔۔۔ لالہ نوبت رائے کی ساری دولت شاید اِس بدصورت لڑکی کے خاوند کو اُس سے متنفر ہونے سے نہ روک سکتی لیکن مَل سنگھ کی دھمکی سے لڑکی کے سُسرال والے چونک گئے۔ بدصورت، کالی کلوٹی، کریہہ المنظر، گھناؤنے چہرے والی بیٹی کہ گھر کی لکشمی، گھر کی دولت، سہاگن میں بدل گئی!!

لیکن یہ رشتہ، یہ برادری، یہ بھائی چارہ مَل سنگھ کو مہنگا پڑا۔ پولیس کو اِس کی کمزوری کا پتہ لگ گیا اور وہ اپنی کمزوری کا شکار ہو گیا۔

اب جیل میں اگر کوئی اُس سے ملنے آتا تو اُس کی بدصورت شکل بہن یا بھُجنگ بھتا کریہہ المنظر باپ، جسے اِس بات کا علم تھا کہ مَل سنگھ کی بدصورتی کا ذمہ دار مَل سنگھ نہیں وہ خود ہے! ــــــ اور اِن کے سہارے مَل سنگھ زندہ تھا۔

اور ٹُنڈ مُنڈ درخت کے نیچے لیٹا ہوا مَل سنگھ سوچے گا ــــــ یہ درخت اکیلا نہیں۔ گِدھ، اُلّو اِس کے ساتھی ہیں جو مرداروں کو کھا کر فضا کو پاک کرتے ہیں اور دوسرے جنہیں اندھیرے سے عشق ہے، جو تاریکی سے نفرت نہیں کرتے، انہیں خدا نے پیدا کیا ہے تو یقیناً اِس میں کوئی راز تو ضرور پنہاں ہو گا ــــــ! اور یہ سوچتے سوچتے اُس کے بھیانک موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ اُبھر آئی اور دو بڑے بڑے دانت نمایاں ہو گئے ــــــ لیکن مَل سنگھ مطمئن تھا۔ وہ اپنی صورت خود نہیں دیکھ سکتا تھا اور جیل کے ماحول کی بدصورتی اُس کی ہمدم و دمساز تھی ــــــ!!

غزلیں

ایم۔ اے۔ حفیظ بنارسی ایم۔ اے

تیرے بغیر کائناتِ دل رہینِ یاس ہے
وہی ہے زندگی مگر بڑی اُداس اُداس ہے

زمانہ ہوگیا کہ چپ ہیں میرے دونوں ہم نوا
گزارشِ نظر ہے کچھ، نہ دل کی التماس ہے

یہ اپنی اپنی آرزو، یہ اپنی اپنی جستجو
وہ جلوہ گاہِ دلنشیں نہ دور ہے نہ پاس ہے

ہزار جشنِ سرخوشی کے بعد یہ پتہ چلا
وہی ہے اصل زندگی جو غم سے روشناس ہے

ستارے کب کے سو گئے، مگر حفیظ آپ کو
کسی کا انتظار ہے کسی کی اب بھی آس ہے

مجاہد جل گانوی

اپنی بھی حکایات ہیں اُن کے بھی گِلے ہیں
کہنے کو بہت کچھ ہے مگر ہونٹ سِلے ہیں

سوغاتِ محبت ہیں، وفاؤں کے صلے ہیں
وہ غم جو ہمیں شہرِ نگاراں سے مِلے ہیں

کچھ اور بھی اے چارہ گرو۔ فکرِ مداوا
کب حرفِ تسلی سے بھلا زخم سِلے ہیں

یوں داغِ محبت ہیں مرے دل میں فروزاں
جیسے کسی ویرانے میں کچھ پھول کِھلے ہیں

اک خوابِ تبسم کی تمنا میں مجاہد
آنسو مری ترسی ہوئی آنکھوں کو مِلے ہیں

طوؔر

جہاں گو برسرِ پیکار بھی ہے
جہاں سے ہم کو لیکن پیار بھی ہے

گلِ تر بھی ہے، نوکِ خار بھی ہے
یہ عشق آسان بھی، دشوار بھی ہے

ترا غم دھوپ بھی ہے گرمیوں کی
ترا غم سایۂ دیوار بھی ہے

ہمیں ہیں اُن کے جلووں سے گریزاں
ہمیں کو حسرتِ دیدار بھی ہے

اگر وہ آنکھ دے اذنِ تکلم
مرا غم قابلِ اظہار بھی ہے

نظر انداز کرتا ہے تو پانے کی جستجو میں کھونے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ شاید یہ کہانی بعض طبائع کو خشک محسوس ہو لیکن موضوع ایسا ہے کہ اس میں رنگینیٔ بیان کی زیادہ گنجائش نہیں . . .

نیاز کیش ——— مدثر حسین رضوی

محترمی! آداب

اگست کے شمارہ میں آپ کا افسانہ "اماوس کا چاند" کے افسانے پڑھتی رہی ہوں لیکن اپنی رائے دینے کی نہ ہمت ہوئی اور نہ کبھی ضرورت ہی محسوس کی۔ اِس بار آپ کے افسانے نے ذہن و دل کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ خط لکھے بغیر سکون ہی نہ ملا۔ آپ نے کہانی کے ساتھ شائع ہونے والے خط میں اِس اندیشہ کا اظہار کیا ہے کہ قارئین کہانی کی ہیروئن شوبی کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ میرے خیال میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ شوبی نے عورت ہوتے ہوئے بھی اپنے ماحول سے خاموش بغاوت کا آغاز کیا ہے۔ یہ بغاوت رازی

ملک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے دلچسپ شاہکار

آن کی بات آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بل کے دلچسپ بلند پایہ افسانوں کا حسین مجموعہ جن کے کرداروں کے قہقہوں اور آنسوؤں کو آپ اپنے قہقہے اور اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

جو عورت ننگی ہے نامور فنکار ام لعل کی رومان پرور اور تلخ کہانیوں کا حسین مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

میرے سپنے نامور افسانہ نگار خاتون پروفیسر کرشنا کماری ایم اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

سنگھار کرتے ہیں پروفیسر کرشنا کماری ایم۔ اے کے بہترین دلچسپ رومانی افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ قیمت دو روپے

دُکھتی رگیں ہر افسانے میں جوانی کا اضطراب ہے، حُسن کی بیکلی ہے عشق کی بیقراری ہے مصنفہ جناب شمس مظفر پوری۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

ایک حمام میں تین ننگے زندگی کی عریاں تصویریں۔ وقت کی دُکھتی ہوئی رگ پر سعید امرت کی فنکارانہ ضرب۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

کالی راتیں سعید امرت کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ۔ تشنہ جوانیوں کے اندھے جذبات کی ترجمان۔ بہکے ہوئے بڑھاپے کی ہوسناکیوں پر طنز ہیں اور کالی راتوں میں رینگنے والے گناہوں پر ضربِ کاری ہیں۔ قیمت فی جلد تین روپے۔

یہ لڑکیاں رنگ رنگ کی شوخ و شنگ لڑکیوں کے جذبات و احساسات

فردوس اُردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر اضافہ مصنفہ شکیل جمالی اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب دوسرا ایڈیشن قارئین کے اصرار پر نہایت آب و تاب سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

۱۸۵۷ء کی دلی جناب مہیشور دیال نے اس میں تاریخی خاکوں کے دھندلے نقوش کو ایک پُرکیف داستان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ جس میں آپ حُسن و شباب کی رنگینیوں ہی سے نہیں، جذبۂ حُب الوطنی، ایثار، اخوت و محبت اور رواداری کے چشموں سے بھی سیراب ہوں گے۔ دلی کی ٹکسالی زبان، قلعۂ معلےٰ کی دِل میں حل ہو لینے والی زبان کی حلاوت آپ کو جناب مہیشور دیال ہی کے زورِ قلم میں پائیں گے۔ کیونکہ یہ اُن کی اپنی مادری زبان ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

ڈارلنگ جناب نریش کمار شاد کے منتخب طبع زاد افسانوں کا بے مثل نادر حسین و جمیل مجموعہ۔ قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

سُرخ حاشیے اُردو کے مشاہیر ادیبوں کے دلچسپ لطیفے۔ قیمت دو روپے پچھتر نئے پیسے۔

راکھ تلے غیر ملکی افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانے ہندستانی لباس میں۔ قیمت دو روپے۔

مالوا میکسم گورکی کے شہرۂ آفاق ناولٹ کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے۔

سیاہ پوش خاتون یہ ایک دلچسپ اور ولولہ انگیز ناول ہے جو بیک وقت رومانی

... اول دو روپے، دوم چار روپے

... ب محسن زیدی قتیل شفائی

... دو روپے۔

... اری میں اتنی توانائی

... قیمت صرف چار روپے

... دور کی بہترین ...

... لینے پر مجبور ہوں گے

... تین روپے۔



طلا شیری یعنی بسلوچن (مکمل جواب)
عورت مرد اور بچوں کیلئے یکساں
طاقت اور قوت پیدا کرتا ہے
چیونٹ پراش اور سنتو پادی
چورن میں شامل ہوتا ہے

مرد نے حیرت سے پوچھا "تم ——؟" اور پھر کچھ دیر بعد سوچ کر بولی: "میرا خیال تھا کہ تم آؤ گے"

"کیوں؟" اُس نے ظاہری طور پر پوچھا حالانکہ اس کا جواب اُسے معلوم تھا۔

"اس لئے" لڑکی نے بہت اطمینان سے کہا: "گھائل کی گت گھائل ہی جانتا ہے۔ میں نے اُس دن تمہاری شکل دیکھی اور تب میں نے سوچا کہ دُنیا میں میرے جیسے اور بھی ہیں اور اسی بھروسے پر میں نے بلا جھجک تم سے درخواست کی"

اور تب تل سنگھ اُس کی شادی پر گیا، اُس کے گونے پر گیا اور اُس نے اُس کے خاوند کے کان میں پھونک ماری کہ اگر اسے ذرا بھی تکلیف ہوئی تو... لالہ نوبت رائے کی ساری دولت شاید

رشتے

مدثر حسین رضوی۔ بی، اے

دانش کدہ۔ امروہہ (یوپی)

۲۷ر اکتوبر ۶۵ء مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

طویل مدت کے بعد بزمِ "بیسویں صدی" میں حاضر ہو رہا ہوں۔ اِس وقفہ میں "بیسویں صدی" برابر آپ کی یاد دلاتا رہا۔ کبھی کبھی قیامِ دہلی کے وہ لمحے بھی یاد آتے ہیں جب آپ اپنی کوٹھی میں "لنچ" پر میرے منتظر رہے ہوں گے اور میں غیر معمولی مصروفیات بلکہ یوں کہوں کہ اپنی بد قسمتی سے وہاں نہ پہنچ سکا۔ یقین کیجئے مجھے اپنی اِس محرومی کا اِتنا افسوس نہیں ہے جتنا اِس بات کا کہ آپ کو کئی گھنٹے انتظار کی زحمت سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ کی شفقت و محبت کے پیشِ نظر میری یہ اُمید بے جا نہ ہوگی کہ آپ اُس واقعہ کو اپنے ذہن سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں گے ——— دیوالی کارڈ کا شکریہ! اِس تیوہار پر آپ کا اُن بہادر شہیدوں کو یاد کرنا جنھوں نے اپنے لہو سے ہماری آزادی اور جمہوریت کے چراغوں کو روشن رکھا ہے، آپ کے قومی کردار کی عظمت کا ایک اہم پہلو ہے۔ اِس بلند اور اعلیٰ کردار کا دوسرا اہم پہلو چند دن پہلے اُس وقت سامنے آیا تھا جب میں نے اخبارات میں پڑھا کہ مُلک کے جاں نثار محافظوں اور دیس کے اُن بہادر سپاہیوں کے لئے جو آج ہسپتالوں میں زخمی پڑے ہیں، جنابِ خوشتر گرامی نے سات ہزار روپے کی اُردو ہندی کتابیں ائیر مارشل ارجن سنگھ اور ڈائرکٹر آف ایجوکیشن آرمی ہیڈ کوارٹر نئی دِلّی کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ اُردو کے صحافیوں میں یہ سب سے بڑی پیش کش ہے ——— چند خطوط پر مشتمل ایک کہانی ارسالِ خدمت ہے۔ "بیسویں صدی" کے بیشتر قارئین اور فنکار اِس طرح کے تجربات سے کبھی نہ کبھی ضرور دوچار ہوئے ہوں گے، جنھیں اِس کہانی میں پیش کیا گیا ہے ——— مانگے کا اُجالا کبھی گھر کو روشن نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی اِس اصول کو نظر انداز کرتا ہے تو پانے کی جستجو میں کھونے کے سِوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ شاید یہ کہانی بعض طبائع کو خشک محسوس ہو لیکن موضوع ایسا ہے کہ اِس میں رنگینیٔ بیان کی زیادہ گنجائش نہیں . . .

نیاز کیش ——— مدثر حسین رضوی

[...]ی منڈی الہ آباد

[...]لائی ۶۵ء

محترمی! آداب

ماہنامہ "ایک صدی" کے اگست کے شمارہ میں آپ کا افسانہ "اماوس کا چاند" [...]گزرا۔ اِس سے پہلے بھی آپ کے افسانے پڑھتی رہی ہوں لیکن اپنی رائے دینے کی نہ ہمت ہوئی اور نہ کبھی ضرورت ہی محسوس کی۔ اِس بار آپ کے افسانے نے ذہن و دل کو کچھ ایسا متاثر کیا کہ خط لکھے بغیر سکون ہی نہ مِلا۔ آپ نے کہانی کے ساتھ شائع ہونے والے خط میں اِس اندیشہ کا اظہار کیا ہے کہ قارئین کہانی کی ہیروئن شوبی کو حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ میرے خیال میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ شوبی نے عورت ہوتے ہوئے بھی اپنے ماحول سے خاموش بغاوت کا آغاز کیا ہے۔ یہ بغاوت راز کی

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	"	چار روپے
گدھے کی واپسی	"	تین روپے
الٹا درخت	"	دو روپے پچھتر پیسے
دروازہ	"	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
مسٹر ۵۰	"	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	"	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں پٹے ہیں	"	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	"	پانچ روپے
داماد	"	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	"	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	"	تین روپے
خاک پروانہ	"	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	"	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	"	چار روپے
گرد کارواں	کنہیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	"	دو روپیہ پچاس پیسے
سوزناکاچی	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	"	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود جاوید	چار روپے پچیس پیسے

شکست ظلمت	قمر جالندھری	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	"	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	"	ایک روپیہ پچیس پیسے
خوابگاہیں	"	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	"	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سعید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپیہ
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	"	تین روپے
اکبری دروازہ	"	چار روپے
دوشیزۂ روم	"	تین روپے
دیوانہ	"	تین روپے
دو دیوانے	"	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	"	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	"	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	"	تین روپے پچانوے پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	"	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	"	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری داؤ	"	پانچ روپے
ریحانہ	"	سات روپے

وعدہ	ہیمدرناتھ	[illegible]
گلی گلی	ایم اسلم	چار روپے
فردوس گوش	حضرت [illegible] لسانی	چار روپے
کفر و ایمان	برج چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لکھن سے تک	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شوا	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
چارلی چیپلن (بچوں کیلئے)	خوشتر گرامی	پچاس پیسے
بلا سبھاش ۔ ہندی	"	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آبشار یہ جھرنا	ستیہ پرکاش سنگر	دو روپے
ابراہیم لنکن	چندر موہن لال	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپے پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس ساہیہ	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۳۲، دہلی

کے لئے بہت آسان تھی لیکن شوبی کے لئے بہت مشکل ــــــ آپ کی کہانی کا ہیرو راآزی اگر حالات اور روایات سے بغاوت نہ کر سکتا تھا تو کیا شادی کرنے سے انکار بھی نہ کر سکتا تھا؟ وہ خود تو اپنی شادی رچاکر بیٹھ گیا لیکن اس نے شوبی کی کوئی پروا نہ کی۔ قابلِ تعریف ہے شوبی جو اپنے فیصلہ پر پہاڑ کی طرح اٹل رہی۔ اس نے اپنے تاریک مستقبل کو راآزی کی یادوں سے سہانے منور کرنے کا فیصلہ کرکے ایثار و محبت کی جو مثال قائم کی، وہ مجھے آج تک کسی افسانہ میں نہیں ملی۔ آپ کا افسانہ نامکمل نہیں ہے لیکن جب ختم ہوتا ہے تو نہ جانے کیوں دل کے بعض گوشوں سے یہ آواز آتی ہے کہ ابھی افسانہ اور آگے بڑھتا۔ بہرکیف آپ کا افسانہ حقیقی میں چودھویں کا چاند ہے جو اپنی روشنی سے ہر دل کو منور کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
میری جانب سے اتنے کامیاب افسانہ کی تخلیق پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔

خلوص کیش ــــــ عزمہ نہاں

شعبہ اُردو۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

۲۵ر جولائی ۶۵ء

مسٹر انیس بزمی! تسلیم

یہ لفافہ کھول کر اور اس میں اپنی تحریر رکھ کر میں ایک اخلاقی جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن اس لفافہ کو آپ تک پہنچانا ہے اس لئے یہ سمجھتا ہوں کہ میرا یہ اخلاقی جرم قابلِ معافی ہے۔ یہ لفافہ کل مجھے یونیورسٹی کی ایک گیلری میں پڑا ہوا ملا تھا۔ میں اسے پوسٹ کرنے ہی والا تھا کہ کسی انجانے جذبہ نے سر اُبھارا اور میں نے اسے نہ صرف چاک کیا بلکہ پڑھ بھی لیا۔ میرا خیال ہے میری اس جسارت کے لئے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

"ایک صدی" میں "اماوس کا چاند" میری نظر سے بھی گزرا۔ یہ نہ صرف اوسط درجہ کا بلکہ اس سے بھی نیچی سطح کا افسانہ ہے۔ اس لئے مجھے پسند نہیں آیا۔ کوئی نئی بات آپ نے نہیں پیش کی بلکہ اس کی تخلیق میں اپنا وقت ضائع کیا اور اسے اشاعت کے لئے بھیج کر قارئین کا قیمتی وقت بھی برباد کیا۔ اس افسانہ میں کچھ نہیں ہے۔ عنوان تک ناقص! بھلا اماوس کی رات میں چاند کہاں ہوتا ہے؟ موضوع کے اعتبار سے بھی وہی محبت کی گھسی پٹی داستان، وہی چباتے ہوئے لقمے، وہی عام سی زبان، عام باتیں ــــــ لیکن آج کل کی لڑکیاں اپنے آپ کو ماڈرن اور ایڈوانس پوز کرنے کے لئے مری جاتی ہیں۔ اس لئے افسانہ نگاروں کو خطوط لکھ لکھ کر اپنا وقت تو برباد کرتی ہی ہیں ساتھ ساتھ ڈاک خرچ پر اپنے والدین کا پیسہ بھی ضائع کرتی ہیں اور انھیں اس کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں یہ ناقص العقل مخلوق کب اپنے آپ کو سدھار سکے گی۔ اب آپ ہی بتایئے کہ ان عزمہ صاحبہ کو کس بیماری کے علاج کے طور پر ڈاکٹر نے یہ بتایا تھا کہ وہ آپ کو اتنے "بور" افسانہ پر تعریفی خط لکھیں۔

آپ کے لئے ایک سوالیہ نشان؟

عزیز رضوی متعلم ایم۔ اے (سال دوم)

شعبہ اُردو۔ الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد

۱۸، اگست ۶۵ء

مسٹر بزمی!

اب آپ کو نہ تو سلام کرنے کو دل چاہتا ہے اور نہ خط ہی لکھنے کو ــــــ آپ میری نظر سے گر چکے ہیں۔ آپ کی شخصیت کا جو پیکر میرے ذہن نے بنایا تھا وہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے ریزے میرے دل و دماغ کے شیش محل کے گوشوں میں منتشر پڑے ہیں۔ آپ نے مجھ میں اتنی سکت بھی نہ چھوڑی کہ میں انھیں چن چن کر یکجا کر سکوں۔ آپ کو میں آج کل کے مردوں سے کچھ الگ سمجھتا تھا لیکن یہ افسانہ نگار حضرات ہوں یا شاعر و ادیب، صنفِ نازک سے گفتگو کرنا، لڑکیوں سے خط و کتابت کرنا، اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار! آپ بھی ان عامیوں سے الگ نہ نکلے اور محترمہ کو اپنے الفاظ کے جال میں لپیٹنے کی کوشش میں خط لکھ ڈالا۔ خاکسار بھی اسی انتظار میں تھا کہ خط آئے تو پتہ چلے کہ آخر یہ افسانہ نگار جو اپنے آپ کو عام مخلوق سے اونچا سمجھتا ہے، دونوں کو الگ الگ کیا جواب دیتا ہے۔ وہی ہوا جس کا مجھے خیال تھا یعنی آپ بھی ــــــ 'وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ' کے قائل ہیں ــــــ کیوں؟

میں نے آپ کو خط پوسٹ کرنے کے بعد عزمہ صاحبہ کے حلقہ کے ڈاکیہ سے مل کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان کے پتے پر آئے ہوئے خط مجھے دے دے۔ غریب آدمی کو چند پیسوں کا لالچ کافی ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے آپ کا یہ نیلا لفافہ دستیاب ہوا۔ اسے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوا کہ آپ نے خاکسار کو بھی جواب سے نوازا ہے۔ بزمی صاحب! آپ بھلا عزیز کو کیوں خط لکھتے۔ اس کے پاس کون سی نعمت ہے۔ اُلٹا آپ نے احقر ہی کو اپنی خط و کتابت کا وسیلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ بہت خوب! ابتدائی پانچ سات سطروں کے علاوہ آپ کو اپنے خط میں اور کوئی بات نہ لکھنی چاہئے تھی۔ "بہرحال" سے آپ نے اپنے خط میں جو جملہ شروع کیا ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ آئندہ مراسلت کا سلسلہ جاری ہو جائے۔ کیوں حضرت ہے نا یہی بات؟ 'مارنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں!'

خط کی نقل ارسال کئے دیتا ہوں تاکہ آپ کو یقین آجائے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے درست ہے۔ اب اگر آپ چاہیں تو تحریر فرمائیں، یہ خط عزمہ صاحبہ کو پوسٹ کر دیا جائے گا۔ اس طرح آپ کے دل کی بے چینی بھی دور ہو سکتی ہے۔

سوالیہ نشان، جو حل ہو گیا!

عزیز رضوی

بعد ملا ہے۔ بغیر کام کے تو تیری تحریر دیکھنے کو بھی نہیں ملتی۔ تجھے کہانیاں لکھنے کی دُھن نہیں تو اور کیا ہے؟ بہتر یہ تھا کہ کہانی کار بننے کی بجائے سی۔ آئی۔ ڈی کے محکمے میں نوکری کر لیتا اور پیری میسن سیریز پڑھا کرتا۔ ذرا تُو نے جو انکوائری میرے سپرد کی ہے، اِس سلسلے میں ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔ وہ جو تیرا وکیل دوست فقوی ہے اُس کی طرف سے ہری منڈی کے پوسٹ ماسٹر کو ایک نوٹس دلا دے۔ پھر دیکھ کیا رنگ آتا ہے؟ میں بھی انکوائری کر سکتا تھا لیکن آج کل اپنے محکمے کے غضب کاموں میں بے حد مصروف ہوں۔ اگر ایک ماہ کا انتظار کر سکے تو انتظار کر اور مجھے ایک ماہ بعد یاد دلانا۔ پھر خط لکھ کر میرا وقت ضائع نہ کرنا کہ میں اِن دنوں نہ صرف بے حد مصروف ہوں بلکہ بے حد غصّے میں بھی ہوں۔ ممکن ہو تو بیٹا یہ کہانیاں وہانیاں لکھنا چھوڑ اور یہ خط و کتابت کا چکر بھی! اگر کوئی لڑکی تیری کہانی کی تعریف بھی کرتی ہے تو یہ کب ضروری ہے کہ اُس کی سات پشتوں کا شجرۂ نسب معلوم کیا جائے یا پھر اُس کے گھر کے حدودِ اربعہ کی جستجو ہو ——— اِس سال کی مئی جون تو گزر گئی۔ آئندہ مئی جون میں تیرا دماغ خراب ہونے کا انتظار کروں گا۔ اگر ہو جائے تو مطلع کرنا۔ تجھے دیکھنے کے بہانے تاج محل بھی دیکھنے کو مِل جائے گا۔ نشاط کو دعا۔

تجھ جیسے نالائق کا بڑا بھائی ——— شاہد اعجاز

بکاشانۂ عزیز پور
۲۹ر جولائی ۶۵ء

محترمہ صاحبہ! خلوصِ بیکراں

آپ کا خط ملا۔ خوشی ملی۔ ذرّہ نوازی کا شکریہ! افسانہ آپ کو پسند آیا، یہ میری خوش قسمتی ہے۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ بھی آپ کی پسند کی کہانیاں لکھوں۔ میں اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں سے اِس نوازش و خلوص کے لئے آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے وقت کے قیمتی لمحات صرف کر کے میری کہانی کا مطالعہ کیا اور پھر اپنے خیالات سے نوازا۔ قارئین کی گرانقدر آراء ہی فنکاروں کے لئے مشعلِ راہ ہوتی ہیں۔

آپ کے خط کے ساتھ ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ وہ لفافہ آپ کی جیب یا فائل سے گر گیا اور ایک صاحب نے اُسے نہ صرف اُٹھا لیا بلکہ کھول کر پڑھا بھی۔ پھر اُس میں اپنی تحریر رکھ کر پوسٹ کر دیا۔ یہ الٰہ آباد یونیورسٹی ہی میں ایم۔ اے فائنل کے متعلم ہیں۔ اُنھیں میں نے الگ خط لکھا ہے۔ بہرحال آپ چاہیں تو میں وہ خط آپ کو بھیج سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہو۔ والدین کو آداب کہیئے۔ چھوٹے بھائی بہنوں کو دعائیں۔

آپ کا بھائی ——— انیس بزمی عزیز پوری

بکاشانۂ عزیز پور
۱۹ر اگست ۶۵ء

بھائی شاہد اعجاز صاحب! سلام مسنون

اُمید کہ مزاجِ گرامی ہمکنارِ عافیت ہوگا۔ مدّتوں بعد آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ گزشتہ سال کی طرح ایک اور انکوائری آپ کے سپرد کرنی ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے اِس معمّہ کا صحیح حل بھیج دیجئے۔ دو خط ملفوف ہیں۔ کوکب میاں اور راشد میاں یونیورسٹی میں پڑھ رہے ہیں۔ اِن سے عزیز رضوی کا پتہ آسانی سے لگا سکتے ہیں۔ اگر یہ معلومات دلچسپ ثابت ہوئیں تو مجھے ایک کہانی کا پلاٹ مِل جائے گا۔ یقین ہے آپ اِس معاملہ میں ہمیشہ کی طرح میری مدد فرمائیں گے۔ آپ کے جواب کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔

احقر ——— انیس بزمی

۱۴ر بی۔ کولہن ٹولہ۔ الٰہ آباد
۲۲ر اگست ۶۵ء

کہانی کار کے بچّے! لعنتوں کے طوق!

نہ تو زندگی میں تُو پڑھ سکا اور نہ قاعدہ کا کہانی کار بن سکا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جا، ورنہ تیرے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ کل تیرا خط پُورے ایک برس



قیصر مبین نقوی۔ ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (علیگ)
وحید منزل، رسول الامتنزل۔ عزیز پور
۲ اگست ۶۵ء

جناب پوسٹ ماسٹر صاحب! ہری منڈی۔ الہ آباد

میں جناب انیس بزمی کے مشیرِ قانونی کی حیثیت سے آپ کو یہ نوٹس بھیج رہا ہوں۔ میرے موکل کو آپ سے یہ شکایت ہے کہ اُن کے ارسال کردہ خطوط غلط پتوں پر تقسیم کر دئے جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں اُنھوں نے ایک خط عزّ تمہ نہاں صاحبہ، ۱۱۱۔ ہری منڈی، الہ آباد کے پتہ پر پوسٹ کیا تھا لیکن یہ خط اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کی بجائے عزیز رضوی متعلّم ایم۔ اے (سال دوم) شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کو پہنچا دیا گیا۔ اس غلطی نے میرے موکل کو سخت ذہنی کشمکش اور اذیت سے دوچار کیا ہے۔ یہ ڈر پیدا ہوگیا ہے کہ اُن کے ذہنی توازن پر بُرا اثر نہ پڑ جائے۔ اس لئے نوٹس ہٰذا کے ذریعہ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اندر میعاد دس یوم مبلغ پانچ سو روپے بابت پہنچانے اذیتِ ذہنی، میرے موکل کو ادا کر دیں۔ بصورتِ عدم ادائیگی رقم مذکورہ عدالتی چارہ جوئی کی جائے گی اور آپ اس کے زرِ خرچہ کے ذمّہ دار ہوں گے۔ نوٹس ہٰذا پاک و صاف ہے اور اس میں سات سطریں ہیں۔

دستخط قیصر مبین نقوی (وکیل)

پوسٹ آفس، ہری منڈی۔ الہ آباد
۶ ستمبر ۶۵ء

جنابِ نقوی صاحب!

بصد ادب گزارش ہے کہ آپ کا مُرسلہ نوٹس مورخہ ۲ اگست ۶۵ء ملا۔ مجھے بڑی افسوس ہے کہ آپ کے موکل کو روحانی کرب سے ہمکنار ہونا پڑا۔ غلط پتوں پر خط تقسیم ہونے کی بے عنوانی ایسے ذمّہ دار محکمہ میں کسی طرح ممکن نہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے عزیز رضوی سلمہٗ میرا لڑکا ہے۔ آپ کا نوٹس ملنے پر میں نے اس سے معاملہ کی تفتیش کی۔ معلوم ہوا کہ اُس نے ایک خط خود اور ایک اپنے چھوٹے بھائی ندیم رضوی سے عزّ تمہ نہاں کے فرضی نام سے بزمی صاحب کو بھجوا دیا تھا۔ ۱۱۱۔ ہری منڈی میرے ہی گھر کا پتہ ہے۔ بات یہ ہے کہ عزیز کہانیاں بھی لکھتا ہے۔ اس مراسلت کے ذریعہ، بقول اُس کے، اُس کا مقصد ایک کہانی کا پلاٹ حاصل کرنا تھا۔ اس کے لئے اُس نے انیس بزمی صاحب جیسے فنکار سے اُن کی غیر شعوری مدد لینی چاہی تھی۔ کہانی وہ تخلیق کر چکا ہے۔ اگر انیس صاحب کی اجازت ہو تو اُسے "ایک صدی" میں اشاعت کے لئے بھیج دے۔ کیونکہ اس کے مُدیرِ اعلیٰ کو خطوط کے پلاٹ کی کہانیاں بہت پسند ہیں اور "ایک صدی" میں چھپنے کا وہ بڑی مدّت سے خواہش مند ہے۔

میں آپ کے موکل سے معافی کا خواستگار ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ اِس معاملہ کو آگے نہ بڑھائیں گے اور اسے ایک تفریح سمجھ کر یہیں ختم کر دیں گے۔

مُحمّد علی دریابادی۔ پوسٹ ماسٹر

مکاتب: عزیز پور
۱۷ ستمبر ۶۵ء

مکرمی! تسلیم

مجھے آپ کا معذرت نامہ اپنے مشیرِ قانونی کی معرفت ملا۔ اُسے پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے صاحبزادے نے کہانی کا پلاٹ بہت اچھی طرح حاصل کیا اور یہ بھی یقین ہے کہ کہانی کی تخلیق بھی کر لی ہوگی لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے ہمارے ملک میں ادیبوں کی معاشی حالت نہایت افسوسناک ہے۔ میری حالت مالی اعتبار سے بے حد سقیم ہے۔ میں بھی ایک فنکار ہوں اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس بنے بنائے پلاٹ سے فائدہ اُٹھاؤں۔ اس لئے میں نے ایک نئی کہانی تخلیق کر کے مُدیر "ایک صدی" کو بھیج دی ہے تاکہ مجھے ایک معقول رقم بطور معاوضہ حاصل ہو سکے۔

آپ عزیز رضوی صاحب سے کہہ دیں کہ دوسروں کی دی ہوئی روشنی زیادہ دیر تک اُن کے ذہن کو منور نہیں رکھ سکتی۔ کہانی کار بننا ہے تو خونِ جگر کے چراغ اپنے دل و دماغ میں روشن کریں۔ اُن چراغوں کی جھلملاتی ہوئی سکون بخش روشنی اُنھیں ایک کامیاب فنکار بننے میں مدد دے گی۔

آپ کا مخلص ——— انیس بزمی

بیسویں صدی دہلی



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ • انسان کا جسم ـــــ ایک نازک اور حیرت انگیز مشین

انسان کا جسم بہت نازک اور حیرت انگیز پیچیدگیوں کی ایک مشین ہے جسے چلانے کے لئے صحت مند اجزاء سے تیار شدہ روغن کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ روغن بہت آسانی سے ایک درست اور بہتر غذا سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک اچھی اور بہتر غذا صرف طاقت اور جاذبیت ہی پیدا نہیں کرتی، انسان کی عمر بھی دراز کرتی ہے۔ اگر آپ صحت مند زندگی کے متمنی ہیں، تو اپنی زندگی کی مشین کے لئے بہتر روغن فراہم کیجئے۔ اپنی غذا کو وٹامنز سے بھرپور بنا کر، متوازن اور بہتر بنا کر دیکھئے کہ آپ کتنے بدل جاتے ہیں۔ آپ کی صحت کتنی اچھی ہو جاتی ہے۔

غذا کو وٹامنز سے بھرپور بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ وٹامنز ہی جسم کو طاقت بخشتے ہیں، آنکھوں میں چمک پیدا کرتے اور اعصاب کو تقویت پہنچاتے ہیں لیکن ہم اس طرف بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ چیزیں بہت آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں، جن سے ہم اپنی غذا کو وٹامنز سے بھرپور بنا سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اپنے جسم کی مشین کے لئے بہتر روغن فراہم کر سکتے ہیں۔

بہت سی غذائیں ایسی ہیں جن کا انحصار ایک دوسری پر ہوتا ہے۔ وہ انسان کی روزمرہ کی ضرورت کی تکمیل کر دیتی ہیں۔ پروٹین والی غذاؤں میں دودھ، بالائی، گوشت، مچھلی، انڈا، دلیہ، بے چھنے آٹے کی روٹی، مٹر، سویابین اور مختلف قسم کی دالیں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ساگ، سبزی اور پھلوں میں پروٹین بہت کم ہوتا ہے۔ دودھ، دہی، چاول، گیہوں، چنا، مٹر، سویابین اور دالوں میں پروٹین بہت زیادہ ہے۔ انڈا، مچھلی، سویابین اور ماش کی دال میں خصوصیت سے پروٹین بکثرت ہوتا ہے۔

انسانی جسم کی تعمیر میں پروٹین کا وہی درجہ ہے جو ایک عمارت بنانے میں اینٹوں، پتھروں اور سیمنٹ کا ہے۔ گوشت اور خون ہماری خوراک کے پروٹین ہی سے بنتے ہیں۔

جہاں تک ممکن ہو پھل اور ترکاریاں تازہ اور کچے استعمال کئے جائیں۔ خاص کر ایسی چیزیں جن میں وٹامن 'سی' پایا جاتا ہو۔ اگر ترکاری پکانا ہی ہو تو مختصر وقت میں بہت جلد ہلکی آنچ پر پکا لینا چاہئے تاکہ ان کی غذائی اہمیت محفوظ رہے۔ ایک پلیٹ سلاد جس میں کچھ گاجر، مولی، ٹماٹر، ادرک اور سبز پیاز ہوں، وٹامن سے بھرپور ہوتی ہے۔ سبزیوں کے ساتھ ساتھ دلیہ کا بھی استعمال کرنا چاہئے۔ دن میں ایک بار جَو دلیہ روزانہ کی خوراک کو کافی لذیذ اور غذائیت بخش بنا دیتا ہے۔

چائے، کافی، شکر اور چکنائی کا استعمال اعتدال سے کرنا چاہئے۔ دیر ہضم، ثقیل اور مرغن غذائیں صحت کے لئے انتہائی مضر ہیں۔

۲ • اپنے معدہ پر ظلم نہ کیجئے

لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی اُن پر ظلم نہ کرے۔ وہ دوسروں پر بھی ظلم نہیں کرنا چاہتے لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ بہت سے لوگ اپنے معدہ پر ظلم کرتے ہیں۔ اس پر اتنا بار ڈال دیتے ہیں کہ اگر معدہ بول سکتا تو زبانِ حال سے کہتا ـــــ "خدا کے لئے عقل سے کام لو اور مجھ پر اتنا بار نہ ڈالو!"

مسلسل غذائی غلط کاریوں کی وجہ سے معدہ میں ورم، قروح اور دوسری بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس لئے ایک مقررہ وقت پر مناسب مقدار میں کھانا کھانا چاہئے۔ ناقابلِ ہضم یا دیر ہضم کھانوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اپنی بھوک کو تسکین دینے کے لئے جو چیز ہاتھ لگے، اُسے پیٹ میں بھر لینا اچھا نہیں۔ اپنی غذا میں ایسی چیزیں شامل کرنی چاہئیں

بحیثیت جسمانی شکست و ریخت کی مرمت ہو کر بدن کی تعمیر ہو سکے۔ جن سے تندرستی کا تحفظ ہو، توانائی حاصل ہو۔

جس طرح کوئی نہیں چاہتا کہ اس کے اوپر یکایک کام کا بہت زیادہ بار ڈال دیا جائے، اسی طرح آپ کے معدہ کا بھی حال ہے۔ اگر اسے اوقات کی پابندی کے ساتھ مناسب غذا پہنچائی جائے تو وہ بہتر طور پر کام کرتا ہے۔

کچھ لوگ غذا کو جلد ہضم تو کر سکتے ہیں لیکن ایک وقت میں زیادہ نہیں کھا سکتے۔ انھیں تھوڑے تھوڑے وقفوں میں کھانا چاہئے۔ کھانے کے دوران میں گفتگو دلچسپ اور مسرت بخش ہونی چاہئے۔ غم و غصہ اور ناگوار بحث سے بچنا چاہئے۔ ورنہ معدے پر برا اثر پڑتا ہے۔

معدہ پر ظلم کرنے سے، معدہ کو غلط طور پر استعمال کرنے سے معدہ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر قبض پیدا ہو سکتا ہے۔ قبض کو روکنے کے لئے، قبض کُش گولیاں کھانے کی بجائے سبز ترکاریاں اور پھل کھانے چاہئیں۔ باقاعدگی کے ساتھ ورزش یا چہل قدمی کرنی چاہئے۔

معدہ کو غلط طور پر استعمال کرنے سے، معدہ پر زیادہ بار ڈالنے سے قبض ہونے کے ساتھ ہاضمہ پر بھی بُرا اثر پڑتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہاضمہ کی درستی ہی پر ساری جسمانی صحت کا دار و مدار ہے۔

اس لئے اگر آپ صحت مند رہنا چاہتے ہیں تو اپنے ہاضمہ پر ظلم نہ کیجئے۔ اس پر زیادہ بار نہ ڈالئے۔ اسے غلط طور پر استعمال نہ کیجئے۔

۳ • اُٹھو اور روشنی کی طرف بڑھو!

اگر آپ حالات سے شکست کھا کر مایوس ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کے سامنے حدِ نظر تک اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے تو ڈاکٹر مارڈن کے ان حیات بخش خیالات سے روشنی حاصل کیجئے۔

"اُٹھو اور روشنی کی طرف بڑھو۔ قسمت کو کوسنا اور الزام دینا چھوڑ کر بلند حوصلہ بنو اور زندگی کو کامیاب بنا کر دکھاؤ۔ تمھارا خدا تم سے یہی چاہتا ہے ــــ اپنے سے کہو ــــ میں کامیاب ہونے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ پھر مجھے مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا مایوس ہونا یا حوصلہ کھونا خدا کو قطعی پسند نہیں ہے۔ میں دُنیا میں زندگی کی کامیابی اور خوشی کے لئے آیا ہوں، نہ کہ ناکامی یا ناکامیابی کے لئے۔ میں فاتح ہوں۔ میں زندگی کی بازی جیتنے کے لئے آیا ہوں نہ کہ ہارنے کے لئے۔ میری زندگی مسرت، سکون اور ہمت کے لئے ہے نہ کہ دکھ تکلیف، فکر و تردّد و مایوسی کے لئے۔ میرا ضمیر کہتا ہے کہ میں حالات کا پابند نہیں ہوں۔ میری غریبی اور تباہی کا سبب میرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں خود حالات بناتا ہوں۔ حالات کا خالق ہوں۔ میں خدا کا بیٹا ہوں۔ میں مایوس ہونے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہوں۔ مجھے مشکلات اور ناکامی کا خوف نہیں ہے، کیونکہ خوف کا خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں بہادر، باہمت اور فاتح ہوں! میں خود ہمت ہوں، طاقت ہوں!!"

۴ • تجربہ ــــ بہترین اُستاد

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــ "تجربہ ایک ایسا اُستاد ہے جس کا کوئی ایسا شاگرد نہیں ہے جس سے وہ نرمی اور رحم دلی سے پیش آئے۔ میں نے اس ظالم اُستاد، اسی سخت گیر اُستاد سے جسے 'تجربہ' کہتے ہیں، زندگی کے حقائق کو حاصل کیا ہے۔ میں یہ خزانہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تاکہ آپ اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکیں ــــ یہ ایک اہم قانونِ قدرت ہے کہ قوت، مدافعت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی لوہار کو لوہا پیٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کی محنت پر ترس آتا ہے۔ وہ ایک بھاری ہتھوڑے سے دن بھر لوہا پیٹتا رہتا ہے لیکن اس طرح اس کے بازوؤں میں جو بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے اُس کا شکریہ نہ کرنا کفر ہے۔"

ایمرسن کہتا ہے ــــ "زندگی اور دوسرے سارے کاموں میں دو طرح کا قانون کارفرما ہوتا ہے۔ جو چوری کرتا ہے وہ اپنی چوری کرتا ہے۔ کیونکہ اعلیٰ چیز جو محنت کے بعد انسان کو ملتی ہے وہ علم و اخلاق ہے۔ روپیہ اور بدلہ صرف اس کی علامات ہیں۔ جس طرح نوٹوں کو جعلی بنایا جا سکتا ہے، اسی طرح روپیہ کو چرایا جا سکتا ہے لیکن کوئی کام کرنے کے بعد جو علم و تجربہ، فراست و عقل ہم حاصل کر سکتے ہیں اُسے چرایا نہیں جا سکتا۔"

۵ • مونگ پھلی ــــ مفید بھی اور مُضر بھی!

مونگ پھلی کا مزاج گرم اور خشک ہے۔ اِسے بھون کر اور بغیر بھونے بھی کھاتے ہیں۔ یہ ثقیل اور دیر ہضم ہے۔ اِس میں بدن کی پرورش کرنے والے، بدن میں طاقت و حرارت پیدا کرنے والے اجزاء بہت ہیں۔ اِس میں تقریباً ۲۲ فیصدی اجزاءِ لحمیہ (پروٹینز) ۳۸ فیصدی نشاستہ اور ۱۲ فیصدی روغنی اجزاء ہوتے ہیں۔

لیکن اِس کا زیادہ استعمال مضرت سے خالی نہیں۔ اِس لئے اِسے کھانے میں اعتدال سے کام لینا چاہئے۔ یہ بہت گرم ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے سے منہ میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ سر چکراتا ہے اور صفرا کا زور بڑھ جاتا ہے۔ کثرتِ استعمال سے جریان کا مرض ہو جاتا ہے۔ اِسے کبھی کبھی استعمال کر سکتے ہیں۔

اِس کے ساتھ کشمش بھی کھائی جائے تو لذت بھی بڑھ جاتی ہے اور فائدہ

بھی زیادہ ہوتا ہے۔

مونگ پھلی کا تیل طاقت بخش ہوتا ہے اور دوسرے تیلوں کی طرح مختلف کاموں میں آتا ہے۔

۶● زندگی کا ہر موقع سُنہرا ہے

دُنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اِس لئے زندگی کی بازی ہار بیٹھے ہیں کہ وہ ہمیشہ اِسی انتظار میں رہے کہ اُن کے سامنے کوئی اچھا موقع آئے۔ اُن کے سامنے کتنے مواقع آئے لیکن اُنھوں نے اُن سے فائدہ نہ اُٹھایا۔ وہ کبھی اچھے موقع کے انتظار میں بیٹھے رہے ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ سُنہرا لمحہ ہے، ہر موقع سُنہرا موقع ہے۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ——— "آپ کسی دس آدمیوں سے یہ سوال کریں کہ وہ زندگی میں کامیاب کیوں نہیں ہیں، تو آپ کو اُن دس میں سے نو آدمی یہی کہتے ہوئے ملیں گے کہ ہم بدقسمت اور بدنصیب ہیں۔ ظالم زندگی نے ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا اور ہمیں وہ مواقع حاصل نہ ہو سکے جو دوسروں کو حاصل ہیں۔ اگر آپ اور آگے بڑھنا چاہیں تو اُن کا نفسیاتی تجزیہ کریں اور اُن کے ایک دن کے کاموں کا جائزہ لیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ مواقع اُن کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور یہ کہ اُن میں سے ہر آدمی اُن مواقع کو اپنے سے دُور ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مواقع آپ کی زندگی میں بے شمار ہیں۔ شاید وہ آتے ہیں اور گُزر جاتے ہیں لیکن آپ میں اُن کے پہچاننے کی صلاحیت نہیں۔ اُن سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت نہیں۔

اگر آپ میں سوچنے کی قوت ہے، اگر آپ میں مواقع سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت صلاحیت ہے، اگر آپ نے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر لی ہے، اگر آپ عمل کی قوت سے واقف ہو گئے ہیں تو آپ کو دنیا میں آگے بڑھنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی! ——— آپ کے لئے زندگی کا ہر موقع سُنہرا موقع ہے!!

۷● اگر آپ تندرست رہنا چاہتے ہیں!

صحت ایسی کوئی دولت نہیں جو کہیں گری پڑی مِل جائے۔ نہ کوئی ایسا دفینہ ہے جو خوش قسمتی سے کہیں ہاتھ آ جائے۔

جو لوگ تندرست رہنا چاہتے ہیں وہ تندرست رہتے ہیں۔ جو لوگ بیمار رہنا چاہتے ہیں وہ بیمار رہتے ہیں اور صحت کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "اگر تم تندرستی چاہتے ہو تو اُس کا تصوّر کرو۔ اپنے خیال میں صحت اور قوت کا عکس، پُوری تندرستی اور کامل صحت کا نمونہ ہر وقت رکھو نہ کہ اُس کے برعکس کمزوری اور مرض کا نمونہ!

بہت سے لوگ ذہنی طور پر بیمار اور مریض ہوتے ہیں۔ وہ کمزوری اور ناتوانی کی تصویر ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کسی مرض کی نامُراد تصویر یا کمزوری کا عکس ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ کوئی کامیابی کا متمنّی ہو لیکن دل میں ناکامی کا خیال کرے اور دل و دماغ پر ناکامی کی تصویر نقش رکھے۔ ایسا خیال تو بامرادی اور کامیابی کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے۔

میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو سالہا سال اِس خیال کو ساتھ لئے پھرے کہ اُن کے جسم میں کوئی بیماری ہے، کوئی مرض شروع ہو رہا ہے جو یا تو موروثی ہے یا چھُوت سے لگ گیا ہے اور کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی دن وہ اِس مرض کا شکار ضرور ہو جائیں گے۔"

سالہا سال تک اِس بات پر یقین کرتے رہنا کہ تمھیں کوئی مہلک ——— مرض لگ گیا ہے جو تمھارے دل و دماغ، صحت و قوت کو چُپکے چُپکے کھائے جا رہا ہے ——— واقعی تمھیں بیمار بنا دیتا ہے، واقعی تمھیں بیمار ڈال دیتا ہے۔

۸● کامیابی کے دروازے کھُل جائیں گے

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ——— "زندگی کی بے شمار نعمتیں محض اِس لئے حاصل نہیں ہوتیں کہ انسان اُنھیں حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ وہ اُنھیں طلب کرنے کی طرح طلب نہیں کر پاتا۔"

روزمرّہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے لے کر بڑی بڑی باتوں کا دار و مدار براہِ راست طلب پر ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ سوچتے ہیں کہ چھوٹی یا بڑی تمام چیزوں میں ہمارا بھی حصّہ ہے، جو ہمیں حاصل کرنا چاہیئے تو ہم ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں لیکن کبھی کبھی ہم اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم اُس کے لئے ٹھوس عملی طریقہ اختیار نہیں کرتے اور شکست و ناکامی کے خوف سے خائف ہو جاتے ہیں ——— لوگ اِس احساس ہی سے کانپ اُٹھتے ہیں کہ اُنھیں ناکامی کا سامنا نہ ہو۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ انسان جو چاہے اُسے فوراً مل جانے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اُس میں دیر بھی لگتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے اور ہمارے مشاہدہ میں آ چکی ہے کہ ایک ٹھوس اور بھرپور اقدام، جنگ کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کو پار کر سکتا ہے، کاروبار کو حیرت انگیز وسعت و ترقی دے سکتا ہے۔ اگر آپ اِس حقیقت پر یقین کر لیں تو آپ کے سامنے بے شمار کامیابیوں کے دروازے کھُل جائیں گے۔

۹• چہل قدمی

تحقیق و تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ چہل قدمی جسمانی صحت اور حصول طاقت کے لئے اتنی ہی مفید ہے جتنی اور کوئی ورزش۔ بلکہ اکثر مواقع پر اُس سے بہتر کئی اعتبار سے یہ ان سخت مشقت والی ورزشوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ عام طور پر لوگوں کو ایسی ورزش کی ضرورت ہے جو کم سے کم مشقت اور بغیر کسی دقت کے جسم کو طاقتور اور صحت مند بنا سکے اور جسے ہر شخص ہر عمر میں آسانی سے کر سکے۔ اس اعتبار سے چہل قدمی کا درجہ سب سے بلند ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چہل قدمی صرف پیروں کی ورزش ہے، بقیہ جسم کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ اُن کا یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ بات تجربات سے ثابت ہو چکی ہے کہ چہل قدمی سے پیر ہی نہیں، ہاتھ، سر، گردن، آنکھیں اور پیٹ کے عضلات وغیرہ سب ہی کی ورزش ہو جاتی ہے۔ یہ سائے فوائد کسی اور آسان ورزش سے ممکن نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ چہل قدمی اس خاص مقصد کے پیش نظر اس کے صحیح اُصولوں پر کی جائے ورنہ آپ کی چہل قدمی محض پیر تھکانے کے مترادف ہوگی اور اس کے حقیقی فوائد سے آپ محروم رہیں گے۔

آپ چہل قدمی سے صحیح فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اُس کی معجز نمائی دیکھنا چاہتے ہیں تو اس نیت کے ساتھ صبح سویرے یا شام کو گھر سے باہر کھلے میدان میں نکل جائیے کہ میں اپنی صحت بہتر بنانے اور طاقت حاصل کرنے کے لئے چہل قدمی کے لئے جا رہا ہوں۔ یہ خیال ہی نہیں یقین ہونا چاہیئے اور یہ یقین چہل قدمی کے دوران میں برابر قائم رہنا چاہیئے کہ آپ کو ہر قدم پر نئی طاقت و توانائی حاصل ہو رہی ہے۔

چہل قدمی کرتے وقت قدم معمول سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ رفتار عموماً ایک گھنٹہ میں چار میل سے زیادہ ہرگز نہ ہو۔ سانس ناک سے لیجئے اور لمبے لمبے لیجئے تاکہ زیادہ سے زیادہ آکسیجن آپ کے پھیپھڑوں میں داخل ہو سکے۔ شروع میں ایک میل سے دو میل تک چہل قدمی کافی ہے۔ آہستہ آہستہ فاصلہ بڑھاتے جائیں لیکن چار میل سے زیادہ نہیں۔

آپ اصول کے مطابق چہل قدمی کریں گے تو چہل قدمی کی معجز نمائی دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ اپنی صحت میں ایک عجیب انقلاب، صحت میں غیر معمولی تغیر محسوس کریں گے۔ آپ کی صحت قابلِ رشک بن جائے گی۔

۱۰• صبح ہونے سے پہلے

کیا بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح آپ بھی حالات سے شکست کھا چکے ہیں؟ آپ کے سامنے مایوسیوں کا اندھیرا چھایا ہوا ہے؟ اگر ہاں تو مشہور مفکر ے. نولسن کے

اس مشورہ سے روشنی حاصل کیجئے ———

"بہت سے لوگوں میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی صلاحیت نہیں" جب انھیں اپنے ارادوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، جب ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے تو وہ دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ اُن کی جگہ آپ ہوں تو کیا آپ کی ایسی حالت نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ یہ ممکن نہیں کہ انسان کبھی مایوس ہی نہ ہو۔ یہ انسانی فطرت سے بعید ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ مایوسیوں کا غلبہ آپ پر زیادہ دیر نہ رہنا چاہیئے۔ اُسے جلد سے جلد موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ مسلسل ناکامیاں یہ بتاتی ہیں کہ اب کامیابی کی منزل دور نہیں رہی" ——— ایک فلاسفر نے شکست خوردہ ذہنیتوں کے مالک لوگوں سے کہا ہے ———

"جہاں تم نے زندگی کی راہ میں جدوجہد کرنی ترک کی تھی، وہاں سے منزل مقصود زیادہ دور نہیں تھی"

اُسے اس حقیقت کا علم کیسے ہوا؟ زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے سے اور تجربات کی دنیا میں اُترنے سے۔ آپ نے لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہوگا ——— صبح ہونے سے پہلے تاریکی زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

مبارک حسین انصاری۔ علی پور دوار جنکشن

س۔ حصولِ کامیابی کا بہترین نسخہ بتائیں؟

ج۔ عزمِ محکم، جہدِ پیہم!

س۔ صورت اور سیرت کا موازنہ کیجئے۔

ج۔ حُسنِ سیرت سے محروم انسان، حُسنِ صورت رکھتے ہوئے بھی عزت و توقیر نہیں پاتا۔ دُنیا میں نیک نام اور بقائے دوام پانے والے حُسنِ سیرت کے مالک تھے۔

سلمیٰ جاہتی۔ ملکاپور

س۔ تنہائی میں انسان کا اچھا ساتھی؟

ج۔ اچھے خیالات!

س۔ عورت کی منزل؟

ج۔ کبھی گھر کا آنگن ہی عورت کی منزل تھی لیکن آج عورت زندگی کے کسی موڑ پر، کسی میدان میں مرد سے پیچھے نہیں ہے۔

جبیں شوخ۔ کلکتہ

س۔ کنول کیچڑ میں کیوں کھلتا ہے؟

ج۔ اِس حقیقت کا اظہار و انکشاف کرنے کے لئے کہ بُرے لوگوں میں بھی اچھے لوگ پیدا ہو سکتے ہیں۔

س۔ آج کے لیڈر؟

ج۔ آج کے لیڈروں میں رہبر کم رہزن زیادہ ہیں!

ایس واعظ احمد۔ ڈیسر گڑھ

س۔ یکے بعد دیگرے پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے تو کیا کریں؟

ج۔ جب بھی پریشان نہ ہوں۔ پھر پریشانیاں نہ رہیں گی ——— درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔

س۔ عورت کیا ہے؟

ج۔ ہیگل نے کہا ہے ——— "عورت زندگی کی کٹھن منزل کے لئے رہبرِ کامل ہے" ——— مولیؔ نے کہا ہے ——— "عورت مرد کا نصف ایمان ہے۔"

ایم۔ اے ندیم۔ کلکتہ

س۔ جان بوجھ کر گناہ کرنے کے بعد پچھتانا کیا کیا معنی؟

ج۔ ایسا کرنا خود کو فریب دینا ہے۔

س۔ لوگ عورت کو پھول، کانٹا، پتھر وغیرہ کیوں کہتے ہیں؟

ج۔ عورت کو یہ سب کہنے والے عورت کو سمجھ ہی نہ سکے۔ ایک مفکر نے لکھا ہے ——— "عورت فرشتوں سے بالا تر ہے!" ——— ایک اور مفکر نے لکھا ہے ——— "جس طرح تارے آسمان کی لطیف درخشاں نظمیں ہیں اِسی طرح پاکباز عورتیں زمین کی دلکش، جادو اثر نظمیں ہیں۔"

محمد شکور انصاری براری۔ دھنباد

س۔ غمِ جاناں ——— غمِ دوراں؟

ج۔ غمِ جاناں انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے، غمِ دوراں فرزانگی بخشتا ہے۔

س۔ طویل عمر کا راز کیا ہے؟

ج۔ زندگی سے پیار ——— صحت کے اصولوں کی پابندی!

محمد نجم الحسن اسسٹنٹ انجینئر سیال ہزاری باغ

س۔ کیا عورتوں کو رقص و موسیقی کی تعلیم دینی چاہئے؟

ج۔ ہماری رائے میں عورت شمعِ انجمن نہیں۔

طلعت پروین۔ بحرین

س۔ بھائی جان! کچھ لوگوں کا خیال ہے آہستہ آہستہ اُردو ختم ہو جائے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ بانو! اُردو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اُردو کی خوبیاں اُردو کی بقا کی ضامن ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو کی مخالفت کرنے والے اپنے گھروں میں اُردو بولتے ہیں۔

محمد محمود علی۔ یلاریڈی۔ نظام آباد

س۔ اُمید کا دامن کب چھوٹتا ہے؟

ج۔ جب انسان ناامیدی کا شکار ہو جاتا ہے۔

نسرین ماہرو۔ مظفر پور

س۔ بھائی جان! آج کے دَور میں انسان کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے؟

ج۔ انسانیت کی! انسانی قدروں کے احترام کی!!

س۔ کیا گھر کے ماحول کا اثر بچوں پر بھی پڑتا ہے؟

ج۔ یقیناً!

س۔ بھائی جان! اسلام نے عورت کو کیا مقام دیا ہے؟

ج۔ بہت بلند! قرآنِ پاک میں عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔

مُلاّجی اقبال بیگ۔ آگرہ

س۔ "بیسویں صدی" کتنے عرصہ سے ادب اور انسانیت کی خدمت کر رہا ہے؟

ج۔ چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ یہ تیسواں سال ہے۔

س۔ خوشتر بھائی! آپ کے آباواجداد کہاں کے رہنے والے تھے اور آپ کہاں پیدا ہوئے؟

ج۔ ہمارے آباواجداد علّامہ اقبال کے مولد سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ہمارا مولد بھی سیالکوٹ ہی ہے۔

س۔ خوشتر بھائی! "بیسویں صدی" دہلی سے کب سے نکل رہا ہے اور دہلی سے پہلے کہاں سے شائع ہوتا تھا؟

ج۔ ۱۹۴۸ء سے دہلی سے نکل رہا ہے۔ اُس سے پہلے لاہور سے شائع ہوتا تھا۔

جوہر اقبال۔ گریڈیہہ

س۔ کیا غمِ دَوراں غمِ جاناں کا مداوا بن سکتا ہے؟

ج۔ جی ہاں!

س۔ احساسِ کمتری کیسے دُور کیا جا سکتا ہے؟

ج۔ اپنے سے کمتر لوگوں سے اپنا مقابلہ کر کے۔ آپ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالیں تو آپ کتنوں سے اچھے ہوں گے۔ کتنوں سے اچھی حالت میں ہوں گے۔

سراج الدین۔ شولاپور

س۔ کسی بھی جگہ سے حاصل کر کے میں ہر مہینہ ضرور "بیسویں صدی" پڑھتا ہوں۔ بتلایئے خریدار بن جانے کے بعد مجھے کیا کرنا ہوگا؟

ج۔ بارہ روپے سالانہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجئے۔ ہر ماہ پابندیٔ وقت کے ساتھ "بیسویں صدی" آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا۔

س۔ لوگ "اُردو مٹا دو!" کا نعرہ اُردو ہی میں کیوں لگاتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ ہندی میں نعرہ کے لئے موثر الفاظ نہیں ملتے! اِسے کہتے ہیں——جادو جو سر چڑھ کر بولے۔

س۔ لوگ گرمیوں میں سردی کی اور سردی میں گرمیوں کی تعریف کیوں کرتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمی پیاری معلوم ہوتی ہے۔

عزیز چوہان۔ بلیک برن۔ انگلینڈ

س۔ اُردو ادب کا بہترین معمار آپ کی نظر میں کون ہے؟

ج۔ آپ کے اِس سوال کے جواب میں کسی ایک کا نام بتانا حقیقت و دیانت کے منافی ہوگا۔ اُردو ادب کے بہترین معماروں کے نام بتاتے جائیں تو فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔ اِس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ

جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے!

س۔ سُنا ہے جناب کرشن چندر بھی فلمی دُنیا سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ کرشن چندر جی فلمی دُنیا سے وابستہ نہیں ہوتے ہیں۔ ہاں فلم نگری کے باسی ضرور ہو گئے ہیں۔

حبیب حسین۔ حیدر آباد

س۔ "بیسویں صدی" کے ایک گزشتہ شمارہ میں "افواہیں" کے کالم میں محمد رفیع، مکیش، طلعت محمود اور لتا منگیشکر کو موسیقار کہا گیا ہے۔ حالانکہ وہ گلوکار ہیں۔

ج۔ انھیں گلوکار کی بجائے موسیقار کہنا زیادہ صحیح ہے۔

تصحیح مارچ کے "بیسویں صدی" میں افسانہ [illegible] کے تخلیق کار محترم بشیر احمد ریاض [illegible] سانڈرس روڈ، نیو کاسل۔ ۶، انگلستان [illegible] کی غلطی سے ڈاکٹر لکھا گیا ہے۔ [illegible] تصحیح کر لیں۔

ابوجعفر محی الدین۔ بھٹکل

س۔ شعلہ نے کہا ہے "حق بات کڑوی ہوتی ہے" تو کیا خوشتر بھائی ہر کڑوی بات حق ہوتی ہے؟

ج۔ جس طرح ہر میٹھی چیز مصری نہیں ہوتی اُسی طرح ہر تلخ بات حق نہیں ہوتی۔

س۔ مخلوط تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہم مخلوط تعلیم کو اخلاق کے لئے تباہ کن سمجھتے ہیں۔

منور احمد انیس۔ ربوہ (پاکستان)

س۔ اپنی پسند کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ سنیئے ؎

چاند تک تم جو گئے بھی تو ملا کیا ہم کو
مژدۂ امن لئے اہلِ جہاں تک آؤ

س۔ زندگی میں دلکشی نہ ہو تو؟

ج۔ دلکشی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

س۔ ساحر لدھیانوی کا پورا نام؟

ج۔ عبدالحیٔ۔

ثمینہ شاہین۔ بنگلور

س۔ کوئی کیسے جئے زہر ہے زندگی...؟

ج۔ زندگی شغلِ آہ وزاری ہے
زندگی ایک ضربِ کاری ہے
پھر بھی کیا دلکشی ہے ظالم میں
پھر بھی کمبخت کتنی پیاری ہے!

س۔ جب کوئی بھی آرزو پوری نہ ہو سکے تو...؟

ج۔ اُس وقت ایک بڑے مفکر کا یہ قول یاد کرنا چاہیئے
"تکمیلِ آرزو آرزو کی موت ہے!"

سلطان سکندر بخت۔ کلکتہ

س۔ میں نو عمر ہوں اور مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ میں کسی سے تصحیح نہیں کرا سکتا۔ کیا میں بغیر تصحیح کرائے اپنا افسانہ آپ کے پاس بھیج سکتا ہوں؟

ج۔ آپ کے لئے ابھی ہمارا پُرخلوص مشورہ یہ ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لئے کسی منزل آشنا رہنما کا دامن پکڑ کر منزل کی طرف بڑھئے۔ ایک شوق کیجئے۔ پھر بیسویں صدی کے لئے اپنے افسانے بھیجئے گا۔ پہلے ہی قدم میں بلندی پر پہنچنے کی کوشش میں ناکام ہو کر لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ نہیں بن سکتے۔

س۔ میرے دوست میری حیثیت و صلاحیت سے زیادہ مجھے سمجھنے لگے ہیں۔ میں اپنے دوستوں کو کس طرح سمجھاؤں؟

ج۔ اپنے پہلے سوال کا جواب انہیں دکھا دیجئے۔ وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔

عارف صدیقی۔ کانپور

س۔ بھیّا! یہ کون سا دور ہے جس میں زہر تک اصلی نہیں ملتا؟

ج۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

س۔ بھیّا! یہ دُنیا اصلیت کی طرف سے ہٹ کر بناوٹ کی طرف کیوں بڑھتی جا رہی ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ اصلیت بناوٹ کے اندھیرے میں گم ہو گئی ہے۔

س۔ کیا دکھوں اور غموں کی کوئی حد ہوتی ہے؟

ج۔ کیوں نہیں۔ حد تلاش کرنے والے حد پا لیتے ہیں۔

محمد خواجہ آفندی فارم۔ نظام آباد

س۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ زندگی سے پیار کرنا چاہیئے۔ زندگی کو رام کرنے کے لئے جد وجہد کرنی چاہیئے۔

س۔ کوئی اچھا سا شعر سنائیں۔

ج۔ مرے ذوقِ جستجو کی کوئی انتہا نہیں ہے
مرا مطمحِ نظر ہے مہ وضوفشاں سے آگے

محمد امین الرحمٰن ہلدوی۔ ہلدی

س۔ میرا دل گھبراتا ہے تو سنیما دیکھتا ہوں۔ جب فلمی ستاروں کا دل گھبراتا ہے تو وہ کیا کرتے ہیں؟

ج۔ آپ جیسے لوگوں کی حماقت پر ہنستے ہیں۔

س۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا کیا ثبوت ہے؟

ج۔ کیا آج کا ننگِ انسانیت انسان اِس حقیقت کا شاہد نہیں ہے؟

ایس۔ فرید۔ کھنڈوہ

س۔ غربت کا احساس نہرو جی کو زیادہ تھا یا ابراہم لنکن کو؟

ج۔ غربت کا احساس نہرو جی کو زیادہ تھا نہ ابراہم لنکن کو۔ غریبوں کا زیادہ احساس غریبوں کے غم میں سوکھ کر موٹے ہو جانے والے منسٹروں کو ہے۔

رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

بیان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات بیسویں صدی دہلی

(۱) مقام اشاعت :۔ دہلی (۲) وقفۂ اشاعت :۔ ماہوار

(۳) پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر :۔ خوشتر گرامی۔ قومیت :۔ ہندوستانی

پتہ :۔ دریا گنج دہلی (۴) ملکیت :۔ خوشتر گرامی

میں خوشتر گرامی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط خوشتر گرامی پرنٹر پبلشر

مورخہ یکم مارچ ۱۹۶۶ء

شاہکار ناول جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں

ٹھاکر پونچھی کے لکھے ہوئے ناول

رات کے گھونگھٹ جس میں نئی تہذیب کے اُن فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ مصنف نے آج کے سماج کے حسین چہروں سے پاسبان کے رنگین گھونگھٹ اُٹھا دیئے ہیں۔ قیمت صرف دو روپے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے اُن مردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عُریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

زلف کے سر ہونے تک عشق و محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین بے سہارا لڑکوں کی حسین ترین کہانی۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

چاندنی کے سائے اس میں شبنم کی ٹھنڈک بھی ہے اور شعلے کی حرارت بھی۔ کتاب کو ایک بار شروع کر کے ختم کئے بغیر آپ کو چین نہ آئے گا۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پیاسے بادل ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک درد انگیز داستان قیمت دو روپے ۵۰ نئے پیسے۔

یادوں کے کھنڈر حیات کے نشیب و فراز کا آئینہ دار ناول جس میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے قابل مصنف نے دل کی دھڑکنوں کو ایسے رنگ و انداز سے اُبھارا ہے کہ قلبی رفاقت اور خلوص پرور محبت کی تصویر نگاہوں کے سامنے چمکنے لگتی ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

وادیاں اور ویرانے سوکھے سڑے میدانوں اور سرسبز و شاداب پہاڑوں کی حسین و جمیل کہانی قیمت فی جلد چار روپے۔

زنجیر ایک گناہگار لڑکی کی حسین و جمیل داستان۔ عشق و محبت کی ایک الہین پیچ رومان پرور داستان جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے۔ جسے زکی انور نے لکھا اور ادارہ "بیسویں صدی" نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے

پگھلتے خواب اُردو ادب کے جواں سال ادیب پروفیسر حامدی کاشمیری کا ایک دلچسپ رومانی ناول جس میں آپ کو کشمیر جنت نظیر کے حسین و دلفریب مناظر اور اُن مناظر تلے سسکتی کہانیوں کے خد و خال صاف دکھائی دیں گے۔ قیمت صرف دو روپے۔

نئے فرہاد پروفیسر شکیل الرحمٰن کا اچھوتا شاہکار ناول۔ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی المناک داستان۔ محنت و زر کی کشاکش کے اسٹیج پر لکھی ہوئی ایک انتہائی دلچسپ کہانی۔ قیمت صرف دو روپے۔

راہیں شباب کی فرانس کے عظیم ترین ناول نگار آپیر پوس کا غیر فانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے' جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں، جسے عشق و محبت کی سب سے عظیم داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اِس ناول کی ہیروئن قلوپطرہ اور ہیلن سے بھی زیادہ حسین اور عظیم ہے۔ مترجمہ جناب مخمور جالندھری۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

طوفانِ بہار روس کے عدیم المثال ناول نگار تورگنیف کا رومانی شاہکار جس کا ترجمہ دُنیا کی بیالیس زبانوں میں ہو چکا ہے۔ جسے دُنیا کے مشہور نقادوں نے لافانی رومان قرار دیا ہے اور جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارہ "بیسویں صدی" دہلی نے شائع کیا ہے۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ قیمت تین روپے۔

بھیگی راتیں فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمل زولا کا مقبول ترین ناول انسان میں چھپے ہوئے حیوان کا افسانہ، اپنے محبوب کیلئے [illegible] کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کی کہانی۔ مترجمہ مخمور جالندھری قیمت فی جلد تین روپے

فرنڈ میوزی حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اُس دیش کی کہانی [illegible] مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔ [illegible] ہوئی ایک عجیب و غریب داستان جو اول سے آخر تک دلچسپیوں اور [illegible] سے لبریز ہے۔ جناب کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ و دلچسپ ناول [illegible] صدی آگے کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہے۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی۔ دہلی نمبر ۶

بیسویں صدی دہلی

محمد صلاح الدین جھریا

س۔ زندگی اور موت کیا ہے؟

ج۔ اچھے لوگوں کی موت بھی زندگی ہے۔ بُرے لوگوں کی زندگی بھی موت سے بدتر ہے۔

س۔ شادی کے اصل معنی کیا ہیں؟

ج۔ خوشی۔

س۔ اگر انسان کوشش کے باوجود اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اِس یقین کے ساتھ منزل کی طرف گامزن رہنا چاہئے کہ ایک دن منزل ضرور ملے گی۔

سیفی عباسی۔ برہانپور

س۔ خوشتر بھائی! آخر کوئی زندگی کا فریب کب تک برداشت کرتا ہے؟

ج۔ زندگی کسی کو فریب نہیں دیتی۔ لوگ خود فریب کھاتے ہیں، بلکہ زندگی کو فریب دیتے ہیں۔

س۔ بیکاری میں انسان حسین سپنوں میں کیوں کھویا رہتا ہے؟

ج۔ بیکاری میں انسان حسین سپنوں میں نہیں کھویا رہتا۔ خوفناک خیالات اور پریشان کُن تفکرات میں گھرا رہتا ہے۔

س۔ منزل سے بھٹکنے کے بعد انسان دُنیا سے بیگانہ کیوں ہو جاتا ہے؟

ج۔ بزدل اور پست حوصلہ انسان دُنیا سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ بلند حوصلہ انسان منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔

رؤف ادیب منصوری۔ کانپور

س۔ خودکشی کرنے والے بہادر ہوتے ہیں یا بزدل؟

ج۔ بزدل ــــــ جو حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حالات سے شکست کھا جاتے ہیں۔

س۔ ضد اور مُستقل مزاجی ایک ہی چیز ہے یا الگ الگ؟

ج۔ ضد ایک عیب ہے مُستقل مزاجی انسان کی ایک اعلیٰ صفت ہے۔

س۔ کوئی حیات افروز شعر سُنائیں۔

ج۔ عزم کے پہلو میں ہو گر روشنی فکر بھی
زندگی میں ضوفشاں ہوتے ہیں فطرت کے چراغ

ایس۔ ایم۔ شہزادہ، کمرہٹی

س۔ بھائی جان! اپنا سگا بھائی دُشمن بن جائے تو؟

ج۔ اُس کا جو بھی نام ہو لیکن اُسے چاچا یا ماما کہا جائے گا!

س۔ ہماری زندگی کو کسی نے خار بنا دیا ہے۔ اسے پھول کس طرح بنائیں؟

ج۔ جس طرح کسی نے خار بنا دیا، آپ پھر پھول بنا لیں۔

محمد مظہر الہدیٰ۔ آرہ

س۔ اگر دُنیا میں صرف نقصان ہی ہو تو کیا دُنیا ترک کر دینی چاہئے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔

س۔ رتن ناتھ سرشار اور منشی پریم چند میں کون زیادہ اچھا افسانہ نویس ہے؟

ج۔ پریم چند۔

ایس۔ ایس۔ یٰسین علی۔ نرمل

س۔ ایامِ جہالت میں لوگ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ آج ــــــ
عصمتوں کا حجاب بکتا ہے حُسن کو بے نقاب بکتا ہے
ماؤں کی فاقہ مستی نے بیٹیوں کا شباب بکتا ہے
یہ ستم کب تک ہوتا رہے گا بھائی جان؟

ج۔ اے شامِ خزاں کے فریادی! اب صبحِ بہاراں دُور نہیں
بے رنگیٔ گلشن ہی بڑھ کر رنگینیٔ گلشن ہوتی ہے

سمیع احمد خاں۔ باڑھ۔ پٹنہ

س۔ زندگی انسان پر کب بوجھ بن جاتی ہے؟

ج۔ جب انسان اپنے حوصلہ کی پستی یا کاہلی سے اُسے بوجھ بنا لیتا ہے۔

س۔ اکبر الہ آبادی کا کوئی شعر سُنائیے۔

ج۔ عابدہ جھکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

فرزانہ ناہید۔ بمبئی

س۔ "بیسویں صدی" ایک ماہ میں آتا ہے اور چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اِس طویل انتظار کی تکلیف سے بچنے کے لئے کیا کروں؟

ج۔ "بیسویں صدی" کی بلند پایہ مطبوعات سے اپنے ادبی ذوق کی پیاس بجھائیں۔

س۔ خوشتر صاحب! شعر و شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اکثر میرا دل شعر کہنے کو چاہتا ہے۔ ویسے افسانہ نگاری بھی پسند ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ شاعری ادب کی لطیف ترین صنف ہے اور افسانہ نگاری بھی مقبول ترین صنفِ ادب ہے۔

مظاہر ملدوسی۔ سور جگریا

س۔ انسان کی آخری اُمید کیا ہو سکتی ہے؟

ج۔ جو پُوری نہیں ہوتی۔

س۔ تقدیر لے کر انسان آتا ہے یا خود بناتا ہے؟

ج۔ خود بناتا ہے۔

س۔ جدوجہد کر کے کتنے لوگ اِس دُنیا میں کامیاب ہوتے ہیں؟

ج۔ بہت سے لوگ ــــــ بے شمار لوگ!

امیر امان اللہ خاں بھوجپور

س۔ دنیا کی حسین شے کیا ہے؟

ج۔ جو اپنے دل کو بھا جائے۔ آنکھوں میں سما جائے۔

س۔ خوشتر بھیا! حقیقی مسرت دولت میں ہے یا عزت میں؟

ج۔ یہ اپنے اپنے خیال اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ کتنے عزت کے لئے سب کچھ تج دیتے ہیں۔ کتنے دولت کے لئے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

س۔ پیہم کوشش کے باوجود اگر امید کی کرن نظر نہ آئے تو انسان کیا کرے؟

ج۔ جب بھی مایوس نہ ہو۔ ورنہ اندھیرا اور گہرا ہو جائے گا۔

ایم فضل عظیم عظیم صدیقی سیوہرہ (میرٹھ)

س۔ خوشتر بھیا! میں آپ سے قلمی دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے خطوط کا جواب دینا پسند کریں گے؟

ج۔ آپ شوق سے ہم سے قلمی دوستی کر سکتے ہیں لیکن خدا کے لئے خط نہ لکھئے گا۔ کاش! ہماری حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات دل کا ساتھ دیتیں!

س۔ طالب علموں کے لئے رسالے یا ناول پڑھنا مضر ہے یا مفید؟

ج۔ اپنے کورس کی کتابیں پڑھنے کے بعد فاضل وقت میں اچھے رسالے اور اچھے ناول پڑھنا بُرا نہیں ہے۔

س۔ خوشتر بھیا! ذرا یہ بتایئے کہ انسان کامیابی سے کب نا امید ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب اس کے ہاتھ سے حوصلہ کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔

رضا کریم ٹیکھر دی۔ مونگیر

س۔ روٹھے ہوئے دشمن کو کس طرح منانا چاہیئے؟

ج۔ اپنے گھر کا کچھ قیمتی حصہ اُسے دے کر ——— جیسا کہ چین چاہتا ہے۔

س۔ آج کل کی لڑکیاں چست فل پینٹ کیوں پسند کرتی ہیں؟

ج۔ لڑکیاں نہیں پسند کرتیں۔ مرد انھیں پسند کرنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔

س۔ مہنگائی کے ساتھ ساتھ مقدمہ بازی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔

محمد رفیع۔ راولپنڈی

س۔ چچا جان! آپ کا سب سے پسندیدہ فنکار کون ہے؟

ج۔ ہر وہ فنکار ہمارا پسندیدہ فنکار ہے جو زندگی کا نقیب اور انسانیت کا پیغامبر ہوتا ہے۔

س۔ "سرگوشیاں" میں آپ کے حیات افروز جوابات نے مجھے ہر مشکل مرحلے پر سہارا دیا ہے ——— اس کے لئے میں آپ کو کیا پیش کروں؟

ج۔ ہماری خامیوں سے آگاہ کر کے رہنمائی اور روشنی!

س۔ ایچ۔ ڈبلیو۔ لانگ فیلو نے کہا ہے ——— ہم اپنی قسمت کے خود بنانے والے ہیں ——— یہ خیال کہاں تک درست ہے؟

ج۔ سو فیصدی درست ہے۔ علامہ اقبال نے بھی فرمایا ہے ؎

حال و استقبال ہر دو حاصلِ تدبیر تست
ہاں بجہد آمادہ شو درو ست تو تقدیر تست

حیدر علی راعین۔ بکسر

س۔ عورت اتنی جذباتی کیوں ہوتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ عورت کا دل نازک ہوتا ہے۔ عورت صنفِ نازک ہوتی ہے۔

س۔ بھیا! حسن میں کشش کیوں ہوتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ حسن کا دوسرا نام کشش ہے۔

س۔ عورتیں جب گھر سے کہیں باہر جاتی ہیں تو اپنے کو ضرورت سے زیادہ کیوں سنوارتی ہیں؟

ج۔ آج کے مرد بھی جب تزئین و آرائش میں عورتوں سے دو قدم آگے ہیں تو پھر عورتیں تو عورتیں ہیں۔ تزئین و آرائش جن کا فطری حق ہے۔

نور جہاں بیگم ناز۔ بھوپال

س۔ خوشتر صاحب! کیا غباروں کی تخلیق کا باعث زیبائش گل ہے؟

ج۔ زیبائش گل بھی اور تحفظ گل بھی [illegible] نہ ہوتے پھولوں ہی [illegible] پھول [illegible] اتنے متاثر نہ ہوتے۔

مس سکینہ کوثر [illegible] گھاٹ

س۔ ندی کے ساحل کیوں [illegible]

ج۔ جہاں ناخدا حوصلہ نہیں چھوڑ [illegible]

س۔ ہم نے جب کلیاں مانگیں [illegible] آخر کیوں؟

ج۔ دنیا میں مانگنے سے کچھ نہیں [illegible] خود آگے بڑھ کے [illegible]

جمیل [illegible]

س۔ آج کل کی دنیا میں خوشامد [illegible]

ج۔ محنت کرنے والا خوشامد [illegible] اٹھاتا ہے۔

س۔ انسان کی آنکھیں [illegible]

ج۔ جب اُسے ٹھوکر [illegible]

سید سراج الدین بھیونڈی

س۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بیکاری کے درمیان ہندوستان کا مستقبل؟

ج۔ لیڈروں کی رائے میں بہت تابناک ہونا چاہئے ——— صبح پھوٹے گی اسی شام کی تاریکی سے!

محمد محفوظ عالم۔ نوادہ

س۔ بھیا! کیا آرٹ اور سائنس بالکل الگ الگ چیزیں ہیں؟

ج۔ جی ہاں!

س۔ بھیا! بتائیے دہلی میں گدھوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ یہ "گدھے کی سرگزشت" کے مصنف کرشن چندر جی سے پوچھئے لیکن گدھوں سے آپ کی اس دلچسپی سے انھیں غلط فہمی نہ ہو۔

شفیع احمد جوہر۔ جھریا

س۔ بھائی جان! ساحر کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

ابھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

س۔ صبح کی پہلی کرن ایک نئی زندگی کا پیغام دیتی ہے اور شام؟

ج۔ شام ایک نئی صبح کی نوید لے کر آتی ہے۔

کلن میاں۔ چکدرین۔ مونگیر

س۔ خوشتر بھیا! رات میں چاند کی بجائے سورج نکل جائے تو؟

ج۔ تو موجودہ حالات میں دنیا کو دن میں تارے دکھتے ہیں، رات میں سورج نکلنے کی بات بہکی ہے۔

س۔ خوشتر بھیا! آپ کس مذہب کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

ج۔ ہم ہر مذہب کو پسند کرتے ہیں۔ ہر مذہب کا احترام کرتے ہیں۔ ہر مذہب کو اچھا سمجھتے ہیں۔

س۔ ایک غم انگیز شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

لطفِ بہار کچھ نہیں، گو ہے وہی بہار
دل کیا اداس ہے کہ زمانہ اداس ہے

کے۔ ایس۔ اقبال رجنتور۔ پربھنی

س۔ خوشتر بھیا! ساری دنیا کے ممالک امن کے لئے آواز اٹھا رہے ہیں لیکن خود ہی دنیا کو جنگ کے دہانے میں دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ ان کے خیال میں یہ امنِ عالم کے لئے پرخلوص کوشش، پرخلوص جد و جہد ہے۔

س۔ کیا تیسری عالمی جنگ ہوگی؟

ج۔ آثار و قرائن تو یہی بتا رہے ہیں۔ اس لئے کہ کچھ ملک امن کے نام پر دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دینا چاہتے ہیں۔

شہر بانو۔ بھوپال

س۔ سچ بولنے کا صلہ؟

ج۔ سچ آپ اپنا صلہ ہے۔ صلے کی پروا کئے بغیر سچ بولنا چاہئے۔

س۔ میری بہن حسن بانو کا خیال ہے، فیض احمد فیض، ساحر اور مجاز سے بڑے شاعر ہیں اور میں کہتی ہوں ساحر لدھیانوی فیض سے بڑے شاعر ہیں۔ اب فیصلہ آپ پر ہے۔ فرمائیے آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ دونوں بڑے شاعر ہیں لیکن ادب میں فیض کا کام اور خدمات زیادہ ہیں۔

ایم۔ ایس۔ انصاری۔ ہوڑہ

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ عورت پیار اور محبت کی وہ حسین اور مقدس مسکراہٹ ہے جس کی خاطر آدم جنت سے نکل آئے۔

ج۔ جی ہاں!

س۔ مومن کا کوئی حسین اور رومانی شعر سنائیے۔

ج۔ نیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے مہر پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

محمد عمر پہلوان۔ عادل آباد (آندھرا پردیش)

س۔ انسان کو اپنا ماضی یاد نہ رہتا تو کیا ہوتا؟

ج۔ ماضی، مستقبل کی باتیں چھوڑیئے۔ آج کی باتیں کیجئے۔ آج کے تقاضوں کو دیکھئے ——— آج کا دن آپ کا دن ہے۔

س۔ آفتابِ مسرت کب طلوع ہوتا ہے؟

ج۔ جب غم کی انتہا ہو جاتی ہے ؎

مسرت کی تمنا ہو تو غم کی انتہا کر لے
ستارے ڈوب کر کرتے ہیں انوارِ سحر پیدا

س۔ بدکار دشمن، بدکار دوست ——— آپ کسے ترجیح دیتے ہیں؟

ج۔ ہم دونوں کو برا سمجھتے ہیں۔ برا ہو تو ہم دوست کو بھی اچھا نہیں سمجھتے۔

احمد آفندی۔ نظام آباد

س۔ دنیا کی بین الاقوامی زبان کون سی ہے اور دنیا کی زبانوں میں اردو کا کون سا درجہ ہے؟

ج۔ دنیا کی بین الاقوامی زبان انگریزی ہے۔ دنیا کی زبانوں میں اردو کا تیسرا درجہ ہے۔

[illegible] انصاری، بی۔ اے۔ مانگو

س۔ اگر "بیسویں صدی" کے لئے ایک خط نما افسانہ بھیجنے کی جرأت کروں تو کیا آپ اُسے "بیسویں صدی" میں جگہ دیں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہوگا تو ضرور جگہ پائے گا۔

س۔ علم نفسیات کی رُو سے ماں کو اپنی اولاد سے زیادہ پیار ہوتا ہے یا باپ کو؟

ج۔ ماں کو۔

س۔ ایک مرد اور عورت کو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے کتنی عمر میں شادی کرنی چاہئے؟

ج۔ سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد۔

نہوفی بلیاوی۔ سہسرام

س۔ کیا آزاد نظم میں بھی بحور وغیرہ کی شرط ہے یا وہ ان پابندیوں سے آزاد ہے؟

ج۔ آزاد نظم صرف کہنے کے لئے آزاد ہے۔ ورنہ آزاد نظم بھی وزن اور بحر کی پابندی سے آزاد نہیں ہے۔

س۔ اگر میں اپنا کوئی افسانہ یا نظم بھیجوں تو آپ اُسے "بیسویں صدی" میں شائع کریں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہوگی تو ضرور شریکِ اشاعت ہوگی۔

عبدالرشید بابل۔ پٹنہ

س۔ کیا نیکی کی طرف بُلانے والا نیکی کرنے والے کے برابر ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ کیا یہ صحیح ہے کہ وقت ٹھہرا رہتا ہے اور ہم گزر جاتے ہیں؟

ج۔ کبھی ہم گزر جاتے ہیں اور وقت ٹھہرا رہتا ہے کبھی ہم ٹھہرے رہتے ہیں وقت گزر جاتا ہے۔

س۔ حوادثِ روزگار کا مقابلہ کس طرح کرنا چاہئے؟

ج۔ مستقل مزاجی سے مسکراتے ہوئے۔

پریتم سنگھ۔ امرتسر

س۔ عورتوں کے اس تنگ اور چُست لباس نے بے پردگی نہیں بڑھا دی؟

ج۔ بڑھا تو دی ہے لیکن فیشن کے دیوانے مردوں کی سمجھ میں نہ آئے تو یہ بے راہ روی کیسے رُک سکتی ہے۔

س۔ کنیڈی کے اصل قاتل کا کیا بنا؟ بس تلاش ہی ہوتی رہے گی یا کچھ اور۔۔۔

ج۔ جب تک اصل قاتل کا سراغ نہ مل جائے تلاش تو جاری رہے گی ورنہ ایک ظلم تو ہو ہی چکا کسی بے گناہ کو قاتل بنا دینا دوسرا ظلم ہوگا۔

نورجہاں بیگم بلہاری۔ مونگیر

س۔ عورت کی عریانیت کا ذمہ دار کون ہے۔ مرد یا عورت؟

ج۔ مرد!

س۔ میں کوشش کے حاصل کو تقدیر سمجھتی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔

س۔ آنسو ———؟

ج۔ دل کے اکثر فسانہ ہائے جمیل
آنسوؤں میں سُنائے جاتے ہیں

اکرم زماں صدیقی۔ لاہور

س۔ حیرت شملوی مرحوم کا پورا نام کیا تھا؟

ج۔ عبدالمجید نام [illegible]

س۔ کیا حیرت شملوی کا حسرت موہانی سے کوئی رشتہ تھا؟

ج۔ ادبی رشتہ تھا، نسبی نہیں۔

محمد سلیم اقبال۔ کشن گنج۔ پورنیہ

س۔ "بیسویں صدی" سے مجھے اتنی محبت کیوں ہے؟

ج۔ اپنے دل کی بات ہم سے زیادہ آپ جانتے ہوں گے۔

س۔ آپ زیادہ تر کن سوالوں کا جواب دیتے ہیں؟

ج۔ جو سوالات دلچسپ، مہذب، معلومات افزا اور خیال افروز ہوتے ہیں۔

غیاث الدین صلابت۔ مالیگاؤں کیمپ

س۔ انسان کی اچھی زندگی کب بنتی ہے؟

ج۔ اچھے کام کرنے سے!

س۔ بیوی بے وفا ہو تو اُس کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے؟

ج۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے ایسا نہ ہو ——— انھیں الزام دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا!

نجمہ پرویز۔ پشاور

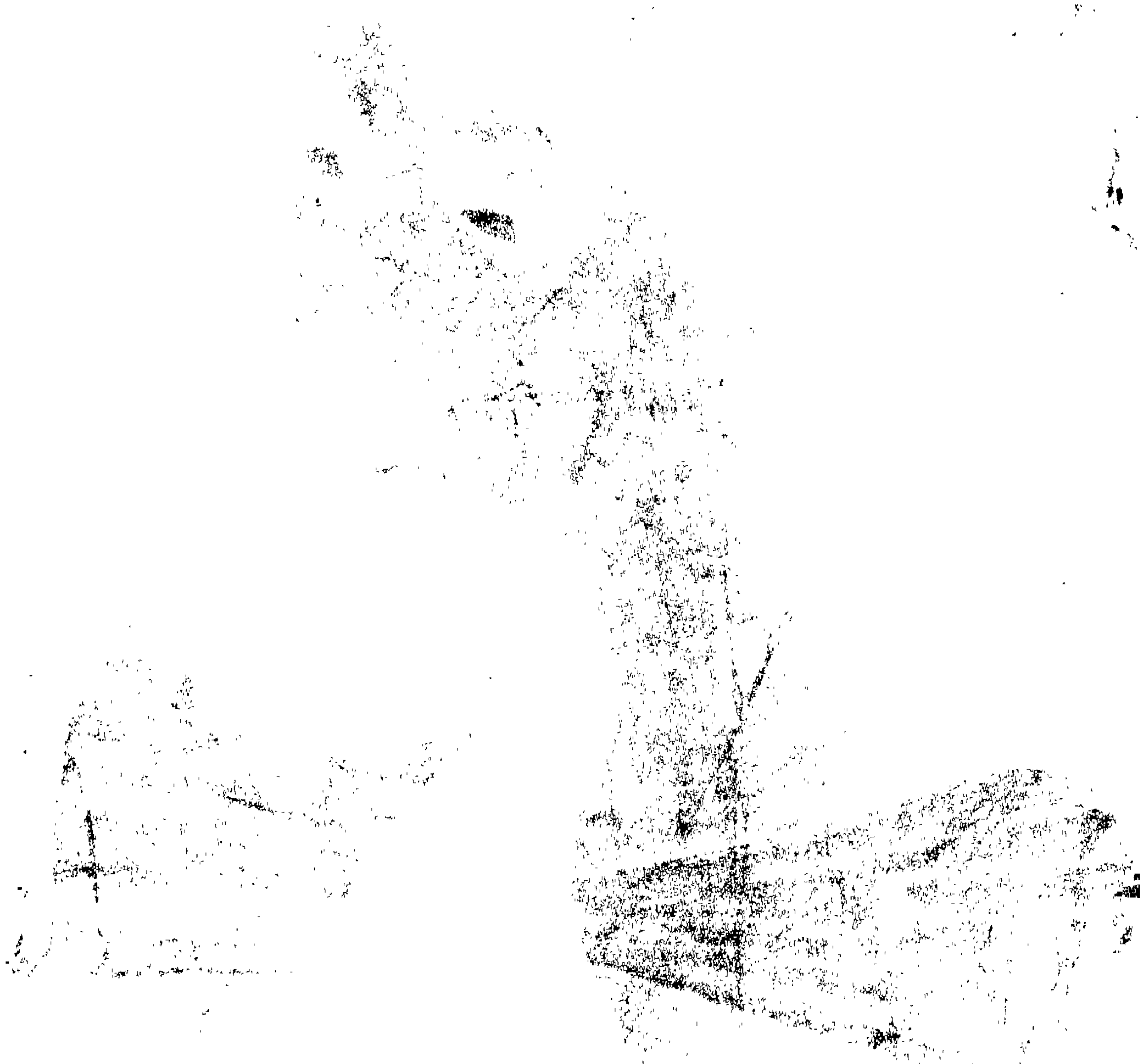
س۔ اقبال کا کوئی ایسا شعر سنائیے جو سیاسی نہ ہو۔

ج۔ سُنئے ـ

خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کہیں کہیں میں نے

ایڈیٹر و پبلشر: خوشتر گرامی ——— مطبوعہ دِلّی پرنٹنگ ورکس [illegible] بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر: برائٹ پریس صدر بازار دہلی ——— پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج۔ دہلی







ترے جمال میں وہ سادگی ہے تیری قسم
نثار جس پہ زمانے کی ہر بہار کے رنگ ——— نریش کمار شاد

فوٹو:۔ کے۔ وارثی، بمبئی



ہندوستان بک ٹرسٹ کی طرف سے چیمسفورڈ کلب نئی دہلی میں منعقد کئے گئے جشنِ بہاراں میں اُردو کے سدابہار شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ گُلفشاں ہیں۔ اِس ٹرسٹ کا بُنیادی مقصد اُردو ہندی کی قدیم و جدید تصنیفات کو دونوں زبانوں کے رسم الخط میں شائع کرنا ہے۔



اِس جشن میں فراقؔ گورکھپوری نے اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر سُنائے ؎

رُکی رُکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی　　وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن　　پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی



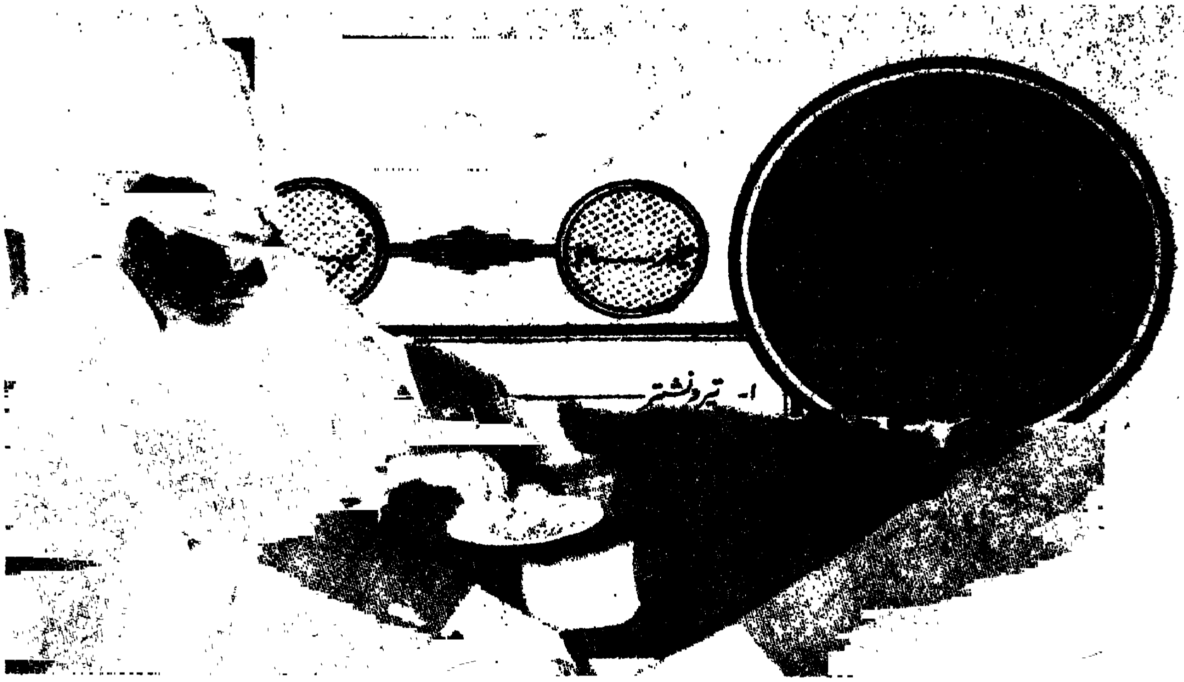
جگن ناتھ آزاد نے موجودہ سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر کہا ؎

وہ خاک جس پہ مرے رہنما نے جاں دی ہے ۔۔۔ مرا سلام اُسی دلنواز خاک کے نام
نوائے خامہ ہو منسوب آج سے یارو! ۔۔۔ شہیدِ امن کی رودادِ تابناک کے نام
مرے جنونِ وفا کا یہی پیام ہے آج ۔۔۔ سخنوران و ادیبانِ ہند و پاک کے نام



فلم اسٹار نمی نے پُرسوز آواز میں غالبؔ کے یہ اشعار پڑھ کر سوز و ساز کو ہم آہنگ کر دیا ؎

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک ۔۔۔ کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۔۔۔ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک



اس سال ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے اُردو کے نامور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کو اُن کے ناول "ایک چادر میلی سی" پر انعام ملا۔ دہلی میں بیدی صاحب کے اعزاز میں بے شمار دعوتیں دی گئیں۔ ایک پُر تکلف دعوت کی ایک جھلک جس کا اہتمام اسٹار پبلشرز نے کیا۔



اِس دعوت کے چار مہمان یا "بیسویں صدی" کے چار درویش۔ عرش ملسیانی فرش پر، کرشن چندر زیرِ تخلیق افسانے کی فکر میں، خوشتر گرامی اپنے نام کی مناسبت سے زیرِ لب مُسکراتے ہوئے اور کرشن موہن اِنکم ٹیکس کی بھول بھلیوں میں۔



پچھلے دنوں نامور ترقی پسند شاعر سردار جعفری اپنی بیگم سلطانہ جعفری کے ساتھ دہلی تشریف لائے۔ اِس موقع پر دہلی رائیٹرس ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی گئی جس میں دہلی کے سرکردہ شاعروں اور ادیبوں نے شمولیت کی۔



اِس محفل میں ایسوسی ایشن کے صدر کرشن موہن سردار جعفری کی جماہیوں سے بے نیاز یوں گلفشاں ہیں ۔

ہوئی ہے ختم کہانی، یقیں نہیں آتا — گزر گئی ہے جوانی، یقیں نہیں آتا
تمہارا حسن ہے فانی، یقین آتا ہے — ہمارا عشق ہے فانی، یقیں نہیں آتا

خوشتر گرامی


ٹیکسوں کا بوجھ انھیں پر ڈالا جاتا ہے جو برداشت کرسکیں۔ وزیر خزانہ

...ت امیر ہوگیا" ایک عنوان ـــــ یہ ہے "بنگال
...یا۔

...ں کانگریس میں وشال ہریانہ کے مطالبہ پر پھوٹ" ایک خبر
...ے موسمی پھل ہے۔

...مدھیہ پردیش کو تین حصّوں میں بانٹنے کا مطالبہ

قیم... ...ئے عشق ہے روتا ہے کیا
آ... ...ے دیکھنا ہوتا ہے کیا

۱۲۔ رسالہ...



پچھلے دنوں نامور ترقی پسند شاعر سردار جعفری اپنی بیگم
ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی گئی جس



اس محفل میں ایسوسی ایشن کے صدر کرشن موہن سردار جعفری کی جماہیوں سے بے نیاز یوں گلفشاں ہیں ؎

ہوئی ہے ختم کہانی، یقیں نہیں آتا — گزر گئی ہے جوانی، یقیں نہیں آتا
تمہارا حُسن ہے فانی، یقین آتا ہے — ہمارا عشق ہے فانی، یقیں نہیں آتا

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"دیوی لال گروپ کانگریس میں شامل ہو جائے گا" ایک خبر ———
اس سلسلہ کی وہاں وزارتیں ملتی ہیں۔

"دلی اور ہریانہ کا نکاح نہ ہو سکا" ایک عنوان ——— سول میرج کا راستہ تو کھلا ہے۔

"ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے برطانوی اسلحہ" ایک خبر
——— خدا کی پناہ پہلے اسلحہ کافی گُل کھلا چکے ہیں۔

"چینی سے کنٹرول ختم کرنے کا مطالبہ" ایک خبر ——— ہرگز نہ کیجئے۔
خدا خدا کر کے چینی کنٹرول میں آئے ہیں۔

"پنجاب کی صرف لسانی بنیاد پر تقسیم کی جائے گی" ایک عنوان ———
دلوں کی تقسیم نہ ہوگی۔ تعلقات، رشتہ داریاں، محبت پیار، میل جول بدستور رہیں گے۔

"ایک طبقہ راتوں رات امیر ہو گیا" ایک عنوان ——— یہ ہے "بنگال کا جادو" جو سچین بابو نے دکھایا۔

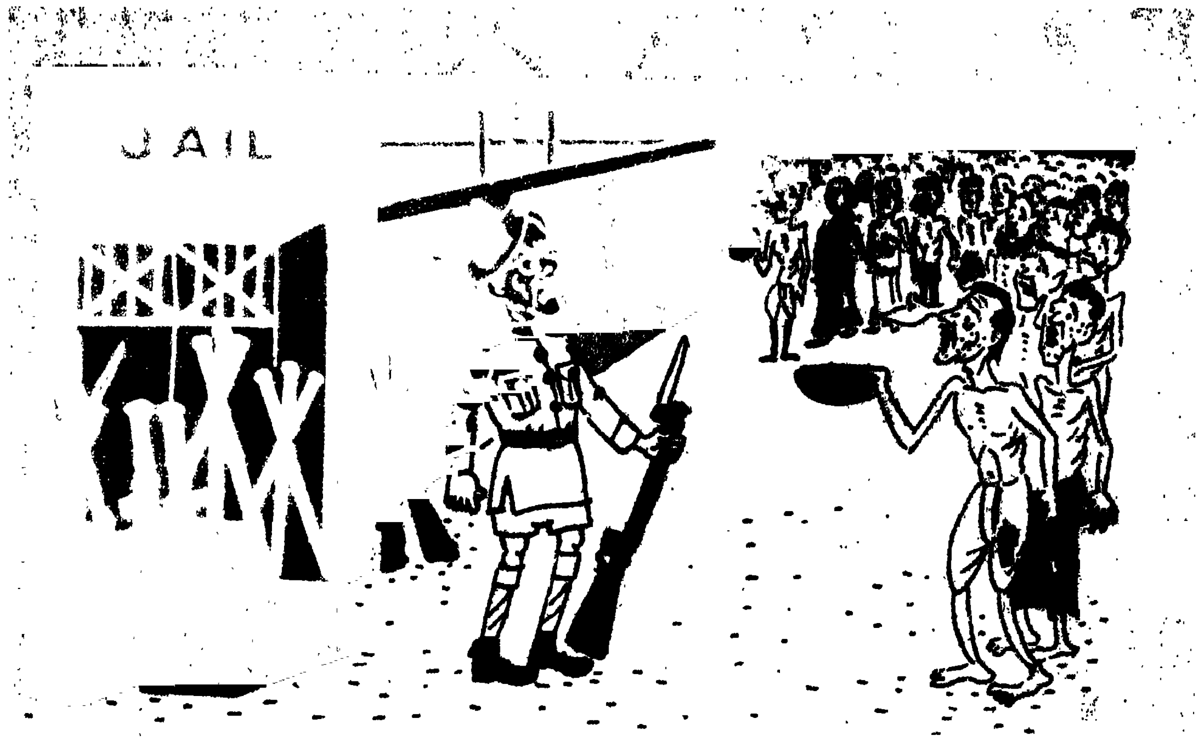
"دلی پردیش کانگریس میں وشال ہریانہ کے مطالبہ پر پھوٹ" ایک خبر
——— تعجب کیا ہے موسمی پھل ہے۔

"[illegible] کے بعد مدھیہ پردیش کو تین حصوں میں بانٹنے کا مطالبہ"
عنوان ———

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا



"ٹیکسوں کا بوجھ اُنھیں پر ڈالا جاتا ہے جو برداشت کر سکیں" وزیر خزانہ



"جمہوری نظام میں فرد کی اہمیت" شری گلزاری لال نندہ کا بیان ـــــ
دفعہ ۱۴۴، لاٹھی، اشک آور گیس، بندوق کی گولی اور جیل کی کوٹھری سے واضح ہوتی ہے۔

"چین سے کوئی گفتگو نہیں ہوگی" ایک عنوان ـــــ بلکہ گفتگو نہ کرنے پر بھی گفتگو نہ ہوگی۔

"غلامی اور آزادی کا فرق" ایک عنوان ـــــ زبان پر نہ لایئے سب کا دل جانتا ہے۔

"دلی کے حالیہ ہنگاموں کے نتیجے میں پولیس میں ردوبدل" ایک خبر ـــــ اور لیڈر سب جوں کے توں اور جہاں کے تہاں رہے۔

"مغربی جرمنی چین کے ہاتھ لوہا فروخت کرے گا" ایک خبر ـــــ چین کو لوہے کے چنے چبوانے کے لئے۔

"سنسکرت میں خبریں" ایک عنوان ـــــ تاکہ کوئی نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

"چین میں زبردست زلزلہ" ایک خبر ـــــ جو ہندوستان کی دفاعی تیاریوں کا ذکر سن کر آیا۔

"دودھ میں ملاوٹ پر جرمانہ" ایک خبر ـــــ بے وقوف کو چاہئے تھا پانی میں دودھ ملاتا۔

"مذہب سے نوجوانوں کی بیگانگی کے ذمہ دار بڑے ہیں" ایک عنوان ـــــ اور بڑوں کی پیروی کرنا چھوٹوں کی سعادتمندی ہے۔

"کمیونسٹ لیڈروں کی طرف سے ہڑتال جاری رکھنے کی دھمکی" ایک خبر ـــــ عوامی خدمت کا کمیونسٹ طریقہ۔

"تھانے میں چوری" ایک خبر ـــــ تھانیدار کو پولیس میڈل عطا کیجئے۔

"اُردو بولنے والے طبقوں کی مخالفت" ایک عنوان —— یہ آسانی دُور ہو سکتی ہے۔ اُردو بولنا چھوڑ دیں۔

"یو۔پی میں وزارتِ صحت کے مطالبات زیرِ منظور" ایک عنوان —— پہلے اس رقم سے کانگریسیوں کی غیر صحت مندانہ روش کا علاج کرایئے۔

"غلہ کی مساوی تقسیم کا مطالبہ" ایک عنوان —— جی نہیں عہدوں کی مساوی تقسیم کا مطالبہ کیجئے۔

"ہوٹل کے احاطے میں چاقو چل گئے" ایک خبر —— جب مسافر دیلیں تو کیا ہو۔

"اُردو کا حق" ایک عنوان —— جتانے کے لئے ہے دینے کے لئے نہیں۔

"یو۔پی کی تقسیم" ایک عنوان —— پنجاب کے بعد آنے کا نمبر۔

"اسکولوں میں سنسکرت پڑھانے کا انتظام ہوگا" ایک خبر —— اور اس کے لئے اُردو کو اسکول بدر کرکے جگہ نکالی جائے گی۔

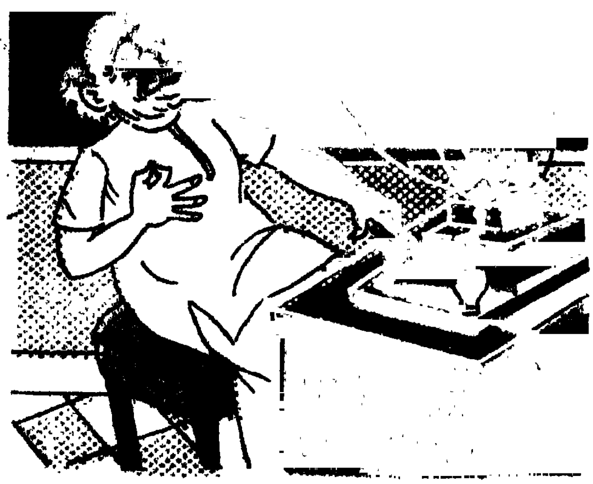
"حکومت سے نشہ بندی پر عمل کرنے کی اپیل" ایک عنوان —— شراب کے نشے کی نہیں، اقتدار کے نشے کی۔

"چین کی طرف سے ہندوستان پر نکتہ چینی" ایک عنوان —— چھوٹا منہ بڑی بات۔

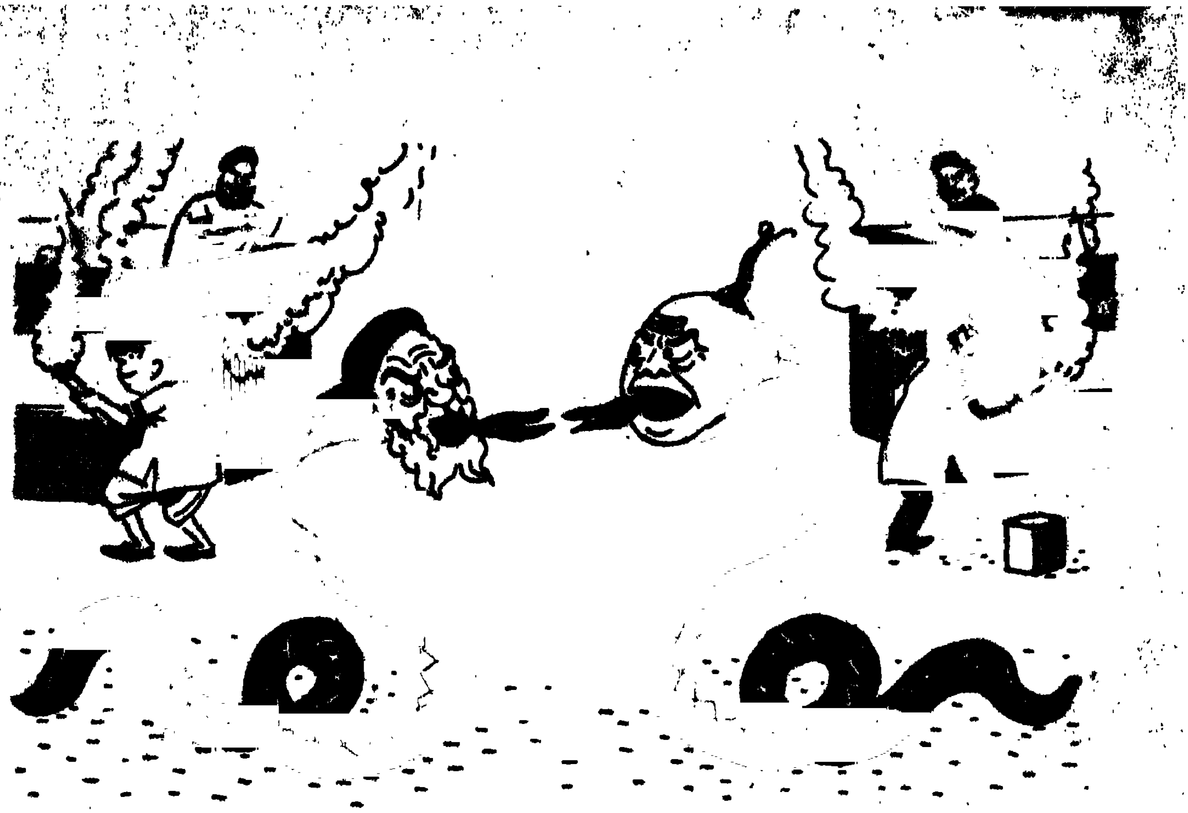
"لکھنؤ میں فحش لٹریچر کی مقبولیت" ایک عنوان —— واجد علی شاہی دَور کے جراثیم کا اثر۔

"ٹیڈی بوائے کا مسئلہ" ایک عنوان —— ٹیڈی گرل ہی حل کرے گی۔





ہندوستان اشاروں پر چلنے والا راکٹ تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔



"مرادآباد میں آنکھ کا ہسپتال" ایک عنوان —— یو۔پی کے کانگریسیوں کو وہاں بھیجیے تاکہ اُن کی آنکھیں کھل سکیں۔

"ہندی نہ جاننے والوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے" ایک عنوان —— بشرطیکہ یہ لوگ اُردو بولنے والے نہ ہوں۔

"سزائے موت ختم ہونے پر غور نہیں ہو رہا" وزیرِ قانون یو۔پی —— مگر اغلب ہے کہ اُسے چھ ماہ کی پھانسی میں تبدیل کر دیا جائے۔

"ملک کی اقتصادی حالت بگڑ رہی ہے" ایک عنوان —— فوراً ایک آرڈیننس جاری کیا جائے۔

"پنجابی صوبے سے ہند کی قومی وحدت مضبوط ہوگی" ایک عنوان —— اور پچھلے دنوں پنجاب میں جو کچھ ہوا وہ اِسی ضمن میں ایک قدم تھا۔

"فحش لٹریچر پر تشویش" ایک عنوان —— بوڑھوں کی طرف سے، کالج کے نوجوانوں کی طرف سے نہیں۔

"جن سنگھ خوش بھی، ناخوش بھی" ایک عنوان —— یعنی نیم دروں نیم بروں۔

"گزشتہ چار سال سے حالات کو بہتر بنانے کا یقین دلایا جا رہا ہے" ایک عنوان —— کوئی مضائقہ نہیں چار سال اور [illegible]۔

"جمہوریت میں ہمارا تجربہ کامیاب رہا تو دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے گا" اندرا گاندھی —— وہاں بھی بھوک ہڑتالیں ہوں گی۔ [illegible] جیل کی کوٹھری اور فائرنگ سے نوازا جائے گا۔

"راجیہ سبھا کا اُمیدوار" ایک عنوان —— اُمید سے ہے۔

"مغربی بنگال کے ٹیچر امتحانوں کا بائیکاٹ کریں گے" ایک خبر —— آخر طالب علموں کی بجائے اِن کا امتحان کیوں لیا جائے۔

"عورتوں نے خالی گھڑے سر پر رکھ کر مظاہرہ کیا" ایک خبر —— وزارت میں شمولیت کا مطالبہ ہوگا۔

"موسم گرما میں آل انڈیا ریڈیو کے پروگراموں کے اوقات میں تبدیلی" ایک خبر —— اِس تبدیلی کے بعد گرمی میں پنکھے اور برف یا پہاڑوں پر جانے کی ضرورت نہ رہے گی۔

"مرکزی حکومت میٹروپولیٹن کونسل کو کچھ اختیارات دینے کے لئے تیار" ایک خبر —— یہی غنیمت ہے، بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔

"لڑاکا ہوا باز" ایک خبر —— جو مسافروں سے لڑتا ہے۔

"چین اور پاکستان کے حملوں کا ہندوستان کی اقتصادیات پر بڑا بوجھ پڑا ہے" اندرا گاندھی —— کاش جنگ کی باتیں کرنے والے یہ سمجھ سکیں۔

"زبان کے بارے میں غلط جذبات میں بہہ کر نہ کیا جائے" ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریر۔ مگر ؎

کون سنتا ہے فغانِ درویش

یہاں تو ہندی کا بھوت سوار ہے۔

"ہم اپنے بڑے آدمیوں کو مغربی معیار سے پرکھنے کے عادی ہو گئے ہیں" جشنِ عرشی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریر —— مگر آپ کو ہم نے مشرقی روایات کے سانچے اور معیار پر پرکھ کر بڑا تسلیم کیا ہے۔

"خوراک کے سوال کو سیاسی جھگڑوں سے الگ رکھا جائے" جے پرکاش نرائن —— تاکہ بھوکے لوگوں کو سیاسی لیڈر اپنے مفاد میں استعمال نہ کر سکیں۔



شریمتی اندرا گاندھی کا کامیاب غیرملکی دورہ

نائب صدر جمہوریہ ہند

خوشتر گرامی

گاندھی ٹوپی، شیروانی اور علی گڑھ کٹ پاجامہ لباس، لمبا قد، سجیلا بدن، کتابی چہرہ، لمبی اور اونچی ناک جو ہندوستان کی ناک بھی بن گئی ہے۔ آنکھوں پر سیاہ عینک جس کی بدولت نظر دنیا کی برائی پر کبھی نہیں جاتی۔ اچھی چیزیں دیکھتی اور دامنِ دل میں محفوظ کر لیتی ہے۔ بڑے کان جو بری باتیں سننے کے عادی نہیں۔ ہلکی پھلکی داڑھی جس نے اس شخص کے مردانہ حسن کو دوبالا کر دیا ہے جو ہندوستان کا نائب صدر جمہوریہ ہے اور جس کا نام ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین



نائب صدر جمہوریہ تو کوئی بھی ہو سکتا ہے مگر ذاکر حسین "ہر کوئی" نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جمہوریہ ہند کی نائب صدارت ذاکر حسین کے لئے باعثِ افتخار نہیں۔ پہلے اسکول کے معلّم تھے۔ پھر یونیورسٹی کے اور آج پوری قوم کے معلّم ہیں۔ پہلے کتابوں کی تعلیم دیتے تھے۔ اب اخلاق اور سیاسیات کا درس دیتے ہیں بلکہ سراپا سبق بن گئے ہیں آنے والی نسلوں کے لئے —— کہ کس طرح ایک بچّہ جو کل ذاکر حسین تھا وہ جامعہ ملیہ کا معلّم پھر مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر، بہار کا گورنر اور بعد کو نائب صدر جمہوریہ ہند بنا۔ ان کی عظمت اس میں ہے کہ اس عہدے پر پہنچ کر بھی عوام سے رابطہ قائم ہے۔ دلّی کی تہذیبی، تمدّنی اور ادبی انجمنوں کی شمع محفل اور سماجی جلسوں اور تقریبات کی جان ہیں۔ بلا تکلف ہر جگہ جانے اور لوگوں میں گھلنے ملنے کو کسرِ شان نہیں سمجھتے —— معلّم ہیں، مفکر ہیں، مدبّر ہیں، سیاست داں ہیں، ادیب ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم انسان ہیں

خوشبو مہندی کی

م۔ک۔ مہتاب، ایم۔ اے

ای۔پی۔ ۹۸۴ ، پریم نگر، جالندھر
۱۶۔ جنوری ۱۹۶۶ء مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

. . . ایک اور مختصر افسانہ "خوشبو مہندی کی" ارسال ہے۔ میں نے یہ افسانہ عام روِش سے ہٹ کر لکھا ہے۔
اُمید ہے قارئین شرفِ قبولیت عطا کریں گے . . . خیر اندیش ــــــ م۔ک۔ مہتاب

"آج تو لُطف آگیا ہے کھانے کا! مٹر پنیر کیا لذیذ بنے ہیں!! انگلیاں چاٹ جانے کو جی چاہتا ہے!"

رام ناتھ ڈسٹری بیوٹر نے لمبی ڈکار لی اور تندور پر رکھی طشتری میں سے سونف کے چند دانے اُٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

فخر کے احساس سے ٹھاکر کی گردن تن گئی اور وہ چپاتیاں لگانے کی سلاخیں ایک ہی ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولا "سیٹھ جی! آپ کی چِلم کی طرح ہماری سبزی بھی کبھی کبھی لاجواب بن جاتی ہے جنابِ عالی! لیکن یہ تو سب مسالہ بھوننے کا کمال ہے سیٹھ جی! ہاں سیٹھ جی! مجھ کو کہہ رہا تھا دو پاس!"

"ہت تیرے کی! بات پھر پاس پر ختم کی ہے نا!! سالی فلم نکمی نکل آئے تو اُسے کوئی دیکھنے نہیں جاتا اور اگر قسمت سے کبھی اچھی نکل آئے تو بس کے ڈرائیور سے لے کر کمیشن کے اردلی تک سب مُفت پاس لینے دوڑے آتے ہیں۔ اچھا آج تمھاری سبزی کے انعام میں دو پاس تمھیں مل جائیں گے۔" رام ناتھ سگریٹ سُلگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ٹھاکر نے مٹر پنیر کے پتیلے کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا ایک سوندھی خوشبو نے اُس کے نتھنوں کا استقبال کیا اور وہ آپ ہی آپ اِترانے لگا "واقعی آج لاجواب سبزی بنی ہے! ورنہ یہ بدمزاج رام ناتھ کب کسی کی تعریف کرتا ہے۔ سالا اپنی چِلم کے گھاٹے کا سارا غصہ میری دال بھاجی پر نکالتا ہے۔ واقعی کیا رنگ ہے۔ جیسے پتیلے میں سُرخ دوپٹے والی کوئی مٹیار مُسکرا رہی ہو! گرم مسالہ کیا قیامت کی خوشبو دے رہا ہے۔ خواہ مخواہ بھوک لگ رہی ہے۔ آج اُس نے یہ سبزی بنائی بھی تو خاص لگن سے تھی۔ جب وہ گرم گھی میں پیاز کے لچھے اور لہسن کے جوے بھون رہا تھا تو اُن کی خوشبو میں اُسے اپنے محلے کی اُس لڑکی کے ہاتھوں کی مہک آرہی تھی جس کا نام پرکاشو تھا لیکن جس کا نام اُس نے پیازو رکھ دیا تھا جو اُس سے جلنے کے لئے روتی تھی لیکن پوچھنے پر کہہ دیتی تھی، پیاز کاٹتے کاٹتے آنسو آگئے ہیں اور جس کی رسوئی کی کھڑکی سے لگ کر وہ اُس سے باتیں کیا کرتا تھا۔ ہائے کیسا چہرہ تھی پیازو بھی! پیازو جو اُس کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی تھی لیکن اُسے روتا چھوڑ کر اپنے ماموں کے ساتھ واپس چلی گئی تھی۔ پیازو جو اُسے ہمیشہ کے لئے یہاں سڑکوں کے کنارے اور سراؤں میں پیاز بھوننے کے لئے چھوڑ گئی تھی۔

جو چیز لگن سے بنائی جائے، عمدہ بنتی ہے۔ ابھی ابھی اُس سامنے والی کوٹھی میں کرایہ دار بابو آیا تھا۔ اُس نے اُسے بھی مٹر پنیر کی پلیٹ دی تھی اور وہ جاتے ہوئے دیاسلائی کی تیلی سے دانت کریدتے ہوئے کہہ گیا تھا "ٹھاکر! آج سبزی کیا بنائی ہے یار! ایسا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پلیٹ میں پنیر نہیں کلیجے کے ٹکڑے تیر رہے ہوں! کیا بات کر گیا ہے پٹھا! سب نامُراد عاشقوں کا یہی حال ہوتا ہے جنابِ عالی! عشق پیل نہ ہو تو ایسی باتیں کب آتی ہیں دماغ میں! اُس نے بھی پڑوس کی کوٹھی میں رہنے والی ایک لڑکی سے پیار کیا تھا۔ دونوں رات کے اندھیروں میں چھتوں پر ملا کرتے تھے۔ آنسو بہاتے اور ساتھ نبھانے کی قسمیں کھایا کرتے تھے لیکن اِس سماج کا گرم مصالحہ زمین میں سے اُبھر کر اُن کے درمیان چٹان بن گیا اور یہ دونوں بے چارے چٹان کی دونوں طرف ٹکرا کر اپنے کلیجے کے ٹکڑے کروا بیٹھے۔ دراصل سچا پیار وہی ہوتا ہے جو ناکام ہوتا ہے جس میں کلیجے کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اگر پیازو مل جائے تو دو برس بعد کبھی پتیلے میں سے اُس کی خوشبو کب آتی ہے۔ ہائے! دیکھو کیا سر جھکائے جی، نئی روڈ پر جا رہا تھا جیسے کمیٹی والے اُس کا کھوکھا سڑک پر سے اُٹھوا کر لے گئے ہوں۔

ٹھاکر نے ایک بار پھر پتیلے کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا۔ اُس کا جی چاہا کہ سبزی میں تیرتے ہوئے پنیر کے ایک گداز گلابی ٹکڑے کو زبان پر رکھ کر چوس لے جیسے کبھی وہ پکاشو کی گلابی اُنگلی منہ میں دبا لیا کرتا تھا۔ لیکن ایکدم ایک بس بھڑبھڑاتی ہوئی آکر بس سٹینڈ پر رُک گئی اور وہ سب کچھ بھول کر مسافروں کو آواز لگانے لگا۔

"آؤ سردار جی! آؤ مہربان فوجی بھائی صاحب! ارے ماں کے چھیلے کو بی بی جی کو اندر بٹھاؤ اور ان کے لئے تھالیاں لگاؤ۔ کیا کھاؤ گے جوان! اسپیشل بھنڈی ہے، آلو مٹر، کوفتے، بھرتا، کریلے۔ روغن جوش اور خاص سپیشل مٹر پنیر کھا کر دیکھو ایسا مال افسروں کے میس میں بھی نہیں ملتا۔" اور وہ اپنے منہ میاں مٹھو بنا ہر گاہک کو خاص زور دے کر مٹر پنیر کھلا رہا تھا۔ ہر بار پتیلے کا ڈھکن اُٹھاتے ہوئے اُسے خاص لطف آتا۔ ہر بار اُس کا جی چاہتا کہ وہ پنیر کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھ کر پکاشو کی انگلیوں کا لطف محسوس کرے لیکن آج ہی تو چار پیسے کمانے کا دن تھا۔ چنت پورنی کے میلے سے دھڑا دھڑ بسیں آ رہی تھیں۔ سٹینڈ خالی ہی نہیں ہو رہا تھا اور ہر بس اُس کے لئے پانچ چار گاہک اُگل جاتی تھی۔ وہ اپنے ملازم نکو کو سخت سست کہتا ہوا تھالیاں لگاتا جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا، پنیر تو شاید کل پھر بن جائے گا لیکن میلہ تو سال بعد ہی آئے گا۔ روپے تو آج ہی ہاتھ آئیں گے جن کے نہ ہونے سے پکاشو اُس سے یوں جُدا کر لی گئی جیسے کسی کے جسم سے اُس کی قمیص اُتار لی جائے۔ روپیہ! جس کے بغیر انسان کی دو کوڑی کی وقعت نہیں۔ روپیہ! جسے انسان اپنا شکم چین بھوک پیاس کھو کر کماتا ہے۔

"اوئے ماں کے گرم سالے! تندور کی موری کھول۔ چپاتی کراری نہیں ہو رہی!" اُس نے خواہ مخواہ نکو پر گالی لڑھکا دی اور اپنی بھوک تندور کی آگ کرید کر اُس میں دفن کر دی۔

"بیٹھئے لالہ جی! میں خود تھالی لگاتا ہوں۔ گھبرائیے مت، میلے کے دن سروِس کچھ خراب ہو جاتی ہے۔" اور وہ روپیہ سمیٹنے کی دُھن میں جیسے چار ہاتھوں سے کام کرنے لگا۔

ساون کی ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا اور وہ سمٹ کر تندور پر بیٹھ گیا۔ بھوک پھر ایک شعلے کی مانند اُس کے پیٹ میں لپکنے لگی اور وہ اپنے بوتھ میں بیٹھے کھانا کھانے والوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا ——— اُس کی بھی کیا زندگی ہے کہ اُس کے سامنے اتنی اچھی سبزیاں ایسی کراری چپاتیاں رکھی ہیں لیکن اُسے کھانے کی اجازت نہیں۔ وہ ایسے لوگوں کو جن کی جیب میں شاید ۵۰ پیسے بھی نہ ہوں آوازیں لگا لگا کر "آؤ مہربان! آؤ مہو سیدار! آؤ میرے بادشاہو!" کھانے کی دعوت دے رہا ہے اور خود پنیر کے ایک گول گداز ٹکڑے کی لذت کے لئے ترس رہا ہے!

اُس نے پھر پتیلے کا ڈھکن اُٹھا کر دیکھا اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کا کلیجہ نکال لیا ہو۔ وہاں بمشکل ایک پلیٹ مٹر پنیر باقی تھا۔ "ان مسافروں کی ماں . ." اُس نے زور سے ڈھکن پتیلے پر پٹکتے ہوئے کہا "میں کسی کو نہیں دوں گا اب یہ سبزی! میں خود کھاؤں گا۔ سالے کہیں کے۔ چاہے بیوی نے عمر بھر کبھی دال کے سوا کچھ نہ پکایا ہو اور یہاں چالیس پیسے کے لئے اُن کے سامنے کلیجہ نکال کر رکھ دو۔ ہونہہ!"

تین بجتے بجتے کھانا کھانے والوں کی بھیڑ کم ہو گئی۔ راشن بھی تقریباً ختم تھا اور کچھ بارش کے باعث مسافر بسوں سے باہر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔

"ابے نکو! لگا میرے لئے کھانا!" ٹھاکر نے تندور سے اُٹھ کر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اُستاد تمہارے لئے کھانا؟" نکو نے حیرانی سے ٹھاکر کی طرف دیکھا جیسے ٹھاکر پاگل ہو گیا ہو۔

"کیوں میرے لئے یہ کھانا حرام ہے کیا؟ چل میز صاف کر جلدی سے مٹر پنیر کی پلیٹ لگا دے اور یہ تھوڑی دال اور کوفتے بھی۔ سبز مرچ، پیاز، چٹنی سب لگا دے۔ تندور میں چپاتیاں لگی ہیں کراری کر کے نکالنا۔ ہاں ایک پلیٹ دہی بھی لگا دے بالائی ڈال کر!"

"لیکن اُستاد . ." نکو دو چپاتیاں نکالتے ہوئے بات پوری نہ کر سکا۔

"لیکن کیا ———؟ ان مسافروں کا گرم مسالہ! ہم کب تک بھوکے رہ کر ان مسافروں کو کھلاتے رہیں گے۔ تو ساری بالائی اُتار کر پلیٹ میں ڈال دے۔ آج تو پیٹ میں بھوک کے بھانبڑ مچ رہے ہیں۔"

زور کے ہارن کی آواز کے ساتھ ایک بس دکان کے سامنے آکر رُک گئی۔ ٹھاکر اور نکو کی نگاہیں بس کی طرف گھوم گئیں۔

دروازہ نہیں کھُلا۔ اُنہیں جیسے اطمینان ہو گیا لیکن پھر دروازہ کھُل گیا ایک چھاتہ کھُلا اور اُس کے نیچے کسمساتی ہوئی ایک نوبیاہتا لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ چپکی ہوئی سی اُن کے بوتھ کی طرف بڑھنے لگی۔ دودھیا رنگت کی جوان لڑکی جس کی مانگ میں سیندور اور پیشانی پر بندیا چمک رہی تھی، جس کی گوری کلائیوں میں سُرخ چوڑیاں چمک رہی تھیں۔

"آئیے آئیے مہربان! ادھر آ جائیے بی بی جی!" نکو نے ٹھاکر کے لئے اُٹھائی سلاد کی پلیٹ وہیں رکھ دی اور نئے گاہکوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے بولا۔

"اُستاد! اُٹھو چپاتیاں لگا دے۔"

ٹھاکر نے حسرت بھری نگاہ سے اپنے کھانے کی طرف دیکھا پھر اُس گلابی ۳

ٹریا کی طرف اور من ہی من میں کہنے لگا "اِس ٹکو کمبخت کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ گولی مارا نھیں! یہ کمبخت جہاں کسی جوڑے کو دیکھ لیتا ہے ریشہ خطمی ہوجاتا ہے۔ مرنے کی اولاد نہ تیرے باپ کی شادی ہوئی تھی، نہ تیری ہوگی۔ پھر کیوں بھٹک رہا ہے؟"

"اُٹھو اُستاد" ٹکو نے تولیے سے اندر میز پر صاف کرتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر نے گلے میں پڑا سفید صافہ اپنے کھانے پر ڈال دیا اور سرد آہ بھر کر گرم تندور پر آبیٹھا۔

"کیا پکایا ہے مہاراج؟" نوجوان نے پوچھا۔

"جناب بھنڈی ہے، کوفتے ہیں، دال ہے، آلو ہیں اور۔۔" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"اچھا لگا دیجیے"

کھانا لگ گیا۔ ٹکو اور ٹھاکر اندر سے آتے ہوئے نقرئی قہقہوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ٹکو اندر آیا تو نوجوان نے سبزیوں کے بے لذّت ہونے کی شکایت کرتے ہوئے کہا "کوئی خاص سبزی نہیں ہے کیا؟"

"ہے جناب! اسپیشل مٹر پنیر لیکن ڈبل ریٹ یعنی ایک روپیہ!"

"لاؤ!"

"نہیں ہے ۔ ختم ہے!" ٹھاکر نے تندور پر بیٹھے بیٹھے جھٹ جواب دیا۔

ٹکو اُس کے قریب آکر بولا "اُستاد وہ تمھاری والی پلیٹ جو رکھی ہے۔ میں نے ایک روپیہ پلیٹ کہہ دیا ہے۔ پُورا ایک روپیہ! سالی خوش ہوجائے گی کہ کسی نے کھانا کھلایا تھا" ٹکو کی جیسے رال ٹپکنے لگی۔ ٹھاکر بول نہیں سکا۔ جیسے ٹکو نے ایک روپیہ کا نوٹ گوند سے اُس کے ہونٹوں پر چسپاں کر دیا ہو۔

ٹکو نے سبزی کی پلیٹ صافے کے نیچے سے نکال لی جیسے فرشتے نے بیمار کی روح قبض کر لی ہو۔ جیسے پردے کے اندر خالی نعش ہی نعش رہ گئی ہو اور اُس کا کفن ہوا سے پھڑپھڑا رہا ہو۔

"کتنے پیسے ہوئے مہاراج؟" نئی بیاہی لڑکی کے لباس کی خوشبو نے ٹھاکر کے خیالات کا طلسم توڑ دیا۔

"تین روپے!" ٹھاکر کی آواز جیسے کسی گہرے غار سے آرہی ہو۔

اور لڑکی نے اپنے لمبے سفید پرس میں سے تین کراری کاسنی نوٹ جن میں اُس کے ہاتھوں کی مہندی کی مہک بِل گئی تھی، ٹھاکر کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

وہ نوجوان اور اُس کی دُلہن ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑک پر آگے بڑھ گئے۔

ٹکو اور ٹھاکر کی نظریں دُور تک خوشبو کے اُس جھونکے کا تعاقب کرتی رہیں۔ ٹھاکر ایک ہاتھ پر روپے اور دوسرے ہاتھ میں سلاخیں پکڑے بیٹھا رہا۔

"اُستاد کھانا!" ٹکو نے آواز دی۔

ٹھاکر نے ایک بار کھانے پر پڑے پھڑپھڑاتے کفن کو دیکھا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"لاش کھائی نہیں جاتی ٹکو! جلائی جاتی ہے!!"

اور اُس نے گہری سانس لے کر مہندی کی خوشبو والے وہ نوٹ تندور میں ڈال دیے!!

غزل

سیدہ حباب ترمذی

ہر ستم اِک نوازش ہے، احسان ہے
میرے محبُوب کی اور ہی شان ہے

جب فرشتوں سے لغزش کا امکان ہے
آدمی کچھ سہی، پھر بھی انسان ہے

ہر اذیت، مسرّت کا عنوان ہے
یہ بھی شاید محبّت کا فیضان ہے

صِرف لب رہ گئے ہیں خلوص آشنا
اب دلوں میں محبّت کا فقدان ہے

زُلفِ پیچاں کو لِلّٰلہ سلجھایئے
اِک عالم کا عالم پریشان ہے

خیریت اُن کی اب کیا کہوں آپ سے
جن سے میری بہت جان پہچان ہے

اُن کے گیسو و رُخ کا کرشمہ ہے سب
کوئی کافر نہ کوئی مُسلمان ہے

بے شمار آدمیوں کے ہوتے ہوئے
آدمیّت کا دُنیا میں فقدان ہے

اُس نظر سے شکایت ہے مجھ کو ضرور
دل کو میں کیا کہوں دل تو ناداں ہے

مُنحرف تھے حباب اِس حقیقت سے تم
زندگی ایک خاموش طوفان ہے

صرف ایک سایہ

کوثر چاندپوری

۱۴۳۶۔ بلی ماران۔ دہلی ۶

۱۵ فروری ۶۶ء   خوشترین! اسلام اور دعائیں

. . . فروری کے شمارہ میں آپ نے بہت سی تصویریں چھاپ ڈالی ہیں۔ اُن تصاویر نے اُن احباب کو میری طرف متوجہ کر دیا ہے جو نہ جانے کب سے بھلائے بیٹھے تھے۔ اِس خط کے ساتھ ایک کہانی "صرف ایک سایہ" بھیج رہا ہوں، اُمید ہے پسند آئے گی . . .

نیازکیش ــــــ کوثر چاندپوری

ناز نین اچھی طرح جانتی تھی کہ رفیق انجم اُس سے یا کسی اور لڑکی سے شادی نہ کرے گا، پھر بھی وہ اُس سے والہانہ محبت کئے جا رہی تھی۔ اُس کی مثال اُس راہی کی تھی جس کے سامنے کوئی منزل نہیں ہوتی لیکن وہ چلتا ہی رہتا ہے۔ نازنین رفیق اور اُس کی سیرت کے نقوش کو گہری نظر سے پڑھ چکی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ رفیق ایک ایسا نوجوان ہے جو ہر حیثیت سے مکمل ہونے کے باوجود سینہ میں فولاد کا ایسا ٹکڑا رکھتا ہے جو شدید آنچ سے بھی نہیں پگھل سکتا۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں وہ سر سے پاؤں تک موم ہی موم تھا۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ نرم اور لوچ دار! ذرا سی بات پر اُس کے اندر گداز پیدا ہو جایا کرتا تھا لیکن جہاں تک حُسن و شباب کی آگ کا سوال ہے وہ بالکل "فائر پروف" تھا۔ آنکھوں کے خمار، لبوں کی حلاوت اور بانہوں کی گرمی سے وہ کبھی متاثر نہ ہوا تھا۔ اِن چیزوں سے ہمیشہ دُور ہی رہا تھا۔ نازنین سے پہلے ثریا جمال اور شیریں اُس کی رگوں میں التفات کی گرمی پیدا کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکی تھیں۔ یہ دونوں کئی سال تک کالج میں اُس کے ساتھ رہی تھیں۔ رفیق انجم انھیں بہت زیادہ پسند تھا اور وہ بیتابانہ اُس کی طرف کھنچتی رہی تھیں۔ جب بھی انھیں تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملتا، رفیق ہی مرکزِ گفتگو ہوتا۔ وہ اُس کے سراپا پر شاعرانہ لب و لہجہ میں اظہارِ خیال کرتیں۔ ثریا جمال کہتی ــــــ "رفیق انجم ایک ایسی کہانی ہے جو تکنیک اور اسلوب کے لحاظ سے بالکل مکمل ہے لیکن اُس کا کوئی کلائمکس نہیں۔" ــــــ شیریں نفسیات اور قیافہ شناسی میں مہارت رکھتی تھی۔ وہ دراز قامت اور پتلی دُبلی لڑکی تھی، جس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کے بال اتنے لمبے ہیں کہ ایڑیوں کو چھونے لگتے ہیں۔ اُس کی ہلکی سبز ہتھیلیوں میں ہر وقت کنول سے کھلے رہتے تھے اور لمبی گھنی پلکوں کے سائے میں جھکنے والی بڑی بڑی آنکھیں نشہ برساتی رہتی تھیں۔ وہ انگریزی کی کسی موٹی سی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہتی: "ثریا! جانتی ہو یہ شربتی آنکھوں والے لوگ جن کے پپوٹے ذرا بھاری ہوتے ہیں، کتنے نرم دل اور ذہین ہوتے ہیں۔" ثریا آگ بگولا ہو جاتی۔ وہ خفگی کے انداز میں جواب دیتی۔

"تمھاری رائے ایک دم غلط ہے شیریں! رفیق کے دیدوں میں ذہانت کی کتنی ہی لہریں اُٹھتی ہوں اور چاہے وہ مانسرودر کی طرح کتنی ہی گہری اور وسیع ہوں لیکن اُن میں رحم یا مروّت نام کی کوئی چیز نہیں۔"

شیریں میٹھے اور دھیمے لہجے کو پسند کرتی تھی۔ وہ آزردہ ہو جاتی۔ اِس لئے نہیں کہ اُس کی قیافہ شناسی پر حرف آنے لگتا بلکہ محض اِس لئے کہ وہ رفیق کی سب جیسی سے واقف ہوتے ہوئے بھی اُسے کٹھور نہیں کہہ سکتی تھی۔ اُس کے نزدیک یہ بہت بڑا عیب تھا اور وہ رفیق کو محاسن کا مجسمہ ہی سمجھتی تھی۔ وہ رفیق کے دل میں ساری کائنات کو سمٹی ہوئی محسوس کرتی تھی اور اُس کے ہونٹوں کی اُس جنبش پر ہر چیز نثار کر سکتی تھی، جسے ایک غیر شعوری تبسّم کے سوا کچھ نہ کہا جا سکتا تھا۔ ثریا جمال اور شیریں دونوں رفیق کو پگھلانے کی سعی میں ناکام ہو چکی تھیں لیکن اُنھوں نے دل نہیں ہارا تھا۔ ایک بار وہ سانچی اسٹوپ دیکھنے گئیں۔ نازنین کو بھی اُس دلچسپ پروگرام میں شامل کرنے کی تجویز تھی لیکن اُس نے عین وقت پر انکار کر دیا۔ رفیق کو کسی نہ کسی طرح ساتھ چلنے پر راضی کر لیا تھا۔ قرارداد یہ تھی کہ اُس سے خوب کھُل کر باتیں کی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ

زندگی کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں کہ انسان کسی حسین و جمیل لڑکی کی حسین بانہوں کے نرم و گرم لمس میں کھو جائے اور زلفوں کی گھنیری چھاؤں میں جوانی کی دہکتی ہوئی دوپہر گزار دے۔ رفیق ساپنی کی تاریکی اور رومانی فضا میں اور زیادہ فرشتہ بن گیا۔ اس نے پہاڑی ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"مہاتما بدھ صرف اِس لئے عظیم ہیں کہ اُنھوں نے عورت اور اُس کے والہانہ حُسن سے مُنہ موڑ کر تجرّد کی زندگی بسر کی۔"

"ایسا نہیں ہے" ثریا اور شیریں ہم زبان ہو کر بولیں "مہاتما بدھ نے شادی کی تھی۔ وہ ایک بچّے کے باپ بھی تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُنھیں پھر ایک بار اِسی دُنیا کی سمت لوٹنا پڑتا جسے تیاگ کر وہ آبادی سے دُور جیون بتانے کی اُمنگ میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔"

ثریا نے اُس کے موڈ کو حد سے زیادہ سنجیدہ دیکھ کر بات کا رُخ دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی۔

"رفیق انجم! تمھاری سمندر جیسی آنکھوں میں محبت کی لہریں کیوں نہیں اُٹھتیں؟"

"ایسا نہ کہو" ثریا شیریں بولی "اِن کی رگ رگ میں نازنین بسی ہوئی ہے۔ تم اُس کا نام لے کر رفیق کی آنکھوں میں جھانکو تو یوں محسوس ہوگا جیسے جوار بھاٹا آ رہا ہے۔"

"ایسا سمجھنا غلط ہوگا ثریا!" وہ اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے کہتا۔ "میں ساپنی کے اِن خوبصورت مناظر کو دیکھ کر ہی از خود رفتہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اِن میں مہاتما بدھ کی مُسکراہٹیں بکھری نظر آتی ہیں اور اِس پہاڑی پر کھڑے ہوئے یہ کھرنیوں کے درخت اِتنے حسین دِکھائی دیتے ہیں کہ میں اِن کے ٹھنڈے سائے میں صرف جوانی ہی نہیں ساری عمر گزار دینے پر تیار ہوں!"

"ارے تم تو نرے بدھو ہو!" ثریا جمال چڑ کر بولی "کھرنی کے درختوں سے وہی پیار کر سکتے ہیں جن کی رگوں میں خون جم گیا ہو اور جن کے دل کی دھڑکنیں رُک گئی ہوں۔ پتھروں، پیڑوں اور ندیوں سے پریم نہیں کیا جاتا، اُن کی عزت کی جاتی ہے، محبت کی جاتی ہے شیریں ایسی ہرنیوں سے، جنھیں دیکھ کر پتھر بھی پگھل جاتے ہیں، پیڑ سرنگوں ہو جاتے ہیں اور ندیاں بہنا بھول جاتی ہیں۔"

"اور یہ کس نے کہا تم سے کہ میں شیریں کو یا تمھیں عزیز نہیں رکھتا؟"

"تمھاری سوئی ہوئی جوانی دن رات یہی کہتی ہے کہ میں کلاتی ہوئی چنگاری ہوں۔ اگر واقعی تمھارے اندر کوئی گرمی یا جذبہ ہے تو شیریں کو اپنا کیوں نہیں لیتے؟ وہ مورنی کی طرح خوبصورت ہے۔ اُس کی آنکھوں سے شراب چھلکتی ہے۔ وہ بال کھول کر دھوپ میں کھڑی ہو جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساون کی گھٹائیں اُمڈ آئی ہوں۔"

"لے توبہ کرو ثریا! اُسے تو میں اب تک بہن ہی سمجھتا رہا ہوں۔ تم نثر میں شاعری ضرور کرتی ہو لیکن انسانی جذبات کو نہ پہچاننا تمھارے پاس کوئی آرٹ نہیں۔ بہن کو اپنا بنا لینا کہاں کی شرافت ہے!"

"چھوڑو شیریں کو۔ نازنین موجود ہے۔ کبھی غور کیا اُس کے باریک اور سُرخ ہونٹوں میں کتنی کشش ہے اور اُس کی بادہ ریز آنکھوں میں کتنا سرور ہے۔ اُن کی ایک نگاہِ مستانہ فرشتہ کو بھی انسانی سطح پر لا سکتی ہے اور اُسے بھی جانے دو میری طرف دیکھو ـــــ؟" وہ شوخی اور بیباکی سے بولی "میں بھی اپنی جگہ ایک قیامت بہار اور طوفانِ رنگ و بو ہوں!"

رفیق انجم نے خلافِ عادت زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "میں قیامت سے بہت ڈرتا ہوں! اور بہار کا کیا ٹھکانا دو جانے کب رخصت ہو جائے۔ طوفان کو قید کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں ثریا۔ رہی نازنین تو وہ میرے دوست سہیل کی پسندیدہ لڑکی ہے۔ اُسے ٹیڈی ڈریس میں جکڑا ہوا نازنین کا جسم بہت اچھا لگتا ہے۔ میں اُس کی نسبت ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"پھر جاؤ بھاڑ میں! خدا کی مار تم پر!!" واپسی میں ثریا اور شیریں کا مُنہ لٹکا ہی رہا۔ کئی بار ثریا کا جی چاہا کہ رفیق کو گاڑی سے اُتار کر حکم دے۔

"پیدل آؤ شیریں کے چہیتے بھائی اور سہیل کی عزت و ناموس کے چوکیدار! قیامتوں سے مُنہ پھیر کر چلنے والے خوابیدہ انسان!!" لیکن جب اُس کی آگ برساتی ہوئی آنکھیں رفیق انجم کی طرف اُٹھ جاتیں تو غصّہ فوراً ٹھنڈا ہو جاتا۔ اُس کے چہرے پہ پھیلی ہوئی سادگی اور آنکھوں میں چمکتی ہوئی انسانیت اُسے ڈرا دیتی۔ اُس کا موڈ بدل جاتا۔ دل چاہتا، رفیق کے سامنے پیشانی جھکا کر معافی مانگ لے۔ پھر فوراً ہی وہ سوچنے لگتی۔ رفیق انجم میں کتنی کشش اور کتنا وقار ہے! وہ عجیب آدمی ہے۔ بشرطیکہ اُسے آدمی کہا جا سکے۔ اُس سے خفا ہو کر بھی اُسے پیار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ ایسا دیوتا ہے جو عمر بھر پجاریوں کو ستاتا ہے لیکن پھر بھی پیشانی اُسی کے سامنے جھکتی ہے۔

پھر کچھ ہی دنوں کے بعد ثریا اور شیریں کی شادی ہو گئی۔ اُنھوں نے اپنے وفادار شوہروں سے سمجھوتہ کر لیا جنھیں اُنھوں نے محض زندگی گزارنے کی خاطر زندگی کا ساتھی بنا لیا تھا۔ اب نازنین تنہا رہ گئی تھی۔ سرسبز شاخ پہ لگے ہوئے اُس نوشگفتہ پھول کی طرح جو اپنی نکہت کو آوارہ دیکھ کر اپنی مہک ہی سے شرمسار ہونے لگتا ہے۔ وہ اِس اعتبار

خوش قسمت تھی کہ بہت سے نوجوان اُسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ کبھی اُن کی جانب متوجہ ہو جائے لیکن نازنین کی منزل کا کسی کو علم نہ تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ رفیق انجم کو اپنا سنگ میل اور مینارۂ نور بنا چکی ہے اور چاہتی ہے کہ اُس میں کسی طرح بیداری، جنبش اور گداز پیدا ہو جائے۔ وہ جمال و رعنائی کے سحر سے متاثر ہو۔ اُس کے سینہ میں بھی وہ آگ جل اُٹھے جو ہر نوجوان کو اپنے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں لپیٹ لیا کرتی ہے لیکن رفیق کے اعصاب میں احساس کی چنگاری نہ جانے کہاں دبی پڑی تھی۔ اُس کا ہر جذبہ موت کی نیند سو رہا تھا۔ نازنین اُس کے کمرے میں داخل ہوتی تو وہ اپنے اوپر اور سنجیدگی طاری کر لیتا اور کوشش کرتا کہ اُس کے کسی سوال کا جواب نہ دینا پڑے۔ وہ پوچھتی۔

"کس سوچ میں ہو رفیق؟"

"کسی سوچ میں نہیں ہوں۔"

"کیا تنہائی میں بھی کچھ نہیں سوچا کرتے؟"

"مطلب کیا ہے تمھارا؟"

"مطلب ــــــ؟" نازنین جھینپ کر اُنگلیاں چٹخانے لگتی۔ اُس کا دَم گھٹنے لگتا۔ اُس کا جی چاہتا زور سے چیخ مار کر رو پڑے۔

"میں کبھی سوچتا ہوں تو صرف یہ کہ تم میری تنہائی میں اُمید کی کرن لے کر نہ آیا کرو۔ اندھیرا بن کر جب چاہو آ سکتی ہو۔ مجھے شوپنہار سے دلچسپی ہے۔ میری رائے میں خودکشی حیات کا بہترین انجام ہے۔ میں اپنے آپ کو ہلاک ہی کر رہا ہوں۔ ہمیشہ یوں ہی آپ اپنا گلا گھونٹتا رہوں گا۔"

نازنین سہم جاتی۔ اُس کی لمبی اور کالی پلکوں پر آنسوؤں کے شفاف موتی لرزنے لگتے۔

"خودکشی وہ کرتے ہیں رفیق! جنھیں جینے کی مٹھاس سے آگاہی نہیں ہوتی۔ تم چاہو تو زندگی کی لذت سے بہرہ یاب ہو سکتے ہو۔ شوپنہار پاگل تھا۔ وہ حیات کے حُسن اور اُس کی رعنائی سے واقف نہ تھا۔ زندگی درحقیقت ایسی شراب ہے جس کا ایک تلخ گھونٹ بھی کائنات کی ساری حلاوتوں پر بھاری ہے۔"

"نازنین! میرے سامنے زندگی کا نام نہ لو۔ میں اِسے گونگے کا خواب سمجھتا ہوں جو کبھی شرمندۂ الفاظ نہیں ہوتا۔ اُس کی کوئی تعبیر نہیں!"

نازنین کو اپنے متعلق پورا یقین تھا کہ وہ بے حد حسین اور دلکش نقوش کی مالک ہے۔ اُس کے جو ساتھی شعر کہنا جانتے تھے، اُسے ایک ایسی نظم سے تعبیر کرتے تھے جو خیال، زبان اور مقصد کے لحاظ سے قطعی مکمل تھی! وہ ایسی رباعی تھی جس میں خیام کی ایرانی شراب بھری ہوئی تھی۔ وہ سچ مچ ایک رومانی مثنوی تھی۔ اُس کا درجہ کسی طرح سحر البیان سے کم نہ تھا۔ وہ اُس وقت تک ہاتھ پاؤں مارتی رہی جب تک شیا اور شیریں ماں نہ بن گئیں۔ اُن کی گود آباد دیکھ کر نازنین کو ایسا محسوس ہوتا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گھر گئی ہو۔ کہیں اُمید کا ستارہ جھلملاتا دکھائی نہ دے رہا تھا۔

ایک دن نازنین نائیلون کی ساڑی پہنے اسٹوو کے قریب بیٹھی ہوئی کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ دفعتاً ساڑی میں آگ لگ گئی اور اُس کی خوبصورت پنڈلیاں جو آرٹ کا ذوق رکھنے والوں کے نزدیک کلائیوں سے بھی زیادہ جاذبِ نظر تھیں، جھلس گئیں۔ ڈیڑھ مہینے تک وہ ایک نرسنگ ہوم میں رہی۔ جس دن وہ اچھی ہو کر گھر آئی تو اچانک رفیق انجم اُس سے ملنے آ گیا۔ اُس نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا تم جل گئی ہو۔ چند روز تک سوچتا رہا کہ جل بھُن کر راکھ کیوں نہ ہو گئیں۔ نازنین تمھارے جلنے کی خبر سے پہلی بار میرے شعور میں جلن ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ تم خودکشی کرنا چاہتی تھیں۔ میں دانستہ تمھیں پوچھنے نہیں آیا۔ آج سوچا کہ آگ میں جلی ہو۔ دو چار گھنٹے کشتی میں بٹھا کر دریا کی سیر ہی کرا دوں۔ کشتی لے آیا ہوں، آؤ ذرا دیر کو جی بہل جائے گا۔"

نازنین بغیر کسی عذر کے رفیق کے ساتھ ہو گئی۔ دونوں دیر تک پانی کی موجوں کو تکتے رہے۔

"نازنین!" رفیق انجم گھُٹی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرا خیال صحیح نہیں تھا کہ زندگی گونگے کا خواب ہے۔ وہ ایک بولتی ہوئی رنگین اور متحرک فلم ہے لیکن....."

نازنین چونک گئی۔ وہ سوچنے لگی نہ جانے رفیق آگے کیا کہنے والا ہے۔ "لیکن نازنین سب کی زندگی ایسی نہیں۔ بعض لڑکیوں کی زندگی ایک ایسا سپنا ہے جس کی کوئی تعبیر انھیں نہیں مل سکتی اور جب تک ایسی لڑکیاں دُنیا میں موجود ہیں۔ میں اپنی محبوب دوشیزہ نازنین کو بیوی نہیں بنا سکتا۔ میری اپنی بہن افروز دونوں آنکھوں سے محروم ہو چکی ہے۔ وہ سچ مچ گونگے کا خواب بن کر رہ گئی ہے۔ کوئی نوجوان اُسے اپنانے کو تیار نہیں اور جب تک وہ کسی کی نہ ہو جائے میں تم سے الگ ہی رہنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ افروز کی خاطر میں اِسی طرح خودکشی کرتا رہوں گا ــــــ آؤ تمھیں کنارے پر پہنچا دوں تم اپنا نصب العین تلاش کر لو۔ میرے پیچھے نہ دوڑو۔ میرا کوئی وجود نہیں۔ میں صرف ایک سایہ ہوں!"

غزل

عشق کو زندگی بناتا ہے — غم و شادی تو اِک بہانا ہے
تیری فُرقت میں تا بہ کے روئیں — زندگی کو بھی مُنھ دکھانا ہے
اشکِ غم روک کر گلے مل لو — کہ بہت دُور مُجھ کو جانا ہے
تیری محفل میں دیر سے چُپ ہوں — مجھ کو اِک ماجرا سُنانا ہے
اب بہانوں کا وقت ختم ہوا — میرے پاس آج تم کو آنا ہے
چشمِ قاتل اِدھر بھی ایک نظر — مجھ کو بھی ایک زخم کھانا ہے
رہ گئی زندگی دُھواں ہو کر — یہ جلانا کوئی جلانا ہے
ہر پلک پر رُکے رُکے آنسو — کس قدر دُکھ بھرا زمانا ہے
سُننے والا نہ ہو تو کس سے کہیں — خامشی بھی تو اِک ترانا ہے
آزمایش ہے آج اپنی بھی — آج تجھ کو بھی آزمانا ہے
خود کو جب زندگی نے پہچانا — تیرے غم کا وہی زمانا ہے
مُجھ پر احسان کس مُسپری کا — اب تو بیگانہ بھی یگانا ہے
آج بے باق ہے حسابِ حیات — کچھ نہ دینا ہے، کچھ نہ پانا ہے
تھا محبت کا کاروبار جہاں — اب سیاست کا کارخانا ہے
ہے نشاطِ حیات نم دیدہ — تیرے غم کا کوئی ٹھکانا ہے
ہدفستاں جہانِ موجودات — ناوکِ ناز کا نشانا ہے
منتیں ہیں شکستہ پائی کی — کہیں آنا ہے اب نہ جانا ہے
سرِ ظُلمت سرائے ارض و سما — مجھ کو بھی اِک دیا جلانا ہے
دوستو! سازِ کائنات اُٹھاؤ — آج مجھ کو غزل سُنانا ہے
ہم صفیرو! اِس اُجڑے گلشن میں — کہیں میرا بھی آشیانا ہے
آئیے واقفانِ رازِ جہاں — مُجھے کچھ آپ کو بتانا ہے

سہمی سہمی سی زندگی ہے فراق
آج بھی ہائے کیا زمانا ہے

افسانہ

کانچ کی دُنیا

پُشکرناتھ، بی۔ اے

معرفت ہیڈ کیشئر، اسٹیٹ بنک آف انڈیا۔ جموں (توی)

۲۵۔ جنوری ۹۶ء   برادرِ محترم! آداب و نیاز

. . "کانچ کی دُنیا" اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی ـــــــ اب کی بار سالنامہ ایک مہینہ کے بعد ملا اور وہ بھی ریپر کے بغیر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کوئی پہلے اپنی پیاس بُجھاتا ہے، پھر جام آگے بڑھاتا ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ جام آگے بڑھاتا ہے، اگر نہ بڑھاتا تو کوئی کیا کرتا ـــــــ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ کرشن چندر صاحب کا ناول "بیسویں صدی" میں قسط وار آرہا ہے۔ اب تو ہر شمارے کا بے تابی سے انتظار رہے گا . . .

خیر اندیش ـــــــ پُشکر ناتھ

اُس کا نام مادھوی تھا اور اُس کی ایک الگ سی زندگی تھی۔ عجب نے کیسی زندگی تھی۔ کیونکہ کسی نے اُس کی زندگی کے پہلے باب نہیں پڑھے تھے۔ کلب کے ہر ممبر نے صرف وہی صفحہ دیکھا تھا جو اُس کے سامنے کُھلا ہوا تھا۔ ہر ممبر اُسی عبارت سے آشنا تھا جو اِس کُھلے ہوئے صفحے پر لکھی تھی ـــــــ اِس کے بعد یہ کتاب میری آنکھوں کے سامنے آئی اور میں نے ایک بڑی غلطی کی جو اِس کتاب کو شروع سے پڑھنا چاہا کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اِس طلسمی کتاب کے ساتھ یہ بددعا وابستہ ہے کہ جو کوئی صفحہ پلٹ کر دیکھے گا، اُس کا اپنا صفحہ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔

میں اُنہی دنوں سن رائز کلب کا ممبر بنا تھا۔ سن رائز کلب میں فلیش کھیلی جاتی تھی اور میں فلیش کھیلنے کا دلدادہ ہوں۔ اِس سے پہلے کہ آپ میرے بارے میں کوئی رائے قائم کریں، میں اپنا تعارف پیش کرتا ہوں۔ نئی مارکیٹ کی چودہ نمبر دُکان آپ نے ضرور دیکھی ہوگی، کیونکہ یہی ایک کیوریو شاپ اس ساری مارکیٹ میں ہے۔ آپ چاہیں تو اسے کباڑیے کی دُکان بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اِس لفظ سے مجھے نفرت ہے۔ دُکان نہایت نفیس انداز سے سجائی گئی ہے اور یہی سجاوٹ اِس دکان کا کُل اثاثہ ہے ورنہ تمام کیوریو تو انگریزوں کے ساتھ ہی سدھار گئے ہیں۔ کبھی کوئی جاہل لیکن دولت مند سیٹھ اِس دُکان میں داخل ہو کر لارڈ کلایو کی پائپ یا بادشاہ کا سماوار یا یوسف شاہ چک کا زرکاری والا پیزار یا تانتیا توپے کے گھوڑے کی لگام بڑی منت سماجت کے بعد اور کوئی تین چار ہندسوں والی رقم ادا کر کے باہر آتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر اِس دُکان میں مکھیاں ہی بھنبھنایا کرتی ہیں۔ بندہ اِسی دکان کا پروپرائٹر ہے۔ اپنی دُکان کے لئے بے وقوف گاہک فراہم کرنے کے لئے میں شہر کے تقریباً سارے کلبوں کا ممبر تھا اور کلبوں کی ممبری نے مجھے فلیش کھیلنے کی طرف راغب کیا تھا۔ ویسے سودا مہنگا بھی نہ تھا کیونکہ فلیش کھیلنے میں مجھے قدرے مہارت حاصل ہو گئی تھی اور عام طور پر کلبوں کی فیس اور دوسرے اخراجات کے لئے پیسے مجھے اِسی شغل سے ملتے تھے۔ اِس لئے آپ اِسے میرا سائڈ پروفیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِس لفظ پر میں ناراض نہیں ہوں گا۔ کیونکہ سائڈ پروفیشن کے بغیر آج کل مہنگائی کے زمانے میں گزارا مشکل ہے۔ اِسی لئے اسکول ماسٹر کا سائڈ پروفیشن ٹیوشن پڑھانا ہے، آرٹسٹ کا سائڈ پروفیشن سائن بورڈ پینٹ کرنا ہے، کلرک کا سائڈ پروفیشن رشوت لینا ہے، لیڈر کا سائڈ پروفیشن منسٹر بننا ہے، ایکٹرس کا سائڈ پروفیشن صابن اور تیل کے اشتہاروں کا ماڈل بننا ہے۔

بہرحال! سن رائز کلب میں میں اپنے سائڈ پروفیشن میں مشغول تھا کہ مادھوی سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے وہ بھی اُسی ٹیبل پر کھیل رہی تھی، جس پر میں کھیل رہا تھا اور اُس نے ایک دو ہاتھ ایسے جمائے کہ اپنی مہارت پر سے میرا ایمان اُٹھنے لگا۔

میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ تنگ پائنچوں والی ململ کی شلوار، ڈھول پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنگ قمیص۔ بالوں کا اسٹائل دل موہ لینے والا۔ ایک ہمہ پری معلوم ہوتی تھی۔ جب ہنستی تھی تو دونوں گالوں پر گڑھے بن جاتے تھے۔ اِن گڑھوں ... میں فارسی شاعروں نے دیوانوں کے دیوان مرتب کئے ہیں۔ میری سوچ کے مطابق تو یہ بھی ایک کیوریو تھا۔ گلستان بوستان کے زمانے کا کیوریو۔ اطلس میں لپٹا ہوا۔

دوسرے دن بھی اُس کے ساتھ کھیل ہوا اور میں ہار گیا۔ تیسرے دن بھی اُس نے چند ہاتھ جما کے مجھے اپنی مہارت کا گرویدہ بنا لیا۔

اُس شام میں نے ایک بیرے سے پُوچھا "یہ کون ہے؟"

"مادھوی!"

"وہ تو میں جانتا ہوں کہ اِس کا نام مادھوی ہے۔ آگے پیچھے کی کوئی تاریخ ——؟"

"ہٹاؤ یار! تاریخ جان کر کون سا امتحان دینا ہے"

چوتھے روز میں نے مادھوی کو ایلیپس میں ڈنر کی دعوت دی جو بغیر کسی جھجک کے قبول کر لی گئی اور پہلی ملاقات کے پُورے دس دن کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ مادھوی کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرنی ہیں اور دوسرا یہ کہ مادھوی کے ساتھ جلد از جلد شادی کرنی ہے۔ اب آپ سے کیا چُھپانا، اِس فیصلے میں محبت کو کم اور مصلحت اور بزنس کو زیادہ دخل تھا کیونکہ میرے اندازے کے مطابق مادھوی کو لائف پارٹنر بنانے میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ایک تو وہ دُکان پر میری مدد کر سکتی تھی۔ انگریزی فرفر بولتی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور دُنیا داری کی ماہر تھی اور دوسرے یہ کہ کلب میں فلیش بھی کھیل سکتی تھی اور اِس معاملے میں میری اور اُس کی مہارت کافی مدد دے سکتی تھی۔

آج کل کی دُنیا میں آدمی Matter of fact نہ ہو تو زندہ رہنا مشکل ہے۔ اور اگر زندہ رہے گا بھی تو لاکھوں سفید کالروں کی طرح بے ڈھب، بے رنگ و بو اور بے مزہ زندگی گزارے گا۔ میرے لئے ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔

پلان کے مطابق کام شروع ہوا اور پہلا مرحلہ طے ہوا۔ یعنی مادھوی کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہو گئیں۔ اطلاع کے مطابق مادھوی ایک اسکول ماسٹر کی بیٹی تھی۔ نرسنگ ہوم میں بطور نرس کام کرتی تھی اور پانچ بجے کے بعد اُس نے اپنی پُرانی زندگی کا لبادہ اُتار دینے کے لئے ایک دوسری زندگی کا ڈریس پہنا تھا۔ یعنی مادھوی ایک ہی وقت میں دو زندگیاں گزارتی تھی۔ ایک غریب نرس کی زندگی، جس میں وہ محبت کا پیکر بن کر مریضوں کے تپتے ماتھے پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھتی تھی، اُن کے زخموں کی ٹیس کو، درد کو، کرب ناکی کو اپنی میٹھی، پیاری اور کومل مُسکراہٹ میں نہلا دُھلا کر اُن کے لئے ایک سہارا تیار کرتی تھی اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتی تھی ——— دوسری ایک شوخ و شنگ تتلی کی زندگی، جس میں وہ جدید فیشن کے قیمتی کپڑے پہن کر ہر شام ٹیکسی میں بیٹھ کر سن رائز کلب میں آتی تھی اور فلیش کھیلتی تھی، ٹونسٹ کرتی تھی، بیئر پیتی تھی اور دو تین گھنٹے تفریح کر کے گھر چلی جاتی تھی۔ اُس گندے سے، تنگ چھوٹے سے مکان میں، جہاں اُس کی اَستانی ماں دن بھر کی تھکان سے چُور اُس کا انتظار کرتی رہتی تھی۔

یہ بھی اطلاع ملی کہ مادھوی نے کبھی ماں کو شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا اور اُس نے جو اپنی ماں کو ایک بھروسہ دیا تھا کہ وہ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اُٹھائے گی جس سے لوگوں سے نظریں چُرانا پڑیں، اُس نے وہ بھروسہ اور اعتماد بھی قائم رکھا تھا۔

میرے لئے یہ اطلاعات حیرت کی بات نہ تھیں۔ کیونکہ آج کل بیشتر انسان دو دو بلکہ تین تین زندگیاں بیک وقت گزارتے ہیں۔ اِسی لئے ایک پنواڑی بیک وقت پنواڑی بھی ہوتا ہے، سمگلر بھی اور اپنے محلّے کا پریزیڈنٹ بھی ہوتا ہے۔ یا ایک افسر بیک وقت سرکاری ملازم بھی ہوتا ہے اور کسی پرائیویٹ کمپنی کا پارٹنر بھی۔ یا ایک سادھو بیک وقت مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے اور بردہ فروش بھی!

اِس لئے مجھے مادھوی کی دوہری شخصیت کے بارے میں جان کر کوئی تعجب نہیں ہوا۔

اور ایک دن، جب میں نے اُسے نیاگرا میں ڈنر پر مدعو کیا تھا، میں نے اپنا مدعا اُس کے سامنے پیش کیا۔ یعنی اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہش ظاہر کی۔ اُسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ وہ نہایت سکون کے ساتھ کھانا کھاتی رہی۔ اُس نے کوئی بات نہ کی۔ میں بھی خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ پھر کافی آئی۔ اُس نے میرے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ دو چار ہلکے سے کش لے کر اُس نے میری طرف دیکھا۔

"آپ کا تعارف کیا ہے؟"

میں اِس سوال پر چونک پڑا۔

"تعارف ——؟" میں نے اُس سے پُوچھا۔

"تعارف سے میری مُراد ہے آپ کا بزنس، آپ کی اسٹینڈنگ وغیرہ وغیرہ ——"

"ارے ہاں! آپ کو یہ سوال کرنے کا اور اِس کا جواب پانے کا حق ہے ——"

افسانہ

کانچ کی دُنیا

پُشکرناتھ، بی۔ اے

معرفت ہیڈ کیشئر، اسٹیٹ بنک آف انڈیا۔ جموں (توی)

۲۵ر جنوری ۶۶ء   برادرِ محترم! آداب و نیاز

. . "کانچ کی دُنیا" اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی ——— اب کی بار رسالہ ایک مہینہ کے بعد ملا اور وہ بھی ریپر کے بغیر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کوئی پہلے اپنی پیاس بجھاتا ہے، پھر جام آگے بڑھاتا ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ جام آگے بڑھاتا ہے، اگر نہ بڑھاتا تو کوئی کیا کرتا ——— یہ جان کر مسرت ہوئی کہ کرشن چندر صاحب کا ناول "بیسویں صدی" میں قسط وار آرہا ہے۔ اب تو ہر شمارے کا بے تابی سے انتظار رہے گا . . .

خیراندیش ——— پُشکرناتھ

اُس کا نام مادھوی تھا اور اُس کی ایک الگ سی زندگی تھی۔ جانے کیسی زندگی تھی۔ کیونکہ کسی نے اُس کی زندگی کے پہلے باب نہیں پڑھے تھے۔ کلب کے ہر ممبر نے صرف وہی صفحہ دیکھا تھا جو اُس کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ ہر ممبر اُسی عبارت سے آشنا تھا جو اس کھُلے ہوئے صفحے پر لکھی تھی ——— اس کے بعد یہ کتاب میری آنکھوں کے سامنے آئی اور میں نے ایک بڑی غلطی کی جو اس کتاب کو شروع سے پڑھنا چاہا کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس طلسمی کتاب کے ساتھ یہ بد دعا وابستہ ہے کہ جو کوئی صفحہ پلٹ کر دیکھے گا، اُس کا اپنا صفحہ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔

میں اُنہی دنوں سن رائز کلب کا ممبر بنا تھا۔ سن رائز کلب میں فلیش کھیلی جاتی تھی اور میں فلیش کھیلنے کا دلدادہ ہوں۔ اِس سے پہلے کہ آپ میرے بارے میں کوئی رائے قائم کریں، میں اپنا تعارف پیش کرتا ہوں۔ نئی مارکیٹ کی چودہ نمبر دُکان آپ نے ضرور دیکھی ہوگی، کیونکہ یہی ایک کیوریو شاپ اس ساری مارکیٹ میں ہے۔ آپ چاہیں تو اِسے کباڑئے کی دُکان بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اِس لفظ سے مجھے نفرت ہے۔ دُکان نہایت نفیس انداز سے سجائی گئی ہے اور یہی سجاوٹ اِس دکان کا کُل اثاثہ ہے ورنہ تمام کیوریو تو انگریزوں کے ساتھ ہی سدھار گئے ہیں۔ کبھی کوئی جاہل لیکن دولت مند سیٹھ اِس دُکان میں داخل ہوکر لارڈ کلایو کی پائپ یا بادشاہ کا سماوار یا یوسف شاہ چک کا زرکاری والا پیزار یا تانتیا توپے کے گھوڑے کی لگام بڑی منت سماجت کے بعد اور کوئی تین چار ہندسوں والی رقم ادا کرکے باہر آتا ہے۔ ورنہ زیادہ تر اِس دُکان میں مکھیاں ہی بھنبھنایا کرتی ہیں۔ بندہ اِسی دکان کا پروپرائٹر ہے۔ اپنی دُکان کے لئے بے وقوف گاہک فراہم کرنے کے لئے میں شہر کے تقریباً سارے کلبوں کا ممبر تھا اور کلبوں کی ممبری نے مجھے فلیش کھیلنے کی طرف راغب کیا تھا۔ ویسے سودا مہنگا بھی نہ تھا کیونکہ فلیش کھیلنے میں مجھے قدرے مہارت حاصل ہوگئی تھی اور عام طور پر کلبوں کی فیس اور دوسرے اخراجات کے لئے پیسے مجھے اِسی شغل سے ملتے تھے۔ اِس لئے آپ اِسے میرا سائڈ پروفیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِس لفظ پر میں ناراض نہیں ہوں گا۔ کیونکہ سائڈ پروفیشن کے بغیر آج کل مہنگائی کے زمانے میں گزارا مشکل ہے۔ اِسی لئے اسکول ماسٹر کا سائڈ پروفیشن ٹیوشن پڑھانا ہے، آرٹسٹ کا سائڈ پروفیشن سائن بورڈ پینٹ کرنا ہے، کلرک کا سائڈ پروفیشن رشوت لینا ہے، لیڈر کا سائڈ پروفیشن منسٹر بننا ہے۔ ایکٹریس کا سائڈ پروفیشن صابن اور تیل کے اشتہاروں کا ماڈل بننا ہے۔

بہرحال! سن رائز کلب میں، میں اپنے سائڈ پروفیشن میں مشغول تھا کہ مادھوی سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے وہ بھی اُسی ٹیبل پر کھیل رہی تھی، جس پر میں کھیل رہا تھا اور اُس نے ایک دو ہاتھ ایسے جمائے کہ اپنی مہارت پر سے میرا ایمان اُٹھنے لگا۔

میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ تنگ پائنچوں والی ماڈرن شلوار ڈھیلی پر
سینے چپکے ہوئے قمیص کی طرح تنگ تھیں۔ بالوں کا اسٹائل دل موہ لینے والا۔ ایک
بہت پیاری معصوم ہوتی تھی۔ ہنستی تھی تو دونوں گالوں پر گڑھے بن جاتے تھے۔ ان گڑھوں
کے بارے میں فارسی شاعروں نے دیوانوں کے دیوان مرتب کئے ہیں۔ میری سمجھ کے
مطابق تو یہ بھی ایک کیوریو تھا۔ گلستان بوستان کے زمانے کا کیوریو۔ اطلس میں
لپٹا ہوا۔

دوسرے دن بھی اُس کے ساتھ کھیل ہوا اور میں ہار گیا۔ تیسرے دن
بھی اُس نے چند ہاتھ جما کے مجھے اپنی مہارت کا گرویدہ بنا لیا۔

اُس شام میں نے ایک ممبر سے پوچھا: "یہ کون ہے؟"

"مادھوی!"

"وہ تو میں جانتا ہوں کہ اِس کا نام مادھوی ہے۔ آگے پیچھے کی کوئی
تاریخ ——؟"

"چھوڑو یار، تاریخ جان کر کون سا امتحان دینا ہے۔"

چوتھے روز میں نے مادھوی کو امپیریل میں ڈنر کی دعوت دی جو بغیر کسی
ہچکچاہٹ کے قبول کر لی گئی اور پہلی ملاقات کے پُورے دس دن کے بعد میں نے فیصلہ
کیا کہ مجھے دو کام کرنے ہیں۔ ایک یہ کہ مادھوی کے بارے میں تمام معلومات حاصل
کرنی ہیں اور دوسرا یہ کہ مادھوی کے ساتھ جلد از جلد شادی کرنی ہے۔ اب آپ سے
کیا چھپانا، اس فیصلے میں محبت کو کم اور مصلحت اور بزنس کو زیادہ دخل تھا کیونکہ میرے
اندازے کے مطابق مادھوی کو لائف پارٹنر بنانے میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ایک تو
یہ کہ وہ دُکان پر میری مدد کر سکتی تھی۔ انگریزی فر فر بولتی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور دُنیاداری
میں ماہر تھی اور دوسرے یہ کہ کلب میں فلیش بھی کھیل سکتی تھی اور اِس معاملے میں
میری اور اُس کی مہارت کافی مدد دے سکتی تھی۔

آج کل کی دُنیا میں آدمی *Matter of fact* نہ ہو تو زندہ رہنا مشکل ہے۔
اور اگر زندہ رہے گا بھی تو لاکھوں سفید کالروں کی طرح بے ڈھب، بے رنگ و بو
اور بے مزہ زندگی گزارے گا۔ میرے لئے ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔

پلان کے مطابق کام شروع ہوا اور پہلا مرحلہ طے ہوا۔ یعنی مادھوی کے
بارے میں تمام معلومات حاصل ہو گئیں۔ اطلاع کے مطابق مادھوی ایک اسکول
ماسٹر کی بیٹی تھی۔ نرسنگ ہوم میں بطور نرس کام کرتی تھی اور پانچ بجوں کے بعد
اُس نے اپنی پُرانی زندگی کا لبادہ اُتارنے کے لئے ایک دوسری زندگی کا ڈریس پہنا
تھا۔ یعنی مادھوی ایک ہی وقت میں دو زندگیاں گزارتی تھی۔ ایک غریب نرس کی
زندگی۔ جس میں وہ محبت کا پیکر بن کر مریضوں کے تپتے ماتھے پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ
رکھتی تھی، اُن کے زخموں کی ٹیس کو، درد کو، کرب ناکی کو اپنی میٹھی، پیاری اور کومل
مُسکراہٹ میں نہلا دُھلا کر اُن کے لئے ایک سہارا تیار کرتی تھی اور ڈیڑھ سو روپیہ
ماہانہ تنخواہ پاتی تھی —— دوسری ایک شوخ و شنگ تتلی کی زندگی، جس میں وہ
جدید فیشن کے قیمتی کپڑے پہن کر ہر شام ٹیکسی میں بیٹھ کر سن رائز کلب میں آتی تھی
اور فلیش کھیلتی تھی، ٹوئسٹ کرتی تھی، بیئر پیتی تھی اور دو تین گھنٹے تفریح کر کے گھر
چلی جاتی تھی۔ اُس گندے سے، ٹوٹے پھوٹے سے مکان میں، جہاں اُس کی اپاہج ماں
دن بھر کی تھکان سے چُور اُس کا انتظار کرتی رہتی تھی۔

یہ بھی اطلاع ملی کہ مادھوی نے کبھی ماں کو شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا
اور اُس نے جو اپنی ماں کو ایک بھروسہ دیا تھا کہ وہ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اُٹھائے گی
جس سے لوگوں سے نظریں چُرانا پڑیں، اُس نے وہ بھروسہ اور اعتماد بھی قائم
رکھا تھا۔

میرے لئے یہ اطلاعات حیرت کی بات نہ تھیں۔ کیونکہ آج کل بیشتر انسان
دو دو بلکہ تین تین زندگیاں بیک وقت گزارتے ہیں۔ اِسی لئے ایک پنواڑی بیک وقت
پنواڑی بھی ہوتا ہے، سمگلر بھی اور اپنے محلے کا پریزیڈنٹ بھی ہوتا ہے۔ یا ایک افسر
بیک وقت سرکاری ملازم بھی ہوتا ہے اور کسی پرائیویٹ کمپنی کا پارٹنر بھی۔ یا ایک
سادھو بیک وقت مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے اور بردہ فروش بھی!

اِس لئے مجھے مادھوی کی دوہری شخصیت کے بارے میں جان کر کوئی
تعجب نہیں ہوا۔

اور ایک دن، جب میں نے اُسے نیاگرا میں ڈنر پر مدعو کیا تھا، میں نے
اپنا مدعا اُس کے سامنے پیش کیا۔ یعنی اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی خواہش
ظاہر کی۔ اُسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ وہ نہایت سکون کے ساتھ کھانا کھاتی رہی۔ اُس نے
کوئی بات نہ کی۔ میں بھی خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ پھر کافی آئی۔ اُس نے میرے
سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ دو چار ہلکے کش لے کر اُس نے
میری طرف دیکھا۔

"آپ کا تعارف کیا ہے؟"

میں اِس سوال پر چونک پڑا۔

"تعارف ——؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

"تعارف سے میری مُراد ہے آپ کا بزنس، آپ کی اسٹینڈنگ
وغیرہ وغیرہ ——"

"ارے ہاں! آپ کو یہ سوال کرنے کا اور اِس کا جواب پانے کا
حق ہے ——"

میں اُس کی صاف گوئی سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے اُسے اپنے بارے میں بتایا۔ میں ایک کیوریو شاپ کا مالک ہوں جس میں اگر دیکھا جائے تو چند سو روپوں کا مال ہے لیکن جس کی قیمت چکانے والا مل جائے تو ہزاروں بلکہ لاکھوں ہو سکتی ہے! اور یہ کہ میں روزمرہ کے اخراجات فلیش کھیل کر پورے کرتا ہوں۔ کبھی کبھی ہارتا بھی ہوں لیکن زیادہ تر میری قسمت اس معاملے میں مجھ پر مہربان ہی رہتی ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس دو بینک اکاؤنٹ ہیں۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ میں جس مکان میں رہتا ہوں، وہ سات پشتوں سے ہمارا آبائی مکان ہے اور بظاہر بوسیدہ خستہ حالت میں ہے۔ باہر سے تو اُس کی طرف دیکھ کر اُبکائی آتی ہے لیکن اندر میں نے اُس کے چند کمروں کو بہت نفاست سے سجایا ہے۔

"اور تم شاید نہیں جانتیں کہ میں نے یہ سب حقیقتیں تم پر اِس لئے ظاہر کی ہیں کیونکہ مجھے تمہاری حقیقتوں کا علم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک مثالی زندگی گزار سکتے ہیں۔"

اُس نے ایک اور سگریٹ جلایا لیکن جلد ہی اُسے ایش ٹرے میں مروڑ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ ہم دونوں مل کر ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہیں — کیا آپ مجھے گھر تک چھوڑنے آئیں گے؟"

"ضرور! لیکن تم نے بات ادھوری چھوڑ دی؟ میرے پھیلے ہوئے ہاتھ کو جواب کی ضرورت ہے۔"

"میرا خیال ہے، مجھے اِس ہاتھ کو تھام لینا چاہئے۔ پھر بھی میں چاہتی ہوں، تنہائی میں اپنے دل سے مشورہ کرلوں۔"

"یہی تو بہت بڑی غلطی ہے۔ آج کل مشورہ دل سے نہیں دماغ سے لیا جاتا ہے۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور میں اُسے ٹیکسی میں بٹھا کر گھر پر چھوڑ آیا۔

اُس رات جب میں گھر پہنچا تو میرے دل میں اُمنگیں جاگ اُٹھیں۔ اِن اُمنگوں کو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک عجیب طرح کا اُمید و بیم کا سا احساس میرے اندر جاگ اُٹھا اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میرے اندر کے شوکیس میں جو جگہ مدت سے خالی تھی، اُس کے لئے میں نے کبھی کوئی کیوریو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہائے! یہ شوکیس کب سے خالی تھا! اور اچانک غیر ارادی طور پر میں نے مادھوی کو اِس شوکیس میں رکھا۔ اندر کی کایا ہی بدل گئی۔

میں کیسا کیوریو ڈیلر ہوں۔ جس نے اِس قدیم، نایاب اور بے قیمت کیوریو کو نظر انداز کیا تھا — محبت!"

وہ رات میں نے بے قراری میں گزار دی۔ دوسرا دن بھی بے قراری کے عالم میں گزارا۔ شام کو کلب پہنچا تو ایک عجیب طرح کے انکشاف نے چونکا دیا اور ایسے میں میرے اندر کا بزنس مین مر گیا۔ زندگی کا سارا فلسفہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ صرف ایک جذبہ باقی رہا۔ محبت کا جذبہ! اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں مادھوی کو کبھی کلب میں تاش نہ کھیلنے دوں گا، نہ کبھی دکان پر کام کرنے دوں گا۔ اُسے تو میں دل کے اندر والے شوکیس میں چھپا کے رکھوں گا — کسی ان جانے ارمان کی طرح!

تیسرے دن مادھوی میری دکان پر آئی۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ آتے ہی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُمید و بیم کے چند جان لیوا لمحے گزر گئے۔

"میں نے ماں سے مشورہ کیا ہے۔ اُس نے میری اپنی پسند منظور کرنا قبول کر لیا ہے۔"

اُس نے چہک کر کہا۔ میرے ہاتھ پاؤں خوشی سے پھول گئے۔ پھر ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زندگی کا خاکہ تیار کیا۔ ہر بات تفصیل سے طے کی۔ شادی عدالت میں ہوگی۔ شام کو سن رائز کلب میں ایک چھوٹی سی پارٹی ہوگی۔ پھر ہنی مون کے لئے پہلگام جائیں گے۔ ہائے! کتنی خوبصورت زندگی کے خد و خال ہمارے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے اُبھرنے لگے۔

"مجھے ایک کپا ونڈر سے محبت تھی —" اُس نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا۔

"لیکن اُس کے ساتھ میں شادی نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ مجھے ایک بے رنگ سی، بے ڈھب سی، بے جان سی زندگی پسند نہیں۔ ایک معمولی کمپاؤنڈر کے ساتھ مجھے اور کیا ملتا — آج میں اُسے اپنا آخری فیصلہ سنا کر یہاں آئی ہوں۔"

میری بات سن کر اُس کے ہاتھ سے دوا کی شیشی گر کر چور چور ہو گئی اور وہ کانچ کے ٹکڑوں کو بہت احتیاط سے چنتا رہا۔ جیسے اپنے دل کے ٹکڑے چن رہا ہو۔"

مادھوی نے یہ کہہ کر ایک قہقہہ لگایا۔ جانے کیوں یہ قہقہہ سن کر میں چونک سا اُٹھا۔

"یہ باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ آدمی کو بہت سی باتوں کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔"

"ہاں تو اور کیا؟ پگلا! کانچ کے ٹکڑوں کو بہت احتیاط سے چنتا رہا۔ زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔"

[illegible] رس بار کے [illegible] شریک
ہوا تھا۔

"[illegible] یہ لوگ بہت جذباتی ہوتے ہیں۔"

"کیا [illegible] ہوگا [illegible] میں بھی کیا ذکر لے بیٹھی۔ میں نے مان
کر [illegible] شادی [illegible] ہوگی۔ کوئی پنڈت نہ ہوگا، کوئی آتش بازی
ہوگی ـــ وہ ـــ وہ کپاؤنڈر تو یہ شب [illegible] کے خواب دیکھتا تھا۔ پگلا کا کہیں کے
[illegible] کو ایسے چھپاتا رہا جیسے دل کے ٹکڑے ہوں ـــ"

[illegible] کو تو مادھوی نے ایک اور قہقہہ مارا۔ ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں
آنسو آگئے۔

"ہاں ڈارلنگ! پھر دوسرے ہی دن سویرے ہم [illegible] جائیں گے۔ خود خود
گھوڑوں پر بیٹھ کر سیر کریں گے۔ کھلے آسمان کے نیچے پیار کا ایک گھروندا تیار
کریں گے۔"

"ہائے! اُس پیار کے گھروندے میں ہمارے بچے کھیلیں گے ـــ اور ـــ
چاندنی راتوں میں ندی کے کنارے ہم سنگریزے چنتے چنتے وہیں سنگریزوں ہی کے
بیچ سو جائیں گے۔ وہ ـــ وہ کپاؤنڈر تو نرسنگ ہوم میں کبھی کبھی میرا انتظار کرتے
کرتے وہیں بنچ پر سو جاتا تھا۔"

"ڈارلنگ! چھوڑو اب اُس کپاؤنڈر کی باتیں!"

"ہنس اُٹھی۔ وہ پگلا انسان سے ایک منظر ہی بنا۔ [illegible] چپ چاپ کاغذ کے
ٹکڑے چھپاتا رہا ـــ"

مادھوی نے ایک اور قہقہہ لگایا اور دوسرے لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں حیران اور ششدر اُس عجیب سی لڑکی کو دیکھتا رہا۔

"پگلا کہیں کا! نروس ٹائپ۔ بزدل" ہاتھ سے گر گئی اور پھر چپ چاپ
[illegible] ـــ

روتے روتے ہی وہ کہتی جا رہی تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔

"مادھوی!" میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ وہ رُک گئی اور میری طرف رحم
طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔

"[illegible]! ہم تو اپنی شادی کا پلان بنا رہے ہیں!"

"شادی؟"

اُس نے دھیمے سے کہا اور دوسرے لمحے وہ لپک کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے
جھپٹ کر میز سے اپنا پرس اٹھایا اور باہر بھاگ گئی۔

"مادھوی! کہاں جا رہی ہو؟"

میں نے حیرت سے پکارا۔

"شادی کرنے! اپنے کپاؤنڈر کے ساتھ!!"

اُس نے پلٹ کر جواب دیا اور دوسرے لمحے وہ بازار کی بھیڑ میں کھو گئی۔

غزلیں

زیدی جعفر رضا ایم۔اے

آنکھ تھی نگہِ یار سے باتیں کرتے
وہ [illegible] دل پیار سے باتیں کرتے

اک ذرا آپ جو کچھ اور مہرباں ہوتے
شوق سے ہم رسن و دار سے باتیں کرتے

پاس ہوتا انہیں کچھ میری محبت کا اگر
کُھل کے اِس طرح نہ اغیار سے باتیں کرتے

میں نے بس اتنی خطا کی ہے کہ چاہا ہے انہیں
وہ سمجھتے ہیں خطا وار سے باتیں کرتے

کاش اُن کو مرے حالات کا ہوتا احساس
کاش وہ میرے دلِ زار سے باتیں کرتے

عنوان چشتی ایم۔اے

زہر بھی، جامِ ارغوانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

مجھکو اُن سے انہیں مرے دل سے
حُسنِ ظن بھی ہے، بدگمانی بھی

خیر ہو دل کی اب مرے، یارب
آگئی اُن کو دل ستانی بھی

"سوزِ دل" بھی ہے اشکِ غم کے ساتھ
عاشقی آگ بھی ہے، پانی بھی

زندگی ہے عجیب شے عنواںؔ
یہ حقیقت بھی ہے، کہانی بھی

ایک پُراسرار دلچسپ رومانی ناول

سپنوں کی رہگذر میں

کرشن چندر ایم۔ اے

اِس سے پہلے کیا ہوا؟

میرا نام موتی لال ناگر ہے۔ میں ایک مصوّر ہوں۔ مجھے یہ دُنیا حقیقی نہیں معلوم ہوتی۔ میرا اعتقاد روحانی اور پُراسرار چیزوں میں بہت زیادہ ہے۔ کبھی کبھی عالمِ خیال میں مجھے دو گلابی پاؤں نظر آتے ہیں اور یہ پاؤں ناچتے تھرکتے ہوئے مجھے اپنی طرف بُلاتے ہیں۔ مجھے اِس دُنیا کی عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اِس لئے میرے ماں باپ میری شادی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ میں محکمۂ آثارِ قدیمہ میں ملازم ہوں۔

۱۹۵۸ء کے ماہ جون میں مجھے محکمۂ آثارِ قدیمہ کی طرف سے بیدرواہ کی ہمالیائی وادی میں جاکر وہاں کے غاروں کی تصاویر نقل کرنے کا حکم ملا۔ بیدرواہ جانے کا راستہ بے حد دشوار گزار ہے۔ وہاں تک نہ ریل جاتی ہے نہ موٹر روڈ۔ بہت مشکل سے وہاں تک پہنچا اور ایک پُرانے راجپوتی قلعے میں قیام کیا، جس کا آدھا حصہ ڈھ چکا تھا اور جس کے باقی آدھے حصے میں انگریزوں کے زمانہ میں انگریز شکاری اور ہندوستانی حاکم آکر رہتے تھے۔ قلعے کا باورچی، اردلی اور بیرہ ایک ہی آدمی تھا۔ اُس کا نام تھا شنکر۔ شنکر نے مجھے رات کو قلعے میں سونے سے منع کیا۔ کیونکہ رات کو یہاں بھوت آتے ہیں اور جو رات کو قلعے میں سوتا ہے، مرجاتا ہے۔ اُس نے مجھے نئے ڈاک بنگلے میں سونے کو کہا جو قلعے سے کچھ فاصلے پر تعمیر کیا گیا ہے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے شنکر سے قلعے کی ساری چابیاں لے لیں اور قلعے میں اکیلا سویا، چاروں طرف سے سب دروازے بند کرکے۔ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ اچانک جاگا تو گھُپ اندھیرے میں آہٹ سی ہوئی۔ دھیرے دھیرے کوئی میرے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اب آگے پڑھئے . . .

پھر جیسے کوئی اُچھل کر غلام گردش سے چوبی فرش پر رُک گیا۔ بہت دیر تک سنّاٹا رہا ـــــ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اب تک جو کچھ میں نے سُنا عالمِ خواب میں سُنا تھا یا کانوں کا واہمہ تھا۔

میں پھر سو جانے کو تھا کہ اچانک مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے آہستہ سے کوئی میرے دروازے کو بہت احتیاط سے ہاتھ لگا کر ٹٹولنے لگا ہے۔ سَر سَر کھر کھر کی آواز آ رہی تھی۔ میں پھر اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ تکیے کے نیچے ڈال کر میں نے ٹارچ نکالی۔ دوسرے ہاتھ میں قریب کی دیوار سے لگی ہوئی ستری ناٹ ستری کو پکڑا اور بے آواز قدموں سے دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔

بالکل بے آواز حرکت سے میں نے اپنے کمرے کا تالا اور اُس کی کُنڈی کھولی۔ چٹخنی بھی اُسی طرح نیچے کی۔ اِس میں کئی منٹ لگ گئے۔ پھر میں نے ایک طرف ہوکر دھیرے سے دروازہ کھول دیا اور ٹارچ کی روشنی باہر ڈالی۔

کمرے کے باہر دروازے کی چوکھٹ سے لگی دو بتیاں مجھے گھور رہی تھیں۔

[illegible] کی روشنی پڑتے ہی دونوں اُچھل کر بھاگیں اور غلام گردش کے چوبی فرش پر آ کر چھلانگ لگا کر غائب ہو گئیں۔

جان میں جان آئی اور سانس میں سانس آئی۔ میں نے مُسکرا کر دروازہ پھر بند کیا۔ اب کے تالا نہیں لگایا۔ صرف کُنڈی چڑھا دی اور واپس اپنے پلنگ پر آکر بے خبر سو گیا۔ صبح دیر تک۔ بے سُدھ سوتا رہا۔ جب جاگا تو گھڑی دوسرے دن کے دس بجا رہی تھی اور کوئی میرا دروازہ زور زور سے پیٹ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ باہر شنکر ہراساں اور خائف گاؤں کے پہاڑی باشندوں کو لئے کھڑا تھا۔ وہ لوگ غالباً مجھے مُردہ سمجھ بیٹھے تھے اور اب میری لاش اُٹھانے آئے تھے!

مجھے زندہ اور مُسکراتے دیکھ کر وہ سب حیرت زدہ رہ گئے!

شنکر کا چہرہ فق تھا۔ جیسے مجھے زندہ دیکھ کر اُسے بہت مایوسی ہوئی ہو۔

"صاحب! میں نے تو سمجھا، آپ کو بھوت نے مار ڈالا۔ دیر تک قلعہ کا دروازہ پیٹا۔ جب آپ نے نہیں کھولا، تو میں گاؤں کے لوگوں کو بُلا کر لایا۔" شنکر نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اگر قلعہ کا دروازہ اندر سے بند تھا تو تم لوگ اندر کیسے آئے؟" میں نے پُوچھا۔

"نوکر خانے کے راستے سے!" شنکر نے بتایا "نوکر خانے کا راستہ الگ ہے۔ اُس کی کُنجی میرے پاس رہتی ہے"

"تم دیکھ سکتے ہو۔ میں زندہ ہوں!"

"رات کو بھوت نہیں آیا ——؟" شنکر نے کسی قدر بے چینی اور تعجب سے پُوچھا۔

"بھوت تو نہیں البتہ دو بلّیاں ضرور آئی تھیں!" میں نے مُسکرا کر کہا "سب ٹھیک ہے شنکر! میں تین دن کے سفر کا تھکا ہوا تھا۔ اس لئے دیر تک سوتا رہا۔ اب تم بھوتوں کی طرف دھیان نہ دو۔ اپنے کام کی طرف دھیان دو۔ ناشتہ لگاؤ!"

"ابھی حاضر کرتا ہوں!" شنکر نے مجوب ہوتے ہوئے کہا۔ پھر گاؤں کے ایک آدمی کی طرف، جو دوسروں سے ممتاز نظر آتا تھا، اشارہ کرتے ہوئے بولا ——" یہ روپی داس ہیں۔ گاؤں کے نمبردار ہیں!"

روپی داس نے میری طرف دیکھ کر بہت عاجزی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں، بولا: "صاحب پولیس میں ہیں؟"

"نہیں تو!" میں نے کہا "تمہیں کس نے بتایا؟"

"کسی نے نہیں جناب!" روپی داس نے شنکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"شنکر نے بتایا آپ کے پاس [illegible] کی بندوق ہے۔ اس سے خیال ہوا [illegible]"

"اس کا تو لائسنس میرے پاس ہے۔ میں [illegible]"

"صاحب جنگل میں شکار کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں!" میں نے ہنس کر کہا "یہاں قریبی بیدرواہ کے غاروں میں جو تصویریں پائی جاتی ہیں، اُن کا رنگ روغن ٹھیک کرنے اور اُن کی نقلیں لینے کے لئے آیا ہوں!"

نمبردار کو اطمینان سا ہوا۔ بولا: "صاحب کچھ عرصہ تک ٹھہریں گے؟"

"ہاں —— جب تک کام پُورا نہ ہو!"

"صاحب اطمینان سے اپنا کام کریں" روپی داس نے سر جھکا کر کہا "کسی طرح کی ضرورت ہو تو غلام حاضر ہے!"

اُس کا لب و لہجہ بالکل ایسا تھا جیسے انگریزوں کے وقت میں نمبرداروں کا ہوا کرتا تھا۔

"سب سے پہلے تو مجھے بیدرواہ کے غار دیکھنے ہوں گے —— تم دکھا سکتے ہو؟"

"سیتا حاضر ہوں!"

"اس وقت نہیں۔ کوئی تین گھنٹے کے بعد آنا" میں نے نمبردار سے کہا۔ نمبردار اپنے آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا اور تین گھنٹے کے بعد لوٹنے کا وعدہ کر گیا۔

ناشتے کے بعد میں نے شنکر کو ساتھ لے کر قلعہ کا باقی حصّہ دیکھا۔ میرے کمرے سے ملحق جو کمرہ بند تھا، وہ طرح طرح کے فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ شنکر نے مجھے بتایا۔ اس لئے میں نے اُسے کُھلوا کر نہیں دیکھا۔ اُس کے ساتھ والا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ اُس کے آگے قلعہ کا زنانخانہ تھا جو ڈھے چکا تھا۔ پھر واپس آکر دوسری غلام گردش سے ملحق کمروں کو دیکھا۔ اُدھر تین کمرے تھے اور ایک باتھ روم۔ بالکل میرے کمروں کی طرح لیکن بے حد گندے اور میلے۔ مٹی اور جالوں سے بھرے ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے کوئی اِن کمروں میں نہیں رہا ہے۔ غلام گردش کے ایک طرف یہ تین کمرے تھے۔ دوسری طرف کی آدھی دیوار پتھروں کی تھی اور پتھروں کی اِس دیوار کے اوپر غلام گردش کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک رنگین شیشوں کی کھڑکیاں تھیں۔ جن میں سبز، نیلے، پیلے اور سُرخ رنگ کے شیشے لگے تھے جب کھڑکیوں سے دھوپ چھن کر آتی تھی تو غلام گردش کے اندر رنگین قمقمے سے جل اُٹھتے تھیں۔ میں نے ایک کھڑکی کھول کر دیکھا اور نیچے جو نظر ڈالی تو [illegible] چٹانوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیا جو تقریباً نیچے کی گہری کھائی تک پھیلا ہوا تھا [illegible] کے دونوں [illegible] بل جاتے تھے [illegible]

پھر بعد کسی ایم کا معدکرنا ناممکن تھا اور قلعہ کو چاروں طرف سے دونوں ندیوں نے گھیر لیا تھا اور ایک قدرتی خندق بنا ڈالی تھی۔ یہ دونوں ندیاں قلعہ کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے کر ایک چھوٹے سے ٹیلے سے گھوم کر پھر الگ ہو جاتی تھیں۔ اس ٹیلے پر درختوں کا ایک گھنا کنج تھا اور اس کنج میں سے مندر کا پیتل کا کلس دھوپ میں چمک رہا تھا۔

"یہ بھوانی کا مندر ہے" شنکر نے کہا۔ "جس پرمار راجہ نے یہ قلعہ بنوایا تھا، اُسی نے یہ مندر بھی بنوایا تھا۔ بہت پُرانا مندر ہے صاحب! پر اب بہت ٹوٹ پھوٹ گیا ہے!"

میں نے دل میں سوچا۔ پہلے غار دیکھ لیں۔ پھر کسی دن اسے بھی دیکھیں گے۔

شنکر نے کھڑکی بند کر دی اور مجھے آگے لے چلا۔ جہاں غلام گردش ختم ہوتی تھی وہاں پر صرف تین سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں جو غالباً قلعے کے دوسرے حصّہ کو جاتی تھیں، جو اب گِر چکا تھا۔

یہاں پر پتھروں، چٹانوں، مٹی، چُونے گارے کا پڑا ہوا ڈھیر اِتنا پُرانا ہو گیا تھا کہ اِس پر جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور لمبی لمبی گھاس پھیلی ہوئی تھی۔

یہاں سے ہم واپس چلے۔ غلام گردش پار کرکے مجھے شنکر اُس زینے پر لایا جو اُتر کر نیچے قلعے کے ہال میں جاتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اِس ہال کے اوپر بھی ایک زینہ جا رہا ہے۔

"اوپر کیا ہے؟" میں نے شنکر سے پُوچھا۔

"گول کرہ ہے۔"

"چلو دِکھاؤ!"

شنکر زینہ چڑھنے لگا۔ چڑھتے چڑھتے ہم ایک بند دروازے کے باہر پہنچے۔ شنکر نے چابی لگا کر قفل کھولا۔ اندر چلے۔ اندر پھر اونچی سیڑھیوں کا ایک حاشیہ نظر آیا۔ اُسے چڑھ کر اوپر پہنچے تو پھر ایک بند دروازہ نظر آیا۔ شنکر نے اُسے کھولا تو ہم گول کمرے میں تھے۔

گول کمرہ اُتنا ہی بڑا تھا، جتنا نیچے کا ہال۔ فرق صرف اِتنا تھا کہ اُس کی شکل ہشت پہلو تھی اور دیواروں پر جانوروں کے سر کے بجائے پرمار خاندان کے راجاؤں اور رانیوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور پُرانی تلواریں اور ڈھالیں، خنجر اور پیش قبض۔ فرش لکڑی کا تھا، جس پر ایک نفیس گول ایرانی قالین بچھا تھا جو اِتنا گندہ اور میلا ہو گیا تھا کہ اُس کے سارے نقش و نگار مٹیالے پڑ گئے تھے۔

شنکر نے بہت فخر سے بتایا: "لاٹ صاحب جب یہاں شکار کو آتا تھا تو اسی گول کمرے میں ڈانس ہوتا تھا!"

"اور جب راجہ لوگ یہاں ہوتے ہوں گے تو مُجرا ہوتا ہوگا؟" میں نے پُوچھا۔

"یہ تو صاحب مجھ کو معلوم نہیں!" شنکر کہنے لگا۔

اِس گول کمرے کے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں چار دروازے تھے۔ شنکر نے چاروں دروازے کھولے اور مجھے باہر لے گیا۔ گول کمرے کے باہر چاروں طرف کوئی تیس فٹ چوڑا فرش تھا۔ جس کے آگے کوئی پانچ فٹ اونچی مضبوط دیوار کا حاشیہ تھا جو اِتنا مضبوط تھا کہ اب تک اُس میں سے ایک پتھر بھی نہ ہلا تھا۔ اِس دیوار میں جگہ جگہ توپیں نصب تھیں۔ میں نے گِنیں۔ کُل آٹھ توپیں تھیں لیکن چاروں طرف اِس خوبی سے لگائی گئی تھیں کہ قلعہ کے چاروں طرف کا علاقہ اُن کی زد میں تھا۔ یہاں سے بیدرواہ کی وادی کا منظر پُورا نظر آتا تھا۔ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک یہ چھوٹی سی وادی میری نظروں کے سامنے کھُلی تھی اور چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ تھا جن کی چوٹیاں برف پوش تھیں۔ میں دیر تک اِس خوبصورت منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنے کام کا خیال کرکے بادلِ ناخواستہ اُس جگہ سے لَوٹا۔ گول کمرے سے نیچے اُتر کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ شنکر سے کہا، وہ دوپہر کا کھانا ابھی تیار کرکے میرے ساتھ رکھ دے۔ میں غسل کے بعد بیدرواہ کے غاروں میں جاؤں گا!

غسل سے فارغ ہو کر میں نے کپڑے بدلے۔ ایک خط گھر کے لئے لکھا۔ خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ دوسرا خط اپنے محکمے کے نام لکھا۔ اِتنے میں رِدی داس آ گیا۔ میں نے دونوں خط اُسے دئے اور تاکید کی کہ وہ آج ہی ایک آدمی تیراہ روانہ کرے جو اِن خطوں کو پوسٹ کرکے آئے۔ رِدی داس نے اُسی وقت گاؤں کے چوکیدار بشمبر کو تیراہ روانہ کر دیا اور میرے لنچ کا ٹفن کیریر اور دوسرا ضروری سامان اُٹھا کر میرے ساتھ بیدرواہ کے غاروں کی طرف چل دیا۔

لکڑی کا پُل پار کرکے ہم ایک پتھریلی ڈھلوان اُتر کر نیچے وادی میں پہنچ گئے اور دھان کے کھیتوں کے بیچوں بیچ جاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی چکنی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے بیدرواہ کے اُس پہاڑ پر پہنچے جہاں غاروں کے تاریک مُنہ کھُلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

دھان کے کھیتوں کو پار کرکے ہمیں کئی کسانوں کے چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھر ملے۔ یہاں سے گزر کر ہم اوپر ایک سطح مرتفع پر پہنچ گئے۔ یہاں پر پھل دار درختوں کا ایک چھوٹا سا باغ نظر آیا جس کے گرد لکڑی کا ایک جنگلہ تھا۔ لکڑی کے جنگلے کے کنارے چلتے چلتے پھل دار درختوں کے سائے میں چُھپا ہوا ایک گیٹ نظر آیا جو باغ کے اندر جاتا تھا اور جس کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی کاٹج کا سامنے کا حصّہ نظر آ رہا تھا۔



ضروری کام کا انبار ۔۔ اور اس کے سر میں درد ہے!
یہ سب کام آج ہی ختم کرنا ہے اور میرے سر میں شدید درد ہے!
شکور بھئی، ایک سیریڈون لے لو، سر کا درد غائب ہو جائے گا تب یہ کام آج ہی ختم کر سکو گے۔
پھر وہ سیریڈون لیتا ہے
اور پھر...
کمال ہے، میرا سر درد تو کافور ہو گیا!
ایک ہی سیریڈون
'روش'
درد دور کرتی ہے، آرام پہنچاتی ہے، تازگی بخشتی ہے
دنیا بھر میں مشہور سیریڈون ایک ایسی بے ضرر چیز ہے جو درد اور تکلیف میں فوراً اور یقیناً پورا آرام پہنچاتی ہے۔ سر کے درد، دانت کے درد، جسم کے درد اور طبیعت کی بے چینی کے لئے ہمیشہ سیریڈون لیجئے۔ پوری خوراک ایک ٹکیہ۔ بچوں کے لئے پاؤ سے آدھی ٹکیہ۔
سیریڈون کی ایک ہی ٹکیہ کافی ہے
'روش' کی تیار کردہ
سول ڈسٹری بیوٹرز، وولٹاس لمیٹڈ

کاٹیج کے پورٹیکو سے گیٹ تک ایک چھوٹا سا ڈھلوان راستہ تھا جس پر سیاہ رنگ کی بجری کوٹ کوٹ کر بچھائی گئی تھی۔ گیٹ پر دائیں طرف لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی لٹک رہی تھی۔ جس کی ایک کیل نکل چکی تھی۔ دوسری کیل سے لٹکی ہوئی تختی ہولے ہولے ہوا میں جھول رہی تھی۔ میں نے گردن خمیدہ کرکے تختی پہ لکھا ہوا نام پڑھا۔ اُس پر لکھا تھا ـــــــ

"ریچمنڈ کاٹیج"

گیٹ کی دونوں طرف گلابی رنگ کے بوگن ویلیا کے پھولوں کی بیلیں چڑھی تھیں۔ ایک عورت سر جھکائے اُن میں پانی دے رہی تھیں۔ میں نے اُسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں نمبردار سے باتیں کئے چلا جا رہا تھا کہ وہ عورت شاید ہم دونوں کی آوازیں سُن کر چونکی اور پانی دینے کا نلکی والا ڈول ہاتھ میں لئے گردن اُٹھا کر سیدھی ہوگئی اور حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگی۔

وہ سفید شلوار اور سفید قمیص پر ایک باریک سفید دوپٹہ اوڑھے جس پر چاندی کی چمپا بھرت کا کام تھا، سیدھی کھڑی تھی۔ دوپٹے کے ہالے میں اُس کا گول گلابی چہرہ نازک پتلے پتلے ہونٹوں والا، حیرت سے مجھے تکتا نظر آیا۔ وہ مجھے اور میں اُسے، ہم دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے تک رہے تھے۔ اُس کے لباس، چال ڈھال اور بالوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک شہری عورت ہے۔ اِس جنگلی دُور افتادہ علاقے میں وہ بھی ایک شہری کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئی تھی!

"صاحب بیدرواہ کی تصویریں اُتارنے آئے ہیں" نمبردار ردی داس نے اپنے سر کی بھاری بھرکم پگڑی کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا، پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"آپ محمود صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں۔ جن کا یہ بنگلہ ہے"

میں نے ذرا جھک کر لکھنوی انداز میں آداب کیا۔ اُس عورت نے ذرا سا مُسکرا کر جواب دیا اور گیٹ کھول کر مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔ میں اُس کے ساتھ باتیں کرتا کرتا پورٹیکو کی طرف بڑھنے لگا۔ گفتگو کے دوران میں اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کا نام نسیمہ ہے۔ اُس کے خاوند کا نام محمود ہے۔ وہ دونوں بارہ سال سے اِسی کاٹیج میں رہتے ہیں۔ اُس کا خاوند امیر آدمی ہے لیکن تنہائی پسند ہے۔ اُسے تنہائی عزیز ہے۔ اِسی لئے اُنھوں نے اِس دُور افتادہ تہذیب و تمدّن سے الگ تھلگ جگہ کا انتخاب کیا۔ میں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن یہ سمجھ نہ سکا کہ کسی امیر آدمی کے لئے اِس ویرانے میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آدمی امیر ہو تو شہر میں بھی اپنے لئے ایک ویرانہ تعمیر کر سکتا ہے۔ جس کی تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو سکے۔

پورٹیکو میں بچھی ہوئی ایک آرام کرسی پر آرام دہ گدّوں میں دھنسا ہوا ایک دُبلا پتلا لانبا آدمی دراز تھا۔ اُس نے اپنے چہرے پر ایک رومال ڈال رکھا تھا اور انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے سو رہا ہے۔

لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ اپنے قریب قدموں کی چاپ اور گفتگو کی آواز سُن کر وہ آدمی چونکا۔ رومال اُس کے چہرے سے اُتر کر اُس کی گود میں جا گرا۔ میں اُسے دیکھ کر حیرت سے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اُس مرد کے دونوں بازو اور چہرہ جگہ جگہ سے بُری طرح جلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پلاسٹک سرجری بھی اُس کے چہرے کی بدنمائی دُور کرنے میں ناکام رہی ہے۔ بھوؤں پر بال نہیں تھے۔ سیاہ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ایک آنکھ جا چکی تھی۔ وہ اِتنا کریہہ المنظر تھا کہ میں اپنے دلی تاثرات چُھپا نہ سکا۔ شاید اُس نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھ لئے۔ کرب کا ایک گہرا رنگ اُس کے چہرے پر آیا اور اُس نے بہت کرخت اور بیزار کُن لہجے میں اپنی بیوی سے پُوچھا۔

"یہ کون ہے؟ اور تم اِسے یہاں کیوں لائی ہو؟"

نسیمہ سہم گئی۔ پھر چند ثانیے چُپ رہنے کے بعد اُس نے میرا تعارف کرایا۔ اِتنے میں میں اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا مفصّل تعارف دیا۔ میرے لہجے میں بے حد خلوص تھا اِس سے غالباً وہ متاثر ہوا ہوگا۔ کیونکہ اُس کا لہجہ بھی اب بدل گیا تھا اور اُس نے مجھے اپنے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ نسیمہ میرے قریب دیوار سے لگے ہوئے ایک دیوان پر بیٹھ گئی۔

"اب تم سمجھ سکتے ہو" محمود نے مجھ سے کہا "میں کیوں اِس ویران جگہ میں آ کے رہنے لگا ہوں۔ میرا چہرہ میرے گھر کی آتشزدگی میں اِتنا جل گیا تھا، اِتنا جل گیا تھا کہ اچھے سے اچھے پلاسٹک سرجن بھی مایوس ہو گئے۔ اُنھوں نے ایک چہرہ تو بنا دیا ہے" وہ مُسکرا کر کہنے لگا "اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مُنہ ہے، یہ کان ہے، یہ آنکھ ہے، یہ ناک ہے لیکن سب کچھ ہونے پر بھی کچھ نہیں ہے... سب جل گیا...!"

اُس کی مُسکراہٹ بہت بھیانک تھی۔ میں نے بڑبڑا کر نیم مہمل جملوں میں اُس سے ہمدردی ظاہر کی۔

"یہ رسمی باتیں ہیں" محمود غصّے سے بولا "اِس چہرے سے کسی کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ جب میں خود ہی اِس چہرے سے نفرت کرتا ہوں۔ تو تم کیسے اِس سے ہمدردی کر سکتے ہو۔ میں جانتا ہوں، تم جھوٹ بول رہے ہو!"

نسیمہ نے خاموشی سے میری طرف ایسی مجبور نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "میرے شوہر کو معاف کر دو۔ اگر تم اُس کی ذہنی حالت سمجھ سکتے ہو!"

میں نے پھر اُس کی باتوں کو اَن سُنی کرکے اُس سے انتہائی شیریں لہجے میں ہمدردی جتائی۔ شاید میرے ہمدردی جتانے میں انسانی خلوص بھی شامل رہا ہوگا۔

شاید تمھیں بہت زیادہ تنہائی کو محسوس کا کوئی بیمار رنگ دیا ہوگا کہ وہ پھر نرم پڑ گیا۔ نسیمہ کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ٹنگی اٹھا کر بولا۔

"یہ سب نسیمہ کی شرارت ہے۔ اسی کی وجہ سے تم بیدرواہ بھیجے گئے ہو۔ تم جانتے ہو کیا؟" محمود نے مجھ سے پوچھا۔

میں حیران ہو کر نسیمہ کی طرف دیکھنے لگا، جو اب اپنے شوہر کا غصہ دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔ بولی ـــــ

"انھیں مصوری کا شوق ہے۔ زیادہ نہیں یونہی سا... میں نے ہی آثارِ قدیمہ کے محکمے کو لکھا تھا۔ بیدرواہ کے مندروں کے بارے میں۔ اور اُس کی تصویروں کی چند نقلیں بھی بھیجی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ ان تصویروں کے رنگ ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ ان کا کچھ ہونا چاہئے۔"

"کئی برس میں نے اسے اجازت نہیں دی۔" محمود کے لہجے میں کچھ تلخی آنے لگی۔ "میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں کوئی آئے اور اگر کوئی آتا بھی تھا تو میں کسی سے ملتا نہ تھا۔ اس لئے میں نے نسیمہ کو کبھی اجازت نہیں دی لیکن اپنی تصویروں کی دُرگت دیکھ کر میری اجازت کے بغیر ہی محکمہ آثارِ قدیمہ کے افسر کو یہاں آنے کی دعوت دی اور مجھ سے بغیر پوچھے ... اور اب تمھیں ان لوگوں نے یہاں بھیج دیا ہے۔ اب تم غالباً یہاں کی مدّت تک یہاں رہو گے اور میری بیوی سے محبت کرو گے!"

"محمود!" نسیمہ غصّے سے جھلا کر بولی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" نسیمہ کی آنکھ میں آنسو تھے۔

"میں نے ... " میں نے گھبرا کر کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے... واقعی مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ میں ادھر کا رُخ نہ کرتا... میں جاتا ہوں مسٹر محمود ـــــ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، میں کبھی ادھر کا رُخ نہ کروں گا!" میں غصّے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو... بیٹھو... میری باتوں کا برا نہ مانو۔" محمود یک لخت شرمندہ سا ہونے لگا۔ "میں ایسا ہی ہوں۔ جب تم مجھے زیادہ جان جاؤ گے تو میری باتوں کو سمجھ کر ان سُنی کر دو گے۔ مجھے ہڈی کا کینسر بھی ہے۔ زیادہ دن نہیں جیوں گا۔ تمھیں مجھے معاف کر دینا چاہئے۔ نسیمہ اکیلی ہے۔ دس سال سے اکیلی رہ رہی ہے میرے ساتھ۔ اُس کی تنہائی ظلم ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ مگر... میں اپنی طبیعت کو کیا کروں؟"

یکایک وہ رونے لگا۔ چُپ چاپ خاموشی سے...!

میں چُپ چاپ خاموشی سے کرسی پر بیٹھا رہا۔ کہتا بھی کیا؟ بالکل کسی ایسے تماشبین کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ جو کسی ڈرامے کے کلائمکس کے عین درمیان اسٹیج پر آ دھمکے۔ میں کرسی سے اُٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن پاؤں جیسے زمین میں گڑے تھے۔

نسیمہ میرے لئے چائے بنا کر لائی اور دونوں میاں بیوی نے مجھے اصرار سے چائے پلائی۔ پھر جب میں چلنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تو محمود نے کہا۔

"نسیمہ تمھارے ساتھ جائے گی۔ یہ سب غاریں اس کی دیکھی ہوئی ہیں۔ یہ تمھیں ایک ایک تصویر کے بارے میں بتا سکتی ہے۔"

میں نے پس و پیش کیا لیکن محمود نہ مانا۔ اُس نے نسیمہ کو میرے ساتھ بھیج دیا۔

گیٹ سے نکل کر ہم ہولے ہولے خاموشی سے چلتے رہے۔ پہاڑ پر چلنے کے لئے نسیمہ نے پستئی رنگ کا بلاؤز پہن لیا تھا اور اودے رنگ کی جینز۔ بالوں کو کس کر پیچھے ایک گچھے کی طرح ایک ربڑ کے کلپ میں باندھ لیا تھا۔ جس سے اُس کی گردن کا خم اور بھی تیکھا ہو گیا تھا۔ ہاتھ میں ایک مضبوط چھڑی تھی۔ ہمارے پیچھے چپراسی کچھ فاصلے پر سامان اُٹھائے اور جھولا لٹکائے آ رہا تھا۔

"مجھے یہ وادی بہت پیاری معلوم ہوتی ہے۔" میں نے اُس سے کہا۔

"جی چاہتا ہے یہیں رہ جاؤں۔"

"دو دن میں اُکتا جاؤ گے۔ رسّیاں تُڑا کر بھاگو گے۔ مجھے اس ماحول سے نفرت ہے!"

"تمھیں شہر چاہئے اور اُس کے ہنگامے! ڈانس اور کلب اور کپڑوں کے نت نئے فیشن ـــــ اور جگمگاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چکنی چکدار باتیں جیسی کہ مہذب لوگ کرتے ہیں!"

"ہاں!"

"پھر تم یہاں کیوں آ گئیں؟"

"وجہ کیوں پوچھتے ہو۔ اب تو تمھیں سب معلوم ہو چکا ہے!"

وہ اپنی چھڑی سے راستے کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو ہٹاتی جا رہی تھی۔

"تم نے اصرار کیا ہوتا۔ شہر میں رہ جاتے دونوں!"

"محمود اپنا چہرہ دُنیا کو نہیں دکھا سکتا۔ تمھیں معلوم نہیں ہے۔ اس آتش زدگی سے پہلے وہ کتنا حسین اور خوبصورت تھا!"

"آگ کیسے لگی؟ کس نے لگائی؟"

"فسادوں کے زمانے میں لگی۔ سن سینتالیس میں۔ غنڈوں نے لگائی۔ کیا تم ہندو ہو؟"

"میرا نام موتی لال ناگر ہے۔" میں نے اُسے پھر بتایا۔ "جو مجھ سے قریب ہو جاتے ہیں وہ مجھے لالی کہتے ہیں۔ لال سے لالی...!"

"آپ کے اور میرے قریب آنے کا کوئی امکان نہیں ناگر جی!" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔ "مجھے ہندوؤں سے نفرت ہے۔" اُس نے ایکدم جھلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے!"

وہ یکدم ہنس پڑی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"I am Very Capricious" وہ انگریزی میں بولی۔

"سبھی عورتیں Capricious ہوتی ہیں۔ یعنی متلون مزاج۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔۔ تم دوسری عورتوں سے الگ نہیں ہو۔ کیا تمھاری اور محمود کی محبت کی شادی ہے؟"

"نہیں!" اس نے اتنا ہی کہا اور دیر تک چُپ رہی۔ پھر چھوٹے سے پتھر کو اپنی چھڑی سے زور سے مار کر بولی "ایک لڑکا تھا اکرم۔ شاید مجھے اس سے محبت تھی!"

"پھر کیا ہوا؟"

وہ سر ہلا کر بولی "نہیں، نہیں۔ مجھے اس سے نہیں، اُسے مجھ سے محبت تھی۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا اور اس کی چاہت مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ شاید میں اس کے ساتھ بہت خوش رہتی لیکن وہ غریب تھا۔ اس کے ماں باپ غریب تھے۔ اُس کا سارا خاندان غریب تھا۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی تھی لیکن میں اُسے صاف صاف بتا بھی نہیں سکتی تھی۔"

"تمھیں اس پر رحم آتا تھا؟"

"رحم نہیں۔ مجھے اس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ جن نظروں سے وہ مجھے دیکھتا تھا، جس طرح وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتا تھا، جیسی جیسی وہ بے وقوفوں کی سی باتیں مجھ سے کرتا تھا، وہ بہت دلکش ہوتی تھیں۔ اس کے خواب بہت عجیب تھے ——— میں رکشا میں بیٹھ کر اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔ کہیں پیدل چل کر پکنک منا رہی ہوں۔ کسی پہاڑی گاؤں میں جا کر ہم کسی چھوٹے سے جھونپڑے میں رہتے ہیں۔ میں گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے لئے ندی سے پانی لا رہی ہوں، اس کے لئے کھانا پکا رہی ہوں۔ رات کو ایک ٹوٹی کھاٹ پر اس کا سر اپنے سینے پر رکھ کر اس کا ماتھا تھپک تھپک کر سُلا رہی ہوں!"

"یہ خواب عجیب کیسے ہیں؟"

"کیونکہ یہ نچلی سطح کے خواب ہیں۔ میں رکشے میں کبھی نہیں بیٹھی۔ میں نے پیدل چل کر کبھی پکنک نہیں منائی۔ کبھی کسی جھونپڑے میں نہیں رہی۔ نہ کبھی ندی سے پانی لائی۔ نہ کھانا پکایا۔ نہ ٹوٹی کھاٹ پر سوئی۔ وہ عجیب آدمی تھا مجھے کہاں گھسیٹنا چاہتا تھا؟ اس کی ایسی باتیں سُن کر مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔ کیا واقعی وہ سنجیدہ تھا؟"

"بات اصل میں یہ ہے" میں نے اس سے کہا" وہ بے چارہ اپنی غربت کو ایک رومانوی غلاف میں لپیٹ کر تمھیں پیش کر رہا تھا!"

"جی ہاں" وہ بہت گہرے جذبے میں بولی "آج کل کی لڑکیاں ایسی احمق نہیں ہیں کہ ایسی باتوں میں آ جائیں۔ اوپر اوپر کا شاعرانہ پیار دُور سے بہت اچھا لگتا ہے۔ جب میں آئی۔ٹی کالج لکھنؤ میں پڑھتی تھی تو ایک صاحب تھے سوز فتح پوری۔ وہ مجھ پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ ہر ماہ ایک نئی غزل رسالہ ماہتاب میں میرے لئے چھپواتے تھے۔ ہر غزل کے کسی نہ کسی شعر میں میرا نام ہوتا تھا اور اوپر بھی بریکٹ میں لکھا ہوتا تھا۔ "ن کے نام" ——— ہر ماہ وہ رسالہ میرے نام بھیجتے تھے۔ پہلی بار جب رسالہ مجھے ملا اور وہ غزل میں نے پڑھی تو دھک سے رہ گئی۔ کتنی خوبصورت اور مرصّع غزل تھی۔ سوز و گداز سے بھرپور اور الفاظ کیسے مترنم جیسے موسیقی پگھل کر بہہ رہی ہو۔ میں تو لوٹ گئی۔ چھ ماہ تک اُن کی غزلیں رسالہ ماہتاب میں میرے لئے چھپتی رہیں اور میرا اپنا دل اپنے نادیدہ پیار کرنے والے کے لئے بے چین رہنے لگا۔ جی چاہتا تھا کیسے اُسے دیکھوں۔ کہاں سے اُس کا پتہ پاؤں اور اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ پہلے سوچا، رسالے کے ایڈیٹر کو خط لکھ کر سوز فتح پوری کا پتہ معلوم کر دوں لیکن شرم سے ایسا نہ کر سکی۔ خوش قسمتی سے ساتویں شمارے میں رسالے کے اندر جہاں غزل چھپی تھی، وہیں مجھے دو صفحوں کا سوز کا خط مل گیا۔ سوز نے اس خط میں اپنا سارا سوز و دروں بھر دیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ صرف ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ میں بھی وہ خط پڑھ کر آتشِ شوق سے تڑپنے لگی۔ فوراً اُسے جواب لکھا۔ اُسے سات دن کے بعد بنارسی باغ میں آنے کو کہا اور شام کے پانچ بجے اُس جگہ انتظار کرنے کو کہا جہاں کہ ملی کے درختوں کے جھنڈ کے اندر ایک بینچ رکھا ہے۔ میں ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچ جاؤں گی!"

ساتویں دن بدھ تھا۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کیسے بن سنور کر دھڑکتا ہوا دل لئے اپنے ابا کی گاڑی خود ڈرائیو کر کے میں بنارسی باغ ساڑھے چھ بجے کے قریب پہنچی۔ اگر پانچ بجے ہی پہنچ جاتی تو بے چارہ کتنا مایوس ہوتا۔ انتظار کسی کو پیار کرنے والے کا پیدائشی حق ہے۔ اگر آپ اپنے عاشق کو انتظار نہیں کرنے دیتیں تو وہ بے حد مایوس ہوگا۔ ہو سکتا ہے پیار کرنا ہی چھوڑ دے۔ اس لئے ... کے لئے وقت دے کر دیر سے پہنچنا بے حد ضروری ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ باہر کے کھلے ماحول سے اس کی ... بشاشت اُبھر آئی تھی اور اب وہ ... کالج کا ... پژمردہ ماحول بھول کر عورتوں کے فطری انداز میں بے حد رواں، رواں لہجے میں باتیں کئے جا رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا؟ ——— کیا ———؟"

اس نے مجھے جلدی سے روک کر کہا "تم سُنو تو ... میں نے جب کھرنی کے کنج کے کنارے اپنی گاڑی روکی اور پٹ کھولا تو سوز فتح پوری مجھے ... تکتا ہوا

نظر آیا۔ جب کالی جھجک صورت پائی تھی اُس نے۔ گال اندر دھنسے ہوئے، آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی، ماتھا پیچھے کو ڈھلکا ہوا۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے بال اور لمبی لمبی قلمیں۔ جیسے پرانے زمانے کے ہالی ووڈ ایکٹروں کی ہوتی تھیں۔ ایک پھولا ہوا سفید چکن کا کُرتہ اور پاپلین کا کُھلے پائنچوں والا پائجامہ پہنے عجیب طرح کا اسکیئر کرو (Scare Crow) نظر آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چار دن کے بعد شیو کر کے بال کٹوا کے آج ہی چھ ماہ میں پہلی بار حمام سے نہا کر نکلا ہے۔ میں تو اُسے دیکھ کر ہی دھک سے رہ گئی۔ سارے ہوائی قلعے دھڑام سے میرے قدموں میں آگرے۔ میں نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ ہی سوز فتح پوری ہیں؟"

جواب میں اُس نے کتھئی رنگ کے دانتوں کی پوری بتیسی کھول دی اور جُھک کر آداب کرنے لگا۔

میں نے کہا "میں ابھی آتی ہوں!" اور اُس کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی میں نے کار کا دروازہ زور سے بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے یہ جا وہ جا۔۔۔!"

"پھر ــــ؟"

"پھر کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ کم بخت کسی چُنگی خانہ میں محرّر تھا۔ ستر روپے پر اور پیار کرنے چلا تھا مجھ سے۔۔۔!"

میں نے کہا "اپنے یہاں ایک کہاوت ہے۔ 'پریم نہ دیکھے جات کُجات، پریم نہ دیکھے کایا مایا۔ پریم تو ہے دل کی چھایا۔۔۔!'"

"یہ سب باتیں قصّے کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔ آدمی کو پیار اپنی کلاس ہی میں رہ کر کرنا چاہیے۔"

"پہلی شرط آپ کی یہ تھی کہ پیار اپنے مذہب ہی میں رہ کر کرنا چاہیے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ پیار اپنی کلاس ہی میں کرنا چاہیے۔ اگر اور بھی کچھ شرطیں ہوں تو وہ بھی بتا دیجیے۔"

وہ ہنسی لیکن اب اُس کی ہنسی میں اُس کا ہانپنا بھی شامل ہو گیا تھا کیونکہ چڑھائی تقریباً عمودی تھی اور ہمیں کئی جگہ تو جُھک کر اور جھاڑیاں پکڑ کر یا چٹانوں کی اُبھری ہوئی نوکوں کا سہارا لے کر اوپر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ اِس لئے گفتگو خود بخود بند ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں پہلا غار آگیا اور ہم تینوں اُس کے اندر چلے گئے۔

دو غار سامنے کی گھاٹی میں تھے۔ تین غار پہاڑ کے دوسری طرف پیچھے کی گھاٹی میں۔ یہ پانچوں غار چٹانوں کو کاٹ کر نہیں بنائے گئے تھے۔ قدرتی غار تھے۔ جن میں پرمار راجپوتوں نے کبھی پناہ لی تھی۔ بعد میں اپنے رہنے کے لئے اُنھوں نے اِن غاروں کو کاٹ کاٹ کر بڑا کر لیا۔ اُنھیں انسانی ضروریات سے سجایا۔ اُن کی دیواروں پر نقش و نگار اُبھارے۔ بعد میں جب سنبھلنے کا موقع مِلا تو باہر نکل کر وادی میں اپنا قلعہ تعمیر کیا۔

ہر غار میں چٹانوں سے ترشا ہوا ایک مرکزی استون تھا جس پر شیو اور بھوانی کی مورتیاں کُھدی ہوئی تھیں۔ پانچویں غار میں ایک چھوٹا سا شوالہ غار کے اندر تھا۔ اُس شوالے کی چٹانی چھت میں دراڑیں پڑ گئی تھیں اور اُن دراڑوں سے کہیں اوپر پہاڑ کی چھاتی میں بہنے والے جھرنے کا پانی رِس رِس کر نیچے اُترتا تھا اور شولنگم کو دھوتا ہوا غار سے باہر ایک چھوٹے سے نالے کی صورت میں بہتا تھا۔

پانچویں غار تک آتے آتے بُھوک چمک اُٹھی تھی۔ یہاں پانی بھی تھا۔ اِس لئے ہم غار کے اندر بہنے والے جھرنے کے کنارے بیٹھ گئے اور ٹفن کیریر کھول کر کھانا کھانے لگے۔ ایک ہی روٹی سے نوالہ توڑنے میں دو افراد کے درمیان انسانی ہمدردی کا رشتہ بہت بڑا رشتہ ہو جاتا ہے۔ روٹی جیسی سادہ چیز روح کی دُوری اور مذہبی مغائرت کو مٹا دیتی ہے۔ کھانا کھاتے کھاتے مجھے یہ چار نوالوں کی روٹی بہت ہی پُر اسرار شئے معلوم ہوئی۔

"اِن غاروں کی مصوّری کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" نسیمہ نے مجھ سے پُوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے پلٹ کر سوال کیا۔

نسیمہ بولی ــــــ

"مجھے پسند نہیں ہیں۔ سبھی انسانی چہرے ایک سے ہیں۔ سبھی درخت ایک سے ہیں۔ آدمی، ماحول، فطرت اپنے تنوّع اور رنگا رنگی میں نظر نہیں آتی۔ وادی کی خوبصورتی اور دلکشی کی ایک بھی تصویر اِن میں نہیں ہے۔ انسان اور فطرت دونوں کو علامتوں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ کانگڑہ اسکول کی مصوّری میں اکثر ہوتا ہے۔ اِن تصویروں میں اندھیرا بہت ہے۔ بُدھ کا موضوع غالب ہے۔ اِن تصویروں کو دیکھ کر دل پر مایوسی کا تاثر زیادہ ہوتا ہے۔"

"شاید یہ تصویریں انسان کی دھرتی سے جُدائی کی یاد دلاتی ہیں۔ جب پرمار راجپوتوں کو اپنا گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور اِس اجنبی وادی میں پناہ لینی پڑی۔ اِسی لئے مایوسی اور اندھیرے کا رنگ غالب ہے۔ مجھے تو یہ علامتیں پسند ہیں۔ اِس لئے کہ انسانوں کے چہروں کی ظاہری ساخت کے اختلاف کے باوجود وہ اندر سے ایک سے ہیں۔ فطرت کی اندرونی حقیقت کو بھی اِسی طرح علامتی انداز میں ڈھالا گیا ہے۔ یہاں تک کہ انسان، ماحول اور فطرت کسی ایک ہی اندرونی کرب کی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ مغربی مصوّری کے بہترین شاہکار باہر کی حقیقت کی اہمیت جتاتے ہیں۔ اِن غاروں کی مصوّری کا رُخ اندر کی طرف ہے۔ جیسے خود انسانی روح

ایک غار ہو۔ جس میں معصوم اپنے موقلم سے راستہ ٹٹول رہا ہو!

اِن تصویروں کو دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگتا ہے" نسیمہ کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں ہونے لگے "اِن تصویروں کو دیکھ کر مسکرانا بھی مشکل ہے۔ یہ تصویریں فطرت کی رعنائی، انسان کی اُمید، عورت اور اُس کے شباب کی مسرت کو جھٹلاتی ہیں"

"مسرت ہے کہاں؟ مسرت تو ایک چھلاوا ہے۔ کرب انسان کی ابدی قسمت ہے۔ اُس کی مستقل تقدیر۔ تم خود اپنے دل کے زخم دیکھو...!"

"لیکن ان زخموں کے باوجود دل کی کسی گہرائی میں چٹانوں کے اندر دبا ہوا مسرت کا کوئی چشمہ بہتا ہے اور اُس شوالے کی دراڑوں سے رِس رِس کر بہنے والے پانی کی طرح باہر آنے کو بیتاب ہے۔ میں جوان ہوں اور خوشی میرے بدن کے ذرّے ذرّے سے پھُوٹ کر بہنے کو بے چین ہے۔ تم اِس بات کو کیوں نہیں سمجھتے؟"

نسیمہ نے بے حد شدّت سے کہا "روح کا بھی ایک جسم ہوتا ہے!"

"مجھے معلوم ہے لیکن میرے لئے اِس بات میں زیادہ اہمیت ہے کہ ہر جسم کی ایک روح ہوتی ہے" میں نے نسیمہ سے کہا۔

"تم آفاقی اور مابعد الطبیعاتی باتیں کرتے ہو۔ تم پرلے درجے کے احمق ہو۔ اِس دُنیا کے باہر کچھ نہیں ہے اور میں تو اِسی دُنیا کی ہوں اور اِسی دُنیا کی خوشیاں مجھے چاہئیں اور وہ بھی جھولی بھر کر...!"

"پھر تم نے اکرم سے اپنی جھولی کیوں نہیں بھر لی؟"

"اِس لئے کہ اُس کا دامن خالی تھا۔ اُس وقت جب اُس نے مجھ سے محبت کی، مجھے وہ بہت پسند تھا اور آج مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں نے زندگی میں پہلی بار اُس سے محبت کی ہوگی لیکن اُس وقت معلوم نہ تھا۔ اُس وقت میرے ماں باپ نے میرے سامنے محمود رکھا۔ محمود جو جوان اور خوبصورت اور ایک امیر و کبیر جاگیردار کا بیٹا تھا۔ وہ میرے سارے خواب پُورے کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے خواب تو پُورے کر لئے۔ لیکن اکرم مجھے یاد آتا رہا۔ تنہائیوں کے سُونے لمحوں میں میری روح میں چٹکیاں لیتا رہا۔ کبھی کلی کی طرح مہکتا تھا، کبھی کانٹے کی طرح زخم دیتا تھا لیکن میرے اِرد گِرد خوشیاں اِتنی تھیں کہ میں نے اکرم کی یاد کو اَن گِنت حریری تہوں کے اندر چھُپا دیا تھا تاکہ بھُولے سے بھی میری نظر اُس پر نہ پڑے"

"آدمی جس کا گُناہ گار ہوتا ہے، اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا" میں نے کہا۔

"گُناہ گار تو میں محمود کی بھی ہوں کہ مصیبت میں اُس کا ساتھ نہیں دے رہی ہوں"

"کیوں؟ دس سال سے تم اِس زندگی کی ساری دلکشیوں اور رعنائیوں سے دُور اِس ویرانے میں پڑی ہو۔ کاہے کے لئے؟ اپنے شوہر کا ساتھ دینے کے لئے نا ___؟"

"دل سے تو ساتھ نہیں ہوں۔ من کو مار کر یہاں آئی ہوں لیکن من مرتا تو نہیں ہے۔ پھر وہ قربانی کوئی قربانی ہے جو ہر لمحہ ایک کانٹے کی طرح کھٹکے پھر لمحہ جس قربانی کی دیوار کو توڑ کر زندگی کی جوان بانہوں میں آنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ قربانی قربانی نہیں رہتی، زنجیر بن جاتی ہے... دس سال سے میں یہ قید کاٹ رہی ہوں۔ آخر میں نے ایسا کونسا گُناہ کیا ہے؟"

نسیمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"پھر تم محمود کو چھوڑ کر چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

وہ ایک طویل آہ بھر کر بولی "اب کیسے چھوڑ کر جاؤں؟ جس کے لئے دس سال سے اپنا سب کچھ تباہ کر لیا ہے۔ اب اُسے چھوڑ کر جانے سے کیا فائدہ؟"

"اکرم کہاں ہے؟"

"ہوگا کہیں" نسیمہ نے تلخی سے کہا ___ "اب سے تین سال پہلے جب محمود کو ایک کینسر ہوا تھا اور میں اُسے بمبئی لے گئی تھی، ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ میں علاج کرانے کے لئے۔ اُن دنوں بمبئی میں ایک بار اکرم ملا تھا۔ انجینئر بن گیا ہے کسی فرم میں پچیس سو تنخواہ لیتا ہے"

"خوش تھا؟"

"خوش کیوں نہ ہوگا؟"

"شادی کر لی ہوگی اُس نے؟" میں نے پُوچھا۔

نسیمہ بولی "میں پُوچھنے کی جرأت نہ کر سکی لیکن شادی کیوں نہ کی ہوگی اُس نے۔ ایسے لڑکے کو کون کنوارا رہنے دیتا ہے۔ اب تو اُس کے بچّے بھی ہوں گے"

نسیمہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اُس کی آواز میں ایسا رشک تھا جیسے وہ بچّے اُس کے کیوں نہ ہوئے اکرم سے ___ اور ایسا غصّہ کہ اکرم کو کسی دوسری عورت سے شادی کرنے کا حق ہی کیا تھا؟ عورت کی مالکانہ حِس بہت تیز ہوتی ہے۔ اُس کے لئے محبت کوئی دھندلی دھندلی چاندنی نہیں ہے۔ اُس کے لئے محبت ایک ایسا محدود و متشکل جذبہ ہے، جو اُس کے ہاتھوں کی گرفت میں آسکتا ہے اور جسے وہ جب چاہتی ہے، اُٹھا کر اپنے پرس میں ڈال سکتی ہے۔ محبت کی مبہم، ماورائی، پُراسرار اور غیر محدود کیفیت سے وہ بہت گھبراتی ہے۔ اِسی لئے میں کسی ایسی عورت سے محبت نہیں کر سکتا جو اِس دُنیا کی ہو۔ مجھے تو بس وہ گلابی چرن کمل پسند ہیں جو مجھے کبھی کبھی خیال کے اُفق پر ناچتے ہوئے نظر آجاتے ہیں!

کہانی سننے کے بعد روی داس نے بتایا: "صاحب! ابھی وہ غار اور بھی ہیں جو بیگم صاحبہ نے ابھی نہیں دیکھے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" نسیمہ ایکدم شوق اور خوشی سے تقریباً چیخ کر بولی۔

"وہ اُدھر ہیں۔ اُس گھاٹی کے پیچھے!" روی داس نے دُور افتادہ جنگلوں سے گھری ہوئی ایک گھاٹی کی طرف اشارہ کرکے بتایا۔

نسیمہ نے دیکھ کر کہا: "پورا دن لگ جائے گا وہاں تک پہنچنے میں!"

میں نے اُس گھاٹی کی طرف دیکھ کر کہا: "دیکھنے میں تو وہ جگہ بہت نزدیک نظر آتی ہے۔"

"بُدھو!" نسیمہ ایکدم بے تکلفی سے بول پڑی: "پہاڑی جگہیں دُور سے دیکھنے میں بہت نزدیک نظر آتی ہیں لیکن جتنے قریب جاؤ اُتنی دُور ہوتی جاتی ہیں۔"

"عورت کی طرح نا؟" میں نے نسیمہ سے پوچھا۔

وہ ہنس پڑی لیکن اُس کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا۔ کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی: "میں نے تمھیں سب جگہیں بتا دی ہیں۔ اب میں جاتی ہوں——!"

"بیٹھو۔ شام کو ساتھ چلیں گے!"

"کیا تم سمجھتے ہو میرا جی نہیں چاہتا۔ مُدّت کے بعد تو اپنے وطن کے ایک آدمی کی صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ مگر۔ . . !"

اِتنا کہہ کر وہ چُپ ہو گئی۔

"اچھا جاؤ۔ روی داس تمھیں گھر تک پہنچا آئے گا!"

"پھر ملیں گے" یہ کہہ کر نسیمہ مجھ سے رخصت ہوئی۔ روی داس کو میں نے ہدایت کی کہ وہ بیگم صاحبہ کو گھر تک پہنچا کر لوٹ آئے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے اپنا سامان درست کیا۔ غار کی دیواروں کا چکر لگایا۔ ہر تصویر کو غور سے دیکھا۔ آخر اُس تصویر کے سامنے اپنا ایزل رکھ دیا جو کانگڑہ کے مشہور مصوّر خوشی رام کی بنائی ہوئی تھی۔ جس میں ایک پہاڑی راجکماری آدھی رات کے وقت اپنے عاشق سے ملنے کے لئے برف و باراں کے طوفان میں جا رہی ہے۔ چند منٹوں میں میرے سامنے نہ یہ دُنیا تھی، نہ یہ غار تھا۔ میرے چاروں طرف طوفان گرج رہا تھا اور میں اُس راجکماری کو بانکا [illegible] سے چراغِ رُخِ زیبا لے کر [illegible] کو ڈھونڈتے ہوئے دیکھ رہا تھا!

[illegible]

(باقی آئندہ)

[illegible] تک آ گئے [illegible]

[illegible] خود کو بچا لیا ہے لیکن اگر آپ کو یہ افسانہ پسند نہ [illegible] چھپنے لگے" میرے خیال میں ابھی تکنیک کی [illegible]

خلوص کار ——— ظفر اوگانوی

غزل

شباب للت ایم۔ اے

رہروانِ شوق کے قلب و جگر تھرا گئے — قافلے یارب یہ کیسی رہگزر پر آ گئے
کیسی نازک بات اُن کی چور نظریں کہہ گئیں — رازِ اُلفت وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے
آج پھر گزرے مرے نزدیک سے مُنہ پھیر کر — لیجئے وہ پھر دلِ مجبور کو تڑپا گئے
اُن کے جانے کی خلش میں کس کو اتنا ہوش تھا — جاتے جاتے وہ لبِ نازک سے کیا فرما گئے
اُف یہ احساسِ ندامت، یہ شعورِ کمتری — دیکھ کر رِندوں کو شیخِ محترم شرما گئے
اب خُدا خود ہی سفینے کا محافظ ہو تو ہو — ناخداؤں کی جبیں پر تو پسینے آ گئے

کیا جوابِ پرسشِ غم اُن کو ہم دیتے شباب
ہاتھ دل پر آ گیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے

[illegible]ال نوچے گی اور پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکرائے گی۔

"مالکن جی یہ ڈاک آئی ہے۔"

"یہ خط صاحب کی ٹیبل پر رکھ دو اور یہ میگزین مجھے اٹھا کر دے دو۔"

لیکن وہ ماں اپنی بیٹی کو کس طرح بچا سکتی ہے جو خود کو جلنے سے نہ بچا سکی۔ میں کس پر الزام رکھوں کہ مجھے آگ میں کس نے جھونکا۔ میں آج سے بیس سال پہلے کس سے کہتی کہ میرے خیالات پڑھو۔ میرے مستقبل کے لئے مجھ سے بھی پوچھو۔ میں اتنی سے کبھی لا یڈی سے کبھی کہ میں نے آنرز میں ٹاپ کیا ہے۔ میرے بھی کچھ آئیڈیل ہیں، کچھ تمنّائیں ہیں۔ مجھے موقع دیا جائے تو میں ایم۔ اے میں بھی پہلی پوزیشن حاصل کر سکتی ہوں لیکن یہ سب کس سے کہتی۔ میری خاموش تمنّاؤں کی زبان کون سمجھتا؟

"ممّی! ممّی!! دیکھئے کرشن چندر نے کتنی پیاری کہانی لکھی ہے "بُڑھی" ونڈر فل!!"

"میں کہتی ہوں یہ افسانے اور ڈرامے تیرا دماغ خراب کر دیں گے۔ انھیں مت پڑھا کر!"

"میری پیاری ممّی! ادب دل کو تازگی اور دماغ کو روشنی دیتا ہے۔"

"بیٹی! نظریات کی باتیں لڑکیوں کو زیب نہیں دیتیں۔"

ایک ژوتا ... ہے" میں نے نسیم سے کہا۔

"تم آفاقی اور مابعد الطبیعاتی باتیں کرتے ہو۔ تم پرلے درجے کے احمق ہو۔ اِس دُنیا کے باہر کچھ نہیں ہے اور میں تو اِسی دُنیا کی ہوں اور اِسی دُنیا کی خوشیاں مجھے چاہیئں اور وہ بھی جھولی بھر کر... !"

"پھر تم نے اکرم سے اپنی جھولی کیوں نہیں بھر لی؟"

"اِس لئے کہ اُس کا دامن خالی تھا۔ اُس وقت جب اُس نے مجھ سے محبت کی، مجھے وہ بہت پسند تھا اور آج مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میں نے زندگی میں پہلی بار اُس سے محبت کی ہو گی لیکن اُس وقت معلوم نہ تھا۔ اُس وقت میرے ماں باپ نے میرے سامنے محمود رکھا۔ محمود جو جوان اور خوبصورت اور ایک امیر و کبیر جاگیردار کا بیٹا تھا۔ وہ میرے سارے خواب پُورے کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے خواب تو پُورے کر لئے لیکن اکرم مجھے یاد آتا رہا۔ تنہائیوں کے سُونے لمحوں میں میری روح میں چٹکیاں لیتا رہا۔ کبھی کلی کی طرح مہکتا تھا، کبھی کانٹے کی طرح زخم دیتا تھا لیکن میرے اِرد گِرد خوشیاں اِتنی تھیں کہ میں نے اکرم کی یاد کو اَن گنت حریری تہوں کے اندر چھپا دیا تھا تاکہ بھولے سے بھی میری نظر اُس پر نہ پڑے۔"

"آدمی جس کا گُناہ گار ہوتا ہے، اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا ـــــ" میں نے کہا۔

"گُناہ گار تو میں محمود کی بھی ہوں کہ مصیبت میں اُس کا ساتھ نہیں دے رہی ہوں۔"

"کیوں؟ دس سال سے تم اِس زندگی کی ساری دلکشیوں اور رعنائیوں

چھینٹے لہو کے

ظفر اوگانوی، ایم۔ اے

نشیمن، رمنہ روڈ، پٹنہ ۶

۱۱ فروری ۱۹۶۶ء گرامی قدر اعتبار صاحب!!

"بیسویں صدی" میں کچھ لکھے ہوئے مدت ہوگئی ـــ کیوں؟ میں نہیں جانتا۔ اس وقت پی ایچ۔ ڈی کی تیاری میں الجھا ہوا ہوں۔ اس لئے خاصہ وقت حضرت قمر بلگرامی مرحوم کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ افسانہ بھی نہ ہو پاتا۔ وہ تو میسور کی ایک بچی سے ڈر کر لکھا گیا ہے۔ جس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اس مہینے میں بھی میں نے کچھ نہ لکھا تو مجھے "غریب دکھیا کی راتیں لگ جائیں گی"۔ اس کی راتوں سے تو میں نے خود کو بچا لیا ہے لیکن اگر آپ کو یہ افسانہ پسند نہ آیا تو پھر آپ ہی بتائیے میرا کیا ہوگا؟ خدا اپنا رحم کرے ـــ "چھینٹے لہو کے" میرے خیال میں اپنی تکنیک کی جدت کی وجہ سے بے حد مقبول ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟... خلوص کار ـــ ظفر اوگانوی

آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں اپنے ماضی کی طرف کیوں لوٹنا چاہ رہی ہوں۔ حالانکہ اب میں اس جگہ پہنچ چکی ہوں جہاں سے مڑ کر دیکھنا بھی مشکل ہے۔ ماضی کی راکھ بس اب رہ گئی ہے۔ بھلا اس میں کوئی چنگاری اب کیا ہوگی۔ برسوں پہلے کی آگ تو کبھی کی بجھ چکی اور پھر جمی ہوئی برف کو پگھلانے سے کیا فائدہ؛ چھوڑو بھی، جو ہوا اچھا ہی ہوا لیکن پھر شمی کا کیا ہوگا؟ کیا وہ بھی میری طرح چالیس سال کی عمر میں ماضی کی سرد راکھ میں یادوں کی چنگاریاں تلاش کرتی پھرے گی۔ نہیں! میں اسے بچاؤں گی۔ اسے بچانا ہی ہوگا۔

"ممی! ممی ڈارلنگ!!"

"شمی بیٹی! تمھیں آج کالج سے آنے میں دیر کیوں ہوگئی؟"

"میں رشیدہ باجی کے ساتھ ہارڈنگ پارک میں فلاور شو دیکھنے چلی گئی تھی۔ زندگی میں اتنے خوبصورت پھول میں نے کبھی نہیں دیکھے ممی! ـــ کرسنتھیمم اور کرسنتھیا! میرے لئے کچھ [illegible]!"

میں چاہتی ہوں، اپنی شمی کو اس لمحے سے بچا لوں جب وہ آئینے کے سامنے جانے سے نفرت کرے گی۔ اس کے پھول سے رخسار مرجھا جائیں گے۔ اس کی آنکھوں سے گدلا پانی بہے گا اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ جائیں گے اور وہ ایم۔ اے کی ڈگری جلا ڈالے گی۔ بال نوچے گی اور پاگلوں کی طرح دیواروں سے سر ٹکرائے گی۔

"مالکن جی یہ ڈاک آئی ہے"

"یہ خط صاحب کی ٹیبل پر رکھ دو اور میگزین شمی بٹیا کو دے دو"

لیکن وہ ماں اپنی بیٹی کو کس طرح بچا سکتی ہے جو خود کو جلنے سے نہ بچا سکی۔

میں کس پر الزام رکھوں کہ مجھے آگ میں کس نے جھونکا۔ میں آج سے بیس سال پہلے کس سے کہتی کہ میرے خیالات پڑھو۔ میرے مستقبل کے لئے مجھ سے بھی پوچھو۔ میں امی سے کہتی ڈیڈی سے کہتی کہ میں نے آنرز میں ٹاپ کیا ہے۔ میرے بھی کچھ آئیڈیل ہیں، کچھ تمنائیں ہیں۔ مجھے موقع دیا جاتا تو میں ایم۔ اے میں بھی یہی پوزیشن حاصل کر سکتی ہوں لیکن یہ سب کس سے کہتی۔ میری خاموش تمناؤں کی زبان کون سمجھتا؟

"ممی! ممی!! دیکھئے کرشن چندر نے کتنی پیاری کہانی لکھی ہے۔ "جڑی" ونڈرفل!!"

"میں کہتی ہوں یہ افسانے اور ڈرامے تیرا دماغ خراب کردیں گے۔ انھیں مت پڑھا کر!"

"میری پیاری ممی! ادب دل کو تازگی اور دماغ کو روشنی دیتا ہے"

"بیٹی! نظریات کی باتیں لڑکیوں کو زیب نہیں دیتیں"

حدیثِ دل

قتیل اب دل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی
کوئی میری طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے ——— قتیل شفائی

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے ——— مجاز لکھنوی

اِس کو نعمت کہوں کہ ظلم کہوں
ایک دل اور اِس قدر حسّاس ——— نازش پرتاپ گڑھی

کس کو ملتی ہے جگر یہ دولتِ بیدار بھی
لاکھ جامِ جم کے بدلے ایک ٹوٹا دل سہی ——— جگر مرادآبادی

اس طرح کچھ اُس نے چھیڑا سازِ دل
دیر تک ہر تار تھرّاتا رہا ——— جاں نثار اختر

(مُرسلہ: سید قدیر۔ گولکنڈہ۔ حیدرآباد)

"ممی! آپ تو آج اُنیسویں صدی کی باتیں کر رہی ہیں"

لیکن میں اُسے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ اُنیسویں صدی نہیں، بیسویں صدی کی باتیں ہیں اور وہ اکیسویں صدی کی باتیں کرتی ہے۔ اُسے ایسا نہ کرنا چاہئے۔ اُسے تو سوچنا چاہئے کہ ہمارا سماج ابھی وہ نہیں ہو سکا جو اُسے آج ہونا چاہئے۔ وہ نہیں سمجھتی کہ عورت ہندوستان میں کیوں پیدا ہوئی ہے۔ ابھی بچّی ہے۔ اُس کی عمر ہی کیا ہے؟ یہی بیس سال! لیکن میں نے تو اپنی اِس عمر میں غالبؔ و آتشؔ سے محبت کی تھی۔ سرورؔ سرشارؔ سے پیار کیا تھا۔ کالجوں کی طالبات کے جلوس نکالے تھے۔ وطن کی آزادی کے لئے مردوں کے دوش بدوش قدم بڑھائے تھے لیکن وہ سب کیا ہوا؟ میرے خوابوں کی مجھے کیا تعبیر ملی؟

"میں تمہارے قدموں میں دُنیا کی دولت نچھاور کر دوں گا!"

"آپ کا خلوص اور پیار ہی میرے لئے سب سے بڑی دولت ہے!"

"اوہ! نو، ڈارلنگ! آج کی دُنیا میں صرف روپوں کی عزت ہے۔ خلوص و محبت جیسی چیزیں تو روپے سیر خریدی جا سکتی ہیں۔ تم تو بہت ہی گھِسی پِٹی باتیں کرتی ہو"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں گھِسی پِٹی باتیں کرتی ہوں لیکن میں بھی تعلیم یافتہ ہوں اور مجھے بھی حق پہنچتا ہے کہ میں خود سوچوں کہ خلوص و محبت اور روپے میں کیا فرق ہے"

"اور مجھے یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ میں شوہر اور بیوی کی حد پار کر سکتی ہوں:

میں شمی کو لاکھ سمجھاتی ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر کیوں اپنا مستقبل تباہ کر رہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تھک ہار کر اُسے چھوڑ دیا ہے۔ جو چاہے کرے۔ وہ کہتی ہے، اُردو میں ڈی۔ لٹ کرے گی۔ یہ سُن کر میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے اور جب میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تو میں شمی کے ڈیڈی سے کہتی ہوں وہ اُس کی تعلیم ختم کرا دیں۔ اُس نے بی۔ اے کر لیا۔ کافی ہے۔

"شمی کی ماں تم نے مجھے ہمیشہ غلط سمجھا۔ مجھ سے تم نے کوئی خوشی نہ دی۔ میں نے تمہیں خوش رکھنے کے لئے یہ لمبی چوڑی کوٹھی، خوبصورت کار اور بنک بیلنس سبھی کچھ تو مہیا کیا لیکن اب بھی پتہ نہیں تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ شمی کا کالج جانا بند کرا دیجئے"

"آخر کیوں ——— ؟"

"یہ میری خواہش ہے"

"تم پاگل ہو!"

لان میں اِتنی عورتیں اور یہ مرد کیوں آ رہے ہیں؟ میں پاگل ہوں لیکن یہ لوگ تو پاگل نہیں ہیں۔ آخر کیوں یہ ہنگامے ہو رہے ہیں؟ یہ مٹھائیاں یہ پارٹی کے انتظامات محض اِس لئے کہ شمی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "گرم راکھ" منظرِ عام پر آیا ہے اور اِس خوشی میں سبھی کے چہرے مُسکرا رہے ہیں، قہقہے اُبل رہے ہیں، مبارکباد دی جا رہی ہے۔ شمی کے ڈیڈی فخر سے پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ شمی خود بھی چہک رہی ہے اور عورتیں مجھے گھیرے بیٹھی ہیں ——— یہ مسز درّانی ہیں اور وہ بلو پرنٹ ڈیکرون کی ساڑی میں سامنے بیٹھی ہوئی مسز خاقان ہیں۔ اُن کی بغل میں مسز رحمان بکریوں کی طرح پان چبا رہی ہیں اور یہ مسز چکرورتی ہیں جن کی سمجھ میں اُردو بالکل نہیں آتی، اِس لئے وہ سب کا مُنہ تک رہی ہیں ——— لیکن اِس ہجوم میں میں خود کو تنہا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے، میرا دماغ پھٹ جائے گا اور میں رونے لگوں گی۔ لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتی۔ میں تو صرف یہ دیکھ رہی ہوں کہ میرے سامنے اُردو کے مشہور ناقد پروفیسر رحمانی ڈائس پر کھڑے ہوئے مہمانوں کو خطاب کر رہے ہیں۔

"شمیم نکہت اپنے افسانوں میں بہت ہی دلکش اور تاثراتی تکنیک کے ذریعہ مسائل کی طرف قاری کو متوجہ کرنا جانتی ہے ——— شمیم نکہت نے اپنے منفرد نظریۂ حیات اور دلکشی فن کے ذریعہ دیکھتے دیکھتے جو شہرت حاصل کی ہے وہ اُردو افسانے کے لئے ایک نیک شگون ہے"

اور تبھی میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ہیں لیکن میں اِن آنسوؤں کو

جانتی ہوں کہ وہ کبھی ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ شمی میری بیٹی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ شمیم نکہت کے پڑھنے والے اور اُس کے ناقد اُس کے افسانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں اُس کے مستقبل کو جاننا چاہتی ہوں۔ وہ اسے اِس بلندی پر لے جانا چاہتی ہے جہاں سے گر کر وہ بے چاری سنبھل بھی نہ پائے گی اور میں اُسے روکنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے لئے شمی ہے، شمیم نکہت نہیں ہے۔ میں اُس کی ماں ہوں تو وہ میری بیٹی ہے۔

"ممی! آج میں راشد خلیق کے یہاں جا رہی ہوں۔ اُن کے یہاں ایک ادبی نشست ہے نا۔ کچھ دیر سے لوٹوں گی۔"

"میں کہتی ہوں راشد صاحب کی نظم آل انڈیا مشاعرے کی سب سے اچھی نظم تھی ممی!"

"راشد بہت اچھا شاعر بھی ہے اور بہت پیارا انسان بھی۔ ممی کبھی کبھی تو اُس سے بس فضول باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

راشد! راشد!! راشد!!! میں اِس نام سے محبت کروں یا نفرت؟ میں نہیں سمجھ پا رہی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے، راشد ایک ذہین اور مشہور شاعر ہے لیکن صرف اِتنا ہونا ہی تو سب کچھ نہیں۔ زندگی کو سماج کے طویل پُرخار راستے پر لے جانے کے لئے کچھ اور بھی تو چاہئے۔ شمی بھی اِس حقیقت سے واقف ہے، پھر بھی وہ ایک مفلس شاعر کا خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ راشد سے قریب ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے، مجھے نہیں معلوم۔ میرے لئے تو بس اِتنا ہی جاننا کافی ہے کہ میں ایک ماں ہوں اور ماں کو اپنے جوان بچوں پر بھروسہ کرنا ہی چاہئے۔ پھر شمی جیسی سمجھ دار اور پڑھی لکھی لڑکیاں اگر اپنے مستقبل کی تعمیر خود اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہیں تو اِس کی بھی اُنھیں اجازت ہونی چاہئے۔ میں خود یہ چاہتی ہوں کہ یہ دونوں زندگی میں ایک نظریۂ حیات، ایک اصولِ محبت لے کر ساتھ ساتھ چلیں لیکن شمی کے ڈیڈی!

"شمی کی شادی میں نے چودھری کرامت کے لڑکے افضل آئی۔ اے۔ ایس سے طے کر دی ہے۔"

"آپ نے شمی سے بھی تو پُوچھا ہوتا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟"

"تم تو پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا اس سے اچھا لڑکا اُسے اور کہاں ملے گا۔ چودھری کے پاس لاکھوں کی دولت ہے اور اُس کا تنہا وارث افضل ہے۔ وہ تو تمھاری شمی کی قسمت اچھی تھی جو چودھری نے ہاں کر لی۔"

اور اب وہی ہونے والا ہے جس کا ڈر تھا۔ شمی کے آئیڈیل کتابوں میں بند رہ جائیں گے۔ وہ سوچے گی اور سوچتی ہی رہے گی۔ اُسے کچھ نہ ملے گا۔ پھر ایک وقت آئے گا جب وہ میری عمر میں پہنچ کر یادوں کی راکھ میں کوئی چنگاری تلاش کرے گی اور ذہن

یادِ محبوب

کس رات تیری یاد سے غافل رہا ہے دل
کس دن ترے خیال میں ڈوبا ہوا نہ تھا ——— عزیز لکھنوی

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں ——— فیض احمد فیض

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں
آپ کی یاد کے سوا نہ رہا ——— حسرت موہانی

میری بیتابیٔ فرقت سر بسر رشکِ سکون
تیری یادوں نے سکھایا مجھ کو گھبرانے کا فن ——— فراق گورکھپوری

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے ——— فیض احمد فیض

(مُرسلہ:۔ ایس۔ ایس ہتکاری، ایم۔ اے، کلکتہ)

کے سب سے نچلے خانے میں کہیں اُس کا راشد شعر ابھٹا کوئی غزل گنگنا رہا ہوگا۔

"بیٹی! میں تمھارا باپ ہوں۔ میں نے تم سے آج تک کچھ نہیں مانگا۔ تمھاری ہر خواہش، ہر تمنّا میں نے پُوری کرنے کی کوشش کی۔ تمھیں آزادی دی، آزاد ماحول مہیا کیا۔ جو ہو سکا میں نے تمھیں دیا لیکن آج میں تم سے ایک اور صرف ایک اُمید وابستہ کرنا چاہتا ہوں اِس یقین کے ساتھ کہ تم مجھے ٹھیس نہ پہنچاؤ گی۔"

"ڈیڈی! میں اب ایسی جگہ پر پہنچ چکی ہوں جہاں سے میری منزل زیادہ قریب اور صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اگر آپ مجھ سے یہ کہیں گے کہ میں اپنی منزل سے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤں تو ناممکن ہے۔ ہاں آپ اگر میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دیں یا میری آنکھیں پھوڑ دیں تو ظاہر ہے کہ میں وہاں تک خود ہی نہیں پہنچ پاؤں گی۔"

"تو کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ پڑھنے لکھنے کے بعد باپ کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے بچّوں کے لئے اچھے راستوں کا تعین نہیں کر سکتا۔"

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں ڈیڈی! والدین صرف راستے متعین کرنے کا حق رکھتے ہیں اور منزل بتانا تو جوان بچّوں کا حق ہے۔"

"میں تم سے بحث نہ کروں گا۔ یہ میرا حکم ہے اور تمھیں ماننا ہوگا۔"

"آپ کا حکم میں ضرور پورا کروں گی لیکن یہ میری مرضی نہیں ہے۔"

آج پھر گھر کے اندر اور باہر لوگوں کا ہجوم ہے۔ ایک چہل پہل ہے، آوازیں ہیں

ور قہقہے ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر گانے پر فلمی ریکارڈ بج رہے ہیں۔ میرا شمیں عطیہ کی شادی ہوئے ایک لیک کر جاسے کیا گا رہی ہیں۔ عورتیں قیمتی کپڑوں میں پھسل رہی ہیں اور میری بہن شمی سنواری جا رہی ہے۔ سر سے پیر تک اُسے نکھارا جا رہا ہے۔ اُس کے جسم پر سونے کے زیوروں کے سانپ اور بچھو لٹکائے جاتے ہیں ــــــ اور میں یہ سوچ رہی ہوں، کیا ہو گیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن میرا یہ احساس آواز نہ بن پائے گا۔ اس لئے آج افضل کو شمی کی قسمت کا مالک بنانے سے بھی کون روک سکے گا۔ کوئی نہیں! لیکن آج کے مقابلے میں کل کا احساس زیادہ شدید ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے میں آج ہی یہ سوچ رہی ہوں کہ شمی کے لئے آنے والا کل کیا ہوگا اور کیا لائے گا۔

"شمی ڈارلنگ! جانتی ہو آج ڈیڈی نے تمھارے لئے ایک قیمتی اور لیٹسٹ ماڈل کار خریدنے کا آرڈر بک کرا دیا ہے لیکن تمھیں کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ تم جانے کیا سوچ رہی ہو؟"

"میں سوچ رہی ہوں، احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر کتنا اچھا ہے، کتنا قیمتی ہے ؎

سر بچا لاتے ہو سکن یہ زیاں تو دیکھو
کتنا ویران ہے تا حدِ نظر، منظرِ دار

"شعر کی یہی کوئی قیمت ہوا کرتی ہے۔ یہ بھی بار ہا ... آج تک یہ سمجھتا آیا ہوں کہ کار کی، سونے کی، بلڈنگ کی یا پھر اقتدار کی قیمت ہوا کرتی ہے اور یہ سب کچھ دولت سے حاصل کیا جاتا ہے اور دولت کس طرح کمائی جاتی ہے یہ ڈیڈی جانتے ہیں، اُن کے بعد کچھ میں جانتا ہوں۔"

"میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ . . ؟"

اور جب شمی اپنے افضل کو نہیں سمجھا پاتی تو میرے پاس اپنی بے بسی لئے چلی آتی ہے اور مجھ سے پوچھتی ہے تم نے آج تک اس سے اچھا شعر بھی کوئی سنا ہے ؎

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے شمی کے جسم پر کسی نے تیزاب کی بوتل اُنڈیل دی ہو اور میری بے بسی اُس کا مُنہ تکتی رہ گئی ہو !!

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (خبر عبیرین صدی دہلی)

غزلیں

رشی پٹیالوی

روشنی ہے آنکھوں میں دل میں بھی اُجالا ہے
سامنا ترا شاید آج ہونے والا ہے

اِک نظر جو ٹھہری ہے جامِ دل کی لبریزی
ساغرِ طلب کو اب ہم نے توڑ ڈالا ہے

اُن کا ذکر کرتے ہیں، داستاں کے پردے میں
رسم و راہِ اُلفت کا راستہ نکالا ہے

اہلِ عقل و دانش بھی آپ میں نہیں رہتے
اُن کے آستانے کا ذکر ہی نرالا ہے

عشق کے تقاضوں کی ہم قسم نہ کھائیں گے
زیست کے تقاضوں کو مشکلوں سے ٹالا ہے

کس کا دل تڑپتا ہے درد کے فسانے پر
ہم کہے تو جاتے ہیں کون سُننے والا ہے

داغِ دل اُڑا تا ہے اب ہنسی اندھیروں کی
آپ کی نوازش سے ہر طرف اُجالا ہے

دم اُسی کا بھرتی ہے زندگی بھی رہ رہ کر
دوستی کے پردے میں جس نے مار ڈالا ہے

اے رشی ہمیں سے ہیں سربلندیاں غم کی
اِک جہاں کی مشکل کو زندگی میں ڈھالا ہے

سیّد یزدانی جالندھری

بزمِ وفا سبھی تو عجب سلسلے ہوئے
شکوے ہوئے نہ اُن سے، نہ ہم سے گلے ہوئے

پت جھڑ کا ذکر عہدِ خزاں میں نہ ہو سکا
تھے سرزمینِ دل پہ شگوفے کھلے ہوئے

اِک عمر سے ہے دوش پہ بارِ مسافرت
سُنتے تھے منزلوں سے ہیں رستے ملے ہوئے

کل تک تھا صرف شامِ جدائی کا احتمال
پیدا دلوں میں آج ہیں فاصلے ہوئے

یارائے گفتگو، نہ تمنائے گفتگو
دیکھے ہیں ہم نے ہونٹ یہاں تک سلے ہوئے

دیکھو ہمیں کہ ہم نے اُبھارے ہیں آفتاب
دیکھو ہمیں کہ خاک میں ہم ہیں ملے ہوئے

یزدانی حزیں ہے عجب زندگی کا باغ
کانٹوں کے درمیاں ہیں شگوفے کھلے ہوئے

پتھر کی آنکھیں

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔ ایم۔ اے، ڈی۔ لٹ

۱۵۔ جواہر نگر۔ گورنمنٹ کوارٹرز۔ سرینگر (کشمیر)

۰ جنوری ۱۹۶۶ء   پیارے بھائی! آداب

کسی فارسی شاعر کا یہ خیال کتنا اچھا خیال ہے کہ خضر کا کام تو مختلف راستوں پر رہنمائی کرنا ہے جب تک ہم منزل پر نہ پہنچ جائیں، خضر رہبر ہے۔ اس لئے جب تک ذہن میں خضر کا پیکر اور تصور ہے، ہم راستوں پر رہیں گے ـــــ آج اُردو افسانہ نگاروں کا کوئی خضر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی منزلیں نظر آرہی ہیں۔ نقاد خضر بن جاتے ہیں تو افسانہ نگاروں کے سامنے صرف پہلے ہوئے راستے ہوتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب خضر نظر نہیں آتے۔ اس طرح اُردو میں بہت خوبصورت اور اچھے افسانے لکھے گئے ہیں۔ نئے رجحانات اور نئے تجربے سامنے آئے ہیں۔ بعض دوسرے رسالوں کے ساتھ "بیسویں صدی" نے بہت سے اچھے افسانے پیش کئے ہیں۔ اُن افسانوں کے رجحانات ممکن ہے دب جاتے، اگر حضرت نقاد خضر بن جاتے۔ پچھلے برسوں میں بہت سے اچھے رجحانات کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملا۔ بات یہ تھی ـــــ "میاں۔ اُس رجحان کے ساتھ منزل کی طرف نہ جاؤ، میاں اِس رجحان کے ساتھ منزل کی طرف جاؤ" ـــــ "پتھر کی آنکھیں" حاضر ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ اُس "آدمی" کو مرتبان میں بند کر دیا جائے جس کی آنکھیں پتھر کی آنکھیں بن گئی ہیں اور اُس مرتبان کو "جانور" کے حوالے کر دیا جائے۔ شاید اُسے اِس سے ہمدردی ہو جائے۔ یہ "آدمی" رحم اور کرم کا محتاج ہے "بیسویں صدی" کے پڑھنے والوں کے سامنے آدمی بھی ہے اور جانور بھی۔ "جانور" مر چکا ہے "آدمی" زندہ ہے۔ اللہ اِسے سلامت رکھے!

مخلص ایک "آدمی" ـــــ شکیل الرحمٰن

"تم آدمی نہیں جانور ہو!"

یہ جملہ اُس کے ماضی کا عنوان تھا۔ بیلا اُسے جانور سمجھتی تھی۔ سچ وہ آدمی نہیں جانور تھا۔ اُس کی ہر حرکت دلچسپ تھی۔ وہ ہنستا تھا، گاتا تھا، حُسن کو دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا تھا، بے پناہ محبت کر سکتا تھا، بے پناہ نفرت کر سکتا تھا۔ آدمی تو اب بن گیا تھا۔

کھنڈر کے ٹوٹے مجسّمے اُس کے لئے آدمی تھے، پتھر تھے۔ یہ مجسّمے ہو سکتا ہے کل جانور ہوں لیکن آج تو ہر مجسمہ اُس کے لئے ایک آئینہ تھا۔ وہ اپنی صورت، اپنے چہرے کے خدوخال اُن میں دیکھ رہا تھا۔

جانور اور آدمی میں فرق یہ ہے کہ جانور پیدا ہوتا ہے، اُس کی تخلیق ہوتی ہے اور آدمی بنتا ہے، بنایا جاتا ہے۔ شاید اُسی طرح جس طرح جادو سے کوئی پتھر بن جائے اور کوئی پتھر سے مجسمہ بنائے۔

جانور ہونا زندگی کی دلیل ہے، آدمی ہونا سکوت کی دلیل ہے۔ سکوت! دل کی دھڑکنوں کی خاموشی، پورے وجود کا سکوت! اُف!! دَم گھٹتا ہے۔ اس تصور سے روح کانپ جاتی ہے۔ بھلا کون جانور آدمی بننا چاہے گا۔

حالات نے ڈاکٹر پاجپائی کو آدمی بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ آدمی بن جانے پر مجبور تھا۔

باجپائی مُسکراتا تھا۔ کام کرتے ہوئے گنگنا نہیں سکتا تھا۔ وہ اِس پُراسرار تبدیلی پر پہلے حیران ہوا، پھر اُس نے اِس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ اِس تبدیلی کی ایک بڑی وجہ اُسے معلوم ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ جانور سے آدمی بنانے میں اُس کے مقدّس پیشے کو بہت دخل ہے۔ اب وہ اپنی نئی زندگی کے سانچے میں اچھی طرح ڈھل چکا تھا۔ ماضی کے بارے میں پہلے اُس نے بہت سوچا۔ بیلا۔ اُس کی محبت اور اُس کے حُسن کے بارے میں اُس نے بہت سوچا، پھر کم سوچا اور اب تو ماضی اور بیلا دونوں کو اشوک کی ایک لاٹ بنا کر اُس نے اپنے وجود اور اپنے شعور سے بہت دُور کہیں نصب کر دیا تھا۔ اِس یاد میں وہ اب کبھی کچھ تلاش نہ کرتا، اِس یاد سے کوئی لذّت نہ لیتا۔ اِس یاد سے اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز نہ ہوتیں۔ صدیوں پُرانی بات تھی۔ حالانکہ یہ وہی یاد تھی جس سے اُس کے پورے وجود میں ہلچل سی آ جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پیار کا نشہ اُمڈ آتا۔ وہ گھنٹوں کھویا کھویا سا رہتا۔ بیلا کا پیکر اُبھرتا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں میں وہ جانے کیا کیا دیکھتا۔ اُس کی آواز اُسے نہ جانے کہاں کہاں لے جاتی۔ وہ گُم ہو جاتا۔ اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگتے۔ کچھ سوچ کر اُس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

اب اُس کے سوچنے کا انداز بدل چکا تھا۔ اب وہ ایک خاص انداز سے سوچتا تھا۔ اُسی طرح جس طرح ایک خاص انداز سے چلتا تھا۔ وہ آدمی بن کر بھی بہت عرصہ تک سوچنے کے معاملے میں آزاد تھا اور اپنی سوچ میں گُم ہو کر داخلی طور پر جانور بن جاتا تھا لیکن آخر کب تک؟ سوچنے پر پابندی تو نہ تھی لیکن سوچنا بیکار تھا۔ سوچ کر کرتا بھی کیا؟ اب تو وہ جانور بننے سے مجبور ہی تھا۔ چاہتا بھی تو شاید بن نہ پاتا۔ وہ آدمی بن چُکا تھا ــــــ مکمّل آدمی!

اپنی کتابوں کی الماریوں اور اپنے ٹیبل پر جانوروں کی نفسیات اور جانوروں کے کردار پر اُسے موٹی موٹی کتابیں ملتی تھیں۔ وہ انھیں پڑھتا تھا لیکن اُن سے لذّت لینے اور اُن کرداروں کا مطالعہ کرتے کرتے ماضی کے کھنڈر میں اُتر جانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ وہ اُن کتابوں کو چاٹ جاتا۔ پھر بھی لذّت حاصل نہ ہوتی۔ وہ اُن کتابوں کو تولتا تھا۔ اُن کے صفحات گنتا تھا۔ اُن کتابوں کے کرداروں کو الماریوں سے نکالتا تھا۔ اپنے ٹیبل پر انھیں اُسی طرح سجاتا تھا جس طرح کھلونوں کی دُکانوں پر کھلونے سجائے جاتے ہیں۔

وہ اُن سے باتیں کرتا تھا۔ کچھ اِس طرح ــــــ "اچھا تو تم جانور ہو"۔ "ہوں، کیسے جانور ہو؟" "اب سمجھ گیا" وہ اُن کرداروں کے لباس کا جائزہ لیتا۔ اُن کے جذبات کو اپنی سرنج سے باہر نکالتا۔ انھیں بڑی بڑی بوتلوں میں رکھتا۔ اُن کا تجزیہ کرتا۔ دیر تک اپنی لیباریٹری میں بیٹھا دیکھتا رہتا۔ اُن جذبوں میں کون سے رنگ ہیں۔ بنیادی رنگ کون سا ہے۔ یہ رنگ کیوں پیدا ہوا؟ یہ رنگ کیوں پیدا نہ ہوا؟ پھر سب کچھ سمجھ جاتا اور اپنی سرنج سے اُن جذبات اور احساسات کو کرداروں میں داخل کر دیتا اور اُنھیں ٹیبل سے اُٹھا کر پھر الماریوں میں سجا دیتا۔ اُسی طرح جس طرح ہسپتال کی لیباریٹری میں خون کی بوتلیں، قارورے اور مختلف قسم کی دوائیں سجا کر رکھی جاتی ہیں۔ وہ واپس اپنے ٹیبل پر آ کر اپنے تجربے لکھنے لگتا۔ وہ تمام جبلتوں کو سمجھ لیتا ــــــ کس جانور کی کون سی جبلت شریر ہے، کون سی جبلت بے قرار ہے۔ وہ اُن کرداروں کے لاشعور کے اندھیرے میں بہت کچھ دیکھ لیتا۔ اُن کے دماغ کے ہر حصّے کو پہچان لیتا۔ ہر دھڑکن کو گن لیتا اور پھر اپنی مخصوص میکانکی چال سے ایک دوسرے کمرے میں داخل ہوتا اور اپنے تجربہ گاہ میں حاصل کئے ہوئے تجربوں کو اگل دیتا۔

"جانوروں" کے مختلف جذبات اور احساسات کا تجزیہ کرتے ہوئے، اُن کی تشریح کرتے ہوئے پہلے اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ جاتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر کچھ سائے پڑنے لگتے تھے۔ اندر کا باجپائی جانے کیا کیا سوچنے لگتا۔ شاید بیلا اور اُس کی محبت کے بارے میں، اُن بڑی بڑی نشیلی آنکھوں کے بارے میں۔ جو اگر ایک بار اُس کی طرف دیکھ لیتی تھیں تو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آسمان کی بلندیوں پر اُڑنے لگا ہو! لیکن اب تو اُسے کچھ بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ آدمی بن چکا تھا اُس کی آنکھیں آدمی کی آنکھیں بن چکی تھیں۔ پتھر کی آنکھیں! جو مُسکرا نہیں سکتی تھیں۔ انتظار کے لموں کو بسا نہیں سکتی تھیں۔ کسی آرزو کا اظہار نہیں کر سکتی تھیں۔ شروع میں اُسے کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔ اُسے یقین نہ آیا کہ اُس کی آنکھیں پتھر کی آنکھیں بن گئی ہیں۔ وہ اُکتایا بھی، رُوٹھا بھی اور لیباریٹریوں کی اِس دُنیا سے بے تحاشہ بھاگ جانے کا اُس نے ارادہ بھی کیا۔ اِس طرح کہ اُسے کوئی پکڑ نہ سکے لیکن بھاگتے ہوئے لموں کی رفتار تیز تھی۔ تجربوں کی تہیں بیٹھتی چلی جا رہی تھیں اور پھر ــــــ وہ عادی ہو گیا۔ اب تو اِس تجربہ گاہ سے بھاگنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب تو کسی بات کا اُس پر اثر ہی نہ ہوتا تھا۔

اگر وہ یہ سُنتا کہ راشد محبوبہ سے بے پناہ محبت کرتا ہے تو اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے راشد کو کئی دن سے بخار ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ محبت کے فلسفہ پر گھنٹوں بولتا تھا۔ حُسن اور جمال کے تصوّرات کا تجزیہ کرتا۔ بیواؤں کی زندگی کا نفسیاتی تجزیہ کرتا، غالب اور میر کے اشعار کی خوبصورت تشریحیں کرتا۔ کچھ اِس طرح کہ رگیں پھڑکنے لگتیں۔ اُس کی آواز میں عجیب تاثیر تھی۔ اُس کی زبان میں عجیب جادو تھا۔ اُس کے لکچروں کی بڑی دھوم تھی۔ اُس یونیورسٹی میں ایسا جادوگر پروفیسر کوئی اور نہ تھا۔ جب وہ شاعری اور شعریات پر لکچر دیتا، کلاس میں کوئی غیر حاضر نہ ہوتا۔ غزل یا نظم پڑھاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں کوئی چمک نہ آتی۔ وہ آدمی تھا۔ اُس کی آنکھیں پتھر کی تھیں۔ بھلا چمک کیسے آتی لیکن لکچر سُننے والوں کی آنکھوں میں چمک آ جاتی تھی۔ کلاس روم میں ایک گہری رومانی فضا چھا جاتی۔ اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی ہلکی سی چمک آ نے

[illegible] کہیں چھپ گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی لیکن نہایت ہی مصنوعی مسکراہٹ، اس طرح جس طرح آدمی مسکراتا ہے۔ اس کا ہر انداز ویسا ہی تھا۔

وہ اس تبدیلی کو کچھ سمجھ نہ سکا۔ یہ تبدیلی بہت آہستہ آہستہ اور پُراسرار طور پر ہوئی تھی اور جب وہ مکمل طور پر آدمی بن گیا تو چیخ اٹھا: "مجھے کیا ہو گیا؟" جیسے ایک اس کی جنس بدل گئی ہو لیکن یہ پہلی اور آخری چیخ تھی ——— آہستہ آہستہ وہ چپ ہوتا رہا، بوڑھا رہا۔ اس نے صبر کیا اور شاید وہ جانتا بھی تھا کہ اس نے صبر کیا ہے۔ ایک اچھے آدمی کی طرح وہ اپنی تجربہ گاہ میں دن رات کھویا رہا۔

یہ لیڈی میک بیتھ کا خواب ہے، اسے شیشے کے اس خوبصورت ڈبے میں بند کر کے رکھو ——— یہ ہیملٹ کی سوچ ہے، اسے سفید کاغذ پر آہستہ سے اٹھاؤ۔ گرفتہ چیتہ، مرکری ہے مرکری ——— یہ یولائی سس کا سفر ہے، اس کے تین حصے کر کے تین بوتلوں میں بند کرنا ہو گا ——— یہ پریم چند کی وہ عورت ہے، جو جاگتے ہوئے خواب دیکھتی ہے، اس کے خواب کو نیلے رنگ کی چھوٹی بوتل میں رکھنا ——— یہ میر کا غم ہے۔ بہت قیمتی چیز ہے، اسے اُس بوتل میں ڈال دو اور ہاں اسے فانیؔ بدایونی کے غم والی بوتل سے الگ رکھنا۔ اس سے مل نہ جائے ——— یہ غالب کی اصطلاحیں ہیں۔ ایسا کرو "رنگِ سنگ" کو نیلے رنگ کی بوتل میں ڈال دو۔ "برقِ تمکدان" کو سفید بوتل میں۔ "محشرِ خیال" کے لئے شیشے مرتبان کی ضرورت ہے، اسے اس مرتبان میں رکھو اور فرائیڈ اور یونگ والی الماری کے قریب رکھو۔ "شہرِ آرزو" کو سُرخ بوتل میں۔ ان میں ایسڈ جیسی کیفیت ہے۔ اچھی طرح بند کرنا، بوتلیں بڑی ہوں۔ یہ اصطلاحیں پھیل کر اوپر اُٹھنے لگتی ہیں۔ یہ رشید احمد صدیقی کے "مرشد" ہیں۔ انھیں اس بوتل میں بند کر دو اور وہ لیبل لگا دو جس پر لکھا ہوا ہے "یہ خالص طنزیہ اور مزاحیہ رجحان ہے"۔ یہ کرشن چندر کا "کالو بھنگی" ہے، اسے میس بورڈ کے ڈبے میں رکھو اور ترقی پسند تحریک والے مرتبان سے آگے رکھو۔ یہ عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" ہے، اسے ابھی کھونٹی پر لٹکا دو۔ اس کے لئے تو خاص قسم کا ڈبہ چاہئے۔

یہ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" ہے، اسے ریفری جریٹر میں رکھو۔

اُس کی لیبارٹری بس دیکھنے کی چیز تھی۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس معاملے میں بہت محتاط تھا۔ اُس کے تجربے بھی تو معمولی نہ تھے۔ وہ ہر روز ایک بوتل اٹھاتا، ایک مرتبان اٹھاتا اور کلاس روم میں چلا جاتا۔ وہاں [illegible] جلاتا، [illegible] رکھ دیتا۔ کچھ دوائیں اور کچھ سفوف نکالتا اور مرتبان سے ایک ایک کردار کو نکالتا، ایک ایک جانور کو نکالتا، اُسے طلبا کے سامنے کھڑا کرتا اور اس پر اپنی دوائیں ڈال کر اپنے سفوف ڈال کر اپنے تجربے دکھاتا۔ طلبا نوٹ لیتے، لذت حاصل کرتے، مسکراتے، سنجیدہ بن جاتے اور پھر وہ لکچر دے کر واپس اپنی تجربہ گاہ میں آجاتا۔ اُس کی آنکھوں میں روشنی تو نظر آتی لیکن وہ چمک نظر نہ آتی جو جانوروں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

وہ چمک جو بیلا کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی ——— بیلا باجپائی کو دیکھ کر کہتی تھی: "تمھاری آنکھیں بہت شریر ہیں۔ مجھے اس طرح نہ دیکھا کرو" ——— "تم مجھے اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟" ——— "جانور!" ——— "بھگوان کے لئے دوسری طرف دیکھو" ——— یہ وہی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں کو کیا ہو گیا تھا!

یہ صدیوں پُرانی بات ہے۔

باجپائی نے ایک محفل میں اپنی ایک رومانی کہانی پڑھی تھی۔ بیلا نے یہ کہانی سُنی تھی۔ بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس نے باجپائی کو ایک خط لکھا تھا ———

"تم نے مجھے اپنے افسانے کا ایک کردار بنا دیا ہے ———
وہ عورت جو خاموش رہتی ہے، سب کچھ دیکھتی ہے، بہت کچھ
سوچتی ہے . . ."

خط طویل تھا۔ باجپائی کی رومان پسند فطرت اس خط سے بے حد متاثر ہوئی۔ اس نے بیلا کو ایک نہایت ہی رومانی خط لکھا۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب دونوں کالج میں پڑھتے تھے۔ کہانی اور خط، یہ تو بس بہانے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ قریب سے قریب تر ہوتے گئے ——— ایک دوسرے کی آنکھوں میں جانے کیا ڈھونڈتے لگے۔ جذباتی زندگی پھیل کر سمندر بن گئی۔ سمندر جتنا پھیلا ہوا ہے، سمندر جتنا گہرا ہے، سمندر کی جتنی لہریں ہیں۔ اس جذباتی زندگی میں بھی اتنا ہی پھیلاؤ اور اتنی ہی گہرائی آگئی اور اس کی لہروں میں وہی کیفیتیں پیدا ہو گئیں جو سمندر کی لہروں میں ہوتی ہیں۔

ایک افسانے اور ایک خط سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پھیل گئی تھی، گہری ہو گئی تھی۔ کالج کی رومان پرور فضاؤں میں دونوں جھومتے رہے، گنگناتے رہے اور پڑھتے رہے۔ بیلا اُسے "جانور" کہتی تھی۔ اُس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں۔ کالج کی لڑکیاں اُس سے پناہ مانگتی تھیں۔ کسی کا لکچر نوٹ لے بھاگا، کسی کو مُنہ چڑا دیا، کسی کا چہرہ [illegible] کسی کو رُلا دیا، کسی کو اپنے افسانے کا کردار بنا لیا۔

جب سے وہ بیلا کے قریب ہوا تھا، بیلا ہی اُس کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی۔ وہ سوتے جاگتے بیلا کے سپنے دیکھتا۔ باجپائی ایک متوسط طبقے کا لڑکا تھا۔ وہ متوسط طبقہ جو آزادی کے بعد فوراً تباہ ہو گیا۔ باپ کی بڑی زمینداری حکومت کی تحویل میں چلی گئی اور باپ کی جُدائی کا غم بھی برداشت کرنا پڑا۔ اُسے ایک بڑے کنبے کو سنبھالنا تھا۔ اس لئے وہ پڑھنا چاہتا تھا، زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ "جانور" تھا۔ اس لئے اُداس بھی ہوتا تھا لیکن بیلا کی ایک مسکراہٹ سے اُداسی دُور ہو جاتی تھی۔ وہ کھو جاتا، نہ جانے کہاں۔ اجنتا کی خوبصورت تصویروں سے عصر کے خاموش اہراموں تک بیلا کے ساتھ سفر کرتا۔

زندگی میں جو حادثے ہوتے اُس نے ہر حال میں اُس مستقل حقیقت کو کر قبول
کر لیا۔ بیلا کی جدائی بھی ایک حادثہ تھی اور اس نے گلا گھونٹ کر کہنا چاہا۔ اسے وجود
کی ایک تیغ سے پوری زندگی کو منتشر کرنا چاہا لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ اُس نے اُس
حادثے کو بھی ایک حقیقت کو کر قبول کر لیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب اُس نے
ایم۔ اے پاس کیا تھا اور ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا۔
اُس وقت وہ بہت رومانی تھا۔ اسے بہت سی باتیں یاد آتیں۔ بیلا کے ساتھ وہ [illegible]
یاد آیا، کھنڈروں کا سفر۔ بیلا کا ہاتھ تھامے وہ اُن کھنڈروں میں دوڑا پھرا تھا اور
اُن کھنڈروں کے خاموش مجسموں سے باتیں کی تھیں۔ کچھ پوچھا تھا، کچھ کہا تھا

"تم پتھر ہو، ہم آدمی ہیں ـــــ تمہاری آنکھوں میں تو صدیاں بسی ہوتی
ہیں ـــــ پتھر کی آنکھوں سے کچھ دیکھ بھی لیتے ہو؟ ـــــ یہ بیلا ہے، تم نے ایسا
مجسمہ کبھی دیکھا ہے؟"

بیلا کے باپ کو ایک انجینئر کی تلاش تھی اور بیلا کو ایک انجینئر شوہر مل گیا تھا۔
وہ سوچتا، عورت کے وجود کو بھلا انجینئر، ڈاکٹر، لیڈر، بزنس مین کی ضرورت کیوں
ہونے لگی۔ وہ تو کبھی نہیں سوچتی کہ اُس کے پورے وجود کو روشن کرنے والا کسی
خاص پیشے کا آدمی ہو۔ وہ عورت ہے۔ وہ شوہر کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور اُس کی
آنکھوں میں روشنی کے سوا اور کیا دیکھنا چاہتی ہے۔ وہ کسی لیڈر کی تقریر سننا
نہیں چاہتی، کسی دوکان پر رجسٹروں کو سلیقے سے رکھنے والے کو دیکھنا نہیں چاہتی۔
وہ کسی کو لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتی اور بھلا ان باتوں
سے اُسے دلچسپی بھی کیا ہو سکتی ہے۔ اُسے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ کوئی اُس
سے دُور کسی ڈیم یا کسی برج کی مرمت کر رہا ہے۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ اُس کے پورے
وجود سے کوئی محبت کرے، کسی کے پورے وجود میں اُس کا وجود جذب ہو جائے، تحلیل

ہو جائے ـــــ وہ سوچتا رہا ہے اور ایک سوچ [illegible]
میں عجیب تبدیلی آئی۔ وہ افسانے لکھنے لگا، [illegible]
مصروف رہا، ڈیم بناتا رہا، پوسٹ مارٹم کرتا رہا۔ [illegible]
فیصلہ نہیں تھا لیکن وہ اس سلسلے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا ـــــ [illegible]
تیزی سے بھاگتے رہے۔ چند برس بیت گئے۔ جانے کتنی صدیاں بیت گئیں۔
وہ یونیورسٹی کے ماحول میں "جانو" نہیں تھا، آدمی بن کر نکل گیا۔ آج
وہ انہی کھنڈروں میں شاتا کے ساتھ گھوم رہا تھا جن کھنڈروں میں ایک دن [illegible]
بیلا کا ہاتھ تھامے وہ دیوانہ وار گھومتا رہا تھا۔ کل اور آج میں بہت فرق تھا۔ آج
اُس نے پتھر کے اُن مجسموں سے کچھ بھی نہ کہا۔ اُن سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ وہ اُن کھنڈروں
میں ملک کی تاریخ پڑھ رہا تھا، تاریخی قدروں کو تول رہا تھا۔ شاتا کے لیے یہاں کشش
تھی۔ وہ اُس کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ مرتب کر رہی تھی۔ جانے کیسے شاتا
کو اُس کی آنکھوں میں روشنی نظر آگئی تھی۔ وہ باجپائی کو چاہنے لگی۔ باجپائی کو اس کی
خبر نہیں تھی کہ شاتا کی روح کتنی بے قرار ہے۔ وہ ان کھنڈروں میں بیلا آیا [illegible]
کہ چند دنوں کی چھٹی ہے۔ کھنڈروں میں بیٹھ کر شاتا کے تحقیقی مقالے پر اطمینان
سے باتیں کر سکے گا۔ یہاں بیلا کی یاد آئی اُسی طرح جس طرح کوئی پرانا خواب یاد آئے۔
یاد آئی اور نہ جانے کھنڈروں میں کہاں چلی گئی۔ وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھا سگریٹ
پیتا رہا اور شاتا سے تحقیق کے موضوع پر باتیں کرتا رہا۔

شاتا چاہتی تھی کہ وہ اُس سے اس ماحول میں اس طرح باتیں نہ کرے۔
اس رومانی ماحول میں باجپائی کی سائنسی گفتگو اُسے اچھی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ
بار بار گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن باجپائی تو جیسے سوچ کر آیا تھا
کہ صرف اس تحقیقی موضوع ہی پر گفتگو کرے گا۔

شاتا نے ایک تیکھے موڑ کو دکھاتے ہوئے کہا،
"ڈاکٹر! پچھلے زمانے میں جنسی موضوعات کا اظہار کتنی
بے باکی سے کیا جاتا تھا"

باجپائی نے کچھ سوچا اور پھر اس موضوع پر ایک
سنجیدہ اور سائنسی تقریر شروع کر دی۔ جیسے وہ ان
کھنڈروں میں شاتا کے ساتھ نہ ہو بلکہ [illegible]
اپنی لیباریٹری میں ہو۔ اُس لیباریٹری میں جہاں بوتلوں،
مرتبانوں اور الماریوں میں بے شمار [illegible]
گھورتے ہوئے اُس کی آنکھوں کی وہی کیفیت تھی جو
ان کھنڈروں کے مجسموں کی تھی۔ پتھر کی آنکھوں [illegible]

جاپانی ہوگئی۔ شمی نے لکھنؤ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اُسے مغربی رقص اور مغربی موسیقی سے دلچسپی تھی۔ ایک نہایت ہی اپ ٹو ڈیٹ گھرانے کی لڑکی تھی۔ اُس کے ترشے ہوئے خوبصورت بال، اُس کی دہکتی ہوئی آنکھیں، اُس کے شہابی ہونٹ، اُس کا چست لباس ـــــــ یہ ساری چیزیں بس دیکھنے کی تھیں۔ اُس نے ایم اے کیا اور ڈاکٹر باجپائی کی نگرانی میں تحقیق کرنے لگی۔ اُسے باجپائی کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ پسند تھے، اُلجھے ہوئے بال پسند تھے، اُس کی شخصیت میں وہ آہستہ آہستہ جذب ہونے لگی تھی۔ وہ باجپائی کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ اُسے چاہتی ہے۔ وہ ان کھنڈرات میں بیٹھ کر کچھ دلفریب رومانی باتیں کرنا چاہتی ہے، اُس کے دل کی دھڑکنیں سننا چاہتی ہے، اپنے دل کی دھڑکنیں سنانا چاہتی ہے لیکن پتھر کی آنکھوں میں اب اُسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن آنکھوں میں کھنڈر بسے ہوئے ہیں۔ آخر بیزار اور بے قرار ہو کر اُس نے باجپائی کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ اُس کی آنکھیں جھکنے لگیں، اُس نے اظہارِ محبت کر ہی دیا۔ اُس کے سارے وجود پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔

اُس نے سوچا اب تو یہ پتھر بول اُٹھے گا، یہ پتھر حرکت میں آجائے گا۔ وہ باجپائی کی آنکھوں میں روشنی دیکھے گی اور اُس روشنی میں تحلیل ہو جائے گی۔

لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ ڈاکٹر باجپائی کی خاموش، پتھر جیسی آنکھیں اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ شاید یہ آنکھیں سوچ رہی تھیں۔ لیبارٹری میں شانتا کو کس رنگ کے مرتبان میں رکھا جائے!!

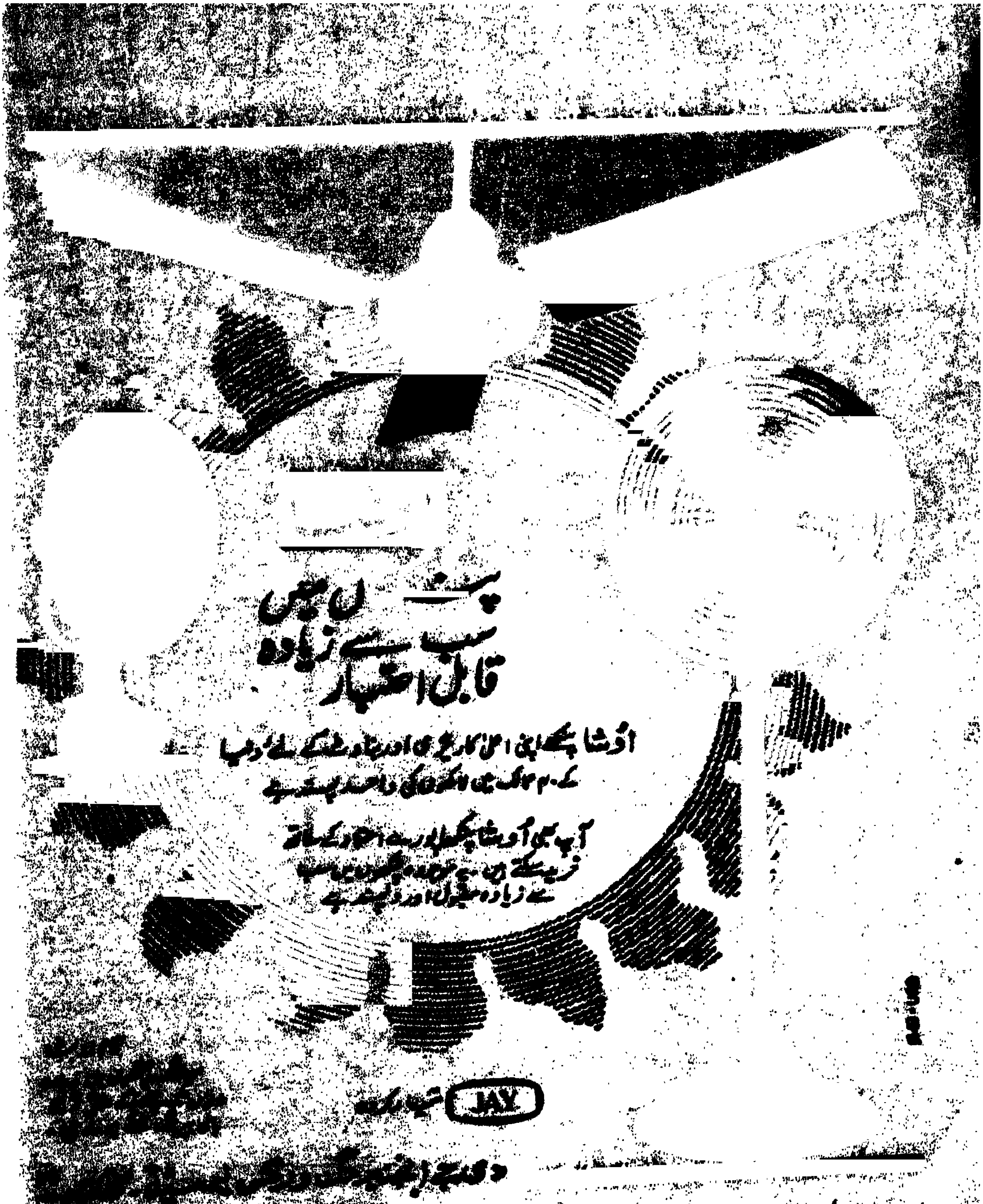
غزلیں

بسمل کچھوچھوی

صحرا سے چلی ہے، نہ گلستاں سے چلی ہے
یہ وحشتِ دل میرے گریباں سے چلی ہے
ڈرتا ہوں کہیں ختم نہ ہو تیرے ستم پر
جو بات مرے حالِ پریشاں سے چلی ہے
لے آئے گی ساحل کو جو منجدھار کی زد میں
اِک ایسی بھی رَو وقت کے طوفاں سے چلی ہے
تعمیر ہی تعمیر کا عالم تھا ازل سے
تخریب تو اِس دَور کے انساں سے چلی ہے
بات اپنی وفاؤں کی، نہ ذکر اُن کے ستم کا
رُوداد تو کچھ اور ہی عنواں سے چلی ہے
معبود مرا عشق ہے ایماں کی حد تک
ہر بات مرے کُفر کی ایماں سے چلی ہے
پھر رُوح فزا زندگیٔ عشق ہے بسمل
پھر سرد ہوا کوچۂ جاناں سے چلی ہے

کیف احمد صدیقی

شبِ ہجر اُن سے مُلاقات کر لی
وہ آئے تصوّر میں اور بات کر لی
کسی رشکِ مہتاب کو یاد کر کے
ضیا بار بزمِ خیالات کر لی
وہ ہو دشتِ پُرخار، یا بسترِ گُل
جہاں نیند آئی بسر رات کر لی
مزاج اُن کا برہم جو پایا، رہے چُپ
جو دیکھا انھیں مہرباں بات کر لی
مرے دل نے اشکوں کی شمعیں جلا کر
منوّر ترے ہجر کی رات کر لی
سرِ بزم اُٹھیں اُدھر اُن کی نظریں
اِدھر دل نے شرحِ اشارات کر لی
کوئی کیفؔ کی سادہ لوحی تو دیکھے
گوارا محبت میں ہر بات کر لی


سب سے زیادہ
قابل اعتبار
JAY

یہ خلش کہاں سے ہوتی

نشتر خانقاہی

[illegible] ۔ دہلی

۱۲ فروری ۹۰ء — محترم [illegible] صاحب، تسلیم

یہ کہانی جو آپ کی دین ہے، آپ ہی کی نذر کر رہا ہوں۔ اگر آپ نے تحریک نہ دی ہوتی تو شاید اس کی تخلیق عمل میں نہ آتی۔ اس کے بارے میں کیا عرض کروں؟ میرا خیال ہے، روح یا ضمیر کی سرزنش جہنم کے عذاب سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ میں نے اس کہانی میں یہی نکتہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ——

نمی دوم بہ تو ماتۂ خویش را   تو دانی حساب کم و بیش را

نیاز مند —— نشتر خانقاہی

[illegible] اُس خادم کے نزدیک پہنچی جو آبادی سے [illegible] درختوں سے گھرا ہوا تھا اور جس کے بیچ [illegible] چمنیوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ مسز شانتا سکینہ نے [illegible] اپنا سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ [illegible] اور ایک عجیب اُداس سی [illegible] بکھری سی [illegible] دھنک کی پتیاں اور کھجوروں کی شاخیں [illegible] ہوا کے جھونکوں میں [illegible] اُداس [illegible] روشن تھی۔

مسز شانتا سکینہ نے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، چاروں طرف [illegible] ایک [illegible] اُجڑا تھا [illegible] ہوتا۔

[illegible] اور بوجھل بوجھل قدموں [illegible] میں ایک بڑے کالے دھبے کی طرح [illegible]

[illegible] مسز شانتا سکینہ

کمرے میں آ کر [illegible] ٹھٹکیں۔ انھوں نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ ساڑی کا پلو کھینچ کر اچھی طرح کمر کے گرد لپیٹ لیا۔ ہاتھ کی مدد سے بالوں کی بکھری ہوئی لٹیں درست کیں۔ اس احتیاط کے پیچھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی اندرونی اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

دھندلی دھندلی روشنی میں کمرے کی ہر چیز ڈوبی ڈوبی سی معلوم ہوتی تھی۔ مسز شانتا سکینہ نے چاروں طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اپنی بڑی بہن اُرملا ماتھر کو کمرے میں نہ پا کر اس بڑی سی تصویر کو حسرت سے دیکھنے لگیں جو شاید مسٹر ماتھر نے کبھی اپنے ہاتھوں سے لگائی ہوگی اور جو اب اُرملا کو صرف یہ یاد دلانے کے لیے باقی تھی کہ وہ بیوہ ہیں۔

آدمی کو احساس ہو تو اس کے سوچنے کا انداز کس طرح بدل جاتا ہے؟ مسز شانتا سکینہ نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور انھیں یاد آیا کہ آج سے پہلے وہ کتنی ہی بار اس کمرے میں آئی تھیں لیکن اس انداز سے انھوں نے کبھی ایک ایک چیز کو محسوس نہ کیا تھا۔

وہ اپنے ہی آپ سے اکتا کر دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر گر گئیں۔

اور جیسے ہی اُرملا کمرے میں داخل ہوئیں پہلی ہی آہٹ پر شانتا سکینہ کو

یہ محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہرے خواب سے چونک اٹھی ہو۔

"دیدی ـــــ !" شانتا سکینہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے جھپٹ کر اپنی بہن سے لپٹ گئیں۔

"تم کب آئیں شانی؟" اُرملا ماتھر نے پُر مسرت لہجہ میں پُوچھا۔

لیکن شانتا سکینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

دونوں ایک دوسرے کو بانہوں میں تھامے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ اُرملا ماتھر نے ایک نظر چھوٹی بہن کے چہرے کو دیکھا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ چند ہی دنوں میں اپنی عمر کے کئی لمبے سال گزار کر آئی ہو۔

اُس کا چہرہ بالکل پیلا، سپاٹ اور بے جان سا تھا۔ غور سے دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے بھیگے ہوئے لتّے کو نچوڑ کر زور سے جھٹک دیا ہو اور اُس پر

- دکھاوے کی عبادت سے ہم لوگوں کو بہکا سکتے ہیں لیکن خدا جو ہماری نیتوں کو جانتا ہے، جھوٹ، سچائی اور دکھاوٹی عبادت سے واقف ہے۔
(بھگت کبیر جی)
- گلے میں بھگوان کی مورتی لٹکانے والے بیوقوف انسان! بھگوان تو تیری آتما کے اندر موجود ہے، اُسے پہچان! (گورو گرنتھ صاحب)
- پرماتما سے پریم کر لیکن ایسا جیسا مچھلی پانی سے کرتی ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو سمجھ کر تُو نے اپنی عمر ضائع کی۔ (گورو گرنتھ صاحب)
- دوسروں کا دل جیتنے کے لئے پہلے اپنے دل کو جیتنا ضروری ہے۔ اگر تم اپنے دل پر قابو پا لو تو دُنیا تمہارے قبضہ میں ہے۔ (گورو نانک دیو جی)

بے شمار شکنوں کے جال بکھر گئے ہوں۔

"ہاؤ از مسز سکینہ؟" اُرملا ماتھر نے ماحول کی خاموشی توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مت پُوچھو دیدی ـــــ کچھ مت پُوچھو ـــــ!" مسز شانتا سکینہ دُکھ بھرے لہجے میں بولیں ـــــ "کبھی کبھی آدمی اِتنا شریف، اِتنا بے ضرر کیوں ہو جاتا ہے کہ اُس سے ڈر لگنے لگے ـــــ سچ میں اُس سے ڈرنے لگی ہوں۔ بہت بُری طرح!"

"پگلی! آخر ہوا کیا ـــــ؟ کچھ کہو گی بھی؟" اُرملا ماتھر نے پیار بھری ڈانٹ دے کر پُوچھا۔

"تم سب جانتی ہو دیدی؟" شانتا سکینہ رُک رُک کر کہنے لگی: "تم سے میری کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ میں اپنی ساری کائنات کو اُس ایک آدمی کی زندگی تک محدود کر دوں جو اب [illegible] سکتا ہے ـــــ اور اسی لئے میں نے ہر طرف سے آنکھیں [illegible] میں اپنے [illegible] سے ناطہ توڑنے کا ناٹک کھیلتی رہی۔ کب آکاش پہ چاند چمکتا ہے اور کب [illegible] کے پھول فضا میں خوشبوؤں کے فوارے بکھیرتے ہیں اور کب ہواؤں کے [illegible] کے نیلے پانیوں میں اٹکھیلیاں کرتے ہیں اور کب کشتیاں [illegible] گیت گاتے ہیں؟ میں یہ سب بھول گئی تھی۔

اور میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ میرا ایک سہانا ماضی بھی تھا۔ جس سے وہ سارے سپنے، وہ سارے خواب دفنا دیئے تھے جو اشوک کے ساتھ دیکھے تھے۔ گرمیوں کی وہ سُہانی راتیں، جن میں ہم نے پیار کے گیت گائے تھے اور محبت کے حسین محل تعمیر کئے تھے اور زندگی کو پیار کے پانی سے سینچنے کی کوشش کی تھی ـــــ میں سب بھول گئی تھی۔"

شانتا سکینہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اُرملا نے بہن کا سر پیار کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔ پیار کی آنچ آنکھوں میں دبے آنسوؤں کو اِسی طرح اُبال دیتی تھی جیسے آگ پتیلی کے پانی کو!

شانتا سکینہ بہن کے سینے سے لگی سِسک سِسک کر رونے لگیں۔

اُرملا ماتھر ایک ہاتھ سے دھیرے دھیرے اپنی بہن کی پیٹھ سہلاتی رہیں۔ انھیں بہن سے کچھ پُوچھنے یا اُس سے ہمدردی کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ زندگی میں کبھی وہ لمحہ بھی آتا ہے، جب زبان تسلّی کے الفاظ ادا کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے اور ہمدردی، خلوص، پیار اور دلجوئی کا سارا جذبہ برف کی طرح پگھل پگھل کر صرف آنکھوں، سانسوں اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ میں سمٹ جاتا ہے۔ اُرملا ماتھر شاید اسی لمحے سے گزر رہی تھیں۔

"دیدی! معلوم نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جوان ہو کر ماضی کے اُن لمحوں میں جیتے رہتے ہیں جو کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم جن چیزوں کو پا نہیں سکتے یا جو چیزیں ہم سے دُور ہو گئی ہیں، ہم انھیں کی طرف لپکتے رہتے ہیں۔ وہی ہمیں خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں زندگی کے جو لمحے ہم گزار آتے ہیں اگر ہمیں ایک بار پھر انھیں لمحوں میں [illegible] جان سے زیادہ عزیز، شفق سے زیادہ سُہانے، خوابوں سے زیادہ رنگین اور سب سے زیادہ حسین محسوس ہوتے ہیں تو کیا دوبارہ اُن لمحوں میں جی کر ہم خوش اور مطمئن رہ سکیں گے؟ ـــــ کیوں دیدی؟ کیا ہم اُن کی یکسانیت سے گھبرا نہیں جائیں گے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھ رہی شانی ـــــ کچھ بھی نہیں؟" اُرملا ماتھر نے الجھے لہجے

یوں کہا۔

" لیکن تمہیں کہنا چاہئے دیدی! اب یہ چیزیں سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیا کرتی تھی کہ اشوک جو میرے ماضی کا ایک گزرا ہوا لمحہ ہے، اگر ایک بار پھر وہ اس کے ساتھ بیٹھا کر آ بھی جائے تو کون یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ میں اس کے ساتھ خوش اور مطمئن رہ سکوں گی۔ میں بار بار اپنے آپ کو سمجھاتی تھی، پگلی! صرف وہی پل حسین نہیں تھا جو گزر گیا۔ وہ پل بھی اتنا ہی حسین ہے جو آج ہے اور وہ بھی جو کل آنے والا ہے۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے دیدی! جیسے بڑے ہو کر بھی ہمارے اندر کا وہ بچہ جیتا رہتا ہے جو کبھی ڈیڈی سے اچھے اچھے اور قیمتی سے قیمتی کھلونے لے کر بھی ایک گھٹیا اور کم قیمت کھلونے کے لئے مچل جایا کرتا تھا اور اس وقت تک نہیں بہلتا تھا جب تک وہ اپنی پسند کا کھلونا نہ پا لے۔"

اُرملا ماتھر کچھ اس طرح خاموش اور کھوئی کھوئی سی یہ سب باتیں سُن رہی تھیں جیسے وہ اپنی بہن کی ذہنی کیفیت اور اندرونی کرب کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

" اور شادی کے بعد میں نے اشوک کو بھی ایک ایسا ہی کھلونا سمجھ لیا تھا جس کے لئے میرے اندر کا بچہ ڈیڈی سے سکینہ جیسے ساتھی کو پا کر بھی یوں بسور رہا تھا جیسے آج پہلی بار ایک شفیق باپ نے اپنے بچے کی ضد پوری نہ کر کے اُسے دُکھ دیا ہو لیکن بچپن تو دیدی بہت پہلے گزر چکا تھا اور میں بھول گئی تھی کہ میں اب بچی نہیں ہوں۔"

" آج تم اس طرح کیوں سوچ رہی ہو شانی! میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہی۔ صاف صاف بتاؤ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اُرملا ماتھر ہمدردی بھرے لہجے میں بولیں "تمہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم چند ہی دنوں میں برسوں کی بیماری سے اُٹھ کر آئی ہو اور اگر میں سمجھنے میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم ضرور کسی ایسے حادثے سے دوچار ہوئی ہو جو تمہاری صحت، تمہاری دلکشی اور تمہارے چہرے کے رنگ و روپ سب پر اثر انداز ہوا ہے۔ اندر کی آگ نے تمہاری جلد تک کو جھلسا دیا ہے ـــــ مجھے بتاؤ تم پر کیا گزری ہے؟"

شانتا سکینہ نے بہن کے سینے سے اپنا سر اُٹھایا اور صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ چاروں طرف اندھیرے کی چادر پھیل گئی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازے کے شیشوں سے آسمان کے تارے جگنوؤں کی طرح جلتے بجھتے دکھائی دے رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی اور اُداسی چھائی تھی۔

" اُف دیدی! آدمی اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے کمینگی کی حد تک اپنے حالات سے سمجھوتہ کر لے۔" شانتا سکینہ نے ندامت بھرے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ــــ میں نے اپنے ارد گرد ایک مضبوط حصار کھینچ لیا تھا تاکہ گزرے ہوئے دنوں کی کوئی دھندلی سی یاد بھی مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ میں نے اشوک کی تصویر پھاڑ کر آگ میں جھونک دی۔ اُس کے سارے خط جلا ڈالے۔ اُن آنکھوں کو بھول گئی جو میری طرف دیکھتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میری روح کی آخری گہرائیوں تک اُتر گئی ہیں ــــ لیکن نہیں، شاید میں غلط کہہ رہی ہوں۔ میں اُسے بھولی نہیں، سمجھتی رہی کہ بھول گئی ہوں۔

اور پھر دیدی! میں نے سکینہ کو اشوک کے خلاف بھڑکایا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اشوک اور سکینہ کے تعلقات دوستانہ ہیں اور اگر اُس کا میرے گھر آنا جانا رہا تو زندگی میں کسی وقت بھی کوئی کمزور لمحہ آ سکتا ہے۔

اُف دیدی! کیسی کمینگی کی بات ہے۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ آدمی اتنا

- خبردار رہو! دل آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ اچھا بن جائے تو سارا جسم اچھا، اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- لوگوں سے خندہ جبینی سے پیش آنا بڑی نیکی ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- بُرائیوں سے نفرت کرو تاکہ تمہارے اچھے عمل برباد نہ ہوں۔
(حضرت سعیدؓ)
- بدترین دشمن تمہارے بُرے ہمنشیں ہیں۔ (سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ)
- میانہ روی میں آدمی روزی اور حُسنِ خلق میں آدھا ایمان ہے۔
(سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ)

نیچ بھی ہو سکتا ہے؟"

شانتا سکینہ کی آواز تاسف اور ندامت کے جذبات سے بھرا گئی۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ پھر مدھم اور متاسف لہجے میں بولی۔

" میں کتنی ہی بار سکینہ سے لڑی کہ وہ اشوک سے کیوں ملتا ہے؟ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ اشوک اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ بدچلن اور جواری ہے۔ وہ کون سا عیب تھا جو میں نے اُس کی ذات سے منسوب نہیں کیا۔ اُس شخص کی ذات سے ــــ جسے میں اپنی روح کی انتہائی گہرائیوں سے چاہتی رہی ہوں جس کے ساتھ میں نے زندگی کے خوبصورت ترین دن گزارے ہیں۔ جسے میں زندگی کا آدرش سمجھتی رہی ہوں۔ کیا اشوک اور خدا، جو آسمانوں پر ہے، مجھے معاف کر سکے گا۔ اُف دیدی! مجھے اعتراف کرنے دو کہ میں نے جرم کیا ہے۔ میں خود غرضی میں کمینگی کی

شانتا سکسینہ کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

اُرملا ماتھر نے پیار سے شانتا سکسینہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور [illegible] لہجے میں بولیں۔

"نہیں شانی! یہ خود غرضی اور کمینہ پن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ کیا کرتے وقت تمہاری نیت بُری نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ لمحہ بھی آتا ہے جب آدمی خود اپنے آپ کو نہیں سمجھ پاتا۔ وہ اُن باتوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا جو وہ کر رہا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے تم نے یہ سب اس لئے نہیں کیا کہ تم واقعی اشوک کو تنہا کرنا چاہتی تھیں۔ تم نے یہ اس لئے کیا ہے کہ تم اپنے آپ کو محفوظ کر لینا چاہتی تھیں۔ تم کسی ایسے خطرے سے بچنے کے لئے یہ سب کر رہی تھیں جو زندگی میں کسی وقت بھی رونما ہو سکتا تھا۔ شاید تم نے ایک پیش بندی کی تھی۔ اپنے بچاؤ کے لئے، اپنے تحفظ کے لئے"

اُرملا ماتھر کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں اور پھر جیسے کچھ سوچتی ہوئی بولیں۔

"شانتا! شاید تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جوان ہو کر بھی ہمارے اندر کا معصوم بچہ جیتا رہتا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا، بچپن میں ہم راجن بھیا کی چیزیں خراب کر دیا کرتے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ ڈیڈی سے ہماری شکایت کریں ہم روتے بسورتے ہوئے ڈیڈی کے پاس جاتے تھے اور گال پھلا کر کہتے تھے۔ بھیا نے ہمیں مارا ——— بھیا بہت بُرے ہیں! اور ہماری بجائے بھیا کی پٹائی ہو جاتی تھی۔

اشوک اور سکسینہ کے معاملے میں بھی تمہارے اندر جو بچہ چھپا ہوا ہے اُس نے وہی کیا ہے جو ہم بھیا کے ساتھ کیا کرتے تھے ——— کیا تم محسوس نہیں کرتیں؟"

"مجھے کچھ خبر نہیں دیدی! ——— مجھے کچھ خبر نہیں!! میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں نے یہ سب کیا ہے۔ اپنے لئے ——— سکسینہ کے لئے ——— اس گھر کے لئے جسے میں سورگ کی طرح سُکھی بنانا چاہتی تھی۔"

"لیکن شاید بھگوان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم جتنی شدت کے ساتھ اُن لمحوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، جنھیں ہم گزار سکتے ہیں وہی لمحے ——— کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کونے سے یوں چپکے سے ہمارے اندر داخل ہو جاتے ہیں کہ ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

شانتا سکسینہ کچھ دیر خلا میں گھورتی رہیں اور پھر جیسے کچھ سوچ کر بولیں۔

"یقین کرو دیدی! میں نہیں چاہتی تھی، کوئی ایسی دُکھ دینے والی بات ہو لیکن ہو گئی۔ اُس رات ——— شاید وہ ماضی ہی کا کوئی گزرا لمحہ ہوگا جو [illegible]

[illegible] ماضی کا کوئی [illegible]

[illegible] اُس [illegible]

[illegible]

[illegible] سے [illegible] ہو اور [illegible]

[illegible] ہو کر [illegible]

[illegible] ساری [illegible] جائے گی۔

"ایک بار [illegible] زندگی [illegible]

[illegible] کے [illegible]

"شانتا! [illegible]

[illegible] کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی ——— [illegible]

[illegible] گھر کے دروازے بند کر رہے ہیں۔ [illegible]

یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد [illegible] ———

"مجھے نہیں معلوم اشوک کب میرے نزدیک آیا اور [illegible]

[illegible] میرے قریب [illegible] بیٹھ گیا۔ [illegible]

سب [illegible] چاہتا ہو۔

میں نے کبھی اپنے آپ کو اتنا مجبور [illegible] نہیں پایا [illegible]

اُس وقت اُس کا ہاتھ میرے ہاتھوں پر [illegible] تھا اور اس کی آواز [illegible]

[illegible] میرے کانوں میں آ رہی تھی:

"شانتا! میں جانتا ہوں۔ [illegible]

تم [illegible] کہ تم یہ [illegible] زندگی [illegible]

[illegible] تمہیں [illegible] ہمیشہ [illegible]

[illegible] کے لئے [illegible]

[illegible] آخری بار [illegible] ہوئے [illegible]"

"اور پھر دیدی! وہ بات ہو گئی [illegible]

اشوک [illegible] گیا اور [illegible]

[illegible] ہو۔

میں نہیں چاہتی کہ [illegible]

احساس [illegible]

سکسینہ کو [illegible] تھا!!

تم [illegible] کر سکو گی [illegible]؟"

[illegible]

[illegible] نے سوچ لیا تھا کہ میں اُس کے سامنے اپنے جُرم کا اعتراف [illegible] معافی مانگوں گی۔ اُس سے کہوں گی کہ تم مجھے سزا دے لو۔ [illegible] سے ایک بار مجھے معاف کر دو۔

[illegible] اُس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا ـــــ کچھ بھی نہیں کہا۔

[illegible] رات بھر [illegible] کرتی رہی۔ ویدی! تم اُس شخص کی مجبوری [illegible] جرم کی معافی تک نہیں مانگ سکتا ـــــ جسے اپنے کیے کی سزا تک [illegible]

کاش! اُس نے مجھ سے کچھ پوچھا ہوتا ـــــ کچھ کہا ہوتا!

اُف! ویدی ـــــ میری روح تڑپ رہی ہے۔ میں کیا کروں ـــــ کہاں [illegible]

[illegible]

غزلیں

ـــــ اختر مشتاق رحیم آبادی ـــــ

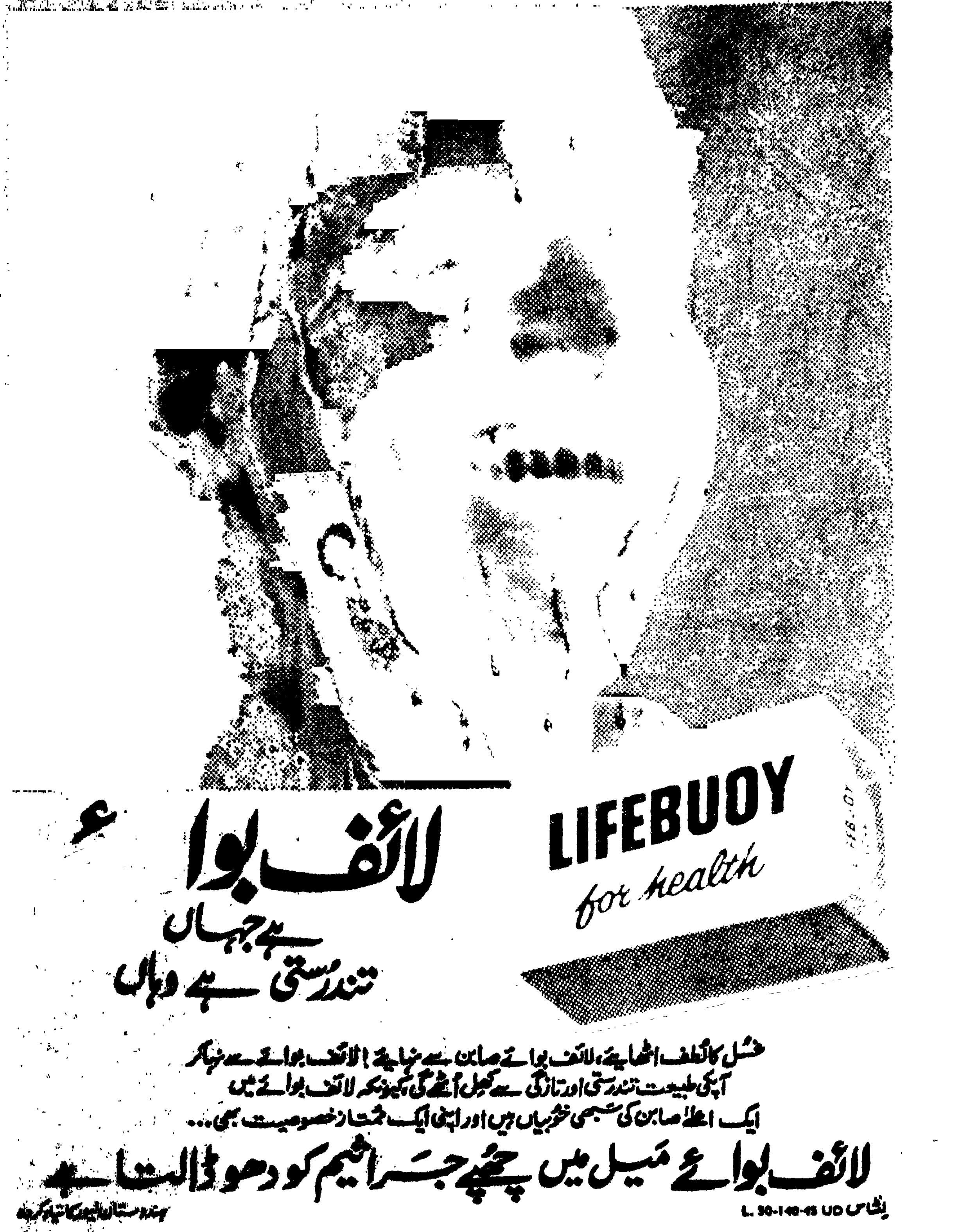
[illegible] شبِ غم مگر کہیں سے نہ ملا کوئی سہارا
[illegible] [illegible] اب گوارا
[illegible] ہو کوئی شکوہ [illegible] قدم قدم سہارا
کبھی [illegible] آخر شب [illegible] کہیں کچھ نہ پکارا
[illegible] کوئی ایک شب ہی مجھے بخش دو دوبارا
یہ جہانِ شوق [illegible] اک عجب تماشا [illegible] کوئی کچھ یہاں جو جیتا کہیں اور جا کے ہارا
[illegible] یہ جو میرا حال ہے اب نہ ہی کل نہ ہو تمھارا

مری ہر غزل میں اختر مرے دل ہی کی صدا ہے
مری کس غزل سے میرا نہیں حال آشکارا

ـــــ [illegible] آبادی ـــــ

[illegible] ہے تو جہان ہے پیارے
[illegible] اتحان ہے پیارے
اہلِ دل [illegible] خود کیا، کیا زبان ہے پیارے
وہ تری [illegible] ہستی کا گمان ہے پیارے
[illegible] بات کی داستان ہے پیارے
[illegible] کیسا طرب [illegible] ہے پیارے

[illegible]
[illegible] ہے پیارے


LIFEBUOY
for health
لائف بوا
ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں
غسل کا لطف اٹھائیے، لائف بوائے صابن سے نہائیے! لائف بوائے سے نہاکر
آپکی طبیعت تندرستی اور تازگی سے کھل اٹھے گی کیونکہ لائف بوائے میں
ایک اعلیٰ صابن کی سبھی خوبیاں ہیں اور اپنی ایک ممتاز خصوصیت بھی...
لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
ہندوستان لیور کا تیار کردہ
L. 30-140-45 UD

سفرنامہ ــ ملکِ کنوارستان

ـــــــــــــــ عمر عادل مارہروی

نزد جامع مسجد۔ قلعہ۔ بریلی

۲۸ر جنوری ۶۶ء

خوشتر بھائی! آداب

. . . کچھ عرصہ ہوا، لاہور کے "کالج آف ہوم اکنامکس اینڈ سوشل سائنس" میں ایک مباحثہ ہوا تھا جس کا موضوع تھا: "شادی زندگی کا ایک المیہ ہے" ــــ اس موضوع کی تائید میں بولنے والی خواتین کی تقریریں پڑھتے پڑھتے میں تصور کی دنیا کے اس ملک میں پہنچ گیا جسے "کنوارستان" کہا جا سکتا ہے اور وہاں جو کچھ دیکھا وہ آپ کو بھیج رہا ہوں ــــــ "سفرنامہ ــ ملک کنوارستان" کا تعلق صرف اُن خواتین سے نہیں جنھوں نے شادی کو زندگی کا المیہ قرار دے کر اس کے رواج کی مخالفت کی۔ اِس میں جو طنز ہے، جو عبرت ہے وہ ہر اُس ذہن کے لئے ہے جو اِس انداز میں سوچتا ہے اور آپ جانتے ہوں گے کہ ایسے ذہن ہر جگہ موجود ہیں ــــــ پھر بھی میں اُن خواتین سے معذرت خواہ ہوں جن کے اقوالِ زرّیں میں نے اِس میں نقل کئے ہیں ــــ آپ محسوس کریں گے کہ یہ صرف ایک فکر انگیز طنز ہی نہیں، اِس کا اندازِ بیان، مریم کا کردار اور "آخر" ایک نفسیاتی کہانی کا لطف بھی دیتا ہے . . .

آپ کا ــــــ عمر عادل مارہروی

صاحبو! آپ میں سے اکثر اصحاب اپنی خوش نصیبی سے اس دردناک اور خوفناک حقیقت سے واقف نہ ہوں گے کہ خدا کی اِس زمین پر بندوں کا ایک ملک ایسا بھی ہے جسے کنوارستان کہا جاتا ہے۔ اِس لئے اِس ملک کا حال بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا تھوڑا سا جغرافیائی اور تھوڑا سا تاریخی حال بیان کر دوں۔

یہ ملک مذاہب اور انسانیت کی بلند قدروں سے بہت دُور ــــ قرآئدہ ... قدروں سے بہت قریب، خطِ ارتقاء پر واقع ہے اور چاروں طرف سے اُن جنگلات سے گھِرا ہوا ہے، جن میں حضرتِ انسان نے اپنی زندگی کا ابتدائی دَور گزارا تھا اور اُن کی سرحدیں اُن علاقوں سے ملتی ہیں جہاں آج بھی وحشی قومیں رہ رہی ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا بے حد گرم ہے۔ شاید اِسی لئے یہاں کے باشندے ایسا لباس پہنتے ہیں جو خورد بین کی مدد سے اگر نظر آ بھی جاتے تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ لباس کو انسان نے پہن رکھا ہے یا انسان کو لباس نے!

اِس ملک کا صدر مقام اُن ذہنوں میں واقع ہے، جو ترقی فرما کر مکمل طور سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اِس لئے دنیا کے نقشے پر اس کی تلاش بے سُود ہوگی، البتہ یہ پوری اُمید کی جا سکتی ہے کہ کنوارستان کی آبادی میں اضافے کی رفتار اگر تیز ہو گئی تو دُنیا کے نقشے پر آپ اسے دیکھ سکیں گے۔

کنوارستان کا تاریخی پس منظر صرف اِتنا ہے کہ یہ ہمیشہ سے کنوارستان نہیں تھا، ہمارے آپ کے ملک ہی کی طرح ایک ملک تھا جہاں کے باشندے اپنے اپنے رسم و رواج کے مطابق شادی کرتے، گھر بساتے اور نئی نسل کی پرورش کرتے تھے ــــ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بزرگوں کی غلطی سے یہاں کچھ انسان ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے رسم و رواج اور مذہب کی حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ خصوصیت کے ساتھ یہ شادی کے رواج کے خلاف تھے۔ رفتہ رفتہ باغیوں کی تعداد اور طاقت بڑھتی گئی اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب اُنھوں نے حکومت پر پُرامن طور سے قبضہ کر لیا ــــ ملک کا نام بدلا، آئین بدلا، بزرگوں کی زبان پر خاموشی کی مہریں لگوائی گئیں، دین کے عالموں کے منہ پر تالے ڈالے گئے۔ ایسی تمام کتابوں کا لکھنا پڑھنا اور شائع کرنا سنگین جرم قرار دیا گیا جن سے

مذہب اور تہذیب کی تشہیر ہوتی ہو۔ رسم و رواج کو خلافِ قانون قرار دیا گیا اور شادی، ایسا جرم قرار دی گئی جس کے مرتکب کو باغی سمجھا جا سکتا تھا۔

انقلاب کے بعد حکومت کی طرف سے پہلا اعلان یہ ہوا کہ آج سے ملک میں شادی کا رواج جرم ہے۔ جو شادی کرے گا یا شادی کی ترغیب دے گا، وہ ملک بدر کر دیا جائے گا۔ اس لئے ملک میں سب کنوارے ہو گئے اور اسی لئے ملک کا نام کنوارستان رکھا گیا۔

صاحبو! ملک کنوارستان ہم سے دُور ہوتے ہوئے بھی بہت قریب ہے۔ اتنا قریب کہ یہاں آنے کے لئے کسی سواری کی ضرورت درکنار دو قدم پیدل چلنے کی بھی زحمت نہیں ہوتی۔ بس تصور کی ایک نگاہ، تخیل کی ایک پرواز یا ایک جھونکا نیند کا بہت ہے اور مجھ سے پوچھو تو میں تو لاہور کے کالج آف ہوم اکنامکس اینڈ سوشل سائنس کے ایک مباحثے میں شادی کے رواج کو المیہ قرار دے کر اس کی مخالفت کرنے والی خواتین کی تقریریں پڑھتے پڑھتے کنوارستان پہنچ گیا۔

جب میں نے کنوارستان کی سرحد عبور کی تو سب سے پہلے مجھے کسٹم آفیسر کے پاس، جو ایک غیر شادی شدہ نوجوان خاتون تھیں، لے جایا گیا۔ جنھوں نے فرائڈ کے نظریات پر مشتمل ایک کتاب پر مجھ سے حلف لیا کہ میں کنوارا ہوں اور یہ کہ کم از کم جب تک میں کنوارستان میں رہوں گا کوئی بات ایسی نہ لکھوں گا، نہ کہوں گا، جس سے کنوارستان کے کسی باشندے کو شادی کرنے کی ترغیب ملے۔ پھر میرے سامان کی تلاشی لی گئی۔ کنوارستان کے کسٹم کے قانون کے تحت ملک میں کسی بھی مذہب کی کوئی کتاب یا کوئی ایسی کتاب، تصویر، سینما فلم اور صوتی ریکارڈ لانا جرم ہے جس سے شادی کا خیال پیدا ہو سکتا ہو ـــــ میرے سامان میں ایسی تو کوئی چیز نہیں تھی، البتہ میری نوٹ بک پر ایک دوست کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر پڑھا گیا ایک سہرا درج تھا۔ وہ بحقِ سرکار ضبط کر لی گئی۔

کنوارستان میں میری میزبان ایک کنواری نوجوان خاتون مس مریم تھیں، جن کا شمار انقلاب کے رہنماؤں اور فلسفہ دانوں میں ہوتا ہے اور جو انقلاب کنوارستان کی عوامی تحریک "شادی بند کرو" کے علم برداروں میں سے تھیں۔ میں انقلاب سے چند سال پہلے اپنے ہی ملک میں اُن سے مل چکا تھا۔ اب جو میں اُن سے ملا تو میں نے اُن میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ پہلے کے بالکل برعکس اب وہ بہت افسردہ سی، مایوس سی اور کسی حد تک بیمار نظر آ رہی تھیں، اُن کے ذہن میں ایک اُلجھن سی تھی۔ میں نے اس طرف اُنھیں توجہ دلا کر سوال کیا تو اُنھوں نے مسکرا کر فرمایا ـــــ "یہ صرف انقلاب کی تھکن ہے۔"

مس مریم نے مجھے کنوارستان آنے کی دعوت دی تھی تاکہ میں یہاں آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ آزادی کس چڑیا کا نام ہے۔ کنوارستان پہنچ کر جب پہلے دن میں مس مریم کے ساتھ شہر کی سیر کو نکلا تو سڑک کے کنارے نصب ایک پتھر پر کندہ اِس عبارت کو دیکھ کر ٹھٹک گیا ـــــ

شادی کے بغیر مرد اور عورت ایک دوسرے سے
محبت کیوں نہیں کر سکتے ـــــ؟ مس ایلس ....

اِس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں مس مریم بولیں ـــــ

"مس ایلس ... بہت عظیم مفکر اور انقلاب کے بانی رہنماؤں میں سے ایک ہیں اُن کا قول ہے۔ ہم نے جگہ جگہ قومی مفکروں کے اقوال پتھروں پر کندہ کرا رکھے ہیں تاکہ عوام اپنے رہنماؤں کے درس کو یاد رکھیں اور گمراہی سے بچتے رہیں ـــــ ادھر دیکھئے" مس مریم نے سڑک کی دوسری طرف نصب پتھر کی طرف اشارہ کیا جس پر تحریر تھا ـــــ

"محبت ایک فطری جذبہ ہے اور شادی ایک سماجی رسم۔ دونوں کو خلط ملط کرنا مناسب نہیں ـــــ" مس رابعہ

"یہ قول ہمارے ملک کے دستور کی روح ہے" مس مریم بولیں۔

میں نے کہا: "آپ نے بجا فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اِس حقیقت سے تو آگاہ ہی ہوں گی کہ عورت اور مرد کی باہمی محبت کی بنیاد اِسی جذبہ پر ہے جس پر نسلِ انسانی کا دار و مدار ہے۔ اُسی جذبے کی تسکین محبت کی معراج ہے، تکمیل ہے، فطرت کا تقاضہ ہے۔"

"جی ہاں!" مس مریم نے کہا۔

"اور محبت اور فطرت کی اِس تکمیل کے لئے ہر مذہب اور ہر تہذیب نے ایک ضابطہ بنایا ہے یعنی شادی ـــــ اور اُس ضابطے سے باہر اِس تکمیل کو گناہ کہا گیا ہے۔ اِس کی مذمت کی گئی ہے۔"

"یہ غلط ہے! محبت کی تکمیل کے لئے شادی ضروری نہیں۔ صرف یہی ایک راستہ نہیں ہے" مس مریم نے فرمایا۔

میں نے عرض کیا ـــــ "اِس کا مطلب ہے کہ آپ دوسرے راستے پسند کرتی ہیں اور کسی مذہب اور ضابطۂ اخلاق کو تسلیم نہیں کرتیں۔ آپ کے ملک میں کوئی مذہب نہیں ہے!"

"آپ کچھ بھی کہیں لیکن بہر حال ہمارے مفکرین کے قول درست ہیں" مس مریم نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

ایک شام جب میں اور مس مریم ایک گلی سے گزر رہے تھے تو سرِ راہ ایک کمرے میں، میں نے چھ سات چھوٹے بڑے بچوں کو ایک بد حواس عورت کو گھیرے دیکھا۔ میں نے دیکھا عورت اور بچے رو رہے تھے۔

"بیچے بھوکے ہیں" مس مریم نے افسوس ظاہر کیا۔

"اور گھر کی گندگی اور بدتہذیبی بھی ـــــ اور یہ بات شاید بیماری بھی ہے" میں نے کہا۔

"جی ہاں" مس مریم نے کہا "لیکن مجبوری ہے۔ ایک عورت آخر تنہا اتنے بچوں کی پرورش اور تربیت کس طرح کرسکتی ہے"

"مگر ایسا کیوں ـــــ؟ ان بچوں کا باپ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا اور مس مریم نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

"آپ بھول گئے کہ یہاں شادی نہیں ہوتی"

"اوہ!" میں نے کہا۔

مس مریم نے کہا "بہرحال یہ ایک بہت سنگین قومی مسئلہ ہے اور اس پر غور کرنے کے لئے ہم نے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے"

اُس گلی سے نکل کر جب ہم سڑک پر آئے تو ایک پتھر پر ایک عبارت نظر آئی۔ لکھا تھا ـــــ

"وہ کون سی شادی ہے جس کا انجام المیہ پر

نہیں ہوتا ـــــ" مس شاہدہ خورشید

میں نے مس مریم سے کہا ـــــ میرے ملک میں نوّے فیصدی شادیوں کا انجام المیہ پر نہیں ہوتا۔ ویسے ہونے کو دوسرے رشتوں میں بھی تلخیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان کا انجام المناک ہوتا ہے۔ مثلاً بھائی بہن، والدین اور اولاد اور دوستی وغیرہ کے رشتوں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ یہ بات صرف ازدواجی ہی رشتہ پر منحصر نہیں "

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن ہماری مفکّر کا نظریہ صحیح ہے" مس مریم نے کہا اور میں ایک بار پھر سر سے پاؤں تک شرمندہ اور قائل ہوگیا۔

جب میں اور مس مریم رہائش گاہ پر واپس آرہے تھے تو راستے میں میں نے ایک نیم پاگل عورت اور مرد کو دیکھا اور جب اُن کے بارے میں میں نے مس مریم سے پُوچھا تو وہ بولیں ـــــ

"اگرچہ ہمارا مُلک شادی کے سوا ہر طریقے سے محبت کی تکمیل کی اجازت دیتا ہے لیکن مُلک میں اب بھی ایسے بہت سے قدامت پرست لوگ مِل جاتے ہیں جو تنہائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ہر تنہائی پسند پاگل نہیں ہوجاتا لیکن ہر ایک میں کسی نہ کسی طرح کی نفسیاتی کمزوری ضرور پیدا ہو جاتی ہے ـــــ ایسے لوگ بھی ایک قومی مسئلہ ہیں"

"جس پر غور کرنے کے لئے حکومت نے ایک کمیشن بٹھا دیا ہے ـــــ" میں نے کہا۔

"نہیں!" مس مریم بولیں "ہم نے ایسے نفسیاتی مریضوں کے لئے نفسیاتی شفاخانے کھلوائے ہیں اور ہماری وزارتِ صحت اور وزارتِ تہذیب و تمدن تنہائی پسندی کے خلاف زبردست مہم چلا رہی ہے لیکن جہاں تک ہسپتالوں کا سوال ہے یہ ایک مسئلہ ہے۔ ایسے نفسیاتی مریضوں کو اکثر کچھ اور شکایتیں بھی ہو جاتی ہیں اس لئے اپنے ضابطے کی رُو سے نفسیاتی ہسپتال اُنھیں اپنے یہاں داخل نہیں کرتے اور دوسری شکایتوں کے ساتھ یہ نفسیاتی مریض بھی ہوتے ہیں اس لئے۔۔"

"اِس لئے دوسرے جنرل ہسپتال بھی اِنھیں قبول نہیں کرتے" میں بیچ میں بول اُٹھا۔

"جی ہاں! ـــــ بس یہی مسئلہ ہے اور اس پر غور کرنے کے لئے ہم نے ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے" مس مریم نے بہت اطمینان کے ساتھ کہا اور میں سڑک کے ایک طرف واقع ایک میدان میں ایک بڑی عمارت کے سامنے عورتوں اور مردوں کے ایک ہجوم کو دیکھ کر رُک گیا۔ بے شمار مرد اور عورتیں پولیس کے گھیرے میں بیڑیاں پہنے کھڑے تھے۔

میرے سوال کرنے پر مس مریم نے ایک پولیس مین سے چند سوال کئے پھر مجھ سے کہنے لگی۔

"یہ سب عورتیں اور مرد مجرم ہیں اور یہ عدالت کی عمارت ہے"

"انھوں نے شادی کی ہوگی" میں نے کہا۔

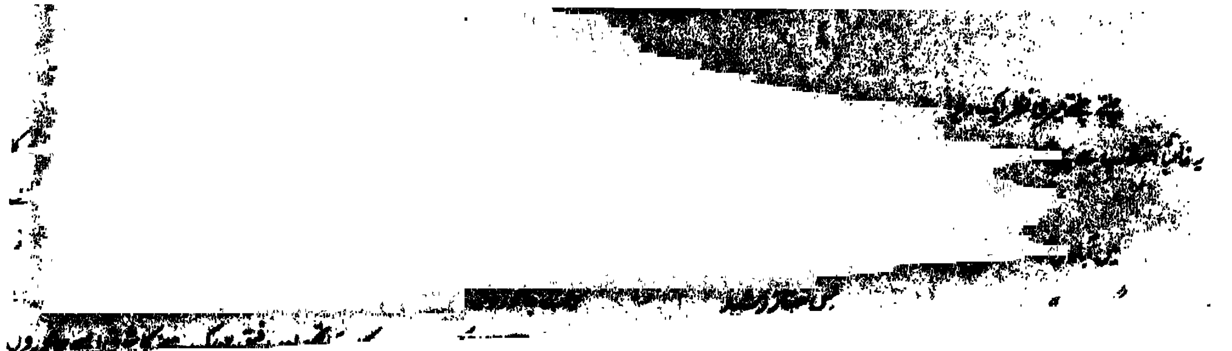
"نہیں!" مس مریم بولی "یہ سب بیکاری، کاہلی اور کام چوری کے مجرم ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب سے مُلک میں انقلاب آیا ہے یہاں کے باشندے ساری توجہ محبت کرنے پر صرف کرتے ہیں۔ اِس وجہ سے مُلک میں تعلیم، روزگار، صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ کو بہت نقصان ہو رہا ہے۔ یہ سب لوگ جن میں حکومت کے سابقہ وزیروں سے لے کر کلرک اور کاشتکار تک ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں ـــــ یہ سب ایک قومی مسئلہ ہیں اور اِن پر غور کرنے کے لئے بھی ہم نے ایک کمیشن مقرر کر دیا ہے"

"بہت خوب! واقعی یہ لوگ تو بے حد سنگین مسئلہ ہیں۔ اِن کی وجہ سے تو مُلک دیوالیہ ہو جائے گا" میں نے اپنی فکر کا اظہار کیا۔

مس مریم میری ہمدردی پر خوش ہوکر بولیں "جب سے انقلاب آیا ہے مُلک میں خودکشی اور قتل کی وارداتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ خصوصیت سے قتل ہونے والوں میں بچے اور خودکشی کرنے والوں میں جوان لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں"

"یہ صورتِ حال تو بہت بُری ہے" میں نے کہا۔

"نہیں بہت اچھی ہے۔ اِس طرح مُلک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کم کرنے میں بڑی مدد مِل رہی ہے اور حکومت غور کر رہی ہے کہ کیوں نہ قتل اور خودکشی کرنے والوں کو اعزاز عطا کیا کرے" مس مریم نے کہا۔



اختیار کی طرف مبذول کی۔

"جی ہاں!" انھوں نے کہا۔

"لیکن یہ بات بالکل غلط ہے" میں نے کہا" ایسی صورت میں جبکہ شادی کے رواج کے مطابق عورت اور مرد کو ایک مخصوص عمر کا پابند کیا جائے اور شوہر کے لئے بیوی اور بیوی کے لئے ایک شوہر ہو تو اولاد محدود ہوگی نہ کہ اس صورت میں جبکہ کوئی بات محدود نہ ہو"

"آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کے بعد سے ملک میں کم عمر ماؤں اور بچوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور یہ بھی ایک قومی مسئلہ ہے لیکن ہماری قومی مفکر کا قول بہرحال درست ہے ——" مس مریم نے کہا اور میں پھر قائل ہوگیا۔

ایک شام جب ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے، میں نے چاروں طرف بیٹھے مردوں اور عورتوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے مس مریم سے کہا۔

"اس ہوٹل ہی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لے کر آپ محسوس کریں گی کہ یہاں کے باشندوں کے چہروں پر اطمینان نظر نہیں آتا۔ ہر چہرہ فکر، اُلجھن اور تھکاوٹ میں ڈوبا نظر آتا ہے"

"آپ کا خیال درست ہے" مس مریم نے کہا" یہ فکر، الجھن اور تھکاوٹ کنوارستان کا ایک بڑا قومی مسئلہ ہے لیکن اس میں حکومت کا کوئی قصور نہیں کیونکہ اُس نے تو محبت بہرحال قائم رکھی ہے۔ پھر بھی حکومت ایک ذہنی انقلاب کے منصوبے پر غور کر رہی ہے"

ایک بات میں نے کنوارستان میں خصوصیت کے ساتھ نوٹ کی۔ وہ یہ کہ یہاں کے باشندے، کتے، بلی اور چوپائے بڑی تعداد میں پالتے ہیں۔ پرندوں میں مرغیاں پالی جاتی ہیں اور ایسے سبھی جانوروں کی بہت حفاظت کی جاتی ہے جن کا جوڑا نہیں ہوتا۔

اس بارے میں مس مریم نے مجھے بتایا کہ ایسا ہر جانور جس کا جوڑا نہیں ہوتا ہم نے قومی جانور قرار دیا ہے اور اُس کا مارنا جُرم ہے اور ایسے تمام جانور جن کا جوڑا ہوتا ہے اُن سے نفرت کی جاتی ہے اور ہر سال قومی جشن کے طور پر اُن کا قتلِ عام کیا جاتا ہے۔

—— جی پیدا ہوتا ہے"

"بہت خوب! آپ کے عوام بہت بھولے ہیں، جنھیں پرندے گمراہ کر دیتے ہیں" میں ہنسا۔

"یہ ایک نفسیاتی بات ہے" مس مریم نے کہا اور میں نے دیکھا وہ چھت کی محراب میں بنے ہوئے آشیانے میں بیٹھے ہوئے فاختہ کے جوڑے کو بہت حسرت سے دیکھ رہی تھیں جو ننھے منے بچوں کو دانا کھلا رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی تھیں۔ یکایک اُن کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹا اور اُنھوں نے چونک کر اُسے دوپٹے میں چھپا لیا۔

کنوارستان سے اپنی روانگی سے ایک دن پہلے میں نے مس مریم سے کہا۔

"میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہوئی ہے لیکن میں آپ کو صرف ایک زحمت اور دوں گا"

"بہ شوق —— فرمایئے" مس مریم نے کہا۔

"میں آپ کے قومی مفکروں اور انقلاب کے اُن علمبرداروں سے ملنا چاہتا ہوں جن کے اقوال میں نے قدم قدم پر پڑھے ہیں اور جو قوم کے نجات دہندہ ہیں" میں نے کہا۔

مس مریم کچھ پریشان سی ہوگئیں۔ کچھ دیر خاموش رہیں اور پھر بولیں۔

"افسوس ہے کہ آپ اُن سے اب نہیں مل سکتے"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"حکومت نے اُن سب کو شادی کے جرم میں جلاوطن کر دیا ہے" مس مریم نے کہا۔

اور اسی دن مس مریم میرے ساتھ ملک بدر کر دی گئیں۔

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵ ایف - موتی باغ ۲ - نئی دہلی

۲۱ فروری ۶۶ء — محترم خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

... "شانِ نزول" کی نئی قسط حاضر کر رہا ہوں۔ مقامِ مسرت ہے کہ "سرخ حاشیوں" اور "انٹرویو" کی طرح "شانِ نزول" کا سلسلہ بھی قارئین "بیسویں صدی" میں کافی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ "بیسویں صدی" میں برگزیدہ اہلِ قلم کی شخصیتوں کے متعلق ایک نئے سلسلۂ مضامین کا آغاز کروں۔ آپ نے اپنا انٹرویو لکھنے سے تو منع کر دیا لیکن اس نئے سلسلے میں آپ کی شخصیت کے بارے میں ایک تاثراتی مضمون ضرور لکھنا چاہتا ہوں ...

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد چودھری جمیل احمد نے ایک بار یہ مصرع پڑھ کر ط

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا

آرزو صاحب سے کہا کہ اس مصرعے پر دوسرا مصرع نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ جو کہنا تھا، وہ ایک ہی مصرعے میں مکمل ہو گیا ہے۔ آرزو صاحب نے قدرے تامل کے بعد یہ کہہ کر شاگرد کی بات کی تردید کر دی ؎

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا\
ہاتھ انگڑائی کو اٹھے اور میخانہ بنا

جوش ملیح آبادی کے اس شعر ؎

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی\
وہ آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

کا دوسرا مصرع بسمل سعیدی کے ذہن میں رہ گیا لیکن پہلا مصرع وہ بھول گئے۔ ایک موقع پر اس شعر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پہلا مصرع خود کہہ کر شعر اس طرح مکمل کر لیا ؎

اُن کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا سروساماں\
وہ آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

جن دنوں میں دہلی کے ہاؤسنگ اینڈ رینٹ آفس میں ملازم تھا شاہدرہ میں مقیم تھا اور یہ دفتر موری گیٹ سے باہر گوکھلے مارکیٹ میں واقع تھا۔ مو دہلی ریلوے اسٹیشن سے گوکھلے مارکیٹ تک میں پیدل جایا کرتا تھا۔ موری گیٹ کے پل کو پار کرنے کے بعد ایک راستہ میرے دفتر کی طرف جاتا تھا اور دوسرا بھولا رام اینڈ سنز وائن مرچنٹ کی بار کی طرف۔ پل سے گزرنے کے بعد اکثر مجھے اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا کہ دفتر میں جاؤں یا بار میں؟ کیونکہ اُن دنوں میں کلرک سے زیادہ رندِ لاابالی تھا۔ یہ قطعہ ذہنی کشمکش میں ایک دن اسی پل پر موزوں ہوا تھا ؎

ایک جانب ہے راہ دفتر کی\
اِک طرف میکدے کا جادہ ہے\
آگیا ہوں عجب دوراہے پر\
اے غمِ زیست! کیا ارادہ ہے

ایک بار اکبر الٰہ آبادی سے اُن کے ایک عزیز نے شب برات کا تحفہ طلب کیا۔ اکبر نے انھیں یہ شعر کہہ کر تحفے کے طور پر بھیج دیا ؎

تحفۂ شب برات کیا بھیجوں\
جانِ من! تم تو خود پٹاخہ ہو!

چلتے چلتے میری نظر ایک دیوار پر چسپاں ایک بڑے سے پرانے اشتہار پر پڑی۔ یہ غالباً انقلاب سے پہلے کا اشتہار تھا، جس پر تحریر تھا

"اگر ملک میں شادیاں اسی طرح ہوتی رہیں تو کچھ دن
میں آبادی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا اور ملک کبھی ترقی نہ کر سکے
گا ——— مس شہناز رشید"

"یعنی ہر پیدا ہونے والا بچہ ایک مسئلہ ہوگا" میں نے مس مریم کی توجہ اشتہار کی طرف مبذول کی۔

"جی ہاں!" انھوں نے کہا۔

"لیکن یہ بات بالکل غلط ہے" میں نے کہا "ایسی صورت میں جبکہ شادی کے رواج کے مطابق عورت اور مرد کو ایک مخصوص عمر کا پابند رکھا جاتے اور شوہر کے لئے بیوی اور بیوی کے لئے ایک شوہر ہو تو اولاد محدود ہوگی نہ کہ اس صورت میں جبکہ کوئی بات محدود نہ ہو"

"آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کے بعد سے ملک میں کم عمر ماؤں اور بچوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور یہ بھی ایک قومی مسئلہ ہے لیکن ہماری قومی مفکر کا قول بہر حال درست ہے ———" مس مریم نے کہا اور میں پھر قائل ہو گیا۔

ایک شام جب ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے، میں نے چاروں طرف بیٹھے مردوں اور عورتوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے مس مریم سے کہا۔

"اس ہوٹل ہی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لے کر آپ محسوس کریں گی کہ یہاں کے باشندوں کے چہروں پر اطمینان نظر نہیں آتا۔ ہر چہرہ فکر، اُلجھن اور تھکاوٹ میں ڈوبا نظر آتا ہے"

"آپ کا خیال درست ہے" مس مریم نے کہا "یہ فکر، اُلجھن اور تھکاوٹ کنوارستان کا ایک بڑا قومی مسئلہ ہے لیکن اس میں حکومت کا کوئی قصور نہیں کیونکہ اُس نے تو محبت بہر حال قائم رکھی ہے۔ پھر بھی حکومت ایک ذہنی انقلاب کے منصوبے پر غور کر رہی ہے"

ایک بات میں نے کنوارستان میں خصوصیت کے ساتھ نوٹ کی۔ وہ یہ کہ یہاں کے باشندے، کتے، بلی اور چوپائے بڑی تعداد میں پالتے ہیں۔ پرندوں میں مرغیاں پالی جاتی ہیں اور ایسے سبھی جانوروں کی بہت حفاظت کی جاتی ہے جن کا جوڑا نہیں ہوتا۔

اس بارے میں مس مریم نے مجھے بتایا کہ ایسا ہر جانور جس کا جوڑا نہیں ہوتا ہم نے قومی جانور قرار دیا ہے اور اُس کا مارنا جرم ہے اور ایسے تمام جانور جن کا جوڑا ہوتا ہے اُن سے نفرت کی جاتی ہے اور ہر سال قومی جشن کے طور پر اُن کا قتلِ عام کیا جاتا ہے۔

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لئے کہ ایسے جانوروں کے جوڑوں کو دیکھ کر عوام کے گمراہ ہو جانے کا ڈر ہے۔ ایک سرکاری جائزے کے مطابق شادی کے جرم میں ملک بدر کئے جانے والوں میں بڑی تعداد ایسی تھی جن کے اندر شادی کے جرم کی تحریک مشترکہ زندگی گزارنے والے جانوروں کی ازدواجی زندگی کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ شادی کر کے ایک گھر بسانے اور ایک دوسرے کا ساتھی اور رفیق بن کر رہنے کا شوق ایسے جانوروں سے بھی پیدا ہوتا ہے"

"بہت خوب! آپ کے عوام بہت بھولے ہیں، جنھیں پرندے گمراہ کر دیتے ہیں" میں ہنسا۔

"یہ ایک نفسیاتی بات ہے" مس مریم نے کہا اور میں نے دیکھا وہ چھت کی محراب میں بنے ہوئے آشیانے میں بیٹھے ہوئے فاختہ کے جوڑے کو بہت حسرت سے دیکھ رہی تھیں جو ننھے منے بچوں کو دانا کھلا رہا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی تھیں۔ یکایک اُن کی آنکھ سے ایک آنسو ٹوٹا اور اُنھوں نے چونک کر اُسے دوپٹے میں چھپا لیا۔

کنوارستان سے اپنی روانگی سے ایک دن پہلے میں نے مس مریم سے کہا۔

"میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہوئی ہے لیکن میں آپ کو صرف ایک زحمت اور دوں گا"

"بہ شوق ——— فرمایئے" مس مریم نے کہا۔

"میں آپ کے قومی مفکروں اور انقلاب کے اُن علمبرداروں سے ملنا چاہتا ہوں جن کے اقوال میں نے قدم قدم پر پڑھے ہیں اور جو قوم کے نجات دہندہ ہیں" میں نے کہا۔

مس مریم کچھ پریشان سی ہو گئیں۔ کچھ دیر خاموش رہیں اور پھر بولیں۔

"افسوس ہے کہ آپ اُن سے اب نہیں مل سکتے"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"حکومت نے اُن سب کو شادی کے جرم میں جلا وطن کر دیا ہے" مس مریم نے کہا۔

اور اُسی دن مس مریم میرے ساتھ ملک بدر کر دی گئیں۔

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵ الیف - موتی باغ ۲ - نئی دہلی

۲۱ فروری ۶۶ء

محترم خوشتر صاحب: تسلیم و نیاز

... "شانِ نزول" کی نئی قسط حاضر کر رہا ہوں۔ مقام مسرت ہے کہ "سرخ حاشیوں" اور "انٹرویو" کی طرح "شانِ نزول" کا سلسلہ بھی قارئین "بیسویں صدی" میں کافی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ "بیسویں صدی" میں برگزیدہ اہلِ قلم کی شخصیتوں کے متعلق ایک نئے سلسلۂ مضامین کا آغاز کروں۔ آپ نے اپنا انٹرویو لکھنے سے تو منع کر دیا لیکن اس نئے سلسلے میں آپ کی شخصیت کے بارے میں ایک تاثراتی مضمون ضرور لکھنا چاہتا ہوں ...

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد چودھری جمیل احمد نے ایک بار یہ مصرع پڑھ کر ؎

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا

آرزو صاحب سے کہا کہ اس مصرعے پر دوسرا مصرع نہیں لگ سکتا کیونکہ جو کہنا تھا، وہ ایک ہی مصرعے میں مکمل ہو گیا ہے۔ آرزو صاحب نے قدرے تامّل کے بعد یہ کہہ کر شاگرد کی بات کی تردید کر دی ؎

چشمِ ساقی میں خمار آتے ہی پیمانہ بنا
ہاتھ انگڑائی کو اٹھے اور میخانہ بنا

جوش ملیح آبادی کے اس شعر ؎

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
وہ آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

کا دوسرا مصرع بسمل سعیدی کے ذہن میں رہ گیا لیکن پہلا مصرع وہ بھول گئے۔ ایک موقع پر اس شعر کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پہلا مصرع خود کہہ کر شعر اِس طرح مکمل کر لیا ؎

اُن کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا سروساماں
وہ آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا

جن دنوں میں دہلی کے ہاؤسنگ اینڈ رینٹ آفس میں ملازم تھا۔ شاہدرہ میں مقیم تھا اور یہ دفتر موری گیٹ سے باہر گوکھلے مارکیٹ میں واقع تھا عموماً دہلی ریلوے اسٹیشن سے گوکھلے مارکیٹ تک میں پیدل جایا کرتا تھا۔ موری گیٹ کے پُل کو پار کرنے کے بعد ایک راستہ میرے دفتر کی طرف جاتا تھا اور دوسرا بھولا رام اینڈ سنز وائن مرچنٹ کی بار کی طرف۔ پُل سے گزرنے کے بعد اکثر مجھے اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا کہ دفتر میں جاؤں یا بار میں؟ کیونکہ اُن دنوں میں کلرک سے زیادہ رندِ لااُبالی تھا۔ یہ قطعہ ذہنی کشمکش میں ایک دن اسی پُل پر موزوں ہوا تھا ؎

ایک جانب ہے راہ دفتر کی
اِک طرف میکدے کا جادہ ہے
آگیا ہوں عجب دوراہے پر
اے غمِ زیست! کیا ارادہ ہے

ایک بار اکبر الہ آبادی سے اُن کے ایک عزیز نے شب برات کا تحفہ طلب کیا۔ اکبر نے انھیں یہ شعر کہہ کر تحفے کے طور پر بھیج دیا ؎

تحفۂ شب برات کیا بھیجوں
جانِ من! تم تو خود پٹاخہ ہو!

اُردو کے پہلے شاعر ولیؔ دکنی نے اپنے غرورِ ریختہ گوئی میں ایک بار اپنے ہم عصر ناصر علی سرہندی کو یہ شعر کہہ کر بھیجا ؎

اُچھل کر عب پڑے جوں مصرعِ برق
اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی نے اس کے جواب میں یہ شعر کہہ کر بھیج دیا ؎

با عجازِ سخن گر اژدہا ہو وہ
ولیؔ ہرگز نہ پہنچے گا علیؔ کوں

میرزا غالبؔ قمار بازی کے جرم میں قید تھے تو کپڑے اتنے میلے ہو گئے کہ اُن میں جوئیں پڑ گئیں۔ جس دن قید سے چھوٹے، کُرتا پھاڑ کر وہیں پھینک دیا اور یہ شعر کہا۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

قلندر بخش جراتؔ نے ظہور اللہ خاں نواؔ کی ہجو کہی جس میں ایک شعر تھا ؎

ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کھچڑی کھسنی
حضورِ بلبلِ بُستاں کرے نوا سنجی

اس کے جواب میں نواؔ نے ایک ترجیع بند لکھا۔ اُس کا ایک شعر جو اُس وقت بہت مقبول ہوا اور جس میں جراتؔ کے نابینا ہونے پر چوٹ کی ہے، وہ یہ ہے ؎

رات کو کہنے لگا جورو کے مُنہ پر ہاتھ پھیر
قدرتِ حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر

علامہ اقبالؔ کے ملنے والوں میں ایک صاحب نیاز محمد بھی تھے جو وکالت کرتے تھے اور لنگڑے تھے اور جنھیں فارسی زبان میں شعر کہنے کا جنون تھا۔ ایک بار نیازؔ صاحب نے ؎

نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

کی زمین میں غزل کہہ کر علامہ کو سنائی۔ غزل سُننے کے فوراً بعد علامہ نے بے اختیار ہو کر کہا ؎

گرچہ در قانونِ فلک پیما شُدی
بر زمینِ شعر لنگانی ہنوز

نواب واجد علی شاہ نے سرِ دربار امیر مینائی سے فرمایا [illegible]
فی البدیہہ شعر کہہ کر دکھایئے کہ [illegible]
لیکن رقیب کی بوسہ ہے۔ امیر نے فکر کرنے کے بعد گزارش کی کہ حضور ایک شعر تو نہیں البتہ اس مضمون کو ایک قطعے میں نظم کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ؎

مجھ کو خفتہ دیکھ کے ظالم غیر کو بوسہ دیا
دیکھتا جا او بُرے وہم باز اپنے طور کو
کِس کا حصّہ تھا دیا کِس کو ذرا انصاف کر
وہ و بے حلوا مجھے حلوائے بے دود اور کو

بیخودؔ دہلوی کی زیرِ صدارت دہلی میں ایک طرحی مشاعرہ ہو رہا تھا جس میں ایک شاعر پریشانؔ نے انتہائی پریشان کُن غزل شروع کی۔ جب پریشان صاحب نے ایک بہت لغو شعر سُنایا، جس کا دوسرا مصرع تھا ؎

پیشاب بھی خطا ہوا جاناں کے سامنے

تو مہاراج بہادر برقؔ دہلوی نے اُسی وقت یہ شعر کہا اور اس کا پہلا مصرع پریشان صاحب کی اور دوسرا مصرع بیخودؔ صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھ دیا ؎

بزمِ سخن کی آپ نے مٹی خراب کی
یہ شعر اور ایسے سخن داں کے سامنے

تقسیمِ وطن کے بعد حاجی لق لق نے اخبار "زمیندار" لاہور میں "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے چند شعر ہندو شعراء کے ترکِ وطن کرنے پر اپنے مزاحیہ انداز میں کہے۔ جن میں ہمدردی کا عنصر شامل تھا۔ دوسرے ہندو شعراء کے علاوہ اُن میں تلوک چند محرومؔ کا ذکر بھی تھا۔ جواب میں محرومؔ صاحب نے لق لق کو یہ قطعہ لکھ کر بھیج دیا ؎

لق لقا! خوش رکھے خدا تجھ کو
پاک لوگوں کے درمیاں ہی سہی
شکر ہے یاد تو کیا ہم کو
از رہِ یادِ رفتگاں ہی سہی

جوشؔ ملسیانی اپنے ایک دوست مفتی مولوی محمد حنیف سید نکودری کے یہاں پہنچے تو اُن کے دو شاگرد کمالؔ کرتارپوری اور قدرؔ نکودری سید صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن تینوں شاعروں کو یکجا دیکھ کر جوشؔ صاحب کی

[illegible] دیا ۔

[illegible] سر ہے

[illegible] ہے

[illegible] کسی کلب سے وہسکی کی ایک بوتل [illegible] ہوگئے ۔ بوتل لے کر اپنے چند شاعر دوستوں کے ساتھ وہ [illegible] یہ مصرع پڑھا ط

میں یہ بوتل کلب سے لایا ہوں

اور [illegible] دوسرے شاعروں کو دی ۔ ساغر نظامی نے [illegible]

آتشِ گل طلب سے لایا ہوں

پٹنہ کے ایک مشاعرے میں جمیل مظہری نے عرش ملسیانی کے کلام پر بہت زیادہ داد دی تو جواب میں عرش نے فارسی کا یہ مشہور شعر ۔

جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اِس [illegible] پڑھ دیا ۔

جمیلِ مظہری در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں عرشم کہ ہستم

[illegible] آسی کے صاحبزادے کی شادی کی خوشی میں ایک مختصر سی محفلِ [illegible] ہوئی ۔ کئی مقامی شاعروں نے اس تقریب سے متعلق نظمیں پڑھیں اور [illegible] مبارکباد دی ۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے وہیں بیٹھے بیٹھے فی البدیہہ یہ شعر [illegible] آسی صاحب کی نذر کرتے ہوئے محفل میں پڑھ دیا ۔

جناب آسی کے لختِ جگر کی شادی ہے
مگر غریب کو کس جرم کی سزا دی ہے

کراچی میں کہیں مشاعرہ تھا ۔ غالب کا مصرع ، طرح تھی ط

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ

حفیظ ہوشیارپوری کہیں گھومتے گھامتے مشاعرہ گاہ میں آگئے ۔ پہلے سے انھیں مشاعرے کی کوئی اطلاع نہیں تھی ۔ انھوں نے فی البدیہہ یہ مطلع کہہ کر سنایا ۔

جو کھینچنا ہی ہے اِس کو تو اپنے اندر کھینچ
نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ

جگن ناتھ آزاد جب اپنے والدِ محترم کو اپنا تین سو سی سی خون دینے کے باوجود مرحوم صاحب کو نہ بچا سکے تو اُن کی زبان سے اِس سعیِ رائیگاں کے پیشِ نظر بے اختیار یہ موزوں ہو گیا ۔

نوائے درد سے یا الٰہی تم سے کیا ہوتا
مقامِ شوق میں دل کے لہو سے کچھ نہ ہوا



گھر بھر کی دُھلائی جگمگاتی سفید! بے داغ صاف! اِسلئے کہ ڈھیروں جھاگ دینے والے سرف میں دُھلائی کی زائد قوت ہے! ساڑھیاں، شلواریں، قمیضیں، بچّوں کے لباس... ہر کپڑا سفید ترین دُھلتا ہے اور صاف ترین! ساری دُھلائی گھر میں سرف سے کیجئے۔

سرف سے کپڑے سفید ترین دُھلتے ہیں

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

SU. 38-140-45 UD

افسانہ

آنکھوں کی زباں

اسنیٰ رباب

ا۸۔ ابوالفضل، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

۱۶ر جنوری ۹۶ء

چچا جان! تسلیم

پہلی کامیابی کے بعد پہلی ناکامی سے نڈھال ہو گئی ـــــــ آپ نے نومبر ۹۵ء میں بھیجی ہوئی میری کہانی واپس کر دی، اچھا کیا۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور رنج بھی۔ خوشی اس لئے کہ "بیسویں صدی" میں کسی تیسرے درجہ کی کہانی کو جگہ نہیں ملنی چاہئے اور وہ ہرگز نہیں ملنی چاہئے۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔ غم کا سبب کچھ اور ہی ہے۔ آپ اگر اپنی رائے کے ساتھ کہانی واپس کرتے تو مجھے مسرت ہوتی لیکن آپ کو اتنی فرصت کہاں تھی؟ کچھ بھی ہے، میں تو آپ کو اپنا بزرگ، کرم فرما اور مصلح سمجھتی ہوں۔ آپ کی جو تصویر بچپن سے میرے ذہن کے گوشوں میں ابھری ہے، وہ اب جوان ہو کر اور بھی دلکش معلوم ہونے لگی ہے۔ آپ کی حق پرستی، صاف گوئی اور انسان دوستی نہ صرف آپ کی تحریروں سے عیاں ہے بلکہ اُس کے بہت سے قصّے میں نے اپنے دوستوں کی زبانی بھی سُنے ہیں۔ اُن دوستوں میں سے کئی تو "بیسویں صدی" کی محفل میں برابر شریک ہوتے ہیں۔ شاید اسی محبت کا اعجاز ہے جس نے مجھے آپ سے اتنا قریب کر دیا ہے ـــــــ اس بار "آنکھوں کی زباں" کے ساتھ "بیسویں صدی" کی جگمگاتی محفل میں شرکت کی اجازت چاہتی ہوں۔ کہانی اگر پسند آئے تو شاملِ اشاعت کر لیجئے۔ اشاعت کی صورت میں یا واپس کرتے وقت خدارا، اپنی رائے سے نوازنا فراموش نہ کریں ـــــــ دسمبر کے شمارہ میں شائع ہونے والی میری کہانی کو بہت سے لوگوں نے پسند کیا ہے۔ کچھ نے تو مجھے مبارکباد کے خط بھی لکھے ہیں۔ میں اُن سب دوستوں کی شکر گزار ہوں لیکن افسوس، اتنے سارے خطوں میں ایک خط بھی کسی اہلِ قلم کا نہیں ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف سینہ قلم اٹھانے والے ادیب خود اپنی ادبی سرمایہ داری سے محروم نظر آتے ہیں۔ ادب کے میدان میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کو میں اچھی نظر سے نہیں دیکھتی . . .

آپ کی بھتیجی ـــــــ اسنیٰ رباب

"اندر آ جائیے نا ـــــــ"

"جی، پھر کسی اور وقت حاضر ہوں گا۔"

"اب کیوں نہیں؟"

"شرمئی شام کی کنواری انگڑائیوں کا لمس مجھے اپنے کمرے ہی میں زیادہ آتا ہے۔"

"شرمئی شام کی کنواری انگڑائیاں ـــــــ آپ تو شاعری کرنے لگے۔"

"شعر آپ مکمل کر دیجئے۔"

"شعر مکمل ہونا آسان نہیں ہے جناب۔"

"کیوں؟"

"اُس کے لئے بہت ریاض کی ضرورت ہے۔ بڑے تپ کی آنچ سے شعر ٹپکتا ہے۔"

"اور جذبہ کی گرمی ـــــــ؟"

"وہ آپ ہی عطا کر دیجئے نا!"

"حُسن کبھی کسی کا ممنونِ کرم ہوا ہے؟"

"ہوا ہے"

"کس کا؟"

"عشق کا!"

"غلط!"

"آپ ثابت کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں!"

"کیجئے!"

"بہاروں کی رنگینی، پھولوں کی رعنائی، چاندنی کا حُسن، پہاڑوں کے دامن میں کل کل کرتے جھرنوں کا نشہ، سیاہ شب کے دامن پر بکھرے ہوئے تاروں کی جگمگاہٹ کنواری صبح کے آنچل سے لپٹی ہوئی ہواؤں کی سرمستی، کیا کسی کی مرہونِ منت ہے؟ کیا ان میں سے کسی چشمِ حیا بار کسی غیر کی ممنونِ کرم ہے؟"

"جی ہے"

"کس طرح؟"

"رنگینی و رعنائی، حُسن و نشہ، جگمگاہٹ اور سرمستی سب عشق کی آنکھ کے جلوے ہیں، سب پیار کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ یہ سب محبت کی کار فرمائیاں ہیں — کیا اس حقیقت سے آپ کو انکار ہے؟"

"ہے — لیکن یہ بحث کبھی اور سہی۔ اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے"

"بور ہو گئے — ؟"

"آپ سے؟ آپ سے بور ہو کر زندہ رہ سکوں گا؟؟"

"بس بنانے لگے!"

"بنانے والا تو خیر کوئی اور ہی ہے جناب۔ چچ چچ چچ! ایسا نہ کہئے، کافر ہو جائیں گی"

"اجی حضور! زیادہ باتیں نہ بنائیے۔ نظر لگ جائے گی۔ اچھا اب کب تشریف لا رہے ہیں اِدھر؟"

"جب حکم دیجئے"

"حکم تو میں اس وقت بھی دے سکتی ہوں لیکن خیر جانے دیجئے۔ آپ کے لئے کنواری انگڑائیاں بے چین ہوں گی۔ کل شب کھانے پر آپ کا انتظار کروں گی۔ دیکھئے بھولئے گا نہیں!"

دوسری شام کو میں حسبِ وعدہ اُس کے یہاں پہنچ گیا۔ داخل ہوتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے گھر کی ہر شئے میری منتظر ہے۔ ہر چیز سراپا انتظار ہے۔ کوٹھی کے خوبصورت لان پر شام کی شرمیلی چادر میں مُنہ چھپاتے ہوئے پھُولوں کی شرمیلی نگاہیں، نوخیز کلیوں کی چنچل نظریں، نغمہ ریز غنچوں کے نازک لبوں سے پھُوٹتی ہوئی خوشبو کی پھُواریں، پورٹیکو کی جالیوں سے نکل کر پھیلنے والی اٹھلاتی کرنیں جیسے سب کی سب میری راہ تک رہی ہیں۔ میں ماحول کی رنگینیوں میں کھو سا گیا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی میرے قدم آپ ہی آپ آہستہ اُٹھنے لگے۔ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں۔ نہ جانے یہ میرے اپنے اخلاص کی بے رحمی تھی یا امارت کے توانا ہاتھوں کا اعجاز ا— میں سوچنے لگا۔

"اتنی بڑی خلیج، اس قدر فاصلے۔ آخر اس ڈرامہ کا کیا انجام ہوگا؟
دن کے اُجالے اور شب کی تاریکی کا رشتہ ہی کیا؟
خوشبو صرف پھُول کے دل میں بستی ہے۔ کانٹے تو اس کی آرزو ہی میں سُوکھ جاتے ہیں۔

اور پھر لاشعوری طور پر میرا دایاں ہاتھ کال بیل سے سرگوشیاں کرنے لگا۔ کمرہ میں کسی کے تیز قدموں کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی۔ دروازہ کھُلا۔
تبسم کی ایک کرن بڑھی اور میرے احساس کی ظلمتوں سے ہمکنار ہو گئی۔
خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور میرے مشامِ حیات کو معطر کر گیا۔
وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔
"آیئے نا — آپ مجھے اس طرح تکے کیوں جا رہے ہیں!"
"کہیں میں پھر تو کوئی نئی غلطی نہیں کر رہا؟" میرے لب آپ ہی آپ وا ہو گئے۔

"حضور! یہ وقت غلطیاں کرنے ہی کا ہے۔ نئی پُرانی غلطیوں پر آنسو بہانے کا نہیں۔ اندر آیئے نا!"

میں اندر داخل ہو گیا۔ وہ میری ہم قدم تھی۔ میرے لبوں پر سکوت کے پُرسکون سائے جگمگا رہے تھے۔ وہ بھی خاموش تھی۔ کوٹھی کے خوبصورت ہال کی شگفتہ وُسعتوں سے مجھے نہ جانے کیوں اپنائیت کی خوشبو آنے لگی۔ نئی طرز کے خوبصورت گلدان میں مُسکراتے ہوئے پھُولوں کے شاداب تبسم سے میری نظروں کا تعارف ہوا کمرہ کے ایک کونے میں رکھے ہوئے قیمتی کتابوں کے شیلف کی سنجیدہ مُسکراہٹوں نے میرا سواگت کیا۔ کسی نازنین و ناز آفریں کے جسم کی طرح نرم و نفیس صوفے پر میرے وجود کے پُرشوق ہاتھ پھیلے تو میرے احساس کی رگوں میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ میں مدہوش ہو اُٹھا۔ میرے شعور کی دُنیا میں نغموں کا چشمہ اُبل پڑا۔ میری سوچیں منجمد ہو کر رہ گئیں۔ پھر ایک دلنواز گیت میرے کانوں میں امرت گھولنے لگا۔

"آپ تھوڑی دیر تنہائیوں سے لطف اندوز ہوں۔ میں ابھی حاضر ہوئی۔"

اُس کے ساتھ امّی بھی تھیں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ میرا ہاتھ سلام کے لئے بلند ہوا اور دعاؤں کی دولت کے ساتھ ہم آہنگِ احترام ہو گیا۔ عقیدت سے میری نظریں جھک گئیں۔ امّی مجھ سے کہہ رہی تھیں۔

"بیٹا! کبھی کبھی آجایا کرو——— بلا تکلف، اپنا گھر سمجھ کر۔"

میری آنکھیں نم ہو اُٹھیں۔

"مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ اکثر گھر میں تمہارا تذکرہ ہوتا ہے۔"

وہ سراپا التفات تھیں۔

"کاش اُنھیں میرے متعلق سب کچھ معلوم ہوتا! میری زندگی کی مایوسیاں، زیست کی ناکامیاں، حیات کی محرومیاں۔ سب اُن کی نظروں سے اوجھل ہیں——— یہ لوگ واقعی بڑے ہیں، عظیم ہیں۔ میں سوچنے لگا۔

"اچھا تم دونوں بیٹھو۔ دیکھو لڑنا نہیں۔" امّی ماحول کی تصویر میں ممتا کا پیارا پیارا رنگ بھر کے چلی گئیں۔

ماحول میں خوشیوں کے پھول کھل اُٹھے۔

گیتوں نے محبت کے گلے میں نغمگی کی مالا پہنا دی۔

اور میں نے خاموشیوں کو زبان عطا کر دی۔

"بتاؤ تو تم نے امّی کو میرے متعلق کیا کیا بتایا ہے؟"

"سب کچھ!"

"سب کچھ کیا؟"

"یہی کہ آپ بہت بُرے ہیں!"

"وہ تو درست ہے——— لیکن تمہیں میرے متعلق معلوم ہی کیا ہے؟"

"اِس سے زیادہ مجھے اور معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے!"

"ضرورت——— ! یہ تو خیر آپ جانیں لیکن شاید اِس سے تو آپ بھی انکار نہ کر سکیں گی کہ ہر انسان کی زندگی کا "آج" اُس کے گزرے ہوئے "کل" سے مختلف ہوتا ہے۔ حال صرف مستقبل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میرے خیال میں حال کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہر انسان کو ماضی کی عینک کا سہارا ضرور لینا چاہئے۔ زندگی کے رُخ پر اُبھرے ہوئے بہت سے نقوش ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر بہت دلکش، بے حد خوشنما معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کی حقیقت اُس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔"

"حال! آپ ہی کے بقول، مستقبل کا آئینہ دار ہوتا ہے، تو ماضی———؟ اُسے آپ حال کی پرچھائیں کیوں نہیں سمجھتے——— اور پھر بہت سے رشتے ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن میں ماضی سے بے خبری اُس کے جاننے سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ آپ اِس بحث کو چھوڑئے۔ میں آپ کو ایک بہت پیاری خبر سناتی ہوں۔ میں شعر کہنے لگی ہوں، جی جناب! رات گھنٹوں مغز پچّی کرنے کے بعد ایک مصرع ہوا ہے۔ کہئے تو عرض کر دوں۔"

"جی، ارشاد!"

"پھر بنانے لگے۔ بس یہی تو آپ کی بے حد بُری عادت ہے۔"

"نہیں تو——— ! میں تو تصوّر ہی میں اِس مصرع کی لذّت سے بے خود ہو گیا تھا اور آپ جانتی ہیں، بے اختیاری کی کیفیت قابلِ معافی ہوتی ہے۔ میں اب ہوش میں ہوں۔ خدا کے لئے اب جلدی سے سنایئے۔"

"جایئے، ہم نہیں سناتے!"

"آپ کو اپنے نوشگفتہ پیار کی قسم!"

اُس نے چشم زدن میں اپنے نرم و نازک مرمریں ہاتھوں سے میرے ہونٹوں پر سایہ کر دیا۔

آنکھوں میں حیا کی نرمی سمیٹے وہ گنگنانے لگی ؏

بعدِ مدّت ترے دیدار کی شام آئی ہے!

اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا——— "آپ اِس مصرع کو شعر کی شکل میں اِس طرح پڑھ سکتی ہیں ؎

صبحِ اُمید بہ۔ مست خرام آئی ہے

بعدِ مدّت ترے دیدار کی شام آئی ہے

"واہ واہ، سبحان اللہ! آپ نے تو میرے دل کی ترجمانی کر دی۔ صبح و شام کی رعایت تو بے حد حسین ہے۔"

"ذرّہ نوازی کا شکریہ!"

"اور دل نوازی کا———؟"

میرے قصرِ دل میں نشاط افروز مستیوں کی اپسرائیں رقص کرنے لگیں۔

"آپ کی نوازشیں روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ میں سوچتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو، میرے قدم راہ کی دلفریبیوں میں اُلجھ کر رہ جائیں اور میں اپنی منزل سے بہت دُور نکل جاؤں۔" میں نے اپنے دل کا تاثر چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے، اُس سے کہا۔

"منزل کی طرف تو آپ کے قدم اب بڑھے ہیں۔"

"منزل کی طرف بڑھے ہیں یا بے خودی میں کسی نئی منزل کی تلاش میں محوِ خرام ہیں، اِس کا تو مجھے بھی صحیح اندازہ نہیں لیکن راہ کے نقوش خوبصورت ہوتے ہوئے بھی وہ نہیں ہیں، جن سے میں پیار کرتا رہا ہوں۔ مجھے اتنا ہوش ضرور ہے۔"

"نئی منزل! نقوش خوبصورت ہوتے ہوئے بھی وہ نہیں ہیں! کیا مطلب؟"

"یہی تو اتنے دنوں سے میں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔"

"کیا آپ کسی اور کو چا۔۔۔؟"

"ہاں!"

"کیا آپ اُس عظیم ہستی کے بارے میں مجھے بھی کچھ بتا سکتے ہیں۔۔۔؟" وہ بے حد پریشان تھی۔

"میں آپ سے اپنی کوئی بات پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا۔"

"تو جلدی سے بتایئے نا۔۔۔!"

میں نے اُس کی آنکھوں میں نمی کی ایک ہلکی سی لہر اُبھرتی محسوس کی۔ میں اُس سے کہنے لگا۔

"اُس کی آنکھیں۔۔۔ بس کیا بتاؤں آپ کو، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صاف و شفاف نیلگوں جھیل پر دو گلابی کنول بہاروں کی خوشی میں کھلکھلا کر ہنس پڑے ہوں۔ جو کسی نو کی آنکھوں میں آپ نے کبھی چھلکتی شراب دیکھی ہے۔۔۔؟ اُس کی آنکھیں تو ہر لمحہ، ہر لحظہ، ہر دم مستیوں کے جام لنڈھاتی رہتی ہیں۔ دوشیزۂ ماہتاب کے معصوم چہرہ پہ انوار کی پھیلی ہوئی نشیلی کرنیں، شفقِ آمیز دو کے رُخ پر حجاب کی مہاتی شعاعیں، اُس کے حُسن کی بس ایک معمولی سی جھلک ہیں، ایک ادنیٰ پرتو۔۔۔ اور اُس کا دل! وہ تو اُس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے، اُس سے بھی کہیں خوبصورت! سارے جہان کی محبت، تمام دُنیا کا پیار اُس نے اپنے دل میں چھپا کر محفوظ کر لیا ہے۔ اِسے اپنی قسمت کہوں یا اُس کی بلند حوصلگی! نہ جانے کیوں اُس نے مجھے جذبہ کی گہرائی سے دعوتِ فکر و نظر عطا کر دی ہے۔

وہ کون ہے، کیا ہے، زندگی کے کس موڑ پر وہ مجھ سے ملی، آپ یہ سب جاننے کے لئے بیتاب نظر آتی ہیں۔ میں آپ کو سب بتا دوں گا۔ یوں تو اُس کے ساتھ بیتے ہوئے لمحوں کا اگر تذکرہ چھیڑوں تو ایسی ہزاروں لاکھوں راتیں بھی تشنہ کام رہ جائیں گی۔ مجھے ذرا سوچنے دیجئے۔

۲۷ مارچ کی صبح میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ امتحان پُر شباب انگڑائیاں لے رہا تھا۔ فیکلٹی آف لاء کے سامنے ہری ہری گھاس پر جگہ جگہ لڑکے اور لڑکیاں اِس طرح بکھرے پڑے تھے، جیسے شبنم نے موتی برسائے ہوں۔ جوانیاں ایک دوسرے سے بے نیاز، اُمنگیں ایک دوسرے سے بے تعلق، آرزو مند آنکھیں گوندے صحیفۂ حیات میں علم کی روشنی بھرنے کی آخری کوشش میں مصروف تھیں۔ مجھ سے کوئی ڈھائی تین گز کے فاصلے پر وہ تھی۔۔۔ اکیلی، بالکل تنہا! پرچہ شروع ہونے میں ابھی دو گھنٹے اور باقی تھے۔ میں بھی اُن سوالوں کو ایک بار آخری کوشش کر کے اپنی پوری گرفت میں لینا چاہتا تھا، جو میرے اندازے کے مطابق آنے والے پرچہ کی زینت بنیں گے۔ اس امتحان سے میری زندگی کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اماں نے میرے بازو پر امام ضامن باندھ کر مجھے امتحان میں کامیابی کی [illegible] یہ امتحان میری اماں کی دعائے نیم شبی کا بہترین ثمر ہے۔ اِس جذبے کے تحت میری کوششوں میں کچھ اور تازگی آگئی تھی اور پھر میرے کانوں میں ایک نقرئی [illegible] گھول گیا۔

"سُنئے۔۔۔!"

میری نظریں اُس کی نگاہوں سے ہم آغوش ہو گئیں۔

"آپ کی گھڑی میں کیا بجا ہے؟"

"پرچہ شروع ہونے میں صرف دو گھنٹے باقی ہیں۔" وہ مجھے بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔

میں پھر کتابوں میں کھو گیا۔

آدھ گھنٹہ اور بیت گیا۔

"اب اور کتنا وقت باقی ہے؟" وہ مجھ سے پھر ہم کلام تھی۔

میری آنکھیں اوپر اُٹھیں۔ اُس کی نظروں میں بہت سے سوال تھے جو وہ صرف مجھ سے کرنا چاہتی تھی۔ بہت سے غم تھے جن میں وہ مجھے اپنا شریک بنا لینا چاہتی تھی لیکن اُس کی زبان اُس وقت سازِ تکلم سے محروم تھی۔ میرے احساس کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وقت کی نزاکت نے مجھے جلدی سے چونکا دیا اور میری زبان سے یہ الفاظ پھسل پڑے۔

"اگر آپ میری وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی ہوں تو میں کہیں اور چلا جاؤں؟"

دو چمکدار موتی اُس کی آنکھوں کی خوبصورت جھیل میں تیرنے لگے۔

میں بے چین ہو اُٹھا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"میں ساری رات جاگتی رہی ہوں۔ اب تک میرا ایک سوال بھی تیار نہیں، کیا آپ مجھ سے دو ایک سوال ڈسکس (Discuss) کر سکتے ہیں؟" وہ میرے بہت قریب آ گئی تھی۔

"کیا آپ نے لاء آف وار پر کچھ پڑھا ہے؟"

"جی! پڑھا تو ہے لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"اور ری پیٹری ایشن (Repatriation)؟"

"وہ تو دیکھا تک نہیں۔"

اور پھر میں اور وہ دیر تک سوالات ڈسکس کرتے رہے۔ گھنٹی بجی اور وہ مجھ سے امتحان بعد ملنے کا وعدہ لے کر اپنی سیٹ کی طرف چلی گئی۔

میرا آج کا پرچہ بھی اچھا ہوا تھا۔ اُسی خوشی میں سرشار میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ مجھے یاد ہی نہ تھا کہ کسی سے ملنا بھی ہے اور پھر وہ بھاگتی ہانپتی کانپتی سامنے آ کر یوں رُکی جیسے چنچل کرن دھرتی کے سینہ پر آ کر رُک جاتی ہے۔

وہ بے حد خوش تھی۔

مطلب یہ نہیں۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچتی تو آپ تو جا بھی چکے ہوتے۔ دیکھئے وہ
[illegible] دوسرا شکایت تھی۔

"میں معذرت خواہ ہوں"

"پہلے آپ کے گھر تک کار میں ہی چلتی ہوں"

میں گھبرا گیا۔

"کیوں؟ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"آپ میرے قدم بہ قدم چل سکیں گی؟"

اُس کی آنکھوں میں تبسم کی پریاں رقص کرنے لگی تھیں۔ بات بات پر وہ کھلی جاتی تھی۔ ہم باتیں کرتے کرتے بلڈنگ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ شوفر نے اُسے دیکھتے ہی کار کا دروازہ کھول دیا۔

"آیئے!"

"شکریہ —— میں بس میں سفر کرنے کا عادی ہوں"

اور پھر اُس کی نرم و نازک انگلیوں میں میرا ہاتھ اِس طرح اسیر ہو گیا جیسے کلیوں کی گود میں خاردار شاخِ گل!

اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے برابر ملتے رہے۔ یونیورسٹی کینٹین میں، کولکتہ کے خوبصورت وزیر سینما گھروں میں، شہر کے حسین باغوں میں، تاریخی عمارات کے گوشوں میں۔

دن مہینے بنے اور مہینے سال بن کر بیت گئے۔

میں نے دیکھا اِس عرصہ میں وہ بے حد بدل گئی ہے۔ آرائش کی پیکر، سادگی کا مجسمہ بن گئی ہے۔ سادگی نے اُس کے حُسن کو اور نکھار دیا ہے۔ کار میں سفر کرنے والی اب اکثر بس سے یونیورسٹی آتی ہے۔ میں اِس غیر معمولی تبدیلی سے حیران تھا۔

فائنل ایئر کا امتحان شروع ہونے سے دو دن پہلے وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"دیکھئے اِس امتحان کے بعد یونیورسٹی چھوڑ دوں گی۔ آپ ایل ایل۔ ایم میں داخلہ ضرور لیں گے۔ مجھے ——!"

"میرے حالات اب اِس کی اجازت نہیں دیتے" اپنی دلی خواہش کا گلا گھونٹتے ہوئے میں نے اُسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا۔

"آپ فکر نہ کیجئے۔ پریکٹس تو میری خیر کیا چلے گی لیکن میں نوکری کر لوں گی۔ آپ بطور قرض مجھ سے جتنی رقم چاہئے لے سکتے ہیں لیکن یہ رقم آپ کو مع سود ادا کرنی ہوگی" وہ مُسکرا رہی تھی۔

"قرض تو خیر میں مع سود در سود ادا کر دوں گا لیکن اماں کا کیا ہوگا؟"

"اِس کی آپ پرواہ نہ کریں۔ وہ میری بھی تو ماں ہیں۔ میں اُن سے بہت پہلے اِس موضوع پر گفتگو کر چکی ہوں"

اور پھر مجھے خیال آیا —— میرے اور اماں کے پلنگ کی بدلی ہوئی خوبصورت چادریں، کمرہ کی کھڑکی پر ہفتہ میں بدل جانے والے حسین پردے، کتابوں کی نئی الماری اور . . . میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔

اور ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ وسیع و عریض بنگلہ کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں اُس کے ڈیڈی نے مُسکراتی ہوئی شفقتوں سے میرا خیر مقدم کیا۔ ڈرائنگ روم سے وہ مجھے اپنے کمرہ میں لے گئی۔ حیرت سے میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ اُس کے کمرہ میں صرف ایک پلنگ تھا جس پر سادہ سی پُرانی چادر بچھی ہوئی تھی۔ یہ وہی چادر تھی جو پچھلے سال کاٹیج ایمپوریم سے میں اپنے لئے خرید کر لایا تھا۔ کونے میں ایک طرف بڑی الماری میں قانون و ادب کی کتابیں سلیقہ سے سجی ہوئی تھیں۔ چھوٹی سی میز کے پاس ایک معمولی کُرسی پڑی تھی۔ میز پر اُس کے ہاتھ کا کڑھا ہوا میز پوش ٹیبل لیمپ کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ میز کے ایک کونے میں کچھ کتابیں حُسنِ ترتیب کی داد طلب کر رہی تھیں۔ وینی شین (Venitian) گلدان میں گلاب کی ایک ننھی سی کلی نہ جانے کس کا انتظار کر رہی تھی۔

میری آنکھیں بھیگ گئیں ——

ناہید میں اِس سے زیادہ اب اور کچھ سُننے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ اُس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں میں خاموش طوفان اُمڈنے لگے تھے۔ ضبط کی شدت سے اُس کا چہرہ گلنار ہو اُٹھا تھا۔

رازِ گل خوشبو تک پہنچنے کے لئے بیتاب تھا۔

بیقرار جھونکا کلی کا مُنہ چُومنے کے لئے آگے بڑھا۔

اور افسانہ حقیقت میں ڈھل گیا۔

"خاموش نظروں، سِلے ہوئے ہونٹوں سے وہ کلی کس کی راہ تک رہی ہے، تم بتا سکو گی ناہید؟"

اور پھر وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ سسک سسک کر روتی رہی۔

میرے مُنہ سے بس اِتنا نکل سکا۔

"ناہید تم میری ہو!"

فضا خوشبوؤں سے معطر ہو گئی۔

نغمے خاموشیوں کی زبان بن گئے۔

کھانے کی میز پر میں خاموش تھا۔ وہ بھی خاموش تھی —— لیکن ہماری آنکھیں شاید زبان بن گئی تھیں۔ ہماری آنکھیں دل کی غماز تھیں ہر جبین تو اتنی معنی خیز تبسم سے ہمیں ہر لمحے جا رہی تھیں۔

[illegible]

جبیں [illegible]

غزلیں

قیس رامپوری

شکوۂ انتظار کیا کرتے
ہم انھیں شرمسار کیا کرتے

آپ تو خود ہی اِک کلی ٹھہرے
آپ پھولوں سے پیار کیا کرتے

جو نہ سمجھے خزاں کو، وہ کم فہم
احترامِ بہار کیا کرتے

دل تھا کم بخت اُن کے کہنے میں
دل کا ہم اعتبار کیا کرتے

یہ بھی کیا کم ہے بن گئے شاعر
اور ہم دلفگار کیا کرتے

قیس وہ لوگ جن کو غم نہ مِلا
میرے شعروں سے پیار کیا کرتے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

خروشِ دل کو وجہِ صد سکونِ دل سمجھتے ہیں
ہم اپنے دردِ پیہم کو عشق کا حاصل سمجھتے ہیں

محبت میں فنا ہونا ہے عینِ زندگی ناصح
مگر یہ راز وہ ہے جس کو اہلِ دل سمجھتے ہیں

یہاں کا ذرہ ذرہ جلوہ گاہِ حُسن ہے لیکن
ہمیں اپنی نظر کو پردۂ محمل سمجھتے ہیں

غمِ طوفاں نہیں اُن سرفروشانِ محبت کو
جو ہر موجِ تلاطم خیز کو ساحل سمجھتے ہیں

ہُنر بن جاتا ہے ہر عیب اے جوہر محبت میں
ہم اپنے داغِ دل کو بھی چراغِ دل سمجھتے ہیں

آمنہ نفاست حرّیتی بی اے

ملنی ہے اگر دادِ تمنّا، تو تجھی سے
اب ہم کو نہیں عزمِ طلب اور کسی سے

ہونا ہے تو ہو قوّتِ بازو سے گِلہ سنج
محرُومیٔ قسمت کا نہ شاکی ہو کسی سے

احساس کی تلخی نے مرا ساتھ نہ چھوڑا
سرشار ہوئی میں نہ کبھی موجِ خوشی سے

ٹوٹا نہ مگر رحمتِ باری سے تعلّق
نکلا نہ کوئی کام دُعائے سحری سے

ہر چند کہ دادِ دلِ ناکام نہ دے پائے
اے دوست مگر پیش تو آ خندہ لبی سے

اِک داغِ لہُو رنگ کی دولت کے سوا کچھ
کیا اور ملا؟ عشق کے دامانِ تہی سے

قطعات

حفیظ مالیگانوی

چاندنی میں بھی ایسی بزمِ طرب
میری تشنہ لبی میرے کام آ گئی
تم نے ایسی نگاہوں سے دیکھا مجھے
جام رکھا رہا، بے خودی چھا گئی

نظر آنے لگی ہے صاف منزل
نہیں راہوں میں غم کی دُھول جیسے
اندھیرے میں وہ چہرہ یوں ہے روشن
کِھلا ہو چاندنی کا پھول جیسے

افسانہ

کیفے کی آخری شام

شبیر احمد۔ بی، اے

روزنامہ صدائے عام، پوسٹ بکس نمبر ۳۲۔ پٹنہ ۴

۵ ـ جنوری ۶۶ء   محترم خورشید گرامی صاحب، اخلوص بیکراں

. . . ایک افسانہ "کیفے کی آخری شام" ارسال کر رہا ہوں۔ اب تک "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن پہلی بار پوری اُمید کے ساتھ یہ افسانہ بھیج رہا ہوں۔ افسانہ کے ساتھ کسی مشہور ادیب کی سفارش نہیں ہے۔ اِس لئے کہ مجھے اپنے فن اور آپ کی فن نوازی پر پورا بھروسہ ہے ——— افسانہ کی ہیروئن سنہا اِس دُنیا سے آب و گِل کی لڑکی نہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اُسے کچھ بلند تر ہستی سمجھ کر افسانے کی روح تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ "کیفے کی آخری شام" میں ایسے کئی اشارے مل جائیں گے جن سے افسانہ کی روح تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے ——— قارئین "بیسویں صدی" کے لئے میرا نام نیا ضرور ہے لیکن ادبی دُنیا کے لئے بالکل نیا نہیں۔ میرے بہت سے افسانے ہند و پاک کے جرائد میں شائع ہو چکے ہیں ——— آپ نئے اور بہتر لکھنے والوں کو موقع دیتے ہیں، اِس کا اندازہ "بیسویں صدی" کے مطالعہ سے بخوبی ہو چکا ہے۔ کہانی معیار پر پوری اُترے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ شریکِ اشاعت نہ کریں . . .   آپ کا عزیز ——— شبیر احمد

اور اِس سال جنوری کا پہلا ہفتہ گزر گیا اور نیوایر ہیپی ڈے (New year happy day) پر مجھے کسی نے کارڈ نہیں بھیجا۔ میں جانتا تھا کہ یہی ہونا ہے لیکن پھر بھی مجھے انتظار سا تھا۔

اور اُس شام جب دل بہت اُداس ہو گیا تو میں گنگا کے کنارے بنے ہوئے کیفے میں چلا گیا اور بیرے کو کافی کا آرڈر دے کر میں اُس کے صحن میں کھڑا ہو گیا اور جب نظر اُٹھائی تو حدِ نظر تک تاریکی ہی تاریکی تھی۔ حالانکہ میری نظروں کے سامنے میلوں تک گنگا کی لہریں موجیں مار رہی ہوں گی۔ اُف! کتنی بھیانک تاریکی تھی ——— گنگا کے سینے میں، میرے دل میں اور آسمانوں کی بلندیوں پر یا یہ میرے ہی احساسات کی تیرگی تھی جو مختلف شکلوں میں نظر آ رہی تھی۔

ایک بار اسی کیفے کے صحن میں چائے پیتے ہوئے میں نے سوچا تھا جیسے گنگا کی گود میں یہ پانی کی لہریں نہیں، کیف و سرور کی پریاں ہیں جو سیل در سیل جلوۂ طور کی طرح آسمانوں سے اُتر رہی ہیں اور میرے سینے میں اُلوہیت کے سارے راز آشکارا کر رہی ہیں۔ بات بس اِتنی تھی کہ اُس شام میں نے چائے کی وہ پیالی، چائے کا وہ جام اُس کی صحت، اُس کے تقدس اور اُس کی ازلی و ابدی معصومیت کے نام پر اُس سے ٹکرایا تھا اور تب اُس نے یہ سوال کیا تھا کہ آخر میں اُس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک دز دیدہ نظر اُس کے لمبے بالوں، کالی آنکھوں اور اُس کے معصوم چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"تم کچھ اور نہ سوچنا۔ میں نے جب تمہیں پہلے پہل شانتی کے ساتھ کالج کے کیری ڈور میں دیکھا تو نہ جانے کیوں میرے دل میں تمہارے لئے عقیدت و احترام کا بے پایاں جذبہ اُمڈ آیا تھا۔"

اور میں نے یہ غلط نہیں کہا تھا۔ کالج کی شوخ و شنگ، تیز و طرار، مہکتی اور لہکتی ہوئی جوانیوں کے بیچ میں رُک رُک کر سنجیدہ انداز میں چلتی ہوئی وہ مجھے ایسی ہی نظر آتی تھی اور تب میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی کہ یہی ہے وہ، ہاں یہی ہے وہ جسے تم ازل سے تلاش کر رہے ہو۔ وہ یہی ہے جو پیکرِ مجازی میں آج مجسم

نظر آتی ہے۔ یہی حقیقت ہے اور کچھ بھی نہیں۔

اور تب شاید کچھ دن بعد میں نے شانتی سے کہا تھا۔

"اُس دن تمھارے ساتھ وہ کون لڑکی تھی جو دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔ سب سے الگ، سب سے جُدا، کوئی آسمانی ہستی نظر آ رہی تھی؟"

اور شانتی نے مجھ سے جھجکتے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"اچھا! تو تم بھی ہم میں سے کسی کا ذکر اس انداز سے کر سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔

"مجھے یاد ہے کہ کسی کا نہیں! ہاں اُس اجنبی لڑکی کا ذکر کر سکتا ہوں۔ تم مجھے اُس سے ملواؤ؟"

اور اِس لئے پھر اُس کیفے ٹیریا میں اُس شام دزدیدہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بہت خلوص کے ساتھ اُس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اُس کے آگے میں کچھ جانتا بھی نہ تھا اور اُس سے آگے کچھ تھا بھی نہیں۔ قطعی کچھ نہیں! اور تب ہوا یہ کہ وہ میں ماتی مسنا میری باتوں سے بہت متاثر ہو گئی۔ اُس نے اپنی بڑی بڑی اور کالی کالی آنکھوں سے میرے دل کے طوفان کو پڑھنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ ایک سادہ سے تاثر کے سوا جو بہت ہی معصوم اور پاکیزہ تھا۔

اور پھر اتوار کی ہر شام کیفے ٹیریا کا صحن اُس کے قدموں سے جاگنے لگا۔ ہم گھنٹوں بیٹھتے اور دریا کے سینے پر پھیلے خیالی نور کے قمقموں کو دیکھتے رہتے جن کا کہیں وجود نہ تھا۔ ہم دونوں کے مشترکہ احساسات کی دُنیا کے باہر جس کا کہیں وجود نہ تھا۔

میرے بہت ہی مخلص و محترم پروفیسر سنہا کی یہ لڑکی حقیقتاً اِس محفلِ آب و گِل کی شے نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اُسے دیکھ کر کسی کے دل میں بھی عقیدت و احترام کے سوا کوئی اور جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہی سمجھتا تھا اور تھا بھی ایسا ہی۔ وہ معصوم لڑکی پہلی نظر میں لوگوں سے اپنے لئے عقیدت و احترام کا خراج وصول کر لیتی تھی۔ میں نے اُس کے ساتھ کئی سال گزارے اور اسی کیفے ٹیریا میں اَن گنت شامیں گزاریں آج بھی در و دیوار میں اُس کے ہلکے سے تبسم کی صدا سوئی ہوئی ہے۔ پیالیوں کی کھنک کے پسِ پردہ اُس کی پتلی پتلی سنہری چوڑیوں کی کھنک کروٹیں بدلتی ہے اور اُس کے خاموش صحن سے اُس کے قدموں کی دھمک آتی ہے جسے کوئی بھی چاہے تو سن سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے دل سے دُنیا کی آلائشوں کو دھو دے۔ اِس لئے کہ پاکیزگی شرط ہے۔ وہ ہماری دُنیا کی ہستی نہیں تھی۔ وہ معصوم لڑکی بے گناہ دلوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی چیز ہے۔

ایک شام، جب وہ یہاں سے جا رہی تھی اپنی تعلیم ختم کر کے، کہیں اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے، تو اُس نے مجھ سے کہا تھا۔

"مسٹر ...! (وہ مجھے اِسی طرح پکارتی تھی۔ حالانکہ اِس حرف کو میرے نام سے کوئی نسبت نہیں) میں کل صبح یہاں سے چلی جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے تم مجھے بھول نہ سکو گے اور مجھے یاد رکھو گے۔ تو آخری جام تمھاری صحت کا پی لوں؟"

اور میں نے شربت کا گلاس اُس کے گلاس سے ٹکراتے ہوئے ایک بھرپور نظر اُس پر ڈالی تھی۔ شاید پہلی بار ——— شاید آخری بار!

اور پھر یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہر سال کے پہلے دن کی خوشی میں ہم ایک دوسرے کو خلوص کے اظہار کے طور پر ایک ایک کارڈ بھیج دیتے تھے اور کچھ نہیں۔ کبھی کوئی خط اور نہ کوئی پیغام۔ حد تو یہ ہے کہ کسی نے کسی سے پرسشِ احوال بھی نہیں کی ——— اور اِسی طرح دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی اور ختم ہو گئی اور ہندوستان غیر ملکی غلامی سے آزاد ہو گیا اور آزادی کو اٹھارہ سال گزر گئے ——— اور یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اُس کی طرف سے نیک خواہشوں کے ساتھ "لکھا ہوا کوئی کارڈ نہ ملا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ کارڈ نہ آئے گا لیکن پھر بھی مجھے انتظار رہا تھا بہت ہی شدید انتظار! مجھے ہر لحظہ یہ اُمید تھی کہ اُس کا کارڈ آئے گا ——— ضرور آئے گا۔ لیکن جنوری کا پہلا ہفتہ بھی گزر گیا اور میں سوچتا رہا، حالات کا تجزیہ کرتا رہا اور متفکر رہا اور مضطرب بھی۔ بے حد مضطرب! اور تب پھر کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کی کہ انتظار کی شمعیں بجھا دو۔



یہ کبھی نہیں آسکے گا۔ وہ کارڈ جسے تم نے اپنی زندگی کا حاصل بنا رکھا ہے۔ اب نہیں آئے گا ———
کبھی نہ آسکے گا!

کل اُس لڑکے نے کہا تھا نا ———

"سر! میں حیدرآباد سے آرہا ہوں۔ وہاں ایک سالتی سنہا آپ کو پوچھ رہی تھیں۔"

اور میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب اُس نے زبانی پیغام بھیجا تھا۔ آخر کیوں؟ میں نے غور کرنا چاہا۔ اتنے میں اُس لڑکے نے کہا۔

"سر! اُن کی کسی منسٹر اردون سے شادی ہونے والی تھی اور جب میں آنے لگا تو انھوں نے بہت تاکید کے ساتھ آپ کو گڈ نائٹ کہنے کو کہا تھا۔"

اور تب میں نے سمجھ لیا کہ اب اُس کا کارڈ نہ آئے گا۔ میں اِس طویل عرصے میں ٹیگور کی وہ نظم اکثر پڑھتا رہتا تھا جو اُس نے جاتے وقت مجھے لکھ کر دی تھی۔ نجانے کیوں میرا دل ایک انجانے سے کرب میں مبتلا ہوگیا اور میں کیفے ٹیریا کے صحن میں تنہا، اُداس اور مضطرب اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا۔ اِتنے میں وہ جانا پہچانا سا بیرا میرے پاس آیا اور اُس نے کہا۔

"یس کرڈر پلیز!"

"شراب، تلخ تر بہت تلخ! جو کائنات کی تلخیوں کو ختم کرسکے!"

اور تب پھر کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

"میں تم سے کہتا تھا نا کہ وہ تمھیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ اب اُس کی یادوں اُس کے ساتھ گزری ہوئی شاموں اور بیتے ہوئے لمحوں کو سمیٹ کر اُس کی پوجا کرو کہ اب تمھارا فرض یہی ہے!"

اور تب میں نے بہت ہی ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کہا تھا ———

Speak no more of her,
Give me bowl of wine, dear;
In this I bury all my unkindness.

اور میں نے بیرے کے ہاتھ سے وہ گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ وہ مجھے روکتا رہا لیکن میں نے اُسے دھتکار دیا اور زور سے بیرے سے کہا ———

"دوسرا پیگ!"

اور تب میں نے سوچا، یہ وہی ہاتھ ہیں جنھوں نے کبھی اُس کے جسم کو چھونے کی کوشش نہیں کی۔ گھنٹوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے باتیں کرنے کے باوجود اُس کی انگلیوں سے مَس نہیں ہوئے۔ ہاں! یہ وہی ہاتھ ہیں جنھوں نے کئی سال اُس کے معصوم اور پاکیزہ خیالات کے ساتھ گزارے ہیں۔ تو پھر آج یہ تبدیلی کیوں؟ کیا اُس کا کہنا ٹھیک تھا کہ مرد بہت خود غرض ہوتا ہے۔ کیا واقعی میں خود غرض ہوں؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے بیرے کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور گنگا کی مقدس لہروں کے حوالے کردیا۔

اور پھر تھکے ہوئے بوجھل قدموں سے میں کیفے ٹیریا سے نیچے اُتر آیا ———!!!

غزل

صغیر احمد صوفی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی

کرتو سکا میں زخمِ تمنّا کا اندمال
ترکِ تعلّقات کا پھر بھی رہا ملال
افشائے راز باعثِ رُسوائی ہے اگر
پھر کیوں نہ اِس جہان میں بن کر رہیں سوال
کل چلتے چلتے راہ میں حیرت سے رُک گیا
اِک مہ جبیں کے دیکھ کے تجھ سے ہی خدّ و خال
مِلتا ہے جب وہ راہ میں پہچانتا نہیں
جس گلبدن کے ساتھ گزارے ہیں ماہ و سال
کل شب کسی کے لطفِ فراواں کی بات تھی
آتا رہا تمھارے تغافل کا بھی خیال
ہم کو وفا پہ ناز، اُنھیں رنجشوں پہ زعم
جو اُن کے دل کا حال، وہی اپنے دل کا حال
ہر نقش، لوحِ دل سے تمنّا کا مِٹ گیا
لیکن کسی کی یاد! کہ ہے اب بھی لازوال
اُف! یہ تکلّفات کہ جی چاہتا ہے اب
اِک اور شخص ہو تو کہیں اُن سے دل کا حال
اب طاقِ دل میں کوئی جلاتا نہیں چراغ
اب غمکدہ ہے، رات ہے اور شعلۂ خیال
دلّی میں اب تو چین سے کٹتی ہے زندگی
صوفی کو مِل گیا ہے جو اِک یارِ خوش خصال

طنزیہ

افواہیں

جہاں گرد کے قلم سے

جہاں گرد چاروں کھونٹ گھومتا ہے۔ افواہیں جمع کرتا ہے۔ اُسے افواہیں جمع کرنے کا جنون ہے۔ یہ جنون اِس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے، جنون کے پیچھے ہوش ہوتا ہے۔ افواہوں کے پیچھے تلخ حقیقتیں ہوتی ہیں۔

فکر تونسوی حراست میں

گورنمنٹ آف انڈیا نے جسے کچھ لوگ بھارت سرکار کہتے ہیں اور کچھ لوگ ہند سرکار (اصلی نام نہ جانے کیا ہے؟) فیصلہ کیا ہے کہ مُلک میں جتنے بدخط یعنی بھونڈے ہینڈ رائٹنگ والے افراد موجود ہیں، اُن سب کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے۔
اِس فیصلہ کی وجوہ بیان کرتے ہوئے ایک معتبر سرکاری مبصّر نے کچھ غیر معتبر، غیر سرکاری آدمیوں کو بتایا کہ بدخط لوگوں نے سماج میں بہت گندگی پھیلا رکھی ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اُنھیں کوئی پڑھ نہیں سکتا۔ چاہے وہ درخواست لکھیں، خط لکھیں، مضمون لکھیں، کچھ پلّے نہیں پڑتا۔ عدالتیں روتی ہیں کہ مُدعی نے کس آدمی کے خلاف درخواست دی ہے اور کیوں دی ہے؟ ڈاکیے روتے ہیں کہ یہ خط کس کو ڈلیور کریں؟ مہر چند کو یا مہندر کور کو؟ آل انڈیا ریڈیو والے روتے ہیں کہ ہمیں جو بدخط لوگ ڈرامے بھیجتے ہیں، اُن میں شوہر کا ڈائیلاگ پڑھا جاتا ہے تو بیوی کا ڈائیلاگ نہیں پڑھا جاتا کہ وہ محترمہ شوہر کو گالیاں دے رہی ہیں یا اُن کی بلائیں لے رہی ہیں۔
کہا جاتا ہے کہ بدخط حضرات سے صرف سرکار ہی کو شکایت نہیں ہے بلکہ غیر سرکاری لوگ بھی اُن سے سخت نالاں ہیں۔ مثلاً محبوبہ اپنے عاشق کو نامۂ محبت بھیجتی ہے تو عاشق سے پڑھا ہی نہیں جاتا کہ محبوبہ نے ملنے کا وعدہ کیا ہے یا پھر ایک بار ٹرخا دیا ہے۔ اُدھر محبوبہ کے پاس جب عاشق کا نامۂ محبت پہنچتا ہے تو اُس کی حالت بھی دِگرگوں ہو جاتی ہے کیونکہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ عاشق صاحب نے کوچہ گھاسی رام کے نکڑ پر ملاقات کے لئے لکھا ہے یا کٹرہ گھوٹا رام کے کھنڈر پہ ـــــ اور یہی قیامت بدخط افراد نے تجارت کے میدان میں برپا کر رکھی ہے۔ وہ فرموں کو گھی کا آرڈر دیتے ہیں تو فرمیں اُسے چنے کی دال سمجھ کر سپلائی کر دیتی ہیں۔

اِس صورتِ حال سے تنگ آ کر ہند سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے تمام بدخط لوگوں کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا جائے (شاید ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت) لیکن افواہ ہے کہ بدخط لوگوں نے سرکار کے اِس غیر جمہوری فیصلہ کو بدلوانے کے لئے اپنی ایک "آل انڈیا بدخط یونین" بنا لی ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ بدخطی اُن کا جمہوری حق ہے اور یہ فیصلہ اُن کے انفرادی جمہوری حق پر چھاپہ ہے۔
اِس یونین کا صدر جناب فکر تونسوی کو بنایا گیا ہے۔

نوجوان اُجرت پر ملیں گے

جہاں گرد کو یہ افواہ دہلی کے ایک نوجوان نے سُنائی۔ وہ بس شاپ پہ کھڑا ہوا ایک حسینہ کی طرف دیکھ دیکھ کر دانت پیس رہا تھا۔
نوجوان مذکور نے بتایا کہ اب ہم نوجوان بیدار ہو گئے ہیں اور اِسی بیداری کی وجہ سے گزشتہ دِنوں ہندوستان بھر کے جوشیلے نوجوانوں کی ایک نمائندہ میٹنگ ہوئی جس میں اِس امر پر سنجیدگی سے غور کیا گیا کہ سوسائٹی آج تک نوجوانوں کو ایکسپلائٹ کرتی رہی ہے اور اُن کی طاقت، جوش اور جوانی سے مُفت میں فائدہ اُٹھاتی رہی ہے۔
فیصلہ کیا گیا ہے کہ اِس ایکسپلائٹیشن یعنی استحصال کا سدّباب کرنے کے لئے ایک آل انڈیا نوجوان تنظیم بنائی جائے اور مُلک میں جس کسی کو بھی نوجوانوں کی خدمات کی ضرورت پڑے وہ اِس تنظیم کی طرف رجوع کرے اور تنظیم کی اجازت کے بغیر کوئی بھی نوجوان استحصال کا شکار نہ بنے۔
پُرجوش تالیوں کی گونج میں آل انڈیا نوجوان تنظیم بنائی گئی جس کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں ہوگا۔ چند نوجوانوں نے کلکتہ کو ہیڈ کوارٹر بنانے پر اصرار کیا اور اِس مطالبہ کو منوانے کے لئے کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے اور صدر کی کرسی کو آگ

لگا دی۔ اِس بڑے بعد یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ ہیڈ کوارٹر دہلی ہی میں ہو لیکن تنظیم کا صدر ہمیشہ کسی نہ کسی بنگالی نوجوان کو بنایا جائے۔

اِس تنظیم کی موجودگی میں آئندہ کوئی بھی ایسا کام جس میں نوجوانوں کی ضرورت ہوگی، تنظیم کی رضامندی ہی سے سرانجام پاسکے گا۔ تنظیم مختلف کاموں کے لئے نوجوانوں کے مختلف جتھے ٹرینڈ کرے گی اور ضرورت مندوں کو اُجرت پر نوجوان سپلائی کرے گی۔ جن مختلف مقاصد کے لئے نوجوان جتھے ٹرینڈ کئے جائیں گے، وہ مندرجہ ذیل ہوں گے:۔

۱۔ یونیورسٹیوں میں امتحانوں کا بائیکاٹ کرنا، پولیس پر سنگ باری کرنا، امتحان کے کمروں کی کھڑکیاں اور شیشے توڑنا، پرنسپلوں کو اُٹھا کر لے جانا۔

۲۔ سیاسی پارٹیوں کے لئے ایجی ٹیشن چلانا، جلوس نکالنا، مظاہرے کرنا، بسیں جلانا، ریل گاڑیاں روکنا، پولیس کی جیپ گاڑیاں توڑنا، بم وغیرہ پھینکنا۔

۳۔ جلسوں میں نعرے لگانا، جلسے درہم برہم کرنا، جلسوں میں سانپ لاکر چھوڑ دینا، والنٹیروں کی پٹائی کرنا، مائیکروفون اُٹھا کر بھاگ جانا وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ سینما گھروں کے باہر ٹکٹ کے دام گھٹنے پر ہلڑ مچانا، سینما ہال کے اندر گھس کر اُس پر قبضہ کر لینا اور سٹیج پر بیٹھ کر عاشقانہ قوالیاں گانا۔

۵۔ کسی فلم ایکٹر کی آمد پر اکٹھے ہو جانا، ٹریفک روک لینا، موقع ملے تو اُس فلم ایکٹر کی مرمت کر دینا۔

۶۔ نوجوان کالجیٹ لڑکیوں کا تعاقب کرنا، اُن کے پیچھے سیٹیاں بجانا، فلمی گانے گانا، لڑکیوں کو اپنے ساتھ پک نک پر لے جانے پر اصرار کرنا

۷۔ بسوں اور ریل گاڑیوں میں بغیر ٹکٹ سوار ہو جانا، کوئی روکے تو ڈرائیور کو پیٹ دینا، زنجیر کھینچ لینا اور پھر انھیں آگ لگا کر "انقلاب زندہ باد" گاتے ہوئے لوٹ جانا۔

غرض سوسائٹی جس مقصد کے لئے بھی نوجوانوں کی خدمات چاہے گی، آئندہ صرف آل انڈیا نوجوان تنظیم کے ذریعہ ہی حاصل کر سکے گی۔ اب کسی سیاسی، سماجی، اقتصادی، عاشقانہ، محبوبانہ کسی مقصد کے لئے نوجوانوں کا لہو مفت استعمال نہیں کیا جاسکے گا۔ اِس کے لئے باقاعدہ اور مقررہ اُجرت ادا کرنا پڑے گی۔

امتحانات آسان ہو گئے

ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں کو طلباء کی طرف سے یہ عام شکایات موصول ہو رہی تھیں کہ ایک تو ہمارے کورس بے حد مشکل ہیں، اُس پر ستم بالائے ستم یہ کہ امتحانات کے پرچے بے حد مشکل ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء فیل ہو جاتے ہیں۔ مُلک بھر میں اُن کی رُسوائی ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان طلباء ذہنی طور پر بے حد پسماندہ ہیں۔ اِس لئے طلباء کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ امتحانات کے پرچے آسان کئے جائیں اور طلباء کے مزاج اور رجحان کے مطابق مرتب کئے جائیں۔

چنانچہ افواہ ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تمام یونیورسٹیوں کو ہدایات بھیج دی ہیں کہ آئندہ طلباء کے لئے جو پرچے مرتب کئے جائیں، اُن میں صرف اِس طرح کے سوالات پوچھے جائیں:۔

۱۔ فلاں ہیروئن شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔ وہ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی؟ اگر وہ شادی پر رضامند ہو جائے تو اُس کے بعد بھی وہ خوابوں میں آیا کرے گی یا نہیں؟

۲۔ بلیک میں سینما کے ٹکٹ خریدنے کے کون کون سے طریقے ہیں؟ آپ کس طریقے کو پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

۳۔ دو چار فلمی گانوں کے بول دے دئے جائیں اور پوچھا جائے کہ یہ کون سی فلموں میں گائے گئے ہیں؟ پلے بیک کس نے دیا تھا؟ میوزک ڈائرکٹر کون تھا؟ اِس میوزک ڈائرکٹر نے کتنی فلموں میں آج تک میوزک دیا ہے؟

۴۔ "گرل فرینڈ" کی تعریف لکھو؟ بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ میں فرق بیان کرو اور زندہ مثالیں دے کر اپنے پوائنٹ کو ثابت کرو؟

۵۔ والدین سے روپیہ بٹورنے کی تکنیک بیان کرو؟ والدین کی جائز اور ناجائز کمائی کو صرف کرنے کے مقبول ترین طریقے کیا ہیں؟

۶۔ محبوبہ کو رِجھانے کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع میں سے کون سے ذرائع استعمال کرنے چاہئیں:۔

۱۔ کافی ہاؤس میں لے جانا اور بِل خود ادا کرنا
۲۔ فلمی ہیرو کے سٹائل کا لباس زیب تن کرنا۔
۳۔ بس سٹاپ پر کھڑی ہوئی لڑکی کو اپنے سکوٹر پر لے جانے کی پیشکش کرنا۔
۴۔ اُس کے بالوں کے جدید ترین سٹائل کی تعریف کے پُل باندھنا۔
۵۔ اُسے اپنی کتابیں مطالعہ کے لئے دے دینا اور خود فیل ہو جانا۔
۶۔ پہلے اُس کی بھونڈی سہیلی سے محبت کرنا پھر اُس سہیلی کی سیڑھی سے چڑھ کر محبوبہ تک رسائی حاصل کرنا۔
۷۔ روزانہ تعاقب، ٹھنڈی آہیں، خط و کتابت، ٹیلیفون، گلی کے پھیرے وغیرہ وغیرہ۔

۸۔ پبلک کا کی کو اپنی کمائی سمجھ کر بیوپر اپنی دولت مندی کی دھونس جمانا۔

اِس طرح آئندہ یونیورسٹی کے سالانہ امتحانات زیادہ آسان ہو جائیں گے۔ سو فیصدی یقین کیا جاتا ہے کہ اب سو فیصدی طلباء کامیاب ہوا کریں گے اور ہم دُنیا بھر کے سامنے سر اُٹھا کر کہہ سکیں گے کہ ہمارے مُلک کا تعلیمی معیار بہت بلند ہے۔

بیویوں کے تجارتی راز ——●

گزشتہ دنوں آل انڈیا وومنز کونسل نے اپنی سالانہ کانفرنس میں کچھ ریزولیوشن تو ایسے پاس کئے جو اخباروں میں شائع ہونے کے لئے پاس کئے گئے تھے لیکن کچھ ریزولیوشن ایسے بھی پاس کئے گئے جو خفیہ تھے اور اُن کا علم صرف خواتین ہی کو تھا۔ ہر خاتون ممبر کو قسم دلائی گئی کہ وہ اُسے "ٹریڈ سیکرٹ" یعنی تجارتی راز کے طور پر اپنے سینے میں محفوظ رکھے۔

ایک افواہ کے مطابق ان خفیہ ریزولیوشنوں کا تعلق براہِ راست شوہروں سے تھا۔ مثلاً معلوم ہوا ہے کہ آئندہ ہر خاتون (بیوی) اپنے شوہر کی ڈنڈے سے مرمت کرے گی اگر وہ عالمِ میگساری میں گھر آئے گا۔ (جبکہ کُھلے ریزولیوشن میں یہ پاس کیا گیا تھا کہ بیویاں اپنے میگسار شوہروں کو پیار سے رجھائیں گی تاکہ وہ محبت کی شراب پی کر الکحل والی شراب بھول جائیں۔

ایک اور خفیہ ریزولیوشن میں خواتین نے حلف لیا ہے کہ وہ اِن ڈائرکٹ یعنی بالواسطہ طریقے سے شوہروں سے گھر کا کام کاج کرائیں لیکن کچھ اس غیر محسوس انداز میں کہ شوہروں کو یہ علم ہی نہ ہو سکے کہ اُن سے خانہ داری کا کام لیا جا رہا ہے۔ مثلاً شوہر سے کہا جائے آپ ذرا سبزی کا یہ مسالا بھون دیں۔ میں اتنے میں آپ کی قمیص کے ٹوٹے ہوئے بٹن لگا دیتی ہوں۔ آپ ذرا ننھے کو نہلا دیں، میں ذرا خدا سے آپ کی درازیٔ عمر کے لئے دعا مانگ لوں۔ آپ ذرا میری ساڑی پریس کر دیں میں شام کے لئے فلم کے ایڈوانس ٹکٹ بُک کروا آؤں۔

اِس ریزولیوشن کا مقصد یہ ہے کہ شوہروں میں مساوات پر عمل کرنے کی عادت پیدا ہو جائے۔ وہ صرف زبانی جمع خرچ کر کے عورتوں کو مساوی حقوق دینے کا ڈھنڈورا نہ پیٹتے رہیں۔

اِسی طرح کے ایک اور خفیہ ریزولیوشن کا بھی انکشاف ہوا ہے جس میں خواتین سے کہا گیا ہے کہ جس دن اپنے شوہر سے لڑائی جھگڑا کرنے کا ارادہ ہو، اُس سے ایک دن پہلے مون برت رکھ لیں تاکہ لڑنے جھگڑنے کے لئے طاقت جمع ہو سکے اور وہ دُگنی طاقت کے ساتھ بھرپُور حملہ کر سکیں

بہرکیف چند دنوں بعد ہر گھر میں ان خفیہ ریزولیوشنوں پر عمل شروع کر دیا جائے گا اور ہر شوہر کو معلوم ہو جائے گا کہ عورتوں کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں، دکھانے کے اور۔ شوہر حضرات کو اِن خفیہ حملوں کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

سچی افواہ کا جھوٹ ——●

ہندوستان میں ہر سال "چلڈرن ڈے" عرف "یومِ اطفال" منایا جاتا ہے جس میں اونچے گھرانوں کے لیڈر، اونچے گھرانوں کے شہزادے، اونچے گھرانوں کے زرق برق بچوں کے ساتھ مل کر بچوں کی بہبودی پر تقریریں وغیرہ کرتے ہیں۔ (وغیرہ زیادہ اور تقریریں کم) اخباروں میں فوٹو چھپواتے ہیں۔ فینسی ڈریس، ڈرامے، ناچ گانے، کھیل تماشے، تقسیم انعامات کے پروگراموں سے اپنی روح پر پڑا ہوا بوجھ اُتار دیتے ہیں (اور یہ بوجھ ہر سال پھر پڑ جاتا ہے)

باخبر حلقوں میں یہ افواہ گشت کر رہی ہے کہ اِس سال بالکل فطری طریقہ پر چلڈرن ڈے منایا جانے گا۔ اِس مرتبہ صرف حقیقی بچے ہی اِس تقریب میں حصّہ لیں گے۔ حقیقی بچوں سے مراد صرف وہ بچے ہیں جنھیں واقعی بہبودی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اربابِ اقتدار کی طرف سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ صرف ڈیڑھ سو روپے ماہانہ آمدنی تک کے افراد اپنے بچوں کو اِس تقریب میں شامل کر سکتے ہیں۔ اس تقریب کو نیچرل بنانے کے لئے یہ حقیقی بچے جس حالت میں ہوں گے، اُنھیں تقریب میں پکڑ لایا جائے گا۔ مثلاً اگر بچّہ ننگا ہے تو ننگا ہی چلا آئے گا۔ نیکر پھٹی ہوئی ہے، بنیان غائب ہے، بھدّا ہے اور مٹّی میں اَٹا ہوا ہے اور ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں اور بھُوک کے مارے آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ غرض جس حالت میں بھی ہوگا، اُسے بلا کر تقریب میں شامل کر دیا جائے گا اور اُن سب سے کہا جائے گا کہ جیسے کھیل تماشے تم اپنی روزمرّہ زندگی میں کھیلتے ہو، وہی کھیل کر دکھاؤ۔ اِس تقریب میں پھٹی پُرانی گُڑیاں ہوں گی، مٹی کے ٹھیکرے ہوں گے، سوڈا واٹر کی بوتلوں کے ڈھکنے ہوں گے، کچھ میلی کچیلی گیندیں، لوہے کی کیلیں، فیوز ہوتے بلب، سنگتروں اور کیلوں کے چھلکے —— غرض اِسی طرح کی عوامی چیزوں کو وہ کھلونے سمجھ کر کھیلیں گے۔ دس دس بچوں کے گروپ کو ایک ایک کیلا دیا جائے گا تاکہ وہ ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کا مظاہرہ دکھا سکیں۔ اُن سے کہا جائے گا کہ وہ سٹیج پر آکر باری باری تقریر کریں اور اپنی بے بسی اور بیچارگی پر آنسو بہا کر دکھائیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھا پائی کر کے فوجی سپرٹ کا ثبوت دیں۔ ایک کلچرل مقابلہ گالیوں کا بھی ہوگا اور اوّل آنے والے بچوں کو امیر بچوں کے اُترے ہوئے پُرانے کپڑے بطورِ انعام دئے جائیں گے اور سب سے آخر میں کوئی بہت بڑا لیڈر اُن بچوں کے سامنے تقریر کرے گا۔ اُنھیں بتائے گا کہ وہ آج بچوں کو اُن کی فطری کیفیت میں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے ہیں اور بچوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنی فطرت پر مضبوطی سے قائم رہیں اور مصنوعی نمود و نمائش سے باز رہیں جو چند امیر بچوں میں آگئی ہے اور یوں ہندوستان کی عظیم روایات کو زندہ رکھیں جن پر ہمارے کلچر، ہمارے بچوں اور ہمارے مستقبل کا دارومدار ہے۔

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

افسانہ لکھ رہی ہوں	خوش باش ایم اے	دو روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	دو روپے
آگ اور دھواں	م، م راجندر ایم اے	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
بیگم صاحبہ	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ نئے پیسے
داماد	〃	دو روپے ۲۵ نئے پیسے
پگلی	〃	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	چار روپے ۲۵ 〃
باون پتے	کرشن چندر ایم اے	پانچ روپے ۹۵ 〃
پہلی لڑکی	راز داں ایم اے	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
انجو	نیاض علی	آٹھ روپے ۵۰ 〃
برہمن	کرشن گوپال عابد	چار روپے ۵۰ 〃
ستم	〃	چار روپے ۷۵ 〃
گھائل	〃	تین روپے ۹۵ 〃
ظالم	سعید امرت	دو روپے ۵۰ 〃
جانے والے	اختر عادل روپ	تین روپے ۵۰ 〃
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	چار روپے
چوٹ	دت بھارتی	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
گناہ	〃	دو روپے ۹۵ نئے پیسے
حالِ دل	بیگم توقیر ولایت حسین	تین روپے ۵۰ 〃
خاتون	انتصار حسین	تین روپے
حاجی مراد	قیسی رامپوری	چار روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
زخم آبرو (نظم)	عبدالحمید عدم	دو روپے ۵۰ نئے پیسے

دو پھول	عادل رشید	تین روپے ۹۵ 〃
دو سال پہلے دو سال بعد	زبیدہ خاتون	چھ روپے
فریب مسلسل	شفیق بانو	دو روپے
زہر	ذکی انور	چھ روپے
برچھیں	قیسی رامپوری	چار روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	تین روپے
سناٹے	رضیہ سجاد ظہیر	تین روپے ۹۵ نئے پیسے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	تین روپے ۵۰ 〃
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	چار روپے ۵۰ 〃
ننگی جوانی	سعید امرت	دو روپے
رہ گزر	انیس مرزا	چار روپے ۷۵ نئے پیسے
خوفناک محبت	عبدالحلیم شرر	تین روپے
شاہو	انتصار حسین	تین روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	تین روپے
ناظمہ کی آپ بیتی	ایم اسلم	تین روپے
ایک دل ہزار غم	عزیز بدایونی	دو روپے ۷۵ نئے پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	چھ روپے ۵۰ نئے پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع	پانچ روپے
دروازہ	نادرہ خاتون	پانچ روپے
چندر کلا	جمنا داس اختر	دو روپے ۵۰ نئے پیسے
جلن	〃	دو روپے ۵۰ 〃
رادھا الزبتھ	〃	دو روپے ۵۰ 〃
پاپی	〃	چار روپے
سوناگاچھی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
طوفانوں کی کہانی	〃	چار روپے ۵۰ 〃
جوار بھاٹا	〃	چار روپے ۵۰ 〃

قیامت	ذکی انور	دو روپے [illegible]
سازش	〃	دو روپے ۵۰ 〃
کانٹوں کی سیج	رشید اختر ندوی	پانچ روپے
گھرانہ	قیسی رامپوری	چار روپے [illegible] نئے پیسے
ناگ دیوتا	محمود جالندھری	دو روپے ۵۰ 〃
خون کے چھینٹے	〃	دو روپے ۵۰ 〃
خوابگاہ میں	〃	تین روپے ۵۰ 〃
فراق	رنگین بھارتی	تین روپے ۵۰ 〃
پیاسا	〃	تین روپے ۵۰ 〃
پراسرار رقاصہ	〃	دو روپے
پراسرار قاتلہ	〃	دو روپے
پیاس	کے۔ ایل ترانہ بی اے	تین روپے ۵۰ 〃
محبت روتی ہے	غلام عباس	دو روپے
مانوا	میکسم گورکی ترجمہ: نریش کمار شاد	ایک روپیہ ۷۵ 〃
کھیت میں لہو	تاجور سامری	ایک روپیہ ۷۵ 〃
جی ہاں پٹے ہیں	شوکت تھانوی	تین روپے ۲۵ 〃
پردے کے پیچھے	منٹو	دو روپے ۵۰ 〃
ملکہ صحرا	اوم پرکاش نامی	دو روپے ۵۰ 〃
خاموش نغمہ		چار روپے
آتش گل (مجموعہ کلام)	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
باقیات اقبال 〃	ڈاکٹر اقبال	تین روپے
تلخیاں (کلاں) 〃	ساحر	چھ روپے
تلخیاں (خورد) 〃	ساحر	تین روپے ۵۰ نئے پیسے
پرچھائیاں 〃	ساحر	ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر (مولانا آزاد)		تین روپے ۵۰ 〃
زہر کا حسن	اشفاق احمد	دو روپے

پتہ:— رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

دو قدم کا فاصلہ

علی اکبر آمبوری

۴۸۔ گراؤنڈ فلور۔ پرس روڈ۔ پیریامٹ۔ مدراس۔ ۲

۹؍ اکتوبر ۱۹۶۵ء کرم گستر حضرت خوشتر گرامی! تسلیم

. . . اپنی کتاب "برف سی اُجلی" کے متعلق اب تک آپ کی رائے سے محروم ہوں۔ اپنے افسانوں کے اِس مجموعہ پر آپ کے گرانقدر تاثرات نہ پاکر ایک تشنگی سی محسوس کر رہا ہوں۔ افسانوں کے بارے میں آپ کی ناقدانہ رائے کو ہر افسانہ نگار کے لئے "مشعلِ راہ" سمجھتا ہوں۔ کیا کل کے اَن گنت، گمنام کہانی کار آپ کی رہنمائی و ہمت افزائی کے بغیر آج کے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے بننے میں کامیاب ہوتے ـــــ "برف سی اُجلی" پر جن فنکاروں نے اب تک مجھے اپنے تاثرات سے سرفراز فرمایا ہے، اُن میں کئی ایسے مشہور افسانہ نویس بھی ہیں جو "بیسویں صدی" کے ہزارہا قارئین میں مقبول ہیں۔ میں نے اُن افسانہ نگاروں کے پتے "بیسویں صدی" سے حاصل کئے تھے جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں ـــــ "ادبی لطائف" اور "محبوب مشغلے" "بیسویں صدی" کی ہمہ گیر مقبولیت میں اضافہ کا باعث ثابت ہو رہے ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں کے طنز و مزاح کی مثال پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ بلا مبالغہ یکتائے زمانہ ہیں اور شاید ہی مستقبل قریب میں ایسا کوئی مزاح نگار اربابِ فکر و نظر کی اِتنی توجہ کا مرکز بن سکے۔ "بیسویں صدی" کے اگست کے شمارے میں اقبال سلیم نے راجہ صاحب کے متعلق منٹو مرحوم کے بیان کردہ جس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اُسے پڑھ کر دیر تک ہنستا رہا۔ منٹو مرحوم نے لکھا ہے: "راجہ کو ایک بار بھیک بھی مانگنی پڑی تھی۔" ذرا ملاحظہ فرمایئے خود راجہ صاحب کیا فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں ـــــ "ڈاکٹر عزیز تمنائی کے یہاں میں پہلے کھانا پکانے کا کام کرتا تھا، ترقی کرکے کمپونڈر ہو گیا، کمپونڈر سے ڈاکٹر بننے والا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مارے حسد کے مجھے الگ کر دیا۔ ویسے ڈاکٹر صاحب کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ میری کوڑی کوڑی انھوں نے چکا دی تھی بلکہ دو آنے اوپر سے دیتے تھے ـــــ" راجہ صاحب نے میرے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے یہ باتیں بھی لکھی تھیں۔ وہ خط میں نے ڈاکٹر عزیز تمنائی کو پڑھنے کے لئے دیا تو وہ راجہ صاحب کے اِس مزاح سے بہت محظوظ ہوئے ـــــ ایک تازہ ترین افسانہ "دو قدم کا فاصلہ" لے کر پہلی بار "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ آپ کی ذرّہ نوازی کے چرچے ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ میں پُر اُمید ہوں جیسا کہ مجھے ہونا چاہئے . . .

نیاز مند ـــــ علی اکبر آمبوری

برسوں بعد نسرین ہمارے گھر آئی تو جیسے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میری زندگی کے چمن میں بہار آگئی۔ ہواؤں نے میرے تصوّرات کی شاخوں سے خزاں رسیدہ زرد زرد پتے گرا دیئے اور اُن پر آرزوؤں کی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ ایک طویل مدّت کے بعد جب میں نے اُسے دیکھا تو کئی لمحوں تک دیکھتا ہی رہ گیا تا کہ اُس کے جلوؤں کی

تابندگی کو، اُس کے رُخِ روشن کی شعاعوں کو اپنی نظروں میں چھپالوں، ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ کرلوں اور اُن سے اپنے دل کی تاریک رہگزاروں کو منور کرلوں۔ پھر اُسے دیکھتا رہوں۔ ہر آن، ہر گھڑی، ہر لحظہ دل کے ایوان میں، نگاہوں کے مرکز پر، ذہن کے پردے پر اُسے دیکھتا ہی رہوں۔

"یہ تمھاری خالہ زاد بہن نسرین ہے انجم! اِسے اِس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ ابھی چار سال پہلے یہ یہاں آئی تھی!" ماں نے شاید میری حیرت دیکھ کر نسرین کا تعارف کرانا ضروری سمجھا۔

جی میں آیا کہہ دوں ــــــ نہیں ماں! یہ نسرین نہیں ہے۔ یہ وہ لڑکی نہیں جو چار سال پہلے یہاں آئی تھی۔ یہ تو سراپا قیامت ہے ــــــ رہزنِ تمکین و ہوش! یہ میرے دل کا صبر و قرار، میری نیندوں کا سکون لوٹنے آئی ہے۔ تمھیں دھوکا ہوا ہے ماں!

اِس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد رکھے گا کہ بھول جائے گا، تمنّا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو تڑپا رہے ہیں، میری خوں چکاں تحریر اُن کے لئے پیامِ مرگ ثابت ہو۔ (قاضی نذرالاسلام)

مشکلات اور مصیبتیں انسان کی اصول پروری اور استقلال کا امتحان ہیں۔ انہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنا ایماندار اور ثابت قدم ہے۔

(پشتو ادب)

وہ دانا ہے جو جنگ و جدل کو امن و امان میں بدل دے۔ وہ نادان ہے جو آشتی کو تیر و کمان میں تبدیل کردے۔ (پشتو ادب)

اتفاق و اتحاد بجائے خود طاقت ہے۔ (سندھی ادب)

یہ ہرگز وہ نسرین نہیں ہے۔ ذرا تمھارے پاس اُس نسرین کی تصویر ہو تو لاؤ جو چار سال پہلے یہاں آئی تھی۔ اُس نسرین کے گال پچکے ہوئے تھے، زُلفیں اُڑی اُڑی سی بے ترتیب۔ سُوکھی شاخ کی طرح بانہیں اور موٹی چھینٹ کی فراک تھی اُس کے جسم سے چپکی ہوئی۔ نہیں، یہ کیسے مان لوں کہ یہ چار سال پہلے کی نسرین ہے! یکسر بدلی ہوئی نسرین!! کہیں اُس نے شفق کی سُرخی تو نہیں چُرالی، گلاب کی سُرخی اور شعلوں کی تپش تو نہیں سجا رکھی ہے اپنے وجود پر؟ نہیں، یہ ہرگز وہ نسرین نہیں ہوسکتی۔

"جی ہاں! یہ نسرین ہی ہے" میں نے ماں کی خفّت مٹاتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان مجھے پہچان نہیں سکے" نسرین ہنسنے لگی۔ اُس کے رخساروں پر انگارے دہکنے لگے۔ آنچ تیز ہوگئی اور کانوں کی لویں شہابی ہوگئیں۔ وہ سفر کی تکان دُور کرنے کے لئے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔

میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ میرے تصوّرات میں [illegible] ہوش و حواس پر چھاگئی تھی۔

اِنھیں خیالوں اور بیداری کے خوابوں کے حسین جھروکوں سے اُسے دیکھتا ہوا میں اپنے کمرے میں گیا۔ زندگی کی دشوار گزار پگڈنڈی پر اکیلے چلتے چلتے میں تھک گیا تھا، تھک گیا تھا ــــــ اور اب نسرین آئی تھی۔ میں نے اُس کی راہ میں پلکیں بچھا دی تھیں اور اُس نے تو ساتھ چلنے سے پہلے ہی تھکن سے چُور ہو کر بہانہ تراش لیا تھا۔ نہیں! میں اُسے تھکنے نہیں دوں گا! دو گھڑی دَم لینے کی اجازت بھی نہیں! اُسے میرا ساتھ دینا ہوگا۔ ورنہ یہ زندگی کا سفر بے معنی اور ادھورا رہ جائے گا ــــــ

سوچتے سوچتے وقت گزارنے کے لئے میں نے ایک ناول اُٹھالیا۔ صفحے اُلٹے لیکن اُس کے ہر صفحہ پر نسرین کی تصویر تھی! اور کوئی عبارت تھی بھی تو دُھندلی دُھندلی سی۔ نسرین کی تصویر اُس دُھندلکے کا سینہ چیرتی ہوئی نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔ صفحے اُلٹتے رہے۔ نسرین کی تصویر الگ الگ زاویوں سے نگاہوں میں گھومتی رہی اور پھر ــــــ کسی ورق پر یہ صبا کی تصویر کہاں سے آگئی؟ ایک انجانے احساس، ایک دبی دبی سی خواہش نے صبا کی تصویر کو نسرین کی خیالی تصویر کے ساتھ مِلانے پر مجبور کیا۔ ہوں! یہ تو نسرین کے پاؤں کی دُھول کے برابر بھی نہیں۔ بہت ناز تھا اُسے اپنی سانولی رنگت پر۔ ساری زندگی مجھ پر راج کرنے کا منصوبہ باندھ رکھا تھا اُس نے۔ بھلا کس قابل تھی وہ؟ کہاں یہ چاندنی میں نہایا ہوا کسی چابکدست سنگ تراش کا مرمریں مجسّمہ اور کہاں وہ سیاہ ناتراشیدہ پتھر!

میں نے پہلی بار صبا کو اڈیار کے دلکش ساحل پر دیکھا تھا۔ ساحل کے پُررونق، رنگین ماحول کا نظارہ کرتے ہوئے اُس نے غیر ارادی طور پر مجھے دیکھ لیا تو شرم سے نظریں جُھکالیں۔ میں نے اُس کی یہ چوری جو پکڑلی تھی۔ وہ شرماگئی، لجاگئی۔ لاجونتی کے بوٹے کی طرح! پھر اُس نے اپنی نگاہیں دُور تک پھیلا دیں۔ میں نے دیکھنا چاہا کہ اب وہ کیا دیکھ رہی تھی۔ اب اُس کی نگاہوں کا مرکز وہ انگریز مرد، عورتیں اور بچے تھے جو سمندر کے کھارے پانی میں نہاکر دُھوپ میں ریت پر کرسیاں بچھائے سن باتھ لے رہے تھے۔ غسل کے بعد مختصر لباس میں ملبوس کچھ انگریز عورتیں، صرف نیکر پہنے ہوئے مرد اور دو ایک تقریباً عریاں بچّوں کو دیکھ کر اُس نے اور سمٹ کر میری طرف دیکھا۔ میانہ قد، فربہ اندام اور اُس پر حسین بننے کی ناکام کوشش! میک اپ سے لپی پُتی اُس لڑکی سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں اُسے دیکھ کر مُسکرادیا۔ وہ جھینپ کر مُسکرانے کی کوشش کرنے لگی اور پھر مُسکراتے ہوئے دُور چلی گئی۔

دوسری بار وہ مجھے ایک سنیما گھر کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ وہاں کوئی مشہور انگریزی فلم لگی ہوئی تھی اور لوگوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ اِس بار اُس نے مجھے نہیں دیکھا۔

شاید دیکھا بھی ہو۔ نہ جانے کیوں میں اس بار یہ چاہتا تھا کہ اس سے دو ایک باتیں کروں۔ اس ملاقات کی تکمیل میں اجنبیت حائل تھی لیکن میں نے یہ خلیج کسی طرح عبور کر لی۔

"آپ فلم دیکھنے آئی ہیں؟"

"جی، جی ۔۔۔ جی ہاں!" وہ ہڑبڑا کر بولی گئی۔ اُس کے اندازِ تکلم میں آواز کی نسوانی تھرتھراہٹ اس حقیقت کی غماز تھی کہ مشرقی عورت لاکھ آزاد خیال، آزاد منش ہونے والی ہو، پہلی بار کسی اجنبی سے گفتگو کرنے میں ایک عجیب جھجکاہٹ، ایک نامعلوم ساخوف ضرور محسوس کرتی ہے۔

"ٹکٹ لے لیا ہے ۔۔۔؟" یہ میرا دوسرا سوال تھا۔

"جی ۔۔۔ جی نہیں، یہ وہی پس و پیش اور جھجکاہٹ سے ملی جلی لرزتی کانپتی ہوئی آواز! پھر وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ شاید اُس نے دیکھ لیا تھا کہ مردوں کی لمبی قطار کو نظر انداز کرتے ہوئے کچھ عورتیں ٹکٹ کاؤنٹر کے کنارے کھڑی لیڈیز فرسٹ" کا حق جتا رہی تھیں۔

تیسری بار میں نے اُسے ماؤنٹ روڈ پر دیکھا۔ وہ پٹرول بنک کے سامنے سڑک پار کر رہی تھی۔

"بڑے شہر میں کسی جوان لڑکی کا اس طرح اکیلی گھومنا، میری رائے میں مناسب نہیں" میں نے اُس کے قریب پہنچ کر ناصحانہ انداز میں کہا۔ پچھلی ملاقات پر میں نے اُس کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی تھی کہ یہ بے زبان سی لڑکی میرے کہنے کا بُرا نہ مانے گی۔

جواب میں اُس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا جیسے اندازہ لگانا چاہتی ہو کہ میں کوئی غنڈہ تو نہیں جو بار بار اُس سے مل کر کچھ نہ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں کُسے چھیڑنا چاہتا ہوں۔ اُس کے اِس انداز نے مجھے پل بھر کے لئے سوچنے پر مجبور کیا کہ وہاں سے ہٹ جاؤں، اُس کا راستہ چھوڑ دوں ورنہ وہ طوفان برپا کرے گی اور یہ طوفان، یہ سیلاب میرے وقار اور میری عزت کو لے ڈوبے گا۔ صنفِ نازک جب بپھر جاتی ہے تو اُس کی مُنہ زوری، اُس کی نزاکت میں بے پناہ طاقت آجاتی ہے۔ میں وہاں سے ہل نہ سکا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ میرا دم گھٹنے لگا اور سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔

خلافِ توقع وہ مُسکراتی ہوئی بولی: "جب بھی باہر نکلتی ہوں، آپ مل جاتے ہیں باڈی گارڈ بنے!" ناگہاں اُس نے یہ جملہ ادا کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا تھا۔ وہ واقعی ایک بے ضرر لڑکی تھی۔

اور پھر جب بھی وہ باہر نکلتی، میں اُس کے ساتھ رہنے لگا۔ ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ میں نے اُس کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اُس کا نام پوچھ لیا تھا۔ صبا! صرف دو ہی پاس

صبا جو شہر کے کسی چھوٹے سے دفتر میں کام کرتی تھی۔ وہ کچھ دن پہلے کسی گاؤں سے آئی تھی اور اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں قیام پذیر تھی۔

صبا نے بھی میرے بارے میں سب کچھ دریافت کر لیا تھا۔ وہ ہر شام مجھ سے ملتی رہی۔ اجنبیت کے پردے ایک ایک کر کے سرکتے گئے۔ اُس نے دوریوں کو سمیٹ کر قربتوں میں بدلنا چاہا۔ شاید وہ ایک انجانے جذبے کے تحت مجھ سے ملتی رہی تھی لیکن میں اپنے پورے ہوش میں تھا۔ اُس کے لئے محبت نام کا کوئی جذبہ میرے دل میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی اتفاقیہ ملاقاتوں نے دوری کی حدیں پار کر لیں تو میں اُس سے بے تکلف ہو گیا۔ چاندنی راتوں میں ساحلِ سمندر پر کسی کشتی کی آڑ میں صبا کے دوش بدوش بیٹھے ہوئے میں لطف ضرور محسوس کرتا تھا۔ شہر کی پُر رونق شاہراہوں پر اُس کے ساتھ چلتے ہوئے میں مسرور ہو جاتا تھا اور سنیما گھر میں اُس کے ساتھ بیٹھے فلم دیکھنے میں مجھے لُطف آتا تھا۔ وہ خوبصورت نہ سہی لیکن منفرد ہو

- جو آدمی بھی مجھ سے ملتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح مجھ سے بہتر ہوتا ہے۔ جب میں اُس کی برتری اور عظمت پر اظہارِ مسرت کرتا ہوں تو وہ آدمی میرا دوست بن جاتا ہے۔ (ایمرسن)
- جو آدمی اپنی ہی ذات کے متعلق سوچتا ہے، وہ تعلیم و تربیت سے قطعی بے بہرہ ہے۔ اُس نے علم چاہے کتنا ہی حاصل کیا ہو لیکن اُسے ان پڑھ ہی سمجھنا چاہئے۔ (ڈاکٹر نکولس)
- آپ دوسرے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں تو لوگوں کے نیک جذبات کو متاثر کیجئے۔ (ڈاکٹر کارنیگی)
- خوبیاں قربانیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ (ایمرسن)

شباب کے عالم میں بہکتی ہوئی جوان دوشیزہ تھی اور جوانی عقل و دانش پر غفلت کا جال سا پھیلا دے تو اُس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ اُس الّھڑ جوانی کا ساتھ، اُس کی بے سروپا باتیں تو میرے فاضل لمحات کی بوریت کا مداوا تھیں۔ وہ میرے لئے وقت گزاری کا ایک اچھا ذریعہ تھی لیکن وہ پگلی تو چاند کی روپہلی کرنوں سے مدہوش ہو کر مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگتی، چلتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیتی۔ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ ایک دن جب اُس نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے زبان کا سہارا لیا تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ چاہنے لگی کہ ہماری یہ ملاقاتیں دائمی بن جائیں، یہ قربتیں اور بھی سمٹ کر ایک مرکز کی شکل اختیار کر لیں اور ہمارا یہ میل جول ساری زندگی کا ساتھ بن جائے ۔۔۔ بھلا یہ کیسے ہوتا؟

میں نے اُس سے مِلنا جُلنا بند کر دیا۔ قُربتوں کا سمٹنے والا نقطہ کھنچ کر ایک خطِ فاصل بن گیا۔ وہ مایوس ہوگئی، اُداس ہوگئی اور شاید بہت روئی بھی۔ اُس کے بعد ایک دن اچانک اُس کا میرا سامنا ہوگیا تو میں نے دیکھا اُس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ تھی۔ میک اپ اور پاؤڈر کی موٹی تہہ کے محتاج اُس کے چہرے سے بلا کی وحشت برس رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ میں نے اُس سے کوئی بات نہ کی۔ میں مجبور تھا۔ تمہارے برائے نام حُسن کی دلکشی مجھے اپنا نہیں بنا سکتی۔ میں اُس سے پیار نہیں کر سکتا۔ بھلا یہ سیدھی سادی، معمولی سی لڑکی اپنے میں اتنی کشش کہاں سے لائے کہ مجھے اپنا دیوانہ بنا سکے۔

"بندی آداب بجا لاتی ہے" میں نے صبا کی تصویر کو موڑ کر مُٹھی میں چھپا لیا۔ سوچوں کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سامنے نسرین کھڑی تھی۔ نہیں نہیں، سامنے ایک شعلۂ جوالہ دہک رہا تھا۔ جیسے سیکڑوں ہزاروں فانوس ایک ساتھ جگمگا اٹھے ہوں اور کمرے میں نور کا سیلاب سا اُمڈ آیا ہو۔ کمرہ بقعۂ نور بن گیا۔

"شکر ہے اتنی دیر بعد بھی آئی تو ہو" میں نے ناول پرے پھینک کر ہنستے ہوئے کہا۔

وہ بھی ہنسنے لگی۔ کمرے کی محدود فضا میں جیسے کئی ساز ایک ساتھ جھنجھنا اٹھے۔ سیلِ نور کی سطح پر موسیقی تیر گئی۔

"اچھا آپ مذاق کرنا بھی سیکھ گئے ہیں! چار سال پہلے جب امّی جان کے ساتھ یہاں دو دن کے لئے آئی تھی تو آپ نے سیدھے مُنہ مجھ سے بات بھی نہ کی تھی" نسرین پلنگ پر میرے قریب بیٹھ گئی۔

"تم اُس وقت بات کرنے کے قابل نہیں تھیں اور یہ بھی کہ دو دن کے مہمان سے دل لگانا بھی تو اچھا نہیں ہوتا" میں نے پھر مذاق کیا۔

"تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں اب بات کئے جانے کے قابل بن کر اِس بار دو سال کے لئے یہاں آئی ہوں؟" وہ اپنی مخروطی اُنگلیوں کے ناخنوں پر سے نیل پالش کھرچنے لگی۔

"کاش تم ساری زندگی کے لئے آجاتیں!" بے اختیار میرے مُنہ سے نکل گیا۔

"زندگی بھی تو دو ہی دن کی ہوتی ہے" اُس نے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے برجستہ کہا۔

اب میں لاجواب ہوکر اُس کی مخمور آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ایک تلخ حقیقت کسی سیّال شے کے تلخ گھونٹ کی طرح میرے حلق سے اُتر رہی تھی۔ میرے احساس میں شرارے بھر گئے۔ چودہ طبق روشن ہونے لگے اور پھر میں ایک سرور سا محسوس کرنے لگا۔ تلخی کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ کچھ ثانیے کے لئے کمرے میں سنّاٹا چھایا رہا۔

"چلئے، اپنے شہر کی سیر کرائیے۔ پچھلی بار یہاں کچھ دیکھ نہیں سکی تھی" نسرین نے جیسے گہرے تالاب کی سطح پر بڑا سا پتھر پھینک دیا تھا۔ خاموشی کا سحر ٹوٹ گیا۔

"ہاں ہاں ضرور!" میں پلنگ پر سے اُٹھا۔

میوزیم، زُو، میرینا، ماؤنٹ روڈ کی چودہ منزلہ فلک بوس عمارت "ایل آئی سی ہاؤس"، سیونٹی ایم۔ایم تھیٹرز، ہر روز نت نئے پروگرام کے تحت سیر و تفریح ہوتی رہی۔ ماں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ نسرین اُن کی بہن کی اکلوتی لڑکی تھی۔ برسوں بعد ہمارے یہاں آئی تھی اور پھر ماں کی زمانہ شناس نظروں نے نسرین کے ساتھ میرے رویّہ اور انداز کو سمجھ لیا تھا۔ ایک دن میں نے ماں کو پڑوس کی کسی عورت سے یہ کہتے بھی سُنا تھا کہ وہ جلد ہی میسور جاکر اپنی بہن سے میرے اور نسرین کے رشتہ کی بات پکّی کر دیں گی۔ میں نہال ہوگیا اور ہر دم سایہ کی طرح نسرین کے ساتھ لگا پھرتا رہا۔ نسرین جو اب میری نظرِ انتخاب پر پُوری اُترتی تھی، جو بہار بن کر میری زندگی کے چمن زاروں میں داخل ہوئی تھی، میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

منزل کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے راہی کے لئے خود منزل بڑھ کر سامنے آگئی تھی۔ صرف دو قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ مختصر سا فاصلہ، یہ دُوری اب کیا حیثیت رکھتی تھی ــــــ میں نے آگے بڑھنے کے لئے قدم اُٹھایا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" نسرین نے میرا ہاتھ جھٹک دیا جو میں نے اُس کے شانے پر رکھنا چاہا تھا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

میرے احساسات پر ایک ٹھیس سی لگی۔ میں نے زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے کہا: "تم نے نہیں دیکھا نسرین، جب سے تم یہاں آئی ہو، میرا دل تمہارے قُرب کے لئے مضطرب ہے، میری مشامِ جاں تمہارے پھُول سے نازک بدن سے اُمڈتی ہوئی خوشبوؤں سے معطّر ہونے کے لئے بے تاب ہے، میرے ہونٹ تمھاری آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آبِ حیات کے لئے تشنہ ہیں! تم میری ہو نسرین ــــــ! کیا تم نے ماں کی بات نہیں سُنی ــــــ؟"

"انجم!" نسرین پہلی بار میرا نام اپنی زبان پر لائی۔ میں تڑپ اُٹھا اور حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ غُصّے سے سُرخ ہوگئی اور پھر اُس نے مجھ سے تقریباً چیختے ہوئے کہا ــــــ "کبھی تم نے اپنی صورت آئینہ میں دیکھی ہے؟" اور پھر وہ پیر پٹختی ہوئی کمرے کے اندر گئی۔ اپنے ہینڈ بیگ سے چھوٹا سا، گول آئینہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور اپنا باقی سامان اٹیچی میں بند کر کے تیزی سے گھر کے باہر چلی گئی۔ ماں نے اُسے روکنا چاہا لیکن اب اُسے روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ میں خاموش کھڑا آئینہ کے اُن بے شمار ٹکڑوں کو دیکھنے لگا جو چُور چُور ہو کر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ میرے دل کی طرح!!

بسیر ریاسعیدی، دہلی

قند پارسی

پروفیسر عبدالرب عرفان، ایم اے

ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف پرشین، ودربھا مہاودیالیہ، امراوتی

۲۵ر جنوری ۱۹۶۶ء

مدیرِ محترم خوشتر گرامی ! بقائے شاہدِ اُردو کے حامی!
ادیبِ خوش نگارو اہلِ دانش ! سخنداں ، ماہرِ فنِ نگارش !
شہیدِ شیوۂ تمکینِ اُردو ! اسیرِ گیسوئے مُشکینِ اُردو !
علمبردار معیارِ سخن کے ! نگہباں گلستانِ فکروفن کے !
وفا کی جان ، پیکر دوستی کے ! امانت دار رازِ زندگی کے !
سَراپا پاسدارِ آدمیت ! یقین واعتبارِ آدمیت !
بصد اخلاصِ دل ہے عرضِ خدمت سلامِ شوق و آدابِ عقیدت
مزاجِ اقدسِ والا گرامی ! دُعائیں امن و خیر و عافیت کی
ہوا موصُول دلکش سالنامہ بہارِ حُسن و زیبائی سَراپا
وہ خوش منظر چمن شعر و ادب کا ہے اپنی شانِ رعنائی میں یکتا
ادیبانِ شہیر و نامور نے اِسے سینچا ہے اپنے خونِ دل سے
خوشا حُسنِ چمن بندی کا اعجاز نرالا باغبانی کا یہ انداز
جو سچ پوچھیں تو دُنیائے ادب پر ہوا یہ اور اِک احسانِ خوشتر
نہ کیوں ہو اے مدیرِ باتدبر ضروری مجھ پہ اظہارِ تشکر
کہ فرمائی ہے میری قدردانی کرم، لُطف و عنایت ، مہربانی
مرے ذوقِ تجسس کو اُبھارا "جھروکوں" کو اشاعت سے نوازا
اشاعت کے لئے یہ دوسری بھی ہے قسط ارسال "قندِ پارسی" کی
یہ مجمُوعہ کسی قابل اگر ہو
تو اِس پر بھی عنایت کی نظر ہو

کشتۂ احسانِ خوشترِ ذی شان ——— عبدالرب عرفان

دہلی فتح کرنے کے بعد امیر تیمور گورگانی المعروف بہ تیمور لنگ نے ہندوستان کے
شرفا اور امرا کو جمع کیا اور ایک پر تکلف محفل آراستہ کی۔ دورانِ گفتگو میں اس نے ...

[illegible] مطالعہ منتخب شعری مجموعے

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	·	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	نریش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
پھوار	·	دو روپے ۵۰ پیسے
فکار	·	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	·	تین روپے
آیاتِ جنوں	·	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	·	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
گنجِ معانی	·	سات روپے ۵۰ پیسے
روپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
روحِ کائنات	·	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	·	دو روپے ۷۵ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	·	دو روپے ۷۵ پیسے
کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اوّل)	اکبر الہ آبادی	پانچ روپے
حصہ دوم	·	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	·	دو روپے ۲۵ پیسے
گلِ رعنا	تجلی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
[illegible]	·	چھ روپے

خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	·	چار روپے
گلنار	·	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	·	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	·	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	·	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
جھومر	·	تین روپے
روزن	·	تین روپے
جلترنگ	·	دو روپے ۲۵ پیسے
گفتنی	محمود سعیدی	دو روپے
نئی صبح	ضیا فتح آبادی	ایک روپیہ
طلوع	·	۷۵ نئے پیسے
نورِ مشرق	·	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
آہنگِ غزل	[illegible]	دو روپے ۵۰ پیسے
شہرِ دل	محسن زیدی	دو روپے
سفینہ و ساحل	[illegible]	چار روپے

آئینۂ اصلاح — الا فصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر۔ مرتبہ [illegible] یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالاتِ زندگی، انتخابِ کلام، شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ساتھ [illegible] صفحے ضخامت [illegible] صفحات [illegible] کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب — غالب کے ایک ایک شعر پر [illegible] کا اپنا دل [illegible] کتاب ہے اور ان [illegible] نے لکھے

جہان کے فکر و دل سے نکلے ہیں۔ قیمت [illegible] روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دئے گئے ہیں۔ اس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اس کتاب کو اس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام چار حصوں میں [illegible] سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے [illegible] صفحات کا [illegible] کے بعد پہلے [illegible] روپے [illegible] میں پیش کیا جا رہا ہے۔ محصول ڈاک ایک روپیہ [illegible] الگ ہوگا۔

تحفۂ غالب غالبیات کے [illegible] صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اس کتاب میں غالب کے [illegible] کے مکمل [illegible] حالات [illegible] تقریباً تین تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔ ہندوستان [illegible] کا فیصلہ ہے کہ کتاب بہترین [illegible] ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان [illegible] اس کتاب کی اہمیت [illegible] مختلف [illegible] کے ساتھ [illegible] قیمت چار روپے۔ کلام [illegible] [illegible] پہلا [illegible] دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ قیمت [illegible] روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

گیا: "میں نے سنا ہے کہ اس ملک میں ذوقِ فن اور طرب عام ہے اور مطرب اور سازندے دیگر ملکوں کی نسبت بہتر تسلیم کیے جاتے ہیں۔" حاضرینِ بزم نے اس امر کی تصدیق کی اور دربار میں سے ایک شخص نے ایک مشہور و معروف مگر نابینا مطرب کو حاضرِ خدمت کر دیا۔ امیر کی فرمائش پر مطرب نے ساز چھیڑا اور اپنے سحر انگیز نغموں سے محفل میں ایک سماں باندھ دیا۔ امیر نے اُس کی مہارتِ فن کو بہت سراہا اور ازراہِ کرم اُس کا نام دریافت کیا۔ مطرب نے اپنا نام دولت بتایا۔ (فارسی میں دولت بمعنی حکومت ہے) مطرب کا نام جان کر امیر کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ اُس نے ہنس کر سوال کیا "کیا دولت بھی اندھی ہوتی ہے؟" مطرب بے ساختہ کہہ اٹھا "اگر اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے گھر جاتی!"

مطرب کی یہ گستاخانہ حاضر جوابی برمحل ہونے کے باعث امیر کے شاہانہ مزاج پر گراں نہ گزری۔ خوش ہو کر اُس نے مطرب کو اپنے الطاف و کرم سے سرفراز کیا۔

عبداللہ خاں اوزبک نے جب خراسان پر فتح پائی تو ایک روز اپنے فتحمند لشکر کے ساتھ سیستان میں رستم کی قبر کے پاس سے گزرا۔ قبر پر نظر پڑتے ہی اُس کی زبان سے استہزائیہ انداز میں نکلا ؎

سر از خاک بردار ایران ببین — بکامِ دلیرانِ توران ببین
(ذرا خاک سے سر اٹھا ایران کو دیکھ — مرادِ دلیرانِ توراں کو دیکھ)

پھر قدرے تامل کے بعد اُمرا کو مخاطب کر کے پوچھا "اگر رستم آج گفتگو پر قادر ہوتا تو جواب میں کیا کہتا؟" ایک ایرانی نژاد وزیر نے کہا: "اگر عالم پناہ مجھے اپنے قہر و عتاب سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمائیں تو میں عرض کروں کہ رستم کیا جواب دیتا۔" اجازت پا کر وزیر نے جرأت کی اور کہا ؎

چو بیشہ تہی ماند از نرّہ شیر — شغالان بہ بیشہ درآیند دلیر
(ہوا جب تہی بن کہ کچھ شیر نر — تو آ نکلے بن کے گیدڑ نڈر)

عبید زاکانی اپنے عہد کا بہت بڑا عالم و فاضل، نثر نگار اور خوش گو شاعر تھا۔ علم و فضل میں دور دور تک اُس کا ثانی نہیں تھا۔ ایک موقع پر اُس نے کسی سنجیدہ موضوع پر بڑی جانفشانی اور عرق ریزی کے بعد ایک کتاب تصنیف کی اور وقت کے حاکم کی خدمت میں پیش کرنے کی غرض سے بغداد پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اُسے دربان کی زبانی معلوم ہوا کہ حاکم ابھی کسی مسخرے کے ساتھ بیٹھا دل بہلا رہا ہے، اس لئے اُسے باریابی کا شرف نہیں بخشا جا سکتا۔ یہ سن کر اُسے بہت صدمہ ہوا اور اُلٹے پاؤں واپس ہو کر اُس نے فوراً ایک قطعہ کہا ؎

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلبِ علم — کاندر طلبِ راتبِ ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز — تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

(اے خواجہ نہ کر کوشش تحصیلِ علوم — ہو جائے گا تو رزق سے ورنہ محروم
کر مسخرگی، سیکھ فنِ نغمہ گری — تا گرد رہے قدر شناسوں کا ہجوم)

اور اُس کے بعد ساری زندگی وہ اپنے اس عہد پر قائم رہا اور اپنے زمانے کا مشہور ترین ہجو گو اور ہزل سرا ہو کر رہ گیا۔ اُس نے تھوڑے ہی عرصے میں بے شمار شعراء، اُمراء اور مشاہیر کی ہجو لکھ ڈالی۔

عبید زاکانی کے ہم عصر اور مشہور قصیدہ گو شاعر سلمان ساوجی کو اُس کی ادبی زندگی کے اس افسوسناک پہلو کو دیکھ کر بہت صدمہ ہوا اور وہ اپنے آپ کو یہ کہنے سے نہ روک سکا کہ ؎

جہنمی ہجاگو عبید زاکانی — مقررست بہ بیدولتی و بیدینی
اگرچہ نیست ز قزوین و روستازادہ ست — ولیک می شود اندر حدیثِ قزوینی
(جہنمی، وہ ہجاگو، عبید زاکانی — نصیب جس کا ہے بیدولتی و بیدینی
وطن اگرچہ نہیں اُس گنوار کا قزوین — مگر ہے حاملِ شہرت بنامِ قزوینی)

(قزوینی قزوین کے باشندے کے علاوہ اصطلاح میں افترا پرداز اور مکار کو بھی کہتے ہیں)

جب یہ قطعہ عبید زاکانی تک پہنچا تو سن کر وہ سخت برہم ہوا اور بغیر کسی توقف کے قزوین سے پاپیادہ چل پڑا۔ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے بغداد پہنچا۔ جس وقت وہ نواحِ شہر میں داخل ہوا، سلمان ساوجی اپنے احباب کے ساتھ دجلہ کے کنارے بیٹھا ہوا حسنِ فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک اجنبی کو جس کی پیشانی پر علم و فضل کی علامتیں پائی جاتی تھیں، دور سے آتے ہوئے دیکھ کر سلمان نے اپنے ایک مصاحب کو روانہ کیا کہ اُسے بلا لائے۔

سلمان نے اجنبی سے دریافت کیا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے؟ اجنبی نے جواب دیا، وہ براہِ راست قزوین سے چلا آ رہا ہے۔

"کیا وہاں لوگ سلمان کے نام سے واقف ہیں؟" سلمان نے پوچھا۔

"ہاں! کوئی شاعر ہے۔" اجنبی کا مختصر سا جواب تھا۔

"کیا سلمان کے کچھ اشعار لوگوں کو یاد بھی ہیں؟" سلمان نے مزید سوال کیا۔

"ہاں! اس کے اکثر اشعار مشہور ہیں۔" اجنبی نے جواب دیا۔

"کوئی شعر تمھیں یاد ہو تو سناؤ۔" سلمان نے فرمائش کی۔

"اس وقت کوئی شعر تو نہیں، ایک قطعہ یاد آ رہا ہے۔" اجنبی نے کہا اور یہ قطعہ سنا دیا ؎

من خراباتیم و بادہ پرست — در خراباتِ مغاں عاشق مست

می کشندم چو سبُو دوش بدوش   می برندم چو قدح دست بدست

(میں رندِ خراباتی ہوں اور بادہ پرست   عاشق ہوں خراباتِ مغاں میں بدمست

لاتے ہیں مجھے مثلِ سبُو دوش بدوش   لیتے ہیں پیالے کی طرح دست بدست)

قطعہ سُنا کر عبید نے کہا "سلمان تو نامور شاعر ہے اور اُس کا کلام نہایت پاکیزہ ہوتا ہے۔ ایسی پست اور مبتذل بات اُس کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتی۔ ہو نہ ہو یہ واردات اُس کی بیوی کی ہے ...."

اور سلمان سمجھ گیا کہ اجنبی، عبید زاکانی کے سوا کوئی دوسرا نہیں!

جواں سال، خوددار اور خود پسند شاعر عُرفی کے تعلقات زندگی کے بیشتر حصے میں ملک الشعراء فیضی سے کشیدہ رہے اور اسی معاصرانہ کشیدگی نے بہت سے دلچسپ لطائف کو جنم دیا ہے۔

ایک بار فیضی صاحبِ فراش ہوا۔ عُرفی عیادت کے لئے پہنچا۔ فیضی کو کتّوں سے بہت رغبت تھی۔ اُس وقت بھی چند پلّے فیضی کے اِردگرد کھیل رہے تھے۔ اُن پر نظر پڑتے ہی عُرفی کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی۔ چند رسمی جملوں کے بعد اُس نے پُوچھ ہی لیا: "ایں مخدوم زادہ ہا بچہ اسم موسوم اند؟" (یہ مخدوم زادے کن ناموں سے موسُوم ہیں؟)

"بہ اسمِ عُرفی!" (متعارف ناموں سے) فیضی نے جواب دیا اور یہ ایک طرح سے عُرفی پر زبردست چوٹ تھی۔ جوابی کاروائی کے طور پر نہایت سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے عُرفی نے کہا: "مبارک باشد!"

(اِس ذُومعنی فقرے کا ایک مفہُوم ہے: "مبارک ہو" اور دوسرا: "مبارک ہوگا" اور شیخ مبارک، فیضی کے والدِ بزرگوار کا اسمِ گرامی تھا)

جب ترک سلطان اتابک محمد ایلد گز کی وفات کے بعد قزل ارسلان تختِ نشین ہوا تو اُس کے معاصر نظامی نے اُس کی مدح میں ایک بلند بانگ قصیدہ لکھا اور جشنِ تخت نشینی کے موقع پر پیش کیا۔ جب وہ اِس شعر پر پہنچا ؎

بہ دریا چوں زند تیغِ بلا رنگ   بہ ماہی گاؤ گوید کیف حالک

(دریا پہ جب وہ کرتا ہے تیغِ بلا سے وار   مچھلی سے گائے کہتی ہے کیا حال ہے ترا)

تو ایک مصاحب نے جو علمِ نحو میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، یہ اعتراض کیا کہ ترکیب کی رُو سے "حالک" میں لام پر ضمہ (پیش) چاہیئے نہ کہ فتحہ (زبر) اِس لئے حالک "رنگ" کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔

جواب میں نظامی نے ہنس کر کہا: "معذور دارید، گاؤ نحو نمی داند!" (معاف فرمایئے، گائے نحو نہیں جانتی)

تُلقی، ترک سلطان بایسنقر مرزا کے دربار کا ایک استاد شاعر گزرا ہے۔ ایک مرتبہ اُس نے منظفری کے قصیدے کا جو باغ کی ردیف میں تھا، جواب لکھ کر سُلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ سُلطان نے ازراہِ مزاح کہا: "اگر تُو سچ کہتا ہے تو منظفری کے اِس قصیدے کا جواب بھی جو سرائے (بمعنی محل)، کی ردیف میں ہے، لکھو۔" تُلقی نے برجستہ جواب دیا: "پہلے یہ تو دیکھوں کہ اِس کے باغ سے مجھے کون سا پَھل (مُراد صلہ) ملتا ہے پھر اُس کے محل میں بھی قدم رکھوں گا۔"

سُلطان اُس کے حُسنِ طلب کے اِس اشارے کی لطافت کو پا گیا اور اُس کی حاضر جوابی سے خوش ہو کر بیش انداز صلہ بخشا۔

اورنگ زیب کے عہد میں صُوفی سرمد شہید تصوّف سے وابستگی رکھنے والوں کے لئے جذب و کشش کا باعث بنے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ شاہزادہ دارا شکوہ بھی اُن سے بے حد متاثر تھا۔ اورنگ زیب کی شکّی نگاہوں میں اُن کا وجود بُری طرح کھٹک رہا تھا۔ اِس لئے اُن کی حرکت و عمل پر افسران کی سخت نگرانی تھی۔

اُس زمانے میں دہلی کا داروغۂ شہر عبدالقوی نامی ایک شخص تھا۔ سرمد ہمیشہ مادرزاد برہنہ رہا کرتے تھے۔ شامتِ اعمال سے ایک دن اُن سے باز پُرس کی کہ کیا انھیں یہ نہیں معلوم کہ احکامِ شریعت میں ستر پوشی کے لئے سخت تاکید آئی ہے اور برہنگی کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

سرمد نے یہ سُن کر جواب دیا: "کیا کروں بابا! شیطان قوی ہے!"

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف نگارستانِ پارس میں سرمد شہید کا یہ لطیفہ درج کیا ہے ——— ایک بار داروغۂ شہر نے سرمد کو عین اُس عالم میں جا پکڑا جب کہ بھنگ کا پیالہ اُن کے ہاتھ میں تھا۔ داروغہ نے اُن سے کہا: "درویش! نشہ اسلام میں حرام ہے۔ تجھ پر شرعی حد کا جاری کیا جانا واجب ہو گیا ہے۔"

سرمد نے یہ سُن کر داروغہ کی قبا کا دامن چٹکی سے پکڑ کر مسَلا۔ داروغہ اُن کا اشارہ سمجھ گیا اور بول اُٹھا: "بیشک ریشم کا لباس مَردوں کے لئے جائز نہیں لیکن اس کپڑے میں کپاس کا جُزو بھی شامل ہے۔ اِسی لئے اسے مشرُوع کہتے ہیں۔"

جواب ہاتھ آتے ہی سرمد بول اُٹھے: "بابا! پھر میں نے کون سا گناہ کیا ہے، میں نے بھی تو اِس ٹھنڈائی میں الائچی اور کالی مرچ ڈال کر اِسے جائز کر لیا ہے۔"

شاپور نیشاپُوری، مشہُور قصیدہ گو شاعر ظہیر فاریابی کے شاگردوں میں سے تھا۔ وہ سُلطان خوارزم شاہ کے وزیر خواجہ نورالدین سے ملاقات کے لئے کئی بار گیا لیکن باریابی کا

موقع نہ ملا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ فرصت کے لمحات شراب نوشی اور عیش کوشی میں گزارتا تھا۔
ایک بار جبکہ محفلِ ناؤ نوش شباب پر تھی ندیموں میں سے کسی نے خواجہ کے گوش گزار کیا کہ شاپور جو کہ معروف شاعر اور کامل ادیب ہے، کئی بار شرف یابی کی غرض سے حاضر ہوا لیکن اُسے شرفِ باریابی نہیں بخشا گیا۔
خواجہ نے فرمائش کی کہ اُس کا کوئی شعر سُنایا جائے۔ تاکہ اُس کی طبیعت کا جائزہ لیا جا سکے کیونکہ شاعر کی باریابی اُس کی لیاقت اور قابلیت پر منحصر ہے۔
ایک شخص شاپور کے پاس پہنچا اور اُس سے صورتِ حال کہہ سُنائی۔ شاپور نے فی البدیہہ یہ رُباعی کہہ کر خواجہ کی خدمت میں بھیج دی ؎

فضلِ تو و ہم بادہ پرستی باہم — مانندِ بلندیست و پستی باہم
حالِ تو بچشمِ ماہر دیاں ماند — کانجاست مدام نور و مستی باہم
(ترا فضل و بادہ پرستی بہم — مثالِ بلندی و پستی بہم
ترا حال جوں دیدۂ مہ رخاں — ایں جن میں سدا نور و مستی بہم)

شاعر ناصر بخاری حج بیت اللہ کے ارادے سے بخارا سے چلا۔ بغداد میں اُس کی ملاقات سلمان ساؤجی سے ایسے وقت میں ہوئی جبکہ وہ معمول کے مطابق دریا کے کنارے فطرت کے نظاروں اور سیر و تفریح سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک دوست نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کیا۔ رسمی گفتگو کے دَوران اچانک سلمان کے دل میں ناصر کی شاعرانہ صلاحیتوں کا امتحان لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اُس نے مصرعہ کہا۔ ع

دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ است
(دجلہ کی اب کے برس رفتار عجب مستانہ ہے)

پھر ناصر سے شعر مکمل کر دینے کی فرمائش کی۔ ناصر نے بغیر کسی تامل کے گرہ لگا دی ع

پائے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ است
(پاؤں میں زنجیر، لب پر کف مگر دیوانہ ہے)

داوری کاشانی نے کسی امیر و کبیر شخص کی شان میں جو خراسان کا باشندہ تھا ایک پُر زور قصیدہ لکھ کر اُس کی خدمت میں پیش کیا۔ ممدوح نے اُس قصیدے پر تنقید کرتے ہوئے اُسے بے معنی ٹھہرایا۔ نازک مزاج شاعر یہ تنقیدِ بے جا کب برداشت کر سکتا تھا۔ اُسے فوراً ہی اُس کا مناسب اور معقول جواب سُوجھ گیا۔ فی البدیہہ یہ قطعہ لکھا اور اُس "قدر ناشناس" کے پاس بھیج دیا ؎

دی خراسان مدحتی گفتم بنازِ روئے طمع — او غلط فہمیدہ گفتا مدح با معنی نداشت
گفتمش بسیار نیکو گفتی ایں انصاف بود — بندہ ہم دانستہ ام مدح شما معنی نداشت

(کی خراساں میں کسی کی مدح لیکن بے غرض — کہہ اُٹھا کج فہم میری مدح بے معنی رہی
اُس سے میں بولا کہ تُو نے یہ کہی انصاف کی — میں نے بھی جانا کہ تیری مدح بے معنی رہی)

نوجوان شاعر عُرفی شیرازی کی خود ستائی اور خودداری ضرب المثل ہے۔ اپنی مختصر سی مدتِ حیات میں عُرفی جو کچھ کہہ گیا اور کر گیا اُس کی مثال فارسی ادب میں ملنی مشکل ہے۔ وہ اپنی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور مضمون آفرینی کے لئے اپنے معاصرین میں ایک ممتاز مقام کا مالک تھا۔
ایک موقع پر اُس نے اپنا تحفہ نظم "گُلِ تازہ" اپنے ایک "وفا پیشہ یارِ ہم مشرب" کی خدمت میں ارسال کیا۔ جس نے اُسے خالی خولی دُعا بھیج دی۔ اِس پر عُرفی نے جل کر کہا ؎

لُطف کردی ولے منّت — مہ گرفتی سُہا فرستادی
(کی عنایت جتا نہ پر احسان — چاند لے کر سُہا دیا تُو نے)
(سُہا ایک بہت ہی کم روشنی والا ستارہ ہے)

ناردرن ریلوے

نوٹس

مورخہ یکم اپریل ۱۹۶۹ء سے ناردرن ریلوے ٹائم ٹیبل میں عام ترمیم عمل میں لائی جائے گی۔ اہم تبدیلیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ نئی ٹرینوں کا اجراء

دو ٹرینیں اونچاہر اور رائے بریلی کے درمیان ہر ایک جانب (نمبر ۱ یو آر/۲ یو آر اور ۳ یو آر/۴ یو آر)

۲۔ ٹرینوں میں توسیع

(i) ۲ آر سی/۳ آر سی کانپور۔ رائے بریلی ٹرینوں میں توسیع الہ آباد سے الہ آباد تک براستہ اونچاہر کر دی جائے گی اور ان کا نیا نمبر رائے بریلی کو چھوڑتے ہوئے ۱ اے یو سی/۲ اے یو سی ہوگا۔

(ii) ۱ اَپ/۲ اَپ انبالہ۔ پٹیالہ ٹرینوں میں نابھہ سے اور تک توسیع کر دی جائے گی۔

(iii) ۲ بی ایس ایچ/۳ بی ایس ایچ سادل پور۔ ہنومان گڑھ ٹرینوں میں ہے پور سے اور تک براستہ چورو توسیع کر دی جائے گی اور ان ٹرینوں کا نیا نمبر ۲۱۶ ڈاؤن/۲۱۵ اَپ ہوگا۔

(iv) ۱۔ بی آر ایس/۲ بی آر ایس سرسہ۔ ریواڑی ٹرینوں میں بھٹنڈہ سے اور تک توسیع کر دی جائے گی اور ان ٹرینوں کا نیا نمبر ۲ بی آر بی/۳ بی آر بی ہوگا۔

۳۔ ٹرینیں جن کی رفتار تیز کی گئی

(i) ۱۔ اَپ ہوڑہ۔ دہلی کالکا میل کی رفتار تیز کی گئی ۴۰ منٹ

(ii) ۲ ڈاؤن کالکا۔ دہلی ہوڑہ میل . . . ۵۰ منٹ

(iii) ۱۳۔ اَپ اپر انڈیا ایکسپریس . . . ۶۵ منٹ

(iv) ۳۵۱۔ اَپ پسنجر . . . ۷۰ منٹ

(v) ۳۵۲ ڈاؤن پسنجر . . . ۱۲۵ منٹ

۴۔ نئے اسٹیشن کھولے گئے

(i) "سلیم گڑھ مسانی ہالٹ" سادل پور۔ ہنومان گڑھ سیکشن پر

(ii) "جودھکا ہالٹ" حصار۔ سرسہ سیکشن پر

(iii) ۲ سندھورو ۱۳ سلطان پور۔ لکھنؤ سیکشن پر
(iv) ۲ کھٹورہ ۳ پٹھانکوٹ۔ مادھوپور سیکشن سے پرے

۵۔ نئے ٹھہراؤ مہیا کئے گئے

(i) ۸۹۔ اَپ پٹیل نگر پر
(ii) ۸۹/۹۰ ڈاؤن مہندر گڑھ پر
(iii) ۱۔ بی ڈی ایس/۲ بی ڈی ایس بجاؤس پر
(iv) ۱۔ بی ڈی بی/۲۲۰ ڈاؤن لیسی دھمان کوٹ پر
(v) ۳ بی ایس آر/۴ بی ایس آر کمریان ہالٹ پر
(vi) ۱۔ بی ایچ/۳۴۴ ڈاؤن دولاکوٹ مجانی ہالٹ پر
(vii) ۳۵۵/اَپ اعتماد پور پر
(viii) ۳۷۶ ڈاؤن صاحب آباد پر
(ix) ۱۳۱۔ اَپ/۱۳۲ ڈاؤن سانہوال پر
(x) ۲ وی ایم اے وپاس نگر پر
(xi) ۲۷ ڈاؤن ہرن گاؤں پر

۶۔ نئے کنکشن مہیا کئے گئے

(i) ۱۔ اَپ کا ۹۳۔ اپ کے ساتھ دہلی میں
(ii) ۱۔ آر پی کا ۳۵۱۔ اَپ کے ساتھ راستے بریلی میں
(iii) ۳۵۲ ڈاؤن کا ۲ آر پی کے ساتھ راستے بریلی میں
(iv) ۱۔ یو آر کا ۲ اے یو سی کے ساتھ اونچاہر میں
(v) ۴ یو آر کا ۱۔ اے یو سی کے ساتھ اونچاہر میں
(vi) ۲ بی سی کا ۴۷ ڈاؤن کے ساتھ بالامئو میں
(vii) ۲۔ ایل سی کا ۱۔ اَپ میل کے ساتھ کانپور میں
(viii) ۴۔ اَپ کا ۹۔ اَپ کے ساتھ وارانسی میں
(ix) ۱۲ ڈاؤن (ایم جی) کا ۳۷۵۔ اَپ کے ساتھ بریلی میں

۷۔ ٹھہراؤ جو منسوخ کئے گئے

(i) ۸۳۔ اَپ/۸۴ ڈاؤن پھپھوند پر

(ii) ۹۳/۹۴ ڈاؤن ریبی پر

(iii) ۹۵-اَپ/ ۹۶ ڈاؤن شری بالاجی اور الائی پر

(iv) ۹۶ ڈاؤن کیرلا پر

(v) ۹۵ جوگی ماگرا پر

(vi) ۳۵۱-اَپ/۳۵۲ ڈاؤن موہن لال گنج، نگوہن سری راج نگر، کندن گنج، ہرچند پور، پریاواں، گرمی مانک پور سمبدری، لال گوپال گنج، رام چورا روڈ، اترام پور، سرائے گوپال پر

۸۔ ٹرینوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں

(i) ۲۲-اَپ ساؤدرن ایکسپریس نئی دہلی سے ۱۰-۱۶ بجے کی بجائے ۱۵-۱۹ بجے چھوٹے گی۔

(ii) ۱۶-اَپ جی ٹی ایکسپریس نئی دہلی سے ۲۵-۱۷ بجے کی بجائے ۴۵-۱۹ بجے چھوٹے گی۔

(iii) ۱۲ ڈاؤن دہلی ہوڑہ ایکسپریس دہلی سے ۱۵-۲۲ بجے کی بجائے ۰۵-۲۱ بجے چھوٹے گی۔

(iv) ۱-اَپ دہلی ۳۵-۲۰ بجے کی بجائے ۵۵-۱۹ بجے پہنچے گی۔

(v) ۲ ڈاؤن دہلی سے ۲۰-۸ بجے کی بجائے ۰۰-۸ بجے چھوٹے گی۔

(vi) ۱۳-اَپ دہلی ۲۵-۱۱ بجے کی بجائے ۰۵-۱۰ بجے پہنچے گی۔

(vii) ۴-اَپ مغلسرائے سے ۰۰-۹ بجے کی بجائے ۵۵-۷ بجے چھوٹے گی۔

(viii) ۳-اَپ الہ آباد ۳۰-۱۱ بجے کی بجائے ۱۸-۱۰ بجے پہنچے گی۔

(ix) ۳-اَپ الہ آباد سے ۰۵-۱۲ بجے کی بجائے ۰۵-۱۱ بجے چھوٹے گی۔

(x) ۳۵۱-اَپ الہ آباد سے ۰۰-۱۶ بجے کی بجائے ۱۰-۱۷ بجے چھوٹے گی۔

(xi) ۳۵۲ ڈاؤن الہ آباد ۳۰-۱۱ بجے کی بجائے ۲۵-۹ بجے پہنچے گی۔

(xii) ۳۸ ڈاؤن فیروز پور سے ۱۰-۲۱ بجے کی بجائے ۰۵-۲۱ بجے چھوٹے گی۔

(xiii) ایم جی ۲۰۲ ڈاؤن دہلی ۰۵-۷ بجے کی بجائے ۲۵-۷ بجے پہنچے گی۔

(xiv) ایم جی ۲۱۴ ڈاؤن دہلی ۲۵-۷ بجے کی بجائے ۳۵-۶ بجے پہنچے گی۔

(xv) ایم جی ۲۳۲ ڈاؤن دہلی ۲۵-۵ بجے کی بجائے ۰۰-۵ بجے پہنچے گی۔

(xvi) این جی ۱ کے ایس کالکا سے ۵۵-۸ بجے کی بجائے ۱۵-۸ بجے چھوٹے گی۔

(xvii) این جی ۱ کے ایس شملہ ۲۵-۱۵ بجے کی بجائے ۲۵-۱۴ بجے پہنچے گی۔

۹۔ (الف) ٹرینوں میں ایرکنڈیشنڈ جگہ مہیا کی گئی

(i) جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ نمبر ۱-اَپ/۲ ڈاؤن میل (دہلی-کالکا) گاڑیوں کے ساتھ ہفتہ میں تین بار کی بجائے روزانہ چلے گی۔

(ii) ایک جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ ۱۹ ڈاؤن/۲۰-اَپ دہرہ دون ایکسپریس گاڑیوں کے ہمراہ ہفتہ میں دو بار

کوٹہ اور دہرہ دون کے درمیان کی بجائے کوٹہ اور دہلی کے درمیان ہفتہ میں تین بار مندرجہ ذیل دنوں میں چلے گی :-

از کوٹہ :- بروز سپیر، بدھ اور جمعہ

از دہلی :- بروز منگل، جمعرات اور سنیچر

(iii) ایک فل ایرکنڈیشنڈ کوچ ۴۱۔اپ/۴۲ ڈاؤن منصوری ایکسپریس گاڑیوں کے ہمراہ دہلی اور دہرہ دون کے درمیان روزانہ چلے گی۔

(iv) ایک فل ایرکنڈیشنڈ کوچ بمبئی سنٹرل اور پٹھانکوٹ کے درمیان ۳ ڈاؤن/۳۳۔اپ اور ۳۴ ڈاؤن/۴۔اپ میل گاڑیوں کے ہمراہ روزانہ چلے گی۔

(v) ایک جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ ۲۱ ڈاؤن/۲۲۔اپ سادرن ایکسپریس گاڑیوں کے ہمراہ مدراس اور نئی دہلی کے درمیان چلے گی۔

(vi) ایک جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ ۹۱۔اپ/۹۲ ڈاؤن بیکانیر میل گاڑیوں کے ہمراہ دہلی اور بیکانیر کے درمیان ہفتہ میں دو بار حسب ذیل طریقے پر مورخہ ۳۱-۷-۱۹۶۶ تک چلے گی :-

از دہلی :- بروز سپیر اور جمعرات

از بیکانیر :- بروز منگل اور جمعہ

(vii) جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ ۹۳۔اپ/۹۴ ڈاؤن جودھپور میل گاڑیوں کے ہمراہ (دہلی۔جودھپور) ہفتہ میں دو بار کی بجائے ہفتہ میں تین بار حسب ذیل طریق پر چلے گی :-

از دہلی :- بروز سپیر، بدھ اور سنیچر

از جودھپور :- بروز اتوار، منگل اور جمعرات

(بی) ایرکنڈیشنڈ جگہ منسوخ کی گئی

(i) جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ ۵۹۔اپ/۶۰ ڈاؤن سری نگر ایکسپریس گاڑیوں کے ہمراہ نئی دہلی اور پٹھانکوٹ کے درمیان جو ہفتہ میں تین بار چلتی تھی۔

(ii) جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ ۱۵ ڈاؤن/۱۶۔اپ جی ٹی ایکسپریس گاڑیوں کے ہمراہ مدراس اور نئی دہلی کے درمیان جو ہفتہ میں تین بار چلتی تھی۔

(iii) جزوی ایرکنڈیشنڈ کوچ جو دہلی اور دہرہ دون کے درمیان ۲۰/۱۹ دہرہ دون ایکسپریس گاڑیوں کے ہمراہ چلتی تھی۔

۱۰۔ تھرو/سیکشنل ڈبوں کے چلنے میں تبدیلیاں

(الف) مندرجہ ذیل تھرو/سیکشنل ڈبے جاری کئے گئے ہیں۔

اسٹیشن مابین	ٹرین نمبر	درجہ	ڈبوں کی تعداد	وقفہ	کیفیت
ہوڑہ - دہلی	۱۔اپ/۲ ڈاؤن	I	ایک	روزانہ	ایڈیشنل کوچ
		III	ایک	"	"
ہوڑہ - الہ آباد	۳۔اپ/۴ ڈاؤن	III	ایک	"	"

اسٹیشن مابین	ٹرین نمبر	درجہ	ڈبوں کی تعداد	وقفہ	کیفیت
سالٹ پور۔ نئی دہلی براستہ بلاسپور کٹنی اور بینا	۵۷/۳۶/۳۲۲ ڈاؤن اور ۵۸۔اپ/۳۵/۳۲۱	I، III	ایک	روزانہ	
جونپور۔ دہلی براستہ کھڑگپور اور آسنسول	۷/۲۵۱/۱۷/ ۸۵۔اپ اور ۸۶ ڈاؤن/۱۸/۲۵۲	I، III	ایک	″	
حیدرآباد نئی دہلی	۳۱/۳۳۱ اور ۴۸/۴۲	I اور III، III	ایک، ایک		سادرن ایکسپریس کے ذریعہ
وارانسی۔ مدراس	۱۶/۲۹/۴۷ اور ۴۸/۲۷/۱۵	I، III			ایک ہفتہ میں تین بار کی بجائے چار بار از مدراس بروز اتوار، منگل، جمعرات اور سنیچر از وارانسی بروز اتوار، منگل، بدھ اور جمعہ
لکھنؤ۔ مدراس	۱۶/۱۰۶ اور ۱۵/۱۰۵	I اور III		ایک ہفتہ میں دو بار کی بجائے تین بار	از لکھنؤ بروز پیر، جمعرات اور سنیچر از مدراس بروز پیر، بدھ اور جمعہ

ایک کمپوزٹ بوگی I اور III کلاس ۱۹ ڈاؤن/۲۰۔اپ دہرہ دون ایکسپریس گاڑیوں کے ہمراہ کوٹہ اور دہرہ دون کے درمیان ہفتہ میں پانچ بار کی بجائے کوٹہ اور دہلی کے درمیان ہفتہ میں چار بار مندرجہ ذیل دنوں میں چلیں گی:۔

از کوٹہ :۔ بروز منگل، جمعرات، سنیچر اور اتوار

از دہلی :۔ بروز پیر، بدھ، جمعہ اور اتوار

(ب) ایک کمپوزٹ بوگی I اور III کلاس جو نئی دہلی اور حیدرآباد کے درمیان ہفتہ میں تین بار ۲۱/۳۲۰ اور ۳۱۹/۱۵ گاڑیوں کے ہمراہ چلتی تھی اب منسوخ کردی جائے گی۔

تفصیلی اطلاعات متعلقہ ٹرینوں کے اوقات، تھرو/سیکشنل ڈبوں کے اجراء یا منسوخی اور ٹرینوں میں جگہ کے درجوں کی ترتیب وغیرہ کے لئے ماہ اپریل ۱۹۶۶ء سے جاری ہونے والے ٹائم ٹیبل کو ملاحظہ فرمائیں جو ریلوے بکنگ، ریزرویشن، انکوائری دفاتر اور اہم ریلوے اسٹیشنوں کے بک اسٹالوں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

چیف اوپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ

ناردرن ریلوے۔ نئی دہلی

R.O–63



زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱● مولی ــــ صحت و تندرستی کی ضامن

مولی بہت ارزاں سبزی ہے اور بے قدری کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے مگر گوناگوں اوصاف و خواص کے اعتبار سے مولی اِتنی فائدہ بخش ہے کہ قیمتی دواؤں کی بڑی بڑی شیشیاں اِس کے سامنے ہیچ ہیں۔

اِس حقیر سی سبزی میں صحت و تندرستی عطا کرنے والی صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

مولی گرم و تر ہے۔ عام طور پر سرد و تر مشہور ہے۔ مولی کے معدنی اجزاء اور وٹامنز آگ پر پکانے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اِسے پکائے بغیر کچی کھانے سے مولی کے وٹامنز اور معدنیات قدرتی حالت میں آپ کو ملتے ہیں۔

مولی خوراک کو ہضم کرتی ہے مگر خود دیر میں ہضم ہوتی ہے۔ اِسے ہضم کرنے کے لئے اِس کے پتّے ضرور کھانے چاہئیں اور پتّوں کو ہضم کرنے کے لئے تھوڑا سا گڑ کھانا ضروری ہے۔ بھوک اور قوتِ ہاضمہ کو تیز کرنے کے لئے مولی کو کھانا کھانے سے پہلے نمک، سیاہ مرچ اور زیرہ لگا کر کھانا چاہئے۔ مرطوب مزاج والوں کا معدہ اِس سے بگڑ جاتا ہے۔ مولی ریاح پیدا کرتی ہے اور بلغم کو خارج کرتی ہے۔ سرد مزاج والوں کو مولی کم کھانی چاہئے۔ نزلہ و زکام میں سخت مضر ہے۔

اگر کثرت سے گوشت کھانے سے گردے اور مثانے پر یورک ایسڈ کا بوجھ بڑھ رہا ہو تو مولی کا استعمال نہایت مفید ہے۔ مولی گردے اور مثانے کو فضلات سے صاف کرتی ہے، پیشاب کھول کر لاتی ہے، حیض کی رکاوٹ میں مفید ہے گردہ و مثانہ کی پتھری، بواسیر اور معدہ کی کمزوری میں مفید ہے۔

- سُرمہ سیاہ دو تولہ کو مولی کے پتّوں کے دس تولہ پانی میں خوب باریک کر لیں۔ یہ سُرمہ بینائی کو تیز کرتا ہے اور آنکھوں سے پانی جاری ہونے کو روکتا ہے۔
- آبِ برگِ مولی چار تولہ روزانہ صبح کو ورمِ طحال کا مریض پئے تو چند دنوں میں طحال کا ورم جاتا رہے گا۔
- مولی کے پتّوں کو سایہ میں خشک کر کے باریک کر لیں اور اُس میں برابر وزن کی مصری ملا کر رکھ لیں۔ چار ماشہ کی مقدار میں صبح کو باسی پانی کے ساتھ ۴۰ دن استعمال کرنے سے بادی بواسیر کی شکایت جاتی رہتی ہے۔
- مولی کے خشک پتّوں کی دُھونی دینے سے گھروں میں سانپ اور بچھو بھاگ جاتے ہیں۔
- مولی کے پتّوں کا دو تولہ پانی صبح و شام استعمال کرنے سے غذا ہضم ہوتی ہے۔ ورمِ جگر کے لئے مفید ہے۔ جگر اور تلّی کے سُدّوں کو رفع کرتا ہے۔ استسقاء اور یرقان کو نافع ہے۔
- آبِ برگِ مولی میں شہد ملا کر آنکھوں میں ڈالنا موتیا بند کے آغاز میں مفید ہے۔
- مولی کے پتّوں کا پانی نچوڑ کر آنکھوں میں ڈالنے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔
- مولی کا پانی نچوڑ کر پانچ تولہ کی مقدار میں دو تولہ شکنجبین ڈال کر پینا سنگِ گردہ کو خارج کرتا ہے۔

۲● محنت کے ساتھ آرام بھی ضروری ہے

محنت کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے، زندگی کی ہر کامیابی کا راز محنت ہے۔ جس نے محنت سے جان چرائی وہ کچھ نہ بن سکا، وہ کچھ نہ پا سکا۔ زندگی کے ہر میدان میں کامیابی محنت ہی کی مرہونِ منت ہے لیکن اِس حقیقت کے ساتھ یہ بھی

روشن حقیقت ہے کہ محنت کے ساتھ آرام بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

محنت کے بعد تھوڑے آرام کرنا کلیدِ کامیابی ہے لیکن صحیح طریقہ سے آرام کرنا چاہئے۔ بدن کو ڈھیلا رکھ کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ آرام کرنا دس گھنٹے کی ایسی نیند سے زیادہ تازگی بخش ہوتا ہے جس میں جسم اور دماغ تناؤ کی حالت میں ہوں۔ اس کے لئے دماغی یکسوئی اور زندگی کے متعلق صحیح نفسیاتی نقطۂ نظر ضروری ہے۔ یکسوئی کی حالت میں آپ سکون کے ساتھ آرام لے سکتے ہیں۔ تمام تشویش و پریشانی دُور ہو جاتی ہے اور جسم کو طاقت و تازگی حاصل ہوتی ہے۔ غذاؤں اور دواؤں کی اہمیت محض ثانوی ہے۔

۳ • لُو سے کیسے بچا جائے

لُو جس طرح پودوں کو جھلسا دیتی ہے، اسی طرح انسانوں پر بھی اُس کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ تیز دھوپ میں چلنا پھرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جب تیز دھوپ سر پر پڑتی ہے اور جسم میں پانی کی مقدار کافی نہیں ہوتی تو لُو لگ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ لُو لگ جانے پر دماغ کی نالیاں پھیل جاتی ہیں۔ دَورانِ خون کی رفتار بڑھ جاتی ہے، دماغ گرم ہو جاتا ہے اور آدمی کو چکر آنے لگتے ہیں۔

دیر تک گرم فضا میں رہنے سے بھی لُو لگ جاتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات جب رات میں درجۂ حرارت بڑھا ہوا ہوتا ہے تو لُو زیادہ لگتی ہے۔ ایسی سڑکوں پر جہاں سایہ نہ ہو اور کھلے میدانوں میں لُو لگنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔

لُو کبھی اچانک لگتی ہے اور ایسی شدید ہوتی ہے کہ مریض کو تیز بخار کے ساتھ بے ہوشی بھی طاری ہو جاتی ہے۔ دوسری حالتوں میں حرارت، دردِ سر، بے چینی، متلی اور قے ہونے لگتی ہے۔ یہ علامتیں جسم میں بہت زیادہ گرمی جمع ہو جانے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی لُو لگنے پر مریض کی حالت بہت نازک ہو جاتی ہے۔ مریض کا چہرہ جو ابتدا میں سُرخ رہتا ہے، زرد پڑ جاتا ہے، ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ بہنے لگتا ہے۔ اس حالت میں اکثر مریض کا جانبر ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔

لُو لگتے ہی مریض کو کسی ٹھنڈی اور سایہ دار جگہ میں، یا مکان کے کسی ٹھنڈے حصے میں جہاں ہوا آ رہی ہو، لے جانا چاہئے۔ اُس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالنا چاہئے، برف مل سکے تو سر، پیٹ، ہتھیلیوں اور تلوؤں پر برف کی تھیلیاں رکھیں یا برف کے پانی میں تولیے کو نچوڑ کر مریض کے بدن کو پونچھ دیں۔ نمک اور شکر اگلوکوز ملا ہوا پانی جتنا بھی مریض پی سکے پلائیں۔ ہو سکے تو کوئی معالج بھی فوراً بلائیں۔

لُو سے بچنے کے لئے ان طریقوں پر عمل کیجئے

- سر کھلا نہ رکھئے، سر پر پگڑی، دبیز تولیہ یا موٹے کپڑے کی ٹوپی رکھنا بہت مفید ہے۔
- کپڑے ایسے پہنیں جن میں ہوا کا گزر ہو اور پسینہ جذب ہو سکے۔
- دوپہر کی تیز دھوپ میں گھر سے باہر نکلتے وقت کافی پانی پی کر نکلنا چاہئے۔
- لُو سے بچنے کے لئے نمک سہل الحصول اور بے حد ارزاں چیز ہے۔ پسینہ کی شکل میں جسم کا بہت سا نمک باہر نکل آتا ہے اُسے پورا کرنا بہت ضروری ہے ورنہ لُو لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ تیز دھوپ میں گھر سے باہر نکلتے وقت پسا ہوا تھوڑا نمک پانی میں ڈال کر پی لینا چاہئے۔ سوڈے کا استعمال بھی مفید ہے۔
- لُو سے بچنے کے لئے آم کا پنّا پینا بھی بہت مفید ہے۔
- پیاز ہاتھ میں یا جیب میں رکھنے سے بھی لُو کا اثر کم ہوتا ہے۔ یہ حقیقت مدیر "بیسویں صدی" کے ذاتی تجربہ میں آ چکی ہے۔

۴ • صحت کے لئے موسیقی کی افادیت

عام طور پر موسیقی کو صرف تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ موسیقی صحت و زندگی کے لئے بیش از بیش فوائد کی حامل ہے۔ ماہرین نے تحقیق کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ موسیقی کا اثر صرف اعصاب ہی تک محدود نہیں، وہ جسم کے سارے اعضاء و اجزاء پر نمایاں اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اخلاق و طبائع پر بھی موسیقی کے اثرات نہایت واضح ثابت ہوئے ہیں۔ جب موسیقی نشاط آور و جذبات انگیز ہوتی ہے تو اُس سے ذہن میں بیداری و تیزی پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس کے برعکس ہوا تو اُس سے ذہن میں ٹھہراؤ اور سکون کی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ اس لئے انسان کو جب تفکرات اور کام کی کثرت تھکا دے تو سکون بخش موسیقی سے قوت و تقویت حاصل ہوتی ہے۔

مشاہدات سے ثابت ہے کہ سرور بخش و نشاط آور موسیقی قوائے جسم کی تجدید و تغذیہ میں بہت معاون و مفید ہے۔ اُن میں چُستی و تازگی کی روح پھونکتی ہے۔

ماہرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ موسیقی دل و دماغ ہی کو فرحت و سُرور سے مالا مال نہیں کرتی، معدہ کو بھی اُس کا فرض ادا کرنے میں مدد پہنچاتی ہے۔ جو اعصاب معدہ سے متعلق ہیں، وہ موسیقی سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ معدہ کی حرکت جو دل کی نبض سے مشابہ ہے درجۂ موسیقی کے مطابق قوی یا ضعیف ہوتی رہتی ہے۔ اس حرکت کا انتظام یا ابتری گانے کی حالت کی تابع بن جاتی ہے۔ یہ حقیقت محتاجِ انکشاف نہیں ہے کہ ہضم کا کام غدودوں اور عصبوں پر موقوف ہے اور یہ دونوں موسیقی سے بہت حد تک اثر پذیر ہوتے ہیں۔

موسیقی کا سکون بخش و خواب آور اثر مدتوں سے معلوم ہے۔ کون نہیں جانتا بچوں کو سُلانے کے لئے ماؤں کی لوریاں کس قدر کارگر و موثر ثابت ہوتی ہیں۔

ایک ڈاکٹر نے تو کم خوابی کے مریضوں کے لئے موسیقی کو مجرّب علاج بتایا ہو۔

۵ ● معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام کیجئے

معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی عادت بے شمار فوائد کی ضامن ہے۔

معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی عادت میں ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو دولت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہ سوتے جاگتے اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ جب اس کا معاوضہ ملنے لگتا ہے تو پیسہ اس طرح کھنچ کھنچ آتا ہے جیسے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ آگیا ہو۔

معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی عادت ہمیشہ فائدہ پہنچاتی ہے اور جب کام کرنے والے کو اس کا معاوضہ ملتا ہے تو وہ معاوضہ بہت بڑا اور بیش قیمت ہوتا ہے۔

جو لوگ معاوضہ سے زیادہ کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں اُنھیں برابر نئے نئے مواقع ملتے رہتے ہیں۔

جب انسان معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام کرتا ہے تو اُس میں بلا کا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بالکل بدل جاتا ہے، اُس کا اندازِ فکر بدل جاتا ہے۔ وہ اپنے ہم چشموں سے الگ ایک خاص شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔

معاوضہ سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی عادت سے خود اُس انسان پر جو کام کرتا ہے عجیب و غریب اثرات مرتّب ہوتے ہیں۔ اِس عادت سے اُن لوگوں کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچتا جن کے لئے کام کیا جاتا ہے۔ اُن سے زیادہ فائدہ وہی اُٹھاتا ہے، جو اپنے اندازِ فکر کو بدل کر آگے بڑھنے لگتا ہے۔ اِس عادت سے اُس کے اندر اقدام کی، آگے بڑھنے کی صلاحیتیں چمک جاتی ہیں۔ اُس میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔

ایمرسن نے لکھا ہے ـــــ "کام کرو ـــــ تمھارے اندر بے اندازہ قوت پیدا ہو جائے گی!"

۶ ● کامیابی کی محبوبہ

مشہور مفکر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ـــــ "جو لوگ بالغ ذہن اور ٹھوس رجحان کے مالک ہوتے ہیں، وہ دوسروں کے سہارے نہیں زندہ رہتے، وہ دوسروں کے دستِ نگر نہیں ہوتے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے بے جھجک اور پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اپنی قابلیت سے کام لیتے ہیں۔ اپنے بوجھ کو بغیر کسی کی مدد کے پوری طرح سنبھالے رہتے ہیں۔ اِس کے لئے نہ تو کسی کی مدد طلب کرتے ہیں اور نہ حرفِ شکایت زبان پر لاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کر سکتے ہیں، جو اُن کے اختیار و امکان میں ہوتا ہے، خود کرتے ہیں۔

کامیابی کی محبوبہ ایسے ہی لوگوں پر فریفتہ ہوتی ہے!!"

یہ خوش نصیبی کسی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ اُن خوش نصیبوں میں آپ بھی شامل ہو سکتے ہیں ـــــ کامیابی کی محبوبہ رنگ رُوپ، شکل و صورت، دولت و ثروت نہیں دیکھتی۔ وہ صرف اپنے لئے خلوص، اپنے لئے تڑپ دیکھتی ہے!

۷ ● نفسیاتی علاج

بہت سے لوگ نفسیاتی علاج پر یقین نہیں رکھتے لیکن جو لوگ اُس پر یقین رکھتے ہیں، اُس سے یقیناً فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ بیماری اور صحت کا جذبات و خیالات سے بہت گہرا تعلق ہے۔

دوسرے امراض اور آزار سے قطع نظر نظامِ ہضم کی تکالیف کو لے لیجئے۔ نظامِ ہضم کی تکالیف کا نفسیاتی علاج دَورِ جدید میں کافی ترقی یافتہ اور کامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ نفسیاتی طریقہ علاج اکثر و بیشتر مریضوں کو حیرت انگیز طور پر شفایاب کر دیتا ہے۔

بعض لوگ تو قبض کا یقیناً شکار ہوتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر محض خیالی قبض کے تصوّر ہی سے بیمار ہو جاتے ہیں۔ اشتہاری نوعیت کا لٹریچر قبض کشا ادویات کا عادی بنا دیتا ہے اور نتیجہ ظاہر ہے۔ آنتیں عارضی طور پر اپنے طبعی افعال سے دست کش ہو جاتی ہیں۔ نظامِ ہضم کی خرابیوں اور اُن کے نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کرنا اُن خرابیوں کی پرورش کے مترادف ہے۔ لاعلمی کی وجہ سے اکثر و بیشتر لوگ فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے دوا فروشوں کی خوش بیانی کا شکار ہو کر اشتہاری دوائیں خرید لیتے ہیں اور زندگی کا ایک طویل عرصہ غیر مفید گولیوں اور معجونوں کے استعمال میں گزار دیتے ہیں اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔

ہر تکلیف کے لئے مُستند اور سمجھدار معالج کا مشورہ ضروری ہوتا ہے۔

ساتھ ہی مریض کو اپنی علامات اور اپنی ذاتی زندگی کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اِس کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے کہ اگر اُس کی مجوزہ علامات اور نفسیاتی زندگی میں کوئی تعلق نظر آئے، جس کا نوّے فیصدی امکان ہے تو مریض کو خود ہی اپنی حالت کی نفسیاتی اصلاح شروع کر دینی چاہیے۔ اپنی زندگی کو منظّم کرتے ہی اُس کے نظامِ ہضم کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی اور وہ تکلیف جو اُس کی مسرّت اور صحت کا خون کر رہی ہے، یقیناً دُور ہو جائے گی۔

۸ ● آپ کا کردار!

آپ کا کردار آپ کی بہت بڑی طاقت ـــــ آپ کی بہت بڑی دولت ہے۔

انگریزی کی ایک مثل ہے ـــــ "اگر آپ نے روپیہ کھویا تو کچھ نہیں کھویا، ہمت گنوادی تو زندگی کے خزانے سے تھوڑی سی چیز کھودی لیکن اگر آپ نے کردار یا اخلاق کھو دیا تو آپ ہر چیز سے محروم ہو گئے۔"

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ کردار کی مثال کیمیا جیسی ہے جو مٹی کو سونا بنا سکتی ہے۔ کردار کے بغیر آپ مفلس ہیں۔ آپ کے پاس کوئی دولت نہیں اور نہ آپ کوئی دولت اِس سے بڑی اکٹھا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے جسم میں خون، گوشت اور ہڈیوں کے سوا کوئی چیز نہیں ہے اور اِن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ کردار ایک ایسی چیز ہے، ایک ایسی دولت ہے جسے آپ نہ خرید سکتے ہیں، نہ مانگ سکتے ہیں، نہ چوری کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنا کردار خود بنانا پڑتا ہے۔ اِسے آپ اپنے صحیح اندازِ فکر اور اپنی قوتِ عمل سے بنا سکتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اِس قیمتی سرمایہ کے حصول کا کوئی اور طریقہ، کوئی اور ذریعہ نہیں۔

۹● ہر خواب تعبیر آشنا ہو سکتا ہے

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــ "اگر آپ اپنی زندگی کا دامن کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے بھرنا چاہتے ہیں تو اپنا ایک واضح مقصدِ حیات بنائیے۔ انسان جب تک ایک واضح مقصدِ حیات نہیں بناتا، اُس کا ذہن یکسوئی سے ایک جانب متوجہ نہیں ہوتا۔ ہر طرف بھٹکتا رہتا ہے اور اُس میں اِتنے مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اُس سے کوئی قوت نہیں پیدا ہوتی بلکہ وہ انسان کی قوتِ فیصلہ کو کمزور اور بیکار بنا دیتا ہے۔

ایک مقصد کے لئے کام کرنے کی عادت آپ کے اندر فوری فیصلہ کرنے کی عادت ڈال دے گی اور یہ عادت زندگی میں ہر جگہ آپ کو مدد دے گی۔ اِس کے علاوہ کسی ایک نصب العین کو سامنے رکھ کر زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کی عادت سے آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ اپنی پوری قوتِ فکر کو اُس کام پر مربوط و مرکوز کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے ـــــ اِس طرح آپ جو چاہیں گے حاصل کر لیں گے۔ اس طرح آپ کا ہر خواب تعبیر آشنا ہو سکتا ہے۔

۱۰● عورت انسان کی سب سے بڑی قوت

عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے' یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مرد اپنی کمزوری، اپنی غلطی کو عورت کے سر ڈالتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عورت مرد کی سب سے بڑی طاقت ہے ـــــ عورت انسان کی سب سے بڑی قوت ہے۔

ایک مشہور مفکر نے لکھا ہے۔ عورت کا تعاون حاصل رہے تو انسان پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ سکتا ہے۔ عورت ہمیشہ سے انسان کو آگے بڑھانے کا سب سے بڑا ذریعہ رہی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی بیوی اُس کے کاموں میں برابر کی شریک ہے۔ جس کی بیوی اُس کے کاموں میں برابر کی شریک ہو، اُس کی کامیابی میں کوئی شک شبہ نہیں ہو سکتا۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہنری فورڈ، ایڈیسن، نپولین اور دوسرے بہت سے کامیاب انسانوں کی کامیابی کا راز وہ ذہنی آسودگی تھی جو شریکِ حیات کے خوشگوار تعلقات اور تعاون سے حاصل ہوتی ہے ـــــ اُن کی کامیابی کا راز زن و شوہر کا دماغی اشتراک تھا۔ بیوی شوہر کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور ہر وقت اُس کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ یہی قوت تھی جس نے انھیں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی معاشی تمدنی علمی ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

عبدالعلیم۔ جے پور

س۔ انسان کو صحیح زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے؟

ج۔ صحیح زندگی گزارنے والوں کے نقشِ قدم پر چل کر۔

س۔ غصّہ کو کس طرح ٹالا جائے؟

ج۔ غصّہ کے افسوسناک نتائج کا تصور کر کے۔

س۔ اُردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنا شروع کر دینا چاہیئے یہ کیا خیال ہے آپ کا؟

ج۔ اُردو کو دیوناگری رسم الخط دینا، اُردو کو موت کی وادی کی طرف لے جانا ہوگا۔ دیوناگری رسم الخط میں اُردو کی لطافتیں باقی نہیں رہ سکتیں۔

محمد شفیع الحسن۔ مدھ پورا (لہرسا)

س۔ راجہ مہدی علی خاں کہاں تک تعلیم یافتہ ہیں؟

ج۔ ہے ہے! زمانے نے وہ دن دکھائے کہ اب لوگ بھی راجوں مہاراجوں کی تعلیم پوچھنے لگے۔

س۔ ایڈیٹر "بیسویں صدی" جناب خوشتر گرامی کا اصلی نام اور اُن کی تعلیم و تربیت سے آگاہ کریں۔

ج۔ راجوں مہاراجوں سے احقر و کمتر خوشتر کا کیا جوڑ جو آپ راجہ مہدی علی خاں کے ساتھ اُس کا بھی نام اور تعلیم و تربیت پوچھ رہے ہیں۔

محمد حبیب کوثر۔ بوروا، بستی پور

س۔ اور وہ خاموش ہو گئی؟

ج۔ اور سینڈل بہنے لگے!!

س۔ زندگی کا کون سا حصّہ گرانقدر ہوتا ہے؟

ج۔ جوانی!

س۔ آدمی کی جیت کب ہوتی ہے؟

ج۔ جب وہ ہار کو بھی جیت بنا لینے کا عزم و عہد کر لیتا ہے۔

ایم۔ رحمان۔ دُھروا۔ رانچی

س۔ آرٹسٹ کی زندگی میں عورت کی کیا حیثیت ہے؟

ج۔ آرٹسٹ کی زندگی میں عورت کی بڑی اہمیت ہے۔ آرٹسٹ کو عورت سے روشنی ملتی ہے، اُس کے فن کو زندگی ملتی ہے۔

س۔ جب ظلم حد سے بڑھ جائے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ ظالم کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے۔

س۔ محبت شعلہ ہے یا شبنم؟

ج۔ محبت کا آغاز شبنم اور انجام شعلہ ہے۔

زیب النساء۔ ملکاپور، بلڈانہ

س۔ خوشتر بھائی! موجودہ جمہوری حکومت میں کیا کبھی اُردو کو اُس کا جائز مقام مل سکے گا؟

ج۔ جائز مقام ملنا تو دُور کی بات ہے، اُردو کو زندہ رہنے دیا جائے یہی بڑی بات ہوگی! اُردو کے حامی اُردو کی حق تلفی کے خلاف دبی زبان سے بھی احتجاج کرتے ہیں تو اُنھیں فرقہ پرست کہا جاتا ہے۔ کبھی ایسے ہی موقع پر اکبر مرحوم نے کہا تھا ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں

ش۔ ا۔ ہیرو، ابوعزیز

س۔ عورت کو اپنے حُسن پر ناز کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ عورت کو اپنے حُسن پر ناز ہونا چاہیئے۔

س۔ بڑھتی ہوئی عریانیت کا انجام کیا ہوگا؟

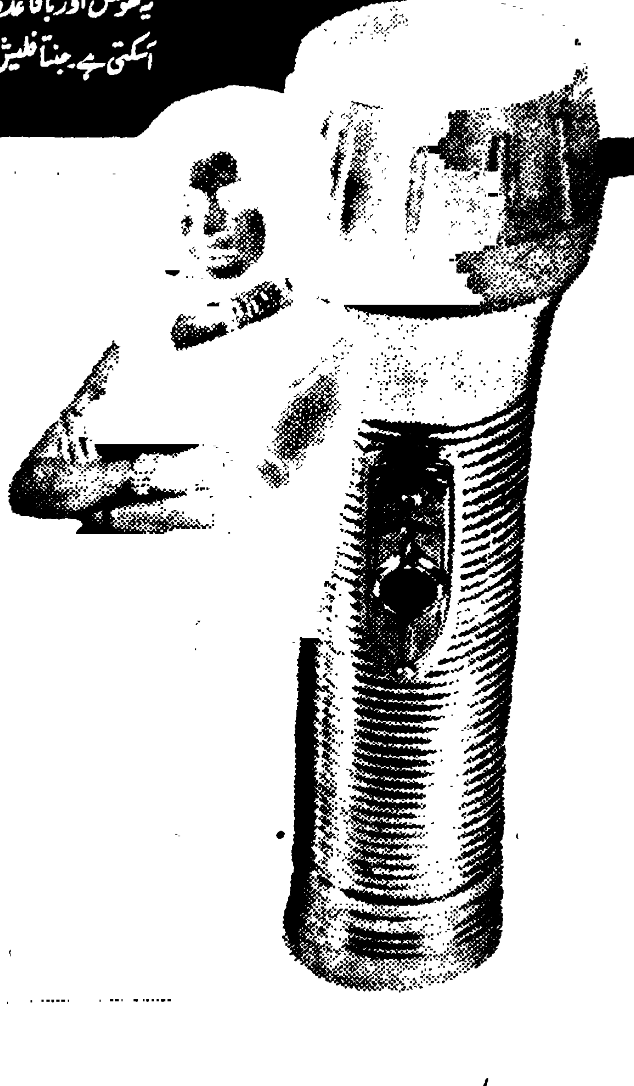
ج۔ عبرت ناک! کاش عریانیت پسند مرد اِس حقیقت کو سمجھتے!

بھروسہ کے لائق
فلیش لائٹ

JANTA

ایک جیپ پروڈکٹ

لیجئے ایک ایسی فلیش لائٹ جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ہمیشہ کارآمد ہونے نے اسے ہر جگہ ایک مثالی ساتھی بنادیا ہے۔ یہ ٹھوس اور باقاعدہ ہے۔ اور آپ کے آرائشی بیگ میں بہ آسانی آسکتی ہے۔ جنتا فلیش لائٹ کو ہمیشہ اپنے پاس رکھیں۔



SHERMAN ENTERPRISE

جیپ فلیش لائٹ
انڈسٹریز لمٹیڈ
۲۸۔ ساوتھ روڈ۔ الہ آباد۔ ۱

STERLING-GF-492

شرافت حسین شاننہ۔ فیض آباد

س۔ کسی ایسے رسالے کا نام بتایئے جس میں میرے پسندیدہ فن کار مثلاً شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیری، نور شاہ وغیرہ جلوہ گر ہوتے ہوں۔

ج۔ "بیسویں صدی"!

س۔ کیا ٹھاکر پونچھی صاحب "بیسویں صدی" سے رُوٹھ گئے ہیں؟

ج۔ ٹھاکر صاحب "بیسویں صدی" سے نہیں رُوٹھے ہیں، خود اپنے آپ سے رُوٹھ گئے ہیں۔

ایم۔ اسے خان۔ توڑیل

س۔ ایک اچھے ناول نگار کی پہچان؟

ج۔ ایک اچھا ناول نگار دوسروں کے فن کی بھی قدر کرتا ہے۔ دوسروں کے پلاٹوں کو بُرا نہیں سمجھتا۔ نہایت خندہ پیشانی و فراخدلی سے انھیں اپنا لیتا ہے۔

س۔ ایک شعر سُنئے ؎

تم صل روتے ہی رہتے تو بُجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا دیتے ہیں

اب آپ کچھ سُنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

جو آگ لگائی تھی تم نے اُس کو تو بُجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

عبدالرّؤف۔ پربھنی

س۔ کسی ایسی کتاب کا نام بتایئے جس سے شاعری سیکھنے میں مدد ملے۔

ج۔ مکتبہ "سیاسی دُنیا" دہلی سے "فنِ شاعری" نامی کتاب منگوا کر مطالعہ کیجئے۔

س۔ دُنیا میں خوش نصیب کون ہے؟

ج۔ جسے خدا نے نیک دل، نیک مزاج عطا فرمایا ہے۔

س۔ دُنیا سے مجبوری اور غریبی کب ختم ہوگی؟

ج۔ جب اِس کے لئے غریب جد و جہد کریں گے۔

وجیہہ احمد خاں رتناسی سہسرام

س۔ ہندوستان کا مستقبل؟

ج۔ بے حد شاندار!

س۔ ادب برائے زندگی یا ادب برائے ادب؟

ج۔ ادب برائے زندگی۔

شیخ امیر پروانہ۔ کریم نگر (آندھرا)

س۔ محبت کے عالمی الیکشن میں ووٹ زیادہ عشق کو ملیں گے یا حُسن کو؟

ج۔ حُسن کو! اِس لئے کہ آج کا ہر مرد دل پھینک ہے۔

حافظ عبدالوقت۔ ایم اے، ایل ایل بی

س۔ جُرم اور سزا کا فاصلہ؟

ج۔ بندہ نواز! آپ ایل۔ ایل بی ہیں، وکیل ہیں اور جُرم و سزا کا فاصلہ ہم سے پوچھ رہے ہیں۔

س۔ قدرت اور انسان کے قوانین کا فرق؟

ج۔ قدرت کے قوانین امیر، غریب، حاکم و محکوم سب کے لئے یکساں ہیں۔ انسان کے قوانین امیروں کے لئے کچھ اور ہیں، غریبوں کے لئے کچھ اور۔ حاکم کے لئے کچھ اور ہیں، محکوموں کے لئے کچھ اور!

س۔ وکالت آپ کی نظر میں؟

ج۔ ایمانداری سے کی جائے تو بُرا پیشہ نہیں لیکن ایمان دار وکیل ناکام وکیل ہوتا ہے۔

ایف۔ ایف۔ آکولہ

س۔ ساحرؔ کمیونسٹ، شکیلؔ کانگریسی اور کیا راجہ مہدی علی خاں جن سنگھی ہیں؟

ج۔ راجہ مہدی علی خاں سب کے سنگی (ساتھی) ہیں اور مُدیرِ "بیسویں صدی" کے محبوب ہیں۔

س۔ "اربابِ حکومت اپنے گھروں میں اُردو ہی بولتے ہیں" جب آپ نے کہا ہے تو سو فیصدی یقین کرتا ہوں۔ کیا آپ یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ اِس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہیں؟

ج۔ اعتراف کیسے کر سکتے ہیں؟ اور بہت سے حقائق کی طرح اِس حقیقت سے بھی وہ انکار کرتے ہیں۔ اربابِ حکومت کے قول اور عمل میں تضاد نہ ہوتا تو مُلک کی یہ حالت کیوں ہوتی!؟

ریحانہ وسیم جمشید پور

س۔ ادب کا افادی پہلو۔۔۔؟

ج۔ تعمیر و ترقی۔ ادیب کو ادب کا افادی پہلو نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔

س۔ زندگی کی ترجمانی کسی خوبصورت شعر سے کیجئے۔

ج۔ حادثات ایک طرف موت بھی شرما جائے
زندگی اپنی حقیقت سے خبردار تو ہو

ایم۔ ظہیر سیتامڑھی

س۔ نیتاؤں کی نیند کب حرام ہو جاتی ہے؟

ج۔ جب الیکشن قریب آجاتا ہے۔

شوکت علی۔ ایم۔ اے۔ لاہور

س۔ "ماڈرن گرلز" عریانی، سینما بینی اور فیشن پرستی کی جانب کیوں اِس قدر مائل ہیں؟

ج۔ مردوں کی بے راہ روی نے عورتوں کو بھی اُس رنگ میں رنگ دیا ہے۔

ایم۔ کمال جاجموی۔ کلکتہ

س۔ غریبوں کی عزّت امیروں کے ہاتھوں کب تک نیلام ہوتی رہے گی؟

ج۔ جب تک غریب غریب رہیں گے، جب تک غریب امیروں کے زیرِ دست رہیں گے۔

س۔ آہ کی آواز اور سِکّے کی آواز میں کون بلند ہوتی ہے؟

ج۔ سِکّے کی آواز سے ہر آواز دب جاتی ہے۔ بیچاری آہ کس شمار میں ہے۔

جمال الدین ساحلی۔ کریم نگر

س۔ بیتی یادوں میں تلخی کیوں ہوتی ہے؟

ج۔ ہر بیتی یاد تلخ نہیں ہوتی۔ یادیں شیریں بھی ہوتی ہیں۔

س۔ منزل نہ ملے تو؟

ج۔ آپ چاہیں تو منزل آپ کے قدموں میں آ سکتی ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎
عزم راسخ کو مرے ہر گام پر منزل ملی!

حسین الحق۔ سہسرام

س۔ خوش رہو بھیا! جب انسان غم و آلام سے تنگ آجائے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ غم کو خوشی بنا لے۔

س۔ "محبت ایک فریب ہے" یہ جانتے ہوئے بھی انسان یہ فریب کیوں کھاتا ہے؟

ج۔ فریب کھانا انسان کی فطرت ہے۔

س۔ آپ "بیسویں صدی" کو اِتنا حسین کیسے بناتے ہیں؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے قلم کاروں اور قارئین کے پُرخلوص تعاون سے۔

عدیل کاظمی۔ سرینگر

س۔ آپ دوسروں کی گھریلو زندگی تو عریاں کر دیتے ہیں لیکن اپنے چہرے سے کبھی نقاب نہیں ہٹاتے، کیوں؟

ج۔ آپ یہ فرماتے ہیں اور دوسرے کہتے ہیں ؎
بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم!

س۔ اگر ایک رات کے لئے آپ کو ہند کا پرائم منسٹر بنا دیا جائے؟

ج۔ رات کی رات اُردو لکھنے اور بولنے کو ممنوع قرار دے دیں گے! وزارت کی گدی پر بیٹھ کر اُس کا احترام تو کرنا ہی ہوگا۔

محمد شمس محروم۔ پورنیہ

س۔ حکومت یا انسان کب بربادی کا شغل اختیار کرتا ہے؟

ج۔ جب فہم و تدبر سے محروم ہو جاتا ہے۔

ذاکر عابدی۔ الہیور سٹی

س۔ "بیسویں صدی" میں میں نے بار بار پڑھا ہے کہ کسی کو معاف کر دینا اچھی بات ہے لیکن آپ غلام محی الدین خضر دہلوی کے خلاف کب تک لکھتے رہیں گے؟

ج۔ ہم نے تو اُس محسن کش احسان فراموش کو معاف ہی کر دیا ہے۔ اُس نے "بیسویں صدی" کے ہزاروں روپے غصب کر لئے ہیں۔ ہم اُن کا مطالبہ کرتے ہیں نہ مقدمہ چلاتے ہیں۔ اُس رُوسیاہ، فریب کار، اُس جعلساز اعظم سے دوسروں کو بچانے اور خبردار کرنے کے لئے ہم بیسویں صدی میں اُس کے متعلق برابر اعلان کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

محمد ذاکر احمد۔ عادل آباد

س۔ عورت کا حقیقی حُسن شرم و حیا ہے اور مرد کا؟

ج۔ شجاعت و مردانگی۔

س۔ زندگی بسر کرنے کے لئے چند ایسے اصول بتلایئے جن میں پھول بھی تر و تازہ رہے اور خوشبو بھی برقرار رہے۔

ج۔ یہ جاننے کے لئے "بیسویں صدی" کی "صحت و زندگی" کے زیرِ عنوان حیات افروز اشارات و مقالات پڑھا کیجئے۔

الیاس احمد قریشی۔ مراد آباد

س۔ چین پھر گھس بیٹھ کر رہا ہے۔ پھر جارحیت پر آمادہ ہے۔ اُس کے پاس کتنی فوج ہے، جو ہماری سرحد پر بھاری تعداد میں فوجیں جمع کر رہا ہے؟

ج۔ برطانوی فوجی تحقیقات کے شعبہ کے ماہرین کی رپورٹ کے مطابق چین کی ہتھیار بند فوج کی تعداد ۲۲ لاکھ ۲۶ ہزار ہے۔

س۔ پچھلے دنوں چین نے ہندوستان پر اپنی بھیڑیں اُٹھا لے جانے کا جو الزام لگایا تھا، کیا وہ صحیح تھا؟

ج۔ اُس نے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لئے یوں ہی الزام لگایا تھا۔ خوئے بد را بہانۂ بسیار!

شاداں نسرین۔ مظفر پور

س۔ فیض کا کوئی حسین شعر سنایئے۔

ج۔ سُنیئے

ہوتی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

س۔ آج کل انسان انسان کا دشمن کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسان انسان نہ رہا

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا


میرے رنگ روپ کی دلکشی لکس کی بدولت
شرمیلا ٹیگور
LUX
TOILET SOAP



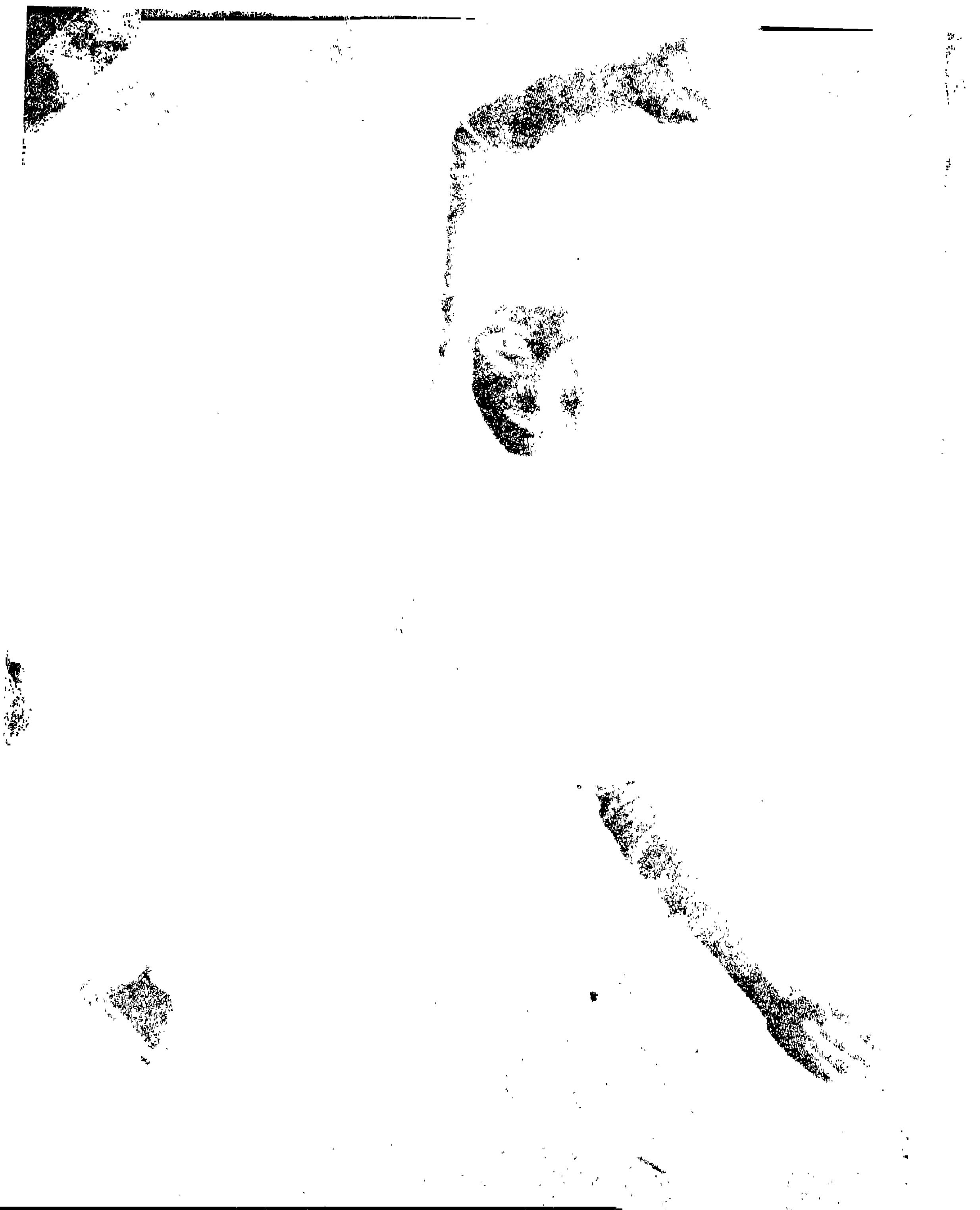
swin Sadi

ELHI



ہر آن وہ رگ رگ میں چٹکتی ہوئی کلیاں

اُس شوخ کی اِک ایک ادا بول رہی ہے ـــــــــ فراقؔ



شفق کی، گُل کی، بجلیوں کی شوخیاں لیے ہوئے

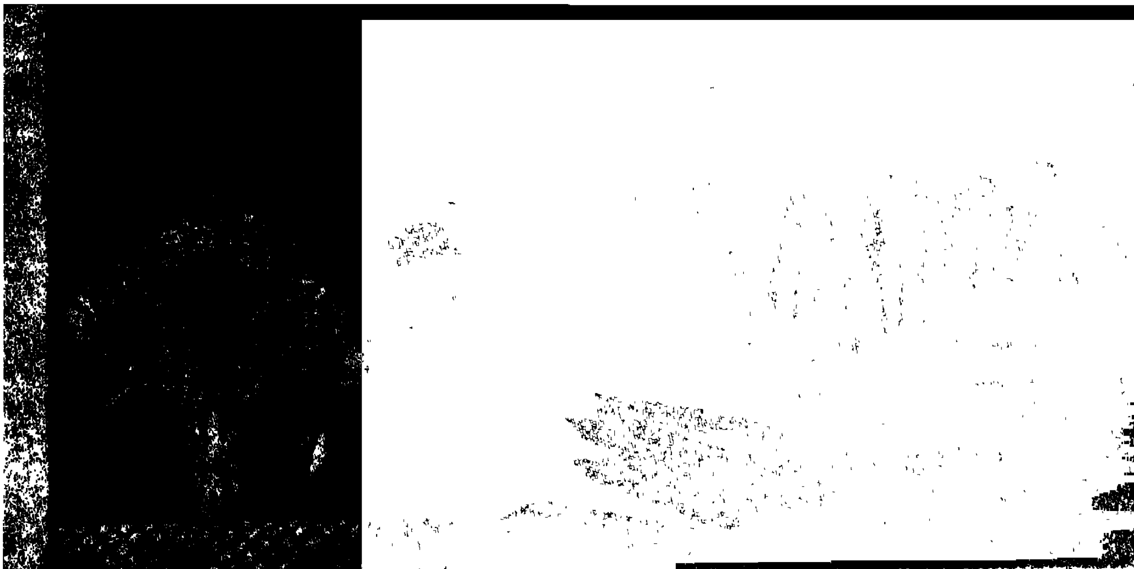


ع ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

مُدیرِ بیسویں صدی، نائب صدر جمہوریۂ ہند محترم ڈاکٹر ذاکر حسین سے شرفِ نیاز حاصل کرنے پہنچے تو عالی جناب ڈاکٹر صاحب نے حسبِ عادت خندہ پیشانی اور گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے دَورانِ گفتگو میں پُوچھا ــــ "آپ کی اور بیسویں صدی کی کامیابی کا راز کیا ہے؟"



مدیرِ "بیسویں صدی" نے چائے کی میز پر ڈاکٹر صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا —— "صبح سے شام تک چکّی پیستا ہوں تاکہ "بیسویں صدی" باقاعدگی سے شائع ہو، اس کے مضامین انسانیت اور وطن کی بہبودی سے متعلّق ہوں اور وہ سرزمینِ ہند و پاک میں بہتر سے بہتر انسانی خدمت انجام دے سکے۔ عام پرچوں کی ادبی عیاشی کے برخلاف ملکی مسائل پر بحث کرنا، صحت اور سائنس کے مفید مضامین قارئین تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ انسانیت کی خدمت میرا ایمان ہے اور آپ کی طرح میرا مذہب بھی انسان دوستی ہے۔"



حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے انجمن ترقی اُردو دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ جلسے [illegible] کی جنرل سکریٹری بیگم حمیدہ سلطان صدرِ جلسہ جناب فخرالدین علی احمد مرکزی وزیر برقیات کو جلسے کا پروگرام پیش [illegible] ہوئے — صدرِ جلسہ نے صدارتی تقریر میں فرمایا: "اُردو کو اُس کا جائز حق ملنا چاہئے [illegible] کے تحت اُردو کو شامل کیوں نہیں کیا گیا؟"

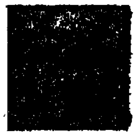


اسی جلسے میں دلی کی ہردلعزیز شخصیت لالہ شام ناتھ نائب وزیرِ ہند نے بھی شرکت فرمائی۔ آپ [illegible] "اُردو دلی کی زبان ہے اور قومی یکجہتی میں اس کا نہایت اہم حصہ ہے۔ اُردو کو اُس کا [illegible] ملکی مفاد کا تقاضہ بھی ہے۔"

بیسویں صدی

جون ۱۹۶۶ء

ایڈیٹر: خوشتر گرامی



ٹیلیفون دفتر ۔۔۔۔۔۔ ۲۷۱۹۴۳
ٹیلیفون رہائش ۔۔۔۔۔۔ ۲۱۹۹۲۴

[illegible] سالانہ قیمت [illegible]
سال [illegible] عام نمبروں کے علاوہ دو عظیم الشان [illegible] خاص نمبر
[illegible] ہوتی ہے۔

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ
پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶

[illegible] [redacted] [illegible]

ملنے کا پتہ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر [illegible]

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"ناگاؤں کو ان کی تخریبی سرگرمیوں کا دندان شکن جواب دیا جائے" وزیراعظم سے مطالبہ ——— وزیراعظم خود نہ دے سکیں تو کسی ماہر دندان ساز کی خدمات حاصل کریں۔

"اس وقت سماج میں صرف امیر آدمی کی عزت ہوتی ہے" ایک تبصرہ ——— ... کیا غریبوں کی جو جن کے پاس نہ ایٹ ہوم کو پیسہ نہ لنچ کے لئے نوٹ۔

"کانگریس کی شکست تک زندہ رہنا چاہتا ہوں" راجہ جی کی تمنا ——— تب تو راجہ جی شریشٹ لکھوانا ہوگا۔

"قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں" ایک عنوان ——— زمین والے شکر گزار ہوں کہ آسمان سے بات چیت کا ایک سلسلہ تو قائم ہوا۔

"اٹلی میں ریڈی میڈ کپڑوں کی نمائش" ایک خبر ——— دِلّی میں ہو تو ریڈی میڈ لیڈروں کی نمائش ہو۔

"کانگریس برانڈ سوشلزم بوگس" راجہ جی کی تقریر ——— اِس پر راجہ جی کا لیبل لگ جائے تو اصلی ہو جائے گا۔

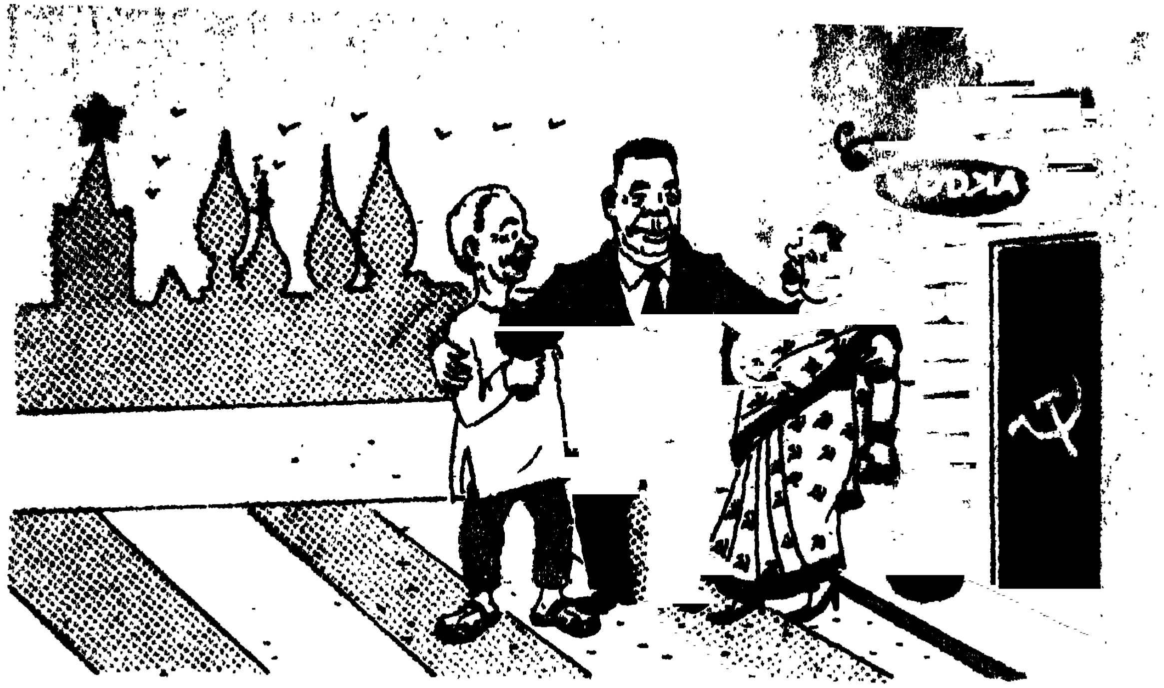
"دِلّی کے چڑیا گھر میں ایک اور سفید شیر" ایک خبر ——— اور دِلّی کے جنگل میں ہزاروں سفید ہاتھی۔

"دِلّی میں جرائم گھٹ گئے" ایک خبر ——— مگر صرف اخلاقی، سیاسی رہ گئے ہیں۔

"کاشت کے لئے بجلی" ایک عنوان ——— جو بطور بیج استعمال ہوگی۔



"پنجاب کی تقسیم کے بعد بھی کانگریس ہی برسرِ اقتدار آئے" کامریڈ رام کشن



ہندوستانی کمیونسٹوں میں ملاپ کرانے کی کوششیں۔ دونوں گروپوں کے لیڈر ماسکو میں" ایک خبر

"فرقہ پرستوں کو سر اُٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی" ہ صادق کی وارننگ ـــ لیکن اگر انھوں نے پاؤں پھیلائے تب؟

"پولس افسر کے گھر چوری" ایک خبر ـــ رپٹ لکھوانے میں دشواری نہ ہوئی ہوگی۔

"پنجاب کی دونوں نئی اسٹیٹوں میں کانگرس کا راج ہوگا" ایک عنوان ـــ یعنی کامراج کا راج ہوگا۔

"دہلی میں بیوپاریوں کی کھوٹ کے خلاف اندولن چلانے کا فیصلہ" ایک خبر ـــ بیوپاریوں کے ساتھ سیاسی لیڈروں کی کھسوٹ کو بھی شامل کیا جائے۔

"شوہروں کی صحت کی محافظ بیویاں" ایک عنوان ـــ شوہروں کو نہ دھمکائیں گی اور نہ اُن کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالیں گی کہ اُن کی صحت خراب ہو۔

"جالندھر میں اِستری میلن ہوگا" ایک خبر ـــ اِس لئے دھوبی اپنی اپنی اِستری وہاں پہنچا دیں۔

"قیمتوں میں یکسانیت پیدا ہوگی" ایک عنوان ـــ یعنی آٹا دال، جوتا ٹوپی، نون تیل لکڑی سب ایک بھاؤ ملے گا۔

"امریکن سرکار کانگرسی لیڈروں کی گدیاں بچا رہی ہے" راجہ جی کا بیان ـــ یعنی امریکن سرکار سوتنتر پارٹی سے بے وفائی کر رہی ہے۔

"خچروں کی خرید میں شدید بے ضابطگیاں" ایک عنوان ـــ یوں کہئے کہ زبردست گدھاپن۔

"عظیم ترین امریکی جہاز گیہوں لا رہا ہے" ایک خبر ـــ کیا [illegible] پیٹ سے بھی بڑا ہے۔



* کانگریس کو ہٹا سکتے ہو تو ووٹ سے ہٹاؤ، تشدد سے نہیں ہٹے گی " کامراج

* "[illegible] کسٹوڈین کی دستے شاہی" ایک عنوان ——— کہ انہیں [illegible]
[illegible] سے جاری ہے۔

---

* "دلی میں مکانوں کا مسئلہ" ایک عنوان ——— دلی میں اسمبلی بنانے
کے مسئلے سے زیادہ اہم ہے۔

---

* "افسران کی لاپروائی" ایک عنوان ——— وزیروں کی بے پروائی
کا نتیجہ۔

---

* "شرح مزدوری میں اضافہ کے لئے کمیشن کا قیام" ایک خبر ——— تاکہ وہ
کمیشن کھا سکے۔

"اناج کی دوکان پر روپیہ خورد برد" ایک خبر ——— غنیمت ہے
اناج بچ گیا۔

"انڈونیشیا سے چینی سفیر کی واپسی" ایک خبر ——— خیر سے بدھو
گھر کو آئے۔

"ایجی ٹیشن اور بند مصائب لاتے ہیں" ایک عنوان ——— مگر عوام
کے لئے، لیڈروں کی تو دوکانیں چمک اٹھتی ہیں۔

"بمبئی میں کایا کلپ کا تجربہ" ایک عنوان ——— مرارجی بھائی
فائدہ اٹھائیں۔

"تم عوام کے حاکم نہیں، خادم ہو" سرکاری ملازموں کو وزیرِ خزانہ کی
تلقین ——— اور حاکم بیچارے وزیر لوگ ہیں۔ کچی نوکری والے آج ہیں کل نہیں۔

"یو۔پی کے ۴½ سو دیہات میں پینے کے پانی کا قحط۔ راشننگ کر دیا گیا" ایک
عنوان ——— وزیر پاور و آبپاشی امریکہ سے پانی منگانے کا پربندھ کریں۔ امریکہ کھانے
کو دیتا ہے تو پینے کو بھی ضرور دے گا۔



"روپوش ناگالینڈ لیڈروں سے بات چیت صحیح سمت میں چل رہی ہے" اندرا گاندھی

"امن کی تلاش" ایک عنوان ــــ بذریعہ ڈنڈا۔

"پانی پت کے حالات" ایک عنوان ــــ جنھیں پڑھ کر ہر شریف آدمی پانی پانی ہوگیا۔

"اُردو یونیورسٹی قائم کی جائے" جمیعتہ علماء کے سالانہ اجلاس میں قرارداد ــــ اجی جناب! پہلے پرائمری درجوں میں تو اُردو تعلیم کا بندوبست کرالیجئے۔ یونیورسٹی تو پھر دیکھی جائے گی۔

"دِلّی کانگریس کا ناراض گروپ کھُل کر سامنے آگیا" ایک خبر ــــ اور مہادِلّی بنے نہ بنے اُس کی ناراضگی مہاناراضگی بن گئی۔

"پولیس اور ڈاکوؤں کے مقابلے میں چوکیدار مجروح" ایک خبر ــــ اور پولیس اور ڈاکو صحیح سلامت رہے، بیچارہ بے گناہ رگڑا گیا۔

"پاکستان میں مکھی مار سوسائٹی کا قیام" ایک خبر ــــ ہندوستانی تیس مار خاں بھی توجہ کریں۔

"خشک سالی کا علاج" ایک عنوان ــــ امریکی گندم!

"ہندوستان میں امریکہ کے مقابلے میں زمین زیادہ اور پیداوار کم" ایک خبر ــــ یہ ہیں سوشلزم کے کھیل۔

"سیل ٹیکس کی مخالفت سے کاروبار ٹھپ ہو جائے گا" ایک عنوان ــــ پھر کاروبار کو بڑھانا ہے تو سیل ٹیکس کی مخالفت فوراً بند کرو۔

"دِلّی کانگریس کو پھٹکار" ایک عنوان ــــ پھٹکار کے بعد کہا

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

"کیرالہ میں کانگریس الیکشن سمجھوتہ نہیں کرے گی" ایک خبر ـــــ بلکہ الیکشن کے بعد گورنمنٹ بنانے کے لئے توڑ جوڑ کرلے گی۔

"جے پرکاش نرائن کی نئی تحریک" ایک عنوان ـــــ پرانی تحریکوں کی ناکامی کے بعد۔

"کالے دھن پر ڈھائی کروڑ انکم ٹیکس" ایک عنوان ـــــ وہ ادا کردیا جائے تو سارا سفید ہوجائے گا۔

"حوض رانی کے لوگوں میں ناراضگی" ایک خبر ـــــ تالاب راجہ آئیں اور دور کریں۔

"ایک ہزار من گندم جل گئی" ایک خبر ـــــ اسے پسواؤ اور ستو اڑاؤ۔

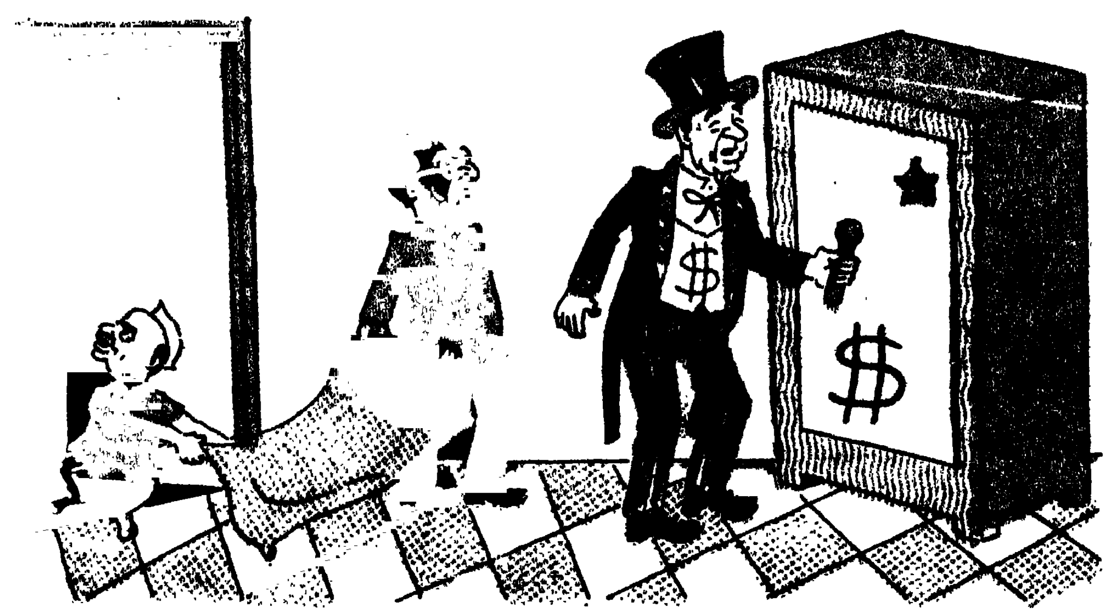
"جن سنگھ ہریانہ کی سب سے بڑی پارٹی" ایک خبر ـــــ بزعمِ خود۔

"چاؤ ماؤ کے جیتے جی صلح ناممکن" ایک مقالہ ـــــ مہاراج امن ناممکن۔

"مغربی بنگال ڈی۔ آئی۔ آر کے خاتمے کے حق میں نہیں" ایک عنوان ـــــ اس لئے کہ اس کے بغیر حکومت کا ٹٹو نہیں چلتا۔

"کانگریس نے پنجابی صوبہ مان کر فرقہ پرستوں کی چودھراہٹ ختم کردی" ایک عنوان ـــــ اسی لئے جن سنگھ والوں کے یہاں صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔

"جن سنگھی ممبر کا عہد" ایک عنوان ـــــ اب کبھی جن سنگھ کا رُخ نہ کروں گا۔



"امریکہ سے توہین آمیز شرائط پر امداد نہ لی جائے" کے۔ ڈی۔ مالویہ کی تقریر

صدر کانگرس ——————

خوشتر گرامی

جو کھدر کی لنگی اور ڈھیلے ڈھالے کھدر کے کرتے میں ملبوس دوہرا بدن، کندھے پر رومال ڈالے، موٹے نک نقشے، بڑی بڑی مونچھوں، موٹے دانتوں اور ہیبت ناک شعلہ بار آنکھوں اور لداخ کی سرزمین کی طرح بے بال و گیاہ کھوپڑی والا نظر آئے سمجھ لیجئے وہی ہیں ——————



شری کامراج

نام اور کام میں اسم با مسمیٰ۔ کامراج بھی اور کام دیو بھی۔ سچ مچ وہ کام کر ڈالے جو پریوں کی کہانیوں میں دیو کیا کرتے ہیں۔ آج کل بادشاہت نہیں جمہوریت ہے۔ جمہوریت میں وزیر بنا کرتے ہیں۔ جس پر مہربان ہوئے اُس کے وارے نیارے ہو گئے۔ وزارت کا تاج سر پر رکھا گیا۔ قہر کی نظر ڈالی تو مرارجی ڈیسائی بنا ڈالا۔

ایک دفعہ نہ جانے کیا دل میں سمائی، کچھ پنڈت جی کے کان میں پھونکا۔ خود بھی کام (وزارت) سے گئے اور بہت سے دوسروں کو لے کر —— ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے کی تفسیر ہو گئے —— اور یہیں سے کام راج —— کا آغاز ہوا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ سامراج کے بعد رام راج ہو۔ وہ تو نہ ہو سکا مگر —— کام راج ہو گیا۔ دیکھو تو خود کچھ بھی نہیں۔ لیکن سبھی کچھ ہیں۔ غیر سرکاری ڈکٹیٹر ہیں۔ سُنتے سب کی ہیں۔ اپنی دل میں رکھتے ہیں اور بولتے ہیں تو مخاطب یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے کہ

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

شہناز

پروفیسر حامدی کاشمیری۔ ایم۔ اے

بہوری کدل۔ سری نگر

۲۵ فروری ۶۶ء

برادرِ مکرم! خلوص بے پایاں

کل آپ کا خط ملا، یہ جان کر سارے گھر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی کہ گُڈّی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ اللہ ہماری گُڈّی کی آئندہ زندگی کامران و شادماں بنائے۔ آمین! ——— حضورِ والا! یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ سری نگر پہنچ کر میں آپ کو خط نہ لکھتا۔ جموں سے سری نگر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے آپ کو ایک طویل خط لکھا۔ تعجب ہے وہ آپ کو نہ ملا۔ خیال ہے اب مل گیا ہوگا۔ سری نگر میں موسم کی خرابی کی وجہ سے ڈاک کا نظام درست نہ رہا ——— ہم لوگ خیریت سے ہیں۔ اکثر آپ کی اور بھابی صاحبہ کی محبت اور خلوص کی یاد آتی ہے۔ میں اپنا تحقیقی مقالہ اب چھپوا رہا ہوں۔ نصف سے زیادہ کی کتابت ہو چکی ہے۔ میرا خیال ہے وسط مارچ تک چار مطبوعہ کاپیاں یونیورسٹی والوں کو پیش کر دوں گا۔ اس سلسلے میں بہت مصروفیت رہی اور ذہنی پریشانی بھی! شکر ہے اب یہ بوجھ میرے ذہن سے اُتر رہا ہے ——— مجھے افسوس ہے کہ میں حسبِ وعدہ جموں سے افسانہ نہ بھیج سکا۔ کل آپ کے خط نے مجھے جھنجوڑ ڈالا اور رات گئے تک میں نے افسانہ کو مکمل بھی کیا اور اسے فیر بھی کیا۔ لیجئے قبلہ افسانہ حاضر ہے۔ عنوان "شہناز" ہے۔ میرا خیال ہے عنوان کی طرح افسانہ بھی خوبصورت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ . . .

آپ کا بھائی ——— حامدی کاشمیری

میں نے اوور کوٹ کے لمبے کالر اوپر اُٹھا لئے اور اجنبی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

برف کے بڑے بڑے سپید گالے شام کے ٹھٹھرے ہوئے، رینگتے ہوئے سایوں کو تیزی سے چھپا رہے تھے۔

شام اپنے سایوں کو سمیٹنے میں ناکام ہو رہی تھی۔

مینٹل ہسپتال میں سارا دن مریضوں سے نمٹنے کے بعد میں ذہنی تھکاوٹ سی محسوس کر رہا تھا اور اب اپنے کمرے میں سٹوو کے پاس بیٹھ کر آرام کرنا چاہتا تھا لیکن ایک ڈاکٹر کی قسمت میں آرام کہاں؟ بے چارہ اجنبی کل بھی مایوس ہو کر لوٹا تھا کیونکہ میں ایک پیشنٹ کو دیکھنے گیا تھا اور آج جونہی نوکر نے بتایا کہ کل والا آدمی پھر آیا ہے تو فوراً احساسِ فرض نے آواز دی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے اُس کے ساتھ ہو لیا۔

گلی سے باہر سڑک کے کنارے اجنبی کی کار تازہ برف سے ڈھکی ہوئی ہماری منتظر تھی۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب!" اُس نے پہلی بار زبان کھولی۔

"چلئے"

ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور ڈرائیور نے جلدی سے کار سٹارٹ کی۔

کار چھت کی نحیف سی زرد روشنی میں کوئی پُرانا ماڈل معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی دیواروں پر سیاہ دھبّے پڑے ہوئے تھے اور سیٹ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ معاً اجنبی نے سیاہ اوور کوٹ کی اندرونی جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ مجھے پیش کیا۔ سگریٹ سُلگاتے ہوئے میری نظر اُس کے چہرے پر اُٹھی۔ چہرے کا نصف سے زیادہ حصّہ کوٹ کے سیاہ کالروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مجھے ایک موٹی سی عینک ——— اور

دو لمبی مونچھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

کار برف اور پانی کے طوفان کا سینہ چیرتی ہوئی شہر کے بازاروں کو پیچھے چھوڑ کر نئی کالونی کے کشادہ راستے پر بھاگی جا رہی تھی۔ سگریٹ کی راکھ سامنے سیٹ کے ساتھ لگے ہوئے ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے میں نے پُراسرار اور گمبھیر خاموشی کو توڑ دیا۔

"اور کتنی دُور جانا ہے؟"

"شاہ آباد!"

"شاہ آباد؟"

"جی ہاں!"

اجنبی کے اس مختصر سے جواب سے میں چڑ سا گیا۔ اُس کے دو حرفی جواب میں بھلا شاہ آباد تک کی لمبی مسافت کیسے سمٹ سکتی ہے؟

"پیشنٹ کو کیا تکلیف ہے؟"

"آپ خود ملاحظہ کر لیجئے گا۔"

میں خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔

خاموشی گہری ہو گئی۔

برف کے اُڑتے ہوئے گالے اب شام کی پھیلتی ہوئی گھنی تاریکی میں تحلیل ہو رہے تھے۔

اتنے میں کار ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ ہم کار سے اُترے۔ ڈرائیور بھی جلدی سے اُترا اور ہمارے آگے آگے ٹارچ دکھانے لگا۔ ہم ایک بلند و بالا کوٹھی کے سامنے آئے۔ نوکر نے جھٹ سے گیٹ کھول دیا اور اجنبی مجھے ٹاٹ بچھی ہوئی سیڑھی کے اوپر ایک وسیع برآمدے سے ایک کشادہ کمرے میں لے گیا جہاں ایک صوفہ سیٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی اور بہت ہی پُرانے زمانے کا ایک بڑا ایرانی قالین بچھا تھا۔

صوفہ سیٹ پر بیٹھتے ہی اجنبی نے مجھ سے کہا۔

"بیٹھئے، میں ابھی آیا۔"

میں بیٹھا رہا۔ مریض کمرے میں نہیں تھا۔ وہ مریض کو لانے گیا ہوگا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میں نے بے چینی میں گھڑی دیکھی۔ پانچ منٹ گزر چکے تھے ۔۔۔ پانچ طویل منٹ! وہ کہاں غائب ہو گیا، اور مریض ۔۔۔ ؟ کمرے کے باہر برآمدے پر کوئی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی اور ادھر سردی کی ظالم لہریں میرے جسم کے اندر گھسنے لگی تھیں۔ عجیب لوگ ہیں ۔۔۔ لیکن یہ کون سا طریقہ ہے؟

میں نے جھنجھلا کر سگریٹ سلگایا۔

اتنے میں اجنبی کمرے میں آیا اور صوفہ پر بیٹھتے ہی بولا۔

"معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب! مجھے کچھ دیر ہو گئی۔" اُس کے گمبھیر لہجے میں عجیب سراسیمگی تھی۔ وہ رُک رُک کر بول رہا تھا۔ ہر لفظ اُس کی سانس سے اُلجھ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ لیکن پیشنٹ کہاں ہے؟"

"پیشنٹ ۔۔۔ ؟" اُس نے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا اور اُسے اپنے چہرے پر پھیرنے لگا۔

میں نے اُس کے چہرے کو بغور دیکھا۔ ایک مخنی سا چہرہ جس پر لکیروں کا جال بُنا ہوا تھا۔

"تو فرمائیے، کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"مجھے!؟ مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ۔۔۔" وہ سانس کے پھندے سے لفظوں کو چھڑاتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! بات یہ ہے کہ میری بیٹی شہناز ۔۔۔ وہ میری پہلی بیوی کی یادگار ہے، کوئی دو سال سے کسی مینٹل ٹربل کی شکار ہے۔ بہت علاج معالجہ کروایا۔ باہر کے ڈاکٹروں سے بھی علاج کروایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ لڑکی کا معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بات پھیل نہ جائے۔ لیکن ۔۔۔ لیکن مجھے اُمید ہے آپ کے علاج سے وہ اچھی ہو جائے گی۔ آپ کی قابلیت اور شرافت کے بارے میں بہت کچھ سُن چکا ہوں۔ آپ ۔۔۔ آپ فیس کی فکر نہ کیجئے ۔۔۔ اور ہاں میں اپنا تعارف کرانا بھول ہی گیا۔ مجھے سراج الدین کہتے ہیں۔"

"سراج الدین اینڈ کمپنی آپ کی فرموں کا نام ہے؟"

"جی ہاں!"

"اچھا تو ۔۔۔"

"آیئے، میں آپ کو شہناز سے ملاتا ہوں۔"

برآمدے سے گزرتے ہوئے برفیلی ہوا میرے جسم کو کاٹتی ہوئی گزر گئی اور جب میں سراج الدین کے پیچھے دروازے پر سے رنگین پھولوں والا حسین پردہ اُٹھا کر کمرے کے اندر آ گیا تو معاً مجھے محسوس ہوا کہ میں عہدِ وسطیٰ کے کسی رنگین، معطر اور سجے سجائے محل سرا میں آ گیا ہوں۔ سب سے پہلے مجھے کمرے میں ایک لطیف اور آسودگی بخش گرمی کا احساس ہوا اور پھر برقی قمقموں سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی جگمگاہٹوں سے میری آنکھیں روشن ہو گئیں۔ کمرے میں عبیر و گلاب کی خوشبو کی لہریں سی اُٹھ رہی تھیں جن میں نسوانی جسم کی مخصوص مہک بھی شامل تھی۔

میں کھو سا گیا۔

دوسرے لمحے ہم دونوں ایک قیمتی اور نرم صوفے پر بیٹھ گئے

"ڈاکٹر صاحب! یہ شہناز ہے ـــــ اور یہ ہیں ڈاکٹر اشرف۔ حال ہی میں انگلینڈ سے آئے ہیں۔"

میں نے دیکھا سامنے کی جھلملاتی ہوئی منقّش دیوار کے پاس ایک آرام کرسی پر شہناز بیٹھی ہے۔ ایک قیمتی شال اُس کے سر کے اُلجھے ہوئے، چمکتے ہوئے بالوں سے پنسل تراش کے سڈول شانوں پر بے ترتیبی سے پڑی ہے۔ وہ ایک موٹا سُرخ رنگ کا سوئٹر پہنے ہوئے تھی۔ بالوں کے اُلجھے ہوئے گچھے اُس کے ماتھے پر جھول رہے تھے۔ بہت ہی کم عمر معلوم ہوتی تھی وہ۔ اُس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں گھنی پلکوں کے سائے میں جاگتی راتوں کا خمار کسمسا رہا تھا اور اُس کے رخساروں کا سونا ماند پڑ چکا تھا۔

عہدِ وسطیٰ کی رنگین محل سراؤں کی یہ شہزادی غرور اور تمکنت کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔ اُس نے ہماری طرف ایک نگاہ بھی نہ اُٹھائی۔ وہ بالکل بے نیازی کے عالم میں اپنے نچلے ہونٹ کی آتشیں لکیر کو سفید دانتوں سے کاٹتی رہی۔

"ڈاکٹر صاحب! میں چلتا ہوں۔ فیکٹری کے کچھ کاغذات چیک کرنے ہیں۔ آپ شہناز سے باتیں کیجئے۔"

وہ چلا گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میں رنگینیوں، خوشبوؤں اور جگمگاہٹوں کی اِس خوابناک دُنیا میں تنہا رہ گیا۔ میں سوچنے لگا ـــــ میں اپنی خوبصورت پیشنٹ سے کس طرح خطاب کروں۔ میں نے سگریٹ سُلگایا اور نزدیک کے صوفہ پر آ بیٹھا۔

"میں آپ کا نام پُوچھ سکتا ہوں؟"

خاموشی ـــــ

"سُنیئے!"

"جی!" وہ تیوری چڑھا کر بولی۔

"میں نے آپ کا نام پُوچھا تھا۔"

"آپ کو میرے نام میں کیا دلچسپی ہے؟" وہ برہم ہوئی۔

"بس یونہی ـــــ آپ نے ابھی سُنا کہ میں ڈاکٹر ـــــ"

"ڈاکٹر ـــــ؟ اور یہاں کون آسکتا ہے؟ لیکن خواہ مخواہ زحمت کی آپ نے!"

میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور منقّش چھت کی طرف دُھویں کے دائرے چھوڑتے ہوئے بولا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ ابھی ابھی نیند سے جاگی ہیں۔"

"میں سوئی کب تھی؟"

"اچھا تو آپ سوئی نہیں تھیں؟"

"جی نہیں!" وہ تیزی سے ہونٹوں کی آتشیں لکیر کو سفید دانتوں سے کاٹتی رہی۔ اُس کے چہرے پر اضطراب اور غصّے کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

"شہناز صاحبہ!"

خاموشی۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو پینٹنگ سے خاصی دلچسپی ہے۔" میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ دیواروں پر ابسٹریکٹ آرٹ کے نمونے ایک تھرڈ کلاس مذاق کے ـــــ"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"جی ـــــ؟"

"جی ہاں!"

"اچھا یہ بتائیے، آپ کی طبیعت ناساز رہتی ہے؟" میں نے بہت سنجیدگی سے اچانک سوال کیا۔

"جی؟" وہ جیسے چونک گئی۔ اُس نے ایک بھرپور نگاہ سے مجھے دیکھا۔ یہ نگاہ برہمی اور اُکتاہٹ لیے ہوئے تھی۔ اُس میں ایک چونکے ہوئے آہو کی معصومیت تھی ـــــ!

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ دماغی طور پر ٹھیک نہیں رہتیں؟" میں نے تیر نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر راست گفتاری سے کام لیا۔

"جی ـــــ؟" وہ اچانک زخم کھائی ہوئی شیرنی کی طرح بپھر گئی۔ "یہ سب جھوٹ ہے، بکواس ہے ـــــ یہ سازش ہے میرے خلاف! ـــــ تم سب لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ پاگل کتّے نے کاٹا ہے کیا؟ تم ڈ... نہیں قاتل ہو ـــــ میں پاگل نہیں ہوں، میں پاگل نہیں ہوں ـــــ دُور ہو جاؤ میری نظروں سے! تم مجھے پاگل بنانا چاہتے ہو ـــــ میں کہتی ہوں چلے جاؤ ـــــ!!"

وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ اُس کے سارے جسم پر شدید رعشہ طاری ہو گیا۔

اِتنے میں باہر سے سراج الدّین آ گئے۔ وہ ابھی تک اُسی لباس میں تھے۔ اُنھوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

شہناز مُسلسل چیخوں کے بعد نڈھال سی ہو گئی تھی اور سر کو دونوں ہتھیلیوں میں لئے سسک رہی تھی۔

"سراج الدّین صاحب!"

"جی فرمائیے!"

"مجھے اب اجازت دیجئے۔ میں کل پھر آؤں گا۔ آپ کی بیٹی جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ اِس وقت اِنھیں تنہا ہی چھوڑ دیجئے ـــــ"

اور جب میں سراج الدین کے ساتھ کمرے سے نکلا تو شہناز کی سسکیاں اب بھی سُنائی دے رہی تھیں۔

دوسرے دن جب میں وہاں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ سراج الدین ایک ضروری کام سے دولت آباد چلے گئے ہیں، جہاں اُن کی دو فیکٹریاں چلتی ہیں۔ کمرے کو پار کرکے میں شہناز کے کمرے کی طرف چلا۔ پردہ اُٹھا کر جب میں کمرے میں آیا تو میں نے دیکھا، کمرہ مدّھم سے سبز رنگ میں نہایا ہوا طلسمی خوابوں کا سماں پیش کر رہا تھا اور شہناز صوفہ پر بیٹھی ہوئی بالوں کو جدید ترین فیشن کے مطابق گوندھتے ہوئے حُسن و شباب کی ایک رنگین مورتی نظر آ رہی تھی۔

"آئیے، ڈاکٹر صاحب! آئیے!"

"اوہ! یہ آپ کہہ رہی ہیں —— شکریہ!" میں مقابل کے صوفہ پر بیٹھ گیا۔

"آپ نے مجھے بہت انتظار کروایا" یہ کہہ کر اس نے انگریزی رسالہ پھینک دیا اور ایک طویل انگڑائی لی۔

"انتظار؟"

"جی ہاں! میں جانتی تھی کہ آپ پھر آئیں گے۔ آپ کو تو آنا ہی تھا۔ یہ سب پیسے کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ انسان مجبور ہے، مجبور ——"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ سے پہلے بھی ڈاکٹر آتے اور موٹی موٹی فیسیں ہضم کرکے چلے گئے! اور آپ کے بعد بھی آئیں گے۔ کمال یہ ہے کہ وہ لاکھ منع کرنے پر بھی آتے ہیں ——" یہ کہہ کر اس نے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔

"شہناز صاحبہ! دیکھئے آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔ آپ کی مرضی ہے تو میں ابھی واپس چلا جاتا ہوں!"

"میری مرضی تو یہ تھی کہ آپ بھول کر بھی اِس گھر میں قدم نہ رکھتے!"

"جی؟"

"یہ گھر گھر نہیں جہنم ہے۔ یہاں آگ کے سانپ لہراتے ہیں پھن پھیلائے ہوئے، چھوٹے بڑے سانپ —— یہ سانپ مجھے ڈراتے ہیں، مجھے پیار کرنے آتے ہیں، پیار ——؟ سانپوں کا پیار! وہ مجھے ڈسنا چاہتے ہیں۔ میرے جسم کے روئیں روئیں کو ڈسنا چاہتے ہیں تاکہ میری رگ رگ میں زہر پھیلے۔ اُف! میرے اللہ، میں کہاں جاؤں؟ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ میں چیخنا چاہتی ہوں۔ میں رونا چاہتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اُس کی نرگسی آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہہ رہے تھے۔

اُس کے رخساروں سے جیسے سارا خون اُڑ گیا!

"بھئی! کمال کرتی ہیں آپ؟ سچ مچ رونے لگیں —— اور یہ آنسو ——" میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ ایک عجیب سی اُلجھن تھی۔ یُوں تو میں عورت کے آنسوؤں کے بہت سے مظاہرے دیکھ چکا تھا اور میں ذہنی طور پر اُن آنسوؤں کے پیچھے چھپے ہوئے محرکات کی تلاش کرتے ہوئے کہیں دُور نکل جایا کرتا لیکن یہاں میں ایک عجیب سی اُلجھن کا سامنا کر رہا تھا۔ شہناز کی نرگسی آنکھوں سے جھر جھر بہتے ہوئے آنسو میرے احساس کے کسی عمیق گوشہ کو چھو رہے تھے۔ ہمدردی اور پیار کا ایک انوکھا سا جذبہ میرے دل میں اُبھر رہا تھا۔ اچانک میں اُٹھا اور میں نے کھڑے کھڑے اُس کی آنسوؤں سے تھرتھراتی پلکوں پر رومال رکھ دیا۔

اُس نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اپنی پلکیں بند کر لیں اور آنسوؤں کے آبدار موتی پلکوں کی جھالروں سے اُبھر اُبھر کر باہر نکلے۔ میں نے وہ موتی بھی احتیاط اور شائستگی کے ساتھ رومال میں جذب کئے اور شہناز آنکھیں بند کئے جیسے گہری نیند میں کھو گئی۔

"آپ سو گئیں شاید؟" میں اپنی جگہ آن بیٹھا۔

"نہیں تو ——" اُس نے آنسوؤں سے دُھلی ہوئی بڑی بڑی شگفتہ آنکھیں کھولیں۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں کے شبنمی لمس سے برگِ گلاب کی طرح کھِل اُٹھا۔

"سوچ رہی ہوں" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟"

"یہی کہ آپ ڈاکٹر نہیں انسان معلوم ہوتے ہیں"

"تو کیا ڈاکٹر انسان نہیں ہوتا؟"

"نہیں! جب تک ڈاکٹر ڈاکٹر ہوتا ہے انسان نہیں ہوتا اور وہ عموماً ڈاکٹر ہی رہتا ہے" اُس کا لہجہ بدل گیا۔

"آپ بڑی منطقی معلوم ہوتی ہیں"

"میں تو صرف اپنا تجربہ بیان کر رہی ہوں"

"آپ اِس چھوٹی سی عمر میں تجربوں کا خزانہ معلوم ہوتی ہیں"

"چھوٹی عمر —— آپ نے بھی خوب کہی" اُس کی آنکھوں کی شبنمی فضاؤں میں تبسّم کی ایک کرن پھوٹ نکلی۔

"تو کیا آپ بہت ایجڈ ہیں؟"

"اور نہیں تو!"

"یہی کوئی فارٹی ففٹی؟"

"اِس سے بھی زیادہ ——" وہ اچانک سنجیدگی سے بولی: "ڈاکٹر صاحب! عمر کا جسم سے نہیں دل سے پتہ چلتا ہے"

"میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس پھول سے بھی زیادہ نازک جسم کے اندر جو دل ہے وہ بوڑھا ہوگا۔"

"آپ کے یقین نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور دیوار کے ساتھ لگے ہوئے سوئچ کو آن کیا۔ کمرہ تیز روشنی سے جگمگا اُٹھا۔

"آپ کو سردی نہیں لگتی؟" میں تیز روشنی میں ایک چُست سفید سوتی سوٹ میں اُس کے سڈول جسم کے خوبصورت خطوط کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فرش پر بچھے ہوئے پھولدار قالین پر کیٹ واک کی طرح قدم اُٹھاتی رہی۔

"جی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں نے کہا، آپ کو اِس سرد سُوٹ میں سردی تو محسوس نہیں ہوتی؟"

"جی نہیں! جلتے ہوئے خیال جسم ہی کیا، سارے ماحول میں آگ بھر دیتے ہیں۔"

"آپ شاعروں کی طرح باتیں کرتی ہیں۔"

"میں شاعروں سے نفرت کرتی ہوں۔" وہ بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنی سفید ہتھیلیوں پر اپنی لمبی ٹھوڑی کو سہارا دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"معاف کیجئے، آپ نے تعلیم کہاں تک پائی ہے؟" میں نے اچانک سوال کیا۔

"آپ کو اِس سے کیا دلچسپی ہے؟" اُس کے تیور بدل گئے۔

"بس یونہی جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ آپ تو ماشاء اللہ سکالر ــــــ"

"سکالر! آپ تعلیم ادھوری چھوڑنے پر میری انسلٹ کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ آپ مجھے ضدی کہیں گے۔ خبطی اور پاگل! اور اِس طرح مجھے ٹریٹ منٹ کرنے کا موقع نکالیں گے۔ آپ ڈاکٹر ہیں نا؟ میرے لئے انجکشنوں کے کورس تجویز کریں گے اور قیمتی دوائیں ــــــ اور کچھ نہیں تو میرے دماغ کے لئے شاک تجویز کریں گے۔ اِس لئے کہ میں پاگل ہوں ــــــ چوبیس گھنٹے اِس قید خانے میں رہتی ہوں۔ راتیں جاگتے جاگتے کاٹتی ہوں۔ ڈراؤنے خواب دیکھتی ہوں، تاریک غاروں میں دھکیلی جاتی ہوں اور نیچے ہی نیچے، بہت نیچے پاتال کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہوں ــــــ اُف ــــــ!"

اچانک اُس کی آنکھیں بوجھل سی ہوگئیں۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور ہونٹ کانپ گئے۔

"لیکن میں تو صرف آپ کی کالج لائف ــــــ"

"میں نے کب کالج چھوڑ دیا، مجھے یاد نہیں ــــــ میرا ماضی دَم گھونٹ دینے والے اندھیروں کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ میں اندھی ہوگئی ہوں ڈاکٹر صاحب! مجھے کچھ سُجھائی نہیں دیتا۔ یہ اندھیرا ــــــ چاروں طرف پھیلا ہوا مہیب اندھیرا مجھے ڈس رہا ہے۔ مجھے بچائیے، ڈاکٹر صاحب! میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں۔ یہاں کوئی میرا اپنا نہیں۔ ممی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں اور ــــــ" وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں اپنے پروفیشن کی نزاکتوں کو بھانپ کر اور کسی انجانے جذبے سے مغلوب ہو کر اُس کے قریب آگیا۔

"کتنے حسین دن تھے وہ بھی۔" شہناز جیسے گنگنا رہی تھی۔ "کالج کی سہانی فضاؤں پر جنّت کا گمان ہوتا تھا۔ میں کالج کے ہر فنکشن میں پیش پیش ہوتی۔ ڈبیٹنگ کلب کی میں سکریٹری تھی اور کالج میگزین کی ایڈیٹر بھی میں ہی تھی۔ لڑکیاں مجھے بیوٹی کوئین کہتی تھیں اور میرے لباس کا ہر نیا انداز لڑکیوں کے لئے فیشن بن جاتا۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئندہ زندگی کے کتنے حسین خواب دیکھتی!" اُس نے ایک لمبی سانس لی۔

"پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا، وہی جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ایک دن میں دیر سے کالج سے لوٹی۔ کالج کے ڈرامیٹک کلب کی طرف سے پیش کئے گئے ڈرامے میں میں ہیروئن کا رول ادا کر رہی تھی۔ ڈیڈی خلافِ معمول میرے انتظار میں تھے۔ اُنھوں نے پہلی بار دیر سے آنے پر مجھے ٹوکا اور پھر اُن کے یہ الفاظ سُن کر میں چکرا گئی۔ "میں آج ہی تمھاری شادی کی بات پکّی کر کے آیا ہوں۔ ایک لکھ پتی آدمی کا اکلوتا بیٹا ہے اور شادی اگلے مہینے کی ۲۵ تاریخ کو ہو رہی ہے" ــــــ ڈیڈی اعلان کر کے چلے گئے ــــــ" وہ تھوڑی دیر رُک کر پھر بولی۔ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "اور مجھے خوابوں کے جُھلستے ہوئے کھنڈرات سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں میں چھوڑ دیا۔" وہ کھانسنے لگی۔

"اور میں آج بھی اُس کڑوے اور کثیف دھوئیں میں گھری ہوئی ہوں ــــــ" وہ پھر کھانسنے لگی۔ جیسے واقعی وہ ایک سجے سجائے، قوسِ قزحی رنگوں سے نکھرے ہوئے معطّر کمرے کی بجائے کسی جلتے ہوئے مکان کے ملبے سے اُٹھتے ہوئے دُھوئیں میں گُھٹ رہی ہو۔

"۲۵ تاریخ کو میری شادی ہو رہی تھی۔ وہ دن آ ہی گیا اور مجھے قسمت کے آگے جُھکنا ہی پڑا۔ میں دُلہن بنی بیٹھی تھی اور سہیلیوں کے مذاق کا نشانہ بن رہی تھی۔ گھر کی چہل پہل شباب پر تھی۔ عورتیں لہک لہک کر گیت گا رہی تھیں۔ برات کے آنے کا وقت ہو رہا تھا لیکن برات نہیں آ رہی تھی۔ برات دو گھنٹے لیٹ ہوگئی۔ گیت تھک سے گئے۔ سرگوشیاں تیز ہونے لگیں اور پھر ماموں جان روتے ہوئے یہ خبر لے کر آئے کہ راستے میں اُسی کار کو حادثہ پیش آیا ہے جس کار میں دولہا سوار تھے ــــــ" اچانک اُس کے جسم پر ایک شدید اینٹھن طاری ہوئی اور وہ چیخنے لگی۔

"سب جانتے ہیں کہ میں نے دولہا کو نہیں مارا۔ میری شادی نہیں ہوئی۔ میرا کوئی شوہر نہیں ــــــ پھر مجھے یہاں کیوں قید کیا گیا ہے؟ مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔

یہ زہریلی تنہائی ——— میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ گھومنا چاہتی ہوں ———"

"لیکن آپ کو روکا کس نے ہے؟"

"مجھے ——— روکا کس نے ہے؟" وہ کچھ یاد کرنے لگی۔ "کسی نے نہیں۔ لیکن میری قسمت! یہ ری قسمت ہی میرے پاؤں کی زنجیر ہے اور میں ڈیڈی کے کندھوں پر بوجھ بنی بیٹھی ہوں۔ مجھے موت بھی نہیں آتی لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ بھی کس ذکر کو لے بیٹھے۔ آپ ضرور مجھے پاگل بنائیں گے۔ آپ بھی کتنے بے رحم ہیں۔ میرے زخموں کو کتنی بے دردی سے کریدتے ہیں۔ کیا میں انسان نہیں ہوں؟"

اُس کا لہجہ رُندھ گیا تھا اور پلکوں کی نوکوں پر نازک سے موتی لرزنے لگے تھے۔

"آئیے ڈاکٹر صاحب! چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"ابھی آیا۔" میں نے جلدی سے نوٹس مکمل کر کے ڈائری جیب میں رکھ لی۔

"آج تو آپ نے مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ بخدا میں اب بھی Sleepy محسوس کرتی ہوں۔" شہناز مسکرا کر بولی۔

"سچ؟"

"جی ہاں! مجھے آپ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ آپ کی آنکھوں میں جادو ہے۔ جادو ———! مجھے تو تن بدن کا ہوش نہیں رہا۔"

"اور آپ کو معلوم ہے آپ کی بے ہوشی کتنا کام کر گئی۔"

"نہیں تو!"

"یوں سمجھ لیجئے میری آنکھوں کے سامنے آپ کا دل آئینہ ہو گیا اور میں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو آپ کہہ نہ پائی تھیں۔"

"آپ تو واقعی جادوگر ہیں ڈاکٹر نہیں!" وہ شرمائی۔

"میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ آپ خود سب کچھ کہتی رہیں۔"

"سچ؟ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کاش میں ٹیپ لایا ہوتا ——— ہپناٹائز (Hypnotize) ہونے پر انسان کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہے، دلچسپ ہوتا ہے۔"

"لیکن آپ کو کسی کے پوشیدہ راز جاننے کا حق کس نے دیا؟"

"آپ نے اور کس نے؟" میں مسکرایا اور میں نے شہناز کا چھوٹا سا نرم حنا آلود ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُس کے ساتھ چلتا ہوا برآمدے میں آیا، جہاں ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں ٹیبل پر سجائے گئے چائے کے سامان پر رقص کر رہی تھیں۔

"آپ سے اب کیا پردہ ہے ڈاکٹر صاحب!" شہناز نے میری پیالی میں چینی گھولتے ہوئے کہا۔ "منیر کے بعد میں نے کبھی اور مرد سے اتنی [illegible] نہیں [illegible] جتنی آپ سے کر رہی ہوں۔"

"جی!" میں اُس کے دوشیزہ رخساروں کے قوسِ قزحی رنگ [illegible]

"منیر میرا چچازاد بھائی تھا اور بچپن سے ہم [illegible] کھیلتے [illegible] پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے سے لڑتے بھی تھے، پیار بھی کرتے تھے اور ——— [illegible] میں نے آپ کو بتایا ایک دن جب وہ رات گئے تک میرے کمرے میں رہا، ہم نے [illegible] زندگی کے کتنے منصوبے بنائے۔ میرا سر منیر کی گود میں تھا اور منیر میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا لیکن ——— ہمارے خواب جلد ہی بکھر گئے۔ ڈیڈی کے فیصلے کو کون بدل سکتا تھا؟ لیکن آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ منیر پر کیا گزری۔ شادی کی تاریخ سے پہلے ہی وہ سرحد پار کر گیا اور جب سے وہ لاپتہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں وہ کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں آپ نے پہلے بھی بتایا تھا۔ اُس کے غم میں اُس کی والدہ بھی انتقال کر گئیں۔"

"لیکن مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ منیر کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہوگا۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمام عمر میرا انتظار کرے گا! اور معلوم ہے آپ کو، منیر اپنے وعدے کا پکا ہے!"

شہناز کے لہجے میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ اُس کا سارا وجود پھر لاشعوری بہاؤ کی گرفت میں آنے لگا تھا۔ اِس لئے میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"شہناز!" میں نے بڑی ملائمت سے کہا۔

لیکن وہ خاموش رہی اور ٹیبل پر چائے کی پیالی کو بھول کر دانتوں سے اپنے نوکیلے ناخن کاٹنے لگی۔

"شہناز! اتوار کے پروگرام کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"اتوار؟" جیسے وہ نیند سے جاگ پڑی۔

"جی ہاں!"

"پارک ویو چلیں گے اور وہیں شام گزاریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

"بہت اچھا خیال ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب!" اچانک اُس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ "میں سوچتی ہوں آپ کتنی تیزی سے میرے خیالوں پر چھاتے جا رہے ہیں۔ جب سے راتوں کی نیند دوبارہ نصیب ہوئی ہے، ساری رات آپ کے ساتھ گھومتے گزرتی ہے۔"

میں نے اُس کی شبنمی آنکھوں کو پیار سے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں کے شبنمی سایوں کے پیچھے خواہشوں کے کتنے ویرانے سُلگ رہے تھے!

لگاتار چھ مہینے تک شہناز کو Therapy دینے کے بعد میری تشخیص مکمل ہو چکی تھی اور میں اپنی سیکیارٹی سے مطمئن سراج الدین کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ [illegible] کے بعد آئے تو میں نے انھیں یقین دلایا کہ شہناز کی ذہنی [illegible] دور کر سکتی [illegible] انھیں سمجھایا کہ شہناز کو ماضی کے اندھیروں سے باہر نکالنا ہوگا اور اُسے [illegible] کی اہمیت کا احساس دلانا ہوگا اور ایسا کرنے کے لئے انھیں جلد سے جلد [illegible] کے لئے ایک اچھے ذی فہم تعلیم یافتہ لڑکے کا انتخاب کرنا ہوگا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب!" سراج الدین نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ [illegible] وہ شادی کے لئے رضامند ہی نہیں ہوتی۔"

"وہ اب راضی ہو جائے گی۔ آپ بے فکر رہئے۔"

"ایک بات کہوں آپ سے؟" سراج الدین کے لہجے میں ایک عجیب احساسِ مجبوری جھلک رہا تھا۔

"کیا؟"

"شہناز کی بات کہیں ٹھہرتی ہی نہیں۔ کئی جگہوں پر منگنی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ لڑکے والے لڑکی کے بارے میں سُنی سُنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں اور اگر وہ اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے لڑکی کو دیکھنے آتے ہیں تو شہناز پر دورہ پڑ جاتا ہے [illegible] اور کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ اب اُس کے دماغی دَوروں کی بات اتنی پھیل گئی ہے کہ کوئی میری بچی کا نام بھی نہیں لیتا ـــــ" سراج الدین نے ایک گہری سانس لی۔ جیسے عمر بھر کا بوجھ اُن کے سینے سے اُتر چکا ہو۔

"شہناز کے ٹھیک ہونے پر یہ ساری باتیں ختم ہو جائیں گی۔"

وہ خاموش تھے۔ اُن کی مونچھوں کے سفید بال پھڑپھڑا رہے تھے۔ دن کی کُنکنی دھوپ میں اُن کے سر کے اُلجھے اُلجھے چھوٹے چھوٹے بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر بیچارگی اور مایوسی کا تاریک سایہ پھیل گیا تھا۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ لوگوں کی زبانوں پر کیسے تالے ڈال دئے جائیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہاں ہر بات افسانہ بنتی ہے۔ بیچاری شہناز کے بارے میں کیا کیا نہیں کہتے۔ یہ ڈائن ہے! شادی کے دن دولہے کو کھا گئی۔ اس پر پریوں کا سایہ ہے۔ بڑی مغرور ہے۔ زمین پر قدم نہیں ٹھہراتی۔ یہ شادی کیا کرے گی۔ کلب میں اس کے دوستوں [illegible] ہے کیا۔ کتنی باتیں، کتنے افسانے ـــــ!!

نان سنس!

اُس شام کو جب میں فرائڈ کے نظریۂ جنس اور جنسی جبلّت کے اسرار و رموز پر اپنا آخری لکچر دے رہا تھا۔ شہناز کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے سے اُبھرنے لگے۔

اُس کی دراز پلکیں جھکنے لگیں۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگی اور سبز ریشمی قمیص میں [illegible] سینے کے ارتعاش سے قوسِ قزح سی پھوٹنے لگی۔ میں پوری توجہ سے اُس کے جذباتی ردِّ عمل کو مارک کر رہا تھا اور میری تشخیص مکمل ہو رہی تھی۔ اچانک وہ اُٹھی۔ ایک عجیب نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی اور میرے قریب آئی۔ میں وقت کی نزاکت کو محسوس کر چکا تھا اس لئے میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دائیں ہاتھ میں اُس کا کانپتا ہوا ہاتھ لے لیا۔ میں ایک عجیب سی اُلجھن میں پھنس گیا۔ شہناز کی منتشر سانسوں کی کنواری خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی اور اُس کا پھول سا جسم میرے جلتے ہوئے ہاتھوں کی ـــ لیکن ـــ لیکن میں نے ہمیشہ اپنے پروفیشن کے اصولوں کو سرِ بلند رکھا ہے۔ میرے کردار میں اس سے نازک ترلمحوں میں لغزش نہیں آئی ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا احساسِ فرض میرے سارے وجود پر چھا کر رہ گیا۔

"شہناز!" میں نے منتشر حواس کو جمع کرتے ہوئے کہا۔

"جی!" وہ خود سپردگی کے عالم میں تھی۔

"اب میں چلتا ہوں!"

"اتنی جلدی ـــــ؟"

"آج مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

"کس بات کی؟"

"تم اب ٹھیک ہو رہی ہو۔"

"یہ سب آپ کی وجہ سے ـــ" اچانک اُسے کچھ یاد آیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"ڈاکٹر صاحب!"

"فرمایئے!"

"آپ اب میرے اتنے قریب آگئے ہیں کہ میں ـــــ میں کبھی کبھی عجیب سی باتیں سوچنے لگتی ہوں۔"

"کیا سوچتی ہیں؟"

"ایسی باتیں سوچتی ہوں جو ــــ جو آپ کے بتلانے کی نہیں ہیں، سمجھے؟"

"میں کچھ نہیں سمجھا۔"

"جب سے میں آپ کے گھر گئی اور بیٹی قدسیہ کو دیکھا۔ کتنی پیاری بچی ہے۔ گھر کا سارا کام کرتی ہے اور پڑھتی بھی خوب ہے، میں بار بار ایک ہی بات سوچتی ہوں ـــــ"

"پھر وہی سوچ ـــــ" میں نے جان بوجھ کر موضوع کا رُخ بدل دیا۔ "کتنی بار کہہ دیا کہ بیکار سوچوں میں نہ اُلجھا کیجئے۔ فرصت کے وقت مطالعہ کیجئے اور ـــــ"

"اچھا ڈاکٹر صاحب! جو حکم ہو ـــــ اور ہاں کل کس وقت آئیں گے؟"

"سات بجے۔"

"او، کے!"

اور جب میں وہاں سے چل دیا تو میرا ذہن بوجھل سا تھا۔

اِس عرصے میں شہناز کے گھر والوں سے اور خاص کر شہناز سے میں بے حد مانوس ہو چکا تھا۔ شہناز تیزی سے روبصحت ہو رہی تھی۔ کئی بار ہم نے سراج الدّین کے ساتھ چائے پی۔ شہناز چائے سرو کرتی رہی۔ سراج الدّین دل ہی دل میں میری کامیابی سے مطمئن تھے۔ شہناز پر اِس عرصے میں کوئی دَورہ نہیں پڑا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے جسم کا رنگ نکھر اُٹھا تھا اور گوشت کی ایک ہلکی سی تہہ اُس کے جسم پر چڑھ گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اور ایک آدھ مہینے میں اُس کی دماغی حالت نارمل سطح پر آجائے گی۔ وہ میری ہر بات کو مقدم سمجھتی اور واقعہ یہ ہے کہ وہ میری شخصیت سے بے حد متاثر ہو چکی تھی۔ شہناز کی سوتیلی ماں سے بھی میں متعارف ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ تر کچن ہی میں رہتی اور نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا اُس کا کام تھا۔ شہناز سے اُس کا سلوک روایتی سوتیلی ماؤں سے بہتر تھا۔ اِس لئے میرے مشورے پر سراج الدّین نے شہناز کو اُس سے الگ ہی رکھنے کا بندوبست کیا تھا۔

شام ہو رہی تھی اور میں حسبِ وعدہ شہناز سے ملنے جا رہا تھا۔ گیٹ پر سراج الدّین سے ملاقات ہوئی۔ وہ کسی کام سے باہر جا رہے تھے۔ وہ شہناز کی صحت سے مطمئن اور اُس کے رویئے سے خوش تھے۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ کل شام کو وہ اُن کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی۔ سراج الدّین نے میرے کان میں یہ بھی کہا ـــــ "شہناز کی بات ایک اچھے گھرانے میں طے ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ میں شہناز کے کمرے میں آیا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔

"شہناز!" میں نے آواز دی۔

"آیئے ـــــ اندر آیئے۔" ملحقہ کمرے سے شہناز کی آواز آئی۔ میں ہچکچایا۔ یہ کمرہ تو اُس کی خواب گاہ ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میں اندر آیا۔ کمرہ بے حد حسین تھا۔ آرائشی سامان سے آراستہ اور قدِ آدم آئینے کے ساتھ ریشمی بیڈ شیٹ سے ڈھکے ہوئے بیڈ پر شہناز شب خوابی کے باریک حریری لباس میں ملبوس ایک آسمانی حور کی طرح لیٹی تھی۔ میں رُکا، جھجکا۔

"معاف کیجئے ـــــ"

"آیئے ڈاکٹر! ـــــ میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا لہجہ نیندوں کے نشے سے چُور تھا۔ اُس کے سیاہ ریشمی بال اُس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔

"میں اِس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔ بس آپ کو دیکھنے آیا تھا ـــــ" میں نے کہا۔

"آپ آتے ہی کیوں تھے؟" وہ خفا ہوئی۔

"دیکھئے!"

"کیا ہے؟" اُس نے گردن اُٹھائی۔

"آپ ناراض ہو گئیں؟"

"نہیں تو ـــــ" یہ کہہ کر وہ شاخِ گُل کی طرح لچکتی ہوئی ننگے پیر میرے قریب آئی۔ قدِ آدم آئینے میں اُس کے جسم کی فطری چھاؤں اپنی بہار دکھا رہی تھی!

"میں ایک سیریس کیس کو دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"کچھ دیر تو بیٹھئے۔" اُس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ میں اُس کے ساتھ ہی اُس کے بیڈ پر بیٹھا۔ سامنے دیوار پر کسی یونانی ملکہ کی ایک پُر تمکنت لیکن نیم عریاں تصویر آویزاں تھی۔

میں نے ہمّت کر کے پھر شہناز کی طرف دیکھا ـــــ وہ شاید ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اُس کے بھیگے بھیگے بالوں سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اُس کے پتلے سے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی باریک سی تہہ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھی اور میری نگاہیں اُس کے خوبصورت جسم کی رعنائیوں میں گُم ہو رہی تھیں۔

"ڈاکٹر!"

"جی!"

"پتہ ہے میں نے کیا سوچ لیا تھا؟"

"کیا؟"

"آج رات ہم دیر تک باتیں کریں گے۔ میٹھی میٹھی سی پیاری پیاری سی باتیں۔ آج پونم ہے نا؟ چاندنی تھوڑی ہی دیر میں کمرے کی کھڑکی پر اُترے گی اور ـــــ عشق پیچاں کی بیل کے پتّے چاندنی میں مُسکرائیں گے اور ہوا کے نرم جھونکوں سے ہلتے رہیں گے۔ چاندنی میں ہلورے لیتے ہوئے یہ پتّے مجھے بہت پیارے معلوم ہوتے ہیں ـــــ میں سوچ رہی تھی کہ آپ کے باغ میں بھی ایک ایسی ہی بیل لگواؤں گی۔ جو چاندنی میں آپ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے جھانکا کرے گی اور پھر ـــــ" شہناز کا سر میرے سینے پر جُھک گیا تھا اور اُس کے کانپتے ہوئے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قریب تھے۔ غیر اختیاری طور پر میرا سر جُھکنے لگا۔ اِتنے میں سراج الدّین کے یہ الفاظ میرے دماغ میں بجلی کی طرح کوند گئے: "شہناز کی بات ایک اچھے گھرانے میں طے ہو رہی ہے۔"

اور میں نے انتہائی ہوشیاری اور سُرعت کے ساتھ شہناز سے رخصت چاہی۔ اُسے میری جلدی کا احساس ہوا لیکن اُس کی پلکیں آپ گون ہو گئی تھیں!

دوسرے دن سب سے پہلا کام جو میں نے کیا، وہ یہ تھا کہ سراج الدین سے ملا اور چند ضروری ہدایات ان کے گوش گزار کیں اور پھر سوموار کو صبح کی گاڑی سے بیس روز کے لئے مینٹل ڈیزیز سپیشلسٹوں کے سیمینار میں شرکت کے لئے دلّی چلا گیا۔ میں نے شہناز کا نفسیاتی اور ذہنی مطالعہ مکمل کیا تھا اور سیمینار میں اِس موضوع پر ایک پیپر پڑھ رہا تھا۔

میں ایک مہینے کے بعد دلّی سے لوٹا۔

چلتے چلتے میری بیٹی قدسی نے کہا۔

"ڈیڈی! شہناز آپ کے جانے کے بعد تین دن تک آتی رہیں۔ کتنی اچھی ہیں وہ ——— مجھے بہت چاہتی ہیں ——— میرے لئے ایک خوبصورت شال لائی ہیں۔ دکھاؤں آپ کو؟" وہ اٹھنے لگی۔

"بیٹھو! ابھی دیکھ لیں گے اور کیا کہتی رہیں شہناز؟"

"اور ہاں ڈیڈی! میں کہنا بھول ہی گئی۔ تیسرے دن جب وہ آئیں تو ان کے ساتھ دو نوکر تھے۔ انھوں نے دیوار کے ساتھ عشق پیچاں کی بیل لگائی۔ اتنی بڑی بیل ہے کہ اوپر آپ کے بیڈ روم تک چلی گئی ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے۔"

دوسرے دن جب میں شہناز سے ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ سراج الدین دولت آباد گئے ہوئے ہیں۔ میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سراپا اشتیاق بنا شہناز کے کمرے میں گیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت اور دکھ کی حد نہ رہی کہ وہ بید کی آرام کرسی پر ٹانگیں پسارے بے سُدھ پڑی ہے اور سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ہے۔ اُس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ اُس کے خشک بال اُلجھے ہیں۔

"شہناز!"

وہ بُت کی طرح خاموش مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر مجھے بے حد تشویش ہوئی۔

"شہناز! مجھے پہچانتی نہیں آپ؟ میں ڈاکٹر ———"

"ڈاکٹر! ——— اُف! تم پھر آ گئے؟ ابھی تم یہاں سے چلے گئے تھے۔ تم پھر آ گئے۔ میرے قاتل! ——— تم سب میرے قاتل ہو!! ——— ہٹ جاؤ میری نظروں سے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو ——— مجھے تنہا چھوڑ دو!!"

وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اُس کا سارا جسم برگِ خزاں کی طرح لرز رہا تھا!

میں چند لمحوں کے لئے ششدر کھڑا رہا اور میرے ذہن پر ساری دُنیا کا غبار چھا گیا۔

لیکن دوسرے لمحے میرا ذہن صاف ہو چکا تھا۔ بارش کے دُھلے ہوئے آسمان کی طرح:

"تم پر اب کبھی دورہ نہ پڑے گا شہناز!" میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ شہناز کی طرف بڑھنے لگا!!

غزل

کشمیری لال ذاکر، ایم۔اے

یہ راہ جب بھی ملی بدگماں ملی ہے مجھے
بھٹک رہا ہوں کہ منزل کہاں ملی ہے مجھے

مرے خلوص کے پھولوں نے چوم چوم لیا
تری نگاہ کی شبنم جہاں ملی ہے مجھے

تمہارے درد کی خوشبو، تمہارے غم کی بہار
بس ایک بار ملی، پھر کہاں ملی ہے مجھے

ترے جمال کی پرچھائیاں بھی ساتھ رہیں
ترے خیال سے فرصت کہاں ملی ہے مجھے

غبار اتنا کہ پہچان بھی نہیں سکتا
مری حیات بچھڑ کر کہاں ملی ہے مجھے

افسانہ

خلل ہے دماغ کا

م۔ک۔مہتاب، ایم۔اے

ای۔جی۔۹۸۴، پریم نگر، جالندھر

۳ مارچ ۱۹۶۹ء — مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

۔۔۔ "بیسویں صدی" کے لئے ایک افسانہ "خلل ہے دماغ کا" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ پسند فرمائیں گے اور قارئین شرفِ قبولیت عطا کریں گے ——— انگلستان میں "بیسویں صدی" کی ایجنسیاں کہاں کہاں ہیں؟ وہاں کے کچھ دوستوں نے دریافت کیا ہے۔ مناسب سمجھیں تو اطلاع دیں۔۔۔

نیاز کیش ——— م۔ک۔مہتاب

اظہارِ محبت کے لئے بھی ایک خاص زبان ہوتی ہے۔ یہ کیا بھونڈا پن ہے۔

"شانتا! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اور اُس نے بھی تو شاید یہی کیا کہ اس بھونڈے سوال کے جواب میں کھانے کی میز پر رکھی سالن کی پلیٹ میں سے سٹیل کا چمچہ کھینچ کر اُس کے سینے پر دے مارا اور کہنے لگی "آپ یہاں سے چلے جایئے۔"

اِس سے زیادہ کسی کی اور کیا بے عزتی ہو سکتی ہے۔ اُس کی سفید قمیص پر ایک بڑا سا داغ پڑ گیا اور وہ سر جھکائے ہوئے کمرے سے باہر آگیا۔ بس کا انتظار کئے بغیر وہ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ احساسِ ندامت سے اُس کی گردن جھکی جا رہی تھی اور سڑک کی بتیوں کی روشنی بھی اُس کے کندھوں پر بوجھ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو کیوں نہ رکھ سکا؟ لیکن محبت جب دیوانگی کی حد تک پہنچ جائے تو ضبط کا دامن چھوٹ ہی جاتا ہے۔ پھر دل کی بات کہنے کے لئے اِس سے زیادہ تنہائی کب مل سکتی تھی؟ اُس کے دوست جتیندر نے آج اُسے کھانے پر آنے کے لئے کہا تھا لیکن خود کسی مجبوری سے گھر پر موجود نہ تھا۔ اُس کی بوڑھی والدہ اور بہن شانتا ہی گھر میں تھیں۔ جتیندر کا انتظار کرتے کرتے دس بج گئے تھے۔ بوڑھی والدہ اپنے بستر میں چلی گئی تھیں۔ وہ صوفے پر لیٹا الماری میں سے کتابیں دیکھتا رہا لیکن اُس کی نگاہیں بار بار شانتا کی طرف چلی جاتی تھیں۔ جو پہلے تو ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے لئے سامان لگاتی رہی۔ پھر ایک مونڈھے پر بیٹھ کر فریم میں کسے ہوئے ریشمی کپڑے پر پھول پتیاں بنانے لگی۔ ٹیوب کی ہلکی نیلگوں روشنی نے شانتا کی گلابی رنگت، اُس کے دلکش بالوں اور ہلکے سے ریشمی لباس پر ایک سحر چھڑک دیا تھا جسے دیکھ کر وہ بے خود ہوا جاتا تھا۔ وہ شانتا کو اِس سے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا اور ہر بار اُس کی دلکش اور پُروقار شخصیت پہلے سے زیادہ گہری چھاپ اُس پر چھوڑ گئی تھی وہ بے اختیار شانتا کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شانتا اُس کی نامکمل زندگی کی تکمیل کر سکتی ہے، اُسے سکون بخش سکتی ہے اور اُسے پالینے کے بعد شاید اُسے کچھ اور پانے کی تمنا نہ رہے!

دو برس پہلے جب وہ جتیندر کے ہاں آنے جانے لگا تھا تو اُن دنوں شانتا بی۔اے فائنل کر رہی تھی۔ اُس نے انگریزی کی کچھ نظمیں بھی اِس سے پڑھی تھیں جب کبھی کتاب اُٹھا کر کچھ پوچھنے کے لئے وہ اُس کے پاس آبیٹھتی تو وہ کبھی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا لیکن امتحان کے بعد شانتا بے جان سی ہو گئی۔ جیسے پھول مُنہ بند کرکے پھر کلی بن گیا ہو۔ رسمی سے بول اور ان کے رسمی سے جوابات جن میں محبت کی گرمی کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ وہ جتیندر سے کہے تو سہی کہ وہ جو شانتا کی شادی کے بارے میں اتنا فکرمند رہتا ہے تو وہ شانتا کی شادی اُس سے کیوں نہیں کر دیتا؟

لیکن ہر بار وہ یہ سوچ کر چُپ رہ جاتا کہ آج وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ بے زبان لڑکی کو چاہے جس کے حوالے کر دو۔ شانتا تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اُس کی

مرضی اور پسند کے مطابق رشتہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے اُس نے شانتا ہی سے پُوچھنے کا فیصلہ کیا۔

شانتا کشیدہ کاری کا فریم رکھ کر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی

" رمیش جی آیئے! کھانا بالکل ٹھنڈا اور بے مزہ ہو جائے گا۔ نہ جانے بھیا آج کہاں اٹک گئے ہیں"

اور جواب میں وہ ڈائننگ ٹیبل کے قریب ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ اُس کے کان شانتا کی آواز کے سنگیت میں کھوئے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھیں اُس کی گداز بانہوں اور مخروطی اُنگلیوں کو دیکھنے میں محو رہیں۔ اُس کے انگ انگ سے روشنی کی کرنیں پھُوٹ رہی تھیں۔ کاش مُجھے اِن اُنگلیوں کا لمس ہر روز میسّر ہوتا۔ اُس نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔ اُس کے یوں سرد آہ بھرنے پر شانتا نے مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا اور بولی۔

"کیا بات ہے رمیش جی؟"

"کچھ نہیں! سوچ رہا تھا کہ تم کتنے اچھے کھانے بناتی ہو اور پھر پروستی کیسے سلیقے سے ہو۔ جتیندر آجاتا تو کھانے کا لُطف دوبالا ہو جاتا!"

شانتا بچوں کی سی سادگی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ وہ اُس کی اِس ادا پر جان سے قربان ہو گیا اور اُس سے یہ بے وقوفی سرزد ہو گئی۔

لیکن محبت تو دیوانگی ہوتی ہی ہے۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے کا نام ہی تو پیار ہے۔ پیار ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا آیا ہے۔ محبت میں اگر عقل و ہوش بھی کام دیں تو وہ محبت کب رہتی ہے۔ دوکانداری ہو جاتی ہے

اُس نے شانتا کے اِس ردِ عمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو اُسے پتہ چلا کہ شانتا کو پروفیسر پرکاش سے محبت ہے۔ پرکاش جتیندر کا کلاس فیلو رہ چکا تھا اور اُن کے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔ پرکاش ایک خوبرو نوجوان تھا۔ اگر شانتا پرکاش کو پانے میں کامیاب ہو جاتی تو یقیناً سب اُس کی خوش نصیبی پر رشک کریں گے۔ اگر اُسے معلوم ہوتا کہ شانتا پرکاش کو چاہتی ہے تو وہ کبھی شانتا سے اظہارِ محبت کی حماقت نہ کرتا۔

شانتا کی محبت کے متعلق اِس انکشاف کے بعد رمیش کا احساسِ ندامت شدید تر ہو گیا۔ کئی بار جتیندر نے اُسے اپنے ہاں مدعو کیا لیکن چاہتے ہوئے بھی اُسے کبھی وہاں جانے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک دن اُسے سخت حیرانی ہوئی جب دفتر میں لنچ کے وقفے میں جتیندر نے اُس سے کہا۔

" رمیش! میری ایک مدد کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

"کیا تم شانتا کا رشتہ قبول کر سکتے ہو؟ میں بہت پریشان ہوں"

رمیش کے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی ہو۔ سارے جسم پر پسینے کی ایک تہہ اُبھر آئی۔ اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"کیا تم نے شانتا سے پُوچھ لیا ہے جتیندر؟"

"ہاں! اُسی کی تجویز پر میں یہ پیشکش کر رہا ہوں"

رمیش کی آنکھیں کھُلی رہ گئیں۔ دل میں جیسے کلیاں چٹک گئیں لیکن ذہن باور کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس غیر متوقع اور غیر معمولی بات پر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر پانی کا پورا گلاس ایک ہی سانس میں اندر اُنڈیلتے ہوئے بولا۔

"جتیندر! میں تمھاری بات ماننے سے کیسے انکار کر سکتا ہوں"

جتیندر اپنی سیٹ پر چلا گیا اور رمیش ہاتھ میں قلم پکڑے نگاہیں فائل پر جمائے سوچتا رہا کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟ شانتا کو تو اُس سے نہیں پرکاش سے محبت ہے۔ پھر اُس نے یہ تجویز منظور کر کے اپنی منظوری کا اظہار کیوں کیا؟ شانتا نے خود یہ تجویز کیوں پیش کی؟ کیا اِس کا سبب یہ نہیں ہو سکتا کہ پرکاش نے شانتا کو ٹھکرا دیا ہو یا جتیندر کہ کوئی اور لڑکا نہ مل رہا ہو اور شانتا نے اُس کی پریشانی دُور کرنے کے لئے مجھ سے شادی کرنا منظور کر لیا ہو۔

اور شادی کے بعد پہلے ہی دن اُس نے یہ سب کچھ شانتا سے پُوچھ لیا۔ شانتا ہاتھ جوڑے رو رہی تھی۔ رمیش نے اُسے سینے سے لگا لیا۔ جیسے ساری کائنات کا حُسن سمٹ کر اُس کی گود میں چلا آیا ہو!

"میں اُس دن کی حرکت کے لئے بہت شرمندہ ہوں" شانتا اپنے ہاتھوں سے مُنہ کو چھُپائے کہہ رہی تھی۔

"نہیں نہیں! شرمندہ تو میں ہوں۔ کیا اِس بدتہذیبی سے بھی کوئی اظہارِ محبت کرتا ہے۔ تمھاری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی، وہ مجھے اِس بے ہودگی کی یہی سزا دیتی لیکن میں مجبور تھا شانتا! تم میرے دل و جاں میں سما چکی تھیں اور پیاسا جب پانی کے قریب آتا ہے تو وہ گہرائی کا اندازہ لگائے بغیر ہی اُس میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک بات پُوچھوں جس نے سگائی سے اب تک مجھے پریشان رکھا ہے"

"پُوچھو!"

"تم نے مجھ سے شادی کے لئے خود تجویز کیوں پیش کی؟"

"اِس لئے کہ آپ مجھے پسند تھے"

"میں... میں.. میں تمھیں پسند تھا؟" رمیش نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "یہ

کیسے ہو سکتا ہے شانتا! تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں! آپ میں کیا کمی ہے۔ آپ اتنے اچھے ہیں۔ اچھے کام پر ہیں۔ گھربار اچھا ہے۔ جتیندر بھیا آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ مجھے۔۔" اور وہ شرما کر بات پوری کرنے کی بجائے چھنگلی کا ناخن دانتوں سے کاٹنے لگی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی: "اگر یہ سب کچھ ہو تو ایک لڑکی کو شادی کے لئے اور کیا چاہیئے ــــــ؟"

خوشی کے جذبات سے رمیش کی آنکھیں چمک اُٹھیں لیکن اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"شانتا! اگر بُرا نہ مانو تو کیا میرا ایک شک رفع کر سکتی ہو۔ تمھیں تو پروفیسر پرکاش سے محبت تھی؟"

"ہاں!" شانتا نے سر جھکا کر اپنے خوبصورت گلابی ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔

"پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہ کی؟"

"یہ ضروری تو نہیں کہ جسے آپ چاہتے ہوں اس سے آپ کی شادی بھی ہو۔ میں انھیں الگ الگ باتیں سمجھتی ہوں۔ محبت دل کی بات ہے اور شادی زندگی کی۔"

رمیش کے پاؤں تلے سے جیسے زمین نکلنے لگی۔ وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔

"اگر تمھاری شادی پرکاش سے ہو جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔"

"لیکن شاید میں وہاں خوش نہ رہ سکتی۔ کیونکہ ایک ایسی لڑکی سے پرکاش کے رشتے کی بات طے ہو رہی تھی جو اُسے پسند تھی۔ اِس لئے میں نے کچھ کہنا بہتر نہ سمجھا۔"

"پھر یہ قرعہ میرے نام کیسے پڑ گیا؟"

شانتا نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔

"جتیندر بھیا میری شادی کے بارے میں بہت فکرمند رہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھ لیا اور مجھے آپ ہی موزوں نظر آئے۔ کیا آپ مجھے اس دن کی گستاخی کے لئے معاف کر سکتے ہیں۔ میں سزا کے طور پر آپ کے پاؤں چھونے کو تیار ہوں" یہ شانتا پاؤں چھونے کے لئے جھکی تو رمیش نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

لیکن شانتا محبت کی گرمجوشی کی بجائے عاجزی اور بےبسی کی تصویر نظر آتی تھی جو جھٹ اس کے سینے سے الگ ہو گئی۔

شانتا جیسی بیوی پاکر رمیش کی زندگی میں بہار آگئی تھی۔ اُس نے اُس کے گھر کو جنت بنا دیا۔ جس کے ہر کونے سے روشنی کی ویسی ہی شعاعیں نکلتی تھیں جیسی وہ شادی سے پہلے شانتا کے انگ انگ سے پھوٹتی دیکھا کرتا تھا۔ شانتا کی سحرآگیں شخصیت گھر بھر میں چھائی ہوئی تھی لیکن اِس ماحول میں شانتا کلی ہی رہی چٹک کر پھول نہ بن سکی۔ زندگی کے تمام فرائض سرانجام دینے کے باوجود اُن میں اجنبیت کا پردہ حائل ہی رہا۔ تنہائیوں میں رمیش کو اُس بےخودی کا احساس نہ ہوتا جو دو چاہنے والوں کو دُنیا کی ہر دوسری شے سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ شانتا اُس کے لئے اچھے سے اچھے کھانے بناتی۔ خود سامنے بیٹھ کر کھلاتی۔ اُس کے کپڑے خود درست کرتی۔ اُس کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جاتی، شاپنگ کرتی۔ گھر چلانے میں وہ اُس سے بھی زیادہ مستعد اور کفایت شعار تھی۔ رات اگر وہ دو دو بجے تک مطالعہ کرتا رہتا تو وہ بھی نہ سوتی۔ کبھی چائے، کبھی پھل اور کبھی کوئی اور من پسند چیز بنا بنا کر لئے آتی یا اُس کے پاس بیٹھ کر کشیدہ کرتی رہتی۔ اگر وہ اُس سے ایسے میں کوئی مذاق بھی کرتا تو وہ شرما جاتی یا ہنسنے لگتی۔ لیکن رمیش کے رُومانی ذہن کے یہ ارمان کبھی پورے نہ ہوتے کہ وہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو، شانتا آئے اور اُس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگے۔ پھر اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھوم جائے اور کہے۔

"اُٹھو! سوؤ گے نہیں؟"

یہ ایک خلش تھی جو خوشگوار ازدواجی زندگی کے پھول کے دامن میں خار کی طرح چبھتی رہتی تھی لیکن اُسے اِس پھول کے کانٹوں سے بھی محبت تھی، اور وہ اپنا سب کچھ اِس پھول کے لئے وقف کر دینا چاہتا تھا۔ اُسے کبھی کبھی شانتا کی یہ بیگانگی کھٹکتی تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں! باہمی زندگی کا جو پودا انھوں نے لگایا ہے اُس سے یقیناً محبت کی گھنی چھاؤں حاصل ہوگی۔ وقت بڑا طاقتور ہے۔ دشمن کو بھی دوست بنا دیتا ہے اور وہ تو جیون ساتھی ہیں۔

شادی اور اس کے ایک برس بعد کی شانتا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُسے رمیش کے گھر کی ہر چیز سے محبت ہو گئی تھی اور اپنے رشتہ داروں کے مُنہ سے شانتا کی تعریف سُن کر وہ کتنا خوش ہوتا تھا۔ شانتا نے گھر کی ہر چیز میں اپنے آپ کو سمو دیا تھا۔

شادی کے دو برس بعد جب اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو وہ دونوں کتنے خوش تھے۔ جیسے ماضی کی سب تصویریں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی ہوں اور پانی کی بےجان سطح پر ایک خوبصورت کنول کھل اُٹھا ہو۔ گھر شانتا کے قہقہوں سے گونجنے لگا اور رمیش نے شانتا کے چہرے پر پہلی بار مسرت کی وہ لہریں دیکھیں جنھیں دیکھنے کے لئے

وہ دو برس سے بے تاب تھا۔

سردیوں کی ایک دوپہر تھی۔ شانتا بچے کو باہر دھوپ میں لٹائے اُس سے باتیں کر رہی تھی۔ اُسے گدگدا رہی تھی۔ اپنے سوالات کے آپ ہی جواب دیتی ہوئی ہنس رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے کرتے دفورِ شوق میں بچے کو چُوم لیتی۔ رمیش دروازے میں کھڑا اِس منظر سے لُطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر وہ بھی باہر دھوپ میں آگیا اور شانتا کے قہقہوں میں شریک ہوگیا۔

"شانتا! تم بچے سے کتنا پیار کرتی ہو؟" رمیش نے شانتا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پُوچھا۔

"اِتنا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

"تم اِسے پیار کیوں کرتی ہو؟"

"اِس لئے کہ یہ میرا بچہ ہے۔ میرے وجود کا ایک جزو ہے۔ آپ کا دیا ہوا ایک خوبصورت تحفہ ہے!" شانتا نے بچے کے پھُول سے گال چُوم لئے اور رمیش کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"میں کتنی خوش ہوں۔ کتنی خوش نصیب رمیش!"

"کیسے؟"

"آپ نے مجھے کیا کچھ نہیں دیا۔ اِتنا اچھا گھر، کپڑے، گہنے۔ سیر و تفریح۔ سچا پیار۔ ہر خواہش کی تکمیل کا سامان اور کھیلنے کو یہ پھُول کا ٹکڑا۔ آپ میری خوشی اور آرام و آسائش کا جتنا خیال رکھتے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے میں کبھی یہ سوچتی ہوں کہ اِس کے بدلے میں آپ کو کیا دے سکتی ہوں؟"

"دے سکتی ہو!" رمیش نے شانتا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" شانتا مجسّم سوال بن گئی۔

"اِس کے بدلے میں صرف ایک بار کہہ دو۔ مجھے تم سے محبت ہے!"

شانتا کے گرم و گداز ہاتھوں کی گرمی ایک دم غائب ہوگئی اور اُس کی آنکھ سے چھلکتا ہوا ایک آنسو یُوں ڈھلک گیا جیسے اُس نے سٹیل کا چمکتا ہوا تیر پیٹ میں سے کھینچ کر اُس کے سینے پر دے مارا ہو۔

غزل

اختر واصفی

گھٹائیں اُٹھی ہیں جھُوم کر اب تو عام دورِ شراب کر دے
نظر اُٹھا کر ہر ایک ذرّے کو ساقیا آفتاب کر دے

مزا ہو تم بھی کسی کو چاہو وہ تم کو رہنِ عتاب کر دے
عدُو سے ہنس ہنس کے بات کرنا تمہارا جگر جلا کر کباب کر دے

زہے مقدر جو کوئی صاحب نظر مجھے فیضیاب کر دے
ضرورت ایسی نگاہ کی ہے جو دل کی دُنیا خراب کر دے

بغیر سوچے بغیر سمجھے کسی کو چاہا ہے تُونے اے دل
مری دُعا ہے یہ تیرے حق میں خدا تجھے کامیاب کر دے

مَیں بھُول کر آ گیا ہوں مسجد میں لے چلے مجھ کو میکدے تک
ہے کوئی ایسا خدا کا بندہ جو اِتنا کارِ ثواب کر دے

نظر اُٹھاتا ہوں جس طرف بھی ہے ایک سے اِک حسین چہرہ
کسے مَیں چاہوں کسے نہ چاہوں کوئی مجھے انتخاب کر دے

سکُوں یہ کیسا ہے یاالٰہی نہ موت ہے اور نہ زندگی ہے
وہی تڑپ دے جو ہر رگ و پے کو وقفِ صد اضطراب کر دے

مرے گُناہوں کی ہے وہ کثرت کہ یہ فرشتے تو کیا ہیں اختر
خدا کو بھی مان جاؤں گا مَیں اگر وہ اُن کا حساب کر دے

افسانہ

نمک

رضیہ سجاد ظہیر۔ ایم، اے

وائی۔ ۲۴، حوضِ خاص۔ نئی دہلی ۱۶

۵ مارچ ۶۶ء

خوشتر بھائی! تسلیم

ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ یقین ہے پسند آئے گی ـــــ بیدی بھائی کو انعام ملنے کے سلسلے میں بہت سی نشستوں میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن آپ نہیں۔ نظر نہ آئے۔ خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو۔۔

آپ کی بہن ـــــ رضیہ سجاد ظہیر

اُن سکھ بی بی کو دیکھ کر صفیہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ اُس کی اماں مرحومہ سے کتنی ملتی تھیں۔ وہی بھاری بھر کم جسم، ویسی ہی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، جن میں نیکی، محبت اور رحم دلی کی روشنیاں جگمگایا کرتی تھیں۔ چمکیلا شفاف چہرہ، جیسے کھلی کتاب؛ اور ویسا ہی سفید ململ کا دوپٹہ جیسا اُس کی اماں اوڑھ کر محرم کی مجلسوں میں جایا کرتی تھیں۔

جب صفیہ نے کئی بار اُن کی طرف پیار سے دیکھا تو انھوں نے بھی اس کے خاندان گھر کی بہو سے پوچھا۔ انھیں بتایا گیا کہ وہ مسلمان ہے۔ کل ہی صبح لاہور جا رہی ہے اپنے بھائیوں سے ملنے، جنھیں اُس نے کئی سال سے نہیں دیکھا۔ لاہور کا نام سن کر وہ اُٹھ کر صفیہ کے پاس آگئیں اور اُسے بتانے لگیں کہ اُن کا لاہور کتنا پیارا شہر ہے۔ وہاں کے لوگ کیسے خوبصورت ہوتے ہیں۔ عمدہ کھانے کے شوقین، نفیس کپڑوں کے شوقین، سیر سپاٹے کے رسیا، زندہ دلی کی تصویر! ... کیرتن ہوتا رہا، وہ آہستہ آہستہ لاہور کی باتیں کرتی رہیں۔ صفیہ نے دو ایک بار بیچ میں اُن سے پوچھا بھی "آپ کو یہاں آئے تو بہت سال ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں بیٹی! بس جب ہندوستان بنا تھا جب ہی ـــــ ہمیں آئے تو بہت دن ہوگئے، پر ہمارا وطن تو جی لاہور ہی ہے۔"

پلکوں سے کچھ ستارے ٹوٹ کر دودھیا آنچل میں گر جاتے تھے۔ پھر بات آگے چل پڑتی تھی۔ وہی ایک بات ـــــ ہمارا لاہور!

کیرتن کوئی گیارہ بجے کے بعد ختم ہوا۔ جب وہ پرشاد ہاتھ میں لئے اٹھیں اور صفیہ کے سلام کے جواب میں دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہونے لگیں تو صفیہ نے سب سے الگ بہت ہی دھیمے سے پوچھا "آپ لاہور سے کوئی سوغات منگانا چاہیں تو حکم دیجئے۔" وہ دروازہ سے لگی کھڑی تھیں۔ بہت جھجکتے جھجکتے، اتنے ہی آہستہ لہجے میں بولیں "لاسکو تو تھوڑا سا لاہوری نمک لانا!"

پندرہ دن یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا! جگمگاتی شامیں، دوستوں کی محبتیں، بھائیوں کی خاطرداریاں ـــــ اُن کا بس نہ چلتا تھا کہ بچھڑی بہن کے لئے کیا کچھ کر دیں! دوستوں، عزیزوں کی یہ حالت کہ کوئی کچھ لئے چلا آرہا ہے، کوئی کچھ۔ کہاں رکھیں، کیسے باندھیں، کیونکر لے جائیں ـــــ ایک مسئلہ تھا اور سب سے بڑا مسئلہ تھا ایک بادامی کاغذ کی پڑیا جس میں آدھ سیر لاہوری نمک تھا۔

اُس نے چپکے سے اپنے بھائی سے پوچھا "نمک لے جا سکتے ہیں؟"

وہ حیران ہوکر بولا "نمک؟ نمک تو نہیں لے جا سکتے۔ غیر قانونی ہے... اور... اور نمک کا آپ کیا کریں گی؟ آپ لوگوں کے حصے میں تو ہم سے بہت زیادہ نمک آیا ہے۔"

"حصے بخرے کی کون بات کر رہا ہے ـــــ آیا ہوگا" اُس نے جھنجھلا کر کہا۔ "مگر مجھے تو لاہور کا نمک چاہئے۔ میری ماں نے یہی منگوایا ہے۔"

بھائی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ذرا نرمی سے سمجھانے کے انداز میں بولا "دیکھئے آپ کو کسٹم سے گزرنا ہے اور اگر ایک چیز بھی ایسی نکل آئی تو پھر آپ کے سامان کی چندی چندی بکھیر دیں گے کسٹم والے!"

"نمک آتا کیا معنی!" وہ بگڑ کر کہنے لگی: "میں کیا چھپا کر لے جاؤں گی؟ میں تو دکھا کر لے جاؤں گی۔ کہہ کر لے جاؤں گی۔"

"بھئی یہ تو آپ بہت ہی غلط بات کریں گی... قانون..."

"پھر قانون قانون کہے جاتے ہو۔ کیا سب قانون حکومت ہی کے ہوتے ہیں، محبت کے نہیں ہوتے؟ آدمیت کے نہیں ہوتے؟ آخر کسٹم والے بھی انسان ہیں، کوئی مشین تو نہیں ہیں!"

"ہاں وہ مشین تو نہیں ہوتے پر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ شاعر بھی نہیں ہوتے۔ اُن کو اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔"

"ارے توبا! میں کب کہہ رہی ہوں کہ فرض ادا نہ کریں۔ ایک تحفہ ہے سو دیکھ لیں، کوئی سونا چاندی نہیں ہے۔ نہ کوئی بلیک مارکیٹ کا مال ہے۔"

"اب آپ سے کون بحث کرے۔ آپ ادیب شہری اور سب ہی ادیبوں کا دماغ ذرا سا گڑبڑ ہوتا ہے۔ ویسے میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ آپ لے جا نہیں پائیں گی۔ کسٹم پر دھر والیا جائے گا اور بدنامی الگ ہوگی۔"

"کاش! کچھ زیادہ لوگوں کا دماغ ہم ادیبوں کی طرح گڑبڑ ہوتا" وہ کھسیا کر بڑبڑانے لگی۔

یہ جھک جھک ختم ہوئی تو رات کافی آگئی تھی۔ اگلے روز دو بجے دن کو اُسے روانہ ہونا تھا۔ صبح کے لئے بہت مصروف پروگرام بن چکا تھا۔ اس لئے اُسے پیکنگ رات ہی کو کرنا تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرکے وہ سامان باندھنے لگی۔ پھیلا ہوا اثاثہ رفتہ رفتہ سب سمٹ کر سوٹ کیس اور بستر بند میں چلا گیا۔ صرف دو چیزیں رہ گئیں۔ ایک تو وہ چھوٹی سی ٹوکری جس میں کینو تھے، ایک محبوب دوست کا تحفہ! سنترے اور مالٹے کو ملا کر پیدا کیا ہوا پھل! مالٹے کی طرح رنگین اور میٹھا، سنترے کی طرح نازک اور رسیلا۔ ایسا طرحدار جیسے اینگلو انڈین لڑکی ــــ اور وہ نمک کی پڑیا!

صفیہ نے سوچا رات تو ہاتھ میں لے لیں گے۔ سب سے پہلے کسٹم والوں کے سامنے یہی رکھ دیں گے اور اگر کسٹم والوں نے نہ جانے دیا؟ تو پھر مجبوری ہے۔ چھوڑ دیں گے۔ پھر اُس وعدہ کا کیا ہوگا؟ ہم نے آج تک کسی سے کوئی وعدہ کرکے جھٹلایا نہیں۔ یہ تو ہماری شان کے خلاف ہے۔ پھر ہم نے زبان ہی کیوں دی تھی، یہ تو پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا کہ کسٹم سے بھی گزرنا ہے۔ اچھا اگر اسے کینوؤں کی ٹوکری میں سب سے نیچے رکھ لیا جائے تو بیسیوں کینوؤں کے ڈھیر میں کون اسے دیکھے گا؟ اور اگر دیکھ لیا؟ نہیں جی! پھلوں کی ٹوکریاں تو کسی کی نہیں دیکھی جا رہی تھیں۔ اُدھر سے کیلے، اِدھر سے کینو سب ہی لے جا رہے تھے۔ یہی ٹھیک ہے۔ پھر دیکھا جائے گا۔

اُس نے کینو سب قالین پر الٹ دیے۔ ٹوکری خالی کی۔ نمک کی پڑیا اُٹھائی اور ٹوکری کی تہہ میں رکھ دی۔ ایک بار جھانک کر اُس نے پڑیا کو دیکھا اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے اپنے کسی عزیز کو قبر کی تاریک گہرائی میں اُتار دیا ہے۔ کچھ دیر وہ ٹوکری کے پاس اکڑوں بیٹھی اُس پڑیا کو تکتی رہی اور اُن کہانیوں کو یاد کرتی رہی جو اُس کی اماں اُسے بچپن میں سُنایا کرتی تھیں۔ جن میں شہزادہ اپنی ران چیر کر اُس میں ہیرا چھپا لیتا تھا اور سرحدوں سے گزر جاتا تھا۔ اِس زمانہ میں ایسی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی تھی ورنہ وہ اپنا دل چیر کر اُس میں یہ نمک چھپا لیتی۔

پھر وہ کینو ایک ایک کرکے ٹوکری میں رکھنے لگی۔ پڑیا کے اِدھر اُدھر، آس پاس اور پھر اوپر، یہاں تک کہ وہ بالکل چھپ گئی۔ مطمئن ہو کر اُس نے [illegible] سوٹ کیس پلنگ کے نیچے کھسکایا، ٹوکری پلنگ کے سرہانے رکھی اور لیٹ گئی۔

رات کا تقریباً ڈیڑھ بجا تھا۔ آخر مارچ کی سُہانی ہوا کھڑکی کی جالی سے آ رہی تھی۔ باہر چاندنی صاف اور ٹھنڈی تھی۔ کھڑکی کے قریب لگا ہوا ایک گھنا درخت سامنے کی دیوار پر پتیوں کے عکس ابھار رہا تھا۔ کبھی شاگرد پیشے کی طرف سے دبی ہوئی کھانسی کی آہٹ، کسی کُتے کے بھونکنے یا رونے کی آواز اور پھر سناٹا ــــ یہ پاکستان تھا جہاں اُس کے بھائی تھے، دوست تھے، اُس کے باپ کی قبر تھی اور ان سب کے اور اُس کے بیچ میں ایک سرحد تھی اور بہت سی نوکدار لوہے کی چھڑیاں بھی جو کسٹم کہلاتی تھیں۔ کل وہ لاہور سے چلی جائے گی۔ ہو سکتا ہے سال بھر بعد پھر آئے۔ ایک سال سے پہلے وہ آ ہی نہیں سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی نہ آ سکے! اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ پھر اُسے ایک سفید دوپٹہ لہراتا دکھائی دینے لگا۔ جس پر یہاں وہاں ستارے جھلملا رہے تھے: "ہمیں وہاں سے آئے تو بہت دن ہو گئے پر ہمارا وطن تو جی لاہور ہی ہے!" پھر اقبال کا سفید مقبرہ، اُس کے پس منظر میں لاہور کا قلعہ، اُس کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی کرنیں، پھیلتا ہوا اندھیرا، اُس رنگین اندھیرے میں بہتی ہوئی نرم لطیف ہوا، اُس ہوا میں رچی ہوئی مولسری کی خوشبو ــــ اور مقبرے کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے دو انسان سر جُھکائے چُپ چاپ، ملول اور اُداس، جیسے دو ساکت بے جان پرچھائیاں!

"تو تم کل چلی جاؤ گی؟"

"ہاں!"

"اب کب آؤ گی؟"

"معلوم نہیں۔ شاید اگلے سال۔ شاید کبھی نہیں!" پھر تاریکیوں پر ایک

سفید دوپٹہ لہرانے لگا" ہمارا وطن تو جی لاہور ہے" ایک دم آنکھ کھل گئی۔ شاید ہوا نے مقبرے کی سیڑھیوں کے نیچے لگی دُوب سے گھاس کی ایک پتی توڑی تھی جس گھاس پر ٹھنڈی اوس جمنی شروع ہوگئی تھی ـــــ نہیں نیند میں کروٹ لیتے ہوئے اُس کا ہاتھ کینوؤں سے لبالب بھری ہوئی ٹوکری پر جا پڑا تھا۔ ٹھنڈے، رسیلے، میٹھے کینو جن کو دیتے وقت اُس کے دوست نے کہا تھا" یہ ہندوستان پاکستان کے اتحاد کا میوہ ہے!"

لاہور کے اسٹیشن پر بھی وہی ہو رہا تھا جو امرتسر کے اسٹیشن پر ہوا تھا۔ تھرڈ کلاس کے مسافر اپنی گٹھریاں، پوٹلیاں سنبھالے، سہمے گھبراتے، حیران پریشان اپنا اپنا سامان دکھا رہے تھے۔ اُن سے طرح طرح کے سوال کیے جا رہے تھے۔ اُن کی ایک ایک چندی بکھیری جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹین کے بکس، کنستر اور ڈبے کھنگالے جا رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے ٹکٹ والے ویٹنگ روم میں بیٹھے سیون اپ (7-up) پی رہے تھے۔ ان کا سامان ویٹنگ روم کی دیواروں کے ساتھ قاعدے سے لگا تھا۔ بڑے بڑے سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، ایئر بیگ، ہولڈال وغیرہ!ـــــ صفیہ بھی فرسٹ کلاس میں تھی۔ کیونکہ دہلی تک کا کرایہ بھائی نے دیا تھا۔ وہ ٹکٹ ہاتھ میں دبائے ویٹنگ روم کے سامنے ٹہل رہا تھا اور وہ اندر بیٹھی چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے کینوؤں کی ٹوکری پر نگاہیں جمائے یہ سوچ رہی تھی کہ اتنے بہت سے لوگوں میں صرف وہی یہ جانتی ہے کہ اس کی تہہ میں نمک کی پڑیا ہے!

جب اُس کا سامان کسٹم ہونے کے لیے باہر نکالا جانے لگا تو اُسے ایک جھرجھری سی آئی اور ایک دم اُس نے فیصلہ کیا کہ نمک کسٹم کو دکھائے گی۔ جلدی سے اُس نے ٹوکری کی تہہ سے پڑیا نکال لی اور اپنے بیگ میں رکھ لی۔ جب سامان کسٹم ہوکر ریل کی طرف چلا تو وہ ایک کسٹم آفیسر کی طرف بڑھی۔ زیادہ تر میزیں خالی ہوچکی تھیں۔ ایک آدھ پر اکا دکا سامان رکھا تھا۔ سب سے آخر والی میز پر ایک صاحب بیٹھے تھے۔ لمبا قد، دُبلا پتلا جسم، کھچڑی بال، آنکھوں پر عینک۔ وہ کسٹم آفیسر کی وردی پہنے تو تھے پر اُن پر بڑی عجیب لگ رہی تھی۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں" صفیہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اُنھوں نے نظر بھر کر اُسے غور سے دیکھا۔ بولے" فرمائیے!"

اُن کے لہجے نے صفیہ کی ہمت بڑھا دی" آپ . . . آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

اُنھوں نے کچھ حیران ہوکر پھر اُسے غور سے دیکھا" خانہ زاد کا وطن دہلی ہے۔ آپ بھی تو ہماری ہی طرف کی معلوم ہوتی ہیں۔ اپنے عزیزوں سے ملنے آئی ہوں گی"

"جی ہاں! میں لکھنؤ کی ہوں۔ اپنے بھائیوں سے ملنے آئی تھی۔ آپ کو تو پاکستان آئے زیادہ دن ہوگئے ہوں گے؟"

"بس جب پاکستان بنا تھا جب ہی آئے تھے۔ مگر ہمارا وطن تو دہلی ہی ہے"

صفیہ نے بیگ کھول کر نمک کی پڑیا اُن کے سامنے رکھ دی۔ پھر رُک رُک کر اُن کو سب کچھ بتا دیا۔

اُنھوں نے پڑیا پر ایک ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ اُسے اپنی طرف سرکاتے رہے۔ جب صفیہ کی بات ختم ہوگئی تو اُنھوں نے پڑیا کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھایا، اچھی طرح لپیٹا اور خود صفیہ کے بیگ میں رکھ دیا جو ابھی تک کھلا ہوا میز کے ایک کنارے رکھا تھا۔ پھر بیگ کو اُٹھا کر صفیہ کو دیتے ہوئے بولے" محبتیں تو کسٹم سے اِس طرح گزر جاتی ہیں کہ قانون حیران رہ جاتا ہے!"

جب وہ چلنے لگی تو وہ بھی کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے" جامع مسجد کی سیڑھیوں کو میرا سلام کہیے گا! اور اُن خاتون کو نمک دیتے وقت میری طرف سے کہیے گا کہ اگر لاہور ابھی تک اُن کا وطن ہے اور دہلی میرا، تو باقی سب رفتہ رفتہ ٹھیک ہوجائے گا"

حسرت بھری نظروں، بہتے ہوئے آنسوؤں، ٹھنڈی سانسوں اور بھینچے ہوئے ہونٹوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ریل سرحد کی طرف بڑھی۔ اٹاری میں پاکستانی پولیس اُتری، ہندوستانی پولیس سوار ہوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون پاکستان ہے، کون ہندوستان۔ کہاں سے لاہور ختم ہوا، کہاں سے امرتسر شروع ہوا ـــــ ایک زمین تھی، ایک زبان تھی، ایک سی صورتیں تھیں، ایک سا لب و لہجہ اور انداز تھے۔ بس مشکل صرف اِتنی تھی کہ بندوقیں دونوں کے ہاتھ میں تھیں!

امرتسر کے اسٹیشن پر بھی وہی ہو رہا تھا جو لاہور میں ہوا تھا۔ تھرڈ کلاس کے مسافر اپنی گٹھریاں، پوٹلیاں سنبھالے، سہمے، گھبراتے، حیران پریشان اپنا سامان دکھا رہے تھے۔ اُن سے طرح طرح کے سوال کیے جا رہے تھے۔ اُن کی ایک ایک چندی بکھیری جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹین کے بکس، کنستر اور ڈبے کھنگالے جا رہے تھے۔ فرسٹ کلاس والوں کا سامان، ہاتھ کے ہاتھ ڈبے ہی کے سامنے اُتار دیا گیا تھا۔ اُن کا کسٹم وہیں ہونے والا تھا۔ لوگ اپنے سامان کے پاس کھڑے وہ کوکا کولا پی رہے تھے۔

صفیہ کا سامان دیکھنے جو صاحب آئے وہ بات چیت اور لہجے سے بنگالی معلوم ہوتے تھے۔

جب اُس کا سارا سامان دیکھا جا چکا تھا تو وہ باقی لوگوں سے الگ، اُن سے آہستہ سے بولی" میرے پاس نمک ہے ـــــ تھوڑا سا!"

پھر اُس نے کانپتے ہاتھوں سے بیگ کھول کر پڑیا نکالی اور اُن کی طرف بڑھا کر بولی۔

"اگر آپ کا دل چاہے تو میرا یہ سارا سامان روک لیجئے لیکن یہ نمک مجھے لے جانے دیجئے . . . یہ . . ." اور آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ آنسوؤں سے اُس کا گلا رُندھ رہا تھا۔ اُنھوں نے سر سے پاؤں تک اُسے گھورا۔ جیسے منتظر ہوں کہ ادر آگے بھی کچھ کہے۔ صفیہ نے پوری بات کہنی شروع کی۔ گھبراہٹ میں الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ زبان کو لکنت ہو رہی تھی مگر خیر سب کچھ کہہ ہی دیا۔ وہ سر جھکا کے سُنتے رہے۔ جب بات ختم ہو گئی تو۔ اُٹھ کر اُنھوں نے پھر ایک بار اُسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ بولے۔ "ادھر آیئے ذرا !"

صفیہ جب اُن کے پیچھے چل رہی تھی تو سوچتی جا رہی تھی کہ اُس نے بے وقوفی کی جو اتنی ایمانداری برتی۔ عورتوں کا ہینڈ بیگ تو دیسے بھی نہیں دیکھا جاتا اور اُنھوں نے اُس کا سامان بھی کوئی خاص توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ بس کھلوایا، ادھر اُدھر سے دیکھا اور چاک پھیر دی۔ اگر وہ نمک نکال کر اُن کو نہ دکھاتی تو وہ کیا جانتے۔ اب پتہ نہیں کیا ہوگا اور یہ جانے وہ اُسے کہاں لے جا رہے ہیں؟

پلیٹ فارم کے بالکل اُدھر والے سرے پر ایک کمرہ تھا۔ کچھ بابوؤں کی کوٹھری کا سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اُس کے اندر گھسے۔ وہ داخل ہوتے ہوئے ہچکچائی۔ اندر ایک میز تھی، روشنائی کے دھبے لگی پرانی سی میز جس پر دھول پڑی تھی۔ تین چار گھٹیا سی کرسیاں، جن میں سے ایک کا ہتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ اُسے ہچکچاتے دیکھ کر اُنھوں نے جیب سے رومال نکال کر ایک کرسی جھاڑی اور بولے "آیئے۔ آیئے نا!" وہ اندر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پُڑیا اور بیگ میز پر رکھ دیا۔ اُنھوں نے باہر کی طرف جھانک کر ایک پولیس والے کو اشارے سے بُلایا۔ صفیہ سن سے رہ گئی۔ اب کیا ہوگا؟

"دو چائے منگواؤ!" وہ پولیس والے سے بولے۔ وہ صفیہ کو غور سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

پھر اُنھوں نے میز کی دراز کھینچی اور اُس میں دُور تک ہاتھ ڈال کر ایک کتاب نکالی۔ ہاتھ سے اُسے تھپتھپا کر اُس کی دھول جھاڑی۔ پھر کتاب کو صفیہ کے سامنے رکھ کر اُنھوں نے پہلا صفحہ کھول دیا۔ بائیں ہاتھ پر نذر الاسلام کی تصویر تھی اور ٹائیٹل والے صفحے پر دھندلی روشنائی سے انگریزی میں لکھا تھا "شنیل داس گپتا۔ ڈھاکہ ۱۹۴۶ء"

تھے۔ جس دن ہم آ رہے تھے، اُس سے ٹھیک ایک برس پہلے میں نے یہ کتاب خریدی تھی۔ پھر ہم کلکتے رہے اور وطن آتے جاتے تھے۔"

"وطن ؟" صفیہ نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں! میں نے آپ سے کہا نا کہ میرا وطن جلپائی گوڑی ہے۔" اُنھوں نے ذرا بُرا مان کر کہا۔

"ہاں ہاں! ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" صفیہ اُنھیں کسی طرح خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"پہلے تو بس اِدھر ہی کسٹم تھا۔ اب اُدھر بھی کچھ گول مال ہو گیا ہے۔ اُنھوں نے چائے کی پیالی صفیہ کی طرف کھسکائی اور خود دو بڑے بڑے گھونٹ بھر کر بولے "ویسے تو ڈاب کلکتے میں بھی ہوتا ہے، جیسے نمک یہاں بھی ہوتا ہے پر ہمارے یہاں کے ڈاب کی کیا بات ہے۔ ہماری زمین کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔"

اُٹھتے وقت اُنھوں نے پُڑیا اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چلنا شروع ہوا۔ صفیہ اُن کے پیچھے ہولی۔ پلیٹ فارم پر آ کر اُنھوں نے صفیہ کے ہاتھ سے بیگ لے کر اُس میں خود پُڑیا رکھی اور ایک قلی کو بُلا کر سامان باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔ اور اس تمام عرصے میں زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ جب صفیہ باہر جانے کو پُل چڑھ گئی تو اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک وہاں سر جھکائے چُپ چاپ کھڑے تھے! پُل سے اُترتے وقت وہ سوچتی جا رہی تھی کہ کس کا وطن کہاں ہے۔ وہ جو کسٹم کے اِس طرف ہے یا اُس طرف !!

غزلیں

سید یزدانی جالندھری

کچھ بزم میں آہِ دلِ سوزاں کی تپش ہے
کچھ شعلۂ رُخسارِ نگاراں کی تپش ہے

کچھ سرخیٔ خونِ دلِ مضطر بھی ہے شامل
اشکوں میں جو سوزِ غمِ پنہاں کی تپش ہے

ہے سرد بہت اہلِ زمانہ کی محبت
کس درجہ خنک گردشِ دوراں کی تپش ہے

بے وجہ سُلگتا نہیں زُلفوں کا تصوّر
سب گرمیٔ افکارِ پریشاں کی تپش ہے

مہتاب کی ٹھنڈک میں بھی پنہاں ہے کوئی آگ
سورج میں جو اک سوزِ نمایاں کی تپش ہے

کس ڈھب سے سُلگتے ہیں یہ صد پارہ شگوفے
جیسے یہ مرے چاکِ گریباں کی تپش ہے

گزرے گا کوئی آبلہ پا آج یقیناً
کیوں ورنہ فزوں ریگِ بیاباں کی تپش ہے

کچھ اور دہکنے دو ابھی لالہ و گل کو
[illegible] گلستاں کی تپش ہے

[illegible]
[illegible] کی تپش ہے

سید حباب ترمذی

بے پیے تشنہ کام کیا کرتے
مے نہ ہوتی تو جام کیا کرتے

سو گئے گیسوؤں کے سائے میں
اور ہم زیرِ دام کیا کرتے

جُنبشِ لب تو خیر ممکن تھی
لیکن اُن سے کلام کیا کرتے

جان دے دی حصولِ مقصد پہ
کوششِ ناتمام کیا کرتے

پی رہے تھے نگاہِ ساقی سے
رند بے روائے جام کیا کرتے

غم ہی اوّل ہے، غم ہی آخر ہے
قصۂ غم تمام کیا کرتے

چند چھینٹے دکھا کے دامن پر
ہم شہیدوں میں نام کیا کرتے

زندگی کی طویل راہوں میں
ہر قدم پر قیام کیا کرتے

[illegible]



سپنوں کی رہگذر میں

کرشن چندر۔ ایم، اے

اِس سے پہلے کیا ہوا؟

میرا نام موتی لال ناگر ہے۔ میں ایک مصوّر ہوں۔ مجھے یہ دُنیا حقیقی نہیں معلوم ہوتی۔ میرا اعتقاد روحانی اور پُراسرار چیزوں پر بہت ہے۔ کبھی کبھی عالمِ خیال میں مجھے دو گلابی پاؤں نظر آتے ہیں اور یہ پاؤں مجھے اپنی جانب بُلاتے ہیں۔ مجھے اِس دُنیا کی عورتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اِس لئے میرے ماں باپ میری شادی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ میں محکمۂ آثارِ قدیمہ میں ملازم ہوں۔

۱۹۵۸ء کے ماہ جون میں مجھے یکایک محکمۂ آثارِ قدیمہ کی طرف سے بیدرواہ کی ہمالیائی وادی میں جاکر وہاں کے غاروں کی تصویریں نقل کرنے کا حکم مِلا۔ بیدرواہ جانے کا راستہ بے حد دشوار گزار ہے۔ وہاں نہ ریل جاتی ہے، نہ موٹر۔ خچروں پر سامان لادکر بڑی مشکل سے کئی دن کی مسافت کے بعد وہاں پہنچا اور ایک پُرانے راجپوتی قلعے میں قیام کیا۔ جس کا آدھا حِصّہ ڈھہ چکا تھا۔ قلعے کے بیرے، باورچی اور اردلی شنکر نے مجھے رات کو اُس قلعے میں سونے سے منع کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ قلعہ میں بھوت ہیں اور جو بھی یہاں رات کو سوتا ہے، مر جاتا ہے۔ یہ سوچ کر میں اور بھی رات کو سونے کے لئے مضطرب ہو گیا۔ شنکر کو قلعہ سے نکال کر میں سب دروازے اور چٹخنیاں بند کر کے سو گیا۔ آدھی رات کو آنکھ کھُلی تو محسوس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں میرے کمرے کی طرف بڑھا آ رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ دوسرے ہاتھ میں بندوق لے کر دروازہ کھولا تو دیکھا، دو بلّیاں تھیں ــــ اطمینان سے ساری رات سویا۔ صبح گاؤں کے نمبردار روپی داس کو لے کر غاروں کی طرف اپنا کام کرنے کے لئے چلا گیا۔ جس پہاڑ میں غار تھے، اُس پہاڑ کی سر سبز اور پُر فضا گھاٹی پر نسیمہ کا کاٹج تھا۔ نسیمہ یہاں اپنے بیمار شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ محمود جو بے حد دولت مند آدمی تھا لیکن آتشزدگی میں چہرہ جل جانے سے دُنیا سے منہ موڑ کر یہاں آن چھُپا تھا۔ اُسے کینسر کا لاعلاج روگ بھی تھا۔ وہ دل و جان سے نسیمہ کو چاہتا تھا۔ اِسی لئے اُسے شہر کے ہنگاموں سے نکال کر اِس ویرانے میں لے آیا تھا۔ نسیمہ دس سال سے اُس کی خدمت کر رہی تھی لیکن اپنی جوانی کے تباہ ہونے پر غمزدہ تھی۔ محمود سے شادی کرنے سے پہلے اُسے ایک غریب نوجوان اکرم سے محبت ہو گئی تھی لیکن اُس نے اُسے ٹھکرا کر محمود سے شادی کر لی تھی اور اب یہی شادی اُس کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا، وہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔

نسیمہ مجھے خود غاروں میں تصویریں دکھانے کے لئے لے گئی۔ کانگڑہ اسکول کی پُرانی کلاسیکی تصویریں تھیں۔ خوبصورت اور بیش بہا! نسیمہ نے میرے ساتھ کھانا کھایا اور واپس اپنے گھر چلی گئی۔

اب آگے پڑھئے . . .

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ رودی داس نے آکر مجھ سے کہا: "صاحب واپس چلئے ورنہ قلعہ تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا۔"

میں نے اپنا سامان بند کر کے رودی داس کے حوالے کیا اور غار سے نکلا۔ ہم تیز تیز قدموں سے بیدر واہ کے غاروں کی گھاٹی اُترنے لگے۔ رچرڈز کاٹج تک پہنچتے پہنچتے سورج غروب ہو گیا۔

رچرڈز کاٹج کے دروازے پر نسیمہ کھڑی ملی۔ اُس کی آنکھیں روروکر سوجی ہوئی تھیں اور اُس کا چہرہ لال تھا۔ اُس کی گلابی ٹھوڑی پر ایک آبلہ اُبھر آیا تھا۔ میں نے رودی داس کو آگے جانے کی ہدایت کی اور خود چوبی گیٹ کے اِس طرف کھڑا ہو گیا۔ دوسری طرف نسیمہ کھڑی تھی۔ اُس نے آنکھیں جھکاتے ہوئے سسکیاں لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"انھوں نے منع کر دیا ہے۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی!"

میں نے پوچھا: "یہ تمھاری ٹھوڑی کو کیا ہوا ہے؟"

"اپنے سگار کی جلتی ہوئی راکھ انھوں نے مجھ پر پھینک دی ــــ" وہ رُک رُک کر بولی۔

پھر میرا بھی سر جھک گیا۔ بہت دیر تک میں چپ رہا۔ آخر میں نے کہا: "وہ بیمار ہیں۔ انھیں معاف کر دو!"

"تم ایسا کہہ سکتے ہو" وہ گہری تلخی سے بولی: "کیونکہ تمھیں کسی کال کوٹھری میں بند کر کے دس سال تک کسی کی تیمارداری پر مجبور نہیں ہونا پڑا ہے لیکن مجھے نفرت ہے! نفرت ہے!! نفرت ہے!!!" وہ شدید تلخی سے بولی۔ پھر پلٹ کر تیز تیز قدموں سے واپس چلی گئی۔

سارے راستے میں نسیمہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ کبھی تو مجھے اُس سے ہمدردی ہو جاتی۔ کبھی نفرت۔ کتنی خود غرض عورت ہے۔ اُس کا خاوند مر رہا ہے لیکن وہ صرف اپنی خوشی کے بارے میں سوچتی ہے لیکن نہیں، اتنی بُری عورت بھی نہیں ہے۔ دس سال سے اِس جنگل بیابان میں پڑی ہے۔ کوئی دوسری ہوتی تو اب تک اُکتا کر بھاگ گئی ہوتی۔ آخر ایک نوجوان عورت کی زندگی اور جوانی کے بھی کچھ مطالبے ہوتے ہیں۔ اُن کا خیال کرتا ہوں تو نسیمہ بہت بہادر عورت معلوم ہوتی ہے۔ کاش! وہ اپنی قربانی کی خود بھی قدر کر سکتی لیکن وہ تو نفرت کرتی ہے اپنے آپ سے، اپنے شوہر سے، اپنے ماحول سے۔ یوں کسی کے بارے میں حکم لگانا آسان نہیں ہے۔ ذرا میں اپنے آپ کو دس سال تک کیا دس ماہ تک ہی اِس ماحول میں رکھ کر دیکھوں؟ شاید مجھے بھی نسیمہ سے ہمدردی ہو جاتی!

راستے بھر دل اِنہی متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ جب قلعہ کے قریب پہنچا تو شفق ڈوب چکی تھی۔ ایک گہرے سرمئی غبار نے ساری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جب لکڑی کے پُل پر پہنچے تو شنکر لالٹین ہاتھ میں لئے کھڑا ملا۔ مجھے دیکھ کر کچھ کہے بغیر پلٹ کر پُل پر راستہ دکھاتے ہوئے واپس چلنے لگا۔

جب قلعہ کے اندر ہال میں پہنچے تو یکایک ایسا معلوم ہوا جیسے کالی اندھیری رات آگئی۔ قلعہ کے مہیب پُراسرار ماحول نے مجھے چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لے لیا۔ جیسے یکایک باہر کی دُنیا سے میرا رشتہ کٹ گیا۔ میں صدیوں پیچھے پُرانے مانوس اجنبی ماحول میں سانس لینے لگا۔

رودی داس کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا تو میں نہانے کے لئے چلا گیا۔ نہا کر کپڑے بدل کر نکلا تو شنکر نے بتایا کہ کھانا تیار ہے۔ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آیا تو کچھ دیر کے بعد شنکر اپنے کام سے فارغ ہو کر میرے پاس آیا۔ آج اُس کے چہرے پر کل سے بھی زیادہ پریشانی تھی۔ کچھ دیر چُپ چاپ کھڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں پھر اُس بحث میں اُلجھوں۔ میں اُسے کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اِس لئے میں نے ذرا مضبوط لہجے میں اُس سے کہا۔

"چابیاں یہاں چھوڑ جاؤ۔ صبح آجانا۔"

شنکر ابھی تک وہیں میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار تھیں یکایک وہ بول پڑا۔

"میں نے صاحب کے لئے نیچے کے ڈاک بنگلے میں کمرہ ٹھیک کر دیا ہے۔ صاحب وہاں چل کر سوئیں۔"

"نہیں ــــ!" میں نے اُس سے بہت سختی سے کہا: "میں یہیں اسی کمرے میں اِسی قلعہ کے اندر سوؤں گا! اور جب تک بیدر واہ میں رہوں گا یہیں سوؤں گا! چلے جاؤ!"

میں نے ایسی سختی سے اُس سے کہا کہ شنکر چند لمحوں کے لئے سہم گیا۔ پھر اُس نے آہستہ سے مایوسی سے سر ہلایا اور گردن جھکا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

کل کی طرح بڑے ہال کا دروازہ میں نے خود بند کیا۔ سارے کمروں کے بند دروازوں کو اچھی طرح سے ہلا کر دیکھا۔ دونوں غلام گردشوں کی بند کھڑکیوں کا غور سے جائزہ لیا۔ پھر اپنے کمرے میں آبیٹھا۔ اب دیکھتے ہیں بھوت کدھر سے آتا ہے میں نے اپنی پتھری ناشپاتی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔

دیر تک بستر پر نیم دراز حالت میں لیٹا پڑھتا رہا لیکن نیند نہیں آئی تھی۔ اِس قلعہ کا ماحول واقعی نیند کے لئے سازگار نہیں ہے۔ اِتنا تھکا ہوا ہوں پھر بھی نیند نہیں آتی۔ قلعہ کا ہولناک سناٹا دھیرے دھیرے میرے حواس پر مسلط ہونے لگا۔ ایک دیوزاد پیکر کی موہوم صورت اختیار کر کے مجھے ڈرانے لگا۔ ایسا محسوس

ہو جیسے قلعہ کی ہر دیوار میں آنکھیں ہیں اور وہ چاروں طرف سے مجھے گھور رہی ہیں۔ انھیں میری موجودگی گوارا نہیں ہے۔ اس لئے انتہائی نفرت اور غصّے سے گھورتی ہوئی مجھے گھور رہی ہیں۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے دل سے اس خیال کو دُور کر دینا چاہا اور اپنی پُوری توجہ کتاب پر مرکوز کر دی لیکن پھر حروف آپس میں مدغم ہو کر عجیب عجیب خوفناک شکلیں بنانے لگے۔ میں نے کتاب بند کر دی۔ لیمپ کی بتی نیچے کر دی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کمرے کی نیم تاریک دیواریں پُر اسرار لبادے اوڑھے ہوئے یکایک میرے بستر کے قریب آگئیں اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ لیمپ کی بتی اونچی کی اور پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔

لاحاصل مطالعہ تھا۔ کوئی حرف پلّے نہ پڑتا تھا۔ کوئی فقرہ سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن میں میکانکی انداز میں اپنے ذہن کو تھکانے کے لئے پڑھتا گیا، پڑھتا گیا یہاں تک کہ میرے پپوٹے ذہن کی تھکن سے بوجھل ہو کر جلنے لگے۔ پھر ایک عجیب سہمی سہمی سی غنودگی کی باہوں سے لپٹ کر میں نے اپنا سر تکیہ پر رکھ دیا اور کتاب اپنے سینے پر۔ پھر مجھے معلوم نہیں میں کب سو گیا۔

میں اپنے بستر پر لیٹا تھا اور میرے چاروں طرف ایک عجیب سی نیم تاریک دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں اُس تاریکی سے بچ کر کہیں نہ جا سکتا تھا۔ اب کوئی آسمان نہ تھا، کوئی زمین نہ تھی۔ میں خوابوں کی دُھندلی دُھندلی فضاؤں میں لیٹا تھا اور میرے چاروں طرف دُھند چھائی ہوئی تھی۔ یہ دُھند چاروں طرف سے تاریک تھی اور بیچ میں نیم تاریک نیم روشن لیکن مدھم مدھم ہالے سے جھلملا رہے تھے۔ یہ دُھند میرے چاروں طرف سانسیں لے رہی تھی۔ لمبی لمبی آہوں اور کراہوں سے مشابہ سانسیں۔ پھر اُس دُھند کے ہالے میں مجھے دو گلابی چرن کمل چلتے ہوئے نظر آئے۔ وہ دھیرے دھیرے میرے بستر کے قریب بڑھ رہے تھے۔ میں نے اُنھیں دیکھا اور پہچان لیا۔ وہ گلابی گلابی نازک خطوط کی طرح ترشے ہوئے پاؤں! میں نے اُن پاؤں کے اوپر دیکھا۔ اوپر پھر دُھند تھی لیکن میرے نیم خوابیدہ ذہن میں جیسے اِس سفید دُھند میں ایک سفید ساڑی کے خم واضح ہونے لگے۔ یہ ساڑی سرسراتی ہوئی دُھند میں ملتی گھُلتی ہوئی میری طرف چل رہی تھی۔ میں نے اور اوپر دیکھا۔ دُھندلے دُھندلے آنچل میں لپٹا ہوا ایک سپید چہرہ مجھے نظر آیا۔ اُس چہرہ پر سُرخی کی ایک لکیر نہ تھی۔ یہ چہرہ برف سے تراشا ہوا تھا یا سنگِ مرمر سے! ناک ستواں، غنچہ دہن، آنکھیں جھُکی ہوئی اور سندر اور ماتھے پر موت کی شبنمی تنویر۔ وہ سفید ساڑی میں ملبوس پیکر میرے قریب آتا گیا۔ میرے قریب آتا گیا۔ وہ چہرہ سوگوار اور اُداس، باریک نازک اور اُجلا، صبح کے اُترتے ہوئے اندھیروں میں چمپلی کا چمکتا ہوا پہلا پھول! وہ چہرہ اب جیسے میرے اوپر جھُکا ہوا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، یکایک دو آنکھیں مجھ پر کھُلیں اور میں ... گویا انتہاہ گہرائیوں میں کھو گیا۔ مجھے احساس نہ رہا کہ میں کہاں ہوں۔ یہ خواب ہے یا حقیقت ـــــ دونوں کا امتزاج یا وہم ـــ یا آرزو ـــ یا صدیوں کی چاہت اور تڑپ! پھر اُس غنچہ دہن کے ہونٹ وا ہوتے اور ایک گہری سسکی کے ساتھ دھیمی دھیمی سانسوں میں اُلجھے ہوئے لہجہ میں مجھ سے کہنے لگی "آہ! میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ میرا دم گھُٹ رہا ہے۔ مجھے بچا لو۔ مجھے بچا لو... مجھے یہاں سے نکالو..."

میں نے اُس چہرہ کو چھُونے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ یکایک وہ چہرہ دُھند کی سطح پر پانی کے عکس کی طرح تھرتھرانے لگا۔ دُھند کی لہروں میں معدوم ہونے لگا۔ معدوم ہوتا گیا، گم ہو گیا۔ اب میرے چاروں طرف دُھند ہی دُھند تھی اور دُھند کے گہرے دھوئیں سپید سپید بادلوں کی طرح میرے چاروں طرف اُڑ رہے تھے۔

یکایک میں چونک کر جاگ گیا۔

کمرہ میں کوئی نہ تھا۔ لیمپ کی روشنی مدھم ہو کر جھلملانے لگی تھی۔ دیواروں پر لمبے لمبے سائے ناچ رہے تھے اور کتاب میرے سینے پر رکھی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی اس کمرہ سے ہو کر گیا ہو۔

لیکن نہیں! یہ میرا وہم تھا۔ کمرہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ غسل خانہ خالی تھا، غسل خانہ کی کھڑکی بھی بند تھی اور غسل خانہ کا دروازہ جو دوسرے کمرہ میں کھُلتا تھا وہ بھی دوسری طرف سے بند تھا۔ آنے جانے کی اور کوئی راہ نہ تھی۔ یقیناً کوئی یہاں نہ آیا تھا۔ ضرور میں نے خواب دیکھا ہے۔

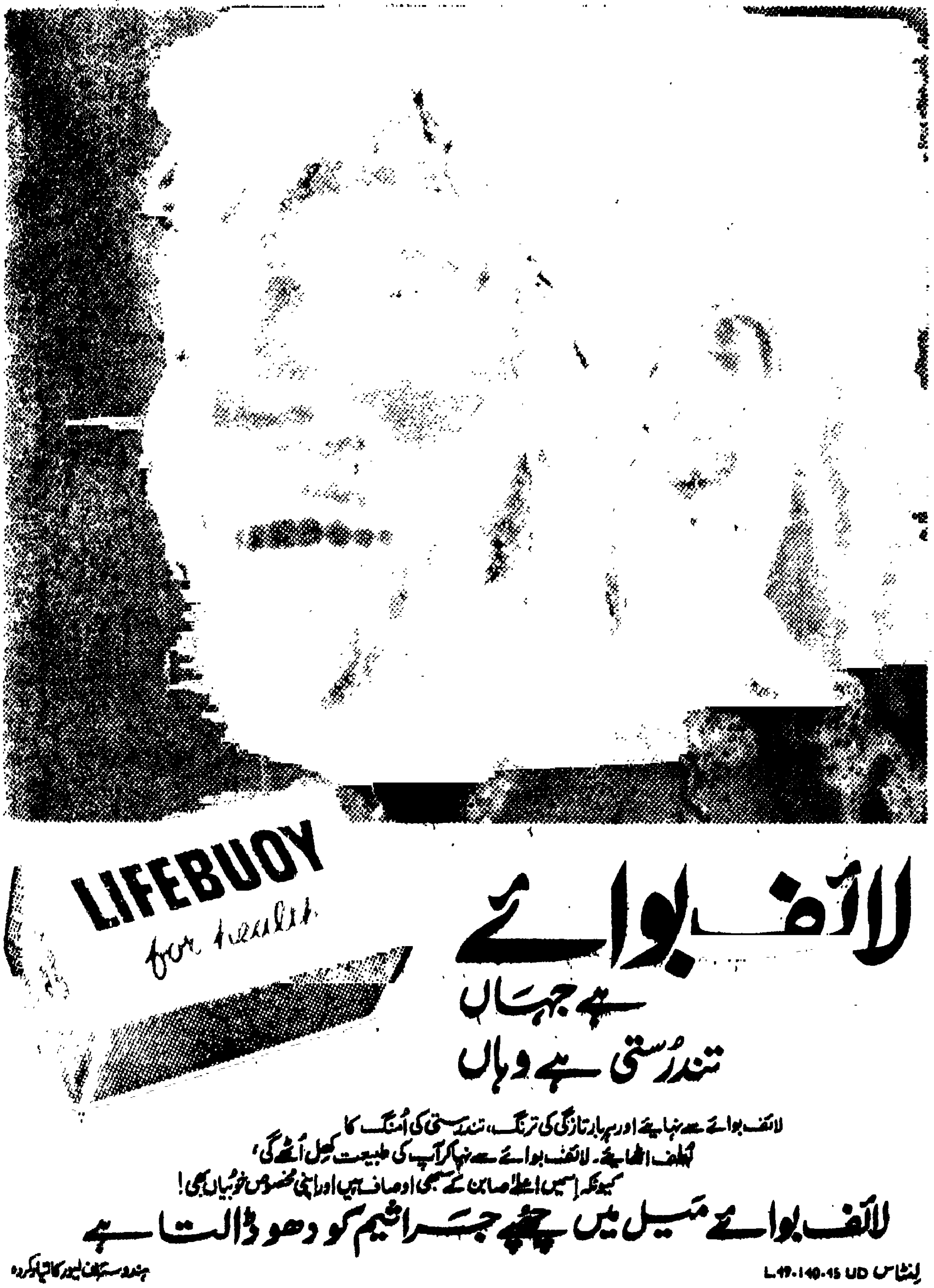
لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ذہن پر یہ احساس غالب تھا کہ ابھی ابھی کوئی یہاں سے ہو کر گیا ہے۔

میں ساری رات سو نہ سکا۔ کتاب گود میں لئے پڑھتا رہا، یہاں تک کہ صبح کے آثار نمودار ہونے لگے۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف جا کر غلام گردش کی ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ قلعہ کا بڑا دروازہ نیچے جا کر کھول دیا اور پھر ڈرائنگ ٹیبل پر جا کر شیو کرنے لگا لیکن ذہن میں ابھی تک وہ سپید ہنستا ہوا چہرہ گھوم رہا تھا اور گھُوم گھُوم کر آنکھوں میں آجاتا تھا اور کسی طرح ذہن سے اوجھل نہ ہوتا تھا۔

پھر شنکر چائے لے کر آگیا۔ اُس نے کچھ کہا تو نہیں لیکن اُس کی پھٹی پھٹی پریشان نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اب تک میں زندہ کیسے ہوں؟ لیکن وہ میرے تیور دیکھ کر مجھ سے کچھ کہنے کی جُرأت نہ کر سکا۔ میں بھی اُس سے رات کا خواب بیان کر کے اُس کی پریشانی میں اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

آخر میں نے جلدی جلدی غُسل کیا۔ بہت جلدی ناشتہ کیا۔ روی داس کے


LIFEBUOY
for health
لائف بوائے
ہے جہاں
تندرستی ہے وہاں
لائف بوائے سے نہایئے اور ہر بار تازگی کی ترنگ، تندرستی کی اُمنگ کا
لُطف اٹھایئے۔ لائف بوائے سے نہا کر آپ کی طبیعت کھِل اُٹھے گی،
کیونکہ اِسمیں اعلےٰ صابن کے سبھی اوصاف ہیں اور اپنی مخصوص خوبیاں بھی!
لائف بوائے مَیل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے
لِنٹاس L.49.140-45 UD
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

آنے سے پہلے ہی شنکر کو ساتھ لے کر قلعہ سے باہر نکل گیا۔ میرا ارادہ نیا ڈاک بنگلہ دیکھنے کا تھا۔ شاید وہیں رہنے کی نوبت آجائے۔ شنکر نے کچھ کہا تو نہیں لیکن میری خواہش کے اظہار پر وہ خوش ضرور معلوم ہوتا تھا۔

قلعہ کے قدموں میں ندی کے پل پار کر کے غربی جانب کوئی سو گز کے فاصلہ پر نسبتاً ایک میدانی جگہ پر نیا ڈاک بنگلہ بنایا گیا تھا۔ جدید وضع کا ڈاک بنگلہ۔ جیسے دوسرے ہزاروں ڈاک بنگلے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی ــــ یہ مسافروں کے لئے بنایا گیا تھا۔ جدید سامان سے آراستہ۔ یہ سامان بھی ہزار بار دوسری جگہ دیکھ چکا تھا۔ ایک عجیب جانی پہچانی پھیکی میٹھی کیفیت اس ڈاک بنگلہ میں تھی۔ جیسی ہر ڈاک بنگلہ میں ہوتی ہے۔ جدید زندگی کی یک رنگی اپنے آپ کو اس قدر دہراتی ہے کہ زندگی زندگی نہیں، فارمولا معلوم ہوتی ہے۔

اس ڈاک بنگلہ کے بالکل قریب ایک طرف شنکر کے لئے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا کاٹج تھا لیکن پتھر کا نہیں چیر کی لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ چھت بھی لکڑی کی تھی جس پر خشک جھاڑیاں بچھا کر مٹی کوٹ کوٹ کر ڈالی گئی تھی۔ اس مٹی پر اب گھاس اُگ آئی تھی۔ البتہ اس چھت کے بیچ میں پتھر کی ایک چمنی تھی جس سے اب تک ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔

یہاں سے درختوں کے کنج میں گھرا ہوا مندر کا کلس بہت قریب نظر آنے لگا۔ میں نے شنکر سے کہا۔

"چلو مندر بھی دیکھ لیں۔"

مندر کا ٹیلہ قلعہ سے نیچا تھا، پھر بھی کافی اونچا تھا۔ مندر تک جانے کے لئے پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے گنیں۔ اکیاون سیڑھیاں تھیں۔ ٹیلے کے چاروں طرف دیودار اور چیڑ کے درخت تھے لیکن جوں جوں اوپر چڑھتے گئے پھلدار درختوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ناشپاتی کے پیڑ اور سیب کے درخت اور انار کے پیڑوں سے لپٹ کر انگور کی بیلیں جھولتی ہوئی، جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں تھیں اور فضا میں شہد کی مکھیوں کی گونج تھی۔

سیڑھیاں چڑھ کر مندر کا بڑا دروازہ نظر آیا جس کے اندر دیواروں سے گھرا ہوا ایک چوکور احاطہ تھا۔ دیواروں کے کنارے کنارے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ ایک طرف تلسی کا چھوٹا سا دیول تھا، دیول کے آگے پھر گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ تھا۔ اس سے آگے گیارہ سیڑھیوں کا اور پتھر کا ایک زینہ تھا۔ زینے کے اوپر سیاہی مائل پتھروں کا مندر سر پر پیتل کے کلس کا تاج پہنے ہوئے سورج کی پہلی دھوپ میں جگمگاتا نظر آیا۔

میں صحن کے اندر پہنچ کر تلسی کے دیول کے پاس سے گزرتا ہوا مندر کے آخری زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر شنکر سے کچھ کہنے کے لئے پیچھے جو مڑا تو اچانک ٹھٹک کر رہ گیا۔

تلسی کے پرانے شکستہ دیول کے پیچھے سے دو گلابی چرن کمل نمودار ہوئے تھے۔ بے حد سُندر نازک پاؤں دھیرے دھیرے تلسی کے دیول کے بائیں طرف کی لمبی لمبی جھاڑیوں میں چلتے ہوئے! اور ایک سپید ساڑی کا پلّو ہوا میں لہراتا ہوا شاخوں کے پیچھے چھپتا ہوا، پھر جھاڑیوں کی باڑھ سے نکل کر یکایک ایک لڑکی میرے سامنے آگئی اور اُسے دیکھ کر ایک ہلکی سی چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔

یہ وہی لڑکی تھی، جو کل رات مجھے خواب میں نظر آئی تھی۔

میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ لڑکی بھی مجھے چونک کر دیکھنے لگی۔ وہی سپید ہنستا ہوا چہرہ اور سیب کے پھول کی طرح چھوٹا سا گلابی دہن۔ گہری کالی آنکھیں اداسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی ہوئی۔ سیدھی مانگ اور کھلے بال اور ہاتھ میں تلسی کی پوجا کی تھالی اور تھالی میں ایک چھوٹا سا دیا کسی کہ دور اُمید کی طرح ٹمٹماتا ہوا۔

وہ لانبی لانبی بوجھل پلکوں کے اندر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اجنبیت اور حیرت تھی۔ وہ آنکھیں دھیرے دھیرے مجھے ٹٹول رہی تھیں۔ وہ بڑی بڑی سیاہ پتلیاں جیسے میرے ارد گرد پھیل کر مجھے اپنے سیاہ ہالے میں لے رہی تھیں، چند ثانیوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میرے چاروں طرف اُن سیاہ پتلیوں کے سیّال کے سوا کچھ نہیں ہے۔

یکایک میرے کانوں میں شنکر کی آواز آئی "صاحب! یہ بھوانی ماتا کی پُجارن ہے"

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی میں نے بے اختیار شنکر سے کہا۔

"مگر یہ تو وہی لڑکی ہے جو رات کو میرے کمرہ میں آئی تھی، خواب بن کر یا بھوت بن کر۔"

لڑکی میری بات سُن کر چونکی، شنکر کا چہرہ ایکدم پیلا پڑ گیا۔

"تو کل رات حضور نے وہ بھوت دیکھ لیا؟"

"بھوت نہیں۔ بالکل یہی صورت تھی!"

"وہ یہ نہیں تھی" شنکر نے خوف سے کانپ کر کہا "اس کی بڑی بہن تھی"

میں حیرت سے اُس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"مندر سے باہر نکل کر میں آپ کو سب قصہ بتاؤں گا" شنکر نے میری بڑھتی ہوئی حیرت اور تجسس کو دیکھ کر کہا۔

لڑکی گھوم گئی۔ اب اُس کی پیٹھ ہماری طرف تھی اور اُس کے کھلے سیاہ لانبے بال کمر سے نیچے تک جھول رہے تھے۔ وہ تلسی کی پوجا کرنے لگی۔ میں کھڑا کھڑا اُسے

دیکھتا رہا۔ جب وہ تلسی کی پوجا کر کے مڑی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اُس سے پوچھا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ کچھ بولی نہیں۔ پوجا کی تھالی ہاتھ میں لئے کھڑی مجھے چپ چاپ دیکھتی رہی۔

"یہ بول نہیں سکتی" شنکر نے مجھ سے کہا۔

لڑکی چپ چاپ آگے بڑھ گئی اور مندر کی آخری سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

میں اُنہی دو گلابی چرن کملوں کو دیکھ رہا تھا جن کے اَن گنت دھندلے نقوش جانے کتنی بار مجھے اپنے ذہن کی پنہائیوں میں گھومتے دکھائی دئے تھے۔ میں اِس لڑکی کو نہیں جانتا لیکن اِن قدموں کو تو پہچانتا ہوں ـــــ یہ کیا راز ہے؟

میرے قدم ہولے ہولے آپ ہی آپ اُس کے پیچھے چلنے لگے۔ مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ مندر کے کھلے دروازہ کے اندر چلی گئی اور بھوانی ماتا کی سیاہ مورت کے آگے جھک کر پوجا میں مصروف ہو گئی۔ میں دروازہ کے باہر ہی سے ڈنڈوت کر کے واپس چلا آیا۔

"یہ ۱۹۴۷ء کا قصہ ہے صاحب!"

ہم مندر کے ٹیلے کے باہر ندی کے کنارے گھاس پر پاؤں پسارے بیٹھے تھے اور شنکر مجھ سے کہہ رہا تھا۔

"پنڈت رودی داس کا ایک چھوٹا بھائی تھا ہری داس۔ وہ اِس مندر کا پُجاری تھا۔ اُس کی بیوی مر گئی تھی۔ اولاد میں دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام شیونتی تھا، چھوٹی کا رتنا۔ بڑی کی عمر اُس وقت اٹھارہ سال کی ہوگی۔ یہ لڑکی رتنا اُس وقت آٹھ نو سال کی ہوگی۔

اِن لوگوں کا خاندان بہت پُرانا ہے صاحب! پرمار راجاؤں کے زمانے ہی سے اِس گاؤں کی نمبرداری اِس خاندان میں چلی آئی ہے۔ ایک بھائی نمبردار ہوتا ہے تو دوسرا مندر کا پُجاری۔ اگر ایک ہی اولاد ہو تو وہی نمبردار، وہی پُجاری۔ اِس مندر کے ساتھ بیس بیگھہ دھان کی زمین بھی ہے۔ معافی کی زمین جس کا لگان نہیں لیا جاتا۔

اُس زمانہ میں ابھی مُلک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ اِدھر علاقہ کا نیا کلکٹر جافرسن صاحب شکار کھیلنے کے لئے آیا۔ پڑاؤ قلعہ میں ڈالا۔ اُن دنوں قلعہ کی حالت بہت اچھی تھی۔ سرکاری کلکٹر صاحب کے ساتھ تیس بتیس آدمیوں کا عملہ تھا۔ صاحب بہادر اپنے ساتھ سب کھانے کے سامان مع کُک لاتے تھے۔ دن بھر شکار ہوتا، رات کو جشن ہوتا۔ خوب گہما گہمی ہوتی تھی۔ مجھے روز بخشش ملتی تھی۔ صاحب بہادر لوگ بہت بخشش دیتے تھے صاحب! آج کل ـــــ" وہ یکایک میری طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

میں نے اُس کے ہاتھ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھا۔ شنکر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حریص چمک آئی۔ اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے سلام کیا اور نوٹ جیب میں رکھ کر کہنے لگا۔

"ایک دن جافرسن بہادر نے رتنا کی بڑی بہن شیونتی کو مندر کے باہر ندی کے کنارے درختوں کے کُنج میں جھولا جھولتے دیکھ لیا۔ وہ اُس پر ریجھ گئے اور اپنے دل دے بیٹھے۔ رات کو کھانے کے بعد مجھے اپنے کمرہ میں بُلا کر کہنے لگے۔

"ویل شنکر بیرا ـــ تم بہت اچا!"

یہ کہہ کر اُنھوں نے مجھے دس کا نوٹ دیا۔ میں نے سلام کر کے لے لیا۔

"تم بہت بہت اچا!" کلکٹر بہادر پھر بولے اور دس کا ایک اور نوٹ مجھے دیا۔

میں نے پھر سلام کر کے اُسے لے لیا۔

"ہم تمھارا سروس سے بوت بوت کھُوش ہے!"

صاحب بہادر نے مجھے اب کے تیس روپے بخشش میں دئے۔ میں نے گر کر جھک کر اُن کو سلام کیا اور روپے لے لئے۔

وہ بولے: "ہم کو وہ مندر والا چھوکری مانگتا!"

میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔

صاحب بولا: "ہم اکدم وہ چھوکری مانگتا۔ تم ہم کو لا کے دے سکتا!"

میں نے خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ بولا: "ہم تم کو بہت بہت بخششیں دیگا۔ پچاس اور دیگا"

میں بولا: "سرکار مائی باپ وہ لڑکی شیونتی ـــــ مندر کے پُجاری کی لڑکی ہے۔ گاؤں کے سب سے بڑے براہمن اور سب سے پُرانے خاندان کی لڑکی ہے۔ اُسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا"

"ہم تم کو پچاس نہیں سَو دیگا! ہم وہ لڑکی مانگتا!"

میں بولا: "سرکار! پچاس کیا پچاس ہزار بھی ہو تو بھی نہیں لا سکتا۔ گاؤں میں بلوہ ہو جائے گا"

صاحب یہ بات سُن کر چپ ہو گیا۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

بس اِتنا کہا: "ڈِسمس!"

میں کمرے سے باہر چلا آیا۔

اُس کے بعد صاحب تین دن اور اِدھر رہا۔ شکار کھیلتا رہا لیکن پھر کبھی اُس نے شیونتی کی بات ہم سے نہیں کی۔ دو دن کے بعد اُس نے اپنا سارا عملہ واپس بھیج دیا۔

بس ایک گھوڑا اور اردلی رکھا۔ تیسرے دن رات کو شیونتی مندر سے غائب ہوگئی۔ چونکہ صاحب، جافرسن صاحب اپنا گھوڑا اور اردلی لے کر چلا گیا لیکن اتنی صبح گیا کہ اُسے جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔"

"تم کہاں تھے؟" میں نے شنکر سے پوچھا۔

"مجھے صاحب بہادر نے مُلے خیلے کی بیراگیری کرنے کے لئے تیراہ تک جانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ تیسرے دن جو لوٹا تو معلوم ہوا کہ شیونتی گھر سے غائب ہے اور صاحب بہادر جا چکا ہے۔ دو دن تک ہری داس اپنی بیٹی کو ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ اُسے کہیں نہ ملی تو ندی میں ڈوب کر مر گیا۔ اُس دن سے اِس لڑکی رتنا کی زبان بند ہوگئی ہے اور یہ کسی سے بات نہیں کرتی۔ بس دن رات بھوانی ماتا کی پوجا میں مگن رہتی ہے۔ اِس نے دُنیا چھوڑ دی ہے۔"

"ہوں!" میں نے اُس سے پوچھا۔ "شیونتی کا کچھ پتہ چلا پھر؟"

"نہیں سرکار!" شنکر بولا۔ "گاؤں والوں کے شور مچانے پر ایک بار ہری داس کا بڑا بھائی ہمت کر کے آلوک پور گیا اور سرکار سے سب قصہ بیان کیا لیکن اُن دنوں دیش تقسیم ہو رہا تھا اور جافرسن صاحب ولایت چلا گیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں جافرسن صاحب شیونتی کو اپنے ساتھ ولایت لے گیا اور وہ وہاں پر بہت خوش ہے۔ سایہ پہنتی ہے، لپ اسٹک لگاتی ہے اور انگریزی میں گٹ پٹ کرتی ہے اور بہت خوش ہے۔ کچھ لوگ بولتے ہیں جافرسن صاحب نے لڑکی کو رات بھر قلعہ میں رکھا، اُس کی عزت لے کر اُسے جان سے مار ڈالا اور اُس کی لاش کو گھوڑے پر لے جا کر جنگل میں کہیں پھینک دیا۔ جتنے منہ اُتنی باتیں لیکن یہ سچ ہے صاحب! اُس دن سے شیونتی کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ نہ وہ ملی نہ اُس کی لاش۔ اب اُس کا بھوت اِس قلعہ میں جہاں اُس کی عزت لی گئی تھی، رات کو گھومتا ہے اور قلعہ میں رہنے والوں کو ڈراتا ہے۔ اُس دن کے بعد سے اِس قلعہ میں کوئی نہیں ٹھہرتا۔ اگر ٹھہرتا ہے تو دوسرے ہی دن بھاگ کر نیچے ڈاک بنگلہ میں آجاتا ہے۔ میں خود قلعہ میں نہیں سوتا ہوں اور جو صاحب لوگ اِدھر آتا ہے اُسے خبردار کر دیتا ہوں۔ ایک انجینئر صاحب نہیں مانتے تھے تو اُن کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا سرکار! شیونتی کا بھوت بہت خطرناک ہے۔ میں آپ کے پاؤں پکڑ کر کہتا ہوں، رات کو قلعہ میں مت سویئے!"

شنکر پھر پاؤں پکڑنے لگا۔ میں نے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ "دیکھا جائے گا! تم اپنا کام کرتے جاؤ۔"

میں نے پھر بہت سختی سے انکار کر دیا لیکن دل اندر سے بہت ڈر رہا تھا۔

دن بھر غاروں میں خاک چھاننے کے بعد جب لوٹا تو راستہ میں رچرڈز کاٹیج کے چوبی گیٹ پر اندر کی طرف تالا لگا ملا۔ رچرڈز کاٹیج کا بنگلہ بالکل سنسان تھا اور پورچ میں بھی کرسیاں نہیں لگی تھیں لیکن پورچ کے اندر بند دروازوں کے پیچھے روشنی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ نسیمہ کا حاسد خاوند اپنی بیوی کو حراست میں لئے بیٹھا ہے۔ یہ سوچ کر ایک لمحہ کے لئے میرے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور دوسرے لمحہ نسیمہ کی دردناک حالت پر مجھے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ تیسرے لمحے بے اختیار میرے قدم نیچے قلعہ میں جانے والے راستہ پر مڑ گئے۔ حالانکہ دن کو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رات کو قلعہ میں نہیں نیچے کے ڈاک بنگلہ میں رہوں گا لیکن جوں جوں قلعہ قریب آتا جا رہا تھا، میرا ارادہ کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ جب قلعہ کے اندر پہنچا تو کسی انجانی غیبی اور پُراسرار طاقت نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں اِس ماحول سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کوئی عجیب و غریب کشش تھی جو مجھے اپنے کمرہ کی جانب بلا رہی تھی۔ میں ہال میں زیادہ دیر نہ رُک کر سیدھا اوپر اپنے کمرہ کی جانب چلا گیا۔

جب کمرہ کے اندر پہنچا تو دیکھا کہ میرا سامان غائب ہے۔ شنکر میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"میرا سامان کہاں ہے؟" میں نے اُس سے ڈپٹ کر پوچھا۔

"نیچے ڈاک بنگلہ میں پہنچا دیا۔"

"کیوں؟"

"صاحب نے بولا تھا نا کہ آپ رات کو نیچے سوئیں گے۔"

"نہیں!" میں نے اُس سے کہا۔ "میں یہیں سوؤں گا! سامان واپس لاؤ۔"

"صاحب!" شنکر کا چہرہ اُتر گیا تھا۔

"میں کچھ سُننا نہیں چاہتا۔ سامان واپس لاؤ۔"

شنکر کچھ دیر کھڑا میرا منہ دیکھتا رہا، پھر چُپ چاپ کمرہ سے باہر نکل گیا اور چند منٹوں کے بعد سامان واپس لے آیا۔

آج میں نے شنکر سے نوکر خانہ کی چابی بھی لے لی۔ اگر یہ بھوت باہر سے آتا ہے تو نوکر خانہ کی طرف سے بھی آسکتا ہے۔ میں نے اُس سے ساتھ والے کمرہ کی چابی بھی لے لی جس کا دروازہ میرے غسل خانہ میں کھلتا تھا۔ ہوسکتا ہے کوئی اُس کمرہ سے اِدھر کے غسل خانہ میں آکر میرے کمرے میں آجاتا ہو۔ اب مجھے اِس بھوت کا صحیح سراغ لگانا ہی پڑے گا۔

شنکر کے جانے کے بعد میں نے ہال کا بڑا دروازہ اچھی طرح سے بند کیا۔ نوکر خانہ کو اپنے ہاتھ سے تالا لگایا۔ باہر سے آنے جانے کے سارے راستے بند کر کے میں اپنے کمرہ میں آگیا۔ پھر اُٹھ کر ساتھ والے کمرہ کو کھول کر اُسے اندر سے غور سے دیکھا۔ دونوں چٹخنیاں اچھی طرح چڑھا کر باہر نکل کر اُس کا دروازہ بھی خوب دیکھ داکھ کر بند کر کے اپنے کمرہ میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ تہیہ کر لیا کہ آج رات پھر نہیں سوؤں گا! دیکھوں گا یہ

بھوت کدھر سے آتا ہے۔

دیر تک پڑھتا رہا، دیر تک پڑھتا رہا۔ آخر جب نیند نے زور مارا تو غسل خانہ میں جا کر پانی کے چھینٹے منہ پر مارے اور پھر آکر پڑھنے لگا۔ پھر بھی جب نیند آنے لگی تو اٹھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایزل سامنے کھڑا کر کے غاروں میں بنائے ہوئے پنسل سکیچ میں رنگ بھرنے لگا۔ پھر جب غنودگی کے غلبے سے رنگ بھی گڈمڈ ہونے لگے تو ایزل سے ہٹ کر پھر اپنے بستر پر آگیا اور پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگا لیکن نیند آستے چلی جا رہی تھی۔ پپوٹے بہت مشکل سے کھلے رکھ سکتا تھا۔ بار بار آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ پھر معلوم نہیں کب ایک لمبی جھپکی سی آگئی اور میں مسہری پر نیم دراز حالت میں لیٹے لیٹے نیم مدہوشی کے عالم میں اپنے حواس کھونے لگا۔

عجیب سوتے جاگتے کا عالم! کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے سو رہا ہوں، کبھی ایسے جیسے جاگ رہا ہوں۔ سب سے پہلے ایک عجیب تیز سی خوشبو میرے نتھنوں میں آئی، کچھ کچھ کافور سے ملتی ہوئی لیکن بے حد تیز! حواس تاریک دھندلکوں میں کھونے لگے اور کوشش کے باوجود ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چاروں طرف تاریک دھند پھیل رہی ہے۔ وہ تیز سی خوشبو دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی لیکن اس خوشبو سے ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے اس نے مجھے بستر پر جکڑ دیا ہے۔ میری آنکھیں کھلی تھیں لیکن میں حرکت نہ کر سکتا تھا، دیکھ رہا تھا لیکن ہل نہیں سکتا تھا۔ عجیب نیم بیداری، نیم مدہوشی کا عالم تھا۔

پھر اسی تاریک دھند میں، ایک سپید ہیولیٰ سا لرزنے لگا۔ سفید ساڑی میں ملبوس۔ ایک سپید سُت ہوئے اداس چہرے کے خد و خال ابھرنے لگے، جیسے کوئی اس دھند میں پنسل کی نوک سے چہرہ بنا رہا تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں میرے بہت قریب آگئیں۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بے شمار روئی کے گالوں سے بھرے ہوئے میرے کانوں کے اندر کوئی آواز آ رہی ہے اور ادھ کھلے ہونٹ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔

"کون ہو تم؟"

"میں موتی لال ناگر ہوں... لیکن سب لالی کہتے ہیں"

"لالی؟"

"ہاں! لالی... لیکن تم کون ہو؟"

"میں شیونتی ہوں"

"تم کہاں سے آئی ہو؟"

"کہیں سے نہیں، اسی قلعہ میں رہتی ہوں"

"اس قلعہ میں کہاں؟"

"تمہارے آس پاس..."

"آس پاس کہاں؟"

"تمہارے بہت قریب! تمہارے چاروں طرف..."

میں چپ ہو گیا۔ اس نیم غنودگی کے عالم میں یہ خیال آیا کہ جو میں دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں، وہ عالمِ خواب ہے، یا بیداری؟ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس لڑکی کو چھونا چاہا لیکن میرے ہاتھ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ اس لڑکی کی آواز جیسے دور دھند کے اندر کے کسی بھنور سے نکل رہی تھی۔ کچھ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جو کچھ دیکھ رہا ہوں، وہ واقعی میرے سامنے ہے، اور ایسا بھی محسوس ہوتا تھا، جیسے جو کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں، وہ محض میرے ذہن کا واہمہ ہے۔ ایک خوابناک کیفیت ہے۔ جس سے میں کوشش کر کے بھی چھٹکارا نہیں حاصل کر سکتا کیا میں واقعی بات کر رہا ہوں یا اپنے ذہن کے واہموں کی آواز سن رہا ہوں؟ واقعی کوئی لڑکی مجھ سے کلام کر رہی ہے یا محض میرے لاشعور کی کوئی بھٹکی ہوئی بازگشت ہے؟

"شیونتی! تم میرے پاس کیوں آئی ہو؟"

"مجھے چھٹکارا دلا دو"

"کس سے؟"

"قلعے کی دیواروں سے۔ جنھوں نے مجھے قید کر رکھا ہے۔ مجھے باہر نکالو... باہر نکالو... باہر نکالو..."

کہتے کہتے وہ مجھ پر جھک گئی۔ جھکتی چلی گئی۔ وہ ہونٹ، وہ شبنمی ماتھا، وہ ستواں ناک، وہ گہری سیاہ المناک آنکھیں میرے قریب آتی گئیں۔ پھر ایک گہری سسکی کی آواز میں نے سنی اور جیسے دھیرے دھیرے وہ چہرہ میرے قریب دھند میں پگھل گیا۔ نظروں سے غائب ہو گیا اور میں گہری نیند میں مدہوش ہو گیا۔

معلوم نہیں کب تک اسی عالم میں بے ہوش پڑا رہا۔ جب جاگا تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ لیمپ کی بتی بجھ چکی تھی۔ میں نے اٹھ کر بتی جلائی۔ اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں، غسل خانے میں، کہیں کوئی موجود نہ تھا۔ سب دروازے کھڑکیاں بند تھے لیکن کمرے میں ایک بھینی بھینی کافور کی سی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔

چند لمحوں کے لئے میں اپنے نتھنے پھلا پھلا کر اسے سونگھتا رہا۔ واقعی تھی۔ کوئی عجیب سی خوشبو تھی، کافور سے کچھ کچھ ملتی جلتی ——— میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور لالٹین لے کر باہر گیا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ میرے ساتھ والے کمرے میں بھی باہر سے تالا لگا تھا۔ میں نے تالا کھولا، اندر گیا۔ غسل خانے والا دروازہ بند تھا۔ دونوں چٹخنیاں اسی طرح لگی تھیں۔ میں بھاگ کر دوسری غلام گردش میں گیا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ نیچے ہال میں۔ ہال کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ نوکر خانے

ہیں۔ وہاں بھی میرے ہاتھ کا لگایا ہوا تالا اسی طرح موجود تھا۔ کوئی آیا نہ تھا۔ کہیں سے آنہ سکتا تھا۔ ضرور یہ کوئی خواب تھا۔ مگر جانے کیوں یہ خواب مجھے واقعی حقیقت سے بھی زیادہ اصل معلوم ہوتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے واقعی شیوتی آئی تھی۔ ۔۔۔ چلی گئی اور میرے کمرے میں کافور کی خوشبو چھوڑ گئی۔ اس کی وہ گہری میٹھی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ جیسے میں نے خواب میں نہیں عالم بیداری میں اسے سنا ہو۔

سب طرف سے مایوس ہو کر اپنے کمرے میں آگیا۔ گھڑی دیکھی۔ چار بج رہے تھے۔ رات کے آخری پہر میں میں نے تھک ہار کر تکیے پر اپنا سر رکھ دیا اور چند منٹ کے بعد گہری نیند میں سو گیا۔

صبح جب جاگا تو سب سے پہلے میں نے اپنے کمرے میں اس کافوری خوشبو کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن وہ بھینی بھینی عجیب سی خوشبو کسی دوسری دنیا سے آنے والی خوشبو کی طرح غائب ہو چکی تھی۔ رات کا سحر آمیز طلسم ٹوٹ چکا تھا

دن بھر اپنا کام کرتا رہا لیکن آج کام میں دل نہ لگا۔ جانے پھر رہا تھا میں کن ذہن کسی اور ہی کے تانے بانے بنانے میں مصروف تھا۔ بار بار غاروں کی دیواروں کی تصویریں میں دھندلی سی بکھرنے لگتی اور شیوتی کا درد اور التجا میں ڈوبا ہوا چہرہ میری نگاہوں میں ابھرنے لگتا۔ آج دوپہر کے بعد ہی میں نے اپنا سامان تیار کر کے رکھ دیا اور قلعے کی طرف چلنے لگا۔ ۔۔۔ وہ نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ آہستہ آہستہ چلتے چلتے میں نے رچرڈ ڈارکائیم کی طرف نگاہ بھی نہیں ڈالی۔ جوں جوں قلعہ قریب آتا جاتا تھا، میرے سامنے ابھری دنیا معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ پہاڑ، وادی، غار، گھاٹی، میدان، دھان کے کھیت، زندگی کی مترنم صدا، جنگلوں کی خوشبو، چرواہوں کے گیت سب غائب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سب حقیقت نہ تھے اور جو حقیقت تھی، وہ قلعے کے اندر تھی اور وہ آج مجھے اپنے قریب بلا رہی تھی!!

(باقی آئندہ)

غزل

مختار انصاری ایم اے

کیا یہی فن کی محبت کا صلہ ہوتا ہے
سر اٹھانے پہ ہمیں سنگ عطا ہوتا ہے

عشق کا فرض کہاں سب سے ادا ہوتا ہے
یہ تو کچھ شیوۂ ارباب وفا ہوتا ہے

بوئے سنبل ترے گیسو کی مہک لاتی ہے
موسم گل میں ترا رنگ قبا ہوتا ہے

زندگی ہے تو یہ نسبت بھی رہے گی قائم
آدمی کب غم دنیا سے رہا ہوتا ہے

ہم نے تکمیل تمنا کی قسم کھائی ہے
موج خوں سر سے گزر جائے تو کیا ہوتا ہے

یہ سمجھ کر بھی تجھے پیار کیا ہے میں نے
درد ہی درد محبت کا صلہ ہوتا ہے

رشتۂ قالب و جاں ٹوٹ رہا ہو جیسے
آج اس طرح کوئی ہم سے جدا ہوتا ہے

ان کو بیگانۂ مفہوم محبت کہیے
جن کے لب پر غم جاناں کا گلا ہوتا ہے

یہ سعادت بھی بڑی چیز ہے انساں کے لئے
سوز دل زخم جگر کس کو عطا ہوتا ہے

دل ہو شامل تو پھر الفاظ بھی لو دیتے ہیں
دل کا پیغام زمانے کی صدا ہوتا ہے

جیسے تو ہم سے ہے برگشتہ و برہم اے دوست
کوئی اپنوں سے بھی اس طرح خفا ہوتا ہے

دل نہ مانے تو خدا کوئی حقیقت ہی نہیں
دل اگر مان لے پتھر بھی خدا ہوتا ہے

قرب منزل کا تصور لئے جاتا ہے مختار
جتنی بڑھتی ہے تھکن شوق سوا ہوتا ہے



بہار میں باہر آئیے
یہ باٹا کے خوبصورت، ہیلتھ ٹائپ چپل آرام سے چلتے ہیں
اور بہت دور جاتے ہیں۔ سارے موسموں میں یہ اپنی شکل
برقرار رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ انتہائی ملائم اور پائیدار چمڑوں سے بنتے
ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے آپ جس قدر
استعمال کریں گے اتنا ہی اچھا ہی محسوس کریں گے
کیونکہ آرام دینے کے لیے یہ خاص طور سے
بنتے ہیں۔ اپنی قریبی باٹا کی دکان پر تشریف
لا کر طرح طرح کے نمونے
دیکھنے کا موقع ۔ ہاتھ سے
نہ جانے دیجئے۔
ریٹا ۹۵.۵
Bata
لینا ۵۰.۱۰
ولیپ ۹۵.۱۳
فرنٹیر ۹۵.۱۸

سُلگتی چنگاری

ڈاکٹر کیول دھیر

جیتو منڈی۔ ضلع بھٹنڈہ (پنجاب)

۲۳ر فروری ۶۶ء

محترم خوشتر صاحب! آداب

... تازہ ترین افسانہ "سُلگتی چنگاری" ارسالِ خدمت ہے۔ آج کے معاشرے کی ایک تصویر ما ہم سبھی کی نظروں کے سامنے! میں نے اسی تصویر کے چند نقش اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اِس افسانے میں۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو محبت اور فرض کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ آخر فرض پر محبت قربان ہو جاتی ہے لیکن ہمارا سماج عورت کی اِس عظیم قربانی پر اُسے کیا دیتا ہے ــــــ؟ آپ کی اور قارئینِ "بیسویں صدی" کی رائے کا انتظار رہے گا۔ "پیاسی روحیں" (نومبر ۶۵ء) اور "خون کے چھینٹے" (فروری ۶۶ء) کے بارے میں اب بھی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ اِتنا ہی نہیں "پیاسی روحیں" پڑھ کر ہندی کے ایک پبلشر نے مجھے ناول لکھنے کی بھی دعوت دی ہے، جسے میں نے منظور کر لیا ہے ــــــ "بیسویں صدی" کی عظمت، معیار و مقبولیت کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا! یقیناً آپ کی شخصیت ایک ادارے جیسی ہے اور "بیسویں صدی" اِس ادارے کا ایک شعبہ ہے ــــــ اِسی خط کے ساتھ اپنی چند کتابیں بھی آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ اِن میں سے ایک ہے "یدھ کے مورچے پر" (ہندی) جو حالیہ ہند و پاک جنگ سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ابھی پرسوں ہی مجھے موصول ہوئی ہے۔ اِس کے بارے میں اور دوسری کتابوں کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے ضرور لکھیں۔ منتظر رہوں گا۔ اِسی ماہ ایک دوسری کتاب "راشٹر نائیک شاستری" (ہندی) بھی شائع ہو جائے گی۔ جیسے ہی کتاب موصول ہوگی اِس کی کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا...

ہمیشہ آپ کا اپنا ــــــ کیول دھیر

"کیا سوچ رہی ہو شیل؟"

"آں!" شیل چونک گئی۔ نظریں اُٹھا کر اُس نے سامنے دیکھا۔ راج دروازے کے نزدیک کھڑا جیسے اُسے گھور رہا تھا۔

"میں کب سے کھڑا تمہیں یونہی دیکھ رہا ہوں لیکن نہ جانے کیا سوچتی رہتی ہو تم؟"

راج کی آواز میں تلخی نہ تھی۔ پیار بھی نہ تھا۔

"آپ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی" شیل نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اپنی جگہ سے اُٹھ کر راج کے قریب آگئی اور بیگ اُس کے ہاتھ سے لیتی ہوئی پھر کہنے لگی: "آپ آفس سے آنے میں اتنی دیر کیوں کر دیتے ہیں؟"

بے اختیار راج کی نظریں کلائی پر بندھی گھڑی پر پہنچ کر رُک گئیں۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اُس نے کہا: "دیر کہاں ہوئی ہے! ابھی ساڑھے پانچ ہی تو ہوئے ہیں۔ دفتر سے گھر پہنچنے میں بیس پچیس منٹ تو لگ ہی جاتے ہیں۔"

"اوہ! میں وقت کا اندازہ نہیں لگا سکی۔"

"تمہاری گھڑی کیا ہوئی؟"

"بے خیالی میں یاد ہی نہ رہا کہ کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی ہے" شیل یہ کہہ کر پھر مسکرا دی۔

"یہی تو میں پوچھتا ہوں، تم کن خیالات میں کھوئی رہتی ہو؟" اِس بار راج

حدیثِ دل

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا ——— غالب

اللہ رے شامِ غم مِرے دل کی شکستگی
تاروں کا ٹوٹنا بھی مجھے ناگوار تھا ——— علامہ سیماب اکبرآبادی

یہ وہ دردِ دل نہیں ہے کہ ہو چارہ ساز کوئی
اگر ایک بار مٹتا تو ہزار بار ہوتا ——— داغ دہلوی

کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل میں لگی تھی آگ
اندھیر ہے کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے ——— جگر مرادآبادی

اے صبا! لالۂ کم ظرف سے اِتنا کہہ دے
دل کی توہین ہے داغوں کا نمایاں ہونا ——— سکندر علی وجد

مرسلہ:۔ سید قدیر۔ گولکنڈہ۔ حیدرآباد

کی آواز میں تلخی کی آمیزش تھی۔ بُوٹ کے تسمے کھولتے ہوئے شیل نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ راج کی نظریں شیل ہی پر تھیں اور جب دونوں کی نظریں ٹکرائیں تو راج نے محسوس کیا کہ اُس کی آواز کی تلخی نے شیل کے چہرے پر اپنا ردِ عمل چھوڑا ہے۔

"یوں سوچتے رہنے کا اثر صحت پر اچھا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اُسے دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔" راج نے آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا اور ہونٹوں میں مُسکان بھیرتے ہوئے پیار سے شیل کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں تمھیں ہمیشہ ہنستے کھیلتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شیل کے جذبات نے محبت کی آنچ محسوس کی تو آنکھیں نم ہوگئیں لیکن اُس نے اِتنا موقع ہی نہ دیا کہ راج دیکھ پاتا۔ اُس کے بُوٹ رکھنے کے بہانے وہ اُٹھ گئی۔ راج اُسے جاتے ہوئے صرف دیکھ رہا تھا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ راج نے اُسے خیالات میں کھوئی دیکھ کر ٹوکا تھا۔ اکثر ایسا ہو چکا تھا۔ شیل خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ راج کی موجودگی میں وہ یوں سوچا کرے لیکن ذہن پھر بھی بھٹک ہی جاتا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا تھا اور وہ کسی نہ کسی سوچ میں ڈوب جاتی تھی۔ جب راج اُسے چونکا دیتا، سوچنے کی وجہ پُوچھتا تو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر وہ بات کو ٹالنے کی کوشش کرتی لیکن اُسے یہ احساس بھی تھا کہ راج بچہ نہیں ہے جو سمجھتا نہ ہو۔ یقیناً وہ سمجھ جاتا ہوگا کہ اُس نے کوئی بہانہ بنایا ہے۔

شیل اِس وقت بھی یہی سوچ رہی تھی۔ کمرے میں مدھم نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نزدیک ہی راج گہری نیند سو رہا تھا لیکن اُس کی آنکھیں نیند سے خالی تھیں۔ رات دوسرے پہر سے آگے جا رہی تھی۔ شیل کا ذہن بُری طرح سے اُلجھ گیا تھا۔ اُلجھتا ہی جا رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔

کوئی ڈیڑھ سال پہلے راج اُسے بیاہ کر لایا تھا۔

شادی سے پہلے اُس نے سُنا تھا، راج ایک بارعب و پُرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ سرکاری محکمے میں کلاس ون گزیٹڈ آفیسر ہے۔ سوسائٹی میں عزت ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طبیعت میں شوخی ہے۔ ہونٹ صرف مسکرانا ہی جانتے ہیں۔ پیشانی پر کبھی کسی نے ایک سلوٹ تک نہیں دیکھی۔ نہایت خوش مزاج ہے۔

اور جب پہلی بار اُس نے راج کو دیکھا تھا تو اُسے اِن سے کہیں زیادہ اوصاف کا مالک پایا تھا۔ پہلی ملاقات کے وقت وہ شرمائی ضرور تھی لیکن صرف جبھی تک جب تک کہ وہ گھونگھٹ میں تھی۔ جیسے ہی راج نے گھونگھٹ اُٹھایا تھا اور شیریں آواز سے اُس نے اُس کا سواگت کیا تھا تو اُسے محسوس ہوا تھا جیسے آواز جانی پہچانی ہو۔ جیسے جلترنگ کی لہراتی لہریں اُس کے کانوں سے ٹکرا رہی ہوں۔ جیسے محبت کے نغمے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اُسے مچل جانے کے لئے مجبور کر رہے ہوں ——— اور چند ہی لمحوں کے بعد اُسے محسوس ہوا تھا کہ وہ جیسے راج سے برسوں پہلے ملی تھی۔ جبھی اجنبیت ختم ہوگئی تھی۔ اُس رات کے چند ابتدائی لمحات میں وہ راج سے گھُل مِل گئی تھی۔

چند ہی دنوں میں ہر بات، ہر چیز اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ شادی سے پہلے جو کچھ بھی اُس نے سُنا تھا، حقیقت اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ دہلی جیسے خوبصورت اور رنگینیوں سے معمور شہر میں وہ تھی اور صرف راج تھا۔ اُن دونوں کے درمیان تیسرا کوئی نہ تھا۔ وہ خوبصورت تھی، پڑھی لکھی تھی، ماڈرن تھی اور راج کی سمجھ بوجھ پرکھ نے اُسے اپنے مطابق ہی پایا تھا۔ اِس لئے اُسے دل و جان سے چاہا تھا۔ آرام و آسائش کا ہر سامان اُس کے لئے مہیا کیا تھا۔ اُس کی دلجوئی کے لئے کبھی سیر و تفریح کا پروگرام بنتا اور کبھی سینما کا۔ کبھی ہوٹل اور کلب کی رنگینیاں ہوتیں اور کبھی وہ پارٹیوں میں شامل ہوتے۔

راج نے اُسے بھرپور محبت دی تھی اور ہر ممکن کوشش کی تھی کہ وہ اِس نئی زندگی میں اپنے آپ کو ہر طرح سے مطمئن محسوس کرے۔

لیکن . . .

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ خوش نہیں ہو سکی تھی۔ اگرچہ اُس نے ایک بار بھی راج کو یہ محسوس نہ ہونے دیا تھا کہ اُس کی ہر خوشی میں، ہر خواہش میں وہ شریک رہی تھی لیکن حقیقی مسرتیں اُسے نہ مِل سکیں۔

اِتنا ضرور ہوا تھا کہ جیسے جیسے وقت گُزر رہا تھا، بیتی زندگی کی یاد دبتی جا رہی تھی ـــــ شدّت کم پڑتی جا رہی تھی اور وہ سوچتی تھی کہ دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن شادی کے تین ماہ بعد جب وہ چند روز کے لئے اپنے ماں باپ کے پاس انبالہ گئی تو ایک بار پھر بیتی زندگی کی کہانیاں تازہ ہو گئیں۔

شیل نے اپنا دل دھڑکتا ہوا محسوس کیا۔ سارے جسم میں کپکپی سی محسوس کی۔ نظریں گھما کر دیکھا ـــــ راج سو رہا تھا۔ اُسے معلوم ہوا ایک کونے سے لحاف شاید نیچے لٹک گیا ہے۔ وہ اُٹھ گئی اور لحاف ٹھیک کرتی ہوئی بھرپور نظروں سے راج کو دیکھنے لگی۔ جیسے خواب میں بھی اُس کے ہونٹ مُسکرا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے اپنے بستر میں لوٹ آئی۔ اُس کا ذہن پھر پُرانی یادوں میں بھٹک چکا تھا۔

انبالہ آئے ابھی اُسے صرف دو دن ہوئے تھے۔ اُس روز شام کے وقت اپنی بھابی کے ساتھ جب وہ سیر کے لئے نکلی تو مالتی سے ملاقات ہو گئی۔ مالتی اُس کی بچپن کی سہیلی تھی، ہمراز بھی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اُس نے کہہ دیا تھا "تمھاری شادی کے بعد رمیش صرف ایک بار دکھائی دیا تھا۔ لیکن کتنا اُداس، کتنا غمزدہ! تم دیکھو تو شاید پہچان بھی نہ سکو" اور وہ تڑپ تڑپ اُٹھی تھی۔ دبی چنگاری سُلگنے لگی تھی۔ وہ ساری رات کروٹیں بدلتی رہی تھی اور سوچتی رہی تھی رمیش کے بارے میں ـــــ اُس نے انبالہ میں پندرہ روز رہنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن پانچویں ہی دن وہ دہلی لوٹ آئی تھی۔ اپنے راج کے پاس! تاکہ بیتی یاد کے زخم مُندمل ہو سکیں۔

راج نے شاید پہلی بار اُس کی اُداسی کو محسوس کیا تھا اور پُوچھ بھی لیا تھا اُس سے کہ وہ کیوں اُداس ہے۔ وہ کیا جواب دیتی۔ طبیعت اچھی نہ ہونے کا بہانہ بنا دیا تھا اُس نے۔ لیکن وہ کب تک ایسے بہانے تلاش کرتی رہتی؟ راج گہری نظروں سے اُسے دیکھنے لگا تھا۔ اِن نظروں میں اور کچھ نہیں۔ صرف پریشانی ہی تھی۔ وہ پُوری پُوری کوشش کرتی کہ راج ایسی نظروں سے اُسے نہ دیکھے۔ اِس لئے وہ بات بات پر مسکراتی۔ اُس کی گہری نظروں کو اپنی شوخ نظروں سے کاٹنے کی کوشش بھی کرتی لیکن چہرے پر اُمڈنے تاثرات پوشیدہ نہ رہتے۔

اِسی طرح وقت آگے بڑھتا گیا ـــــ بڑھتا گیا اور وہ سُلگتی چنگاری پر راکھ کی پرتیں ڈالنے کی کوشش کرتی رہی۔

فسانۂ ہجر

یہ وصال و ہجر کی بحث کیا کہ عجیب چیز ہے عشق بھی
تجھے پا کے ہے وہی درد دل وہی رنگ زخم جگر بھی ہے ـــــ فراق گورکھپوری

کیا سُناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے مہر پہ مرنے سے تو آساں ہوگا ـــــ مومن

عالم سوز و ساز میں، وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذّتِ طلب ـــــ علامہ اقبال

ہجر کی شب گزر ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو ـــــ فیض احمد فیض

یہ اعجازِ محبت، جب بھی میں فُرقت سے گھبرایا
تری آواز سے ملتی ہوئی آئی صدا دل سے ـــــ ابر احسنی

مُرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہتکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

ایک سال گُزر گیا۔ اُس دن وہ اکیلی ہی بازار گئی تھی۔ راج چند دنوں کے لئے دہلی سے باہر گیا ہوا تھا۔ ایک جنرل اسٹور سے اپنی ضروریات کی چیزیں خرید کر جیسے ہی وہ باہر آئی اُس کی نظریں رمیش کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ رمیش نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ پاؤں ٹھٹک گئے۔ اُس نے دیکھا، رمیش جیسے تپدق کا مریض نظر آ رہا تھا۔ شیو بڑھا ہوا تھا، سر کے بال اُلجھ گئے تھے، لباس بے ترتیب سا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا ـــــ رمیش اُسے دیکھے جا رہا تھا لیکن وہ ضبط نہ کر سکی تھی اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑاتی ہوئی سی آگے بڑھ گئی تھی۔ دل و دماغ ایک بھیانک طوفان میں گھر گئے تھے۔ ٹیکسی کے ذریعہ بہت مشکل سے وہ اپنے گھر پہنچ سکی تھی۔ اُس وقت راج کا دہلی سے باہر ہونا اُسے اچھا ہی لگا تھا ورنہ اُس کی حالت چھُپی نہ رہتی اور۔ ۔ ۔ اور نہ جانے کیا ہو جاتا؟

دن پر دن اُس کی اُداسی بڑھتی گئی۔ اُسے ہر لمحہ ایک عجیب سی چبھن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہر گھڑی اُس کی آنکھوں کے سامنے رمیش کا چہرہ گھومتا رہتا تھا اور وہ کسی نہ کسی سوچ میں ڈوب جاتی تھی۔ راج اب اُس سے اکثر شکایت کرنے لگا تھا کہ کیوں وہ اُداس رہتی ہے؟ اب کبھی کبھی اُس کی زبان تلخ بھی ہونے لگی تھی۔ آج ہی تو راج کا مُوڈ بگڑ گیا اُسے دیکھ کر!

شیل سوچتی رہی ــــ کمرے کی مدھم روشنی میں اُس کی نگاہیں بھٹکتی رہیں۔

اُس کے ذہن میں ایک تصویر تھی، راج کی، جو اُس کا شوہر تھا۔ دوسری تصویر تھی رمیش کی جو . . . وہ چاہتی تھی رمیش کو جھٹک دے۔ نکال پھینکے اپنے ذہن سے اور صرف راج ہی رہ سکے وہاں لیکن وہ جتنا سوچتی جاتی رمیش کی تصویر کے نقش اور زیادہ اُجاگر ہوتے جاتے۔ آخر کار شیل نے جھٹک دیا اپنے سر کو۔ جیسے رمیش کی تصویر پر کسی گہرے رنگ کا برش پھیر دیا ہو تاکہ اس کے نقش مِٹ جائیں اور اُس نے ارادہ کر لیا کہ اب وہ کبھی نہ سوچے گی۔ جب کبھی ایسے کسی جذبے نے سر اُبھارا وہ اُسے کُچل ڈالے گی، مسل دے گی۔ راج ہی اُس کی زندگی ہے۔ اُس کا سرتاج ہے۔ اُس کی مسرّت اور اُمنگ ہے۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد شیل نے ایک عجیب سی راحت محسوس کی۔ اُسے عجیب سے سکون کا احساس ہوا اور وہ نیند کی گہری وادیوں میں ڈوب گئی۔

ایک ماہ گزر گیا اور اِس عرصہ میں شیل نے کوشش کی تھی کہ اپنے آپ پر قابو پا سکے۔ جب بھی رمیش کا تصوّر اُس کے ذہن میں اُبھرتا وہ اُسے جھٹک ــــ دیتی۔ جب بھی کوئی ایسا جذبہ انگڑائی بھرتا، اُسے شیل کُچل ڈالتی۔ صبح جب راج دفتر روانہ ہوتا تو وہ ایک دلآویز مُسکراہٹ لئے اُسے رخصت کرتی اور جب شام کو لَوٹتا تو ایک دلکش مُسکراہٹ سے اُس کا خیر مقدم کرتی۔ کبھی کبھی اب وہ راج کے ساتھ کلب بھی جانے لگی تھی۔ اب اُس نے ہر لمحہ راج ہی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اُسی کے بارے میں سوچتی اور اُسی کے لئے سب کرتی تھی۔ راج بھی اطمینان محسوس کرنے لگا تھا کہ شیل اُس کی خواہش کے مطابق ہی ڈھلتی جا رہی ہے۔

راج اور شیل گرمی کی چھٹیاں گزارنے شملہ آئے ہوئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شیل راج کے ساتھ کہیں باہر گھومنے کی غرض سے گئی تھی۔ دراصل شیل ہی نے زور دے کر یہ پروگرام بنایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ دہلی کے شور و غل سے دُور، بے حد مصروف اور مشینی زندگی سے الگ ہو کر راج کو اپنی محبت کا گہرا احساس دلائے اور ساتھ ہی چند روز وہاں رہ کر ماحول تبدیل کرے۔

ایک شام کو راج اور شیل مال روڈ پر گھوم رہے تھے کہ اچانک ہی ڈاکٹر دنیش سے ملاقات ہو گئی۔ دنیش راج کا بچپن کا دوست تھا اور برسوں بعد اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ دنیش کے ساتھ اُس کی مِسز بھی تھیں۔ دنیش نے بتایا کہ وہ دھرم پور سینی ٹوریم میں ڈاکٹر انچارج ہے اور ساتھ ہی اُس نے دونوں کو وہاں چلنے کی دعوت بھی دے دی۔ دھرم پور زیادہ دُور نہیں تھا اِس لئے اتوار ہی کو وہاں کا پروگرام طے پا گیا۔

راج اور شیل دھرم پور پہنچ گئے۔ یہ ایک خوشگوار و صحت افزا پہاڑی مقام تھا۔ شیل کو یہاں کا ماحول بے حد پسند آیا۔ شام ہوئی تو ڈاکٹر دنیش کے ساتھ سینی ٹوریم دیکھنے چل پڑے۔ شیل سب کے پیچھے چل رہی تھی۔ یہاں کے پُر ... ماحول نے اُس کے جذبات کو بھی دُکھی بنا دیا تھا۔ یہاں چاروں طرف تپِ دق ... شکار مرجھائے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے اُن لوگوں کی زندگی کے المیہ کے متعلق غور کرتی ہوئی شیل کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ ایک بیڈ پر لیٹے ہوئے مریض پر ... پڑتے ہی شیل چونک گئی۔ اُس کا سر چکرا گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلنے ... اُس کے سامنے رمیش تھا! تپِ دق کا مریض رمیش!! جس کے تصوّر سے بھی دُور رہنے کی کوشش میں شیل یہاں آئی تھی لیکن وہی حقیقت کے رُوپ میں اُس کے سامنے تھا۔

رمیش نے بھی شیل کو دیکھ لیا تھا۔ جب دونوں کی نظر ٹکرائی تو رمیش ... مُسکرا دیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے مُنہ پھیر لیا جیسے شیل سے کہہ رہا ہو: دیکھو ... تمھاری ہی وجہ سے آج میں اِس حالت کو پہنچا ہوں!"

راج، ڈاکٹر دنیش اور مِسز دنیش آگے بڑھ گئے تھے۔ جب وہ وارڈ کے آخر میں پہنچ گئے تو راج نے شیل کی طرف مُڑ کر دیکھنا چاہا۔ اُس نے دیکھا وہ بہت پیچھے ایک مریض کے بیڈ کے قریب کھڑی ہے۔ اُس کا جسم کانپ رہا ہے، لرز رہا ہے۔ شاید وہ لڑکھڑا کر گِر جائے گی۔ راج دوڑ پڑا اُسی طرف اور اِس سے پہلے کہ شیل گِر جاتی، راج نے اُسے سہارا دے دیا اور غور سے اُس مریض کی طرف دیکھنے لگا۔ رمیش بھی اُنہیں کو دیکھ رہا تھا۔ جب تک ڈاکٹر اور مِسز دنیش بھی وہاں پہنچ گئے تھے، شیل بے ہوش ہو چکی تھی۔

وہ لوگ اِس وقت ڈاکٹر دنیش کی قیام گاہ پر تھے۔ شیل کو ہوش آ گیا تھا لیکن بے سُدھ سی بستر میں پڑی تھی۔ اُس کے قریب ہی مِسز دنیش بیٹھی تھیں۔ راج اور دنیش دوسرے کمرے میں تھے۔ دنیش اُسی مریض کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"چند ہی دن پہلے اِس مریض کو یہاں داخل کیا گیا ہے۔ عجیب آدمی ہے، کبھی کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا ــــ یہاں تک کہ اگر اُسے کھانا مل گیا تو بہتر ورنہ خاموش ہی رہتا ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟" راج نے پُوچھا۔

"عموماً خاموش ہی رہتا ہے لیکن جب کبھی کسی سے بات کرتا بھی ہے تو وہ بات ہوتی ہے، مجھے جینا نہیں ہے۔ میں مرنے ہی کے لئے یہاں آیا ہوں!"

"واقعی عجیب آدمی ہے!"

"اور ہاں!" ڈاکٹر دنیش آہستہ سے بولے: "اِس کے پاس سے ایک خط بھی

سنبھال کر رکھا جسے میں نے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ خط پڑھنے کے بعد یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی کی محبت میں وہ اس حال کو پہنچا ہے۔۔۔ ٹھہرو وہ خط تمھیں دکھاتا ہوں" اور ڈاکٹر دنیش خط لانے کے لئے اُٹھ گئے۔

راج خط دیکھتے ہی چونک گیا۔ پڑھنے لگا اُسے۔

رمیش!

میں نے تم سے محبت کی ہے، اِس بات سے مجھے انکار نہیں ہے۔ میری خواہش تھی کہ ساری زندگی ہم ساتھ ساتھ چلتے اور ہماری محبت کے پھول اپنی مسرور کُن خوشبوؤں سے زندگی کو معطر کرتے لیکن مجھے دُکھ ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ دل کی بات میں نے اپنے ماں باپ سے کہہ دی ہے لیکن کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی انھیں یہ گوارا نہیں ہے۔ اُن کی نظروں میں سماج کی اہمیت محبت بھرے دلوں سے کہیں زیادہ ہے۔ میرا رشتہ اُنھوں نے کسی دوسری جگہ طے کر دیا ہے۔ سُنا ہے لڑکا ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ میری التجا ہے کہ تم میری محبت پر شک نہ کروگے اور بھگوان سے پرارتھنا کروگے کہ میں اپنی نئی زندگی میں ثابت قدمی سے آگے بڑھ سکوں اور ایک بیوی کے فرائض بخوبی سر انجام دے سکوں۔ تبھی تو ہماری محبت سچی و مقدس ہوگی!

بدنصیب . . .

خط کے آخر میں کسی کا نام نہیں تھا۔ راج کی حالت عجیب سی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر دنیش کہہ رہے تھے "کیا خیال ہے تمھارا؟"

"تم نے ٹھیک کہا تھا" راج بمشکل کہہ سکا۔ چند لمحوں کے بعد دنیش کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا "اگر یہ خط میں رکھ لوں . . ."

"کیا کروگے اِسے؟"

"یونہی! . . . جذباتی انسان ہوں اور جذبات ہی سے تعلق ہے اِس کا"

ڈاکٹر دنیش نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور تہہ کرکے خط راج نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اِسے پہچانتی ہو؟" دہلی لَوٹنے کے دوسرے ہی دن راج نے وہ خط شیل کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ شیل نے اُسے دیکھا تو چونک گئی۔ کانپ گئی۔ اُداس چہرہ زرد پڑ گیا اور سہمی سہمی نظروں سے راج کی طرف دیکھنے لگی۔

"رمیش کو یہ خط تمھی نے لکھا تھا نا؟" راج کی آواز تلخ تھی۔

"ہاں!" شیل نے نظریں جھکا لیں۔

"بدذات! ۔۔۔ بدچلن! ۔۔۔ ڈوب کیوں نہیں مریں تم؟ کیوں مجھ سے شادی کی تم نے؟ کیوں فریب دیا مجھے؟" راج یک بیک بھڑک اُٹھا۔ غصہ سے اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور دایاں ہاتھ شیل کے رخسار پر اپنے واضح نشان چھوڑ چکا تھا۔

شیل لڑھک گئی اور اِسی حالت میں راج کی طرف دیکھنے لگی۔ اب اُس کی نظروں میں جھجک نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں ۔۔۔ "راج! تم زیادتی کر چکے ہو پھر بھی اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو تو ساری بات تمھاری سمجھ میں آجائے گی"

"میں بہت سوچ چکا ہوں شیل! اور بخوبی سمجھ چکا ہوں کہ تم نے جان بُوجھ کر مجھ سے فریب کیا ہے تاکہ میری غیر حاضری میں رمیش سے رنگ رلیاں منا سکو۔ تمھیں پوچھنے والا تھا ہی کون؟"

راج نے اتنا سب کہہ دیا کہ شیل ضبط نہ کر سکی۔

"راج! آج بھی مجھے انکار نہیں ہے کہ رمیش سے میں نے محبت کی ہے لیکن جبھی تک جب تک میں تمھاری بیوی نہ تھی ۔۔۔ اور جب تمھاری بیوی بن گئی تو اپنے دل پر پتھر رکھ لیا میں نے۔ کچل ڈالا اُن جذبات کو جو کبھی رمیش کے لئے مچلتے تھے۔ اِس لئے کہ میں ایک بیوی کے فرائض خوش اسلوبی سے سر انجام دے دوں۔ اپنی محبت کا خون کرکے میں نے فرض کو سینچا ہے۔ جیسی مقدس اور پاکیزہ محبت میں نے کی ہے، ویسے ہی میں نے اپنے فرض کو بھی نبھایا ہے۔ میں بدچلن نہیں ہوں راج! تم میری محبت پر، میرے فرض پر الزام نہیں لگا سکتے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔"

"تمھارے چلّانے کا اثر مجھ پر نہ ہوگا۔ اب اور فریب تم مجھے نہیں دے سکتیں"

"اگر محبت کرنا فریب ہے تو یقیناً میں قصور وار ہوں لیکن . . ." اِس سے پہلے کہ شیل کچھ اور کہتی، راج چلا گیا تھا۔

آخر شیل کی پاکیزہ محبت کو فرض کے ہاتھوں وہی سزا ملی جو ہمیشہ ہی محبت کو ملتی آئی ہے۔ راج نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شیل کو اپنی زندگی سے الگ کر دیا۔

شیل سوچ رہی ہے اپنی زندگی کی المناک داستان کے بارے میں۔ ایک عورت کی زندگی کے بارے میں ۔۔۔ رمیش سے اس نے محبت کی تھی، اُسے چاہا تھا اور جب اُس کی شادی کہیں اور کی جانے لگی تھی تو اُس نے اپنے ماں باپ سے التجا کی تھی کہ ایسا مت کرو۔ اُس کی پاک محبت کا خون نہ کرو لیکن سماج کے ضابطوں کی فولادی زنجیروں میں اُسے جکڑ دیا گیا تھا۔ کیا فرق تھا راج اور رمیش میں؟ رمیش کسی بھی لحاظ سے راج کے مقابلے میں کم نہ تھا۔ غریب بھی نہ تھا۔ پھر بھی وہ ماں باپ کی مرضی کے آگے جھک گئی تھی اور اُس نے اپنی محبت فرض پر قربان کر دی تھی۔

لیکن سماج نے کیا دیا اُسے؟ کیا ظلم نہیں کیا سماج نے اُس پر؟؟

شیل اب پہلے جیسی شیل نہیں رہی۔ اُس کا چہرہ کتنا بھیانک ہوگیا ہے! جسم کتنا نحیف ہوگیا ہے! صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی تو ہے وہ! اِس وقت وہ سینی ٹوریم میں داخل ہے۔ تپدق میں مبتلا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ دو چار دن کی مہمان ہے اُس کی زندگی اور پھر وہ مر جائے گی۔ رمیش ہی کی طرح وہ بھی مر جائے گی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی غم نہیں ہے اُسے مرنے کا۔ شاید وہ اب مرجانا ہی چاہتی ہے۔ جبھی تو سب سے کہتی ہے . .

"مجھے جینا نہیں ہے۔ میں مرنے ہی کے لئے یہاں آئی ہوں!!"


میرے رنگ روپ کیلئے
میرا پسندیدہ صابن
لکس
کلپنا کہتی ہیں
LUX
TOILET SOAP
دلفریب رنگ روپ آپکے لئے بھی اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کلپنا کے لئے... اس کی دیکھ بھال بھی ویسی ہی ہونی چاہئے۔
فلمی حسینہ کلپنا کہتی ہیں: "عورت کا اصلی حسن اُسکا بیداغ رنگ روپ ہے۔ یہ آپکے لئے اُتنا ہی ضروری ہے جتنا میرے لئے۔ اپنے رنگ روپ کی دیکھ بھال میں لکس سے کرتی ہوں۔ اسکا ملائم جھاگ اور اس کی دلنواز خوشبو مجھے بیحد پسند ہے"۔ لکس سے آپ کا رنگ روپ بھی کھِل اُٹھے گا۔
سفید اور دھنک کے چار رنگوں میں
لکس ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا خالص، ملائم حسن بخش صابن
ہندوستان لیور کا تیار کردہ
LTS. 199-140-45 UD لنٹاس

مزاحیہ

گیہوں کی تلاش

وجاہت علی سندیلوی۔ بی، اے۔ ایل ایل بی

نصرت منزل۔ سندیلہ (اُتر پردیش)

۱۵ مارچ ۶۶ء

مکرمی و مُعظمی خوشتر صاحب! آداب۔

"بیسویں صدی" افسانوی ادب میں بیش بہا اضافہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مسائلِ حاضرہ کے متعلق اپنے طنزیہ اور مزاحیہ تیر ونشتر اور مضامین کی بدولت سماجی شعور کو بیدار کرنے کی بھی گرانقدر خدمت انجام دے رہا ہے ـــــ ایک مزاحیہ مضمون "گیہوں کی تلاش" بھیج رہا ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ یہ افسانہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ سُنتے آتے تھے کہ گیہوں کبھی انسان کے جنّت سے نکالے جانے کا بہانہ بنا تھا لیکن اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اِس زمانے میں اِس کا فُقدان انسان کے پھر جنّت میں پلٹ جانے کا سبب بن رہا ہے ؎

یہاں ملنے کی پابندی، وہاں چکھنے کی پابندی
ہے گیہوں ڈھونڈنے والوں کی یہ دُنیا نہ وہ دُنیا

سُنا ہے کہ فرقت بھائی داڑھی بڑھا کر حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے ہیں۔ اُن کی خاموشی سوہانِ روح ہے۔ دِلّی والوں نے انھیں چھین کر لکھنؤ سُنسان کیا تھا۔ لکھنؤ والوں نے انھیں اپنا کر کاکوری کو ویران کیا تھا۔ اب وہ دِلّی کو بھی داغِ مفارقت دے گئے؟ ہائے دِلّی وائے دِلّی!... راقم ـــــ وجاہت علی سندیلوی

ہندوستان جنّت نشان کو بھارت بنے یعنی آزاد ہوئے اٹھارہ سال بیت چکے تھے اور ہم خود بھی جلد ہی قیدِ حیات و بندِ غم سے آزادی حاصل کرنے والے تھے۔ پندرہ روز سے گھر میں نہ غلّہ تھا، نہ شکر اور نہ مٹّی کا تیل۔ بقول شخصے خشک ہوا پر بسر ہو رہی تھی اور اس اندھیر میں رات کا اندھیرا سونے پر سُہاگے کا کام کر رہا تھا! جس چیز پر بھی سرکاری کنٹرول تھا، وہ دُکانوں سے غائب اور ہم جیسے عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہو چکی تھی۔ اُس کا علاج ہماری سمجھ میں صرف یہ آتا کہ اب ہم خود ہی کنٹرول کی دسترس سے باہر چلے جائیں۔

ہماری موٹی کھال پر کنٹرول کی بدولت بے نیازی اور بے غیرتی کی ایک دبیز تہہ جم چکی تھی۔ تنخواہ ملتی تو بیوی بچّوں کو لے کر ہوٹل پہنچ جاتے اور جب آدھے مہینے سے پہلے وہ قریب قریب پُوری اُڑ جاتی اور صرف اُس کی دُم ہمارے ہاتھ میں پھڑپھڑاتی رہ جاتی تو گھر ہی میں پُرانے اخبار جلا کر آلو یا بینگن یا الّم غلّم جو بھی ہاتھ آجاتا اُبال کر کھاتے رہتے اور اِس خیال سے خوش ہوتے کہ اپنے مُلک کی غذائی عادتیں تبدیل کرنے میں اپنے نیتاؤں کے بھاشنوں کے بموجب ذاتی تجربے سے ہم بڑی دیش بھگتی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ زمانے کی کج رفتاری دیکھتے ہوئے دُور اندیشی کے ماتحت ہم نے گھر کی پُرانی چپلیں اور جوتے بلکہ چیتھڑے تک پھینک دینے کی بجائے ایک طرف سمیٹ کر احتیاط سے رکھ دئے تھے کہ سند رہیں اور بوقتِ ضرورت 'داشتہ آید بکار' ثابت ہوں۔

ایک روز آلو، پانی اور پُرانے اخبار تو تھے کیونکہ اُن پر کنٹرول نہیں تھا لیکن دیا سلائی نہیں تھی کیونکہ وہ بیچاری چند ہی دن پہلے کشتۂ کنٹرول ہو چکی تھی۔ اُسے دُگنے داموں پر خریدنے کے لئے ہمیں جھلجھڑی رام پان فروش کی ایک گھنٹہ خوشامد کرنی پڑی تھی اور بالآخر اُس کا دل ہمارے اِس وعدے پر پگھلا تھا کہ ہم اِسی سال کے اندر سپلائی افسر کے بھتیجے کے خالو سے سفارش کر کے اُسے ایک بوری سیمنٹ کا پرمٹ دلوا دیں گے۔

جس طرح عشق کا تکون عاشق و معشوق کے ساتھ ہی ساتھ بغیر رقیب کے

مکمل نہیں ہوتا اُسی طرح شادی کے تکون کے لئے میاں اور بیوی کے علاوہ گیہوں کا ہونا بھی لازمی ہے۔ مثال کے لئے دُور کیوں جائیے بلکہ دُور ہی چلے جائیے تو دیکھئے کہ بابا آدم اور اماں حوّا کی روایتی داستان میں بھی شامتِ اعمال کی طرح گیہوں کا قضیہ موجود تھا۔ ہماری بیوی نے روز روز کی فاقہ مستی سے تنگ آکر "ہائے گیہوں"، "مولئے گیہوں" کے ایسے دل شگاف نعرے لگانا شروع کر دئے کہ ہمیں اپنی پچیس سال کی ازدواجی زندگی کا تاج محل متزلزل نظر آنے لگا۔ دوستوں اور عزیزوں میں سے جن لوگوں سے سیر بھر، آدھ سیر یا پاؤ بھر غلہ بھی اُدھار لے کر بعض اوقات پیٹ کی آگ بجھائی تھی، اُن کے تقاضے بے مروّتی اور بداخلاقی کی حدود سے بڑھ کر نقضِ امن کا خطرہ بن گئے۔

اِن حالات میں اپنے ضمیر کو حریفوں بھی بڑا موقع شناس اور سعادت مند واقع ہوا ہے، بہلا پھسلا کر ہم نے لالہ موٹومل سے جو پہلے پنساری اور اب کنٹرول کے بعد سیٹھ کہلاتے تھے، "مان نہ مان میں تیرا مہمان" کے مصداق زبردستی کی راہ و رسم بڑھائی۔ روز دفتر جانے سے پہلے اُن کی دُکان پر پہنچ کر اُن سے بہت ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر "نمستے سیٹھ جی" کہتے اور وقت ہوتا تو چند منٹ کے لئے اُن کے پاس بیٹھ کر اُن کی اوٹ پٹانگ باتوں میں اُن کی ہاں میں ہاں بھی ملا دیتے۔ دفتر سے واپس آکر شام کو اُنھیں اکثر اخبار پڑھ کر سُناتے۔ کبھی اُن کا کوئی خط لکھ دیتے۔ چھٹی کے دن اُن کی بھینس کو مویشی ہسپتال دکھلا آتے۔ نوکر نہ ہوتا تو اُن کی چھوٹی بچیوں کو اسکول پہنچا آتے اور واپسی میں سبزی منڈی سے اُن کے لئے ترکاری بھی خرید لاتے۔ اِس طرح جب بظاہر پیر رکھنے یا زبان کھولنے کی گنجائش پیدا ہوگئی تو ایک روز تنہائی میں موقع محل دیکھ کر ہم اُن کے سامنے زبان پر حرفِ مطلب لے ہی تو آئے ـــــــــ

"سیٹھ جی! کچھ گیہوں کی ضرورت ہے۔"

"گیہوں!" موٹومل کچھ ایسا بوکھلائے اور ہمیں ایسی خشمگیں نظروں سے دیکھا جیسے ہم نے اُنھیں کوئی موٹی سی گالی دے دی ہو!

اِس ڈر سے کہ کہیں وہ بیٹھے ہی پر سے نہ اُکھڑ جائیں ہمیں اپنے مطالبے کو بہت مختصر کرنا پڑا۔ "بس ایک بوری کی ضرورت ہے۔"

موٹومل بیٹھے سے لیٹ گئے۔ اپنی توند پر ہاتھ پھیرا۔ ایک بہت مہیب ڈکار لی اور پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ کئی منٹ گزر گئے اور وہ بالکل ساکت پڑے رہے تو ہم سمجھے کہ شاید سو گئے یا مر گئے۔ ہم اُٹھنے ہی والے تھے کہ بول اُٹھے ـــ "صاحب گیہوں تو پیدا ہوتا ہے بس امریکہ میں لیکن نہیں معلوم وہاں کے لوگ کیسی اوندھی عقل کے ہیں کہ دوسرے دیشوں میں بھیج کر وہاں کے بھاؤ کا ستیاناس مار دیتے ہیں۔"

مجھے مُنہ کھولنے کا موقع دئے بغیر اُنھوں نے ایک دوسرا انکشاف کیا۔

"صاحب اُسنتے ہیں کہ اب روس بھی ہندوستان کو غلّہ دینے پر تُلا ہوا ہے۔ نہیں معلوم وہاں کے بیوپاریوں کی کیا مت ماری گئی ہے جو وہاں غلّے کی ریل پیل ہے اور وہ دوسرے دیشوں کے بیوپاریوں کی بھانجی مار رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے اگر اپنے دیش میں دوسرے دیشوں کا اناج گھس پڑا تو پھر یہاں کے بیوپاری کیا کھائیں گے۔ اناج روپے کا دو سیر بکنے لگا تو کر چکے ہم لوگ روزگار!"

سیٹھ جی دو چار اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لینے کے بعد کچھ اور کہنے والے تھے کہ میں بول اُٹھا۔ "والد صاحب کا فاتحہ کرنا ہے۔ بھائی بندوں کے سامنے ناک خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ایسی سخت ضرورت نہ ہوتی تو میں آپ سے ہرگز نہ کہتا۔"

"صاحب کس کو ضرورت نہیں ہے۔" سیٹھ جی لیٹے سے اُٹھ بیٹھے۔ "دیکھئے گیہوں تو ہے نہیں لیکن خیر آپ کی بات دوسری ہے۔ آپ اپنے ہی آدمی ہیں۔" اور پھر وہ کھسک کر میرے قریب آ گئے اور بڑے رازدارانہ انداز میں دھیمی آواز سے کہنے لگے "ایک سو دس روپے بوری کے حساب سے مجھے کچھ ٹرک کانپور کے لئے لدوانا ہیں۔ چار بوریاں انسپکٹر صاحب کو بھی دینا ہیں۔ رات میں دس بجے کے بعد آپ بھی آ جائیے۔ میں آپ کو سو روپے میں ایک بوری دے دوں گا لیکن پرماتما کے لئے یہ بات اپنے ہی تک رکھئے گا ـــــ اور جی ہاں ذرا مُنجلی بھینس کو آج پھر مویشی ہسپتال پر دکھلا دیجئے گا۔"

بارہ بجے رات کے قریب جب ایک رکشے پر جس میں محلّے والوں کی نظر سے بچانے کے لئے ہم نے ایک پردہ بھی ڈال دیا تھا، ہم موٹومل کی دی ہوئی یا دُگنے داموں پر خریدی ہوئی بوری لے کر اپنے مکان کے احاطے میں داخل ہوئے تو ہم ایسی فخرآمیز خوشی محسوس کر رہے تھے جو غالباً پرتھوی راج نے سنجوگتا کو اپنے محل میں لے آنے پر بھی نہ کی ہوگی۔ اپنی بیوی سے جب ہم نے اپنے اور موٹومل کے تعلقات اور اُن کی دریادلی بہت کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کی تو اُس کی بھی باچھیں کھل گئیں کہ اُس کا بظاہر حقیر کلرک شوہر درحقیقت کس قدر بااثر اور بارسوخ ہے۔ جب عام لوگ ایک ایک مٹھی گیہوں کو ترس رہے ہیں تو وہ اپنے غیر معمولی وسیلے سے ایک مسلّم گیہوں کی بوری رات کے سنّاٹے میں گھر لا سکتا ہے!

لوگ گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں اور ہم گیہوں خرید کر سوئے تھے اِس لئے ذرا دیر سے جاگے۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بیوی نے مُنہ اندھیرے بوری کھول ڈالی تھی۔ اُس کی فہرستِ برآمدگی کچھ اِس طرح تھی۔

خالص مٹی ـــ کوڑا اور بھوسہ ۲۵ سیر

چنا مٹر اور جو ۲۵ سیر

ربر کے جوتے کا تلا ایک عدد

گھن لگا ہوا بدبودار گیہوں ۴۵ سیر

بیگم توپ کی طرح بھری بیٹھی تھیں۔ اُن کا غصہ اِس وجہ سے اور بھی تلخ اور تُرش تھا کہ اُس بوری کی قیمت فراہم کرنے میں اُنھیں اپنے کانوں کے طلائی بُندوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ جیسے ہی بوری کی تفصیلات بتانے کے بعد اُن کے حلق میں زلزلہ خیز گھڑگھڑاہٹ پیدا ہوئی، ہم بھاگے اُن کے سامنے سے اور سیدھے موٹو مل کی دُکان پر پہنچے۔

موٹومل دُکان کے سامنے تخت پر بنیائن اور دھوتی میں بیٹھے اپنے سامنے کھڑے اپنی ہی وضع اور قطع کے اپنے سے بھی زیادہ موٹے آدمی سے ہنس ہنس کر کچھ راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے، جن میں الفاظ کم اور اشارے زیادہ تھے۔ مجھے صبر کی تاب نہ تھی اِس لئے جملۂ معترضہ کی طرح میں گھس ہی تو پڑا اُن کی گفتگو میں۔

"سیٹھ جی! آپ کی بوری میں سے پچیس سیر مٹی اور کوڑا نکلا۔"

موٹومل بے اختیار ہنسنے لگے: "صاحب! گیہوں مٹّی ہی سے نکلتا ہے آسمان سے نہیں برستا اور نہ ہمارے منتریوں کے بھاشنوں سے پیدا ہوتا ہے۔"

موٹومل کا دوست بولا: "گیہوں مٹّی سے نکلتا ہے اور گیہوں سے بھی مٹّی ہی بنتی ہے۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔"

"اور بوری میں جَو، چنا اور مٹر پچیس سیر نکلا ہے۔"

موٹومل نے ہمیں کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اُنھیں ہمارے پاگل پن پر ترس آرہا ہو۔

"صاحب! یہ جَو، چنا اور مٹر آپ کے دیش ہندوستان ہی میں پیدا ہوتا ہے اور قومی ایکتا کی بات شاید آپ کے کان میں کبھی پڑی ہو۔ قومی ایکتا کا پہلا سدھانت یہی ہے کہ سب چیزوں کو ایک میں ملا دیا جاتے۔ نہیں معلوم لوگ ملاوٹ کا رونا کیوں روتے ہیں۔ میں کہتا ہوں ملاوٹ کے بغیر قومی ایکتا ہو ہی نہیں سکتی!"

"بالکل نہیں ہوسکتی" موٹومل کا دوست بولا۔

"بوری میں ربر کے جوتے کا ایک تلا بھی نکلا ہے" ہم نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"مٹّی بھر گیہوں سے ربر کا تلا بہرحال قیمتی ہے" موٹومل کا دوست بولا۔ اُس کی بات کاٹ کر موٹومل نے کہا۔

"صاحب! خط آیا حال معلوم ہوا۔ ہمارے اور آپ کے درمیان آئندہ کوئی لین دین نہیں ہوسکتا اور جی ہاں! جو بوری آپ لے گئے ہیں اُس کے سمبندھ میں دو روپے پچاس پیسے آپ پر بوری کے دام باقی ہیں۔ ربر کے تلے کے دام میں آپ کو چھوڑے دے رہا ہوں۔"

"ڈھائی من کی بوری سے جو صرف پینتالیس سیر گیہوں نکلا ہے وہ بھی گھن لگا ہوا اور انتہائی بدبودار ہے" ہم نے جھلاکر کہا۔

"صاحب! گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔ آپ گیہوں یوں ہی استعمال کرتے ہیں یا آٹا پسوا کر؟ چکّی پر آپ کسی طرح کا گیہوں بھیجئے وہاں قومی ایکتا کے بعد آپ کو ایک ہی قسم کا آٹا ملتا ہے۔ پھر ایسی جلی کٹی باتوں سے فائدہ کہ گیہوں میں گھن لگا ہوا ہے اور اُس میں سے خوشبو کیوں نہیں آتی؟ گیہوں عطر تو ہو نہیں سکتا۔"

"آپ کا جی چاہے تو آپ گیہوں کی روٹی پر گھی کی بجائے عطر چپڑ لیا کیجئے" موٹومل کے دوست نے لقمہ دیا۔

یہ باتیں سُن کر ہماری سمجھ میں ربر کے تلے کی ترکیب استعمال تو اچھی طرح آگئی لیکن کر ہی کیا سکتے تھے۔ حکام کا رزق کبھی موٹومل اور اُن کے دوست جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں اُترا تھا اور وہ اُن کا پانی بھرتے ہیں۔ ہمارے جیسے غریب کلرک کی فریاد کون سُنتا۔ اپنا ہی خون پی کر خاموشی سے گھر لوٹ آئے اور کورٹ مارشل کئے جانے کے لئے بیوی کے حضور میں پیش ہوگئے۔

کچھ ہی دنوں میں موٹومل کی دی ہوئی بوری کی تفصیلات علاوہ ربر کے تلے کے قریب قریب زہرمار ہوچکیں تو پھر گیہوں کی تلاش شروع ہوئی۔ اُسی زمانے میں اتفاق سے ہمیں اپنے دفتر کی جانب سے ایک راشن کارڈ مِل گیا۔ بہت خوشی ہوئی اور خصوصاً اِس خیال سے کہ گیہوں کھانے کی جو سرکاری اجازت ہمارے جدِ امجد حضرت آدم کو جنّت میں نہ مِل سکی تھی وہ ہم کو اِس زندگی کے جہنّم میں گھر بیٹھے مِل گئی تھی لیکن اب مرحلہ تھا بِلّی کی گردن میں گھنٹی باندھنے کا یعنی راشن کی دُکان پر جانے اور غلّہ لانے کا!

دفتر جاتے ہوئے اکثر راشن کی دُکان پر ہم جو بے قابو ہجوم، غُل غپاڑہ، دھینگا مشتی، گالی گلوچ، کھینچ تان بلکہ دھول دھپّڑ دیکھ چکے تھے وہ بے حد ہمّت شکن تھی اور وہاں تک جانے کے خیال ہی سے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے۔ راشن کی جدوجہد میں اپنے محلّے کے ہیکڑ خاں کی ملیشیا کی نئی قمیص تار تار ہوگئی تھی۔ راجو مہترانی کا کارڈ کسی لفنگے نے بیچ مجمع میں اُچک لیا تھا۔ بھوندو میاں اپنی جیب کٹا کر اور نہ صرف راشن کے دام بلکہ ایک دوست کی امانت بھی لُٹا کر واپس آئے تھے۔ بدّھو رام مونچھوں پر تاؤ دیتے اپنے پیروں گئے تھے لیکن چاقو بازی کے بعد خون میں نہائے چارپائی پر لد کر واپس آئے تھے۔ جھگڑالو شاہ کی منڈی ہم نے کھولی [illegible] نکلنے وہ سبھ پورٹیپ جھنڈ کی تھی کہ آج تک شاہ صاحب اپنے سر [illegible] مالنے والے کے ہاتھ کی صفائی کی داد چند مخصوص گالیوں سے دیتے ہیں۔ راشن لینے کے بعد اپنا بٹوہ کھول کر تھا کو کبھی نہیں پہچانتے پاتی تھیں کہ آئے غلّے کی پوٹلی

جو بیچاری کی تہی چادر میں بندھی ہوئی تھی، کوئی اُٹھائی گیرا لے کر ایسا چمپت ہوا کہ اب بھی جب وہ بلک بلک کر اُس کی سات پشتوں کو کوستی ہیں تو دُنیا اندھیر معلوم ہونے لگتی ہے۔ غرض کہ راشن کی دُکان پر جانا شرافت کو نیلام، اپنے آپ کو بدنام اور زندگی کو سلام کرنا تھا۔ فی الحقیقت اگر جُوئے شیر لانے کی بجائے راشن لانے کو کہا جاتا تو غالبؔ وہ زندگی بھر شیریں کو کیا اُس کی والدہ تک کا نام زبان پر نہ لاتا اور بجائے تیشے سے اپنا سر پھوڑنے کے یونیورسٹی کا کوئی ہونہار طالب علم ثابت ہوتا۔

جہاں تک ہو سکا ٹالتے اور جان بچاتے رہے اور راشن کی دوکان تک جانے سے کتراتے رہے لیکن آخر کب تک؟ بھُوک اور بیوی، فرائڈ اور مارکس، ایسے بے ڈھب اشتراک کے مقابلے میں "مرتا کیا نہ کرتا" والا مضمون تھا۔ چنانچہ ہم ایک سُنہری صبح کو گھامڑ داس لپنے ہمسایہ اور جگری دوست کے ساتھ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ کی طرح اپنے سب سے پُرانے اور گئے گُزرے کپڑے پہن کر راشن کارڈ اور ردیوں سے مسلح، ہاتھ میں جھولا ہلاتے ہوئے تماشائے اہلِ کرم دیکھنے راشن کی دوکان کی طرف چل ہی تو پڑے۔ ہماری روانگی کے وقت ہم دونوں کی بیویاں دروازوں کی آڑ سے ہمیں اِس فخر اور خوشی کے ساتھ دیکھ رہی تھیں جیسے ہم دو سورما اپنے مُلک اور قوم کے لئے میدانِ جنگ کو سدھار رہے ہوں لیکن سچ پُوچھئے تو ہم دونوں کی مثال دو بد ذوق اور پھگوڑے لڑکوں کی تھی جو زبردستی اسکول بھیجے جا رہے تھے۔

راشن کی دوکان پر پہنچے تو وہاں ایک درکی چھوٹی سی دوکان کے سامنے قریب پانچ سو آدمیوں کا ایک مشتعل لیکن منجمد ہجوم پایا۔ مشتعل یوں کہ ایک ہی وقت میں سب آدمی ہاتھ ہلا ہلا کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنی مختلف بولیاں بول رہے تھے اور منجمد یوں کہ یہ مجمع کسی طرف گھٹ بڑھ نہیں رہا تھا بلکہ کچھ ایسا پتہ چلتا کہ بڑی تندہی اور یک جہتی سے وہ اُس پُوری عمارت کو جس میں راشن کی دوکان تھی پیچھے ڈھکیل رہا ہے۔

گھامڑ داس چھوٹے ڈیل ڈول اور مُنڈے سر کے گول مٹول انسان تھے۔ نہ صرف اپنی قدرتی جسامت بلکہ پیہم مشق سے حاصل کی ہوئی مہارت کے باعث بڑے سے بڑے مجمع میں بے ساختہ گھُس جانا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن اِس وقت جو مجمع اُن کے سامنے تھا اُسے دیکھ کر غالباً وہ بھی کچھ ہراساں ہو گئے تھے۔ وہ بے تحاشا بیڑی پر بیڑی پیتے چلے جاتے اور مُنہ سے کچھ بول نہیں رہے تھے۔ کئی بار وہ مجمع کے ارد گرد گھومے جیسے کوئی چور چوری کرنے سے پہلے ایرا پھیری کر رہا ہو اور پھر یکبارگی کسی ماہر غوطہ خور کی طرح وہ ایک سمت سے مجمع میں گھُس ہی تو پڑے لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجمع نے اُنھیں باہر اُگل پھینکا اور وہ اپنے غروب ہونے کے مقام سے کچھ فاصلے پر اپنی گُدّی سہلاتے نظر آئے۔

اب گھامڑ داس کو بھی جوش آگیا تھا اور اُنھوں نے اپنا جسم سکوڑ اور سر جھکا کر کسی مینڈھے کی طرح مجمع پر مختلف سمتوں سے تابڑ توڑ حملے کرنا شروع کر دئے لیکن جس تیزی سے مجمع اُنھیں نگلتا اُس سے زیادہ تیزی سے پھر باہر اُگل دیتا۔ ہم خاموش تماشائی بنے یہ آواگون یا اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے کی ستم ظریفیاں تعجب اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ آخری بار ہمارا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گھامڑ داس نے نہ صرف مجمع پر حملہ کیا بلکہ ساتھ میں یہ شور بھی مچانا شروع کیا "پولس آگئی! پولس آگئی!!" لوگ بھونچکے ہو کر پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگے اور اِس طرح ہم لوگ اپنی چرمراتی پسلیوں پر کُہنیاں کھاتے اور دبتے پستے مجمع کی چار پانچ قطاریں پار کر جانے میں کامیاب ہو گئے اور اگرچہ معاملہ لبِ بام تو خیر نہیں مگر قریبِ شام ضرور ہو گیا تھا یعنی اگر اسی رفتار سے ہم بڑھتے رہتے تو اُمید تھی کہ شام تک راشن کی دوکان تک غالباً پہنچ ہی جاتے۔ لیکن اُسی وقت ہم پر ایک اور آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی یعنی ہمارا ایک چپّل اور گھامڑ داس کی دھوتی داغِ مفارقت دے گئی!

گھامڑ داس اپنی دھوتی سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوتے اُسی میں اُلجھ کر گر پڑے۔ وہ تو کہئے کہ مجمع کے دو پہلوانوں نے بڑی عنایت کی جو کسی مرشد ہوتے تربوز کی طرح اُنھیں باہر اُٹھا کر پھینک دیا ورنہ وہ یقیناً بینگن کا بھُرتہ بن کر رہ جاتے۔ بہت مشکل سے ہم بلبلاتے کلکلاتے اور دُہائی دیتے باہر نکلے تو دیکھا کہ گھامڑ داس ننگے بدن اپنے کُرتے کو لنگوٹ بناتے اور خود ٹارزن کا پاکٹ اڈیشن بنے ہمارے منتظر کھڑے ہیں۔ کہنے لگے "بس ایک اور ہو جائے! میں نے ایک بالکل نئی ترکیب سوچی ہے۔ یہ نیم کا درخت دیکھ رہے ہو، میں اِس پر چڑھا جا رہا ہوں۔ اِس کی شاخیں دوکان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر ختم ہوتی ہیں۔ بس وہیں میں کود پڑوں گا اور پرماتما نے چاہا تو چٹکی بجاتے راشن لئے آتا ہوں!"

ہم نے اُنھیں اُن کے اِس نامعقول ارادے سے باز رکھنے کے لئے اُن کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ ایک نہ مانے اور بالآخر اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ کر ہم تنہا گھر لوٹ آنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسرے دن ہم اُنھیں دیکھنے ہسپتال پہنچے جہاں اُن کی چارپائی اور جس شخص کی پیٹھ پر وہ کودے تھے پاس پاس پڑی ہوئی تھیں تو پتہ چلا کہ راشن کے لئے جس دوکان پر ہم لوگ دھاوا بول رہے تھے، ہمارے کارڈ وہاں کے نہیں تھے۔ بیچارے گھامڑ داس نے چوٹ تو کھائی تھی لیکن ایک قاعدے کی بات دریافت بھی کر لائے تھے۔

تین دنوں کے بعد جب گھامڑ داس بالکل ٹھیک ہو چکے تھے تو ہم دونوں ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ راشن کی دوسری دوکان پر پہنچے۔ یہاں کے حالات کچھ قاعدے کے نظر آئے۔ دوکان کے سامنے باقاعدہ قطار لگی ہوئی تھی۔ البتہ یہ قطار شبِ فراق سے زیادہ طویل اور زلفِ جلیپات زیادہ پیچیدہ تھی۔ دوکان کے سامنے ہی

پیراڈائز سینما کے ٹکٹ گھر کی کھڑکی تھی اور اُس کی قطار کی دُم بھی بہت دُور تک پھیلی اور بنے ہیر پھیر سے تھی۔ دونوں ہجوموں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ زیادہ لوگ گیہوں کھانا چاہتے ہیں یا سینما دیکھنا! ہم دونوں کچھ دیر تو اِدھر اُدھر گشت کرتے رہے پھر جب ایک قطار سے ایک آدمی کسی ضرورت سے ہٹا تو گھامڑ داس نے بلا تکلف اُس کی جگہ مجھے فٹ کر دیا۔ پیچھے کے آدمی نے اعتراض کیا تو انھوں نے اُسے ایک بیڑی کی رشوت دیتے ہوئے یہ کہہ کر خاموش کر دیا: "یہ اُن کے بھتیجے ہیں" کچھ دیر بعد نہیں معلوم کیسے قطار میں اُس جگہ جہاں گھامڑ داس کھڑے کسی قطار والے سے باتیں کر رہے تھے کچھ ہنگامہ ہو گیا اور تھوڑی دیر کے لئے اُس کا ایک حصّہ بکھر سا گیا۔ دو کانسٹبل ڈنڈے لئے دوڑ کر آئے اور اُنھوں نے پھر سے قطار بنوا دی۔ اب قطار میں گھامڑ داس بھی میرے آگے باقاعدہ فٹ ہو چکے تھے۔

وقت گزرتا گیا اور قطار آگے رینگتی رہی۔ رینگتی رہی، رینگتی رہی۔ طبیعت اوب گئی، سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے اور ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے۔ دفعتاً گھامڑ داس نے ہمارے ہاتھ سے ہمارا راشن کارڈ چھین لیا اور ایک نعرۂ مستانہ کے ساتھ سامنے کھڑکی میں اپنے اور ہمارے راشن کارڈوں اور کچھ نوٹوں کے ساتھ اپنا ہاتھ گھسیڑ دیا۔ چند سکنڈ بعد اُن کے ہاتھ میں سینما کے دو کنسیشن ٹکٹ تھے۔ غالباً ہمارے راشن کارڈ طلباء کے نشاندہی کے کارڈ سمجھے گئے تھے۔ اِس سے پہلے کہ ہم کچھ پوچھ سکیں کھڑکی بند کر دی گئی۔ ہاؤس فُل ہو چکا تھا۔ اے خدا! یہ کیا ہوا؟ گیہوں کی بجائے سینما۔ گیہوں کھانے کے بعد جنّت سے نکالے جانے کی بات تو صرف سُنی تھی لیکن گیہوں کھانے سے پہلے جنّت میں بھیجے جانے کی واردات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ قطاروں کے خلط مبحث میں کسی سنگم پر ہم لوگ راشن کی بجائے سینما کی قطار میں پہنچ گئے تھے۔

دن بھر دھوپ میں بھوکے کھڑے رہنے اور پھر تین گھنٹے جبریہ سینما دیکھنے کے بعد ہم سینما ہال سے چوندھیائے ہوئے لڑکھڑاتے نکلے تو ہماری بیویاں جو ہمیں تلاش کرنے راشن کی دوکان پر آئی تھیں، ہمیں مل گئیں۔ پھر کیا ہوا؟ کاش زمین پھٹ جاتی یا آسمان گر پڑتا یا کم سے کم راشن دینے والے کا، جو نہیں معلوم کتنی دیر پہلے دوکان بند کر چکا تھا، دل پسیج جاتا اور اُس کی دوکان کھل جاتی۔

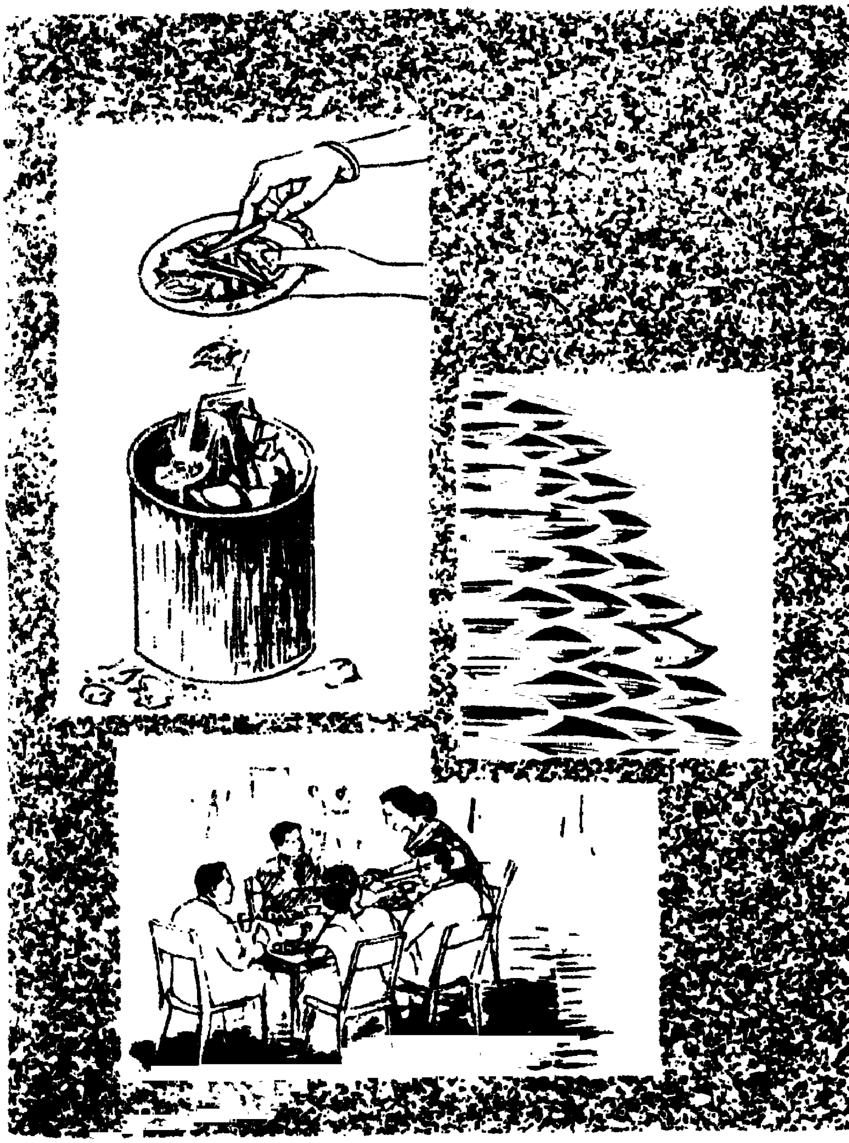
گھامڑ داس نے گھر جانے سے قطعاً انکار کر دیا اور وہیں راشن کی دوکان کے برآمدے میں بیہوش ہو کر گر پڑے یا سو گئے۔ رات بھر اُن کی تیمار داری ہوتی رہی اور وہ خراٹے لیتے رہے۔ سویرے جب راشن کی دوکان کھلی تو سب سے پہلے راشن اُن کو اور ہم کو ہی ملا۔ ہنسی خوشی ہم سب گھر لوٹ آئے لیکن جب راشن کی پوٹلی کھولی تو پتہ چلا کہ راشن کی دوکان والا قومی ایکتا کے معاملے میں موتوِمل کا بھی چچا تھا!!

بیساکھی کا تہوار

صارفین اور کاشت کاروں

کے باہمی تعاون

کا مقتضی ہے



کسان کے ذریعہ سے
حاصل کی گئی پیداوار سے
بیش از بیش فائدہ اٹھائیں

اناج ضائع نہ کریں

جب بہت سے لوگوں کو خوراک کی
ضرورت ہو تو اُسے ضائع کرنا
ایک مجرمانہ فعل ہے۔

ذخیرہ اندوزی نہ کریں

بڑی بڑی ضیافتوں سے گریز کریں

اور اناج بچائیں

یاد رکھیے:۔

اگر پانچ افراد کے کنبے کا ہر فرد [illegible] ۵۰ کلوگرام اناج کی بچت ہوجاتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۹ کروڑ کنبے ہیں

جاری کردہ :۔ محکمہ تعلقات عامہ، پنجاب

چند تصویرِ بُتاں

اختر عابد نوگانوی

گھیر جنات ۔ امروہہ ۔ یو ۔ پی

۱۵ مارچ ۶۶ء

محبی! ہدیۂ خلوص

لیجئے اِس بار "چند تصویرِ بُتاں" حاضر ہے۔ یقین ہے آپ پسند کریں گے۔ آپ مناسب سمجھیں تو افسانہ نمبر کے لئے محفوظ کر لیں۔ آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا . . .

آپ کی محبتوں کا تمنائی ——— عابد

سُرخ بلب کی روشنی سے کمرے میں آگ سی لگ رہی تھی، اور ایسی ہی آگ کی ...ریاں اُس کے سینے میں دہک رہی تھیں۔ آنسو بھاپ کے قطروں کی طرح اُس کی ...ں پر کانپ رہے تھے۔ وہ اپنی کہانی سُناتے سُناتے خاموش ہو گیا

میری انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ ایک داغ چھوڑ کر فرش پر سُلگ رہا ہے۔ ...ک دھوئیں کی خوشبو کو میں محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے دوسرا سگریٹ پھر جلا ...ہے۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اُسے ٹوکا۔

اُس نے ایک طویل سانس لی۔ جیسے بیہوشی کے عالم سے ہوش میں آیا ہو۔

"عسمی ایک ایسا حسین خواب تھی جو اُس کی قربتوں نے میری آنکھوں کو بخشا ...ر میں جذبات کی روانی کے ساتھ اُس کے خیالوں میں بہتا رہا۔ اِس طرح میں خود کو ...ل گیا، غموں کو بھول گیا، دُنیا کو بھول گیا اور اپنے خیالوں کی ایک چھوٹی سی خوبصورت ... جانے لگا۔ جیسے میں گہری نیند میں تھا۔ اُس نیند میں ایک ہی حسین خواب بسا ہوا ...۔ اُس خواب میں میری چھوٹی سی دُنیا تھی۔ اُس دُنیا میں عسمی تھی، اُس کی محبت تھی، ...ں کا التفات تھا، شوخ مُسکراہٹیں تھیں ——— لیکن جب آنکھ کھُلی تو کچھ نہ تھا۔ دوپہر ...، دھوپ کی جلن تھی ——— عسمی مجھ سے دُور چلی گئی تھی۔ جہاں کوئی غم نہ تھا۔ ...شیاں تھیں۔ جہاں رات کے آنچل میں ستارے ٹکے ہوتے ہیں۔ عیش ہوتے ہیں، ...ے ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ راتوں کی سیاہی تھی۔ میں ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے ...طرح پڑا رہ گیا۔"

اُس نے کہتے کہتے دَم لیا تو میں نے عسمی کی تصویر کو بغور دیکھا۔ کتنی شوخ اور اُس شوخی میں چھُپی ہوئی معصومیت۔ بڑی بڑی آنکھیں، گہری گہری، جن میں ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے ——— میں سوچتا رہا۔ اُسے حسین تشبیہات دینے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کی آرزوؤں پر غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا جیسے عسمی کی تصویر میری نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی ہے اور میری آنکھوں میں اندھیرا پھیل گیا ہے۔

اُس نے البم کا ورق اُلٹ دیا ہے اور میں نے اپنے احساسات کو سُلانے کے لئے دوسرا سگریٹ جلا لیا ہے۔

"یہ تصویر حُسنی کی ہے" اُس نے کہا۔ "حُسنی عسمی کی سوتیلی بہن تھی۔ اُس دن وہ میرے قریب آئی جب عسمی رخصت ہو کر مجھ سے دُور چلی گئی اور میں آنکھوں پر غم کا بوجھ اُٹھائے کھڑا تھا۔

"آپ کا غم میں جانتی ہوں" حُسنی نے اچانک مجھ سے کہا تھا۔

میں چونک گیا تھا "تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے اُس سے سوال کیا۔

"آپ کی تحریر سے، آپ کے پرچے پڑھ کر اور اب آپ کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں دیکھ کر۔ آپ کا مُرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر۔ میں آپ کے کسی کام آ سکتی ہوں؟"

"حُسنی! تم میرے زخم کا مرہم بن سکتی ہو۔ اُن لمحات کو واپس لا سکتی ہو جن کے دامن میں میری خوشیاں تھیں" میں نے غیر ارادی طور پر اُس کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے لیا۔

"اگر آپ کا دل اجازت دے تو ——— یقیناً وہ لمحات پھر لوٹ سکتے ہیں۔ باجی

بیساکھی کا تہوار

صارفین اور کاشت کاروں

کے باہمی تعاون

کا مقتضی ہے



کسان کے ذریعہ سے
حاصل کی گئی پیداوار سے
بیش از بیش فائدہ اٹھائیں

اناج ضائع نہ کریں

جب بہت سے لوگوں کو خوراک کی
ضرورت ہو تو اُسے ضائع کرنا
ایک مجرمانہ فعل ہے۔

ذخیرہ اندوزی نہ کریں

بڑی بڑی ضیافتوں سے گریز کریں

اور اناج بچائیں

یاد رکھیے:

اگر پانچ افراد کے کنبے کا ہر فرد روزانہ [illegible] ۵۰ گرام اناج کی بچت ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۹ کروڑ کنبے ہیں۔

شائع کردہ : محکمہ تعلقات عامہ، پنجاب

افسانہ

چند تصویرِ بتاں

_____ اختر عابد نوگانوی

محلہ بناف، امروہہ۔ یو، پی

۱۵ مارچ ۶۶ء — محبی! ہدیۂ خلوص

لیجئے اِس بار "چند تصویرِ بتاں" حاضر ہے۔ یقین ہے آپ پسند کریں گے۔ آپ مناسب سمجھیں تو افسانہ نمبر کے لئے محفوظ کرلیں۔ آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا . . .

آپ کی محبتوں کا تمنائی _____ عابد

سُرخ بلب کی روشنی سے کمرے میں آگ سی لگ رہی تھی اور ایسی ہی آگ کی چنگاریاں اُس کے سینے میں دہک رہی تھیں۔ آنسو بھاپ کے قطروں کی طرح اُس کی پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ وہ اپنی کہانی سُناتے سُناتے خاموش ہوگیا۔

میری انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ ایک داغ چھوڑ کر فرش پر سُلگ رہا ہے۔ اُس کے دھوئیں کی خوشبو کو میں محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے دوسرا سگریٹ پھر جلا لیا ہے۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے اُسے ٹوکا۔

اُس نے ایک طویل سانس لی۔ جیسے بیہوشی کے عالم سے ہوش میں آیا ہو۔

"عسمیٰ ایک ایسا حسین خواب تھی جو اُس کی قربتوں نے میری آنکھوں کو بخشا تھا اور میں جذبات کی روانی کے ساتھ اُس کے خیالوں میں بہتا رہا۔ اِس طرح میں خود کو بھول گیا، سَموں کو بھول گیا، دُنیا کو بھول گیا اور اپنے خیالوں کی ایک چھوٹی سی خوبصورت دُنیا بنانے لگا۔ جیسے میں گہری نیند میں تھا۔ اُس نیند میں ایک ہی حسین خواب بسا ہوا تھا اُس خواب میں میری چھوٹی سی دُنیا تھی۔ اُس دُنیا میں عسمیٰ تھی، اُس کی محبت تھی، اُس کا التفات تھا، شوخ مُسکراہٹیں تھیں _____ لیکن جب آنکھ کھُلی تو کچھ نہ تھا۔ دوپہر تھی، دھوپ کی جلن تھی _____ عسمیٰ مجھ سے دُور چلی گئی تھی۔ جہاں کوئی غم نہ تھا۔ خوشیاں تھیں۔ جہاں رات کے آنچل میں ستارے ٹکے ہوتے ہیں۔ عیش ہوتے ہیں، قہقہے ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ راتوں کی سیاہی تھی۔ میں ایک ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح پڑا رہ گیا۔"

اُس نے کہتے کہتے دَم لیا تو میں نے عسمیٰ کی تصویر کو بغور دیکھا۔ کتنی شوخ اور اُس شوخی میں چھُپی ہوئی معصومیت۔ بڑی بڑی آنکھیں، گہری گہری، جن میں ڈوب جانے کو دل چاہے _____ میں سوچتا رہا۔ اُسے حسین تشبیہات دینے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کی آرزوؤں پر غور کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا جیسے عسمیٰ کی تصویر میری نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی ہے اور میری آنکھوں میں اندھیرا پھیل گیا ہے۔

اُس نے البم کا ورق اُلٹ دیا ہے اور میں نے اپنے احساسات کو سُلانے کے لئے دوسرا سگریٹ جلا لیا ہے۔

"یہ تصویر حُسنیٰ کی ہے" اُس نے کہا "حُسنیٰ عسمیٰ کی سوتیلی بہن تھی۔ اُس دن وہ میرے قریب آئی جب عسمیٰ رخصت ہوکر مجھ سے دُور چلی گئی اور میں آنکھوں پر غم کا بوجھ اُٹھائے کھڑا تھا۔

"آپ کا غم میں جانتی ہوں" حُسنیٰ نے اچانک مجھ سے کہا تھا۔

میں چونک گیا تھا "تمھیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے اُس سے سوال کیا۔

"آپ کی تحریر سے، آپ کے پرچے پڑھ کر اور اب آپ کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں دیکھ کر۔ آپ کا مُرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر۔ میں آپ کے کسی کام آسکتی ہوں؟"

"حُسنیٰ! تم میرے زخم کا مرہم بن سکتی ہو۔ اُن لمحات کو واپس لاسکتی ہو جن کے دامن میں میری خوشیاں تھیں" میں نے غیر ارادی طور پر اُس کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے لیا۔

"اگر آپ کا دل اجازت دے تو _____ یقیناً وہ لمحات پھر لوٹ سکتے ہیں۔ ہاں جی

کی آنکھوں میں بجلیوں کی چمک تھی، اُسی نے اُنھیں متاثر کر دیا تھا وہ آپ کا دامن چھوڑ کر چلی گئیں لیکن میں آپ کی شریکِ غم بن سکتی ہوں ۔"

"ہمیشہ کے لئے ؟" میں نے جذبات میں کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو . . ."

وقت گزرتا گیا لیکن میں چاہتے ہوئے بھی عسمیٰ کے خیال کو ذہن سے نہ نکال سکا۔ تحسینؔ نے اپنی محبت کے سرور سے مجھے بے خود بنانے کی لاکھ کوششیں کیں۔ ایک دن تحسینؔ نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا۔

"میرے دل نے آپ کو بہت پہلے چاہا ہے۔ اُس وقت جب آپ کے قدم باجی کی جانب اُٹھے بھی نہ تھے لیکن جب میں نے آپ کے قدموں کا رُخ اُن کی جانب دیکھا تو میری آس ٹوٹ گئی۔ آپ باجی کے بہت قریب آچکے تھے۔ میری مداخلت ایک ہنگامہ بن

- رات کو پچھلے پہر مالک تجھ سے ملنے آتا ہے لیکن تو اُس وقت خراٹے بھرتا ہے۔ (گرو گرنتھ صاحب)
- جو نیک انسانوں سے محبت کرتا ہے ایشور سے محبت کرتا ہے۔ (سوامی سار شیدا نند جی)
- کسی کی بدحالی پر نہ ہنسو۔ نہ جانے کل تمھیں کیسے دن دیکھنے پڑیں۔ (ماتا ریحسانہ جی)
- شہرت کی ہوس، لالچ اور غضب، جب تک یہ دل سے نہ نکلیں عالِم اور بیوقوف برابر ہیں۔ (تُلسی داس جی)
- بھلائی ہی بُرائی کے اثر کو زائل کرتی ہے۔ (سوامی سار شیدا نند جی)

سکتی تھی، ایک طوفان اُٹھا سکتی تھی۔ میں مایوس قدموں سے پیچھے ہٹ گئی اور اپنے دل کو بہلانے کی سعی کرنے لگی ۔"

لیکن راتوں کی پُرسوز تنہائیاں میرے احساس میں بس چکی تھیں۔ عسمیٰ کی یاد مجھے بیقرار کر دیتی اور تحسینؔ کو میں بھول جاتا۔ وہ اپنی بے لوث محبت کا دامن پھیلائے میری جانب بڑھتی رہی اور میں اپنی تلخیوں کو سینے میں چھپائے اُس سے دُور بھاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک دن وہ مجھے درد بھری آواز سے پکارتی رہ گئی اور میں اس کی نگاہوں سے اتنی دُور چلا آیا کہ وہ میرے لئے ایک نقش بن گئی، مگر ایسا نقش جسے میں اپنے دل کی لوح سے آج تک نہ مٹا سکا۔ میں نہیں جانتا' میں نے تحسینؔ کے جذبات کو کیوں کچل دیا، اُسے کیوں ٹھکرا دیا اور کیوں اُس سے دُور چلا آیا ؟ لیکن آج اُس کی تصویر کو جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں بے اختیار نم ہو جاتی ہیں پھر ایسا محسوس ہوتا ہے، ایک سوگوار لاش سیاہ کفن میں لپٹی ہوئی سامنے کھڑی ہے اور مجھ سے میری بے رُخی کا گلہ اشکوں کے سیلاب میں بہتے ہوئے کر رہی ہے۔ میری بانہیں پھیلتی ہیں اور سمٹ جاتی ہیں ۔"

"تو کیا تحسینؔ اِس دُنیا میں نہیں ہے ؟" میں نے کرب کے ساتھ پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا . . . دل کہتا ہے کہ وہ اُس غم کے بوجھ کو نہ اُٹھا سکی ہوگی ۔"

اتنا کہہ کر اُس نے البم کا ایک اور ورق اُلٹ دیا اور جیسے ایک نیا قدر میرے سامنے آ گیا ہے۔

"وقت کے دامن میں بڑے بڑے انقلاب چھپے ہوئے ہیں۔ وقت جب انگڑائی لیتا ہے ایک نیا ایک انقلاب سامنے آجاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی میں انقلاب آ گیا ہے۔ انقلاب تو پہلے بھی رونما ہوتے تھے لیکن یہ انقلاب ایسا تھا جس نے مجھے بدل دیا تھا۔ میں زندگی کی دشوار رہگزاروں میں بھٹکتے بھٹکتے سب کچھ بھول گیا تھا۔ تنہائی کے تنگ دائرے میں پھنس کر مجبور ہو گیا تھا۔ تحسینؔ اور عسمیٰ کا خیال میرے ذہن سے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی طرح اُڑ گیا تھا اور راہوں کی گرد دل و دماغ پر جم گئی تھی۔

"یہ تصویریں جو تم دیکھ رہے ہو، یہ اُسی گرد کے طوفان میں [illegible] رہی ہیں ——— یہ ناز ہے جو متاعِ غم لے کر میرے قریب آئی تھی اور پھر ہمیشہ کے [illegible] اندھیرے میں سو گئی ———"

"یہ تصویر شمع کی ہے جس نے ہر دل کو اپنی روشنی دی، ہر محفل کو منور کیا لیکن خود جلتی رہی، پگھلتی رہی۔ اپنی کانپتی ہوئی لَو کے ساتھ میرے اندھیروں میں آئی۔ مجھے اُس کی ضرورت تھی لیکن اچانک طوفان آیا اور اِس طرح آیا کہ شمع گُل ہو گئی اور گہرا اندھیرا چھا گیا ۔"

"یہ ریتا ہے ——— جو میرے ساتھ فیکٹری میں کام کرتی تھی، مشین چلاتی تھی۔ مشین کی آواز اِس کے لئے مدھر گیتوں سے کم نہ تھی۔ اگرچہ اُس کے کانوں نے کسی کی محفل میں کوئی گیت نہ سُنا تھا۔ شاید وہ گیت کی لَے سے آشنا ہی نہ تھی۔ وہ خود ایک مشین معلوم ہوتی، اُس کی زندگی مشین معلوم ہوتی۔ اُس کے ذہن میں صرف چند باتیں تھیں۔ اُس کا شوہر مر چکا ہے، اُسے زندگی کے دن اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ کانٹوں پر چل کر گزارنے ہیں۔ پیٹ کی آگ بجھانی ہے۔ دل کی آگ کیسے بھڑکتی ہے، وہ نہیں جانتی تھی۔ اگر جانتی تھی تو دانستہ انجان بن گئی تھی۔ ایک دن اُس کے دونوں ہاتھ مشین سے کٹ گئے۔ اُس کے بعد وہ میری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئی ———"

"یہ لوسی ہے، کرسچین۔ مریم کی بیٹی ! ایک آرٹسٹ، جو تصویریں بنایا کرتی تھی اور ہر تصویر میں ایک نقص ضرور چھوڑ دیتی تھی۔ اُن تصویروں میں کوئی لنگڑا ہوتا، کوئی

کوئی دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں سے مفلوج ہوتا، کوئی کانا ہوتا، کوئی اندھا۔ کوئی فالج زدہ ہوتا اور کوئی کوڑھی نظر آتا۔

میں نے ایک دن اُس سے پوچھا "کوستی! تم اِتنی بھیانک تصویریں کیوں بناتی ہو؟"

میرے سوال پر کوستی مُسکرا دی۔ اُس کی مُسکراہٹ میں تلخی تھی۔ جواب دیا "ہماری سوسائٹی میں سب ایسا ہی لوگ ہے۔ اِس لئے ہم اُنھیں کا پوز بناتی ہے۔"

میں اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے دل میں ایک آرزو جاگی۔ میں نے کہا "کوستی! کیا ہم آرٹسٹ ہو سکتا ہے؟"

"تم آرٹسٹ ہو سکتا نہیں تم آرٹسٹ ہے۔ تمہارا فیس آرٹ ہے، تمہارا ٹیلنٹ آرٹ ہے، تم سر سے پاؤں تک آرٹ ہے۔ ہم تمھارا پوز بنائے گی۔"

"لیکن مفلوج، بھیانک، کوڑھی جیسا ــــ؟" میں نے طنزیہ کہا۔

"نہیں! بالکل تمھارا مافک۔ تم ہمارا فرسٹ فرینڈ ہے جو ہمارا جیسا دل رکھتا ہے!"

اُسی دن سے میرے دل میں ایک آرٹسٹ سر اُٹھانے لگا تھا۔ پھر مجھے کوستی نے آرٹ کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا۔ ایک دن وہ لندن چلی گئی۔ مجھے اپنا بہت کچھ دے کر ــــ اپنا آرٹ، اپنا فن اور فن سے وابستہ ہر شے! صرف میری تصویر اپنے ساتھ لے گئی جو اُس نے شاید سبھی [illegible] حسین رنگوں کے امتزاج سے بنائی تھی۔

سب سے پہلے جو تصویر میں نے بنائی، وہ ممّے کی تھی، پھر مُنّے، ناز، شمع، ریتا اور کوستی کی ــــ میں آرٹسٹ بن گیا۔ برش کا سہارا لے کر زندگی کے مختلف رنگ کاغذ پر بکھیرتا رہا۔ تصویریں بنتی رہیں لیکن پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئی تھیں اور سب یکجا ہو کر دل سے دیمک کی طرح چمٹنے لگی تھیں۔ کبھی ممّے کی بے رُخی یاد آتی، کبھی مُنّے کی وفا! کبھی شمع پگھلتی، کبھی ناز کراہنے لگتی۔ کبھی ریتا کے کٹے ہوئے ہاتھوں سے خون ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا اور کبھی . . ."

وہ کچھ کہتے کہتے اچانک اِس طرح خاموش ہو گیا ہے جیسے قوتِ گویائی کسی نے چھین لی ہو یا کوئی انجانی طاقت اُس کا گلا گھونٹنے لگی ہو۔ وہ عجیب آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا ہے۔ شاید میری آنکھوں سے چھلکے ہوئے آنسوؤں نے اُسے متاثر کر دیا ہے۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو کیوں آئے؟ مجھ سے وابستہ کوئی غم بھی تو نہیں ہے۔ یہ شاید اُس کی کہانی کا اثر ہے، جس نے مجھے اِتنا متاثر کر دیا ہے۔ نجانے کتنے مرد، عورتیں اور حسین لڑکیاں اُس کے آرٹ کی شیدائی ہیں۔ میں بھی اُنھیں میں سے ایک ہوں لیکن میں کچھ حد سے آگے بڑھ گیا ہوں کہ اُس کے آرٹ پر اپنا خیال ظاہر کرنے کی بجائے اُس کے آرٹ اور اُس کی زندگی کی گہرائی کو ٹٹولنے لگا ہوں اور اُس نے ہر رُخ سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ سامنے ٹیبل پر پھیلا ہوا اُس کا البم دیکھنے کی مجھے بہت آرزو تھی، جس کی میں نے بہت تعریف سُنی تھی اور میرا دل مچل گیا تھا۔ آج میری یہ آرزو پوری ہو گئی ہے کہ اُس نے میری درخواست قبول کر لی اور اپنا البم بھی لانے کا وعدہ کیا۔ اِس البم کی ہر تصویر کی کہانی میں اُس کے خالق کی زبانی سُن چکا ہوں۔ اب صرف ایک ورق باقی ہے جسے میں اپنے ہی ہاتھ سے اُلٹ دینا چاہتا ہوں۔

پے بہ پے سگریٹ پینے کے بعد میں نے نیا سگریٹ جلا لیا ہے، جس کا دھواں کمرے میں پھیلی ہوئی سُرخ روشنی میں اُڑتا ہوا ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی آگ بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں نے اُس ورق کو اُلٹ دیا ہے لیکن اِس طرح چونک گیا ہوں جیسے کسی نے پیٹھ میں نشتر پیوست کر دیا ہو۔ یہ تصویر ــــ یہ البم ــــ آرٹ ــــ آرٹسٹ! میرے ذہن میں بہت سے سوالات بیک وقت جاگ گئے ہیں۔ بمشکل تمام میں نے دل کو سنبھالا ہے۔

- میرے بندوں سے کہہ دو! وہی بات کہیں جو بہتر ہو۔ جس میں نیکی اور بھلائی ہو۔ (قرآن پاک)
- حُسنِ خلق، انسان کا رفیق ہے اور ادب اُس کی میراث۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- جو چھوٹے ہاتھ سے دیتا ہے وہ لمبے ہاتھ سے پاتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- ضرورت پُوری نہ ہونا اِس سے کہیں اچھا ہے کہ اُس کی خاطر کسی نااہل سے رجوع کیا جائے۔ (حضرت حسن رضی اللہ عنہٗ)
- اللہ اہلِ انصاف کو پسند کرتا ہے (قرآن پاک)

"تم کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہو؟" شاید اُس نے میرے چہرے کے تاثرات کو پرکھ لیا ہے۔

"میں . . . میں پریشان . . . نہیں! نہیں!! مگر ہاں یہ تصویر دیکھ کر مجھے تمہاری فن کی بلندی پر حیرت ہو رہی ہے۔ تم کچھ کہتے کہتے رُک گئے تھے ــــ"

"میں اِسی تصویر کے بارے میں کہنا چاہتا تھا۔" وہ پھر کہیں کھو سا گیا اور اُسی کھوئے ہوئے انداز سے کہنے لگا۔ "اور کبھی نشاط سامنے آجاتی۔ اُس کی ریشمی زُلفیں شانوں کو چھوتی ہوئی، جن میں میں اُلجھ گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن کی گہرائی میں ڈوب گیا تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ جن کی رس بھری خوشبو کو میں محسوس کر چکا تھا۔ گداز کلائیاں جو ایک بار محبت سے میرے کاندھے پر مچل گئی تھیں۔ خوبصورت ہاتھ جن کے

کی آنکھوں میں بجلیوں کی چمک تھی، اُسی نے اُنھیں متاثر کر دیا تھا وہ آپ کا دامن چھوڑ کر چلی گئیں لیکن میں آپ کی شریکِ غم بن سکتی ہوں ۔"

"ہمیشہ کے لئے ؟" میں نے جذبات میں کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو . . ؟"

وقت گزرتا گیا لیکن میں چاہتے ہوئے بھی عسمیٰ کے خیال کو ذہن سے نہ نکال سکا۔ محسنیٰ نے اپنی محبت کے سروں سے مجھے بے خود بنانے کی لاکھ کوششیں کیں۔ ایک دن محسنیٰ نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا۔

"میرے دل نے آپ کو بہت پہلے چاہا ہے۔ اُس وقت جب آپ کے قدم باجی کی جانب اُٹھے بھی نہ تھے لیکن جب میں نے آپ کے قدموں کا رُخ اُن کی جانب دیکھا تو میری آس ٹوٹ گئی۔ آپ باجی کے بہت قریب آچکے تھے۔ میری مداخلت ایک ہنگامہ بن سکتی تھی، ایک طوفان اُٹھا سکتی تھی۔ میں مایوس قدموں سے پیچھے ہٹ گئی اور اپنے دل کو سہلانے کی سعی کرنے لگی ۔"

لیکن راتوں کی پُر سوز تنہائیاں میرے احساس میں بس چکی تھیں۔ عسمیٰ کی یاد مجھے بیقرار کر دیتی اور محسنیٰ کو میں بھول جاتا۔ وہ اپنی بے لوث محبت کا دامن پھیلائے میری جانب بڑھتی رہی اور میں اپنی تلخیوں کو سینے میں چھپائے اُس سے دُور بھاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک دن وہ مجھے درد بھری آواز سے پُکارتی رہ گئی اور میں اُس کی نگاہوں سے اتنی دُور چلا آیا کہ وہ میرے لئے ایک نقش بن گئی، مگر ایسا نقش جسے میں اپنے دل کی لوح سے آج تک نہ مٹا سکا۔ میں نہیں جانتا، میں نے محسنیٰ کے جذبات کو کیوں کچل دیا، اُسے کیوں ٹھکرا دیا اور کیوں اُس سے دُور چلا آیا؟ لیکن آج اُس کی تصویر کو جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں بے اختیار نم ہو جاتی ہیں پھر ایسا محسوس ہوتا ہے، ایک سوگوار لاش سیاہ کفن میں لپٹی ہوئی سامنے کھڑی ہے اور مجھ سے میری بے رُخی کا گلہ اشکوں کے سیلاب میں بہتے ہوئے کر رہی ہے۔ میری باہیں پھیلتی ہیں اور سمٹ جاتی ہیں ۔"

"تو کیا محسنیٰ اِس دُنیا میں نہیں ہے؟" میں نے کرب کے ساتھ پُوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا . . . دل کہتا ہے کہ وہ اُس غم کے بوجھ کو نہ اُٹھا سکی ہوگی ۔"

اتنا کہہ کر اُس نے البم کا ایک اور ورق اُلٹ دیا اور جیسے ایک نیا فقدریے سامنے آگیا ہے۔

"وقت کے دامن میں بڑے بڑے انقلاب چھپے ہوتے ہیں۔ وقت جب انگڑائی لیتا ہے ایک نہ ایک انقلاب سامنے آجاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی میں انقلاب آگیا ہے۔ انقلاب تو پہلے بھی رونما ہوتے تھے لیکن یہ انقلاب ایسا تھا جس نے مجھے یکسر بدل دیا تھا۔ میں زندگی کی دشوار رہگزاروں میں بھٹکتے بھٹکتے سب کچھ بھول گیا تھا یا وقت کے تنگ دائرے میں پھنس کر مجبور ہو گیا تھا۔ محسنیٰ اور عسمیٰ کا خیال میرے ذہن سے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کی طرح اُڑ گیا تھا اور راہوں کی گرد دل و دماغ پہ جم گئی تھی

"یہ تصویریں جو تم دیکھ رہے ہو، یہ اُسی گرد کے طوفان میں [illegible] ہیں ——— یہ نازؔ ہے جو متاعِ غم لے کر میرے قریب آئی تھی اور پھر ہمیشہ کے [illegible] کے اندھیرے میں سو گئی ——"

"یہ تصویر شمع کی ہے جس نے ہر دل کو اپنی روشنی دی، ہر محفل کو منوّر کیا لیکن خود جلتی رہی، پگھلتی رہی۔ اپنی کانپتی ہوئی لَو کے ساتھ میرے اندھیروں میں آگئی مجھے اُس کی ضرورت تھی لیکن اچانک طوفان آیا اور اِس طرح آیا کہ شمع گُل ہو گئی اور گہرا اندھیرا چھا گیا۔"

"یہ ریتا ہے ——— جو میرے ساتھ فیکٹری میں کام کرتی تھی، مشین چلاتی تھی، مشین کی آواز اِس کے لئے مدھر گیتوں سے کم نہ تھی۔ اگرچہ اُس کے کانوں نے کسی کی میٹھی زبان سے کوئی گیت نہ سُنا تھا۔ شاید وہ گیت کی لَے سے آشنا ہی نہ تھی۔ وہ خود ایک مشین معلوم ہوتی، اُس کی زندگی مشین معلوم ہوتی۔ اُس کے ذہن میں صرف چند باتیں تھیں کہ اُس کا شوہر مر چکا ہے، اُسے زندگی کے دن اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ کانٹوں پر چل کر گزارنے ہیں۔ پیٹ کی آگ بُجھانی ہے۔ دل کی آگ کیسے بجھ سکتی ہے؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ اگر جانتی تھی تو دانستہ انجان بن گئی تھی۔ ایک دن اُس کے دونوں ہاتھ مشین سے کٹ گئے۔ اُس کے بعد وہ میری آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئی ——"

"یہ لُوسی ہے، کرسچین۔ مریم کی بیٹی! ایک آرٹسٹ، جو تصویریں بنایا کرتی تھی اور ہر تصویر میں ایک نقص ضرور چھوڑ دیتی تھی۔ اُن تصویروں میں کوئی لنگڑا ہوتا، کوئی لُولا

- رات کو پچھلے پہر مالک تجھ سے ملنے آتا ہے لیکن تُو اُس وقت خرّاٹے بھرتا ہے۔ (گرو گرنتھ صاحب)
- جو نیک انسانوں سے محبت کرتا ہے ایشور سے محبت کرتا ہے۔ (سوامی سارشدا نند جی)
- کسی کی بدحالی پر نہ ہنسو۔ نہ جانے کل تمھیں کیسے دن دیکھنے پڑیں۔ (ماتا ریحانہ جی)
- شہرت کی ہوس، لالچ اور غضب، جب تک یہ دل سے نہ نکلیں عالم اور بیوقوف برابر ہیں۔ (تُلسی داس جی)
- بھلائی ہی بُرائی کے اثر کو زائل کرتی ہے۔ (سوامی سارشدا نند جی)

کوئی دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں سے مفلوج ہوتا، کوئی کانا ہوتا، کوئی اندھا۔ کوئی فالج زدہ ہوتا اور کوئی کوڑھی نظر آتا۔

میں نے ایک دن اُس سے پوچھا: "لوسی! تم اِتنی بھیانک تصویریں کیوں بناتی ہو؟"

میرے سوال پر لوسی مُسکرا دی۔ اُس کی مُسکراہٹ میں تلخی تھی۔ جواب دیا "ہماری لائف میں سب ایسا ہی لوگ ہے۔ اِس لئے ہم اُنھیں کا پوز بناتی ہے۔"

میں اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میرے دل میں ایک آرزو جاگی۔ میں نے کہا "لوسی! کیا ہم آرٹسٹ ہو سکتا ہے؟"

"تم آرٹسٹ ہو سکتا نہیں، تم آرٹسٹ ہے۔ تمہارا فیس آرٹ ہے، تمہارا لائف آرٹ ہے، تم سر سے پاؤں تک آرٹ ہے۔ ہم تمھارا پوز بنائے گی۔"

"لیکن مفلوج، بھیانک، کوڑھی جیسا ۔۔۔؟" میں نے طنزیہ کہا۔

"نہیں! بالکل تمھارا مافک۔ تم ہمارا فرسٹ فرینڈ ہے جو ہمارا جیسا دل رکھتا ہے!"

اُسی دن سے میرے دل میں ایک آرٹسٹ سر اُٹھانے لگا تھا۔ پھر مجھے لوسی نے آرٹ کے متعلق بہت کچھ بتایا تھا۔ ایک دن وہ لندن چلی گئی۔ مجھے اپنا بہت کچھ دے کر ۔۔۔ اپنا آرٹ، اپنا فن اور فن سے وابستہ ہر شئے! صرف میری تصویر اپنے ساتھ لے گئی جو اُس نے شاید سبھی [illegible] حسین رنگوں کے امتزاج سے بنائی تھی۔

سب سے پہلے جو تصویر میں نے بنائی، وہ ممے کی تھی، پھر ممنے، ناز، شمع، ریتا اور لوسی کی ۔۔۔ میں آرٹسٹ بن گیا۔ برش کا سہارا لے کر زندگی کے مختلف رنگ کاغذ پر بکھیرتا رہا۔ تصویریں بنتی رہیں لیکن پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئی تھیں اور سب یکجا ہو کر دل سے دیمک کی طرح چمٹنے لگی تھیں۔ کبھی ممے کی بے رُخی یاد آتی، کبھی ممنے کی وفا! کبھی شمع پگھلتی، کبھی ناز کراہنے لگتی کبھی ریتا کے کٹے ہوئے ہاتھوں سے خون ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا اور کبھی . . ."

وہ کچھ کہتے کہتے اچانک اِس طرح خاموش ہو گیا ہے جیسے قوتِ گویائی کسی نے چھین لی ہو یا کوئی انجانی طاقت اُس کا گلا گھونٹنے لگی ہو۔ وہ عجیب آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا ہے۔ شاید میری آنکھوں سے چھلکے ہوئے آنسوؤں نے اُسے متاثر کر دیا ہے۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو کیوں آئے؟ مجھ سے وابستہ کوئی غم بھی تو نہیں ہے۔ یہ شاید اُس کی کہانی کا اثر ہے، جس نے مجھے اِتنا متاثر کر دیا ہے۔ نجانے کتنے مرد، عورتیں اور حسین لڑکیاں اُس کے آرٹ کی شیدائی ہیں۔ میں بھی اُنھیں میں سے ایک ہوں لیکن میں کچھ ادھر سے آگے بڑھ گیا ہوں کہ اُس کے آرٹ پر اپنا خیال ظاہر کرنے کی بجائے اُس کے آرٹ اور اُس کی زندگی کی گہرائی کو ٹٹولنے لگا ہوں اور اُس نے ہر رُخ سے پردہ ہٹا دیا ہے۔ سامنے ٹیبل پر پھیلا ہوا اُس کا البم دیکھنے کی مجھے بہت آرزو تھی، جس کی میں نے بہت تعریف سنی تھی اور میرا دل مچل گیا تھا۔ آج میری یہ آرزو پوری ہو گئی ہے کہ اُس نے میری درخواست قبول کر لی اور اپنا البم بھی لانے کا وعدہ کیا۔ [illegible] ہر تصویر کی کہانی میں اُس کے خالق کی زبانی سُن چکا ہوں۔ اب صرف ایک ورق باقی ہے جسے میں اپنے ہاتھ سے اُلٹ دینا چاہتا ہوں۔

پے بہ پے سگریٹ پینے کے بعد میں نے نیا سگریٹ جلالیا ہے، جس کا دھواں کمرے میں پھیلی ہوئی سُرخ روشنی میں اُڑتا ہوا ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی آگ بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں نے اُس ورق کو اُلٹ دیا ہے لیکن اِس طرح چونک گیا ہوں جیسے کسی نے پیٹھ میں نشتر پیوست کر دیا ہو۔ یہ تصویر ۔۔۔ یہ البم ۔۔۔ آرٹ ۔۔۔ آرٹسٹ! میرے ذہن میں بہت سے سوالات بیک وقت جاگ گئے ہیں۔ بمشکل تمام میں نے دل کو

- میرے بندوں سے کہہ دو! وہی بات کہیں جو بہتر ہو۔ جس میں نیکی اور بھلائی ہو۔ (قرآنِ پاک)
- حُسنِ خلق، انسان کا رفیق ہے اور ادب اُس کی میراث۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- جو چھوٹے ہاتھ سے دیتا ہے وہ لمبے ہاتھ سے پاتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- ضرورت پوری نہ ہونا اِس سے کہیں اچھا ہے کہ اُس کی خاطر کسی نااہل سے رجوع کیا جائے۔ (حضرت حسن رضی اللہ عنہٗ)
- اللہ اہلِ انصاف کو پسند کرتا ہے (قرآنِ پاک)

سنبھالا ہے۔

"تم کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہو؟" شاید اُس نے میرے چہرے کے تاثرات کو پرکھ لیا ہے۔

"میں . . . میں پریشان . . . نہیں! نہیں!! مگر ہاں یہ تصویر دیکھ کر مجھے تمہاری فن کی بلندی پر حیرت ہو رہی ہے۔ تم کچھ کہتے کہتے رُک گئے تھے ۔۔۔"

"میں اِسی تصویر کے بارے میں کہنا چاہتا تھا" وہ پھر کہیں کھو سا گیا اور اُسی کھوئے ہوئے انداز سے کہنے لگا: "اور کبھی نشاط سامنے آجاتی۔ اُس کی ریشمی زلفیں شانوں کو چھوتی ہوئی، جن میں میں اُلجھ گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں جن کی گہرائی میں ڈوب گیا تھا۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ جن کی رس بھری خوشبو کو میں محسوس کر چکا تھا۔ گداز کلائیاں جو ایک بار محبت سے میرے کاندھے پر مچل گئی تھیں۔ خوبصورت ہاتھ جن کے

ان ایک بار میرے اور مجروح ہو کے کھل اٹھا تھا —— نشاط میرے آرٹ کو چاہتے چاہتے ... خوشگوار شامیں اور جگمگاتی راتیں میں نے اُس ... اُن کی پیاس اُس نے اپنی محبت کی شیرینی سے ... پھر سب کچھ ... آشیاں بنانے کی سعی کرنے لگا تھا۔

لیکن پھر اُس آشیانہ پر بجلی گری اور میں اُس کی راکھ سمیٹتے سمیٹتے دیوانہ وار بھٹک گیا —— نشاط نجانے کون سی دُنیا کی کھوہ میں اُسے تلاش نہ کر سکا، میں اُسے پا نہ سکا۔ ایک سال گزر چکا ہے۔ اُس کے تصور نے یہ تصویر بنانے پر مجبور کر دیا تھا!"

وہ اُس تصویر سے وابستہ کہانی سُنتے سُنتے خاموش ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں آتے ہوئے آنسو اپنے ہاتھوں میں جذب کر لئے ہیں۔

"اب میں اجازت چاہوں گا۔ یہی میری زندگی کا المیہ ہے جس میں رنگ بھرتا رہا ہوں اور جس کے لئے تم نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ یقین ہے اب تشنگی کا ہلکا سا احساس بھی نہ رہا ہوگا۔"

"تشنگی اور بڑھ گئی ہے!"

اُس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ البم بہت پسند ہے۔ اس کی قیمت کیا لے سکتے ہو؟"

"اس کی قیمت؟" وہ تلخی سے مسکرایا۔ "شاید دنیا میں کوئی ایسی ہستی نہیں جو اس کی قیمت دے سکے!"

"میں معذرت چاہتا ہوں..." میں نے اُس کے جذبے کو پرکھ لیا ہے۔

وہ جانے لگا۔ میں نے اُسے پھر روک لیا ہے —— "میں تمھیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں..."

اُس کی آنکھوں میں تجسس کی پرچھائیاں پھیل گئی ہیں۔ میں نے ٹیبل بیل کا سوئچ دبایا —— چند لمحے بعد وہی پیکرِ جمیل سامنے ہے، جس کی تصویر میں دیکھ چکا ہوں۔ نشاط —— تصویر —— محبوبہ —— آرٹسٹ اور میری خوبصورت بیوی! —— سب یکجا ہو گیا ہے۔ آگ اور بھڑک گئی ہے، شعلے اور بلند ہو گئے ہیں —— ان شعلوں سے بچ کر آرٹسٹ جا چکا ہے۔

کتنے ہی دن گزر چکے ہیں۔ نجانے وہ کہاں گیا ہوگا لیکن میں ایک ہی جگہ اب تک جل رہا ہوں۔ وہ البم اب بھی میرے سامنے رکھا ہے جس میں آرٹسٹ کا فن، اُس کا آرٹ، اُس کی زندگی کا المیہ، سب کچھ دفن ہے اور جس کی قیمت یقیناً کوئی نہیں دے سکتا!!

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

اوپندر ناتھ اشک سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵۔ ایف۔ موتی باغ نمبر ۲۔ نئی دہلی

۱۰ مارچ ۶۶ء

قبلہ خوشتر صاحب!

"بیسویں صدی" کے آئندہ شمارے کے لئے اوپندر ناتھ اشک سے انٹرویو بھیج رہا ہوں۔ اشک صاحب کو آج ادبی دنیا میں جو مقبولیت اور کامیابی حاصل ہے۔ یہ ساز گار حالات کی دین نہیں، اُن کی غیر معمولی محنت کا ثمر ہے۔ اُس کے پیشِ نظر اگر وہ یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

شاد:۔ اشک صاحب! سب سے پہلے تو یہ فرمایئے کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے اور تعلیم کہاں کہاں سے کہاں تک حاصل کی؟

اشک:۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء میرا جنم دن ہے۔ جالندھر میں پیدا ہوا۔ دسویں جماعت تک سائیں داس اینگلو سنسکرت ہائی اسکول جالندھر میں پڑھا۔ بی۔ اے، ڈی۔ اے۔ وی کالج جالندھر اور ایل۔ ایل۔ بی لا کالج لاہور سے کیا۔

شاد:۔ اور آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟

اشک:۔ پانچویں جماعت کا طالب علم تھا جب سے لکھ رہا ہوں۔ ابتدا بھجن لکھنے سے ہوئی، جنھیں میں آریہ سماج کے جلسوں میں پڑھا کرتا تھا۔ اُس کے بعد کچھ مُدت تک پنجابی شعر بھی لکھے۔ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب ہولی کے موقع پر اپنی پنجابی نظم پر میں نے انعام بھی حاصل کیا۔ نویں یا دسویں جماعت میں تھا جب اُردو شعر کہنے لگا۔

شاد:۔ غالباً آپ کا یہ تخلص اُسی زمانے کی یادگار ہے؟

اشک:۔ میں نے تو اپنے لئے اپنا تخلص شناور تجویز کیا تھا لیکن میرے محلّے میں میرا ایک دوست کشمیری لال اشک رہتا تھا جو عنفوانِ شباب ہی میں تپِ دق میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ اُس کے بعد اُس کی یادگار کے طور پر میں نے اُس کا تخلص اپنا لیا۔

شاد:۔ اپنی اُردو شاعری پر آپ نے کسی سے اصلاح بھی لی؟

اشک:۔ اپنے دوست امر چند قیس جالندھری کے توسط سے میں سیّد محمد علی آذر جالندھری کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گیا۔

شاد:۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ نے سب سے پہلا اُردو شعر کیا کہا تھا؟

اشک:۔ جالندھر میں ایک ایڈوکیٹ صاحب کی کوٹھی پر مشاعرۂ گرانی منعقد ہوا کرتا تھا۔ اُس کے پہلے مشاعرے کے لئے ایک غزل کہی تھی۔ مصرعہ طرح تھا کہ

حال بے زار کسی شوخ کے سودائی کا

میں نے اِس کی گرہ یوں لگائی تھی

جیبُ دامن کے کئے دستِ جنوں نے ٹکڑے
حال بے زار کسی شوخ کے سودائی کا

اُس غزل کا مطلع تھا

بس اِس بات پہ دعویٰ تھا مسیحائی کا
دم ترے سامنے نکلا ترے شیدائی کا

اور مقطع یہ تھا

اب تو برپا ہے خیالات کا محشر اے اشک
عالمِ حشر ہے عالم تری تنہائی کا

شاد ۔ اپنی ادبی زندگی کا آغاز تو بہت سے افسانہ نگاروں کی طرح آپ نے بھی شاعری سے کیا لیکن اب تو دوسرے کئی افسانہ نگاروں کی طرح آپ کبھی اُردو شعر نہ کہتے ہوں گے؟

اشک ۔ نہیں کبھی کبھی اب بھی کہہ لیتا ہوں۔

شاد ۔ موجودہ دور میں کہا ہوا اپنا کوئی شعر سنایئے۔

اشک ۔ میرے پیروں کے نشاں اب بھی پریشاں ہیں یہاں
خاک چھانی ہے انھیں راہوں کی برسوں میں نے

شاد ۔ آپ نے اپنا سب سے پہلا افسانہ کب لکھا اور وہ کہاں شائع ہوا؟

اشک ۔ افسانہ تو نہیں وہ ایک خاکہ تھا "دھواں دھواں سے جذبات" جو میں نے ۱۹۲۹ء میں لکھا اور روزنامہ "پرتاپ" لاہور کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا۔

شاد ۔ آپ افسانے کیوں لکھنے لگے؟

اشک ۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں ہر روز ایک غزل کہتا تھا اور اُستاد صاحب ہفتوں میں ایک غزل دیکھ کر دیتے جبکہ میرے ایک دوست کی غزل جو اکثر میری ہی لکھی ہوتی، اُسی دن دیکھ دیتے بلکہ خود بھی اُس میں کچھ اشعار بڑھا دیتے۔ میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری غزلوں میں کسی شعر کا اضافہ کریں لیکن میری یہ خواہش ضرور تھی کہ جس دن میں انھیں غزل دوں اُس کے دوسرے یا تیسرے دن دیکھ کر دے دیں۔ وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔ اُن دنوں میں نے ایک افسانہ لکھا۔ ہم دونوں نے مل کر اُسے نظم کیا۔ میرا دوست اپنے نام سے اُسے آذر صاحب کے پاس لے گیا۔ انھوں نے نہ صرف دو دن میں اُسے دیکھ دیا بلکہ بہت سے اشعار اُس میں بڑھا دیے۔ ہم نے وہ افسانہ "گوردو گھنتال" لاہور کو بھیجا۔ جس دن میرا وہ افسانہ میرے دوست کے نام سے چھپ گیا، اُسی دن سے نظم کہنا بند کر دیا اور نثر لکھنے لگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے والد شرابی تھے۔ عموماً اپنی ساری تنخواہ جوئے میں ہار جایا کرتے تھے۔ ہم بھائیوں کو بات بے بات بُری طرح زدو کوب کیا کرتے تھے۔ اس کے برعکس میری ماں بڑی خدا ترس تھیں۔ محلّے کے زیادہ تر لوگ اَن پڑھ تھے اور وہ علاقہ غلاظت اور بیماریوں کا مسکن تھا۔ ماحول کی اِسی تلخی نے مجھے جذباتی طور پر حسّاس بنا دیا اور اپنے ماحول کی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے مجھے بعد میں شاعری کی نسبت افسانے کا میڈیم بہتر معلوم ہوا۔

شاد ۔ ابتدا میں آپ کن کن افسانہ نگاروں سے خاص طور پر متاثر تھے؟

اشک ۔ ٹیگور، پریم چند اور سدرشن سے۔ عام طور پر اپنے افسانوں میں انھیں کی نقل کیا کرتا تھا۔ ذرا آگے بڑھا تو ایک غیر معروف جرنلسٹ کے توسط سے کچھ انگریزی کہانیاں پڑھنے کو ملیں۔ اُس کے بعد چیخوف اور ترگنیف کے اندازِ نگارش سے میرا ذہن متاثر ہوا اور پھر اُس کے بعد تو دُنیا کے بے شمار افسانہ نگار ہیں جن کے نقوش میرے ادبی مزاج نے قبول کئے۔ اس کے بعد میں نے جو لکھا مقبول ہوا۔

شاد ۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ ہے جس نے آپ کی افسانہ نگاری پر بہت گہرا اثر ڈالا ہو؟

اشک ۔ ۱۹۳۶ء میں میری پہلی بیوی کی موت! اُس کی وفات کے بعد جب زندگی کی کئی کڑی حقیقتیں میرے سامنے آئیں تو مجھے معلوم ہوا کہ اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔ اُس حادثے کے بعد زندگی کے متعلق میرا نقطۂ نظر یکسر بدل گیا اور ایک نئی نگاہ مجھے حاصل ہوئی۔

شاد ۔ اب آپ یہ فرمائیے کہ آپ افسانہ لکھتے کیوں کر ہیں؟

اشک ۔ زندگی کا کوئی مسئلہ جب بہت زیادہ پریشان کرتا ہے یا جب دماغ میں کوئی ایسا خیال آتا ہے جو افسانے کی زبان ہی میں کہا جا سکتا ہے تو افسانہ اپنے آپ لکھا جاتا ہے۔

شاد ۔ کیا ایک ہی نشست میں آپ ایک افسانہ لکھ لیتے ہیں؟

اشک ۔ بہت کم افسانے ایک ہی نشست میں مکمل کر سکا ہوں۔ عام طور پر میرا افسانہ تین یا چار نشستوں میں مکمل ہوتا ہے۔ کم سے کم ایک ہفتہ زیادہ سے زیادہ ایک برس جس میں کئی بار افسانہ لکھتا ہوں۔

شاد ۔ مختصر افسانے کی آپ کے نزدیک مختصر ترین تعریف کیا ہے؟

اشک ۔ کسی ایک خیال، واقعہ یا زندگی کے کسی خاص ٹکڑے کی اکہری تصویر لیکن یہ تو مختصر افسانے کی پُرانی تعریف ہے۔ اب تو مختصر افسانہ کسی تعریف کی ذیل میں نہیں آتا۔ اب پُرانی بناوٹ اور تکنیک نہیں رہی۔ اب تو خاکہ، سفرنامہ، رپورتاژ، ڈائری اور خط اِن سب کے ملے جُلے تاثر سب افسانے کی تکنیک کے زیرِ بحث آجاتے ہیں۔

شاد ۔ پریم چند کے بعد آپ اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کسے سمجھتے ہیں؟

اشک ۔ یہ تو لڑائی کرانے والا سوال ہے شاد صاحب!

شاد ۔ لیکن اشک صاحب! آپ تو لڑائی سے گھبراتے نہیں۔ آپ خلوصِ دل سے جو کچھ محسوس کرتے ہیں اُسے بیان کرنے میں تو آپ کو ہچکچاہٹ نہ ہونی چاہئے۔

اشک ۔ اِس مسئلے پر جب غور کرتا ہوں تو میرے سامنے تین نام آتے ہیں۔ اُن کی ترتیب یوں بھی ہو سکتی ہے۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو۔ یوں بھی، بیدی، کرشن، منٹو اور یوں بھی، منٹو، کرشن، بیدی۔ دس سال بعد اِن میں کون سب سے بڑا

مانا جائے گا، یہ تو ابھی نہیں کہا جا سکتا۔

شاد۔ کرشن، بیدی اور منٹو سے آپ کی پہلی ملاقات کب اور کس طرح ہوئی؟

اشک۔ کرشن جب کالج میں پڑھتے تھے تو لاہور میں رشی نگر کے ہندو ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۴۴ میں رہتے تھے۔ اُنھی زمانے میں اُنھوں نے کمرہ نمبر ۴۴ کے عنوان سے "ہمایوں" لاہور میں ایک ڈرامہ لکھا تھا۔ یہ ڈرامہ مجھے اِتنا اچھا معلوم ہوا کہ میں اُنھیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُن کے کمرے میں جا پہنچا اور اُس ڈرامے کی اُنھیں داد دی۔ یہی پہلی ملاقات ہماری دوستی کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔ جب میں نے بیدی کی کہانی "بھولا" پڑھی تو وہ مجھے بہت پسند آئی۔ اُس کے چند دن بعد ہی مجھے کرشن چندر نے بتایا کہ وائی۔ ایم۔ سی ہال میں بیدی ایک کہانی پڑھ رہا ہے۔ دوسرے ادیبوں کے ساتھ میں بھی کہانی سُننے وہاں چلا گیا۔ بیدی نے وہاں اپنی کہانی "ہم سفر" پڑھی۔ سُننے والوں میں تقریباً سب نے کہانی کی تعریف کی البتہ میں نے کسی بات پر اختلاف کرتے ہوئے اعتراض کر دیا۔ اُس پر وہاں بڑا ہنگامہ ہوا لیکن دوسرے ہی دن بیدی مجھ سے ملے تو کہنے لگے کہ میں آپ کی بات سے متفق ہوں اور یوں ہماری دوستی کا آغاز ہو گیا اور منٹو سے جون ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پہلی ملاقات ہوئی جہاں وہ مجھ سے پہلے کام کر رہے تھے۔

شاد۔ اُردو کے جدید ترین افسانہ نگاروں میں کیا آپ کے نزدیک کوئی قابلِ ذکر افسانہ نگار ہے؟

اشک۔ مجھے اُردو کے نئے افسانہ نگاروں کا علم نہیں ہے۔ اِس لئے اِس سلسلے میں کُلّی طور پر کوئی رائے نہیں دے سکتا، لیکن بلونت سنگھ کو میں بہت بڑا افسانہ نگار سمجھتا ہوں۔ شاید ہی کوئی ایسا افسانہ نگار ہو جس نے کم عرصے میں اِتنے شاندار افسانے لکھے ہوں۔

شاد۔ آپ کے خیال میں کیا تقسیمِ وطن کے بعد اُردو افسانے کی تکنیک میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے؟

اشک۔ ہونی چاہئے تھی لیکن ہوئی نہیں۔ کرشن اور بیدی اپنے اپنے اسٹائل میں لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ پہلے سے بہتر لکھ رہے ہیں۔ میرے افسانوں میں البتہ تین ادوار ضرور آئے ہیں لیکن اُردو میں برابر نہ آنے کی وجہ سے اُن کا کوئی اثر نہیں۔ کرشن نے کچھ تجربے کئے ہیں لیکن وہ اِتنی جلد طرز بدل لیتے ہیں کہ کسی تحریر کا اثر نہیں رہتا۔ پھر کرشن کا کمال تکنیک کا کمال نہیں، طرزِ تحریر کا کمال ہے۔

شاد۔ آپ ادب میں افادیت کے کس حد تک قائل ہیں؟

اشک۔ میں ادب میں افادیت کا پُوری طرح قائل ہوں کیونکہ اُس کے بغیر مجھے ادب اور افیون میں کوئی فرقِ نظر نہیں آتا لیکن ادب کو میں تقریر یا طالب علمانہ جوابِ مضمون تسلیم کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ افادیت ضرور ہونی چاہئے لیکن آرٹ کی قدروں کا خیال رکھتے ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی وقتی تحریک کی تائید یا مذمت افسانوں کے ذریعے سے نہیں کی جا سکتی۔ ہنگامی دور میں جو کچھ ہوتا ہے، جب وہ لاشعور میں رچ بس جاتا ہے اور اُس کے بعد وہ افسانے کے سانچے میں ڈھلتا ہے تو اپنے آپ اُس میں ادب کا عنصر چھپا رہتا ہے۔ میرے خیال میں افادیت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک سماجی اور دوسری انفرادی۔ سماج اور فرد کو جاننے پہچاننے اور اُسے بہتر بنانے کے پراسس میں جو بھی ادب تخلیق ہوتا ہے وہ افادی ہی ہوتا ہے۔ خواہ بظاہر ایسا معلوم نہ ہو۔

شاد۔ ترقی پسند ادب کی تحریک سے آپ کس حد تک متاثر ہیں؟

اشک۔ کافی حد تک متاثر رہا ہوں اور اب بھی ہوں۔ زندگی اور آدمی کی حقیقت جاننے اور سماج کے چہرے سے جھوٹے آدرش کا پردہ اُٹھانے میں اِس تحریک نے جو کارِ نمایاں کیا ہے میں اُس کی اہمیت تسلیم کرتا ہوں لیکن اِس تحریک کے زیرِ اثر کافی گھٹیا ادب بھی شائع ہوا ہے لیکن ایسا ہر تحریک کے ماتحت ہوتا ہے۔ اِس لئے کہ دو چار اچھا لکھنے والوں کے ساتھ بہت سے عام ادیب بھی ہوتے ہیں۔

شاد۔ آپ کا سیاسی نقطۂ نظر کیا ہے؟

اشک۔ میں اُس جمہوریت کا حامی ہوں جس میں خیالات کی آزادی تو برقرار رہے لیکن جمہوریت کی دوسری بُرائیاں نہ ہوں۔

شاد۔ مثلاً؟"

اشک۔ مثلاً ہر محکمے اور ادارے میں خویش پروری، امیروں کا زیادہ امیر اور غریبوں کا زیادہ غریب بننا اور رشوت ستانی۔ دوسرے لفظوں میں اِسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں اُس سوشلزم کا حامی ہوں جس میں سوشلزم تو ہو لیکن ساتھ ہی خیالات کی بھی آزادی ہو۔ بات یہ ہے کہ میں آزاد ادیب کو حکومت کی روح سمجھتا ہوں۔ ادیب کا مُنہ بند کرنے سے حکومتِ وقت حقیقت میں اپنی روح کی آواز کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ جبکہ کوئی جماعت حکومت کے خلاف جد وجہد کر رہی ہوتی ہے تو ادیب اُس جماعت کے ہراول دستے میں ہوتا ہے لیکن جب وہی جماعت برسرِ اقتدار آ کر پُرانی حکومت کی طرح اپنے وعدوں کو بھول جاتی ہے تو ادیب ہی اُسے اُس کے وعدوں کی یاد دہانی کرا سکتا ہے۔ آزاد ادیب حکومت کے اُس ضمیر کی آواز ہے جسے وہ بار ہا بھول جاتی ہے۔

شاد۔ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

اشک۔ بہت اچھا نظر نہیں آ رہا ہے تا وقتیکہ اُردو کو چاہنے والے لوگ اور اُردو نواز انجمنیں

اِس زبان کی اشاعت اور تحفظ کے لئے عملی کوشش نہ کریں۔ کوئی ادب اُس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک زندہ ادیبوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ ایسی انجمنیں جنھیں اُردو کے نام سے حکومت کی طرف سے ہر سال لاکھوں روپے ملتے ہیں وہ بھی اپنے اشاعتی پروگرام میں اُردو کے زندہ ادیبوں کو کوئی خاص جگہ نہیں دیتیں اور اُردو کے مستقبل کو تاریک سے تاریک تر کر رہی ہیں۔ میں یہ نہیں مانتا کہ ملک تقسیم ہوتے ہی اُردو پڑھنے والے ختم ہو گئے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اُردو کے تحفظ کی پوری کوشش ہی نہیں کی گئی۔ کیا اتنے سارے لوگ ایک بھی اچھا رسالہ جاری نہیں کر سکتے یا ایک بھی معقول اشاعتی ادارہ قائم نہیں کر سکتے؟ جو ہو گیا ہے اُس کا الزام حکومت کا ہے لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ برٹش حکومت نے زبردستی اُردو کو لادا لیکن ہندی جاننے والوں نے کچھ اس شدت سے کام کیا کہ پنجابی بولنے والے بھی ہندی کو اپنی مادری زبان کہنے لگے۔ دس بارہ مسودے اُردو کے میرے پاس ہیں لیکن انھیں چھاپنے والا کوئی نہیں "گرتی دیواریں" میں نے اُردو میں لکھا تھا۔ ہندی میں اب تک وہ ساٹھ ہزار سے زیادہ تعداد میں شائع ہو چکا ہے اور اُس کے انگریزی ترجمے کو شائع کرنے کی بات بھی یونسکو کی طرف سے چل رہی ہے لیکن کتنا بڑا المیہ ہے کہ اُردو میں یہ کتاب ابھی تک نہیں آ سکی!

شاد:۔ اُردو کے سلسلے میں ہماری حکومت کا جو رویّہ ہے کیا آپ اُسے مذموم نہیں سمجھتے؟

اشک:۔ اپنی حکومت جمہوری ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ تو وہی کچھ کرے گی جو لوگ چاہیں گے لیکن ہندی کی مخالفت کرنے سے یا اسے فرقہ وارانہ سوال بنا کر اُردو کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

شاد:۔ اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اُردو کی بقا کی صرف یہی صورت ہے کہ ہندی رسم الخط کو اپنا لیا جائے، اِس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

اشک:۔ ایسا کرنے سے ہندی اُردو ہو جائے گی یا شاید ایک ایسی زبان معرضِ وجود میں آ جائے گی جو نہ ہندی ہو گی اور نہ اُردو۔

شاد:۔ تو کیا ایسی زبان کے پیدا ہونے میں آپ کو اعتراض ہے؟

اشک:۔ نہیں ذاتی طور پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرے افسانوں اور ڈراموں کی زبان پر اُردو کا اثر زیادہ ہے جبکہ نظموں اور مضامین کی زبان پر ہندی کا۔

شاد:۔ کیا اُردو ادب اِس وقت جمود کا شکار ہے؟

اشک:۔ بے شک۔

شاد:۔ آپ کے خیال میں اِس کی وجہ کیا ہے؟

اشک:۔ اُردو ادب میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ منظرِ عام پر نہیں آتا۔ اِس لئے اُردو ادب میں جمود ہے۔ اُردو میں معاوضہ ملتا نہیں یا بہت کم ملتا ہے۔ اِس لئے مشہور اُردو ادیب اُردو میں لکھ کر پہلے ہندی میں پیش کرتے ہیں۔

شاد:۔ اچھا یہ بتایئے کہ کیا شراب اور عورت ادیب کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں؟

اشک:۔ شراب کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، عورت البتہ ضرور اہمیت رکھتی ہے۔

شاد:۔ "کیا اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے؟

اشک:۔ ہونا چاہیے۔

شاد:۔ ہوتا ہے یا نہیں؟ صرف اِس کا جواب دیجئے اشک صاحب!

اشک:۔ میرے خیال میں ہوتا ہے۔ جتنا بڑا ادیب ہوگا وہ خواہ بظاہر نظر نہ آئے لیکن حقیقت میں اُتنا ہی بڑا انسان بھی ہوگا۔

شاد:۔ کیا ادب ادیب کی شخصیت کا یا شخصیت سے اُس کے فرار کا ترجمان ہوتا ہے؟

اشک:۔ دونوں طرح ہوتا ہے۔

شاد:۔ تخلیقِ ادب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُس سے ادیب کو ایک گونہ ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے، آپ اِس پہلو کو کس حد تک اہمیت دیتے ہیں؟

اشک:۔ سو فیصدی اہمیت دیتا ہوں۔ اِس سے زیادہ سکون میں دولت اور شہرت کسی چیز میں نہیں پاتا۔"

شاد:۔ آپ کے نزدیک ایک سچے ادیب کا منصب کیا ہے؟

اشک:۔ میرے خیال میں اگر کوئی ادیب اپنے کو یا سماج کو جاننے اور اِس سلسلے میں دوسروں کی مدد کرنے میں ذرا بھی کامیاب ہوتا ہے یعنی جتنا دوسرے جانتے ہیں اگر اُس سے ذرا بھی زیادہ بتا دیتا ہے تو اُس کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

شاد:۔ کیا ادیب کے لئے انا پسندی آپ ناگزیر سمجھتے ہیں؟

اشک:۔ انا کے بغیر تو کوئی ادیب ادیب نہیں بن سکتا۔ انا ہی تو اُس کی شخصیت کے کونے گھسنے نہیں دیتی اور اُس کے احساس کو زندہ و شاداب رکھتی ہے لیکن ایک کامیاب ادیب ہمیشہ انا کے اوپر سوار رہتا ہے اور اُس کے برعکس ایک ناکام ادیب کے اوپر انا خود سوار رہتی ہے۔

شاد:۔ آخر میں صرف یہ اور فرما دیجئے کہ اپنے کون کون سے افسانے اور ڈرامے خاص طور پر پسند ہیں؟

اشک:۔ افسانوں میں "ڈاچی" "کاکڑاں کا تیلی" "اُبال" "کونپل" "چیتنا" "کیپٹن رشید" "تیس لیٹر" "پلنگ" اور "بے بسی"۔ بڑے ڈراموں میں "صبح و شام" "قیدِ حیات" "چھٹا بیٹا" اور "بھنور" اور ایک ایکٹ کے چھوٹے ڈراموں میں "لکشمی کا سواگت" "حقوق کا محافظ" "پاپی" "میمونہ" "معجزے" "کسی کی بات" "تولیے" "خادر" "پردہ اُٹھاؤ، گراؤ" اور "چونک"۔

نیلوفر

ایم کوٹھیاوی راہی

قاضی پور خورد۔ گورکھپور (یو۔پی)

۴ مارچ ۶۶ء   برادرِ محترم خوشتر صاحب! آداب

... عجیب عجیب سی اُلجھنوں کا شکار ہوں۔ بیمار بھی ہوں۔ کوئی جاندار تخلیق نہیں ہو پا رہی ہے۔ پچھلے دنوں جو کچھ لکھا سب کچھ یونہی پڑا ہے۔ صاف کرنے کو بھی جی نہیں چاہا۔ "بیسویں صدی" پڑھنے والے پوچھتے ہیں "کیوں خاموش ہو؟" اُن سے کیا کہوں، کیوں چُپ ہوں! چُپ ہوں کہ چُپ رہنے پر مجبور ہوں۔ آپ کے التفات کا سلسلہ عرصہ سے بند ہے۔ آپ ناراض ہیں۔ خط کا جواب نہیں ملا۔ آپ کیوں ناراض ہیں؟ یہ بھی نہیں معلوم۔ آپ کیوں خفا ہیں؟ آپ نے ہمیشہ فن کو دیکھا فنکار کو نہیں۔ پھر کیا بات ہے؟ سچ کہتا ہوں خوشتر بھائی! آپ کی رفاقت، آپ کا خلوص میرے لئے بہت کچھ ہے۔ بلکہ سب کچھ! خدا کے لئے ہاتھ مت کھینچئے ——— "بیسویں صدی" فن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اِس کا حُسن، اِس کا نکھار نُورِ شباب پر ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ حاسدوں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس کا ہر صفحہ آپ کے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے ——— تازہ کہانی "نیلوفر" ارسالِ خدمت ہے۔ کچھ طویل ہوگئی ہے لیکن اِس کی طوالت 'بوریت' کا باعث نہ ہوگی۔ اِسے مختصر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دیکھنے کے بعد آپ بھی یہی کہیں گے۔ براہِ کرم اِسے شرفِ قبولیت بخشیں، تاکہ آئندہ کے لئے تحریک ہوسکے۔ اِس بار آپ کی کرم فرمائی کا شدّت سے انتظار رہے گا...

آپ کا بھائی ——— ایم کوٹھیاوی راہی

سردی تیز ہوگئی ہے۔ نیلوفر کی جلتی رگوں میں خون منجمد ہو چلا ہے۔

"میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار"

ایاز کی تصویر بول رہی ہے۔

اور نیلوفر نے گلدان اُٹھا کر اُس تصویر پر دے مارا ہے لیکن وہ سیاہ و سفید تصویر ۔۔ کی نیلی دیوار پر اُسی طرح آویزاں ہے اور گلدان ٹوٹ کر چُور چُور ہوگیا ہے۔ پھول بکھر گئے ہیں اور نیلوفر نے کسمسا کر کروٹ بدل لی ہے اور لحاف سینے تک کھینچ ۔۔۔ نیند نہیں آرہی ہے۔

"اُن دنوں مجھ پہ قیامت کا جنون طاری تھا۔"

ایاز کی تصویر بولے جارہی ہے اور کھڑکی کے شیشوں کے اُس طرف کُہرے کی دیوار ۔۔ چاندنی اُونگھ رہی ہے۔ جیسے پردۂ سیمیں پر کوئی خلائی تصویر... اور اُس خلائی تصویر پر نیلوفر کی نظریں جم گئی ہیں۔ آنسو بھری۔ ویران ویران سی... اور وہ خلائی تصویر معاً کُہرے میں جذب ہوگئی ہے اور ایک دوسری تصویر اُبھر آئی ہے... پائیں باغ کا ایک پُرسکوت گوشہ ہے۔

"تم آگئے ایاز!"

"ہاں!"

"تم بہت پیارے ہو ایاز!"

"ہوں!"

"دیکھو دیکھو آج یہ بوریت نہیں چلے گی۔ کوئی مزے کی بات کرو، ہنسو مسکراؤ قہقہے لگاؤ۔ آج حویلی میں کوئی نہیں ہے۔"

"سدا کے لئے سُونی ہوگئی؟"

"یہ کب کہتی ہوں۔ آج کی بات ہے۔ بس آج کی۔ سب ہی لوگ پکنک پر گئے ہیں۔"

"اور تم کیوں نہیں گئیں؟"

"تم جو آنے والے تھے۔"

"مزا آیا تو کیا کرتیں؟"

"روتی یا تمہارا کوئی نغمہ گاتی۔"

"تو سمجھو میں نہیں آیا۔ روؤ اور گاؤ میرا کوئی نغمہ۔"

"رو تو نہیں سکتی، کہو تو گاؤں؟"

"گاؤ!"

اور پائیں باغ کے اس پرسکوت گوشے میں نغمہ گونج اٹھا ہے۔ سکوت ٹوٹ گیا ہے۔ گلاب کے ایک شبنم سے بھیگے پودے پر نظریں جمائے ایاز کھڑا ہے۔ چپ — اداس...

اور پھر یہ تصویر بھی کہرے کی دیوار میں سما گئی ہے۔ اور اس کی جگہ ایک — تیسری تصویر ابھر آئی ہے۔ دریا کے ساحل کا سناٹا لرزاں ہے۔ آسمان کی کھلی شفق بھی لرزاں، دریا کا ساکت پانی بھی لرزاں، سارا ماحول لرزاں لرزاں۔

"کوئی نظم سناؤ۔"

"چپ رہو۔"

"میں بہت اداس ہوں۔"

"تمہاری یہی ادا اچھی لگتی ہے!"

"کیسی ادا؟"

"اداسی کی!"

"اچھی بات ہے تو میں ساری زندگی اداس رہوں گی تمہارے لئے!"

"مگر تمہاری دنیا کے اور لوگ نہیں۔"

"میری دنیا تو صرف تم ہو۔"

"یہ سب خواب کی باتیں ہیں نیلو!"

"نیلو نہیں نیلوفر!"

"فر اچھا نہیں معلوم ہوتا نیلو! — نیلو پیارا نام ہے۔"

"تمہارے منہ سے آج یہ بو کیسی آ رہی ہے؟"

"شراب کی!"

"تو کیا... تو کیا... تم بھی پینے لگے؟"

"ہوں!"

"کب سے؟"

"جب سے دنیا بدلی۔"

"کس کی دنیا؟"

"تمہاری۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھ سے پیار کرتی ہو نا؟"

"ہاں!"

"میرے لئے جان دے سکتی ہو نا؟"

"ہاں!"

"میرے لئے... میرے لئے سب کچھ کر سکتی ہو نا؟"

"ہاں!"

"اور مجھ سے شادی؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"چاہنے والے سے شادی، محبت کی موت ہے۔ تم موت کو گوارا نہیں کر سکتیں۔ تمہارے ہاتھ حنا کا رنگ پانے والے ہیں۔ تمہیں ایک دولت مند شخص ملنے والا ہے۔ جیون ساتھی کے روپ میں..."

"پر یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"کیا غلط ہے؟"

"نہیں... ہاں... نہیں..."

"مت گھبراؤ۔ مجھے کوئی غم نہیں، کوئی غم نہیں۔ تنہائی کے نشے نے سب کچھ بھلا دیا۔ آؤ، آؤ۔ اس شفق میں رنگ جائیں، ڈوب جائیں۔ اس تنہائی، اس سناٹے میں گم ہو جائیں۔ بہت خوبصورت ہو نیلو! ہاں بہت خوبصورت..."

اور اس تصویر کے جذب ہوتے ہی ایک چوتھی تصویر ابھر گئی ہے۔ ہلتی کانپتی تھرتھراتی تصویر — نئی عمارت، نئے ماحول، نئی دنیا کی ایک چاندنی رات کھلی چھت پہ اونگھ رہی ہے اور پائیں باغ میں لگے بیلے کی پاگل بیلیں اوپر تک چڑھ آئی ہیں جن میں بہت سے سفید سفید پھول مہک رہے ہیں اور ان کی خوشبو سے چھت پر اونگھتی چاندنی بسی ہوئی ہے اور مسہری پر ایک شہزادہ محوِ خواب ہے، نظر — نیلوفر کا جیون ساتھی اور وہیں سر جھکائے نیلوفر کھڑی حدِ نظر تک پھیلے ہوئے خوابیدہ شہر کو دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھ میں آنسو جھلملا رہے ہیں اور دل میں ایاز کی یاد اور ایاز کا غم اور ایاز کا نغمہ... اور یہ تصویر بھی اپنے پورے ماحول کے ساتھ لرزاں لرزاں...

معاً نظر کی آنکھ کھل گئی ہے۔

"کھڑی کیوں ہو نیلوفر؟"

"نیلوفر نہیں نیلو کہو، نیلو۔ سرتاج!"

"کیوں! آدھا نام لوں۔ کیا گھر کے لوگ تمھیں اسی طرح پکارتے ہیں؟"

"ہاں!"

"یاد آرہے ہیں؟"

"ہاں!"

"جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں ہاں"

"اچھی بات ہے۔ سو جاؤ۔ کل پہنچا دوں گا"

"تم بھی چلو گے؟"

"ہاں!"

"یہاں تمھارے کاروبار کا نقصان نہ ہوگا؟"

"ہونے دو"

"تم مجھے کتنا چاہتے ہو!"

"ہاں! لیکن میں تمھارے ساتھ اس لئے چل رہا ہوں کہ وہاں ایک آرٹسٹ ہے اُس سے ملنے کی تمنا ہے"

"کون آرٹسٹ؟"

"جانتی ہوگی تم بھی اُسے۔ ضرور جانتی ہوگی۔ بلکہ دیکھا بھی ہوگا۔ ایاز نام ہے"

"ایاز؟"

"ہاں! بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ کیسا ہے؟ دیکھا ہو تو ذرا بتاؤ نیلوفر!"

"نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔ میں نے نہیں... نہیں..."

"ضرور دیکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے یاد نہ ہو۔ خیر چلو میں خود مل کر تم سے بھی اُسے لاؤں گا"

"نہیں نہیں، میں کسی آرٹسٹ سے نہیں مل سکتی۔ بہت بُرے ہوتے ہیں۔ شراب پی، آوارہ پھرتے ہیں۔ اُن کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ تم بھی نہ ملو تمھیں بھی نہ ملنے دوں گی"

"بہت معصوم ہو نیلوفر!"

"نیلوفر نہیں، نیلوفر نہیں۔ میں نیلو ہوں۔ فر اچھا نہیں لگتا"

"پاگل بے وقوف!"

... اور پھر ایک پانچویں تصویر اُبھر گئی ہے۔ لرزاں لرزاں...

"بہت اچھا شہر ہے یہ نیلوفر!"

"نیلوفر نہیں نیلو... نیلو کہو نظر!"

"ہاں نیلو! بہت اچھا ہے تمھارا شہر!"

"لیکن مجھے تو تمھارا شہر اچھا لگتا ہے"

"وہ تو محض ایک تجارتی شہر ہے"

"اور یہ؟"

"علم و ادب کا مخزن ہے۔ تمھارے اس شہر میں بڑے بڑے آرٹسٹ پیدا ہوئے۔ شعر و ادب کا تمھیں بھی کچھ ذوق ہوتا تو تم بھی یہی کہتیں"

"ہاں میں بھی یہی کہتی۔ اب کار اِدھر موڑ دو"

"اِدھر کیا ہے؟"

"میرا کالج!"

"اُسے دیکھو گی؟"

"ہاں۔ یاد آرہا ہے"

"اچھی بات ہے، لو اُسی طرف چلو"

"نہیں نہیں۔ اُدھر چلو اُدھر"

"اُدھر کیا ہے؟"

"کچھ نہیں"

"پھر کیوں؟"

"یونہی"

"بہت جذباتی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کوئی حادثہ کرواؤ گی۔ خیر چلو اسی سڑک پر۔ کبھی کبھی ٹیڑھی میڑھی سڑکیں بھی پیاری لگتی ہیں۔ کاش تمھارا ایاز مل جاتے"

"میرا ایاز؟"

"مطلب یہ کہ تمھارے شہر کا ایاز۔ بہت بد ذوق ہو۔ سمجھتی کم ہو۔ کہاں ڈھونڈوں کم بخت کو!"

"اُسے پہچانتے ہو؟"

"میں تو نہیں لیکن تم ضرور پہچانتی ہوگی"

"نہیں۔ میں بھی نہیں پہچانتی"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مشہور فن کار ہے اور تم کوئی پردہ نشین نہیں ہو۔ کالج کے فنکشنوں میں ضرور دیکھا ہوگا"

"میں نے نہیں دیکھا"

معاً ایک رہگیر کار کے سامنے سے کچھ اس طرح سے گزرا ہے کہ دبنے سے صاف بچا ہے ـــــ ایاز! نیلوفر کانپ اُٹھی ہے۔ نظر نے ہنس کر رفتار کم کر دی ہے۔

"پاگل ہیں تمھارے شہر کے رہگیر بھی!"

"ہاں! پاگل ہیں"

"تم شاید ڈر گئی تھیں کہ دب نہ جائے!"

"ہاں! ڈر گئی تھی۔"

"اگر دب جاتا تو کیا ہوتا؟"

"موت کی سزا موت... مگر نہیں نہیں۔ میں گواہی دیتی کہ غلطی رنگیہ کی تھی۔ نشے میں تھا، خود ہی کار کے سامنے آگیا۔"

"اور میں اقبالِ جرم کر لیتا تو؟"

اور پھر ایک اور تصویر ابھر آتی ہے۔ اندھیرا... ایک ساکت کھنڈر موم بتی کی پھیکی زرد روشنی میں کانپ رہا ہے اور تیز سنسناتی ہوا کے جھونکے کوئی پھوٹی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر موم بتی کی پتلی لو سے ٹکرا رہے ہیں اور ایاز کہنیوں کے بل لیٹا دھواں اڑا رہا ہے اور نیلوفر اُس کے سامنے ایک ٹوٹی کرسی پر بیٹھی ہے۔

"سگریٹ بہت پینے لگے ہو!"

"ہوں!"

"اور شراب بھی کم نہیں ہوتی؟"

"نہیں۔"

"مرنا چاہتے ہو؟"

"ہوں!"

"اور بھی راستے ہیں موت کے!"

"اور کوئی راستہ پسند نہیں۔"

"کیوں خود اپنی زندگی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو ایاز!"

"دوسروں کی زندگی پر حق نہیں رہا۔"

"شادی کر لو۔"

"کس سے؟"

"جس سے جی چاہے، جس سے بھی!"

"کسی سے جی نہ چاہے تو؟"

"تمھیں کھانسی بھی آتی ہے؟"

"ہاں! کئی مہینے سے۔"

"اُف! تمھارا تو ہاتھ بھی آگ کی طرح جل رہا ہے!"

"ہاں! مگر دل کی طرح نہیں!"

"کوئی نیا نغمہ؟"

"کچھ نہیں لکھا۔"

"پھر یہ موم بتی جلائے کیوں بیٹھے ہو؟"

"اندھیرا راس نہیں آتا اب!"

"دیکھو میں تم سے ملنے کے لئے کتنا رسک لے کر آئی ہوں۔"

"کیوں یہ رسک لیا؟"

"بہت یاد آئے تھے۔"

"اچھا تو کہو!"

"کیا کہوں؟"

"اچھا تو مت کہو۔"

"سُنو گے؟"

"کیا سُناؤ گی؟"

"کچھ درد کی، کچھ ہجر کی، کچھ..."

"پھر آنسو؟ اب کیوں یہ آنسو بہاتی ہو؟ رہنے بھی دو۔ اب... اب تو تمھارا اُداس ہونا بھی اچھا نہیں لگتا۔"

"اسی لئے نا کہ میری شادی ہو گئی۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"قسم کھاتی ہوں ایاز! اب اور بھی چاہنے لگی ہوں تمھیں۔"

"دل کی فطرت یہی ہے نیلوفر!"

"نیلوفر کیوں، نیلو کیوں نہیں کہا؟"

"ذرا اچھا لگنے لگا ہے اب، نیلوفر!"

"دیکھو میرے ہونٹ آج کتنے پژمردہ ہیں ایاز!"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"اور آنکھیں بھی بہت روتی ہیں۔"

"دیکھ رہا ہوں۔"

"تم... تم... اپنے کو بدل دو ایاز! خدا کے لئے بدل دو، تمھیں بدلا ہوا دیکھ کر مجھے سب کچھ مل جائے گا۔"

"میں تو نہیں!؟"

"ہاں مگر... ہاں مگر... وہ جو میرے جیون ساتھی ہیں، تمھارے بہت مداح ہیں۔ تمھیں بہت ڈھونڈا لیکن تم نہیں ملے۔ اچھا ہوا تم انھیں نہ ملے ایاز! نہیں تو میں کیا کرتی۔"

"رقص نیلوفر — رقص! ایسے میں بہت پیارا معلوم ہوتا ہے ناچنا تم کو۔ خیر اب تم جاؤ، رات بہت ہو گئی!"

"وہ واپس جا چکے ہیں!"

"ساری زندگی یہیں بسر کر دو گی؟"

"اگر تم چاہو!"

"اب کیسے چاہوں گا۔ مجھے جانا ہے!"

"کہاں؟"

"بادلوں سے پرے۔ کہکشاں کے پاس!"

"پھر وہی باتیں؟"

"ہاں! نیلوفر! تم جاؤ۔ جاؤ۔ خدا کے لئے۔۔"

"بہت مفلس ہو گئے ہو؟"

"نہیں۔ میں کبھی مفلس نہیں تھا۔ میں ہمیشہ دولت مند رہا ہوں۔ مرتے دم تک دولت مند رہوں گا! اس کھنڈر پر نہ جاؤ۔ اس بوسیدہ لباس، اس پرانے ساز و سامان پر نہ جاؤ۔ یہ تو یونہی ہیں، یونہی۔ بزرگوں کی یادگار!"

"میرے لئے تمہارے دل میں اب کوئی جگہ نہیں ہے ایاز!"

"تمہارے لئے کیا کسی کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ ایک دولتمند کی فطرت سے شاید تم واقف نہیں ہو۔ شاید تم نہیں جانتیں دولت والے کسی کے نہیں ہوتے۔ جاؤ جاؤ نیلوفر! خدا کے لئے۔۔"

"تمہیں بخار تیز ہے!"

"ہو سکتا ہے!"

"تمہیں کھانسی بھی بار بار آ رہی ہے!"

"ہو سکتا ہے!"

"تم کمزور بہت ہو گئے ہو۔ تمہارا چہرہ اتنا زرد کیوں ہو گیا ہے۔ تمہیں یہاں ٹھنڈ لگتی ہو گی۔ تم ایاز کچھ پاگل بھی ہو گئے ہو۔ ڈیر! خدا کے لئے زندہ رہو۔ زندہ رہو۔۔!"

اور اس تصویر کے بعد کوئی تصویر نہیں اُبھر سکی۔ پھر وہی کہرے کی دیوار ہے۔ وہی چاندنی اور وہی خلائی تصویر، بھوری بھوری سی، ویران ویران سی۔ شیشوں کے اس طرف۔ نیلوفر کی نظریں وہاں سے ہٹ گئی ہیں اور دیوار پر آویزاں ایاز کی تصویر پر جم گئی ہیں۔ فرش پر پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ گلدان کے ٹوٹے شیشے بکھرے ہوئے ہیں۔ نیلوفر کے آنسو بکھرے ہوئے ہیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ علی الصبح نظر کے نام ایک تار آیا تھا — "قدر افزائی کا شکریہ! میں آ رہا ہوں!" اور ابھی دل کی تیز دھڑکنوں پر وہ قابو بھی نہ پا سکی تھی کہ وہ آ گیا۔ اُسے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی تھی! —— نظر اپنے محبوب فن کار کی خاطر مدارات میں مشغول ہو گیا تھا اور نیلوفر کھوئی کھوئی سی دیکھ رہی تھی۔ یہ ایاز چند ماہ پہلے والا ایاز نہ تھا۔ نہ اُسے کھانسی آ رہی تھی نہ اُسے بخار تھا اور نہ غم کے آثار چہرے پر نمایاں تھے۔ نہ وہ بوسیدہ لباس تھا، نہ وہ پرانا حلیہ۔ وہ ہنس رہا تھا۔ سب طرح ہنس رہا تھا۔ جیسے سچ مچ بہت دولتمند تھا۔

اور ناشتے کی میز پر بھی وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔

نظر نے نیلوفر کا اُس سے تعارف کرایا تو بول اُٹھا تھا ——

"میں نے شاید انھیں کہیں دیکھا ہے!"

"ضرور دیکھا ہوگا جناب! یہ آپ ہی کے شہر کی رہنے والی ہیں!"

"میں آپ کو جانتی ہوں۔ آپ شاید خان بہادر عنایت اللہ صاحب کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں!" اُس کے ساتھ کی لڑکی بولی تھی۔

اس پر بھی وہ چُپ سادھے بیٹھی رہ گئی تھی۔

نظر نے اُس کی تائید کی تھی۔

اور پھر دوپہر کو وہ کمرہ بند کئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ کیوں رو رہی تھی؟ اُسے کیا ہو گیا تھا، کون سا غم تھا اور کسی کی دستک پر جب اُس نے دروازہ کھولا تو کانپ کر رہ گئی تھی۔ ایاز اکیلا کھڑا ہنس رہا تھا۔

"میری چارہ گر زلیخا سو رہی ہے۔ میرے قدردان نظر صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں۔ موقع ہو تو آؤ کچھ باتیں کریں!"

"میرے پاس وقت نہیں ہے!" وہ جل اُٹھی تھی۔

"مگر سُنو تو نیلوفر!"

"نیلوفر نہیں، نیلو۔۔ مگر نہیں، ہاں ٹھیک ہے نیلوفر۔۔ نیلوفر ہوں میں۔ کہو کیا بات ہے۔۔؟"

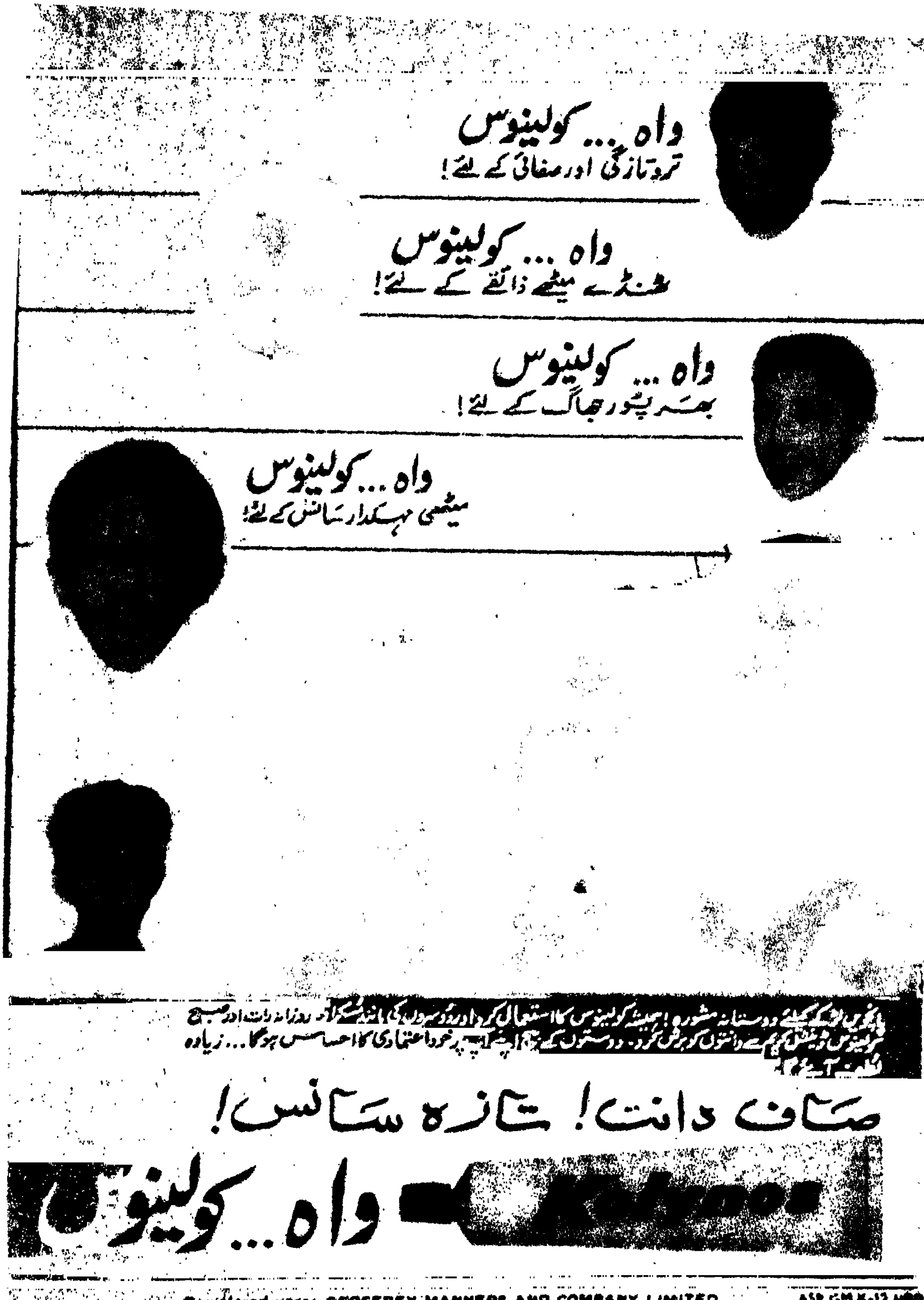
"کچھ خفا ہو؟؟"

"تم ہو کون؟" وہ تڑپی۔

"وہی ایاز! تمہارا محبوب! تمہارے ہی کہنے سے اچھا ہو گیا ہوں، خوش رہنے لگا ہوں، زندگی سے پیار کرنے لگا ہوں۔ مگر کہو تو پھر شراب میں ڈوب جاؤں۔ پھر بیمار ہو جاؤں، پھر اسی راہ پر چلنے لگوں۔ کہو تو، کہو تو۔۔" کہتے کہتے وہ اُداس ہو گیا اور نیلوفر نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔۔۔ اور اب یہ حال ہے کہ دھڑکنیں رُکی رُکی سی، کمرہ سُونا سُونا سا اور نیلوفر کے آنسو اور گلدان کے شیشے اور گلدان کے پھول فرش پر بکھرے ہوئے ہیں اور شام ہی سے وہ تینوں غائب ہیں۔ زلیخا، ایاز، نظر — اُسے تنہا چھوڑ کر —— اور دیوار پر آویزاں ایاز کی تصویر نیلوفر کی پُرنم آنکھوں سے کہے جا رہی ہے ——

"میں کہ خود اپنے مذاقِ طرب آگیں کا شکار

میں کہ خود اپنے۔۔۔


واہ... کولینوس
تروتازگی اور صفائی کے لئے!
واہ... کولینوس
ٹھنڈے میٹھے ذائقے کے لئے!
واہ... کولینوس
بھرپور جھاگ کے لئے!
واہ... کولینوس
میٹھی مہکدار سانس کے لئے!
صاف دانت! تازہ سانس!
واہ... کولینوس
Registered user: GEOFFREY MANNERS AND COMPANY LIMITED
ASP GM.K-12 URD

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم۔اے

افسانۂ نشاط سُنا کر چلے گئے
آئے وہ اور غمِ بڑھا کر چلے گئے

سو سو طرح سے کھنچ گئی تصویرِ زندگی
وہ جلوۂ حیات دِکھا کر چلے گئے

ہم جاگ اُٹھے تو نظریں اُنہیں ڈھونڈتی رہیں
مانندِ خواب آنکھوں میں آ کر چلے گئے

آئے تھے ہنستے کھیلتے کتنے دِنوں کے بعد
مُجھ کو بہت اُداس وہ پا کر چلے گئے

اب میں ہوں اور غمِ گُزشتہ کے واقعات
یادوں کے سو چراغ جلا کر چلے گئے

کس درجہ حیرتی ہے اجل خانۂ جہاں
آئینۂ حیات دِکھا کر چلے گئے

جب جب وہ آئے دردِ دلِ بیقرار کو
کُچھ مُسکراہٹوں میں دبا کر چلے گئے

رفتار تھی کہ موجِ نسیمِ بہار تھی
گُلہائے رنگ رنگ کِھلا کر چلے گئے

میں پوچھتا ہوں میری طرف آ کے بارہا
تم کیوں مری نگاہ بچا کر چلے گئے

اَب میں ہوں اور تلخ حقائق ہیں زیست کے
اک خوابِ زندگی وہ دِکھا کر چلے گئے

میں غم نصیب پاس کھڑا دیکھتا رہا
وہ دولتِ نشاط لُٹا کر چلے گئے

گُزرے خیال بن کے اُدھر سے اگر کبھی
دُنیا کو ایک خواب بنا کر چلے گئے

دل تک رواروی میں وہ آئے تھے کس لئے
کُچھ درد تھے جنھیں وہ جگا کر چلے گئے

وہ خوابگاہِ غم میں دبے پاؤں آ کے رات
مبہم سی کوئی یاد جگا کر چلے گئے

جب جب وہ آئے غم کدۂ سوز و ساز میں
افسانۂ فراقؔ سُنا کر چلے گئے

تاخیر سے موصول ہونے کے باعث اسے موزوں جگہ دی گئی۔
خورشید

ہر روز

[illegible]



۵۰ لاکھ ۸۰ ہزار مسافر روزانہ

مال واسباب

[illegible]

مسافر

[illegible]

دفاع

[illegible]

ہندستانی ریلوے

قومی خدمت میں ۱۱۳ سال

IRF - 34UR - 66

جیسونی احمدی دہلی

افسانہ

قرض کی دھوپ

ایم تمنا، ایم۔ اے

[illegible]۔ رانچی

[illegible]

خوشتر جہانی اہتمیں

. . . طویل مدت کے بعد "قرض کی دھوپ" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اگر آپ یہ سوچتے ہوں کہ میں آپ سے غافل رہا تو یہ غلط ہے بلکہ سچ پوچھئے تو "بیسویں صدی" کے بلند معیار نے کچھ ایسا احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے کہ اس درمیان جو کچھ بھی لکھا وہ ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ آپ کے پاس بھیجنے کی جرأت نہ ہوئی ——— اُمید ہے "قرض کی دھوپ" آپ ضرور پسند کریں گے۔ قرض و محبت کی کشمکش اتنی ہے۔ محبت کہاں کہاں کمند نہیں پھینکتی۔ میری کہانی کے ہیرو کی قربانی کی داد دیجئے۔ وہ کن خوبصورتی سے اس دام سے بچ نکلا ہے ——— اور زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا اِس لئے کہ آپ کی باریک بین نگاہیں وہ سب کچھ دیکھ لیں گی جو میں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے . . .

نیاز آگیں ——— تمنا

[illegible] شام اُتر رہی ہے۔

کہسار [illegible] فیل سلے مرغزاروں کو اپنی چادروں میں لپیٹ رہے ہیں اور [illegible] چنار کی لچکتی شاخوں سے کھیل رہی ہیں [illegible] کا درد ہاک اُٹھا ہے۔ [illegible] کی [illegible] معلوم ہو رہی ہے [illegible] کے پاؤں میں پائل باندھ دیئے گئے ہوں۔ میرے سر کے اوپر پہاڑوں کا غول اُڑتا ہے اور [illegible] پہاڑیوں کی [illegible] کی لمبی قطار [illegible] موتی کی طرح نظر آ رہی ہے۔ اُن کے لبوں پر ایک گیت ہے [illegible] سمجھ رہا ہوں لیکن اُس کا درد میری رگ رگ میں سما رہا ہے۔ لہر لہر گیت [illegible] ہے۔ آواز کا سوز و درد فضا میں پھیل رہا ہے۔ میری نظریں بھی اُسی کارواں پر ہیں۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ساری فضا وہی گیت گا رہی ہو۔ چنار کی پتی پتی وہی آواز گنگنا رہی ہو۔ گل گل کے سینوں میں وہی رس گھل گیا ہو۔ کہسار کی چٹانوں میں اب بھی وہی گیت گونج رہا ہو [illegible] کی [illegible] ایک آواز اُٹھتی ہے۔

"جانا!"

اور میں گھبرا کر اپنی نظریں پھیر لیتا ہوں۔ میری اُداس نظریں چاروں طرف [illegible] اُسی راستے پر آکر رُک جاتی ہیں جہاں تم اپنا آنچل پھیلائے [illegible] کر رہی ہو۔ میری راہ سے ہٹ جاؤ [illegible] اپنے آنچل کو سمیٹ لو [illegible] کو اپنا لو میرے ہمدم!! میری منزل بہت دور ہے [illegible] ہے۔ میرے پیچھے ایک قافلہ ہے۔ [illegible] دو [illegible] [illegible] میرا امتحان [illegible] آندھی آئے گی اور [illegible] کی فضائیں [illegible] جائیں گی میرے خواب بکھر جائیں گے۔ میری منزل دھندلکوں میں گم ہو جائے گی میرے آدرشوں کی شمع [illegible] بجھ کر ٹوٹ جائے۔ اپنی دنیا میں چلی جاؤ۔ اپنی اِن گیلی گیلی آنکھوں کو پھیر لو۔ تمہاری آنکھوں کے پلکوں سے ٹوٹتے آنسو مجھے راہ سے دور کر دیں گے۔ مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ تمہاری اِن بھیگی آنکھوں کو دیکھ سکوں۔ تمہاری اِن آنکھوں کو دیکھ کر تو مجھے اُس دن کا خیال آتا ہے جس دن . . .

اُس دن یکایک فضا خواب آلود ہو گئی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں برسات [illegible] کا کوئی بھروسہ نہیں۔ [illegible] ایک برس پڑی تھی۔ میں [illegible] تنہا [illegible] کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک کسی کی جانی پہچانی آواز نے

نکار اور گہرا کر دیا۔ تم زینے کے گرد بیٹھی تھیں [illegible]
[illegible] جیسے آکر ذکر میرے قدموں پر آگیا ہو۔ پائل کے گھنگھرو [illegible]
[illegible] ہو گئے ہوں۔ بس ایک آواز گونج رہی تھی۔

"بابو جی!"

ڈوبتے ابھری ہوئی آواز کو میں نہ پہچان سکا۔ میں نے تمھیں غور سے دیکھا۔ تم دونوں ہتھیلیوں کو زمین سے ٹیکے بیٹھی تھیں اور بہت بےبسی سے مجھے تک رہی تھیں۔ تم بارش سے بھیگ گئی تھیں۔ کرتے کی آستینوں سے ٹپ ٹپ پانی گر رہا تھا۔ بالوں کی لٹیں جھک کر پیشانی پر آگئی تھیں۔ پلکوں کی جھالریں سمٹ کر چھوٹی ہو گئی تھیں۔ تمھارے عارض کا سونا دھل کر دمک گیا تھا۔ اُس دن تم حیران حیران سی مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی تھیں۔ میں تمھیں لے کر آتشدان کے پاس آگیا۔ شعلوں کی سرخی میں تم اور بھی گلنار ہو گئیں، جیسے قدرت نے تمھارے جسم کے میدے میں لالے چنار کی پتیوں کا رس نچوڑ کر گوندھ دیا ہو۔

"کچھ پریشان ہو!" میں نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔

"میری گائے مر گئی بابو جی!" تم پھوٹ پڑیں۔

اور تب میری نظر تمھارے سونے سونے ہاتھ پر پڑی جس میں دودھ کی بالٹی

[illegible]
کی زندگی [illegible]
چھین لی جاتی تو زندگی کتنی [illegible]
میں نے ان آنکھوں کی جھالریں جھانک کر دیکھا [illegible]
زمانے کے کتنے جگ سے چھپے تھے۔ پتھر کی چھت [illegible]
میری ساری ہمدردیاں امڈ آئیں۔

"تمھاری آنکھیں دیکھ کر تو مجھے برستے ساون کا خیال آتا ہے۔ [illegible] ہو جاؤ ورنہ تمھاری اس وادی میں ایک دوسرا جہلم پھوٹ [illegible] کھیتیاں ڈوب جائیں گی!"

"بابو جی!" درد کے آبگینے ایک بار پھر چٹخے۔

میں نے حیرت سے تمھیں دیکھا۔ آخر اس کشمیر کی شہزادی کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیسا درد ہے؟ یہ کیسا سوز ہے؟ یہ کیسی التجا ہے؟ کیسی آواز ہے [illegible] بھی ہے اور ہلکا سا وقار بھی۔ یکایک کئی بار جلدی جلدی تمھاری پلکوں کی جھالر لرزی اور تب ریشم کا لچھا کھلا۔

"تم دودھ کیسے پیو گے؟"





[illegible] کی ... رہ گئیں۔ [illegible] تم پہاڑ کی
سب سے اونچی چوٹی پر [illegible] گئی ہو۔ یا کشمیر کی [illegible]

[illegible] اس کشمیری بیٹی کا دل کتنا بڑا ہے! اپنے دامن میں کانٹے سمیٹ کر جہان کے سر پہ پھول برساتی ہے۔ کشمیر کی وہ بیٹی جس کی زندگی بھیڑ اور بکریاں چرانے میں گزر رہی ہے۔ جس کا آنگن کہساروں کی دیواروں میں محدود ہے، وہ اپنے سینے میں کتنا معصوم اور پاکیزہ دل رکھتی ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے، یہ آواز اب بھی اِن پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی ہے اور شاید اُس وقت تک گونجتی رہے گی جب تک بیرونی تہذیب کے اثرات اِس وادی کو میلا نہ کر دیں۔

اُس دن تم میرے کمرے میں آتش دان کے پاس بیٹھی رہیں اور لمحے گزرتے رہے۔ لمحات کے اُن دبیز پردوں سے جب میں نے جھانک کر دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ تم صرف ایک پہاڑی دوشیزہ ہی نہیں ہو ـــــ وہ حنا ہو جس نے اپنے اندر نجانے کتنی حناؤں کو چھپا لیا ہے اور یہ غلاف تو صرف ایک ہی حنا کے چہرے سے اُترا تھا اُس سہلو دار حنا کے دماغ میں روشنی کی کتنی قندیلیں جگمگا رہی تھیں۔ کتنی آرزوؤں کے گلاب مہک رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے میری نظر تمھارے چھاگلوں پر پڑی تھی اور میں نے کہا تھا۔

"تمھارے پاؤں کے یہ چھاگل مجھے بہت پیارے معلوم ہوتے ہیں اور تم جب دوڑتی ہو تو اِس کی آواز سُن کر سوتی ہوئی کلیاں جاگ اُٹھتی ہیں۔"

اور میں نے کنکھیوں سے دیکھا تھا۔ تمھارا چہرہ سچ مچ پھول کی طرح کھل اُٹھا تھا۔ اپنے حجاب کو چھپانے کے لئے تم شعلوں کے رقص کو دیکھنے لگی تھیں۔ مجھے احساس ہوا تھا یہ عمر کی ایسی دہلیز ہے جس سے آگے قدم رکھتے وقت لڑکیاں جھجکتی اور شرماتی ہیں۔ پھر تم نے سرگوشی کی تھی۔

"میرے چھاگل کی آواز سے ساری وادی مانوس ہے بابو! اِس وادی کا ذرّہ ذرّہ مجھے پہچانتا ہے۔ میرے قدموں کے گھنگرو جب بجتے ہیں تو بھٹکی ہوئی بکریاں میرے پاس آجاتی ہیں لیکن بابو جی . . ."

تمھاری آواز کا سوز میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ نہ جانے تمھیں کیا یاد آگیا۔ تمھارے آنسوؤں کے آبشار گرنے لگے۔ بہت مشکل سے قابو پاتے ہوئے تم نے آستین سے آنکھوں کو خشک کیا اور رک رک کر کہنے لگیں۔

"بابا کہتا ہے یہ چھاگل میری ماں کا ہے۔ اُسے بھی یہ چھاگل بہت پسند تھا۔ کبھی کبھی میلے یا بیاہ شادی میں پہن کر جاتی تھی۔ سُنتے ہیں جس دن وہ اِس چھاگل کو پہنتی تھی، بابا جنگل میں لکڑی کاٹنے نہیں جاتا تھا۔ بابو جی! وہ دن میری زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ کابلی شاہ کی درگاہ پر میلہ تھا۔ ماں اُس میلے میں جانا چاہتی تھی لیکن بابا اُسے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چھاگل میری ماں کی کمزوری ہے۔ اُس نے اِسے بکس میں چھپا کر رکھ دیا لیکن ماں اپنی سہیلیوں کے ساتھ بغیر چھاگل پہنے ہی چلی گئی اور کبھی لوٹ کر نہ آئی! سُنتے ہیں اُس رات طوفان آیا تھا اور بہت برفباری ہوئی تھی۔ بابا نے پہاڑ کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن اُس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

"اُس وقت میں بہت چھوٹی تھی۔" تمھاری آنکھوں کا رم جھم پھر جاری ہوگیا۔

یکایک تم کھڑی ہوگئیں اور اپنے چھاگل کی چھم چھم سے فضا کو بیدار کرتی ہوئی گھاٹی کی پُرپیچ راہوں میں گُم ہوگئیں۔

چُپ ہو جاؤ میری جانِ جاں! ورنہ تمھاری آنکھوں کا یہ کاجل بہہ جائے گا۔ نہیں دیکھی جاتی تمھاری یہ سُونی مانگ! ڈھک لو اِسے اپنے آنچل سے۔ مہندی کے استعمال کے بغیر اِن ہتھیلیوں میں کیا رکھا ہے۔ میری نظروں سے انھیں بچاؤ ـــــ تم بغیر کچھ کہے چُپ چاپ چلی گئیں۔ کاش تھوڑی دیر اور انتظار کر لیا ہوتا! کیا میں چھٹی میں اِسی لئے گیا تھا کہ لوٹ کر نہ آتا۔ اُف! ایسی بھی کیا جلدی تھی؟ ہفتہ بھر بھی تو نہ رہا کہ تم روٹھ کر بہت دُور چلی گئیں۔ اِتنی دُور جہاں میری آواز نہیں جا سکتی۔ میں نے مُٹھی بھر مٹی اُٹھا کر اپنی ڈبیہ میں رکھ لی اور چلا آیا۔ کیسے رہتا یہاں ـــــ؟ تم میرے سامنے بیٹھی رہو اور مجھ سے باتیں نہ کرو۔ میں تمھیں تھامنے کو بڑھوں تو تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ تمھارے چھاگل کی آواز سُننے بیٹھوں تو تم اُسے اُتار کر گھاٹی میں پھینک دو۔ کیا میں تمھارا کوئی نہ تھا؟ یہ بکریاں تمھاری کوئی نہ تھیں جنھیں بیابان میں چھوڑ کر تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔ اپنے بابا کو تو دیکھو۔ آنکھوں میں آنسو کا دیا جلائے ہاتھوں میں چھاگل لئے تمھیں پہنانے کی التجا کر رہا ہے۔ پھولوں کے اِن پودوں کو تو دیکھو پھولوں کا گلدستہ بنائے تمھارے بالوں میں لگانے کو بیتاب کھڑے ہیں۔ پھر میں کیسے رہتا حنا! میں کیسے رہتا، یہ سب دیکھنے کے لئے؟ میں اُس راستہ پر کیسے چلتا جو تمھیں چھوڑ کر دوسری طرف نکل جائے۔

میرا تبادلہ ہوگیا۔ میں بہت دُور بھیج دیا گیا لیکن دُور رہ کر بھی تمھاری قربت کا احساس جاگتا رہا۔ وہ ایک مُٹھی مٹی اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ جو میری کائنات ہے۔ جب کبھی تنہا ہوتا ہوں تو تمھیں اپنے پاس بُلا لیتا ہوں۔ ڈبیہ کھولتا ہوں اور خلوص و محبت سے بھرپور تمھارا حریری پیکر سامنے آجاتا ہے۔ تمھارے جسم کی خوشبو اب بھی اِس ڈبیہ میں محفوظ ہے۔ کیا دُنیا اِس ڈبیہ کی قیمت لگا سکتی ہے؟ کبھی نہیں حنا! تمھی نے تو وہ لوک کہانی سُنائی تھی ـــــ

"ساری وادی پانی کی آغوش میں سر رکھے ہوئے تھی۔ لوگ باری باری تختِ سلیمانی کو بوسے دے کر احترام سے پیچھے ہٹ جاتے لیکن شہزادی کی نظریں حسین

...شکلوں اور لڑکیاں اپنے پانی کے نگر ہو چکی تھیں۔ شہزادی ہیرو نے بڑے دل سے

تھک کر بوسہ دیا اور ہیرو وادی کی پہنائیوں میں گم ہو گئی۔ وہ برابر سوچتی رہی کہ وادی

کب پانیوں سے کر پائے گی اور پریوں کے بادشاہ نے ایک دن ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ جو

اس وادی کے پانی کو باہر نکال دے گا اُسے دو ہزار اشرفیاں انعام دی جائیں گی۔ یہ کام

بہت مشکل تھا لیکن پڑوسی ملک کا شہزادہ کاشو جو ہیرو کے حسن پر فریفتہ تھا تیار ہو گیا۔

کاشو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کام میں لگ گیا لیکن ایک ایک کر کے سبھی ساتھی الگ

ہو گئے اور کاشو تنہا رہ گیا۔ اُس نے ہمت نہ ہاری۔ برسوں کی محنت کے بعد وہ اپنے

مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ساری وادی پانی سے خالی ہو گئی۔ کاشو اُسی دریا کے کنارے

ہیرو کا انتظار کرتا رہا لیکن پریوں کے بادشاہ نے ہیرو کو قتل کر دیا۔ کاشو انتظار کرتے

کرتے تھک کر دریا میں ڈوب گیا۔ سُنتے ہیں اب بھی جہلم کے کناروں پر دو پرچھائیاں

دوڑتی نظر آتی ہیں۔"

یہ کہتے کہتے تمھاری آنکھیں دریا کے کناروں پر کچھ ڈھونڈنے لگی تھیں۔ پھر تم

نے ایک طرف خلاؤں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ـــــ "دیکھو! وہ دیکھو! اب بھی

دو سائے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں"

خوف سے تمھارے چہرے کے کنول سیاہ پڑ گئے تھے۔ تم نے آنکھیں بند کر لیں اور

میرے سینے میں اپنے سر کو چھپا لیا تھا جیسے اس سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں ہے۔ میں نے

تمھیں اپنی باہنوں کی زنجیروں میں لپیٹ لیا تھا۔ تب مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کہ سچ مچ

میں کاشو ہوں جو ہیرو کو اپنی باہنوں میں چھپائے پریوں کے راجہ سے لڑنے کو تیار

ہے اور اُس روز میں پہلی بار تمھارے جسم کی خوشبو سے مدہوش ہوا تھا۔

"ہمت کرو حنا! اپنی باہنوں کو سمیٹ لو۔ جہاں تم اب کھڑی ہو ٹھیک اسی

کے سامنے جہلم کی طرف یوکلپٹس کے پیڑ کے نیچے میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اُسے پورا

کرنے آیا ہوں۔ میں نے کہا تھا جنم جنم کے ساتھی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کہیں نہ کہیں

ضرور ملیں گے۔ آج میں آگیا ہوں۔ آج صبح مجھے خبر ملی ہے کہ تم راستہ روکے کھڑی ہو۔

سب تمھیں ہٹانے سے ہار گئے ہیں۔ وہ تمھارے مزاج کو کیا جانیں۔ میں اپنے ہیڈ کوارٹر

سے اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ تم سے مجبور کر لوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات نہ ٹالو گی۔

ایک فوجی کے پاس پتھر ہی کا دل نہیں ہوتا، ایسا دل بھی ہوتا ہے جس کی دھڑکن وہ

رگِ جاں کے قریب سُنتا ہے۔ میں نے تمھارے دل کی دھڑکنوں کو کئی بار سُنا ہے۔ میں

یہ بھی جانتا ہوں کہ تمھارا دل پھول کا دل ہے۔ نازک سا کومل کومل . . ."

جی ہاں!

یہ مزار حنا کا ہے۔

پھول کے دل کا ہے۔

کھڑی رہی ہے۔

میری... میری

نہیں نہیں... کچھ نہیں... چلتے رہئے۔

ان جاؤ۔ تم میری آنکھ ہو... سن رہی ہو

حنا! تمھاری ماں اس وادی کی آنکھ ہے... پانی

دریا پھیلتا... وقت بہت تیزی سے بہہ رہا ہے... تمھارے

فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ساری چھاؤنی ... ہو

سے واپس چل رہی ہے... گلشن کے اندر ... سے

والا ہے۔ ... گلشن کے بعد تمھارے فوجی ... میں

دیتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ راستے ... میں بھر کر

اُن کے ماتھے پر تلک لگا دو۔ اپنی آنکھوں کے ... کی

آرتی اُتار دو۔ یہ تمھاری کنواری وادی کے پاسبان ہیں ... کے سیندور

کے نگہبان ہیں۔ میری اچھی حنا! میرے ... تاریخ یاد

کرے گی۔ تمھاری قربانی کی صدا آنے والی صدیوں ... ہوگی۔ مجھے معاف

کر دو میری حنا! الوداع میری حنا!! الوداع!!!

دوسرے ہی لمحے بل ڈوزر خاک کے ... پر کر ... آگے بڑھ

چکے تھے!!

طنزیہ

اوٹ پٹانگ

فکر تونسوی

میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ آئندہ میں آپ کو اوٹ پٹانگ باتیں سنایا کروں گا۔ مثلاً میں آپ کو بتاؤں گا کہ آل انڈیا ریڈیو، مہاتما گاندھی کی جو پرانی تقریریں براڈکاسٹ کرتا ہے اُن کی وجہ سے پانی پت میں موٹروں کے ٹائر پنکچر ہو گئے ہیں۔ اور جس دن ٹائر پنکچر ہوئے اُسی دن ایک جن سنگھی لیڈر نے بڑی دلیری سے اعلان کرایا کہ وہ جاہل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جہالت کسی کی میراث نہیں۔ ڈیموکریسی میں اس پر سب کا برابر حق ہے لیکن اس بے تکی بات میں ایک تُک یہ ہے کہ ایک دن جن سنگھیوں نے ٹائروں کی ایک دکان کو آگ لگا دی۔ جس میں ٹائروں کے ساتھ ساتھ تین انسان بھی جل گئے۔ یہ ریڈیو سے مہاتما گاندھی کی اہنسا پر تقریریں نشر ہو رہی تھیں۔ چنانچہ دنیا سے تین انسان اور تین ہزار ٹائر کم ہو گئے۔ جس سے ٹائر مہنگے ہو گئے۔ اس پر جن سنگھی لیڈر نے اپنی جہالت کا اعلان کرایا کہ کاش تین ہزار ٹائر نہ جلائے جاتے بلکہ تین ہزار انسان جلائے جاتے۔ کم از کم ٹائروں کے ریٹ پر تو برا اثر نہ پڑتا۔

دراصل اوٹ پٹانگ باتیں کرنا ہر ایرے غیرے کا کام نہیں۔ ایک بار کا ذکر ہے ہمارے گھر میں ایک نوجوان رہتا تھا۔ اچانک وہ اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگا تو والدین نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔ بلکہ ساتھ ہی دھمکی بھی دے ڈالی کہ ہماری جائداد پر اب اُس کا کوئی حق نہیں (یہ جائداد پوتے دو کمروں کے ایک کچے مکان پر مشتمل تھی جو بعد میں دریا برد ہو گیا)

لیکن چند دن ہوئے تقریباً بیس سال بعد اُس اوٹ پٹانگ نوجوان سے میری پھر ملاقات ہو گئی۔ تو معلوم ہوا کہ اب اُس کا نام سوامی ہری ہر نارائن ہے۔ اب وہ ایک سنت مہاتما ہے، بالکل ایسے جیسے کئی لوگ بھٹے کے مالک ہوتے ہیں۔ سیکڑوں عقیدت مند اُس کے سامنے آکر سر جھکاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُس کے والدین بھی اُس کے چرن چھوتے ہیں اور اُس کی روحانی باتیں سنتے ہیں۔ اگرچہ باتیں اب بھی وہ اوٹ پٹانگ کرتا ہے لیکن اب لوگ ان میں مفہوم پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک ٹرانسسٹر سیٹ میکنگ کمپنی کا مالک اُس کا بھگت ہے جو اپنے ٹرانسسٹروں میں ہندوستانی پرزے ڈالتا ہے اور اُن پر "میڈ ان جاپان" لکھوا دیتا ہے۔ وہ ہر ایک سے کہتا پھرتا ہے کہ سوامی ہری ہر نارائن کو آئندہ الیکشن میں پارلیمنٹ کا ممبر بنا دینا ضروری ہے ورنہ بھارت دیش تباہ ہو جائے گا ——— وہ سوامی ہری ہر نارائن کو بھی ایک پرزہ بنا کر اُسے "میڈ ان جاپان" بنا دینا چاہتا ہے۔ ٹرانسسٹر ہو یا انسان۔ اگر اُن پر "میڈ ان جاپان" لکھ دیا جائے تو اُن میں ایک مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اوٹ پٹانگ باتیں کرنا آسان نہیں ہے۔ اِس سے انسان یا تو پاگل ہو جاتا ہے یا سنیاسی یا ممبر پارلیمنٹ۔

مگر فکر تونسوی نہ پاگل بننا چاہتا ہے، نہ سنیاسی، نہ ممبر پارلیمنٹ (جھوٹ بولتا ہے۔ اُس میں بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے) کیونکہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو آکاش سے دیوتاؤں نے پھول نہیں برسائے تھے اور نہ اُس کے والد صاحب نے غریبوں کو بُلا کر کھانا کھلایا تھا۔ کیونکہ وہ خود غریب تھے۔ غریب اگر غریب کو کھانا کھلائے تو دونوں بے وقوف لگتے ہیں۔ لہٰذا فکر تونسوی کو اپنے والد پر تو غصہ نہیں آیا مگر وہ دیوتاؤں پر سخت ناراض ہوا کہ اُن کے پاس تو پھولوں کی کمی نہیں تھی۔ مگر یہ ناراضی بھی بعد میں بے معنی ثابت ہوئی۔ کیونکہ فکر تونسوی پر انکشاف ہوا کہ سائنس کے نقطۂ نگاہ سے دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پھول کیا برساتے ——— البتہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ہوائی جہازوں پر بیٹھ کر آکاش پر جاتے ہیں اور وہاں سے کبھی پھول برساتے ہیں اور کبھی بم۔ جیسا بھی موقع محل مناسب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار ایک فوجی دستے پر گلاب اور موتیے اور چنبیلی کے پھول برستے اُس نے دیکھے۔ چھ ماہ بعد بالکل اُسی قسم کے ایک فوجی دستے پر دھڑا دھڑ بم برسائے جانے لگے۔ جس سے وہ فوجی یوں گِر گِر کر مرنے لگے جیسے درختوں سے خزاں کے پتے جھڑ جھڑ کر گِر رہے ہوں ——— چنانچہ فکر تونسوی نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس کے جنم پر دیوتاؤں نے پھول نہیں برسائے۔ ایسے بے ہنگم دیوتاؤں کا کیا اعتبار؟ جن کا کوئی کیریکٹر ہی نہیں۔ کبھی پھول برساتے ہیں کبھی بم۔ اِن سے تو میرے والد صاحب اچھے تھے۔ کم از کم اُن کا ایک کیریکٹر تو تھا یعنی غریب تھے تو عمر بھر غریب ہی رہے۔ کبھی

پہنچ گیا کہ غریبوں کو کھانا کھلانے کی خاطر فنانس کمپنی کھول لی اور غریبوں، پولیس اور بھنگوان کو کچھ دے دلا کر اُن کا ضمیر خرید لیا، اپنا ضمیر بیچ دیا۔

مجھے شک ہے کہ میری باتوں میں کچھ مفہوم سا پیدا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا تا؟ کہ اوٹ پٹانگ باتیں کرنا آسان کام نہیں۔ دراصل اوٹ پٹانگ باتوں کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اُن میں مفہوم تو ہو مگر کسی کے پلے نہ پڑیں اور ایسی باتیں صرف دو قسم کے انسان کر سکتے ہیں۔ انتہائی چالاک مرد یا انتہائی حسین عورت!

پہلی قسم میں لیڈر اور ڈپلومیٹ آتے ہیں کہ اگر وہ کیک کھاتے ہوئے اناج کی قلت پر بات کر رہے ہوں تو ایک دم رونے لگیں گے اور روتے روتے دھمکی دینے لگیں گے کہ وہ اناج کی قلت کے خلاف باقاعدہ مرن برت رکھنے والے ہیں اور پھر اُن کے مرن برت کے بھی کئی مفہوم ہوتے ہیں۔ مثلاً بچے سمجھیں گے کہ وہ کھلونوں کو سستا کرنے کے لئے قربان ہو رہے ہیں۔ عورتیں سمجھیں گی کہ وہ لپ اسٹک کی کوالٹی بہتر بنانا چاہتے ہیں اور بوڑھے سمجھیں گے کہ وہ خضاب میں ملاوٹ کے خلاف مر جانا چاہتے ہیں اور ڈپلومیٹ سمجھے گا کہ عوام چاہے مجھے لپ اسٹک سمجھ کر ہونٹوں پر لگا لیں، چاہے خضاب بنا کر اپنے بال کالے کر لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو صرف آئندہ الیکشن کے لئے اپنے ووٹروں کی تعداد محفوظ کر رہا ہوں۔

ایک بار ایک ڈپلومیٹ نے مرن برت رکھا تو دوسرے ہی دن بیہوش ہو گیا۔ دراصل وہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ اُس میں اپنی تقریر نہ دیکھ کر اُسے انتہائی صدمہ ہوا اور وہ بیہوش ہو گیا۔ لوگوں نے سمجھا برت کی نقاہت اور دیش کی دُردشا کے سبب بیہوشی طاری ہو گئی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ایک پریس رپورٹر نے اُس سے دھوکا کیا تھا۔ وہ بھوک ہڑتالی لیڈر سے فوٹو اور پچاس روپے رشوت لے گیا تھا۔ روپوں کی شاید وہ وہسکی پی گیا اور وہسکی کے نشے میں فوٹو پھاڑ کر نالی میں پھینک دیا۔ اخلاق کی یہ گراوٹ دیکھ کر بھوک ہڑتالی کو سخت صدمہ ہوا اور وہ بیہوش ہو گیا۔ چنانچہ اُس کے بعد ہر روز اخباروں میں اُس کی بیہوشی پر طبّی بلیٹن شائع ہونے لگے۔ اپنی یہ مقبولیت دیکھ کر اُسے ہوش آ گیا اور ہوش میں آتے ہی اُس نے اوٹ پٹانگ باتیں شروع [illegible] مثلاً یہ کہ میری روح اندھیرے میں بھٹک رہی ہے مگر مرن برت سے اُس کے [illegible] ہو گیا ہے۔ جسم فانی ہے، روح امر ہے۔ جسم کا مرن برت ختم ہو جائے گا [illegible] کا مرن برت کبھی ختم نہیں ہوگا۔ روح کو کوئی پولیس افسر گرفتار [illegible]۔ روح جگنو بن گئی ہے اور عوام کے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ لہٰذا — پولیس افسر مردہ باد!

[illegible] ہو گئے اور [illegible] بس کو آگ لگا دی۔ [illegible] لے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ [illegible]۔

اور پھر [illegible] دن [illegible] لیڈر نے جوس کا گلاس پی کر مرن برت توڑ دیا اور [illegible] پورا ہو گیا ہے۔

ڈپلومیٹ کا آویشن وہ صفر ہوتا ہے جو ہندسے کے پیچھے لگا ہو۔ چاہے ہٹا دو یا لگا دو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈپلومیٹ کا آویشن اور حسین عورت کا جسم دونوں صفر کی طرح ہیں۔ ظاہر میں بڑے دلفریب مگر باطن میں گول صفر جو ہندسے کے پیچھے لگا ہوا ہے بلکہ کئی بار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہندسہ ہوتا ہی نہیں، صفر ہی صفر ہوتا ہے۔ آپ بہت سے صفروں کو ایک قطار میں بٹھا دیں تو لوگ کہتے ہیں "یہ بیوٹی کانٹسٹ" ہو رہا ہے اور اس مقابلۂ حسن میں "فلاں صفر" اوّل آیا ہے اور اب یہ صفر ہوائی جہاز پر نیویارک جا رہا ہے۔ جہاں وہ ایک سوپ مینوفیکچرنگ کمپنی کی طرف سے اپنے حسین و جمیل بدن پر صابن ملنے کا مظاہرہ کرے گا۔

سنگھار کی چیزیں تیار کرنے والی کمپنیاں بڑی چالاک ہوتی ہیں۔ وہ "بیوٹی کانٹسٹ" کرتی ہیں صرف حسین عورتوں کے لئے مگر سنگھار کی چیزیں تیار کرتی ہیں صرف بدصورت عورتوں کے لئے — صابن، عطر، تیل، ماڈرن ہیئر پن، سکرٹ، کریم، پاؤڈر، لپ اسٹک — یہ سب چیزیں وہی عورتیں خریدتی ہیں جو اور سب کچھ ہوتی ہیں مگر حسین نہیں ہوتیں۔ کوئی کمپنی یہ حماقت نہیں کرتی کہ بھونڈی اور بھدی عورتوں کا "بیوٹی کانٹسٹ" کرائیں۔ وہ انہیں نیویارک تو ایک طرف غازی آباد تک نہیں بھجواتیں۔ وہ اپنی بدصورت گاہک عورتوں کو یہ کبھی نہیں بتاتیں کہ وہ "مس [illegible] سندری" جس نے ہمارا صابن استعمال کر کے اپنے بدن کو حسین و جمیل بنا لیا، ذہنی طور پر انتہائی بے وقوف ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک پریس رپورٹر نے ایک [illegible] سندری سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا: "خربوزہ کلی داس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟" [illegible] نے جواب دیا: "ہم نے اُسے نوکری سے نکال دیا ہے کیونکہ وہ [illegible] کا ممبر بن گیا تھا اور [illegible] چنانچہ کہتے ہیں کہ مقابلۂ حسن کرانے والی کمپنی کے [illegible] اور رپورٹ کی کاپی پھاڑ ڈالی اور کہا: "تم ایسے سوالات [illegible]"

وہ شیشے میں صرف دیکھ سکتی ہے جو وہ دیکھنا چاہتی ہیں۔

لہٰذا عورت جتنی زیادہ حسین ہوگی اتنی زیادہ بیوقوف ہوگی۔ بدصورت عورت بے وقوف نہیں ہوتی بلکہ اُسے دیکھ کر دوسرے لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حسین عورت کو دیکھتے ہی لوگ انتہائی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگتے ہیں لیکن بدصورت عورتوں کو دیکھ کر عقل سلامت اور محفوظ رہتی ہے لیکن اِس کا کیا جائے کہ ہر بدصورت عورت حسین بننا چاہتی ہے۔ وہ ایسے ایسے میک اپ خرید کر لاتی ہے، جس میں وہ کم سے کم بدصورت اور زیادہ سے زیادہ خوبصورت نظر آئے۔ وہ بناؤ سنگھار کی نت نئی چیزیں لاکر نت نئے زاویوں سے لگاتی، سجاتی اور باندھتی ہے۔ وجہ صاف ہے کہ انہیں حسین عورتوں سے حسد ہوتا ہے اور وہ اُس حسد کے مارے انتہائی بے وقوفانہ حرکتیں کرنے لگتی ہیں ـــــ اور تھوڑا بہت کالیداس جو اُن کے دماغ میں بسا ہوا ہوتا ہے، وہ یا تو باہر نکل جاتا ہے اور یا گھریلو نوکر بن کر جھوٹے برتن صاف کرنے لگتا ہے۔ حُسن اور بدصورتی میں یہ خانہ جنگی مسلسل چل رہی ہے اور اِس خانہ جنگی میں اگر کوئی فائدے میں رہتا ہے تو صرف مینوفیکچرنگ کمپنیاں، جو کسی کے ہاتھ کالیداس کی کتابیں چھاپ چھاپ کر فروخت کرتی ہیں اور کسی کے ہاتھ لپ اسٹک اور ساڑیاں!

اگر کوئی حسین عورت میرا یہ مضمون پڑھ رہی ہو تو اُسے میرے خلاف مشتعل نہیں ہو جانا چاہئے کیونکہ اشتعال میں آکر وہ اور بھی حسین معلوم ہونے لگے گی اور کوئی شاعر کسی جنتائی سٹال میں پندرہ پیسے والا چائے کا کپ پیتے پیتے اُس کے غصّے کو شعر بنا ڈالے گا اور پھر ساہتیہ اکیڈیمی کو نوٹس بھیج دے گا کہ مجھے اِس شعر پر اکیڈیمی ایوارڈ دیا جائے ورنہ میں اِس مُلک کو چھوڑ کر الجیریا چلا جاؤں گا۔

قارئینِ کرام! ذاتی طور پر میں اِس بات کے حق میں ہوں کہ چائے کا کپ سستا ہو جانا چاہئے ورنہ خطرہ ہے کہ شاعر غصّہ میں آکر ساہتیہ اکیڈیمی کا دشمن بن جائے گا۔ ویسے اگر الجیریا میں چائے کا کپ سستا ہو تو شاعر کو اجازت دے دینی چاہئے کہ وہ وہاں چلا جائے۔ ہمارے مُلک کے شاعر کا سب سے بڑا غم یہ ہے کہ وہ تیسرے درجے کی چائے، دوسرے درجے کا ادب اور اوّل درجے کا ایوارڈ چاہتا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی مجھے یہ شک بھی ہوتا ہے کہ اگر ایوارڈ کی بجائے وسکی کے دو چار پیگ دے دئے جائیں تو وہ آپے سے باہر ہو جائے گا یعنی یا تو اپنے بٹوے سے بچے کھچے نوٹ نکال کر سب کے سامنے یوں پھاڑ دیگا جیسے ساہتیہ اکیڈیمی کے ایوارڈ کا دعوت نامہ پھاڑ دیا ہو اور یا پھر کسی بجلی کے کھمبے کے ساتھ اپنا سر لگا کر زار و قطار رونے لگے گا اور کہے گا "آہ! ہندوستان کا ذہن بانجھ ہے۔ وہ مجھے سمجھاتا نہیں۔ ہندوستان کی تمام محبوبائیں بانجھ ہیں، وہ میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔ میں لندن چلا جاؤں گا۔ واشنگٹن چلا جاؤں گا، الجیریا چلا جاؤں گا۔ میں اِس کائنات میں اکیلا ہوں، اجنبی ہوں، اناتھ ہوں۔

لیکن دوسری شام کو وہ پھر اُسی جگہ پندرہ پیسے والا چائے کا کپ پیتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ کہیں نہیں جائے گا کیونکہ وہ تھان کا گھوڑا ہے وہ وفادار جانور ہے۔ وہ دیش بھگت ہے اور

خاکِ وطن کا اُس کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

پھول کا زخم

ناز چکدیتوی

سیکشن اے۔ اے، اے۔ جی۔ آفس، پوسٹ ہیوڈ، رانچی

۹ مارچ ۹۶ء

بھائی میاں

اس بار "پھول کا زخم" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ یہ کہانی صرف ایک پھول کی کہانی نہیں ہے۔ اس ملک میں کھلنے والے بے شمار پھولوں کی کہانی ہے۔ آپ درد بھرا دل رکھتے ہیں اس لئے مجھے یقین ہے کہ پھول کے اس زخم پر آپ کی آنکھیں بھی اشکبار ہو جائیں گی۔ اگر ایسا ہوا تو اسے میں اپنی کامیابی کا سب سے بڑا انعام سمجھوں گا۔ کہانی کچھ طویل ضرور ہو گئی ہے لیکن اس کی دلچسپی کے پیش نظر یہ طوالت بار نہ گزرے گی۔ پھر بھی آپ کے فیصلے کا میں انتظار کروں گا ـــــ میری پہلی کہانی "خاک ہو جائیں گے ہم" کی اشاعت پر بے شمار کرمفرماؤں نے مجھے یاد کیا تھا اور چند نے تو مجھ سے اس سلسلے میں بہت سے سوالات بھی کئے تھے۔ میں شرمندہ ہوں کہ ان دنوں اتنا مصروف تھا کہ خواہش اور ارادے کے باوجود کسی کو جواب نہ دے سکا۔ اپنے کرمفرماؤں سے اپنی اس کوتاہی کے لئے معذرت خواہ ہوں . . .

آپ کا ـــــ ناز چکدیتوی

دروازے پر ڈولی لگی ہوئی ہے۔ باہر براتیوں کا شور ہے۔ بابل کے گھر سے ایک لڑکی رخصت ہو رہی ہے۔ ماں باپ کا یہ نشیمن اور لڑکی کے بچپن کا یہ گہوارہ جہاں ایک ننھی کلی زندگی کے نشیب و فراز سے یکسر بے نیاز مسکراتی تھی۔ پالنوں کی دھیمی پینگوں میں ہاتھ پاؤں پھینکتی ہوئی یہ کلی یک بہ یک اتنی بڑی کیسے ہو گئی۔ آج اپنے بچپن کی اُن مسکراتی، گاتی اور ناچتی یادوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر، بابل کے گھر کے در و دیوار کو اداس اور سوگوار چھوڑ کر زندگی کے ایک نئے حسین موڑ کی طرف جا رہی ہے اور نئی زندگی کی، نئی راہ کی اس حسین مسافر کو میں اپنے گلے سے لگائے ہوئے الوداعی سلام کہہ رہی ہوں۔ الوداع میری ننھی گڑیا! میری بہن! یہ نئی زندگی اور اس زندگی کا ساتھی مبارک ہو۔ میں جانتی ہوں کہ یہ آنسو جو آج تم میرے گلے سے لگ کر بہا رہی ہو یہ آنسو نہیں، تمھارے دل اور تمھارے جگر کی وہ تپش ہے جو پگھل کر میرے کندھے پر بہہ رہی ہے۔ اب چپ بھی ہو جاؤ انجم ورنہ میں وہ ضبط کھو بیٹھوں گی جسے میں نے اپنی زندگی سے عزیز رکھا ہے۔ میرے دل پر اتنا بوجھ تو نہ دو انجم ـــــ اُف! میرے اللہ! اب چپ بھی ہو جاؤ۔ دیکھو تو تمھاری سسرال والے رخصتی کے لئے کتنی عجلت کر رہے ہیں اور تم ہو کہ مجھ سے چمٹی ہوئی ہو۔ جاؤ میری بہن! خدا حافظ! میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ تمھاری اپنی زندگی کا سارا درد سمیٹے زندہ رہے گی۔ بس اب مان بھی جاؤ ـــــ" اور یوں درد بھرے گیتوں تلے نشیمن کی ایک ننھی گڑیا آج اس گھر سے رخصت ہو گئی۔

اب میں اکیلی ہوں اور یہ اتنا بڑا مکان ہے۔ نشیمن ـــــ ہر طرف سناٹا ہے اور ہر چیز اداس ہے۔ پورے مکان پر ایک حسرت برس رہی ہے۔ جسے محسوس کرنے کے لئے میں اس کی واحد نگہبان رہ گئی ہوں۔ میں ـــــ اس کہانی کا ایک ایسا کردار جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ کوئی خوشی، نہ زندگی کی کوئی اُمنگ، نہ کوئی تمنا اور نہ کوئی آرزو ـــــ میں ایک لڑکی ہوں ـــــ اور میرے سامنے آئینہ ہے اور ابھی ابھی میں نے محسوس کیا ہے جیسے میں نے عمر کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ آخر سر میں یہ اتنے سارے سفید بال، چہرے پر چھایا ہوا یہ بے پناہ سناٹا اور محرومیوں اور نامرادیوں کی یہ تصویر ـــــ آخر وقت میرے لئے انتظار کب تک کرتا۔ اب میرے پاس صرف یادیں ہیں یا اس تشنۂ تکمیل زندگی کا وہ عہد رفتہ جو آج نہ جانے کیوں بے اختیار یاد آ رہا ہے۔ لیکن یہ آنکھیں کمبخت اتنی تیزی سے بھر آتی ہیں کہ کہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ یادوں کے اس کھنڈر میں بیٹھ کر میں یہ

کہانی آپ کو تمہیں سناؤں گی۔ میری یہ کہانی انجم کے لئے ہے جو میری بہن ہی نہیں تھی، میری زندگی کی آرزو تھی، میرے تیاگ کا عنوان تھی، میری لاج تھی اور میری ریاضت ——— وہ میری بیٹی تھی۔ ہاں! بہن کی میں نے ایک ماں کی طرح پرورش کی، وقت کے حوادث سے بچاتی ہوئی اپنی زندگی سے بڑھ کر میں نے اس کلی کی حفاظت کی، اس کی نوک پلک سنواری اور لٹیہ ایک ایسا آب دار موتی بنایا جس پر میں فخر کر سکتی ہوں اور پھر اس بیش بہا موتی کو آج میں نے ایک اجنبی کے سپرد کر دیا۔ شاید یہی میری عبادت، میری خدمت اور میرے تیاگ کی قیمت تھی۔ آج میرا دل کتنا مطمئن ہے۔ تکمیل ذہن کے احساس سے آج میں خود کو کتنی ہلکی پھلکی محسوس کر رہی ہوں ——— لیکن دل کا درد وہ پرانا زخم آج کیوں اس طرح یاد آنے لگا ہے۔ میرے معبود! انجم کی جدائی کا یہ درد ہی کیا اتنا کافی نہ تھا کہ میرا سینہ چھلنی ہو جاتے۔ پھر یہ اتنی ساری یادیں، دل کا یہ پرانا درد ——— آخر یہ سب کچھ آج ہی

- سچائی اور نیکی کو صرف اپنی میراث سمجھنا جہالت اور بے وقوفی ہے۔
(ایک مشرقی دانشور)
- جو اپنی زبان اور کردار پر نظر رکھتا ہے، اس کی روح ہر طرح کے عذاب سے بچی رہتی ہے۔ (عربی مقولہ)
- کام کو جلد کرنے کی فکر نہ کرو۔ بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کرو۔ لوگ یہ نہ پوچھیں گے کہ یہ کام تم نے کتنے وقت میں کیا؟ وہ تو تمہارے کام کی اچھائی کو دیکھیں گے۔ (ایک مشرقی مفکر)
- غم دو باغوں کے درمیان ایک دیوار ہے۔ (خلیل جبران)
- مصائب کی سختی سے ضمیر کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ (ایک مشرقی مفکر)

کیوں یاد آنے لگے ہیں۔ یادوں کا یہ زخم، پھول کا یہ نازک دل اور اس پر یہ تنہائی ——— کیا میں آج سچ مچ پاگل ہو جاؤں گی؟

جب میں آئینے کے پاس جاتی ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پھول مجھ سے کہہ رہی ہے۔ اس عکس کو پہچانتی ہو نا؟ یہ میں ہوں۔ پھول! جس پر پورا کالج دیوانہ تھا کتنی الھڑ تھی میں اور زندگی کی نیرنگیوں اور رعنائیوں سے کتنی بھرپور ——— لڑکیوں کی جماعت کا سب سے درخشندہ ستارہ اور کالج کی روح۔ میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ، میرے چہرے کا جمال، میری سادگی اور میرا کومل سا دل ——— میں اپنے وجود کے کسی حصے پر بھی تو مغرور نہیں تھی۔ میں نے غرور کی تعلیم ہی نہیں پائی تھی اور نہ مجھے اس میں لطف آتا تھا کہ میں چراغِ محفل بن کر لڑکوں کے ہوش و حواس پر چھا جاؤں اور نہ میں نے کبھی یہ سوچا کہ کالج کی زندگی اور موجودہ نظام کا سہارا لے کر دوسروں کے لئے میں

بربادیوں اور تباہیوں کا باعث بنوں۔ زندگی کا یہ رُخ مجھے بہت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا۔ محبت کا مفہوم میری نظر میں کچھ دوسرا تھا۔ میں سب سے خلیق تھی، سب سے ہنس کر باتیں کرتی تھی اور کوئی اگر اپنی حد سے تجاوز کر کے میرے دل کے قریب آنے کی کوشش کرتا تھا تو میں اپنے دل کا دروازہ بند کر کے اپنے ماحول میں سمٹ جاتی تھی۔ میری کوشش ہوتی تھی اس خوبصورتی کے ساتھ کہ کسی کے دل کو کوئی چوٹ نہ پہنچے۔ کوئی مجھ سے ظالم نہ کہے اور کسی کی آنکھوں میں اپنے لئے میں کوئی آنسو نہ دیکھوں ——— میرے کردار کا یہ رُخ بہت عجیب اور انوکھا تھا۔ کسی نے مجھے پاگل کہا، کسی نے پتھر! اور یہ بات کالج میں پھیل گئی کہ میں آسمان پر چمکتا ہوا ایک ایسا ستارہ ہوں جو انسانی پہنچ سے بالاتر ہے ——— میں نے بھی یہ سنا اور پل بھر کے لئے سوچنے لگی، کیا یہ ضروری ہے کہ ہر لڑکی کی زندگی میں کوئی نہ کوئی رومانس ضرور ہو؟ اس سوال پر میں خود بخود شرما سی جاتی تھی اور فوری طور پر میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ ہوتا تھا۔ اس لئے کہ ابھی تک میں نے زندگی کا یہ روپ نہیں دیکھا تھا اور نہ میں نے کبھی اپنے دل کی یہ آواز سنی تھی۔ کون جانے کبھی میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی طوفان آ جائے جو اس پتھر کے دل میں اتھل پتھل پیدا کر دے۔ ایک طوفان ایسا بھی تو ہوتا ہے جو اچانک اور انجانی سمت سے آتا ہے اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ انجانی باتیں، یہ ان دیکھے حادثات اور دل کی بدلتی ہوئی یہ لطیف دھڑکن ——— کیا ان پر کسی کا قابو ہو سکتا ہے؟ میں کوئی پتھر تو نہیں ہوں کہ اس لطیف اور ٹھوس حقیقت سے انکار کر دوں۔

اور آخر وہ طوفان جس سے میں ہمیشہ اپنا دامن بچاتی رہی میری زندگی میں بھی نہ جانے کدھر سے چپکے سے آ ہی گیا۔ پھول کا وہ دل جو سدا انجانی، ان دیکھی اور اجنبی راہوں کو اپنانے سے کتراتا رہا تھا، طوفان کی اس آمد سے اپنا راستہ کھو بیٹھا مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ رات ——— موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج سے دھرتی کا دل ہل رہا تھا۔ امی تسبیح کے دانوں پر اپنی انگلیاں تیزی سے گھما رہی تھیں۔ ان کا گمان تھا کہ یہ طوفان کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہے اور وہ خدا سے دعا کر رہی تھیں کہ یہ طوفان تھم جائے۔ انجم۔ میری چھوٹی بہن امی کے پلنگ پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی اور ڈر سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک میں تھی جو گھر کے اندر چاروں طرف نگہبانی کر رہی تھی اور دروازے اور کھڑکیوں کے پٹ بند کرتی پھر رہی تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے دروازے کے عین پیچھے کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی ہے۔ تجسس اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میں نے دروازہ کھولا۔ بارش کا ایک تیز جھونکا آیا اور میرے سامنے کے پورے کپڑے شرابور کر گیا۔ اسی وقت بجلی چمکی اور میں نے اسے دیکھا۔ ایک خوبرو نوجوان بارش میں لت پت میرے دروازے کے چھجے کے نیچے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ "آیئے اندر آ جایئے۔" اس

بارش میں آپ بُری طرح بھیگ گئے ہیں؟" میں نے دروازہ کھول دیا اور ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔ وہ مکان کے اندر داخل ہوا۔ میں نے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور وہ بارش میں بُری طرح بھیگ چکا تھا۔ اُس کا پُورا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ میں نے اُسے سہارا دیا اور ایک کمرے میں لے جا کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اُس کا جسم بخار کی تیزی سے جل رہا تھا۔ میں بھاگی بھاگی گئی اور ایک تولیہ اور چادر لے آئی اور اُسے کہا کہ وہ اپنے جسم کو تولیے سے خشک کر کے چادر اوڑھ لے ——— "کون ہے پھول کیا بات ہے؟" امّی کی آواز سُنائی دی۔ "کوئی اجنبی ہے امّی! بارش سے بھیگا ہوا اور بخار میں جل رہا ہے۔ میں نے اُسے پناہ دی ہے۔" امّی اور انجم دونوں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔ پھر ہم کمرے میں آئے تو دیکھا وہ کپڑے بدل چکا تھا اور بستر پر نڈھال آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ میں اُس کے سرہانے آئی اور یہ دیکھ کر میرا دل تڑپ اُٹھا کہ وہ بیہوش تھا۔ لحاف اُس کے بدن پر ڈالنے کے بعد میں اُس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ امّی نے انگیٹھی سُلگا دی اور میں اُس کے سر میں تیل ڈالنے لگی۔ اُف! وہ لمحہ میری زندگی میں کبھی نہ آیا تھا! ایک اجنبی نوجوان کے بالوں میں اُنگلیاں پھنسائے میں ایک انجانی مسرت میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ خدمت اور ہمدردی کا جذبہ میرے دل میں نجانے کدھر سے ایک طوفان بن کر پیدا ہوا۔ وہ بیہوش تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور پُورا جسم بخار کی تپش سے جل رہا تھا۔ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ یا اللہ! رات کے اس اندھیرے اور بارش، طوفان کے اس زور میں ڈاکٹر کو کیسے بُلاؤں؟ میں ایک عجیب اُلجھن میں پھنس گئی تھی۔ امّی اور انجم سو گئیں اور ساری رات میں اُس اجنبی کے سرہانے بیٹھی اُس کی حالت کا جائزہ لیتی رہی۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ فضا صاف ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر آیا۔ اُس نے کئی دوائیں دیں اور انجکشن بھی دے گیا لیکن اُس کی بیہوشی دُور نہ ہوئی۔ پُورے چوبیس گھنٹے کی مسلسل بیہوشی کے بعد اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اُس وقت میں اُس کے پاس ایک کُرسی پر بیٹھی ہوئی تھی ——— "میں کہاں ہوں؟ ——— اور آپ کون ہیں؟" اُس کے چہرے پر سراسیمگی اور حیرت طاری تھی ——— "آپ محفوظ جگہ ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب تھی۔ آپ گھبرائیں نہیں، اب ڈر کی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اُسے سمجھانا چاہا ——— "کیا میں اپنی مہربان کا نام جان سکتا ہوں؟" اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی اور میرا دل یوں دھک دھک کرنے لگا جیسے اگر میں نے اُسے اپنا نام بتایا تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑ جائے گا اور اُس وقت مجھے سچ مچ اپنے والدین پر غصّہ آنے لگا۔ آخر اُنھوں نے میرا یہ نام کیوں رکھ دیا؟ پھول ——— ! بھلا یہ بھی کوئی نام ہے اور ایک اجنبی مرد کو جب میں اپنا یہ نام بتاؤں گی تو کیا وہ سچ مچ ہنس نہ دے گا ——— "آپ نے بتایا نہیں۔ شاید بتانا نہیں چاہتی ہیں۔" اُس نے شاید میری اُلجھن کو محسوس کر لیا تھا۔

"نہیں نہیں، ایسی بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ دیکھئے میرا نام کچھ عجیب سا ہے۔ اِس لیے اگر نہ بتاؤں تو کیا آپ بُرا مان جائیں گے؟" "آپ کی مرضی! یہ شاید میری گستاخی تھی۔ اجنبی ہو کر آپ سے نام پُوچھنے کی جرأت کر بیٹھا۔ گستاخی معاف بھی تو کی جا سکتی ہے۔" وہ یکلخت بہت اُداس ہو گیا اور اپنے کپڑے پہننے کے لئے اُٹھنے لگا۔ "مجھے پھول کہتے ہیں۔" آخر میں ضبط نہ کر سکی۔ بھلا میں کسی کو تکلیف کیسے دے سکتی تھی۔ کسی کی ناراضگی مجھے پسند کب تھی؟ یہ تو میری زندگی کا اصول تھا کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤں اور یہ اجنبی مرد تو نشیمن کی چار دیواری میں پُورے چوبیس گھنٹے زندگی اور موت کی کشمکش میں اُلجھا رہا تھا۔ وہ اب بیگانہ تو نہیں رہا تھا۔ اجنبی ضرور تھا اور کہتے ہیں اُنسیت تو ایک ہی لمحہ کی ملاقات میں ہو جاتی ہے۔

"پھول ——— اوہ! تو آپ ہی پھول ہیں۔" اُس کے چہرے پر حیرت اور

- احتیاج اور ضرورت کے سخت اسکول میں دیو ہیکل انسان پیدا ہوتے ہیں۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- جو لوگ منزل کا تعین نہیں کرتے وہ ہمیشہ دشت و بیابان میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- جس قدر میری عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اس بات کا یقین بڑھتا جاتا ہے کہ وہ چیز جو کمزور کو طاقت ور اور ادنیٰ کو اعلیٰ بنا دیتی ہے وہ صرف اٹل ارادہ ہے، جو ایک بار قائم ہو کر فتح حاصل کرتا ہے یا موت! (بورن بسٹن)
- خود فریبی بھی ایک بڑی خطرناک بیماری ہے۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- بعض افراد پستی میں رہنے کے باوجود بلندی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ (فلورنس ہیرلڈ)

استعجاب کی لکیریں اُبھرتی جا رہی تھیں۔ "میں نے تو آپ کے بارے میں سُنا تھا آپ بالکل پتھر ہیں لیکن میں اپنی مہربان مسیحا کو پتھر کیسے کہوں۔ میں نے تو آپ کو اس رُوپ میں دیکھا ہے کہ آپ کی پرستش کرنے کی تمنّا ہونے لگی ہے ——— میں نے اس کالج میں حال ہی میں داخلہ لیا ہے اور ہوسٹل میں آج ہی جگہ ملی ہے۔ ہوسٹل میں آنے کے بعد ہی لڑکوں نے مجھے بتایا کہ پھول سے دامن اُلجھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اُس کا نام پھول ہے لیکن اُس کا دل پتھر کا ہے اور مجھے آپ کو دیکھنے کی سچ مچ خواہش تھی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ آج جب میں گھر سے نکلا تو یوں طوفان کی زد میں آگیا اور پناہ بھی ملی تو پتھر ہی کے نشیمن میں ——— "

"آپ نے جو کچھ سُنا ہے وہ سچ ہے۔ آپ اطمینان رکھئے اُن کے اِس الزام کی میں تردید نہ کروں گی۔ آپ مجھے انسان ہی سمجھ لیں تو آپ کی عنایت۔ ویسے کیا میں اپنے

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپے پچاس پیسے
[illegible]	〃	چار روپے
[illegible]	〃	تین روپے
[illegible]	〃	دو روپے پچھتر پیسے
[illegible]	〃	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
[illegible]	〃	تین روپے پچاس پیسے
[illegible]	〃	دو روپے پچاس پیسے
[illegible]	〃	تین روپے پچیس پیسے
[illegible]	〃	پانچ روپے
[illegible]	〃	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	〃	گیارہ روپے
[illegible]	〃	تین روپے
خاک پروانہ	〃	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	〃	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	〃	ایک روپیہ پچاس پیسے
سیدہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سیہ پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	〃	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	〃	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا آنگن	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کوثر چاندپوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	〃	دس روپے پچھتر پیسے
شکیلہ	مسعود جاوداں	چار روپے پچیس پیسے

شکست الفت	[illegible]	ایک روپیہ پچھتر پیسے
آرزو کی کلیاں	〃	ایک روپیہ پچھتر پیسے
پہلی محبت	〃	ایک روپیہ پچھتر پیسے
خواب گاہیں	〃	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	〃	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سیدہ [illegible]	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	〃	تین روپے
اکبری دروازہ	〃	چار روپے
دوشیزۂ روم	〃	تین روپے
دیوانہ	〃	تین روپے
دو دیوانے	〃	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	〃	تین روپے
گناہ	رت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	〃	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	〃	تین روپے پچھتر پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	〃	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	〃	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	〃	پانچ روپے
ریحانہ	〃	سات روپے

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	تین روپے
موٹر مکینک گائڈ	[illegible]	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا [illegible]	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	[illegible]	تین روپے
[illegible] (بچوں کیلئے)	[illegible]	پچاس پیسے
[illegible]	〃 ہندی	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہر انور	دو روپے
[illegible]	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
[illegible]	مصطفیٰ حسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھ نہ	ستیہ پال [illegible]	دو روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچھتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	[illegible]	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ [illegible]	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چاند	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- [illegible] دریا گنج [illegible] پوسٹ بکس [illegible]

ہوں۔ سخت تکلیف ہو رہی ہوں؟"

"میں عارف ہوں اور ایم اے کے پہلے سال میں داخل ہوا ہوں ـــــ اچھا خدا حافظ! معاف کیجئے گا میں نے شکریہ کے الفاظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کئے کیا دو آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچے ـــــ" اور وہ دھیرے دھیرے میرے گھر سے نکل گیا۔ میں خاموش بیٹھی تھی۔ خیالات اور سوچ کی بے شمار الجھنوں میں الجھی ہوئی۔ جیسے آج میرا وجود بہت ہلکا ہو گیا ہو۔ یہ انوکھی دل کی دھڑکنیں، یہ انجانی راہیں اور یہ انجانے کا دل اپنا کیوں ہے۔ یہ ایک طوفان میں کھو گئی ہوں۔ یہ زندگی آج اس قدر دشوار کیوں معلوم ہونے لگی ہے، یہ مجھے جسم میں ایک عجیب سی سرسراہٹ کیسی پیدا ہو رہی ہے۔ آخر اپنی ہی سانسوں کے بار بار آج مجھے اپنی ہی آنکھیں کیوں معلوم ہونے لگی ہیں اور یہ آنکھیں آج بار بار اشکبار کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟ میرے معبود! کیا میری زندگی بھی ایک مسلسل امتحان بنتی جا رہی ہے؟

عارف سے میری ملاقات بڑھتی رہی۔ کبھی لائبریری میں، کبھی کالج کینٹین میں اور کبھی گنگا کے ساحل پر ـــــ رات رات گئے میں واپس آتی۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا کہ میں زندگی کی کس انجانی ڈگر پر بڑھتی جا رہی ہوں۔ یہ اجنبی راہیں مجھے اس طرح آگے لئے جا رہی تھیں کہ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ عارف کے ساتھ رہ کر میں کیسی طمانیت، کیسا سکون اور کیسا وجد محسوس کرتی تھی اور جب وہ مجھ سے جُدا ہو جاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں سب کچھ کھو چکی ہوں۔ دل و دماغ، اپنی زندگی، اپنا سکون اور اپنا قرار۔ جیسے میرا پُورا وجود ہی داؤ پر لگ گیا ہو لیکن یہ ملاقاتیں، یگانگت، قُربت کی یہ شدت اور یہ نزدیکیاں ابھی تک بے معنی تھیں۔ میں نے اِن کا کوئی عنوان ہی نہ سوچا تھا اور نہ عارف اب تک دل کی باتیں زبان پر لایا تھا۔ کتابِ دل کا ایک ورق بھی نہ میں نے عارف کو سُنایا تھا اور نہ عارف نے مجھے۔ ملاقاتیں صرف رسمی اور اِدھر اُدھر کی باتوں پر ختم ہو جاتی تھیں۔ محبت کا نام، جنم جنم بھر ساتھ رہنے کا عہد، نہ اب تک میرے ہونٹوں پر آیا تھا اور نہ عارف کی زبان پر۔ پھر آخر یہ سب کچھ کیا تھا؟ عارف کے لئے اتنی بے قراری اور اتنی تڑپ کیوں؟ کیا یہ محبت نہیں تھی ـــــ؟ دھک۔ دھک۔ دھک۔!! اور بس اِس کے علاوہ دل کا کوئی جواب نہ تھا۔

وقت کے اِس عظیم انقلاب نے ابھی قدم بھی نہیں جمایا تھا کہ میری زندگی ایک انتہائی سنگین انقلاب کی لپیٹ میں آگئی۔ ایک رات جب میں دیر سے گھر لوٹی تو امی کی حالت اچھی نہ تھی۔ وہ بستر پر بے سدھ پڑی تھیں اور انجم اُن کے پاس ہی بیٹھی ہوئی چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ میرے تو سارے اوسان خطا ہو گئے۔ یا اللہ! رحم ـــــ! اور میں بدحواس ہو کر امی سے لپٹ گئی ـــــ "آپی! آپ نے آج اتنی دیر کیوں کر دی؟ امی کتنی بار آپ کے بارے میں دریافت کر چکی ہیں ـــــ" میں اِس معصوم کلی کی کُریدتا کا جواب کیا دیتی۔ میں تو ان دنوں ایک ایسے دھارے پر بہی جا رہی تھی کہ خود اپنے تن کا ہوش نہ رہا تھا۔ گھر سے بے پروائی تو لازمی تھی اور آج پہلی بار مجھے خود سے نفرت ہونے لگی۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے۔

"امی! خدا کے لئے آنکھیں کھولئے" میں اُن کے بخار سے جلتے ہوئے جسم پر جھک گئی اور پھر انھوں نے آنکھیں کھول دیں جیسے وہ میرا انتظار ہی کر رہی تھیں۔

"تم آگئیں پھول ـــــ!" انھوں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے میرا چہرہ ڈھانپ لیا۔ اُن ہاتھوں کے جانے پہچانے لمس اور اُن کی بے پایاں شفقت سے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــــ "بیٹی! مجھے تمہارے کردار اور تمہاری پسند دونوں پر بھروسہ ہے۔ کاش میں تمہاری پسند کو تمہاری مانگ کا سیندور بنتے بھی دیکھ لیتی لیکن میرے پاس اب اِتنا وقت ہی نہیں ہے۔ تم یہ نہ بھولو کہ تم ایک بہادر ماں کی بیٹی ہو جس نے تمہیں حالات اور وقت کے تپتے ہوئے ریگستانوں سے نکال کر آج اِس منزل پر لا کھڑا کیا ہے۔ تمہارے ابّی کے گزر جانے کے بعد میری زندگی بھی نت نئی دشواریوں میں اُلجھتی رہی لیکن میں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی اور آج تم میرے عزم و ارادہ اور میری جدوجہد کا ایک ایسا انعام ہو جس پر میں بجا طور پر فخر کر سکتی ہوں۔ آج میں تم سے رخصت ہو رہی ہوں۔ نشیمن کے در و دیوار پر آج تک کسی نے آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ اِس وقار کو اپنے کردار کے انمول موتی کے ساتھ برقرار رکھنا۔ انجم اب تمہاری چھوٹی بہن ہی نہیں ہے، آج سے تم اُس کی ماں بھی ہو۔

احساسِ ذمّہ داری اور فرض کی تکمیل میں تمہارے قدموں میں کبھی لغزش نہ آنے پائے ——— اچھا خدا حافظ!" اور امّی نے ایک بار ڈوبتی اُبھرتی نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھا اور پھر نشیمن کی یہ روح خاموشی سے کہیں دُور پرواز کر گئی۔ اندھیرے، سنّاٹے، چیخیں، آنسو اور آہیں ———!!!

اور امّی کا غم بھی مجھے بھولنا پڑا اِس لئے کہ انجم کی آنکھیں ہمیشہ بھیگی رہتی تھیں ——— "دیدی! آپ جب کالج چلی جاتی ہیں تو تنہائی میں میرا دل نہیں لگتا ہے۔" تب میں نے انجم کا نام بھی ایک اسکول میں لکھوا دیا۔ اُسے صبح سویرے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی، کپڑے بدلواتی، اُس کے بال باندھتی اور اُسے اپنے ساتھ لے کر گھر سے نکلتی۔ اُسے اسکول میں چھوڑ کر کالج چلی جاتی۔ کالج سے لوٹتے وقت اُسے اپنے ساتھ لے کر لوٹتی۔ اب میری زندگی کا صرف ایک مقصد رہ گیا تھا۔ انجم کی تعلیم اور اُس کی نگہداشت! میں نے اپنے دل کے سارے دروازے بند کر لئے۔ اپنے کانوں میں اُنگلیاں ڈال لیں۔ عارف آتا۔ وہ چاہتا میں اُس کے ساتھ باہر نکلوں، بوٹنگ کے لئے چلوں، گھومنے جاؤں لیکن میں انکار کر دیتی۔ گھر کے کاموں کی دیکھ بھال اور پھر انجم کا فرض۔ میرے پاس اپنی نجی زندگی کی مسرّتوں کے لئے وقت ہی کہاں تھا۔ عارف چُپ چاپ بیٹھا رہتا ——— "کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم واقعی ایک پتھر ہو؟" کبھی کبھی اُس کی قوّتِ ضبط جواب دے دیتی اور جیسے میرے دل پر چھُریاں چلنے لگتیں۔ ایک انجانی کسک، ایک درد اور ایک ٹیس سے میرا سارا وجود کانپ جاتا ——— "آپ یہ نہ بھولئے کہ جب آپ کالج میں داخل ہوئے تھے تو لڑکوں نے میرے بارے میں آپ کو کیا بتایا تھا۔" میرا سیدھا سادہ جواب ہوتا۔ "لیکن پھر یہ سب کچھ کیا تھا۔ ملاقات کی وہ طوفانی رات، تمہاری وہ خدمت۔ اور پھر اُس کے بعد تمہاری اتنی قربت! کیا یہ سب کچھ محض خواب تھا؟ کیا میں اُن جیتے جاگتے واقعات کو خواب سے زیادہ اہمیت نہ دوں ———؟ بعض خواب زندگی سے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ اُنہی کے سہارے انسان پُوری زندگی گزار دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پھر اُن کی حقیقتوں کا انتظار کون کرے اور اِس کی ضرورت بھی کیا رہ جاتی ہے۔ زندگی کے فیصلے یوں بدلا نہیں کرتے ——— "آئیے چائے پیجئے۔" میں عارف کو بہلانے کی کوشش کرتی ——— ایک دن وہ بہت موڈ میں تھا۔ کہنے لگا ——— "پھول! آج تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ آج شہر میں بزمِ اُردو کا جلسہ ہے۔ جس میں بڑے بڑے ادیب آ رہے ہیں۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"میں نہیں جا سکتی عارف! کل سے انجم کا سالانہ امتحان شروع ہو رہا ہے۔ آج مجھے اُس کی تیاری دیکھنی ہے ———"

"اُف! ہر وقت انجم ——— انجم ——— انجم ——— تم سچ مچ پتھر ہو پھول! بالکل پتھر! میں خواہ مخواہ ایک پتھر سے سر ٹکرانے لگا ہوں ———" اور وہ غصّہ میں چلا گیا، میں چُپ تھی۔ دل کی آواز کو دبانے کی کوشش میں ناکام ہو رہی تھی۔ یہ آنکھیں تو ایسی باتوں پر یونہی برس پڑتی ہیں اِن پر کسی کا کیا زور ——— "آپ چلی جائیے آپی! عارف بھائی ناراض ہو گئے۔ جب تک آپ نہیں جائیے گا میں کتابیں لئے آپ کا انتظار کرتی رہوں گی ———" انجم کہہ رہی تھی ——— "نہیں انجم! چلو کتابیں نکالو ———!!"

پھر عارف نے میرے گھر آنا چھوڑ دیا۔ کالج میں کہیں ملتا تو کترا جاتا۔ اُسے مجھ سے نفرت ہو گئی لیکن اُس نے مجھ سے محبت ہی کب کی تھی۔ اُس نے تو آج تک اِس بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ پھر میں اُسے یہ الزام کیسے دوں؟ اُس نے مجھے ہمیشہ پتھر ہی سمجھا ——— ایک دن میں نے سوچا عارف سے سب کچھ کہہ دوں۔ اپنی ذمّہ داری اور اپنے فرض کو اُس کے آگے رکھوں اور اُس سے صاف صاف کہہ دوں کہ زندگی کے اِس رُخ کے لئے اور نشیمن کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے مجھے سہارے کی اُس کی ضرورت ہے۔ کیا وہ اِس پتھر کو قبول کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرے گا ———

اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں آج اُس سے کالج میں ملوں گی اور اُسے سدا کے لئے اپنی زندگی اور نشیمن کا محافظ بننے کی دعوت دوں گی ——— لیکن وہ خود مجھ سے پہلے ہی مل گیا ——— "میں آپ ہی کو تلاش کر رہا تھا ———"

"دھک۔ دھک۔ دھک!!" اِس کمبخت دل کو اِس کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں۔ میں زندگی کا اِتنا بڑا فیصلہ اِتنا اچانک کر کے آئی تھی اور جب منزل سامنے ہے تو دل کی یہ دھڑکن مجھے پریشان کرنے پر تُلی ہوئی ہے ——— "کچھ آپ کہئے یا پھر مجھے کہنے کی اجازت دیجئے ———" یہ خاموشی مجھے گراں معلوم ہونے لگی تھی ——— "میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا اِس لئے کہ انجم کے لئے آپ کو جلدی ہوگی ———"

"انجم میرا فرض ہے، عارف! اُس کا طعنہ نہ دیجئے۔ احساسِ فرض سے پُجاری کی پُوجا میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا اور نہ اُس کی عبادت میں کوئی کمی آتی ہے ——— میں اپنے فیصلے کے تحت آج کچھ کھُل کر بات کرنا چاہتی تھی ——— "خوش نصیب ہے وہ جس کے آستاں پر آپ جیسی پُجارن کا سر جھُکے۔ میں نے بھی ایک خواب دیکھا تھا جو پتھر سے ٹکرا کر چُور چُور ہو گیا ——— یہ ہے میری شادی کا کارڈ۔ اگلے ماہ کی یکم کو میری شادی ہو رہی ہے۔ آپ سے شرکت کی استدعا ہے ——— چھن چھن۔ چھناک ———! میرے خوابوں کی یہ تعبیر آج میرا انتظار کر رہی تھی۔ زندگی کے اِس ایک لمحہ کے تصوّر میں میں نے ارمانوں اور تمنّاؤں کے کتنے چراغ جلائے تھے اور یہی ایک لمحہ میری زندگی کو خزاں سے ہمکنار کر گیا۔

"شکریہ ———!" اور میں سیدھی گھر چلی آئی۔ پتھر کا دل پھٹ گیا۔ پتھر کے ہونٹ چیخ اُٹھے اور نکہت، میری زندگی کا واحد راز دار! آنسوؤں کے تار اپنے اندر جذب کرتا رہا ———!!

پھر میں نے کالج چھوڑ دیا اور لڑکیوں کے ایک اسکول میں ملازمت کرلی۔ آخر نشیمن کی زندگی بچانے کے لئے اور انجم کے لئے، مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ زندگی کی اِس سنگلاخ وادی میں محض خوابوں کے سہارے فرض اور ذمہ داری کے تانے بانے تو نہیں سلجھائے جا سکتے ہیں نا ـــــ انجم بڑی ہوتی گئی۔ اُس کی زندگی کو سنوارنے میں میں نے اپنی زندگی کا ہر سانس، اپنی زندگی کی ہر دھڑکن ایک ایک کرکے صرف کردی۔ سال پر سال بیتتے گئے۔ انجم کہتی "آپی! آخر آپ نے اپنے لئے کیا سوچا ہے؟ آپی! آپ اتنی اُداس کیوں رہتی ہیں؟ آپ کے چہرے پر یہ تھکی کہاں سے آگئی؟ آپ کی مسکراہٹ کیا ہوئی؟ یہ تیاگ نہیں، سراسر ظلم ہے۔ آپی! خدا کے لئے اپنے لئے کچھ سوچئے، کچھ کیجئے ـــــ" پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور میں اُسے اپنے گلے سے لگا لیتی ـــــ "تمہاری آپی بالکل ٹھیک ہے انجم ـــــ"

اِس طرح دس سال گزر گئے زندگی کے دس قیمتی سال اور ایک دن اچانک عارف میرے یہاں آئے اور میں اُنھیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شادی کی اِتنی طویل مدت کے بعد اُنھیں آج میری یاد کیسے آگئی۔ میں نے اُنھیں دیکھا وہ بہت تندرست نظر آ رہے تھے اور میرا دل ایک بار پھر دھڑکنے لگا۔ "ارے پھول! یہ تم ہو؟" ـــــ "پتھر کہئے ـــــ" "کیا واقعی تم وہی پھول ہو؟ کسی طرح پہچانی نہیں جاتی ہو" ـــــ "میں تو آپ کو پہچانتی ہوں اور یہ دس سال تو کیا اگر میری دوسری زندگی میں بھی آپ یوں یک بیک آ جاتیں تو میری نظریں دھوکا نہ کھائیں گی ـــــ" میں نے دیکھا وہ افسردہ ہو گئے ـــــ "تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" ـــــ "شادی ـــــ وہ تو آج سے دس سال پہلے ہو چکی"

"نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ ہے! تم جھوٹ بول رہی ہو" ـــــ "میری شادی ہو چکی ہے عارف! آپ جانتے ہیں نا کہ میں جنم جنم سے پاگل ہوں۔ ایک پاگل لڑکی کی شادی یوں ہی ہوا کرتی ہے۔ بس یہی نہیں ہوا نا کہ نشیمن کے آنگن میں کوئی منڈوہ نہیں ٹنگا، کوئی ڈھول نہیں بجا، کوئی گیت نہیں گایا گیا، کوئی برات نہیں آئی اور کوئی دولھن ہاتھوں میں مہندی رچائے سہاگ کا جوڑا پہن کر اِس گھر سے رخصت نہیں ہوئی ـــــ تو اِن سب سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو آج بھی سہاگن ہوں اور ماضی کی یادیں اور اُن سے وابستہ دن میرا سہاگ ہیں ـــــ" میں نے دیکھا عارف کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں چونک اُٹھی ـــــ "آپ کی آنکھوں میں آنسو ـــــ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ میں تو یہی سوچ رہی تھی کہ آنسو پتھر ہی بہا سکتے ہیں۔ آپ کا کومل دل آنسوؤں کے اِس بوجھ کو برداشت نہ کر سکے گا۔ خشک کر لیجئے اِن آنسوؤں کو۔ ایسا نہ ہو آپ کی وفا کے دامن پر اِن کا کوئی داغ کہیں لگا رہ جائے ـــــ"

"مجھے افسوس ہے پھول! میں نے تمھیں سمجھنے میں غلطی کی۔ کاش میں لوگوں کے بہکاوے میں آکر تمھیں ایک پتھر ہی نہ سمجھتا رہتا، تمھاری مجبوریوں اور ذمہ داریوں کو سمجھتا اور اُنھیں بانٹنے کی کوشش بھی کرتا ـــــ تم سچ مچ عظیم ہو پھول! بہت بلند ـــــ!! اب میں جاتا ہوں، شاید پھر کبھی آؤں" ـــــ "ممکن ہے اب جب آپ آئیں تو مجھے اِس روپ میں نہ پائیں۔ اِس لئے کہ اب میں بہت تھک گئی ہوں اور سو جانا چاہتی ہوں۔ ایسی نیند جس سے کبھی نہ جاگوں۔ نشیمن کے اِسی احاطے میں میری قبر ہوگی اُس وقت دل چاہے تو اُس پر چند پھول ڈال دیجئے گا ـــــ" اور پھر عارف چلے گئے۔

زندگی کے تین سال اور گزر گئے ـــــ نشیمن کا وقار نہایت آن بان سے قائم تھا۔ انجم کی تعلیم مکمل ہو گئی اور اُس کی شادی بھی میں نے طے کر دی۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے اُس کے لئے ایک اچھا شریکِ زندگی ڈھونڈا ہے۔ میں نے اُسے اپنا سارا زیور دے دیا، اپنی زندگی کی ہر خوشی اُس کے حوالے کر دی اور اپنے خونِ جگر سے سینچی ہوئی اُس کلی کو آج میں نے ایک اجنبی کے سپرد کر دیا۔ ابھی ابھی میری انجم بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی، اجنبی راہوں پر، ایک اجنبی مسافر کے ساتھ! جنم جنم تک ساتھ رہنے کے لئے ـــــ!!

اب میں ہوں اور نشیمن کی یہ چہار دیواریاں ہیں۔ آئینہ میرے سامنے ہے اور اِس میں میرے چہرے کی جھرّیاں اور بالوں کی سفیدی جھلک رہی ہے ـــــ یادوں کے اِس کھنڈر میں میں تنہا ایک تصویر کو ہاتھ میں لئے سوچ رہی ہوں۔ پتھر کے پجاری انتظار نہیں کر سکتے۔ انتظار اور پوجا تو پتھر کی تقدیر بن گئی ہے اور میں دھیرے سے اُس تصویر پر اپنے ہونٹ رکھ دیتی ہوں ـــــ!!

غزلیں

آخگر مشتاق رحیم آبادی

تیری بھی زباں پر ہیں الزام، کہاں جائیں
اب تو ہی بتا ہم سے بدنام کہاں جائیں

اللہ رے ویرانی اِس رہگذر غم کی !
اے صبح کدھر نکلیں، اے شام کہاں جائیں

اب نامہ و قاصد کی پرواہی نہیں اُن کو
اب درد کے ماروں کے پیغام کہاں جائیں

اب رات گئے اُٹھ کر کس در پہ صدا دیں ہم
لے ساز اُٹھا مُطرب، لا جام، کہاں جائیں

آغاز نے تو بے شک آنکھوں میں جگہ پائی
سرکار مگر اب یہ انجام کہاں جائیں

ساقی مے و ساغر کی تہمت تو مٹا دیں ہم
لیکن تری نظروں کے الزام کہاں جائیں

آخگر تری توبہ تو تسلیم ہمیں، لیکن
یہ ساز کہاں جائیں، یہ جام کہاں جائیں

آیاز جھانسوی

مجھے تم سے کوئی شکوا نہیں ہے
جو چاہا جائے وہ ہوتا نہیں ہے

پشیماں ہوں تری محفل سے اُٹھ کر
کسی نے بھی مجھے روکا نہیں ہے

کہو اب غمگساروں سے کہوں کیا
کئی دن سے تُمھیں دیکھا نہیں ہے

بہت بیتاب ہیں آنکھوں میں آنسُو
کوئی اپنا نظر آتا نہیں ہے

نگاہیں دوستوں کی جھک گئی ہیں
مجھے غیروں نے ٹھکرایا نہیں ہے

جدھر دیکھو مری رُسوائیاں ہیں
تعجب ہے ترا چرچا نہیں ہے

تم آخر کیوں پریشاں ہو رہے ہو
آیاز اپنوں سے بیگانا نہیں ہے

پرکاش ناتھ پرویز ایم اے

یاد آیا ہے سایۂ زُلف
جب بھی چلی ہے غم کی لُو

غیر کی شرکت کیا معنی
میرے دل میں صرف ہے تُو

گلشنِ دل میں رقصاں ہے
تیرے تصور کی خوشبُو

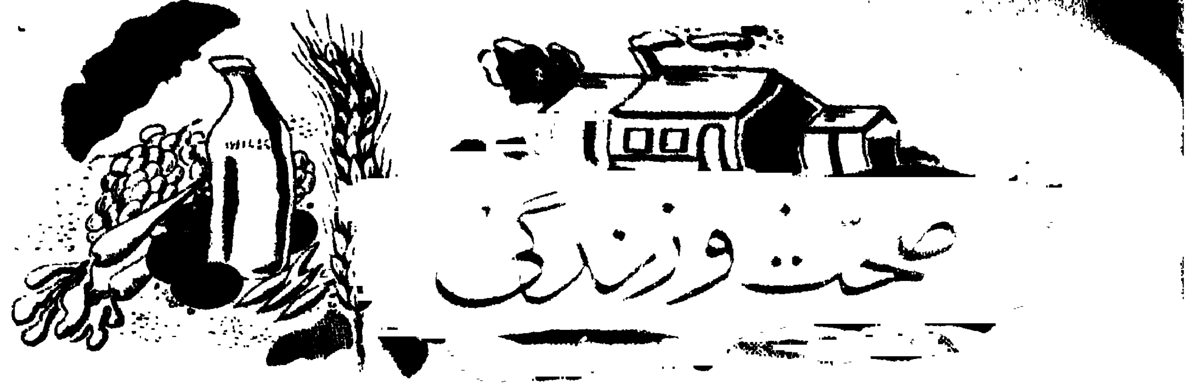
جب سے توبہ کی ہم نے
چُپ چُپ سے ہیں جام و سبُو

چھایا ہوا ہے عالم بھر
تیری نگاہوں کا جادُو

میری فطرت عجز و نیاز
ناز و تکبر تیری خُو

شیخ نے دھوکے سے پرویز
مَے کو سمجھا آبِ وضو


ماں کی مامتا
کسوٹی ہے...



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱ ● ٹنڈا ـــــ ایک صحت بخش ترکاری

ٹنڈا موسم گرما کی ایک مرغوب اور مفید سبزی ہے۔ اس کا مزاج سرد تر ہے۔ یہ غذائی اجزاء سے بھرپور ہے۔ ٹنڈا بدن کی گرمی اور خشکی کو دور کرتا ہے۔ دل و دماغ اور جسم کو سکون بخشتا ہے۔ یہ قبض کشا، زود ہضم اور مصفیٔ خون ہے۔

ٹنڈا خشک کھانسی، پیشاب کی کمی، پیشاب کی جلن، گرمی کے بخار میں مفید ہے ـــــ یہ جسم سے تیزابی مادّہ اور دوسرے فاسد اجزاء کو خارج کرتا ہے۔ یہ ہائی بلڈ پریشر کے مریضوں کے لئے بہترین غذا ہے۔

ٹنڈا نزلہ، زکام، کھانسی کی حالت میں نقصان دہ ہے۔

ٹنڈا دماغی کام کرنے والوں کے لئے قدرت کا ارزاں ترین عطیہ ہے۔ یہ دماغ کے لئے خصوصیت سے مفید ہے۔

اسے قدرت نے غذائی اجزاء سے بھی نوازا ہے۔ اس میں پروٹین، چکنائی، نشاستہ اور شکر کے اجزاء (کاربوہائیڈریٹس) موجود ہیں۔ چونا، فاسفورس اور فولاد بھی ہے۔ ان کے علاوہ وٹامن اے، سی اور کے بھی ہیں۔

اطباء کی رائے میں ٹنڈا دل کے لئے مخصوص غذا ہے۔ خفقان، اختلاج اور دل کے دوسرے عارضوں کے مریضوں کو ٹنڈے کثرت سے کھانے چاہئیں۔

۲ ● خندہ جبیں رہو!

ایک مفکر نے لکھا ہے ـــــ اگر اپنی زندگی کا دامن کامیابی و کامرانی کے پھولوں سے بھرنا چاہتے ہو تو ہر حالت میں خندہ جبیں رہو۔ زندگی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کرو ـــــ ڈاکٹر ماردن۔

لکھا ہے ـــــ کامیابی کے امیدوار کو ہر حالت میں مسکراتے رہنا چاہئے۔ اس طرح نہ صرف لوگ ہی تمھاری طرف کھنچے چلے آئیں گے، کامیابی بھی کھنچی چلی آئے گی۔ ایسے خوش دل، خوش باش شخص کی خوش نصیبی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جس کی طرف ہر کوئی کھنچا چلا آئے۔ کوئی بھی اس سے نفرت نہ کرے۔ ہر شخص خندہ رو خندہ جبیں لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ ہر کوئی ایسے آدمی کو جاننے کا، اس سے ملنے کا آرزو مند ہوتا ہے۔ ان کے لئے بغیر کسی کوشش اور سعی کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں، جنھیں وا کرنے کے لئے زود رنج لوگوں کو بہت دشواری کا سامنا ہوتا ہے بلکہ ان کے کھولے تو وہ کھلتے ہی نہیں۔ قدرت بھی خندہ جبیں لوگوں کو بہت سی چیزیں خود بخود عطا کر دیتی ہے۔ وہ انسان جو ہر حالت میں خندہ جبیں رہتا ہے، راضی برضا رہتا ہے، وہ اس آدمی کی مانند ہے جو اپنا منہ سورج کی طرف رکھتا ہے۔ اس حالت میں رنج والم کے سائے اس کی پشت کے پیچھے رہتے ہیں۔

۳ ● نیند آپ کے لئے ضروری ہے

سونا انسان کا ایک فطری مطالبہ ہے، جس سے بے نیاز نہیں ہوا جا سکتا۔ کوئی شخص زیادہ سے زیادہ ۹۰ گھنٹے جاگ سکتا ہے۔ نیند ان چند چیزوں میں سے ایک ہے، جن کا بدل علم و سائنس کی ترقی ابھی تک پیش نہیں کر سکی ہے۔ نیند انسان کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی غذا، بلکہ غذا سے نیند کے مقابلہ میں زیادہ دیر تک انسان بے نیاز رہ سکتا ہے۔ [illegible]

عام طور [illegible] گ بیٹے کے عادی ہو گئے ہیں، جیسے ان کی عمر پانچ سو سال ہو گی [illegible] کہ انھیں بالکل احساس ہی نہیں ہوتا۔ [illegible]

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی آخر ایک [illegible]

پہلے کا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تندرست آدمی کے لئے رات کے ۷ گھنٹے سونے کے لئے کافی ہوتے ہیں جبکہ ایک دُبلا پتلا کمزور آدمی ۹ گھنٹے سوتا ہے۔

نیند کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذہن اور جسم کو ایک ساتھ سکون پہنچاتی ہے۔ خون کا دباؤ کم ہوتا ہے اور خون جو عام طور سے دماغ کو پہنچتا ہے دل کو پہنچنے لگتا ہے۔ جسم میں استرخاء پیدا ہوتا ہے۔ خون کا دوران جاری رہتا ہے اسی کے ساتھ سانس لینے اور ہضم کرنے کا کام آہستہ آہستہ چلتا رہتا ہے۔

جسم کے تین سو سے زیادہ حصے نیند کی حالت میں سُست پڑ جاتے ہیں۔ جسم کی گرمی میں کافی کمی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ صبح کے پانچ چھ بجے کے قریب جسم کی حرارت دو درجہ تک کم ہو جاتی ہے۔

۴ ● اگر آپ طویل عمر حاصل کرنا چاہتے ہیں

اگر آپ طویل عمر کے خواہاں ہیں، اگر آپ طویل عمر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو دانشوروں کے ان زرّیں مشوروں پر عمل کیجیے۔ رہگزارِ حیات پر چلتے ہوئے انہیں مشعلِ راہ بنائیے۔

اپنے دل کو غم و غصہ سے دُور رکھیے۔ سب سے پہلے اپنے غصّے کو زیر کرنے کی کوشش کیجیے۔ جو آدمی ہر وقت غصّے کی لہروں میں بہتا رہتا ہے اُس کے ہاتھوں سے اعتدال کا دامن چھُوٹ جاتا ہے، اس وجہ سے اُس کی طبیعت کو چین اور آسودگی نصیب نہیں ہو سکتی، جو عمر کی درازی کے لئے شرطِ اول ہے۔ غصہ سے معنوی قوتیں ضائع اور زائل ہوتی ہیں۔ اس لئے غصہ کرنے والے کے جلد ہلاک ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

زندگی کو صرف عیش و عشرت کا سامان نہ سمجھنا چاہیے۔ زندگی کا مقصد بہت اہم، بہت عظیم ہے۔ ہماری زندگی اور صحت کا مقصد و منشا بہت بلند اور اعلیٰ قوت کے ماتحت ہے۔ اس لئے ہمیں اس یقین، اس عقیدہ سے دُور نہ جانا چاہیے، جسے متقدمین خدا پر بھروسہ کرنے سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں۔ اس یقین، اس عقیدے سے ہمیں زندگی کی اُلجھی ہوئی دشوار گزار منزلوں میں راستہ تلاش کرنا آسان ہو جائے گا اور وہ ساری آفتیں، وہ ساری مشکلات ایک طرف ہو جائیں گی، جو ہمارے اطمینانِ قلب میں خلل انداز ہوتی ہیں۔

جب تک زندہ رہیے، سوچ سمجھ کر زندگی گزاریے۔ ہر دن کو اس طرح [illegible] جیسے وہ آپ کی زندگی کا آخری دن ہے۔ وہ لوگ بہت بدنصیب ہیں [illegible]

انسان طویل عمر کو نہیں پہنچ سکتا۔ مرغن، دیر ہضم اور ثقیل غذا وقت سے ہمیشہ پرہیز کیجیے۔

جس انسان کی نبض ایک منٹ میں سو بار چلتی ہے، اس کی زندگی اس شخص کی بہ نسبت جلد ختم ہو جائے گی، جس کی نبض ایک منٹ میں صرف پچاس حرکت کرتی ہے۔ جن لوگوں کی نبض تیز ہو، جن پر ذرا سی پریشانی سے ہول سوار ہو جاتا ہو اور دل دھڑکنے لگتا ہو، وہ درازیٔ عمر کے خوش نصیب اُمیدوار نہیں ہوتے۔

۵ ● سونف ـــــ جتنی ارزاں اُتنی ہی گرانقدر

سونف بہت ہی سستی چیز ہے لیکن گوناگوں فوائد کی حامل ہے۔ نظر اور دماغ کی کمزوری دُور کرتی ہے۔ دست، دمہ، قبض، کھانسی کے لئے بے حد مفید ہے۔ پیچش کے عارضہ میں اکسیر ہے۔ سینے، جگر، تلی، گردے اور مثانے کے دَرد کو کم کرتی ہے۔ اپھارے اور پُرانے بخاروں میں مفید ہے۔ کف کو خارج کرتی، ریاح کو مٹاتی اور پیٹ کے درد کو دُور کرتی ہے۔

سونف کو نرم نرم چھلکے سے کوٹ لیں۔ جب چھلکا اُتر جائے تو کسی برتن میں رکھ لیں۔ نو ماشہ روزانہ صبح نیم گرم دودھ کے ساتھ کھائیں۔ بینائی کی تقویت کے لئے نہایت مفید ہے۔

سونف کو کوٹ کر چھلکا اُتار لیں اور اُسی کے برابر کھانڈ ملا لیں۔ رات کو ۹ ماشہ سے ایک تولہ کی مقدار میں پانی یا دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ یہ آسان اور ارزاں نسخہ بے حد مقویٔ دماغ ہے۔ یہ نسخہ بینائی کی کمزوری کے لئے بھی اکسیر ہے۔ اس سے قبض دُور ہو کر معدہ کو بھی تقویت ملتی ہے۔

پیچش کے لئے بھی سونف اکسیر ہے۔ سونف کا مغز ۵ تولہ، بیل گری ۵ تولہ، مصری ۱۰ تولہ۔ ان چیزوں کو باریک کر کے سفوف بنا لیں اور صبح شام تازہ پانی کے ساتھ ۶ ماشہ روزانہ استعمال کریں۔ ہر طرح کی پیچش خصوصاً خونی پیچش کے لئے اکسیر ہے۔

۶ ● منزل آپ کی منتظر ہے!

ایک مفکر نے لکھا ہے ـــــ

کتنی ہی ایسے ہوتے ہیں [illegible] رہتے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں [illegible] انہیں اپنا مستقبل [illegible] قدم کہ ایک دن [illegible]

تکرے ان کی صلاحیتوں کے دروازے کھُل جاتے ہیں، جن کی موجودگی کی توقع انھیں خواب میں بھی نہ تھی۔

ہم دوسروں کی مدد سے، دوسروں کے سہارے اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ اپنی راہ میں حائل ہونے والی مشکلات کا خود مقابلہ کرتے ہوئے، مشکلات پر فتح پاتے ہوئے جو ہمت اور قابلیت ہم کام میں لاتے ہیں وہی صحیح معنوں میں ہماری شخصیت کی تکمیل ہے۔ پھر بھی حیرت ہے کہ لوگ دوسروں کی مدد کے متوقع رہتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ یہی شکایت رہتی ہے کہ انھیں کامیابی کی راہ میں مدد دینے والا کوئی نہیں ملا۔ کاش! وہ جان لیتے کہ اپنے سچے مددگار تو وہ خود ہی ہیں۔ ان کی سچی معاون ان کی اپنی قابلیت و صلاحیت ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔

جو لوگ اپنی زندگی کو قابلِ رشک بنانا چاہتے ہیں وہ زندگی کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں سے کبھی نہیں رکتے۔ ان کے قدم ہمیشہ ترقی کی راہ پر بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ ان کی منزل ہمیشہ آگے ــــــ اور آگے ہی ہوتی ہے۔ وہ راستے میں اگر رکتے ہیں تو صرف تھوڑی دیر کے لئے۔ صرف بیکار بوجھ کو اتارنے کے لئے، رکاوٹوں کو ہٹانے کے لئے۔ پھر وہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے وہ اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

اگر آپ ایسے ہی لوگوں میں ہیں تو آپ کی منزل آپ کی منتظر ہے!

۷ • پانی

قیامِ صحت اور بقائے حیات کے لئے ہوا کے بعد پانی سب سے ضروری چیز ہے۔ چوبیس گھنٹے میں ہمیں ساٹھ ستر اونس پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں وہ پانی شامل نہیں ہے جو ترکاریوں، پھلوں اور غذا میں شامل ہوتا ہے۔ پانی جلد کے ذریعہ ۲۸ فی صد، پھیپھڑوں کے ذریعہ ۲۰ فیصد، گردوں کے ذریعہ ۵۰ فیصد اور باقی ۲ فیصد ترشح کے ذریعے خارج ہوتا ہے۔ جسم کے خلیات اپنی سرشت میں آبی پودوں اور جیوالوں [illegible] ہیں۔ پانی جسم کی رطوبات کو رقیق اور بافتوں کو گیلا رکھتا ہے اور فضلات کے اخراج میں مدد دیتا ہے۔ پانی کا استعمال دوسری غذاؤں کے ساتھ اس لئے ضروری ہے کہ یہ غذا کو رقیق بنا کر ہضم کے قابل بناتا ہے۔ یہ غذائی اجزاء کو باریک باریک رگوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اپنی ٹھنڈک سے جسمانی حدت کو تسکین بخشتا ہے۔ پانی ہی کی وجہ سے خون کا دوران قائم ہے اور ہمارے حسیات و خیالات بجلی کی طرح حرکت کرتے رہتے ہیں۔

بڑوں کے مقابلہ میں بچوں کو زیادہ مقدار میں پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر پانی سے روکا جاتا ہے۔ بچوں کو پانی سے ہرگز نہ روکنا چاہئے۔ اگر آلاتِ ہضم کو پانی نہ ملے تو وہ پوری طرح کام نہیں کرتے جس کے نتیجے میں منہ اور حلق میں خشکی سے کانٹے پڑنے لگتے ہیں۔ آنتیں اپنا کام کرنے سے انکار کر دیتی ہیں اور خون میں گاڑھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ فضلات تحلیل ہونے لگتے ہیں اور تغذیہ میں نقص واقع ہو جاتا ہے۔ پانی کی کمی عصبی نظام کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔

بافتیں، دوسرے رقیق یا خون کی ضرورت پوری کرنے کے لئے جب جسم کو پانی کی طلب ہوتی ہے تو اس کا اظہار پیاس کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس لئے پیاس کو بہت دیر تک روکنا نقصان دہ ہوتا ہے۔

کھانا کھاتے وقت زیادہ مقدار میں پانی پینے سے معدے کی رطوبات میں تیزی نہیں رہتی اور لعاب دہن کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کھانے کے ساتھ زیادہ مقدار میں پانی پینا مضر ہے۔ کیونکہ اس سے معدے کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور وہ معدہ جو غذا سے پہلے ہی وزنی ہوتا ہے اور زیادہ بوجھل ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں کو اکثر قبض کی شکایت رہتی ہے، انھیں کھانے کے دوران میں تھوڑا تھوڑا پانی پیتے رہنا چاہئے اور کھانے کے ایک گھنٹہ بعد خوب پینا چاہئے۔ صبح خالی پیٹ ایک گلاس پانی پینا بھی قبض کو رفع کرتا ہے۔

دو کھانوں کے درمیانی وقت میں جو پانی دیا جاتا ہے وہ گردوں کو تحریک دیتا ہے، بافتوں کو دھو کر صاف کرتا ہے اور آنتوں کی غذا کو پتلا کر کے اسے آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

پانی صحیح وقت پر پیا جائے تو اس سے غذا کے ہضم ہونے میں مدد ملتی ہے۔

پانی پینے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ گھونٹ گھونٹ کر کے پیا جائے۔ جیسے آپ کوئی چیز کھاتے ہیں۔ خشکی کے غلبہ کے باعث زیادہ پیاس محسوس ہو تو نیم گرم پانی پینے سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔

وبائی امراض کے دنوں میں پانی کو جوش دے کر، چھان کر صاف برتنوں میں رکھ لینا چاہئے۔ جوش دینے سے پانی کے جراثیم مر جاتے ہیں۔

۸ • زندگی کی بازی

مشہور مفکر جی۔ سی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ــــــ بہت سے لوگ اس بے نیازی اور بے پروائی سے جینے کے عادی ہوگئے ہیں، جیسے ان کی عمر پانچ سو سال کی ہو۔ [illegible] کا انھیں بالکل احساس ہی نہیں ہوتا۔ [illegible]

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی آخر ایک بار [illegible]

میں موت ہی کی جیت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے بلند خیال انسان اِس بازی کو آخر میں نہیں جیت سکے لیکن ایک چالاک اور ہوشیار جواری بہت سی بازیاں جیتنے کے بعد ایک بازی ہار جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ آپ کو بھی یہی کرنا چاہئے۔ جو بازی آپ کو مجبوراً ہارنی ہے، اُسے بچانے کی آپ بے سُود کوشش نہ کریں۔

زندگی کی بازی آپ کو آخرکار ہارنی ہے۔ اِس حقیقت کو سمجھنا دانائی کی طرف پہلا قدم اُٹھانا ہے۔ زندگی کی بازی آپ کو ہر حالت میں کھیلنی ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا: "میں یہ کھیل اب نہ کھیلوں گا" صرف وہی آدمی جس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہو، یہ کہنے کی ہمت کر سکتا ہے "میں زندگی کے اِس کھیل کو اب اپنی مرضی کے مطابق ختم کرتا ہوں"

شیکسپیر کے ان الفاظ کا بہت جوانمردی سے مقابلہ کیجئے ——— "موت کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے۔ موت کے برفیلے اور جابر ہاتھ ہر کندھے پر پڑتے ہیں۔ زندگی ایک ایسا قفس ہے جسے ہر قیدی کھُلا چھوڑ کر موت کی ہمراہی میں بے نام تیرگیوں کی طرف چل پڑتا ہے۔"

اس حقیقت کو سمجھنا آپ کو اِس بات سے باز رکھے گا کہ آپ چھوٹی چھوٹی فضول اور بے سود چیزوں پر اپنا وقت ضائع کریں۔

۹ ● بند دروازہ

آج جسے دیکھئے بیکاری اور بے روزگاری کا رونا رو رہا ہے۔ حکومت کو الزام دے رہا ہے۔ حالات کا گِلہ کر رہا ہے۔ اُس کے آگے مایوسی کا اِتنا گہرا اندھیرا چھا گیا ہے کہ اُسے کوئی راہ نظر نہیں آتی ——— وہ اِس اندھیرے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا سوچ میں ڈوبا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی اِس حالت کے لئے ایسے لوگ خود ذمہ دار ہیں۔ ایک مغربی مفکّر نے لکھا ہے ——— "یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ جب رزق کا ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دس نئے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم اُس بند دروازے کو اِتنے تاسف سے دیکھنے میں مشغول رہتے ہیں کہ کھُلے ہوئے نئے دروازوں پر ہماری نظر ہی نہیں [illegible]۔"

۱۰ ● ایک راز ——— ایک نکتہ

مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ——— "دُنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں، جو دماغ اور دماغ کے استعمال کی قیمت ——— [illegible] [redacted] [illegible] سکتا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اب تک

اپنی حقیقت سے اِتنا بھی واقف نہیں کہ وہ محض اپنے دماغوں کو کام میں لا کر دُنیا میں کیا کچھ کر سکتا ہے!

دماغ کی قوت اور کامیابی مترادف الفاظ ہیں۔ قوت اور کامیابی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ ایک کا دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جو کوئی شخص اِس راز سے واقف ہے اور اِس قوّت کے استعمال سے دوسروں کا اشتراک حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، وہ کامیابی کی کسی بھی منزل تک پہنچ سکتا ہے اور اُسے ایسا کرنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔

دُنیا کی تاریخ میں انسان کو آگے بڑھنے کے اِتنے مواقع کبھی حاصل نہ تھے جتنے آج حاصل ہیں۔ لیکن یہ اُنہی لوگوں کا حصّہ ہے جو زندگی سے کام لینا چاہتے ہیں۔

۱۱ ● امراض سے نجات حاصل کیجئے!

ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— یقین انسان کے لئے صحت بخش دوا ہے۔ دواخانوں میں رکھی ہوئی اکسیر دوائیں اُس قوت کے سامنے بیکار ہیں جو اُمید اور یقین کی شکل میں انسان کے اندر موجود ہے۔ یقین و اعتقاد کے ذریعہ ہم اپنی زندگی کا تعلق صحت و طاقت کے اُس منبع سے جوڑ لیتے ہیں جو مرض کو دُور کر کے ہمیں نئی زندگی اور نئی طاقت دیتا ہے۔

صحت مند رہنے اور صحت مند ہونے کے لئے صحت مند خیالات کو دل میں جگہ دینا بہت ضروری ہے۔ جب تک دل میں بیماری کا خیال رہے گا، آپ کبھی تندرست نہیں ہو سکتے۔ آپ کبھی تندرست نہیں رہ سکتے۔

اگر آپ تندرست رہنا چاہتے ہیں تو یہ یقین رکھئے کہ جسمانی امراض کی کوئی حقیقت نہیں۔ صحت ہی انسان کی فطرت ہے۔ تندرستی اٹل سچائی ہے۔ مرض یا بیماری فریب اور جھوٹ ہے۔ صحت اور تندرستی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ یہ یقین ہی سب سے بڑا علاج ہے۔ یقین ہی انسان کے لئے حیات بخش دوا ہے! ——— اِس یقین کو اپنے دل میں جگہ دے کر، اپنے دل میں یہ یقین پیدا کر کے اِس کی معجز نمائی دیکھئے۔

DL 118-14048 UD لنشاس

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

نور محمد انصاری سہوں۔ الہ آباد

س۔ خوشتر بھیا! زندگی کیسے خوشگوار بن سکتی ہے؟

ج۔ جن لوگوں کی زندگیاں خوشگوار ہیں، اُن کے نقشِ قدم پر چل کر، اُن کی زندگیوں سے روشنی لے کر!

عبدالخالق محمد حسین۔ برہانپور

س۔ خوشتر بھیا! آپ اکبر الہ آبادی کو کس درجہ کا شاعر سمجھتے ہیں؟

ج۔ ایک بلند مرتبہ شاعر! حضرت اکبر کو فاضل اہلِ نظر لسان العصر کہتے تھے اور بجا کہتے تھے۔

س۔ خدا ذرہ ذرہ میں ہے تو بت پرستی کیوں گناہ ہے؟

ج۔ اس لئے کہ خدا ذرہ ذرہ میں ہے لیکن ذرہ خدا نہیں ہے اور پرستش کا سزاوار صرف خدا ہے

عبدالرشید۔ دھنباد

س۔ خوشتر بھائی! آج کل انسان کو سکون کیوں نہیں ملتا؟

ج۔ اس لئے کہ انسان امن و سکون کے خرمن کو خود آگ لگا رہا ہے۔

س۔ اقبال کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

علامہ اقبال کا ایک مصرعہ اور سُنئے ؎

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

خورشید احمد وارثی۔ سکھر

س۔ خوشتر بھیا! کیا کوئی غم کی آرزو کرتا ہے...؟

ج۔ جی ہاں! وہ لوگ غم کی آرزو کرتے ہیں جو اِس ... حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں ——

ہے بڑی چیز انبساط مگر
غم نہ ہو تو ... بھی نہیں
... ہجوم غم ...

س۔ انسانیت کا ...

ج۔ انسانیت کو ...

س۔ زندگی ...

ج۔ حُسنِ تدبیر سے تقدیر ... جاتی ہے۔

ایم۔ اے۔ ندیم۔ کلکتہ

س۔ بھیا! کیا ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے پیشِ نظر، مسلمانوں کو پاکستان ہجرت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟

ج۔ کسی سمجھدار کو ایسی بات نہ سوچنی چاہیئے۔ مسلمان پاکستان کیوں چلے جائیں گے ہندوستان ... مسلمانوں کا اُتنا ہی حق ہے جتنا ...

ثقلین وارثی۔ آسام

... بہت ہارتا ہے؟

... ہے حوصلہ کا مرا من چھوٹ ...

ج۔ ... ہے اندازہ تاسف!

ساتھ ہی ہے خونِ شہیداں کے اِن نگیں دریا میں
کتنے ہاتھوں کی حنا بندی ہیں کتنے ہونٹوں کی سُرخی بھی



یونٹ خریدیئے
روپیہ لگانے کا محفوظ موثر طریقہ
یونٹوں میں لگا روپیہ نہ صرف محفوظ رہتا ہے، بلکہ بڑھتا بھی جاتا ہے۔
یونٹ خریدنے والوں کو ٹیکسوں میں خاصی رعایتیں بھی ملتی ہیں۔
اس برس زیادہ منافع کی امید ہے
DA 84/110



Siswin Sadi



سب کھلے ہیں کسی کے عارض پر
اس برس باغ میں گلاب کہاں

فوٹو:۔ روشن لال۔ ہوشیارپور



ازبکستان کے نامور ادیب، اُردو کے سکالر جناب محمد نبی جان، جنھوں نے تاشقند یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف اُردو لٹریچر کی ڈگری حاصل کی ہے، گزشتہ دنوں دِلّی تشریف لائے تو اُن کے اعزاز میں جناب رنبیر ایڈیٹر روزنامہ "ملاپ" نے پُرتکلّف دعوت دی. رنبیر جی اُردو کی صحافتی دُنیا کے شہنشاہ تو ہیں ہی، انسان دوست اور بندۂ خلوص بھی ہیں۔ تصویر میں رنبیر جی اور ساغر نظامی خوشتر گرامی کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے، محبت کے رشتے میں بندھے کھڑے ہیں۔



ازبک ادیب جناب محمد نبی جان غیر مُلکی ہونے کے باوجود اُردو اتنی صاف اور شستہ لکھتے ہیں کہ اُن پر اہلِ زبان کا گمان ہوتا ہے۔ وہ اپنی ایک اُردو نظم سُنا رہے ہیں۔ نظم کی شگفتگی حاضرین اور خود شاعر کے شگفتہ و متبسّم چہرے سے عیاں ہے۔ نریش کمار شاد، جگن ناتھ آزاد، ساحر ہوشیار پوری اور خوشتر گرامی ہمہ تن گوش ہیں اور خوش ہیں، اُردو کی اِس ہر دلعزیزی پر کہ واگا سے گنگا تک اِس کی آواز گُونج رہی ہے۔



اس محفل رنگارنگ میں اردو کے محبوب شاعر جناب ساغر نظامی نے اپنے پرکیف ترنم اور رسیلی شاعری سے نغموں کا جادو جگایا۔
نریش کمار شاد اور جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ازبک شاعر محمد نبی جان ساغر صاحب کو داد دے رہے ہیں۔ ساغر صاحب نغمہ سرا ہیں۔۔۔۔

کیا سنائیں کہ ہم پہ کیا گزری — عشق میں ہر قدم پہ کیا گزری
ساغرِ چشم کیوں ہوا پرنم — حسن کے جامِ جم پہ کیا گزری
ان کو دیکھو کہ ان پہ کیا بیتی — یہ نہ پوچھو کہ ہم پہ کیا گزری
اے نسیمِ سحر! بتا تو سہی — اس سراپا ارم پہ کیا گزری
عارضِ گل بہ گل پہ کیا بیتی — گیسوئے خم بہ خم پہ کیا گزری
ساتھ تھے اپنے وہ قدم بہ قدم — کیا کہیں ہر قدم پہ کیا گزری



ساغر صاحب کے بعد جناب شہریار پرواز نے حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ تصویر میں دائیں طرف ازبک ادیب محمد نبی حبان، جگن ناتھ آزاد اور نریش کمار شاد کے درمیان "خندۂ دنداں نما" کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ پرواز صاحب فرماتے ہیں ——

پھر ترے آستاں پہ آئے ہیں ہدیۂ صد نیاز لائے ہیں
سر ہے اور اک ہجوم سجدوں کا بندگی کا خراج لائے ہیں
خون ٹپکا ہے چند یادوں سے زخمِ دل جب بھی مسکرائے ہیں
ساری تاریخِ عشق کا حاصل چند یادیں ہیں چند سائے ہیں
حسنِ معصوم کو کہاں معلوم عشق نے جو فریب کھائے ہیں
دلِ یزداں کے بس کی بات نہیں آدمی نے جو زخم کھائے ہیں



اُردو سیکڑوں برس سے ہندوستانی تہذیب و تمدّن کا گہوارہ ہے اور آج بھی دِلّی کی تہذیبی زندگی میں اِس کی حیثیت نمایاں ہے۔ دِلّی میں سیاسی اور مجلسی طور پر اِس کا کوئی مخالف نہیں۔ سبھی چاہتے ہیں، اُردو کو اُس کا جائز مقام مِلے لیکن نہ جانے کیوں وزارتِ داخلہ کے ذمّہ دار، جن کے ہاتھوں میں دِلّی کے انتظام کی باگ ڈور ہے، اِس طرف توجّہ نہیں دیتے۔ اسٹیٹ اسمبلی کی زبان کمیٹی کی رپورٹ جس میں اُردو کے حق کو تسلیم کیا گیا تھا، وزارتِ داخلہ نظر انداز کرتی رہی ہے۔ آل پارٹیز اُردو کنونشن کے مطالبے کا بھی کوئی جواب نہیں مِلا۔ محبّانِ اُردو اِس صورتِ حال پر غور کریں ؛

تہاب یرنی

مدیر خوشتر گرامی

اگست ۱۹۶۱ء

ٹیلیفون دفتر ۔۔۔۔۔ ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ۔۔۔۔۔ ۶۱۹۹۲۷



قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ
پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

" اندھوں اور گونگوں کو مراعات" ایک خبر ـــــ کیبنٹ منسٹر بنایا جائے گا۔

"یو۔پی وزارت میں توسیع کی جائے گی" ایک خبر ـــــ وزارت کے اُمیدوار ایمپلائمنٹ ایکسچینج میں نام رجسٹر کرائیں۔

"غربت اور افلاس کا اپنی پُوری قوت سے مقابلہ کرو" وزیرِ اعظم کا مشورہ ـــــ پُوری قوت اور بھوکے پیٹ دونوں سے۔

"بدعنوانی اور رشوت لینے پر محکمہ انکم ٹیکس کا چپراسی ڈِسمس" ایک خبر ـــــ نہ ہوا وزیر، کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

"چینی پر کنٹرول جاری رہے گا" ایک خبر ـــــ جب تک چینی نیفا اور لداخ خالی نہیں کرتے۔

"افسروں کے گھر پر چھاپے نہیں مارے گئے" ایک خبر ـــــ یہ قسمت تو غریب کلرکوں اور چپراسیوں ہی کی ہے۔

"اضافۂ آبادی کی روک تھام اشد ضروری ہے" ایک عنوان ـــــ اِس سے زیادہ ضرورت لیڈروں میں اضافے کی روک تھام کی ہے۔

"پولیس کو اشک آور گیس کم استعمال کرنے کی ہدایت۔ کیونکہ گیس باہر سے درآمد کی جاتی ہے اور وہ مہنگی ہو گئی ہے" ایک خبر ـــــ لاٹھی گولی تو مہنگی نہیں ہوگئی وہ استعمال کیجئے۔

"مہنگائی کی رفتار" ایک عنوان ـــــ ماشاء اللہ چشمِ بد دُور، بہت تیز ہے۔



وزیر ریلویز مسٹر پاٹل کو ریلوے حادثات پر بہت دُکھ ہوا ہے۔



ہندوستان کو ممالک غیر سے بہت بڑی امداد ملنے کی توقع ہے۔

"اعلیٰ سرکاری افسروں کا وقت کیسے بچایا جائے۔ مرکزی حکومت سروے کر رہی ہے" ایک خبر ـــــ اُن کے لئے چائے، بسکٹ، سگریٹ اور لیڈی اسٹینوگرافروں کا بندوبست کیا جائے۔

"سرکاری گوداموں میں مکّی سڑ رہی ہے" ایک خبر ـــــ کوئی مضائقہ نہیں کھاد بن جائے گی۔ ہم غیر ملکی کھاد منگانے سے بچیں گے۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ محفوظ رہے گا۔

"انکم ٹیکس چوری کا پتہ لگانے کے لئے ایک نئے محکمہ کا قیام" ایک خبر ـــــ اور اُس محکمہ کی چوریوں کا کون پتہ لگائے گا۔

"پاکستان اسمبلی میں بناؤ سنگھار ممنوع قرار دینے کا مطالبہ" ایک خبر ـــــ مطالبے کے بعد ممبر صاحب گھر گئے ہوں گے تو بیگم سے معافی مانگی ہوگی اور کہا ہوگا ؎

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

"روپے کی قیمت گرنے سے کوئلہ صنعت کو نقصان" ایک خبر ـــــ ایک کوئلہ صنعت کو، بہت سی صنعتوں کو نقصان ہوا ہے اور گرنے اور گرانے والوں کو خبر تک نہیں کہ ؎

کس حال میں ہیں یارانِ وطن

"شریمتی گاندھی کا نقلی سکریٹری سہارن پور میں گرفتار" ایک خبر ـــــ حد ہوگئی ملاوٹ کی۔

"سارے پنجاب میں بارش" ایک خبر ـــــ ایسی زبردست کہ رام کشن سرکار ہی اس میں بہہ گئی۔

"مٹی کے تیل کی زبردست قلّت" ایک خبر ـــــ وزیرِ اعظم کے کہنے پر عمل کرو، سودیشی کی تحریک چلاؤ یعنی گھروں میں مٹی کو نچوڑ کر تیل نکالنا شروع کرو۔

"دِلّی میں مہنگائی روکنے کے لئے اقدامات" ایک خبر —— روس اور امریکہ سے ہتھیار اور ریاستوں سے مسلح پولیس طلب کی گئی ہے۔

"بھٹو کو چلتا کرنے سے چین کو پریشانی" ایک عنوان —— ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

"صدر سوکارنو کو اختیارات سے محروم کر دیا گیا" ایک خبر —— یعنی ترکی تمام شُد۔

"پنجابی عورت نے چار بچوں کو جنم دیا" ایک خبر —— خاندانی منصوبہ بندی کا کامیاب مظاہرہ۔

"لڑکیاں پیدا ہونے پر بیوی کو چھوڑ دیا" ایک خبر —— دوسری بیویاں خیال رکھیں اور لڑکے پیدا ہونے پر شوہر کو چھوڑ کر انتقام لیں۔

"سپر مارکیٹ میں اسٹور کھولنے کی اسکیم کھٹائی میں پڑ گئی" ایک خبر —— یوں کہئے کولڈ اسٹوریج میں رکھی گئی۔

"وزیرِ اعظم آندھرا کے قحط زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے لئے حیدرآباد پہنچ گئیں۔ ہوائی اڈے پر مسز گاندھی کا استقبال" —— تمام بھوکے استقبال کے لئے جمع ہو گئے۔

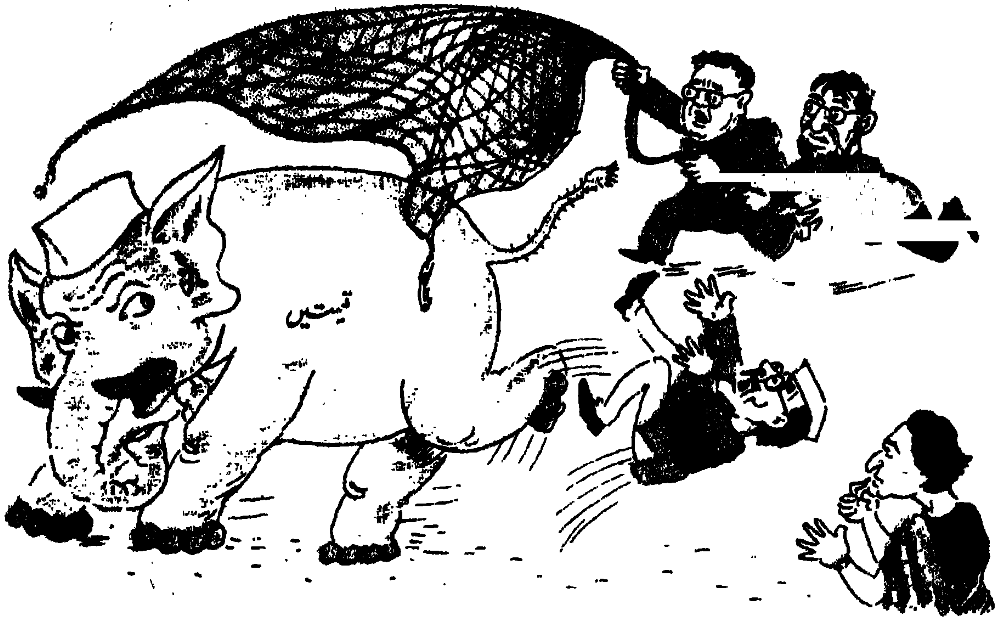
"حد سے زیادہ آزادی خطرناک ہے" ایک عنوان —— جو ہمارے لیڈروں کو حاصل ہے۔

"جن سنگھ سرکار بنائے گا" نانا جی دیش مکھ کا بیان —— چھپنے سے پہلے ہی آنکھ کھل گئی اور پتہ چلا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا



گپتا جنم دن فنڈ سکینڈل



"ملک میں مہنگائی کی رفتار"

• "ناگاؤں کی رانی غیر ممالک کا دورہ کرے گی" ایک خبر ——— اور وہاں آزاد ناگالینڈ قائم کرے گی۔

• "دیش میں کسی چیز کی کمی نہیں" ایک عنوان ——— صرف نیتوں میں فتور آگیا ہے۔

• "کانگرس نے آئندہ چناؤ لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں" ایک خبر ——— کیا انتخابی پہلوانوں کو لنگر تقسیم ہوتے دیکھا ہے۔

• "مجسٹریٹ نے جرمانہ اپنی جیب سے دیا" ایک خبر ——— اور ملزم نے اپنی جیب (زبان) سے دعائیں دیں۔

• "رنگ میں بھنگ" ایک عنوان ——— ایک پنتھ دو کاج، ہاتھ بھی رنگئے اور بھنگ کا مزہ بھی لیجئے۔

• "دودھ میں ملاوٹ" ایک خبر ——— اور [illegible] پانی میں ملاوٹ کی جاتی ہے۔

"چنڈی گڑھ کے بارے میں اندرا جی انصاف سے [illegible] ایک بیان" ——— تو کیا وہاں بالکل بندر بانٹ ہو گئی ہے۔

"جوانمردوں کی دھرتی" ایک عنوان ——— [illegible] جسے حال ہی میں رام کش اینڈ کمپنی سے نجات [illegible]۔

• "جھانسی ڈویژن میں سینچائی کی اسکیموں [illegible]" عنوان ——— کسان بھائیوں کے ساتھ جھانسہ

"ہم قرض لے رہے ہیں خیرات نہیں" وزیر اعظم کی [illegible] ——— اور نہایت شان سے، سینہ تان کر، اکڑ کے ساتھ لے رہے ہیں۔

"خریف کی فصل اچھی ہے" ایک خبر ـــــ ایک خواب ہے بھوکے کا۔

"ہندی کا فروغ" ایک عنوان ـــــ اُردو کا گلا گھونٹ کر۔

"ہندی جنوبی ہند والوں کے حلق میں نہیں ٹھونسی جائے گی" وزیر اعظم کا بیان ـــــ بلکہ دفتروں میں نافذ کی جائے گی تاکہ وہ اِس کڑوی گولی کو نگلنے پر مجبور ہوں۔

"لدھیانہ کے خاکروبوں کے مطالبات" ایک خبر ـــــ بصد افسوس یہ کہہ کر پیش کیے گئے ہیں۔

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

"چلتے پھرتے سنیماؤں کے لئے لائسنس" ایک عنوان ـــــ لائسنس کی کیا ضرورت ہے۔ نئی نسل کی موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ لبرل پالیسی اپنائیے۔

"قومی مزاج کے دھارے" ایک عنوان ـــــ اگر ہمارے ہیں تو ـــــ

جلسے، جلوس، ہڑتالیں۔
پولیس سے تصادم۔
پولیس پر پتھر پھینکنا۔ اُس سے لاٹھی گولی کھانا۔
بھوک ہڑتال۔ جیل کی ہوا خوری۔
لیڈروں کی تقریریں سُننا اور سر دُھننا۔
شر انگیز جھوٹی افواہیں پھیلانا۔
دنگا فساد، لڑائی جھگڑا کرنا۔
خدائی آفتیں اور سرکاری آفتیں روزانہ برداشت کرنا۔
گورنمنٹ کا ہر جائز ناجائز ٹیکس قبول کرکے اپنی دولتمندی کا مظاہرہ کرنا۔

"تاشقند کے حالیہ زلزلوں میں ہزاروں عمارتیں تباہ ہوئیں لیکن صرف تیرہ اشخاص مرے" تاس کی ایک خبر ـــــ زلزلہ صرف عمارتوں کے لئے آیا تھا۔ یہ تیرہ آدمی بھی جھپٹ میں آ گئے۔



پنجاب میں راشٹرپتی راج

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا



خوشتر گرامی

گول چہرہ۔ آنکھوں پر چشمہ۔ جس کے پیچھے سے ایجی ٹیشنیں جھانکتی ہیں۔ ٹوپی کے رنگ ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی لال کبھی سفید۔ آج کل ننگے سر ہیں۔ لبوں میں زہرِ ہلاہل۔ جو بول نکلے ہیں بے مول نکلتے ہیں۔ قد چھوٹا۔ یعنی ننھی مُنی سی جان سَو جھگڑوں کی استھان ـــ کھدر کا دھوتی کُرتہ مگر کون جانتا ہے اُسے کب کانگریس کی ضد میں تیاگ پتر دے دیں۔ اِن تمام سیمابی صفتوں کے مجموعے کا نام ہے ــــــــــ

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا

سیاسی ٹریڈ مارک بدلتے رہتے ہیں۔ دل میں مرغِ بادنما فٹ ہے۔ اُس کی چونچ کانگریس کی طرف تھی تو وہاں تھے۔ اُس نے مُنہ موڑا تو سوشلسٹ پارٹی کے نام سے ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنالی۔ پھر اُس کو کندھے پر اُٹھاکر اچاریہ کرپلانی کی جھونپڑی (کسان مزدور پرجا پارٹی) میں لے گئے۔ کیرل میں گولی چلنے کا بھیانک خواب دیکھا تو خیر سے سپر گھر کو لوٹ آئے۔ پھر سوشلسٹ پارٹی کی جھیل میں ڈبکیاں لگانے لگے مگر دل بے قرار نے قرار نہ پایا۔ پرجا سوشلسٹوں سے مِل کر ایس۔ ایس۔ پی کا بِلّہ لگایا لیکن ساجھے کی ہانڈی چورا ہے پر پھوٹ گئی۔ اِس بِلّے پر تو اب بھی قبضہ ہے مگر اِس سے پرجا سوشلسٹ نکل گئے ہیں۔ نیت نئے نعرے تصنیف کرتے ہیں ؎

قافلہ درد کا

رام لعل

ملتی اسٹوری فلیٹ نمبر ۳۹-آر- چار باغ لکھنؤ ۴

۲۱ مئی ۶۶ء　　　　برادرم خوشتر صاحب! آداب

. . میں عزیزہ کی شادی کے موقع پر دہلی نہ پہنچ سکا۔ میرا معذرت نامہ مل چکا ہوگا۔ اُمید ہے شادی خیر و خوبی سے انجام پائی ہوگی ـــــ یہ کہانی "قافلہ درد کا" کچھ طویل ہوگئی ہے۔ اگرچہ میں کسی کہانی کو بے ضرورت طول دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ کہانی تو خود اپنے لئے حدود کا تعین کرتی ہے لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی طویل ترین کہانی بھی عجزِ اظہار کی وجہ سے مختصر محسوس ہونے لگتی ہے۔ فراق صاحب کہتے ہیں ؎

کہتے چلو افسانۂ ہجراں　　　اب بھی رات کی رات پڑی ہے

ـــــ اُمید ہے یہ کہانی آپ کو اور اُن لوگوں کو یقیناً پسند آئے گی جو کہانی میں پلاٹ کی بجائے احساس کی تلاش کرتے ہیں۔ کہانی میں پلاٹ اور احساس دونوں ہی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن بعض اوقات احساس پلاٹ پر سبقت لے جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک اہم مثال جیمز جوائس کے افسانے *The Dead* کی دی جا سکتی ہے۔ اِس میں ایک شوہر کو انتہائی مسرت کے لمحات میں یکایک یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس کی رفیقۂ حیات کا ماضی میں کوئی اور محبوب بھی تھا، جو اب زندہ نہیں ہے۔ وہ آج اچانک ایک درد بھرا گیت سُن کر افسردہ ہوگئی ہے۔ اُس کا شوہر سوچ میں مستغرق ہو جاتا ہے اور کھڑکی سے باہر مسلسل گرتی ہوئی برف کو دیکھتا رہتا ہے۔ جو شاید کبھی بند نہیں ہوگی۔ اِس کہانی میں پلاٹ کی اہمیت صرف اِتنی ہے کہ شوہر ایک بہت اچھی شام گزار چکنے کے بعد (جہاں وہ ایک اہم ترین شخصیت کے طور پر پیش کیا گیا تھا) اب اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ مسرت سے بھرپور لمحے گزارنے کا آرزو مند ہے لیکن بیوی کی اچانک سسکیاں اُسے ایک صدمے سے دوچار کر دیتی ہیں۔ وہ بیوی کے اعتراف کرنے سے پہلے ہی اِس حقیقت کا احساس کر لیتا ہے کہ اُس کی زندگی میں آنے سے پہلے وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی رہی ہے اور اس کا یہی احساس (*Realization*) کہانی کی گزشتہ ساری *Development* پر حاوی ہو جاتا ہے ـــــ طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں اِس سلسلے میں اُردو کہانیوں کی بھی دو ایک مثالیں پیش کرتا . . .

آپ کا مخلص ـــــ رام لعل

بینا بیری کتابوں کی ایک بہت بڑی فرم میں ملازم تھی۔ اِس فرم میں کبھی اُس کا شوہر سُدرشن کمار بیری منیجر تھا۔ دو سال پہلے اُس کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔ فرم کے مالکوں نے اُس کی بیوہ کو اِسی فرم میں ٹائپسٹ کی جگہ آفر کی تھی۔ اُس وقت بینا بیری کو ٹائپ کرنا نہیں آتا تھا لیکن اُس نے رفتہ رفتہ یہ کام سیکھ لیا۔ اب وہ کھٹا کھٹ ٹائپ کیا کرتی اور جو کام اُسے ملتا، اُسے پورا کرنے میں کبھی دیر نہ لگاتی۔ فرم کے مالک اُس سے بہت خوش تھے۔ وہ اُسے اِتنی تنخواہ تو نہیں دیتے تھے جتنی سُدرشن کمار بیری

پاتا تھا۔ اُسے تو آٹھ سو روپے ملتے تھے لیکن بینا مطمئن تھی کہ اُسے ہر مہینے تین سو روپے مِل جاتے تھے۔ اِس رقم میں اُس کا اور اُس کے پانچ سال کے بچے کا گزارا ہو جاتا تھا۔ اُسے سب سے بڑا اطمینان تو یہ تھا کہ وہ ایک ایسی جگہ کام کرتی ہے، جس سے اُس کے شوہر کی یادیں وابستہ ہیں۔ جہاں سب لوگ اُس کے شوہر کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ اُسے خود بھی آصف علی روڈ کی سہ منزلہ عمارت میں جو لاکھوں کتابوں سے بھری ہوئی تھی، اپنے مرحوم شوہر کے وجود کا ہر وقت احساس ہوتا رہتا۔ جیسے وہ اب بھی اِس جگہ موجود ہو۔ مُنہ میں پائپ دبائے، ہر شخص سے مُسکرا مُسکرا کر مِلتا ہوا اور اُن کے سلام کا جواب سر کی ہلکی سی جنبش سے دیتا ہوا۔ ہمدردی، عزت اور یادوں سے بھرپور ماحول میں وہ خود کو شگفتہ بھی سمجھتی تھی اور محفوظ بھی۔

آج صبح وہ بس سے اُتر کر دفتر کی طرف جا رہی تھی۔ اُس کے آگے آگے اِسی فرم کے دو اکاؤنٹنٹ، نئے مینیجر کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے ـــــ سُدرشن کمار بیری کی موت کے بعد سے اب تک کوئی دوسرا مینیجر نہیں رکھا جا سکا تھا۔ اِس عہدے کے لائق کوئی شخص مِل ہی نہیں سکا تھا۔ دفتر کے اسسٹنٹ ہی کام چلا رہے تھے۔ پچھلے مہینے کچھ لوگ پھر انٹرویو کے لئے بُلائے گئے تھے۔ اُن اکاؤنٹنٹوں کی بات چیت سے بینا کو معلوم ہوا کہ نئے مینیجر کا انتخاب ہو چکا ہے اور وہ کوئی عورت ہے۔

اُس عورت کا نام سُن کر بینا بیری چونک اُٹھی۔

وہ میرا الیس علی کے پُورے نام سے پہلے سے واقف نہیں تھی۔ صرف آدھا نام ہی جانتی تھی۔ میرا ـــــ! میرا سچر!! کہیں یہ وہی میرا تو نہیں ؟ اُس نے سوچا۔

کچھ سال پہلے میرا سچر نام کی ایک لڑکی اُس کے شوہر کی پرسنل اسسٹنٹ تھی جو بہت اسمارٹ تھی، بہت اشلکچول! وہ کسی کرنل کی لڑکی تھی اور اِس فرم کی ملازمت محض شوقیہ کر رہی تھی۔ دراصل وہ کسی مناسب میچ کی منتظر تھی۔ کسی ایسے رفیقِ حیات کی جو اُسے اچھی طرح سمجھ سکے۔ اِس مسئلے پر وہ ہمیشہ بڑی آزادی سے گفتگو کیا کرتی۔ اُس کا شوہر بھی میرا کی بہت تعریف کیا کرتا تھا اور اُسی کے کہنے پر سُدرشن نے میرا کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ وہ پہلی بار اُن کے یہاں اپنے فوجی باپ کے ساتھ آئی تھی۔ میرا کو دیکھتے ہی بینا بیری کا دل ایک نامعلوم خوف سے کانپ اُٹھا تھا۔ وہ اُس سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اُسے یہ بھی احساس ہوا کہ میرا سچر ذہنی طور پر اُس کے شوہر کے زیادہ قریب ہے۔

حسد عورت کی بُنیادی کمزوری ہے۔ کمزور اور خوبصورت مخلوق کی طینت یہی ہے۔ اِسی جذبہ کے تحت وہ اپنے شوہر کی رکھوالی کرتی ہے۔ اُس کی ہر بات پر نظر رکھتی ہے۔ اپنے حق کی حفاظت کے لئے اُس سے لڑتی اور جھگڑتی بھی ہے۔ مجبور ہو کر اُس کی خوشامد بھی کرتی ہے اور اُس سے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ محبت کرنے لگتی ہے۔

بینا بیری اپنے شوہر کے ساتھ کئی بار کرنل سچر کے گھر گئی تھی۔ کرنل سچر اور اُس کی بیٹی نے اپنے یہاں کی تقریبوں اور دعوتوں میں انہیں کئی بار بُلایا تھا۔ میرا سچر اُس کے ساتھ کافی بے تکلف ہو گئی تھی اور دونوں بہت اچھی دوست بن گئی تھیں۔ دونوں نے مِل کر بہت سے سوشل پروگرام انجام دیئے تھے۔ ڈیفنس فنڈ کے لئے ہزاروں روپے جمع کئے۔ فوجیوں کے لئے کتابیں، رسالے اور دوسری ضروری چیزیں گھر گھر گھوم کر جمع کیں۔ اُن کے لئے اسٹیشن پر ایک کینٹین بھی کھولی تھی۔ جہاں اور عورتیں بھی اُن کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اُنھوں نے گھریلو عورتوں کا ایک کوآپریٹیو اسٹور بھی کھولا تھا۔ کئی کلچرل شو اور پکنک کے پروگرام بھی کئے تھے لیکن اتنے دلچسپ مشغلوں اور اتنی مصروف زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے تھے جب بینا بیری نے اپنے آپ کو بے حد تنہا اور افسردہ محسوس کیا تھا۔ ہر کسی سے رُوٹھی ہوئی، ہر چیز سے نفرت کرتی ہوئی، ہر بات پر لڑتی اور کُڑھتی ہوئی۔ وہ اپنی اِس کیفیت کا حقیقی سبب جانتی تھی۔ خود کو متوازن بنانے کی کوشش بھی کرتی تھی لیکن ہوا وہی جو عام طور پر ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔ عورت کی آنکھوں کے سامنے سارے واقعات نہیں ہوتے لیکن وہ اُنھیں صرف محسوس کر کے اپنے آپ کو جلانے بیٹھ جاتی ہے۔ جب بھی وہ اپنے شوہر کی زبان سے کسی عورت کا ذکر سُنتی، اُس کے بنائے ہوئے کھانوں کی تعریف سُنتی، اُسے اُس کی طرف مُسکراتا ہوا دیکھتی تو وہ بہت سی گزشتہ ٹوٹی ہوئی اور بکھری ہوئی باتوں کے سرے مِلا مِلا کر ایک کہانی سی بنا لیتی۔ اپنی ہی اُلجھنوں کا ایک جال سا بُن لیتی اور اُس کے اندر خود کو قید کر لیتی۔

اِس کشمکش سے نجات پانے کے لئے بینا بیری نے تنہائی میں کتنی ہی بار آنسو بہائے تھے۔ اپنے شوہر کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر اُس کے سینے پر سر رکھ کر اُسے اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلایا تھا لیکن اُس کی کشمکش ختم نہ ہوتی۔ ایک دن اُس نے میرا سچر سے مِلنے سے انکار کر دیا۔ اپنے شوہر کو اُس کے پاس جانے سے روک دیا۔ وہ دن ـــــ میرا سچر کا اُس فرم میں آخری دن تھا۔ وہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر امریکہ جانے والی تھی۔ ہائر اسٹڈیز کے لئے ـــــ اُس دن فرم والوں نے اُس کے لئے ایک شاندار الوداعی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ سُدرشن نے اُس کی اندرونی کشمکش کو سمجھ کر وہاں جانا ملتوی کر دیا تھا۔ اگرچہ اُسے بہت کوفت ہوئی تھی لیکن وہ اپنی بیوی کا دل نہیں دُکھانا چاہتا تھا۔ وہ اُس کی غلط فہمی دُور کرتا رہا تھا۔ ایک اچھے شوہر کی طرح اُس نے اپنی بیوی کو مطمئن

کرنے کی پوری کوشش کی اور کامیاب بھی ہوا تھا۔ بینا بیری نے جیسے اپنی کھوئی ہوئی شئے واپس پالی تھی اور وہ پھر سے مطمئن ہوگئی تھی۔ اس کے سارے خدشے اور خوف دُور ہوگئے تھے۔ اس کے بعد کبھی اس نے میرا سچر کا نام نہیں لیا تھا۔ نہ اس کے پاس امریکہ سے کبھی اس کا کوئی خط آیا تھا۔ کافی عرصہ گزر گیا لیکن میرا سچر کے بارے میں گھر میں پھر کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ جیسے وہ ـــــ وہاں، اُن کے گھر میں، اُن کی فرم میں، اُن کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہ ہو۔ کبھی کبھی کسی کو بھلا دینا کتنا آسان ہو جاتا ہے!

سُدرشن کی اچانک موت بھی بینا کے دل میں میرا سچر کی یاد واپس نہیں لاسکی تھی۔ جیسے وہ تو سُدرشن سے بھی پہلے مر چکی تھی۔ وہ اُسے پوری طرح بھول چکی تھی۔ معلوم نہیں امریکہ جاکر میرا نے کیا کیا تھا؟ وہاں سے واپس بھی آئی تھی یا نہیں یا وہیں پر بس گئی تھی۔ اس کا کرنل باپ اب کہاں تھا؟ یہ بھی اُسے معلوم نہیں تھا۔ یہاں سے تبدیل ہوکر نہ جانے کہاں چلا گیا ہوگا؟ اُن کے بارے میں اب یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔

لیکن آج صبح دفتر پہنچتے ہی میرا ایس علی کا نام سُن کر اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ جیسے میرا ایس علی سچ مچ میرا سچر ہی ہو۔ اگر واقعی ایسا ہوا تو جیسے وہ اُس کا سب کچھ چھین لے گی لیکن اب اُس کے پاس تھا ہی کیا؟ سوائے غم اور محرومی کے ـــــ؟

ساڑھے دس بجے دفتر میں ہر طرف ہلچل سی مچ گئی۔ میرا ایس علی کی آمد کی خبر سُن کر ہر شخص چوکنا ہوکر بیٹھ گیا۔ نئے منیجر کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو اٹھا۔ مرد نہیں ایک عورت تھی۔ وہ اپنے ائیرکنڈیشنڈ کیبن میں بیٹھی، دفتر کے خاص خاص لوگوں سے مل رہی تھی۔ جن لوگوں نے اُسے دیکھ لیا تھا، وہ اُس کی خوبصورتی، اُس کی دلکش پرسنالٹی کی تعریف کر رہے تھے۔

مزمدار اُس پاس بیٹھے ہوئے کلرکوں کو بتا رہا تھا ـــــ "باپ رے باپ! ایک دم مرد لگتی ہے ہماری باس! اُس کے بال بوائے کٹ ہیں۔ اُس کا چہرہ تو بالکل منگل لگ ہے! خاندان مغلیہ کی شاہزادیوں جیسی کھڑی مگر درناک، محراب دار بھویں اور اتنی چوڑی چمکتی ہوئی پیشانی!"

سمیر استھانا اپنے پائپ کا تمباکو بدلتے ہوئے کہہ رہا تھا ـــــ "ہمارے باس کو ٹاٹا سیلز کی طرف سے یہاں کی نسبت زیادہ پے کا آفر ملا تھا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ پتہ ہے کیوں؟ کیونکہ وہ پہلے بھی یہاں کام کر چکی ہیں۔ یہاں سے اُن کی بڑی اٹیچ منٹ ہے۔ جذباتی لگاؤ بہت اہم ہوتا ہے نا!"

یہ سُن کر بینا کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ تو وہی میرا سچر ہے۔ وہی اس فرم میں پہلے کام کر چکی ہے۔ وہ اُسے دیکھنے کے لئے بیتاب ہو اٹھی۔ وہ اس بات کی تصدیق چاہتی تھی کہ کیا وہ واقعی میرا سچر ہے۔

مایا اگروال باہر کے کاؤنٹر سے یہ خبر لے کر آئی ـــــ "باس ابھی سب کو باری باری اپنے کیبن میں بلائے گی۔ سب سے ملے گی۔"

بینا بیری یہ خبر سُن کر سوچنے لگی "میرا اُسے اچانک یہاں دیکھ کر کیا کہے گی؟ کیا اُسے معلوم ہے سُدرشن اب زندہ نہیں ہے؟"

میرا ایس علی اپنے کیبن میں اکیلی رہ گئی تو اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ چاہ رہی تھی، لوگ باہر چلے جائیں تو وہ اس نئی جگہ کے بارے میں کچھ سوچے، کچھ یاد کرے۔ وہ اس کیبن میں پانچ برس کے بعد آئی تھی۔ جب یہاں ملازم تھی تو اس کیبن میں اکثر آیا کرتی تھی۔

اُس کے سامنے دیوار پر چار تصویریں آویزاں تھیں۔ ہر تصویر کے نیچے اُس کا نام اور عرصہ ملازمت درج تھا۔ یہ لوگ اس دفتر کی سب سے بڑی کرسی پر رونق افروز رہ چکے تھے۔

دامن جی جمشید بھائی ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۵ء تک

مانک لال سکھارام پٹیل ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک

بی جی بونڈرے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۸ء تک

سُدرشن کمار بیری ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۱ء تک

میرا ایس علی کی نظریں سُدرشن کمار کی تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ سُدرشن کمار بھی اُسی کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کرسی پر وہ بیٹھی تھی، اُس پر کبھی سُدرشن کمار بیٹھا کرتا تھا۔ اُس وقت وہ اُس کی پرسنل اسسٹنٹ تھی۔ ساتھ کے چھوٹے کیبن میں اُس کی سیٹ ہوتی تھی۔ گھنٹی بجتے ہی وہ نوٹ بُک اور پنسل اٹھا کر اندر چلی آتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی کام نہ ہونے پر بھی سُدرشن کمار اُسے بلا لیا کرتا تھا۔ باتیں کرنے کے لئے۔ وہ باتوں کا بڑا رسیا تھا۔ فائلوں سے نپٹ کر اُسے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا لیکن اس کی باتیں سطحی نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ایک اوسط ذہن سے بلند ہو کر سوچتا تھا۔ پالٹکس، آرٹ، ادب اور بزنس سے متعلق سارے ہی موضوعات پر وہ بے تکان بول سکتا تھا۔

اُس کی باتیں میرا کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ خود بھی صرف اُس کی باتیں سُننے کے لئے ہی اُس کے پاس چلی جاتی تھی۔ اتنی آزادی تو سُدرشن نے اُسے دے ہی رکھی تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی بات ایسی چھیڑ دیتی جس پر پھر گھنٹوں بحث چلتی رہتی۔ سُدرشن ساتھ ساتھ فائلیں بھی دیکھتا رہتا اور باتیں بھی کئے جاتا۔ کبھی کبھی کام بھی رُک جاتا لیکن باتیں ختم نہیں ہوتی تھیں۔

میرا سوچا کرتی ـــــ یہ آدمی کتنا دلچسپ ہے، کتنا وجیہہ اور دلکش! اپنی باتوں سے کتنی جلدی دوسروں کا دل موہ لیتا ہے! ایسا آدمی مجھے زندگی میں ملا بھی تو اُس وقت، جب وہ شادی کر چکا ہے۔ ایک بچے کا باپ بھی بن چکا ہے۔ ایسے آدمی

کے ساتھ زیادہ دُور تک نہیں جاسکوں گی۔ ایسے آدمی اکثر اپنی بیوی کے بارے میں حماقت کی حد تک سینٹی منٹل ہوتے ہیں۔ وہ دوسری عورت سے اِس حد تک دلچسپی لے سکتے ہیں کہ وہ بے تاب زدہ ہو کر اُس کے پیچھے بھاگتی رہے لیکن وہ کبھی کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے جو اُن کی زندگی میں ایک نیا باب کھول دے۔ سُدرشن ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ خوبصورت، خوش مزاج، ہمدرد، نیک، ذہین اور محتاط! سوشل لائف پر ذرا سی بھی آنچ نہ آنے دینے والا!

کتابوں کی اِس فرم میں انگریزی کا ایک مصنف کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ وہ میرا کو دیکھ کر اُسے اپنے مطالعے اور علم سے مرعوب کرنے کی کوشش کیا کرتا۔ میرا اُس کے رویے کو پسند نہیں کرتی تھی۔ یوں بھی وہ جس طرح کا ادب تخلیق کرتا تھا، اُس سے میرا متاثر نہیں ہوتی تھی لیکن وہ اُس کی باتیں سننے میں ناگواری نہیں دکھاتی تھی۔ اِس بات پر سُدرشن بہت چڑتا تھا۔ وہ اکثر میرا سے کہا کرتا ـــــــ "یہ آدمی تم سے محبت کرتا ہے۔ تم اِسے لفٹ کیوں نہیں دیتیں؟"

میرا جانتی تھی، سُدرشن کے لہجے میں حسد کی آمیزش جھلکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سُدرشن کو چڑانے کے لئے اُس مصنف کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرتی تھی۔

اِسی طرح ایک اور شخص زیدی تھا جو اُس کے ڈیڈی کا دوست تھا۔ وہ دونوں کبھی برما کے فرنٹ پر اکٹھے رہے تھے۔ بے حد شراب پینے والے اور لطیفہ گو شکار کے دلدادہ۔ وہ اُس کے ڈیڈی کا ہم عمر ہوتے ہوئے بھی بہت چارمنگ تھا۔ میرا اُس کے بارے میں یہی لفظ استعمال کیا کرتی تھی جس سے سُدرشن کی آنکھوں میں عجیب سی بے چینی پیدا ہو جاتی۔ اُس کی باتوں سے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُسے دُنیا بھر کے مسلمانوں سے نفرت ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اُس کے کتنے ہی دوست مسلمان تھے۔ میرا جانتی تھی وہ غیر متوازن صرف اِس لئے ہو جاتا ہے کہ وہ زیدی کی جان بوجھ کر تعریف کرنے لگتی ہے۔ صرف اُسے چھیڑنے کے لئے اور اُس کی بے چینی سے لطف اندوز ہونے کے لئے۔

جب میرا سچر سُدرشن کی بیوی سے ملی تو اُس نے اُسے بھی حسد کی آگ میں جلتے پایا۔ اُس نے میرا سے ملنے سے پہلے ہی یہ سمجھ رکھا تھا کہ میرا نے اُس کے شوہر کو ہڑپ لیا ہے۔ بہت سی عورتیں اپنی تنگ نظری کی وجہ سے خود اعتمادی کھو بیٹھتی ہیں اور پھر ساری زندگی کڑھتے ہوئے گزار دیتی ہیں۔ میرا سچر نے میاں بیوی دونوں ہی کو احمق سمجھا لیکن اُن کے ساتھ تین برس ہنسی خوشی گزار دیے۔

جب وہ امریکہ میں وسکانسن یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی تو ساؤتھ انڈیا سے ایک نوجوان شیر علی اُس یونیورسٹی میں پڑھنے کے لئے آگیا تھا۔ وہ مائننگ انجینئرنگ کا کورس کر رہا تھا۔ چندارم قصبے کا سیاہ فام لیکن بے حد دلکش اور سڈول مرد تھا۔ آنکھوں میں شرافت، سنجیدگی اور تعظیم طلب وقار لئے ہوئے۔ اُس کا سلسلۂ نسب اُسی علاقے کے ایک برہمن گھرانے سے ملتا تھا۔ میرا کو اِس بات کا احساس بہت دیر بعد میں ہوا کہ اُس نے شیر علی سے شادی محض انتقام لینے کے لئے کی تھی ـــــــ سُدرشن کمار بیری سے انتقام لینے کے لئے۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے ذکر سے بہت چڑتا تھا۔ وہ شیر علی کو بہت چاہتی تھی لیکن اُس سے شادی کرنے کے بعد اُسے یہ بھی احساس ہوا کہ وہ سُدرشن کی زندگی میں داخل ہونے کا موقع کھو بیٹھی ہے۔ وہ اُس کی زندگی میں کیسے آسکتی تھی؟ تین سال اُس کے دفتر میں اُس کے ماتحت کام کر کے بھی وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ پھر بھی وہ ایک مبہم سی اُمید دل میں لئے ہوئے احساسِ محرومی کو تقویت پہنچاتی رہی۔ اُس نے سُدرشن کو اپنی شادی کی اطلاع نہ دی۔ کبھی کبھی اُس کے اندر فروتنی کا احساس شدید ہو جاتا اور وہ شیر علی کے ساتھ اچانک اُس کے سامنے جا کر کھڑا ہو جانے کی خواہش کرنے لگتی۔ آخر وہ ایک ایسے شخص کو زک کیوں نہ پہنچاتی جو اُس کے لئے کوئی قربانی دینے کے لئے تیار نہ ہو سکا تھا لیکن اُس پر اپنا حق ضرور سمجھتا تھا۔ ایک عورت کو آزادی سے اپنا فیصلہ کرنے سے آخر کیوں روکا جائے، چاہے وہ اپنا فیصلہ زیدی کے حق میں دے یا سُدرشن کمار کے!

شیر علی کو پا کر میرا بہت مطمئن تھی۔ وہ اکثر اپنے آپ سے کہا کرتی، وہ امریکہ میں تعلیم پانے نہیں آئی تھی، شیر علی کو ڈھونڈنے آئی تھی۔ وہ شیر علی جو اُسے اپنے ڈیڈی کے دوست زیدی میں بھی نظر آیا تھا اور اپنے باس سُدرشن کمار بیری کے اندر بھی۔

شیر علی مائننگ انجینئرنگ کی سب سے بڑی ڈگری لے کر ہندوستان آیا تو میرا بھی اُسی کے ساتھ چلی آئی۔ دونوں کے خاندان اِس شادی کے سلسلے میں خاموش رہے۔ دونوں طرف سے ناخوشی اور ناپسندیدگی کے ملے جلے جذبات تھے جیسے وہ جن قدروں کے گھیرے میں برسوں سے رہتے چلے آرہے تھے، اُس سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن میرا اور شیر علی کو اپنے اپنے خاندان کے ساتھ تو رہنا نہیں تھا۔ شیر علی کو بہار کی ایک کولری میں ملازمت مل گئی۔ وہاں کولری ہی کے ملنے کی ایک چھوٹی سی کالونی بن گئی تھی۔ بے حد سکون تھا۔ اُنھوں نے ڈیڑھ برس ساتھ گزارا پڑھے لکھے اور مہذّب لوگوں کے درمیان رہ کر اُنھوں نے سمجھ لیا تھا، زندگی یوں بھی گزاری جا سکتی ہے۔ اپنوں سے الگ رہ کر۔ اپنے جو محبت بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی لیکن ایک دن اچانک زمین کے نیچے دو سو فٹ گہری کان میں زہریلی گیس پھوٹ پڑی جس سے بہت سے آدمی مر گئے۔ شیر علی بھی اُنھیں میں تھا۔

میرا ایس علی کے لئے یہ حادثہ بے حد دل شکن تھا۔ وہ تو زمانے سے لڑ رہی تھی۔ اچانک اکیلی رہ گئی۔ شیر علی اور سُدرشن تو روز ہی مرتے ہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور مرتے ہیں اور کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق صرف اُس وقت پڑتا ہے

جب اُن کی موت کے ساتھ کوئی آدرش بھی مر جاتا ہے۔ جب کوئی تیز و تند جذبہ شکست کھا جاتا ہے۔ میرا اپنی ساری آن بان کھو کر، بے حد دکھی اور ٹوٹی ہوئی سی اپنے والدین کے پاس لوٹ آئی۔ اُس کے ڈیڈی اب فوجی سروس سے ریٹائرڈ ہو کر دلی میں بس گئے تھے۔ اُنھوں نے دلی سے دو سو میل دور راجستھان میں ایک جگہ فارم خرید لیا تھا۔ کبھی کبھی جیپ لے کر وہاں بھی چلے جاتے تھے۔ وہ اکیلے نہیں تھے۔ اُن کی ممی اُن کے ساتھ تھیں۔ لیکن میرا اب اِس گھر کی فرد نہ بن سکی۔ وہ یہاں بھی تنہائی محسوس کرنے لگی۔ ایک دن اُس دفتر میں جہاں وہ کبھی پہلے کام کر چکی تھی، اُس نے ملازمت کے لئے درخواست دے دی۔ اِس بار اُس نے ایک بڑے عہدے کے لئے درخواست دی تھی۔

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو میرا ایس علی چونک پڑی۔ اُس نے سامنے رکھے دونوں فون دیکھے۔ پھر انٹرنل مشین اُٹھا کر پوچھنے لگی ——— "ہیلو۔ کہئے!"

اُس کا اسسٹنٹ پوچھ رہا تھا ——— وہ فرم کے اسٹاف سے ملنے کے لئے باہر کب آئے گی۔ فرم کے ملازمین اُس سے اپنا تعارف چاہتے تھے۔ اُس نے کہہ دیا: باری باری سب کو اندر بھیج دو۔"

چند ہی منٹ میں اُس کے سامنے باری باری کئی لوگ آئے۔ بوڑھے، ادھیڑ اور نوجوان۔ کچھ چہرے اُس کے جانے پہچانے تھے۔ کچھ بالکل نئے تھے۔

ایشر سنگھ جوڑیار، ہاتھ جوڑ کر بولا ——— "میں نے میم صاحب جی! آپ کو اِس دفتر میں کام سکھایا تھا۔ یاد ہے؟ آپ نے ایک بار ایک بل میں سو روپے کم لگائے تھے۔ معاف کیجئے گا ——— غلطی ہر آدمی سے ہو سکتی ہے۔ انسان غلطی کا پتلا ہے۔"

تبت پر چین کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہاں سے بھاگا ہوا ایک تبتی رفیوجی بھی اب اِس دفتر میں ملازم تھا۔ جب وہ لاماؤں کے ایک قافلے کے ساتھ یہاں آیا تھا، آٹھ سال کا بچہ تھا۔ اب یہاں تعلیم پا کر اِس فرم کا پبلسٹی انچارج بن گیا تھا۔ اُس نے اہلِ تبت کی روایتی انکساری سے میرا ایس علی کی جھک جھک کر تعظیم کی اور اُسے اپنی محنت اور وفاداری کا یقین دلایا۔

دو بالکل نوخیز لڑکیاں جو سیلز ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھیں، اپنی دلکشی اور خوش پوشی کی وجہ سے میرا ایس علی کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ اُس نے دونوں لڑکیوں سے کئی سوالات کئے۔ اُن کی تعلیم، اُن کا تجربہ اور اُن کی مشکلات اور مستقبل کے متعلق کچھ پوچھا، جس کا جواب اُنھوں نے ہنس ہنس کر دیا۔

آخر میں اسسٹنٹ نے آکر اطلاع دی: "اب صرف ایک ہی شخص رہ گیا ہے جو آپ سے نہیں مل سکا۔ وہ مسز بینا بیری ہیں۔ وہ ابھی ابھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر کہیں چلی گئی ہیں۔ اُنھیں تلاش کیا جا رہا ہے۔ اُن کے آتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔"

بینا بیری کا نام سُن کر میرا ایس علی چونک اُٹھی۔ بولی: "کیا وہ کبھی یہیں کام کرتی ہے؟ اِسی دفتر میں؟"

اُس کی نظر پھر تصویر کی طرف اُٹھ گئی۔ سُدرشن کمار بیری کی تصویر کی طرف۔

اُس کے اسسٹنٹ نے بتایا: "جی ہاں! جب سے بیری صاحب نہیں رہے اُنھیں یہیں جاب دے دی گئی ہے۔ کیا کرتیں بیچاری؟ اور کوئی آسرا نہیں تھا اُن کا۔"

میرا ایس علی نے جیسے بے خیالی میں کہا ——— "اچھا ہے، اچھا ہے، وہ یہاں ہیں تو میرے لئے بھی اچھا ہے۔ میرا بھی جی لگا رہے گا۔ کسی زمانے میں میری فرینڈ بھی رہی ہیں!"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کر اپنے کیبن سے باہر آگئیں۔ ہال کے دونوں طرف کے رنگ میں نگاہ دوڑائی۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

اُس کی نظر ایک میز پر گئی جو خالی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُس کے اسسٹنٹ نے اُس کے اندازے کی تائید کی کہ بینا بیری کی جگہ وہی ہے اور پھر جلدی جلدی کچھ لوگ اُس کی تلاش کے لئے اِدھر اُدھر دوڑے۔

میرا ایس علی اُس خالی میز کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ کچھ دیر بالکل ساکت کھڑی رہیں۔ پھر اچانک اُنھوں نے دیکھا، دفتر کے سبھی لوگ ایک ہی طرف دیکھنے لگے ہیں۔ کاریڈور سے ملے ہوئے دروازے کی طرف!

میرا ایس علی نے اُدھر دیکھا تو چونک پڑی۔ بینا بیری دھیرے دھیرے چلی آرہی تھی۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی۔ جنھیں وہ بار بار رومال سے پونچھتی چلی آرہی تھی۔ اُس کی نظریں بھی میرا ایس علی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ قریب پہنچی تو میرا ایس علی نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اُن کی اپنی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ وہ اُس سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اُس کے لب کپکپا کر رہ گئے اور وہ اُس کے کاندھوں پر اپنا بازو ڈال کر اُسے لئے لئے اپنے کیبن میں چلی گئی!!

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ایم۔ اے

یہ جو قول و قرار ہے، کیا ہے — شک ہے یا اعتبار ہے، کیا ہے
عشق کی یادگار ہے، کیا ہے — ایک ٹوٹا مزار ہے، کیا ہے
کس کو سمجھے کوئی نمودِ بہار — برگ ہے، گل ہے، خار ہے، کیا ہے
کچھ جو اٹھتا ہے دل میں رہ رہ کر — ابر ہے یا غبار ہے، کیا ہے
کیف میں ڈوبی نرگسِ جادو — مست ہے، ہوشیار ہے، کیا ہے
نیچی نظروں میں کچھ تبسم سا — شوخ ہے، شرمسار ہے، کیا ہے
زیرِ لب اک جھلک تبسم کی — برق ہے یا شرار ہے، کیا ہے
کوئی دل کا مقام سمجھاؤ — گھر ہے یا رہگزار ہے، کیا ہے
پھول ہے یا چراغ ہے کوئی — یہ جو روئے نگار ہے، کیا ہے
عشق مجبور مالکِ تقدیر — جبر ہے اختیار ہے، کیا ہے
بادۂ زندگی سے عالم کو — نشہ ہے یا خمار ہے، کیا ہے
آب و آتش سے یہ خمیرِ چمن — ہے خزاں یا بہار ہے، کیا ہے
تر و سوزاں ہیں جس سے یہ پلکیں — اشک ہے یا شرار ہے، کیا ہے
جس سے سینہ ہے خار خار اپنا — اک گلِ نوبہار ہے، کیا ہے
زندگی کا رکا رکا وقفہ — بس ترا انتظار ہے، کیا ہے
یہ زمان و مکاں کی صد چاکی — دامنِ تار تار ہے، کیا ہے
پچھلے کو یہ فضا کی محویت — کوئی شب زندہ دار ہے، کیا ہے
گردشِ مہر و ماہ و دورِ حیات — ایک رقصِ شرار ہے، کیا ہے
زندگی جس کو اک زمانہ ہوا — آج تک بیقرار ہے، کیا ہے
نہ کھلا یہ کہ سامنا تیرا — دید ہے، انتظار ہے، کیا ہے

جس کو کہتے ہیں لوگ شعرِ فراق
میر ہی کا شعار ہے، کیا ہے

چراغ گُل کردو

نورشاہ

ہسپتال روڈ۔ درگہ جن۔ سرینگر

۲۷ مارچ ۱۹۶۶ء

برادرِ محترم!

... تازہ ترین تخلیق "چراغ گُل کردو" ارسالِ خدمت ہے۔ یہ ایک لمحے کی کہانی ہے۔ لمحے فانی بھی ہوتے ہیں اور امر بھی لیکن یہ لمحہ ساکن ہے اور مجھے بے حد پیارا ہے۔ اس لمحے میں میں نے اپنی زندگی کا ایک اجنبی سا رُوپ دیکھا ہے۔ شاید آپ کو بھی پسند آئے!...

آپ کا بھائی ——— نورشاہ

یہ خاموشی بھی کبھی کبھی بے حد اجنبی سا رُوپ اپنا لیتی ہے اور جب کسی کسمساتے سے لمحے میں دل کی آواز بن جاتی ہے تو ہر شئے اپنے وجود کا اظہار چاہنے لگتی ہے، جیسے پھُول کی معطر پتیاں، جھیل کی ٹھنڈی ٹھنڈی بانہیں، جیسے بادل سیاہ آنچل میں مُنہ چُھپاتے ——— پھُول اپنی خوشبو اس لئے بکھیرتے ہیں کہ کسی کا ذہن معطر ہو۔ جھیل کی لہریں اس لئے اُمڈ اُمڈ کر ہاتھ پھیلاتی ہیں کہ کنارے کے دل میں گدگدی ہو۔ بادل اس لئے اُمڈ اُمڈ کر آتے ہیں کہ دھرتی کے وجود میں اپنے آپ کو سمو دیں ——— سب سراپا اظہار بن جاتے ہیں۔

ازل سے ابد تک یہ سلسلہ رواں دواں ہے!

کاش زندگی اور اُس کی محبت ایک گونگا لمحہ ہوتی۔ خاموش خاموش، بے زبان، بے درد سا لمحہ!

یہ میری باتیں نہیں۔ صوفیہ کی سوچیں ہیں۔ صوفیہ نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا۔ کہہ بھی کیسے سکتی تھی۔ کمروں کے درمیان ایک ویران سے برآمدے کا فاصلہ تھا لیکن اب یہ سب کچھ سوچنے سے کیا حاصل؟ وہ لمحہ تو میں دُور پہلگام کی فضاؤں میں چھوڑ آیا ہوں۔ وہ لمحہ اب کیسے واپس آسکتا ہے۔ زاہد بھی ابھی تک نہیں آیا۔ وہ جانتا ہے کہ میری ہر شام لابیلا میں گزرتی ہے۔ بس اب آتا ہی ہوگا۔ ابھی تو شام کی سُرخی باقی ہے۔ ابھی تو یہاں کوئی نہیں۔ صرف میں ہوں تنہا ——— وہ ایرانی رقاصہ بھی نہیں جو لابیلا کے چکنے فرش پر رقص کرتی ہے۔ اُسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ جھرنوں کی یاد آتی ہے جو اُچھل اُچھل کر لپک لپک کر بہتے ہیں لیکن... یہاں بات تو جسم کی نمائش کی ہے۔

"ایک کافی؟"

"سر! کافی؟"

میرا جانا پہچانا ویٹر حیران ہو رہا ہے۔ بے وقت کی چیز طلب کی ہے۔ اُسے کیسے سمجھاؤں کہ میری جیب میں ایک روپیہ ہے، صرف ایک روپیہ! ایک کافی اور ٹپ۔ میں اپنی ساری کی ساری رقم پہلگام کے ریسٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں چھوڑ آیا ہوں۔ جانے کیوں یہ پہلگام کا نام بار بار ذہن میں رقص کرنے لگتا ہے۔ میں تو خود ہی وہاں سے چلا آیا۔ خود ہی اُن ٹھنڈی معطر و معنبر فضاؤں سے بھاگ آیا۔ زاہد کے ساتھ بھی آسکتا تھا۔ وہ بھی تو آج ہی آنے والے تھے۔ شاید اب تک آ بھی گئے ہوں۔

"ہاں ایک کافی!"

جانے آج وہ ایرانی رقاصہ کہاں ہے؟ انگریزی موسیقی کی دُھن پر رقص کرنے لگتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی حسین جسم لکیر بن کر بکھر رہا ہو اور اُس بکھرے ہوئے جسم کے ایک ایک تار سے مسحور کُن خوشبو پھیل رہی ہو لیکن یہاں کوئی نہیں۔ نہ خوبصورت جسم اور نہ عریاں رقص کی خوشبو۔ زاہد اب بھی نہیں آیا۔ پہلگام کے بس اسٹینڈ کے قریب مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا اور پھر میں نے تو اُسے کہا تھا کہ شام کو لابیلا میں ملوں گا۔ شاید صوفیہ نے کچھ کہا ہو۔ کیا کہا ہوگا؟ پھر بھی تو اُسے اب تک آجانا چاہئے تھا۔ اقبال اور بنسی نظر نہیں آرہے ہیں۔ بنسی سارا دن کافی ہاؤس میں بے معنی سی باتیں کرکے اب کہیں اکیلا چائے پی رہا ہوگا اور اقبال ——— اُس کی تو بات ہی نرالی ہے۔ کسی لڑکی کے آگے پیچھے بھاگ رہا ہوگا۔

لڑکی کی بات پر مجھے کلپنا یاد آرہی ہے۔ سرو قد کلپنا! جو مجھے گلمرگ میں فیروز پور نالے کے پاس ملی تھی۔ کلپنا مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ پہلے بھی اُسے دیکھا تھا لیکن دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ دیکھنے اور پہچاننے میں فرق ہے۔ اب کی بار میں نے اُسے قریب سے دیکھا اور پہچانا۔ کلپنا ایک گیت ہے۔ خالص کشمیری گیت! کشمیر کی رنگت لئے، کشمیر کی خوبصورتی لئے۔ کشمیر کی زندگی سے بھرپور گیت ——— کلپنا، ہاں کلپنا، جو مجھے فیروز پور نالے کے پاس ملی تھی۔

ہلکی ہلکی سی بارش میں بھیگتے ہوئے ہم دونوں ایک ساتھ کلب آئے۔

"میں بیئر پی لوں گا اور تم؟"

"چائے!"

"ویٹر ——— ایک بیئر اور ایک چائے۔"

"تم کہانیاں لکھتے ہو نا؟"

"ہاں کبھی کبھی کہانیاں بھی لکھتا ہوں۔ تم کیسے جانتی ہو؟"

"یہ بتانا کیا ضروری ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تمھاری ایک کہانی حال ہی میں پڑھی تھی۔"

"کون سی کہانی؟"

"دیو اور شہزادی!"

بارش کی آواز کلب کی چھت پر جلترنگ بجا رہی ہے اور ایسے میں جی چاہتا ہے کلپنا کے تراشیدہ ہونٹوں کی لالی کو ایک بار چرا لوں لیکن کیا کروں۔ باہر بارش ہو رہی ہے اور اندر میرا سارا وجود بھیگ رہا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"ایک گیت کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیسا گیت ہے وہ؟"

"خالص کشمیری گیت جیسے . . ."

"ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں!"

"یہ شہزادی کون ہے؟"

"شہزادی ——— تم نہیں جانتیں؟"

"نا۔"

"تم نے وہ گیت سنا ہوگا۔"

"کون سا گیت؟"

"اُس شہزادی کے بارے میں جو جھیل کے پانیوں میں اپنے دیو کی صورت تلاش کر رہی تھی اور جب دیو . . . !"

"میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟"

"ہوٹل ——— میرا منگیتر سرینگر سے آ رہا ہوگا۔"

دیو اور شہزادی کی یہ کہانی کتنی پرانی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی اُس کا جنم ہوا ہو۔

"آپ کی کافی؟"

کافی ——— اب میں شراب پینا چاہتا ہوں۔ یہ شراب میرے جسم کو فرار کی راہ پر لے جاتی ہے۔ اُس راہ پر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میڈیکل کالج کی وہ چھوٹے سے قد والی نوراں میرا انتظار کر رہی ہے۔ بھرا بھرا سا جسم اور چھوٹے چھوٹے قدموں کی چاپ والی نوراں! لیکن اِس راہ پر جو نشان نظر آتے ہیں یہ میرے قدموں کے نشان نہیں ہیں۔ نوراں کے بھی نہیں ہیں۔ یہ نشان تو پہلے ہی سے یہاں موجود ہیں یہ نشان آسد کے ہیں جو پہلے ہی فرار کا ایک طویل راستہ اختیار کر چکا ہے۔ نوراں بھی اب یہی راستہ طے کر کے اسد سے جا ملنا چاہتی ہے اور میں ——— میں بھی نوراں سے جا ملنا چاہتا ہوں۔ پر نوراں ایک جال ہے۔ نہایت ہی نرم و نازک جال میں اُس جال میں اُلجھنا نہیں چاہتا۔ میں ایک بار اُس میں اُلجھ گیا تو اسد کا کیا ہوگا؟

"ایک بات کہوں نوراں؟"

"کہئے۔"

"تم اسد سے محبت کرتی ہو نا؟"

"ہاں۔"

"تو مجھ سے مت ملا کرو۔"

"کیوں؟"

"بتا دوں؟"

"جانے دیجئے۔ میں جانتی ہوں آپ جو بتا دینا چاہتے ہیں۔"

"تم کچھ بھی نہیں جانتیں نوراں۔ ہر خوبصورت شئے کو دیکھ کر میرے دل میں گدگدی سی ہوتی ہے اور تم تو جاندار شئے ہو نوراں! ڈولی میں بیٹھ کر اپنے اسد سے جا ملو۔ فرار کا راستہ طویل ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمھارا راستہ روک لوں۔"

لیکن میں یہ سب نوراں سے کیسے کہہ سکتا ہوں!!

زاہد نہیں آیا۔ اب تو شام کی سُرخی بھی ختم ہو چکی ہے۔ ہوٹل میں اب

زندگی کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں اور چکنے فرش پر ایرانی رقاصہ کا رقص شروع نہیں ہوا ہے۔ سگریٹوں کا دھواں نہیں بکھرا ہے۔ الائچیوں کی سی خوشبو نہیں پھیلی ہے۔ قہقہوں کی جھنکار نہیں ہے۔ جسموں کا انبار نہیں پھیلا ہے۔ نیم عریاں لباسوں میں حُسن جلوہ بار نہیں ہے ——— بس میں ہوں۔ بے حد شراب پینا چاہتا ہوں اور جیب میں صرف ایک روپیہ ہے!

"Hello my Sleepy boy"

یہ آواز ایرانی رقاصہ کی ہے۔ وہ شاید مجھے بُلا رہی ہے لیکن خود نظر نہیں آتی۔ کیا رقص ختم ہو چکا ہے۔ کیا لوگ جا چکے ہیں ——— یہ کیسی نے لباس کی سرسراہٹ ہے۔ اِس سرسراہٹ میں یہ کیسا جادو ہے؟

اور قریب آؤ ——— !

یہ سرسراہٹ مجھے پھر دھیلا کے ماحول سے باہر پہلگام کی فضاؤں میں لے جا رہی ہے۔ جہاں میں جُھک جُھک کر ویران سے برآمدے کے اُس پار دیکھ رہا ہوں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور اُس پر ریشم کا باریک نیلگوں پردہ لٹک رہا ہے۔ بہکی اور گرم سانسوں کی مہک میں یہ کیسا جادو ہے کہ مدھم سی روشنی میں بھی کمرے کی ہر شئے صاف صاف نظر آرہی ہے۔

میں ٹھہر ٹھہر کر اپنے دل سے پُوچھ رہا ہوں۔

"یہ سب کیا ہے؟"

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟؟"

دل خاموش ہے لیکن میں بھیگے ہوئے تعفّن اور رات کی تاریکی کا بھاری پن محسوس کر رہا ہوں۔ میرا سارا وجود تھرتھرا رہا ہے۔

"صوفیہ! ——— صوفیہ بیگم یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

صوفیہ نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ کہہ بھی کیسے سکتی ہے۔ کمروں کے درمیان ایک ویران سے برآمدے کا فاصلہ ہے لیکن میں پردے کی سرسراہٹ میں یہ سب کچھ محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے ہر شئے اپنے وجود کا اظہار چاہتی ہے، اُسی طرح صوفیہ کا دودھیا بدن بھی اپنی سیمابی حرکت کے ساتھ اپنے وجود کا اظہار کر رہا ہے۔ بھرپور اور قیامت خیز اظہار ——— میں دیکھ رہا ہوں، صوفیہ بیگم جدوانے کے باریک پردے کے سامنے لگی کھڑی ہے۔ اپنے سارے جسم کو ہلا رہی ہے۔ جیسے انجانے میں کوئی ستار کے تاروں کو آہستہ آہستہ چھیڑ رہا ہو۔ یہ سراپا، جیسے شیش ناگ سورج کی نرم و گرم تابناک کرنوں کے سامنے خود کو سنوار کر آیا ہو۔ وہ بار بار اپنے موٹے رس بھرے ہونٹوں کو برف جیسے سپید سپید دانتوں سے چبا رہی ہے۔ جیسے وہ چلّا چلّا کر کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن ہونٹ دل کا ساتھ نہ دے رہے ہوں اور پھر یہ خود سپردگی کا اظہار کر تیل کو آگ کی شہ نہ لگ جائے۔

میری سانس تیز تیز چل رہی ہے۔ آنکھیں جھپکا رہا ہوں، آنکھیں مسل رہا ہوں لیکن صوفیہ اور کمرے کی ہر شئے اپنی جگہ موجود ہے۔ شاید آنکھیں مسلنے سے حقیقتیں بدلا نہیں کرتیں بلکہ اور بھی نکھر کر دلکش ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔

صوفیہ کی طرح ——— وہ بے قرار ہے، مضطرب ہے۔ آسودگی کی تلاش میں ہے اور میں برآمدے کے اِس پار دوسرے کمرے میں بیٹھا اُس کی بے کلی اور بے قراری کو دیکھ رہا ہوں۔

مختصر سا فاصلہ۔ ایک قدم آگے بڑھنے کی بات ہے، ایک لمحہ اور ایک بار پھر یہ سب کچھ میرا ہوگا!

میں سوچ رہا ہوں ———

لمحے فنا ہوتے ہیں اور امر بھی، میرا لمحہ کون سا ہے۔ برآمدے کے اُس پار دروازے پر لٹکے ہوئے پردے کی سرسراہٹ قائم ہے۔ برآمدے کے اِس پار میں ہوں۔ اکیلا، تنہا۔ پہلگام کی فضاؤں میں لِدر کے کنارے پیاس سے ہانپ رہا ہوں۔ یہ کیسی پیاس ہے کہ میٹھے ٹھنڈے پانی کے ہوتے ہوئے بھی جیسے پیاس بُجھانے سے مجبور ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے اب صوفیہ کی ساری تشنگی خود میرے وجود میں سمٹ کر آرہی ہو۔ ابھی ابھی یہ لمحہ بھی فنا ہو جائے گا۔ فاصلہ خود بخود طے ہوگا اور . . . !!

اور میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً احساس کے جھروکے میں ایک صورت اُبھری۔ یہ زاہد کی صورت ہے اور زاہد میرا دوست ہے اور صوفیہ اب میرے دوست زاہد کی بیوی ہے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ زاہد کو دیکھ کر یہ جھونکا تو دہ بن جاتی ہے۔ سرد اور بے جان! اُس وقت اِس کے جذبات کِن خوابوں میں بکھر جاتے ہیں، کِن اندھیروں میں کھو جاتے ہیں اور مجھے دیکھ کر وہ پُرانی کہانی کیوں دُہرانا چاہتی ہے۔ میں تو اُس کہانی کو بھول چکا ہوں۔ اِس لئے نہیں کہ صوفیہ سے مجھے محبت نہ تھی۔ اِس لئے بھی نہیں کہ اب میرے دل میں صوفیہ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ صرف اِس لئے کہ زاہد میرا دوست ہے اور صوفیہ ——— میں صوفیہ کو جانتا ہوں۔ جانے کب سے؟ کیسے؟ ایک لمبی داستان ہے۔ میں اُس داستان کو چھیڑ کر بھاگنا نہیں چاہتا۔ اب میرے پاؤں میں سکت نہیں۔ میں تھک چکا ہوں۔ اِتنا تھک چکا ہوں کہ نوراں کا راستہ بھی نہیں روک سکتا اور اسد پہلے ہی فرار کا راستہ اختیار کر چکا ہے۔ وہ اپنی منزل پر کھڑا نوراں کا منتظر ہے۔

ایرانی رقاصہ شاید بہت پی چکی ہے۔ وہ اب اِسی لئے رقص نہیں کر سکتی۔ اُس کا جسم بھی سو چکا ہے۔ سوتے سوتے بھی اُس کا جسم کتنا پُرکشش نظر آتا ہے۔

لیکن زاہد کہاں گیا ؟ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا ؟ کیا سوچے گا اگر اُسے معلوم ہو جائے کہ میں اور صوفیہ ——— میرا کیا دوش ؟ اُس زمانے میں زاہد صوفیہ کو جانتا بھی نہ تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ گواہ ہیں وہ خط جو میرے کمرے کی الماری میں بکھرے پڑے ہیں۔ ایک ایک لمحے کی داستانیں تصویروں کی صورت میں میرے البم میں سجی ہوئی ہیں۔

"میں نے سنا، کل رات تم گِر پڑے اور تمھارے سر میں سخت چوٹ آئی۔ سمجھ میں نہیں آتا آخر اتنی رات گئے گھر کیوں جاتے ہو ؟ اب تو برف بھی جم چکی ہے۔ اس شدید سردی میں رات گئے تک گھر سے باہر رہنا کیا مطلب ——— اپنی صحت کا خیال رکھو، میرے لئے . . ."

مجھے یہ بھی اُس رات میں گِر پڑا تھا۔ اب میں صوفیہ کو کیسے بتاتا کہ زاہد سے اُس رات تمھاری شادی طے ہو چکی تھی۔ وہ اُس لوک کہانی کا دیو بن چکا تھا اور تم شہزادی . . . !!

نہ سہاگ گیت گائے گئے، نہ ڈھولک اور شہنائیاں بجیں، نہ بینڈ باجے اور آتش بازی۔ نہ رنگ برنگے پھولوں کی محرابیں بنیں۔ بس ایک دیو آیا اور اپنی شہزادی کو جادوئی گھوڑے پر بٹھا کر لے گیا اور میں خاموش رہا۔ کیونکہ زاہد میرا دوست تھا———

ہاں زاہد میرا دوست ہے۔

"رات بہت ہوگئی اور آپ کی کافی بھی ٹھنڈی ہوگئی۔"

"میں انتظار کر رہا ہوں کسی کا۔"

"صاحب! وہ سب آئے تھے، جن کا آپ کو انتظار ہے۔"

"تمھارا مطلب ؟"

"ایرانی رقاصہ ——— نفیسی اور اقبال اور . . ."

"اور . . . ؟"

"وہ زاہد کے ساتھ تھی۔"

"میں صوفیہ کو پوچھ رہا ہوں۔"

"میں صوفیہ اور زاہد ہی کی بات کر رہا ہوں۔"

"پھر یہ روشنیاں کیوں ہیں ؟"

"صرف آپ کے لئے۔ ہوٹل کے دروازے بند ہیں۔"

"ایک لمحے کے لئے یہ روشنیاں بجھا دو !"

"کیوں ؟"

"تاکہ میں اپنی محبت کو چور دروازے سے باہر لے چلوں۔"

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

غزل

حقی حزیں ایم۔ اے

ہوگئے دل پہ منکشف، تھے جو رموزِ زندگی
اُتنے ہی باخبر ہوئے بڑھ گئی جتنی بیخودی

عشق تمام گمرہی، حُسن تمام سرکشی
سارے جہاں سے دشمنی، اُف رے جنونِ آگہی

حُسنِ فسردہ میں بھی کچھ پائی نہ حُسن کی کمی
اُس رُخِ پُرملال کی بڑھ گئی اور دلکشی

اپنا ہی سوزِ باطنی کام نہ جب تک آسکا
کم نہ ہوئی کسی طرح دیدۂ و دل کی تیرگی

گاہ وہ بے رُخی میں بھی ایک ادائے التفات
گاہ وہ التفات میں ایک ادائے بے رُخی

اور بھی ہوگئیں فزوں عشق کی بے قراریاں
پوچھئے اور حالِ غم، کیجئے اور دلدہی

آج تو اُن کی یاد کا دل پہ اثر نہ پوچھئے
آج تو زخمِ کُہنہ میں آگئی جیسے تازگی

آہ یہ جبرِ عشق کا کتنا عجیب حکم ہے
دل میں ہو گو ہجومِ غم رُخ پہ رہے شگفتگی

جس کا خیال بھی حزیں نشترِ جاں سے کم نہیں
یاد نہ آئے اب ہمیں کاش وہ دَورِ زندگی

افسانہ

ہنی مون

پروفیسر ظفر احمد نظامی۔ ایم، اے

شعبۂ سیاسیات، گورنمنٹ کالج۔ شیوپوری (مدھیہ پردیش)

۱۸ر مارچ ۶۶ء — برادرِ محترم! آداب و تسلیمات

"بیسویں صدی" پابندی سے موصول ہوکر آپ کے الطاف و کرم کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے اور میں غالب کا یہ شعر؂

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

گنگنا کر رہ جاتا ہوں۔ کوشش کے باوجود اب تک دلی پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہوں۔ وہ کون سا دن ہوگا، جب میں اپنے ارادے کو تکمیل کا جامہ پہنا سکوں گا؟ آپ ہی بتایئے، دلی کی یادیں ذہن و دل پر مہریں ثبت کرچکی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہاں پہنچنے میں دیر ہورہی ہے؟ ——— سالِ نو سے کتنی توقعات وابستہ تھیں لیکن ابتدا ہی سے کتنے ناقابلِ تلافی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا! ملک کے نامور رہنما، شاعر اور سائنس داں کی اموات نے امیدوں پر برف برسادی ہے۔ کہاں پیدا ہوں گے آنجہانی شاستری سے مدبر اور امن پسند؟ کہاں سے لائیں گے ہم مرحوم اور زار ایسے شعرا کو اور کہاں نصیب ہوں گے بھابھا ایسے سائنس داں؟ اِن کی اموات صرف قومی ہی نہیں بین الاقوامی نقصان ہے، جس کی تلافی ناممکن ہے۔ "بیسویں صدی" میں اشاعت پذیر اشعار اِس حقیقت کے شاہد ہیں۔ میں نے کئی رسائل کو لکھا ہے کہ وہ مرحوم نمبر اور زار نمبر شائع کرکے انھیں خراجِ عقیدت پیش کریں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ ——— "احساس" پر خطوط کا سلسلہ جاری ہے۔ سبھی نے اِس موضوع کو پسند کیا ہے۔ خصوصاً یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنے خطوط میں اِسے سراہتے ہوئے اِسی موضوع پر آیندہ دوسری کہانیوں کی اشاعت کا مطالبہ کیا ہے ——— "بیسویں صدی" کی پچھلی اشاعتوں میں میں نے کچھ کہانیاں مشاعروں سے متعلق لکھی تھیں، جنھیں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اِن میں "آٹوگراف"، "الجھن" وغیرہ خاص تھیں۔ اِسی سلسلہ کی ایک کڑی "ہنی مون" ہے۔ میرا خیال ہے، ایک ہی موضوع پر مختلف کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں اور صرف ایک معمولی سی بات کہانی کی بنیاد بن سکتی ہے۔ محض اِسی خیال کے تحت میں نے اتنی ساری کہانیاں ایک ہی موضوع پر لکھی ہیں حالانکہ اِن کی فضا ایک سی ہے۔ آپ کی گرانقدر رائے کا منتظر رہوں گا ——— گرمیاں آپہنچی ہیں۔ شیوپوری قدیم مدھیہ بھارت کے "شملہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اِس لئے موسمِ گرما کے لئے یہ ایک خوشگوار مقام ہے۔ کسی پہاڑی پر جانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی ——— میں بہت جلد دلی پہنچوں گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنا "شملہ" چھوڑ کر آپ تک پہنچوں اور آپ کسی ہل اسٹیشن پر پہنچ چکے ہوں . . .

آپ کا بھائی ——— ظفر احمد نظامی

شادی ہوتے ہی میں نے ہنی مون کا پروگرام بنالیا۔ خوش قسمتی سے اِس کا موقع بھی جلد ہی ہاتھ آگیا تھا۔ مئی کے پہلے ہفتہ میں شادی ہوئی اور دوسرے ہفتہ میں ایک مشاعرہ کا دعوت نامہ مل گیا۔ بہت معقول رقم پر معاملہ طے ہوا۔ خاص بات یہ تھی کہ جس شہر میں مشاعرہ تھا وہ ہل اسٹیشن کی راہ میں واقع تھا۔ میں دل ہی دل میں بہت مسرور تھا کیونکہ بیوی پر رعب جمانے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ میں اُس پر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا سکہ جمانے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ میں نے مشاعرہ سے ملنے والی رقم میں ہنی مون منانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اخراجات اِس میں پورے ہو سکتے تھے۔

میں نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے اور بیگم کے ساتھ چل پڑا۔ اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے چکا تھا۔ اس لئے روانگی کے وقت تار دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بیگم کے ساتھ سفر کا پہلا موقع تھا۔ یہ بھی ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ اتنی جلد اتنے شاندار طریقہ پر کسی ہل اسٹیشن پر ہنی مون منانے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ میں نے ہل اسٹیشن کے بہترین ہوٹل میں کمرے کے ریزرویشن کے لئے خط لکھ دیا تھا اور تمام ضروری کارروائی مکمل کر لی تھی۔ مختصر سامان ساتھ لے لیا تھا اور مشاعرہ میں شرکت کے بعد آگے کے سفر کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ ٹکٹ دوسرے یا تیسرے درجہ کے بھی خریدے جا سکتے تھے لیکن اپنی بیگم کے ساتھ پہلی مرتبہ فرسٹ کلاس سے کم درجہ میں سفر کرنا شان کے خلاف تھا اور پھر مشاعرہ کے منتظمین پر بھی تو کچھ رعب جمانا تھا۔ مجھے کالج کا پروفیسر اور مُلک کا مشہور شاعر ہونے کے باعث اپنے معیارِ زندگی کی بلندی کا ثبوت دینا تھا۔

سفر پورے چوبیس گھنٹوں کا تھا۔ میں شام کے چھ بجے والی ٹرین پر سوار ہوا تھا تاکہ دوسرے دن چھ بجے تک مشاعرہ میں شرکت کے لئے پہنچ جاؤں۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ہونے کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ کے عذاب سے نجات مل گئی تھی۔ ہر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اُن کی پریشانی سے عبرت حاصل کرنے کا احساس بار بار ذہن و دماغ میں چکّر لگا رہا تھا۔ میں نے آمنے سامنے کی دونوں سیٹوں پر بستر پھیلا دئے۔ ایک پر بیگم کے آرام کا انتظام تھا اور دوسری میرے لئے تھی۔ میں نے راستہ کے لئے ناشتہ لینا مناسب نہیں سمجھا تھا اگرچہ گھر کے لوگ مُصر تھے کہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان ضرور رکھ لیا جائے تاکہ راستہ میں کام آسکے مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ سامان میں اضافہ ہو۔ پھر ڈائننگ کار کا استعمال فرسٹ کلاس کے مسافر نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔ اِسی خیال کے تحت میں نے کھانے کی کوئی چیز ساتھ نہیں لی تھی۔ پہننے کے کپڑے اور دوسری ایسی اشیاء ضرور رکھ لی تھیں جو ہل اسٹیشن پر پُرسکون دن گزارنے کے لئے کام آسکیں۔ راستہ کاٹنے کے لئے بہت سی کتابیں اور رسالوں کی فائلیں رکھ لی تھیں۔ اُن رسائل کی تعداد زیادہ تھی جن میں میری نظمیں شائع ہوئی تھیں یا جن میں میری تصاویر بڑے اہتمام سے شائع کی گئی تھیں۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ میں دوسروں پہ اپنی شہرت و مقبولیت کا سکّہ جما سکوں۔ ایسے تمام رسائل میں نے اپنی بیگم کی تحویل میں دے دئے تھے۔ وہ انہیں پڑھ کر سفر میں اپنا وقت گزار رہی تھیں۔

میں نے ہر اسٹیشن پر بیگم کے لئے کچھ نہ کچھ خریدا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں کسی طرح کی تکلیف ہو یا شکایت ہو۔ میں اسے ایک یادگار سفر بنا دینا چاہتا تھا۔ میں بیگم پر ظاہر کر دینا چاہتا تھا کہ میں اُسے کتنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ ڈبّہ میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ اس طرح ہم سمجھ رہے تھے کہ جیسے کمپارٹمنٹ ہمارے ہی لئے ریزرو کیا گیا ہو۔ ایک اسٹیشن پر ہم نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔ دوسرے اسٹیشن پر کھانا کمپارٹمنٹ میں آگیا اور ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں اور کھیتوں پر روشنی بکھری ہوئی تھی اور ہماری ٹرین اپنی مخصوص گڑگڑاہٹ کے ساتھ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی کرنیں آنکھوں سے ٹکرا کر دلوں کو سرور بخش رہی تھیں اور ہم دونوں پکنک کا لُطف اُٹھا رہے تھے۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا اور مشاعرہ والوں کا شکر گزار کہ اُن کی ادب نوازی کے باعث یہ موقع میسّر آگیا تھا۔ میں اُن مسافروں کا احسان بھی محسوس کر رہا تھا جنھوں نے آج فرسٹ کلاس میں سفر کرنا ملتوی کر دیا تھا یا جنھوں نے ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے کی زحمت نہیں کی تھی۔ رات اسی لُطف اور محویت میں گزرتی رہی۔ اور میں رومان پرور خیالوں سے ہمکنار رہا۔ میں نے سوچا، میری بیوی کتنی خوش ہوگی، جب وہ اسٹیج پر مجھے کلام پڑھتے ہوئے دیکھے گی اور اُس وقت اُس کی مسرّت کی انتہا نہ رہے گی جب سامعین میرے کلام کو سراہیں گے۔ ہال میں تالیوں کا شور ہوگا اور تحسین و آفریں کے فلک شگاف نعرے بلند ہوں گے اور میں نہ جانے کتنی نگاہوں کا مرکز بن کر رہ جاؤں گا۔ نہ جانے کتنی آنکھیں مجھ پر مرکوز ہوں گی اور اَن گِنت کان میرے الفاظ پر لگے ہوں گے۔ سیکڑوں دھڑکتے ہوئے دل میرے حسین اور رومان پرور اشعار پر دھڑک رہے ہوں گے۔ کتنے ہی ہونٹ سرد آہوں کا شکار ہو کر رہ جائیں گے اور ہزاروں آنچل شانوں سے ڈھلک جائیں گے۔

میں نے سوچا، اُس وقت کا عالم بھی کیا ہوگا، جب مشاعرہ کے اختتام کے بعد سیکڑوں پرستار اپنی نوٹ بکیں لئے مجھ کو صفحات میرے آٹوگراف سے سجانے کے لئے مضطرب ہوں گے۔ میں جلد جلد اپنے دستخطوں سے انہیں خوش اور مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرا احساس اُس وقت کتنا جاگ رہا ہوگا جب مہوشوں کے ہجوم میں میری بیوی مجھے گِھرا دیکھے گی اور عجیب عجیب خیالات کو اپنے دل

میں جگہ دے کر میرے بارے میں رائے قائم کرے گی۔ یقیناً وہ مجھے ایک ایسا ہیرو خیال کرے گی، جس کے سر مشاعرہ کی کامیابی کا سہرا ہوگا اور مشاعرہ کے بعد وہ مجھے مُسکرا کر مبارکباد دے گی۔ ساتھ ہی میری شاعری کے متعلق تاثرات کا اظہار کر کے مجھے مغرور بنا دے گی اور میں اُس سے صرف یہی کہوں گا کہ میری شاعری میں جو کچھ ہے تمہارا ہی دیا ہوا ہے۔ جذبات بھی تمہاری ہی دین ہیں۔

صبح ہوئی، میں نے ناشتہ منگایا اور چائے پیتے وقت اپنی بیوی سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہوگیا۔ اُسے مشاعرہ کے تجربات سے آگاہ کیا اور مختلف مشاعروں کے واقعات بڑھا چڑھا کر بیان کئے۔ دن میں مختلف اسٹیشنوں پر بہت سے مسافر ہمارے ڈبہ میں آئے اور چلے گئے۔ اُن کی موجودگی میں کتابیں اور رسائل ہمارے لئے بہترین رفیق ثابت ہوئے۔ پڑھتے پڑھتے جب نظریں اٹھا کر کبھی اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا تو وہ بھی مجھے کتاب یا رسالہ کی اوٹ سے دیکھ رہی ہوتی۔ جب وہ مجھے پڑھتی ہوئی دکھائی دیتی تو میں سمجھ لیتا کہ وہ میری ہی کوئی ہوئی نظم بڑی سنجیدگی سے پڑھ رہی ہوگی۔ اگر اُس کے ہونٹ ذرا بھی جنبش کرتے تو سوچتا کہ وہ میری ہی کسی غزل کا شعر گنگنا رہی ہے۔ اسی طرح راستہ کٹتا رہا۔ پانچ بج چکے تھے اور اب ہماری منزلِ مقصود قریب تھی۔

میں نے اپنی بیوی سے باتھ روم میں جاکر لباس تبدیل کرنے کے لئے کہا۔ اِدھر میں بھی سامان سمیٹنے میں مصروف ہوگیا۔ اُس نے سادہ سا لباس زیب تن کیا مگر وہ بھی اُس کے حُسن میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ میں نے بھی سوٹ تبدیل کیا اور خوب سج دھج کر سیٹ پر آبیٹھا۔ میں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ بہت سے لوگ استقبال کو وہاں پہنچیں گے۔

"کیا آپ پہلے بھی اِس شہر میں آئے ہیں؟" اُس نے سوال کیا۔

"نہیں، یہ پہلا اتفاق ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ انھیں پہچانیں گے کیسے؟"

"مشاعرہ کمیٹی کے بیج اُن کے سینوں پر آویزاں ہوں گے۔"

"پھر تو انھیں پہچاننے میں کوئی دُشواری نہ ہوگی۔"

"کچھ واقف کار بھی ہیں۔ اکثر ایسے بھی ہوں گے جو میری تصویریں دیکھ چکے ہوں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"

اور وہ خاموش ہوگئی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ عوام کے سامنے جانے کا اُس کا پہلا اتفاق ہے۔ وہ کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کر سکے گی۔

"ہم پلِ اسٹیشن کے لئے کب روانہ ہوں گے؟" اچانک اُس نے دریافت کیا۔

"بس کل ہی کسی گاڑی سے روانہ ہوکر پرسوں شام تک پہنچ جائیں گے۔"

"کتنا سفر ہوگا یہاں سے؟"

"یہی کوئی چوبیس گھنٹے کا۔"

"بڑا لطف آرہا ہوگا ان دنوں پہاڑ پر۔"

"کیا بات ہے۔"

گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہونے لگی۔ میں نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ یہاں بہت رش تھا۔ اتنی بھیڑ میں کسی کو تلاش کر لینا آسان کام نہیں تھا۔ اِس لئے گاڑی رُکتے ہی میں نے قُلی کو آواز دی۔ قُلی نے میرا سامان اُتار دیا۔ میں گاڑی سے اُترا اور بیگم کو بھی اُترنے میں مدد دی اور دیکھتے ہی دیکھتے کمپارٹمنٹ فرسٹ کلاس کے مسافروں سے پر ہوگیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لے کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اتنے طویل سفر میں کسی طرح کی دقت پیش نہیں آئی اور راستہ بہت آرام سے کٹ گیا۔ میں نے قُلی سے سامان ایک طرف رکھنے کو کہا اور بیگم کے ہمراہ منتظمین کا انتظار کرنے لگا لیکن مجھے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ رش کم ہو چلا تھا لیکن والنٹیر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سوچا ممکن ہے، انھوں نے بیج نہ لگائے ہوں اور سادہ لباس ہی میں مجھے تلاش کر رہے ہوں بہت سے آدمیوں کی نظریں مجھ پر پڑیں مگر میں کسی کو اپنا میزبان نہیں سمجھ سکا۔

"اب تک کوئی ہمیں لینے نہیں آیا؟" میری بیوی نے پوچھا۔

"معلوم نہیں کیا بات ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"پھر اب کیا ہوگا؟" اُسے تشویش تھی۔

"ممکن ہے انھیں گاڑی کا علم نہ رہا ہو کیونکہ میں نے صحیح وقت اور گاڑی سے مطلع نہیں کیا تھا۔"

میں نے صریحاً جھوٹ بول کر اُسے مطمئن کرنا چاہا کیونکہ یہ میرے وقار کا سوال تھا۔

"تو پھر کب تک یہاں کھڑے رہیں گے ہم لوگ؟"

"بس چلتے ہی ہیں۔"

"چلیں گے کہاں؟" اُس نے پھر تشویش کا اظہار کیا۔

"فی الحال کسی اچھے ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں۔ وہیں سے مشاعرہ میں چلیں گے۔"

"اور پھر؟"

"مشاعرہ سے واپسی پر یا تو اسی ہوٹل میں ٹھہریں گے یا پھر منتظمین کے ہمراہ [illegible] پر چلے چلیں گے۔"

میں نے قلی سے کہا کہ وہ ٹیکسی ٹھہرا کر کسی اچھے سے ہوٹل کا پتہ بتا دے۔ اُس نے ٹیکسی والے سے "ہوٹل ایمپیریئر" میں لے جانے کو کہا۔ یہ بہت شاندار ہوٹل تھا۔ دروازہ پر ایک چوکیدار نے ہمارا استقبال کیا جو یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ کاؤنٹر پر معلوم ہوا کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ چالیس روپیہ یومیہ کا ایک کمرہ مِل سکتا ہے۔ جو چند منٹ میں خالی ہونے والا ہے۔ میں نے سوچا، سفر کی تکان رفع کرنے کے لئے کیوں نہ اسی کمرہ کو لے لیا جائے۔ ایک ہی دن کی بات ہے۔ پھر قیام کے اخراجات کی ذمہ داری منتظمین پر عائد ہوتی ہے اور پھر بیگم کی موجودگی میں کسی قِسم کی بحث شان کے خلاف سمجھتا تھا، اِس لئے کرایہ میں تخفیف کا سوال فضول تھا۔ میں نے کسی اور ہوٹل میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ایڈوانس کے مطالبہ پر میں نے دیکھا کہ میرے پرس میں صرف چند روپے کے نوٹ باقی رہ گئے ہیں۔ میں نے سوچا، مشاعرہ کے اختتام پر چند گھنٹوں بعد یہ پرس پھر بھر جائے گا۔ اِس لئے صبح تک کے لئے کہہ دیا۔

کمرہ بہت نفیس تھا۔ بیگم کو بہت پسند آیا۔ اُس نے ہاتھ منہ دھو کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانا کھا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور میری بیوی بھی تیار ہو گئی۔ ہم نے اندازہ کیا کہ ہوٹل بہت معیاری ہے، کھانا بھی یقیناً مہنگا ہوگا لیکن اِس سے ہمیں کیا؟ منتظمین مشاعرہ کے لئے اچھا سبق ہوگا جنھوں نے اسٹیشن پر کسی کو نہ بھیج کر اپنی بے پروائی کا ثبوت دیا۔ خود ہی بھگتیں گے اب۔ ساڑھے نو بج رہے تھے معلومات حاصل کرتے کرتے میں نے ایک ٹیکسی لی اور نمائش کی جانب بڑھنے لگا۔ ٹیکسی سے اُتر کر نمائش میں قدم رکھا تو متعدد نگاہوں نے ہمارا پیچھا کیا۔ میں نے بے نیازانہ آگے قدم بڑھا دئے۔ وہ یقیناً میرے مدّاح ہوں گے۔ نمائش خوبصورت تھی۔ ایک جگہ میری بیوی کو چوڑیاں پسند آگئیں۔ میں نے فوراً خرید لیں حالانکہ بہت مہنگی تھیں۔ میں آگے بڑھ گیا۔ بے شمار نگاہیں ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔ میں کسی سے پوچھے بغیر آگے بڑھتا جا رہا تھا تاکہ مشہور شاعروں کی روایت برقرار رکھتے ہوئے تاخیر سے مشاعرہ میں پہنچوں۔ میں نے مہوشوں کے جھرمٹوں کو دیکھ کر سوچا، تھوڑی ہی دیر بعد یہ میرے مدّاحوں کی صف میں ہوں گی اور میرے آٹوگراف حاصل کرنے کے لئے دَوڑ دھوپ کر رہی ہوں گی۔

سامنے ہی عالیشان شامیانہ تھا جس میں ہزاروں آدمی جمع تھے میں اسٹیج کی جانب بڑھنے لگا لیکن وہاں تو شعراء کی جگہ کسی مزاحیہ ڈرامے کے کردار جمع تھے اور ہیروئن ہیرو سے رُوٹھ کر میکے جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے ایک شخص سے دریافت کیا۔

"کیوں بھئی، مشاعرہ کہاں ہو رہا ہے؟"

"کون سا مشاعرہ؟"

"جو نمائش میں ہوا کرتا ہے۔"

"وہ، ارے وہ تو کل ہو چکا۔ ۱۱ کو تھا نا، آج ۱۲ ہے۔"

دل و دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں سوچنے لگا، میں ۱۲ کے خیال میں کیوں رہا؟ ہنی مون کے پروگرام کا تعمیر شدہ محل گرتا ہوا دکھائی دیا۔ کیونکہ ہوٹل کی رقم کی ادائیگی تو رہی دُور، وہاں پہنچنے کے لئے ٹیکسی کا کرایہ تک موجود نہ تھا!!

غزل

علی احمد جلیلی ایم۔ اے

اے دوست مرے دم سے قائم ہے بھرم تیرا
یہ رنگ ترے رُخ کا میں نے ہی نکھارا ہے

کھیلے غمِ جاناں سے اُلجھے غمِ دوراں سے
شب یوں بھی بسر کی ہے، دن یوں بھی گزارا ہے

اے عمرِ رواں میری کچھ دیر کو تھم جانا
اُس نے مجھے چلمن سے کچھ کہہ کے پکارا ہے

سُنتے ہیں محبت کی بازی میں دلِ ناداں
کچھ ہار کے جیتا ہے، کچھ جیت کے ہارا ہے

ڈوبیں کہ اُبھر جائیں سوچا یہ نہیں اب تک
اُس سمت تلاطم ہے اِس سمت کنارا ہے

اے شمعِ اُمید اتنی بجھنے میں نہ کر جلدی
وہ دیکھ ابھی باقی اِک صبح کا تارا ہے

اُس شب پہ علی قرباں سو صبح کی تنویریں
جس کو کسی زُلفوں کے سائے میں گزارا ہے

طنزیہ

طِلسمی قالین

قرۃ العین حیدر، ایم۔ اے

۲۔ گراؤنڈ فلور۔ آشا محل۔ این، گماڈیا روڈ۔ بمبئی ۲۶

۲۹ر اپریل ۱۹۶۶ء

صاحبو!

اگر تم کو اپنے عہدِ طفلی میں اپنی دادی، اماں کی سُنائی ہوئی حکایاتِ ہند قدیم اور الف لیلے کے قصّے یاد ہوں تو یہ حقیقت تم پر روزِ روشن کی مانند روشن ہووے گی کہ ہمارے دورِ زرّیں میں بڑا زبردست ٹریفک مشرق کے نیلگوں آسمانوں پر اُڑن کھٹولوں، سورج کے سمان جگمگاتے ومانوں اور طلسمی قالینوں کا رہتا تھا۔ اُسی ہوشربا زمانے کی ایک لاثانی کہانی اس فدویہ کو بمشکل دستیاب ہوئی ہے جو تمہاری خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ یہ داستانِ جادو بیان کیا ہے، بھاکھا، ریختہ و زبانِ فرنگ کی بوقلموں گلکاری ہے۔ بالفاظِ دیگر ایک دل پسند کھچڑی ہے کہ ہر دانہ جس کا مثل اُس صدفِ بے بہا کے ہے، سُرمہ جس کا چشمِ عبرت وا کرنے کے واسطے لگایا جاوے۔

خاکسار ——— قرۃ العین حیدر

آج سے ٹھیک پونے بارہ سو برس پہلے کا ماجرا ہے کہ کشورِ ہند کی راجدھانی اندرپرستھ (کہ اب دلّی کہلاتی ہے) کے پالم وایو استھان پر سویرے سے خلقِ خدا حسبِ معمول جمع تھی۔ دیش کے مختلف شہروں، مُول استھانوں، اجے میرو، نو دویپ، کونارک، کانچی، متھیلا وغیرہ وغیرہ سے اُڑن کھٹولے آ آ کر اُترتے تھے یا ٹیک آف کر رہے تھے۔ وایو استھان کے پرتیکشالیہ میں مسافرانِ باکمال و خوش خصال مع اہل و عیال صندلی چوکیوں پر بیٹھے مصروفِ قیل و قال تھے۔ انٹرنیشنل فلائٹس کے حصّے میں کمبوج، چمپا، یاوادیپ، سنگھل پوری، مصر اور روما جانے والے تاجرانِ ستر راشٹریہ مچنگی منڈل کے سامنے موجود تھے۔ ایک طرف رقص و سرود کے جنوبی مرکز وینی شہر مدرائے کی رقاصاؤں اور گائیکوں کا ڈیلی گیشن، مانو اپسراؤں اور گندھروں کا پرا گاندھار جانے کے لئے گویا پر تولتا تھا تو دوسری طرف تامل ناڈ، آندھرا اور ونگ کے انٹلکچوئیل، مہا گجرات اور سوراشٹر کے بیوپاری، راجستھان کے دھنش دھاری سُورما اور مگدھ کے زمیندار منتظر اپنے اپنے اُڑن کھٹولوں کے تھے۔ نظریں سب کی گھڑی گھڑی آنگن میں گڑی، سونے سے گھڑی دھوپ گھڑی پہ گڑتی تھیں۔

اتنے میں ایک برق رفتار شہزادہ عمارت کے صدر دروازے پر آن کر رکتا ہے

اور اُس میں سے دو پُرشش بنارسی ستالیس بانہوں پہ سنبھلے اُترتے ہیں۔ یہ سجن کون ہیں؟ ایک ناٹا سا ہے اور دوسرا طرحدار کج کُلاہ جوانِ رعنا ہے۔ آ سمجھے! یہ دونوں ودیش منترالیہ کے کرم چاری ہیں۔ وہ دیکھئے، دونوں گمبھیرتا سے چلتے، رنگین کھمبوں کے درمیان سے گزرتے رن وے کی اور بڑ... اب مسافروں میں چہ میگوئیاں شروع ہوتی ہیں۔ آیئے ذرا ہم بھی سُنیں۔ یہ بھ نواسی کیا باتیں کر رہے ہیں؟

"کوئی ودیشی وی۔ آئی۔ پی آنے والے ہیں۔ ایسا مجھے جان" کوشل دیش کے ایک زمیندار نے پان کا بیڑا مُنھ میں رکھتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"بدیشی مہمان؟ ہے پرمیشور! یہ مہنگائی اور یہ راجہ جی کی بے پروائی! یہ دعوتوں کی فضول خرچی، یہ بڑھتی ہوئی آبادی اور یہ دھن کی بربادی۔ میں تو لوٹ کر واپس جاتے ہی ایجی ٹیشن آرمبھ کرتا ہوں" ونگ کے انٹلکچوئیل نے کہا۔

"دیش تباہ ہو رہا ہے بھائی!" دوسرے مسافر نے کہا۔

"اُتر والوں نے برباد کر دیا" تیسرے نے کہا۔

"اور دکھن والوں نے کوئی کم کسر چھوڑی ہے؟" پہلے مسافر نے بگڑ کر کہا۔

"شانتی راکھو بھائی۔ بھارت کی IMAGE خراب ہوگی" ایک گجراتی تاجر نے نرمائی سے پہلو گرا یا کہ یکایک آگئے آگئے!! "کا غل مچا اور سب باہر نکل کر آسمان کو دیکھنے لگے۔

"ہمارا اُڑن کھٹولہ راج ہنس پالم انٹرنیشنل وایو استھان پر اُتر اہی چاہتا ہے۔ آکاش پاتریوں سے پرارتھنا ہے کہ اپنے اپنے کمر بند کس لیں اور اپنے نرپل بجھادیں۔ دھنیہ واد" جلتے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑی میں ملبوس اور نئے فیشن کا گنبد نما اونچا سا جوڑا بنائے حسین وایو بالا نے اناؤنس کیا۔ مسافروں نے کمر بند باندھے اور نیچے جھانکا۔ کھڑکی سے شہر جگمگا رہا تھا۔ ایک اعلیٰ فوجی افسر نے باہر کی طرف قدم رکھا اور دی آئی پی روم کی طرف بڑھا۔ پائلٹ بلڈنگ کی طرف روانہ ہوا۔ ایک لمحے کے لیے وایو بالا اس سمت دیکھتی رہ گئی۔ یہ کیا! پائلٹ تو مدد دینے کی بجائے بڑا کبیدہ خاطر معلوم ہوتا ہے! اور پیالے کو کرودھ سے گھورتا ہے۔ خیر ہم اُسے یہیں چھوڑتے ہیں۔ وہ دیکھئے وایو بالا مہیلا پرتیک شالہ میں داخل ہوگئی جس کی دیواروں پر اندرپرستھ سوتنتر مہیلا سمتی کی طرف سے رچائے جانے والے مقابلۂ حسن" راشٹریہ سندری کون؟" کے پوسٹر لگے ہیں۔ "جمبودیپ کی سندری" کے خطاب کے علاوہ رُوما کی ایک ہفتے کی مفت سیر بھی مقابلہ جیتنے والی حسینہ کے انعام میں شامل ہے۔

ادھر دی۔ آئی۔ پی رُوم میں ودیش منترالیہ کے ناٹے کرمچاری اجنبی سے آئے ہوئے فوجی افسر کا سواگت کرنے میں جُٹے ہیں۔

"بغداد سے کوئی سندیش؟" فوجی افسر نے پوچھا۔

"ارجنٹ کبوتر آدھی رات اُدھر، آدھی رات ادھر۔ تب یہ سندیش بغداد سے لایا تھا کہ اسلامی خلیفہ کے نائب آج نہیں آپائیں گے۔" ناٹے کرم چاری نے جواب دیا۔

"کارن؟"

"ایران میں دنگا!"

"اوہ!"

"پرنتو۔۔ دوسرا کبوتر آج سویرے آن پہنچا۔ بایاں پنجہ اُس کا زخمی تھا۔ جان پڑتا ہے شترو نے اُس کی راہ کھوٹی کرنا چاہی تھی۔ پر مہاراج! اُس جیالے پنچھی نے سندیش ہمیں پہنچانے کے بعد ہی جان دی۔ سندیش ڈی کوڈ کر لیا گیا ہے۔ نائب خلیفہ آج دوپہر کو اندرپرستھ پہنچ رہے ہیں۔"

"جولی گڈ۔ شاباش! دی کیلف از اے ڈیم گڈ چیپ" فوجی افسر کہتا ہے۔

"فوجی سلامی کا پربندھ مکمل ہے۔" ناٹے کرمچاری نے رپورٹ جاری رکھی۔ "جنتا سواگت کے لئے موجود ہے۔ پاٹھ شالاؤں کے بالک پھول لے کر آرہے ہیں۔ پالم گاؤں کے کسان بھی برسنے کے لئے آچکے ہیں۔ وہ دیکھئے۔"

فوجی افسر نے وی آئی پی روم کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ جہاں ہوائی اڈے کے پیچھے بیل گاڑیاں کھڑی تھیں اور کسان آم کے درختوں کے نیچے اطمینان سے بیٹھے چلم پی رہے تھے۔

"ترجمان کا بندوبست؟" فوجی افسر نے سوال کیا۔ تب ناٹے کرمچاری نے اُس عجیب و غریب شخص کا تعارف کرایا۔ "شری مہیر کانت چترویدی۔ کاشی کے رہنے والے ہیں۔ خصوصیت یہ ہے کہ چار ودیشی بھاشاؤں کی جانکاری رکھتے ہیں — چینی، یونانی، لاطینی — اور عربی کی معلومات انہوں نے بغداد میں حاصل کی ہے۔"

"آپ بغداد کب گئے تھے؟" فوجی افسر نے اپنا نمک ذرا دلچسپی سے دریافت کیا۔

"تین سال اُدھر۔۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں میں بغداد گیا تھا۔" شری مہیر کانت چترویدی نے جواب دیا۔

"اوہ!" فوجی افسر خاموش ہوگیا۔ اُسی وقت ہند سمراٹ کے وِدیش منتری وی آئی پی رُوم میں داخل ہوئے۔ اور سرکاری پارٹی باہر نکل کر رن وے پر چلی گئی۔

آہا ہا! باہر کتنی رونق ہے۔ جنگل میں منگل ہے۔ بنارسی پوتھ نے تھان بچھا کر کیلے کے پتوں اور پھولوں سے سیلیوٹنگ سٹیپ دُلہن کی طرح سجایا جا رہا ہے۔ گھڑ سوار دستہ، ہاتھیوں کا ڈی ٹیچ منٹ اور ڈھال تلوار سے لیس پیادے اسٹیٹ ڈرائیو کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ تیر اندازوں کا گارڈ آف آنر ایسی جگہ چوکس ہے۔ جب شری مہیر کانت چترویدی ٹہلتے ہوئے دیسی اور ودیشی پترکاروں کی ٹولی کی طرف چلے گئے تو فوجی افسر نے دھیرے سے ناٹے کرمچاری سے پوچھا

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ وہی شخص تو نہیں جن کے بغداد میں خلیفہ ہارون الرشید کے ایک وزیر کی بیٹی سے جن کی دوستی کے کارن ہمارے دونوں دیشوں کے بیچ چند ڈپلومیٹک اُلجھنیں پیدا ہوگئی تھیں؟"

"وہی ہیں مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ ان سے بہتر ترجمان۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" فوجی افسر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"میں سول سروس کی مجبوریاں سمجھتا ہوں۔"

اُدھر منتری جی نے سیکورٹی کے انتظام کا جائزہ لینے کے لئے چاروں

نظر ڈالی اور مسافروں کے ہجوم میں رلے ملے مداریوں، مسخروں اور سادھوؤں کا بھیس بدلے سی۔آئی۔ڈی کے عملہ کو پہچان کر اطمینان کی سانس لی ——— اتنے میں دُور اُفق پر ایک نقطہ سا نمودار ہوا۔ مجمع نے تالیاں بجائیں اور ایک جواہر نگار طلسمی قالین بادلوں سے نیچے اُترنے لگا۔ قالین کے وسط میں گاؤ تکیے کے سہارے معزز مہمان آلتی پالتی مارے بیٹھے حقہ گُڑگُڑا رہے تھے۔ ایک آہو چشم فضائی کنیز دیبا و حریر میں ملبوس اپنا چہرہ آب رواں کے سیاہ نقاب سے پورا چھپائے معزز مہمان کے پیچھے کھڑی اُن کے سر پر مورچھل جھل رہی تھی۔ شاہی وفد کے دوسرے اراکین چند ملفوظات کے مطالعے میں منہمک تھے۔ دو زنگی غلام طلسمی قالین کے بالکل کنارے پر اکڑوں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ دوسری فضائی کنیز نے فواکہات کی طلائی قاب اور شربت کی بلوریں صراحی تپائی پر رکھ کر ایک شبک ریت گھڑی اُٹھاتے ہوئے اناؤنس کیا۔

"یہ قائم مقام امیرالمومنین! یہ ساعت طور ہے اور ہمارا طلسمی قالین "سحاب" دارالسلطنت اقلیم ہند میں پہنچنے والا ہے۔ ملتجی ہوں کہ اپنے کمر پٹکے کس لیں اور حقہ نوشی سے احتراز فرمائیں۔"

طلسمی قالین نے نہایت سہولت سے رن وے پر لینڈ کیا۔ نائب خلیفہ سلطنت عباسیہ نے اپنی عبا سنبھال کر بھارت ورش کی دھرتی پر قدم رنجہ فرمایا۔ ایک غلغلۂ تحسین و آفریں از زمیں تا چرخ بلند ہوا۔ دایو استھان کی شہ نشین میں مٹھی روشن بیوی کی نے سواگت کا راگ چھیڑا اور سیڑھیوں پر ہار لئے کھڑی چنچل ناریوں نے یہ مناجات گائی:۔

(سہیلیوں کا گانا)

تُو دا تا۔ دو دھاتا۔ تُو سب کا پالن ہار۔ تم پرواری بلہاری
توری لیلا اپرم پار۔ سب جگ تورا نام رٹت ہر دم۔
تو ہ پہ نثار۔ کرتار۔ کیسون ہار کیسی آئی بہار۔ رشکِ چمن
گلزار۔ ہے دینا ناتھ کرلو پار۔

اس کے بعد منتری نے آگے بڑھ کر نائب خلیفہ سے ہاتھ ملایا اور نمسکار کہا۔

نائب خلیفہ عرب دستور کے انوسار گلے ملے۔ چتر کاروں نے کمال سرعت سے اس منظر کا خاکہ کھینچا۔ وہ بوڑھا چترکار جسے اہم تقریبات کی نقاشی کے لئے خاص طور پر آندھرا سے راجدھانی بلایا جاتا تھا اور جس نے ایرانی سفیر کی محفل کی تصویر اجنتا کی ایک دیوار پر بنائی تھی، اُس وقت موجود نہ تھا۔ وہ ایک کلچرل ایکسچینج پروگرام کے تحت حکومت انورادھا پور کی دعوت پر لنکا گیا ہوا تھا اور اُن دنوں اپنی نگرانی میں سگریہ کے فریسکو تیار کروانے میں معروف تھا۔

گارڈ آف آنر کے معائنے اور خلافت عباسیہ اور ہند سرکار کے باہم دوستانہ تعلقات کے متعلق تقریروں کو چتر کاروں نے فوراً قلمبند کیا۔ عرب اور یونانی چترکار تندہی سے اپنے اسکرولز پر جھکے ہوئے تھے اور چینی چترکار کہ شاید ہیون سانگ کا پوتا تھا اور چھلاوے کی طرح ہر جگہ موجود ہوتا تھا، اپنے چین پٹے پر نقوش قابل دید بنا تا رہا۔

نائب خلیفہ اپنے ہمراہ دو ترجمان لائے تھے اس لئے شری مہیر کانت چتر ویدی کو جلد فرصت مل گئی۔ جونہی معزز شاہی مہمان اور اُن کی پارٹی راج محل روانہ ہوئی شری مہیر کانت چتر ویدی مہیلا پر تیک شالیہ کے دروازے پر گئے اور آہستہ سے آواز دی: "ہے غزالہ!۔ ہے برگ نینی پہ بیلے!" ——— پر کوئی جواب نہ ملا۔

(ناظرین۔ مہیلا پر تیک شالیہ کے اندر تخت پر بیٹھی ایک ماہ جبین کی ایک آنکھ ہنستی ہے دُوجی آنکھ روتی ہے اور مُنہ سے وہ گاتی ہے۔ ہاں، ہاں، خوب سمجھے۔ یہی فضائی کنیز غزالہ ہے۔ اس کی ساتھی یعنی فضائی کنیز ریحانہ اسے دلاسہ دیتی ہے)

فضائی کنیز ریحا:۔ پردیسی کا کرے دل نہ لگاتی نادان۔ اب کیوں ہوتی ہے حیران؟"

آہو چشم غزالہ:۔ "دیکھو خدا کی شان! ذرا سنو تو بہن! باہر کون گا رہا ہے؟"

ریحانہ:۔ (کان لگا کر سننے کے بعد) "کوئی بھی تو نہیں ہوا ہوگی۔"

(باہر سے مہیر کانت چترویدی کے گانے کی آواز آتی ہے)

غزل حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ

(ایمن کلیان تین تال)

مہیر کانت۔ زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو ———

غزالہ:۔ (خوشی سے اُچھل کر) "ہاں! وہی ہیں۔ وہی ہیں!"

مہیر کانت:۔ "شبانِ ہجراں دراز چوں زُلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ"

غزالہ:۔ "سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں"

مہیر:۔ "چوں شمع سوزاں، چوں ذرہ حیراں، ز مہر آں ماہ گشتم آخر"

غزالہ:۔ "نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں، بھیجیں پتیاں"

مہیر:۔ (دروازے کے پاس جاکر) "غزالہ! میں آگیا!"

وہ پری رُو، غیرتِ ماہ، قمر رخسار، غنچہ بدن، غیرتِ حُور، آفتِ جان، غارت گرِ ہوش، قیامتِ صغریٰ روش بدوش فوراً باہر آئی اور مہیر کو دیکھ کر رُخ روشن سے نقاب سرکائی۔ ایک دم سارا دایو استھان منور ہو گیا۔

غزالہ:۔ (آسمان کی سمت آنکھیں اُٹھا کر)

بھجن راگنی بھیروی۔ تال جت

"اپنا پرایا سب ہی چھوڑا، رانی سے چکرانی کہائی
کیسے دُکھ موہے دین بدھاتا سنکٹ ہر تو میرا رے "

مہیر کانت چتر ویدی :- خدارا جلد بتاؤ۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ میرا تو دل ڈوبا جاتا ہے "

غزالہ :- "تو سنو! میری ایک کنیز کی بہن دی رائل بغداد میجک کارپٹ کارپوریشن میں فضائی کنیز ہے۔ رشوتِ کثیر ہیروں کے گلوبند کی اُسے دے کر راضی کیا کہ بہانہ علالت کا کرے اور مجھے اپنی جگہ بھیج دے۔ شکر ہے اُس نیلی چھتری والے کا کہ کامیاب رہی اور تمہاری صورت دیکھی۔

(مہیر کانت گم سم کھڑے اُس آفتِ روزگار کو تکتے رہے)

غزالہ :- اے صاحب! کچھ تو کہو۔ منھ سے بولو۔ سر سے کھیلو۔ تمہاری اس طویل خاموشی سے اِس بندی کا کلیجہ منھ کو آ رہا ہے!"

مہیر کانت :- (کھنکار کر) "خلیفہ بغداد اور تمہارے پوجیہ پتا جی کو جوں ہی پتہ چلا قیامت آجائے گی۔ قومی اندیشہ یدھ چھڑ جانے کا ہے!"

غزالہ :- (لرز کر آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے) "نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔ دنیا کے عوام امن چاہتے ہیں!"

تب مہیر کانت چتر ویدی نے حسبِ حال یہ شعر پڑھا ؎

ناقہ چلا ہے نجد میں لیلےٰ کا بے مہار
مجنوں کی بن پڑے گی اگر ساربان نہ ہو

"پیارے مہر! اِس شعر کا کیا مطلب ہے؟" اُس کمسن دوشیزہ نے معصومیت سے پوچھا۔

(نوٹ مصنف :- بوجہ سنسکرت کا مہیر بہ معنی سورج اور فارسی کا مہر بہ معنی سورج ہونے کے یہ ماہ پارہ ہمارے چندے آفتاب چندے مہتاب ہیرو کو مہر ہی کہتی ہے اور ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں)

"میجک کارپٹ کے crew کو اشوکا دھرم شالہ میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ آؤ وہیں چل کر سوچتے ہیں کہ اب کیا کیا جائے" مہیر کانت نے جواب دیا۔

اپنی وفادار سہیلی ریحانہ کو وہیں لیڈیز روم میں سوتی چھوڑ کر غزالہ، مہر کانت کے ساتھ دبے پاؤں والو استھان سے باہر نکلیں۔ عمارت کے پچھواڑے مہیر کانت کا رخش تیز گام کمال خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔ ہمارے ہیرو نے نازک بدن غزالہ کو اپنے آگے اسپ پر بٹھایا اور وہ وفادار و باشعور حیوان پلک جھپکتے میں ہوا ہو گیا۔

داستان میں یہاں پہنچ کر صنفِ نازک کی ڈھلمل یقینی پر ایک نصیحت آموز مقالہ تحریر کرنے کے بعد راوی لکھتا ہے کہ جس وقت وہ دونوں اشوکا جانے کے بجائے پالم کی سڑک پر دوسری سمت کو اُڑے جا رہے تھے تو اُس ماہ رُو نے بھارت اور دُنیا کے سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد یوں تقریر کی ——— "اِس ملک میں ستی کی رسم اگر خلافِ قانون قرار نہیں دی گئی ہے تو میں اپنے اِس فیصلے پر فوری نظرِ ثانی کر جاؤں گی" اِس کا جواب مہر کانت نے کیا دیا راوی لاعلم ہے کیونکہ گھوڑا بہت دُور نکل چکا تھا۔

(تالیاں)

اب ہم ناظرین کو پالم والو استھان واپس لاتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ یہاں ایک کلائمکس پیش آ چکا ہے۔ اسٹیٹ ورنٹ کے ہنگامے میں عباسی ڈپٹی گیسٹ کا ایک فرد پالم ہی پر رہ گیا ہے۔ یہ مردِ عاقل اُن بیش بہا تحائف کی نگرانی میں مصروف تھا جو خلیفۂ بغداد نے ہندوستان کو بھیجے تھے۔ چلتے جلوس کے کنفیوژن میں شاہی مہمان راج محل روانہ ہو چکے تھے اور یہ اجنبی کہ مقامی زبان نہ جانتا تھا لہٰذا کسی سے ہرگز نہ کہہ سکا، منھ تکتا تھا سچے موتیوں سے لبریز ہاتھی دانت کے صندوق پر مضطرب و پریشان بیٹھا تھا کہ ایک جوگی کو اُس کے حالِ زار پر ترس آیا۔ ستار بجا کر گاتے ہوئے اس کے نزدیک آیا اور بولا ——— "بچہ!"

(راگنی سورٹھ۔ تال جت)

مورکھ من کاہے گھبراتا
جھوٹھی رے دنیا جھوٹھی یہ مایا جھوٹھا مال خزانہ
مورکھ من ———

تس پہ اُس صاحبِ جمال (کہ نام اُس کا ابوالفضا سلمان بن سلیمان تھا) کی نرگسی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے اشاروں سے بتایا کہ طلسمی قالین کا پائیلٹ ہے، قافلے سے بچھڑ گیا ہے اور شہر جانا چاہتا ہے۔ اب گرد اُس کے مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔ ایک مسافر سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر کو (کہ مونگ پھلی بیچنے والے کے بھیس میں تھا) بلا لایا۔ ابوالفضا سلمان نے اُسے وہ انگوٹھی دکھائی جو بغداد خفیہ پولیس کے چیف نے ایسے ہی مواقع کے لئے اُسے دی تھی۔ مگر انگوٹھی پر بھی عربی ہی کندہ تھی۔ سی۔ آئی۔ ڈی افسر کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا۔ تب شری مہیر کانت چتر ویدی کی ڈھنڈیا مچی۔

عین اُس وقت ہونی نے اپنی بنسی بجائی اور ایک چترنی ناری تیزی سے چلتی ہوئی اِدھر آئی کہ وہ بھی مہیر کانت چترویدی کی متلاشی تھی جن کا راج محل میں اس سمے انتظار کیا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک ملیالی اور ایک گجراتی تاجر نے تھوڑی سی کاروباری عربی جن کو آتی تھی، ابوالفضا سلمان بن سلیمان سے بات چیت کی اور فوراً حسینہ کو بلایا۔

یہ حسینہ نام جس کا کماری سنہہ لتا تھا، ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ کی پبلک ریلیشنز آفیسر تھی اور اپنے فرائضِ منصبی کے سلسلہ میں اکثر پالم آتی رہتی تھی۔

(جاننا چاہیئے کہ عموماً غیر ملکی سیاح عربستان، ایران، ترکستان، چین اور دنیا کے

روم سے بھارت وورشش آتے تھے کہ یونان وروم وعرب اسپین کے علاوہ بقیہ یورپ ابھی ندر ویلپڈ ممالک پرمشتمل تھا اور وہاں سے ٹورسٹوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا)

اب سُنیئے کہ چند گھنٹے پہلے اندرپرستھ کے راج محل کی سبھا میں مدرائے کی کماری ... پدما جب نائب خلیفۂ بغداد اور دوسرے شاہی مہمانوں کے سامنے بھرت ناٹیم کا مظاہرہ پیش کر چکیں تو منتری جی نے کماری سنہیہ لتا کو اپنے پاس بُلا کر آہستہ سے کہا تھا کہ شاہی مہمانوں کو اجنتا، ایلورا اور تالندہ وغیرہ کی سیر کرانے کے لئے سمراٹ کا ذاتی ائیر کنڈیشنڈ تیار کروایا جاوے۔ ونیز شری مہیر کانت چترویدی کل صبح شاہی مہمانوں کے ساتھ جانے کے لئے مستعد رہیں۔ شری مہیر کانت شاہی ضیافت میں موجود نہ تھے اس لئے کہ وہ ابھی تک پالم سے نہ لوٹے تھے۔ کماری سنہیہ لتا نرنت اپنے عبار فتار رتھ پر سوار ہوکر پالم دائیو استھان آئی تھیں مگر دویش منترالیہ کے چیف انڑپریٹر یہاں بھی موجود نہ تھے اور تبھی ملیالی تاجر نے کماری سنہیہ لتا کو اپنی طرف بُلایا اور ابو الفضا سلمان اور کماری سنہیہ لتا نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہلی نظر میں ایک دوسرے پر ہزار جان سے عاشق ہوئے۔

فوراً آنچل سے سر ڈھانپ کر اور نظریں جھکا کر اُس دلرُبا نے ٹوٹی پھوٹی یُونانی بھاشا میں ابو الفضا سلمان سے دریافت کیا "میں آپ کی مدد کرسکتی ہوں؟"

پہلے تو وہ گلفام گم سُم کھڑا اُس قتالۂ عالم کو تکتا رہا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ یونانی ہی میں اپنی بپتا سُنائی تو وہ کامنی یوں بولی ــــ "اچھا تو میں آپ کو ہٹوکا لئے چلتی ہوں۔ پر آپ کو ذرا انتظار کرنا پڑے گا۔ میں ایک ضروری کام ختم کرلوں۔ آئیے ــــ"

تب وہ ابو الفضا جی کو ساتھ لے کر دائیو استھان کے دفتر میں پہنچیں۔ ابو الفضا سلمان بن سلیمان ہال میں ایک چوکی پر ٹِک گئے اور وہ ڈائریکٹر جنرل ناگرک اُڑین دبھاگ کے کیبن میں چلی گئیں۔ پانچ منٹ بعد بہت ہی پریشانی سے باہر نکلیں اور گئیں سیدھی کمیونی کیشنز سیکشن میں۔ وہاں ارجنٹ کابک میں سے ایک کبُوتر نکالا منتری جی کے نام ایک پرچی لکھ کر اُس زیرک پرندے کے پنجے میں اٹکائی اور اُسے راج محل کی سمت اُڑا دینے کے بعد اُس مردِ شکیل یعنی ابو الفضا کے ساتھ پھر دائیو استھان کے مرکزی ہال میں آئیں۔

سجنو! مشہور انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیر کا مقولہ ہے کہ ــــ تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے۔ لیکن ہم کو واللہ معلوم نہیں کہ ان نوگرفتارانِ محبت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا عہد وبیان ایک دوسرے سے کئے۔ نہ ہم جاننا چاہتے ہیں۔ وہ شخص نہایت حمق سے بھرا ہے جو دو پریمیوں کے دل کا راز معلوم کرنا چاہے۔ چچا سعدی کہہ گئے ہیں ؎

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ مرغی کا پنجر تو مجھ کو بنا

اس کے باوجود بفرمائشِ شائقین اور ناظرینِ پُرتمکین کی تسکینِ ذوقِ سلیم کی خاطر اور کمپنی کی شہورتی کے لئے اُس سین کا فوٹوگراف کھینچا گیا ہے ــــ جب دو دل ایک ہوئے تو سُنیئے گا:۔

لاؤنی

ابو الفضا سلمان :۔ "سیدھے سے ہمارے سنگ
چلو کرو نہ ہم کو تنگ"

سنہیہ لتا :۔ "ہٹو چھیڑو نہ چھیڑو" (بطرز چلو کاہے کو جھوٹی ــــ)

ابو الفضا سلمان :۔ (تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر)

"آتا ہے نظر یہ رنگ   کرنا ہی پڑے گا جنگ"

ایک آکاش یاتری :۔ "اوہو۔ ہوتا ہے رنگ میں بھنگ! اوہو!"

سارے آکاش یاتریوں کا کورس :۔

"رکھیں گے تم کو یار ہم کر کر کے خوب پیار ہم
ہوں گے گلے کے ہار ہم دشکِ قمر چلو چلو"

اور عین اُسی وقت دُور بہت دُور، وہی جوگی ستار پر گا تا ہوا جا رہا تھا

"ہوئیں چار آنکھیں تو بے ساختہ اُن کی نظریں جھکیں مجھ کو حیرت ہوئی
دل کی لمبی کہانی ہوئی ختم[ل] یوں مجھ کو ہوش آگیا اُن کو حال آگیا"

القصہ وہ دونوں دائیو استھان سے شاداں وفرحاں باہر آئے اور رتھ پر چڑھنے لگے (زیر دو مس ہونے کے ناطے کماری سنہیہ لتا اپنا رتھ خود چلاتی تھیں) تو یہ ہم البتہ جانتے ہیں کہ کماری سنہیہ لتا نے کچھ سوال بطرز انٹرویو کئے جن کے جواب میں ابو الفضا جی نے کہا کہ وہ بقیہ تین شادیوں کا ارادہ ابھی نہیں رکھتے اور کماری سنہیہ لتا اگر چاہیں تو بیشک پردہ نہ کریں۔ ابو الفضا جی کے ان لبرل خیالات سے ہماری یہ حسینہ بہت متاثر اور پرسن ہوئیں۔ گھوڑوں پر چابک لہرایا اور رتھ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ (تالیاں)

اب اُدھر کی سُنیئے۔ پالم سے اُڑ کر کبُوتر ٹھیک اُس سمے راج محل پہنچا جب منتری جی اور بغداد کے وزیر کلچرل ایکس چینج کے معاہدوں پر دستخط کرنے میں مصروف تھے۔ کبوتر کھڑکی میں سے اندر آکر منتری جی کے سامنے بیٹھ گیا اور لگا غٹرغوں

ل؎ "ختم" کی جگہ "شروع" پڑھا جائے۔

غور و غوض کرنے۔ انھوں نے ترنت اُس کے پنجے سے پرچی نکال کر پڑھی اور وزیر سے معذرت چاہ کر فوراً سمراٹ کے کمرے میں پہنچے کر سمراٹ اور نائب خلیفہ دونوں بھوج کے بعد اپنی اپنی خوابگاہوں میں قیلولے کے واسطے جا چکے تھے۔

"مہاراج کی جے ہو!" منتری جی نے کھنکار کر کہا۔

"کہو منتری کیا بات ہے؟" سمراٹ نے سونے کے چھپر کھٹ پر کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"مہاراج! ابھی ابھی پالم سے سوچنا آئی ہے کہ شاہی اُڑن کھٹولہ سرونگ کے لئے گیا ہو ہے۔"

"تو کمرشل دمان چارٹر کرو۔" سمراٹ نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کردں۔"

"کہو۔"

"مہاراج! دوسری سوچنا کماری سنہیہ لتا نے یہ بھیجی ہے کہ اُڑن کھٹولہ کارپوریشن کے سارے پائیلٹ اور نیوی گیٹر آج شام ساڑھے پانچ بجے سے مہنگائی الاؤنس بڑھانے کی مانگ کے لئے اسٹرائک پر چلے گئے ہیں۔" اور اس سے پہلے کہ سمراٹ کی آتشِ غضب پوری طرح بھڑکے، منتری نے جلدی سے اضافہ کیا ــــ "مہاراج ــــ خلیفہ جی اپنے قالین پر سیر کے واسطے نہیں جاسکتے؟ میرا مطلب ہے ــــ"

"بڑی شرم کی بات ہے، بڑی شرم کی بات ــــ!!" سمراٹ نے گرج کر کہا ــــ "یہ ودیشی مہمان کیا کہیں گے۔ ساری دنیا کیا کہے گی۔ بھارت کا image (اور زیادہ گرج کر) تباہ ہو رہا ہے!"

"مہاراج! میں خلیفہ جی کے وزیر کو سچویشن سمجھا دوں؟" منتری نے مہاڈکھی ہو کر دریافت کیا۔

"ہاں، جاؤ ــــ" سمراٹ نے پژمردگی سے کہا۔ منتری جب دروازے تک پہنچے تو سمراٹ نے آواز دی "اور دیکھو ــــ پوری بات سمجھا کر کہنا۔ جوشیلے عرب آدمی ہیں۔ کہیں یہ سمجھ بیٹھے کہ اُن کی بے عزتی کی گئی ہے تو بیکار میں یُدھ چھڑ جائے گا۔"

الغرض منتری جی باہر آئے اور وزیر کو معاملہ سمجھانے کے لئے بات شروع کی ــــ "برکی جی ــــ" اُسی وقت وزیر کا حبشی غلام چپکے چپکے اُن کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ جب غلام اپنی کاناپھوسی ختم کر چکا تو وزیر نے آگ بگولہ ہو کر اتنے زور سے فرش پر اپنا پیر پٹخا کہ چھت کے جھاڑ فانوس اور زنگی غلام کے کانوں کے بالے زور زور سے ہلنے لگے۔ ترجمان نے فوراً منتری جی کو وزیر کے طیش کا سبب بتایا اور منتری جی لرزتے کانپتے اُلٹے پاؤں سمراٹ کے حضور میں پہنچے۔

"بڑا اچرج ہے مہاراج!" انھوں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ "نائب خلیفے کے جادوئی غالیچے کا پائیلٹ بھی لُپت ہو گیا!"

"لُپت ہو گیا! کیا کہتے ہو ــــ؟"

"مہاراج! وہ اشوکا پہنچنے کے بجائے کماری ــــ کماری سنہیہ لتا کے سنگ ڈرائیو پر چلا گیا اور اب تک غائب ہے!"

"کون ہے یہ سنہیہ لتا ــــ؟ کوئی وشو کنیا ہے؟"

"نہیں مہاراج! سول سروس کی لڑکی ہے۔"

"ہُوں۔"

"بڑا اچمبھا ہے مہاراج!"

"جاؤ منتری! ہم خاموشی چاہتے ہیں ــــ" سمراٹ نے آزردگی سے کہا۔ افزودنی ملالِ خاطر ہوئی اور چھپر کھٹ سے پاؤں لٹکا کر سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

منتری نے باہر آن کر گیلری میں کھڑے کن سوئیاں لیتے ہوئے اپنے چیف سیکریٹری سے کہا ــــ "اسی لئے کہتا تھا، استریوں کو اتنی سوتنترتا مت دو۔ مت دو۔ اب بیٹا بھگتو!" (قہقہہ)

مہیر کانت چترویدی، فضائی کنیز غزالہ بت ابوالخفقان، پائیلٹ ابوالفضا سلمان بن سلیمان اور کماری سنہیہ لتا پی۔ آر۔ او کی گمشدگیوں کی خبر دوسرے دن راجدھانی میں آگ کی مانند پھیل گئی۔ شہر کے ڈپلومیٹک حلقوں میں اس فرار کو دوسرے ہی معنی پہنائے جا رہے تھے کہ عباسی حکومت اور بھارتیہ ودیشی منترالیہ کے بہت سے اہم راز سلمان بن سلیمان اور مہیر کانت چترویدی کے پاس ضرور رہے ہوں گے، اور اب بڑا بھاری انترراشٹریہ گھپلا ہووے گا۔ خفیہ پولیس اُن کی تلاش میں ناکام رہی اس لئے کہ قیس و لیلے کے یہ چاروں سچے جانشین جانے کہاں اڑنچھو ہو چکے تھے۔ (نوٹ مصنف: لفظ "اڑنچھو" اُسی گھٹنا کے بعد سے نکلا ہے) عباسی وفد کا ہندوستان گیر دورہ منسوخ ہوا۔ اُڑن کھٹولہ کارپوریشن کا اسٹرائک جاری تھا۔ نائب خلیفہ اور اُن کی پارٹی بذریعہ کاروان بغداد سدھارنے والی تھی۔

پرنتو خوش قسمتی سے اِن چاروں عاشقانِ پاک طینت کے بھاگنے کا بھارت اور سلطنتِ بغداد کے دوستانہ تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایک ہفتہ بعد سمراٹ منتری جی اور دیگر اہلِ دربار مع گارڈ آف آنر راج محل کے پھاٹک پر کھڑے ہیں۔ راج پروہت روانگی کی شبھ لگن دیکھ چکے ہیں اور نگر کی چنچل ناریاں منگل گان گا رہی ہیں۔

(سہیلیوں کا گانا ــــ شہانہ۔ جھپ تال)

شبھ گھڑی شبھ دن سومنگل
بیٹھے اونٹ پر آج خلیفہ
آؤ سکل مل کر و بدائی

کنک کلس بھرنیک دھروا
شبھ گھڑی ———

حاضرین پر رقت طاری ہے۔ سمراٹ اور نائب خلیفہ بار بار رومال کو آنکھوں تک لے جا رہے ہیں اور ناک سنکتے ہیں کہ اتنے میں ——— یہ کیا؟ پھر ایک کبوتر اڑتا ہوا آکر منتری جی کے بائیں ہاتھ پر بیٹھ جاتا ہے۔ منتری جی پرچی کھول کر پڑھتے ہیں۔

یا نائب امیر المومنین! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

پوجیہ منتری جی! نمسکارم

سیوا میں ہاتھ جوڑ کر نویدن ہے کہ ہم چاروں تجھ سیوکوں کے رس بھرے امس افیم کو اعلیٰ درجہ کی سماج میں، دیشی لڑکیوں کو عموماً جنگ کے بعد حاصل کیا ہوا مال غنیمت ہی سمجھا جاتا ہے۔ کے سلسلے میں آپ کو مزید سنکوچ سے بچانے کے لئے اب امریکہ کو ہم جاتے ہیں۔ ابوالفضا سلمان بن سلیمان نے ایک دشمن ملک کا طاسی قالین بھی اس مقصد کے لئے ... ... کر لیا ہے۔ باقی یہ کہ کہے سنے کی معافی دیویں اور تھوڑا لکھے کو بہت سے بھی تصور جانیں۔

پلا ساقیا مالوے کی افیم
کہ کر آؤں گلگشت باغ نعیم

وعلیکم السلام نمسکارم"

منتری جی نے پرچہ مسکرا کر کے سمراٹ اور نائب خلیفہ کی خدمت میں پیش کیا۔

امریکہ چلے گئے! سمراٹ اور نائب خلیفہ نے یک زبان ہو کر سر ہلایا اور رومال سے آنکھیں پونچھیں۔

نوبت نے عباسی اور بھارتی قومی راگ بجائے۔

نائب خلیفہ اونٹ پر سوار ہو گئے۔

ٹھیک اسی وقت منتری جی کی عاقل بیٹی جو محل کی آخری سیڑھی پر شگون کی دہی مچھلی اور تیل باش کی روپہلی تھالی اور کٹوریاں لئے کھڑی تھی، زور سے چلائی۔

"بابا ——— بابا ——— یہ چاروں امریکہ کیسے چلے گئے۔ امریکہ تو ابھی تلک دریافت ہی نہیں ہوا ہے!"

واللہ عالم بالصواب

غزلیں

آخگر مشتاق رحیم آبادی

اگر قرب جبین و آستاں کچھ اور بڑھ جاتا
تو پھر کیا غم تمہارا ربطِ جسم و جاں کچھ اور بڑھ جاتا

نقاب رخ اٹھا دینے میں ایسی کیا قیامت تھی
فقط ہنگامۂ کون و مکاں کچھ اور بڑھ جاتا

مرے غم پر وہ مجبور کرم تو خیر کیا ہوتے
ستم ہی ہاں بنامِ امتحاں کچھ اور بڑھ جاتا

مجھے محرومِ عرضِ شوق ہی رہنا مبارک ہے
کہ کچھ کہہ کر حجابِ درمیاں کچھ اور بڑھ جاتا

ذرا دیکھا تو ہوتا دے کے اذنِ باریابی بھی
ترے سجدوں سے حسنِ آستاں کچھ اور بڑھ جاتا

اسیرانِ قفس پر برق گر احساں نہ کر دیتی
تو فصل گل میں رنج آشیاں کچھ اور بڑھ جاتا

اگر وہ بھی پسِ پردہ کہیں سے سن رہے ہوتے
تو پھر در پردہ لطف داستاں کچھ اور بڑھ جاتا

خرد مندوں کی بھی صحبت سے کیا حاصل تھا اے اخگر
مگر ہاں، رنجِ عمرِ رائیگاں کچھ اور بڑھ جاتا

کیف احمد صدیقی

محبت نے کیا ہے جب سے مانوسِ الم مجھکو
خوشی بن کر نظر آتا ہے اکثر تیرا غم مجھکو

نہ احساسِ مسرت ہے نہ احساسِ الم مجھکو
یہ کس منزل پہ لے آئی ہے میری شامِ غم مجھکو

جفاؤں میں تری اک دن وفا کا رنگ بھرنا ہے
ستم ہی پر ترے رکھنی ہے بنیادِ کرم مجھکو

کوئی تازہ خطا پھر مجھ سے سرزد ہونے والی ہے
اشارے کر رہی ہے پھر تری چشمِ کرم مجھکو

وہیں پر بیخودی میں خم جبینِ شوق کرتا ہوں
نظر آتا ہے جس جا بھی ترا نقشِ قدم مجھکو

بھری محفل میں مجھکو مسکرا کر دیکھنے والے
کہیں رسوا نہ کر دے آج میری چشمِ نم مجھکو

بجھا دیں آتشِ دوزخ کے جو بھڑکے ہوئے شعلے
عطا ہوں بابِ رحمت سے کچھ ایسے اشکِ غم مجھکو

سمجھ لو انقلاب آجائے گا سارے زمانہ میں
اگر کہنی پڑی اے کیف رودادِ الم مجھکو

ایک پُراسرار، دلچسپ رُومانی ناول — پانچویں قسط

سپنوں کی رہگذر میں

کرشن چندر، ایم، اے

اِس سے پہلے کیا ہوا؟

میرا نام موتی لال ناگر ہے۔ میں ایک مصوّر ہوں۔ ۱۹۵۸ء کے ماہ جون میں مجھے محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے بیدر واہ کی ہمالیائی وادی میں جاکر وہاں کے غاروں کی تصویریں نقل کرنے کا حکم ملا۔

بیدرواہ پہنچنے کے بعد میں گاؤں کے نمبردار روی داس کو لے کر غاروں کی طرف اپنے کام کے لئے چلا گیا۔

جس پہاڑ میں غار تھے، اُس پہاڑ کی سمت شمال اوپر پُرفضا گھاٹی پر نسیمہ کا کاٹج تھا۔ نسیمہ یہاں اپنے بے حد دولتمند لیکن علیل شوہر محمود کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک آتش زدگی میں چہرہ جل جانے سے محمود دُنیا سے روپوش ہوکر یہاں آگیا تھا۔ اُسے کینسر کا لاعلاج روگ بھی تھا۔ وہ دل و جان سے نسیمہ کو چاہتا تھا۔ نسیمہ بھی دس سال سے اُس کی خدمت کر رہی تھی لیکن اپنی جوانی کے تباہ ہونے پر غمزدہ تھی۔ محمود سے شادی کرنے سے پہلے اُسے ایک غریب نوجوان اکرم سے محبت ہوگئی تھی لیکن اُسے ٹھکرا کر اُس نے محمود سے شادی کرلی اور اب یہی شادی اُس کے لئے مصیبت بن گئی۔

رات کو قلعہ میں سونے کے بعد اچانک ایک تیز کافوری خوشبو میری ناک میں آئی اور میں اپنی دانست میں جاگ گیا لیکن بستر سے نہ ہل سکا۔ جو چرن کمل مُدتوں سے مجھے نظر آتے رہے تھے، وہی چرن کمل اُس وقت میرے قریب آرہے تھے۔ اُن پیروں کے اوپر ایک دُھندلی دُھندلی سفید ساڑی کا عکس دکھائی دیا اور پھر اُس سفید ساڑی کے آنچل میں چنبیلی کے سفید پھولوں کی طرح ایک پیارا لیکن سُتا ہوا چہرہ ـــــ اپنی گہری کالی آنکھیں مجھ پر گاڑے ہوئے وہ سپنوں کی حسینہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ۔ ۔ "مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ ـــــ میرا دم گھٹتا ہے۔ اِس قلعے کی دیواروں میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

اچانک میری آنکھ کُھل گئی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا لیکن وہ کافوری خوشبو چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ سارے قلعے کو چھان مارا، کوئی لڑکی نہ ملی۔

صبح میں گھبرا کر نیچے کا ڈاک بنگلہ دیکھنے گیا۔ شاید یہاں ہی رہنا پڑے۔ اُس کے بعد مندر دیکھنے گیا۔ مندر کی پجارن لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ بالکل وہی لڑکی تھی جو رات کو میرے خواب میں آئی تھی لیکن یہ لڑکی تو بول نہیں سکتی تھی اور رات کو جو لڑکی میرے پاس آئی تھی وہ بولتی تھی۔

شنکر نے بتایا کہ وہ اِس مندر کی پجارن لڑکی رتنا کی بڑی بہن شونتی تھی جو رات کو مجھے دکھائی دی تھی۔ وہی بھوت بن کر قلعے میں رہتی ہے۔ شنکر نے مجھے پُورا قصہ بتایا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک انگریز کلکٹر جافرسن یہاں شکار کھیلنے

کے لئے آیا اور ایک روز شونتی کو دیکھ کر خود اُس کے حُسن کا شکار ہوگیا۔ اُس وقت رتنا کی عمر صرف آٹھ نو سال کی تھی۔ جانسن صاحب نے شنکر کو روپے کا لالچ دے کر شونتی پر ڈورے ڈالنے چاہے لیکن شنکر نے انکار کر دیا۔ ایک رات شونتی مندر سے غائب ہوگئی اور دوسری صبح جانسن صاحب بھی قلعے سے ولایت کے لئے روانہ ہوگیا ـــــ اب وہ شونتی کو اپنے ساتھ ولایت لے گیا؟ یا اُس نے شونتی کو قتل کر کے اُس کی لاش قلعے میں کہیں گاڑ دی؟ اِس معاملے کی تحقیقات اِس لئے نہ ہوسکی کہ وہ تقسیم ہندوستان کے دن تھے۔ جبھی سے شونتی کی روح اِس قلعے میں بھٹکتی ہوئی اپنی رہائی کے لئے التجا کرتی ہے۔ اُس حادثے کے بعد شونتی کے باپ ہری داس نے خودکشی کر لی اور رتنا جو بالکل شونتی سے مشابہ ہے، وہ خوف اور دہشت سے گونگی ہوگئی ـــــ دوسرے دن رات کو مجھے شونتی پھر دکھائی دی اور رو رو کر مجھے مدد کے لئے پکارنے لگی۔ اُس کے بعد خود بخود غائب ہوگئی۔ میرے دل نے اُس کی پکار کا عجیب اثر لیا ـــــ اب میرا یہ معمول ہوگیا کہ جلد سے جلد اپنا کام ختم کر کے قلعے میں آکر رات کا انتظار کرتا۔ کیونکہ رات آئے گی تو شونتی آئے گی۔ سپنوں کی رہگزر پر چلتے چلتے مجھے شونتی کی روح سے عجیب و غریب نسبت ہوگئی تھی۔ جس رات مجھے شونتی اُس خواب اور حقیقت کے ملے جلے دھندلکے میں نظر نہ آتی تھی، اُس رات میں پاگل سا ہوکر قلعے کی چہار دیواری میں اُس کا نام پکارتا ہوا گھومتا تھا ـــــ شونتی نے مجھے کئی بار سمجھایا کہ وہ مر چکی ہے اور اب اُس کی روح اِس قلعے میں قید ہے اِس لئے میرا اور اُس کا ملاپ ممکن نہیں۔ کیونکہ بیچ میں موت کی کھائی ہے لیکن میں نہ مانا اور اپنی اُس دل گرفتگی کی وجہ سے بیمار پڑ گیا اور اتنا کہ دس دن تک ہوش ہی نہ آیا لیکن بخار کی اُس ہذیانی کیفیت میں بھی شونتی میرے پاس آتی رہی اور دن رات میرے بستر کی پٹی سے لگی میری تیمار داری کرتی رہی۔ اُس بے ہوشی اور سرسام کے زمانے کی بھی ایک ایک بات مجھے یاد ہے لیکن جب دس دن کے بعد میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میں قلعے میں نہیں ہوں۔ نیچے کے ڈاک بنگلے میں پڑا ہوں اور شونتی کی بجائے نسیمہ میری تیمار داری کر رہی ہے۔ نسیمہ نے مجھے بتایا کس طرح اطلاع ملنے پر وہ مجھے قلعے سے نکال کر یہاں لائی۔ اُس نے مجھے قلعے میں جانے سے روک دیا اور شنکر سے کہہ دیا کہ اگر پھر میں نے قلعے میں گھسنے کی کوشش کی تو فوراً نسیمہ کو خبر دے۔ نسیمہ کو یقین تھا کہ اب پھر میں نے قلعے میں قدم رکھا تو شونتی کی روح مجھے کھا جائے گی۔

اب آگے پڑھیے۔ ۔ ۔

دوسرے دن جب میں جاگا تو شنکر ایک گلدان میں لانبی لانبی ڈنڈیوں والے نرگسی پھول لگا رہا تھا۔ اِن پھولوں کو دیکھ کر مجھے شونتی کی آنکھیں یاد آگئیں ـــــ دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا۔ میں نے شنکر سے پُوچھا۔

"یہ پھول تم لائے ہو؟"

اُس نے انکار میں سر ہلایا ـــــ "رتنا لائی تھی۔"

"رتنا کون؟"

"شونتی کی بہن۔"

یکایک مجھے رتنا یاد آگئی جو ہوبہو شونتی سے ملتی تھی۔

"تو وہ اندر کیوں نہیں آئی؟"

"وہ کسی سے نہیں بولتی۔ بہت شرماتی ہے۔"

"بولتی کیوں نہیں؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے اُس حادثے کے بعد سے سہم گئی ہے یا کوئی ڈر اُس کے دل میں سما گیا ہے۔" شنکر نے سوچ سوچ کر کہا۔

"اُس وقت اُس بے چاری کی عمر آٹھ یا نو سال کی تھی۔ اب تو بول بھی نہیں سکتی۔ کسی سے ملنا جلنا ہے اُس کا۔ بس اپنی پُوجا پاٹھ میں مگن رہتی ہے۔"

شنکر نے گلدان میں پھول سجا کر میرے قریب تپائی پر رکھ دئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہزار آنکھوں سے شونتی مجھے دیکھ رہی ہے!

"اِس گلدان کو باہر لے جاؤ!"

شنکر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

"یہ پھول مجھے پسند نہیں" میں نے سسک کر کہا۔ میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔

شنکر گلدان باہر لے گیا۔

لیکن دوسرے دن پھر وہی پھول گلدان میں سجا رہا تھا۔

"اب کہاں سے آئے یہ پھول؟"

"وہی رتنا لائی تھی ——— اشارے سے بتا رہی تھی کہ بیمار بابو کے لئے ہیں۔"

"اس سے کہہ دیا ہوتا مجھے یہ پھول پسند نہیں ہیں"

"میں نے کہا تھا" شنکر بولا "لیکن اشارے سے مجھے سمجھانے لگی، صاحب کو پسند نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ مجھے تو پسند ہیں!"

"عجیب خبطی لڑکی ہے" میں نے نسیمہ کو یہ بات بتائی تو وہ بولی۔

"میرا خیال ہے، بہن کے اس خوفناک حادثے کے بعد سے اس لڑکی کا دماغ چل گیا ہے۔ مجھے تو کچھ باؤلی سی معلوم ہوتی ہے۔ عورتوں سے کتراتی ہے، مردوں کو دیکھتے ہی بھاگ جاتی ہے۔ ساری دنیا سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ —— خیر اُس مندر کے ساتھ بیس پچیس بیگھے زمین ہے۔ بے چاری کی زندگی کسی نہ کسی طرح کٹ جائے گی"

آہستہ آہستہ میں اچھا ہونے لگا۔

اب نسیمہ روز آتی تھی اور دن کا بیشتر حصّہ میرے پاس صَرف کرتی تھی۔ وہ نرسنگ کا کام تو ایسا سیکھ گئی تھی کہ میں اس کی مرضی کے خلاف ایک پتّہ نہیں ہلا سکتا تھا اور یہ کہنا پڑے گا کہ اُسے یہ کام بہت اچھا آتا تھا۔ اگر وہ بروقت میری تیمار داری نہ کرتی تو میں اب تک مُلکِ عدم سدھار چکا ہوتا۔

"تمھیں میرا نہیں، میرے شوہر کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ جس کی اجازت کے بغیر میں یہاں نہ آسکتی تھی"

"جب چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا تو سب سے پہلے محمود بھائی کا شکریہ ادا کرنے تمھارے ساتھ چلوں گا۔ اُن کا حال کیا ہے؟"

"بس ویسا ہی ہے۔ وہی طبیعت کا عالم ہے۔ خود ہی تو اصرار کرکے تمھارے پاس بھیجتے ہیں اور جب میں یہاں سے جاتی ہوں تو۔۔۔ اُداس۔۔۔ برہم۔۔۔ غصّے میں ڈوبے ہوتے۔۔۔ جلی کٹی سُنانے لگتے ہیں۔ کبھی تو میں چُپ ہو جاتی ہوں۔ کبھی میں بھی برس پڑتی ہوں۔ پھر ساری ساری رات خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ صبح جب میں اِدھر آنے کے لئے انکار کر دیتی ہوں تو معافی مانگنے لگتے ہیں۔ انسانیت کا واسطہ دے کر۔ خدا ترسی کا سبق پڑھاتے ہیں۔ اب کوئی کیا کہے اُن سے؟ جوں جوں مرض بڑھتا جاتا ہے، اُن کا مزاج بھی برہم ہوتا جاتا ہے"

"اکرم کی کوئی اطلاع ہے؟"

نسیمہ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ دیر تک مجھے گھورتی رہی۔ آخرکار بولی۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"کیا؟"

"میں نے تو ابھی تک محمود کو بھی نہیں بتایا لیکن تمھیں کیسے معلوم ہو گیا؟"

"کیا معلوم ہو گیا؟"

"یہی اکرم کے بارے میں؟"

"مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا"

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ ہم بالکل اکیلے ہیں تو اُس نے اپنی آواز کم کرکے، نیچے سُروں میں بہت راز داری سے مجھ سے کہا۔

"اکرم کے کئی خط میرے پاس آئے ہیں۔ معلوم نہیں اُس نے کیسے میرا پتہ معلوم کر لیا۔ وہ اب تک مجھے چاہتا ہے —— اب تک اُس نے شادی نہیں کی"

نسیمہ کی آواز میں نسائی غرور اور فتحمندی کی ایک جھلک تھی۔

"میں نے یہ خط محمود سے چھپا لئے ہیں" نسیمہ نے اور بھی گہری راز داری سے مجھ سے کہا۔

"تم نے اچھا کیا۔ اُسے بتانے سے کیا حاصل؟ طبیعت اور برہم ہو گی" میں نے کہا۔

"بیکار چیخیں گے۔۔۔ چلّائیں گے۔۔۔!! جھلّائیں گے۔۔۔!!!"

"بلا وجہ مجھ پر شک کریں گے" نسیمہ بولی۔ پھر رُک رُک کر بولتی گئی۔

"غصّے میں اپنا مُنہ نوچیں گے"

"یا برتن توڑیں گے۔ آدمی تو رہے نہیں ہیں اب وہ"

وہ بہت بیزاری سے بولی۔

"ہیئت کے ساتھ ساتھ روح بھی مسخ ہو چکی ہے۔ اُس آدمی کو خود تو شدید اذیت ہو رہی ہے لیکن جب تک وہ مجھے اُس سے دُگنی اذیت نہ پہنچا لے، اُس وقت تک اُسے چین نہیں آتا" نسیمہ کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے "محمود آدمی نہیں ہے —— آدمی کے بھیس میں شیطان ہے!"

"وہ بیمار آدمی ہے" میں نے احتجاج کیا "تم یہ کیسے بھول سکتی ہو کہ اتنی طویل اور شدید اور جان لیوا بیماری کے باوجود وہ آدمی اِتنا اچھا دل رکھتا ہے کہ ایک بالکل غیر اور اجنبی آدمی کی تیمار داری کے لئے تمھیں یہاں بھیج دیتا ہے"

"اور اُس کے بعد مجھے جو جلی کٹی سُنا تا ہے وہ تمھیں نہیں سُننی پڑتی ہے نا؟


آپ کی آنکھیں راز سے آگاہ ہیں!
ہاں! آپ کے چہرے کی دلکشی کے راز کو وہ بخوبی جانتی ہیں۔ وہ
ٹھنڈی افغان سنو سے پوری طرح مانوس ہیں — آپ کی
پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔ آپ کی آنکھیں آپ کے صحیح انتخاب کی معترف ہیں۔
افغان سنو
آپ کے چہرے میں خوشگوار تبدیلی لاتی ہے۔ ملاحت سے بھرپور
افغان سنو آپ کے چہرے کے داغوں کو صاف کرتی ہے۔ جھریوں اور
کیلوں کی الجھنیں ختم ہوجاتی ہیں۔ افغان سنو کا شکریہ — کہ اس کے
استعمال سے آپ کا چہرہ دن بھر تروتازہ اور جاذب نظر رہتا ہے۔
افغان سنو آپ کی پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔
ای۔ ایس۔ پاٹن والا — بمبئی۔ ۷۷

...نے تم یُوں کہتے ہو؟" نسیمہ جل کر بولی: "مجھے جلا کر خاک کر دیا ہے اُس نے۔"
نسیمہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگی۔
میں نے بہت ہوشیاری سے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد نسیمہ مُسکرانے لگی۔

کچھ دیر کے بعد میں نے اُسے اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کی کنجوسی کے لطیفے سُنانے ...ع کئے تو وہ قہقہے پر قہقہے لگانے لگی۔ وہ کنجوس لوگوں کے لطیفے سُننا بے حد پسند ...تھی۔

سارا دن ہم ساتھ رہے۔ ساتھ ہی لنچ کھایا۔ سہ پہر کو ندی کے کنارے گئے۔ ...آج اپنی صحت مندی محسوس کر رہا تھا کہ میں نے آج ہی نسیمہ کے گھر جا کر محمود کا ...کریہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔

نسیمہ آج بے حد خوش تھی۔ ایک عرصے کے بعد اُس کے اُداس اور حسرت ...چہرے پر مسرت کی سُرخی چمک رہی تھی۔ اُس کی ہنسی میں نوجوان لڑکیوں کی سی ...اپلی تھی۔

میرے لطیفے سُنانے پر وہ بار بار میرا ہاتھ پکڑ کر ہنسی سے دوہری ہوتی ...تی ——— "خدا کے لئے بس کرو! اور مت سُناؤ بس اور مت سُناؤ۔ اب ...سے ہنسا نہیں جاتا۔"

چلتے چلتے میں نے گھاٹی کی گھاس پر پھیلے ہوئے بنفشے کے ایک پودے ...فشہ کے پھُولوں کا ایک گچھا توڑ کر نسیمہ کے بالوں میں لگا دیا۔ وہ ترچھی نگاہوں ...میری طرف دیکھ کر بولی۔
"کیا یہ اظہارِ محبت ہے؟"
"نہیں اظہارِ عقیدت ہے!" میں نے عاجزی سے کہا۔
"اے بُزدل ہندو!" اُس نے گرج کر کہا۔
لیکن اُس کی گرج بالکل مصنوعی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مُسکرانے لگی۔ ...دریز ...پکڑ کر گھاٹی کا آخری حصہ چڑھ آئی۔ اب ہم رچرڈز کاٹیج کے سامنے کھڑے تھے۔
"رُک جاؤ!" نسیمہ نے مجھ سے کہا: "آؤ پہلے چہروں کو سنجیدہ بنا لیں۔ رونی ...شا اپنے آپ پر طاری کر لیں پھر اندر چلیں۔"
"کیا فضول باتیں کرتی ہو؟"
"میرا جی چاہتا ہے اِس گھر کو جلا کر خاک کر دوں!" نسیمہ دانت پیس کر ...پھر وہ چوبی گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ...بجری پر ہمارے قدموں کی چاپ ایسے سُنائی دینے لگی جیسے ہم کانچ کے ...ا پر چل رہے ہوں۔

پورچ میں کوئی نہ تھا۔ نوکر پیچھے کے نوکر خانے میں تھے۔ پورچ میں محمود کی آرام کرسی خالی تھی۔ کرسی کے پاس ایک تپائی پر محمود کا پائپ اور اُس کا تمباکو پاؤچ (Pouch) رکھا تھا۔

"محمود!" نسیمہ نے بشّاش لہجے میں اپنے شوہر کو آواز دی اور پورچ سے گزر کر اندر کے ہال میں گئی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے داخل ہوا۔
ہال کمرے کی چوبی چھت سے لٹکی ہوئی رسّی میں جھُولتی ہوئی، محمود کی لاش ہولے ہولے ہل رہی تھی۔

محمود نے غصّے میں اور شدید غیض و غضب کے عالم میں خودکشی کر لی تھی۔ چند منٹ پہلے وہ اپنی بیوی نسیمہ کے لئے ایک خط لکھ کر چھوڑ گیا تھا جس میں اُس نے اپنی بیوی پر بے وفائی اور ظلم کا الزام لگایا تھا۔

وہ ایک ہندو سے محبت کرتی تھی (یعنی مجھ سے) اور اگر اُس ہندو سے محبت نہیں کرتی تھی تو اکرم سے محبت کرتی تھی اور اگر اکرم سے بھی محبت نہیں کرتی تھی تو اپنے شوہر سے تو بالکل محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک بے حیا اور بے وفا عورت تھی جس کے ظلم و ستم سے عاجز آ کر محمود خودکشی کر رہا ہے۔

"اگر ہم چند منٹ پہلے آ جاتے تو شاید محمود کو خودکشی سے روک دیتے۔ کیونکہ باہر تپائی پر اُس کا پائپ ابھی تک گرم تھا۔" تین چار دن کے بعد میں نے نسیمہ سے کہا۔

"کیسے پہلے آ جاتے!؟" نسیمہ بھڑک کر بولی: "تم مجھے لطیفے جو سُنا رہے تھے اور میں تمھیں منع کر رہی تھی لیکن تم سُنائے چلے جا رہے تھے۔ احمق کنجوسوں کے لطیفے! تم نے دیر کر دی اور میرا شوہر بے چارہ ———" وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"وہ کئی برس سے تقریباً مُردہ ہو گیا تھا!" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا: "تم محض اُس کی زندہ لاش کو گھسیٹ رہی تھیں۔"

"میں گھسیٹ رہی تھی؟ تم تو نہیں گھسیٹ رہے تھے؟" وہ خفا ہو کر بولی۔
"وہ تم پر تو بار نہیں تھا؟ ہائے! میرا معصوم محمود!!"
وہ مجھے ایسی غضب ناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جیسے مجھے کچا کھا جائے گی۔ پھر روہانسی ہو کر بولی ——— "ہمیشہ ہم مسلمانوں پر تم ہندوؤں کی وجہ سے مصیبت آئی ہے۔ نہ تم وادی میں آتے نہ میرا شوہر خودکشی کرتا لیکن ہمیں خود جاننا چاہئے تھا کہ اِس قوم سے فیض ممکن نہیں ہے۔ دیکھ لو!" وہ رو کر بولی: "میں نے دن رات تمھاری تیمار داری کی اور تمھاری وجہ سے میرے شوہر کی جان گئی ——— آخر ہو نا شیواجی کی اولاد!؟"

"پہلی بات تو یہ ہے میڈم! کہ میں شیواجی کی اولاد نہیں ہوں۔ دوسری

بات یہ ہے کہ محض ایک فرد یعنی شیواجی کو مغلیہ سلطنت کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرانا کسی طرح درست نہیں ہے۔ اتنی بڑی سلطنت کو کوئی ایک فرد ختم نہیں کر سکتا تھا۔ ان اسباب و عوامل کو ہم اگر گہری نظر سے جانچیں . . . !"

"میں اسے کسی اور نظر سے جانچنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ آپ میرے گھر سے نکل جایئے۔"

"یہ دوسری بار ہے کہ میں آپ کے گھر سے نکالا جا رہا ہوں۔ میں جانے کے لئے تیار ہوں لیکن جانے سے پہلے دو ایک سوالوں کے جواب چاہتا ہوں۔"

"پوچھئے! ــــ پوچھئے!! ــــ جلدی پوچھئے!!! اور دفع ہو جایئے!"

نسیمہ ایک چھوٹے سے رومال میں اپنی ناک سُڑک کر بولی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا اب پروگرام کیا ہے؟ جس آزادی کی آپ خواہش مند تھیں، وہ غیر متوقع طور پر اتنی جلدی آپ کو مل گئی۔ میرے خیال میں اب آپ اس وادی سے فوراً اپنے وطن جانے کو بے قرار ہوں گی؟ ــــ تہذیب و تمدن کی سرزمین کی طرف . . . !"

"ہرگز نہیں!" نسیمہ بے جھجک سر ہلا کر انکار کرنے لگی ــــ "میں یہیں رہوں گی! اسی وادی کی مٹی میں میری مٹی دفن ہو گی۔ جہاں میرے شوہر کی مٹی دفن ہے!"

"لیکن تم تو اُس سے نفرت کرتی تھیں؟"

"کون کہتا ہے؟ ــــ کس نے کہا آپ سے؟ میں اپنے شوہر سے شدید محبت کرتی تھی۔ محبت نہ کرتی تو کیا دس سال یونہی میں اُس کی خدمت میں اِس وادی میں گزار دیتی؟ میں نوجوان، خوبصورت اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ چاہتی تو کینسر کے مرض کے بعد چٹکی میں اُس سے طلاق لے سکتی تھی۔"

"تم اب بھی خوبصورت، نوجوان اور امیر گھرانے کی لڑکی ہو۔ ساتھ ہی ایک امیر بیوہ بھی ہو۔ جس کے نام اُس کا شوہر اپنی ساری جائداد چھوڑ گیا ہے!"

"لیکن تمھیں اُس میں سے ایک پیسہ نہ ملے گا! تم ہو کس خیال میں؟"

"میں اپنے لئے نہیں سوچ رہا تھا . . . میں سوچ رہا تھا تم اب جتنی جلدی اس وادی سے چلی جاؤ اچھا ہے۔ اپنے وطن میں جا کر، اپنے گھر والوں میں رہ کر اپنی باقی ماندہ زندگی گزارو۔ ہو سکتا ہے تمھیں وہاں اپنی پسند کا کوئی دوسرا شوہر مل جائے ــــ اکرم بھی انتظار کر رہا ہے۔"

"میں کہیں جانے والی نہیں ہوں۔" نسیمہ اپنا پاؤں پٹک کر بولی۔ "میں یہیں رہوں گی اور ساری زندگی اسی کاٹیج میں رہ کر کسی سے نہ مل کر اپنے آپ کو اسی جگہ دفن کر دوں گی! محمود نے مجھ پر جو غلط الزام لگایا ہے، اُسے میں اپنے خون سے دھوؤں گی۔"

"اب اس اُجاڑ، سنسان اور جنگلی علاقے میں تمھارا تنہا رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

"میں کسی خطرے سے نہیں ڈرتی۔ یہیں برسوں کے دو پرانے نوکر میرے ساتھ ہیں۔ میری آیا جس نے مجھے بچپن ہی سے ماں کی طرح پالا، میرے ساتھ رہتی ہے۔ مجھے کسی طرح کا ڈر یا خوف نہیں ہے یہاں۔ یہاں سب لوگ میری عزت کرتے ہیں۔ کوئی منافق نہیں ہے یہاں تمھارے سوا!" نسیمہ گرج کر بولی۔

"میں نے کیا منافقت کی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے؟ اندر سے مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اوپر سے ظاہر کرتے ہو جیسے تم کچھ محسوس ہی نہیں کرتے ــــ اُس دن بنفشے کے پھولوں کا گچھا کیوں دیا تھا؟" نسیمہ نے تیز لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"وہ تو محض اپنی محسنہ کے لئے، جس نے میری جان بچائی تھی، ایک طرح کا اظہارِ عقیدت تھا۔ تم اُس میں بھی منافقت ڈھونڈ رہی ہو؟"

"ہاں ہاں! میں تمھاری طرح منافق نہیں ہوں۔ نہ تمھاری طرح فلسفہ طراز ہوں۔ میں باتوں کو اُلجھانا نہیں جانتی۔ میں ایک سیدھی، کھری مسلمان عورت ہوں۔ تم سے صاف صاف کہتی ہوں۔ کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔ تمھاری وجہ سے میرے شوہر کی جان گئی۔ میں تمھاری جان تو نہیں لے سکتی لیکن تمھیں کبھی اِس گھر میں قدم رکھنے نہ دوں گی۔ بس چلے جاؤ!"

نسیمہ اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ اُنگلی کے اشارے سے مجھے گیٹ دکھا رہی تھی۔

"چلے جاؤ!"

میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی اُنگلی ہلا ہلا کر کہہ رہی تھی۔

"اور دیکھو! اگر تم پھر کبھی قلعے کے اندر سوئے تو میں خود وہاں آ کر تمھارا گلا گھونٹ دوں گی! سمجھ گئے!؟ نیچے کے ڈاک بنگلے میں تم رہو گے اور کبھی قلعے کے اندر نہ جاؤ گے!!"

"اب میرے مرنے جینے سے تمھیں کیا؟" میں نے چلتے چلتے اُس سے کہا۔ "میرا ارادہ تو آج رات ہی سے قلعے میں سونے کا ہے۔"

وہ تیزی سے اُچھل کر میرے سامنے آ گئی اور میرا راستہ روک کر بولی۔

"خبردار جو تم قلعے میں سوئے! ورنہ میں جانے نہیں دوں گی! اپنے نوکروں سے کہہ کر ابھی نوکر خانے میں بند کرا دوں گی۔"

"ابھی تو تم مجھے گھر سے نکال رہی تھیں۔ ابھی اِس گھر میں بند کروا رہی ہو؟"

میں نے احتجاج کیا۔

وہ بولی ـــــــ "یہ میرا گھر ہے۔ میں جو جی چاہے کرسکتی ہوں۔ تم کیا میرے شوہر ہو؟ جو مجھ پر دھونس جماتے ہو؟"

میں نے کہا ـــــــ "جب تم پر تمھارا اپنا شوہر ہی دھونس نہ جما سکا تو میں کیا جماؤں گا؟"

"گیٹ آؤٹ!" وہ چیخ کر بولی۔

میں چلا آیا ـــــــ گیٹ سے باہر نکل کر دیکھا، وہ اب تک وہیں کھڑی تھی۔ جہاں سے اس نے مجھے گیٹ آؤٹ کہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اس نے پھر غصّے سے مٹھی بند کرکے اپنا بازو میری طرف بہت خطرناک انداز سے ہلایا۔ میں جلدی سے چلا آیا۔

شیرنی اُسی طرح بپھری کھڑی تھی!

اُسی رات میں قلعے میں واپس چلا گیا۔ نسیم کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے خیال سے نہیں، اُسے جلانے یا کڑھانے کے خیال سے نہیں بلکہ اِس لئے کہ قلعہ مجھے بُلا رہا تھا۔ ہر لحظہ جب میں اُس کی طرف دیکھتا، وہ مجھے اپنی سمت بُلاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے دیواریں اور کنگورے، بُرجیاں اور ایک ایک کائی لگا پتھر اُس پُرانے قلعے کا اپنے نظر نہ آنے والے ہاتھوں سے مجھے اشارہ کرکے بار بار بُلا رہا ہو۔ قلعہ جیسے میری غیر حاضری سے سوگوار ہو اور عجیب حسرت ناک انداز میں میری طرف دیکھتا ہوا مجھے اپنے اندر آنے کی دعوت دے رہا ہو۔

جب میں اندر چلا گیا اور قلعے کا دروازہ باہر کی دُنیا پر بند ہوگیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے صرف میں نے نہیں، پورے قلعے نے آج ایک مُدت کے بعد اطمینان کی سانس لی ہو۔ اُس کے در و دیوار، چھت اور فرش تک مجھے خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ ہنستے کھیلتے نوکروں چاکروں اور باندیوں سے غلام گردشیں بھری تھیں۔ وہ سب میری طرف خوشی اور بشاشت سے دیکھ رہی تھیں۔ باندیاں اور مہریاں کولہے مٹکاتی، پائل چھنکاتی، ترچھی نظروں کے بان مارتی چلی جا رہی تھیں۔ سارا قلعہ آج پھر سے آباد تھا۔

اِس قلعے میں ہمیشہ میں نے دو سطحوں پر، دو مختلف غیر مرئی دُنیائیں آباد دیکھی ہیں یا محسوس کی ہیں۔ ایک دُنیا تو راجپوتوں کے زمانے کی ـــــــ مغلوں اور راجپوتوں کی آویزش اور آمیزش کی۔ دوسری دُنیا اِک عجب ویرانے اور سنّاٹے کی۔ جس میں شونتی کے اُداس مُسکراتے ہوئے چہرے کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا اور جب میں چاہتا ہوں، جس سطح پر جو دُنیا آباد ہے اُسے اُس قلعے میں دیکھ لیتا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے بہت کم پہلی سطح پر آباد دُنیا کا مطالعہ کیا ہے۔

مجھے اُن غلاموں، باندیوں اور مہریوں سے بھری ہوئی دُنیا سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ شاید اگر شونتی کا چہرہ پہلے نظر نہ آجاتا تو ہوتی۔

لیکن اب تو جونہی رات ہوتی ہے اور قلعہ آباد ہونے لگتا ہے، میں باندیوں، مہریوں، غلاموں، راجپوتی سپاہیوں اور سرداروں کی ٹولیوں سے بےخطر اُلجھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ میں اُن سے ہم کلام ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔ میں تخلیہ چاہتا ہوں۔ تنہائی اور سنّاٹا۔ اِس لئے پہلی سطح کی غیر مرئی آباد دُنیا میرے حکم سے تحلیل ہوجاتی ہے اور سارا قلعہ چشم زدن میں ویران ہوجاتا ہے ـــــــ اور سانس روک کر شونتی کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔

کوئی دو بجے کے قریب وہ آئی۔

اب تو مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ وہ کب آتی ہے۔ آدھی رات سے پہلے کبھی نہیں آتی۔ جب تک آنکھوں میں نیند بھر نہ جائے کبھی نہیں آتی۔ جب تک احساس انتظار کرتے کرتے تھک کر سُن نہ ہونے لگے، نہیں آتی۔ جب غنودگی کا غبار ساری فضا میں تحلیل ہونے لگتا ہے، اُس وقت وہ آتی ہے۔ جب تک جسم اور روح، ذہن اور منطق کو خلاء میں معلّق نہ کردیں، وہ نہیں آتی۔

لیکن آج تو میں نے اُس کے آنے کے لئے پہلے ہی سے سب آسانیاں بہم پہنچا دی تھیں۔

بتی گُل کردی تھی۔

بستر پر سیدھا لیٹ گیا تھا۔

سارا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

دماغ سے خیالات کو دُور کر دیا تھا۔

آنکھیں اُس کے انتظار میں تھک کر چُور ہو چلی تھیں۔

میرے چاروں طرف تاریک دُھندلکوں کے بھنور سے پڑنے لگے تھے۔

آج میں بالکل تیار تھا اُس کے لئے . . . جب وہ آئی۔

اور جب وہ آئی تو سب سے پہلے وہی کافوری خوشبو آئی۔

اور ہولے ہولے میرے ہوش و حواس معطّل ہوتے گئے۔

اور اب میرا پلنگ فضا میں معلّق تھا۔

اور میں اُس پر سیدھا لیٹا تھا۔

اور وہ میرے اوپر جُھکی ہوئی، مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھے بھول گئے ہو لالی؟"

"نہیں شونتی!"

"تم نسیمہ کو پیار کرتے ہو نا؟"

"نہیں شونتی!"

"تو اتنے دن قلعے میں کیوں نہیں آئے؟"

"کسی نے آنے نہیں دیا۔"

"میں ہر روز رات کو اس کمرے میں تمھارا انتظار کرتی تھی۔"

"میں بہت بیمار تھا شونتی! مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔"

"میں تو ہوش میں تھی اور ہر وقت تم پر نگاہ رکھتی تھی۔ جب تک تم یہاں رہے کبھی میری آنکھ سے اوجھل نہیں رہے۔ میں ہر دم تمھارے ساتھ رہی۔ تمھیں معلوم بھی نہ ہوا ہوگا۔ ایک پوری رات میں تمھارے پیٹ سے لگی تمھارے بدن کی حرارت اپنے اندر جذب کرتی رہی لیکن میرا تو کوئی بدن نہیں ہے۔ اس لئے میں تمھارے بخار کی حرارت اپنے اندر جذب نہ کر سکی —— نسیمہ ایسی زندہ عورتوں کے لئے پیار کرنا آسان ہے!"

"وہ مجھ سے پیار نہیں کرتی، نہ میں اس سے!"

"میں جانتی ہوں۔ پھر بھی یقین نہیں آتا۔"

"کیوں نہیں آتا؟"

"عورت ہو کر رقابت سے دُور نہیں رہ سکتی۔ مجھے معلوم ہے تم نسیمہ سے پیار نہیں کرتے۔ پھر بھی میرے دل کے اندر شاید کوئی اور دل ہے، جو مجھے نسیمہ سے حسد کرنے پر اکساتا ہے۔ جو تمھیں طعنے دینے پر مجھے مجبور کرتا ہے لیکن اب میں زیادہ دن تمھارے ساتھ نہ رہ سکوں گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میرے جانے کے دن آ گئے۔"

"کہاں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔"

"کب جاؤ گی؟"

"جس دن تم مجھے اس قلعے سے آزاد کر دو گے۔"

"تو میں ساری زندگی تمھیں آزاد نہ کروں گا۔"

"کیا تم چاہتے ہو کہ میں زندگی بھر اس اکیلے، سنسان، ویران قلعے میں اکیلی پڑی سسکتی رہوں؟ میرا دم گھٹتا ہے اور روح کچلی جاتی ہے؟... لالی! مجھے آزاد کر دو!... آزاد کر دو!!!"

"کیسے شونتی؟"

"مجھے جلا دو! جلا دو مجھے!! مجھے جلا دو!!!"

اس کی آواز یکایک دُور ہوتی گئی۔

وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وہ تیز تیز قدموں سے جیسے ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

پہلی غلام گردش سے دوسری غلام گردش میں پہنچ گئی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

اس کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

"مجھے جلا دو... ! مجھے جلا دو... ! مجھے جلا دو... !!! لالی! مجھے آزاد کر دو... مجھے آزاد کر دو لالی!"

اس طویل تاریک غلام گردش میں وہ اکیلی چلی جا رہی تھی۔ ایک سفید کافوری شمع کی طرح رُخ روشن لئے ہوئے۔ وہ ان شیشے کی کھڑکیوں کے قریب سے سرکتی جا رہی تھی جو دوسری طرف ندی کے بہاؤ کی جانب قلعے کے باہر کھلتی ہیں۔ پھر نیچے جانے والی تین سیڑھیاں آئیں اور یکایک مجھ سے بیس تیس گز کے فاصلے پر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی... میں نے تاریکی میں آگے ہاتھ پھیلائے لیکن کچھ نہ تھا۔ کہیں پر کچھ نہ تھا۔ میرے سامنے قلعے کے زمانے کا گرا ہوا ملبہ تھا جس پر گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

"شونتی!... شونتی!!" میں زور سے چیخا۔

غلام گردشوں میں میری آواز گونجتی، شونتی کو بار بار پکارتی چلی گئی۔ جیسے باری باری فاصلے پر سپاہی شونتی کا نام لے کر پکار رہے ہوں۔

میں لوٹ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور لیمپ کے ٹارچ لے کر باہر نکلا۔ پھر اسی غلام گردش میں گیا۔ پھر اس جگہ گیا جہاں شونتی غائب ہوئی تھی۔ وہاں کچھ نہ تھا۔

نہ کوئی کمرہ نہ دروازہ... پتھر اور مٹی، گارے اور چونے کا ملبہ پڑا تھا۔

اس پر جھاڑیاں تھیں اور گھاس اُگی ہوئی تھی۔

پھر میں نے ایک ایک کر کے اس غلام گردش کی کانچ والی ساری کھڑکیاں کھول ڈالیں اور کھڑکیاں کھلتے ہی باہر کی ندی کا شور اُبھر آیا اور جنگل میں درختوں کی سائیں سائیں!!

اور اس تکلیف دہ سناٹے میں میں نے چیخ کر کہا۔

"شونتی!... شونتی!!... کہاں ہو تم؟... کہاں ہو تم؟... میری جان! میں تمھارے بغیر مر جاؤں گا!"

میری پاگل آواز دُور تک ہوا کے دوش پر ایک مایوس چمگادڑ کی طرح رات کے سناٹے میں چکر لگاتی ہوئی اُڑتی گئی اور تھک ہار کر وہیں باہر کسی پرانے درخت کی شہنی سے لٹک کر اُلٹی ہو گئی —— شاید اس دُنیا میں جتنی چمگادڑیں ہیں، ناکام و نامراد عاشقوں کی آوازیں ہیں!

پھر دُور غلام گردش کے موڑ پر مجھے روشنی آتی دکھائی دی۔ پہلے روشنی پھر ایک سایہ ـــــ پھر دونوں ساتھ ساتھ چلتے نظر آئے۔ قریب آئے تو دیکھا یہ شنکر تھا اور ہاتھ میں لالٹین لئے چلا آرہا تھا۔

میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے کچھ کہا نہیں۔ اُس نے بہت مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے میرے کمرے میں لے جاکر میرے بستر پر سُلا دیا۔

دوسرے دن یکایک میرا ذہن صاف ہونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اب تک میں اِس معمّے کے غلط کونے پر کھڑا تھا۔ مجھے اِس سوال کو کسی دوسرے زاویے سے حل کرنا ہوگا۔ بھُوت کے پیچھے بھاگنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ . . .

سونتی کیسے مری تھی؟ اور . . . کہاں پر ماری گئی تھی؟ اور کون اُس کے قاتل تھے؟

اس معمّے کو حل کرنے کا ایک زاویہ یہ بھی ہوسکتا ہے، جو اب تک میری نظر سے اوجھل تھا ـــــ اور جب یہ زاویہ نگاہ میں آیا تو سب سے پہلے میں نے رتنا سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں نے اُسے مندر کے پیچھے ندی کے کنارے پھُولوں کی جھاڑیوں میں تقریباً چھپے ہوئے پکڑ لیا۔

وہ ایک تھالی میں گلاب اور گیندے کے پھُول رکھے ہوئے بھوانی ماتا کے لئے ہار پرو رہی تھی اور اُس کے ہاتھ کی اُنگلیاں کافوری شمعوں کی طرح لانبی اور مخروطی تھیں اور آنکھیں اُسی طرح پُراسرار تھیں۔

میں قریب کی جھاڑیوں سے گیری گولڈ کے پھُول چُن چُن کر اُسے دینے لگا۔

"کیا تم واقعی نہیں بول سکتی ہو؟"

اُس نے سر ہلا دیا، ناں میں۔

"کیا تم سچ مچ نہیں بول سکتی ہو؟ یا بنتی ہو؟"

اُس نے پھر غصّے سے انکار میں سر ہلا دیا۔

میں حیرت سے اُس کے پاؤں دیکھنے لگا۔ وہی گلابی چرن کمل! حیرت انگیز طور پر خوبصورت! نازک، چھوٹے اور پتلے۔

ایسے خوبصورت پاؤں میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھے۔

اُس نے گھبرا کر اپنے دونوں پاؤں ندی میں ڈال دئے۔

"پانی میں اور بھی خوبصورت نظر آتے ہیں"

اُس نے پاؤں پانی سے نکال کر جلدی سے اپنی سفید ساڑی میں چھپا لئے۔

"مجھے بتاؤ! کس نے تمھاری بہن کو مارا؟ جافرسن صاحب نے؟"

رتنا نے انکار میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے نہیں معلوم۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟"

"سچ سچ کہو تمھاری بہن کا قاتل کون ہے؟"

وہ میرے تیز و تُند لہجے سے گھبرا گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اُس کا فق چہرہ پہلے سے بھی زیادہ فق ہوگیا۔ ہونٹوں کا رنگ اُڑ گیا۔ رخساروں کے گلاب سفید ہوگئے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"تمھیں بتانا ہوگا ـــــ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے!"

وہ میری طرف دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ پھر یکدم ہاتھ چھُڑا کر بھاگ گئی اور مندر کے اندر ایک عقبی دروازے سے غائب ہوگئی۔ جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ اندر سے بند ہوچکا تھا۔ میں موڑ کاٹ کر مندر کے سامنے کے دروازے کی طرف گیا۔ وہ بھی اُس وقت اندر سے بند کردیا گیا تھا۔ میں واپس ندی پر آگیا۔ جہاں رتنا اپنی تھالی بھُول گئی تھی۔ جس میں بھوانی ماں کے لئے پھُولوں کا ہار ادھ گندھا پڑا تھا۔

میں نے تھالی سے ہار اُٹھایا اور اُس میں پھُول پرو کر اُسے آہستہ آہستہ پُورا کرنے لگا۔ جب ہار قریب قریب پُورا ہوگیا تو مجھے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، میرے پیچھے رتنا کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پیچھے شونتی کھڑی ہے . . . لیکن نہیں، رتنا تھی۔

اُس نے جلدی سے پُوجا کی تھالی میرے ہاتھ سے لے لی اور میری گود میں کاغذ کا پُرزہ گرا دیا۔

میں نے پُرزہ کھول کر دیکھا۔

اُس پر دیوناگری حروف میں صرف ایک نام لکھا تھا۔

"گوکل داس!"

گوکل داس؟ میں نے غور سے پڑھا۔ گوکل داس کون ہے؟ اِتنے دن سے اِس گاؤں میں رہ رہا ہوں۔ گوکل داس نام کے کسی آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔

"یہ گوکل داس کون ہے؟" میں نے گھُوم کر رتنا سے سوال کرنا چاہا۔

لیکن رتنا غائب ہوچکی تھی۔ میں نے مندر کا دروازہ بہت بار پیٹا لیکن رتنا نے دروازہ نہ کھولا۔

میں کاغذ کے اُس پُرزے کو بہت احتیاط سے لپیٹ کر اپنی جیب میں ڈال کر واپس چلا آیا۔

(باقی آیندہ)

غزل

گنور۔ ضلع بدایوں
۱۵ جون ۱۹۶۶ء

محبی جناب خوشتر! خوش باش و کامراں باد

افسانہ نمبر ۱۹۶۶ء رنگ و نور کی محفل سجاتے ہوئے جنتِ نظر بنا۔ کچھ ایسی دلکشی تھی کہ ہر ضروری کام ترک کر کے اِس کے مطالعہ میں کھو گیا اور آج ختم کر کے یہ خط لکھ رہا ہوں —— کچھ لوگ ترقی دمعیار کی حدیں مقرر کیا کرتے ہیں۔ آپ نے بھی بہت سوں کو کہتے سنا ہوگا، اب یہ چیز ترقی کی حد پر پہنچ گئی؛ گویا اِس سے آگے اب امکانِ ترقی نہ رہا لیکن "بیسویں صدی" کا ہر خاص نمبر اِس اصول کو ہر بار توڑ دیتا ہے۔ جس نمبر کو دیکھئے زبان سے احسنت و مرحبا کے بعد یہی نکلتا ہے کہ اِس سے آگے کسی رسالہ کا صوری و معنوی حُسن ممکن نہیں مگر جب اِسی رسالہ کا اگلا نمبر سامنے آتا ہے تو گُمان ہوتا ہے ہماری پہلی رائے غلط تھی، اب اس سے آگے ممکن نہیں۔ اِسی کی گردان کرتے ہوئے لمبی مدت گزر گئی۔ کسی "حد" کا تعین نہیں قرار پاتا۔ خدا ہی جانے آپ کی نظر میں کون سی منزل ہے —— اِس حُسنِ ظاہر و باطن کو نُورِ نظر "کنول" کی شادی خانہ آبادی کے مرقعوں نے اور بھی سجا دیا۔ خدا اِن کی زندگیوں کو ہمیشہ سجائے رکھے —— افسانوں، مضامین، نظموں اور غزلوں کا معیار اِس مرتبہ کافی بُلند ہے —— ایک ہی سلسلے کی تین غزلیں ہو گئی ہیں۔ ایک "بیسویں صدی" میں آ چکی۔ دوسری اب بھیج رہا ہوں۔ تیسری اس کے بعد بھیجوں گا....

بندۂ اخلاص
ابر احسنی

ابر احسنی گنوری

مسرت حدِ غم تک آ گئی کیا تم نہ آؤ گے؟
تمنا پر اُداسی چھا گئی کیا تم نہ آؤ گے؟

یہ کھٹکا تھا، دل آ جائے گا باہر توڑ کر سینہ
تڑپ دل کی قیامت ڈھا گئی کیا تم نہ آؤ گے؟

تمہیں تو اِس سے پہلے ہی مُداوا بن کر آنا تھا
نظر کی چوٹ دل تک آ گئی کیا تم نہ آؤ گے؟

جُھلس کر رہ گیا باغِ تمنا سوزشِ غم سے
بہارِ زندگی مُرجھا گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟

تم آؤ گے تو تازہ زندگی کا دَور آئے گا
یہ اُمید اور بھی تڑپا گئی کیا تم نہ آؤ گے؟

سکون و صبر پہلے جا چکے تھے اب تو ہمت بھی
ہماری راہ سے کترا گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟

اب اِس کے بعد تو دم گُھٹ کے مر جانے کی منزل ہے
طبیعت اِس قدر گھبرا گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟

دُھواں اُمڈا ہے سینے سے نفس شعلے اُگلتا ہے
محبت آگ وہ بھڑکا گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟

ہزاروں بار اِس سے پیشتر بھی آ چکے ہو تم
تو کیا شے بیچ میں اب آ گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟

تغافل اب دلِ بیتاب پر آرے چلاتا ہے
جُدائی رُوح کو برما گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟

کلیجہ مُنھ تک آیا، آہ لب تک اشک آنکھوں تک
ہر اِک شے آنے والی آ گئی کیا تم نہ آؤ گے؟

چلے آؤ جو اپنے ابرؔ کی تم زندگی چاہو
حیات اب تو قضا تک آ گئی کیا تم نہ آؤ گے؟

افسانہ

مسرّت چند لمحوں کی

حسن اجمل مسرّت۔ ایم، اے

۳ جی ۴/۴، ناظم آباد۔ کراچی

۵ اپریل ۶۶ء

بزرگوارم! آداب

ایک کہانی ارسالِ خدمت ہے —— یہ ایک طویل کہانی تھی لیکن "بیسویں صدی" کی گنجائش کے پیشِ نظر میں نے اِسے مختصر کر دیا ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی —— آپ کی قیمتی رائے کا منتظر رہوں گا۔ ۔ ۔

احقر —— مسرّت

کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے ایکسرے رپورٹ لی اور زرد رنگ کے لمبے سے لفافہ کو بغل میں دبا کر ہسپتال کی چہار دیواری سے باہر آ گیا۔ اوپر درختوں پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور نیلگوں آسمان پر سفید سفید بادلوں کے گالے ایک دوسرے کے پیچھے یوں دوڑ رہے تھے جیسے معصوم بچے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

وہ بس اسٹاپ پر رُک کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے سوچا تھا، اطمینان سے بس میں بیٹھ کر ایکسرے رپورٹ دیکھے گا لیکن پھر انتظار کے یہ لمحے اُسے گراں گزرنے لگے۔ کسی دلچسپ جاسوسی ناول کے آخری باب کی طرح وہ جلد از جلد رپورٹ پڑھ کر کشمکش کی اُس کیفیت کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اُس نے لفافہ کے اندر سے اپنا ایکسرے باہر نکالا۔ چوکور سیاہ فلم پر اُس کے پھیپھڑوں کا عکس تھا، جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی پرچی نتھی تھی اور اُس پرچی پر ڈاکٹر نے سُرخ روشنائی سے اُس کی رپورٹ لکھی تھی۔

اُس نے سانس روک کر رپورٹ پڑھی اور پھر اُس کا موڈ ایکدم بدل گیا۔ اُس کے فکرمند چہرے پر اچانک مُسکراہٹ آ گئی اور وہ اِس طرح کپکپانے لگا جیسے اُس نے ابھی ابھی اخبار میں اپنا بی اے کا نتیجہ دیکھا ہو۔ اب اُس میں انتظار کی تاب کہاں تھی۔ اُس نے بس کا خیال چھوڑ کر فوراً ایک ٹیکسی لی اور ٹیکسی والے کو اپنا رہائشی پتہ بتا کر پچھلی سیٹ پر اِس شان سے بیٹھا جیسے ٹیکسی میں سفر کرنا اُس کا روز کا معمول ہو۔ دورانِ سفر میں اُس کے ہونٹوں پر بے خیالی میں کئی بار مُسکراہٹ آئی اُس نے راستہ میں دو بار سگریٹ سُلگایا لیکن وہ ہر بار ایک ایک کش سے زیادہ نہ لے سکا۔ تمام راستہ اُس کے ہونٹوں پر کسی انگریزی گیت کی دُھن سرسراتی رہی تھی۔ آج اُس نے اپنے دوستوں کو پھر ہرا دیا تھا۔ ایکسرے کی رپورٹ اُن سب کی توقعات کے برعکس تھی!

اُس کے دوست اُس کی صحت کے بارے میں عرصہ سے فکرمند تھے۔ اُسے عموماً ہلکی ہلکی حرارت رہتی اور جب وہ سگریٹ کا گہرا کش لیتا تو اُس پر کھانسی کے دورے پڑ جاتے۔ اِس سے اُس کے دوست یہ سمجھنے لگے تھے کہ شاید گھٹیا چائے اور سستے سگریٹوں نے اُس کے پھیپھڑے گلا ڈالے ہیں اور وہ تپ دق کا شکار ہو چکا ہے لیکن اُس نے دوستوں کے کہنے پر کبھی توجہ نہ کی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ تپ دق جیسے موذی مرض میں کبھی مبتلا نہ ہوگا۔ یہ ضرور تھا کہ اُسے بعض اوقات ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ آنے لگتا اور رات کو اکثر اُس کے سینے میں ٹیسیں اُٹھا کرتیں۔ اُس کی نیند کم ہو گئی تھی اور خوراک گھٹ گئی تھی لیکن اِس کے معنی یہ کبھی نہیں تھے کہ وہ تپ دق میں مبتلا ہو چکا تھا ——

دوستوں کے بہت زیادہ کہنے سُننے پر وہ ایک دن چُپکے سے سرکاری ہسپتال میں اپنا ایکسرے کرا آیا اور آج اُس کی رپورٹ ملتے ہی اُسے ٹیکسی کی سُوجھی۔

گھر پہنچ کر اُس نے ٹیکسی والے کو کرایہ کے ساتھ ایک روپیہ ٹپ بھی دیا اور پھلانگ پھلانگ کر اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں طے کیں۔ پھر اُس نے اپنا بکس کھول کر اپنا سب سے اچھا سوٹ پہنا، بال سنوارے، ٹائی کی گرہ نئے فیشن کے مطابق لگائی اور واپسی میں گھر کا دروازہ بند کرنا بھی بھول گیا۔ اُس کے انداز سے ایسی عجلت ظاہر ہو رہی تھی جیسے اُسے آج سیکڑوں ضروری کام انجام دینا ہوں۔ لیکن وہ اپنے ایکسرے کی رپورٹ ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔

یادِ محبوب

اب میں ہوں اور عمرِ گزشتہ کے واقعات
یادوں کے سو چراغ جلا کر چلے گئے —— فراقؔ گورکھپوری

ملاقاتوں سے پہلے اور ملاقاتوں کے بعد اکثر
کسی کے رنگ و بوئے پیرہن کی یاد آئی ہے —— سردار جعفری

آیا ہی تھا خیال کہ آنکھیں چھلک پڑیں
آنسو کسی کی یاد سے کتنے قریب ہیں —— نامعلوم

اُس کو بھولے ہوئے تو ہو فانیؔ
کیا کرو گے، اگر وہ یاد آیا؟ —— فانیؔ بدایونی

میری بیتابیٔ فرقت سر بسر رشکِ سکون
تیری یادوں نے سکھایا مجھ کو گھبرانے کا فن —— فراقؔ گورکھپوری

مرسلہ:- ایس۔ ایس ہنکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

اِس بار وہ پچھلے دروازے سے باہر نہیں نکلا۔ اب وہ پان والے سے نظریں چُرانا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ وہ یہ فیصلہ کر کے چلا تھا کہ آج اُس کا حساب بے باق کر دے گا۔ بے چارہ دو مہینے سے کان دبا کر اُسے اُدھار دیے رہا تھا۔ اُس نے پان والے سے حساب کی نوٹ بک لے کر جلدی جلدی رقم جوڑی۔ کُل سترہ روپے نو آنے بنتے تھے لیکن اُس نے عمداً اِس رقم کو اُنیس روپے نو آنے بنا دیا اور پان والے کو حساب سے دو روپیہ زیادہ دے کر اُسے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔ پھر اُس نے حسبِ معمول قینچی کی سگریٹ کا ایک پیکیٹ خریدا۔ پھر کچھ سوچ کر قینچی واپس کر کے تھری کیسلز کی ڈبیہ لی اور پان والے کو متحیر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

راستے میں اُسے ایک گول مٹول سا بچہ مِلا تو اُس نے بے اختیار اُس کے گال تھپتھپائے۔ محلے کے خارش زدہ کتے کو ایک بار اُس نے پتھر کھینچ مارا تھا۔ یہ یاد کر کے اُسے دُکھ ہوا اور اُس نے حلوائی سے رس گُلّوں کا ایک دونا لے کر اُس کے آگے ڈال دیا۔ اسکول سے واپس آتی ہوئی بچیوں کو اُس نے مُسکرا کر دیکھا اور محلے کے موذن کو خلافِ عادت سلام کرتا ہوا گزرا۔ اُسے رہ رہ کر آج ہر چیز پر پیار آ رہا تھا۔ نیلے آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے خوشی سے بھاگ رہے تھے۔ اب اُس کا رُخ یونیورسٹی ہاسٹل کی طرف تھا۔ اسے نہ معلوم کیوں پرانے ساتھی ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔

"سلمان!—— ابے او سلمان کے بچے!"

سلمان گھبرا کر اپنے کمرہ سے باہر نکلا: "کیا ہے یار! خیریت تو ہے؟"

"چائے پلاؤ پھر بتاؤں گا۔"

"چائے اِس وقت؟ کینٹین چلنا پڑے گا۔"

"اِس وقت سات سمندر پار بھی کہو تو چلنے کو تیار ہوں۔"

"کیا بات ہے آج بہت خوش نظر آ رہے ہو؟"

"آج مجھے زندگی کی صحیح قدر معلوم ہوئی ہے۔"

کینٹین میں اُس نے بہت بے نیازی سے سلمان کو تھری کیسلز کا سگریٹ پیش کیا۔

"اوہو ہو!" سلمان مذاقاً کھنکھار کر بولا: "تو یوں کہو۔ اب اوپر کی آمدنی بھی شروع ہو گئی ہے۔"

وہ صرف مُسکرا دیا۔ جیسے سلمان کی بات کی تردید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اوپر کی آمدنی کا تصور ہی اُس کے لئے گھناؤنا تھا اور حقیقت صرف اِتنی تھی کہ اُسے آج ہی تنخواہ مِلی تھی اور اچانک وہ انتہائی شاہ خرچی کے موڈ میں آ گیا تھا۔

چائے کے دَوران اُس نے سلمان سے کہا: "تم مجھے شیکسپیر کا کوئی درس سُنا سکتے ہو؟"

"بڑے بھائی! میرا مضمون فلسفہ ہے، ادب نہیں۔"

"تو پھر گویا تم جھک مارتے ہو۔ میرا تو خیال یہ ہے، فلسفہ ذہنی بیماری کا دوسرا نام ہے۔" اُس نے کہا: "اب اِس روشنی میں شیکسپیر اور کارل مارکس کا مقابلہ کرو۔ شیکسپیر عظیم ہے کہ اُس نے دُنیا کے غم کم کئے ہیں اور موصوف یعنی کارل مارکس اپنے دُکھ درد دوسروں کے سر تھوپ کر چلتے بنے۔ لاحول ولاقوۃ!"

"مگر کل تک تو تم ——"

"کل کی بات چھوڑو۔ کل تیس تاریخ تھی اور میں خالص پرولتاری انداز میں سوچ رہا تھا۔ آج پہلی ہے اور میری جیب میں نوٹ کڑکڑا رہے ہیں۔ آج میں خالص بورژوا انداز میں سوچ رہا ہوں!" اُس نے کہا۔ پھر بے حد رازداری کے ساتھ پوچھا۔ "کیوں یار! کیا خوش ہونا بھی بورژوائی حرکت ہے؟"

"آج بکواس کرنے کا عہد کر آئے ہو کیا؟" سلمان نے پوچھا۔ پھر یوں جیسے کوئی بات یاد آ جائے کہنے لگا: "اے ہاں! وہ بات کیا تھی جو تم کہتے آئے تھے؟"

"یار ایک کام لے کر آیا تھا۔" اُس نے بہت سنجیدگی سے کہا: "تم وقت نکال کر داس کیپٹال اور مولانا اکبرؔ کا موازنہ کرو اور اعلان جمع کر ۱۹۴۴ سے تقسیم کر کے دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

سلمان ہنس پڑا اور وہ اُسے ہنستا چھوڑ کر اٹھ آیا۔

اب سہ پہر ہو چلی تھی اور درختوں کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ اُسے وقت بہت تیزی سے گزرتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس میں کسی کھلنڈرے بچے کے سے جذبات پیدا ہوگئے تھے جیسے شام کی سیاہی اِس لئے گراں گزرتی ہے کہ ہنگامے ماند پڑ جاتے ہیں۔

یونیورسٹی سے وہ پیدل ہی چل پڑا اور کسی شریر بچے کی طرح راستے کے روڑوں سے کھیلتا ہوا بڑے بازار تک آگیا۔ پھر کچھ یاد کرکے ایک دوکان سے چند قیمتی کھلونے خریدے اور اِس بار اُس نے شاہدہ کے دروازے پر دستک دی۔

جواب میں شاہدہ کا چھوٹا بچہ باہر آیا: "کون صاحب؟"

اُس نے لپک کر بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کے رخساروں کو چوم کر بولا۔

"اپنی امی سے کہو کہ انور بھائی ہیں"

دروازے کی اوٹ میں شاہدہ نے اُس کی آواز سُنی تو اُس کی آنکھوں کے آگے دُھند سی چھا گئی: "انور بھائی!"

اَن گنت برسوں کے بعد تم کس جذبہ کے تحت میری دُنیا میں آنکلے انور!

شاید تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔

شاید میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں!

"ہلو شاہدہ! ارے تم تو بالکل بدل گئیں۔ کمال ہے!" اُس نے اِس بے تکلفی سے گفتگو شروع کی جس میں اَن گنت برسوں کی اجنبیت کا شائبہ تک نہ تھا۔

"دس برس کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا انور بھائی!" شاہدہ نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"بلاشبہ! یہ تو میں بالکل ہی بھول گیا تھا کہ ہمیں ملے ہوئے دس برس ہوگئے ہیں!" اُس نے کہا اور غیر ارادی طور پر ایکسرے کے لفافے کو تھپتھپانے لگا۔

شاہدہ نے فوراً ہی بھانپ لیا کہ لفافہ کے اندر کیا ہے: "خیریت تو ہے انور بھائی! ـــــ آپ کی صحت کیسی ہے؟"

"فرسٹ کلاس! لوگ سمجھ بیٹھے تھے مجھے ٹی بی ہوگئی ہے!"

"خدا نہ کرے" شاہدہ نے کہا۔ پھر ٹھہر کر بولی: "رُکئے میں آپ کے لئے چائے لے آؤں"

"مگر ذرا جلدی کرنا۔ میں زیادہ دیر نہیں رُکوں گا" اُس نے بالکل تکلف نہیں کیا۔

چائے آئی تو انور کو گزرا ہوا وقت یاد آنے لگا۔

"تمہیں یاد ہے شاہدہ! میں تمہیں کیسی اوٹ پٹانگ انگریزی پڑھایا کرتا تھا؟"

"جی!" شاہدہ مسکرائی: "آپ کی شرارت کی وجہ سے میں کالج میں بہت

حدیثِ دل

یوں دل کے تڑپنے کا، ہے کچھ تو سبب آخر
یا درد نے کروٹ لی، یا تم نے اِدھر دیکھا ـــــــ جگر مراد آبادی

کوئی ہمدرد زمانے میں نہ پایا اختر
دل کو حسرت ہی رہی کوئی ہمارا ہوتا ـــــــ اختر شیرانی

لے گیا چھین کے یہ کون ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل، کبھی ایسی تو نہ تھی ـــــــ بہادر شاہ ظفر

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ اُمید
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے ـــــــ روش صدیقی

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور! کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے، کیا؟ ـــــــ غالب

مرسلہ:- سید قدیر۔ گولکنڈہ۔ حیدر آباد

ستائی گئی ہوں"

انور بھی مسکرایا: "کیا تھا وہ یادگار بند؟"

اور شاہدہ اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں شیلے کی نظم پڑھنے لگی:-

We look before and after
And pine for what is not
Our sincerest laughter—
With some pain is fraught
Our sweetest songs are those that tell of saddest thought.

"یاد ہے اِس کا کیا مطلب بتایا تھا میں نے؟" انور نے پوچھا۔

"ہم آگے پیچھے دیکھتے ہیں اور اَنناس کے درخت پر چڑھ جاتے ہیں۔ اپنے رنج و غم بھول کر قہقہے لگاتے ہیں اور میٹھے سُروں میں محبت کے گیت گاتے ہیں ـــــ" شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی: "یقین مانئے انور بھائی! مجھے بھری کلاس میں اِتنی خفت اُٹھانی پڑی کہ میں تین دن تک کالج نہیں گئی تھی"

انور کو بھی بے ساختہ ہنسی آگئی اور وہ تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول گیا کہ یہ دس برس پہلے کی بات تھی اور اُن دس برسوں میں زمانہ بہت تیزی سے گزرا تھا۔

شاید وہ کوئی خواب دیکھنے لگا تھا۔
شاید وہ دونوں کوئی خواب دیکھنے لگے تھے!

وہ شاہدہ کے گھر سے چراغ جلے اٹھا۔ سڑکوں پر روشنی ہو چکی تھی اور جگہ جگہ نیون سائن کے بھڑکیلے رنگ جگمگا رہے تھے۔ نیلی پیلی ہری لال رنگ برنگی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔

"ڈالڈا گھی آپ کی صحت کا ضامن ہے!"

"اسپرو کھائیے، صحت یاب ہو جائیے!"

"زندگی ایک امانت ہے۔ اس کی بہتر حفاظت کے لئے بیمہ کرائیے!"

اس نے ان رنگ برنگی عبارتوں کو پہلی بار بہت دلچسپی سے پڑھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے ہیں —— جیسے زندگی رنگین پروں والی تتلی کا نام ہے جس کے پیچھے وہ کسی معصوم بچے کی طرح دوڑتا چلا جا رہا ہے۔

وہ مختلف بازاروں میں بلا مقصد گھومتا رہا۔ اُس نے ہر بڑی دوکان پر جا کر چیزوں کے دام بلا ضرورت معلوم کئے۔ پھر جب وہ پھول والوں کی دوکانوں کے قریب سے گزرا تو یکلخت اُسے اپنی ماں یاد آئی۔ اُس نے پھولوں کا ایک قیمتی ہار اور موم بتیوں کے کئی درجن پیکیٹ خریدے اور قبرستان کی طرف چل پڑا۔

اُس نے ماں کی مٹتی ہوئی کچی قبر پر پھولوں کا ہار چڑھایا، روشنی کی اور دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔ بالکل اس انداز میں جیسے اُس کی ماں کان لگائے اُس کی بات سن رہی ہو لیکن اُس نے جو کچھ کہا وہ اتنی آہستگی سے کہا کہ اُس کی آواز نہ سنی جا سکی۔ البتہ جب وہ قبرستان کے رکھوالے سے مخاطب ہوا تو اُس کی آواز بلند تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "اگر میں نہ بھی آسکوں تو تم اس قبر پر روشنی کرتے رہنا۔ یہ شمعیں ہیں اور یہ تمہارا انعام!"

اب وہ پھر سڑکوں پر مسکراہٹیں بکھیرتا ہوا گھوم رہا تھا اور اُس کی بغل میں ایکسرے رپورٹ کا لفافہ اتنی احتیاط سے دبا ہوا تھا جیسے یہی اُس کی کل متاع ہو!

ایک موڑ پر اُسے بوڑھا پنٹو مل گیا۔ ہمیشہ کی طرح کندھے جھکائے اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ سڑک کے کنارے اس طرح کھڑا ہوا تھا جیسے اس دنیا سے اپنا تعلق معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ انور جانتا تھا کہ پنٹو کا نشہ اکھڑ رہا ہے۔ شراب پنٹو کی کمزوری تھی اور وہ سب دفتر میں مل کر اُس کی بری گت بنایا کرتے تھے۔

"مسٹر پنٹو! اگر تم اپنا نام نصور رکھ لو تو ایک پیگ روز ملے گا —— کوئی دعوت دیتا اور پنٹو فوراً ہی لاالٰہ کا ورد کرنے لگتا۔

کرسچین ساتھی لکارتے —— شرم مسٹر پنٹو شرم! اُدھر دو پیگ ملیں گے!"

اِس پر پنٹو فوراً ہی سینے پر صلیب بنانے لگتا!

انور نے آج پنٹو کو بھی سیراب کرنے کی ٹھانی۔

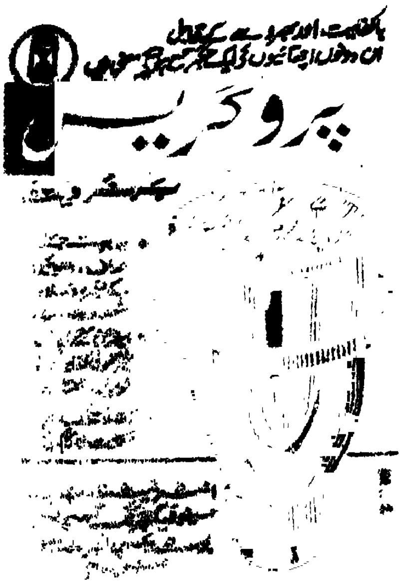
"ہلو مسٹر پنٹو! بولو کیا چلے گا۔ جن، وہسکی، رم؟"

پنٹو اُلوؤں کی طرح آنکھیں جھپکا کر رہ گیا۔ انور اُسے دھکیل کر بار میں لے گیا۔

یہاں سے جب انور باہر نکلا تو اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اُس نے ٹھوکر کھائی اور اوندھے منہ پتھریلے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ایکسرے کی رپورٹ کا لفافہ ہوا میں لہراتا ہوا دور تک چلا گیا یہاں تک کہ فٹ پاتھ پر بیٹھے ایک بوڑھے فقیر نے اُسے کوئی قیمتی چیز سمجھ کر اپنے بوریئے کے نیچے چھپا لیا۔

پتہ نہیں اُس کے بعد انور کو ہسپتال لے جایا گیا یا قبرستان! —— بہر حال ایک بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ وہ بوڑھا فقیر اب انور کا ایکسرے دکھا کر بھیک مانگا کرتا ہے اور رپورٹ کی ننھی سی پرچی اُس پر اسی طرح چسپاں ہے جس پر سُرخ روشنائی سے لکھی ہوئی عبارت صاف پڑھی جاتی ہے۔

"تشخیص —— پھیپھڑوں کا کینسر"



غزل

شیلائٹ ٹاؤن۔ سرگودھا (پاکستان)

۱۶ر جون ۱۹۶۶ء

برادرِ عالی مقام!

جب بھی آپ کا گرامی نامہ آتا ہے، آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور بخشتا ہے۔ فی الحقیقت آپ کا خلوص احباب کے لئے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن میں حیران ہوں، آپ کو مجھ سے شکایت کیسے پیدا ہوگئی؟

میں نے تو آپ کے ہر گرامی نامہ کا جواب فوراً دیا ہے۔ دراصل حالات کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی۔ ڈاک کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ ڈاک اب بھی شاید ٹھیک طرح سے نہیں پہنچ رہی ہے ممکن ہے میرا خط کہیں گم ہوگیا ہو —— عزیزہ گڈی کی شادی میں شرکت کی کتنی تمنا تھی —؟ لیکن یہ آہنی دیواریں!! کاش میں اس مبارک موقع پر حاضر ہوسکتا۔ کاش انسان کی خاص خاص تمنائیں تو پوری ہوہی جایا کریں —— خدا کرے وہ دن جلد آئے، جب راہ کی یہ دشواریاں ختم ہوں اور ہم ایک دوسرے سے گلے مل سکیں ——

پیارے بھائی! آج کل میری صحت ٹھیک نہیں ہے۔ خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ علاج کر رہا ہوں۔ صحت کے لئے دعا فرمایئے۔ بیماری کی حالت میں بھی آپ جیسے مخلص، جو مجھ سے دور ہیں، برابر مجھے یاد آتے رہتے ہیں —— ایک غیر مطبوعہ غزل حاضر ہے امید ہے آپ پسند فرمائیں گے۔

اپنی اور بچوں کی خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہیئے۔

آپ کی بھابی اور بھتیجی آپ کے لئے سلام اور دعائیں بھیج رہی ہیں

منتظرِ جواب

الطاف مشہدی

الطاف مشہدی

اُن کا پیغام دے دیا ہوتا
ایک الہام دے دیا ہوتا

نام اوروں کے کام کی شے ہے
مجھ کو تو جام دے دیا ہوتا

میری تعریف اے معاذاللہ!
کوئی الزام دے دیا ہوتا

دینے والے مجھے بھی اِک انعام
صورتِ شام دے دیا ہوتا

کاش پھولوں نے مسکرا کے مجھے
اپنا انجام دے دیا ہوتا

درد نایاب ہوگیا ورنہ
پھر انعام دے دیا ہوتا

وقت جاتا کہاں اگر تم نے
زلف کا دام دے دیا ہوتا

زخم اِک زخم مسکراتا ہوا
پھر آرام دے دیا ہوتا

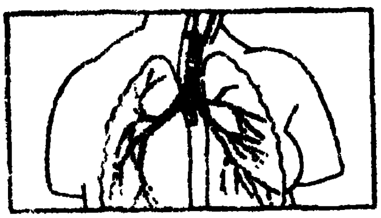
کھانسی سے نجات پانے کے لئے واٹربریز کمپاؤنڈ لیجئے

لال لیبل

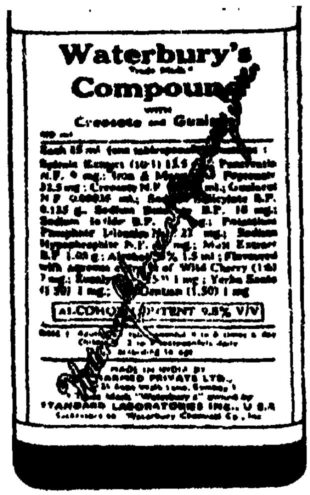








واٹربریز کمپاؤنڈ میں موجود کریوسوٹ اور گائیکول سانس کے نظام کو جراثیم سے پاک رکھتے ہیں اور بلغم خارج کرتے ہیں، پھیپھڑے صاف رکھتے ہیں، کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے میں مدد کرتے ہیں اور جراثیم کو دوبارہ پھیلنے سے روکتے ہیں۔



کھانسی مستقل رہنے سے کمزوری آجاتی ہے اور بیماری کا مقابلہ کرنے والی توانائی کم ہوجاتی ہے۔ واٹربریز کمپاؤنڈ بیک وقت تین طرح سے اثر کرتا ہے: آرام پہنچاتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے، اور بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے موثر اجزاء کریوسوٹ اور گائیکول کھانسی میں آرام پہنچاتے ہیں، لوہا اور مقوی اجزاء نیز جو اور طحال کے ست بھوک بڑھاتے ہیں، طاقت بحال کرتے ہیں اور جراثیم کا مقابلہ کرنے والی توانائی پیدا کرتے ہیں جس سے مرض کے پلٹنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

بارہ مہینے بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی توانائی برقرار رکھنے کے لئے لال لیبل والا واٹربریز کمپاؤنڈ پیجئے۔

واٹربریز کمپاؤنڈ

کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی توانائی پیدا کرتا ہے

وارنر - ہندوستان لیمیٹڈ، بمبئی

JWT-WL. 2394

انٹرویو

اکرم فاروقی۔ بی، اے۔ بی، ٹی

۶۴۔چلہ۔ امروہہ (یو۔پی)

۲۵ر اپریل ۶۶ء

مخدومی خوشتر بھائی! آداب

عزیزہ کی شادی کا دعوت نامہ مسرت افروز ہوا۔ بہت بہت شکریہ! مجھے افسوس ہے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باعث تقریب میں شریک نہیں ہوسکوں گا۔ میں عزیزہ گذّی کی شادی کے پُرمسرت و مقدس موقع پر اپنی نیک دعاؤں کی شگفتہ کلیاں اور بہترین خواہشات کے حسین گلدستے بھیج رہا ہوں۔ اللہ کرے وہ سدا خوش و خرم رہے، ہمیشہ شادمانیوں سے ہمکنار رہے۔ میری جانب سے پُرخلوص مبارکباد قبول فرمائیے ——— اِس بار "انٹرویو" پیشِ خدمت ہے۔ یقین ہے پسندِ خاطر ہوگا۔ یہ بہت مسرت کی بات ہے کہ موقر جریدہ "بیسویں صدی" میں میری جتنی کہانیاں اب تک شائع ہوئی ہیں، وہ سب ہند و پاک کے کسی نہ کسی اچھے ماہنامہ میں ڈائجسٹ کی گئی ہیں۔ یہ کامیابی میری کم اور آپ کی زیادہ ہے!...

مخلص ——— اکرم فاروقی

ابھی انٹرویو شروع ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔

میں جلدی جلدی معلوماتِ عامہ کے سوالات دیکھنے لگا۔ دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں آرہے تھے۔ نہ جانے کیا کیا سوال کئے جائیں۔

میں اپنی اِس مختصر زندگی میں دو باتوں سے ہمیشہ گھبراتا رہا ہوں۔ اوّل بیگم کی فرمائشیں اور دوئم انٹرویو کے سوالات! دونوں کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ دونوں باتیں "بلائے ناگہانی" کی طرح نازل ہوتی ہیں۔ ہر گھڑی یہی وسوسہ دل میں اُلجھن پیدا کئے رہتا ہے کہ نہ جانے کب کیا سوال کر دیا جائے۔

"کیا آپ بھی اُمید وار ہیں؟" ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"جی ہاں!" میں نے گردن اُٹھائی۔

میرے سامنے ایک نکھرے ستھرے نقوش کی لڑکی کھڑی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں اُداسیوں کے سیاہ ساگر تھے۔ چہرہ پر محرومیوں کی دُھندلی پرچھائیاں تھیں۔ وہ تھکی تھکی سی معلوم ہوتی تھی جیسے زندگی کا سارا سفر طوفانی ہواؤں اور گرم دھوپ میں پیدل طے کرکے آرہی ہے اور اب اپنی پلکوں پر آشاؤں کے ننّے دیپ جلا کر کسی خنک سائے کی تلاش میں نکل آئی ہے۔

"اور آپ بھی؟" میں نے سوال کیا۔

"جی!" اُس کے خشک ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ آگے بڑھ گئی اور میں اپنی جگہ بیٹھا کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا۔ میری طرح اور بھی بہت سے اُمید وار اِدھر اُدھر بیٹھے تقدیر سازی کے گُر یاد کر رہے تھے۔ پیپل کے سائے میں پڑی بینچ پر کئی ٹیڈی نوجوان بیٹھے محوِ گفتگو تھے۔ کچھ لڑکیاں بہت سج دھج کے ساتھ چہل قدمی میں مصروف تھیں۔ اُنھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انٹرویو میں شرکت کے لئے نہ آئی ہوں، اپنی کسی عزیز سہیلی کی شادی میں شریک ہونے آئی ہوں۔ کچھ اُمید وار، اُمید وار کم اور فرہاد زیادہ معلوم ہوتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی سندوں کو اِس طرح ہاتھوں میں دبا رکھا تھا جیسے وہ سندیں نہ ہوں، تیشۂ فرہاد ہوں اور وہ شیریں کے حکم کے منتظر ہوں کہ کب وہ لبِ نازک کو جنبش دے اور یہ نئے فرہاد جوئے شیر نکالیں۔ بعض سگریٹ کے مرغولے اِس طرح فضا میں تحلیل کر رہے تھے جیسے اُن کی نگاہوں میں ملازمت صرف ایک مرغولہ ہے۔ جس میں سفیدی بھی ہے، آنچ بھی اور پیچیدگی بھی اور جسے وہ ایک چٹکی بجاتے ہی اپنا بنالیں گے۔ کچھ اپنی کلائی پر بندھی گھڑیوں کو اِس طرح گھور گھور کر دیکھ رہے تھے

جیسے وقت کی رفتار مدھم پڑ گئی ہو۔ بعض کی نگاہیں آفس کے دروازہ پر لٹکی ہوئی چق میں کھو کر رہ گئی تھیں جیسے زندگی کی تمام تر خوشیاں چق کی شبک سلائیوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں اور جیسے وہ آج ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔

"انٹرویو کب شروع ہوگا؟" ایک فرہاد مجھ سے مخاطب تھا۔

"وقت مقررہ پر!" میں نے وقت کے مطابق مختصر جواب دیا۔

"وقتِ مقررہ کیا ہے؟" اس نے سوال کا ایک تیشہ اور مارا۔

"جو مقرر کیا جا چکا ہے۔" میرے لہجہ میں پتھروں جیسی کرختگی تھی۔

"بھائی جان! آخر کتنے بجے؟" اس کے لہجے میں کچے دودھ کی سی مٹھاس آگئی۔

"بھائی صاحب! گیارہ بجے!" اب کی بار میری آواز میں بھی موم کی طرح نرمی تھی۔

- شریر کو حلم سے، حریف کو نرمی سے اور جھوٹے کو صداقت سے رام کرو۔
(گوتم بدھ)
- میدانِ جنگ میں لڑنا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے نفس سے جنگ کرنا مشکل ہے۔
(بابا تلسی داس)
- جو لوگ نادان ہیں، پرماتما کو اپنے آپ سے دُور سمجھتے ہیں۔ وہ تو آتما کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔
(گورو گرنتھ صاحب)
- راجہ، جوگی، آگ، پانی، اِن سب کی ریت نرالی ہے۔ ان سے ہوشیار رہنا، پریت نہ بڑھانا۔
(پرسرام)
- خدا اور موت کو ہمیشہ یاد رکھو۔
(گورو نانک دیو جی)

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے "لہجۂ شیریں" تو اختیار کیا۔" وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا لیکن میں اپنے ذہن میں اِس "فرہاد و شیریں" کی نسبت کو سوچتا رہا کہ آخر ظالم میرے خیالوں پر تیشہ مار ہی گیا۔ میں وہاں سے اُٹھ کر آفس گیلری میں آگیا۔

"کیا صاحب آگئے؟" میں نے دفتر کے چپراسی سے پوچھا۔

"ابھی نہیں آئے۔" چپراسی کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

"دوست ناراض ہوگئے؟" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ارے صاحب ناراض نہ ہوں تو کیا خوش ہوں۔ جسے دیکھئے یہی پوچھتا چلا آتا ہے۔"

"لو سگریٹ پیو۔" میں نے پیکٹ بڑھایا۔

اور اس نے بغیر کسی چوں چرا کے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ اس کے چہرے پر تازگی دوڑ گئی۔ موڈ ٹھیک ہوگیا۔ مجھے چپراسیوں کے موڈ سے کئی بار واسطہ پڑ چکا ہے میں ان کی نفسیات سے واقف ہوں۔ میری واقفیت صرف چپراسیوں ہی تک نہیں ہے۔ میں ہر ناپ کے کلرکوں اور آفیسروں کے "موڈ شکنی" اور "موڈ سازی" کے طریقے بھی جانتا ہوں لیکن یہ میری کم نصیبی ہے کہ اب تک کسی بڑے انٹرویو میں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ مجھے بمبئی آئے ہوئے تقریباً دو ماہ گزر گئے۔ آج سے پہلے میں سرکاری، غیر سرکاری دفتروں کے دروازوں پر قسمت آزمائی کر چکا ہوں کہیں نو کا بورڈ میرے منصوبوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہوگیا اور کہیں میری تھرڈ ڈویژن رکاوٹ بن گئی ہیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا کاش میرا کوئی اپنا ہیڈ کلرک ہوتا، آفیسر، منسٹر ہوتا لیکن افسوس ایسا کوئی نہیں۔ مجھے کئی بار اپنی سندوں سے نفرت ہوئی چاہا کہ انھیں نذرِ آتش کر دوں لیکن قبلہ والد مرحوم کی خون پسینہ کی کمائی آنکھوں سامنے گھوم جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سندوں کے حروف سیاہی نہیں، میرے والد کے گاڑھے خون سے لکھے گئے ہوں! میں دوسرے ہی لمحہ ان حروف کے تقدس میں کھو جاتا ہوں اور اپنی پیاسی پلکوں سے لگا کر ایک عظیم روحانی آسودگی محسوس کرتا ہوں۔

"بڑے صاحب کا کیا نام ہے؟" میں نے چپراسی کے چہرے کی بشاشت دیکھ کر سوال کیا۔

"آر، کے ماتھر!" اس نے بے نیازی کے ساتھ دھواں چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"آر، کے ماتھر!" میں نے دل ہی دل میں، اس نام کو دُہرایا۔ میرے دل میں نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے اِس نام سے شدید نفرت ہے۔ میں اِس نام کے شخص سے ملتے ہوئے ہمیشہ گریز کرتا ہوں۔ مجھے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں راجندر کمار سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ وہ میرا گہرا دوست ہے لیکن بعد میں کچھ ناسازگار حالات کی وجہ سے اس قدر نفرت ہوگئی کہ میں اس سے کبھی نہیں ملا اور اب تو اس نام کے شخص سے ملتے ہوئے بھی دامن بچاتا ہوں لیکن آج پھر ایک ایسے ہی نام کے شخص سے سابقہ پڑنے والا تھا میں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا انٹرویو میں شرکت نہ کروں لیکن پھر اپنی زندگی کی محرومیوں کا خیال آیا اور ٹھہر گیا۔

"کیا واقعی ان کا نام راجندر کمار ماتھر ہے؟" میں نے کچھ اپنے معصومانہ انداز سے پوچھا جیسے مجھے یقین نہ ہو۔

"آپ کو شک ہے؟" چپراسی نے میرا سراپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں مجھے یقین ہے۔" میری بدحواسی میرے لہجے سے ظاہر تھی۔

میں آفس کے سامنے والے لان میں آکر بیٹھ گیا۔

"کتنی جگہیں خالی ہیں؟" وہی پہلے والی لڑکی مخاطب تھی۔

"تین" میں نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کیا۔

"لیکن اُمیدوار تو تین سو معلوم ہوتے ہیں!" لڑکی فکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"دیش کی بے روزگاری کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بھی کم ہے" میں نے اپنے پچھلے انٹرویو کے تجربوں کے پیش نظر کہا۔

"دیکھئے کس کے نصیب جاگتے ہیں" یہ لڑکی تقدیر پرست معلوم ہوتی تھی۔

"جس کے پاس بڑی سفارش کی کنجی ہے وہی اپنے نصیب کا قفل کھول سکتا ہے" میں اپنے تلخ تجربوں کی بنیاد پر بول رہا تھا۔

"لیجئے انٹرویو شروع ہو گیا!" لڑکی آفس کی جانب بڑھتے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

میں بھی اپنی آرزوؤں کے ہجوم کو گلے لگاتے آگے بڑھ آیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں انٹرویو کے وقت نروس ہو جاتا ہوں لیکن آج میرے اندر خود اعتمادی کے جوہر بیدار ہو گئے تھے۔ مجھے اپنی کامیابی کا سو فیصدی یقین تھا لیکن باس صاحب کی نیم پلیٹ دیکھ کر میں پھر ہراساں ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے تختی کے حروف دہکتے انگارے ہوں جو لمحہ بھر میں میرے سارے بدن کو جھلس دیں گے۔ مجھے جلا کر راکھ کر دیں گے! نہ جانے کیوں جب میں کسی راجندر کمار کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے بچپن کا رتن یاد آجاتا ہے اور اُس کی یادوں کی چنگاریاں نفرت کے سیاہ کفن سے نکل کر میرے ذہن کی نسوں سے چمٹ جاتی ہیں۔

"اُرملا کماری!" چپراسی نے آواز لگائی

یہ وہی لڑکی تھی جو پہلے مجھ سے بات کر رہی تھی۔ اُس نے اپنی ساڑی کے پلو کو سنبھالا، بالوں کو درست کیا، ہونٹوں پر زبان پھیری، رومال سے چہرہ صاف کیا اور آہستہ آہستہ انٹرویو روم میں داخل ہو گئی۔ مجھے لڑکی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کی پریشانی دیکھ کر میرے دل کے گوشوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ خدا کرے اِس لڑکی کا بھی سلیکشن ہو جائے۔ میں اُس کے انٹرویو کو دیکھنے کے لئے کھڑکی سے جھانکنے لگا لیکن یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ سر چکرا گیا۔ انٹرویو لینے والا وہی راجندر کمار ماتھر تھا جسے میں رتن کہتا تھا!

میرے خدا! اب کیا ہوگا؟ میرا سلیکشن کیسے ہوگا؟ رتن تو میرا جانی دشمن ہے! کئی سوال میرے دل میں کلبلانے لگے۔

میں بہت تیز قدموں سے آکر لان میں سرنگوں بیٹھ گیا اور میرا ذہن ماضی کی پُرخار وادیوں میں بھٹکنے لگا۔

رتن میرے بچپن کا ساتھی تھا، میرا ہم وطن تھا۔

ہم نے زندگی کی کئی منزلیں ایک ساتھ گزاری تھیں۔ کتنی ہی راہوں پر ایک ساتھ قدم اُٹھائے تھے، ہاتھوں میں ہاتھ دے کر پارکوں میں گھومے تھے، ہوٹلوں میں چائے نوشی کی تھی، رات کے سناٹوں میں پلیٹ فارم پر گشت لگائے تھے۔ ٹرین میں حسین چہروں کو دیکھا تھا۔ ایک ساتھ ایک جیسے ملے جُلے جذبے بیدار ہوئے تھے۔ بہ صورت ہمارا ایک خوبصورت مشغلہ تھا، ایک تفریح تھی اور ایسی کوئی بھی تفریح جس سے کردار کے شیشے پر بال نہ آئے، جائز ہے۔ بہت دنوں تک ہماری گاڑی چلتی رہی۔ لیکن بزرگوں کا یہ مقولہ غلط نہیں کہ عورت کی ذات دوستوں کے بیچ خلیج پیدا کر دیتی ہے۔

ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

جب ہم لوگ ہندو کالج کے طالب علم تھے، اُس وقت ڈینس نام کی ایک

- مجھے پڑوسی سے حسنِ سلوک کی یہاں تک تاکید کی گئی کہ مجھے خیال ہوا کہ اُنھیں میرا وارث بنا دیا جائے گا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- ہمسایہ کا صرف اِتنا ہی حق نہیں کہ اُسے ایذا نہ دی جائے، اُس کا یہ بھی حق ہے کہ اُس کے ساتھ احسان کیا جائے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- مجھے نئے کپڑوں میں دفن نہ کیا جائے، نئے کپڑوں کے زیادہ مستحق وہ ہیں جو زندہ اور برہنہ ہیں۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- عورت اگر صاحب عصمت ہے تو اُس کی دوسری فروگزاشتوں پر درگزر سے کام لو۔ (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)
- ایمان والو! اپنے معاہدے پورے کرو۔ (قرآن پاک)

کرسچین لڑکی بھی ہماری ہم جماعت تھی۔ لڑکی خوبصورت تو نہ تھی لیکن اُس کے چہرے میں بے پناہ کشش اور ملاحت تھی۔ بے کراں متانت تھی۔ سادگی اُس کی فطرت تھی لیکن اُس کی سادگی میں بھی ایک حُسن تھا، ایک وقار تھا اور ایک انفرادیت تھی جس وقت اُس نے کالج میں داخلہ لیا اور مضامین کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا تو میں نے جرأت کے ساتھ اُسے مخاطب کیا تھا۔

"سنئے!" وہ کامن روم کے دروازہ پر ٹھہر گئی۔

"جی میں نے ہی پکارا ہے" میں نے گردن جھکائی اور اُس کی طرف بڑھ گیا۔

"فرمایئے کیا بات ہے؟" غالباً اُس نے میری حیدرآبادی شیروانی سے متاثر ہو کر یہ لہجہ اختیار کیا تھا۔

جیسے وقت کی رفتار مدھم پڑگئی ہو۔ بعض کی نگاہیں آفس کے دروازہ پر لٹکتی ہوئی چق میں کھو کر رہ گئی تھیں جیسے زندگی کی تمام تر خوشیاں چق کی شبک سلائیوں کے پیچھے چھپی ہوتی ہیں اور جسے وہ آج ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔

"انٹرویو کب شروع ہوگا؟" ایک فرہاد مجھ سے مخاطب تھا۔

"وقتِ مقررہ پر!" میں نے وقت کے مطابق مختصر جواب دیا۔

"وقتِ مقررہ کیا ہے؟" اُس نے سوال کا ایک تیشہ اور مارا۔

"جو مقرر کیا جا چکا ہے۔" میرے لہجہ میں پتھروں جیسی کرختگی تھی۔

"بھائی جان! آخر کتنے بجے؟" اُس کے لہجے میں کچھ دودھ کی سی مٹھاس آگئی۔

"بھائی صاحب! گیارہ بجے!" اب کی بار میری آواز میں بھی موم کی طرح نرمی تھی۔

- شریر کو حلم سے، حریف کو نرمی سے اور جھوٹے کو صداقت سے رام کرو۔ (گوتم بدھ)
- میدانِ جنگ میں لڑنا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے نفس سے جنگ کرنا مشکل ہے۔ (باباتُلسی داس)
- جو لوگ نادان ہیں، پرماتما کو اپنے آپ سے دُور سمجھتے ہیں۔ وہ تو آتما کی طرح ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے۔ (گورو گرنتھ صاحب)
- راجہ، جوگی، آگ، پانی، اِن سب کی ریت نرالی ہے۔ ان سے ہوشیار رہنا، پریت نہ بڑھانا۔ (پرسرام)
- خدا اور موت کو ہمیشہ یاد رکھو۔ (گورو نانک دیو جی)

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے "لہجۂ شیریں" تو اختیار کیا۔" وہ مُسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا لیکن میں اپنے ذہن میں اس فرہاد و شیریں کی نسبت کو سوچتا رہا کہ آخر ظالم میرے خیالوں پر تیشہ مار ہی گیا۔ میں وہاں سے اُٹھ کر آفس گیلری میں آگیا۔

"کیا صاحب آگئے؟" میں نے دفتر کے چپراسی سے پُوچھا۔

"ابھی نہیں آئے۔" چپراسی کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

"دوست ناراض ہوگئے؟" میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"ارے صاحب ناراض نہ ہوں تو کیا خوش ہوں۔ جسے دیکھئے یہی پُوچھتا چلا آتا ہے۔"

"لو سگریٹ پیو۔" میں نے پیکٹ بڑھایا۔

اور اُس نے بغیر کسی چوں چرا کے سگریٹ نکال کر سُلگا لیا۔ اُس کے چہرے پر تازگی دوڑ گئی۔ موڈ ٹھیک ہوگیا۔ مجھے چپراسیوں کے موڈ سے کئی بار واسطہ پڑ چکا ہے میں اُن کی نفسیات سے واقف ہوں۔ میری واقفیت صرف چپراسیوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ میں ہر ناپ کے کلرکوں اور آفیسروں کے "موڈ شکنی" اور "موڈ سازی" کے طریقے بھی جانتا ہوں لیکن یہ میری کم نصیبی ہے کہ اب تک کسی بڑے انٹرویو میں کامیابی حاصل نہیں کرسکا۔ مجھے بمبئی آئے ہوئے تقریباً دو ماہ گزر گئے۔ آج سے پہلے بھی کئی سرکاری، غیر سرکاری دفتروں کے دروازوں پر قسمت آزمائی کرچکا ہوں کہیں تو دیکھی کا بورڈ میرے منصوبوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہوگیا اور کہیں میری تھرڈ ڈویژن رکاوٹ بن گئی ہیں۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا کاش میرا کوئی اپنا ہیڈ کلرک ہوتا، آفیسر ہوتا، منسٹر ہوتا لیکن افسوس ایسا کوئی نہیں۔ مجھے کئی بار اپنی سندوں سے نفرت ہوئی تو چاہا کہ انھیں نذرِ آتش کردوں لیکن قبلہ والد مرحوم کی خون پسینہ کی کمائی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سندوں کے حروف سیاہی سے نہیں، میرے والد کے گاڑھے خون سے لکھے گئے ہوں! میں دوسرے ہی لمحہ اُن حروف کے تقدس میں کھو جاتا ہوں اور اپنی پیاسی پلکوں سے لگا کر ایک عظیم روحانی آسودگی محسوس کرتا ہوں۔

"بڑے صاحب کا کیا نام ہے؟" میں نے چپراسی کے چہرے کی بشاشت دیکھ کر سوال کیا۔

"آر۔ کے۔ ماتھر!" اُس نے بے نیازی کے ساتھ دُھواں چھوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"آر۔ کے۔ ماتھر!" میں نے دل ہی دل میں اس نام کو دُہرایا۔ میرے دل میں نفرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مجھے اس نام سے شدید نفرت ہے۔ میں اس نام کے شخص سے ملتے ہوئے ہمیشہ گریز کرتا ہوں۔ مجھے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں راجندر کمار سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ وہ میرا گہرا دوست ہے لیکن بعد میں کچھ ناسازگار حالات کی وجہ سے اس نفرت ہوگئی کہ میں اُس سے کبھی نہیں ملا اور اب تو اس نام کے شخص سے ملتے ہوئے بھی دامن بچاتا ہوں لیکن آج پھر ایک ایسے ہی نام کے شخص سے سابقہ پڑنے والا تھا میں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا انٹرویو میں شرکت نہ کروں لیکن پھر اپنی زندگی کی ضرورتوں کا خیال آیا اور ٹھہر گیا۔

"کیا واقعی اُن کا نام راجندر کمار ماتھر ہے؟" میں نے کچھ ایسے معصومانہ انداز سے پُوچھا جیسے مجھے یقین نہ ہو۔

"آپ کو شک ہے؟" چپراسی نے میرا سراپا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں مجھے یقین ہے؟" میری بدحواسی میرے لہجہ سے ظاہر تھی۔

میں آفس کے سامنے والے لان میں آکر بیٹھ گیا۔

"کتنی جگہیں خالی ہیں ؟" وہی پہلے والی لڑکی مخاطب تھی۔

"تین" میں نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کیا۔

"لیکن امیدوار تو تین سو معلوم ہوتے ہیں!" لڑکی فکر میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"دیش کی بے روزگاری کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بھی کم ہے" میں نے اپنے پچھلے انٹرویو کے تجربوں کے پیش نظر کہا۔

"دیکھیے کس کے نصیب جاگتے ہیں" لڑکی تقدیر پرست معلوم ہوتی تھی۔

"جس کے پاس بڑی سفارش کی کنجی ہے وہی اپنے نصیب کا قفل کھول سکتا ہے" میں اپنے تلخ تجربوں کی بنیاد پر بول رہا تھا۔

"لیجیے انٹرویو شروع ہوگیا!" لڑکی آفس کی جانب بڑھتے ہوئے ہجوم کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔

میں بھی اپنی آرزوؤں کے ہجوم کو گلے لگائے آگے بڑھ گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں انٹرویو کے وقت نروس ہو جاتا ہوں لیکن آج میرے اندر خود اعتمادی کے جوہر بیدار ہوگئے تھے۔ مجھے اپنی کامیابی کا سو فیصدی یقین تھا لیکن بڑے صاحب کی نیم پلیٹ دیکھ کر میں پھر ہراساں ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے تختی کے حروف دہکتے انگارے ہوں جو لمحہ بھر میں میرے سارے بدن کو جھلس دیں گے۔ مجھے جلا کر راکھ کر دیں گے! نہ جانے کیوں جب میں کسی راجندر کمار کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے بچپن کا رتن یاد آجاتا ہے اور اُس کی یادوں کی چنگاریاں نفرت کے سیاہ کفن سے نکل کر میرے ذہن کی نسوں سے چمٹ جاتی ہیں۔

"اُرملا کماری!" چپراسی نے آواز لگائی

یہ وہی لڑکی تھی جو پہلے مجھ سے بات کر رہی تھی۔ اُس نے اپنی ساڑی کے پلّو کو سنبھالا، بالوں کو درست کیا، ہونٹوں پر زبان پھیری، رومال سے چہرہ صاف کیا اور آہستہ آہستہ انٹرویو روم میں داخل ہوگئی۔ مجھے لڑکی میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اُس کی پریشانی دیکھ کر میرے دل کے گوشوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ خدا کرے اِس لڑکی کا بھی سیلکشن ہو جائے۔ میں اُس کے انٹرویو کو دیکھنے کے لئے کھڑکی سے جھانکنے لگا لیکن یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ سر چکرا گیا۔ انٹرویو لینے والا وہی راجندر کمار ماتھر تھا جسے میں رتن کہتا تھا!

میرے خدا! اب کیا ہوگا؟ میرا سیلکشن کیسے ہوگا؟ رتن تو میرا جانی دشمن ہے!

کئی سوال میرے دل میں کلبلانے لگے۔

میں بہت تیز قدموں سے آکر لان میں سرنگوں بیٹھ گیا اور میرا ذہن ماضی کی پُرخار وادیوں میں بھٹکنے لگا۔

رتن میرے بچپن کا ساتھی تھا، میرا ہم وطن تھا۔

ہم نے زندگی کی کئی منزلیں ایک ساتھ گزاری تھیں۔ کتنی ہی راہوں پر ایک ساتھ قدم اُٹھائے تھے، ہاتھوں میں ہاتھ دے کر پارکوں میں گھومے تھے، ہوٹلوں میں چائے نوشی کی تھی، رات کے سناٹوں میں پلیٹ فارم پر گشت لگائے تھے۔ ٹرین میں حسین چہروں کو دیکھا تھا۔ ایک ساتھ ایک جیسے ملے جلے جذبے بیدار ہوتے تھے۔ بہرحال ہمارا ایک خوبصورت مشغلہ تھا، ایک تفریح تھی اور ایسی کوئی بھی تفریح جس سے کردار کے شیشہ پر بال نہ آئے، جائز ہے۔ بہت دنوں تک ہماری گاڑھی چھنتی رہی۔

لیکن بزرگوں کا یہ مقولہ غلط نہیں کہ عورت کی ذات دوستوں کے بیچ خلیج پیدا کر دیتی ہے۔

ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

جب ہم لوگ ہندو کالج کے طالب علم تھے، اُس وقت وینس نام کی ایک کرسچین لڑکی بھی ہماری ہم جماعت تھی۔ لڑکی خوبصورت تو نہ تھی لیکن اُس کے چہرے میں بے پناہ کشش اور ملاحت تھی۔ بے کراں متانت تھی۔ سادگی اُس کی فطرت تھی لیکن اُس کی سادگی میں بھی ایک حُسن تھا، ایک وقار تھا اور ایک انفرادیت تھی جس وقت اُس نے کالج میں داخلہ لیا اور مضامین کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا تو میں نے جرأت کے ساتھ اُسے مخاطب کیا تھا۔

- مجھے پڑوسی سے حُسنِ سلوک کی یہاں تک تاکید کی گئی کہ مجھے خیال ہوا اُنھیں میرا وارث بنا دیا جائے گا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- ہمسایہ کا صرف اِتنا ہی حق نہیں کہ اُسے ایذا نہ دی جائے، اُس کا یہ بھی حق ہے کہ اُس کے ساتھ احسان کیا جائے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- مجھے نئے کپڑوں میں دفن نہ کیا جائے، نئے کپڑوں کے زیادہ مستحق وہ ہیں جو زندہ اور برہنہ ہیں۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- عورت اگر صاحب عصمت ہے تو اُس کی دوسری فروگزاشتوں پر درگزر سے کام لو۔ (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)
- ایمان والو! اپنے معاہدے پورے کرو۔ (قرآن پاک)

"سنیے!" وہ کامن روم کے دروازہ پر ٹھہر گئی۔

"جی میں نے ہی پکارا ہے" میں نے گردن جھکائی اور اُس کی طرف بڑھ گیا۔

"فرمایئے کیا بات ہے؟" غالباً اُس نے میری حیدرآبادی شیروانی سے متاثر ہوکر یہ لہجہ اختیار کیا تھا۔

"جی وہ... اصل میں... بلت... ؟" میری زبان دل کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"کہیے — کہیے!" اُس نے مجھے حوصلہ بخشا۔

"میں چاہتا ہوں آپ اُردو آفر کریں۔" میں نے اپنا مقصد ظاہر کیا۔

"تو آپ ہیں اُردو کے ایجنٹ!" اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لمبی لکیر تھی۔

"ایجنٹ کہہ لیجیے یا ادنیٰ خادم!" میں نے شیروانی کا مرکزی بٹن کھول دیا۔

"خادم —؟ اپنے یا اُردو کے؟" اُس کے لہجہ میں ذہانت آمیز طنز کی آمیزش تھی۔

"دونوں ہی کا سمجھ لیجیے!" میرا جواب اُس کی خندہ پیشانی کا ردِ عمل تھا۔

وینس نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ میں اپنی اُس کامیابی پر بے حد مسرور تھا۔ جیسے میں نے کوئی عظیم معرکہ سر کر لیا ہو۔ اُردو پروفیسر بھٹناگر صاحب نے میرے اِس کام کو بہت سراہا تھا اور اُس کے صلہ میں اُنھوں نے مجھے کالج میگزین کے اُردو سیکشن کا ایڈیٹر بھی منتخب کر دیا تھا۔

دن گزرتے گئے اور میرا رجحان وینس کی طرف بڑھتا گیا۔

میری توجہ، میرا خیال اور میری تمام تر دلچسپی نصابی کتابوں سے ہٹ کر رومانی ناولوں میں کھو گئی، رومانی نظموں میں ڈوب گئی۔ میرے دل و دماغ پر محبت کی کیف آگیں رعنائیاں محیط ہو گئیں۔ مجھے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک انقلاب محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے ہر چیز شباب انگیز نظر آتی تھی۔ میں نے زندگی کا تمام تر مقصد رُومان کے حسین سبزہ زاروں میں کھوئے رہنا سمجھ لیا تھا اور میری اِسی ناسمجھی کا عبرتناک نتیجہ یہ میری تھرڈ ڈویژن ہے۔ کاش میں اُس وقت عشق و محبت کے تباہ کُن آغاز کے انجام کو سمجھ لیتا لیکن میں نے اپنے مخلص دوستوں کو "مہرنا آشنا ناصح" کہہ کر ٹال دیا، کبھی اُن کے پُرخلوص مشوروں کو اہمیت نہ دی۔ میرے دل کے ایوان میں وینس کی محبت کی شمعیں فروزاں تھیں۔ میرے دماغ کی نسوں میں عشق کا جنون کارفرما تھا۔ میں ہر لمحہ، ہر لحظہ، ہر آن وینس کے حُسن آفریں تصوّر میں غرق رہتا تھا۔

"نریش کمار!" چپراسی نے ایک اور نام پُکارا۔

اُمیدواروں کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ بہت دیر تک جب کوئی آگے نہ بڑھا تو چپراسی آفس میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے تیسرا نام پُکارا — پھر چوتھا — پھر پانچواں — اِنٹرویو جاری رہا اور میں کچھ فاصلہ پر بیٹھا ہوا ماضی کے الاؤ سے چنگاریاں کُریدتا رہا۔

انجام کار میں اپنی عدم دلچسپی کے باعث ششماہی امتحان میں فیل ہو گیا۔ رتن اور وینس پاس ہو گئے۔ پہلے وینس میری ذہانت سے بہت متاثر تھی لیکن ششماہی کے نمبر دیکھنے کے بعد میری حماقت کی قائل ہو گئی اور مجھ سے بچنے لگی۔ جیسے میں بے حد کند ذہن طالب علم ہوں۔ اِسی عرصہ میں رتن اور وینس کے تعلقات بڑھ گئے۔ مجھے رتن سے نفرت سی ہو گئی۔ اپنی توہین کا شدید احساس ہوا اور میں نے رتن سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔

"رتن! مجھے تم سے ایسی اُمید ہرگز نہ تھی!" آخر میں ایک دن شکایت کر ہی بیٹھا۔

"کیسی اُمید؟" وہ سراپا سوال بن گیا۔

"جان بُوجھ کر انجان بنتے ہو؟" میں نے کرخت لہجہ میں کہا۔

"صاف صاف کہو۔ معموں کے اشاروں میں نہ اُلجھاؤ۔" اُس نے اپنے شانوں پر بکھرے بالوں کو سنوارا۔

"پودے ہم لگائیں پھول تم سُونگھو!" میرے لہجے میں ناکام حسرت کے غنچوں کی مِٹتی ہوئی خوشبو تھی۔

"کیسے پودے؟ — کیسے پھول؟" اُس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

"دوست! اتنے بھولے نہ بنو۔ وینس کو پہلے میں نے چاہا ہے۔ اُس کے پیار میں فیل میں ہوا ہوں۔ بدنامی میں نے لی ہے۔ ذہنی آسودگی سے محروم میں ہوا ہوں۔ یاس میں نے سہی اور تم ہو کہ "مگن لال رستوگی" بنے پھرتے ہو!" میری آواز میں احتجاج کی گونج تھی۔

"راشد! یہ تمھاری غلط فہمی ہے!" رتن نے میرے شانوں کو ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ دیکھا جائے گا۔" میں نے اپنے جذبات پر قابو پایا اور آگے بڑھ گیا۔

ٹھنڈی ہواؤں کی نشیلی لہر میرے بدن کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے اِرد گرد کے ماحول کا جائزہ لیا اور سگریٹ سُلگا کر مرغولوں میں مستقبل کی پرچھائیاں دیکھنے لگا۔

"کیا آپ اِنٹرویو دینے آئے ہیں؟" ایک اُمیدوار نے مجھ سے آکر پُوچھا۔

"نہیں۔" میرا جواب مختصر تھا اور لہجہ خُشک۔

"آپ کچھ اُداس اُداس سے نظر آتے ہیں۔" وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"پھر آپ سب سے الگ کیوں بیٹھے ہیں؟" اُس کی نگاہیں آفس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

"میرا ارادہ اِنٹرویو دینے کا نہیں ہے۔" اُسے میں نے اپنا فیصلہ سُنایا۔

"آخر کیوں؟" اُس کے لہجہ میں خلوص تھا۔

"نیاز محمد!" چپراسی نے آواز لگائی۔

اور میرے قریب بیٹھا ہوا نوجوان تیزی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ شاید وہ اپنے نام کی ترتیب کی پروا کئے بغیر میری دلجوئی کے لئے آ گیا تھا۔ میں نے حقارت آمیز نگاہوں سے آفس کی

دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہوئی۔ جو امید وار انٹرویو دے کر باہر آیا تھا۔ دوسرے نوجوان اُس سے کیے گئے سوالات کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔

جب وینس اور رتّن کے تعلقات کو برداشت نہ کر سکا میں نے وینس کو گمنام خط لکھے کہ وہ رتّن کا ساتھ چھوڑ دے ورنہ پچھتانا پڑے گا! لیکن وینس اُس کے اور قریب ہوتی گئی اور ایک دن میں نے رتّن کے نام سے وینس کے ڈیڈی کو خط لکھا۔ وہ اُن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن خط اُس کے والد کو نہیں ملا۔ ایک بار میں رتّن کے پتاجی سے بھی ملا اور اُن سے صاف صاف کہا کہ "آپ کا بیٹا روز بروز آوارہ ہوتا جا رہا ہے اگر اُس پر پابندی عائد نہ کی گئی تو آپ کی عزّت کو بٹا لگنے کا ڈر ہے۔" پتاجی نے رتّن کو بہت سخت سُست کہا اور اُسے گھر سے نکال دینے کی دھمکی بھی دی۔ میں اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور تھا لیکن رتّن میرے ان تمام حملوں کو برداشت کرتا رہا۔ آخر میں نے رتّن اور وینس کے رومان کا خوب خوب پروپیگنڈہ کیا۔ دوسرے طلباء سے بھی یہ اعزازی خدمت حاصل کی۔ کالج میں پڑھنے والی دوستوں کی بہنوں کو اس بات کے لئے ہموار کیا کہ وہ وینس کو رتّن سے کشیدگی پر آمادہ کریں، ورنہ کالج بدنام ہو جائے گا۔ رفتہ رفتہ یہ بات کالج کے گوشے گوشے میں عام ہو گئی۔ لڑکیاں وینس کو لعنت ملامت کرتیں، گرلس یونین کے وقار کا واسطہ دیا جاتا، سیتا و مریم کے کردار پیش کیے جاتے۔ آخرکار کوشش کارگر ہو گئی۔ دوسری طرف کچھ دوستوں کا ایک گروپ اس کام کے لئے مقرر تھا کہ وہ رتّن کو کھلم کھلا اظہارِ محبت پر اکسائیں۔ محبت کا کھیل کھیلنے والوں کی فطرت ہے کہ وہ جلد کہا مان جاتے ہیں۔ اس لئے رتّن کلاس میں ہو، لائبریری میں، اوپن شیلف میں یا گیلری میں، اُسے اظہارِ محبت سے مطلب! جب وینس سے روبرو ہونے کے مواقع کم ہو گئے تو اُس نے خطوط کا سہارا لیا۔ وینس کے نام رومانی خط لکھے۔ لڑکیوں کے لئے یہ خطوط دستاویز بن گئے اور انہوں نے وینس کو اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ وہ پرنسپل کے سامنے رتّن کے تمام خطوط رکھ دے اور صاف صاف یہ کہہ دے کہ رتّن اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ گواہی کے لئے کئی لڑکیوں نے اپنے نام پیش کر دیے۔ آخرکار معاملہ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچ ہی گیا۔ تحقیقات کی گئی اور ایک دن رتّن کا ریسٹریکشن کر دیا گیا۔

میں نے ایک سگریٹ اور سلگایا اور سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ میرے سامنے مستقبل ایک سوالیہ نشان تھا۔ میری ساری اُمیدیں ساری آرزوئیں اس انٹرویو سے وابستہ تھیں لیکن ماضی کے واقعات نے آرزوؤں کے چراغ بجھا دیئے۔ امیدوں کے ستارے ڈوبنے لگے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ میں نے رتّن کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا تھا۔ میں اب کس منہ سے اُس کے سامنے امیدوار بن کر جا سکتا ہوں؟ لیکن پھر میں نے سوچا، اُن واقعات کو بارہ سال سے زیادہ گزرے ہوئے ہو گئے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ وہ واقعات اُسے یاد ہوں؟ اور اگر یاد بھی ہوں تو بہت ممکن ہے نظر انداز کر دے لیکن دوستوں کے زخم اکثر بھرا نہیں کرتے۔ "نہیں نہیں میں انٹرویو میں ہرگز نہ جاؤں گا!" میری غیرت اور خودداری کے جذبے جاگ اُٹھے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی بیوی اور بچوں کے چہرے یاد آ گئے۔ برسوں کی ہوئی چھوٹی موٹی ملازمتیں یاد آ گئیں۔ کئی کئی ماہ تنخواہ نہ ملنے کے سبب اذیتوں کا ہجوم یاد آ گیا۔

"میرے خدا! کیا کروں ——؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے کو تھام لیا۔

"ناکامی یقینی ہے! اس لئے انٹرویو میں جانا فضول ہے۔" نہ جانے یہ آواز کہاں سے آ کر میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی۔ میں تیزی کے ساتھ اُٹھا، دامن جھاڑا اور اپنی قیام گاہ کی طرف چلنے لگا۔

"راشد قریشی ——" چپراسی نے آواز لگائی۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے دھوپ چھاؤں کی پرچھائیاں ناچ اُٹھیں۔ دوسرے لمحہ میرے قدم آفس کے اندر تھے۔

"آپ!!" رتّن مجھے دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام میری درخواست میں لکھا ہوا ہے۔" میں بے اعتنائی سے بولا۔

"تو آپ نے یہاں تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ——!" اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"جی وہ... اصل میں... بات..." میری زبان دل کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"کہیے ___ کہیے!" اس نے مجھے حوصلہ بخشا۔

"میں چاہتا ہوں آپ اُردو آفر کریں" میں نے اپنا مقصد ظاہر کیا۔

"تو آپ ہیں اُردو کے ایجنٹ!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لمبی لکیر تھی۔

"ایجنٹ کہہ لیجیے یا ادنیٰ خادم" میں نے شیروانی کا مرکزی بٹن کھول دیا۔

"خادم ___؟ اپنے یا اُردو کے؟" اس کے لہجہ میں ذہانت آمیز طنز کی آمیزش تھی۔

"دونوں ہی کا سمجھ لیجیے!" میرا جواب اس کی خندہ پیشانی کا ردِّ عمل تھا۔

وینس نے میرا مشورہ قبول کر لیا۔ میں اپنی اس کامیابی پر بے حد مسرور تھا۔ جیسے میں نے کوئی عظیم معرکہ سر کر لیا ہو۔ اُردو پروفیسر سچدانند صاحب نے میرے اس کام کو بہت سراہا تھا اور اس کے صلہ میں انھوں نے مجھے کالج میگزین کے اُردو سیکشن کا ایڈیٹر بھی منتخب کر دیا تھا۔

دن گزرتے گئے اور میرا رجحان وینس کی طرف بڑھتا گیا۔

میری توجہ، میرا خیال اور میری تمام تر دلچسپی نصابی کتابوں سے ہٹ کر رومانی ناولوں میں کھو گئی، رومانی نظموں میں ڈوب گئی۔ میرے دل و دماغ پر نسبت کی کیف آگیں رعنائیاں محیط ہو گئیں۔ مجھے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک انقلاب محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے ہر چیز شباب انگیز نظر آتی تھی۔ میں نے زندگی کا تمام تر مقصد رُومان کے حسین سبزہ زاروں میں کھوئے رہنا سمجھ لیا تھا اور میری اسی ناسمجھی کا عبرتناک نتیجہ یہ میری تھرڈ ڈویژن ہے۔ کاش میں اُس وقت عشق و محبت کے تباہ کن آغاز کے انجام کو سمجھ لیتا لیکن میں نے اپنے مخلص دوستوں کو "مہر ناآشنا ناصح" کہہ کر ٹال دیا، کبھی اُن کے پُر خلوص مشوروں کو اہمیت نہ دی۔ میرے دل کے ایوان میں وینس کی محبت کی شمعیں فروزاں تھیں۔ میرے دماغ کی نسوں میں عشق کا جنون کارفرما تھا۔ میں ہر لمحہ، ہر لحظہ، ہر آن وینس کے حُسن آفریں تصور میں غرق رہتا تھا۔

"نرگس کمار!" چپراسی نے ایک اور نام پکارا۔

اُمیدواروں کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ بہت دیر تک جب کوئی آگے نہ بڑھا تو چپراسی آفس میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے تیسرا نام پکارا ___ پھر چوتھا ___ پھر پانچواں ___ انٹرویو جاری رہا اور میں کچھ فاصلہ پر بیٹھا ہوا ماضی کے الاؤ سے چنگاریاں کُریدتا رہا۔

انجام کار میں اپنی عدم دلچسپی کے باعث ششماہی امتحان میں فیل ہو گیا۔ رتن اور وینس پاس ہو گئے۔ پہلے وینس میری ذہانت سے بہت متاثر تھی لیکن ششماہی کے نمبر دیکھنے کے بعد میری حماقت کی قائل ہو گئی اور بدھو سمجھنے لگی۔ جیسے میں بے وقوف ذہین طالب علم ہوں۔ اِسی عرصہ میں رتن اور وینس کے تعلقات بڑھ گئے۔ مجھے رتن سے نفرت سی ہو گئی۔ اپنی توہین کا شدید احساس ہوا اور میں نے رتن سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔

"رتن! مجھے تم سے ایسی اُمید ہرگز نہ تھی!" آخر میں ایک دن شکایت کر ہی بیٹھا۔

"کیسی اُمید؟" وہ سراپا سوال بن گیا۔

"جان بوجھ کر انجان بنتے ہو؟" میں نے کرخت لہجہ میں کہا۔

"صاف صاف کہو معموں کے اشاروں میں نہ اُلجھاؤ" اُس نے اپنے خمدار بالوں کو سنوارا۔

"پودے ہم نے لگائیں پھول تم سونگھو!" میرے لہجے میں ناکام حسرت کے غنچوں کی مٹتی ہوئی خوشبو تھی۔

"کیسے پودے؟ ___ کیسے پھول؟" اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

"دوست! اتنے بھولے نہ بنو۔ وینس کو پہلے میں نے چاہا تھا۔ اس کے پیار میں فیل میں ہوا ہوں۔ بدنامی میں نے لی ہے۔ ذہنی آسودگی سے محروم میں ہوا ہوں۔ ماضی میں نے ... اور تم ہو کہ مگن لال رستوگی بنے پھرتے ہو!" میری آواز میں احتجاج کی گونج تھی۔

"راشد! یہ تمھاری غلط فہمی ہے!" رتن نے میرے شانوں کو ہلایا۔

"ٹھیک ہے۔ دیکھا جائے گا" میں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا اور آگے بڑھ گیا۔

ٹھنڈی ہواؤں کی نشیلی لہریں میرے بدن کو چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ میں نے انٹرویو ... ماحول کا جائزہ لیا اور سگریٹ سلگا کر مرغولوں میں مستقبل کی پرچھائیاں دیکھنے لگا۔

"کیا آپ انٹرویو دینے آئے ہیں؟" ایک اُمیدوار نے مجھ سے آکر پوچھا۔

"نہیں" میرا جواب مختصر تھا اور لہجہ خشک۔

"آپ کچھ اُداس اُداس سے نظر آتے ہیں" وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"پھر آپ سب سے الگ کیوں بیٹھے ہیں؟" اس کی نگاہیں آفس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

"میرا ارادہ انٹرویو دینے کا نہیں ہے" اسے میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"آخر کیوں؟" اس کے لہجہ میں خلوص تھا۔

"نیاز محمد!" چپراسی نے آواز لگائی۔

اور میرے قریب بیٹھا ہوا نوجوان تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید وہ اپنے نام کی ترتیب کی پروا کئے بغیر میری دلجوئی کے لئے آ گیا تھا۔ میں نے حقارت آمیز نگاہوں سے آفس کی

طرف دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہوئی۔ جو اُمیدوار انٹرویو دے کر باہر آیا تھا۔ دوسرے نوجوان اُس سے کئے گئے سوالات کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔

میں دینس اور رتن کے تعلقات کو برداشت نہ کر سکا۔ میں نے دینس کو گمنام خط لکھے کہ وہ رتن کا ساتھ چھوڑ دے ورنہ پچھتانا پڑے گا! لیکن دینس اُس کے اور قریب ہوتی گئی اور ایک دن میں نے رتن کے نام سے دینس کے ڈیڈی کو خط لکھا کہ وہ اُن کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن خط اُس کے والد کو نہیں ملا۔ ایک بار میں رتن کے پتا جی سے بھی ملا اور اُن سے صاف صاف کہا کہ آپ کا بیٹا روز بروز آوارہ ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اُس پر پابندی عائد نہ کی گئی تو آپ کی عزت کو بٹا لگنے کا ڈر ہے۔ پتا جی نے رتن کو بہت سخت سُست کہا اور اُسے گھر سے نکال دینے کی دھمکی بھی دی۔ میں اپنی اِن کامیابی پر بہت مسرور تھا لیکن رتن میرے اِن تمام حملوں کو برداشت کرتا رہا۔ آخر میں نے رتن اور دینس کے رومان کا خوب خوب پروپیگنڈہ کیا۔ دوسرے احباب سے بھی یہ اعزازی خدمت حاصل کی۔ کالج میں پڑھنے والی ہندوستانی بہنوں کو اس بات کے لئے ہموار کیا کہ وہ دینس کو رتن سے کشیدگی پر آمادہ کریں ورنہ کالج بدنام ہو جائے گا۔ رفتہ رفتہ یہ بات کالج کے گوشے گوشے میں عام ہو گئی۔ لڑکیاں دینس کو لعنت ملامت کرتیں، گرلس یونین کے وقار کا واسطہ دیا جاتا، سیتا و مریم کے کردار پیش کئے جاتے۔ آخر کار کوشش کارگر ہو گئی۔ دوسری طرف کچھ دوستوں کا ایک گروپ اس کام کے لئے مقرر تھا کہ وہ رتن کو کھُلم کھُلا اظہارِ محبت پر اُکسائیں۔ نبت کا کھیل کھیلنے والوں کی فطرت ہے کہ وہ جلد کہا مان جاتے ہیں۔ اس لئے رتن کلاس میں ہو، لائبریری میں، اوپن شیلف میں یا گیلری میں، اُسے اظہارِ محبت سے مطلب ہے! جب دینس سے روبرو ہونے کے مواقع کم ہو گئے تو اُس نے خطوط کا سہارا لیا۔ دینس کے نام رومانی خط لکھے۔ لڑکیوں کے لئے یہ خطوط دستاویز بن گئے اور اُنھوں نے دینس کو اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ وہ پرنسپل کے سامنے رتن کے تمام خطوط رکھ دے اور صاف صاف کہہ دے کہ رتن اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ گواہی کے لئے کئی لڑکیوں نے اپنے نام پیش کر دئے۔ آخر کار معاملہ پرنسپل صاحب کے پاس پہنچ ہی گیا۔ تحقیقات کی گئی اور ایک دن رتن کا ریسٹریکشن کر دیا گیا۔

میں نے ایک سگریٹ اور سُلگایا اور سوچوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ میرے سامنے مستقبل ایک سوالیہ نشان تھا۔ میری ساری اُمیدیں ساری آرزوئیں اِس انٹرویو سے وابستہ تھیں لیکن ماضی کے واقعات نے آرزوؤں کے چراغ بجھا دیئے۔ اُمیدوں کے ستارے ڈوبنے لگے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ میں نے رتن کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا تھا۔ میں اب کس مُنہ سے اُس کے سامنے اُمیدوار بن کر جا سکتا ہوں؟ لیکن پھر میں نے سوچا، اُن واقعات کو بارہ سال سے زیادہ گزرے ہوئے ہو گئے ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ وہ واقعات اُسے یاد ہوں؟ اور اگر یاد بھی ہوں تو بہت ممکن ہے نظر انداز کر دے لیکن دوستوں سے ملے زخم اکثر بھرا نہیں کرتے: "نہیں نہیں میں انٹرویو میں ہرگز نہ جاؤں گا!" میری غیرت اور خودداری کے جذبے جاگ اُٹھے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی بیوی اور بچوں کے چہرے یاد آ گئے۔ برسوں کی ہوئی چھوٹی موٹی ملازمتیں یاد آ گئیں۔ کئی کئی ماہ تنخواہ نہ ملنے کے سبب اذیتوں کا ہجوم یاد آ گیا۔

میرے خدا! کیا کروں۔۔۔؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے ماتھے کو تھام لیا۔

"ناکامی یقینی ہے! اِس لئے انٹرویو میں جانا فضول ہے؟" نہ جانے یہ آواز کہاں سے آ کر میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی۔ میں تیزی کے ساتھ اُٹھا، دامن جھاڑا اور اپنی قیام گاہ کی طرف چلنے لگا۔

"راشد قریشی۔۔۔!" چپراسی نے آواز لگائی۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے دھوپ چھاؤں کی پرچھائیاں ناچ اُٹھیں۔ دوسرے لمحے میرے قدم آفس کے اندر تھے۔

"آپ!!" رتن مجھے دیکھ کر محوِ حیرت ہو گیا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام میری درخواست میں لکھا ہوا ہے۔" میں بے اعتنائی سے بولا۔

"تو آپ نے یہاں تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔۔۔!" اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔

"میں بھیک مانگنے نہیں، ملازمت کرنے آیا ہوں" میں نے صفائی سے کہا۔
"یہاں آپ کلرکی کے لئے آئے ہیں ——— ؟" وہ تیز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔
"ظاہر ہے" میرے لہجے میں متواتر بے پروائی تھی۔ اس لئے کہ میں انجام سے باخبر تھا۔
"اگر آپ فلموں میں ولین کا پارٹ ادا کریں تو ٹھیک رہے گا" اس کے مشورہ میں ماضی سمٹ آیا تھا۔
"میں فلموں کی ملازمت کے لئے نہیں آیا ہوں" میرا لہجہ قدرے تلخ تھا۔
"تو پھر آپ کسی فرم میں پروپیگنڈہ سکریٹری ہو جائیے" رتن بارہ سال پیچھے پہنچ چکا تھا۔
میری آنکھوں کے سامنے رتن کے خلاف کالج میں کیا گیا پروپیگنڈہ گھوم گیا۔
"آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے احساس ہے" شاید میری گردن جھک گئی تھی۔
"جی چاہتا ہے آپ کو انارکلی کی طرح زندہ دیوار میں چنوا دیا جائے!" اس کی بھویں کانپ رہی تھیں۔
"میں انٹرویو کے لئے حاضر ہوا ہوں" اب کی بار میں نے اور بگڑ کر کہا۔
"آپ ہرگز اس پوسٹ کے قابل نہیں۔ تشریف لے جا سکتے ہیں" غالباً رتن غصہ سے کانپ اٹھا تھا۔
میں بے بس تھا، مجبور تھا اور انجام سے باخبر تھا۔ کچھ کہے سنے بغیر گردن جھکائے باہر نکل آیا۔
دوسرے دن مجھے ایک خط ملا ———

ڈیر راشد!

ماضی ایک خواب تھا بھول جاؤ۔ تم میرے اپنے ہو۔
کسی بات کا برا نہ ماننا۔ میں نے تمہارا تقرر بحیثیت اسسٹنٹ منیجر کر دیا ہے۔ جلد آکر جوائن کر لو۔

تمہارا ہی ——— رتن

میں رتن کا خط پڑھ کر بے حد شرمندہ تھا لیکن بے پناہ مسرور بھی!!

غزلیں

——— پروفیسر عبد الرب عرفان ایم۔ اے ———

زندگی کی ہے آبرو غم سے — کوئی جینے کا درس لے ہم سے
ہو سکے گا نہ، چارہ گر! ہرگز — زخمِ دل کا علاج مرہم سے
کر کے برباد زندگی یہ کھلا — عشق میں کچھ نہ ہو سکا ہم سے
آپ کی دوستی تو جرم نہیں — کیوں ہے دنیا کو دشمنی ہم سے
اصل میں زندگی عبارت ہے — دوستو! حادثاتِ پیہم سے
آئی ہے فصلِ گل خزاں بردوش — جشن بھی کم نہیں یہ ماتم سے

جس کو عرفان ہو امیدِ سحر
کیوں ہراساں رہے شبِ غم سے

——— رشتی پٹیالوی ———

نظر بھی کچھ کام کر گئی ہے خموشیوں میں زباں سے پہلے — حقیقتِ حال آئینہ ہے بیانِ رازِ نہاں سے پہلے
چلی تھی جو رسم اتفاقاً اسی پہ چلتا گیا زمانہ — کسے خبر ابتدا ہوئی کب چلی محبت کہاں سے پہلے
چمن کی بیدار بختیوں میں کوئی کلی بھی کھلی نہ ہو گی — کوئی بھی غنچہ ہنسا نہ ہو گا تبسمِ گل رخاں سے پہلے
نہ جانے کب سے رواں دواں ہے مرادِ منزل کی جستجو میں — لٹا لٹا قافلہ ہمارا تباہیٔ کارواں سے پہلے
جو ابتدا ان کی برہمی سے تو انتہا ان کی بے رخی ہے — فسانہ اپنی تباہیوں کا انہیں سنائیں کہاں سے پہلے
جگر سر آنکھوں پہ دیتے آئے ازل سے آتش نواز ہیں ہم — تعارف اپنا تھا بجلیوں سے تعلقِ آشیاں سے پہلے

رشتی قیافہ شناسیوں میں پناہ دیں گے نہ ماہ و انجم
زمیں کی گردش بھی کم نہیں ہے تغیرِ آسماں سے پہلے

افسانہ

تمنّا دبی رہی

رقیہ شبنم منیجری۔ بی، اے (آنرز)

۷/۱۶ بی آئی۔ ٹی بلاکس، ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

۳۰ مارچ ۶۶ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

مدت سے ایک تمنا دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ سوچا، آج کیوں نہ اُسے بہلانے کی کوشش کی جائے۔ ممکن ہے یہ کوشش کامیاب ہو جائے۔ لیجئے ایک افسانہ "تمنا دبی رہی" حاضرِ خدمت ہے۔ اُمید ہے میری یہ تمنا مایوسی اور ناکامی کی چٹان تلے دب کر دم توڑ دینے کی بجائے شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔ افسانے کے متعلق صرف اتنا عرض ہے کہ اِس کا انتساب میں اُن لوگوں کے نام کرنا چاہتی ہوں جن کے خیال میں ؎

محبت کی معراج شاید یہی ہے   عیاں ہو کے دل میں، لبوں تک نہ آئے

مخلص ——— رقیہ شبنم منیجری

کتنی عجیب بات تھی وہ! آج سوچتی ہوں تو ذہن چیخ اُٹھتا ہے۔ ایک ہلکی سی لرزش رگ و پے میں دَوڑ جاتی ہے۔ پلکیں کانپنے لگتی ہیں۔ کچھ ستارے اُن پر سے ٹوٹ کر رخساروں پر آگرتے ہیں اور میں سوچ کی وادیوں میں کھو جاتی ہوں۔ سوچ، اُلجھن، فکر۔ یہ سب کچھ میرے لئے نیا نہیں۔ سوچنے کی عادت تو مجھے بچپن ہی سے ہے۔ نہ جانے کس مفکر کا سایہ میری روح پر پڑ گیا تھا کہ آج تک بے معنی خیالوں سے دامن نہ چھڑا سکی۔ ہر وقت سوچنے کی عادت مجھے کہاں سے کہاں لے آئی۔ ایک ایسی منزل کی جانب جو میری ہوتے ہوئے بھی میری نہیں، جو منزل ہوتے ہوئے بھی منزل نہیں، جو غبارِ رہ کارواں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور میں سوچتی ہوں میں نے سب کچھ گنوا کر کیا پایا۔ صرف چند بے معنی سی یادیں، کچھ تلخ حقیقتوں کا تلخ ترین احساس اور پلکوں پر ٹمٹماتے ہوئے آنسوؤں کے بے شمار چراغ! جو میری تاریک زندگی کو منوّر نہیں کر سکتے۔ ہاں! زندگی کی شاہراہوں پر آگ ضرور لگا سکتے ہیں۔ آگ... آگ ... آگ!! اچانک میرے ذہن میں آگ سی لگ جاتی ہے اور آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔

اُس دن ممّی کے چولہے پر گوشت بھون رہی تھی۔ گھی کا پیالہ جو اُنڈیلا تو وہ کڑھائی کی بجائے جلتی ہوئی لکڑیوں پر جا گرا اور پھر نہ جانے بیک وقت کتنے شعلے بھڑک اُٹھے اور اُن کی لپٹ جب اُنگلیوں تک پہنچی تو میں نے گھبرا کر پیالہ ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔ آگ اور بھڑک اُٹھی۔ دوپٹہ ڈھلک کر شعلوں پر جا گرا اور قریب تھا کہ اُن شعلوں کے درمیان گھر کر میرا چہرہ بُری طرح جُھلس کر ہمیشہ کے لئے کریہہ منظر ہو جاتا، جبھی کسی نے مجھے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ میں خوف اور گھبراہٹ میں اُن مضبوط اور توانا ہاتھوں پر جھول گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے بھئی آپ اِس طرح رو کیوں رہی ہیں۔ آنسو تو اُس وقت روا تھے جب واقعی آپ کی یہ لمبی لمبی پلکیں نذرِ آتش ہو چکی ہوتیں"۔ کتنی پیار بھری آواز تھی۔ خلوص کی مٹھاس سے بھرپور، رحم اور ہمدردی کے جذبات سے معمور! میں نے ہوش سنبھالنے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ لرزتی ہوئی پلکوں کو اوپر اُٹھایا۔ سامنے مردانہ وجاہت کا ایک خوبصورت پیکر تھا! "ہائے اللہ آپ!؟" میں اِس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی اور گھبرا کر وہاں سے چلی آئی۔ رات بھر رشدی کا پُر وقار چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومتا رہا اور میں سوچتی رہی اگر عین وقت پر رشدی نہ آجاتا تو میرا کیا حال ہوتا؟ میرا یہ چہرہ جس کی بدولت مجھے خاندان کی لڑکیوں میں انفرادیت حاصل ہے، نہ جانے کتنا بھیانک ہو جاتا۔

اور یہ چھوٹا سا حادثہ میری زندگی کا ایک عظیم حادثہ بن گیا۔ جیسے سمندر کی کوئی مچلتی ہوئی موج کنارے پر چلی آئے اور اپنے ساتھ کنارے کی ہر چیز کو بہا لے جائے۔

میری زندگی کا سارا سرمایہ اُس ایک حادثے کے ساتھ بہہ گیا اور میں جیسے بھکارن ہو کر رہ گئی۔ ایک ایسی بھکارن جس کے خالی ہاتھوں میں کسی نے بھیک تک دینا پسند نہ کی۔ رشدی نے بھی نہیں! وہ رشدی جو ایک بار خود میرے دامن میں موتی رولنے چلا آیا تھا۔

اِتنے بھرے پُرے گھر میں جہاں روز کتنے ہی ہنگامے ہوتے تھے۔ نت نئی شرارتیں جنم لیتی تھیں، شوخ قہقہے کھنکتے تھے، معصوم مسکراہٹیں رقص کرتی تھیں اور چنچل لوائیں اپنا جادو جگاتی تھیں، میری تنہائی پسند فطرت کبھی سکون نہ پا سکی۔ میں سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہا رہی۔ میں نے اُس انجمن میں بھی خلوت ہی محسوس کی۔ شام سب کے لئے خوشیوں کا تحفہ لے کر آتی تھی۔ بھائی جان، عشرت بھیا، روحی، ناہید، رفعت باجی، سبھی باغ کے عقبی حصہ میں چلے آتے۔ شفق کا نظارہ کیا جاتا۔ آسمان پر منڈلاتے ہوئے پرندوں کی قوتِ پرواز ناپی جاتی۔ کِھلتے ہوئے گلابوں کو توڑا جاتا، آنکھ مچولی کھیلی جاتی، چائے پی جاتی، تاش کھیلے جاتے، بیت بازی ہوتی اور پھر بے شمار قہقہے ایک ساتھ گونج اُٹھتے لیکن میں پھر بھی اکیلی اکیلی رہتی۔ تنہا اور اُداس، غمگین اور مایوس! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ اُداسی، یہ مایوسی میری زندگی کا جزو بن چکی ہے۔ عشرت بھیا اکثر چھیڑتے "شوبی! یہ تم ہمیشہ کیسی رونی صورت لئے پھرتی ہو۔ آخر کبھی تو ہنسو، کبھی تو مسکراؤ۔ یہ ہر وقت کا رونا کیسا ہے؟" اور ان کی اِس چھیڑ میں بھائی جان ایک اور رنگ بھر دیتے۔ پھر تو ایسی لے دے مچتی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ رفعت باجی الگ مذاق اُڑاتیں۔ ناہید الگ آوازے کستی اور رعنا اور روحی عجب انداز میں نقل اُتارتیں۔ یہاں تک کہ پپّو اور گڈو بھی میرے آس پاس منڈلاتے ہوئے تالیاں بجانے لگتے: "اللہ آنٹی! آپ ہنسئے نا۔ دیکھئے ہم چارلی چپلن کی نقل کر رہے ہیں اور میں ایک ہلکی سی اُداس مسکراہٹ کے ساتھ وہاں سے لوٹ آتی اور اپنے تاریک اور سنسان کمرے میں لیٹے لیٹے مجاز کی غزلیں یا واجدہ تبسّم کے افسانے پڑھا کرتی۔ نہ جانے کیوں، اُس مطالعے سے میری روح کو کچھ سکون مِل جاتا۔ میری بھاری بھاری پلکیں آپ ہی آپ بند ہونے لگتیں اور پھر جانے کب مجھے نیند آجاتی۔

ایسی ہی ایک اُداس شام کو میں اپنے کمرے میں محوِ خواب تھی میرے سینے پر مجاز کا "آہنگ" کھلا پڑا تھا۔ اور... اور ـــــ پتہ نہیں کب، کیسے اور کس طرح میری نیند اُچٹ گئی۔ بند اور بوجھل پلکوں کو موندے موندے میں کچھ سوچ رہی تھی کہ اچانک کمرے میں ایک ہلکی سی چاپ گونجی اور پھر ایک قہقہہ سنائی دیا: "اچھا تو یہاں ہے ہماری شہزادی سنڈریلا!" میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو حیران رہ گئی۔ رشدی مسکراتا ہوا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں جھٹ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے میری کلائی اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے لی اور پھر ایک تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح نبض دیکھتے ہوئے اُس نے خالص کاروباری انداز میں بھائی جان سے کہا ـــــ "مسٹر یامین! آپ کی خواہرِ عزیز کو Over Sleeping کی شکایت ہے اور یہ مرض بہت خطرناک ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو ان کے ذہن اور دماغ کا ایکس۔ رے کروانا ہوگا۔" میں کچھ نہ بول سکی لیکن اُس کی اِس سنجیدگی کو دیکھ کر بھائی جان بے ساختہ ہنس دیے اور پھر وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گئے۔ دیر تک اُن کے قہقہوں کی آواز میرے کانوں میں آتی رہی۔ جیسے کنکر پھینک دینے سے پانی میں کئی دائرے بنتے اور بگڑتے ہیں اور پھر میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔

رشدی کی اچانک آمد نے میری زندگی میں ہلچل مچادی تھی۔ میری زندگی کی اُداس راہوں پر ایک "شناسا اجنبی" کے قدموں کی آہٹ گونج رہی تھی اور میرے مضطرب دل کی بے ہنگم دھڑکنیں ایک نیا راگ الاپ رہی تھیں۔ یہ کیسے نغمے تھے، یہ کیسے گیت تھے؟ اِس کے معنی تو میں خود بھی سمجھ نہ پا رہی تھی لیکن ایک عجیب سی موسیقی میری روح کی گہرائیوں میں اُتر رہی تھی۔ جیسے دُور دیس کا کوئی شہزادہ اپنی بانسری بجا کر مجھے اپنے پاس بُلا رہا ہو۔ جیسے میں یونان کی حسین شہزادی ہوں، میرے آگے ہزاروں دیوتاؤں نے اپنے سر جھکا دیے ہیں اور میرے سر پہ ایک سنہرا تاج ہے ـــــ میں اُن دنوں عجیب عجیب خواب دیکھنے لگی تھی۔

اُس دن مجاز کے ایک شعر پر ہنگامہ ہو گیا۔ بھائی جان اُس شعر کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور رشدی اُسے انتہائی بوگس اور لغو کہہ رہا تھا۔ نہ جانے یہ بحث کب تک چلتی رہتی۔ آخر رشدی خود ہی میرے پاس چلا آیا "کیوں شوبی! کیا واقعی مجاز نے اِس شعر میں کوئی بہت بڑی بات کہہ دی ہے یا صرف لفاظی ہے؟" مجاز کا شعر اور پھر میری رائے! کیا میں مجاز کی شعری لطافت سے انکار کر سکتی تھی؟ بجلے میں کیا کچھ کہہ گئی تھی۔ مجھے تو صرف اِتنا یاد ہے کہ جب میں خاموش ہوئی تو رشدی نے اپنے بالوں کو مخصوص انداز سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اِس وقت میں کچھ اور سوچ رہا ہوں شوبی! تم نے مجاز کی زندگی اور شاعری پر اِتنا کچھ کہہ دیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کاش... کاش..." اور اِس سے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ صرف ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "نہ جانے کبھی کبھی انسان اپنی حیثیت سے زیادہ کیوں سوچنے لگتا ہے شوبی!" اور پھر کمرے سے نکل گیا۔ اُسی مخصوص انداز میں قہقہے لگاتا ہوا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے رشدی کا یہ قہقہہ کھوکھلا ہو، سراسر کھوکھلا! مسرت کی اصلی لطافت سے عاری، صرف لبوں کے گوشوں سے نکلا ہوا اور میں سوچتی ہی رہ گئی کہ رشدی نے اپنی حیثیت سے زیادہ کیا بات سوچی ہوگی؟

لیکن وہ بات آج بھی معمہ ہی بنی رہی۔ وہ اُس دن بھی جب میں باغ میں گل مہر کے پیڑ کے پاس کھڑی آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں چکور کی تلاش کر رہی تھی اور وہاں بادلوں کے دبیز ٹکڑوں میں سے جھانکتے ہوئے چاند کے سوا مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک میرے قریب ایک جانا پہچانا قہقہہ گونج اُٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رشدی گڈو سے کہہ رہا تھا۔

"منے! یہ آج کل کے لوگ بھی عجیب ہیں۔ یہ جو تمہارے چچا گگارن ہیں نا؟ پرلے درجے کے بے وقوف ہیں!" — "وہ کیسے انکل؟" گڈو نے معصومیت سے اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے سوال کیا تھا۔ "ارے گڈو! تم نہیں سمجھو گے۔ دیکھو بات یہ ہے، گگارن نے خلاء کے چکر اِس لئے کاٹے کہ آسمان کے چاند تک پہنچ سکے لیکن میں کہتا ہوں وہ لوگ پگلے ہیں، جو چاند تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ سراسر پگلے! بھلا اتنی بلندیوں تک وہ پہنچ سکیں گے؟" گڈو نے کچھ اِس انداز میں سر ہلایا جیسے بات بالکل سمجھ میں آ گئی ہو۔ "گڈو یہ دُنیا تو ایسی جگہ ہے جہاں دھرتی پر رہنے والے چاند کو بھی نہیں پایا جا سکتا۔ پھر اُن بلندیوں تک لوگ کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ ہمارے جذبے پاگل ہیں، ہماری آرزوئیں نادان ہیں، ہم خود پاگل ہیں گڈو! ہم، تم، گگارن اور وہ ننھا سا پرندہ چکور" اور پھر رشدی ہنستا ہوا گڈو کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ جیسے واقعی دُنیا کی بے وقوفی پر ایک قہقہہ لگا رہا ہو لیکن اُس کے یہ قہقہے میرے سینے میں تیر کی طرح چبھ گئے۔ کاش! اس چاندنی رات میں رشدی محبت کا کوئی مدھر راگ ہی چھیڑ دیتا۔ اپنی بانسری کی مدھر تانوں سے میرے دل کو مسحور کر دیتا لیکن اُس نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میری طرف دیکھا تک نہیں۔ صرف چاند کو تکتا رہا یا گڈو کے چہرے کو یا پھر ڈالیوں پر جھولتے ہوئے گلاب کو۔ عجیب ہے یہ رشدی بھی! میں جھنجھلا کر رہ گئی۔

رشدی کو یہاں آتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تھا لیکن اب تک اُس کا مقصد حل نہ ہوا تھا۔ وہ ملازمت کے سلسلہ میں یہاں آیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم، معاشیات میں ایم۔ اے لیکن ابھی تک ملازمت کے لئے بھٹک رہا تھا۔ شاید اِس لئے کہ خالو جان ایک بارسوخ آدمی نہ تھے۔ معمولی سے بزاز تھے۔ شاید اِس لئے کہ اُس کے پاس کوئی بڑی سفارش نہ تھی۔ شاید اِس لئے کہ اُس کے پاس کوئی حسین سہارا نہ تھا اور شاید اِس لئے کہ اب تک ابّو جان نے اُس کے لئے کوشش نہ کی تھی۔ ورنہ شہر میں ایسا کون سا ادارہ تھا جو ابّو جان کی بات ٹال سکتا۔ ہر محکمہ میں ابّو جان کو کافی عزت اور اہمیت حاصل تھی۔ ایم۔ ایل۔ اے جو ٹھہرے اور رشدی بھی اِسی اُمید پر آیا تھا کہ ممکن ہے اُن کا اثر کچھ کام کر جائے لیکن اب تک ابّو جان خاموش تھے۔ اپنے رشتہ داروں کی سفارش کے معاملے میں وہ کافی اسٹرکٹ تھے اور اپنے وقار کو کھونا پسند نہ کرتے تھے اور نہ رشدی ہی نے اب تک اُن کے وقار کو ٹھیس پہنچانے کا خیال کیا تھا۔ وہ تو اِس کی ہمت ہی نہ کر پاتا تھا۔ کیونکہ ابّو جان بہت بڑے تھے اور وہ بہت چھوٹا! جیسے ایک کوہِ گراں کے آگے حقیر ذرّہ! جیسے وسیع سمندر کے آگے بے مایہ سا شبنم کا قطرہ! جیسے ایک درخشاں ستارے کے آگے مدّھم سا جھوٹا موتی! شاید اِسی لئے وہ ہر بات پر قہقہے لگا کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیتا تھا اور سب کی شامیں رنگین ہو جاتی تھیں۔ بھائی جان اُسے جُدا ہونے ہی نہ دیتے تھے۔ عشرت بھیا بھی سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگے رہتے اور رفعت باجی، ناہید اور روحی بھی اُسے گھیرے رہتیں۔

اُس دن بھی شام کو وہ ناہید اور روحی کو کوئی مزے دار بات سُنا رہا تھا۔ میں اچانک وہاں پہنچ گئی۔ نہ جانے کون سی تمنّا مجھے وہاں لے گئی۔ جب سے رشدی آیا تھا میں خود ہی یہ خواہش کرنے لگی تھی کہ سب کی محفل میں شرکت کروں۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ناہید اور روحی اصرار کرتی رہیں لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا اور بہانہ بنا کر وہاں سے چلا آیا۔ مجھے بہت ناگوار ہوا۔ میں بہت اُداس اُداس اپنے کمرے میں چلی آئی۔ دیکھا تو وہ میرؔ کی غزلوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر نظریں اُٹھائیں۔ کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔ میں نے سوچا کاش اِس لمحہ کو وہ خوشگوار بنا دے۔ میری روح کی اُداسیاں ختم ہو جائیں۔ لیکن اُس نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ صرف مجھے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور دیکھتا رہا!

رشدی کی نگاہوں سے میں گھبرا گئی تھی۔ رفعت باجی کی شادی کے ہنگامے، چہل پہل اور مہمانوں کی بھیڑ، مجھے قدرے وحشت ہو رہی تھی۔ ہنگاموں سے میں ہمیشہ گھبراتی تھی اور خصوصاً شادی کے ہنگامے! ڈھول کی تھاپ پر مچلتے ہوئے میراثنوں کے گیت اور شوخ کھنکتی ہوئی جھانجنیں۔ اُس وقت شہر کی کوئی مشہور میراثن یہ گیت گا رہی تھی ؎

"بنا میرا عید کا چاند ہے

ناچو چاندنی رات ہے!"

اور میں اِس وحشت سے گھبرا کر باغ میں نکل آئی تھی۔ اچانک میرے قدم رُک گئے۔ سامنے ہی رشدی کھڑا تھا۔ گلاب کی کیاریوں کے قریب۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور اُس کی نگاہیں میرے گلابی جوڑے پر جم کر رہ گئیں۔ "شوبی! یہ گیت سُن رہی ہو؟" اُس نے جیسے بہت دُور سے آواز دی۔ "ہُوں!" میں نہ جانے کون سے لمحے میں ڈوب گئی۔ اچانک وہ بچوں کی طرح ہنستے ہوئے بولا۔ "سوچتا ہوں۔ . . سوچتا ہوں تمھاری شادی میں بھی یہی گیت گونجے گا۔" اور کچھ دیر کے لئے میرا رنگ زرد پڑ گیا۔ کاش! رشدی "تمھاری شادی" کی بجائے "تم ہماری شادی" کہتے! لیکن رشدی کے چہرے پر تو کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شوبی! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں" — "کہیے" میرا دل

دھڑک اُٹھا۔ وہ لمحہ قریب تھا جس کا مجھے صدیوں سے انتظار تھا۔ صدیاں صرف ایک لمحہ میں سمٹ آئی تھیں۔ میری پلکیں شرم کے بوجھ سے لرز رہی تھیں، میری سانسیں تیز تیز تھیں اور میرے کان شہزادے کے مدھر نغمے کے منتظر تھے لیکن کوئی نغمہ پیدا نہ ہوا۔ کوئی گیت نہ چھڑا۔ میری نظروں کے سامنے تو صرف پتھر کا ایک بُت تھا۔ ایک بے جان، بے حس مجسمہ! رشدی نے کچھ بھی نہ کہا۔ صرف ایک قہقہہ لگایا۔ وہی کھوکھلا سا قہقہہ اور مجھے پریشان کر کے شادی کے ہنگاموں میں کھو گیا اور میں تڑپ کر رہ گئی۔

ساری رات مجھے نیند نہ آئی۔ کتنے ہی ستارے میرے رخساروں پر جگمگا اُٹھے۔ میرا تکیہ بھیگ گیا تھا۔ میری پلکیں بھیگ گئی تھیں لیکن ہونٹ خشک تھے۔ صبح کی پہلی کرن مجھے اور اُداس کر گئی۔ دن نکلا تو وہ بھی روشن اور منوّر نہ تھا۔ دوپہر کو ناہید اور روحی چلی آئیں۔ مجھے دیکھ کر دیر تک قہقہے لگاتی رہیں۔ میری بانہوں میں جھولتی رہیں۔ مجھے اپنی بانہوں میں گھسیٹ کر گنگناتی رہیں۔

"ہائے اللہ! اب تو ہمارے گھر کا یہ گلاب بھی چلا جائے گا!" ناہید میرے چہرے کو اوپر اُٹھاتے ہوئے بولی۔

"کیا بکواس ہے!" میں نے چڑ کر کہا تو روحی نے اپنی بڑی بڑی کالی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

"بکواس نہ کہو میری بنو! اب سونے کی چڑیا زیادہ دنوں تک کنواری نہیں رہ سکتی۔ ایک خوبصورت سا شکاری آ پہنچا ہے۔"

"کون؟" بے اختیار میرے ہونٹوں پر آ گیا۔ دل دھڑک اُٹھا۔

"ارے وہی امجد، جن کی والدہ پرسوں رفعت باجی کے نکاح میں آئی تھیں۔"

امجد... امجد... امجد... جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اُنڈیل دیا۔ پھر کچھ بھی تو یاد نہ رہا۔ ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا اور ناہید اور روحی ہنستے ہوئے چلی دیں۔ اچانک پھر وہی مخصوص چاپ میرے کمرے میں گونج اُٹھی۔ میں نے گھبرا کر پلکیں صاف کیں تو رشدی کو ہنستے ہوئے پایا۔

"پگلی! پھر رو رہی ہو۔ اب کہاں آگ لگی ہے؟ اب کیا جل گیا؟"

جی چاہا کہہ دوں: "وہ آگ تو معمولی سی تھی رشدی! اب تو میرے دل میں آگ لگی ہے۔ اب تو میرا دل جل گیا ہے۔ رشدی! اب اگر مجھے بچا سکتے ہو تو بچاؤ، خدا کے لئے بچاؤ رشدی! یہ شعلے میرے وجود کو جلا کر خاک کر دیں گے!" لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکی، صرف مسکرا دی اور وہ بھی مسکرا دیا: "ہنسو میری شہزادی سنڈریلا! ہنسو، خوب ہنسو، مسکراؤ۔ آج تو ہنسنے کا دن ہے۔" اور وہ قہقہہ لگانے لگا۔ خوب ہنستا رہا۔ کتنا خوش تھا رشدی اُس دن۔ بے حس، بے جان!! مجھے غصہ آ گیا اُس پر لیکن وہ ہنستا رہا۔ پھر اچانک خاموش ہو گیا۔ جیسے کسی نے

اُس کے قہقہوں کا گلا دبا دیا ہو "سنو شوبی! ایک بات کہوں تم سے ؟"۔۔۔ "کیا ؟" میں مُردہ آواز میں بولی لیکن ۔۔۔ لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ کتاب اُٹھا کر ورق اُلٹ پلٹ کرنے لگا قلم سے آڑی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔ اُوٹ پٹانگ سے جملے لکھتا رہا اور پھر ہنستا ہوا اُٹھ کر چلا گیا۔ میں نڈھال ہو کر مسہری پر گر گئی اور کتاب میں مُنہ چھپا کر رونے لگی۔ رشدی کے کھینچے ہوئے آڑے ترچھے خطوط پھیل گئے۔ اُوٹ پٹانگ سے جملے مٹ گئے لیکن وہ شعر ۔۔۔ وہ شعر یوں ہی میری نظروں کے سامنے رہا۔ وہی ایک شعر جو رشدی انجانے میں لکھ گیا تھا۔ صرف ایک شعر ؎

میں آج بھی نہ اُن سے کوئی بات کہہ سکا

لفظوں کے پتھروں میں تمنا دبی رہی

اور لفظوں کے پتھروں میں تمنا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دب کر رہ گئی۔ ایسی دبی کہ اُس کی واُس بھی نہ نکل سکی۔ سب کچھ خاک ہو گیا۔ سب کچھ! لیکن سارا گھر بے خبر رہا شادیانے گونج اُٹھے۔ ڈھولک پر تھاپیں پڑیں اور پھر وہی جانا پہچانا گیت گونج اُٹھا "بنا میرا عید کا چاند ہے، ابو چاندنی رات ہے" اور اچانک گیت خاموش ہو گئے۔ قہقہے رُک گئے پلکیں بھیگ بھیگ گئیں۔ چاند جیسا رشدی زندگی کی آخری سانسیں ختم کر چکا تھا۔ دلہن کا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ لیکن پھر بھی مانگ میں افشاں جگمگا رہی تھی۔ اور ڈرائنگ روم میں پریشان پریشان سے ٹہلتے ہوئے ابو جان بھائی جان سے کہہ رہے تھے "غضب ہے۔ اگر واقعی رشدی کا منشا یہ تھا تو اُس نے ہم پر ظاہر کیوں نہ کر دیا۔ ہم اتنے سنگدل تو نہ تھے کہ انسانیت کو نہ پہچانتے اور صرف دولت پر مر مٹتے ۔۔۔" اور پھر ۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سونے والے رشدی کے سینے سے جب مجاز کا "آہنگ" ہٹایا گیا تو پتہ چلا مجاز کا یہ قطعہ اُس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے

سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے

اور بہت دُور آسمانوں سے

موت آواز دے رہی ہے مجھے !!

آج وہی قطعہ میرے سینے سے چمٹا ہوا ہے ۔۔۔ میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے دُور، بہت دُور آسمانوں سے موت اور رشدی مجھے آواز دے رہا ہے !!

اِسی وقت پڑوس کے مکان میں میراثنیں گانے لگی ہیں ۔۔۔

"بنا میرا عید کا چاند ہے، ناچو چاندنی رات ہے"

ایک سرد آہ کے ساتھ میرے ہونٹ بھی ہلنے لگے ہیں ۔۔۔

"بنا میرا عید کا چاند ہے، ناچو چاندنی رات ہے"

غزلیں

پنڈت بالمکند عرش ملسیانی۔ بی۔ اے

میں چُپ رہوں تو عشق پہ تہمت ہے کیا کروں
فریاد بھی خلافِ محبت ہے کیا کروں

میری خوشی تھی، باز نہ آئے وہ ظلم سے
جور و ستم سے اُس کو ندامت ہے کیا کروں

مُنھ دیکھنے کو بھی تو کوئی آئینہ نہیں
ہر ایک دل میں گردِ کدورت ہے کیا کروں

اب مجھ کو اُن سے کوئی شکایت نہیں رہی
اِس کی بھی اُن کو مجھ سے شکایت ہے کیا کروں

اب اُن کی برہمی کے مزے بھی نہیں نصیب
فریاد سے بھی اب اُنھیں راحت ہے کیا کروں

ہے آرزو کہ حکمِ خدائی پہ ہو مرا
یہ آرزو خدا سے بغاوت ہے کیا کروں

جی چاہتا ہے، لاکھ سیاست سے ہو گُریز
حُسن اور عشق میں بھی سیاست ہے کیا کروں

آئے گی ایک روز قیامت سُنا ہے یہ
ہر روز زندگی میں قیامت ہے کیا کروں

جی چاہتا ہے عرش کروں ترک شاعری
لیکن یہی ذریعۂ عزت ہے کیا کروں

ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے

یہ اہلِ تقویٰ اگر میکشی کا دم بھرتے
تو بھول کر بھی نہ پھر شیخ جی کا دم بھرتے

جیو کہ موت کو آنا ہے آ ہی جائے گی
امر ہوئے جو مرے زندگی کا دم بھرتے

اُٹھو کہ دامنِ شب تار تار کرنا ہے
ملے گا نُور کہاں تیرگی کا دم بھرتے

تری نگاہِ محبت ہے شاملِ تخلیق
فرشتے کیوں نہ پھر آدمی کا دم بھرتے

ہمارے عشق کی مستی کہاں اماں پاتی
جو اہلِ حُسن فقط ہوش ہی کا دم بھرتے

امانت اُس کی ہے انمول دولتِ احساس
کہ جس کی عمر کٹی بے کسی کا دم بھرتے

مہ و نجوم بہت پیچھے رہ گئے ہیں، ضیا
ہم آ گئے ہیں کہاں روشنی کا دم بھرتے

افسانہ

نیلی کوٹھی

رفعت سروش

آل انڈیا ریڈیو۔ اُردو مجلس۔ نئی دہلی

۱۱ اپریل ۶۶ء　　　　محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

کیسے کہوں کہ آپ سے ملاقات نہیں ہوتی۔ کیونکہ "بیسویں صدی" کے ذریعہ آپ کی طبعِ رسا کی جولانیاں ہر ماہ تسکینِ دل ونظر کا باعث بنتی ہیں۔ رسالہ میں تنوع قائم رکھنا آپ کا حصہ ہے!۔۔۔۔ ایک عرصہ ہوگیا "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک نہ ہو سکا۔ آج ایک نفسیاتی افسانہ "نیلی کوٹھی" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ پسند فرمائیں گے اور "بیسویں صدی" کی زینت بنائیں گے . . .

نیاز کیش۔۔۔۔ رفعت سروش

فتح نگر پہاڑیوں سے گِھرا ہوا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ بہت گنجان آباد! آس پاس کے پہاڑی علاقوں کے لوگ یہیں آکر کاروبار کرتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن ہونے سے جنگلات کی لکڑی اور دوسری چیزیں یہیں سے باہر جاتی تھیں۔ آبادی کے باہر ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔ جس کے کنارے شہر کے رئیسوں کی کوٹھیاں تھیں۔ شام کے وقت یہاں بہت چہل پہل رہا کرتی تھی۔ خوبصورت مرد، عورتیں، لڑکے، لڑکیاں اور پیارے پیارے بچے جھیل کے چاروں طرف پھولوں کی طرح بکھرے ہوئے نظر آتے لیکن رات ہوتے ہی اُس علاقہ میں سناٹا چھا جاتا۔ بجلی کے قمقمے جگمگاتے رہتے۔ تب کبھی کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز زندگی کا اعلان کر دیتی۔

رات ہو گئی تھی اور روز کی طرح آج بھی اُس علاقے میں سناٹا تھا۔ اُس سناٹے میں کسی کے قدموں کی آواز گونجی۔ جب وہ آواز ایک درخت کے سائے سے آگے بڑھی تو بجلی کی روشنی نے بتایا کہ ایک خوش پوش نوجوان اٹیچی کیس ہاتھ میں لئے چلا جا رہا ہے۔ وہ ایک نیلی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ پھر کوٹھی کا نمبر اور نیم پلیٹ دیکھی اور اطمینان سے احاطہ میں داخل ہو گیا۔ دو چار قدم چل کر اُسے پھر رُکنا پڑا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کدھر جائے۔ کوٹھی بہت بڑی تھی لیکن خاموش بس صرف ملازموں کے کمروں کی طرف کچھ زندگی کے آثار تھے۔ اُس نے راحت کی سانس لی اور سرونٹس کوارٹرز کی طرف بڑھ کر ایک کوارٹر کے دروازہ پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"ذرا باہر آیئے!" التجا بھری آواز میں اُس نے کہا۔

"کہئے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟" نوکر نے باہر آکر اخلاقاً دریافت کیا۔

"بابو چندر پرکاش سے" اُس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ "یہ انھیں کی کوٹھی ہے نا؟"

"ہاں کوٹھی تو اُنھیں کی ہے لیکن وہ باہر گئے ہوئے ہیں" اُس نے جواب میں کہا۔

"باہر گئے ہیں! یعنی شہر سے باہر؟" لہجہ سے حیرت اور پریشانی مترشح تھی۔

"جی ہاں!" نوکر نے مختصر سا جواب دیا۔

"کوئی اور بھی نہیں ہے؟" اُس نے مزید معلومات کے لئے پوچھا۔

"چھوٹے بابو بمبئی ہیں۔ بس بٹیا ہیں اور ماتا جی لیکن آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟" نوکر نے سوالات کی بوچھار کرتے ہوئے کہا۔

"میں دہلی سے آرہا ہوں"

"دہلی والی گاڑی تو چھ بجے آجاتی ہے" نوکر نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج دو گھنٹے لیٹ تھی"

"اچھا میں بٹیا کو خبر کرتا ہوں لیکن کیا کہوں آپ کون ہیں؟"

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں کیونکہ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ بابو چندر پرکاش ہوتے تو اور بات تھی۔" اُس نے مایوسی سے کہا۔

"لیکن اِس وقت آپ جائیں گے بھی کہاں؟"

"کیوں یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے؟"

"ہوٹل تو ہیں لیکن بٹیا کا حکم ہے کہ بابو جی سے جو بھی ملنے آئے اُس کی خبر کی جائے۔"

"اچھا تو یہ کارڈ دے دینا۔ اس پر میرا نام اور پتہ لکھا ہے۔"

"لائیے۔" نوکر کارڈ لے کر چلا گیا اور سریش ایک نئی اُلجھن میں پڑ گیا۔

"عجیب مصیبت ہے۔ پہلے تو یہاں تک پہنچنے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اب

- اگر دشمن کے مقابلے میں تمہاری قوت و طاقت زیادہ ہو، پھر بھی صلح ہی میں بہتری ہے۔ (جالینوس)
- دو بھائیوں میں عداوت پیدا نہ کرو۔ وہ تو پھر صلح کر لیں گے مگر تم ہمیشہ کے لئے لائقِ مذمت رہو گے۔ (اقلیدس)
- جس احمق کی نظر اپنے عیوب پر نہیں پڑتی وہ کبھی دوسرے کی نصیحت نہیں سنتا۔ (بقراط)
- جسم کے لئے صحت سے بہتر کوئی چیز نہیں اور نہ استغناء سے بہتر کوئی نعمت ہے۔ (لقمان)
- دُنیا کو چوروں کی کمین گاہ سمجھو اور چوکنے رہ کر زندگی بسر کرو۔ (افلاطون)

یہاں پہنچا تو بابو جی نہیں ہیں!" اُس نے اپنے آپ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "گھر پر کوئی مرد معلوم نہیں ہوتا۔ شاید اسی وقت لوٹنا پڑے۔ دہلی جانے والی گاڑی کا وقت بھی نہیں معلوم۔۔۔"

"چلئے بابو جی!" نوکر نے آکر اُس کے خیالوں کا تانا بانا توڑ دیا۔ "آئیے، میرے ساتھ آئیے۔"

نوکر اُسے اُس کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ نئے طرز کا ڈرائنگ روم ہر طرح کے ساز و سامان سے آراستہ! وہ ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک حسین لڑکی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور بے تکلفی سے نپے تُلے انداز میں پوچھنے لگی: "آپ ہی کا نام سریش چاولہ ہے؟"

"جی!"

"بابو جی سے کیا کام ہے آپ کو؟"

"میں دہلی سے آیا ہوں۔" اُس نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہو چکا ہے۔" لڑکی نے طنز آ کہا۔

"مجھے لالہ رُوپ نرائن نے بھیجا ہے اور بابو جی کے نام یہ خط دیا ہے۔"

"لائیے۔" لڑکی نے خط پڑھا اور پھر قدرے تحکمانہ انداز میں بولی: "آپ نے اِس سے پہلے بھی کسی کو گانا سکھایا ہے؟"

"جی ہیں ایک سنگیت ودیالیہ میں پروفیسر تھا لیکن پرائیویٹ ٹیوشن کوئی نہیں کیا۔"

"کیوں؟"

"بس یونہی۔"

"خیر۔ آپ کوئی گانا سُنائیے۔"

"جی!" وہ سٹپٹا گیا۔

"آپ نوکری ہی کی تلاش میں تو آئے ہیں۔" لڑکی کا لہجہ نہایت کاروباری تھا۔

"جی ہاں۔"

"میں آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ اگر ضرورت ہوگی تو میں آپ کو ابھی بتا دوں گی۔"

"بہت اچھا!"

مجبور ہو کر سریش کو گانا سُنانا پڑا۔ لڑکی بہت بے بس گانا سُنتی رہی۔ اُس کا چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ گانا سُن کر جیسے ممتحن نے نتیجہ سُنا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب آپ آرام کیجئے۔ صبح ملنے گا۔" اُس نے رُوکھے لہجے میں کہا۔ "اور ہاں رامو! مہمان خانے میں اِن کا بستر لگا دو۔ خیال رکھنا اِنہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔" وہ رامو کو حکم دیتی ہوئی اُٹھ کر چلی گئی۔

صبح سریش چاولہ کو بتا دیا گیا کہ اُسے دو سو روپے ماہوار پر رکھ لیا گیا ہے اور رہنے اور کھانے کا بندوبست بھی کوٹھی ہی میں کر دیا گیا ہے۔ اُسے ملازمت ملنے کی خوشی ہوئی —— دو سو روپے اور ہر طرح کا آرام! دہلی میں تو وہ ایسی شاندار کوٹھی میں رہنے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ سنگیت ودیالیہ والے اُسے نوّے روپے دیتے تھے اور پھر دہلی کا خرچ! بھلا ہو لالہ رُوپ نرائن کا جن کی سفارش پر اُسے اِتنی اچھی نوکری مل گئی!

دو ایک دن بعد بابو چندر پرکاش بھی آ گئے۔ لیکن اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ نیلی کوٹھی کے سیاہ و سفید کی کامنی ہی مالک تھی۔ کامنی تھا اُس لڑکی کا

تاہم! وہ کاروبار میں کبھی بابوجی کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ گھر کا سارا انتظام ہی اُس کے ہاتھ میں تھا۔ بابو چندر پرکاش کسی کام میں دخل نہ دیتے تھے۔ ناناجی کامنی کی دادی تھیں۔ اُنھیں تو پوجا پاٹ ہی سے فرصت نہ ملتی تھی۔

سریش کا کام صرف یہ تھا کہ صبح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کامنی کو گانا سکھائے۔ اُس کے بعد اُسے فرصت ہی فرصت تھی۔ وہ سارا دن اپنے کمرہ میں پڑھتا رہتا یا نئی نئی دُھنیں بناتا رہتا۔ فرخ نگر کی آب و ہوا نے اُس کی صحت اور طبیعت پر اچھا اثر ڈالا تھا اور اُس کے فن میں نکھار آگیا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ وہ کامنی کو گانا سکھاتا رہا۔ وہ اُس سے نپے تُلے انداز میں ملتی تھی۔ اُس کے لہجہ میں تکلف ہوتا تھا نہ بے تکلفی۔ اُس کی باتوں میں اپنا پن تھا نہ بے تعلقی۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ صرف ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے اُس کے سامنے آتی اور وہ بھی گانا سیکھنے۔ پہلے تو سریش کو محسوس نہ ہوا لیکن جب یہ ایک دستور بن گیا تو اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کلاکار سے ایک مشین بنتا جا رہا ہے۔ مشین، گانا سکھانے کی مشین! جس میں دو سو روپے کا لالچ روز چابی بھر دیتا ہے۔ اِس احساس نے اُس کی طبیعت کو سرد کر دیا اور اب جو اُس نے ماحول کا جائزہ لیا تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ ایک آباد ویرانے میں رہتا ہے۔ جہاں اُس کا کوئی دوست نہیں، جو اُس سے ہنس بول سکے، اُس کے فن کو سراہ سکے۔ اُس کا کوئی دشمن نہیں جو اُس کی ذہانت اور فن کی ترقی دیکھ کر جلے۔ زندگی میں دوست اور دشمن کتنے ضروری ہیں، یہ اُسے یہیں آکر معلوم ہوا۔

ایک دن جب وہ گانا سکھانے کے بعد جانے لگا تو کامنی نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سریش صاحب! ذرا یہ گیت دیکھئے۔" وہی سپاٹ لہجہ تھا۔

کلی کلی چٹک گئی، چمن چمن مہک اُٹھا

لبوں پہ مُسکراہٹیں لئے یہ کون آگیا!"

"بہت اچھے بول ہیں۔" سریش نے خوش ذوقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کس نے لکھا ہے یہ؟"

"میں نے۔"

"آپ نے!؟ یعنی —— آپ گیت بھی لکھ لیتی ہیں؟" آواز سے حیرت اور خوشی ٹپکی پڑ رہی تھی۔

"جی ہاں! طرز بنانے کے لئے دے رہی ہوں۔ پرسوں میری سالگرہ ہے۔ پارٹی میں آپ بھی آیئے گا۔ وہاں میری ایک سہیلی تارا کے ساتھ آپ کو یہ گیت گانا پڑے گا۔ آج آپ طرز بنا لیجئے۔ کل تارا آئے گی، تب اُسے طرز سکھا دیجئے گا۔"

کامنی یہ حکم سُنا کر چلی گئی لیکن سریش وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہ کامنی کے بارے میں سوچنے لگا —— وہ خوبصورت ہے، پڑھی لکھی ہے، پینٹنگ جانتی ہے، گیت لکھ لیتی ہے، گانا اُسے آتا ہے۔ ڈانس بھی ضرور جانتی ہوگی لیکن اُس کے لہجہ میں وہ لوچ اور نرمی کیوں نہیں جو ایک آرٹسٹ لڑکی میں ہونی چاہئے۔ اُس نے آج تک کامنی کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا تھا اور نہ کامنی نے کبھی اُس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ پُوچھا تھا۔ وہ جتنا سوچتا گیا، اُتنا ہی اُلجھتا گیا۔ آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر نفسیات کی کتاب پڑھنے لگا۔

اگلے دن سریش نے کامنی کی موجودگی میں تارا کو گانے کی طرز سکھائی۔ اور پھر سالگرہ پارٹی میں اُس کے ساتھ وہ گیت گایا۔

- یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے زیادہ تر رنج و الم ہمارے عدم ضبطِ نفس کا نتیجہ ہیں۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- اپنے دشمن کے لئے انگیٹھی اِتنی گرم نہ کرو، ایسا نہ ہو یہ تمھیں ہی جلا ڈالے۔ (شیکسپیئر)
- افسردگی ایک متعدی مرض ہے۔ اِسی طرح خوشی بھی ایک سے دوسرے تک پہنچنے والی چیز ہے۔ (چیننگ)
- جو زیادہ ہوشیار بنتا ہے اُسی سے زیادہ حماقتیں سرزد ہوتی ہیں۔ (انگریزی ادب)
- زبان بے قابو فتنہ ہے، جسے کوئی نہیں سُدھار سکتا۔ (جیمز سوئم)

تارا اور سریش کے گانے کی سبھی نے تعریف کی۔ آج کامنی پھول کی طرح کِھلی ہوئی تھی۔ سب سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی لیکن سریش کے ساتھ آج بھی اُس کا وہی رویّہ تھا۔ جیسے وہ ایک مشین ہے۔ گانا سکھانے والی مشین اور بس! ایک انسان، ایک کلاکار، کچھ نہیں۔

اچانک سریش کے دل میں نفرت کا ایک طوفان اُٹھا۔ نفرت! کامنی کے رویّہ سے نفرت! اور وہ چپ چاپ اُٹھ کر ہال سے باہر آگیا۔ کامنی نے پھر بھی کوئی توجّہ نہ دی۔ البتہ اُس کی سہیلیوں نے سریش کی کمی محسوس کی۔

"کہاں گئے تمھارے ماسٹر صاحب؟" ایک نے پُوچھا۔

"وہ بہت اچھا گاتے ہیں۔" دوسری نے کہا۔

"کامنی! تم نے کیوں نہیں گایا اُن کے ساتھ؟" تیسری کامنی کو چھیڑتی

ہوئی بولی۔

"یہ بھی ایک ادا ہے اِس کی!" چوتھی نے چٹکی لیتے ہوئے کہا "دل میں کچھ، زبان پر کچھ۔ گیت اُس کے بارے میں لکھا اور گوا دیا تارا سے!"

"واہ! میں اُس کے بارے میں کیوں لکھتی۔ یہ تو میں نے یونہی لکھ دیا تھا۔ ایک دن صبح چمن میں کھلے پھولوں کو دیکھ کر!" کامنی اپنا آنچل ٹھیک کرتے ہوئے اِٹھلائی۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ! تو تو مجھ سے خود کہہ رہی تھی کہ جب سے رشی آیا ہے میں۔۔"

"غلط!!" کامنی ایکدم چمک کر بولی۔ جیسے کسی نے بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی ہو "مجھے اُس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"اچھا نہ سہی، اِس وقت تو اُسے بلواؤ اور ہمیں گانا سنواؤ۔ ہائے کتنا اچھا کلاکار ہے!"

"مگر اب تو بے چارہ نیلی کوٹھی کے قید خانے میں پڑا ہے!" تارا نے رشی سے ہمدردی جتاتے ہوئے کامنی پر طنز کیا۔

"تارا! سوچ سمجھ کر بات کرو۔ میں اُسے بلانے نہیں گئی تھی۔ وہ خود یہاں آیا تھا نوکری کی تلاش میں۔" کامنی ایکدم سنجیدہ ہوگئی اور نیلی کوٹھی کی فضا جیسے ایکدم بوجھل ہوگئی۔ وہ تیزی میں بولے چلی جارہی تھی "ہاں بیشک رشی ایک اچھا کلاکار ہے لیکن تم لوگ اِس قابل نہیں کہ اُس کا گانا سنو اور پھر مجھ پر طنز کرو۔ میں اُسے تمھارا کھلونا نہیں بننے دوں گی!"

"تو تم نے اُسے اپنا کھلونا بنا کر رکھا ہے!" تارا نے جھلاکر کہا اور دوسری سہیلیوں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی "تم نے سراسر ہماری توہین کی ہے۔ ہم اُس کا گانا سننے کو کہہ رہی تھیں یا کھلونا بنانے کو؟"

"اُسے کامنی نے واقعی اپنا کھلونا بنا رکھا ہے۔ اِسی لئے کھلونا بنانے کی بات بے ساختہ اُس کی زبان پر آئی۔ بے چارہ کلاکار!!

اور سالگرہ پارٹی تلخ گفتگو پر ختم ہوگئی۔ کامنی کی سہیلیاں منہ بناتی ہوئی اپنے اپنے گھر چلی گئیں اور کامنی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی ——— وہ اپنے رویّہ کا جائزہ لے رہی تھی۔ سہیلیوں کے فقرے اور طنزیہ قہقہے اُس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اُسے اُن واقعات پر کبھی غصہ آرہا تھا، کبھی اپنے آپ سے پشیمان ہو رہی تھی کہ آخر اُس نے کیوں تصنع کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کیوں؟ کیوں؟؟ اُس کی آواز جیسے خلاء میں گونج کر رہ گئی۔ آخر وہ تمام مصلحتوں اور رکھ رکھاؤ کی زنجیر توڑ کر رشی کے کمرہ میں پہنچی ——— پہلی بار!! لیکن اُس کے دل پر جیسے بجلی سی گر گئی۔ جیسے قدرت نے اُس سے زبردست انتقام لیا تھا۔ کمرہ میں رشی نہ تھا۔ ہاں ایک خط تھا کامنی کے نام ———

"آپ کی عنایتوں کا شکریہ! لیکن میں اب یہاں ایک لمحہ نہیں ٹھہر سکتا۔ آپ کے رویّہ نے مجھ میں ایسا احساسِ کمتری پیدا کر دیا ہے کہ میں اپنے آپ کو انسان نہیں مشین سمجھنے لگا ہوں لیکن میرے سینے میں ایک فنکار کا دل دھڑکتا ہے ——— غیور اور خوددار دل! اِس نیلی کوٹھی میں رہ کر بالکل ہی مشین نہ بن جاؤں، اِس لئے دہلی کے ہنگاموں میں واپس جا رہا ہوں۔ اب میں فرشتہ بن کر آؤں گا۔ آپ کے بلانے پر بھی نہ آؤں گا!"

خط پڑھ کر کامنی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ آسمان سے زمین پر گر پڑی ہے۔ وہ بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں کھڑی رہی اور اُس کے اپنے ہی تحکمانہ جملے، تارا اور دوسری سہیلیوں کے طنزیہ فقرے اور قہقہے اور رشی کے خط کے الفاظ رہ رہ کر اُس کے ذہن سے ٹکراتے رہے۔

نیلی کوٹھی اُسی طرح خاموش کھڑی تھی اور سنسان جگمگاتی سڑک پر ایک نوجوان اٹیچی کیس ہاتھ میں لئے اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا اور دور سے آتی ہوئی کسی گھنٹے کے رونے کی آواز سناٹے کے دل کو دونیم کر رہی تھی!!

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵۔ ایف۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۲ مئی ۶۶ء   محترم خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

..."شانِ نزول" کی تازہ قسط ملاحظہ فرمائیے۔ اس قسط کا آخری واقعہ کہیں اس اندیشے سے قلم زد نہ کر دیجیئے گا کہ اس میں "وینگرز" والی دعوت کا ذکرِ خیر ہے اور اس کی اشاعت سے آپ کی میزبانی کے پراپگنڈے کا پہلو نکلتا ہے۔ باور کیجیے کہ آپ کی میزبانیاں میرے پراپگنڈے کی محتاج نہیں ہیں۔ یہ تو پہلے ہی ادبی حلقوں میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں ——— "افسانہ نمبر" کے لئے ہمہ تن انتظار ہوں اور اُس دن کی راہ دیکھ رہا ہوں، جب یہ اپنی روایتی اور مخصوص آن بان کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا۔ میرزا غالب کی طرح میں بھی گرمیِ نشاطِ تصور یعنی "افسانہ نمبر" میں ہونے والی دلچسپیوں اور رعنائیوں کے خیال سے نغمہ سنج تو نہیں بسرور ضرور ہو رہا ہوں...

آپ کا اپنا ——— نریش کمار شاد

اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کے تعلقات کشیدہ تھے۔ حفیظ صاحب اختر کے متعلق اکثر کہا کرتے کہ اگر اختر کے والد محمود شیرانی کا احترام نہ ہوتا تو میں اختر کی ہر بدتمیزی کا جواب بدتمیزی سے دے سکتا تھا۔ اختر صاحب نے حفیظ صاحب کے اِس قول اور اُن کی دنیوی کامیابی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا ؎

مجھے پسند ہے دُنیا میں اپنی ناکامی
کہ ہر ذلیل یہاں کامیاب ہے ساقی

آرزو لکھنوی نے لاہور میں جب پہلی بار نور جہاں کا مزار دیکھا تو مزار کی شکستگی اور ویرانی سے افسردہ دل ہو کر وہیں یہ شعر کہا اور کوئلے سے مزار پر لکھ دیا ؎

قتالِ جہاں معشوق جو تھے سُونے ہیں پڑے مرقد اُن کے
یا مرنے والے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں

حمیدیہ کالج بھوپال کے ایک مشاعرے میں بہت سے شاعروں کے علاوہ سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر اور سلام مچھلی شہری بھی مدعو تھے۔ اُن دنوں ادبی حلقوں میں اس بات کا چرچا تھا کہ انسان چاند کو تسخیر کر رہا ہے۔ سردار جعفری نے مشاعرے میں اسی موضوع پر اپنی نظم پڑھی۔ سردار کے بعد سلام کا نمبر آیا تو انھوں نے فی البدیہہ ایک قطعہ موزوں کیا جس کا ایک شعر یہ تھا ؎

ساتھ شاعر کا حسیں چاند نے بھی چھوڑ دیا
عہدِ سائنس نے رومان کا دل توڑ دیا

جوش ملیح آبادی جب دہلی میں ماہنامہ "آجکل" کے مدیر تھے تو انھوں نے نائب مدیر عرش ملسیانی کے پاس اپنے ساٹھ روپے بطور امانت جمع کر رکھے تھے۔ عرش صاحب کچھ دنوں کی چھٹی لے کر دہلی سے باہر اپنے گھر جانے لگے تو جوش صاحب کو اپنے روپوں کی فکر ہوئی اور انھوں نے یہ شعر موزوں کیا اور چٹ پر لکھ کر عرش صاحب کے پاس بھیج دیا ؎

گھر اپنے پھُل پھُل کے جاؤ
وہ ساٹھ روپے اُگل کے جاؤ

عندلیب شادانی طالب علمی کے زمانہ میں اپنے ایک دوست کے یہاں کسی تقریب میں مدعو تھے۔ ایک باغ جو رنگارنگ پھولوں سے بھرا ہوا تھا، دعوت گاہ تھی۔ بہت سی خوش اندام خواتین کے ہجوم میں یہ پھول اور بھی بہار دے رہے تھے۔ ایک شوخ و شنگ کا فرا دانے پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میزبان سے کہا۔ "کیوں جناب کیا اِس جگہ بھی میونسپلٹی کا قانون نافذ ہوتا ہے؟" میزبان جو اتفاق سے میونسپل کمشنر بھی تھے، میونسپلٹی کے لفظ سے چونکتے ہوئے بولے "کونسا قانون محترمہ؟" اُس نے معصومیت سے جواب دیا "یہی کہ پھول توڑنے والے گرفتار کر لئے جائیں گے۔" اِس جُملے پر میزبان کے علاوہ تمام مہمان بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور میزبان نے شرمندہ ہو کر خواتین کو گُل چینی کی اجازت دے دی۔ اکثر نے اپنی آرائش کے لئے جی بھر کر پھول توڑے۔ یہ پُربہار منظر دیکھ کر عندلیب شادانی نے اُسی وقت یہ شعر کہا ؎

گریباں میں ہیں اور کچھ پھول بالوں میں سجاتے ہیں
چمن کو لُوٹنے والے گُلستاں بن کے آتے ہیں

جب علامہ اقبال وطنیت کی شاعری کو خیرباد کہہ کر اسلامی شاعری کرنے لگے تو اُن کے ہم وطن کشمیری پنڈت آنند نرائن مُلّا نے اپنی وہ مشہور نظم لکھی، جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رندِ پُرانا آج نمازی بن بیٹھا
محمل میں چھپا ہے قیسِ حزیں، دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا اقبال وہ اب دُنیا میں نہیں

مُلّا کی یہ نظم منتور لکھنوی کی نظر سے گزری تو اُنھوں نے یہ شعر موزوں کیا ؎

اقبال میں جرأت کچھ ہو اگر تو مُلّا کی تردید کرے
ورنہ جو مسلک ترک کیا تھا پھر اُس کی تجدید کرے

بھٹنڈے کے ایک مشاعرے میں جوش ملسیانی اپنا کلام سُنانے کے لئے مائک کے سامنے آئے تو اُنھوں نے دیکھا، چند شاعر شراب کے نشے میں مدہوش اسٹیج ہی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب نے اپنی وہ مشہور غزل ؎

گردِ غم دل پہ نمایاں کبھی ایسی تو نہ تھی
زندگی خاک بداماں کبھی ایسی تو نہ تھی

سُنانی شروع کی۔ مدہوش شاعر قہقہہ لگا لگا کر ہر شعر پر داد دینے لگے۔ جوش صاحب کو یہ داد اتنی ناگوار گزری کہ اُنھوں نے اُسی وقت یہ شعر کہہ کر اپنی غزل میں پڑھ دیا ؎

بیٹھنا بزمِ سخن میں کبھی ہوا ہے مشکل
بے مزا صحبتِ یاراں کبھی ایسی تو نہ تھی

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کو لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے صرف پچیس روپے ماہوار ملا کرتے تھے اور جب سید انشاء اللہ خاں انشا شہزادے کی غزلیں درست کرنے لگے تو مصحفی ایسے باکمال شاعر کو پچیس روپے کی بجائے پانچ روپے ملنے لگے۔ اِس افسوسناک اور تکلیف دہ تخفیف کے پیشِ نظر مصحفی نے یہ قطعہ کہا ؎

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے
ہم بھی تھے کبھی، روزوں میں پچیس کے لائق
اُستاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر
ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

سید قلندر بخش جرأت جو عینِ جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے، ایک دن فکرِ شعر میں محو تھے کہ سید انشاء اُن سے ملنے آئے اور پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو۔ جرأت نے جواب دیا، ایک مصرع خیال میں آیا ہے، دوسرا مصرع نہیں سُوجھ رہا۔ مصرع یہ ہے ؏

اُس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سُوجھی

سیّد انشاء نے فوراً کہا ؏

اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سُوجھی

حکیم آغا جان عیش کے ایما پر مدہد نے ایک بار ایسی غزل کہی جس کے اشعار الفاظ اور تراکیب کے اعتبار سے بہت عالی شان اور پُرشوکت تھے لیکن معانی سے قطعی طور پر عاری تھے۔ وہ غزل مدہد نے سرِ مشاعرہ میرزا غالب کی موجودگی میں اُنھیں مخاطب کرتے ہوئے یہ کہہ کر پڑھی کہ میرزا صاحب یہ غزل میں نے آپ کے انداز میں کہی ہے۔ غزل کا مطلع ہے ؎

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں
ناخنِ قوسِ قزح شیشۂ مضراب نہیں

میر علی اوسط رشک شاعری میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کو ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے کسی مشاعرے میں ایک وہ طویل غزل پڑھی

جس کا مطلع تھا ؎

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں
وہ محبت نہیں، وہ چاؤ نہیں

غزل کا ہر شعر محض قافیہ پیمائی کی پیداوار تھا۔ غزل سن کر اُن کے کسی دل جلے حریف نے کہا کہ رشک صاحب! جو دو قافیے آپ سے بچ گئے ہیں، انھیں میں نے نظم کر دیا ہے اور یہ شعر سُنا دیا ؎

دُور سے چھیچھڑے دکھاؤ نہیں
رشک بیٹھا ہے تن بلاؤ نہیں

۱۸۵۷ء کے غدر میں جب آصف الدولہ کے امام باڑے کو انگریزی فوجوں نے اپنا قلعہ بنا لیا اور اُس کے سامنے مینائی خاندان کے مکانات جلا دیے یا مسمار کر دیے تو امیر مینائی نے اِس حسرت ناک منظر کو دیکھتے ہوئے یہ رباعی کہی ؎

گھر کھُدنے کی پُوچھو نہ مصیبت ہم سے
روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر
یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

اکبر الٰہ آبادی بہت سخت بیمار تھے۔ انھیں دنوں اُن کے ایک دوست میر سجاد علی نے انھیں ایک طرحی مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے لکھا اور خط کے ساتھ ہی رساول کی ایک ہانڈی بھی تحفے کے طور پر بھیجی۔ اکبر نے بیماری کی وجہ سے مشاعرے میں شامل ہونے کی تو معذرت چاہی لیکن جواب میں طرحی غزل کہہ کر بھیج دی جس کا مطلع تھا ؎

ہو بیاں کیونکر عنایت حضرتِ سجّاد کی
لذتیں لوں گا میں اب دوغِ "رساول زاد" کی

جاوید لکھنوی برسات کے موسم میں کہیں جانے لگے تو راستے کی کیچڑ میں پاؤں پڑ گیا اور گندے پانی کے چھینٹے مُنہ اور سر تک پہنچے۔ اپنی ہیئت کذائی دیکھتے ہوئے جاوید نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

جو چھینٹ پاؤں سے اُڑتی ہے سر پہ آتی ہے
فلک کی صبح زمیں بھی ہمیں ستاتی ہے

پہلی بار جب آغا حشر کاشمیری لاہور آئے تو لاہور کی بزمِ ادب نے اُن کے استقبال میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ علامہ اقبال بھی اِس جلسے میں شامل تھے۔ جب حشر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو مجمع نے اُن کے ریشمی کُرتے اور مشہدی تہبند کو دیکھتے ہی تالیاں بجا بجا کر شور مچانا شروع کر دیا۔ مجبوراً حشر صاحب کو خاموشی اختیار کرنی پڑی لیکن مجمع کا یہ نازیبا برتاؤ دیکھ کر علامہ غصّے میں آگئے اور اُنھوں نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر جلسے میں سُنا دیا ؎

شور ایسا ہے کہ قصّابوں کی ہو جیسے برات
آیئے لاہور کی یہ بزمِ ماتم دیکھئے

فصیح سندیلوی کچھ روپے قرض لینے کے لئے اپنے کسی دوست کے پاس پہنچے۔ اتفاق سے اُس دوست نے پہلے انھیں سے قرض کا مطالبہ کر دیا۔ فصیح صاحب بہت نادم ہوئے اور اُسی عالم میں بے اختیار یہ شعر کہہ دیا ؎

قسمتوں سے کوئی ہمدرد جو مِلتا ہے کبھی
وہ بھی کم بخت مصیبت میں گھِرا ہوتا ہے

سر عبدالقادر کی صدارت میں حفیظ جالندھری انجمنِ حمایت الاسلام کے جلسے میں اپنی نظم پڑھ رہے تھے جس میں انجمن کے لئے چندہ دینے کی اپیل کی گئی تھی۔ سامعین میں اتفاق سے تلوک چند محروم بھی تھے۔ اُنھوں نے حفیظ صاحب کی نظم سُن کر اُسی وقت یہ شعر موزوں کر دیا ؎

حفیظ کہتے تھے احباب جس کو بندہ نواز
ہوئے ہیں گردشِ دَوراں سے اب وہ چندہ نواز

خوشتر گرامی، مدیر "بیسویں صدی" نے کوثر چاندپوری اور اعجاز صدیقی کے اعزاز میں نئی دہلی کے ایک خوبصورت ریستوران میں ایک دعوت کا شاندار اہتمام کیا۔ دعوت کے موقع پر میں نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر وہیں سُنایا ؎

حضرتِ کوثر کے اور اعجاز کے اعزاز میں
محترم خوشتر نے کی ہے دعوت ایسی جاں فروز
کھا کے جس دعوت کو لب پر آ رہا ہے بار بار
ایسی دعوت ہو میسّر یاالٰہی روز روز

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔ بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)


ایک اہم میچ کھیلنا ہے اور راج کی کمر میں درد ہے!
آج شام کو ہاکی میچ ہے مگر میں نہیں کھیل سکوں گا۔ میری کمر میں سخت درد ہے۔
ایک ٹکیہ سیریڈون کی لے لو۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔
راج سیریڈون لیتا ہے
اور پھر...
ارے واہ! میری کمر کا درد تو غائب ہو گیا! سیریڈون بہت عمدہ چیز ہے۔
ایک ہی سیریڈون
'روش'
درد دُور کرتی ہے، آرام پہنچاتی ہے، تازگی بخشتی ہے
دنیا بھر میں مشہور سیریڈون ایک ایسی بے ضرر چیز ہے جو درد اور تکلیف میں فوراً اور یقیناً پورا آرام پہنچاتی ہے۔ سر کے درد، دانت کے درد، جسم کے درد اور طبیعت کی بے چینی کے لئے ہمیشہ سیریڈون لیجئے۔ پوری خوراک ایک ٹکیہ۔ بچوں کے لئے پاؤ سے آدھی ٹکیہ۔
Saridon
سیریڈون کی ایک ہی ٹکیہ کافی ہے
'روش' کی تیار کردہ
سول ڈسٹری بیوٹرز: وولٹاس لیمیٹڈ

کاغذی پیرہن

بشیر احمد ریاض

۴ اسپن سائیڈ ٹیرس۔ نیوکیسل۔ ٹائن ۶

۱۱ مارچ ۶۶ء برادرِ محترم خوشتر صاحب! تسلیم و آداب

. . . امید ہے آپ اس اچانک صدمہ سے اب تک سنبھل چکے ہوں گے ـــــ محترمہ بھاوج صاحبہ کی خدمت میں میرا آداب کہیے گا۔ خدا کرے وہ بھی والدہ مرحومہ کے انتقال کے صدمہ سے سنبھل جائیں۔ ماں ہی ایسا عظیم رشتہ ہے جس پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے اور اُس کی مفارقت کا گھاؤ سب سے گہرا ہے۔ میری نیک تمنائیں آپ دونوں کے شریکِ حال ہیں ـــــ محترم بزرگ میاں ایم اسلم صاحب (لاہور) کی اہلیہ پر بھی اللہ نے کرم کیا ہے۔ ابھی تک ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں لیکن رُوبصحت ہو رہی ہیں۔ میاں صاحب نے پرسوں ہی یہ اطلاع دی ہے ـــــ مارچ کا پرچہ راجہ صاحب نے بمبئی سے بھی بھجوا دیا ہے "مغرب کی بیٹی" کی اشاعت سے مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے اور یہ خوشی یوں دوچند ہو گئی کہ مجھے انڈیا سے اُس کہانی کی پسندیدگی اور مبارکباد کے خطوط آتے ہیں۔ اِن خطوں میں دھرم گاؤں (مہاراشٹر) کے محترم عابد بینا نگری کے پُرخلوص خط نے میرے دل کو چھو لیا ہے۔ موصوف نے مجھ سے عقیدت کا والہانہ اظہار کرتے ہوئے آٹوگراف تصویر بھی مانگی ہے۔ اُن کی قدر افزائی کا میں خاص طور پر شکر گزار ہوں "بیسویں صدی" میں میری یہ پہلی شرکت میری توقع سے زیادہ مسرت انگیز ثابت ہوئی ہے ـــــ "کاغذی پیرہن" ایک تازہ کہانی ارسال ہے۔ دراصل حوصلہ افزائی ہی کے احساس کی بنیاد پر اِس کہانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ اپنی طرف سے صرف یہی کہوں گا کہ میں نے کوشش کی ہے کہ یہ کہانی آپ کو پسند آئے اور قارئین کی توجہ پا سکے۔ کہانی کا آخری حصہ ہی شاید کلائمکس کہلائے ـــــ بیسویں صدی کے افسانہ نمبر میں اِس کی شمولیت کی خواہش شاید چھوٹا منہ بڑی بات ہو۔ آپ کو پسند آ جائے تو کسی بھی شمارہ میں اِس کی اشاعت میرے لئے موجبِ مسرت ہے۔ آپ کی رائے کا مجھے انتظار ہے . . .

خیر اندیش ـــــ بشیر احمد ریاض

پونچھ، ۲۰ فروری ۶۴ء

محترم درانی صاحب! تسلیم

کئی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کو جی چاہ رہا ہے لیکن زبانِ قلم کوئی بات کہتے ہوئے شرماتی ہے۔ جیسے یہ کسی کے دل کا راز آشکارا نہ کرے اور سچ تو یہ ہے کہ جب بھی قلم لیا، آپ کا خیال میری سوچ کو چھیڑنے لگتا ہے اور میں بے بس ہو کر اس خیال کی گرفت میں آ جاتی ہوں۔ نہ جانے یہ کیسی کیفیت ہے، جس کے اظہار کا مجھے طریقہ نہیں آتا۔ میری سوچ اُس خیال کے سحر میں دب کر کیوں رہ جاتی ہے اور بہت کچھ ذہن میں ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتی، کچھ نہیں لکھ سکتی۔

آپ نے جس خلوص سے شدید بیماری میں میری خیریت پوچھی تھی، اُس میں اپنائیت کی جو مہک ہے، وہ اُسی دن سے میری شریکِ حال ہے اور اگر یہ کہوں کہ آپ کے

اُس کی خلوص اور اپنایت نے مجھے صحت بخشی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اُس دن سے انجانے میں مجھ پر یہ احساس غالب آگیا ہے۔ جیسے میں بہت پہلے سے آپ کو جانتی ہوں۔ آپ کے افسانوں کو پڑھ کر کبھی آپ کے بارے میں سوچا کرتی تھی اور آپ سے یہی عقیدت میرے دل میں کسی پردہ نشیں آرزو کی طرح چھپی رہی ہے اور اب جھجک بھی غالباً اسی وجہ سے ہے کہ کہیں یہ آرزو بے نقاب نہ ہو جائے اور میں پانی پانی ہو جاؤں۔

صحت یابی کے بعد آج آپ کے خلوص کا شکریہ ادا کر رہی ہوں۔ اِس وقت میں اپنی کوٹھی کے باغیچہ میں پھولوں کے حُسن سے جی بہلا رہی ہوں اور اِن لمحے آپ کو یاد کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اِس خط میں آپ کو پھولوں کی تازہ خوشبو بھیج رہی ہوں۔ خلوص بھی تو ایک پھول ہی ہے جو انسانیت کے باغ میں کھلتا ہے اور آدمیت جس سے مہکتی ہے۔ وہ لمحہ کتنا عظیم ہوتا ہے۔ جب دل عقیدت کی بارگاہ میں سر جھکاتا ہے!

آپ میری ان عجیب و غریب باتوں کو شاید میری بیماری کا اثر کہیں یا میرا پاگل پن۔ مجھے خود علم نہیں کہ میں کیوں اور کس لئے یہ عجیب سی باتیں لکھ گئی ہوں۔ اُمید ہے آپ میری اِس بھول کو معاف کر دیں گے۔

آپ کی مخلص ——— فرحانہ

لندن: ۱۵ مارچ ۶۴ء

محترمہ فرحانہ! اسلام و خلوص

آپ کا خلوص نامہ میرے پیشِ نظر ہے۔ آپ کی یہ تحریر پڑھ کر ایک اُلجھن کے ساتھ مجھے خوشی بھی ہو رہی ہے۔ ایک فنکار کو جب سچی داد ملتی ہے، تو اُس خوشی کے مقابلہ میں ہر بڑی سے بڑی چیز اُسے ہیچ نظر آتی ہے اور پر خلوص داد کے سوا اُس کی ذات سے اگر کسی طرح کی لگن کا بھی کوئی اظہار کر دے تو اُس کی محنت کے صحیح انعام کے ساتھ اس کی شخصیت کی تکمیل کے مدارج طے ہونے کا آغاز بھی ہو جاتا ہے۔

میں نے مزاج پُرسی ایک اخلاقی تقاضہ کے طور پر کی تھی۔ آپ کی دوست نے جب بیماری کی اطلاع دی تھی تو میرے لئے یہ قیاس زیادہ مشکل نہ تھا کہ آپ میرے افسانوں کی کوئی پرستار ہیں اور یہ رشتہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اِس تعلق سے میں نے فوراً خیریت پوچھی اور مقامِ شکر ہے کہ آج آپ کے ہاتھوں صحت یابی کی اطلاع کے علاوہ آپ کی تحریر کے حُسن سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا ہے۔

آپ نے اپنی تحریر میں یہ حُسن پھولوں سے چُرایا ہے یا یہ آپ کے اپنے خوبصورت خیالات کا عکس ہے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اِن میں آپ کے بہت ہی پیارے، پاکیزہ جذبات کی جھلک شامل ہے اور بعض جملے تو دل کی طرح دھڑکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور الفاظ کی یہ دھڑکن ہی دل کی زبان بن گئی ہے اور کچھ نہ کہتے ہوئے بھی آپ نے اِن جملوں میں بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اِسی وجہ سے مجھے ایک پیاری سی اُلجھن محسوس ہوئی ہے۔ اُلجھن ——— جو نشاط انگیز بھی ہے اور کیف آفریں بھی!

اِس تحریر کے پسِ پردہ اگر آپ کی شخصیت مستور ہے، تو آپ کو اخلاص کا خوبصورت پیکر کہا جا سکتا ہے۔ قدرت نے یقیناً آپ کو حسین دل عطا کرنے کے علاوہ شخصیت کے اِس شگفتہ پھول میں ڈھالا ہوگا۔ بہار انسانیت جس کے حُسن کی رہین منت ہے۔

آپ کے پُرخلوص جذبات کی میرے دل میں قدر ہے اور آپ کے انتہائی پاکیزہ جذبات کا بھی احترام ہے۔ خدا کرے آپ کی یہ بھول کبھی بھی سرزد ہو جایا کرے۔

خیر اندیش ——— دُرّانی

پنڈی: ۳۰ مارچ ۶۴ء

دُرّانی صاحب! آداب

مجھے اُمید نہیں تھی کہ آپ میرے خط کا جواب اِتنی وضاحت سے دیں گے۔ مجھے تو یہ خوف تھا کہ کہیں آپ پاگل سمجھ کر میرا مذاق ہی نہ اُڑائیں۔ اِس اندیشے کے باوجود دل میں اُمید کی یہ کِرن روشن تھی کہ آپ میرے اِس خط کا اسی پُرخلوص انداز میں جواب دیں گے۔ یہ اعتماد اور یقین عقیدت کی سچائی کی بدولت تھا اور جب یہ خط پایا تو خوشی سے میری دُنیا ہی جھومنے لگی۔ پاگل پن کی حد تک آپ کی تحریر پر میری آنکھیں بار بار جھکی ہیں۔ الفاظ میرے دل میں اُتر گئے ہیں۔ اِسے آنکھوں سے لگا کر مجھے خوشی اور سرور محسوس ہو رہا ہے۔

سوچتی ہوں اِسے بار بار پڑھنا پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ جتنی بار اِسے پڑھا ہے تشنگی اور بڑھی ہے۔ آپ کا یہ خط پا کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آج میری زندگی کا سرور ترین دن ہے۔ یہ گھڑی اپنے سینے میں نہ جانے کتنے انمول تصوّرات سجا کر میرے گلے ملی ہے۔ میری آرزوئیں خوشی کی چاندنی میں نہا کر پریوں کی طرح اور بھی اُجلی نظر آتی ہیں اور خواہشات کے نورستے جیسے میری تمام زندگی کو جگمگا دیا ہے۔

آپ کی کہانیوں سے مجھے پیار ہے۔ اُن میں میں نے اپنے دل کی کہانی پڑھی ہے۔ جیسے یہ افسانے صرف میرے ہی احساسات کی عکاسی کے لئے لکھے گئے ہیں۔ آپ کی اَن دیکھی شخصیت کا پرتو اُنہی افسانوں کے حُسن میں دیکھا ہے اور اب جب یہ اِتنا پیارا خط مل گیا ہے تو آپ سے عقیدت فزوں تر ہو کر ایک جذبہ کی طرح میرے دل میں سما گئی ہے۔ میں اِسی جذبہ کی پرورش کروں گی اور اِسے اتنا توانا اور مستحکم

...ناؤں گی کہ عقیدت کے پھول سدا بہار بن کر کھلے رہیں۔

سچائی کا سر ہمیشہ اونچا رہا ہے۔ میری عقیدت اِسی سچائی کی علمبردار ہے اور یہ خط بھی اِس حقیقت کا اعتراف ہے کہ آپ نے نہ صرف میرے عقیدت مندانہ جذبات کو اپنے دل میں جگہ دی ہے بلکہ مجھ سے اپنائیت اور اُنس کا بھی اظہار کیا ہے۔ عقیدت ——— جو خاموش چاہت کا رُوپ ہے، اُس نے آپ تک باریابی حاصل کی ہے اور میں تو یہ بھی وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کے دل کی تہہ میں بھی میرے لئے ایک جذبہ جنم لے چکا ہے۔ یہ جذبہ آگے چل کر کیا شکل اختیار کرتا ہے، ابھی کہنا مشکل ہے لیکن اِتنا ضرور جانتی ہوں کہ مجھے اپنی لگن پر پُورا بھروسہ ہے اور یہ ہوا آپ کے دامن کو ضرور چُھو سکے گی۔

آپ نے میری تحریر سے میری شخصیت کے بارے میں شاید صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ میرے پاس اچھی شکل و صورت ہے۔ البتہ ...پہلو میں ایک پُرخلوص دل ضرور ہے۔ اِسے اگر خوبی سمجھتے ہیں تو زہے نصیب!

عقیدت مند ——— فرحانہ

...پنڈی: ۱۰ اپریل ۶۴ء

دُرّانی ڈیر اسلام شوق لیجئے

میرا پہلا خط مِل چکا ہوگا۔ میں اُس کے جواب کی منتظر ہوں لیکن اِس جنون کو کیا کروں جو آپ کو خط لکھنے کے لئے بیقرار بنائے رہتا ہے۔ جب تک آپ سے مخاطب نہیں ہوتی، مجھے چین نہیں مِلتا اور جب آپ سے باتیں کرتی ہوں تو میرے انگ انگ سے خوشی کی پھوار برسنے لگتی ہے۔ شاید اِسی کو پیار کا نام دیتے ہیں۔ یہ دھیمی دھیمی آگ جو دل میں سُلگ رہی ہے۔ چاہت کی اِس آگ میں تمنائیں کُندن ہو رہی ہیں ——— وہ تمنائیں جو آپ کے خیال اور تصوّر سے عبارت ہیں۔

کل ایک ماہنامہ کے سالانہ نمبر میں آپ کی تازہ کہانی ” سہاگ رات“ پڑھی۔ وہ تخلیق مجھے بے حد پسند آئی اور میں اِس کی مبارکباد دینے کے لئے آپ کو یہ سطور لکھ رہی ہوں۔ آپ کا وہ افسانہ پڑھ کر تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جیسے ہر لڑکی کی تخلیق سہاگ رات ہی کے لئے ہوئی ہے۔

آپ کی تصویر بھی کل ایک اخبار میں دیکھی ہے۔ کسی تقریب میں ایک پیکرِ ناز آپ سے مصروفِ گفتگو ہے اور وہ اِس طرح آپ کو دیکھ رہی ہے، جیسے آپ ہی اُس کے سب کچھ ہیں اور آپ بھی مُسکراہٹ کی کلیاں اُس کے دامن میں ڈال رہے ہیں۔ یہ تو مجھے علم نہیں کہ آپ کی اُس میں کہاں تک دلچسپی ہے لیکن مجھے اُس پر بہت غصّہ آیا ہے۔ مجھے اُس کا گھورنے کا انداز بالکل نہیں بھایا۔

آپ انجانے میں میرے سراپا کو پھولوں اور خوشبوؤں کا گلدستہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ آپ کی تصویر دیکھنے کی خوشی میں اپنی تصویر بھی بھیج رہی ہوں۔ اگر پسند نہ آئے تو اِس کی توہین نہ کیجئے گا اور نہ میری بُری صورت کا مذاق اُڑا لیجئے گا۔ شاید خوبصورت تِتلیوں کی صحبت میں رہنے والے کو یہ عام سی معمولی شکل بھائے نہ بھائے!

لندن: ۳۰ اپریل ۶۴ء

فرحانہ حضور! تسلیم و نیاز۔

تمہارا پہلا خط پا کر میں نے جہاں تمہارے گہرے جذبات کے اوراق پڑھے، وہاں کہیں دُور میرے لاشعور میں یہ وسوسہ بھی رینگتا رہا کہ کہیں تم میرے احساسات سے آنکھ مچولی نہ کھیل رہی ہو۔ تمہارے تازہ خطوں سے یہ خوف دُور ہو چکا ہے۔ تمہارے دل میں میرے لئے جو چنگاری سُلگ رہی ہے، اُس کی تڑپ میں اپنے دل میں بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔ چاہت کی یہ آگ دلوں سے نکل کر اب بغیر کسی جھجک کے زبانِ قلم سے آمادۂ اظہار ہو چکی ہے۔ اور ہمارے قلم ہمارے دلوں کے ترجمان بن چکے ہیں۔

میں نے اپنے تصوّر کی روشن راہوں پر تمہیں اکثر محوِ خرام دیکھا ہے اور تمہاری معصوم صورت نے بارہا تحریک کی ہے کہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کچھ قدم تمہارے ساتھ چل کر چاندنی کے اُسی نُور میں نہالوں۔ اِتنا قریب ہوتے ہوئے بھی قربت کی تشنگی کا احساس کم نہیں ہوتا۔ اب تمہاری تصویر نے میرے پیاسے احساس کو ٹھنڈک بخشی ہے۔

تمہاری یہ تصویر ہوبہو میرے تصوّر پر پُوری اُتری ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تصوّر کس قدر حسین ہوتا ہے۔ تصوّر سے زیادہ خوبصورت شاید کچھ نہیں ہوتا۔ اِس کاغذی پیرہن نے میرے تصوّر کو اور تابندہ کیا ہے اور میرے دل میں ایک معصوم پرستش کی خواہش انگڑائی لینے لگی ہے۔ اگر تصوّر میں عبادت کی کچھ حقیقت ہے تو تمہاری یہ تصویر اُسی حقیقت کے اعتراف کی مظہر ہے۔ اپنی ایک آٹوگراف تصویر ارسال ہے۔

کیا خوب! ”سہاگ رات“ تمہیں پسند آئی۔ مجھے اِس سے زیادہ خوشی اور کیا ہوگی۔ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی مجھے مبارکباد کے پیغامات بھیجے ہیں لیکن تمہاری پسند نے مجھے خوشی کا جو بے بہا احساس عطا کیا ہے۔ احساس کے اُس سمندر میں دوسرے لوگوں کی مبارکباد چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی طرح تیرتی نظر آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے حُسنِ نظر کی بدولت میری کاوش نے اپنا حقیقی صلہ پا لیا ہے۔ دراصل عورت کی زندگی میں سہاگ رات ایک انتہائی اہم موڑ ہے اور اُس کی تخلیق سے قدرت کا منشا


سرگرم لوگوں کے لیئے - ہمیشہ تشفی بخش !
انٹرول
میں
۱
کہو شوکت !
جب بھی پکچر دیکھنے
آتا ہوں - تم سے
ملاقات ہو ہی جاتی ہے -
اور میرا ایک کپ
چائے کا خرچ بڑھ جاتا
ہے - سیزرز کی
بات تو
جانے دو -
۲
لو بھئی ! میں بھی اب
سیزرز
ہی پینے لگا
ہوں !
۳
اصلی چیز پہچان لی نا ؟
اچھا یہ تو بتاؤ کہ
سیزرز
کیوں پینے لگے - ؟
نیکی اور پوچھ پوچھ !
تم صحیح فرماتے
تھے -
سیزرز واقعی
بہترین سگریٹ ہے -
کوئی دوسری سگریٹ
اس کا مقابلہ نہیں
کر سکتی -
سگریٹ ہو تو
ایسا -
SCISSORS
۳۸ پیسے میں ۱۰ عدد
سیزرز
کے سواد میں ایک
خاصیت ہے -
یہ ہمیشہ مزیدار

مرد کو ایک غم گسار اور مونس ساتھی عطا کرتا ہے۔ سہاگ رات دو انسانوں کے لئے ایک بہت ہی پیارا شیریں تحفہ ہے، جس کی لذت آفرینی کے سہارے وہ آیندہ طویل زندگی میں ایک دوسرے کا ہنسی خوشی ساتھ دے سکیں یا یہ کہہ لیجئے، مرد اور عورت کے لئے سہاگ رات زندگی کے سفر کی سختی کا پیشگی انعام ہے۔

مونس و ہمدم ——— دُرّانی

پنڈی ۱۸ مئی

عزیز ترین دُرّانی صاحب! اسلام محبت

صبح باغیچہ میں ٹہلتے وقت نسیم سحر میرے لئے کچھ غیر محسوس خوشیوں کے پیغام لا رہی تھی۔ چڑیوں کے چہچہانے میں بھی میں اپنے دل کا گیت سُن رہی تھی۔ تازہ پھولوں پر شبنم دیکھ کر مجھے صرف ایک ہی احساس ہوا کہ میری آرزو کے پھول کو قدرت نہلا رہی ہے۔ باغیچہ کی حسین دُنیا سے لطف اندوز ہو کر جب میں ناشتہ سے فارغ ہوئی تو پوسٹ مین کی گھنٹی پر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ شاید آپ کا خط آیا ہو، اس خیال سے ڈاک اُٹھائی۔ سب سے آخر میں تمہارا لفافہ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ باقی ڈاک ڈرائنگ روم کی ٹیبل پر رکھ کر میں فوراً اپنے کمرہ میں بھاگ آئی۔ جذبات سے میرے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ خط کو انتہائی احتیاط سے چاک کیا۔ آپ کے خط کا ایک ایک لفظ میرے دل کی گہرائیوں کو چھوتا گیا۔ دل میں خوشی کے غبارے اُڑنے لگے اور میں جھوم کر پلنگ پر گر پڑی۔

لڑکی کے ساتھ والی تصویر دیکھ کر مجھے جو کوفت ہوئی تھی، اُس تکلیف کا احساس کر کے شاید آپ نے اپنا پیارا سا کاغذی عکس بھیجا ہے۔ دل میں سجانے کے علاوہ میں نے اُسے اپنے البم کی زینت بنا لیا ہے۔ دن نہ جانے خوشی کی بیقراری میں کس طرح بیتا۔ رات بھی وہی بیتابی رہی، وہی بے چینی رہی۔ میری آنکھیں نیند کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ شاید وہ مجھے چھوڑ کر آپ کے پاس چلی گئی۔ یہ غم اور خوشی کیسی حقیقتیں ہیں کہ دونوں کے ساتھ بیقراری کا سایہ لگا ہوا ہے۔ جب دل مغموم ہو، تب بھی نیند بے وفائی کرتی ہے اور خوشی کے لمحات میں بھی یہ ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

میں سونا چاہتی تھی تاکہ سہانے سپنوں میں کھو کر آپ کو تلاش کروں۔ نہ جانے کب نیند ہم آغوش ہوئی۔ خواب جاگ اُٹھے۔ میں آپ کے ساتھ ایک رومان پرور جگہ پر آ نکلی۔ آپ میرے بالوں میں مُنہ چھپائے مدہوش تھے اور میں آپ کے سینے سے لگی آپ کے گلے میں بانہیں حمائل کئے لہرا رہی تھی۔

اچانک باجی کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں کچھ کھو دینے کا احساس لئے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ سپنے اِتنے چھوٹے کیوں ہوتے ہیں؟ آرزو کی بیل تو بہت لمبی ہے۔

آپ کی پرستار

فرحانہ

لندن: ۳۰ مئی

میری محبوب! سلام آرزو

خوبصورتی سے مجھے محبت ہے۔ اُدھر حالات کی بدصورتی مجھے پیار کرتی ہے۔ تم بھی حُسن کا وہ نازک شعلہ ہو جو میرے دل میں بلند ہو کر میرے وجود کو آنچ دینے لگا ہے۔ کبھی یہ آنچ پھیل کر جب میرے جذبات تک آتی ہے تو میں بے خود ہو جاتا ہوں۔ اُس وقت تمہارا خیالی سراپا میرے تصوّر میں مُسکرانے لگتا ہے اور میں آگے بڑھ کر اُسے آرزوؤں کی بانہوں میں کھینچ لیتا ہوں۔ تمہاری شرمائی لجائی دھڑکنیں جب میں اپنی سانسوں میں تحلیل پاتا ہوں تو سب کچھ بھول کر ایک بہت ہی حسین دُنیا میں آنکلتا ہوں۔ جہاں مجھے چاروں طرف خوبصورتی اور پیار محوِ بوس و کنار نظر آتے ہیں اور آشاؤں کی البیلی پریاں اپنی آغوش وا کئے کسی کے انتظار میں مضطرب ہو کر اِدھر اُدھر بھاگتی پھرتی ہیں۔ اُن کے پیچھے چھُپ چھُپ کر جب تم کسی خواب کی طرح مجھ سے دُور بھاگنا چاہتی ہو، تو میں پھر تمہاری تلاش میں گھوم کر تمہارے تصوّر کو پکڑ لیتا ہوں۔ آجکل تصوّر میں یہ آنکھ مچولی میرے دل و دماغ کی زینت ہے۔

تم میرے بارے میں کچھ سپنے دیکھنے لگی ہو۔ ایسے ہی سُہانے خواب میرا پیچھا بھی کرنے لگے ہیں۔ ہمارے یہ خواب اپنے جلو میں پیار کے کچھ گرم انگارے لے کر ایک دوسرے کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ شاید کبھی ایک دوسرے کا دامن پکڑ کر حقیقت کو پالیں۔

تمہارا اپنا ——— دُرّانی

مری ہل: ۱۸ جون

میرے ہمدم دُرّانی! اسلام تمنّا

موسم کی تبدیلی نے مری کے لُٹے ہوئے حُسن کا پھر میک اپ کر دیا ہے۔ زندگی کی آسائش جن پر مہربان ہے، گرما کا سیزن کاٹنے کے لئے اُن کی آمد آمد ہے۔ شام کے وقت حُسن کے نئے نئے دلکش و دلفریب رنگوں سے مال کی اُجڑی مانگ سنورنے لگی ہے۔ درختوں پر کونپلیں جوان ہو رہی ہیں۔ آنے والے مہمانوں کے لئے طرح طرح کے خوبصورت پھول کھلے ہوئے ہیں۔ چیڑ کے درختوں کی خوشبو شام کو اور بھی تیز ہو جاتی ہے اور ہوا کے ارتعاش سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ سوز میں ڈوب کر مجھے آپ کی یاد دلانے لگتی ہے۔ ہر طرف شاد و مسرور جوڑے چہل قدمی

کرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میرے دل میں یہ مستور خواہش مسکرانے لگتی ہے کہ ہم بھی قدرت کے ان حسین مرغزاروں میں کچھ دیر کے لئے اپنی مسکراہٹوں کے پھول بکھیر دیں۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو رہا ہے۔ دوسرے لوگ پک نک کے ہنگاموں میں کھوئے ہوئے ہیں اور میں سب سے الگ اس چشمہ کے قریب بیٹھی آپ سے ہمکلام ہوں۔ چشمہ کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی بھی میرے دل میں آپ کے قرب کی خواہش کی پیاس کم نہیں کر سکا ہے۔ ان پہاڑی آوارہ ہواؤں کو میں سندیسے دے دے کر تھک گئی ہوں کہ وہ آپ کو بلا لائیں۔

ان خوبصورت لمحوں میں ایک انگریزی شاعر کے یہ الفاظ میری روح میں بولنے لگے ہیں :-

Think of me when this you see,
Acthmgh you see me not, although
But little flowers that cultivate,
They call for-get me not.

میں قدرت کی شکر گزار ہوں کہ اس خوبصورت وادی میں آپ کی یاد کی عبادت یکسوئی سے کر سکتی ہوں۔ قدم قدم پر آپ میرے ساتھ ہیں۔ میرے یہ سپنے قبول کیجئے گا۔

آپ کی "تصویرِ شوق"

فرحانہ

لندن ، ۱۵ جولائی

میری رفیقِ تنہائی! پیار اور سلام

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

فیض کو یہ شعر کہتے وقت شاید میرے آج کے دل کی کیفیت معلوم نہ ہو لیکن مجھے تو یہ شعر اپنے ہی حالِ دل کے اظہار کے لئے کہا گیا معلوم ہوتا ہے۔

سکوتِ شب میں میرے افکار کی دلہن جب نغمہ سرا ہوتی ہے تو تصوّر میں تم سے ملاقاتوں کی یاد کے شعلے میرے دل کو اپنے حلقہ میں لے لیتے ہیں اور اس آگ سے میرا احساس دہکنے لگتا ہے۔

کبھی تم چاند کی کرن میں مسکرانے لگتی ہو اور کبھی چنبیلی کی خوشبو کی طرح مجھ سے لپٹ جاتی ہو۔ رات کی اس تنہائی میں میرے پاس آکر تم میری ہو جاتی ہو۔ اور ایک گیت کی طرح میں تمھیں اپنی روح میں بسا لیتا ہوں۔ رات بجھ جاتی ہے اور سحر کا نور پھیلنے لگتا ہے تو دن کے ہنگامے تمھیں مجھ سے دور لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غم روزگار کے یہ لمحے کبھی کبھی تو مجھ کو بھی اپنے آپ سے چھین لیتے ہیں۔ زندگی کے تقاضوں کی ریل پیل میں انسان کا گم ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ضرورتوں کے اس ہجوم سے دامن بچا کر شام کی سرخی پھیلنے کے ساتھ جب میں اپنے گھر قدم رکھتا ہوں، تو سب سے پہلے اپنا استقبال آپ کرتا ہوں۔ میں اپنے آپ سے ملتا ہوں اور اس وقت تمھاری جستجو میں سرگرداں ہو کر میرا خیال تمھیں بلانے چلا جاتا ہے اور تصوّر میں تم پھر میرے پاس آجاتی ہو۔

ہماری ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کائنات کے طلوع و غروب کے نظام کی طرح معمول بن چکا ہے۔ شام کے وقت تم میرے دل کے افق پر طلوع ہو کر ستارۂ صبح کے ساتھ غروب ہو جاتی ہو اور میں ضرورتوں کے وسیع خلاء میں حقیقت بن کر گھومنے لگتا ہوں۔

زندگی ہمیشہ تم پر آسائشیں نچھاور کرتی رہے!

تمھارا "شریکِ دل" ـــــــ درانی

کویت (بحرین) ۳ ، مارچ ۱۹۵۸ء

میرے تصوّر کے سرتاج! سلامِ حسرت

میری طویل خاموشی آپ کے لئے حیران کن ہو گی۔ کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ میں آپ کو کویت روانہ ہونے کی اطلاع تک نہ دے سکی۔ میرے دل پر ایک بوجھ آپ سے مخاطب ہونے میں مانع رہا۔ دل اور دماغ کی کشمکش میں اپنے آپ تک کا ہوش نہ تھا۔ جو کچھ سوچا تھا، چاہا تھا، سب ظالم تقدیر نے مجھ سے چھین لیا۔ اب میں ہوں اور میری ناتمام آرزوئیں!

بجھے بجھے دل میں آپ کی یاد کی حرارت تو باقی ہے لیکن چاہت کی چنگاریاں اور شعلے سینے میں دھڑک کر بجھنے لگے ہیں۔

مجھ میں تو اب یہ ہمت بھی نہیں کہ کاغذ ہی پر آپ سے آنکھیں ملا سکوں۔ آپ کا کیا قصور تھا! جو میری آگ میں آپ بھی جھلس گئے؟ یہ میں آپ سے کون سا انتقام لے رہی ہوں؟ کیا میری چاہت صرف آگ کے شرارے ہیں جن سے میں آپ کا دامن بھر رہی ہوں؟ یا الٰہی پیار تو میٹھا پانی ہوتا ہے جسے پی کر روح سرور کی ٹھنڈک پاتی ہے لیکن یہ دہکتی آگ کیوں ہو گیا ہے؟

میرا وجود اور میرا دل دونوں جل رہے ہیں!

میں نے آپ کو اپنے دل کی گہرائی سے چاہا ہے۔ آپ کی محبت کے خواب دیکھے ہیں اور اپنے دل کی تڑپ میں ہر دم آپ کو محسوس کیا ہے۔ اب میں آپ کو اپنے دل سے کیسے باہر نکال پھینکوں؟ میرا دل اس رنج میں پاگل ہے کہ آپ کیا سوچیں گے!

مجھے کتنی مکار اور دھوکے باز کہیں گے۔ میرے بے شمار خطوط آپ کو جھوٹ کے سانپ بن کر ڈسیں گے اور اس زہر سے وہ سب جذبے ہلاک ہو جائیں گے جو آج تک میرے لئے آپ کے دل میں زندہ رہے ہیں۔

میرے پاس اپنی صفائی کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میں آپ کی مجرم ہوں اور جو سزا آپ دیں گے اُسے قبول کر لوں گی۔ میری بےکسی کے جرم کا یہی المناک انجام ہونا چاہئے۔

چھ ماہ پہلے کار کے حادثہ میں امی کی اچانک موت میری خوشیاں بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اس حادثہ کے بعد سے خوشی ہمارے گھر کی راہ بھول گئی ہے ہم سب مغموم ہیں۔ در و دیوار سوگوار ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم سب مر چکے ہیں!

امی کی یہ آخری آرزو تھی کہ میری شادی کویت میں اُن کے بھتیجے سرفراز سے ہو۔ میں نے امی کو یہ الوداعی وعدہ دیا ہے۔ ابا اسی لئے مجھے یہاں کویت لے آئے ہیں۔ ایک ماہ بعد ایک اطاعت گزار لڑکی کی طرح میں اپنی امی کی روح کے لئے سکون بن رہی ہوں۔

میری اپنی روح فنا ہو چکی ہے اور اسی فنا میں میری بقا ہے!

کاش میں آپ کی ہو سکتی!

کشتۂ تقدیر ——— فرحانہ

لندن: ۲۰ مارچ ۶۵ء

میری آرزو کے پھول! سدا مسکراتی رہو

زندگی چند آزمائشوں کا نام ہے اور اُس کی مرکزیت دل کی آزمائش ہے۔

ہم اپنے دل کی دنیا کچھ آرزوؤں سے آباد رکھ کر جب "کچھ کھو" یا محسوس کرتے ہیں تو اِس چھوٹی سی دنیا میں زلزلہ آ جاتا ہے۔ ہمیں اپنے نصیب کے [illegible] ڈوبتے نظر آتے ہیں اور ہم اپنے گرد و پیش مایوسی کی تاریکی کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اُسی طرح ہوتا ہے، جب ہمارے دل غرض کی آلائشوں سے معمور ہوں۔

کچھ جذبوں کی تلاش میں ہم ایک پیارا سا روگ اپنا لیتے ہیں، اگر ہمارے دل بے لوث پیار کی مورتی کو پوجتے ہیں تو جس جذبہ کے ہم متلاشی ہوتے ہیں، وہ ہمارے اپنے ہی دل میں پیار کی روشنی سے چمکنے لگتا ہے۔ پیار کی اُسی چمک سے آج تمہیں شادی کی مبارکباد دے رہا ہوں۔ میری نیک خواہشات کی خوشبو تمہارے سہاگ کے دامن میں ہمیشہ مہکتی رہے گی۔

تمہاری اِس اچانک رخصتی سے میرے دل میں غم کی بوندیں برسنے سے میری روح میں تبسم کی کلیاں کھل اٹھی ہیں۔ غم نے اپنے آپ کو خوشی سے سنوار لیا ہے۔ کچھ کھو دینے کا احساس کچھ پانے میں بدل چکا ہے۔ اِس لئے میں اُداسی کے صحرا میں مغموم کانٹوں کی چبھن محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک شاداب سی جگہ پر اطمینان کی ٹھنڈک میرے دل کو چھو رہی ہے۔ بھونرے کلیوں پر منڈلاتے ہیں اور میں تصور میں اپنے اُس پھول کو سونگھ رہا ہوں جس کی رنگینی زندگی کے نئے عنوان تخلیق کرے گی اور جو نئے ماحول کی رونق ہوگا۔

پھولوں سے تمہارے پیار کو میں یہی احترام دے سکتا ہوں کہ اُنہیں مسکراتے دیکھ کر اُن کی ہنسی میں شامل ہو جاؤں۔

فرحانہ دیوی! تم اُس سماج کی بیٹی ہو جو عورت کی توقیر اور احترام کا حصار ہے اور میرا تعلق بھی اُسی تہذیب سے ہے۔ جہاں عورت کو بغاوت نہیں، شرافت سکھائی جاتی ہے۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل تو ایک عام انسانی مطالبہ ہے۔ اپنے لئے ہماری جد و جہد اتنی حقیر نہ ہونی چاہئے کہ ہم محض جذبات کے غلام بن کر رہ جائیں۔ اپنے دلوں میں محبت کے نور سے ہمیں اپنی تہذیب کی عظمت کے مینار کو منور رکھنا ہے۔ جو ہر حالت میں ہمارے ارادوں اور آرزوؤں سے بلند اور مقدس ہے۔

لوگ اپنے وطن کے لئے جان دے دیتے ہیں۔ کیا ہم اپنے سماج کی خاطر محبت کی معمولی سی قربانی نہیں دے سکتے؟

میرا یہ خط سُرخ روشنائی سے لکھا دیکھ کر تمہیں تعجب نہ ہونا چاہئے۔

کیونکہ ان سطور کی سُرخی میں پیار کی اِس شہادت کا لہو جھلک رہا ہے۔

میرے دل کے یہ سُرخ گلاب اپنے سہاگ کا نذرانہ سمجھ کر قبول کیجئے گا۔

تمہارا ——— درّانی

طنزیہ

اُوٹ پٹانگ

فکر تونسوی

اگر آپ گلاب کا پھول اپنے کوٹ پر لگا لیں تو مجھے یقین ہے آپ پنڈت نہرو نہیں بن جائیں گے۔ ہر آدمی بکری کا دودھ پی کر اپنا نام مہاتما گاندھی نہیں رکھ سکتا اور پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کا کوٹ پھٹا ہوا ہو یا سرے سے آپ کے پاس کوٹ ہی نہ ہو۔ جیسے کئی آدمیوں کے پاس لنگوٹی تو ہوتی ہے لیکن بکری خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں گلاب کا پھول اور مہاتما گاندھی دونوں ناقابلِ استعمال ہو جاتے ہیں۔ میرے محلّے میں ایک صاحب رہتے تھے، جن کے پاس پچیس کلو سونا تھا لیکن اُس بے چارے کو ایک مرض لاحق تھا۔ جونہی وہ پلنگ یا فرش پر لیٹتا، اُس کے جسم سے چنگاریاں سی اُٹھنے لگتیں۔ وہ تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوتا اور گھومنے لگتا جس سے چنگاریاں بجھ جاتیں اور جسم شانت ہو جاتا۔ ایک دن میں نے پُوچھا ــــــــ

"بہاری لال جی! یہ آپ کو کیسا روگ لگ گیا ہے۔ آپ تو لیٹ بھی نہیں سکتے، سو بھی نہیں سکتے۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولا: "مقدّر کی بات ہے فکرؔ صاحب!"

"لیکن آپ کے پاس تو پچیس کلو سونا ہے۔ کسی کو دے دیجئے۔ شاید آپ کو نیند آنے لگے۔" لیکن بہاری لال کی بیوی بڑی ظالم تھی۔ وہ پچیس کلو سونے پر سانپ بن کر بیٹھی پھنکارا کرتی تھی ــــــ مقدّر کی بات ہے۔ کسی کے پاس سونا ہے تو نیند نہیں، کسی کے پاس نیند ہے تو سونا نہیں۔ نیند کے لئے صرف سونے کا ہونا کافی نہیں۔ پنڈت نہرو بننے کے لئے صرف گلاب کا پھول ہونا کافی نہیں جس کے پاس بکری ہے، اُس کے اندر مہاتما گاندھی غائب ہے۔ اگر مہاتما گاندھی بکری کا دودھ نہ پیتے، اگر پنڈت نہرو گلاب کا پھول نہ لگاتے تو بھی وہ نہرو اور گاندھی ہی رہتے۔ میں نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو خرّاٹے کی نیند سوتے ہیں مگر اُن کے پاس ایک گرام سونا بھی نہیں ہوتا۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو صرف گلاب کا پھول لگا کر کہتے پھرتے ہیں "مجھے پنڈت نہرو کہہ کر پکارو۔ میں تمھیں رشوت میں سونا دوں گا۔ میرے پاس پچیس کلو سونا ہے۔" لیکن آہ نیند ــــــ! وہ تو رشوت دینے سے نہیں آتی۔

لیکن ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ رشوت دے دو تو پُورے ہندوستان کو خرید کر جیب میں ڈال سکتے ہو۔

تو کیا ہندوستان سگریٹ کا ایک پیکٹ ہے جسے خرید کر جیب میں ڈالا جا سکتا ہے۔ پینتالیس کروڑ انسانوں کو کیا سگریٹ کا ایک پیکٹ بنایا جا سکتا ہے۔ پینتالیس کروڑ انسان اگر ایک جیب میں ڈال دئے جائیں تو یہ اُس جیب کا کمال ہے یا پینتالیس کروڑ انسانوں میں کوئی نقص ہے کہ اُنھوں نے سگریٹ کے پیکٹ کی طرح بازار میں فروخت ہونا قبول کر لیا؟ عیسیٰ مسیح نے کہا تھا ــــ اے انسانو! تم سب خدا کی بھیڑیں ہو۔ عیسیٰ مسیح کے پیرو اِس پیغمبرانہ فقرے کو لے اُڑے اور اُنھوں نے خدا کی بھیڑوں کو ہانکنا شروع کر دیا۔ کسی نے کمیونزم کی طرف ہانک دیا، کسی نے سوشلزم کی طرف۔ کسی نے سرمایہ داری کی طرف تو کسی نے اسلام کی طرف ــــــ اے میری بھیڑو! دائیں طرف چلو۔ اے میری بھیڑو! بائیں طرف چلو اور اے میری بھیڑو! دائیں بھی چلو اور بائیں بھی! ــــ اور بھیڑیں معصوم، سادہ اور بے زبان! اُن کے ریوڑ کے ریوڑ چلے جا رہے ہیں۔ گڈریئے انھیں ہانک رہے ہیں۔ کالے پہاڑوں کی طرف، گورے سمندروں کی طرف، سُرخ آسمانوں کی طرف۔ جو بھیڑیں چلنے سے کتراتی ہیں، گڈریئے انھیں ڈنڈے مارتے ہیں، بم مارتے ہیں، زہریلی گیسوں سے، طلائی اور نقرئی سِکّوں سے، رشوت سے، دھوکے سے، لالچ سے، بے حیائی سے، ڈھٹائی سے۔ یہ ڈھیٹ گڈریوں اور عیسیٰ کی بے بس بھیڑوں کی دُنیا ہے۔ ایک پُوری قوم کو بھوک کی دھمکی دو اور سگریٹ کے پیکٹ کی طرح جیب میں ڈال لو۔ شرم اُس وقت آتی ہے، جب کوئی گڈریا پُوری قوم کا ایک کش لگا کر پی جاتا ہے اور نشے میں لہرا کر کہتا ہے ــــــ آہا ہا۔ آج تو لُطف آگیا۔"

مگر عیسیٰ مسیح نے تو یہ نہیں کہا تھا۔ اُس پیغمبرانہ فقرے کو مسخ کیوں کر دیا گیا؟ کیا لُطف کے ایک چھوٹے سے ثانیے کی خاطر؟ شیم شیم شیم!!

تو آیئے ہم بھی ارد گرد کی چیزوں کو مسخ کر ڈالیں۔

آپ جانتے ہیں کہ اِس نیک کام کے لئے ہم کیا کریں؟ ایک گدھے کو مسخ کردیں اور اُسے وزیر بنا ڈالیں۔ ایک کافر ادا حسینہ کو سلم ایریا کی تنگ و تاریک جھونپڑی میں پھینک دیں اور پھر شاعرانہ انداز میں لہک لہک کر کہیں ——— "آہا ہا۔ یہ تو گودڑی میں لعل ہے۔" ——— سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدیں اور سول سپلائی افسر کے چپراسی کی جیب میں ٹھونس دیں۔ چپراسی آپ کو ساڑھے تین گز لمبا سلام کرے گا۔ اگر آپ چاہیں تو سول سپلائی افسر کو بھی مسخ کر سکتے ہیں۔ یعنی اُس کی جیب میں بھی سگریٹ کا ایک نہیں، پچاس پیکٹ ٹھونس سکتے ہیں۔ کیونکہ مسخ کرنے کے ریٹ الگ الگ ہیں۔ گاؤں کے چھوٹے سے مندر کا دیوتا آٹھ آنے میں مسخ کیا جا سکتا ہے، شہر کے عظیم الشان مندر کا دیوتا ایک ہزار روپے میں مسخ ہونا پسند کرتا ہے حالانکہ دیوتا وہی ہوتا ہے، گاؤں کا بھی، شہر کا بھی۔ شِو بھگوان کی مورتی پانچ آنے میں بھی مِل جاتی ہے، پانچ سو روپے میں بھی۔ شِو بھگوان کو اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فرق صرف اُن لوگوں کو پڑتا ہے جو شِو جی کو مسخ کرنے کا ریٹ طے کرتے ہیں۔ شِو جی کا مرتبہ بدلتا رہتا ہے۔ مقام بدل دو، جگہ بدل دو، مندر بدل دو، شِو جی کا مرتبہ بھی بدل جائے گا۔ کاش! میں شِو بھگوان سے پُوچھ سکتا کہ اِس ادلا بدلی کے سلسلہ میں اُس کا اپنا نقطۂ نگاہ کیا ہے؟ سُنا ہے، شِو جی اِس طرح کے اُوٹ پٹانگ سوالوں کا جواب نہیں دیتے، صرف مُسکرا دیتے ہیں اور یہ بھی سُنا ہے کہ ایک دن یہ مُسکراہٹ اچانک تانڈو ناچ میں بدل جاتی ہے اور پھر دُنیا میں تباہی آجاتی ہے۔ تخریب کا ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے اور پھر اِس رقص میں وزیر گدھوں کی طرح رینکنے لگتے ہیں۔ چپراسی اور سول سپلائی افسر کی جیب کی سگریٹوں کے پیکٹ طوفانی ہواؤں میں اُڑنے لگتے ہیں۔ سلم ایریا کی حسینہ گودڑی سے باہر کھُلی ہوا میں نکل آتی ہے اور دیوتاؤں کے چھوٹے بڑے سبھی مسخ شدہ مندر اُڑ کر سمندروں میں جا گرتے ہیں۔ مقام، جگہ، ریٹ، پُجاری ہر شئے اُلٹ پلٹ جاتی ہے، بِہ جاتی ہے، پگھل جاتی ہے، مر جاتی ہے ——— اور جب طوفان تھم جاتا ہے تو یہ دُنیا ایک معصوم بچّے کی مُسکراہٹ کی طرح شفاف اور نرمل ہو جاتی ہے۔

یہ تانڈو ناچ کب شروع ہوگا؟ میں نہیں جانتا۔ آیئے، شِو بھگوان تک صحیح صحیح رپورٹ پہنچا دیں کہ ہم تیری ہر شئے مسخ کر چکے ہیں۔ ناچ میں دیر کیوں ہے؟

ابھی ابھی چند منٹ پہلے ایک ادھیڑ عمر عورت میرے پاس آئی تھی۔ ہونٹوں کے خم بتا رہے تھے کہ کسی زمانہ میں قیامت ہوگی لیکن اب اُس کا خاوند اُسے چھوڑ کر کہیں بھاگ گیا تھا۔ "ہم نے لَو میرج کی تھی۔" اُس نے میرے میز پوش پر آنسو گراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا تم دونوں کی "لَو" ایک فراڈ تھی؟ دو جسموں کی پُراسرار پکار! اور کیا جسم کی پکار بھی فراڈ ہوتی ہے۔ محبت اپنا گھر چھوڑ کر بھاگ کیوں جاتی ہے؟ شاید محبت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ چار بچّے، کچھ قرضہ اور کچھ تلخ و شیریں یادیں چھوڑ کر محبت بھاگ گئی۔ محبت سے زیادہ مشکوک چیز دُنیا میں اور کوئی نہیں۔ میں نے تو صرف اتنا سُن رکھا تھا کہ حُسن چند روزہ ہوتا ہے۔ گلابی ہونٹ، غزالی آنکھیں، سُرخ رخسار، بھری بھری پنڈلیاں، گوری چٹّی سڈول کلائیاں ——— ایک ہفتہ، ایک مہینہ، چند سال! چند بچے اور پھر حُسن اپنی لاش کندھے پر اُٹھائے ڈینٹسٹ کے کلینک میں پہنچ جاتا ہے۔ عینکوں کا ڈاکٹر حسینہ کی غزالی آنکھوں پر فریم لگا کر کہتا ہے "سامنے دیوار پر لگے ہوئے چارٹ کو پڑھو۔ کیا نظر آتا ہے ——— اے، بی، سی ———" ارے بیٹا! میری پنڈلیوں میں سکت نہیں رہی۔ مجھے ذرا سہارا دے کر تانگے پر بٹھا لو۔ کیا اِنہی پنڈلیوں نے "لَو میرج" کی تھی؟ کیا یہ وہی سانسیں ہیں جو عاشق کی چاپ سُن کر دھونکنی کی طرح چلنے لگتی تھیں اور اب دمے کی وجہ سے دھونکنی کی طرح چل رہی ہیں۔ عاشق بھاگ گیا ہے، عشق کو زوال آگیا ہے، حُسن کا زوال عشق کا بھی زوال ہے۔ گلابی ہونٹوں کے مُرجھاتے ہی پُورا گلستان مُرجھا گیا ہے اور ادھیڑ عمر عورت کہہ رہی ہے ——— "بیٹا! اخبار میں اشتہار دے دو تاکہ میرا خاوند گھر آجائے۔" ——— چھوڑو بھی اے ادھیڑ عمر حُسن! مرے ہوئے عشق کو قبر سے اُٹھا کر دوبارہ کیوں لانا چاہتی ہو۔ دو روٹیاں کھاؤ، پانی کا گلاس پیو اور باقی زندگی گزار دو اور اگر خدا توفیق دے تو بقیہ زندگی کا کچھ حصہ یادِ خدا میں بھی گزار سکتی ہو کیونکہ محبت کا انجام یادِ خدا ہے ———"

شاید خدا نے شوہر کو بھگا دیا تاکہ کوئی یادِ خدا کر سکے اور خدا یقیناً اُس اشتہار کو پڑھ کر ہنسے گا جو گم شدہ شوہر کی تلاش میں دیا جائے گا۔

لیکن خدا کی ہنسی کی کون پروا کرتا ہے؟ انسان خدا سے زیادہ ذہین ہو گیا ہے۔ صرف انسان کو ہی یہ معلوم ہوا ہے کہ خدا کی پرابلم اور ہیں، انسان کی اور۔ اِس لئے وہ اپنی پرابلم کو حل کرنے کے لئے برابر اشتہار دئے جا رہا ہے۔ شوہر گُم ہو جائے تو اشتہار دو، زہر بیچنا ہو تو اشتہار دو ——— "ہمارا زہر تیر بہدف ہے۔ موت نہ آئے تو قیمت واپس" ——— ایک حسین لڑکی نے اشتہار دیا کہ مجھے ایک ایسے جیون ساتھی کی ضرورت ہے جو میری گالیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہو۔ ایک تند مزاج افسر کو ایک شریف بھلے مانس "دبّو" سٹینو گرافر کی ضرورت ہے۔ ایک صاحب کی بھینس رسّہ توڑ کر بھاگ گئی تو مالک نے اخبار میں اشتہار دے دیا کہ

جو آدمی میری بھینس کو زندہ یا مُردہ کسی بھی حالت میں پکڑ کر لائے گا' میں اُسے آدھی بھینس دے دوں گا اور اگر بھینس خود یہ اشتہار پڑھے تو از راہ نوازش خود گھر لوٹ آئے۔ اُس کی ساری خطائیں معاف کر دی جائیں گی اور اُس کی سب منشا جاری دیا جائے گا۔ اُس کے دودھ میں ملاوٹ بند کر دی جائے گی۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، اگر اشتہار صرف پچاس فیصدی جھوٹ بولا کریں تو ہندوستان کے پچاس فیصدی غم کافور ہو جائیں اور کوئی بھینس رسہ تڑا کر گھر سے نہ بھاگے۔ سارا تماشا ہی اس جھوٹی زندگی کا ہے۔ بھینس مالک کے جھوٹ سے دُکھی ہے، گاہک خریدار کے جھوٹ سے دُکھی ہے، جنتا لیڈر کے جھوٹ سے دُکھی ہے، عاشق اپنی محبوبہ کے جھوٹ سے دُکھی ہے۔ بھینس کو داد دینی چاہئے کہ وہ اپنے دودھ میں ملاوٹ کے خلاف پروٹسٹ کرتے ہوئے بھاگ گئی۔ اگر ہندوستان بھر کی ساری بھینسیں انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر بغاوت کر دیں کہ ملاوٹ بند نہ کی گئی تو ہم دودھ دینا بند کر دیں گی تو مسٹر کامراج کی زبانی جمع خرچ کے باوجود ہندوستان میں سوشلزم آ جائے گا ـــــ تو کیا اب سوشلزم بھینسوں کی مدد سے آئے گا؟ شاید! شاید! ـــــ کیونکہ انسان کا ذہن کرپٹ ہے، بھینس کا ذہن کرپٹ نہیں ہے۔

کاش! کوئی امریکی ماہر حیوانات ہندوستان میں آتا اور ہماری پسماندگی دُور کرنے کے لئے ہماری بھینسوں کو کرپٹ کر دیتا۔ انڈو امریکی کلچرل تعلقات کو بہتر بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہماری بھینسوں کو "امریکن وے آف لائف" سکھایا جائے اور اگر امریکہ چوک گیا تو مجھے خطرہ ہے کہ امریکی ساہوکار ہماری امداد بند کر دے گا۔ اُس کے اندر انسانیت مر جائے گی اور ہمیں مجبور ہو کر اپنے روپے کی "ڈی ویلیوشن" کرنی پڑے گی۔

بھینس کو "انٹرنیشنل کمیونسٹ مینی فیسٹو" پڑھنے سے روکنا چاہئے۔ ورنہ ایشیا میں ڈیموکریسی خطرہ میں پڑ جائے گی اور سارا ایشیا ایک بہت بڑا ویت نام بن جائے گا اور ایشیا کی تمام بُدھ بھکشو عورتیں زندہ آگ میں جل مریں گی۔ اِس لئے بھینس کو چاہئے کہ وہ گھر لوٹ آئے اور پارلیمنٹری ڈیموکریسی کے تحت دودھ میں ملاوٹ اور چارے کی کمی کو چُپ چاپ برداشت کرتی رہے۔ انسان برداشت کر لیتے ہیں تو کیا بھینس نہیں کر سکتی؟

اب برداشت کی بات چلی ہے تو آؤ کچھ اُوٹ پٹانگ باتیں اور کر لیں۔

کل میں نے ایک کوا دیکھا جو ایک بچے کے ہاتھ سے بسکٹ چھین کر اُڑ گیا بچہ چیخنے چلانے لگا۔ بچہ اگر کوا ہوتا تو اُس کا تعاقب کرتا اور کوے کو قتل کر کے اپنا بسکٹ چھین کر لاتا لیکن بچہ صرف ایک بسکٹ کی خاطر کوا نہیں بن سکتا تھا۔ اِس لئے وہ رو دھو کر چُپ ہو رہا ـــــ سوال برتری کا ہے، طاقت کا ہے۔ جس کے پاس زیادہ طاقت ہے، وہ اُس سے کم طاقت والے کا بسکٹ چھین کر بھاگ جاتا ہے۔ اور کم طاقت والا بچہ زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے، دو چار آنسو بہا سکتا ہے۔ شاید خدا نے انسان کو آنسو اسی لئے عطا کئے تھے کہ جب اُس پر ظلم ہو تو آنسو بہا سکے۔ خدا نے کوئی چیز بے مصرف نہیں بنائی۔ ایسا شاستروں میں لکھا ہے اور شاستر اگر سچ نہیں بول سکتے تو جھوٹ کہاں بول سکتے ہوں گے۔

مجھے آج تک وہ آدمی نہیں بھولتا جو شہر کے بھرے چوک میں کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا ـــــ "کاہے نیر بہاوے؟" وہ بولا: "میرے پاس ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ ایک دن ایک بڑے ہوٹل والا آیا اور اُس نے میرا چھوٹا ہوٹل خرید کر وہاں اپنا بڑا ہوٹل بنا لیا۔"

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے کامریڈ!" میں نے اُسے تسلی دی۔ "وہ بڑی مچھلی تھی۔ تم چھوٹی مچھلی تھے۔ وہ تمھیں کھا گئی۔ تم بھی اب اپنے سے کوئی چھوٹی مچھلی تلاش کرو اور اُسے کھا جاؤ۔"

ایک ہفتہ بعد میں نے دیکھا کہ وہ ایک نئے ہوٹل کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ مجھے وہ دھوکا نہیں دے سکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے یہاں ایک چھوٹا سا ٹی سٹال تھا، جسے یہ نئے ہوٹل والا کھا گیا۔

اور وہ کوا بھی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ جب وہ بچے سے بسکٹ چھین کر بھاگا تو ایک چیل نے جھپٹا مار کر اُس سے وہ بسکٹ چھین لیا اور پھر بچہ اور کوا دونوں بیک وقت رو رہے تھے۔ ایک کوے کو رو رہا تھا، دوسرا چیل کو۔

افسانہ

آنکھیں

عظیم اقبال۔ ایم، اے

گنج ۱، بتیا (بہار)

۱۱/اپریل ۶۹ء — محترم بھائی! سلام و نیاز

میری بیشتر کہانیاں واحد متکلم کے ذریعہ بیان ہوتی ہیں، اسی لئے شدت احساس اُن کا سب سے بڑا وصف ہے۔ زیرِ نظر افسانہ سماجی زنجیروں کی داستان ہے۔ مجھے اُمید ہے، میرا یہ تجربہ بھی آپ ضرور پسند کریں گے۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں... خلوص آگیں ——— عظیم اقبال

باتیں تھیں یا سیلاب آسا جذبات کی لہریں ———!!

اپنے حواس میں سنبھال نہ سکا۔ اِن تند و تیز موجوں نے اپنے اندر مجھے بھی سمیٹ لیا۔ پھر میں نے شفقت آلود ہاتھوں سے زیبا کے سر پر تھپکی دی لیکن وہ سسک پڑی۔ اُس کی آنکھوں سے موتیوں کے آبشار اُبل پڑے تھے۔ اپنے دل کا درد چُھپاتے ہوئے بہت نرمی کے ساتھ میں نے سرگوشی کی۔

"رونے سے کیا حاصل؟ چُپ بھی ہو جاؤ زیبا! بہادر لڑکی ہو نا؟ دوسروں ہی کے لئے سہی! اپنے آنسوؤں کو روک لو۔"

سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہوئیں، دھڑکنیں تیز ہوئیں، مدّھم ہوئیں، فضا کی تمام تر خاموشی ہمارے گرد سمٹتی چلی گئی ———

سنّاٹے میں بھی کچھ آوازوں کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ تاریکی میں بھی میری بینائی عود کر آئی ہے۔ میں سُن رہا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں۔ میں سُن رہا ہوں، یہ روتی بلکتی آوازیں۔ میں دیکھ رہا ہوں، یہ زرد کُمھلائے ہوئے چہرے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، ذہن کی بیکراں اُلجھنوں کو۔

میرے ہوسٹل سے کچھ دُور ایک خوبصورت بنگلہ ہے۔ اُس میں رہنے والے لوگ بھی خوش وضع ہیں۔ پھول سے چہرے اور موم جیسے دل والے لوگ! اُنھیں میں چھ سال کا ایک معصوم بچّہ بھی ہے۔ مجید! اِس شہر میں وہ میرا پہلا دوست ہے۔ نہ جانے کون سے مبارک لمحہ میں اُس سے میری جان پہچان ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ہنستے ہوئے میرا بچپن لوٹ آتا ہے۔ اُس کی شرارتوں میں میرے جیسے دلوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ میں نے اُس کے کئی اسکیچ تیار کئے ہیں۔ مجید میری ہی طرح آرٹسٹ بننا چاہتا ہے۔

کہتا ہے ———

"اعجاز بھائی! میرا نام بھی آرٹ اسکول میں لکھا دو نا۔ میں بھی تمھارے ساتھ پڑھوں گا۔"

"تم ابھی بہت چھوٹے ہو دوست! ذرا کھا پی کر میری ہی طرح جوان بن جاؤ، مونچھیں نکل آئیں، تب آرٹ اسکول میں چلے جانا۔"

"آرٹسٹ بن کر سب سے پہلے اپنی آپا کی تصویر بناؤں گا۔ پھر باجی کی، تب امّی کی، بھیا کی اور تمھاری بھی۔"

"ابّا کی نہیں ———؟"

"نہیں، کبھی نہیں! وہ بہت بُرے آدمی ہیں۔ ہمیں بہت مارتے ہیں۔ ہم سے پیار نہیں کرتے۔"

"اوہ!"

میرے ذہن میں پنسل کی کچھ لکیریں اُبھرتی ہیں۔ یہ مہیب شکل کے دیوؤں کی تصویریں ہیں اور یہ کچھ سہمے ہوئے معصوم صورت انسانوں کے خد و خال ہیں۔ آڑے ترچھے خطوط کی دُنیا سے گزرتے ہوئے میرا تجسّس، میرا خلوص مجید کو میرے بہت قریب کر دیتا ہے۔ اُس کی ماں مجھے مجید ہی کی طرح عزیز رکھتی ہے، مجھے بے حد چاہتی ہے۔ وہ بھی عجیب عورت ہے۔ میرے سامنے اُس نے اپنے ماضی کے صفحے پلٹ دئے۔ حال کی کہانیاں

سُنا ڈالیں۔ نصف درجن بچوں کی اُس ماں نے زندگی کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔ چوک کی مشہور رقاصہ جس کی آواز، جسم اور اداؤں کا سارا شہر رسیا تھا۔ آخر کار انجینئر رفیق احمد کے مقدر کا نگینہ بن کر جگمگا اٹھی۔ تب سے اُس کی نگاہیں چلمن کی اوٹ سے باہر نہ پھسلیں۔ دل شوہر اور بچوں کی محبت کے سوا کچھ نہ محسوس کر سکا۔ ذہن نے کبھی فرائض سے منہ نہ موڑا لیکن مرد ذات کا کیا بھروسہ؟ آنکھ جھپکتے ہی اُس کی نظریں بدل جاتی ہیں اور وہ جو حسن کو گلی گلی تلاش کرتا پھرے، کب چین کی سانس لیتا ہے۔ اُس کے لئے عورت ایک خوشنما پھول ہے۔ پھول میں جب تک شگفتگی ہو، خوشبو ہو، اُسے وہ گلے کا ہار بنا سکتا ہے۔ پژمردہ پھول قدموں تلے روند ڈالے جاتے ہیں اور تروتازہ پھولوں کی جانب ہاتھ ہمیشہ لپکتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں انجینئر رفیق احمد کو اس بات کا احساس ہو تو کیسے کہ زیبا اب سیانی ہو گئی اور ذکیہ بھی دو چار موسم بدلتے بدلتے پرانے کپڑوں میں کسمسانے لگے گی۔

زیبا نے اپنے اِردگرد کی فضا میں گھٹن سی محسوس کی ہے۔ اُسے اپنی ماں کی پریشانیوں اور باپ کے لااُبالی پن کا شدید احساس ہے۔ وہ جانتی ہے، اُس کی دُنیا کتنی محدود، کتنی مختصر ہے۔ اُس گھر کی چہار دیواری کے باہر اُس کے لئے نہ کوئی ٹھکانا ہے، نہ رشتہ دار، نہ کوئی ہمدرد ہے، نہ غم گسار — تعلیم و تربیت نے اُسے اور بھی حساس بنا دیا ہے۔ ہمیشہ سوچ میں ڈوبی رہتی ہے، کتابوں میں کھوئی رہتی ہے۔ اُسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خوشی کی کوئی بھولی بھٹکی کرن بھی اُسے کبھی میسّر نہ آئی — زیبا کی ماں ایک ایسی عورت ہے جس نے ہمیشہ مستقبل پر یقین کیا ہے لیکن انجینئر رفیق احمد کے لئے حال کی خوشیاں ہی پیاری ہیں۔

زیبا کی ماں نے سسکتے ہوئے مجھ سے کہا ہے — بہت کچھ، بہت سی باتیں! کہاں تک اُن کے بارے میں سوچوں لیکن ایک بات، صرف ایک جملہ ایسا بھی ہے، جس نے مجھے تڑپا دیا ہے۔

"کس سے ہوگی زیبا کی شادی، کون اِسے گلے سے لگائے گا؟ طوائف کی بیٹی طوائف بن جائے گی۔"

ایک ماں اپنی بیٹی کے لئے یہ بھی کہہ سکتی ہے . . . یہ بھی . . . یہ بھی —

گھنٹوں بیت گئے لیکن میرے اسکیچ بک پر کوئی تصویر نہیں اُبھری ہے۔ صرف لکیریں ہیں، گڈمڈ لکیریں، موٹی پتلی لکیریں — تھک ہار کر میں نے آنکھیں مُوند لی ہیں۔ سکون کی کچھ سانسیں تو لے لوں۔

زیبا کا شاداب چہرہ پژمردہ ہو رہا ہے۔ اُس کی کنول جیسی آنکھیں بیمار معلوم ہو رہی ہیں۔ اُس کے شاداب ہونٹوں کی صبا خشک ہونے لگی ہے۔ ہر گھڑی اُداس اُداس، بُجھی بُجھی، سمٹی سمٹی یہ زیبا آرزوؤں کی چتا پر سُلگ رہی ہے —!!

یہ ظلم ہے، یہ قتل ہے، یہ خودکشی ہے!!

زیبا کی بانہوں کو میں نے تھام لیا ہے۔ اُسے اِس گھٹن میں دم توڑتے ہوئے ...ں نہیں دیکھ سکتا۔

یہ میرے دل کی صدا ہے ——......

آؤ زیبا ہم ایک خواب دیکھیں۔ آؤ عہد کریں ایک ایسے دَور کے آغاز کے لئے ...جدوجہد کریں گے جس میں اُجالوں کی حکمرانی ہوگی۔ جہاں ہر چہرہ شادماں ہوگا، ... پیار کے گیت گائے گا۔ ہر سانس سے محبت کی خوشبو پھیلے گی، ہر راہ میں تقدیر ... کھلیں گے۔ میں تمہارے دوش بدوش ہوں۔ جہاں تمہارے قدم ڈگمگانے ... میں تمہیں سنبھال لوں گا۔ جب تمہاری آنکھیں نم ہونے لگیں گی، میری ... اس نمی کو جذب کر لیں گی، جب تمہارے ہونٹ خشک ہونے لگیں گے، میرے ... تمہیں سیراب کر دیں گے۔ جب تمہاری آواز کا سحر معدوم ہونے لگے گا، میں ... پیکر میں ایک نئی روح پھونک دوں گا۔ جب تم تھک کر چُور ہو جاؤ گی، میری ... تمہیں تھام لیں گی۔ میری آغوش میں تمہارا پژمردہ جسم ہوگا اور میرے آہنی ... تمہارے جسم کو پھر تازہ دم کر دیں گے۔

یہ میری روح کی پکار ہے ——

تمہاری آنکھوں میں غم کے آنسو دیکھ کر میں کانپ جاتا ہوں۔ مجھے ...ہٹ تم کتنی سمجھدار ہو۔ تم اپنے غموں کی آنچ سے دوسروں کو بچانا چاہتی ہو۔ چاہتی ... مصائب کے شعلوں میں جل بھُن کر تم اکیلی تباہ و برباد ہو جاؤ۔ تم اپنی فکروں کو ...ظاہر نہیں کرتیں۔ اندر ہی اندر جلتی رہتی ہو، سُلگتی رہتی ہو۔ میں تمہارے جذبات ...قدر کرتا ہوں۔ میری بھی کچھ یہی فطرت ہے لیکن دیکھو، مجھے غیر نہ سمجھو۔ اپنے دل کی ... مجھ سے کہہ دیا کرو، اپنے اندیشوں کو مجھ پر ظاہر کر دیا کرو۔ میری ہمدردی اور ...بت کے چند جملے تمہاری دُکھی روح کو سکون دیں گے۔ جب تم روتی ہو تو یہ ...ٹپکتے ہوئے آنسو صرف تمہارے نہیں ہوتے۔ اِن میں میرا بھی حصّہ ہوتا ہے۔ تم مانو ...نہ مانو لیکن حقیقت تمہیں بتاتا ہوں۔ تم جب بھی اُداس ہوتی ہو، میں بھی اُداس ...ہو جاتا ہوں۔ تم جب بھی پریشان ہوتی ہو، میرا دل بھی مضمحل ہو جاتا ہے۔ تم جب بھی ...مند ہوتی ہو، غم و اندوہ کی پرچھائیاں مجھے بھی اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔

یہ میرے تجربے ہیں ——

جب تمہاری ہتھیلی میرے ہاتھوں میں ہوتی ہے، تم اندازہ نہیں کر سکتیں ...ن لمحہ کی خوشی کا۔ مجھے خود اُس کا اندازہ نہیں۔ نرم، گداز، گلابی ہتھیلی مجھے کس قدر ...حت بخشتی ہے۔ تم کیا جانو اُس جذبہ کو۔ تم تو چند لمحوں میں گھبرا جاتی ہو۔ بے چین ...ہو جاتی ہو۔ اپنی ہتھیلی بے رحمی سے چھڑا لیتی ہو اور میری سانس رُکنے لگتی ہے۔

دل ڈوبنے لگتا ہے، خواہشیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ میں بے قرار ہو جاتا ہوں۔ تم کتنی سنگدل ہو۔ کم سے کم اِس خوشی کو تو مجھ سے نہ چھینا کرو۔ کیا جاتا ہے تمہارا۔ صرف تمہارے ہاتھوں کے لمس چُرا پاتا ہوں۔ تمہارے جسم کی حرارت ہی تو مجھے مِل پاتی ہے۔ کیا تم میری خوشی کے لئے اپنی ہتھیلی کو میرے ہاتھوں میں تھوڑی دیر کے لئے نہیں چھوڑ سکتیں۔ میرے اُبلتے جذبات کو سمجھو تو ذرا۔ یہ تمہارے ہاتھوں کی حرارت جو مجھے ملتی ہے، میرے کتنے ہی سوئے ہوئے جذبوں کو بیدار کر دیتی ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے، میری تنہائی کا کوئی ساتھی تو ہے۔ میرے دُکھوں کا کوئی سمجھنے والا تو ہے۔ میرے لمحوں کا کوئی شریک تو ہے۔ کیا تم مجھے اب بھی غیر سمجھتی ہو؟

تمہاری ادائیں بھی نرالی ہیں۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے، تم میرے بہت قریب آگئیں۔ میرے اور تمہارے درمیان کی ساری حدیں مسمار ہو گئیں۔ کوئی شیشے کی دیوار بھی ہمارے درمیان حائل نہیں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے، ہم تم بالکل غیر ہیں۔ تم نگاہیں جھکا لیتی ہو، لب سی لیتی ہو۔ سانسیں روک لیتی ہو۔ تم بالکل پتھر کی مورتی بن کر رہ جاتی ہو۔ میں اپنا سر ٹکراتا ہوں۔ تمہاری بے حسی سے، تمہاری اجنبیت سے، میرے احساسات پر ضرب لگتی ہے۔ میں چیختا رہ جاتا ہوں لیکن تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی جو تم رُوٹھ جاتی ہو تو تمہیں منانے میں بہت لطف آتا ہے۔ تمہارے رُوٹھنے کا انداز بھی تو عجیب ہے۔ ابھی ہنس رہی ہو، ابھی رنگینیاں بکھیر رہی ہو، ابھی لطافتیں لُٹا رہی ہو اور ابھی تمہارے چہرہ کا رنگ بدلنے لگا۔ رخساروں کے گلاب پر ہتھیلیوں کے سائے پڑ گئے۔ چہرہ ڈھانپ لیا۔ نگاہیں جھکا لیں۔ سر زمین کی طرف جھکنے لگا۔ ابھی ابھی جہاں تبسّم کی لکیریں روشن تھیں، وہیں غصّہ کے بادل منڈلانے لگے۔ اِس طرح تمہیں دیکھ کر میں سہم سہم جاتا ہوں۔ کتنے پیار سے تمہیں منانے کا جتن کرتا ہوں۔

"رُوٹھ گئیں۔ اوہ! بُرا مان گئیں ... ناراض ہو گئیں کیا؟ ارے من بھی جائیے۔ دیکھئے میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اُٹھ کر چلا جاؤں گا۔ ذرا ہاتھ تو ہٹائیے۔ سر اُٹھا دیجئے۔ دیکھئے دیکھئے، آپ تو رونے لگیں۔"

اور یکایک تمہارے چہرے پر رونق آجاتی ہے۔

آج میں خوشی سے پاگل ہو اُٹھا۔ تمہارے ایک جُملہ نے میرے اوپر عجیب کیفیت طاری کر دی۔ تمہارا وہ جُملہ ساری زندگی کے پیار سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا تھا۔ شاید کچھ پوچھا تھا، تم نے کہا "تمہیں بتاؤں گی۔"

بظاہر یہ جُملہ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ اِس میں کوئی کشش نہیں لیکن تمہارے انکار میں بھی کتنی دلربائی تھی۔ کیسی پُراسرار ہلکی ہلکی ہنسی کھیل رہی تھی،

تمھارے لبوں پر۔ تمھیں کیا بتاؤں، مجھ پر تو نشہ سا چھا گیا۔ جی میں آیا تمھیں اپنی بانہوں میں لے لوں اور . . . اور . . . !

جب تم ہنستی ہو تو ساری کائنات والہانہ انداز میں رقص کرنے لگتی ہے۔ سوچتا ہوں، فرشتے بھی تمھاری ہنسی کے سحر میں کھو جاتے ہوں گے کبھی ہنستے ہوئے آئینہ دیکھا ہے؟ اگر نہیں تو ذرا میری آنکھوں میں جھانک کر اپنی مسکراہٹ کا عکس تو دیکھ لو کتنی حسین ہو تم!! کس دیش کی تم شہزادی ہو؟

تمھارے تبسم کے پھول جب کھلنے لگتے ہیں تو جی میں آتا ہے، اپنا دامن پھیلا دوں۔ ایک ایک کر کے تمھارے ان پھولوں کو سمیٹ لوں، پھر ایک خوبصورت مالا تیار کر دوں، جس میں میری آرزوؤں کی کلیاں بھی گوندھ دی جائیں - یہ مالا، پھولوں اور کلیوں کا یہ ہار تمھاری زلف میں سجا دوں، تمھیں سامنے بٹھاؤں۔ تمھاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ماضی کو بھول جاؤں، حال سے آنکھیں پھیر لوں، صرف مستقبل کا ایک خاکہ ہو میرے ذہن میں ——— ایک روشن، دلکش، تابناک، قابلِ رشک مستقبل کا نقش! ہماری منزل کے راستے ایک ہوں، تم میرا ہاتھ تھام لو میں تمھیں سنبھال لوں۔ ہم آگے بڑھتے جائیں۔ ایک نئی دُنیا کی کھوج کریں۔ ایک نئے دَور کا آغاز کریں۔ ایک نئے فردوس کی تعمیر کریں۔

میں تمھاری ہنسی میں اپنی خوشی ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم میری بانہوں تلے اپنا مقام بنا لو۔ میرا دل، میرا ذہن، میرے جذبات صرف تمھارے لئے ہیں، میری یادیں، میرے خواب صرف تمھاری جستجو میں ہیں۔ میرے ارمان، میرے سپنے صرف تمھیں پانے کے لئے ہیں۔ بولو، میرا ساتھ دو گی۔

تمھیں محبت کے نام سے چڑ ہے۔ تم سوچتی ہو یہ بے بنیاد ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ——— زیبا! محبت ایک بلند احساس ہے۔ ایک مقدس احساس! محبت ایک جذبہ ہے، ایک لطیف جذبہ۔ محبت آگ ہے۔ دہکتی ہوئی آگ ——— یہ ایک شعلہ ہے۔ بھڑکتا ہوا شعلہ! اس میں شبنم کے قطروں کی تازگی ہے، نمی ہے، محبت روشنی کی چمکتی دمکتی لکیر ہے۔ محبت سکون ہے، دائمی سکون۔ محبت اطمینان ہے، ایک ایسا اطمینان جس سے ہم کنار ہو کر انسان کچھ اور پانا نہیں چاہتا۔ محبت کے نقوش زمانے کے ماتھے پر امٹ بن کر رہ جاتے ہیں۔ محبت کی پرچھائیاں کبھی معدوم نہیں ہوتیں، محبت کی روشنی کبھی مدھم نہیں ہوتی۔ محبت کی خوشبو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ محبت کی آنچ کبھی سرد نہیں ہوتی۔ محبت کے شعلے کبھی نہیں بجھتے۔ محبت کا چراغ کبھی گل نہیں ہوتا۔ محبت کا سمندر کبھی خاموش نہیں ہوتا۔ محبت کی موجیں کبھی ساکت نہیں ہوتیں۔ محبت کے ولولے کبھی سرد نہیں ہوتے۔ محبت میں حرکت ہے، طاقت ہے، زندگی ہے۔ محبت ایک ہمہ گیر حقیقت ہے ———!!

تم کہتی ہو، محبت کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر دُنیا میں ازل سے محبت کے جو نغمے گونج رہے ہیں ان کا وجود کیسے ہوا؟ دُنیا میں محبت کی جو کہانیاں بکھری پڑی ہیں، ان کی داغ بیل کس نے ڈالی۔ دُنیا میں محبت کی لطافتوں نے جو گُل کھلائے ہیں، جو خوشیاں عام کی ہیں، کیا ان سب حقیقتوں سے تمھیں انکار ہے؟ کہہ دو کہ تمھارے دل میں جو یہ میٹھی میٹھی آنچ تمھارے وجود کو پگھلا رہی ہے، یہ بے بنیاد ہے۔ کہہ دو کہ میرے دل و دماغ پر سکون و اطمینان نے جو خوشبوئیں عام کی ہیں اُن کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔ یہ بھی کہہ دو کہ ہمارے دلوں کے دروازے پر کسی اَن دیکھی قوت نے پیار کی جو دستک دی ہے، یہ سب دھوکا ہے، یہ سب فریب ہے!!

مجھے کہہ لینے دو کہ دُنیا میں اگر محبت کا وجود نہ ہوتا تو یہ ساری رنگینیاں، ساری چہل پہل جو تم دیکھ رہی ہو، کچھ بھی نہ ہوتی۔ پھول کھلتے لیکن اُن کی مہک کبھی ہواؤں کے دوش پر نہ لہراتی۔ راتوں کو چاندنی چھٹکتی لیکن دلوں کے تار پر گیت کبھی نہیں بجتے۔ تم ہنستیں لیکن میرے دل میں یہ ٹیس نہ اُٹھتی۔ تم روتیں لیکن میں بے قرار نہ ہوتا، میں تڑپ نہ اُٹھتا۔ یہ سب محبت کا سحر ہے۔

میری باتوں کو تم مانو نہ مانو لیکن مجھے غلط تو نہ سمجھو۔ فریبی اور مکار تو نہ جانو۔ میں نہیں کہتا۔ جو کہتا ہوں وہ پتھر کی لکیر ہے۔ میں نہیں کہتا، آنکھیں مُوند کر مجھے اپنا سب کچھ سمجھ لو۔ میں یہ سب کچھ نہیں کہتا، یہ سب کچھ نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ میری باتوں میں خلوص ہے، سچائی ہے، محبت ہے، اصلیت ہے، دکھاوا نہیں۔ دل کی آواز ہے۔ میں ظاہر میں جو ہوں، میرا باطن اُس سے کچھ زیادہ الگ نہیں۔ میں وہی ہوں جو کہتا ہوں۔ میں وہی ہوں جو تم دیکھتی ہو—— !!

میں دیکھ رہا ہوں، میں سُن رہا ہوں —— میں دیکھ رہا ہوں، کچھ ہنستے مُسکراتے چہرے۔ میں سُن رہا ہوں دلوں کے ساز پر بجتے ہوئے دلولہ خیز نغمے میں محسوس کر رہا ہوں بہاروں کی شگفتگی، پیار کے لمس، محبت کے اشارے نگاہوں کی چمک، سانسوں کی مہک، روحوں کی سرشاری، دلوں کا قرار، قلب کا سکون —— !!

فضا کی یہ دلفریب انگڑائی!

میرے اسکیچ بُک میں بے شمار تصویریں اُبھر چکی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت، دلکش، دلگیر، جاوداں —— !!

لیکن یہ اندھیروں کے بادل کہاں سے اُمڈ پڑے۔ تاریکی کے یہ غبار، یہ آہنی زنجیریں، یہ نڈھال چہرے، یہ اُداس ماحول۔ یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں —— میری بہنیں، میرے بھائی۔ میری آبرو، میرا وقار —— ان سب کا وقار، انسانیت کی عظمت، ان سب کا سماجی رُتبہ، رشتے، مستقبل —— میرے بغیر سُنسان، ویران، ویران —— !!

میں دَوڑ رہا ہوں، میں بھاگ رہا ہوں۔ میرا دم پھُول رہا ہے۔ سانسوں کا یہ زیر و بم —— اُف! دھڑکنوں کا یہ طوفان!!

اور یہ دو آنکھیں —— !!

یہ آنکھیں ہمیشہ مجھے گھُورتی رہتی ہیں۔ چاروں طرف آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ خندہ زن آنکھیں، اشک ریز آنکھیں، طنز آمیز آنکھیں، شکوہ انگیز آنکھیں۔ کوئی بچائے مجھے اِن آنکھوں کی کشش سے۔ یہ ہزاروں اُنگلیاں جو میری جانب اُٹھ رہی ہیں، مجھے اِن سے بہت خوف معلوم ہوتا ہے!!

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶" لکھنا کافی ہے۔ منیجر

افسانہ نمبر دیکھا

اہل قلم حضرات کی رائیں

. . . بے اختیار دل سے واہ واہ نکل گئی۔ ہر کام کو سلیقے سے کرنا کچھ آپ ہی کا حصّہ ہے . . .
کرشن چندر (بمبئی)

◆

. . آپ نے روایتِ خوشترگرامی کو برابر قائم رکھا۔ خوب سے خوب تر کی وہ روایت جو اب اُردو ادب اور صحافت میں ایک ضرب المثل بن گئی ہے۔ ہر افسانہ ایک نگینہ ہے، ہر غزل ایک ہیرا ہے، ہر صفحے سے حُسنِ ترتیب اور وقار جھلکتا ہے۔ آپ کی بھرپور شخصیت کی چھاپ ہر سطر میں نمایاں ہے . . .
پُشکر ناتھ (جموں)

◆

. . . حسبِ معمول تسکینِ قلب و نظر کا سبب بنا۔ واللہ! اسے خامے کی چیز بنانے میں آپ نے جس محنتِ شاقّہ سے کام لیا ہے، اُس کی داد نہ دینا ظلمِ صریح کے مترادف ہوگا۔ نظم و نثر کا ہر گوشہ اپنی جگہ خوب سے خوب تر کی مُنہ بولتی تفسیر ہے . . .
رازؔ یوسفی (لاہور)

◆

. . . افسانہ نمبر رنگ و نور، کیف و سُرور کی ایک دُنیا ہے! ان حالات میں ایسا نمبر پیش کرنا آپ کے عزمِ جواں کا عظیم کارنامہ ہے! خدا کرے اسی طرح ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں! کہنا ہوا" بیسویں صدی" بلندیوں کی طرف بڑھتا ہے، بڑھتا چلے . . .
آسی رام نگری (مغاسرائے)

◆

. . . اِس بار پھر" بیسویں صدی" کے افسانہ نمبر نے اُردو ادب کی دُنیا میں ایک دُھوم مچا دی ہے۔ اِس میں شامل ہونے والی کس کس تخلیق کی تعریف کی جائے کیونکہ کسی ایک کی تعریف کرکے تعریف محدود ہو جائے گی۔ مضامین سب ہی بلند پایہ اور معیاری ہیں . . .
نفیس نجمی امروہوی (امروہہ)

◆

. . . آفریں! آپ کی ہمتِ عظمٰی پر۔ آپ نے اِس عہد میں دو دُلھنیں سجائیں! دو دُلھنوں کی مشاطہ گری کی! پیاری بہن عزیزہ کنول اور غیر فانی شاہکار افسانہ نمبر!! کس کس کی تعریف کیجئے۔ کون کون سے شہ پاروں کو سراہئے! ہر سطر آپ کے ارفع ذوق اور ہر ورق آپ کی ژرف نگاہی کا آئینہ دار ہے! . . .
عفت موہانی (حیدر آباد)

◆

. . . افسانہ نمبر اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس اُردو کُش دَور میں آپ عزم کی ایک شمع جلائے ہوئے ہیں۔ کاش مخالفینِ اُردو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھتے کہ اُن کی نشو و نما اور تہذیب و تمدن پر اُردو کا کتنا احسان ہے . . .
تہری پرتاب گڑھی (پرتاب گڑھ)

◆

. . خوب ہے، خوب تر ہے یہ افسانہ نمبر، آپ کے دم خم سے یہ چمنستانِ ادب ہرا بھرا ہے اور شاخ شاخ آپ کی مرہونِ منت ہے۔
موہن یاور (جموں)

◆

. . . افسانہ نمبر دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ کون کافر ہوگا جو اس عظیم الشان ادبی دستاویز کو دیکھ کر آپ کی پُرخلوص مدبرانہ صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرے . . .
کیف احمد صدیقی (سیتاپور)

◆

. . . اُردو زبان کے لئے جو خدمات آپ سرانجام دے رہے ہیں، تاریخ انھیں فراموش نہ کر سکے گی . . .
جوش صہبائی (جموں)

◆

. . . حسین ترین نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ یوں تو کشمیری لال ذاکر، پُشکر ناتھ، ظفر پیامی، م۔ک۔ مہتاب کے افسانے لاجواب ہیں لیکن رام لعل کا" کیا کھویا کیا پایا" اور شیشر پردیپ کی کہانی" راکھ اور تصویر" نے بہت متاثر کیا ہے۔ ان کا فن بلندیوں کو چھو رہا ہے . . .
عظیم واسطی (لاہور چھاؤنی)

◆

. . . افسانہ نمبر گزشتہ تمام نمبروں سے کسی طرح کم نہیں۔ شادی کی مصروفیات سے پرچہ کا متاثر نہ ہونا آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے . . .
حباب ترمذی (کراچی)

◆

. . . رنگا رنگ تخلیقاتِ نظم و نثر کا حسین امتزاج دیکھا اور اُسی میں گم ہو کے رہ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نمبر تمام سابقہ نمبروں سے کہیں آگے ہے۔ آپ کی فکر، آپ کا فن، آپ کی شخصیت اِس کے ہر ہر صفحہ سے نمایاں ہے . . .
ایم کوشیاوی راہی (گورکھپور)



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱۔ آم ——— لذیذ بھی، مفید بھی!

آم ہندوستان اور پاکستان کا بے حد لذیذ و خوش ذائقہ پھل ہے اور بے حد مفید بھی! اعضائے رئیسہ، دل و دماغ، پھیپھڑوں، معدہ اور آنتوں کو طاقت بخشتا ہے۔ نیا خون پیدا کرتا اور بدن کو فربہ کرتا ہے۔ نیز بدن کی خشکی کو بھی دُور کرتا ہے۔ آم مکھن سے کئی گُنا زیادہ طاقت بخش ہے۔ اِس سے جسم کے نروس سسٹم کو تقویت ملتی ہے۔ خونِ صالح پیدا ہوتا ہے اور جسم مضبوط بنتا ہے آم مقوی باہ اور مقوی مثانہ ہے۔ گُردوں کو طاقت بخشتا ہے۔ آم کھانے کے بعد دودھ پینے سے قوت پیدا ہوتی ہے۔ سونے سے کچھ دیر پہلے آم کھا کر اوپر سے دودھ پی لیا جائے تو بے خوابی کی شکایت رفع ہو جاتی ہے۔

آم کے متعلق جو جدید تحقیقات ہوئی ہے اُس کی بنا پر آم میں وٹامن سی کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ وٹامن اے کی بھی کافی مقدار اِس میں ہوتی ہے۔ آم کی اعلیٰ قسموں میں وٹامن زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ قلمی آموں میں ایک اعلیٰ قسم کے آم الفانسو کے متعلق تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس میں سیب سے چھ گُنا اور سنگترے سے چالیس گُنا وٹامن سی موجود ہے۔

پختہ آم کا استعمال چہرہ کو نکھارتا ہے۔ مُنہ کو خوشبودار کرتا، اشتہا (بھوک) کو بڑھاتا اور قبض کو دُور کرتا ہے۔ دل کی دھڑکن، کھانسی اور دمہ کیلئے مفید ہے۔ بے حد مقوی قلب و دماغ ہے۔ اِس کا سونگھنا دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ زیادہ خوشبودار آم زیادہ مقوی دماغ ہوتا ہے۔ آم انسانی جسم کی تعمیر کے لئے بہت کارآمد ہے۔

تازہ اور میٹھے آم حاملہ عورت کے لئے سود مند ہیں۔ اِس سے جسم میں طاقت آتی ہے اور تندرست بچہ پیدا ہوتا ہے۔ بچوں کی نشو و نما کے لئے بھی آم مفید ہے۔

نہار مُنہ (خالی پیٹ) آم کھانا مضر ہے۔ بھوک کم ہو جاتی ہے اور قبض ہو جاتا ہے۔ آم کھانے کا سب سے اچھا وقت دوپہر یا رات کا کھانا کھانے کے بعد ہے۔ سہ پہر کو بھی کھایا جا سکتا ہے۔ سہ پہر کو آم کھانے کے بعد دودھ یا دودھ کی لسی پینے سے جسم کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔

آم کھانے کے بعد پیچش ہو جائے تو چھ ماشہ روغن بادام پینے سے یہ شکایت دُور ہو جاتی ہے۔

ترش آم صحت کے لئے مضر ہے۔ دانتوں، مسوڑھوں اور پھیپھڑوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ باہ کو کمزور کرتا ہے۔ آنتوں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ ترش آم کھانے کے بعد دودھ پینا مضر ہے۔ ترش آم کا مصلح میٹھی چیزیں ہیں لیکن ترش آم صفراوی مزاج والوں کے لئے مفید ہے اور اُن کے معدہ کو قوی کرتا ہے۔

آم میں جتنی زیادہ ترشی ہوگی اُتنا ہی وہ کم گرم ہوگا اور جتنا زیادہ شیریں ہوگا اُتنی ہی اُس میں گرمی زیادہ ہوگی

پختہ آم کھانے کے بعد تھوڑی جامنیں کھانا یا جامن کا شربت پینا آم کی گرمی کو دُور کر دیتا ہے۔

آم کا مُربہ مقوی قلب و معدہ ہے۔ پھیپھڑوں کو طاقت بخشتا ہے، فرحت بخش اور قبض کُشا ہے۔ دل کی دھڑکن کے لئے مفید ہے۔ بواسیر کے لئے نافع ہے۔

آم کی چٹنی غذا کو ہضم کرتی اور بھوک بڑھاتی ہے۔ کچا آم بلغمی و سوداوی مزاج والوں کے لئے مضر ہے۔ پھیپھڑوں، گُردوں اور باہ کے لئے

مضر ہے۔ کچے آم کا اچار زکام، کھانسی اور نزلہ پیدا کرتا ہے۔ مہینے میں ایک دو بار کھا لینے میں مضائقہ نہیں۔

آم جگر کے لئے مضر ہے اور ترش آم جگر کے لئے زیادہ مضر ہے۔ استسقاء کا مرض پیدا کرتا ہے۔ اس کا مصلح مویز منقیٰ اور سونٹھ ہے۔ اگر آم کھانے کے بعد شربت زرشک یا سکنجبین سادہ یا شربت جامن پی لیا جائے تو جگر کو نقصان نہیں پہنچتا۔ آم کھانے سے گرانی محسوس ہو تو ایک چٹکی نمک چاٹ لیں یا تھوڑی سی باریک سونٹھ پھانک لینے سے طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کے مزاج میں زیادہ گرمی ہو انہیں چاہئے کہ آم کھانے کے بعد میٹھا دہی پی لیں۔

آم ایک خوش ذائقہ پھل ہی نہیں بہت سے دوائی خواص بھی رکھتا ہے۔

آم کے ۵ تولہ رس میں ۲ ماشہ سونٹھ سفوف کیا ہوا ملا کر روزانہ صبح کو ناشتہ کے بعد پینے سے معدہ قوی ہوتا ہے۔

آم کا تازہ رس ۵ تولہ، میٹھا دہی دو تولہ، آب ادرک ایک چمچی، سب کو ملا کر پی جائیں۔ روزانہ تین بار استعمال کریں۔ پرانے اسہال، سنگرہنی، آنتوں اور معدہ کی کمزوری اور بواسیر کے لئے مفید ہے۔

میٹھے آم کا رس ایک پاؤ، تازہ دودھ ایک چھٹانک، آب ادرک ایک چمچہ، چینی بقدر ضرورت سب کو خوب ملا کر روزانہ استعمال کریں۔ یہ مفرح بھی ہے۔ جسمانی کمزوری بھی دور کرتا ہے اور خون بڑھاتا ہے۔

بالوں کو بڑھانے اور سیاہ کرنے کے لئے آم کے پتے اور نرم شاخ کو پیس کر لیپ کرنے سے بال بڑھتے اور سیاہ ہوتے ہیں۔

آم کے درخت کی چھال دو چھٹانک۔ ایک پاؤ تل کے تیل میں ڈال کر پانچ دنوں تک دھوپ میں رکھیں۔ پھر تیل کو صاف کر کے شیشی میں رکھ لیں۔ اس تیل کا استعمال بالوں کو سیاہ اور دراز کرتا ہے۔ بالوں کو گرنے سے روکتا ہے۔

آم کے پرانے اچار کا تیل سر کے گنج کے لئے مفید ہے۔ اچار جتنا پرانا ہوگا اس کا تیل اتنا ہی زیادہ مفید ہوگا۔ ایک برس کا ہونا ضروری ہے۔ چند ہفتوں کے استعمال سے سر پر بال پیدا ہو جائیں گے۔ آم کے تازہ پتے کے ڈنٹھل ۹ عدد، سیاہ مرچ ۹ عدد۔ دونوں کو باریک کر کے چنے کے برابر گولیاں بنائیں۔ ہیضہ کا ایسا مریض جس کے قے دست بند نہ ہوتے ہوں، ایک ایک گولی چند بار استعمال کرانے سے قے اور دست بند ہو جاتے ہیں۔

۲ • کیا آپ بڑھاپے سے خائف ہیں؟

اگر آپ جوان ہیں تو ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کے خیال سے آپ کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ آپ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی عظمت سے واقف نہیں ہیں۔

کہتے ہیں ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی زندگی زرد، پھیکی اور اکتا دینے والی ہوتی ہے لیکن اگر آپ چاہیں تو اپنی زندگی کو بہت آسانی سے خوشگوار بنا سکتے ہیں۔ آپ کو اپنی دلچسپیوں میں وسعت پیدا کرنی چاہئے۔ زندگی کو گوناگوں بنا لیجئے۔ اپنی ذات میں مستغرق نہ رہئے۔ تفریحی مشغلوں میں بھی کچھ وقت صرف کیجئے۔ دوسرے لوگوں میں، دوسرے خاندانوں میں، اپنے دوستوں اور ہمسایوں میں دلچسپی لیجئے۔

یہ حقیقت ہے اور ناقابل تردید حقیقت کہ ادھیڑ عمر کے لوگ دنیا کے سب سے اچھے کارگزار ہوتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بوجھ انہیں کے کندھوں پر رہتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا احسان ہر شخص کی گردن پر ہے۔ وہ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ انہیں یہ بتانے کی بھی مہلت نہیں کہ وہ کیا باتیں پسند کرتے ہیں اور کیا نہیں۔ اصل میں ادھیڑ عمر بھرپور اور خوشگوار زندگی کا دور ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ——— یہ ہماری زندگی کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ جیسے ہی انسان چالیس سال کی عمر میں داخل ہوتا ہے، وہ ایک نامعلوم خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ زمانہ ہے، جب اس کا ذہن پختہ ہوتا ہے۔ جب اس کے خیالات تجربات کی آنچ میں کندن بن جاتے ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب وہ صحیفۂ قدرت کی ورق گردانی کے قابل ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب وہ چیزوں کو دیکھ کر صحیح نتائج نکال سکتا ہے لیکن بڑھاپے کا خوف اس کی ہمت کو پست اور اس کے خیالات کو پراگندہ کر دیتا ہے اور وہ منظم جد و جہد کے اصول سے دور ہٹ جاتا ہے اور اس طرح اس کی بجائے کہ وہ قانون قدرت سے کوئی فائدہ اٹھائے، آپ اپنے لئے تباہی اور بربادی کا موجب بن جاتا ہے۔

انسان طرح طرح کے خوف کا شکار ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ تباہ کن خوف جو اس کی قوت عمل کو سلب اور مفلوج کر دیتے ہیں، دو ہی ہیں۔ ایک افلاس کا خوف، دوسرا بڑھاپے کا خوف! ہم ان سے اتنا ڈرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ اس لئے جمع کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں کام آئے۔ بڑھاپے کے خوف سے ہی انسان وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے اور جس چیز سے وہ خوف کھاتا ہے، نادانستہ طور پر اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دیتا ہے!

۳ • صحت کے لئے پھلوں کی اہمیت

جدید تہذیب کے پرستار بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ پھل

انسان کی قدرتی غذا ہے۔ انسان کی صحت کی بقاء کے لئے پھلوں کا استعمال بے حد ضروری ہے۔ پھلوں میں صحت بخش وٹامنز کافی مقدار میں ہوتے ہیں۔ اُن میں نمکیات، کیلسیم، فولاد، فاسفورس، سوڈیم اور میگنیشیم وغیرہ پائے جاتے ہیں جو جسم کی پرورش کے لئے بے حد ضروری ہیں۔

مختلف غذاؤں کے ساتھ اگر پھل بھی استعمال کئے جائیں تو اُن کی شور کیفیت تیزابی غذاؤں کے مُضر اثرات کو کم کر دیتی ہے اور نظامِ ہضم کو درست رکھنے کے ساتھ ساتھ بدن کی متضاد کیفیتوں کے درمیان توازن اور اعتدال پیدا کرنے اور صحت کو برقرار رکھنے میں نہایت اہم خدمت انجام دیتی ہے۔ بعض اپنے اندر زود ہضم شکر اور معدنی، حیاتینی مادوں کا بھی ذخیرہ رکھتے ہیں۔ انھیں صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو بہت سے امراض سے حفاظت اور نقصِ تغذیہ کی اصلاح میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔

ہر کھانے کے بعد کچھ ایسے پھل کھانے چاہئیں جو چبا کر کھائے جاتے ہیں۔ اس سے دانت شکری اور نشاستی غذائی اثرات سے پاک ہو جاتے ہیں اور سڑنے سے محفوظ رہتے ہیں۔ کھجور، خوبانی، کشمش، منقیٰ، آلو بخارا، سیب کھانا کھانے کے بعد استعمال کرنے کے لئے بہت مناسب ہیں۔

قبض کو اُمّ الامراض (امراض کی ماں) کہا گیا ہے۔ قبض سے محفوظ رہنے کے لئے پھل بہت مفید ہیں۔ پھلوں میں ایسے اجزاء بھی ہوتے ہیں جو آنتوں کو طبعی حرکت پر قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور قبض نہیں ہونے دیتے۔ خاص کر انجیر، سنگترہ، آلو بخارا، آلو، شہتوت، ناشپاتی، نارنگی، امرود اس مقصد کے لئے بے حد مفید ہیں۔ پھل قبض کی بہترین دوا ہیں۔ کیلا خصوصیت سے قبض دُور کرنے کے لئے مفید پھل ہے۔ روزانہ کیلے کھائے جائیں تو دائمی قبض دُور ہو جاتا ہے۔

پھلوں میں نمک اور تُرشی بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ اس میں فاسفورس بھی ہوتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ طاقت دینے والی چیز ہے۔ جن لوگوں کو خون کی خرابی کی وجہ سے کمزوری لاحق ہو جاتی ہے، اُن کے لئے پھلوں کا نمک نہایت مفید ہوتا ہے۔

حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لئے بھی پھلوں کا رس بہت مفید اثر رکھتا ہے اور بچوں کو بھی نفع پہنچاتا ہے۔ پھلوں کے اجزاء صالح خون، مضبوط ہڈیاں اور بے عیب دانت بناتے اور انھیں کمزور اور خراب ہونے سے بچاتے ہیں۔

قلمی پھلوں کے مقابلہ میں چھوٹے، سخت اور بڑی گٹھلی یا زیادہ بیج والے پھل عام طور پر ادنیٰ درجہ کے پھل سمجھے جاتے ہیں لیکن تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ غذائی قدر و قیمت کے لحاظ سے بڑے اور نفیس پھلوں پر چھوٹے اور معمولی پھل برتری رکھتے ہیں۔ سخت چھلکے والی چھوٹی نارنگیوں میں وٹامن ڈی ڈھیلے چھلکے والے بڑے سنگتروں سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ دیسی امرود قلمی امرود سے زیادہ افادیت رکھتے ہیں۔ تخمی آم میں قلمی آموں سے زیادہ غذائیت ہوتی ہے۔ بیج والے سیاہ انگور میں سفید بے دانہ انگور سے اور بیج والی کشمش میں بے دانہ کشمش سے زیادہ غذائیت پائی جاتی ہے۔ زرد یا سُرخ رنگ کے پھل اُسی قسم کے ہلکے رنگ کے پھلوں سے اور چھوٹے پھل اپنی قسم کے بڑے پھلوں سے زیادہ غذائی اہمیت رکھتے ہیں۔

جن پھلوں کے چھلکے کھائے جا سکتے ہیں، اُن کا چھلکا دُور نہ کرنا چاہئے۔ پھلوں کے غذائی عناصر کا توازن برقرار رکھنے میں اُن کے چھلکے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مختلف پھلوں میں ۴ فیصدی سے ۸۲ فیصدی تک غذائی صلاحیت اُن کے چھلکوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ ٹماٹو کے چھلکے میں وٹامن سی کی مقدار گودے سے تین گُنا زیادہ ہوتی ہے۔

۴ • لوگ ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

دُنیا میں بہت سے ایسے انسان ہیں جو زندگی کی بازی ہار کر، زندگی کی دوڑ میں ناکام ہو کر حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں۔

اگر آپ زندگی کی بازی جیتنا چاہتے ہیں، زندگی کی دوڑ میں کامیاب و کامران ہونا چاہتے ہیں تو زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے سے پہلے اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کر لیجئے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے

"وہ انسان جو مقصد کا تعین کئے بغیر زندگی کی شاہراہ پر آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا، اُس کی راہ میں ایسی ایسی مشکلات آئیں گی جنھیں ایک معمولی ذہانت کا انسان برداشت نہ کر سکے گا۔ اُس کے برخلاف جو لوگ مقصد کا تعین کر کے آگے بڑھیں گے، اُن کی ساری مشکلات خود بخود دُور ہوتی چلی جائیں گی۔ وہ اس تیزی سے آگے بڑھ جائیں گے کہ دُنیا حیران رہ جائے گی!"

جس وقت آپ اپنا مقصدِ حیات چُن لیں گے، آپ کو ایک عجیب مسرّت کا احساس ہوگا اور اُسے حاصل کرنے کے بہت سے طریقے فوراً آپ کے ذہن میں آجائیں گے ــــــ آپ کو ایسے مواقع ملیں گے جن کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ آپ کو دوسرے لوگوں کا اشتراک حاصل ہوگا اور آپ کو اتنے ہمدرد دوست ملیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔

۵• تربوز —— موسمِ گرما کا مفید پھل

تربوز موسمِ گرما کا مشہور پھل ہے۔ یہ مزاج کے اعتبار سے سرد تر ہے۔ گرم مزاجوں اور گرمی سے متاثر ہونے والے مریضوں کے لئے فائدہ مند ہے۔

اس میں غذائیت بھی ہے لیکن غذائیت کے مقابلہ میں اِس کی دوائی افادیت زیادہ ہے۔ یہ گرمی کے بخار میں مفید ہے۔ صفراوی بخاروں اور تپ محرقہ میں جبکہ بدن میں گرمی بڑھی ہوئی ہو اور بخار کی گرمی سے پیدا شدہ سوزش اور پیاس سے مریض بے چین ہو، بار بار پانی پینے سے تسکین نہ ہوتی ہو تو برف سے ٹھنڈا کیا ہوا تربوز کا پانی اُس کے لئے آبِ حیات سے کم نہیں ہوتا۔ اِس سے جسم کی بڑھی ہوئی گرمی کم ہوجاتی ہے، پیاس بجھتی ہے اور ساتھ ہی طبیعت میں فرحت پیدا ہوتی ہے۔ صفرا کی تیزی اور خون کی حدت کو مٹاتا ہے۔

یہ ملیّن تاثیر بھی رکھتا ہے۔ اِسے کھانے سے اجابت کھُل کر ہوجاتی ہے۔ پیشاب خوب لاتا ہے جس سے جگر کی گرمی دُور ہوجاتی ہے۔ گُردے، مثانہ اور اُس کی نالیاں صاف ہوجاتی ہیں۔ اگر اُن میں چھوٹی موٹی پتھری یا ریگ ہو تو وہ بھی پیشاب کے ساتھ نِکل جاتی ہے۔ سکنجبین کے ساتھ اِس کا استعمال یرقان کے لئے مفید ہے۔ سِل و دق اور خشک کھانسی میں بھی تربوز سود مند ہے۔ صفرا کے غلبہ سے دست آتے ہوں تو تربوز سے فائدہ پہنچتا ہے۔ اِس صورت میں بدن کو غذائیت بھی دیتا ہے اور صفرا کو کم کرکے دستوں کو روکتا ہے۔

مغزِ تربوز بھی ٹھنڈا اور تر ہوتا ہے۔ اِس کے استعمال سے بدن میں ٹھنڈک اور تری پیدا ہوتی ہے اور اِس سے بدن کو غذائیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ مغزِ تربوز پیشاب لاتے ہیں۔ خون اور صفرا کے غلبہ کو تسکین دیتے ہیں۔ بدن لاغر ہو یا گُردوں میں لاغری کی شکایت ہو، پیاس زیادہ لگتی ہو، خشک کھانسی ستاتی ہو، بخار تیز ہو تو اِن حالات میں اِنھیں تنہا یا مناسب دواؤں کے ساتھ پانی میں پیس چھان کر پلانا چاہئے۔ گرمی یا خشکی کی وجہ سے نیند نہ آتی ہو تو اِن کے استعمال سے فائدہ پہنچتا ہے۔

تربوز بلغم پیدا کرتا ہے۔ بُوڑھے بلغمی مزاج والوں کے لئے اِس کا استعمال مناسب نہیں ہے۔ اِسے حدِ اعتدال سے زیادہ کھانے سے جوڑوں میں درد پیدا ہوجاتا ہے۔

تربوز دیر ہضم ہے۔ چاول کھاکر تربوز یا تربوز کھاکر چاول ہرگز نہ کھائیں۔ ایسا کرنے سے پیٹ میں شدید درد ہونے لگتا ہے۔ جس دن تربوز کھائیں اُس دن چاول ہرگز نہ کھائیں ورنہ ہیضہ یا فسادِ ہضم کا اندیشہ ہے۔

تربوز نہار مُنہ ہرگز نہ کھانا چاہئے۔ اِسے کھانے کا سب سے اچھا وقت دونوں کھانوں کے درمیان ہے۔ یعنی سہ پہر کو کھانا چاہئے۔

۶• کیا آپ کو زندگی عزیز ہے؟

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے —— اگر آپ کو زندگی سے پیار ہے، اگر آپ زیادہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اچھی صحت سے لُطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اِس مقصد کی تکمیل کے لئے آپ کو ڈاکٹر الیکس کارل کے اِس مشورہ پر عمل کرنا چاہئے —— کیا آپ جدید اندلز کے شور و غل میں اپنا قلبی سکون برقرار رکھ سکتے ہیں؟ اگر آپ ایک نارمل انسان ہیں تو جواب اثبات میں ہوگا۔ یقیناً اثبات میں ہوگا۔ ہم میں سے اکثر اپنے اندازے سے کہیں زیادہ مضبوط اور توانا ہوتے ہیں۔ ہم ایسے داخلی ذرائع کے مالک ہیں جنھیں ہم نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ تھورو اپنی زندۂ جاوید کتاب 'والڈن' میں لکھتا ہے —— شعوری جد و جہد کے ذریعہ زندگی کو رفعتوں تک پہنچانے کے لئے مجھے انسان کی مسلّمہ صلاحیت کے سوا کچھ دوسری حوصلہ افزا حقیقت کا علم نہیں —— اگر کوئی شخص خود اعتمادی اور خلوص کے ساتھ اپنے خوابوں کی منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور اپنے تخیل کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایسی کامیابی سے ہمکنار ہوگا جو عام حالات میں ناقابلِ توقع سمجھی جاتی ہے۔

بیسویں صدی کی قیمت میں اضافہ

جب سے ہندوستانی روپیہ کی بین الاقوامی قیمت کم ہوئی ہے کاغذ کی گرانی ہمارے لئے سوہانِ روح بن گئی ہے۔ نیوز پرنٹ ۵۰ فیصدی گراں ہوچکا ہے اور آرٹ پیپر مارکیٹ سے پر لگا کر اُڑ گیا ہے۔ بلاکس کے ریٹ چار آنے فی انچ سے بارہ آنے فی انچ ہوگئے ہیں۔ بعض اخبارات و رسائل کے بند ہوجانے کا اندیشہ ہے —— خدا کے فضل و کرم اور سرپرستوں کی عنایت سے آپ کا "بیسویں صدی" مضبوط بُنیادوں پر کھڑا ہے۔ اِس لئے نقصان تو ہوسکتا ہے لیکن "بیسویں صدی" بند نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ زیرِ نظر شمارہ پر ہمیں ۱۳۰۰ روپے کا خسارہ ہوا ہے۔ اندریں حالات ہم پچیس پیسے فی پرچہ بڑھانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ کاغذ کی قیمت میں ڈیڑھ گُنا اضافہ ہوا ہے اور بلاکس کی قیمت تین گُنا بڑھ گئی ہے مگر ہم بہت مجبوری میں محض اخراجات پُورے کرنے کے لئے قیمت میں معمولی سا اضافہ کر رہے ہیں —— آئندہ شمارہ سے "بیسویں صدی" کی قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچیس پیسے اور سالانہ قیمت چودہ روپے ہوگی۔ اگر حالات سازگار ہوگئے تو قیمت میں کمی کردی جائے گی۔

منیجر رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

ایچ اشوک۔ پرنس ہلیں۔ ردولی

س۔ آپ کی راجہ مہدی علی خاں سے بہت جگری دوستی ہے لیکن آپ نے شاید یہ کہاوت نہیں سُنی ہے ——— "زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں؟"

ج۔ اور شاید آپ نے یہ کہاوت نہیں سُنی ہے ——— "شہر کے اندیشے سے قاضی جی دُبلے!"

س۔ میں نے سُنا ہے، آپ ایم۔ اے کی ڈگری دیکھ کر، اُس سے متاثر ہو کر تخلیقات شائع کر دیتے ہیں۔ یہ خبر کہاں تک سچّی ہے؟

ج۔ یہ ہوائی کسی جھوٹے نے اُڑائی ہو گی۔ "بیسویں صدی" کا کوئی شمارہ دیکھ لیجئے۔ اُس میں ایسی بہت سی تخلیقات ہوں گی جن کے فنکاروں کے ناموں کے ساتھ کوئی ڈگری نہ ہو گی۔ اِس وقت ہمارے سامنے دسمبر ۹۱ء کا شمارہ ہے۔ اِس میں ایک دو نہیں، بیس ایسی تخلیقات ہیں جن کے فنکاروں کے ناموں کے ساتھ کوئی ڈگری نہیں ہے۔ آپ بھی دیکھ لیں۔

س۔ مُلک میں روز بروز مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ غریب بے موت مر رہے ہیں، پھر بھی حکومت کچھ نہیں کر رہی ہے۔ کیا حکومت اپنا فرض بھول گئی ہے؟ بھوکے عوام کب تک خاموش رہ سکتے ہیں؟

ج۔ حکومت بہت کچھ کر رہی ہے۔ بڑی بڑی اسکیمیں بنا رہی ہے، بڑے بڑے بیانات دے رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ غذائی زون نہیں توڑ رہی ہے۔ گراں فروشوں کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ ذخیرہ اندوزوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔

جوہر اقبال۔ گریڈیہہ

س۔ موجودہ زمانہ میں تعلیم کی اہمیت؟

ج۔ موجودہ دَور میں ہر دَور سے زیادہ تعلیم کی اہمیت ہے۔ اِس دَور میں تعلیم سے تہی دامن انسان، انسان نہیں سمجھا جاتا۔ ہاں! قسمت سے تعلیم سے بے بہرہ انسان لیڈر بن جائے تو اُس کے لئے تعلیم چنداں ضروری نہیں۔ انگوٹھا لگانے کا سلیقہ ہونا چاہئے۔

س۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی پستی کے اسباب؟

ج۔ سب سے بڑا سبب احساسِ کمتری ہے!

ولی اللہ انصاری بی۔ اے۔ ٹانڈہ فیض آباد

س۔ دوستی کا انجام؟

ج۔ اِس دَور میں دوستی کا انجام بیشتر تلخ ہی ہوتا ہے۔ بھارت اور چین کی دوستی کا انجام آپ کے سامنے ہے!

س۔ مُلک میں بڑھتی ہوئی بیکاری دُور کرنے کا کوئی اچھا طریقہ بتائیں۔

ج۔ بیکار لوگوں کو چاہئے کہ کسی کام کو باعثِ عار نہ سمجھیں۔ محنت سے جی نہ چرائیں۔ مشکلات سے نہ گھبرائیں۔

س۔ کسی گہرے دوست کو اپنی کن کن باتوں سے واقف کرنا چاہئے؟

ج۔ گہرے دوست کو بھی اپنے وہ راز نہ بتائیے، جو دشمن کو نہ بتانے چاہئیں۔ اِس لئے کہ ہو سکتا ہے، دوست کبھی دشمن ہو جائے۔

احمد حسین ناصر بی۔ ایس سی، بروڈلی۔ بہار

س۔ کہا جاتا ہے فنکار کی تصنیف و تخلیق اُس کی شخصیت و کردار کا آئینہ ہوتی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو کیا انسان کا ہر قول و قرار، وعدہ و عہد، پند و نصیحت اُس کے مستقبل کے افعال و کردار کا آئینہ ہوتا ہے ـــــ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا؟

ج۔ بہت حد تک یہ کہنا صحیح ہے۔

س۔ راہ پُرخار ہو۔ رہنما بیزار ہو، منزل گلزار ہو تو اُسے پانے کی سہل ترکیب بتائیں۔

ج۔ راہ پُرخار ہو اور رہنما بیزار ہو تو منزل پانے کی آرزو رکھنے والے کو سہل پسند نہ ہونا چاہئے۔ مشکلات سے گھبرانے والوں کو مشکل سے منزل ملتی ہے۔

محمد اصغر۔ کانپور

س۔ ازراہِ کرم بیوقوفوں کی تعداد بتایئے۔

ج۔ دُنیا میں ہر شخص اپنے سوا سب کو بیوقوف سمجھتا ہے! تعداد آپ خود جوڑ لیجئے ـــــ دُنیا آپ کے سامنے ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟

س۔ ضمیر کی آواز؟

ج۔ کاش! انسان ضمیر کی آواز پر دھیان دیتا۔

س۔ آج کے دَور میں انسان کی قیمت؟

ج۔ روٹی کے چند سُوکھے ٹکڑے!

تاج الدین۔ زکیاپور

س۔ خوشتر بھائی! ترقی کی پہلی سیڑھی کیا ہے؟

ج۔ ترقی کی بلندی پر پہنچنے کا عزمِ محکم!

س۔ ایک مزدوری پیشہ آدمی کو کیسی لڑکی سے شادی کرنی چاہئے؟

ج۔ جو اُس کے ساتھ خوش رہ سکے۔

س۔ ساحر لدھیانوی کے دو شعر سُنایئے۔

ج۔ ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے
جگمگاتے ہیں اُفق پار ستارے لیکن
راستہ منزلِ ہستی کا مہیب آج بھی ہے

محمد سعید اکبر پوری۔ کٹک

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں چاند کی دُنیا کیسی ہوگی؟

ج۔ سُونی سُونی ہوگی ـــــ اِس لئے کہ وہاں جنگ کے نعرے لگانے والا، جنگ کے ہنگامے بپا کرنے والا انسان نہ ہوگا۔

س۔ کوئی ایسا شعر ارشاد فرمائیں جس میں پھولوں کی مہک ہو۔

ج۔ کسی شعر میں پھولوں کی مہک محسوس کرنا نہ کرنا اپنے ذوق کی بات ہے ـــــ ایک حسین شعر سُنیئے ؎

وہیں ساقی تو پھر ہم کو بادہ کشو! کیا چمن کی ہوس، کیا بہاروں کا غم
اُن کی رنگیں نظر جس طرف اُٹھ گئی، پھول بکھرا گئی رنگ برسا گئی

سرفراز الرحمٰن۔ گیا

س۔ سارے انسان خدا کی مخلوق ہیں لیکن ایک کے پاس شراب کے لئے دولت ہے تو دوسرا زندہ رہنے کے لئے صرف دو روٹی کا محتاج!

ج۔ اپنی اِس محرومی و محتاجی، اپنی اِس حالت کے لئے انسان خود ذمّہ دار ہے۔

س۔ زندگی ایک تلخ تجربہ ہے اور موت؟

ج۔ زندگی کو تلخ تجربہ کہنا غلط ہے۔ تلخ تو اُسے لوگ خود بنا لیتے ہیں۔ بنا دیتے ہیں اور موت ؎

موت اُس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دُنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

عبدالرحیم ساگر کر۔ بنگلور

س۔ عورت، دولت اور شراب! ـــــ اِن تینوں میں کون سی چیز زیادہ تباہ کُن ہے؟

ج۔ ایسی ذہنیت جو عورت کو تباہ کُن سمجھے! ـــــ دولت بھی تباہ کُن نہیں: دولت کو غلط طور پر استعمال کر کے تباہی کو دعوت دی جائے تو اِس میں دولت کا کیا قصور ہے؟ ـــــ ہاں شراب بے شک تباہ کُن ہے!

شمس عالم آرزو۔ اورنگ آباد

س۔ بھائی جان! آپ سب سے زیادہ کس چیز کے دلوانے ہیں؟

ج۔ خلوص اور خدمت کے!

س۔ میں آپ کے لئے آئس کریم کا پارسل ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اُسے قبول فرمائیں گے؟

ج۔ پہلے آپ شکریہ قبول فرمائیں۔ پھر آئس کریم کا وہ پارسل ہماری طرف سے قبول کر لیں۔

مشتری پروین کٹیہار۔ پورنیہ

س۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں، ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن جانا چاہتے ہوں لیکن وہ جانتے ہوں کہ اُن کے والدین یہ شادی ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ ایسی حالت میں اس راز کو ماں باپ پر ظاہر کرنا چاہئے یا نہیں؟

ج۔ ماں باپ کے مشورہ کے بغیر اِس طرح کا اقدام اکثر "تلخ تجربہ" ثابت ہوتا ہے۔ اِس لئے جہاں دیدہ ماں باپ کے مشورہ کی روشنی میں زندگی کی راہ پر آگے قدم بڑھانا چاہئے۔

س۔ کیا اسلام بھی ذات پات کا حامی ہے؟

ج۔ جی نہیں! اسلام اخوّت کا علمبردار ہے۔

پرہلاد چند چھابڑا۔ میرٹھ کینٹ

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

جی خوش ہوا ہے مسجدِ ویراں کو دیکھ کر

میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

ج۔ یہ شعر کسی خانہ خراب شاعر کا ہوگا۔

س۔ راجہ مہدی علی خاں کیسے راجہ ہیں ———؟ انگریزی حکومت کے خطاب یافتہ "راجہ" تو ہو نہیں سکتے کہ بقول منٹو مرحوم (جواہر ریزے" انگست از اقبال سلیم) وہ انارکلی میں بھیک مانگا کرتے تھے۔ کیا خود ساختہ نواب (راجہ) بے مُلک ہیں یا کوہ مری کے خاندانی راجہ ہیں؟ یا . . . ؟

ج۔ بندہ نواز! راجہ صاحب اِن سارے راجاؤں سے بڑے راجہ ہیں۔ سب کے دلوں پر راج کرنے والے راجہ ہیں۔

س۔ آپ دوسرے فنکاروں کی گھریلو زندگی کی تصویریں بہت اہتمام سے "بیسویں صدی" میں پیش فرماتے ہیں لیکن اپنے گھریلو ماحول کی تصویر آج تک نہیں پیش فرمائی۔ کیوں؟

ج۔ ہم کیا اور ہمارے گھریلو ماحول کی تصویر کیا۔ ہم اپنے کو فنکار سمجھتے ہیں نہ ادبی میدان کا شہسوار۔ ہم تو بس زبان و ادب کے ادنیٰ خدمت گزار ہیں۔

محمد رفعت علی انصاری۔ نلگنڈہ۔ حیدرآباد دکن

س۔ میرے دوست کہتے ہیں، سوداؔ شہنشاہِ تغزّل تھے لیکن میں اُن کی رائے سے متفق نہیں ہوں۔ آپ فرمائیں حقیقت کیا ہے؟

ج۔ شہنشاہِ تغزّل حضرت میرؔ تھے۔

س۔ رنج و الم سے گھبرانے والا کیا انسان کہلانے کا مستحق ہے؟

ج۔ انسان کہلانے کا مستحق کیوں نہیں؟ ہاں اُسے سمجھدار انسان نہیں کہا جا سکتا۔

س۔ دوست کے انتخاب میں کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے؟

ج۔ سب سے زیادہ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ خود غرض نہ ہو، خلوص سے عاری نہ ہو ——— چین کے چاؤ کی طرح دوستی کے دامن کو تار تار کر دینے والا نہ ہو۔

شوکت خواجہ۔ چکوال

س۔ نثر اور نظم میں آسمانِ ادب کے دو درخشندہ ستارے؟

ج۔ نظر اپنی اپنی۔ بہت سے درخشندہ ستارے ہیں۔ آپ اپنے ذوق کے مطابق خود ہی انتخاب کرلیں۔

س۔ کلیوں جیسا نازک اور پھولوں جیسا حسین شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

رنگ، خوشبو، صبا، چاند، تارے، کرن، پنکھڑی، شبنم، شفق، آبجو، چاندنی

اُن کی دلکش جوانی کی تکمیل میں حُسنِ فطرت کی ہر چیز کام آگئی

اصغر علی۔ بنگلور

س۔ خوبصورت خیالات کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

ج۔ اچھائی سے پیار کرنے سے، بُرائی سے بچنے سے!

س۔ ماں کی محبت اور بیوی کے پیار میں کیا فرق ہے؟

ج۔ ماں کی محبت کا کوئی جواب نہیں۔

سیف الہ آبادی۔ رشٹرا ہگلی

س۔ اُردو جن کی مادری زبان ہے، وہ اُردو کے دشمن کیوں بنے ہوتے ہیں؟

ج۔ انقلابات ہیں زمانے کے! ایسے لوگ نہ ہوتے تو ابن الوقت کسے کہا جاتا؟

س۔ اندھے اور جاہل میں کیا فرق ہے؟

ج۔ اندھے کو معذور سمجھ کر لوگوں کو اُس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ جاہل سے لوگوں کو نفرت ہوتی ہے۔ اندھا آنکھوں کا اندھا ہوتا ہے۔ جاہل دل اور دماغ کا اندھا ہوتا ہے۔

محمد عمر پہلوان۔ عادل آباد دکن

س۔ بزدل کے ہاتھ میں تلوار کیوں زیب نہیں دیتی؟

ج۔ اِس لئے کہ وہ اُس کے جوہر نہیں دکھا سکتا۔

س۔ کیا دوستوں کی کثرت کمزوری کی علامت ہے؟

ج۔ اچھے دوست ہوں تو سمجھداری کی علامت ہے۔

س۔ انسان اپنی تمام تر بلندیوں کو چھوڑ کر گناہ کے غار میں کب گرتا ہے؟

ج۔ جب وہ ایمان اور عقل کا دامن چھوڑ کر گمراہی کے اندھیرے میں گھر جاتا ہے۔

معین الدین۔ برہانپور

س۔ کچھ صاحب رائے لوگوں کا خیال ہے، تیسری جنگِ عظیم ۷۶ء میں شروع ہونے والی ہے۔ کیا یہ خیال صحیح ہے؟

ج۔ یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ دُنیا ایک خطرناک موڑ کی طرف جا رہی ہے۔

س۔ جناب ظفر پیامی کا اصل نام کیا ہے؟

ج۔ بندہ نواز! نام سے کیا لینا ہے، کام دیکھنا چاہئے۔

س۔ حفیظ جالندھری کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ یہ دامن ہے یہ ہے گریباں، آؤ کوئی کام کریں

موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

عبدالمجید خاں۔ برہانپور

س۔ بڑھاپے میں بھی سیاست داں اپنی کرسی کیوں نہیں چھوڑتے؟

ج۔ اس لئے کہ بڑھاپے میں تو اور بھی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوان تو کھڑے بھی رہ سکتے ہیں۔

س۔ سیاست اور رقابت؟

ج۔ سیاست اور رقابت لازم و ملزوم ہیں۔

س۔ تلوک چند محروم کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم
ہمیں یہ ساری دنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

عبدالحکیم خاں۔ پکوڑیا۔ ایس، پی

س۔ خوشتر آپ کا نام ہے یا تخلص؟ اگر تخلص ہے تو آپ کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ خوشتر ہمارا نام بھی ہے اور تخلص بھی! جیسے حضرت امیر مینائی نے فرمایا ہے ؎

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر

س۔ "بیسویں صدی" عورتوں کی طرف داری کیوں کرتا ہے جبکہ دوسرے لوگ عورتوں کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔

ج۔ "بیسویں صدی" کسی کی طرف داری نہیں کرتا۔ سچائی کی تائید و ترجمانی کرتا ہے۔

اے۔ رشید، شری پور

س۔ ضمیر فروش کی شناخت؟

ج۔ ضمیر کی ملامت سے اس کے چہرے کی آب و تاب اور آنکھوں کی چمک ختم ہو جاتی ہے۔

س۔ تنہائی کی خلش؟

ج۔ خدا کرے کسی کا مقدر نہ ہو!

رضیہ قریشی۔ بہار شریف

س۔ سچائی جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں، ہندوستان میں سب سے پہلا ریڈیو اسٹیشن کہاں بنا اور کب بنا؟

ج۔ سب سے پہلا ریڈیو اسٹیشن مدراس میں ۱۹۲۴ء میں بنایا گیا۔

س۔ اس وقت ہندوستان میں کتنے ریڈیو اسٹیشن ہیں؟

ج۔ اٹھائیس۔

شمیم صغیر۔ گریڈیہہ

س۔ مندرجہ ذیل شعر کا ہم وزن شعر سنا کر ممنون فرمائیں ؎

پُر ہے دل شکوے سے یوں رنگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ج۔ وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں شکوہ تیرا
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

نذر الاسلام انصاری۔ فوربس گنج

س۔ انسان پتھر کو کیوں پوجتا ہے، انسان کو کیوں نہیں پوجتا؟

ج۔ آج تو انسان بھی پتھر بن گیا ہے!

س۔ آج کل زندگی سستی ہے یا موت؟

ج۔ آج کل موت بھی سستی نہیں ہے۔ زہر بھی مہنگا ہو گیا ہے۔ پھر زندگی تو زندگی ہے۔ زندگی کا کیا ذکر؟

ہر ذہن منتشر ہے تو ہر دل ہے مضمحل
اب زندگی بھی موت کے سائے سے کم نہیں

ارشد حسین خاں۔ ملیح آباد

س۔ سچی دوستی کس طرح قائم رکھی جا سکتی ہے؟

ج۔ دوستی پر خود غرضی کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا جائے۔

اُستاد فیقو۔ کامٹی

س۔ ماضی کی تلخ یادوں کو کس طرح بھلایا جائے؟

ج۔ حال کے ہنگاموں میں گم ہو کر!

س۔ زندگی میں اگر غم ہی غم رہے تو؟

ج۔ جب بھی بددل نہ ہونا چاہئے ؎

یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں

اسد دسنوی۔ رانچی

س۔ دسمبر کی "سرگوشیاں" میں کسی سوال کے جواب میں آپ نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اگر عورت کی حکومت ہو جائے گی تو مرد رشک سے زہر کھا کر مر جائیں گے۔ اب آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ ہم بھی زہر کھا کر مر جائیں تو عورتوں کو ناقص العقل کہنے والوں کی بے بسی پر ترس کون کھائے گا؟

ایس۔ ایس علی۔ نظام آباد

س۔ زندگی کی دوڑ میں انسان کو دروغ گوئی کس موڑ پر پہنچاتی ہے؟

ج۔ ذلت و رسوائی کے غار کے کنارے!

س۔ "ٹیڈی ازم" کے پرستاروں کا انجام؟

ج۔ ابھی تو آغاز ہے، انجام دیکھنے کے لئے ذرا ضبط سے کام لیجئے!

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ پہلوانِ ادب راجہ مہدی علی خاں ٹیڈی پتلون پہننے لگے ہیں؟

ج۔ پہلے یہ سن لیجئے، اس کے بعد یہ سوال پوچھئے۔۔۔ راجہ صاحب اپنے متعلق غلط بیانی سے کام لینے والوں کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے ہیں۔

محمد عظیم۔ ایزٹ نگر۔ بریلی

س۔ مارچ ۱۹۶۶ء کے "بیسویں صدی" میں صفحہ ۱۰۲ پر بزمِ سرگوشیاں میں محمد علی نیمابادی کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے جو شعر درج فرمایا ہے، وہ شعر کس کا ہے؟

ج۔ متین بدایونی کا۔

س۔ پنجاب کا سرکاری رسالہ "پاسبان" کس پتہ سے منگوایا جا سکتا ہے۔ اس کی سالانہ قیمت کیا ہے؟

ج۔ سالانہ قیمت تین روپے ہے۔ پتہ یہ ہے:۔

دفتر ماہنامہ "پاسبان" چنڈی گڑھ پنجاب

سرجیت سنگھ۔ کلکتہ

س۔ خوشتر صاحب! میرا دوست جگا کہتا ہے ہندوستان میں سب سے بڑا ریلوے پلیٹ فارم سورن پور کا ہے۔ میں کہتا ہوں دلّی بھارت کی راجدھانی ہے، سب سے بڑا پلیٹ فارم دلّی کا ہوگا۔ آپ بتائیں سچ کیا ہے؟

ج۔ آپ کے دوست جگا کی بات سچی ہے۔

معین الدین احمد معین۔ کلکتہ

س۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے لیکن حالات سے مجبور ہو کر میں آگے پڑھ نہیں پا رہا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ حالات سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔

س۔ سائنس اور اسلام کے قوانین ملتے جلتے ہیں۔ یہ کہاں تک سچ ہے؟

ج۔ اسلام کے آئین کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں۔

س۔ کیا راجہ مہدی علی خاں کتوں کا کاروبار بھی کرتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں! ان سے بچے رہئے گا۔

سید زبیر طاہر۔ رامپور

س۔ خوشتر بھائی! ہم اپنا قد کس طرح بڑھا سکتے ہیں؟

ج۔ اگر آپ کی عمر ۲۶ سال سے کم ہے یا ۲۶ سال تک ہے تو آپ کا قد بڑھ سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے کسی اچھے معالج سے رجوع کیجئے تاکہ آپ کی حالت کا جائزہ لینے کے بعد معقول علاج تجویز کیا جا سکے۔

محمد عمر۔ کلکتہ

س۔ کیا ہندوستان میں "آمنہ" نام کا کوئی پرچہ شائع ہوتا ہے؟ اگر ہاں تو کہاں سے؟

ج۔ ہماری نظر سے تو نہیں گزرا۔ نہ ہمیں کسی ایسے پرچے کا علم ہے۔ ہاں! "نرگس" "نورجہاں" اور "اشتیاق" نام کے پرچے نکل چکے ہیں۔

محمد سیف اللہ انصاری "منیر" شریف۔ پٹنہ

س۔ "بیسویں صدی" کے صفحۂ اوّل پر تصویرِ زن کو کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ؎

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

مسعود ادیب۔ رتلام

س۔ خوشتر بھیا! "بیسویں صدی" کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تخلیق کار راجہ مہدی علی خاں کی تصویر شائع فرمائیں تاکہ قارئینِ "بیسویں صدی" اس عجیب و غریب خلقت کی صورت بھی دیکھ سکیں۔

ج۔ سالنامہ ۶۶ء میں راجہ صاحب کے دیدار فرمائیے

کنارے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیں۔

س۔ ایک فنکار کی آخری آرزو؟

ج۔ اس کی تخلیقات قبولِ عام اور بقائے دوام حاصل کریں۔

س۔ میرے خیال میں یہ شعر ڈاکٹر اقبال کا نہیں ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تدبیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ج۔ یہ شعر علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے لیکن آپ نے اس کا پہلا مصرع غلط لکھا ہے۔ صحیح یوں ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

اقبال احمد خاں۔ گیا

س۔ خوشتر بھیا! غالب اور رابندر ناتھ ٹیگور میں بلند مرتبہ کس کا ہے؟

ج۔ دونوں کا۔

س۔ سکندر ذوالقرنین دو تھے یا ایک؟

ج۔ ایک — ذوالقرنین سکندرِ اعظم کا لقب تھا۔

رضیہ اختر۔ مرادآباد

س۔ بھائی جان! آپ بتا سکتے ہیں چاند زمین سے کتنی دوری پر ہے؟

ج۔ ۲۴۰۰۰۰ میل۔

شمیم صدیقی مرادآبادی

س۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کا اصلی نام کیا تھا؟

ج۔ احسان اللہ خاں۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر۔ خوشتر گرامی ——— مطبوعہ مہدی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر۔ برائٹ پریس اسد بازار دہلی ——— پتہ۔ دفتر بیسویں صدی دریا گنج۔ دہلی ۶

ڈکشنریاں، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری	ترشنا کماری ایم اے	چار روپے
[illegible]ت کشیدہ کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
[illegible]	"	چار روپے ۵۰ پیسے
کشیدہ [illegible]	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
[illegible]	زینب انور	دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible]ین	"	دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible]	قدسیہ انور	ایک روپیہ
[illegible]	"	ایک روپیہ
[illegible]	زینب انور	دو روپے
[illegible]	اشرف بانو عرفان	دو روپے
[illegible]	زینت کوثر	پانچ روپے

انگریزی اردو میں اپنی قابلیت بڑھایئے

اردو انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

پاکٹ ڈکشنری۔ انگریزی سے اردو ہندی		چار روپے
انگریزی اردو ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		دس روپے
اردو انگریزی ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		گیارہ روپے
[illegible] اردو ڈکشنری	عبدالحق	تیس روپے
[illegible] اردو ڈکشنری	"	بیس روپے
[illegible] اردو ڈکشنری	"	بارہ روپے
اردو انگریزی ڈکشنری		گیارہ روپے
انگریزی اردو ڈکشنری		دس روپے
[illegible] ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی		تین روپے
اردو لغت		آٹھ روپے
لغات [illegible] کلاں		بارہ روپے
[illegible]		سات روپے ۵۰ پیسے
لغات کشوری خورد		چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت و حرفت

الیکٹریکل انجینئرنگ گائیڈ	زندہ ناتھ	بارہ روپے
الیکٹرک گائیڈ (نیا ایڈیشن)	"	آٹھ روپے
الیکٹرک [illegible]	"	چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک میٹرز	"	تین روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک [illegible]	"	چھ روپے
الیکٹرک [illegible] امتحان کے پیپرز (پنجاب)	"	چھ روپے ۵۰ پیسے
آئل و ڈیزل انجن گائیڈ	"	دس روپے
آئل انجن گائیڈ	"	چھ روپے
کروڈ آئل انجن گائیڈ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائیڈ	"	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک)	"	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ٹانکا لگانے کا ہنر	"	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹرز بنانا	"	تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے۔ سی۔ ڈی۔ سی)	"	ستار روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائیڈ	"	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
[illegible] ریڈیو گیان	"	پندرہ روپے
ٹرانسفارمر گائیڈ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز	"	آٹھ روپے
خراد شکشا یعنی ٹرنر گائیڈ	"	تین روپے
ورکشاپ گائیڈ (فیٹر ٹریننگ)	"	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	"	چھ روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی	رام اوتار ورما	چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپیرنگ	"	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	تین روپے
رضیہ کا دسترخوان	رضیہ سلطانہ چمن	دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی	پروفیسر زندہ ناتھ	دو روپے ۵۰ پیسے
ماشک گائیڈ	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بوٹ پالش سازی	"	دو روپے ۵۰ پیسے
[illegible] روشنائیاں بنانا		دو روپے ۵۰ پیسے
کھٹائیاں (انگریزی مٹھائیاں بنانا)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
ہیر آئل (خوشبودار تیل)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بکری بہار (بسکٹ ڈبل روٹی کیک)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
جنتری کا کام	"	چار روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (چیتر کاری)	"	چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر	"	دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار		دو روپے ۵۰ پیسے
اچار، مربہ، چٹنی	جیمنی رنگیا	دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر	چندر بھان [illegible]	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دوکان)		دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دوکان	"	دو روپے ۵۰ پیسے
چھپائی پارچہ جات کیلیکو پرنٹنگ	"	تین روپے ۵۰ پیسے
انڈو یوروپین کوکری بک دیسی انگریزی کھانے	کالی چرن	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	"	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	"	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	"	چار روپے

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج، دھلی نمبر ۶

BISWIN SADI
30 TH YEAR OF PUBLICATION
Telephones Office 271637 Residence 619927

[illegible] = [illegible]



شباب کیا ہے یہ مست شباب کیا جانے

خود اپنے کیف کو جام شراب کیا جانے

فوٹو: شہناز شاہد۔ لاہور



حُسن اور اُس پہ بے پناہ شباب
بے تکلف قیامت آئی ہے

فوٹو۔ محفوظ شاہد۔ لاہور



ادبی مجلس دلی اور حلقۂ اربابِ فکر دلی نے مشترکہ طور پر دلی پبلک لائبریری میں اُردو کے عظیم المرتبت شاعر محترم پروفیسر تلوک چند صاحب محروم کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی۔ جس کی صدارت وزیرِ تعمیرات و مکانات جناب مہر چند کھنہ نے کی۔ تصویر میں جناب علی جواد زیدی محروم صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ صاحبِ صدر نے محروم صاحب کے جذبۂ حب الوطنی، اُن کی امن پسندی اور انسان دوستی کی تعریف کی ؛



جلسے میں حاضرین کا ایک منظر۔ حاضرین میں دہلی کی سرکردہ ادبی شخصیتوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی محروم صاحب کا ماتم کیا گیا اور مرحوم کی خدمات کو سراہا گیا۔ محروم صاحب کے آبائی شہر کے لوگوں نے وہاں ایک محروم لائبریری اور ایک بزمِ محروم قائم کرنے کا فیصلہ کیا ؛



جناب حیات اللہ انصاری ایڈیٹر "قومی آواز" لکھنؤ، محروم صاحب کی دردمند شخصیت اور پُر درد شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ انصاری صاحب نے فرمایا کہ محروم صاحب جتنے بڑے شاعر تھے اُتنے ہی بڑے انسان بھی تھے حالانکہ یہ دونوں اَوصاف شاذ ہی یکجا ہوتے ہیں ؎



جناب منوہر لال طالب چکوالی محروم صاحب سے متعلق اپنی ماتمی نظم پڑھ رہے ہیں اور تصویر میں ڈاکٹر عابد حسین، جناب گوپی ناتھ امن، جناب مالک رام، جناب مہر چند کھنہ کے چہروں پر بھی اِس نظم کے غمناک تاثرات کو محسوس کیا جا سکتا ہے ؎



عزیزی مودود علی صدیقی منیجر "بیسویں صدی" کی شادی خانہ آبادی امروہہ میں بہت تزک و احتشام سے ہوئی۔ اِس تقریبِ سعید کے موقع پر دہلی کے پُرخلوص احباب کے علاوہ بمبئی، مرادآباد، رام پور اور بریلی کے سربرآوردہ شاعر و ادیب اور بے شمار دوست احباب اور رشتہ دار بہت بڑی تعداد میں برات اور پُرتکلف دعوتِ ولیمہ میں شریک ہوئے۔ تصویر میں شادی کے بعد چائے کا ایک منظر۔



دہلی کی ایک ممتاز شخصیت اور فرشتہ خصلت انسان جناب میاں صالح الدین دُلہن کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے اپنی دلی دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار کر رہے ہیں اور خوشترؔ گرامی نے بھی دولہا دُلہن پر خلوص و محبت اور نیک خواہشات کے پھول نچھاور کرتے ہوئے کہا ؎

ہاں رہو تم کامگارِ زندگی
تم کو حاصل ہو بہارِ زندگی

مدیر: خوشتر گرامی

شمارہ ۹

ٹیلیفون دفتر ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ۶۱۹۹۲۷

قیمت فی پرچہ

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

تیرونشتر

"ایک فرم جس کے حصہ داروں میں ایک وزیر کی بیوی شامل" ایک خبر
——— عاقبت اندیشی کی بات ہے۔ میاں کی وزارت چلی جائے، بیوی کی فرم تو باقی رہے گی۔

"یو۔پی کے سالِ رواں کے بجٹ میں تخفیف" ایک خبر ——— کیا وزیروں کی تعداد میں کمی کی جا رہی ہے؟

"گورنر پنجاب نے مختلف تعلیمی اداروں کی امداد روک دی" ایک خبر
——— وزیروں کے بھائی بھتیجوں کے خود ساختہ ادارے ہوں گے۔

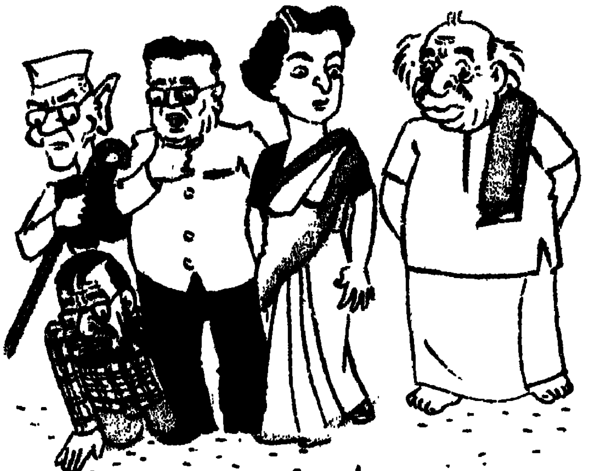
"ہمیں بیرونی خطرہ سے نہیں اندرونی خطرہ سے تشویش ہے" وزیر دفاع ——— اور اندرونی خطرہ کانگرسیوں کا باہمی جھگڑا اور لوٹ کھسوٹ۔

"ماسکو میں سردی نہیں" کامراج ——— کامراج کو کانگرسیوں کی دن رات کی باہمی لڑائیوں اور گرماگرمی نے سردی پروف بنا دیا ہے۔

"مخالفانہ تحریکوں سے نمٹنے کے لئے جلد ہی پبلک سیکوریٹی ایکٹ وضع کیا جائے گا" گلزاری لال نندہ ——— اِس لئے کہ اشک آور گیس، لاٹھی اور گولی کے تمام طریقے فیل ہو گئے ہیں۔

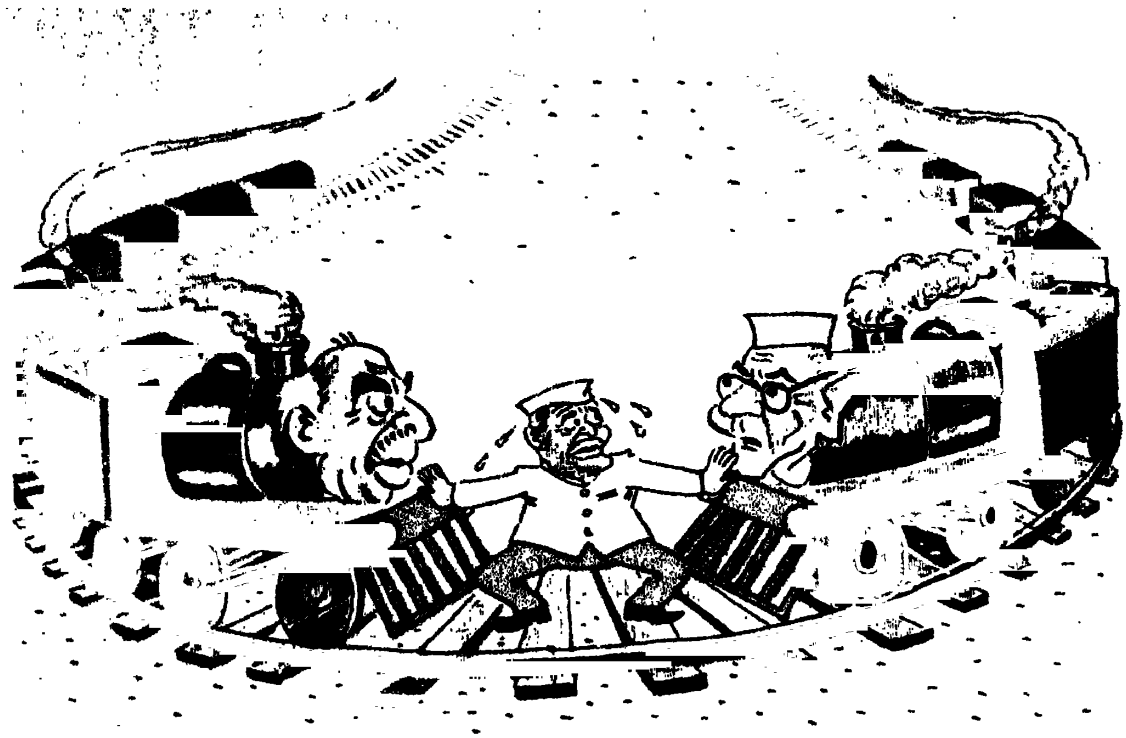
"مغربی جرمنی میں جرائم بڑھ گئے" ایک خبر ——— یعنی وہ بھی ہندوستان کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

"قوم کو خود کفیل بنانے کے ذرائع تلاش کئے جائیں" وزیر تعلیم ——— ایک کمیشن مقرر کر دیجئے اِس کام کے لئے، وہ آپ تلاش کرے گا یا یہ ادارہ خود کفیل مقرر کر دیجئے۔





کانگرس کے خلاف مختلف پارٹیوں کا انتخابی گٹھ جوڑ



"ریلوں کے حادثات روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی" وزیرِ ریلویز ——— اور کانگرسیوں کی ٹکر جو اِن سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

"اُستاد اور طالب علم چوری کے الزام میں گرفتار" ایک خبر ———
اِس میں گرفتاری کی کیا بات تھی۔ وہ تو اُسے فنِ چوری سِکھا رہا تھا۔

"بے زمین کسانوں کا ستیہ گرہ" ایک خبر ——— جب اُن کے
پاس زمین نہیں ہے تو آسمان میں ستیہ گرہ کر رہے ہوں گے

"سوشلسٹ کانگرس میں شامل ہو جائیں گے" ایک خبر ——— تاکہ
کانگرس ٹکٹ پر الیکشن لڑ سکیں۔

"ہندوستان کی امن تجاویز پر چینی وزیرِ اعظم کی نکتہ چینی" ایک خبر
——— اِس لئے کہ چین کو امن پسند نہیں۔

"ہماری سیاست کی خام کاری" ایک عنوان ——— یہ ہے کہ
یہاں ہر شخص سیاسی لیڈر بن جاتا ہے۔

"ہریانہ کے لوگ چنڈی گڑھ کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے"
ایک عنوان ——— اور ماسٹر تارا سنگھ بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھیں گے۔

"ہم نے طوفان کا تو مقابلہ کر لیا مگر ساحل تک نہیں پہنچے" اندرا گاندھی
——— قصور ملّاح کا ہے، ساحل کا نہیں۔

"جمہوریت کے موجودہ رجحانات" ایک عنوان ———
پارلیمنٹ کے ہنگامے اور اسپیکر کی حکم عدولی۔
ہڑتالیں، جلوس اور مظاہرے۔
جھگڑا، فساد اور بدامنی پھیلانا۔
ریلوں کو روکنا۔ بسوں پر پتھراؤ کرنا۔
اسکولوں اور کالجوں سے غائب رہنا۔
آگ لگانا۔ سرکاری جائداد کو نقصان پہنچانا۔
دھرنا دے کر لیٹ جانا اور اُسے بھوک ہڑتال کا نام دینا۔



"ملک کو اِس وقت زبردست مشکلات کا سامنا ہے" اندرا گاندھی

"الٰہ آباد میں طلباء کی مجلسِ عمل کا قیام" ایک خبر ——— آج کل کے طلباء کا عمل سے کیا تعلق۔ اُن کے لئے تو مجلس بے عمل بنائی ہوتی

"فرقہ پرستوں کی طرف سے ہنگامہ آرائیاں" ایک عنوان ——— اِنہی ہنگاموں پر ہے موقوف الیکشن کی رونق۔

"تشدد کو ہر قیمت پر روکا جائے" ایک عنوان ——— اور بذریعۂ تشدد۔

"جن سنگھ اور مسلمان" ایک عنوان ——— دو متضاد چیزیں جیسے آگ اور پانی۔

"چین کو پٹرول اور ڈیزل تیل کی زبردست قلت کا سامنا" ایک خبر ——— پنجاب کے ماہرین کو بُلا لیں۔ پٹرول اور تیل سب تیار کر دیں گے۔

"اُردو کے حق میں پمفلٹ۔ چھ ماہ کی سزا کے لئے جن سنگھ کا مطالبہ" ایک خبر ——— بہت کم ہے چھ ماہ کی پھانسی ہونی چاہئے۔

"تخفیفِ زر کی بیکار بحث" ایک عنوان ——— اِس میں تخفیف کی جائے۔

"لاقانونیت کو برداشت نہیں کیا جائے گا" ایک عنوان ——— اور قانون پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔

"دِلّی میں ۲۱ دل پھینک گرفتار" ایک خبر ——— سڑکوں پر آم اور کیلے کے چھلکے کیا کم پڑے رہتے ہیں کہ لوگوں نے دل بھی پھینکنے شروع کر دئے۔

"ہندوستانی دیہاتی برطانوی سماج میں" ایک عنوان ——— ایسا معلوم ہوگا جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔

"دِلّی میں زرعی پیداوار کے لئے کمیٹی کا قیام" ایک عنوان ——— کسان اب کوئی اور دھندا دیکھیں۔ زرعی کام یہ کمیٹی انجام دیگی۔



"زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے آل انڈیا ریڈیو سے زرعی تقریروں کا پروگرام" ایک خبر

"سینما کی برکتیں" ایک عنوان ـــــ کہ ہر لڑکی سادھنا اور ہر لڑکا دلیپ نظر آتا ہے۔

"کچھ لوگ اپنے لئے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور کچھ لوگ نوکری کے لئے" ایک تبصرہ ـــــ اور کچھ لوگ اسکولوں میں جاکر ہڑتالیں کرنے، سیر و تفریح کرنے، پروفیسروں کو بے عزت کرنے اور پولیس کے ساتھ تصادم کے لئے حاصل کرتے ہیں۔

"مغربی فلموں میں بوس و کنار کو چھوٹ کیوں دی جاتی ہے" وزیرِ اطلاعات و نشریات سے سوال ـــــ تاکہ ہندوستانی مغربی تہذیب و تمدن سیکھ لیں۔

"اخباروں کی مشکلات" ایک عنوان ـــــ ان کے لئے کون شور مچاتے۔ وہ دُنیا بھر کی مشکلات کے لئے شور مچاتے ہیں۔

"دَھن دُگنا کرنے والا گروہ" ایک عنوان ـــــ وزیرِ خزانہ سے ملاقات کرایئے۔

"ہندوستان میں غذائی پیداوار بڑھانے کے لئے امریکی مہم" ایک عنوان ـــــ ہندوستانی کمیونسٹ امریکیوں کا پیدا کردہ غلّہ نہیں کھائیں گے۔

"جی۔ بی روڈ پر گانے والی کے یہاں چھاپہ" ایک خبر ـــــ اور ایک فوجی، ایک آنریری مجسٹریٹ اور چار دوسرے برآمد۔

"ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں چھلانگیں لگا رہی ہیں لیکن کانگری حکمرانوں کو اُن کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں" ایک تبصرہ ـــــ اِس وقت تو بیوی بچوں سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں اور الیکشن تک ہوگی بھی نہیں۔

"دِلّی میں قیمتیں گرانے کے لئے ڈیپارٹمنٹ اسٹور کھولے جارہے ہیں" ایک خبر ـــــ قیمتیں گرانے کے لئے نہیں بلکہ قیمتیں ڈیپارٹ کرنے کے لئے اسٹور کھولے جارہے ہیں۔

"جھوٹ کی ایک قسم" ایک عنوان ـــــ وہ ہے جو مفادِ عام کا نام لے کر بولا جاتا ہے۔

"پنجاب میں بلیک مارکیٹوں کے خلاف مقدموں کی سماعت کے لئے اسپیشل عدالتیں مقرر ہوں گی" ایک خبر ــــــ تاکہ بلیکیوں کو اسپیشل سزائیں دی جاسکیں۔

"محبوبہ کے گھر پر خودکشی کرنے کی کوشش، ناکام عاشق گرفتار" ایک خبر ــــــ نہ محبوبہ ہاتھ آئی نہ موت۔

"ٹیوب ویل یا تیراکی کے تالاب" ایک عنوان ــــــ دونوں ایک میوہ دو مزے۔

"مسلمان اور پاکستان" ایک عنوان ــــــ دونوں ایک ہی چیز کے دو نام نہیں ہیں۔

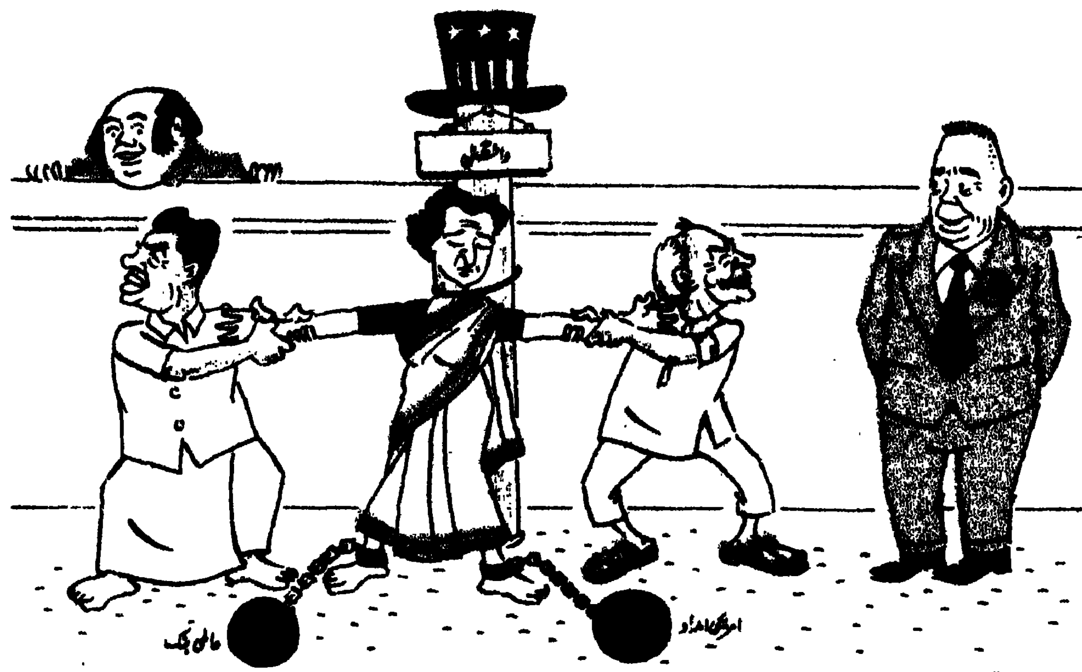
"شہری علاقوں میں ترقی کے پروگرام" ایک عنوان ــــــ جو کانگریس کے دفتروں میں چلتے ہیں۔

"حکومت کو اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنے کا حق حاصل ہے" راجیہ سبھا میں مسٹر چھاگلہ کا بیان ــــــ اور جنتا کو اس پر احتجاج کا بھی حق نہیں۔

"لاگت گھٹانے کے لئے مال کا بہتر انتظام ہونا ضروری ہے" وزیر آبپاشی ڈاکٹر کے۔ ایل۔ راؤ کی تقریر ــــــ بہتر انتظام تو مشکل ہوگا۔ وہ سرکار کے بس کا نہیں۔ کوئی ملاوٹ کا طریقہ بتا دیجئے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ لاگت بھی کم ہو جائے اور مال بھی بافراط ملے۔

"پنجاب میں راشٹرپتی راج کا نفاذ" ایک عنوان ــــــ رحمت ثابت ہوا ہے اور لوگ دعا کرتے ہیں کہ سدا قائم رہے۔

"دولت مسرت نہیں لاتی" ایک عنوان ــــــ بلکہ سوشلزم کے نعرے اور کمیونسٹوں کی دھمکیاں لاتی ہے۔



"ہندوستان کو امریکہ کی گرفت سے آزاد کرانا ہوگا" کمیونسٹ لیڈر ــــــ تاکہ روس کی گرفت مضبوط ہو سکے۔

پیدائش سے بنگالن - ازدواجی اعتبار سے سندھن - سیاسی کام کے لحاظ سے دہلوی اور اب حکومت کرتی ہیں یو۔پی میں ——— آپ کو یو۔پی میں کامریڈ رام کشن کو پنجاب میں، خواجہ صادق کو کشمیر میں وزارت اعلیٰ کا عہدہ کامراج پلان کی لاٹری میں ملا تھا اور ہندوستان میں عورت راج کا سہرا جس کے سر سب سے پہلے بندھا وہ آپ ہی کی ذات ہے جس کو عرف عام میں کہتے ہیں ———



سیاسی زندگی بڑی گول مول رہی ہے - اب جسمانی طور پر بھی گول مٹول بن گئی ہیں - کانگریس میں تھیں - وہاں سے پتی دیو اچاریہ کرپلانی کو لے کر سوشلسٹ پارٹی میں داخل ہوئیں اور پارٹی کا کایا کلپ کر کے اُسے پرجا سوشلسٹ پارٹی بنایا مگر ایک دن اچانک شوہر کو پی۔ ایس۔ پی میں چھوڑ کر خود کانگریس میں پہنچ گئیں - وہاں اُس کے وسیع دسترخوان پر وزارت اعلیٰ ہاتھ آئی مگر نہ خود چین پایا نہ جنتا کو سکھ ملا ——— دن رات ایجی ٹیشن، ہڑتالیں، مظاہرے اور جلوس جنتا نے شعار بنایا اور گول لاٹھی حکومت کا کام ہو گیا - نہ جنتا جیتی نہ آپ ہاریں - اب یہ کھیل آئندہ الیکشن تک جاری رہے گا - اِن دنوں بہت بُری طرح سے جنتا کے نرغے میں آئی ہیں - کلرکوں کی ہڑتال ختم ہوئی تو ملازمین کی چل گئی - دیکھئے کب

بدلتے رنگ

پروفیسر حامدی کاشمیری، ایم۔ اے

بہوری کدل۔ سرینگر

۱۲ر جون ۶۶ء

برادرِ محترم! آداب

مجھے افسوس ہے کہ ہزار دل چاہتے ہوئے بھی افسانہ نمبر میں شریک نہ ہو سکا۔ آپ کے خطوط ملے تھے لیکن میرے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ اُمید ہے آپ میری بے پناہ مصروفیت کے پیشِ نظر خیال نہ فرمائیں گے ــــــ ایک چھوٹا سا افسانہ "بدلتے رنگ" ارسال کر رہا ہوں . . .

آپ کا ــــــــــ حامدی کاشمیری

ہم نئی کالونی کی کشادہ سڑک پر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے ساری کائنات کو مسخر کر لیا ہے، میرے جسم کا ہر ایک روآں احساسِ مسرت سے سرشار تھا۔ میں ابھی تک نشے میں چُور تھا۔ یہ کبھی نہ اُترنے والا نشہ تھا۔ کتنی تیزی تھی اِس نشے میں۔ کتنی تاثیر، کتنی لطافت اِس میں مِس آفندی کے گلنار ہونٹوں کی آتشیں حدت، اُس کی سُلگتی ہوئی عریاں باہوں کا گداز اور اُس کی گہری نشیلی آنکھوں کا جادو گھل گیا تھا۔ یہ نشہ چاندنی کی سیمیں لہروں پر بہتی ہوئی اُس بہکی بہکی رات کے سینے میں بھی اُتر گیا تھا۔ رات دیوانی ہو رہی تھی، اور پیرسٹر میں روشنی کی تیز جگمگاہٹوں میں انگریزی سازندوں کی جذبات انگیز دُھن پر رقص جاری تھا۔ ٹیبلوں پر شراب کے جام کھنک رہے تھے، خوشبو اُڑ رہی تھی۔ سازوں کی دُھن کلائمکس کو چھو رہی تھی۔ پسینے میں دمکتے ہوئے نیم عریاں نسوانی نقرئی بدن اپنے ہم رقصوں کے بازوؤں میں جھول رہے تھے اور مِس آفندی جھومتی ہوئی، لہراتی ہوئی مدّھم سی سبز روشنی میں اب میرے بازوؤں کے حلقے میں جذب ہو رہی تھی اور اُس کے جوان مہکتے ہوئے جسم کی ساری خوشبو اور سارا گداز میرے جذبات میں قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح گھل رہا تھا۔ اُس کے کانپتے ہوئے رسیلے ہونٹوں پر خود سپردگی کے الف لیلوی افسانے بکھرے ہوئے تھے۔

اور ہم رات گئے جب پیرسٹر سے لوٹے، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، تو میں کتنا مسرور تھا! مسرت کا یہ احساس کتنا انوکھا تھا۔ دیوانہ کرنے والا۔ مِس آفندی میری ہو چکی تھی۔ مِس آفندی! جس کے حُسن و جمال کا چرچا ساری کالونی میں تھا اور جس کے حُسن کی تمکنت اور غرور میں ایک مرعوب کُن سحر تھا۔ نئی کالونی کی خاموش سڑک پر چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ نئی وضع کے بنے ہوئے خوبصورت سفید مکان شفاف چاندنی میں نہا رہے تھے۔ بہت ہی پُراسرار رات تھی۔ خاموش، نور فشاں، خوابوں کے حُسن میں کھوئی ہوئی اور میں خوابوں کا شہزادہ روشنی کی راہوں پر اپنی محبوبۂ دلنواز کی مہکتی ہوئی گلنار ہتھیلیوں کو چُوم رہا تھا۔ ہم روشنی کی راہوں پر قدم بڑھا رہے تھے۔ چاند ہمارا ہم سفر تھا اور ستارے ہمراز!

نئی کالونی کے لوگ سوئے پڑے تھے۔

میری تقدیر جاگ اُٹھی تھی۔ ابھی اِس کالونی میں آئے ہوئے مجھے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ مِس آفندی اپنے حُسن و شباب کی رعنائیوں کے ساتھ میری ہو چکی تھی۔ میرا خالی دامن کونین کی دولت سے بھر چکا تھا۔ میری زندگی کی ویران تنہائیوں میں گلابوں کے ہجوم مُسکرا رہے تھے۔ سارا دن اِنکم ٹیکس کے کاغذوں کے پلندوں میں بھی اُس کے پُرتمکیں چہرے اور گہری نشیلی آنکھوں کی یاد، دفتر کے بوجھل لمحوں میں حُسن و رنگ کی پھوار برساتی!

وہ میرے ہوش و حواس کی دُنیا پر چھا چکی تھی!

مجھے اُس سے محبت ہو گئی تھی، یہ سوچ کر قلبی گداز کی جس کیفیت سے میں دوچار ہوتا، وہ میرے لئے کتنی اجنبی تھی!

میں نے جس سیٹ کو کرایہ پر لیا تھا مس آفندی اُس کے عین مقابل، پختہ سڑک کے پار چھوٹے سے خوشنما بنگلے میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کے ڈیڈی ریٹائرڈ انجینئر تھے۔ مس آفندی کے بیڈ روم کی کھڑکی میرے بیڈ روم کی طرف کھلتی ہے۔ یہاں اپنے قیام کے دوسرے دن جب میں دفتر سے لَوٹ کر کھڑکی کی طرف آیا، میں نے پردہ ہٹایا تو سامنے کی کھڑکی پر وہ بجلی کی طرح لہرائی۔ حُسن اور جوانی کی ایک جیتی جاگتی مُورت! اُس کے جدید وضع کے گُندھے ہوئے لہردار بال، اُس کے پُرتمکنت رخساروں سے پھُوٹتی ہوئی گُلابی! اور اُس کی گہری نشیلی آنکھوں کی بے باک سادگی ——— وہ مجھے برابر پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ دل میں اُتر جانے والی نگاہوں سے!

اور زندگی میں پہلی بار ایک اچھوتی کیفیت میرے وجود کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔

اور پھر جب بھی میں کھڑکی پر آتا، وہ مجھے نظر آتی، آنکھوں میں تکلّم کا محشر لئے اور ہیرے کی طرح ترشے ہوئے ہونٹوں پر تبسّم کی روشنی بکھیرے ہوئے!

میرے خاموش خیالوں کی دُنیا میں تموّج پیدا ہو چُکا تھا۔

میری راتیں سوچ کے انگاروں پر لوٹتیں!

اتوار کو میں اُس کے ہاں چائے پر مدعو تھا۔ دھُوپ خوشگوار تھی۔ تر و تازہ سبزے پر ٹیبل لگا ہوا تھا اور مس آفندی چائے بنا رہی تھی۔ کسی قیمتی دھات کا بنا ہوا منقّش ٹی سیٹ ٹیبل کی زینت بنا ہوا تھا۔ پورچ کے سنگِ سیاہ کے ستونوں کے ساتھ عشق پیچاں کی بیلوں کی نازک پتّیاں ہوا کے معطّر جھونکوں سے رہ رہ کر ہلتیں اور مس آفندی کی مرمریں پیشانی پر ریشمی بال لہراتے۔ اُس کی نگاہوں سے مسرّت کی شعاعیں پھُوٹ رہی تھیں۔ اُس نے بہت ہی چُست قمیص اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ جس میں اُس کے سڈول اور بھرے بھرے جسم کے خطوط جھلک رہے تھے۔ اُس کے جسم کو دیکھ کر ایک گہری، شاداب اور پُراسرار جھیل کا خیال آتا، جس کے سینے پر مرمریں کنول کِھلے ہوئے ہوں۔ آنکھوں کے نیچے ہلکی سی سیاہی سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی تیس بہاریں دیکھ چُکی ہے۔ کتنی بھرپُور جوانی ہے! کتنا بھرپُور جسم! اُس کی صندلی گردن اور گداز شانوں کا زیادہ حصّہ کھُلا تھا۔ اُس کے صحت مند جسم کے گندمی رنگ کا غمّاز!

انجینئر صاحب چائے کی چُسکی لیتے اور پھر پیالی ٹیبل پر رکھ دیتے۔ وہ مختلف موضوعات پر بولتے چلے جا رہے تھے۔ فراخ چہرے پر جھُرّیوں کے گھنے جال کے باوجود اُن کی صحت اچھی تھی لیکن مسلسل باتیں کرنے سے اور غیر ضروری تفصیلات میں ڈوب جانے کی عادت سے میرے لئے اُن کی کہنہ سالی میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ وہ چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارنے کے بعد رُک جاتے اور گفتگو کا سلسلہ کسی دوسری کڑی سے ملاتے میں بظاہر سُننے کا فرض پُورا کر رہا تھا لیکن میری ساری توجہ مس آفندی کی طرف تھی جو بیچ بیچ میں اپنے ڈیڈی کو ٹوکتی، سوال کرتی میری طرف دیکھتی، تبسّم کی بجلیاں گراتی اور میں اپنی خوش قسمتی پر حیران ... سے محبت سے چھلکتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جاتے وقت انجینئر صاحب نے مجھے اپنا انکم ٹیکس کیس سمجھانا چاہا، لیکن مس آفندی نے فوراً ٹوکا۔

"رہنے دیجئے ڈیڈی! کسی اور وقت سہی۔ ایسی بھی کیا جلدی ... اب اشفاق صاحب کو دیر ہو رہی ہے"

"اچھا بابا جو تمھاری مرضی"

میں کچھ نہ کہہ سکا اور وہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ گیٹ پر ... اُس نے متبسّم ہونٹوں سے کہا۔

"اشفاق صاحب شام کا کیا پروگرام ہے؟"

"میرا؟"

"جی ہاں ——— آپ کا!" اُس کے لہجے کی نغمگی مسحور کُن تھی۔

"کچھ نہیں ——— بس ——— بس"

"تو چلئے نیو پارک گھوم آئیں"

"ضرور ——— ضرور ———!"

"میں تیار ہو جاتی ہوں ——— آپ گھر پر میرا انتظار کیجئے۔ میں ڈیڈی کو انفارم کر دوں گی۔ بائی، بائی!"

"بائی بائی!"

وہ تبسّم کے پھُول بکھیرتی ہوئی مست ہرنی کی طرح چِکتی ہوئی واپس مُڑی اور میں حیرت زدہ کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں سڑک پر راستہ ... ہوں یا خوابوں کے بادلوں کے ساتھ اُڑ رہا ہوں۔

صبح میں دیر سے جاگا۔ دھُوپ نکل آئی تھی۔ میں نے انگڑائی لی اور آنکھیں ملیں۔ رات کے البیلے واقعات ایک ایک کر کے میرے احساس میں اُبھرنے لگے اور میں زندگی کے ایک نئے موڑ سے گزرنے کے عزم و یقین کے ساتھ بستر سے نکلا۔ آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن تھا۔

میں باتھ روم سے نکلا تو نوکر نے اطلاع دی کہ کل والے صاحب پھر آئے ہیں۔

"کہہ دو، میں آیا ہے"

میں جلدی سے اِس آدمی سے نمٹنا چاہتا تھا۔ یہ کل بھی آیا تھا اور گزشتہ اتوار کو بھی لیکن میں گھر میں موجود نہ تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ آئل فیکٹری کا مالک ہے۔ کار میں آتا ہے۔ ہو سکتا ہے انکم ٹیکس کے چکر میں ہو۔ بے ہنگم لوگ!

"میں اُسی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اُس کا ساتھی، لیکن بعد میں میں نے سروس چھوڑ دی اور بزنس شروع کیا ——" وہ کہہ رہا تھا اور ایک ایک لفظ جو درد و غم سے بوجھل تھا، اُس کے منہ سے بمشکل نکل رہا تھا اور ہر لفظ سیسہ بن کر میرے کانوں میں اُتر رہا تھا۔

"میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری لاکھوں کی جائداد ہے لیکن سب بیکار ہے۔ اُس نے مجھے پاگل بنا دیا ہے ——" وہ تیز سانسوں سے اُلجھ رہا تھا اور اُس کی بڑی بڑی باہر کو نکلی ہوئی ویران آنکھوں میں وحشت کے بگولے اُٹھ رہے تھے۔

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔

"اشفاق صاحب! اُس نے میرے ہوش و حواس کو لوٹ لیا ہے۔ کئی راتیں اُس نے میرے ساتھ گزاری ہیں لیکن اب —— اب وہ بالکل بدل گئی ہے —— آپ کے کوئی راہ بتائیے، مجھ پر کرم کیجئے۔ میں —— میں ساری زندگی آپ کا ممنون رہوں گا۔ میں نے سنا ہے آپ کا اُس پر بہت اثر ہے ——"

اچانک دھرم ویر کی تصویر میری نگاہوں میں اُبھری۔ ایک بلند قامت ذہین آنکھوں والا نوجوان جو کلب میں مجھے ملا تھا اور جس نے وہسکی کے جام پر جام خالی کرنے کے بعد کہا تھا کہ مس آفندی ناگن ہے۔ اُس نے مجھے ڈس لیا ہے —— وہ بہت بے رحم ہے۔ اُس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے! اور جب میں نے مس آفندی سے اُس کا ذکر کیا تو وہ بہت بے پروائی سے ہنس دی تھی!

اور پھر صابر؟ اُلجھے اُلجھے بالوں والا مشہور آرٹسٹ، جس نے مس آفندی کی ایک نیم عریاں تصویر بنائی اور پاگل ہو گیا! —— یہ دُھند میں لپٹی ہوئی مسخ شدہ تصویریں، حرکت کرتے ہوئے سائے۔ اُف! مجھے اِن سے ڈر لگتا ہے! —— یہ سب کون ہیں؟ —— یہ میری مسرّتوں کے رہزن ہیں۔ مجھ سے میری خوشیوں کو چھین لینا چاہتے ہیں۔ مس آفندی کا کردار اُن کے لئے معمہ ہے۔ وہ اُس کے کردار کی پیچیدگی کو سمجھ ہی نہ سکے ہیں۔ نفسیات کے مطالعے سے مجھے یہ فائدہ ہوا ہے کہ میں اپنے ملنے والوں کے بارے میں کوئی فوری رائے قائم نہیں کرتا۔ یہ عظیم عورت ہے۔ اِس کی نفسیات میں گہرائی ہے۔ کسی مرد سے دو گھڑی ہنس بول لینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اُس پہ دل و جان سے فریفتہ ہو گئی۔ عورت کو سمجھنا کتنا مشکل ہے اور یہ نئے زمانے کے بوالہوس —— عورت پہلے بھی ایک حسین راز تھی اور آج بھی ہے!

مجھے اطمینان ہوا اور میں نے آئل فیکٹری کے مالک کی بھیانک باتوں کا اثر ذہن سے نوچ پھینکا اور دوسرے ہی لمحہ دھرم ویر اور صابر بھی سایوں کی مانند کافور ہو گئے!

اُس شام مس آفندی سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں دوسرے دن شام کو مس آفندی کے گھر گیا لیکن نوکر سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی آفس سے لوٹی نہیں۔ میں دوسرے دن بھی گیا اور اتوار تک برابر جاتا رہا لیکن مجھے کہیں اُس کا سایہ بھی نظر نہ آیا۔ میری بے چینی بہت بڑھ گئی تھی اور میرا ذہنی سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ اتوار کو انجینئر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے مس آفندی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے رومال سے دبیز عینک صاف کرتے ہوئے بڑھتی ہوئی قیمتوں پر تشویش کا اظہار کیا اور میں بہت بے دلی سے اُن کی باتیں سنتا رہا اور جب میں وہاں سے لوٹا تو مجھے مس آفندی کے بارے میں کوئی اطمینان بخش اطلاع نہیں ملی تھی۔

میرا قلبی اضطراب زیادہ بڑھ چکا تھا۔

شام ہو رہی تھی۔

میں پارک روڈ سے تنہا گزر رہا تھا۔ مایوسی، اضطراب اور بے دلی کا مجسمہ بنا ہوا۔ کتنی ویران اور اُداس شام تھی! اپنی قرارِ جاں کو دیکھے ہوئے آج ہفتہ ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے ہر جگہ ڈھونڈا۔ اُس کے آفس بھی گیا۔ گھر تقریباً روز جاتا رہا۔ کلب گیا۔ پریمیئر کے پھیرے لگائے لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ دریچہ بند تھا۔ وہ کہاں تھی؟ جیسے وہ پر لگا کر اُڑ گئی تھی! دُنیا میرے لئے ویرانہ تھی اور ——

اچانک وہ مجھے سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی —— وہی تو ہے! وہی اندازِ خرام، جیسے جھومتی گھٹائیں۔ ہر عضو سے مستی چھلکتی ہوئی۔ وہی پُر تمکنت رخسار، وہی آنکھوں کی بے باک سادگی۔ وہی ریشمیں گیسوؤں کی گھٹائیں ——

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا!

شام کے رنگیں سائے لرزنے لگے!

وہ اب نزدیک آ رہی تھی۔ میں نے دُور ہی سے اُسے پہچان لیا تھا لیکن ابھی اُس نے مجھے دیکھا نہیں —— وہ قریب آ رہی تھی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ کوئی اُس کے ساتھ تھا۔ کون؟ —— ہو گا کوئی۔ مجھے اُس سے مطلب؟

اور جب وہ میرے سامنے پہنچی تو میرے قدم رُک گئے، میرا جسم لرزنے لگا۔ ہماری نگاہیں ملیں اور —— اور دوسرے لمحے میں نے دیکھا، وہ بہت بے نیازی سے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر آگے بڑھی۔ اُس نے مجھے پہچانا نہیں شاید؟ —— نہیں،

اُس نے مجھے دیکھا اور پہچانا بھی ——— پھر ؟
مجھے محسوس ہوا کہ میں زمین میں دھنس گیا ہوں !!

میرے بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ باتیں کر رہی تھی۔ اچانک اُس کا لہجہ اُداس ہو گیا اور اُس کی دراز سیاہ پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ اچانک میرے پاس آئی تھی اور میں ابھی تک سوچ رہا تھا کہ میں بیداری کے عالم میں ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ اُس کے یوں اچانک چلے آنے کی قیامت نے ابھی دم نہ لیا تھا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی نمی جھلکنے لگی ——— اِن قیامتوں کا سامنا کرنے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میرا جگر پھٹنے لگا اور وہ کہہ رہی تھی ———

"اشفاق صاحب! کسی کو نہیں معلوم کہ میں اپنے سینے میں کتنے زخم چھپائے بیٹھی ہوں ——— یہ زخم اندر ہی اندر رِستے رہتے ہیں ——— یہ دیکھئے ——— یہ دیکھئے ——— " اچانک اُس نے گردن پر سایہ کئے ہوئے ریشمیں بالوں کی ایک لٹ اپنے ہاتھ سے اُلٹ دی۔ میں نے دیکھا کہ بالوں کا ایک گچھا سفید ہو چکا ہے ——— "میں بھی عجیب انسان ہوں۔ میں مُسکراتی رہتی ہوں ——— میری زندگی ایک ویرانہ ہے۔ میری تنہائیاں زہر بھری ہیں۔ میں سب کچھ کھو بیٹھی ہوں اور حقیقت سب کچھ پا چکا ہے۔ اُس کا گھر آباد ہے۔ بیوی ہے، بچے ہیں اور اب وہ مجھ سے مِلتا ہے تو اِتنے تکلف سے، جیسے اُس نے کبھی میری محبت کا دم نہ بھرا تھا۔ اُس کی مُسکراہٹ میں کتنا تصنع ہے۔ میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے ——— "

معاً وہ اُٹھ بیٹھی۔

"ارے، کمال ہے! میں بھی کس ذکر کو لے بیٹھی۔ ڈیڈی سچ ہی کہتے ہیں کہ میں میڈ کیپ ہوں ——— اچھا اب میں چلتی ہوں۔ شام کو پریس میں کپتان بیرنگھم نے ڈنر پر بلایا ہے ——— بائی بائی !"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ بیٹھی اور مجھ پر ایک مشفقانہ مُسکراہٹ ڈال کر جانے لگی۔

میرے لبوں پر مہرِ سکوت تھی اور ہاتھ پاؤں بے حس و حرکت !
نئی کالونی شام کے بدلتے ہوئے رنگوں میں ڈوب چکی تھی !!

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کے لئے ہمیشہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

غزل

سید حباب ترمذی

لائے گا رنگ میرا پیار آج نہیں تو کل سہی
خود بھی وہ ہوں گے بے قرار آج نہیں تو کل سہی

پھول کھلیں گے بے شمار آج نہیں تو کل سہی
آئے گا موسمِ بہار آج نہیں تو کل سہی

مہکے گا عشق کا دیار آج نہیں تو کل سہی
پھیلے گی بوئے زلفِ یار آج نہیں تو کل سہی

دونوں بنیں گے شاہکار آج نہیں تو کل سہی
میرا خلوص تیرا پیار آج نہیں تو کل سہی

دیکھ دلِ الم نصیب فکر نہ کر، کہ غم نصیب
ہوگی فضا یہ سازگار آج نہیں تو کل سہی

صبر سے اور کام لے دامنِ ضبط تھام لے
جبر پہ ہوگا اختیار آج نہیں تو کل سہی

اے مرے جذبِ آرزو بڑھتا رہا یونہی جو تُو
وہ بھی کریں گے مجھ سے پیار آج نہیں تو کل سہی

جاگ اُٹھیں گے اہلِ خواب لا کے رہے گی انقلاب
میری نوا، مری پکار آج نہیں تو کل سہی

خونِ وفا ہے صرفِ کار اب کے یہ موسمِ بہار
کانٹوں پہ آئے گا نکھار آج نہیں تو کل سہی

ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا آپ کو حضور
میری وفا کا اعتبار آج نہیں تو کل سہی

لاکھ ہو بحرِ بے کنار [illegible] اگر ہے پائیدار
کشتی حباب ہوگی پار آج نہیں تو کل سہی

دُودھ کا جَلا

ش مظفر پوری

روزنامہ "ملک و ملت" بلیماران۔ دہلی ۶

۲۱ جون ۱۹۶۶ء   محترم خوشتر بھائی! السلام علیکم

باغ و بہار افسانہ نمبر کا شکریہ۔ اس کے متعلق "آفتاب آمد دلیلِ آفتاب" سے زیادہ کیا کہوں۔۔۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند! ایسے کامیاب نمبر نکالنا گویا آپ کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔۔۔۔۔ بعض احباب کو شکایت ہے کہ طنز نگاری کے شوق میں میرا اصل رنگ پھیکا پڑتا جا رہا ہے۔ ذرا ذائقہ بدلنے کے لئے اپنے اصل رنگ کی ایک کہانی "دُودھ کا جلا" حاضر ہے۔۔۔۔ "پولیٹیکل واقف" کے بعد اب "سیکنڈ ہینڈ واقف" بھی تیار ہے۔ جب کہیے پیش کر دوں۔ باقی بدستور۔۔۔

آپ کا اپنا۔۔۔۔۔۔ ش مظفر پوری

بس کچی سڑک پر لڑکھڑاتی، ہچکولے کھاتی رینگ رہی تھی۔

کئی ماہ کے بعد کشور شہر سے گاؤں لوٹ رہا تھا۔

امتحان کے بعد کالج تقریباً ڈھائی ماہ کے لئے بند ہوا تھا۔ شہر سے گاؤں اُس کا آنا جانا لگا ہی رہتا تھا لیکن اِس بار وہ بہت مسرور تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ پر لگ جاتے اور وہ اُڑ کر اپنے گاؤں۔۔۔۔ اپنے گھر۔۔۔۔ اپنی ماں کے پاس پہنچ جاتا۔ ماں، جو آج اُس کی آمد کی خوشی میں باؤلی ہو رہی ہوگی۔ اُس نے اپنے بیٹے کے لئے کیا کیا اہتمام کر رکھا ہوگا۔ ڈھیر ساری اچھی اچھی چیزیں پکا کر رکھی ہوں گی سامنے بٹھا کر پنکھا جھل جھل کر کھلائے گی اور چار پانچ مہینے کی رام کہانی سنائے گی۔ گھر میں اور رشتہ داری میں گزری ہوئی چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی، ساری باتیں اور سب سے آخر میں دبی زبان سے کہے گی "بیٹا، اب تو شادی کے پیغامات ٹالتے ٹالتے ناک میں دم آ چکا ہے۔ اب تو تو بی۔ اے بھی پاس کر چکا ہوگا۔ اپنا وعدہ پورا کر۔ تو ہاں کر دے تو میں بھی کہیں ہاں کر دوں۔"

اور ایسی ہی بہت ساری باتوں کے تصوّر میں کشور بھری بس میں جھٹکے اور ہچکولے کھا رہا تھا۔ اِس بار کشور گھر پہنچنے کے لئے بہت بے تاب تھا۔ اُس کی ماں اُس سے بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہی ہوگی۔ پچھلی بار جب وہ گھر سے شہر آیا تھا تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہو گیا تھا۔ کشور کے لئے چھوٹا سا لیکن اُس کی ماں کے لئے بہت بڑا۔ اُس نے بمبئی کی سیر کو جانے کے لئے ماں سے روپے مانگے تھے۔ ماں نے ٹال دیا تھا۔ ماں نے بمبئی کے بڑے بڑے قصے سُن رکھے تھے جن کی وجہ سے وہ بمبئی کو "کامروپ کماکھیا" سمجھتی تھی۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ جو لڑکا بمبئی جاتا ہے وہ خراب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں گلی گلی ناچ رنگ والی کسبیاں پھرتی ہیں۔

پھر بھی ماں نے انکار نہیں کیا تھا، صرف یہ کہہ کر ٹال دیا تھا "جب تیری شادی ہو جائے تب جہاں جی چاہے جا!"

بس اسی بات پر کشور ماں سے رُوٹھ کر شہر چلا آیا تھا اور اِس دھمکی کے ساتھ کہ وہ گرمیوں کی تعطیل میں بھی گھر نہ آئے گا کسی دوست کے گھر چلا جائے گا۔

لیکن ماں کی ممتا کچا دھاگا نہیں ہوتی کہ اُسے توڑ کر کوئی نکل جائے۔

جب کشور نے پانچ ماہ کے دوران ہر چھٹی شہر میں گزار دی اور ماں کے بلاوے کا کوئی اثر نہ لیا تو گرمیوں کی لمبی تعطیل شروع ہونے سے پہلے ماں نے اُسے لکھ بھیجا۔۔۔۔ "اب تو میں خود تیرے پاس پہنچ کر دیکھتی ہوں کہ تو گھر کیسے نہ آئے گا۔ بمبئی تو کیا میں تجھے ولایت بھیج سکتی ہوں لیکن پہلے تجھے شادی کرنی ہوگی۔"

ماں کی اِس بات کو یاد کر کے کشور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ سامنے بیٹھے ہوئے دو تین مسافروں کو کشور کے اپنے آپ مسکرانے پر اچنبھا سا ہو رہا تھا۔

کشور دل ہی دل میں سوچنے لگا: "ماں بھی کتنی بھولی ہے۔ مجھے جیسے کنواری

لڑکی سمجھتی ہے جس پر زندگی کی مسرّتوں اور دُنیا کی رنگینیوں کے دروازے شادی کے بعد کھلتے ہیں۔

سڑک پر لڑھکتی ہوئی کسی بیل گاڑی کو بچانے کے لئے ڈرائیور نے اچانک بریک لیا تو بس کے سارے مسافر ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور خوف سے کلیجہ دہل گیا۔

کشور کے خیالات کے سارے تانے بانے ٹوٹ گئے۔

اور سب سے بڑا غضب یہ ہوا کہ بس خراب ہو گئی۔ کشور کا جی چاہا ڈرائیور کو گولی مار کر بس کو آگ لگا دے! وہ سوچنے لگا اگر وہ وقت پر گھر نہ پہنچ سکا تو اُس کی ماں کا کیا حال ہوگا۔ مایوسی کے عالم میں اُس کے دل و دماغ میں نہ جانے کہاں کہاں کے خیالات بسیرا کر لیں گے ـــــ ماں نے کیا کیا پکا کر رکھا ہوگا۔ کیا کیا سوچ رکھا ہوگا۔ سب پر پانی پھر جائے گا۔

جب بس کنڈکٹر نے بتایا کہ کچھ ٹھیک نہیں کہ کتنی دیر میں بس آگے چل سکے تو مسافر بے بسی کی لمبی سانس لے کر نیچے اترنے لگے کہ گھٹن سے نکل کر ذرا دیر تازہ ہوا میں سانس لے سکیں۔

کشور بھی باہر نکل آیا۔ وہ دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا۔ ابھی تو آدھی مسافت بھی طے نہیں ہوئی تھی۔ منزل دُور تھی۔ اِتنی دُور پیدل بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تو بس کی مسافت باقی تھی۔ اگر بس ٹھیک وقت پر پہنچتی تب وہ سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے اپنے گاؤں سے پرے دھرم پور میں اُترتا جہاں سے تقریباً ایک میل پیدل چل کر اپنے گھر پہنچتا لیکن اب تو وہ راستے ہی میں پھنس گیا تھا۔ نہ جانے بس کب ٹھیک ہو، کب چلے اور کب پہنچے۔ اِس خیال سے کشور کے دل میں ہُوک سی اُٹھی کہ اگر آج وہ گھر نہ پہنچ سکا تو ماں ساری رات سو نہ سکے گی۔

بس کے سارے مسافر ایک ایک کر کے باہر نکل چکے تھے۔ صرف ایک عورت بس میں بیٹھی رہ گئی تھی جس کی شکل کشور کو صاف نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ پہلے بھی، بس کے اندر دم گھٹنے والی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اُس عورت کی طرف اُس کی نگاہ نہ اُٹھ سکی تھی۔

ڈرائیور، کنڈکٹر، خلاصی اور میکانک سب کے سب بس کے انجن پر ٹوٹ پڑے تھے اور اُس کے مُردہ جسم میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مسافر اِدھر اُدھر منتشر ہو کر اپنا اپنا شغل کر رہے تھے۔ کوئی بس والوں کو گالیاں دے رہا تھا تو کوئی سیاسیاتِ حاضرہ پر اپنے گرما گرم خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ کوئی مقدمہ اور کچہری کی باتیں کر رہا تھا تو کوئی بیوپار اور دوکانداری کا رونا رو رہا تھا لیکن کشور کچھ نہیں کر رہا تھا۔ وہ صرف اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا ـــ پھر ماں کہے گی کہ جہاں کے لئے تُو ہاں کر دے وہاں ماسٹرنی جی کو تیری کر لڑکی پسند کر دوں ـــ سماج کلیان والی بچوں کی اُستانی پربھا دیوی بہت خوش مزاج عورت تھی اور اپنے ہاتھ کی لکیریں پڑھوانے کے لئے کشور کو بہت پریشان کیا کرتی تھی۔ کشور نے اُس پر جھوٹ موٹ رنگ جما رکھا تھا کہ وہ ہاتھ کی ریکھائیں پڑھتا جانتا ہے۔ وہ لکیریں دیکھ دیکھ کر اٹکل پچّو اُلٹی سیدھی باتیں بتایا کرتا۔ کچھ باتیں جو بہت عام نوعیت کی ہوا کرتی تھیں وہ پربھا دیوی کے حالات پر منطبق ہو جایا کرتیں۔ پربھا دیوی کو کشور کے علم فراست پر یقین ہو چکا تھا۔ پربھا دیوی بہت شریف اور خوش طبع عورت تھی۔ اُس کے دونوں بچے بھی اُس کے ساتھ رہتے تھے۔ بیوہ ہونے کے بعد اُس نے سماج کلیان میں اُستانی گیری شروع کر دی تھی۔ وہ کسی دُور دراز گاؤں کی رہنے والی تھی۔ سرکار نے اُس کی پہلی تقرری کشور کے گاؤں رگھوناتھ پور میں کی تھی اور وہ چار سال سے یہیں پڑی تھی۔ تبادلہ کا نوٹس ملتا تو گاؤں والے پیروی کر کے اُسے روک لیتے۔ سماج کلیان کے لئے زمین کشور کے باپ نے دے رکھی تھی۔ اِس لئے اُس کے گھر سماج کلیان کے عملے کا گہرا میل جول رہتا تھا۔ یہ عملہ ایک گرو جی، ایک لیڈی ہیلتھ وزیٹر، ایک گرام سیوکا اور لیڈی ٹیچر پربھا دیوی پر مشتمل تھا

کشور کو یہ سب باری باری یاد آ رہے تھے۔

بس کی مرمّت جاری تھی۔

آفتاب ڈھل کر بالکل نیچے آ گیا تھا جس سے دھوپ کی تمازت بہت کم ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بدلیوں کی وجہ سے بھی دھوپ کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف دُور دُور تک کھیت اور جا بہ جا درختوں کے جھُنڈ نظر آ رہے تھے۔ پچھلے دنوں کی موسلا دھار بارش سے کھیتوں میں جا بہ جا پانی چمک رہا تھا۔ کھیتوں کی مینڈھوں پر سبز دُوب دُھل کر نِکھر گئی تھی اور سڑک کے کنارے کنارے اُگی ہوئی دُوب اور گھاس کی بکھری سُتھری ہریالی سے آنکھوں کو فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے دُور تک نظر دَوڑانے سے ایسا معلوم ہوتا تھا، قدرت نے سڑک کی دونوں طرف ہرے رنگ کی پٹّیاں لگا دی تھیں۔

آخر وہ عورت بھی تھک کر اور پریشان ہو کر بس سے باہر نکل آئی۔

کشور نے اب اُسے غور سے دیکھا۔ وہ عورت نہیں لڑکی تھی۔ اِکّیس بائیس سال کی تندرست اور پختہ شعور رکھنے والی ایسی لڑکی جسے زمانے سے واسطہ پڑ چکا ہو۔ اُس کی ہلکی سانولی رنگت نے اُس کے چہرے کے تیکھے نقوش میں بہت ملاحت اور جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ اُس کے سادہ چہرے پر بس ایک ننھی سی کیل دمک رہی تھی۔ گہرے نیلے کنارے کی سفید براق ساڑی، شریفانہ وضع قطع کا بلاؤز اور پاؤں میں معمولی قسم کی چپلیں۔ بالوں کی لٹ گوندھنے کی بجائے اُس نے جلے گھر کی

عورتوں جیسا جوڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی اٹیچی اور دوسرے میں رنگین جالی دار تھیلہ تھا ـــــ اُس کی آنکھوں میں خاموشیوں اور اُداسیوں کا بسیرا تھا۔ اُس کے چہرے سے بیزاری، کوفت اور گھٹن کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ چُپ چاپ سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی۔

اُسے سب دیکھ رہے تھے لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہ کبھی فضا میں اُڑتے ہوئے پنچھیوں کے جُھنڈ اور کبھی کھیتوں میں چرتے ہوئے مویشیوں پر بھٹکنے لگتی تھی۔ جس طرح کشور کے چہرے پر ماں کے پاس جانے والے بیٹے کی اُمنگوں اور مسرتوں کی چمک تھی، بالکل اُسی طرح اُس مغموم لڑکی کے چہرے پر ماں سے جُدا ہونے والی لڑکی کی اُداسی کانپ رہی تھی۔ لڑکی اپنے چہرے کی کیفیت سے بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔

لڑکی کو تنہا دیکھ کر ایک مسافر عورت اُس کے قریب آ گئی۔ دونوں میں کچھ باتیں ہونے لگیں۔ کشور محض اُس لڑکی کی آواز سُننے کے شوق میں اُن دونوں کے قریب آ گیا۔ اُس کی آنکھیں کہیں اور تھیں لیکن کان اُن دونوں کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ آواز صاف اور ہلکی تھی۔ کشور نے اُن دونوں کی بات ادھوری سُنی تھی۔ اس لئے پوری بات سمجھ میں نہ آ سکی۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ لڑکی پہلی بار کسی گاؤں جا رہی تھی۔ منزل بھی اجنبی اور راستہ بھی اجنبی۔ بس خراب ہونے کی وجہ سے وہ ڈر رہی تھی کہ اگر رات ہو گئی تو وہ نئی جگہ پر نئے راستوں سے کیسے پہنچ سکے گی۔

کشور پھر الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور لڑکی کو دیکھنے لگا لیکن اِس طرح نہیں جس طرح وہ کالج میں یا شہر کی سڑکوں پر لڑکیوں کو گھورتا رہا تھا۔ اِس لڑکی کی بات کچھ اور تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ لڑکی باتوں کے دوران کسی کسی لمحہ مُسکرا بھی دیتی تھی۔ اور ایک بار جب وہ کسی بات پر ذرا سا ہنس پڑی، تو کشور نے پہلی بار جانا کہ حُسن صرف چہرے کا نام نہیں۔ جو چیز چہرے کے حُسن کو فروزاں کرتی ہے وہ مُسکراہٹ ہے۔ ہر مُسکراہٹ لڑکی کے چہرے کی تازگی اور شادابی میں نُور بھر دیتی تھی۔

شام کا جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ مسافروں کی اُکتاہٹ اور بددلی اب اشتعال کی صورت اختیار کرنے لگی تھی۔ کچھ لوگ بس والوں کو گالیوں کے ساتھ مارنے کی دھمکیاں دینے لگے تھے کیونکہ اِس ویران اور سنسان مقام پر بھوکے پیاسے رات گزارنے کا تصور ہر کسی کو پریشان کئے دے رہا تھا۔ وہ لڑکی تو اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ ذرا دیر میں بس اب وہ رو پڑنے والی تھی۔

لیکن اچانک بس والوں نے مسافروں کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو جان میں جان آئی۔ کسی نہ کسی طرح بس کو چلنے کے قابل بنا لیا گیا تھا۔

دیہات کی ناہموار اور ریتیلی سڑک پر جب بس کے پہیے متحرک ہوئے تو مسافروں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ وہ لڑکی پھر بس کے کسی گوشے میں نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بس ابھی دو تین میل گئی ہو گی کہ اندھیرا چھا گیا۔ ایک طرف سے گھٹا اُٹھی تو اندھیرا اور بھی گہرا ہونے لگا۔ عجیب اُلجھن کی گھڑی اور عجیب وسوسے کا عالم تھا ـــــ جوں جوں مسافت طے ہوتی جاتی تھی کشور کے دل کی دھڑکن خوشی سے تیز ہوتی جاتی تھی۔ اُسے آج ہر قیمت پر گھر پہنچنا تھا۔ اپنی ماں کے پاس، جو بے قراری سے اُس کی راہ دیکھ دیکھ کر مایوس ہو چکی ہو گی۔

آخر خدا خدا کر کے بس کے کنڈکٹر نے صدا لگائی: "دھرم پور اُترنے والو تیار ہو جاؤ۔ آگے بڑھو"

کشور فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہیں سے اُتر کر رگھوناتھ پور جانا ہوتا تھا۔ اُس کے ساتھ تین چار اور مسافر وہاں اُترے لیکن وہ رگھوناتھ پور کے نہیں اِدھر اُدھر کے گاؤں کے تھے۔ اُس وقت بدحواسی میں وہ لڑکی کشور کے ذہن سے محو ہو چکی تھی اور اب وہ صرف اِس انتظار میں کھڑا تھا کہ بس آگے چل پڑے تو وہ بھی اپنا راستہ لے۔ کچھ دیر پہلے جو گھٹا اُٹھی تھی وہ برسے بغیر چلی گئی تھی۔

بس نکل گئی تو کشور نے ہاتھ میں اٹیچی کیس سنبھالا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا ہی تھا کہ تین چار قدم کے فاصلے سے ایک آواز آئی: "سُنئے۔ آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟"

کشور کے قدم ٹھٹک گئے اور اُس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پلٹ کر دیکھا۔ یہ مترنم آواز اُسی اُداس لڑکی جیسی معلوم ہوئی۔ کشور نے ایک قدم آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو لباس، قد، تھیلہ اور چھوٹی اٹیچی سے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی لڑکی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے چہرہ دُھندلا دُھندلا نظر آ رہا تھا۔

"کہئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" کشور ایک قدم اور قریب ہو گیا۔

"میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔ بالکل انجان ہوں۔ مجھے رگھوناتھ پور جانا ہے۔" لڑکی بالکل قریب آ کر کہنے لگی: "مجھے راستہ معلوم نہیں۔ اِتنا اندھیرا ہے۔ دن کا وقت ہوتا تو پوچھ پوچھ کر پہنچ جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

کشور کے کچھ کہنے سے پہلے لڑکی نے خود ہی خیال ظاہر کیا: "اِس گاؤں کا چوکیدار یا کوئی اور آدمی مِل سکتا جو مجھے وہاں تک پہنچا سکے تو بہت اچھا ہوتا۔"

کشور نے کہا: "اگر آپ چاہیں تو میں یہیں دھرم پور میں آپ کے رات بھر

ٹھہرنے کا انتظام کر دوں۔ صبح اُٹھ کر رگھوناتھ پور چلی جایئے گا۔ یا اگر آپ کی مرضی ہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہیں۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"

لڑکی سوچ میں پڑ گئی تو کشور نے پوچھا: "آپ کو رگھوناتھ پور کس کے ہاں جانا ہے؟ میرا گھر بھی تو وہیں ہے۔"

"مجھے سماج کلیان میں جانا ہے۔ میں ٹیچر ہوں۔ یہاں ایک پربھا دیوی جی ہیں۔ اُن کا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اُن کی جگہ مجھے کام کرنا ہے۔ آج صرف جگہ دیکھنے آئی ہوں۔ سوچا تھا کہ شام تک پہنچ جاؤں گی لیکن یہاں تو بات ہی کچھ اور ہو گئی ——— یہاں سے رگھوناتھ پور کتنی دُور ہوگا؟"

کشور نے کہا: "دُور تو کچھ اتنا نہیں۔ آدھے میل سے کچھ زیادہ ہوگا۔ راستہ بھی صاف ہے لیکن اندھیرا بہت ہے اور آپ نئی نئی آئی ہیں۔"

لڑکی سوچ میں پڑ گئی۔

کشور نے اُس کی تسلّی کے لئے بتایا: "آپ تو میری مہمان ہیں۔ آپ کو میرے ہی یہاں جانا ہے۔ سماج کلیان کا اسٹاف ہمارے ہی پاس رہتا ہے۔"

"آپ کا شبھ نام؟"

"میں کشور ہوں۔"

"سمجھ گئی۔ آپ ہاتھ کی ریکھائیں پڑھتے ہیں۔ وہی نا؟"

"یہ بات تو آپ کو پربھا جی نے بتائی ہوگی۔" کشور نے ہنس کر کہا ——— "وہ بہت پریشان کرتی ہیں۔"

"چلئے۔ اب کوئی ڈر نہیں۔"

دونوں چل پڑے۔

کبھی آگے پیچھے، کبھی پہلو بہ پہلو ——— لیکن خاموش۔

باتیں کچھ نہ کچھ دونوں کرنا چاہتے تھے لیکن کوئی عنوان نہیں مِل رہا تھا۔
آخر ایک بات کشور نے کہی: "آپ کو بھوک تو ضرور لگی ہوگی۔ چلئے، ماتا جی نے بہت کچھ پکا کر رکھا ہوگا۔ خوب کھائیں گے۔ میری ماتا جی کے بارے میں پربھا جی نے آپ کو بہت کچھ بتایا ہوگا۔"

"بہت کچھ نہیں۔ صرف ایک بات بتائی ہے کہ وہ عورت نہیں دیوی ہیں۔"

لڑکی کے مُنہ سے اپنی ماں کے لئے اِتنے احترام کا لفظ سُن کر کشور کا جی چاہا کہ اُس کا مُنہ چوم لے۔ وہ بولا: "ماں تو دیوی سے بھی بڑی ہوتی ہے۔ کیونکہ ماں پتھر نہیں موم ہوتی ہے۔"

لڑکی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اُسے اپنی ماں یاد آگئی جو اب دُنیا میں نہیں تھی۔

کشور نے پوچھا: "معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کا نام نہیں پوچھا۔"

اچانک لڑکی ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے سنبھلی تو کشور نے کہا: "آپ اپنی [illegible] مجھے دے دیجئے۔" اور یہ کہتے ہوئے اُس نے لڑکی کی ہچکچاہٹ کے باوجود اُس کی اٹیچی اپنے دوسرے ہاتھ میں لے لی۔

پھر چلتے چلتے بولا: "میں آپ کا نام پوچھ رہا تھا۔"

لڑکی نے شرمیلے لہجے میں کہا: "کچھ اچھا نام نہیں ہے۔ نہ پوچھئے تو اچھا تھا۔ رُوپ شرما۔" پھر ذرا رُک کر بولی: "صورت دیکھئے اور نام دیکھئے۔ پتہ نہیں میری ماں نے مجھ جیسی کے لئے یہ نام کیوں پسند کیا۔ کسی کو بتاتے ہوئے بھی شرماتی ہوں۔"

"معاف کیجئے گا دیوی جی۔ آپ کا نام آپ کے گُن سے بہت چھوٹا ہے۔"

دونوں پھر چُپ ہو گئے۔ ایک اور سوال رہ رہ کر کشور کے ذہن کو پریشان کر رہا تھا لیکن اُسے پُوچھنے کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اِس سوال پر کشور کا دِل دھڑک اُٹھتا تھا۔ اُسے الفاظ نہیں مِل رہے تھے اور پہلی ہی ملاقات میں صاف صاف پُوچھنے کی ہمّت کرنا ذرا شرافت سے گِری ہوئی بات معلوم ہوتی تھی۔

آخر کشور کے ذہن نے کام کیا اور اُس نے بہت خوبصورتی سے پُوچھا: "کیا اِس طرح الگ تھلگ رہ کر ملازمت کرنے پر آپ کے پتی کو کوئی اعتراض نہیں؟"

رُوپ شرما چُپ رہی۔

کشور سوچنے لگا شاید یہ سوال اُسے ناگوار گزرا ہو۔ جب دو تین منٹ گُزر گئے، تو کشور نے خجالت سے کہا: "معاف کیجئے گا۔ مجھے ایسا نجی سوال آپ سے نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

رُوپ شرما پھر بھی خاموش رہی۔

دونوں چلتے رہے۔ آگے پیچھے۔ کشور نے محسوس کیا کہ بات کر کے غلطی ہو گئی۔ نہ جانے وہ کیا کیا سوچنے لگی ہو۔ کشور نے دبی دبی زبان سے کہا: "کسی کو بتایئے گا نہیں کہ میں نے آپ سے ایسا کوئی سوال کیا تھا۔ پربھا جی کو بھی نہیں اور ماں کو تو بالکل ہی نہیں۔"

رُوپ شرما کو ہنسی آگئی: "آپ ماں سے بہت ڈرتے ہیں۔"

"ڈرنے کی بات نہیں۔ اگر ماں پوچھ بیٹھی کہ کیوں پُوچھا تھا تو کیا جواب دوں گا۔"

"آپ گھبرایئے نہیں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"اور آپ نے تو بُرا نہیں مانا؟"

"ہرگز نہیں۔"

"پھر آپ چُپ کیوں ہو گئیں؟"

"میں کچھ سوچنے لگی تھی۔"

"اچھا میں آپ سے ایسی کوئی بات نہ پُوچھوں گا جس پر آپ کو سوچنا پڑ جائے۔"

پھر دونوں چُپ چاپ چلتے رہے لیکن کشور کے دل میں یہ بات اُٹھتی رہی کہ رُوپ شرما کنواری ہے یا بیاہتا؟ آخر وہ اِس سیدھی سی بات کا جواب دینے میں کیوں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی ہے؟

اِس کے بعد دونوں نے کوئی بات نہیں کی اور منزل آ گئی۔

صبح کافی دن چڑھے کشور سو کر اُٹھا اور جب گھر سے باہر نکلا تو دیکھا سماج کلیان کے صحن میں رُوپ شرما پربھا دیوی سے گھُل مِل کر باتیں کر رہی تھی۔ سفر کی تکان دُور ہونے پر نہانے دھونے کے بعد رُوپ شرما کی شگفتگی اور بھی نکھر گئی تھی۔ گیلے بال اُس کے شانوں پر کالی گھٹا کی طرح پھیلے تھے۔ کشور سوچنے لگا رُوپ کی ناک میں لقلقل ہیرے کی کیل میں زیادہ چمک تھی یا اُس کی جھُکی جھُکی سی نرگسی آنکھوں میں۔ اُس وقت بھی رُوپ کی بھینی بھینی، ہلکی ہلکی مُسکان سے کشور کے احساسات زیر و زبر ہو رہے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے اُس کے محتاط ہونٹ اِتنی آہستگی سے ہل رہے تھے جیسے غنچے چٹک رہے ہوں۔ آج اُس نے گہرے سُرخ کنارے والی سفید براق ساڑی کے ساتھ ہلکے نیلے رنگ کا سادہ سا بلاوز پہن رکھا تھا۔ اُس کی ہلکی سانولی رنگت آج کچھ زیادہ صاف نظر آ رہی تھی۔

پربھا دیوی کشور کی طرف اشارہ کر کر کے رُوپ کو کچھ بتا رہی تھی کسی بات پر رُوپ کو ہلکی سی ہنسی آئی تو اُس کے سفید چمکدار خوبصورت دانتوں کو دیکھ کر کشور کو ایسا محسوس ہوا کہ رُوپ شرما عورت نہیں ایک ہنستا بولتا جادو ہے۔

اُس دن پربھا دیوی یا رُوپ شرما سے کشور کوئی بات نہ کر سکا۔ پربھا دیوی نے گاؤں کے خاص خاص گھروں میں لے جا کر رُوپ شرما کو متعارف کرایا جس وقت رُوپ کشور کی ماں سے ملنے گئی کشور بھی گھر میں تھا۔

دو چار باتوں کے بعد ہی ماں نے جھٹ رُوپ شرما سے سوال کر دیا "بیٹی! تم تو ماسٹرنی بن گئی ہو لیکن تمہارے پتی کیا کرتے ہیں؟"

رُوپ کی نظر فوراً کشور کی طرف اُٹھ گئی۔ کشور کو کچھ گھبراہٹ بھی ہوئی اور دلچسپی بھی محسوس ہوئی۔ دو تین ہی پل میں رُوپ کی نظر کئی بار کشور کی طرف اُٹھی اور جھُکی اور پھر اُس نے ماں کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر اِتنی دھیمی آواز میں کچھ کہا کہ پربھا دیوی بھی شاید نہ سُن سکی ہوں۔

ماں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا ــــ "اچھا، اچھا۔ ٹھیک ہے بھگوان تمہارا جنم سپھل کرے۔"

اِس سسپنس نے کشور کو بے چین اور پریشان کر دیا۔ اُسے رُوپ سے چڑ سی محسوس ہوئی۔ جی میں آیا کہ رُوپ کا بازو تھام کر پُوچھے "صاف صاف بتاؤ تمہاری شادی ہو گئی ہے یا نہیں؟"

لیکن یہ ایک ایسا سوال بن کر رہ گیا تھا جسے اب وہ رُوپ سے نہیں پُوچھ سکتا تھا۔ ماں سے یا پربھا دیوی سے بھی تصدیق کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی۔ کیونکہ رُوپ کنواری ہو یا بیاہتا اِس سے کشور کی دلچسپی کا کیا سوال؟

کشور نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ اُس کے دل نے کہا "اگر رُوپ کی شادی ہو چکی ہے تو ــــ اگر اِس کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو کتنا اچھا تھا! ــــ اور اگر وہ کنواری ہے تو اِس بات کو کہتے کیوں شرماتی ہے؟"

وہ گھنٹوں اِسی اُدھیڑ بُن میں پڑا رہا۔

پھر جب شام سے ذرا پہلے گھر کی عورتوں میں رُوپ شرما کی کوئی بات نکلی تو کشور یوں ہی بیچ میں بول پڑا "نوکری بھی کیا لعنت ہے۔ پتی کہیں، پتنی کہیں!"

ماں نے جھٹ جواب دیا "اِس بے چاری کا پتی کہاں، وہ تو بال وِدھوا ہے لیکن کیسا زمانہ آیا ہے۔ وِدھوا ہو کر ناک میں کیل جگمگاتے پھرتی ہے۔ بے چاری کرے بھی کیا۔ مانگ میں سیندور بھرنے سے رہی تو کیا ناک میں کیل لگانے سے بھی گئی۔ بھگوان کسی کو ایسا بھی نہ کرے۔"

اِس انکشاف سے کشور کے دل کو دھچکا سا لگا لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس کے دل میں مسرتوں کے چراغ جگمگا اُٹھے اور وہ طرح طرح کے خیالات کا ہجوم لئے گھر سے نکل گیا۔

شفق پھیلی ہوئی تھی۔

ایک دن پہلے کی موسلادھار بارش نے آدھے اساڑھ کی تپش ختم کر دی تھی۔ شام ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ہوا ذرا تیز تھی۔ گھنے درختوں کے پتّوں کی سرسراہٹ اور چڑیوں کی چہکار سے عجیب سماں ہو گیا تھا۔ رگھوناتھ پور کی چاروں سمتوں کے نشیبی کھیتوں میں دھان کے بیج کے پودوں کی ہریالی جا بجا لہرا رہی تھی۔ دُور کھیتوں سے پرے چاروں طرف آم کے گھنے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ آم خوب آئے تھے لیکن ابھی پکنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ باغوں میں بہار اور چہل پہل تھی۔ آم کی فصل گاؤں کی رونق کو بَن میں بُلا لیتی ہے۔

کشور گھر سے باہر آیا تو پربھا دیوی رُوپ شرما کو لئے سماج کلیان کے احاطے سے باہر ہری ہری گھاس پر بیٹھی سرگوشیوں میں مصروف تھی کشور نے اُن کے

روپ جاکر کہا۔

"آیئے پربھا جی! باغ چلیں۔ رُوپ جی کو اب رگھوناتھ پور کے بن دکھائیں۔ گاؤں تو وہ بہت دیکھ چکیں"

رُوپ شرما بولی "میں تو آج گاؤں میں چل چل کر تھک گئی ہوں۔ کل مجھے واپس بھی جانا ہے اور پھر دو تین دنوں کے بعد یہاں آکر اپنا کام سنبھالنا ہے"

کشور نے مسکرا کر کہا "آپ نے تو ایک ہی سانس میں پوری زندگی کا پروگرام بتادیا! آج آپ تھکی ہیں۔ کل آرام کریں گی۔ پرسوں کہیں جائیں گی"

پربھا نے کہا "ہاں رُوپ! چلو ذرا گھوم آئیں۔ پھر ہم کہاں اور تم کہاں۔ میرا تو یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا لیکن اِس بار تو ٹرانسفر فائنل ہی ہوگیا"

باغ پہنچنے تک اِسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں لیکن رُوپ شرما نے باتوں میں بہت کم حصّہ لیا۔ وہ کچھ بُجھی بُجھی اور تھکی تھکی آنکھوں سے کشور کو دیکھتی رہی۔ رُوپ کی اصلیت معلوم ہوجانے کے بعد نہ جانے کیوں کشور کی زبان میں تیزی آگئی تھی۔

تینوں باغ سے لوٹ کر گاؤں پہنچے تو ہر طرف مٹمیلی تاریکی پھیل چکی تھی چڑیوں کا شور دب چکا تھا اور ہوا رُک رُک کر اور بہک بہک کر چلنے لگی تھی۔ گاؤں کے گھروں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ سماج کلیان میں بھی چولہا چکی کا کام شروع ہوچکا تھا۔

رُوپ کو پہلی رات جتنی گہری اور پُرسکون نیند آئی تھی دوسری رات اُتنی ہی بے خوابی اور اُلجھن میں گزری۔ رگھوناتھ پور میں اُسے اپنے لئے خطرہ نظر آنے لگا تھا۔ ایک بار پھر اُس کی زندگی کی ساکن اور گہری جھیل میں ہلچل کے آثار تھے لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اُسے بہرحال اب رگھوناتھ پور کے سماج کلیان میں کام شروع کرنا تھا۔ ٹرانسفر کو ٹالنا اُس کے بس میں نہ تھا اور کشور ـــــ اُس کی تو وہ نظر پہچان گئی تھی۔ یہ نظر اُسے آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں گھائل کرنے والی تھی۔ ایسی نظر کے سامنے وہ پہلے بھی ایک بار کمزور ثابت ہوچکی تھی جس کا گھاؤ آج تک سینے میں چھپائے نگر نگر اور گاؤں گاؤں ماری پھر رہی تھی۔ اُس نظر کی پکار، اُس نظر کی کشش، زندگی کے تھمے تھمے طوفان کو ضرور جگا کر رہے گی۔ اور اگر ایسا ہوا تو اِس بار وہ تلخیوں کا جام پی کر زندہ نہ رہ سکے گی۔

رُوپ کو صرف چوبیس گھنٹوں کے اندر یقین ہوچکا تھا کہ اُس کا دشمن رگھوناتھ پور میں بھی کشور کے رُوپ میں موجود تھا جو اُسے چین سے جینے نہ دے گا اور مرنا چاہے گی تو آرام سے مرنے نہ دے گا۔ وہ زندگی سے جتنا ہی دُور بھاگتی تھی زندگی اتنا ہی قریب ہوکر اُس کا پیچھا کر رہی تھی۔ سماج کہتا تھا کہ وہ ودھوا ہے ـــــ بال ودھوا! زندگی کہتی تھی کہ ودھوا جوان نہیں ہوسکتی۔ ودھوا تو عورت کی لاش کا نام ہے۔ اور جس لڑکی کے انگ انگ سے جوانی پھوٹتی ہو اور جس کی نس نس میں شباب سانس لیتا ہو وہ لاش نہیں ہوسکتی ـــــ وہ ایک بار زندگی کے تقاضوں سے ہار مان کر اپنے گرد کھینچے ہوئے دائرے کو پھلانگنے کی کوشش کرچکی تھی لیکن سماج اور زمانے نے اُسے پھر اُسی دائرے میں واپس دھکیل دیا۔ وہ پھر اپنے آپ کو ایک لاش سمجھ کر اُسے اپنی ہستی کے کاندھے پر اُٹھائے اُٹھائے پھر رہی تھی لیکن پھر وہ موڑ آگیا تھا جہاں اُس کی لاش کے دھڑک اُٹھنے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا ـــ ایک بال ودھوا کی دھڑکتی ہوئی لاش!

رُوپ نے اپنے آپ سے سوال کیا "کیا میں کشور کو آج ہی بتادوں کہ جس چیز پر وہ پھول کے دھوکے میں ہاتھ بڑھا رہا ہے، وہ انگارہ ہے"

اُس کے اپنے اندر سے آواز آئی "نہیں۔ تو کیوں پھر بُجھتے چیتے کو جگائے! ہاتھ جل جانے دے اُس کا۔ پھر وہ خود بجھ جائے گا"

پربھا دیوی چارپائی پر بیٹھی لیڈی ہیلتھ وزیٹر نیلما چودھری سے مزے کی باتیں کر رہی تھی۔ شاید رُوپ شرما کے بارے میں کوئی دلچسپ بات بتا رہی تھی۔ پربھا کو رُوپ کے ایک ناکام رومان کا علم تھا۔ شاید اُسی کا کوئی ذکر ہو رہا تھا۔ بیوہ ہونے کے بعد پربھا کے کردار میں بہت تیکھا پن پیدا ہوگیا تھا۔ ہر المیے پر طنز کرنا، ہر غم کا مذاق اُڑانا اُس کا شیوہ بن گیا تھا۔ اُس نے زندگی کے اسی انداز میں تسکین اور سہارے کی تلاش کی تھی اور رُوپ سے جب کبھی ملاقات ہوئی اُسے بھی جینے کا یہی سبق پڑھاتی رہی لیکن فرق یہ تھا کہ پربھا دو بچوں والی بیوہ تھی اور رُوپ کنواری بیوہ تھی۔

کشور کو اُدھر سے گزرتے دیکھ کر پربھا نے آواز دی۔ کشور اسی لئے قصداً وہاں سے گزر بھی رہا تھا۔ رُوپ نے اُسے دیکھا تو ضرور لیکن فوراً نگاہ پھیر لی۔ کشور کی نظر اُس کے چہرے پر جم کے رہ گئی۔

"آیئے بیٹھیے کشور جی!" کہتے ہوئے پربھا نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا "آپ ... بار دیکھ کر بتا دیجیے کہ کیا لکھا بدا ہے۔ آگے نہ جانے پھر کب آپ سے ملاقات ہو"

"میں آپ کے ہاتھوں کی ساری لکیریں پڑھ چکا ہوں۔ کوئی نئی لکیر ہو تو بتایئے" کشور نے اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو جھکاتے ہوئے کہا اور سامنے ... بیٹھ گیا۔

"اچھا نیلما تم اپنا ہاتھ دکھلاؤ" پربھا نے نیلما کا ہاتھ کھینچا۔

"نا بابا، میں نہ دکھاؤں گی۔ پچھلی بار دکھایا تھا تو ساری باتیں غلط ... تھیں، سوائے ایک بات کے" نیلما نے جھینپ کر کہا "اور وہ ایک بات ...

میں جانا نہیں چاہتی تھی۔"

اب پربھا نے رُوپ کو ترغیب دی "ایک بار تم بھی دکھلا لو۔"

رُوپ نے زہرخند کے ساتھ کہا "میرے ہاتھوں میں صرف ماضی کی لکیریں ہیں۔ ماضی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور مستقبل کی فکر نہیں۔"

کشور نے ہاتھ بڑھا دیا "لایئے دیکھوں۔ ماضی اور مستقبل دونوں کچھ حالی کی باتیں دیکھوں۔ لایئے۔"

کشور نے اتنے اصرار کے ساتھ ہاتھ بڑھایا کہ روپ انکار نہ کر سکی۔ ہاتھ سے ہاتھ پڑا تو رُوپ کا دل دھڑک اُٹھا اور کشور کا بدن جھنک گیا۔ دل کا چور دونوں کے احساسات میں ہلچل مچانے لگا۔ ایسے احساسات جن کا کوئی عنوان نہیں تھا۔

کشور نے جھوٹ موٹ دیر تک دونوں ہاتھوں کو باری باری غور سے دیکھنے کے بعد اُس کا ایک ہاتھ تھام کر کہا۔ "باتیں بہت ساری ہیں لیکن ابھی صرف ایک بات بتاتا ہوں۔ ایک ناکام محبت اور دو شادیاں!"

رُوپ نے جھٹکے کے ساتھ اس طرح اپنا ہاتھ کھینچ لیا جیسے ہتھیلی پر چنگاری پڑ گئی ہو۔ قلب دھک دھک کرنے لگا اور جیسے سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔

رُوپ کی اِس کیفیت کو دیکھ کر کشور کو گھبراہٹ لیکن نیلما اور پربھا کو حیرت ہوئی۔ کشور ڈرنے لگا کہ ایک بار تو ایک سوال کر کے اُس نے رُوپ کو پریشان کیا تھا اور اب دوسری بار ایک اور بات کہہ کر اُسے دھچکا لگایا ہے۔

گھبراہٹ میں کشور کہنے لگا "آپ بُرا نہ مانئے۔ مجھے ہاتھ وات دیکھنا نہیں آتا۔ میں تو یوں ہی دلچسپی کے لئے جھوٹ موٹ کچھ بتایا کرتا ہوں۔"

رُوپ کی آنکھوں میں سناٹا چھا گیا تھا۔ کشور کی پریشان کیفیت پر اُسے ترس آ گیا تو مری ہوئی آواز میں کہنے لگی "آپ گھبرایئے نہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ ایسی باتیں سُن کر مجھے کچھ شرم آتی ہے۔ ورنہ آپ نے تو ٹھیک ہی ذرا دلچسپی پیدا کرنے والی بات کہی ہے۔ آپ کچھ اور نہ سمجھیں۔ لیجئے کچھ اور بتایئے۔"

رُوپ نے پھر ہاتھ بڑھایا تو کشور نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بس اب رہنے دیجئے۔ اِس وقت سارا موڈ آف ہو گیا۔"

اِس کے بعد بے دلی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں اور رُوپ چوری چوری کشور کے معصوم اور بھولے چہرے کو بار بار دیکھتی رہی۔ یہ چہرہ رُوپ کو بے عیب اور بے داغ نظر آیا۔ وہ محسوس کرنے لگی جیسے اُس کی اپنی نظر میں کھوٹ ہو تو ہو لیکن کشور کے چہرے پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اُس میں کھوٹ نہیں ہے۔

دوسرے دن بہت سویرے رُوپ شرما چلی گئی اور ایک ہفتہ بعد واپس آنے کا وعدہ کر گئی۔ اُس کے چلے جانے کے بعد پربھا دیوی نے اُس کی زندگی کی ساری داستان کشور کو سُنا دی۔ رُوپ کا باپ بچپن ہی میں مر چکا تھا۔ جب وہ ذرا سیانی ہوئی تو ماں بھی مر گئی۔ بال ودھوا ہونے کی وجہ سے وہ بھائیوں اور بھابیوں کے سینے کا بوجھ بن گئی۔ تب اُس نے ٹریننگ لے کر سماج کلیان کے محکمہ میں ٹیچری کر لی تاکہ سب سے الگ تھلگ دُور دُور رہے۔ اِس ملازمت کے دوران اسکولوں کے ایک انسپکٹر سے اُسے دلچسپی ہو گئی۔ اس دلچسپی نے رفتہ رفتہ محبت کی شکل اختیار کر لی لیکن جب محبت کا وہ موڑ آیا جہاں انھیں شادی کر لینی چاہئے تھی تو اُس کے بال ودھوا ہونے کی وجہ سے وہ انسپکٹر آدھے راستے میں اُسے چھوڑ کر لوٹ گیا۔ اِس واقعہ کو دو سال گزر گئے۔ اب دُنیا میں اُسے کسی پر اعتبار نہیں رہا ہے۔

رُوپ شرما کی کہانی سُن کر کشور کے دل میں سوگ سما گیا۔ اتنی اچھی لڑکی کی ایسی المیہ زندگی! کاش وہ رُوپ کی اندھیری زندگی میں خوشیوں کا چراغ جلا سکتا۔ رُوپ شرما اُس کے دل و دماغ پر اس طرح چھا گئی کہ وہ ہر وقت اُسی کے خیال میں کھویا کھویا سا رہنے لگا۔

رُوپ شرما کو رگھوناتھ پور واپس آئے ڈیڑھ ماہ گزر چکے تھے اور وہ گاؤں کے ماحول میں کافی حد تک گھُل مل گئی تھی۔ کشور کو بی۔ اے پاس کرنے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اب وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا لیکن ماں اِس بات پر مُصر تھی کہ شادی کرنے کے بعد ہی وہ شہر واپس جا سکتا ہے۔ کسی عورت نے چغلی کھا دی تھی کہ کشور رُوپ کو بہت میٹھی نظروں سے دیکھا کرتا ہے اور اُس سے اکیلے میں باتیں کیا کرتا ہے۔

اُنھیں دنوں کی ایک رات تھی۔

چودھویں کی اُجلی اور شفاف رات! برسات کی دُھلی ہوئی بے داغ چاندنی کا دامن فضا کی ناپیدا کنار وسعتوں میں پھیلا ہوا تھا۔ رات کے سناٹے میں جھینگروں کی تیز سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ کھیتوں میں دھان کی ہریالیاں ہواؤں سے سرسرا رہی تھیں۔ کہیں سے کوئل کی آواز رہ رہ کر رات کے سینے کو چیرتی ہوئی دُکھی دلوں میں ہُوک پیدا کر رہی تھی۔ رگھوناتھ پور سے پچھم دریائے باگمتی چڑھا ہوا تھا۔ سیلاب کی آمد آمد تھی۔ دریا کے تیز رواں دواں پانی میں چاندنی کے عکس سے تلواریں چمک رہی تھیں۔

کشور اور رُوپ دریا کے کنارے بیٹھے گونجتی گنگناتی لہروں میں کھوئے ہوئے تھے۔ اُداس اور خاموش۔ دونوں نہ جانے کب سے اور کیا کیا باتیں کرتے کرتے چُپ ہو گئے تھے۔

"تم نے کچھ جواب نہیں دیا رُوپ؟" کشور نے خاموشی توڑی۔



"میں تو خود ایک سوال ہوں۔ جواب کہاں سے لاؤں"

"شاید تمھیں اندازہ نہیں کہ میرے دل میں تمھارے لئے کتنی جگہ ہے۔"

"لیکن تمھارے گھر میں تو میرے لئے کوئی جگہ نہیں"

"تم چھوٹے سے گھر کی بات کرتی ہو۔ یہ نہیں دیکھتی ہو کہ دُنیا کتنی بڑی ہے۔ تم بھروسہ کرو" کشور اُس کے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو ہٹاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا جو ڈبڈبا آئی تھیں۔

"کشور! تم عمر میں میرے برابر ہو سکتے ہو لیکن تم نے صرف گھر دیکھا ہے اور میں نے دُنیا دیکھی ہے۔ یہ دُنیا اتنی چھوٹی ہے کہ اس میں ایک بال ودھوا کے ٹھہرنے کی بھی جگہ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ میرے لئے جان بھی دے سکتے ہو لیکن محبت جیون کو سُکھی بنانے کے لئے کی جاتی ہے دُکھی بنانے کے لئے نہیں۔ میری اور تمھاری محبت میں دُکھ ہی دُکھ ہیں۔ محبت کا مزہ محبت کرکے جینے میں ہے۔ محبت کرکے مرنے میں نہیں۔ تم میرا خیال چھوڑ دو۔ محبت وہی اچھی ہوتی ہے جس کا انجام شادی ہو۔ جدائی، بدنامی اور رُسوائی نہیں۔"

روپ نے لہروں پر نظریں جما کر ٹھنڈی گہری سانس لی۔

کشور نے بُرا مان کر کہا: "تم کتنی ضدی ہو روپ! میری بات مان جاؤ۔ میں تم سے شادی ہی تو کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتے۔ سُنا نہیں تم نے۔ تمھاری ماں ایک دن نیلما دھری سے کہہ رہی تھیں کہ سرکار نے رگھوناتھ پور کے سماج کلیان کو ودھوا آشرم بنا رکھا ہے۔"

"میں تمھاری خاطر ماں کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔"

"جو ماں کو چھوڑ سکتا ہے وہ بیوی کو بھی چھوڑ سکتا ہے۔ کیونکہ بیوی ماں سے زیادہ محبت نہیں کر سکتی۔ بھگوان کے لئے کشور، تم اِس ارادے سے باز آجاؤ۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ میں تمھیں دُکھی نہیں دیکھ سکتی۔ اپنے دُکھوں میں تمھیں شریک کرنا نہیں چاہتی۔"

"تم پاگل ہو۔ ضدی اور بزدل ہو!" کشور ایک دم سے بگڑ گیا۔

"میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ صرف ودھوا ہوں۔ ایک بار بیاہ کرکے ودھوا ہوئی۔ اس کی یاد تک باقی نہیں۔ دوسری بار پریم کرکے ودھوا ہوئی جس کا داغ ابھی سینے میں ہے۔ اب تیسری بار سہاگن ودھوا بننے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میرے جینے کے لئے ادھورا پریم ہی بہت ہے۔"

"یعنی پریم تم سے کروں اور شادی کسی اور لڑکی سے کر دوں؟ تم عورت ہو کر کس منہ سے ایسی بات کرتی ہو! تم مجھے کسی دوسری معصوم لڑکی کو دھوکا دینے کو کہتی ہو۔ شرم آنی چاہئے تمھیں۔"

"پھر میں کیا کروں ——— کیا کروں کشور!" روپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "اگر تم مجھے زیادہ پریشان کروگے تو میں دریا میں چھلانگ لگا دوں گی ——— میں شادی نہیں کر سکتی۔ ہرگز نہیں کر سکتی! تم صرف آغاز کی بات کرتے ہو۔ میں انجام کی بات سوچتی ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا دل شادی کرنے کو نہیں چاہتا۔ کیا میں پتھر ہوں۔ مٹی کی مورت ہوں لیکن میرے اندر جو ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہے وہ منع کرتی ہے۔"

کشور ایکدم خاموش ہوکر روپ کے چہرے کو غصّے سے گھورنے لگا۔ بہت دیر کے بعد اُس نے اچانک جوش میں آکر روپ کو بازو سے جھنجھوڑتے ہوئے تیز آواز میں کہا: "وہ بوڑھی عورت تمھاری دشمن ہے۔ میرے خون کی پیاسی ہے۔"

پھر وہ تیزی سے ندی کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑایا: "اب صرف ایک ہی راستہ ہے ——— ایک ہی راستہ!!"

جوش پر آئے ہوئے باگمتی میں پانی کا گرجتا دہاڑتا ہوا ایک زبردست ریلا آیا جس کی گونج دُور دُور تک پھیل گئی۔ روپ چیختی ہوئی بے تحاشا دوڑی۔

"نہیں ——— نہیں ——— کشور! ایسا نہ کرنا۔ تمھیں بھگوان کی سوگند! میری جان کی قسم!!" ——— اور پیچھے سے اُس کے پیروں سے جا لپٹی۔

کشور ٹھٹک گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر کامرانی کی جو شریر مسکراہٹ مچلنے لگی اُسے چاند کے سوا کسی نے نہیں دیکھا۔ عورت کی دلیل کو مرد کی عیاری مات دے گئی۔

کشور نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا: "تم نے غلط سمجھا۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ تمھیں کہاں سے چھلانگ لگانی چاہئے کہ بچ نکلنے کا خطرہ نہ ہو۔ میں تو زندہ رہنا چاہتا ہوں ——— تمھارے ساتھ!!"

روپ، کشور کے سینے سے لگ کر چاند کے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ایم-اے

ٹھان لی اُس نے مُنہ چھپانے کی — بچ گئی آبرُو زمانے کی
گیسوئے یار سے جو ہو کے گئیں — یہ ہوائیں نہیں اب آنے کی
پھُوٹتی پَو بھی پا سکی نہ ادا — زیرِ لب تیرے مُسکرانے کی
حُسن آیا نہیں شباب پر، اور — آنکھ پڑنے لگی زمانے کی
تیرے وعدے کا ہے یقیں، لیکن — تجھ کو عادت ہے بھُول جانے کی
مِری تغیرِ حال کی رُوداد — یہ کہانی نہیں سُنانے کی
سِمٹ آئی ہے اُس کی آنکھوں میں — ساری مستی شراب خانے کی
کہتے ہو داستانِ آدم کیا — یہ تو تمہید ہے فسانے کی
دل بھی سینوں میں ٹھہرے ہیں — کچھ خبر بھی ہے اس کے آنے کی
ہائے شعلہ نوائیاں [illegible] — جل گئی شاخ آشیانے کی
کیا ہیں آلامِ روزگار اے دوست — اک ادا تیرے آزمانے کی
اُف یہ احساسِ بیکسی شبِ غم — بات اگر ہے ترے نہ آنے کی
کیا کیا اُس نے مجھ سے مت پوچھو — [illegible]
جو مرے دوستوں نے مجھ سے کیا — [illegible]
اُن لبوں نے بتائی ہے ترکیب — [illegible]
پھر تو دنیا کو بھول بیٹھا ہوں — [illegible]
جاتے جاتے ہر ایک لمحۂ غم — [illegible]
چوٹ کھا کھا کے غنچۂ گُل کو — [illegible]

اے فراقؔ اب [illegible]
دیر تھی آپ [illegible]

مزاحیہ

مکان کی تلاش

احمد جمال پاشا، ایم۔ اے (علیگ)

سروری منزل، کچا احاطہ، لکھنؤ (یو۔ پی)

یکم رجون ۱۹۶۶ء

مکرمی دفتری خوشتر گرامی صاحب! آداب

"بیسویں صدی" جدید طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں اہم اور قیمتی اضافے کے ساتھ ساتھ موجودہ ملکی اور عالمی افکار و مسائل پر اپنے باغ و بہار اور نرم گرم "تیر و نشتر" کے ذریعہ سیاسی اور سماجی شعور کو بیدار کرنے کی تاریخی خدمت انجام دے رہا ہے ——— ایک مزاحیہ مضمون "مکان کی تلاش" بھیج رہا ہوں۔ خوشتر صاحب! حقیقت یہ ہے کہ مضمون مکمل ہو گیا ہے لیکن ابھی مکان کی تلاش جاری ہے! دیکھئے مکان ملتا ہے یا میٹریل ہاتھ آتا ہے ——— دلی سے خبر آئی ہے کہ فکر تونسوی صاحب کو ٹائیفائڈ نے بے حال کر دیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کئی بار ٹی بی تک کو ہو چکے ہیں۔ اُن کی خیریت سے نوازئے ——— امریکہ میں "بیسویں صدی" کی ایجنسیاں کہاں کہاں ہیں۔ شکاگو میں کچھ احباب اس کا اتا پتہ چاہتے ہیں۔ اگر آپ توجہ دیں تو میری مشکل آسان ہو جائے . . .

آپ کا ——— احمد جمال پاشا

ایک آدمی دریا میں ڈوبتے ہوئے چلا رہا تھا۔

"بچاؤ! بچاؤ!!"

ایک شخص دوڑا اور اُس سے پوچھا۔

"تم کہاں رہتے ہو؟"

اُس کا پتہ نوٹ کر کے بھاگا لیکن جب اُس کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ [illegible] نیا کرایہ دار آ چکا ہے۔

[illegible] نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"ہو نہ ہو! نیا کرایہ دار وہی شخص ہے جس نے مرحوم کو دریا میں دھکیلا تھا!"

ہم نے یہ ٹریجڈی سننے کے بعد اپنا سر پیٹ لیا کہ کاش ہم نے مرحوم کو دریا میں دھکیلا ہوتا تو اِس وقت وہ نئے کرایہ دار ہم خود ہوتے!

اُس کے بعد ہم افتاں و خیزاں مکان کی تلاش میں نکل پڑے۔ راستے میں ایک جنازہ جا رہا تھا۔ ہم نے پوچھا۔

"[illegible] کا جنازہ ہے؟"

مرنے والے کا نام پتہ نوٹ کر کے فوراً الاٹ منٹ کے دفتر پہنچے اور درخواست دی۔

"فلاں شخص مر گیا ہے اُس کا مکان ہمیں الاٹ کر دیا جائے۔"

[illegible] اپنے نام الاٹ کرا لیا۔ اُس کے بعد ہم تقریباً [illegible] اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] اب میں یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا!" اور

ہم نے وہاں [illegible] لیکن [illegible] دونوں کے جانے کے بعد مرحوم کے پس ماندگان نے ہماری ایک [illegible] اور [illegible] کیا۔

مرحوم کے [illegible] کے بعد بھی ہم ہمت نہ ہارے اور مکان حاصل کر [illegible] کچھ کرایہ [illegible] تیار [illegible] انہیں سکھا پڑھا کے چلتا کیا

اور [illegible]

یہ عورتیں بیٹھ پر سامان لادے گھر گھر جا کر پوچھتیں۔
"مکان کا کوئی حصّہ کرایہ پر مل سکتا ہے؟"
"نہیں!"
"اچھا صحن یا کھلی چھت کا کوئی حصّہ دے دیجئے ہم چھپر ڈال لیں گے۔"
"نہیں!"
اس کے بعد عورتیں سامان رکھ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔
"پانی پلا دیجئے۔"
پانی پینے کے بعد سستانے کے لئے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ پھر مچل گئیں۔
"ہم رات یہاں گزار لیں؟"
صبح جب ان سے مکان خالی کرنے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے چلّانا شروع کیا۔
"تم نے ہمیں آدھا مکان کرایہ پر دیا ہے!"
ان کا شور سن کر باہر منتظر ہم لوگ اندر آ گئے اور وہ شور غل مچا کر پولیس آ گئی۔ زبردستی مہمان بنے رہنے کے شرف کو برقرار رکھنے کے لئے ہم نے عدالتی چارہ جوئی کی۔ عدالت نے حکم امتناعی جاری کر دیا۔ ایک طرف مقدمہ چلتا رہا اور دوسری طرف ہم مہمان لوگ میزبان کو پریشان کرتے رہے۔ یہاں تک عاجز کیا کہ مجبوراً مکان والے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس سے پہلے کہ مکان پر ہمارا قبضہ ہو جاتا کسی نے مالک مکان کو گھر خالی کرتے دیکھ کر فوراً الاٹ منٹ کے دفتر کا رخ کیا اور مکان الاٹ کرا کے ہمیں نکال باہر کیا۔

کہتے ہیں ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ ضرور مل جاتا ہے لیکن لاکھ لاکھ تلاش کے باوجود مکان نہیں ملتا۔ اسی چکّر میں یہ طے کر کے نکلے کہ یا مکان تلاش کر لیں گے ورنہ خود ہی لاپتہ ہو جائیں گے! لیکن ہوا یہ کہ نہ مکان مل سکا اور نہ تو جیتے جی لامکاں ہو سکے! لیکن ہر مکان کو خالی سمجھ کر اس پر لپکنے کے چکّر میں کئی بار پولیس کے ہتّے چڑھتے چڑھتے ضرور بچے!

جب سارے شہر میں ایک بھی "ٹو لٹ" کا بورڈ نہ ملا اور نہ کسی نے بتایا کہ کسی کا کوئی مکان کہیں خالی ہے تو ہم نے اخباروں اور رسالوں میں "مکان چاہئے، مکان!" کے اشتہار نکلوائے۔ احباب کو دھمکی دی کہ اگر مکان نہ ملا تو مع سامان کے تمھارے یہاں دھرنا دے دیں گے لیکن اس طرح مکان یا اس کا اتہ پتہ تو نہ ملا البتہ دوستوں کی بھیڑ ضرور چھٹ گئی۔

جب ہم کسی خالی مکان میں تالا لگا دیکھتے تو اس خیال کے تحت اس کے چکّر لگانے لگتے کہ یہ ضرور خالی ہوگا! جب سے پاس پڑوس والوں کو شک ہونے لگا کہ کہیں ان کا ارادہ قفل شکنی کا تو نہیں ——؟

لیکن یہاں قفل شکنی تو کجا کسی کی دل شکنی بھی نہیں کر سکتے اور اسی مروّت کے مارے آج مکان کی تلاش میں زمین کا گز بنے ہوئے ہیں۔

ہوا یہ کہ جس مکان میں ہم رہتے تھے اس کے مالک نے ہمیں بڑے سبز باغ دکھائے کہ "اگر ہم کچھ دن کے لئے کہیں اور چلے جائیں تو وہ اس ٹوٹے ہوئے مکان کو توڑ کر نئی بلڈنگ کھڑی کر دیں گے، جس میں ہمیں بجلی اور پانی کے پائپ وغیرہ کی خاص سہولتیں بالکل مفت حاصل ہوں گی۔" ہم نے ان کی باتوں میں آ کر اپنے دوست خان صاحب کے یہاں ڈیرا جما یا۔ مالک مکان نے مکان بنوانے کی بجائے ایک سال کا پیشگی کرایہ اور پگڑی لے کر ایک نیا کرایہ دار بسا لیا۔ بس تبھی سے ہم مکان ڈھونڈتے اور خان صاحب سے آنکھیں چراتے پھرتے ہیں۔

ہمارے ایک دوست جو مکان تلاش کرنے میں ہماری کافی مدد کر رہے تھے سخت بیمار پڑ گئے۔ ہم نے بہت جی لگا کر ان کی تیمارداری کی تاکہ وہ جلد از جلد اچھے ہو کر ہمارے لئے مکان ڈھونڈ سکیں لیکن جوں جوں ان کا علاج کیا، حالت بگڑتی گئی۔ یہاں تک کہ آخر ان کا انتقال ہو گیا۔ ہم نے اپنے دوست کا کفن دفن اور تیجہ، چالیسواں اس خیال سے کر دیا کہ پگڑی اور پیشگی کرایہ نہیں دیا، مرحوم کی آخری رسوم ادا کر دیں اور ہم مرحوم کے مکان میں منتقل ہو گئے لیکن ابھی ہم نے اچھی طرح سامان بھی نہ جمایا تھا کہ پولیس نے ہمیں نکال باہر کیا کیونکہ مرحوم کے پس ماندگان نے مکان اپنے نام الاٹ کرا لیا تھا۔

اس بار خان صاحب نے بھی ہمیں پناہ نہ دی۔ مجبوراً ہم نے سامان اسٹیشن کے لگیج روم میں جمع کروایا اور پلیٹ فارم پر رات کو سونے کے ساتھ ساتھ دن کو مکان کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس تلاش کے باوجود کچھ دنوں میں گھر تو نہ ملا لیکن ایک عدد گھر والی ضرور مل گئی۔ جس کی وجہ سے رات بسر کرنے کے لئے کرایہ پر رات میں "رین بسیرے" میں جگہ مل جاتی لیکن مکان کے بارے میں ہماری مایوسی یہاں تک بڑھ گئی کہ ہم سوچنے لگے، کیوں نہ ہم دونوں کوئی ایسا جرم کر ڈالیں کہ ہمیں جیل ہو جائے اور اس طرح رہنے کا سہارا ہو جائے۔

مکان نہ ملنے کی صورت میں ہم نے یہاں تک کوشش کی کہ مکان نہ سہی ایک کمرہ یا کوٹھری ہی مل جائے لیکن گولر کے پھول کی طرح وہ بھی نہ ملی۔ ہم نے اپنے دوستوں اور رشتے داروں پر ہر ہر طرح سے زور دیا لیکن کوئی بھی "ہاں، ہوں" یا زبانی ہمدردی سے آگے نہ بڑھا۔ رفتہ رفتہ ہمارا یہ عالم ہو گیا کہ ہم محل اور کوٹھی بنگلے کا کیا ذکر، کسی غریب کی جھونپڑی، فٹ پاتھ یا سایہ دار درخت دیکھ لیتے تو ہماری رال ٹپکنے لگتی اور چلتے پھرتے فٹ پاتھ پر چھپر چھانے کے امکانات پر

غور کرنے لگے۔

جب کسی کا کوئی آسرا نہ رہا تو ہم خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ ایک دن ایک مخبر نے سراغ دیا کہ فلاں محلّے کی فلاں گلی میں فلاں مکان کا ایک حصّہ کرایہ کے لئے خالی ہے۔

مکان جاکر دیکھا۔ مکان تو کیا مکان کا نام تھا جس کی چھت آسمان اور دیواریں سرسبز تھیں۔ گھنٹوں آوازیں دینے پر ایک بڑے میاں اندر سے برآمد ہوئے۔ بولے۔

"مکان تو مِل جائے گا لیکن اِس شرط پر کہ پہلے اِسے بنوانا پڑے گا!"

ہم نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ پہلے اِس کا نقشہ بنوا کر منظور کرالیں۔"

اُس کے بعد ہم وہاں سے سر پہ پیر رکھ کر بھاگ نکلے۔

ایک اور مکان کا پتہ لگا۔ اُس میں سے ایک برخوردار برآمد ہوئے اور پوچھا۔

"کیا بیچتے ہو؟"

عرض کیا۔

"مکان خریدنے نہیں کرایہ پر لینے آئے ہیں۔"

یہ سُن کر وہ اپنے بڑے بھائی کو بُلا لائے۔ اُن کے بڑے بھائی نے ہماری تعلیم، مالی اور خاندانی حالت اور ہماری باتوں اور عادتوں کے بارے میں سیکڑوں باتیں پُوچھ ڈالیں۔

اُس کے بعد پُوچھا۔

"آپ بچّوں کو پڑھا سکتے ہیں؟"

عرض کیا۔

"اِس سے پہلے کبھی نہیں پڑھایا۔"

"کھانا پکانا آتا ہے؟"

"یہی تو ایک شوق ہے ہمیں۔ جب سے ہمارا باورچی بھاگا ہے تب سے ہم نے باورچی رکھنا ہی چھوڑ دیا۔"

"شادی ہوگئی ہے؟"

"جی ہاں!"

"پھر خواہ مخواہ دیواریں کالی کرنے سے فائدہ؟"

یہاں سے جو چلنے کے لگے تو ایک اور مالک مکان کے پاس پہنچے۔ انھوں نے اپنے ایک مقدمہ کی پُوری مثل ہمیں سُنانے کے بعد ہم سے قانونی مشورہ لیا۔ اُس کے بعد بولے۔

"باپ رے باپ! ہم اِتنے قانونی آدمی کو اپنا مکان نہیں دے سکتے۔ مسٹر چلتے پھرتے نظر آیئے! چلتے پھرتے!!"

دوسری جگہ جب قسمت آزمائی کے لئے پہنچے تو انھوں نے ہمیں اپنی مکمل کلیات سُنا دی۔ اُن کا کلام سُنتے سُنتے ہم بے ہوش ہو گئے۔ جب ہم ہوش میں آئے اور موقع غنیمت پاکر عرضِ مدّعا کیا، تو بولے۔

"کسی نے آپ کو بہکا دیا۔ بھلا شاعر اور مکان؟ میں خود دن رات مشاعروں میں رہتا ہوں۔ مکان وکان میرے پاس کہاں ہے؟"

ایک گلی میں ہم نے جاکر مکان کے سلسلے میں اِتنی آوازیں (مکان ہے مکان؟) لگائیں کہ کسی دل جلے بہرے نے تنگ آکر اوپر سے ہمارے اوپر ایک بالٹی پانی پھینک دیا۔ اب جو ہم وہاں سے چوہا ہوکر بھاگے اور اوپر والوں نے چور! چور!! کا نعرہ بلند کیا تو آگے آگے ہم پیچھے پیچھے محلّے کے لونڈوں اور گلی کے کُتّوں نے تالیاں بجا بجاکر اور بھونک بھونک کر ہمیں دوڑا لیا۔ پھر جو ہم بے تحاشہ بھاگے تو ایک صاحب سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ اُنھوں نے ———

"یا وحشت؟"

کہہ کر ہمیں پکڑ لیا اور بولے۔

"خیریت؟"

عرض کیا۔

"مکان ——!"

"بجلی بنانا جانتے ہو؟"

"جانتے ہیں!"

اِس کے بعد اُنھوں نے ہم سے فیوز وغیرہ بنوانے کے بعد کہا۔

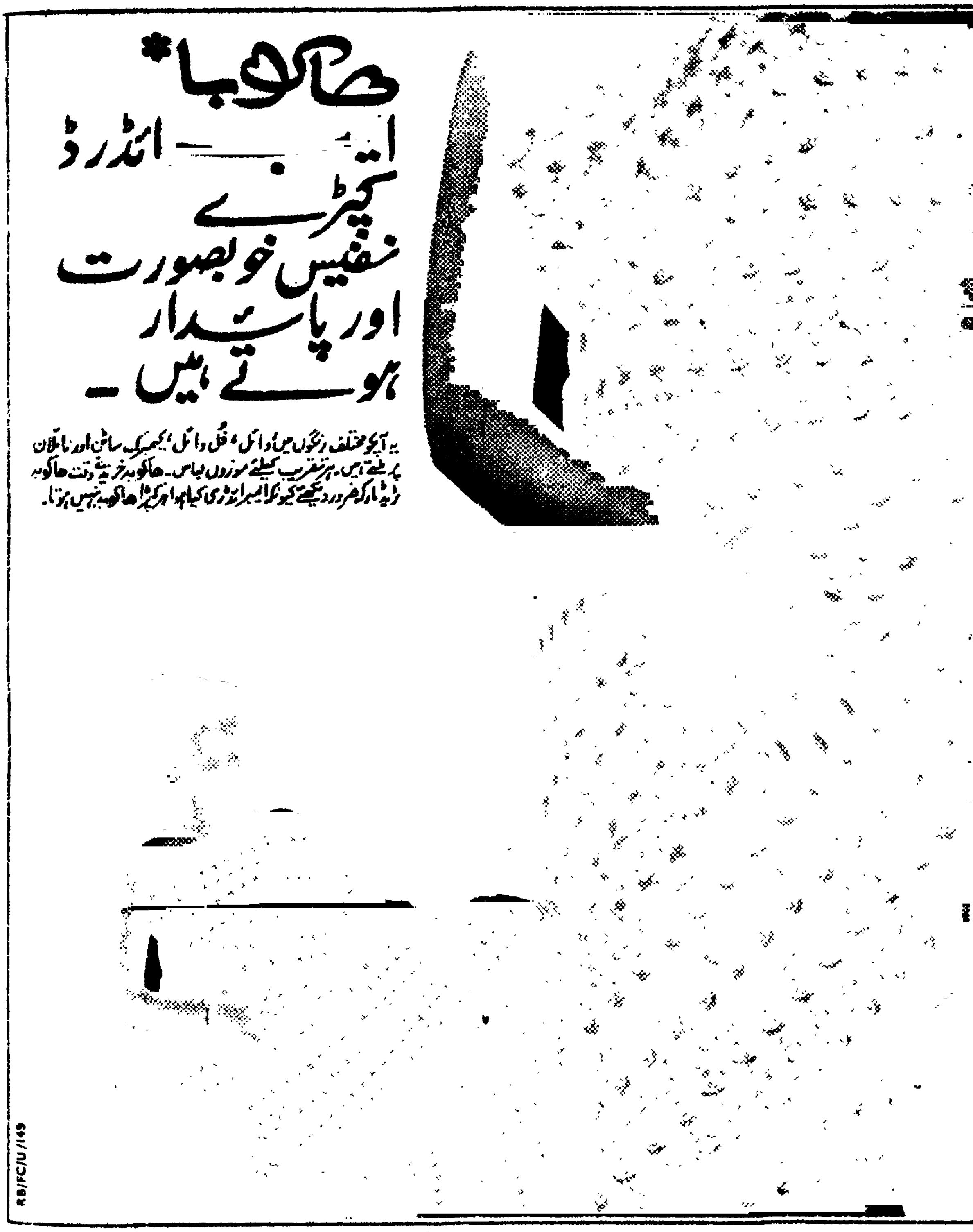
"وہ سامنے والا کمرہ آپ کو مِل سکتا ہے لیکن ہر ماہ پیشگی سَو روپے دینا ہوں گے۔"

ہم نے کرایہ کی پروا نہ کرتے ہوئے جاکر کمرے کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ محض ایک تنگ و تاریک کوٹھری ہے جس میں صرف پنجوں کے بَل داخل ہوا جا سکتا ہے۔ ہم داخل ہوتے ہی مکڑی کے جالوں اور گرد و غبار میں اٹ گئے۔ نہ دروازہ، نہ روشن دان، کچھ بھی نہ تھا۔ بولے۔

"آپ اِس میں آجایئے ہم اپنی بکریاں کہیں اور باندھ دیا کریں گے ——" چلتے وقت اُنھوں نے پُوچھا۔

"آپ کی شادی ہوگئی؟"

عرض کیا "نہیں!"



ھاکوبا*
ایمبرائڈرڈ
کپڑے
نفیس خوبصورت
اور پائیدار
ہوتے ہیں۔
یہ آپکو مختلف رنگوں میں وائل، فل وائل، کیمبرک، ساٹن اور نائلان پر ملتے ہیں۔ ہر تقریب کیلئے موزوں لباس۔ ھاکوبہ خریدتے وقت ھاکوبہ ٹریڈ مارک ضرور دیکھئے کیونکہ ایمبرائڈری کیا ہوا ہر کپڑا ھاکوبہ نہیں ہوتا۔
RB/FC/U/149

وہ گرجے "اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو کوئی اور مکان دیکھئے۔ یہ گھر ہے کوئی سرائے نہیں۔"

پھر نکالے جانے کے بعد ایک اور قبر رسیدہ بزرگ کے پاس پہنچے اور کہا۔

"سنا ہے آپ کے یہاں مکان خالی ہے؟"

انھوں نے جگالی کرتے ہوئے پوچھا۔

"کھانے میں آپ کو کیا کیا پسند ہے؟"

عرض کیا "جو مل جائے!"

بولے "ہم لوکی کھاتے ہیں"

"ہم بھی آج تک لوکی کھاتے آئے ہیں۔"

"مجھے بٹیر اور مقدمہ لڑنے کا شوق ہے۔"

"اپنا بھی یہی شوق ہے!"

انھوں نے ہمیں گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"بس ہم ایسا ہی آدمی چاہتے تھے جو ہمارے سامنے بیٹے اور لوکی کھائے۔"

مکان ڈھونڈھنے کے بارے میں ہماری اتنی معلومات ہیں کہ راہ چلتوں، دوستوں اور رشتے داروں کی چال ڈھال اور بات چیت سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ یہ ایک مکان کی تلاش میں ہیں۔ اخباروں میں اِس قسم کے اشتہار اور خبریں نظروں سے گزریں۔ مثلاً ایک خبر تھی۔

"کیا واقعی آپ کو مکان کی بہت سخت ضرورت ہے؟ اگر آپ مکان کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں تو لگے ہاتھوں ایک مکان ہمارے لئے بھی تلاش کر ڈالئے۔ مکان تلاش کرنے والے کی خدمت میں سفر خرچ پیش کیا جائے گا اور مکان دلا دینے والے کو اُس کے ساتھ معقول نذرانہ بھی قبضہ ملتے ہی نقدی کی صورت میں ادا کر دیا جائے گا۔ معرفت پوسٹ بکس، ۲۱۰ / الف۔ خ"

پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ جسے اب تک خبر سمجھ رہے تھے وہ محض ایک اشتہار تھا۔ ساتھ میں ایک اعلان بھی تھا۔

"مکان نیا ہو یا پرانا، بوسیدہ یا خستہ، دلوانے والے کی تصویر ہم اپنے اخبار میں نمایاں طور پر شائع کریں گے۔"

خیر یہ تو ایڈیٹر صاحب کی تلاش مکان کا شاخسانہ تھا۔ ایک سرخی نظر پڑی۔

"ضرورت مطلوب ہیں! سب سے شاندار اور سب سے کم کرایہ کا مکان مع فرنیچر تلاش کرنے والے کو ترجیح دی جائے گی۔ ساتھ میں مالک مکان کی تحریری منظوری آنا ضروری ہے۔۔۔ یا۔۔۔"انسان ہمیشہ سے مکان میں رہتا آیا ہے۔"

دلیل معقول۔ لیکن کسی ہوٹل والے نے پیش کی تھی جسے سب سے زیادہ کرایہ دینے والے مسافروں کی ضرورت تھی اور نقد پر اصرار تھا۔

ایک صاحب جنھیں مکان مل گیا تھا۔ انھوں نے اخبار کے ذریعہ مکان تلاش کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا تھا اور معذرت یہ کی تھی کہ فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ عملاً یہ اُن کے لئے ممکن نہیں۔

ایک نوکری کا اشتہار سنبھلائے نہیں بھولتا۔

"اُن حضرات کو ترجیح دی جائے گی جو دفتر کے لئے ایک معقول عمارت تلاش کر سکیں۔ عملے کے لوازمات تلاش کرنے والوں کی ملازمت مستقل کر دی جائے گی۔"

یا پھر وہ وصیت کہ باپ نے بیٹے سے وصیت کی: "بیٹا! ہر حالت میں مکان کی مسلسل تلاش جاری رکھنی چاہئے۔" واضح ہو کہ یہی وصیت اُس کے دادا نے مرتے وقت اُس کے باپ سے کی تھی۔

اِس قسم کی کتابیں تو اکثر آپ کی نظر سے بھی گزری ہوں گی۔۔۔"مکان تلاش کرنے کا سلیقہ"۔۔۔"مکان ڈھونڈنے کا فن"۔۔۔"سوچنا چھوڑیئے اور مکان تلاش کرنا شروع کیجئے"۔۔۔"میں نے مکان کیسے حاصل کیا؟"

ایک البم یاد آگیا۔ اُس میں کسی مادر زاد لیڈر کی فل سائز تصویر تھی۔ اُس نے اپنی پارٹی کو دھمکی دی تھی کہ "اگر پندرہ دن کے اندر پارٹی نے میرے لئے مکان نہ تلاش کیا تو میں مخالف پارٹی میں جا ملوں گا۔" اگلی تصویر ایک جاسوس کی تھی جس نے مکان تلاش کر کے ہلچل مچا دی تھی۔ وہ تصویر میں مکان دیکھ کر اِس طرح مسکرا رہا تھا جیسے زمین دیکھ کر کولمبس پہلی بار مسکرایا تھا۔

اکثر احباب جو پہلے سرے کے بے فکرے تھے اور جن کے ساتھ گپ شپ میں بآسانی وقت کٹ جاتا تھا، اچانک غائب ہو گئے اور اتنا زمانہ گزر گیا کہ ہم انھیں بھول گئے لیکن پھر اچانک ایک طویل مدت کے بعد مع مکان کے برآمد ہوئے۔

ایک شادی میں گئے۔ دعوت کے بعد دولہا کو جا کر مبارکباد دی۔ دولہا نے سہرے میں سے چاند سا مکھڑا نکال کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں صاحب! نہ مکان ملتا، نہ ہم سب کو جمع ہونے کا موقع ملتا۔"

گویا یہ سب کچھ شادی نہیں، مکان ملنے کا ہنگامہ تھا جس کا سہرا اِن کے سر باندھا گیا تھا۔

ایک انٹرویو میں کئی سو افراد نے شرکت کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کسی صاحب کے پاس ایک فاضل کوٹھری نکل آئی تھی۔ انھوں نے آمدنی میں اضافے کے خیال سے اِسے کرایہ پر اٹھانے کا اشتہار دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اِن کے پاس

ہزاروں درخواستیں آگئیں۔ وہ غریب بھلے آدمیوں کا اِنٹرویو لیتے جاتے اور سر پیٹتے جاتے کہ کِس کِس سے جھوٹ بولیں اور کِس کِس سے تعلقات خراب کریں۔

اکثر دوست "ہالی ڈے موڈ" میں نظر آتے۔ پُوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج کل مکان تلاش کر رہے ہیں۔ جب تک مکان سے چھُٹی نہ مِل جائے دفتر سے چھُٹی رہے گی۔

مکان تلاش کرنے کے سلسلے میں خود ہماری حالت سب سے پتلی تھی اِس لئے "ٹیبل ٹاک" کے دَوران ہمیشہ گھُما پھرا کر گفتگو کا رُخ اُس پہلو کی جانب لاکر نہایت گمبھیر آواز میں کہتے۔

"صاحب مکان تو بہت ہی سیریس پرابلم بنتا جا رہا ہے!"

اور لوگ "ہاں صاحب! ہاں صاحب!!" کہہ کر اُس پر روشنی ڈالنے لگتے۔

لوگ پُوچھتے بھی کہ "کبھیٔ کیا کر رہے ہو؟"

ہم کہتے "مکان تلاش کر رہے ہیں"

اِس مکان تلاش کرنے کی وجہ سے وہ پیسہ جو اب تک ہم اپنے گھر والوں کے علاج معالجہ میں حکیم ڈاکٹروں پر صرف کرتے تھے، اب بڑی فیّاضی کے ساتھ مکان تلاش کرنے والوں پر خرچ کر رہے تھے۔ دوست اور دلال مکان کا وعدہ اِتنے زور شور سے کرتے کہ ہم اِن سے کہہ کر شرمندہ ہوتے اور اُن کے خلوص کے آگے ہمارا سر جھک جاتا۔ بار بار اپنے محسنوں کو ٹوکتے خود اچھا نہ لگتا بلکہ اکثر کو تو ٹوکنے سے پہلے ہی اپنے غم میں برابر کا شریک پایا لیکن ایسے لوگوں کا ساتھ رکھنا خطرے سے خالی نہ تھا کہ اگر کہیں مکان بلتا بھی ہو تو بیچ سے نہ اُچک لے جائیں۔ تعلّقات تو تھوڑے سے نشیب و فراز کے بعد سب ہی سے استوار ہو جاتے ہیں لیکن نادر موقع زندگی میں بار بار نہیں آتا۔

اکثر ایسے مکان بالکل بس مِلتے مِلتے رہ گئے جس کے بارے میں کبھی پتہ نہ لگ سکا کہ اُس میں مکانیت کیا ہے۔ یہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہو ملتے۔ ایسے مکانوں میں تلاش کے باوجود ہمیں زمین و آسمان کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔

ہمارے ایک بے تکلف دوست ایک دن راستے میں ہم سے کترا کر نکلنے لگے۔ ہمیں اُنھیں یوں کچھ لے جاتے دیکھ کر شک ہوا۔ ہو نہ ہو ضرور ہم سے چھُپا کر مٹھائی لئے جا رہے ہیں اور ہم سے بچ کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ جب دوستی کے درمیان سے بے تکلفی کا پردہ اُٹھ جاتے تو جیب میں ہاتھ ڈال دینا عین محبت سمجھی جاتی ہے لیکن اُنھوں نے ہمارے اصرار کے باوجود جیب میں ہاتھ نہ ڈالنے دیا۔ ہم نے کہا۔

"ہم بھی کھائیں گے!"

کہنے لگے "کھانے میں نہیں ہے"

پُوچھا "سُونگھنے میں سہی! لیکن ہم اِس وقت بلا سُونگھے ہرگز نہ مانیں گے"

بولے "پریشان نہ کرو"

اِتنے میں ہمارا ہاتھ اُن کی جیب کی گہرائیوں میں پہنچ کر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ ہم نے کہا۔

"یہ اکیلے اکیلے اُڑانے کے لئے حلوا سوہن لئے جا رہے ہو!"

بولے "نہیں مانتے۔ اچھا تمھاری ضد سہی!" یہ کہہ کر اُنھوں نے شرماتے ہوئے جیب سے وہ شے نکالی۔ ہمارے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

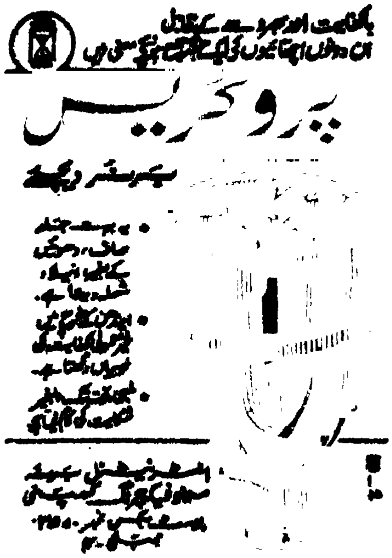
"اے یہ تو اینٹ ہے! بھلا اِس کا کیا کروگے؟"

اُنھوں نے فخر سے سر بلند کر کے کہا۔

"جب مکان نہ مِلا تو اب مکان بنوانے کا ارادہ ہے۔ اُس کے لئے ابھی سے میٹیریل جمع کرنا شروع کر دیا ہے"

مکان کا تذکرہ اُنھوں نے کچھ اِس انداز سے کیا جیسے اُن کے گھر میں خوشی ہونے کے آثار ہوں۔ معصومیت اُن کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔

بس وہ دن ہے اور آج کا دن! قسم لے لیجئے جو ہم نے کبھی مکان تلاش کرنے کا نام بھی لیا ہو!!



افکارِ تازہ

ساغر نظامی

تمھیں خبر اُس کی شوخیوں کی ابھی تک اہلِ خبر نہیں ہے ۔۔۔ کہاں کا اقرار اُس کا انکارِ عشق بھی معتبر نہیں ہے

نہیں نہیں صبح کے ستارے ابھی نمودِ سحر نہیں ہے ۔۔۔ فریب وہ رات نے دیئے ہیں کہ صبح بھی معتبر نہیں ہے

لباس اندھیرا بدل رہا ہے، غرورِ شب کا پگھل رہا ہے ۔۔۔ مرے ستارے یہ کہہ رہے ہیں ابھی طلوعِ سحر نہیں ہے

سراب ہے صبح کا دھندلکا اُفق کی لالی نظر کا دھوکا ۔۔۔ نئے اندھیروں کا قافلہ ہے یہ کاروانِ سحر نہیں ہے

بہارِ تازہ کی آمد آمد کا جشن ہے میرے آشیاں میں ۔۔۔ حیاتِ نو مُسکرا رہی ہے یہ رقصِ برق و شرر نہیں ہے

یہ صبحِ نَو کا حسیں ترنّم دِرا ہے اِک تازہ قافلے کی ۔۔۔ نئے سفر کا غُبارِ آغاز ہے یہ گردِ سفر نہیں ہے

ہے رہنما تو اِک استعارہ فقط اندھیرے میں اِک اشارہ ۔۔۔ وہ راہ رَو، راہ رَو نہیں ہے جو اپنا خود راہبر نہیں ہے

چمن میں گر بال و پر بھی ہوتے تو کونسا کارنامہ کرتے ۔۔۔ کہ ہم تو وہ ہیں جنھیں قفس میں بھی شکوۂ بال و پر نہیں ہے

جو سرِ پرواز جانتے ہیں، جو زیست کا راز جانتے ہیں ۔۔۔ چمن؟ چمن، کیا انھیں قفس میں بھی شکوۂ بال و پر نہیں ہے

تخیُّل اپنا ہے خُلد آرا، تصوّر اپنا ہے عرش پیما ۔۔۔ جنُونِ پرواز تو ہے باقی، نہ ہو اگر بال و پر نہیں ہے

ہیں موسمِ بے وفائی دونوں، چمن میں فصلِ جدائی دونوں ۔۔۔ خزاں ہی نامعتبر نہیں تھی، بہار بھی معتبر نہیں ہے

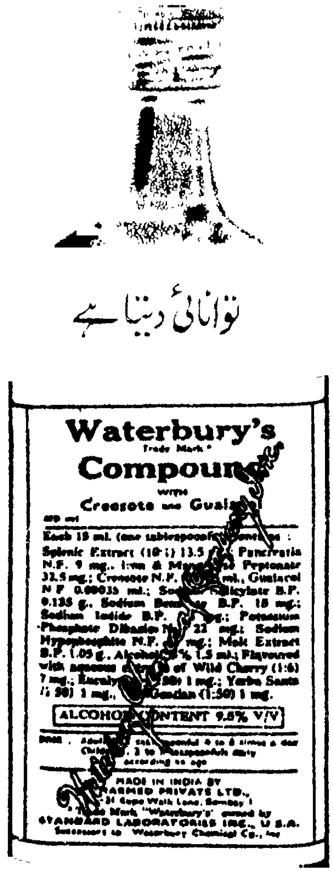
کہاں کا الہام اور القا ہے شعر میرا مجھی سے رنگیں ۔۔۔ وہ کونسا لفظ ہے کہ جس کی رگوں میں خونِ جگر نہیں ہے

حریف کیا کر سکیں گے ساغرؔ میں خود ہوں بربادیوں کا محشر
خود اپنی ہستی سے کانپتا ہوں، مجھے حریفوں کا ڈر نہیں ہے

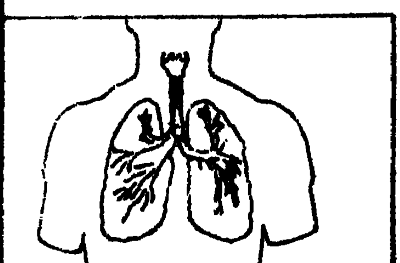
زکام کا مقابلہ کرنے کے لئے
واٹربیریز کمپاؤنڈ لیجئے

لال لیبل









واٹربیریز کمپاؤنڈ میں موجود کریوسوٹ اور گائیکول سانس کے نظام کو جراثیم سے پاک رکھتے ہیں اور بلغم خارج کرتے ہیں، پھیپھڑے صاف رکھتے ہیں، کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف و دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے میں مدد کرتے ہیں اور جراثیم کو دوبارہ پھیلنے سے روک سکتے ہیں۔

عام طور سے زکام کو معمولی بات سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے دراصل کمزوری آجاتی ہے اور بیماری کا مقابلہ کرنے کی توانائی کم ہوجاتی ہے۔ واٹربیریز کمپاؤنڈ بیک وقت تین طرح سے اثر کرتا ہے: آرام پہنچاتا ہے، طاقت بحال کرتا ہے اور بیماریوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے موثر اجزاء کریوسوٹ اور گائیکول زکام میں آرام پہنچاتے ہیں، لوہا اور مقوی اجزاء نیز جو اور طحال کے ست بھوک بڑھاتے ہیں، طاقت بحال کرتے ہیں اور جراثیم کا مقابلہ کرنے والی توانائی پیدا کرتے ہیں جس سے مرض کے پلٹنے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔

بارہ مہینے بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی توانائی برقرار رکھنے کے لئے لال لیبل والا واٹربیریز کمپاؤنڈ پیجئے۔

واٹربیریز کمپاؤنڈ

کھانسی، زکام، سانس کی تکلیف
اور دمہ جیسی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی توانائی پیدا کرتا ہے

وارنر - ہندوستان لمیٹڈ، بمبئی

اُجالے اندھیرے

مختار شکیب

۲۔ پریری مینشن، پریری پارک روڈ۔ لندن۔ این، ڈبلیو۔ ۶

۶ جون ۱۹۶۶ء

خوش تر بھائی! آداب و اخلاص

لیجئے، ایک دوسرا "تجربہ" "اُجالے اندھیرے" حاضرِ خدمت ہے۔ اس کا عنوان "صبح و شام" تھا لیکن ظفر عالمگیر صاحب نے اس کا عنوان "اُجالے اندھیرے" تجویز فرمایا ہے۔ میرا پہلا "تجربہ" کافی پسند کیا گیا تھا۔ مجھے اس سلسلہ میں کافی خطوط موصول ہوئے تھے اور مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی کوشش کروں۔ یہاں کی مشینی زندگی میں ادبی کتابیں پڑھنے کا موقع ملتا ہے نہ لکھنے کی فرصت۔ اسی لئے ایک طویل عرصہ کے بعد "بیسویں صدی" کی بزم میں حاضر ہوا ہوں ——— نہ معلوم کیوں یہاں آزادیٔ نسواں میرے لئے دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ میں آزادیٔ نسواں کے حامیوں میں سے ہوں لیکن کسی حد تک۔ اس آزادی کے فوائد سے ہم میں سے بہت لوگ واقف ہیں۔ میری کوشش ہے کہ میں اس کے کچھ نقائص پیش کروں۔ یہاں کی تہذیب کی چمک دمک میں اس کے تاریک پہلو نظر نہیں آتے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں رہ کر اُن پہلوؤں کو پیش کروں۔ خدا کرے یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار ہو ——— یہاں سولہ سال کی عمر سے، جب کہ لڑکی اسکول چھوڑتی ہے، شوہر کی تلاش شروع کر دیتی ہے۔ بیس سال سے پچیس سال کی عمر کے درمیان میں یہ تلاش خاصی شدید ہو جاتی ہے اور پھر تیس سال کے بعد تک اگر شوہر حاصل کرنے میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو یہ لوگ ٹرافلگر اسکوائر پر کبوتروں کو دانہ ڈالتے، کُتے بلی پالتے یا پھر ہائڈ پارک کی جھیل میں بطخوں کو ڈبل روٹی ڈالتے دیکھے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی خواتین کا خیال ہے کہ یہاں کی عورتیں آزاد ہیں اور میرا خیال ہے ہمارے ہاں کی عورتیں ہمارے گھر کی رانیاں ہیں۔ کاش اُن لوگوں کو یہاں کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع مل سکے۔ یہ لڑکیاں کس طرح شوہر کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگتی ہیں۔ جوانی کا سورج غروب ہونے تک کوئی مل گیا تو خوش نصیبی ——— ورنہ پھر ——— یہ لوگ زندگی میں کتنی بار محبت کرتے ہیں اور کتنی بار شادی اور کتنی بار طلاق! کوئی یہاں آکر دیکھے . . .

نیاز آگیں ——— مختار شکیب

ابتدائی دسمبر کی بھیگی ہوئی سرد شام تھی اور میں لیسٹر اسکوائر کے ایک اطالوی بار کے ایک نیم خاموش سے گوشے میں بیٹھا بغیر دودھ کی تلخ کافی سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی انسان تلخیوں سے بھی محظوظ ہوتا ہے، یہ میں نے اُسی روز جانا تھا۔

عموماً شام کو شراب خانے، کافی بار اور چائے خانے وغیرہ لوگوں سے پٹے ہوتے ہیں اور پھر ویسٹ اینڈ (WEST END) تو لندن کا مرکز ہے۔ وہاں کے ہوٹل اور ریستوران میں تو ایک نشست تک کے لئے بھی کافی دیر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جب میں

آیا تھا تو بار میں صرف چند آدمی تھے۔ پھر دیکھتے دیکھتے سارا بار آدمیوں سے بھر گیا۔ میں نے میزوں پر نظر دوڑائی۔ میری نگاہیں کئی بار کئی حسین و مرمریں بانہوں سے پھسلیں۔ کئی بار سیاہ اور سُنہری زُلفوں سے اُلجھیں اور آخرکار پھر میری وہ مایوس نگاہیں اُس کرسی پر آکر ٹھہر گئیں جو میرے سامنے خالی پڑی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اُس کرسی پر کوئی پیاری سی چیز آبیٹھے جس کے رخساروں پر گُلاب کھلے ہوں۔ آنکھوں میں شوخی رچی ہوئی ہو اور سیاہ لانبے بال اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے ہوں۔ اُس وقت میرا دل ہنسنے کو چاہ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میں کسی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کو بے قرار سا تھا۔

ابھی میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"معاف کیجئے! کیا یہ کرسی خالی ہے؟" حُسن کا ایک دلنواز مجسمہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ حُسن کا مجسمہ! لیکن میرے ذہنی خاکے سے کسی قدر مختلف!!

زُلفیں سیاہ اور لانبی تو نہ تھیں لیکن سُنہری اور تراشیدہ تھیں۔ اُنھیں اس طرح سنوارا گیا تھا کہ بہت پیاری معلوم ہوتی تھیں۔ رخساروں پر گُلاب بھی کھلے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں شوخی تو نہ تھی لیکن غصہ اور سنجیدگی کی آمیزش سی تھی۔ میں اُس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا اور یہ بھول گیا کہ اُس نے مجھ سے کچھ پُوچھا تھا۔ اُس نے مجھے قدرے طنز سے پھر مخاطب کیا۔

"کیا آپ انگریزی سمجھتے ہیں؟ میں نے ابھی آپ سے پُوچھا تھا کہ کیا یہ کرسی خالی ہے؟؟"

اُس کے خدوخال اور گفتگو کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ انگریز نہیں تھی، کوئی غیر مُلکی تھی۔

"اوہ! معاف کیجئے گا!! میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ انگریزی میں گفتگو کر رہی تھیں ـــــ بہرحال، یہ کرسی خالی ہے ـــــ!!" میں نے اپنے چہرے کو سخت بناتے ہوئے کہا۔ میں اُسے اُسی کے انداز میں مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ وہ اچھی خاصی انگریزی بول رہی تھی لیکن لہجہ فرانسیسی تھا۔ اُس نے کسی قدر بے رخی سے کرسی کھینچی اور بیٹھ گئی۔ وہ کبھی مجھے گھورتی تھی اور کبھی ویٹرس کا انتظار کرنے لگتی۔ ویٹرس آئی اور کافی کا آرڈر لے کر چلی گئی۔ اُس لڑکی نے اپنے پرس سے سگریٹ نکالا اور ہونٹوں میں دبا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"معاف کیجئے! کیا آپ کے پاس لائٹر ہے؟"

"جی ہاں!" میں نے اپنے لائٹر سے اُس کا سگریٹ جلا دیا۔

"شکریہ! آپ بھی سگریٹ لیں!!" وہ پہلی بار مُسکرائی۔

"شُکریہ! میں سگریٹ نہیں پیتا" میں نے معذرت چاہی۔

"پھر لائٹر کیوں رکھتے ہیں؟" اُس نے حیرت سے پُوچھا۔

"آپ جیسے کرم فرماؤں کے لئے ـــــ" میں نے کہا اور وہ ایک بار پھر مُسکرائی۔ اُس کی کافی آچکی تھی۔ میں ابھی تک اُس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بہت پُرکشش لڑکی تھی۔ عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ میک اپ بہت نفاست سے کیا گیا تھا۔

چُپ بیٹھے بیٹھے شاید وہ اُکتا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولی۔

"معاف کیجئے! کیا آپ اطالوی ہیں؟"

"جی نہیں! ـــــ کیا میں اطالوی معلوم ہوتا ہوں؟" میں تقریباً چونک پڑا!

"آپ کے چہرے کے خدوخال اور بالوں کا رنگ تو مجھے اطالویوں جیسا معلوم ہوتا ہے"

"جی نہیں ـــــ میں پاکستانی ہوں ـــ اور آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟" میں نے بھی ایک سوال اپنے جواب کے ساتھ شامل کر دیا۔

"آپ اندازہ لگائیں تو جانوں؟"

"اندازہ سے تو نہیں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا تعلق فرانس سے ہے"

"بالکل ٹھیک! لیکن اب یہ بتائیں کہ آپ نے یہ کیسے جانا؟" وہ جیسے خوشی سے پھُوٹ پڑی۔

"آپ کے لہجے اور آپ کے خدوخال سے!"

"تو کیا میں واقعی فرانسیسی معلوم ہوتی ہوں؟"

"سو فیصدی!" میں نے مُسکرا کر کہا۔ وہ بہت خوش نظر آنے لگی۔ راک اَن رول کی دُھن کا ریکارڈ لگا تو وہ بیٹھے ہی بیٹھے تھرکنے لگی۔ میں نے پُوچھا۔

"کس طرح کی موسیقی پسند ہے تمھیں؟ کلاسیکی یا ماڈرن؟!"

"ماڈرن! ـــــ لیکن کبھی کبھی کلاسیکل بھی سُننے کو دل چاہتا ہے"

وہ ایک ادا سے بولی۔

"کچھ بجا لیتی ہو؟" میں نے پُوچھا ـــ "میرا مطلب ہے پیانو یا گٹار کا شوق ہے؟"

"ہاں ـــ پیانو بجا لیتی ہوں لیکن بہت اچھی طرح نہیں"

"گانا؟" جیسے میں انٹرویو لے رہا تھا۔

"نہیں!"

"یہاں تک کہ باتھ روم میں بھی نہیں؟؟"

"ہاں۔ وہاں تو گالیتی ہوں ——" وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اِدھر اُدھر کے لوگوں نے ہماری طرف مُڑ کر دیکھا اور پھر اپنی اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔

"آپ بہت اسمارٹ ہیں۔" اُس نے تبصرہ کیا۔

"شکریہ —— اور دلچسپ بھی!" وہ پھر ہنسی اور ایک سوال پھر کر دیا۔

"آپ یہاں کیا کرتے ہیں —— ؟"

"آپ یہاں کے اخبار پڑھتی ہیں —— ؟"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہوا۔"

"اگر آپ یہاں کے اخبارات پڑھتی ہوتیں یا ٹیلی ویژن دیکھتی ہوتیں تو آپ کو معلوم ہوتا کہ یہاں جو دوکانوں اور تھیٹروں کی لُوٹ مار ہوتی ہے اُس میں میرا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔"

"اوہ ہو —— سچ بتائیے نا!" وہ ٹھنکنے لگی۔

"میں یہاں ایک طالب علم ہوں۔ —— اور آپ؟"

"میں بھی طالب علم ہوں۔ انگریزی سیکھنے کی غرض سے ایک انگریز خاندان کے ساتھ رہتی ہوں۔"

اُس شام اُس فرانسیسی لڑکی سے بہت سی اور بہت سے موضوعات پر گفتگو رہی۔ انگلستان کے موسم پر بھی بات ہوئی اور اُس مُلک کے لوگوں کے بارے میں بھی۔ لوگوں کے پرانے خیالات اور دُنیا میں اُن کی گرتی ہوئی قدر کی باتیں بھی بعد میں۔ ہم نے رقص و موسیقی، فلم، ٹیلی ویژن اور دوسرے تفریحی مشاغل کے بارے میں بھی تبادلۂ خیالات کیا۔ وہ کافی ذہین تھی۔ وہ ہنستی بھی خوب تھی اور ہنستے ہنستے یکایک خاموش بھی ہو جاتی تھی جیسے ساحل پر لہروں کے ٹکرانے کے بعد ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے۔ اُس شام کوئی دو گھنٹوں تک اُس سے باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم کافی بار سے باہر نکل آئے۔ بادل چھٹ گئے تھے اور سردی بڑھ گئی تھی۔ دو روز بعد ملنے کا وعدہ کر کے پھر وہ چلی گئی۔ اُسی بار میں اُس کے بعد اُس سے کتنی ہی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ ایک اچھی دوست بن چکی تھی۔ بلکہ دوست سے بھی زیادہ! دوست سے بھی زیادہ اِس لئے کہ اُس نے بعد میں کئی بار مجھ سے اظہارِ محبت کیا تھا۔

"عامر! کیا تم جانتے ہو کہ میں ہر وقت تمھارے لئے کیوں سوچا کرتی ہوں؟"

"عجیب الخلقت چیزوں کے بارے میں عموماً لوگ اِسی طرح سوچا کرتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم پھر مذاق کے موڈ میں ہو۔ میرے لئے کبھی تو سنجیدگی سے سوچ لیا کرو۔"

"کیا —— ؟"

"مجھے تم سے بے پناہ پیار ہو گیا ہے۔" وہ قریب آتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا چیز ہوتی ہے؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اُس سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"عامر! سنجیدہ ہو جاؤ خدا کے لئے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔"

"میں بھی تمھیں پسند کرتا ہوں۔"

"صرف پسند کرتے ہو؟"

"محبت جیسا عظیم جذبہ میں کیسے پیدا کر سکتا ہوں!"

اکثر ہم نے اِس انداز سے گفتگو کی۔ پھر وہ خاموش اور اُداس ہو جایا کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے اُس نے اِس طرح کی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ وہ ہر ایک ویک اینڈ (WEEK END) پر صبح آجاتی۔ سارے دن میرے ساتھ رہتی۔ میرے سختی سے منع کرنے پر بھی میرے کپڑے دھوتی۔ استری کرتی۔ کمرہ صاف کرتی اور دوسرے بہت سے کام کرتی اور پھر شام کو آٹھ نو بجے واپس چلی جاتی۔ مجھے اُس پر ترس آتا۔ میں نے اُسے کئی بار سمجھایا

"آین! شاید تم سمجھتی ہو کہ تم مجھے اپنی خدمت سے جیت لو گی۔ یاد رکھو مجھ سے اِس قسم کی اُمید فضول ہے۔"

"لیکن عامر! میں نے تو پڑھا تھا کہ مشرق کے لوگوں کے دل سچی محبت سے پُر ہوتے ہیں۔"

"تم نے ٹھیک پڑھا تھا لیکن اُن کے دل ہر کسی سے محبت نہیں کر سکتے۔ کسی ایک کے لئے ہی دل میں جگہ پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ دل اُسی کے لئے وقف ہو جاتا ہے۔"

"کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے۔ اگر تمھیں میری کوئی عادت پسند نہیں ہے۔ لباس پہننے کا طریقہ۔ اندازِ گفتگو اور کوئی چیز پسند نہیں ہے تو بتا دو۔ میں تمھاری پسند کے مطابق اُسے بدل لوں گی۔" وہ اُداس ہو گئی تھی۔

"نہیں آین! یہ بات نہیں ہے۔ میں تمھیں بہت پسند کرتا ہوں۔ تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ بہت اچھی دوست ہو۔ دوست کی حیثیت سے میں نے تمھیں ہمیشہ پسند کیا ہے لیکن مجھے اُس وقت تم پر ترس آتا ہے جب تم شادی کی اُمید میں میرے سارے کام کرتی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھیں ایسے مقام پر لے جا کر سب کچھ بتاؤں جہاں سے تمھارا لوٹنا مشکل ہو جائے۔ اس لئے میں ابھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکوں گا۔"

وہ بہت اچھی دوست تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اُس کے ساتھ دوستی قائم رہے۔ اِس لئے میں نے اُسے سب کچھ بتایا لیکن میں یہ نہ بتا سکا کہ کوئی ہزاروں میل کے فاصلہ پر اُس سے بھی زیادہ چاہنے والا میری واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔

میں نے اُس سے یہ نہیں کہا نہ ایں! تم تو مجھے کھو کر اور کسی کو تلاش کر لوگی کیونکہ یہ یہاں کی ریت ہے لیکن وہ، وہ جو میرا انتظار کر رہی ہے۔ مجھے کھو کر خود کھو جائے گی۔

میں نے اُسے بہت کچھ بتایا اور بہت کچھ سمجھایا لیکن اُس کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ برابر آتی تھی اور سارے کام کر کے، ہنس بول کر چلی جاتی۔ جب وہ آتی تو کبھی میرے لئے فروٹ لاتی اور کبھی خوبصورت ٹائیاں۔ اُسے میرے پسندیدہ رنگوں کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا۔ میری الماری بہترین ٹائیوں سے بھر گئی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اُس نے کبھی میری جیب کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ میں اُسے کبھی کبھی فلم دکھانے لے جاتا تھا تو وہ اپنا ٹکٹ خود لینے کے لئے اصرار کرتی۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اُسے مایوس کر رہا تھا۔

اُس سے ملتے ہوئے تقریباً ایک سال بیت گیا۔ اُس کے معمول اور اُس کی محبت میں کوئی فرق مجھے محسوس نہیں ہوا۔ پھر ایک روز اچانک — وہ مجھے زمین دوز اسٹیشن میں ایک انگریز کے ساتھ مل گئی۔ مجھے قدرے حیرت ہوئی۔

"ہیلو عامر!" وہ گھبرا سی رہی تھی جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

مجھ سے تعارف کراتے ہوئے وہ یہ نہ بتا سکی کہ اُس لڑکے رابرٹ سے اُس کا کیا تعلق ہے۔ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ مختصر سی گفتگو کے بعد ہم نے اپنی اپنی راہ لی۔ دو روز بعد سنیچر کی صبح کو وہ آنے والی تھی لیکن اُس روز وہ خود تو نہ آئی، اُس کی طرف سے ایک خاصہ طویل خط ملا۔ لکھا تھا ——

پیارے عامر!

نہ جانے اُس روز تم نے مجھے رابرٹ کے ساتھ دیکھ کر کیا سوچا ہوگا؟ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں کیا کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کئی بار اپنے بارے میں تمھیں بتانا چاہا لیکن تم نے اُس کا کبھی موقع نہیں دیا۔ ہر ایک کی زندگی میں خوشی اور غم کے مواقع آتے ہیں لیکن میری زندگی تو مسلسل غم کی داستان ہے۔ مجھے زندگی میں دوسری بار خوشی اُس وقت ہوئی تھی جس شام تم سے ملاقات ہوئی تھی اور پہلی خوشی اُس وقت جب میں نے اسکول چھوڑا تھا۔ اُس وقت میری جوانی کی صبح تھی اور میری عمر سترہ سال کی تھی۔ مجھے اپنے ایک ہم وطنی جوّن سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ پھر اُس محبت کا انجام ایک سال بعد شادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے دو سال کا عرصہ ہنسی خوشی گزارا۔ پھر جوّن کا مجھ سے جی بھر گیا تو وہ دوسری لڑکیوں کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ رات کو دیر سے گھر لوٹتا۔ نشے میں چُور۔ پھر ہماری حالت اتنی خراب ہو گئی کہ دو وقت اچھی طرح کھانے کو بھی نہ رہا۔ اُس نے سب کچھ شراب پر خرچ کر دیا۔ میں نے اُسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن اُس کی آوارگی ختم نہ ہوئی۔ پھر ایک روز ایک قیامت کی سی خبر آئی۔ مجھے اطلاع ملی کہ ایک لڑکی نے جوّن کے بچّہ کو جنم دیا ہے۔ یہ مقام میرے لئے بہت مشکل تھا۔ میری دُنیا اُجڑ رہی تھی۔ خوشیوں سے بھرا پُرا گھر بنانے کے خواب ایک لمحے میں بکھرتے نظر آئے۔ بہرحال انسان کو سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے میں نے پھر بھی کوشش کی کہ وہ کسی طرح راہِ راست پر آجائے لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ آخر کار مجھے اُس سے طلاق لینی پڑی۔ اس بات کو بھی پانچ سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان پانچ سالوں میں میں کئی لوگوں سے ملی۔ وہ مجھے پسند بھی آئے۔ میں نے اُن سے محبت بھی کی۔ اُن میں سے ہر ایک نے مجھ سے محبت جتائی اور شادی کا یقین دلایا لیکن وہ محبت ایک مختصر سے عرصہ کے لئے ہوتی تھی۔ جب لوگوں کا جی بھر جاتا میں بھلا دی جاتی۔ جب سگریٹ جل کر ختم ہو جاتا ہے تو پھینک دیا جاتا ہے۔ میں نے زندگی میں کتنے ہی خواب دیکھے اور کتنے ہی فریب کھائے لیکن اِس عرصے میں میں کسی کو نہ پا سکی جو مجھے زندگی کی چند خوشیاں دے سکتا۔ پھر وطن سے میرا جی بھر گیا۔ میں نے آسٹریلیا میں اپنی دُنیا آباد کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہاں جانے کے لئے انگریزی زبان جاننا ضروری تھا۔ اِس لئے مجھے یہاں انگلستان آنا پڑا اور پھر تم سے ملاقات ہوئی۔ تم یقین جانو عامر! میں نے تمھیں حقیقت میں پسند کیا اور ایک طویل عرصہ کے بعد ہنسی خوشی کا وقت تمھارے ساتھ گزارا۔ میں نے تمھیں دل سے چاہا اور ہمیشہ کے لئے تمھیں اپنا بنانے کی تمنا کی۔

لیکن تمھارے پاس میرے لئے چند الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا پھر بھی میں نے ہر طرح سے تمھیں جیت لینا چاہا۔ لیکن انجام ——— وہی ناکامی !!

گزشتہ ہفتہ غیر ارادی طور پر رابرٹ سے اُسی بار میں ملاقات ہوئی۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ تمھیں کھو دوں لیکن مجھے اب یقین ہوگیا ہے کہ میں تمھیں کبھی پا نہ سکوں گی۔ میری جوانی کی شام ہونے کو ہے۔ اگر مجھے اب کوئی ساتھی نہ مل سکا تو بڑھاپے کے اندھیرے میں مجھے کون سہارا دے گا۔ تم ہی جواب دو۔ عامر! کیا تم میری اِس دُکھ بھری کہانی سُننے کے بعد بھی ناراض ہو۔ کیا تمھارے خیال میں میرا اب رابرٹ کے ساتھ جانا غلط ہے؟

تم اتنے اچھے انسان ہو کہ تمھارے لئے اچھے دوستوں کی کمی نہیں لیکن مجھ بدبخت کے لئے اِس دُنیا میں کچھ نہیں۔ تم مجھے بھول جاؤ اور میں بھی کوشش کروں گی تمھیں بھول جاؤں۔

غم نصیب ——— آئن

"خدا کرے رابرٹ تمھیں زندگی کی خوشیاں دے سکے ——" میرے دل سے دعا نکلی لیکن دوسرے ہی لمحہ میں اُس کے لئے بے قرار تھا۔ نہ جانے کیوں ——!!

غزلیں

ذوقؔ کیفی، بی۔اے

عشق کا حُسنِ حقیقی جو نمایاں کرلیں
دل کے ہر داغ کو رشکِ مہِ تاباں کرلیں

آہ کر سکتے ہیں ہم بھی مگر اے غیرتِ عشق
کیوں زمانے کو شریکِ غمِ ہجراں کرلیں

ہے مرا ذوقِ جنوں تشنۂ تکمیل ابھی
اپنی زلفوں کو وہ کچھ اور پریشاں کرلیں

اہلِ ہمت کے لئے کھیل ہے تجدیدِ حیات
یہ تو جس موج کو چاہیں اُسے طوفاں کرلیں

اک نئے دَور کی تنظیم کے خاکے ہی سہی
ہم نفس کچھ تو علاجِ غمِ دَوراں کرلیں

کشتیٔ زیست کو طوفاں کا خطرہ ہی تو ہے
کیوں نہ طوفان کو کشتی کا نگہباں کرلیں

چند آنسو ہی سہی یاد میں اُن کی شبِ ہجر
اِن ستاروں ہی سے کچھ دیر چراغاں کرلیں

ذوقؔ اگر فکرِ خزاں سے کبھی فرصت مل جائے
ہم بھی کچھ تذکرۂ فصلِ بہاراں کرلیں

اخگرؔ مشتاق رحیم آبادی

بس ترکِ عاشقی بھی جو کسک مٹی تو دل کی
مرے دل سے یہ بھی اُن کا کوئی انتقام ہوگا

شبِ غم سکونِ دل کی کوئی اور شکل اے دل
شبِ غم فقط تڑپنا تو مذاقِ عام ہوگا

مری مُسکراہٹوں ہی پہ نظر رہے نہ تیری
مرے آنسوؤں کے پیچھے بھی مرا پیام ہوگا

جسے کہہ رہی ہے دنیا تری بخشش و عنایت!
مرے ہاتھ پر وہ ساقی کوئی عکسِ جام ہوگا

تری کم نگاہیوں کا ہے عبث ہی مجھکو شکوہ
مرا جذبِ دل ہی شاید ابھی ناتمام ہوگا

یہ ہوا و ابر ساقی نہیں محض اتفاقی!
کہیں آج زندگی کا کوئی اہتمام ہوگا

یہ جو چُپکے چُپکے دستک کی صدائیں آرہی ہیں
درِ میکدہ پہ شاید کوئی نیک نام ہوگا

مرا ذوقِ شعر رسمی نہ جنوں روایتی ہے
مری سرگزشتِ ہستی ہی مرا کلام ہوگا


دانت کا درد
سر کا درد
بے چینی
اور "ان دنوں" کی تکلیف
جسم کا درد
سیریڈون 'روش' لیجئے
درد دور کرتی ہے، آرام پہنچاتی ہے، تازگی بخشتی ہے۔
دنیا بھر میں مشہور سیریڈون ایک ایسی بے ضرر چیز ہے جو درد اور تکلیف میں
فوراً اور یقیناً پورا آرام پہنچاتی ہے۔ سر کے درد، دانت کے درد، جسم کے درد
اور طبیعت کی بے چینی کے لئے ہمیشہ سیریڈون لیجئے۔
پوری خوراک ایک ٹکیہ۔ بچوں کے لئے پاؤ سے آدھی ٹکیہ۔
سیریڈون کی ایک ہی ٹکیہ کافی ہے
روش کی تیار کردہ
سول ڈسٹری بیوٹرز: وولٹاس لیمیٹڈ

پُراسرار، دلچسپ رُومانی ناول

چھٹی قسط

سپنوں کی رہگذر میں

——— کرشن چندر، ایم۔ اے

اِس سے پہلے کیا ہوا؟

میرا نام موتی لال ناگر ہے۔ میں ایک مصوّر ہوں۔ مجھے یہ دُنیا حقیقی نہیں معلوم ہوتی۔ میرا اعتقاد روحانی اور پُراسرار چیزوں پر زیادہ ہے۔ کبھی کبھی عالمِ خیال میں مجھے دو گلابی پاؤں نظر آتے ہیں۔

کئی دن کی دشوار گذار مسافت کے بعد بیدر داہ پہنچ کر میں نے ایک پُرانے راجپوتی قلعے میں قیام کیا۔ جس کا آدھا حصّہ ڈھہ چُکا تھا۔ قلعے کے بیرے، باورچی اور اردلی شنکر نے مجھے رات کو اُس قلعے میں سونے سے منع کیا۔ اُس کا خیال تھا قلعے میں بھوت ہیں۔ جو بھی رات کو قلعے میں سوتا ہے مر جاتا ہے۔ یہ سن کر میں رات کو قلعے کے اندر سونے کے لئے اور بھی مضطرب ہوگیا اور بالآخر رات کو اکیلا قلعے کے اندر سویا۔ آدھی رات کو محسوس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں میرے کمرے کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ میں اُٹھا، ایک ہاتھ میں ٹارچ دوسرے ہاتھ میں بندوق لے کر دروازہ کھولا تو دیکھا دو بلیاں تھیں۔

پھر بڑے اطمینان سے رات بھر سویا۔ صبح گاؤں کے نمبردار روی داس کو لے کر غاروں کی طرف اپنے کام کے لئے چلا گیا۔ جس پہاڑ میں غار تھے، اُس پہاڑ کی صحت بخش اور پُرفضا گھاٹی پر نسیمہ کا کاٹیج تھا۔ نسیمہ یہاں اپنے بے حد دولت مند لیکن علیل شوہر محمود کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک آتش زدگی میں چہرہ جل جانے سے محمود دُنیا سے رُوپوش ہوکر یہاں آگیا تھا۔ اُسے کینسر کا لاعلاج روگ بھی تھا۔ وہ دل وجان سے نسیمہ کو چاہتا تھا۔ نسیمہ بھی دس سال سے اُس کی خدمت کر رہی تھی مگر اپنی جوانی کے تباہ ہونے پر غمزدہ تھی۔ اُسے پہلے پہل ایک غریب نوجوان اکرم سے محبت ہوئی تھی لیکن اُسے ٹھکرا کر اُس نے محمود سے شادی کر لی اور اب یہی شادی اُس کے لئے مصیبت بن گئی۔

نسیمہ خود میرے ساتھ غاروں میں تصویریں دکھانے کے لئے گئی۔ وہ کانگڑہ اسکول کی پُرانی کلاسکی تصویریں تھیں۔ شام کو پھر میری واپسی پر اپنے گھر کے گیٹ پر کھڑی غصّے میں بھری ہوئی مل گئی۔ معلوم ہوا اُس کے شوہر نے مجھ سے ملنے کو منع کر دیا تھا۔ میں قلعے میں پہنچا تو روی داس نے بھی مجھے منع کیا کہ رات کو قلعے میں نہ سوؤں مگر میں نہ مانا۔ میں قلعے میں بھوت دیکھنا چاہتا تھا۔

آج رات کو سونے کے بعد اچانک ایک تیز کافوری خوشبو میری ناک میں آئی اور میں اپنی دانست میں جاگ گیا لیکن بستر سے نہ ہل سکا۔ جو کنول جیسے پاؤں مدّتوں سے مجھے نظر آتے رہے تھے، وہی کنول جیسے پاؤں اِس وقت میرے قریب آرہے تھے۔ اُن پیروں کے اوپر ایک دُھندلی دُھندلی سفید ساڑی... ساڑی

کے آنچل میں چنبیلی کے سفید پھول کی طرح ایک پیلا لیکن سُتا ہوا اُداس چہرہ —— اپنی گہری کالی آنکھیں مجھ پر گاڑے ہوئے وہ سپنوں کی حسینہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ۔ ۔ "مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ —— میرا دم گھٹتا ہے۔ اِس قلعے کی دیواروں میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کوئی نہ تھا —— صبح میں مندر دیکھنے گیا۔ مندر کی پجارن لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ بالکل وہی لڑکی تھی جو رات کو میرے خواب میں آئی تھی مگر یہ لڑکی تو بول نہیں سکتی تھی اور رات کو جو لڑکی میرے پاس آئی تھی وہ بول سکتی تھی۔

شنکر نے مجھے بتایا کہ وہ اِس مندر کی پجارن لڑکی رتنا کی بڑی بہن شونتی تھی جو رات کو مجھے دکھائی دی تھی۔ وہی بھوت بن کر قلعے میں رہتی ہے۔ شنکر نے مجھے پورا قصہ بتایا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک انگریز کلکٹر جافرسن یہاں شکار کھیلنے آیا اور ایک روز شونتی کو دیکھ کر خود اُس کے تیرِ نظر کا شکار ہوگیا۔ اُس وقت رتنا کی عمر صرف آٹھ نو سال کی تھی۔ جافرسن صاحب نے شنکر کو روپے کا لالچ دے کر شونتی پر ڈورے ڈالنا چاہے لیکن شنکر نے انکار کر دیا مگر ایک رات شونتی مندر سے غائب ہوگئی اور دوسری صبح کو جافرسن صاحب بھی قلعے سے ولایت کے لئے روانہ ہوگیا۔ اب وہ شونتی کو اپنے ساتھ ولایت لے گیا؟ یا اُس نے شونتی کو قتل کر کے اُس کی لاش قلعے میں کہیں گاڑ دی؟ اِس معاملے کی تحقیقات کبھی نہ ہو سکی۔ جبھی سے شونتی کی روح قلعے میں بھٹکتی ہوئی اپنی رہائی کے لئے تڑپتی ہے۔ اُس حادثے کے بعد شونتی کے باپ ہری داس نے خودکشی کر لی۔

رات کو مجھے شونتی پھر دکھائی دی اور رو رو کر مدد کے لئے مجھے پکارنے لگی۔ اُس کے بعد خود بخود غائب ہوگئی۔ میرے دل نے اُس کی پکار کا بڑا عجیب اثر لیا —— اب میرا یہ معمول ہوگیا کہ جلد سے جلد اپنا کام ختم کر کے قلعے میں آکر رات کا انتظار کرتا۔ کیونکہ رات آئے گی تو شونتی آئے گی۔ سپنوں کی رہگزر پر چلتے چلتے مجھے شونتی کی روح سے محبت ہوگئی تھی۔

شونتی نے مجھے کئی بار سمجھایا کہ وہ مر چکی ہے۔ اِس لئے میری اور اُس کی محبت ممکن نہیں ہے کیونکہ بیچ میں موت کی کھائی ہے مگر میں نہیں مانتا اور اپنی اُس دل گرفتگی کی وجہ سے بیمار پڑ گیا اور اِتنا کہ دس دن تک ہوش ہی نہ آیا لیکن بخار کی اُس ہذیانی کیفیت میں بھی شونتی میرے پاس آتی رہی اور دن رات میرے بستر کی پٹی سے لگی میری تیمارداری کرتی رہی۔ اُس بے ہوشی کے زمانے کی بھی ایک ایک بات مجھے یاد ہے لیکن جب دس دن کے بعد میں ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا' میں قلعے میں نہیں ہوں۔ نیچے کے ڈاک بنگلے میں پڑا ہوں اور شونتی کے بجائے نسیمہ میری تیمارداری کر رہی ہے۔

نسیمہ کی نگہداشت سے میں دن بدن اچھا ہونے لگا اور اُس کے ساتھ گھومنے کے لئے باہر جانے لگا۔ نسیمہ بھی اپنے شوہر کی طبیعت سے عاجز آکر میری صحبت کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ مجھے اپنا رازداں بنا کر اکثر اکرم کے وہ خط دکھا دیتی، جن میں اکرم نے بار بار اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور اُس کی چاہت کی خاطر اُس نے آج تک کسی اور سے شادی نہیں کی ہے۔

صبح نسیمہ محمود کو خوش و خرم چھوڑ کر میرے پاس آئی تھی۔ اب جو میں نسیمہ کے ساتھ پہنچا تو محمود کو چھت سے ایک رسی کے ذریعہ لٹکتا پایا! محمود نے خودکشی کر لی تھی اور نسیمہ پر بے وفائی کا الزام لگایا تھا۔

جو بالکل غلط تھا لیکن نسیمہ کو یہی خیال ہوا کہ میری وجہ سے اُس کے شوہر کی جان گئی۔ اُس نے مجھے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ میں پھر قلعے میں واپس چلا گیا۔ اس رات پھر شونتی میرے پاس آئی۔ پہلی بار اُس نے نسیمہ سے اپنی رقابت کا اظہار کیا۔ مجھ سے استدعا کی کہ میں اُس کی روح کو قلعے سے رہائی دلاؤں۔ وہ پھر کہنے لگی۔ "مجھے جلا دو! مجھے جلا دو!!" یہ کہتی ہوئی وہ پھر غائب ہو گئی۔ دوسرے دن میں رتنا کے پاس گیا، یہ پوچھنے کہ اُس کی بڑی بہن کا قاتل کون ہے؟ اور وہ اُس کے قتل کے بارے میں کیا جانتی ہے؟ میرے سوالات سن کر گونگی رتنا نے کاغذ کا ایک پرچہ میرے ہاتھ میں تھما دیا جس پر صرف ایک نام لکھا تھا ــــ "گوکل داس!"

اب آگے پڑھئے . . .

اُس رات سونے سے پہلے میں نے شنکر سے پوچھا۔

"یہ گوکل داس کون ہے؟"

شنکر اُس وقت ایک ٹرے میں پانی کا جگ اور دو خالی گلاس لے کر میرے کمرے میں پلنگ کے قریب پڑی ہوئی تپائی پر رکھنے جا رہا تھا۔ یکایک وہ تپائی سے ٹکرا کر ٹھوکر کھا گیا اور گرتے گرتے بچا لیکن ٹرے اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی شیشے کا جگ اور دونوں گلاس، ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

شنکر "سارِی سر!" کہہ کر باہر گیا۔ بڑی احتیاط سے اُس نے شیشے کے ایک ایک ریزے کو جھاڑو سے اکٹھا کر کے، ایک ٹوکری میں ڈال کر باہر لے گیا۔

واپس آیا تو ایک گیلا کپڑا لے کر فرش کو اچھی طرح صاف کرنے لگا۔

جب وہ فرش صاف کر رہا تھا تو میں نے اُس سے پھر پوچھا۔

"یہ گوکل داس کون ہے؟"

اُس نے ہاتھ روک کر کہا . . . "مجھے معلوم نہیں صاحب۔ اس گاؤں میں کوئی گوکل داس نہیں رہتا ہے۔ میں کسی گوکل داس کو نہیں جانتا مگر آپ نمبردار سے پوچھ سکتے ہیں۔"

شنکر نے اپنا کام روز کی طرح بہت ہی احتیاط اور تیزی سے کیا۔ میری علالت میں جو اُس نے میری خدمت کی تھی اُس سے خوش ہو کر میں نے اُسے آج دس روپے انعام میں دئے۔ انعام پا کر وہ تین بار نیچے جھکا اور جھک کر کورنش بجا لایا۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ میں شنکر کو پسند کرنے لگا تھا۔

ایک تو باتونی نہ تھا۔ دوسرے وفادار تھا۔ تیسرے اُس سے کچھ کہنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ خود ہر بات کا خیال رکھتا تھا۔

شنکر نے قلعے کے اندر کی چابیوں کا گچھا مجھے دیا اور سلام کر کے رخصت ہوا۔ روز کی طرح میں نے قلعے کو چاروں طرف سے بند کیا اور اپنے کمرے میں آ کر سونے لگا لیکن آج مجھے بہت جلد نیند آ گئی۔ نہ جانے کیوں؟

لیکن آج میں شونتی سے ملنا نہ چاہتا تھا۔ جی چاہتا تھا آج وہ نہ آئے۔ آج میرا دل کسی اور سوچ میں گم تھا۔ جی چاہتا تھا جلد صبح ہو اور میں اپنے کام میں لگ جاؤں ــــ کچھ فیصلے میں نے بھی کئے تھے۔

لیکن شونتی آ گئی . . . وہ آنے سے باز نہ رہ سکی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔

"جب تم آتی ہو تو اپنے ساتھ یہ کیسی خوشبو ساتھ لاتی ہو؟ اِس سے میرے رگ و پے میں زہر دوڑنے لگتا ہے۔ جسم کا بند بند ٹوٹنے لگتا ہے۔"

"یہ سمے کی خوشبو ہے۔" شونتی گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اس کے بنا میں تمھارے پاس نہیں آ سکتی۔ یہ گزرے ہوئے وقت کی خوشبو ہے جو مستقبل میں جمع رہتی ہے۔ اگر کوئی لوٹ کر اِدھر آنا چاہے، جیسے میں تمھارے پاس آتی ہوں، تو مجھے اِس خوشبو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اِس کے بغیر میں تمھارے پاس نہیں آ سکتی۔"

"تو گویا تم میرے لئے اپنے مستقبل کو خرچ کر رہی ہو؟ کتنا خرچ کر چکی ہو؟"

"بس ایک رات باقی رہ گئی ہے!" شونتی گہری اُداسی سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی ــــ "اپنے مستقبل کے سات سال دیتی ہوں، تو ایک رات تمھاری جانب لوٹتی ہوں۔ اِسی طرح میں نے اپنا سارا مستقبل خرچ کر ڈالا ہے۔ بس اب میں ایک رات کے لئے اور تمھارے پاس آ سکتی ہوں۔"

اُس نے ہوا کے لمس سے بھی نازک انگلیوں سے میرے چہرے کو چھوا اور برف کے گالوں سے بھی شفاف ہونٹوں سے میری آنکھوں کو چوما۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے بستر پر نہیں گلاب کی دو پتیوں کے درمیان لیٹا ہوا ہوں۔ میں نے اُس کی سسکی کی سرد آہ اپنے ماتھے پر محسوس کی۔

"شونتی!" میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اُس نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"نہیں! آج تم نہیں بولوگے۔۔۔ آج مجھے کہنے دو۔۔۔ انھوں نے مجھے محبت نہیں کرنے دی ـــــ انھوں نے میری آبرو مجھ سے چھین لی۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ عورت کے لئے عزت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ عورت کے لئے جو کچھ ہے محبت ہے۔۔۔ اور اگر وہ محبت نہیں کرسکتی یا اُسے محبت کا موقع نہیں دیا جاتا، تو اُس کی زندگی ادھوری رہتی ہے۔ میں یہ کمی پوری کرنے کے لئے تمھارے پاس آئی ہوں"

"کیسے مکمل کروگی اپنے آپ کو؟ مجھ سے محبت کرکے؟"

"نہیں!۔۔۔ اپنے آپ کو آزاد کرکے ـــــ میں اس قلعے کی چار دیواری میں محصور ہوں۔۔۔ ایک قیدی کی طرح بند کردی گئی ہوں۔۔۔ اور قیدی محبت نہیں کرسکتے۔۔۔ محبت کرنے کے لئے آزاد ہونا ضروری ہے"

"آج تم ایک پنڈتائن کی طرح باتیں کررہی ہو؟"

"یہ مت بھولو! میں ایک پنڈت کی بیٹی ہوں۔ میں نے بہت کچھ پڑھا ہے جو ہمارے گرنتھوں میں ہے اور جو آج بھی بہت قیمتی ہے"

"اور اگر میں تمھیں آزاد کرادوں؟ جس کا میں نے آج فیصلہ کیا ہے"

میں نے اُس سے کہا۔ "تو پھر تم غالباً مجھ سے ملنے کے لئے نہ آؤگی؟ ٹھیک بھی ہے ایک آخری ملن کے لئے سارے مستقبل کو خرچ کردینا بڑی حماقت ہے"

"تو تم ایک عورت کو نہیں جانتے۔۔۔!" شونتی نے اپنے گال میرے گال سے لگادئے۔ اُس کے گال کے آنسو میرے گال پر آگئے جس سے معلوم ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔

میں بہت دیر تک چپ رہا۔ پھر رُک رُک کر کہنے لگا۔

"میں نے تمھیں آزاد کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے"

"یعنی تمھیں آزاد کرانے کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگادوں گا!"

"اور بدلے میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک بار اپنی صورت اور دکھادو!"

"حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ جو روح آزاد ہوجاتی ہے وہ پھر واپس نہیں آتی"

"میں واپس آؤں گی" شونتی پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "میں ضرور واپس آؤں گی۔ چاہے ایک پل کے لئے آؤں لیکن آؤں گی ضرور!"

میں نے اُس کے ہونٹ اپنے ماتھے پر محسوس کئے۔ پھر وہ دھیرے دھیرے مجھ سے دُور ہوتی گئی۔۔۔ دھیرے دھیرے وہ خوشبو بھی جانے لگی لیکن آج میں نے اُٹھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم نہیں وہ کب گئی؟ کدھر گئی؟ میں گہری نیند سوچکا تھا۔

دوسرے دن صبح شنکر نہ آیا۔ ناشتے کا وقت ہوگیا جب بھی نہ آیا۔ میں کچھ حیران اور پریشان ہوکر قلعے سے باہر نکلا اور ابھی چوبی پل تک ہی گیا تھا کہ شنکر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گاؤں کی جانب سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

آتے ہی اُس نے مجھ سے معافی مانگی

"انڈے ختم ہوگئے تھے صاحب! مجھے خیال نہیں رہا۔ آج صبح جو نہی دیکھا تو جلدی سے بھاگا گاؤں سے انڈے لانے کے لئے"

وہ ایک تھیلی میں بہت سے انڈے لئے چلا آرہا تھا۔

غسل کے بعد میں ناشتہ کرکے گاؤں کی طرف نکل گیا۔ سب سے پہلے نمبردار رودی داس کو اُس کے گھر کے آنگن میں جاکر پکڑا۔

"یہ گوکل داس کون ہے؟" میں نے اُس سے براہِ راست سوال کیا

سوال اتنی تیزی اور جلدی میں ہوا تھا کہ رودی داس اپنے ہوش درست نہ رکھ سکا۔ اُس کا چہرہ اکدم پیلا پڑگیا اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ میں نے دیکھا۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہے لیکن میں اُسے اس کا موقع نہ دینا چاہتا تھا

"گوکل داس۔۔۔؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں ہاں گوکل داس! اور بنومت! تمھارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے تم اُسے جانتے ہو!؟"

رودی داس اب اپنے آپ پر قابو پاچکا تھا۔ اُس نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں صاحب! میں کسی گوکل داس کو نہیں جانتا۔ ہمارے گاؤں میں کوئی گوکل داس نہیں رہتا"

میں دیر تک اُسے دیکھتا رہا پہاڑی دیکھنے میں سادہ لوح ہوتے ہیں لیکن اندر سے بہت چالاک بھی ہوتے ہیں وہ اپنا منہ تھوڑا سا کھولے ہوئے احمقوں کی طرح منہ اُٹھا میری طرف دیکھے جارہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے لیکن اب میں اُس وقت اُس سے کچھ اور معلومات حاصل نہ کرسکتا تھا

پھر میں کچھ کہے بغیر اُس کے گھر سے لوٹ آیا۔

پھر میں دوسرے کسانوں کے پاس آیا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کئی کسانوں سے پوچھا۔ وہ سب سر ہلاکے انکار کرتے تھے۔ اُن میں سے کسی نے گوکل داس کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ وہ اُسے جانتے تھے۔ نہ کسی ایسے شخص کی ہستی سے آگاہی رکھتے تھے۔

ایک گوپال داس تو تھا، اُن کے گاؤں میں لیکن گوکل داس کوئی نہ تھا

میرے دل میں شکوک بڑھنے لگے۔ کہیں دتا نے مجھے چکمہ تو نہیں دیا تھا؟ اُس کا مطلب کیا تھا؟ اگر گوکل داس اِس گاؤں میں نہیں ہے۔ تو پھر کہاں ہے؟

جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نسیمہ سے صلاح کرنے کے لئے رچرڈز کاٹیج کی طرف روانہ ہو گیا۔ جو اب میرے راستے سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔

نسیمہ کاٹیج کے باغیچے میں سیب کے شگوفوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کے نیچے بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ پاس کی تپائی پر چائے رکھی تھی۔ وہ ایک پیٹ بھری بلی کی طرح ایک چھوٹے سے بسکٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنے ہاتھوں سے کاٹ کاٹ کر اُسے بڑی نزاکت سے چبانے لگتی۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"بڑے شرم کی بات ہے۔ منع کرنے پر بھی آجاتے ہو!"

"بہت خوش معلوم ہوتی ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا

وہ ایک دم بھڑک گئی۔ بولی۔

"تم کیا چاہتے ہو؟ آگ میں جل کے ستی ہو جاؤں گی ـــــ عجیب ہوتے ہیں یہ ہندو۔۔۔ خود تو مرتے ہیں۔۔۔ اپنے ساتھ عورت کو بھی جل جانے کی تلقین کرتے ہیں۔"

"میں اِس وقت تم سے فضول بحث کرنے نہیں آیا۔"

"تو کیا پیار کرنے آئے ہو؟ ـــــ یہ چپل دیکھی ہے!؟"

"چپل کے چھتے سے کون پیار کرے گا؟" میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "میڈم! میں تو صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ تم گوکل داس کے نام کے کسی شخص کو جانتی ہو؟"

"نہیں!" وہ اکدم بڑے وثوق سے انکار کرتے ہوئے بولی لیکن دوسرے ہی لمحے میں فوراً اپنی بات کی تردید کرتے ہوئے چیخ پڑی "ہاں ہاں۔۔۔ جانتی ہوں۔ گوکل داس؟ ـــــ قلعے کے بنگلے کا نائب بیرا تھا۔۔۔ انگریزوں کے وقت میں تھا۔۔۔ لیکن اب تو وہ یہاں نہیں رہتا۔ برسوں سے اُسے کسی نے اِس گاؤں میں نہیں دیکھا۔ کیوں جان محمد؟"

نسیمہ نے مڑ کر اپنے بیرے سے پوچھا۔ جو اُس وقت میرے لئے چائے کی ٹرے اُٹھائے لا رہا تھا۔

"ہاں بیگم صاحب! وہ جارج صاحب کے واقعے کے بعد سے کسی نے اِس گاؤں میں نہیں دیکھا۔" جان محمد ٹرے رکھ کے چلا گیا۔ نسیمہ چائے بنانے لگی

"تمہاری چائے میں کتنا زہر ڈالوں؟" وہ شکر کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یہ تو ناگن کے زہر کی کوالٹی پر منحصر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرا پڑی۔ بولی "ہندوؤں سے اور کچھ نہیں تو مسلمانوں سے باتیں کرنا تو سیکھ ہی لیا ہے۔"

میں نے کہا "اور جو باتیں رہ گئی ہیں وہ بھی ہوتے ہوتے سیکھ جائیں گے۔"

اُس نے مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا "گوکل داس سے تمہیں کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "میں شوبھی کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ!" نسیمہ چونک کر بولی "وہ چڑیل ابھی تک تمہارے پیچھے پڑی ہے؟"

میں خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"دیکھ لینا!" وہ معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی "ایک دن یہ چڑیل تمہاری جان لے لے گی۔ ایک دن تم بھی اپنے بستر پہ مُردہ پائے جاؤ گے۔"

چائے پی کر جب کاٹیج سے باہر نکلا، تو مجھے لکڑی کے بنگلے کے باہر بوگن ویلیا کی بیل کے قریب اپنی کُہنی ٹکائے ہوئے جان محمد باورچی مل گیا۔ مجھے دیکھ کر آگے بڑھا

"حضور! میں آپ کو گوکل داس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔"

میں نے اُسے دس کا نوٹ دیا۔ جو اُس نے جلدی سے اپنی اندر کی جیب میں رکھ لیا

"وہ اِس گاؤں میں نہیں رہتا۔" جان محمد نے میرے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔ "وہ اِس وادی کے آخری سرے پر ـــــ" جان محمد نے اشارہ کرکے بتایا: "سب سے الگ تھلگ اور اکیلا رہتا ہے اور کسی سے مِلتا جُلتا نہیں۔"

"کام کیا کرتا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ مگر اُس کے گھر سے ملی ہوئی ایک پُرانی پن چکی ہے۔ اس وادی کی آخری گھاٹی کے بالکل آخری سرے پر۔ لیکن اب تو وہاں کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ کیونکہ یہ پن چکی ہمارے گاؤں سے کوئی آدھے دن کی مسافت پر ہے۔ اِتنی دُور کون جائے گا۔"

"وہاں کھیتی باڑی کرتا ہے؟"

"ہاں مکئی کا ایک چھوٹا سا کھیت ہے اُس کا۔ لیکن مشکل سے ایک مہینے کی فصل ہوتی ہوگی اُس میں۔"

"بال بچے ہیں اُس کے؟"

"میرے خیال میں تو اکیلا رہتا ہے وہاں۔"

"تم اُسے کیسے جانتے ہو؟"

"دو سال پہلے وادی میں ایک سیلاب آیا تھا۔ گاؤں کی پن چکّی اُس سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ اتفاق سے انھیں دنوں ہمارے ہاں آٹا ختم ہو گیا۔ میں نے [illegible] داس نمبر دار سے اپنی مشکل کا ذکر کیا تو اُس نے مجھے اُس دُور دراز کی پن چکّی پر آٹا پسوانے کے لئے کہا۔"

"پن چکّی کے مالک کا نام بتایا تھا روی داس نے؟" میں اپنی حیرت کو [illegible] نہ سکا۔

"[illegible] بتایا تھا۔ گوکل داس کی پن چکّی ہے۔ پسوا لاؤ لیکن یہ بھی خیال [illegible] ظاہر کیا تھا کہ گوکل داس کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ میں گیا تھا تو اُس [illegible] نہیں دیا۔ اس لئے مجھے یہ پورا واقعہ یاد ہے۔"

"[illegible] روی داس نے پن چکّی کے مالک کا نام بتایا تھا؟" میں نے [illegible] پوچھا۔

"[illegible] بال [illegible] سے تو مجھے گوکل داس نام معلوم ہوا۔"

تو پھر روی داس نے مجھ سے غلط کیوں کہا؟ میں نے اپنے دل سے [illegible] یہاں نمبر دار سے کچھ نہیں کہا۔ سوچتا ہوا ڈھلان سے نیچے گاؤں کی طرف [illegible] تنگ تھا اور دونوں طرف اونچی اونچی گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ [illegible] چلتے چلتے مجھے ایسا احساس ہوا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ گھاس [illegible] ہو رہی تھی۔ کبھی جھاڑیوں کے پیچھے سے کوئی سایہ سا [illegible] کرتا [illegible] میں تیز چلتے چلتے یکدم رُک کر جو ایک جھاڑی کے قریب پہنچا تو جلدی سے اُس کے نیچے سے ایک سفید خرگوش اُچھلا اور چھلانگ مار کر لمبی گھاس میں [illegible] ہو گیا۔

[illegible] چہرے پر اب مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ پھر بھی میں نے یہ بہتر [illegible] گوکل داس سے نپٹنے کے لئے یہ کہیں بہتر ہے کہ پن چکّی پر اپنی تھری ناٹ تھری [illegible] جایا جائے۔

میں نے شنکر سے بہانہ کر دیا کہ میں آج شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ اتنا کہہ کر میں نے اپنی تھری ناٹ تھری اُٹھائی۔ شکار کا دوسرا سامان اُٹھایا اور اکیلا ہی اُس [illegible] نکل پڑا جدھر جان محمد نے مجھے بتایا تھا کہ اُدھر گوکل داس کی پن چکّی ہے۔

اُدھر مجھے گھوم کے جانا پڑا۔ پہلے میں نے جنگلوں کا رُخ کیا تاکہ اگر کوئی دیکھتا بھی ہو تو یہی سمجھے کہ صاحب شکار کو جا رہے ہیں۔ پھر وہاں سے گھوم [illegible] گھاٹی کی اوٹ میں ہو لیا اور ندی کے کنارے چلتے چلتے ایک تکونی ڈھلان [illegible] جہاں سے ندی کا ایک حصّہ ایک گہری دھار کی صورت میں ایک پُرانی پن [illegible] کے اندر سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس پن چکّی سے ملا ہوا مٹّی کا ایک پُرانا گھر [illegible] کے پیچھے مکّی کا ایک کھیت تھا۔ جس کی باڑھ پر کاؤ کے سخت کھردرے اور [illegible] پتّوں والے پیڑوں کی ایک گھنی قطار کھڑی تھی اور اُس تکونی گھاٹی [illegible] سورج مکھی، کتان اور سنتھے کی جھاڑیوں کی اونچی باڑھ کھڑی تھی [illegible] میں ایک عجیب مرطوب بساندسی بسی ہوئی تھی جو بہت اعصاب [illegible] پیدا کرنے لگی تھی۔ میں نے تھری ناٹ تھری کو اچھی طرح [illegible] حفاظت باڑھ کو توڑ کر سیدھا اندر گھستا گیا۔ گھاس اور جھاڑیوں [illegible] پن چکّی کے [illegible] پن چکّی میں کوئی نہیں تھا۔ پتھر کے دو [illegible] دوسرے پر [illegible] ساکت تھے۔ ان کے پیچھے سے پانی ایک [illegible] کے ساتھ تیزی سے بہتا ہوا، جھاگ اُڑاتا ہوا پن چکّی کے باہر نکل [illegible] پن چکّی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے ایک [illegible] استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ [illegible] پن چکّی کے اندر چاروں طرف [illegible] دیکھتا رہا۔ اسی دوران میں میری نیند پن چکّی کے پتھر کے پاؤں [illegible] ہو گئی۔

[illegible] خوف سے اُچھلا۔ پتھر کے پاٹ الدم [illegible] گھوم کر جو دیکھتا ہوں [illegible] گہری آنکھوں [illegible] والا ایک بھاری بدن کا کسان اپنے سینے پر ایک میلی قمیص پہنے [illegible] نیچے ایک موٹا سا لنگا پاجامہ پہنے، کاندھے پر کمبل لئے کھڑا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ کر بڑے بڑے دانتوں سے ہنس رہا ہے۔

"صاحب ادھر کدھر شکار کھیلنے آیا ہے؟" اُس نے [illegible] آواز میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے تھری ناٹ تھری اُس کی طرف گھمائی۔

"تم گوکل داس ہو؟"

وہ بڑی بے خوفی سے بولا "ہوں!"

"شونتی کے قتل میں تم نے کیا حصّہ لیا تھا؟"

یکایک اُس کا چہرہ اُترنے لگا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی گہری آنکھوں [illegible] خوف کی چمک پیدا ہوئی۔ پتلیاں تیزی سے گھوم کر ساکت ہو گئیں۔ [illegible] میری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے کہا: "تمھاری ناش تمھری بھری ہوئی ہے! میں اس سے عام طور پر شکار کرتا ہوں۔ آج میں اس سے تمھاری جان لوں گا!"

میں نے شست باندھی۔

گوکل داس آگے بڑھ کر وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

"مجھے معلوم تھا ایک دن ایسا ہوگا۔" اس نے آپ ہی آپ سے کہا۔ "میرا پاپ میرے سامنے آئے گا!"

"مگر تمھیں گولی مارنے سے پہلے میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ اس قتل میں اور کون شریک تھا؟ حالانکہ میں سب کچھ جانتا ہوں، مجھے سب معلوم ہے لیکن میں تمھاری زبان سے پورا واقعہ سننا چاہتا ہوں۔ اگر تم سچ سچ بتا دو گے تو شاید میں تمھاری جان نہ لوں گا۔ مگر وہیں بیٹھے رہو۔ اٹھنے کی کوشش نہ کرو۔"

وہ چالاکی سے آگے سرک کر مجھ پر حملہ کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا اسے میں نے تاڑ لیا تھا اور اب اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کی اس حرکت کو میں نے بھانپ لیا ہے۔ وہ مجھ سے تقریباً تگنا تگڑا تھا۔ اس لئے میں بہت ہوشیار رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دیا۔ بڑی عاجزی اور خوشامد میں گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"صاحب معافی دو۔ میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ میری بات سنو!"

"تمھارے ساتھ اور کون تھا؟"

"رودی داس!"

"رودی داس؟" میں اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں رودی داس! گاؤں کا نمبردار اور پنڈت ہری داس کا بھائی خود قلعے سے میرے ساتھ گیا تھا۔ اسے پہلے تو جانسن صاحب نے بہت ڈرایا دھمکایا تھا۔ کہا تھا وہ اس کی نمبرداری ضبط کر لیں گے۔ پھر اسے پھسلایا اور پچکارا اور اسے آس پاس کے سات گاؤں کا سرپنچ بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ آخر میں اسے روپے نقد دیئے تھے۔"

"تمھیں کتنے ملے تھے؟"

"پچاس روپے ملے تھے صاحب۔ میرا کام تو خالی شونتی کو اس کے گھر سے قلعے کے اندر پہنچانا تھا۔ خود پنڈت رودی داس میرے ساتھ گیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"اس وقت پنڈت ہری داس گھر کے اندر سویا ہوا تھا جب ہم اس کے دروازے پر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ اندر سے بولا "کون ہے؟" رودی داس نے کہا "میں ہوں تمھارا بھائی! دروازہ کھولو۔" جوں ہی پنڈت ہری داس نے دروازہ کھولا میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچے گرا لیا اور رسی سے جکڑ کر ایک کونے میں پھینک دیا۔

اتنی ہوشیاری اور پھرتی سے میں نے یہ کام کیا کہ ہری داس کے منہ سے ایک چیخ تک نہ نکل سکی۔ پھر رودی داس نے مجھ سے کہا۔ اندر جا کر شونتی کو اٹھا لاؤ! اور اتنا کہہ کر خود غائب ہو گیا۔ میں اندر گیا۔ دونوں بہنیں ساتھ ساتھ ایک کھاٹ پر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے سو رہی تھیں۔ میں نے جب شونتی کو اٹھایا تو رتنا بھی جاگ پڑی اور زور سے چیخی۔ میں نے شونتی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا پھر بھی وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر گھر سے باہر لانے لگا تو رتنا مجھ سے الجھ گئی۔ مزاحمت کرنے لگی، چیخنے چلانے لگی۔ میں نے ایک ہاتھ سے تو شونتی کو پکڑے رکھا۔ دوسرے سے رتنا کو کس لیا اور زور سے رتنا کو ایک گھونسہ مار کے اسے کھاٹ پر گرا دیا۔ آٹھ سال کی بچی ہی تو تھی۔ میرا ایک گھونسہ کھاتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ پھر میں شونتی کو اٹھا کے قلعے کے اندر لے آیا۔ صاحب بہادر بہت خوش ہوئے۔ مجھے بیس روپے انعام میں اور دیئے۔ بولے "تم ادھر ہی بیٹھو۔ اس چھوکری کو اس کے گھر پہنچا دینا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

گوکل داس ایک دم چپ ہو گیا۔ اس کا چہرہ ایک دم تن گیا تھا۔ اس کے کان باہر لگے ہوئے تھے۔ واقعی باہر کے کھیت میں آہٹ ہو رہی تھی۔ گوکل داس کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود دیکھنے کے لئے دبے قدموں سے باہر چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ آہٹ خود بخود بند ہو گئی۔ پتہ نہیں قدموں کی آہٹ تھی یا کسی جنگلی جانور کی یا پتوں کی سرسراہٹ تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ خود بخود بند ہو گئی اور پھر پن چکی کے اندر گہرا سناٹا چھا گیا۔

دس منٹ گزر گئے۔ بیس منٹ گزر گئے۔ تیس منٹ گزر گئے گوکل داس واپس نہیں آیا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا، اس نے مجھے چکمہ دیا تھا۔ کس صفائی سے اک ذرا سی چالاک نفسیاتی حرکت کو کام میں لا کے وہ فرار ہو گیا تھا۔ کون

کہتا ہے کہ کسان لوگ بے وقوف ہوتے ہیں۔ یہ تو شہریوں کے بھی کان کترتے ہیں۔ میں نے اپنی حماقت پر اپنا ماتھا پیٹا۔ جس نے گرفتار قاتل کو یوں نکل جانے کا موقع دیا۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں پن چکی سے باہر نکلا۔ ساتھ میں لگا ہوا اُس کا گھر تھا۔ بڑی احتیاط سے اُس کے گھر کے دروازے تک گیا۔ دروازے کو ذرا سی جنبش دی۔ چیں چیں کی آواز پیدا کرتے ہی دروازے کا کواڑ خود بخود کھل گیا۔ گھر کے اندر ایک ہی کمرہ تھا اور ایک چھوٹا سا آنگن۔ کمرے میں ایک طرف ایک کھاٹ، مٹی کا ایک گھڑا اور مٹی کے چند برتن، دیوار پر ایک میلی کچیلی روئی دار جاکٹ کھونٹی کی ایک کیل پر لٹکی تھی لیکن کمرہ بالکل خالی تھا۔

میں دبے پاؤں گھر سے باہر نکلا اور ستھری تان ستھری ہاتھ میں لئے ساتھ کے کھیت میں اسے ڈھونڈنے لگا۔ لمبی لمبی گھاس، اونچی اونچی جھاڑیاں، کاؤ کے درختوں کی گھنی قطار سب دیکھ ڈالیں۔ گوکل داس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ تینوں طرف سے چکر کاٹ کر چوتھی طرف چلا۔ جدھر ندی کا ایک حصہ کٹ کر پن چکی میں داخل ہو کر تیزی سے ایک ڈھلان پر بہتا تھا۔ پانی کے کنارے چلتے چلتے جب میں پن چکی کی دیوار کے قریب پہنچا تو میں نے گوکل داس کو یک لخت دیکھ لیا۔

وہ پانی کے کنارے اکڑوں پڑا تھا۔ اُس کے پاؤں کنارے کی گھاس میں پھیلے ہوئے تھے اور سر پانی کے اندر تھا۔

میں نے اُس کا سر اُٹھا کے دیکھا۔ کسی نے پیچھے سے اُس کے سر پر کند آلے سے وار کیا تھا۔ اُس کا سر پھٹ گیا تھا۔ موت فوراً واقع ہوئی تھی۔ ندی کے بہاؤ میں اُس کا خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔

میں نے اُس کا سر پھر اُسی طرح پانی میں ڈال دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دور اُفق کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف سے گہرے اودے بادل منڈلاتے ہوئے وادی کی جانب بڑھ رہے تھے۔

میں نے سوچا۔ اب مجھے فوراً چل دینا چاہئے۔

بہت احتیاط سے چلتے ہوئے قلعے کی جانب واپس آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ ایک نہیں دو آدمی ہیں۔ شاید کئی آدمی ہیں۔ یا تو اُن کی زندگی رہے گی یا میری! میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے میں احتیاط سے چلتا ہوا پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آ رہا تھا۔ یہ تو بالکل ظاہر ہو چکا تھا کہ جو کوئی بھی میرا تعاقب کرنے والا ہے اُس کے پاس بندوق نہیں ہے۔ ورنہ اب تک کئی مقام ایسے آئے تھے، جہاں سے وہ مجھے بہت آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اس خیال سے مجھے راستے میں بڑی ڈھارس دی۔ پھر بھی میں بے حد چوکنا تھا۔ کئی جگہوں پر جہاں راستہ بہت تنگ ہو اور دو رویہ اونچی چٹانوں سے گھرا ہوا، جہاں کسی بھی بڑے پتھر کو لڑھکا کر مجھے ختم کیا جا سکتا تھا۔ میں نے گھوم کر چکر کاٹا اور اُس راستے سے بچ کر نکلا لیکن بہت تیزی سے چلا۔ میں روشنی ختم ہونے سے پہلے قلعے کے اندر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

آج میرا مقابلہ بہت سے دشمنوں سے تھا۔ ایک تو وہ دشمن تھا جو شاید میرے تعاقب میں تھا۔ جس نے گوکل داس کو بڑی چالاکی سے ختم کیا تھا۔ گوکل داس اب اُس کے خلاف کوئی بیان نہیں دے سکتا تھا۔ دوسرا روی داس تھا جس نے روپیہ لے کر اپنے بھائی کی بیٹی کی عصمت بیچ دی تھی اور جسے میں گوکل داس کا نام لے کر خبردار کر چکا تھا۔ پورا قصہ تو میں نے سنا نہیں۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر روی داس ہی شونتی کا قاتل ثابت ہو یا کوئی اور؟ —— جس طرح گاؤں کے بہت سے لوگوں نے شنکر سمیت گوکل داس کا نام سن کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب لوگ کسی سے خائف ہیں یا غالباً نمبردار کے چچو ہیں اور اُس کا نام نہیں لینا چاہتے۔ بہر حال وہ جو کوئی بھی ہے۔ ایک یا دو یا دس، انہیں آج رات کھل کر میرے سامنے آنا چاہئے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں حقیقت کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں!

بادل گھر گھر کر بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ روشنی رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ بادلوں کی چمک اور گرج بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ زور کا جھکڑ چلنے لگا۔ پھر یکدم بارش کے تھپیڑے میرے چہرے پر تڑا تڑ پڑنے لگے اور میں تیز تیز قدموں سے قلعے کی طرف دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے انتہائی تیز رفتاری سے ایک ٹیلے کے نیچے سے گزر گیا اور [illegible] ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ چند ثانیوں کے بعد زور سے گڑگڑاتا ہوا ایک بہت بڑا پتھر ٹیلے کی چوٹی سے گرتا ہوا [illegible] پانی میں شور [illegible] غائب ہو گیا۔ [illegible] چند ثانیوں [illegible] میری موت یقینی تھی!

میں [illegible]
گھنٹے میں پانی میں شرابور [illegible]
جب شنکر گیلے کپڑوں میں [illegible] اور [illegible] ایک [illegible]
کو اُس کی اوٹ میں رکھے ہوئے [illegible] کا [illegible] تھا۔

اُس نے [illegible]
[illegible] مجھے گرم پانی [illegible]
[illegible] پھر شنکر کے [illegible] کیونکہ سردی یکایک

پڑ گئی تھی اور میرے دانت کٹکٹا رہے تھے اور اس طوفان میں دو کمبل کافی نہیں تھے۔ رات کی سردی کو دور کرنے کے لئے آج ایک اور لحاف کی شدید ضرورت تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"آپ سو جائیے۔ آج میں رات بھر جاگ کر آپ کی نگہبانی کروں گا۔ آپ کو سردی لگ گئی ہے۔"

لیکن میں نے انکار کر دیا۔ آج تو قتل کی رات تھی! آج تو وہ آنے والا تھا جس نے مجھ سے شوبتی کے قتل کا انتقام لینا تھا۔ اب اس کے پاس بھی زیادہ وقت نہیں تھا۔ آج اسے اپنے آپ کو خود بخود ہی ظاہر کر دینا چاہئے وہ کوئی بھی ہو۔

اس لئے میں نے شنکر کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور اسے ہر روز کی طرح قلعے سے باہر بھیج دیا۔

ایک نوکر خانے کے سوا میں نے قلعے کے سارے دروازے اندر سے بند کر لئے۔ نوکر خانے کا راستہ اس لئے کھلا چھوڑ دیا کہ کوئی تو راستہ کھلا رکھنا چاہئے۔ اس کے اندر آنے کے لئے۔ مگر یہ آسانی بے کار تھی۔ وہ کوئی راستہ تو نکال ہی لے گا اندر آنے کا۔ یہ سوچ کر میں نے نوکر خانے کا دروازہ بھی بند کر دیا۔ ہو سکتا ہے اسے یہ دروازہ دیکھ کر ہی شک ہو اور وہ خبردار ہو جائے۔

سب دروازے بند کر کے اور سارے تالے اچھی طرح سے ہلا کے۔ سب کنڈیاں چٹخنیاں دیکھ کر میں اپنے کمرے کے اندر محصور ہو گیا۔ کچھ دیر تک پڑھتا رہا۔ پھر بتی بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

لیکن بہت دیر تک مجھے نیند سے لڑنا پڑا۔ کیونکہ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ آج ساری رات جاگنا چاہتا تھا لیکن نیند تھی کہ آئے چلی جا رہی تھی۔ شاید یہ برانڈی کے پیگ کا اثر تھا۔ اگر جاگنا تھا تو برانڈی نہیں پینی چاہئے تھی لیکن سردی اس قدر بڑھ چکی تھی اور میں بارش میں اتنا بھیگ چکا تھا کہ برانڈی لئے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔

معلوم نہیں جاگتے جاگتے میں کب سو گیا۔ یکایک جیسے میرے جسم کے اندر کوئی الارم بجا اور میں یک لخت جاگ کر چوکنا ہو گیا۔ باہر بادل کی گرج اور چمک ہو رہی تھی۔ پانی برسنے کی آواز بھی آ رہی تھی لیکن میرے احساس ان آوازوں کو ایک پس منظر کی طرح جذب کر رہے تھے۔ ان آوازوں سے اوپر جو آواز ابھر رہی تھی، کسی کے رک رک کر سانس لینے کی آواز تھی۔ جو حالانکہ سب آوازوں سے کم تھی لیکن اس وقت وہی سب سے اوپر ابھر رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے میرے کمرے میں کوئی داخل ہو چکا ہے!!

(باقی آئندہ)

غزلیں

کشمیری لال ذاکر، ایم۔اے

چمن کا پاسباں کوئی نہیں ہے — گرائے برقِ تپاں کوئی نہیں ہے
جہاں تو ہے وہاں ہے ایک دنیا — جہاں میں ہوں وہاں کوئی نہیں ہے
کروں جس سے تری الفت کی باتیں — اب ایسا رازداں کوئی نہیں ہے
فقط میں ہوں، مری تنہائیاں ہیں — شریکِ کارواں کوئی نہیں ہے
ہم اہلِ درد ہیں، بے آسرا ہیں — ہمارا مہرباں کوئی نہیں ہے

مری بھولی ہوئی ماضی کی یادو
چلی آؤ یہاں کوئی نہیں ہے

علی احمد جلیلی، ایم۔اے

صبا کا صبح کا گل کا کلی کا نام نہیں — تمہارے نام کے ہوتے کسی کا نام نہیں
سحر ہے نام اسی کا تو رات پھر کیا ہے — کہ دور دور تلک روشنی کا نام نہیں
یہ اپنے اپنے سلیقہ کی بات ہے ساقی — کہ غرق بادہ ہوں، تر دامنی کا نام نہیں
تری ہنسی سے بھرم ہے بہار کا ورنہ — بہار صرف شگوفوں کی ہنسی کا نام نہیں
حیاتِ عشق کی راہیں بہت طویل سہی — جو تم ہو ساتھ تو واماندگی کا نام نہیں

غمِ نشاط کی بھی اس میں دھڑکنیں ہیں علی
نشاطِ غم ہی مری شاعری کا نام نہیں


میرے رنگ رُوپ کیلئے
میرا پسندیدہ صابن
لکس
کلپنا کہتی ہیں
LUX
TOILET SOAP
دِلفریب رنگ رُوپ آپکے لئے بھی اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کلپنا
کے لئے... اس کی دیکھ بھال بھی ویسی ہی ہونی چاہیئے۔
فلمی حسینہ کلپنا کہتی ہیں: "عورت کا اصلی حُسن اُسکا بیداغ رنگ رُوپ ہے۔
یہ آپکے لئے اُتنا ہی ضروری ہے جتنا میرے لئے۔ اپنے رنگ رُوپ کی دیکھ بھال
میں لکس سے کرتی ہوں۔ اسکا ملائم جھاگ اور اس کی دلنواز خوشبو مجھے بیحد
پسند ہے" لکس سے آپ کا رنگ رُوپ بھی کھِل اُٹھے گا۔
سفید اور دھنک کے چار رنگوں میں
لکس ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا خالص، ملائم حُسن بخش صابن
لنتاس LTS. 199-140-45 UD
ہندوستان لیور کا تیار کردہ

زخم کی کہانی، کہانی کا زخم

شمیم احمد

روم نمبر ڈی - ۵، ریجنل انجینئرنگ کالج، نسیم باغ، سری نگر ۲ (کشمیر)

۲۴ مئی ۱۹۶۶ء — محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

"بیسویں صدی" کی بزم میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں۔ اس جرأت اور حوصلہ افزائی کا سہرا پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب کے سر ہے۔ جو میرے لئے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے خلوص اور آپ کے نئے لکھنے والوں کو فنکار بنا دینے والے جذبے سے حوصلہ پا کر "زخم کی کہانی، کہانی کا زخم" لے کر حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ اُمید ہے آپ اور "بیسویں صدی" کے قارئین یہ کہانی پسند کریں گے . . .

مخلص ـــــــ شمیم احمد

ڈاکٹر راجنیش کپور۔ ایم، بی، بی، ایس۔ ایم، ایس (لکھنؤ)
سینٹ جازف، ٹی بی کلینک
جنیوا (سوئزرلینڈ)

۷ مئی ۶۶ء — ڈیر ندیم! بہت سی یادیں

تم ایر میل کے اِس لفافے اور اِس کے اندر اِس طویل خط کو دیکھ کر غالباً چونک گئے ہو! ایک اجنبی کا خط جو ہے ـــــ ہے نا؟ لیکن میں اجنبی نہیں ہوں۔ اس لئے میری پہلی کوشش یہ ہے کہ تمھیں یاد دلانے میں کامیاب ہو جاؤں کہ میں کون ہوں ـــــ غالباً میں نے خود کو اجنبی کہہ کر لفظ "دوستی" کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے لیکن میرے دوست! وقت کی موجیں کبھی کبھی ایک راہ پر چلنے والے دو ہم سفروں کو دو الگ الگ دھاروں کے ذریعے زندگی کے دو کناروں پر بھی پہنچا دیتی ہیں ـــــ ہم بھی بچھڑ گئے تھے ـــــ ایک بار پھر اپنا تعارف کرا رہا ہوں۔ شاید اب پہچان لو ـــــ مجھے پہچاننے کے لئے ماضی کی طرف چلنا ہوگا ـــــ آؤ میرے ساتھ، ہم دونوں ساتھ ماضی کی طرف چلیں ـــــ اُن لمحوں میں چلیں، جن لمحوں میں ہم ساتھ رہے تھے ـــــ ماضی میں بہت اندھیرا ہے۔ میں تمھیں زیادہ دُور تک نہ لے جاؤں گا ـــــ صرف چار قدم ـــــ چار سال پیچھے ـــــ یہ یادوں کی دُنیا ہے ـــــ اُن برسوں کی یادوں کو منتشر موتیوں کی طرح میں نے سمیٹنے کی کوشش کی ہے ـــــ چار سال کی بات ہے تمھیں وہ دن یاد آ گئے ہوں گے جب تم لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کر رہے تھے اور Student's Paradise لاج میں رہتے تھے اور تمھارا ایک روم پارٹنر راجنیش کپور بھی تھا ـــــ راجنیش کو بھول تو نہیں گئے؟ ارے وہی راجنیش ہوں جسے افسانے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ میڈیکل کا طالب علم ہوتے ہوئے بھی افسانوں پر اپنا بہت وقت برباد کیا کرتا تھا ـــــ تمھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ تم اکثر اُس سے ایسے افسانے لکھنے کی فرمائش کرتے تھے، جن کا مرکزی کردار تم ہو ـــــ یعنی ندیم! ـــــ اور وہ تمھیں یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا ـــــ "نہیں دوست! تم افسانے کے کردار نہیں بن سکتے، افسانے کے کردار تو فنکار کے ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار کے ذہن کے کسی گوشے میں جنم لیتے ہیں اور افسانے کی شکل میں کاغذ پر نمودار ہو جاتے ہیں ـــــ" اور تم مسکرا کر جواب دیتے ـــــ "شٹ اپ یار کے بچے! اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو اور جھٹ پٹ مجھ پر ایک افسانہ لکھ ڈالو ـــــ" اور اُس لڑکے نے تمھارے حکم سے تنگ آ کر ایک بار کہا بھی تھا ـــــ "اچھا میں کوشش کروں گا" ـــــ "کوشش نہیں پرومس (Promise) کرو" ـــــ "اچھا تو پرومس ہی سہی" ـــــ اب شاید تم مجھے پہچان گئے ہو گے۔ اب تو شاید مجھے یہ بتانا نہیں ہے کہ میں وہی راجنیش ہوں، جو ایک بہت بڑا فنکار تو نہ بن سکا لیکن

آنکھیں

آنکھ میں آنکھ تو ڈالی نہیں جاتی ظالم
دل میں دل ڈال دے کس طرح سے انساں کوئی ———— داغ

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں ———— اصغر گونڈوی

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ تو بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟ ———— غالب

مجھ ایسا ناتواں رفتار کیا دیکھے زمانے کی
چلی آتی ہے گردش آنکھ کو پہونچی ہے مشکل سے ———— آرزو

آنکھ اُس کی پھر گئی تھی دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا انقلاب میں ———— مومن

مرسلہ :- حمید یوسفی ناگپور

ایک کامیاب ڈاکٹر ضرور بن گیا ہوں —— چلو، چار سال —— چار قدم پیچھے ہٹ کر تم نے مجھے پہچان لیا —— اور شاید اب تم یہ سوچ رہے ہوگے کہ آج چار سال کے طویل عرصے کے بعد تم مجھے یاد آئے تو کیسے۔ اگر تم میری بات کا بُرا نہ مانو تو میں صاف کہہ دوں کہ تم مجھے یاد نہیں آئے۔ اگر یاد آیا ہے تو وہ وچن جو میں نے کبھی تمھیں دیا تھا، کہ میں تمھیں اپنے افسانے کا مرکزی کردار ضرور بناؤں گا —— میں نے اِس عرصے میں آج پہلی بار یہ محسوس کیا ہے کہ افسانے کے کردار، بھگوان کے اوتار کی طرح کسی فنکار کے ذہن میں جنم نہیں لیتے، بلکہ اِسی مٹی اور پانی کی بنی ہوئی دھرتی پر جنم لیتے ہیں۔ آدمی کی طرح —— وہ بھی تو آدمی کے پیکر ہیں۔ اُن کے جذبات اور احساسات بھی وہی ہوتے ہیں۔ جو ہمارے ہوتے ہیں۔

آج، جب کہ تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں، میرے ایک ہاتھ میں قلم ہے اور دوسرے میں سگریٹ، جو سُلگ رہا ہے اور اُس کے دھوئیں میں ماضی کی یادیں اُبھر رہی ہیں۔ وہ یادیں جو خوبصورت بھی ہیں اور رنگین بھی۔ آزاد بھی ہیں، نغموں سے پُر بھی۔ سوچتا ہوں، کاش وہ دن لوٹ آئیں —— ایک بار پھر —— کبھی سے کوئی کس طرح کہے کہ اُن لمحوں میں زندگی کا سارا حُسن تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ لمحے واپس نہیں آسکتے۔ یادوں کی خوش بُو میں کچھ دیر چاہیں تو سانس لے سکتے ہیں۔

اِس سینٹ فورڈیم میں جب سپنے ممبر کلاس کے اپنی تنخواہ لیا ہوں اور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ قلم سے روشنائی نہیں بہہ رہی خونِ جگر نکل رہا ہو اور وہ دن یاد آجاتے ہیں جب ہم یوں ہی بیٹھے بیٹھے منی آرڈر فارم پر دستخط کرکے روپے وصول کیا کرتے تھے۔

تمھیں شاید یاد ہوگا کہ امتحان کے دنوں میں عزم کے سپاہیوں کی تم نماز پڑھنے اور میں گیتا۔ آج بھی جب میں گیتا کا پاٹھ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دوسرے کونے میں تم بیٹھے ہو اور ہم دونوں کی کامیابی کے لئے دعا کر رہے ہو لیکن یہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ تمھاری دعائیں بدل گئیں تم امتحان کی کامیابی کی دعا چھوڑ کر دیر تک کسی اور کے لئے دعائیں مانگتے رہے ہو۔ تمھاری ویران زندگی میں کسی شمع نے جنم لیا اور بقول تمھارے اُس کا نام صرف شمع نہیں وہ تمھاری تاریک راتوں کے لئے چراغِ راہ بنی تھی۔ ہمارے لاکھ کہنے پر بھی اپنے کپڑے اور سوٹ تم صرف اِس لئے نہیں پہنتے تھے کہ ایسے کپڑے لوگ دولت دولت و امارت کی نمائش کرنے کے لئے زیبِ تن کرتے ہیں —— لیکن ہر وقت تم نت نئے سُوٹوں میں نظر آنے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ تم خدا کی عبادت چھوڑ کر کسی سنگِ مرمر کے صنم کو پوجنے لگے تو میں نے ایک دن تمھیں چھیڑتے ہوئے کہا تھا —— "میرے دوست! تم ایمان سے کفر کی راہ پر جا رہے ہو ——"

تم نے میرے جملے کو مکمل ہونے سے پہلے ہی میرے منہ میں ایک سگریٹ ڈال دیا اُسے جلاتے ہوئے جواب دیا —— "یہ بھی ایک عبادت ہے۔ عبادت کا دوسرا نام محبت ہے۔ میں خدا سے محبت کرتا ہوں اگر اُس کی مخلوق سے ایک "مقدس جذبے" کے تحت محبت کروں تو یہ خدا پرستی ہے، بت پرستی نہیں ——" جب میں نے تمھارے منہ سے "مقدس جذبے" کا نام سنا نہ جانے کیوں مجھے ہنسی نہیں رُکی۔ کیونکہ شمع سے ملنے کے بعد یہ بھی تمھاری ہزاروں تبدیلیوں میں ایک تبدیلی تھی۔ مجھے اُس وقت یاد آیا کہ تم لفظ محبت کا کتنا مذاق اُڑاتے تھے۔ میرے ایک افسانے میں جب تم نے پاک محبت، مقدس معصوم جذبے کا ذکر دیکھا تو قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا —— "میرے دوست اگر محبت کو پاک کہا جاتا ہے تو پھر ہوس کے ساتھ ناانصافی کیوں کی جاتی ہے کیا محبت کا دوسرا نام ہوس نہیں ہے؟ کسی معصوم کے دل سے کھیلنے کے لئے لوگ محبت لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ کوئی یہ کہے کہ مجھے پاک محبت ہے اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مجروح دل کے لئے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیا رومیو اور جولیٹ کی محبت میں ہوس نہیں تھی؟ —— مجنوں نے اِس لئے اپنے آپ کو ختم نہیں کیا کہ اُسے لیلیٰ نہ مل سکی؟ —— کیا

نے کوہ کنی اس لئے نہیں کی کہ اُسے شیریں کے جسم کی تمنا تھی ——— تو تم ہی بتاؤ، کیا محبت کا دوسرا نام ہوس پرستی نہیں ——— میرے فنکار! پاک محبت اب صرف کتابوں ہی میں ملتی ہے، اور جس کے لکھنے والے تم جیسے ادیب ہوتے ہیں ——— لیکن جب میں نے تمھاری زبان سے "پاک محبت" کا نام سُنا تو میری ہنسی نہ رُک سکی اور میں سمجھ گیا کہ میرا اچھا بھلا دوست کام سے جاتا رہا۔

پھر تم نے مجھ پر یہ راز کھول دیا کہ شمع نام کی ایک معصوم لڑکی نے تم میں وہی احساس جگا دیا ہے، جس کا ذکر تم نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ تم شمع کے دیوانے، پروانے ہو گئے تھے۔ تم مجھے برابر بتاتے کہ تم نے شمع سے کیا کیا باتیں کیں۔ اُسے کس طرح اپنی محبت کی کسوٹی پر پرکھا اور وہ سیتا کی طرح ہر اگنی پریکشا میں کس طرح کامیاب اُتری۔

ایک دن میں نے تمھیں چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ "ہو سکتا ہے وہ فراڈ ہو" اور مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تم مجھ پر اس طرح برس پڑے۔ جیسے کسی جنتی پر گاؤں کا کتا! "راجنیش! یہ تم تھے جس نے کہہ دیا اور وہ میں تھا جس نے سُن لیا ——— اور وہ صرف اس لئے کہ میں تمھاری عزت بڑے بھائی کی طرح کرتا ہوں۔ اگر تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اُس کا خون پی جاتا۔۔۔ اب بھولے سے بھی میری شمع کے لئے اپنے منہ سے ایسا لفظ نہ نکالنا۔ تم فنکار اپنے افسانوں میں جتنے ہی Ideal نظر آتے ہو، دل سے اُتنے ہی پست اور گرے ہوئے ہوتے ہو ——— راجنیش! تم نے آج تک محبت نہیں کی اس لئے تم ایک محبوبہ اور فراڈ میں فرقِ محسوس نہیں کر سکتے۔ میں نے شمع سے پیار کیا ہے۔ میں اس کے دل کی گہرائیوں تک اُتر چکا ہوں اور وہاں پہنچ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ عورت کا وجود اس دُنیا میں صرف گناہوں کے لئے نہیں ہے۔ عورت کا دل گنگا کی لہروں کی طرح مقدس جھیل کے کنول کی طرح معصوم اور خوبصورت کوثر و تسنیم کی طرح پاک اور سیتا اور مریم کی طرح مقدس ہوتا ہے۔۔۔" اور پھر تم نے میرے سگریٹ کو روشن کرتے ہوئے مسکرا کر کہا ——— "تم شاید میری باتوں کا بُرا مان گئے لیکن میرے دوست! افسوس اِس بات کا ہے کہ تم نے اُسے فراڈ کہنے سے پہلے میرے جذبات کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی ———"

تم برابر مجھے شمع کے بارے میں بتاتے رہے اور میں بہت شوق سے سُنتا رہا۔ دوسرے کی محبت بھری داستان کسے دلچسپ نہیں لگتی۔ میں نے کئی بار تم سے کہا بھی کہ میری ملاقات شمع سے کرا دو اور تم نے وعدہ بھی کیا لیکن وہ میرا فائنل ایر تھا اس لئے میں پڑھنے میں زیادہ مشغول رہا اور اُس سے کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔

حدیثِ دل

غضب ہے جن پہ دل آیا کہیں انسان ہو کر وہ
کہاں آیا، کدھر آیا، یہ کیوں آیا، یہ کب آیا ——— داغ

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا ——— جگر

خموش اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں ——— اقبال

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے ——— مجاز

مرسلہ:۔ طاہرہ بیگم، حیدرآباد

جب میں ایم۔ اے کے فائنل میں تھا، ان دنوں کی بات ہے۔ ایک رات تم بہت گھبرائے ہوئے کمرے میں آئے۔ جب تم میرے سامنے آکر بیٹھے، میں نے جیسے چیخ سی مار دی کیونکہ تم شراب کی بوتل کی طرح مہک رہے تھے۔ تم نے آج کیوں پی لی ندیم ——— لیکن تم نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے پریشان دیکھ کر تم نے قہقہہ لگایا اور تم نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔۔۔ تم ہنستے کیوں نہیں۔ آج تو رونے کی بات نہیں۔ تم بھی ہنسو۔ آج نہیں ہنسو گے تو پھر کب ہنسو گے۔ آؤ ہنسو ورنہ میں رو پڑوں۔۔۔ اور تم نے میرے ہاتھ چومتے ہوئے کہا ——— تم بہت بڑے فنکار ہو تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ فراڈ ہو ——— ہاں یار۔ وہ فراڈ ہی نکلی۔ اُس نے۔۔۔ تم پر شراب کا پہلا نشہ تھا اس لئے تم بستر پر لیٹتے ہی سو گئے یا یوں کہوں کہ بے ہوش ہو گئے۔ جب میں تمھارا کوٹ اتار کر ہینگر میں لٹکانے لگا تو مجھے تمھاری جیب میں ایک خط ملا۔ جس میں لکھا تھا ———

میرے ندیم!

جب تمھیں یہ خط ملے گا، اُس وقت میں تم سے بہت دُور دوسری دُنیا میں ہوں گی۔ شاید تمھیں یہ جان کر تعجب ہو گا کہ آج سے چند دنوں بعد میں ایک انجینئر سے بیاہ

دی جاؤں گی۔ میں نے اُنھیں دیکھا تو نہیں، ہاں اتنا سُنا ہے کہ وہ بہت حسین نوجوان ہیں اور ہزاروں روپے کی آمدنی ہے ——— میں مانتی ہوں کہ تم نے مجھ سے پیار کیا ہے اور میں تہ دل سے تمھاری احسان مند بھی ہوں لیکن انسان کی زندگی صرف پیار سے نہیں چل سکتی۔ پیار سے پیٹ کی بھوک نہیں مٹ سکتی۔ پیار سے اچھے کپڑے، اچھے زیور اور اچھی موٹر کار نہیں مل سکتی۔ تم صرف M. A کے طالب علم ہو۔ بہت ہوا تو ڈھائی تین سو روپے پر کہیں لکچرر ہو جاؤ گے۔ تم جانتے ہو میں بڑے رئیس خاندان کی لڑکی ہوں۔ تم مجھ سے پیار ضرور کر سکتے ہو لیکن مجھے پیار کے علاوہ اور جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ تم مجھے تین سو روپے میں نہیں دے سکتے۔ دُنیا کا ہر انسان خود غرض ہوتا ہے اور آج میں نے بھی ایک لکچرر کے پیار کو ایک انجینئر کے پیسے کے عوض بیچ ڈالا ہے۔

تمھیں اپنی حیثیت کی بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی۔ تم یہ سمجھ لو کہ کسی نے تمھیں دھوکا دیا ہے اور مجھ سے نفرت کرنے لگو۔ سُنا ہے جب پیار نفرت میں بدل جاتا ہے تو جلد ختم ہو جاتا ہے۔

تمھاری بے وفا ——— شمع

جب میں نے شمع کا وہ خط پڑھا تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور میری ساری ہمدردی تمھارے ساتھ ہو گئی ——— لیکن پچھلے سال جب میں چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا اور دہلی میں قاسم سے ملاقات ہوئی تو میرے دل میں تمھارے لئے جتنی ہمدردیاں تھیں سب ایک ایک کر کے نفرت میں بدل گئیں۔ مجھے قاسم نے بتایا کہ تم اِن دنوں پاگل جیسے ہو گئے ہو اور عیش کوشی میں نواب واجد علی شاہ بھی تمھارے سامنے کچھ نہیں ہیں۔ تم نے لڑکیوں کی زندگی، عزت اور ارمان سے کھیلنا اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ تم ملک بھر میں ہر شہر میں جا کر معصوم لڑکیوں کی عزت و آبرو سے کھیلتے ہو اور پوچھنے والوں کو تمھارا جواب یہ ہوتا ہے کہ تم عورت ذات سے بدلہ لے رہے ہو۔ تم ہر امیر باپ کی بیٹی کی زندگی سے کھیلنا اپنا حق اِس لئے سمجھتے ہو کہ کسی رئیس باپ کی لڑکی تمھاری زندگی سے کھیلی تھی۔ جب تمھاری ہوس کا شکار ہو کر کوئی لڑکی خودکشی کرتی ہے تو تم پُرزور قہقہہ لگاتے ہو اور اسے اپنی فتح سمجھتے ہو، اِس لئے کہ کسی نے تمھیں جیتے جی مار ڈالا ہے ——— قاسم سے تھوڑی دیر کے لئے ملاقات ہوئی اِس لئے میں اُس سے تمھارا پتہ لینا بھول گیا، ورنہ ایک دوست اور بقول تمھارے بڑے بھائی کی حیثیت سے تمھیں یہ لکھتا کہ میرے دوست! اِن بے گناہ لڑکیوں کی عزت سے کھیلنے سے اگر تمھاری شمع تمھیں مل جاتی تو کھیلو، بہت شوق سے کھیلو لیکن جس دُنیا میں تم پل رہے ہو وہاں کا یہ شیوہ نہیں۔ اگر کوئی کلی پھول بننے سے پہلے تمھارے آنگن میں مرجھا جاتی تو اِس کا مطلب یہ نہیں کہ تم دُنیا کے سارے باغ کی کلیوں کو پھول بننے سے پہلے مسل ڈالو۔ اگر تمھارے پیر میں پتھر سے ٹھوکر لگ جاتی تو ساری دُنیا کے پتھروں کو تم توڑ کر پھینک دو۔ اگر شمع نے تمھارے ارمانوں کی ارتھی پھونک ڈالی ہے تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم ان گنت معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کی عزت و آبرو کو آگ لگا دو۔ جیسا انتقام تم لے رہے ہو اس سے تمھارا مطلب پُورا نہیں ہوتا ——— تمھیں تو چاہئے کہ اُن موجوں کا رُخ موڑ دو، جس نے تمھاری ساری کائنات کو بہا دیا ہے۔ تم جو کر رہے ہو یہ ایک سچے عاشق کا شیوہ نہیں۔ تمھیں دھوکا شمع نے دیا ہے۔ تم نے شمع کو دھوکا نہیں دیا۔ آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، آگ سے نہیں ———!!

تم میرے اِس خط کو پڑھ کر بُری طرح مجھ پر جھنجھلا رہے ہو گے کہ اگر چار برس بعد بھی آج تم یاد نہ آتے تو کیا بُرا تھا۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ میں پاگل تو نہیں ہو گیا جو آج تمھاری کہانی تم ہی کو سُنانے چلا آیا ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں۔ یہ خط لکھتے وقت ہوش میں ہوں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ مجھے کیا سُوجھی جو تمھارے پُرانے زخم کو پھر سے نشتر لگانے چلا آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں میرے اِس طویل خط کو پڑھ کر تمھارے بھرے زخم پھر ہرے ہو گئے ہوں گے لیکن میرے ندیم! میں ڈاکٹر ہوں۔ ڈاکٹر جب کسی کے نشتر لگاتا ہے تو اُسے اچھی طرح یہ علم ہوتا ہے کہ مریض پر کیا بیت رہی ہو گی لیکن وہ مجبور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زخم پر نشتر ضرور لگاتا ہے لیکن اُس کے اندر چھپے ہوئے زہریلے مواد کو باہر نکال کر وہ پھر اُسے مرہم سے بھی بھر دیتا ہے۔

زندگی میں میں نے دو وچن دے رکھے تھے اور میں کوشش کروں گا کہ دونوں زخموں پر ایک ساتھ مرہم رکھ سکوں۔ پہلا وچن تو وہ جو میں نے چار برس پہلے تمھیں دیا تھا کہ ایک نہ ایک دن میں تمھیں اپنے افسانے کا مرکزی کردار بناؤں گا۔ اگر تم میرے اِس خط کو ایک افسانہ بھی سمجھ لو تو میرا پہلا وچن تو پُورا ہو گیا۔ لیکن تم یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ افسانہ مکمل ہو گیا ہے۔ میرے دوست میرا افسانہ تو اب شروع ہوا ہے۔ اصل افسانہ تو میں تمھیں ایک ایسی زندگی کا سُناؤں گا جو بالکل تم سے مِلتی جُلتی ہے۔ فرق ہے تو اِتنا کہ تم نے ساری دُ

نے انتقام کی ٹھان لی ہے۔ اور وہ صرف اپنے آپ سے انتقام لینے کی کوشش میں ہے

میرے ہسپتال میں سیلون کی ایک نہایت ہی حسین اور نوجوان لڑکی کوئی دو برس پہلے آئی۔ میں نے اُس کے Appointment Card پر نام دیکھا جو مس طلعت تھا۔ میں بہت خوش ہوا اس لئے کہ یہ لڑکی میرے وطن سے قریب رہتی ہے لیکن میری ساری خوشی کافور ہو گئی جب میں نے اُس کی X-RAY رپورٹ دیکھی۔ اُس کے دونوں پھیپھڑے دق سے چھلنی ہو چکے تھے۔ میں نے X-RAY سے نظر اُٹھا کر سر سے پیر تک اُس کا جائزہ لیا۔ وہ سُرخ و سفید سنگِ مرمر کی مورت نظر آ رہی تھی۔ اُس کی خاموش نگاہیں مجھ سے پُوچھ رہی تھیں ——— "ڈاکٹر! کیا میں بچ جاؤں گی —؟" اور جیسے ہی میری نظر اُس کے X-RAY رپورٹ پر پھر گئی تو میں سہم گیا، کیونکہ ایسے کئی کیس میں نے پہلے بھی ڈیل کئے تھے اور اُن کا انجام جانتا تھا مجھے طلعت پر رحم اور قدرت کی خدائی پر غصہ آ رہا تھا۔ قدرت نے اِس نازک حسین پیکر پر ظلم کیا تھا۔ میں نے آج تک سوئزرلینڈ کے اس ہسپتال میں ایسے بہت سے مریض دیکھے تھے لیکن آج پہلی بار میرے دل میں ایک خاص جذبہ جنم لے رہا تھا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا اور اُسے مشورہ دیا کہ وہ اس سینی ٹوریم میں علاج کراتی رہے۔ طلعت بھی اُردو جانتی تھی اس لئے ہم جلد گھُل مل گئے۔ وہ مجھے ڈاکٹر کپور کے بجائے راجنیش بھیا کہنے لگی۔ یوں طلعت پر بہت سے ڈاکٹر محنت کر رہے تھے لیکن ہم زبان ہونے کی وجہ سے میں اُس سے زیادہ قریب تھا۔ راکھی کے دن برسوں بعد سوئزرلینڈ جیسی جگہ میں اُس نے میرے ہاتھ پر راکھی باندھی۔ اب میں اُس کا بھائی بن گیا تھا، اِس لئے ہم دونوں میں ڈاکٹر اور مریض ہی کا رشتہ نہ تھا، بھائی بہن کا بھی رشتہ تھا۔ میں اپنے فرصت کے وقت میں اُس سے باتیں کیا کرتا۔ میں اُسے اپنے کالج اور دوستوں کے بارے میں بتاتا اور وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتی ——— بات بات میں ہم آپس میں بہت فرینک (Frank) ہو گئے۔ اُس نے مجھے اپنی محبت کی کہانی بھی سُنائی۔

کولمبو میں ایک لڑکے سے اُسے محبت تھی۔ اُس کی کہانی اور تمہاری کہانی میں اتنی یکسانیت تھی کہ کیا بتاؤں۔ اُس نے ایک بہت ہی چھیلے نوجوان سے پیار کیا تھا اور شادی رچانے کی بات بھی چل پڑی تھی کہ اُسے ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ دق کی مریض ہے۔ جیسے ہی اُسے اِس مرض کا علم ہوا اُس نے اپنے محبوب کو ٹھیک اُسی طرح کا خط لکھا جیسا کہ تم نے تمہیں لکھا تھا۔ اور وہ صرف اس لئے کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنے محبوب کی زندگی کو ایک مصیبت میں ڈال دے۔ اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ——— "بھیا! وہ مجھے اتنا چاہتے تھے کہ اگر میں اُنھیں بتا بھی دیتی کہ مجھے ٹی بی ہے تب بھی وہ مجھ سے شادی کر لیتے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ ان کی آنے والی نسل کو ہمیشہ کے لئے یہ روگ لگا بیٹھوں۔ میں نے اپنے خط میں جھوٹ اپنی شادی کا تذکرہ اس لئے کیا کہ وہ مجھے بے وفا سمجھ کر شاید آسانی سے بھول جائیں۔ میں نے اپنے والدین کو راضی کر لیا اور شہر میں یہ خبر پھیلا دی کہ میں نے اپنی پسند سے شادی کر لی اور اب اپنے وطن سے باہر چلی آئی ہوں۔ میں نے اتنے عرصے میں بہت سے ٹی بی کلینک میں علاج کرایا۔ آخر لوگوں نے سوئزرلینڈ آنے کی رائے دی ——— وہ اس طرح اپنی کہانی سُناتی جاتی اور میں بہت دلچسپی سے سُنتا رہتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے شمع مجھے اپنی کہانی سُنا رہی ہو۔ میں نے کئی بار تمہیں خط لکھنے کے لئے سوچا اور تمہیں یہ بتانا چاہا کہ ایسی کوئی مجبوری شمع کی بھی ہو اور اس نے بھی طلعت کی طرح اپنے محبوب سے یہ بات راز میں رکھی ہو۔

تمہاری کہانی بھی اُس سے ملتی جلتی تھی اس لئے میں نے اُسے تمہارے بارے میں بھی بتایا اور جب اُس نے تمہاری موجودہ حالت کے بارے میں سُنا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میرے پُوچھنے پر اُس نے کہا ——— "ہو سکتا ہے میرے محبوب نے بھی ایسی ہی کوئی راہ اختیار کی ہو؟"

دو برس کے عرصے میں وہ کئی بار اچھی ہوئی اور کئی بار اس کی حالت بگڑی۔ اُس کا کیس کافی Advanced تھا اس لئے ڈاکٹروں کا دماغ کام نہیں کرتا تھا۔ یکایک ایک رات جب میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا تو ایک نرس نے دروازے پر دستک دی۔ میں دوڑا ہوا طلعت کے کمرے میں گیا لیکن وہاں میری راکھی کا دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ موت نے اپنی سیاہ چادر طلعت پر ڈال دی تھی اور ڈاکٹر جیکسن اُسے سفید چادر میں بدل رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے طلعت

نہیں میری اپنی بہن تشا کی میت ہو۔ میں دیوانہ وار اُس کے پلنگ سے لپٹ کر رونے لگا اور جب ڈاکٹر جیکسن مجھے دلاسا دیتے ہوئے میرے کمرے میں لائے اور ایک خط مجھے دیا اور کہا یہ طلعت کے تکیے کے نیچے تھا تو میں چونک سا گیا خط پر اب سے کوئی دو مہینے پہلے کی تاریخ تھی۔ میں گھبرا کر خط پڑھنے لگا۔

راجنیش بھیا!

مجھے یقین ہے۔ میرا یہ خط آپ کو میری موت کے بعد ملے گا۔ زندگی کا کیا ٹھکانا اور۔ وہ بھی میری جیسی مریضہ کا، جو روز مرتی ہے اور زندہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خط آج ہی آپ کو لکھ رہی ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے کبھی آپ کے ہاتھوں میں راکھی باندھی تھی، لیکن ایک چھوٹی بہن کی طرح میں نے آپ سے کچھ مانگنے کے بجائے ایک وچن مانگا تھا۔ اور آج میں اپنے بھیا سے اُمید رکھتی ہوں کہ وہ اس وچن کو پورا کر کے میری راکھی کی لاج رکھیں گے۔

آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ میں سیلونی نہیں ہندوستانی ہوں اور میرا گھر کولمبو نہیں — لکھنؤ ہے۔ اب آپ مجھ سے خفا ہوں گے کہ میں نے یہ راز آپ کو کیوں نہ بتایا۔ تو وہ راز آج بتا رہی ہوں — میں جانتی تھی کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں اور آپ ندیم صاحب کو اچھی طرح جانتے بھی ہیں — آپ کو آج یہ بھی بتا دوں کہ میں ہی آپ کے دوست ندیم کی وہ بدقسمت شمع ہوں۔ میرا پورا نام شمع طلعت ہے۔ ندیم صاحب کو ساری کہانی سُنا دیں گے۔

اب آپ کو زیادہ کیا بتاؤں — کہانی آپ کو معلوم ہے۔ کہانی کا یہ اختتام ہے۔

آپ کی بہن — شمع طلعت

ندیم! یہ ہے وہ کہانی جس کے تم مرکزی کردار ہو! — اچھا اب اجازت دو۔

تمھارا — راجنیش

غزلیں

تابش سلطانپوری

اے ساقیٔ گلفام بدن ٹوٹ رہا ہے
دے بھر کے نئے جام بدن ٹوٹ رہا ہے

کیا رات کہیں پی تھی؟ پلائی تھی کسی نے؟
کیوں صبح کے ہنگام بدن ٹوٹ رہا ہے

انگڑائیاں لے لے کے، ستم اور نہ توڑو
خوبانِ گل اندام بدن ٹوٹ رہا ہے

پھر بزم سجاؤ، مرے یاروں کو بلاؤ
پھر ہونے لگی شام بدن ٹوٹ رہا ہے

برسے تری زلفوں کی گھٹا جھوم کے ساقی!
چھلکے مئے گلفام بدن ٹوٹ رہا ہے

اے پیرِ مغاں خادمِ میخانہ ہے تابش
اِک جام کر انعام، بدن ٹوٹ رہا ہے

کیف احمد صدیقی

فضائیں رقص کرتی ہیں ستارے مسکراتے ہیں
جہاں تم مسکراتے ہو نظارے مسکراتے ہیں

چراغِ ماہ و انجم کچھ فلک ہی پر نہیں روشن
زمیں کے ذرے ذرے میں ستارے مسکراتے ہیں

کچھ اس انداز سے ڈوبا سفینہ میری ہستی کا
تلاطم آبدیدہ ہے کنارے مسکراتے ہیں

شبِ ہجراں کی تاریکی بھی اکثر کانپ اٹھتی ہے
مری آنکھوں میں جب اشکوں کے تارے مسکراتے ہیں

اگر صحنِ گلستاں میں بہار آئی تو کیا آئی
ابھی تک پھول شبنم کے سہارے مسکراتے ہیں

دیارِ عشق میں ہر گام پر ہیں ٹھوکریں کھاتے
مگر اے کیف پھر بھی غم کے مارے مسکراتے ہیں

قندِ پارسی

پروفیسر عبدالرب عرفان، ایم۔اے

ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف پرشین،
ودربھ مہاودیالیہ، امراؤتی

۲۰ جون ۱۹۶۶ء

ادیبِ فقید و مدیرِ شہیر   جہانِ ادب کے مہِ مُستنیر
امینِ ہُنر، ضامنِ فکر و فن   یقینِ ادب، اعتبارِ سخن
مزاج آشنائے زبان و بیاں   ریاضِ صحافت کے رُوحِ رواں
بصد احترام و بصد عجز و ناز   کروں عرضِ خدمت سلام و نیاز
مِلا آپ کا نامۂ دلپذیر   ہُوا جس کے پڑھنے سے روشن ضمیر
زہے بخت آئے "جھروکے" پسند   (مرے حوصلے کیوں نہ ہوتے بلند)
ملی اُن کو افسانہ نمبر میں جا   ہُوا مجھ پہ احسان اِک اور آپ کا
کروں جس قدر شُکرِ لُطف و کرم   حقیقت یہ ہے پھر بھی ہوگا وہ کم
خلوص و عقیدت کا تازہ خراج   اِس اُمید پر پیشِ خدمت ہے آج

کہ یہ بھی جو کامل ہو معیار پر
عنایت کی اِس پر بھی ہو اِک نظر

خلوص کوش ... عبدالرب عرفان

شہنشاہِ خمریات حکیم عمر خیام کا فلسفۂ حیات یہی تھا کہ اِس بے ثبات چند روزہ زندگی کو جہاں تک ممکن ہو سکے عیش و نشاط اور لذت کوشی میں گزار دیا جائے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ تادمِ واپسیں اپنے اس فلسفے پر عمل پیرا رہا۔

حسبِ معمول ایک مرتبہ وہ چراغِ بادہ روشن کئے بیٹھا تھا۔ نشے میں اچانک اُس کے ہاتھوں سے صراحی گر کر چُور چُور ہوگئی اور شرابِ گلرنگ کیا تلف ہوئی حکیم کی اُمنگوں اور تمناؤں کا خون ہوگیا۔ اِس ناخوشگوار حادثے کو اُس نے اپنے ساتھ قضا و قدر کے بے جا مذاق سے تعبیر کیا۔ وہ اپنے لُطف و عیش میں یہ خلل برداشت نہ کر سکا اور اُس کی زبان پر حرفِ شکایت آہی گیا ؎

ابریقِ مئے مرا شکستی ربّی   بر من درِ عیش را ببستی ربّی
برخاک فگندی مئے گلگونِ مرا   خاکم بدہن، مگر تو مستی ربّی

(کیوں توڑ دی میری یہ صراحی یارب   کیوں بند رہِ عیش و طرب کی یارب
مٹّی میں مِلا دی مری گُلرنگ شراب   خاکم بدہن مست ہے تُو بھی یارب)

کہا جاتا ہے کہ اِس رُباعی کے کہتے ہی اُس کے گلے میں شدید تکلیف ہونی شروع ہوئی اور دَم گھٹنے لگا۔ اِس کیفیت کو اُس نے اپنے گُستاخانہ طرزِ کلام کی سزا پر محمول کیا اور گھبرا کر یہ رُباعی کہہ دی ؎

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو   واں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو

من بدکنم و تو بد مکافات دہی — پس فرق میانِ من و تو چیست بگو
(کب کون گناہوں سے بچا ہے، بتلا — ناکردہ گنہ کون جیا ہے، بتلا
کی میں نے بدی، تُونے سزا دی اُس کی — ہم دونوں میں اب فرق ہی کیا ہے، بتلا)
اور وہ دِلّگو سے "مخلصی" حاصل کی۔

طریح بن اسماعیل الثقفی، منصور عباسی کے دَور کا ایک ممتاز و معروف شاعر تھا۔ ایک روز موقع پاکر وہ منصور عباسی کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور شعرائے دربار کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ اس پر نظر پڑتے ہی منصور کے چہرے پر غصّے کی علامتیں پیدا ہوئیں اور عتاب کے طور پر اُس سے خطاب کیا: "اے بدبخت! تُو وہی ہے نا جس نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر ولید بن عبدالملک اموی کی شان میں یہ اشعار پڑھے تھے اور اسے خدائی اوصاف سے متصف کیا تھا ؎

اگر سیل بگوئی کہ رو بگرداں زود — دراں زماں کہ بود موج او چو کوہِ گراں
فرو رَوَد بہ زمیں یا ز راہ برگردد — نیاورد کہ رَوَد بر خلافِ آں فرماں
(اگر کہے تُو یہ سیلاب سے کہ واپس جا — جب اُس میں موج اٹھی ہو مثالِ کوہِ گراں
اگر زمیں پہ نہ بیٹھے تو راہ سے لَوٹے — نہیں مجال ترے حکم سے ہو رُوگرداں)

اِس خطابِ عتاب آمیز کو سُن کر ادب و احترام کا پُورا پُورا لحاظ رکھتے ہوئے طریح نے انتہائی معصومیت سے کہا: "یا امیر! خدا گواہ ہے، جس وقت میں اُن اشعار پر پہنچا تھا تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے تھے اور اُن اشعار کو زبان سے بطور مناجات ادا کرتے ہوئے اپنی حاجتوں کی تکمیل کے لئے خدا کے حضور میں دامنِ اُمید پھیلائے ہوئے تھا۔"

طریح کے اِس جواب پر منصور خوب ہنسا اور اُسے انعام و اکرام سے نوازا۔

ایک مہمل گو مگر بزعمِ خود شاعر نے ایک نہایت غیر مربوط اور بیہودہ قصیدہ لکھا اور اپنے ایک سخن شناس دوست کو سُنا کر داد طلب لہجے میں اِس پر اُس کی رائے چاہی۔ اُس شخص نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اِس قصیدے کو بے مزہ اور غیر مربوط کہہ دیا۔ شاعر نے برہم ہو کر اُسے گالی دے دی۔ اُس شخص کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی۔ وہ بے ساختہ کہہ اُٹھا: "خدا کی قسم تیری یہ نثر اپنی خوبیوں کے اعتبار سے تیرے اشعار سے بدرجہا بہتر ہے۔"

فردوسی ایران کے اُن گِنے چُنے اہلِ کمال میں سے ایک ہے جن کی شہرت کو بقائے دوام کے دربار میں بلند مقام حاصل ہے۔ اُس کی فطری صلاحیتوں اور تاریخ دانی کے پیشِ نظر سلطان محمود غزنوی نے شاہنامے کی تصنیف کا اہم کام اُسے سونپا تھا۔

جب فردوسی کو سُلطان کا حکم ملا تو وہ اپنے وطن طوس سے روانہ ہوا اور دارالسلطنت غزنی کی راہ لی۔ غزنی کے نواح میں قدم رکھتے ہی اُس کا گزر ایک پُر فضا باغ میں ہوا جہاں درباری شاعر عسجدی اور فرخی کے ساتھ ملک الشعراء عنصری بیٹھا ہوا مناظرِ فطرت سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُن پر نظر پڑتے ہی فردوسی نے اُن کے لباس سے قیاس کر لیا کہ یہ درباری شعراء ہی ہو سکتے ہیں۔ کمال اشتیاق و عقیدت کے ساتھ وہ اُن کی طرف بڑھا۔ اُن شعراء نے ایک "دہقانی" کو اپنی سمت بڑھتا دیکھ کر ناگواری کا اظہار کیا۔ وہ اُسے ٹالنے کی فکر کرنے لگے۔ عنصری نے تجویز پیش کی کیوں نہ اُس کا امتحان لیا جائے۔ اگر وہ واقعی باکمال ثابت ہوا تو اُسے بھی اِس حلقے میں شامل کیا جائے۔

فردوسی کے پہنچتے ہی عنصری نے اُس کے سامنے اِس حلقے میں شامل ہونے کی شرط بیان کر دی جسے اُس نے فوراً منظور کر لیا۔ عنصری نے پہل کی ع

چوں عارضِ تو ماہ نباشد روشن
(عارض سا ترے، چاند نہ ہوگا روشن)

یہ سُن کر عسجدی بول اُٹھا ع

مانندِ رُخت گُل نہ بود در گلشن
(رُخ سا ترے، گُل لائے کہاں سے گلشن)

اب فرخی کی باری تھی اُس نے کہا ع

مژگانت گذر کند ہمی از جوشن
(مژگاں سے تری ہوتا ہے چھلنی جوشن)

تینوں شعراء کو یقین تھا کہ اِس رُباعی میں چوتھے مصرعے کے لئے کوئی قافیہ نہیں مِل سکتا اور اجنبی کو مُنہ کی کھانی پڑے گی۔ لیکن اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب فردوسی نے برجستہ کہا ع

مانندِ سنانِ گیو در جنگِ پشن
(جس طرح سنانِ گیو ہم جنگِ پشن)

اور رباعی مکمل کر دی۔ شعرائے دربار کو اِس بات پر شرمندگی اُٹھانی پڑی کہ اُنہیں "گیو" (ایک جنگجو پہلوان)، اور پشن (ایک مقام کا نام جہاں کیخسرو اور افراسیاب کی فوجوں کے درمیان گھمسان کی لڑائی ہوئی تھی) کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

ساغری، مشہور و معروف شاعر اور ادیب جامی کا ہمعصر و ہم بے تکلف دوست تھا۔ جب ساغری نے اپنے ایک شعر میں اِس بات کا دعویٰ کیا کہ اُس کے اشعار کے عمدہ مفہوم "دُزدانِ معانی" چُرا لے گئے تو جامی سے خاموش نہ رہا گیا۔ وہ بے ساختہ کہہ اُٹھے

ساغری میگفت دُزدان معانی بُردہ اند   ہر کجا در شعرِ من یک معنیٔ خوش دیدہ اند
دیدم اکثر شعر ہایش را یکے معنی نداشت   راست میگفت اینکہ معنیہاش را دزدیدہ اند
ساغری کہتا ہے دُزدانِ معانی نے اُڑائے   اُس کے شعروں میں جہاں مفہومِ خوب آئے نظر
میں نے اکثر شعر اُس کے دیکھے بے مفہوم تھے   اِس سے جانا اُس کی باتوں میں صداقت تھی مگر)

اِس قطعہ پر ساغری کا برہم ہونا فطری تھا۔ جب جامی نے اُسے خشمناک پایا تو فوراً بات بنا دی کہ اِس قطعہ میں اُس نے "شاعری" (یعنی کوئی شاعر) لکھا تھا۔ نقطوں کی تبدیلی سے اُسے "ساغری" بنانے کا مذاق تو کسی شریر کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔ اور اِس طرح اُس نے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔

ایک شاعر نے اپنے معشوق کو گلاب کے خوشرنگ پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ پیش کیا۔ معشوق اُس سے سوال کر بیٹھا ؎

بگو اے عاشقِ صادق چرا گلدستہ آوردی   دلِ بلبل شکستی غنچہ را دل خستہ آوردی
(بتا اے عاشقِ صادق تو کیوں لایا ہے گلدستہ   دلِ بلبل بھی توڑا کر دیا غنچے کو دل خستہ)

شاعر نے جواب دیا ؎

نہ بہرِ زیبِ دستت ماہِ من گلدستہ آوردم   بخوبی لاف می زد گل بہ پیشت بستہ آوردم
(نہ تیری زینتِ کف کے لیے گلدستہ لایا ہوں   تھا گل کو حُسن کا دعویٰ اسے پابستہ لایا ہوں)

مخفی گیلانی ایک انتہائی بذلہ سنج اور حاضر جواب شخص تھا۔ افیون خوری نے اُس کی صحت کو اِس درجہ تباہ کر دیا تھا کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ کسی موقع پر اُس کے ایک بہی خواہ نے افیون کے نقصانات گِنا کر اُسے افیون کا استعمال قطعی طور پر ترک کر دینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ افیون نے اُسے موت کے دروازے پر پہنچا دیا ہے۔

مخفی نے جواب دیا "میری صحت کی خرابی میں افیون کا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو بھی کتاب طبع ہوتی ہے یا لکھی جاتی ہے اُس میں مصنّف لکھتا ہے "مخفی نماناد" (اِس فقرے کا ایک مطلب یہ ہے کہ (کوئی چیز قاری سے) پوشیدہ نہ رہے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ خدا کرے مخفی نہ رہے اور مخفی کا اشارہ اسی مفہوم کی طرف ہے) اسی بد دعا کا اثر ہے کہ میں اِس حال کو پہنچ چکا ہوں"۔

عطاء الملک عطا ملک جوینی مصنّفِ تاریخ جہاں کُشا کو حکمرانِ وقت اباقا نے جوینی کے ایک حاسد مجد الملک کے ورغلانے پر قید کر لیا تھا اور اُسے سخت آزار پہنچایا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اباقا کی موت واقع ہو گئی اور بے گناہ جوینی کو رہائی نصیب ہوئی۔

لیکن اُس کے حاسد مجد الملک کو اُس کے کئے کی سزا اِس صورت میں ملی کہ ایک مشتعل ہجوم نے اُسے قتل کر دیا اور اُس کے اعضا کاٹ کر مختلف علاقوں میں بھیج دیئے۔ اپنے حاسد کے اِس عبرتناک انجام کا ذکر جوینی نے اِن الفاظ میں کیا ہے ؎

روزی دو سہ سرمایۂ تزویر شدی   جویندۂ مال و جاہ و توقیر شدی
اعضائے تو ہر یکے گرفت اقلیمے   فی الجملہ بیک ہفتہ جہانگیر شدی
(دو تین ہی دن مایۂ تزویر بنا   ذی مرتبہ و صاحبِ توقیر بنا
اک ملک ہر اک عضو نے قبضے میں کیا   اک ہفتے میں آخر تو جہانگیر بنا)

ایک فاضل نے ایک عالمِ دین سے سوال کیا ؎

اے راہبرِ خلق مرا راہ نما   وز حرفِ جوابت درِ مشکل بکشا
گویند خدا بود و دگر ہیچ نبود   گر ہیچ نبود است خدا بود کجا
(اے راہبرِ خلق مجھے راہ دکھا   دے مجھ کو جواب اور مری گتھی سلجھا
کہتے ہیں خدا کے سوا کچھ اور نہ تھا   جب کچھ نہ تھا موجود کہاں تھا خدا)

عالمِ دین نے جواب دیا ؎

از مذہب و ملت خبرے نیست ترا   می داں تو یقیں کہ لامکانست خدا
کیفیتِ حق ز من چہ می پُرسی تو   جاں در تنِ تُست گو کجا دارد جا
(تجھ کو نہیں کچھ مذہب و ملت کا پتا   کر اِس پہ یقیں ہے لامکاں ذاتِ خدا
کیفیتِ حق مجھ سے تو کیا پوچھتا ہے   ہے جان ترے جسم میں کس جا، یہ بتا)

صاحب ابن عباد اپنے عہد کا نامور فاضل تھا۔ ایک شب اُس کی مجلس میں شعر و سخن کا موضوع زیرِ بحث آ گیا۔ اِس سلسلے میں حاضرین میں اختلافِ رائے تھا۔ کچھ لوگ شاعری کو نثر پر فضیلت دے رہے تھے جب کہ چند حضرات اس کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔ ہر شخص اپنی بات منوانے کے لئے دلائل و شواہد پیش کر رہا تھا۔

اتفاقاً اُس بزم میں ابو محمد خازن نامی ایک عالم بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے خاموشی سے حاضرین کی بحث سُنی اور موقع پا کر اپنی رائے کا یوں اظہار کیا کہ شعر انسان کی عظیم ترین فضیلتوں میں سے ایک ہے۔ لوگوں نے سوال کیا کہ اس کے ثبوت میں اُن کے پاس کون سی دلیل ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: "دلیل یہ ہے کہ دروغ کو فروغ نہیں اور کلامِ دروغ بے مزہ ہوتا ہے۔ لیکن شعر ایسا مرغوب کلام ہے کہ باوجود دروغ اور جھوٹ پر مبنی ہونے کے نہ صرف دل کو نہایت درجہ متاثر کرتا ہے بلکہ دروغ بیانی کے عیب کو بھی اپنے حُسنِ اسلوب میں پوشیدہ کر لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دروغ بیانی میں جس قدر مبالغہ کیا جائے شعر کا حُسن اُتنا ہی نکھرتا ہے اور یہ سُن کر حاضرین نے سکوت اختیار کر لیا۔

نقشِ وفا

اکرام جاوید۔ بی۔ کام (عثمانیہ)

معرفت ٹاؤن انسپکٹر آف پوسٹ آفسز، بیگم بازار، حیدرآباد۔ ۱۲ (آندھرا پردیش)۔

۵ مئی ۱۹۶۶ء

محترم خوشتر بھائی! تسلیم

... آپ کی بے پایاں محبت اور خلوص کے لئے دل سے شکر گزار ہوں ۔۔۔ میرے افسانے "کانچ کی گڑیا" کو قارئین "بیسویں صدی" نے بے حد پسند کیا۔ اکثر کرم فرماؤں نے خطوط بھی لکھے ہیں۔ میں آپ ہی کی وساطت سے اپنے پڑھنے والوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔ "بیسویں صدی" کے لئے ایک تازہ افسانہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے افسانہ آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو پسند آئے گا۔ مجھے آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا...

آپ کا اپنا ۔۔۔۔ اکرام جاوید

اُس کا نام نہ جانے کیا تھا لیکن محلے بھر میں کاکا کے نام سے مشہور تھا۔ آدھے کچے، آدھے پکے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے سر کے بال، سانولا رنگ، بھرا بھرا صحت مند اور سڈول جسم، چوڑا چکلا سینہ، اُس کا چہرہ بیضوی اور بارُعب تھا۔ داڑھی مونچھ سے بے نیاز چہرے پر دو بڑی بڑی مخمور آنکھیں، گھنی سیاہ ابروؤں کے سائے میں ستاروں کی طرح چمکتی رہتی تھیں۔ دائیں گال پر بڑا سا تِل تھا اور ہونٹ ٹھوڑی کے درمیان ہلکا سا گڑھا ۔۔۔ اُس کی ناک لمبی اور ستواں تھی اور ہونٹ موٹے لیکن خوبصورت تھے۔ جب وہ بات کرتا تو اُس کا دہانہ پھیل جاتا اور پُر گوشت رخساروں میں دونوں طرف ہلکے سے گڑھے پڑ جاتے تھے۔ وہ بہت کم مُسکراتا تھا۔ بات بات پر زوردار قہقہہ بلند کرتا۔ پُر وقار چہرہ اور بھاری گونجدار آواز اُس کی شخصیت کو نمایاں کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ باریک ململ کے سفید کرتے اور سفید ڈھیلے ڈھالے پاجامے میں ملبوس رہتا، جس پر ہلکی سی شکن تک نہ ہوتی۔ وہ لباس کے معاملے میں بہت نفاست پسند آدمی تھا۔ سردیوں میں اُس کے جسم پر ایک سیاہ اونی کوٹ۔ اور نیلے اُونی مفلر کا اضافہ ہو جاتا تھا اور گرمیوں میں کالے رنگ کے فوجی بوٹ کی جگہ نازک تالیوں والی ہلکی پھلکی سی چپل آجاتی تھی۔ صورت شکل اور وضع قطع سے وہ خاموش، سنجیدہ اور خلوت پسند آدمی تھا لیکن عام زندگی میں وہ اس کے برعکس واقع ہوا تھا۔ وہ نہایت خلیق، ملنسار اور یار باش تھا اور ہر وقت دوستوں میں گھرا رہتا تھا۔ محلے میں وہ کتنے سال سے مقیم تھا، کوئی بھی ٹھیک سے نہیں بتا سکتا تھا۔ محلے کے بوڑھے اپنی نوجوانی کے زمانے سے اُسے محلے میں دیکھتے آرہے تھے۔ ناز ہوٹل کاکا کا مستقل ٹھکانا تھا۔ بہت کم لوگوں کو اُس کے مکان کا پتہ معلوم تھا۔

میں پچھلے دو تین برس سے کاکا کو محلے کے گلی کوچوں اور ناز ہوٹل میں دیکھ رہا تھا۔ دُور ہی دُور سے اُس کی شخصیت کی کشش کو محسوس کرتا رہا تھا۔ مجھ میں اُس کے قریب جانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں ایک متوسط خاندان کا سفید پوش شریف نوجوان ہوں۔ مجھے کاکا سے ملنے میں خاندان کی نیک نامی اور اپنی شرافت پر حرف آنے کا اندیشہ تھا۔ محلے کے اعلیٰ اور متوسط گھرانوں میں کاکا کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی۔ وہ آوارہ اور بدکردار آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے کاکا کے سارے دوست نچلے طبقے کے لوگ تھے۔ ہوٹل کے ملازم، ریل مزدور، رکشا والے، پان فروش، شرابی اور آوارہ نوجوان جو اکثر جرائم پیشہ یا بے روزگار ہوتے تھے۔ وہ اُن لوگوں میں کافی ہر دلعزیز تھا۔ وہ نچلے درجے کے لوگوں کا ہیرو تھا لیکن کاکا میں مجھے کوئی ایسی بُرائی نظر نہیں آئی جو اُسے آوارہ یا بدکردار ثابت کر سکے۔ وہ ہر طرح سے شائستہ اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا۔ محلے بھر کے غریب اور مفلس لوگ اُس کی شرافت، اخلاق اور انسانیت کے قائل تھے اور دل سے

اُس کی عزت کرتے تھے۔ رات گئے تک وہ ناز ہوٹل میں بیٹھا چائے اور سگریٹ پیتا رہتا، دوستوں کی جھرمٹ میں پونم کے چاند کی طرح چمکتا، باتیں کرتا اور سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ پھر بھاری گونج دار آواز میں قہقہے لگاتا۔ تلخ، کھوکھلے اور طنز بھرے قہقہے۔ رات گزرتی جاتی اور اُس کے دوست آتے اور جاتے رہتے تھے!

دسمبر کے آخری ہفتے کی ایک شام کو معمول کے خلاف وہ ناز ہوٹل میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے میز پر پانی کے دو گلاس اور چائے کی خالی پیالی تھی۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ سُلگ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں دیا سلائی تھی جسے وہ میز پر رکھے ہوئے چار مینار سگریٹ کے پیکٹ پر آہستہ آہستہ بجا رہا تھا اور چھت کی طرف مُنہ اُٹھائے سگریٹ کے دھوئیں کو گھور رہا تھا۔ اُس شام میں بھی تنہا تھا۔ کاکا کو

- زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار کا نام سنیاس نہیں، اِن اُلجھنوں کو کامیابی سے حل کرنے کا نام سنّیاس ہے۔ (ٹھاکر سری چند)
- خوشی خوشی اُٹھائے جانے پر بھاری بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ (اروند رشی)
- انسان ترقی کرتا ہے تو اُس کے راستے کی خاک فرشتوں کی آنکھوں کا سُرمہ بنتی ہے۔ (سوامی سار شیدا نند جی)
- جو لوگ محنت سے کام کرتے ہیں اور ایشور پر بھروسہ رکھتے ہیں، کامیاب ہوتے ہیں۔ (سوامی وویکانند)
- خلقِ خدا کی خدمت ہی انسان کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ (جواہر لال نہرو)

اکیلا دیکھ کر دل میں برسوں کا دبا ہوا جذبہ اُبھر آیا۔ میں اُس سے ملنا چاہتا تھا لیکن سرِعام اُس سے ملنے میں اندیشۂ رُسوائی تھا۔ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا سوچتا رہا اور پھر ہمت کر کے اُس کی میز کی طرف بڑھ گیا۔

"آیئے۔ اشفاق صاحب! تشریف لایئے" وہ خیالوں سے اُبھر کر بھاری گونج دار مگر پُر اخلاق آواز میں بولا اور میں حیران رہ گیا کہ اُسے میرا نام کیسے معلوم ہوا جبکہ میں اُس سے ہمیشہ دُور ہی دُور رہا تھا۔ میں اُس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ حیران نہ ہوں، مجھے آپ کے والدِ بزرگوار کا نام بھی معلوم ہے" وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا "میں اِس محلّے کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ یہاں کے سب لوگ مجھ سے واقف ہیں۔ . . آپ صرف چند سال سے اِس محلّے میں رہتے ہیں۔ آپ نے سائنس سے گریجویشن کیا ہے۔ ابھی کنوارے ہیں۔ بندوبست کے محکمے میں ملازم ہیں اور ملازمت سے بیزار ہیں اور اِس لئے بیزار ہیں کہ آپ کو افسانہ نگاری کا شوق ہے اور محکمۂ بندوبست میں افسانہ نگاری کا کام نہیں۔ دیکھئے میں آپ کے بارے میں کیا کچھ نہیں جانتا!"

مجھے حیرت تھی۔ اُس کی معلومات پر نہیں، اُس کی اِس صلاحیت پر کہ اَن کہی باتوں کو وہ سُن لیتا تھا۔ میں اُس سے مرعوب ہو گیا تھا۔

"گھبرایئے نہیں۔ شہر میں آج کئی نئی فلمیں دکھائی جا رہی ہیں۔ جاسوسی پہچاننے والے سارے لوگ محلّے سے باہر ہیں۔ آپ کو میرے پاس اِس وقت کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"جی۔ یہ بات نہیں ہے۔ . ." میں بوکھلا گیا۔

"جی یہی بات ہے" وہ پُر اعتماد لہجے میں کہنے لگا۔ "میں جانتا ہوں اشفاق صاحب . . . آپ میرے مقابلے میں ابھی بچے ہیں۔ آپ کی عمر مشکل سے پچیس برس ہوگی اور میں زندگی کی ساٹھ خزاں آلود بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے آپ سے زیادہ دُنیا اور دُنیا والوں کو دیکھا ہے۔"

وہ سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا "اپنے چہروں پر نقاب اوڑھے ہوئے لوگ . . . ہر ایک کی روش منافقانہ، ہر دل کی دھڑکن سے ریاکاری کی صدا آتی ہے۔ سچائی کا نام بھی لیا جاتا ہے تو کتنی جھوٹی اور غیر حقیقی آوازمیں ـــــ" وہ بات اِس طرح کر رہا تھا جیسے کسی ڈرامے میں مکالمے ادا کر رہا ہو۔ مجھے وہ اسٹیج کا اداکار معلوم ہو رہا تھا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔ میں اداکار تھا اور ہوں" وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "اداکار ـــ اسٹیج اور فلم ـــ اور زندگی کی بھی اداکاری!"

"واقعی؟" میں حیرت میں ڈوب کر بولا "آپ اداکار تھے؟"

"ہاں! میں جھوٹ نہیں کہتا" وہ متوازن لہجے میں کہنے لگا "اِسی شہر میں دس سال تک میں اسٹیج پر کام کرتا رہا۔ اِس شہر سے دُور بمبئی اور کلکتہ میں بیس سال تک زندگی اسٹیج اور فلم کے ہنگاموں میں بسر ہوئی اور پندرہ سال سے ماضی کی شہرت، دولت اور عزت کو رُسوائی کے تیزاب سے بُجھاتا آ رہا ہوں۔ ایک ایک کر کے ہر ستارہ ٹوٹتا جاتا ہے۔ ہر چراغ بُجھتا جاتا ہے۔ ایک ایک شعلہ سرد ہوتا جاتا ہے اور ایک دن آئے گا جب یہ زندگی کا شعلہ بھی بُجھ جائے گا۔ سارا قصّہ ختم ہو جائے گا۔ زندگی کے اسٹیج پر اپنے ڈرامے کے ڈراپ سین کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں حیرت سے اُس کے صحت مند اور سڈول جسم کو، اُس کے پُر وقار

سانولے پُرگوشت چہرے اور بڑی بڑی گہری سیاہ چمکدار آنکھوں اور دائیں گال کے سیاہ تِل کو دیکھتا رہا۔ وہ ہرگز ساٹھ سال کا بوڑھا دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ میری حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بھاری پُر اثر آواز میں کہہ رہا تھا۔

"اُس زمانے میں میرا نام کاکا نہیں تھا۔ میں ایک مشہور اور مقبول اداکار تھا۔ لاکھوں روپے کمائے اور اُڑا بھی دئے۔ بہت نام پیدا کیا اور اُسے گنوا بھی چکا ہوں ... وہ زمانہ گزر گیا۔ وہ لوگ نہ رہے۔" وہ رُک کر بولا "لوگ تو راستے کے مسافر ہیں صبح آئے، شام گئے، شام کو آئے، صبح رختِ سفر باندھا۔" غم و یاسیت کی شدت سے اُس کی آواز لرز کر رہ گئی اور میں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں پوچھا "آپ نے کن فلموں میں کام کیا تھا؟"

"آپ کو فلم سے اتنی دلچسپی تو نہیں معلوم ہوتی۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "فلموں میں میں نے زیادہ دن کام نہیں کیا ... راز دار بھائی اور کاڈیا وانوں کے ان چانس ملے تھے۔" وہ ایکدم کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا اور پھر جلدی سے چونک کر بولا "چھوڑئیے اِن باتوں کو ... میرا ماضی جو کچھ تھا وہ اب خواب ہو چکا ہے اور اب جو کچھ میں ہوں وہ ہوں۔"

"لیکن ــــــ!" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "آپ نے اسٹیج اور فلم کی دُنیا کیوں چھوڑ دی؟"

"آپ کا یہ سوال غیر متوقع نہیں ہے۔" وہ تلخ لہجے میں کہنے لگا "اسٹیج تو زمانہ ہوا، لوگوں کی ناقدری کا شکار ہو گیا۔ رہی فلم ــــــ خدا کے لئے مجھ سے مت پُوچھئے کہ میں نے فلمی دُنیا کیوں چھوڑ دی۔ یہ میرا راز ہے ــــــ کوئی اور بات کیجئے ــــــ!"

"جی!" میں نے خفیف ہو کر جلدی سے کہا "فلمی کہانیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"فلمی کہانیاں؟" وہ زوردار قہقہہ لگا کر بولا۔ "جنابِ من! آج کی فلموں میں کہانی کہاں ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں آپ ایک اچھے کہانی کار ہیں لیکن اچھائی اور بُرائی میں امتیاز کہاں باقی رہا ہے۔" وہ خیالوں میں کھو گیا "پتھروں کے دیس میں اصنام تراشے جاتے۔ تراشیدہ اور ناتراشیدہ اصنام کی مسرت اور حسرت میں ڈوبتے اُبھرتے رہتے۔ پتھروں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کوئی آنکھ نہیں دیکھے گی۔ کوئی کان نہیں سُنے گا۔ کوئی دل نہیں دھڑکے گا۔" وہ تلخی سے کہنے لگا۔ "یہ پروپیگنڈے کا دَور ہے۔ جو لوگ کچھ بھی نہیں ہوتے، بہت کچھ بن جاتے ہیں۔ اور جو سب کچھ ہوتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھے جاتے ــــــ زندگی سوداگری ہے۔" وہ بہک سا گیا تھا۔ ابھی میرے دل میں خیال اُبھرا ہی تھا کہ وہ سنبھل گیا۔

"واقعی میں بہت فضول باتیں کر رہا ہوں۔ آپ کوئی خیال نہ کریں۔ ساٹھ سال کی عمر میں آدمی کچھ اِسی طرح فضول اور بیکار ہو جاتا ہے۔" وہ لہجہ بدل کر کہنے لگا "ہاں تو بات فلمی کہانیوں کی ہو رہی تھی۔ ایک کہانی کار کی حیثیت سے آپ فلمی دُنیا میں بے شک اُبھر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے آپ کو سخت جدوجہد کرنی ہوگی۔ اُڑنا ہوگا۔ جو شخص اُڑ نہیں سکتا وہ زندگی کے حُسن سے محروم ہو جاتا ہے۔ پرندے اُڑتے ہیں اِس لئے اکثر آزاد رہتے ہیں۔ چوپائے اُڑ نہیں سکتے اِس لئے مار کھا جاتے ہیں۔ قید ہو جاتے ہیں لیکن ــــــ" وہ بُجھ سا گیا "میرے پر پرواز کٹ گئے، جھڑ گئے، پت جھڑ میں پتّوں کی طرح ــــــ اب میرا وجود بیکار ہے۔" وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر دھیرے سے بولا "پھر بھی مجھے زندہ رہنا ہے۔"

"اور زندہ رہنا انسان کے اختیار کی بات نہیں ہے" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

- بخدا وہ مومن (کامل) نہیں جس کی بدی سے اُس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- وہ ناکام ہے جو اپنے بھائیوں کی دوستی حاصل نہ کر سکے۔ اور سب سے زیادہ ناکام وہ ہے جو اپنے بھائیوں کی دوستی حاصل کر کے اُسے گنوا دے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- جس کے پاس صحت ہے اُس کے پاس اُمید ہے، جس کے پاس اُمید ہے اُس کے پاس ہمت ہے اور جس کے پاس ہمت ہے اُس کے پاس سب کچھ ہے۔ (ایک مشرقی دانشور)
- انسان پر خدا کا سب سے بیش بہا انعام اچھی عورت ہے۔ (ایک مشرقی مفکر)

وہ چونک پڑا۔ مجھے تعریفی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا "اِس کے باوجود میں زندہ رہوں گا۔ اپنی بیوی اور بچّی کے لئے۔ اپنی پیاری بیٹی کے لئے۔" اُس کی آواز لرز کر رہ گئی اور وہ جلدی جلدی سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اپنی دلی اضطراب کی پردہ داری کرنے لگا۔

میں سوچ رہا تھا، اُس سے اُس کی بیوی اور بیٹی کے بارے میں سوال کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ اتنے میں بدنام نوجوانوں کا ایک گروپ ناز ہوٹل میں نمودار ہوا۔ وہ لوگ کاکا کی میز کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں متفکر ہو گیا۔ کاکا نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جلدی سے میز پر رکھی ہوئی چار مینار کی ڈبی کو پھاڑ کر اُس کے دو ٹکڑے کئے اور ململ کے کُرتے کی جیب سے سُرخ رنگ کا ایک سستا سا

فونٹین پن نکال کر سگریٹ کی ڈبی پر اپنے گھر کا پتہ اُردو میں لکھ دیا اور بولا۔

" یہ میری جھونپڑی کا پتہ ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی بھی دن دوپہر میں آجایئے۔ آپ سے باتیں کر کے بہت دل خوش ہوا لیکن اب وقت نہیں ہے" وہ رُک کر آہستہ سے کہنے لگا " میں آپ کا انتظار کروں گا۔ کسی دن بھی دوپہر میں "

" میں حاضر ہو جاؤں گا " میں نے جلدی سے کہا " خدا حافظ " اور کاکا کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ کاکا کے آوارہ دوست اُس کی میز تک پہنچ گئے تھے۔

دسمبر کا مہینہ دفتر کی مصروفیت کی نذر ہو گیا۔ اُن دنوں ناز ہوٹل میں بھی میرا جانا کم ہوا۔ جنوری کی ایک دوپہر کو کاکا کے دئے ہوئے پتہ پر میں اُس کے گھر پہنچ گیا۔ کاکا محلے کے آخری گنجان آباد اور گندے حصّے میں ایک نہایت مختصر سے تنگ و تاریک مکان میں رہتا تھا، جس کی دیواریں مٹّی کی بنی ہوئی اور بوسیدہ حالت میں تھیں۔ دیواروں کی سفیدی جگہ جگہ سے اُڑ گئی تھی اور مٹّی کی چھت گرد و غبار اور مکڑی کے جالوں سے اٹی ہوئی تھی۔ مختصر سے کمرے، مختصر سے دالان اور مختصر سے صحن پر مشتمل اِس مکان میں فرش پر ایک خستہ بوریا بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایک میلی بوسیدہ اور بدرنگ شطرنجی کا ٹکڑا پڑا تھا۔ دیوار سے لگا ہوا ایک میلا کچیلا گاؤ تکیہ تھا جس پر چار مینار سگریٹ کی آدھ کھلی خالی ڈبی رکھی تھی۔ کاکا مجھے دیکھ کر کھل اُٹھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

" آپ بہت اچھے وقت پر آئے " وہ مسرور لہجے میں بولا " میری سابت پیاری بیٹی کے ایک چاند سی لڑکی ہوئی ہے۔ میں نانا بن گیا ہوں ـــــ ہاہاہا ـــــ لیجئے۔ پہلے مُنہ میٹھا کیجئے " یہ کہتے ہوئے مجھے اُس نے دالان میں شطرنجی کے ٹکڑے پر بٹھا دیا اور سامنے والے نیم تاریک کمرے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے باہر نکلا تو اُس کے ہاتھوں میں مٹھائی کی چنگیری تھی۔ اُس پر لپٹا ہوا اخبار کا کاغذ پھاڑ کر جلیبیوں سے بھری ہوئی چنگیری اُس نے میرے سامنے رکھ دی۔ میں حیرت سے خالی دالان اور خالی کمرے کی طرف دیکھنے لگا تو وہ جلدی سے بولا۔

" آپ حیران نہ ہوں۔ میرا کمرہ عمرو عیار کی زنبیل کی طرح ساری کائنات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اِس کمرے میں میری بیوی رہتی ہے، میری اکلوتی بیٹی اور اُس کا شوہر رہتا ہے اور اب ایک چاند سی نواسی بھی اسی کمرے میں رہنے کے لئے آگئی ہے۔ دیکھئے، ہاتھ مت روکئے ـــــ مٹھائی کھایئے۔ میں آپ کو اپنا ... دکھاؤں گا "

مٹھائی کھانے کے بعد میں نے المونیم کے گلاس سے پانی پیا اور کاکا نے ...

"چلئے یہاں نہیں ملے گی۔ آپ سگریٹ اور پان ہی سے دل بہلائیں۔" اُس نے میلے سے گاؤ تکیہ کو ہٹا کر اخباری کاغذ میں لپٹے ہوئے پان کے بیڑے میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے پان کھایا، سگریٹ سُلگائی۔ کچھ دیر کاکا موسم، ماحول، مُلک کی سیاسی اور سماجی حالت پر تبصرہ کرتا رہا۔ پھر بولا "آیئے آپ کو اپنے طلسمی کمرے کی سیر کرا دوں؟"

میں اُٹھ کر اُس کے ساتھ اُس کے مختصر سے نیم تاریک کمرے میں گیا۔ کمرہ کی نیم تاریک فضا میں کچھ دیر مجھے کچھ نظر نہ آسکا اور جب آنکھیں اِس قابل ہوئیں تو میں نے دیکھا، کمرے میں ایک چارپائی پر سفید چادر، سفید غلاف کے تکیے اور اُونی بلانکٹ سے بستر سجا ہوا ہے۔ ایک طرف ٹین کا ایک بڑا سا ٹرنک رکھا تھا۔ کھونٹیوں پر مل کے کرُتے، ہرک کے پاجامے اور سیاہ اُونی کوٹ اور مفلر لٹکے ہوتے تھے۔ اور سرہانے کی طرف دیوار پر شیشے کے فریم آویزاں تھے جن کی سفید سُوتی کپڑے کے ٹکڑوں سے پردہ پوشی کی گئی تھی۔ ایک گوشے میں چھوٹا سا چوبی تخت پڑا تھا۔ جس پر چند کتابیں، رسائل اور اخبارات بکھرے ہوتے تھے۔

"دیکھئے یہ میری باوفا بیوی ہے۔ باحیا مشرقی عورت،" وہ سرہانے کی دیوار پر آویزاں کپڑے کے پردے سے ڈھکے ہوئے فریم کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "اِس کے بازو میں میری نہایت پیاری بیٹی ہے اور اِس کے ساتھ میرا شریف اور ہونہار داماد ہے اور اِن دونوں کے درمیان میری نواسی ہے۔ آپ اِنھیں نہیں دیکھ سکتے۔ مشرقی عورتیں ہیں یہ۔ پردہ کرتی ہیں" وہ زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "خدا کے لئے یہ نہ پوچھئے، میری بیوی اور بیٹی کہاں رہتی ہیں اور میں یہاں اکیلا کیوں ہوں۔ یہ میرا ذاتی راز ہے۔ ہاں ـــــ ذاتی راز" وہ ایکدم خاموش ہوگیا۔ اِتنا خاموش کہ اُس نے پھر کوئی بات ہی نہ کی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے اُس سے جانے کی اجازت لی تو بھی وہ خاموش رہا۔

"اچھا اب اجازت دیجئے" میں نے دوبارہ کہا تو اُس نے کھوئی کھوئی سی بوجھل آواز میں کہا۔

"خدا حافظ!" اور خاموش ہوگیا۔

میرے ذہن پر کاکا کی شخصیت بُری طرح چھا گئی تھی۔ میں اکثر اُس کے بارے میں سوچا کرتا۔ اُس نے اسٹیج اور فلمی دُنیا کیوں چھوڑی؟ دولت کیسے گنوا دی؟ کیوں گمنامی اور تنہائی کی زندگی گزار رہا ہے؟ اب اُس کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ کیا واقعی اُس کی کوئی بیوی، بچی اور داماد اِس دُنیا میں موجود ہیں؟ اِس کا ذاتی راز کیا ہے؟ کاکا میرے لئے بہت پُراسرار بن گیا تھا۔

اُنھیں دنوں کیفے 'امروز' میں میری ملاقات رمیش سے ہوئی۔ رمیش میرے کالج کا ساتھی تھا اور کرائم برانچ میں ایک اچھے عہدہ پر مامور تھا۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے کاکا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"تم کاکا کو جانتے ہو؟" رمیش نے حیرت سے کہا "اُس سے ملنے جُلنے میں احتیاط کرو۔ پولیس کے ریکارڈ میں اُس کا نام مشتبہ لوگوں کی فہرست میں شامل ہے۔ وہ غنڈوں کا سرغنہ ہے۔ جوئے اور سٹے کا کاروبار کرتا ہے!"

"جوئے اور سٹے کا کاروبار؟" میں چونک گیا۔ مجھے رمیش کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ "کاکا اگر غیر قانونی اور ناجائز دھندا کرتا ہے تو پھر پولیس اُس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتی۔ میرا خیال ہے وہ کبھی جیل نہیں گیا۔"

"کسی مُجرم کا جیل نہ جانا الگ بات ہے اور اُس کا مُجرم ہونا ایک الگ بات ہے۔" رمیش نے مُسکراتے ہوئے کہا "کاکا بھی اُن چالاک مُجرموں میں سے ایک ہے جو جُرم کا ارتکاب بھی کرتے ہیں اور جیل بھی نہیں جاتے۔"

"میں سمجھا نہیں ـــــ؟"

"بہتر ہے، سمجھنے کی کوشش بھی مت کرو۔ بس یقین کر لو۔ کاکا ایک خطرناک آدمی ہے۔ اُس سے بچ کر رہو۔" رمیش نے کہا" ورنہ ایک دن پچھتاؤ گے۔"

اِس کے بعد میں کاکا سے بچنے لگا۔ مجھے اُس سے نفرت ہوگئی۔ میں اُس کے تصور ہی سے خوفزدہ ہو جاتا تھا۔ رمیش کے بتانے سے پہلے بھی محلے کے شریف لوگوں میں کاکا کی آوارگی اور بدچلنی کے چرچے عام تھے۔ شریف لوگ جو کہتے تھے وہ درست تھا اور میں جو کاکا کے بارے میں سوچ رہا تھا، غلط تھا۔ میں کاکا سے دُور دُور رہنے لگا۔ میں نے ناز ہوٹل جانا چھوڑ دیا۔ کاکا اگر راستے میں مِل جاتا تو میں اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتا اور کاکا بھی انجان ہو جاتا۔ اُس نے کبھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو سال بیت گئے

میں کاکا کے خیال سے غافل ہوگیا تھا۔ اچانک گرمیوں کی ایک چاندنی رات میں غیر متوقع طور پر کاکا سے میری مڈبھیڑ ہوگئی۔ شہر سے بارہ میل دُور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور چٹانوں سے محصور "مون لیک" کے کنارے چاند کی صاف اُجلی چاندنی میں میں ایک چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا بے خیالی کے عالم میں مون لیک کے بیقرار پانی میں کنکریاں پھینک رہا تھا کہ اچانک جانی پہچانی بھاری آواز میرے قریب ہی گُونج اُٹھی۔

"آہاہ۔ اشفاق صاحب ہیں۔ خوب اتفاق ہے جناب" کاکا کے سانولے بھاری چہرے پر شراب کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ اُس کی سانسوں سے شراب کی بُو آرہی تھی۔ بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں پُراسرار طور پر چمک رہی تھیں "آپ کب تک

سارے خاندان کی صحت کے لئے فاسفومن®

فاسفومن پھلوں کے ذائقے والا ہرے رنگ کا وٹامن ٹانک ہے۔ اس میں وٹامن بی کامپلیکس ہے نیز کئی طرح کے گلیسروفاسفیٹس بھی ہیں جن کی وجہ سے آپ کا خاندان توانا، ہشاش بشاش اور تندرست رہتا ہے۔ فاسفومن گھر میں رکھئے۔ فاسفومن کے استعمال سے تھکان اور کمزوری کا نام ونشان نہیں رہتا۔ فاسفومن کے استعمال سے کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو جاتی ہے، بھوک پھر سے لگنے لگتی ہے۔ زیادہ کام کرنے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور جسم کی قوت مدافعت بڑھتی ہے۔ سارے خاندان کی صحت کا راز۔ فاسفومن



SQUIBB® TTT®

® یہ ای۔ آر۔ اسکوئب اینڈ سنز انکارپوریٹڈ کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔ جس کے استعمال کا لائسنس کریمچند پریمچند پرائیویٹ لمیٹیڈ کو حاصل ہے

SARABHAI CHEMICALS

Shilpi SC 881 Ur

مجھ سے دامن بچائیں گے جناب . . . میں تسمہ پا ہوں۔ داستانوں میں جن سخت جان اور ظالم تسمہ پاؤں کا ذکر آیا ہے اُن سے بھی زیادہ سخت جان ـــــ ظالم . . . اور گردن گیر ـــــ میں سایے کی طرح ہوں۔ مجھ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔"

"کاکا ـــــ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

اُس نے وحشت بھری نگاہوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور دھیرے سے بولا: "میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سچ بولا ہے اور جھوٹ سننے کے عادی لوگ ہمیشہ میری باتوں کو ناپسند کرتے رہے ہیں۔" وہ رُک رُک کر کہنے لگا۔ "میں نے کبھی نہیں کہا میں اچھا آدمی ہوں۔ ارے میرے بھائی! میں تو اتنا بُرا، اتنا گناہ گار ہوں کہ دوزخ بھی میرے وجود کو برداشت نہ کر سکے گی اور یہ تو دُنیا ہے۔ میں تو کھلے عام کہتا ہوں۔ میں آوارہ ہوں، شرابی ہوں، جواری ہوں، سٹے کا کاروبار کرتا ہوں۔ اور سب سے بڑی گراوٹ یہ ہے کہ سچ بولتا ہوں۔" وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑایا۔ "میں سچ بولتا ہوں۔"

وہ میرے سامنے ہی پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے بڑبڑایا۔ "میں سچ بولتا ہوں!"

میرے ذہن پر جمی ہوئی کائی چھٹ گئی۔ کاکا نے کبھی میرے آگے نیک اور اچھا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی میں نے اُسے اِس قابل سمجھا تھا کہ اُس سے باتیں کروں، اُس کو سمجھوں اور خود ہی اُس سے بدگمان ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میں نے ندامت سے کہا۔

"کاکا ـــــ! میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں۔ میں نے آپ سے دانستہ بے مہری برتی۔"

"بے مہری؟" وہ وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "گویا مہر و وفا نام کی کوئی چیز دُنیا میں پائی جاتی ہے، جو آپ مجھ سے برت نہ سکے . . . میرے بھائی! ابھی آپ بچے ہیں، نادان ہیں، ناتجربہ کار ہیں۔ جو اتنی معصومیت سے الفاظ اور اصطلاحوں کے مفہوم پر یقین رکھتے ہیں۔ ہائے ہائے یہ سادگی ـــــ" وہ درد ناسا ہو کر بولا۔ "میں اپنی معصومیت سے محروم ہو گیا۔ میرے عقاید اور عبارت کے محل مسمار ہو گئے۔ میں انسان سے مایوس ہو چکا ہوں بھائی! میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور اب مرجانا چاہتا ہوں۔" وہ کرب کے عالم میں دُہرا رہا تھا۔ "میں مرجانا چاہتا ہوں۔"

"کاکا!" میں نے حیرت اور پریشانی سے کہا۔ "آپ بہت زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔"

"پریشان؟" وہ وحشت بھری آواز میں بولا۔ "لفظ پریشان میں اتنی وُسعت کہاں جو میری دلی کیفیت کا احاطہ کر سکے۔ سچ کہتا ہوں اب زندگی سے جی اُکتا گیا ہے . . ."

"لیکن زندگی اتنی غیر اہم تو نہیں۔" میں نے اُس کا دل بڑھانا چاہا۔

"زندگی انمول خزانہ ہے لیکن اب مجھ میں سکت نہیں رہی کہ اِس خزانے کی حفاظت کر سکوں۔" وہ تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ "شیر گولی کھا کر پہلے یہ دیکھتا ہے کہ بچنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔ اُمید ہو تو جدوجہد کرتا ہے، ورنہ پاؤں پھیلا کر زمین پر ڈال دیتا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے چٹان پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر چت لیٹ گیا۔ "ریس کا گھوڑا جب بہت بوڑھا اور کمزور ہو جاتا ہے تو اُسے گولی مار دی جاتی ہے . . . لوگ جانوروں پر بھی رحم کرتے ہیں لیکن مجھ پر کوئی ترس نہیں کھاتا . . . کوئی خنجر، کوئی چاقو، کوئی رائفل یا پستول کی گولی یا کوئی انتہائی مہلک زہر . . . مجھے یہاں موت تک نہیں ملتی!"

"آپ موت کا اس طرح ذکر کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت، غم اور ہمدردی سے پوچھا۔

"اِس لئے کہ میرے دل سے زندہ رہنے کی خواہش واقعی نکل چکی ہے۔"

وہ کراہ کر رہ گیا۔

"کاکا ـــــ!" میں نے مضبوط آواز میں کہا۔ "خدا کے لئے انکار مت کیجئے۔ مجھے بتایئے، وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے آپ کے دل سے زندہ رہنے کی خواہش نکل گئی۔"

کاکا نے پتھر کی سطح چٹان پر کروٹ لی اور پھر تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ میں جواب طلب نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا لیکن وہ خاموش رہا۔ جھیل کی بے قرار موجوں پر نظریں جمائے پتھر کا بُت بنا بیٹھا رہا۔ بڑی دیر کے بعد اُس نے زبان کھولی تو مجھے اُس کی آواز بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔

"تو تم میرے راز کو جاننا چاہتے ہو؟"

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے ململ کے کُرتے کی جیب سے سیاہ چرمی پاکٹ نکالا اور اُسے کھول کر پاسپورٹ سائز کی چند تصویریں نکالیں اور میری طرف کھسک آیا۔

"اِن تصویر کو دیکھو اور پہچانو۔" اُس نے ایک تصویر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ کسی زمانے کی مشہور فلم اسٹار شیشم کی تصویر تھی، جو اب فلموں میں ماں کا رول ادا کرتی تھی۔

"شمعِ محفل بننے سے پہلے شیشم میرے گھر کا چراغ تھی۔ میری باوفا اور نیک بیوی! جو میری پیاری بچی کی ماں بنی . . . اور پھر فلم اسٹار بنا . . . اور اب

مجھ سے دامن بچائیں گے جناب . . . میں تسمہ پا ہوں۔ داستانوں میں جن سخت جان بد ظالم تسمہ پاؤں کا ذکر آیا ہے اُن سے بھی زیادہ سخت جان ـــــ ظالم . . اور گردن گیر ـــــ میں سایے کی طرح ہوں۔ مجھ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔"

"کاکا ـــــ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

اُس نے وحشت بھری نگاہوں سے مجھے گھور کر دیکھا اور دھیرے سے بولا "میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سچ بولا ہے اور جھوٹ سُننے کے عادی لوگ ہمیشہ میری باتوں کو ناپسند کرتے رہے ہیں۔" وہ رُک رُک کر کہنے لگا "میں نے کبھی نہیں کہا کہ میں اچھا آدمی ہوں۔ ارے میرے بھائی! میں تو اِتنا بُرا، اِتنا گناہ گار ہوں کہ دوزخ بھی میرے وجود کو برداشت نہ کر سکے گی اور یہ تو دُنیا ہے میں تو کھلے عام کہتا ہوں۔ میں آوارہ ہوں، شرابی ہوں، جواری ہوں، سٹّہ کا کاروبار کرتا ہوں۔ اور سب سے بڑی گراوٹ یہ ہے کہ سچ بولتا ہوں" وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑایا۔ "میں سچ بولتا ہوں۔"

وہ میرے سامنے ہی پتھر کی ایک چٹان پر بیٹھ گیا اور آہستہ سے بڑبڑایا۔

"میں سچ بولتا ہوں!"

میرے ذہن پر جمی ہوئی کائی چھٹ گئی۔ کاکا نے کبھی میرے آگے نیک اور اچھا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی میں نے اُسے اِس قابل سمجھا تھا کہ اُس سے ملوں، باتیں کروں، اُس کو سمجھوں اور خود ہی اُس سے بدگمان ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میں نے ندامت سے کہا۔

"کاکا ـــــ! میں اپنے رویّے پر شرمندہ ہوں۔ میں نے آپ سے دانستہ بے مہری برتی۔"

"بے مہری؟" وہ وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا "گویا مہر اور وفا نام کی کوئی چیز دُنیا میں پائی جاتی ہے، جو آپ مجھ سے برت نہ سکے . . . میرے بھائی! ابھی آپ بچّے ہیں، نادان ہیں، ناتجربہ کار ہیں۔ جو اپنی معصومیت سے الفاظ اور اصطلاحوں کے مفہوم پر یقین رکھتے ہیں۔ ہائے ہائے یہ سادگی ـــــ"

وہ روہانسا ہو کر بولا "میں اپنی معصومیت سے محروم ہو گیا۔ میرے عقاید اور اعتبارات کے محل مسمار ہو گئے۔ میں انسان سے مایوس ہو چکا ہوں بھائی! میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور اب مرجانا چاہتا ہوں۔" وہ کرب کے عالم میں بار بار دُہرا رہا تھا "میں مرجانا چاہتا ہوں۔"

"کاکا!" میں نے حیرت اور پریشانی سے کہا "آپ بہت زیادہ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

"پریشان؟" وہ دحشت بھری آواز میں بولا "لفظ پریشان میں اتنی وسعت کہاں جو میری دلی کیفیت کا احاطہ کر سکے۔ سچ کہتا ہوں اب زندگی سے جی گیا ہے۔"

"لیکن زندگی اتنی غیر اہم تو نہیں" میں نے اُس کا دل بڑھانا چاہا۔

"زندگی انمول خزانہ ہے لیکن اب مجھ میں سکت نہیں رہی کہ اِس خزانے کی حفاظت کر سکوں۔" وہ تلخ لہجے میں کہنے لگا "شیر گولی کھا کر پہلے یہ دیکھتا ہے کہ بچنے کی کوئی صورت ہے یا نہیں۔ امید ہو تو جہد کرتا ہے، ورنہ پاؤں پھیلا کر زمین پر ڈال دیتا ہے" یہ کہہ کر اُس نے چٹان پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر چت لیٹ گیا۔ "زمین کا گھوڑا جب بہت بوڑھا اور کمزور ہو جاتا ہے تو اُسے گولی مار دی جاتی ہے . . . لوگ جانوروں پر بھی رحم کرتے ہیں لیکن مجھ پر کوئی ترس نہیں کھاتا . . . کوئی خنجر، کوئی چاقو، کوئی رائفل یا پستول کی گولی یا کوئی انتہائی مہلک زہر . . . مجھے یہاں موت تک نہیں ملتی۔"

"آپ موت کا اس طرح ذکر کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت، غم اور ہمدردی سے پوچھا۔

"اس لئے کہ میرے دل سے زندہ رہنے کی خواہش واقعی نکل چکی ہے۔"

وہ کراہ کر رہ گیا۔

"کاکا ـــــ!" میں نے مضبوط آواز میں کہا "خدا کے لئے انکار مت کیجئے۔ مجھے بتایئے، وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے آپ کے دل سے زندہ رہنے کی خواہش نکل گئی۔"

کاکا نے پتھر کی سُسطح چٹان پر کروٹ لی اور پھر تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ میں جواب طلب نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا لیکن وہ خاموش رہا۔ جھیل کی بے قرار موجوں پر نظریں جمائے پتھر کا بُت بنا بیٹھا رہا۔ بڑی دیر کے بعد اُس نے زبان کھولی تو مجھے اُس کی آواز بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔

"تو تم میرے راز کو جاننا چاہتے ہو؟"

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے ململ کے کُرتے کی جیب سے سیاہ چرمی پاکٹ نکالا اور اُسے کھول کر پاسپورٹ سائز کی چند تصویریں نکالیں اور میری طرف کھسک آیا۔

"اس تصویر کو دیکھو اور پہچانو" اُس نے ایک تصویر میری طرف بڑھا دی۔ میں نے حیرت سے دیکھا۔ وہ کسی زمانے کی مشہور فلم اسٹار شیشم کی تصویر تھی جو اب فلموں میں ماں کا رول ادا کرتی تھی۔

"شمعِ محفل بننے سے پہلے شیشم میرے گھر کا چراغ تھی۔ میری باوفا اور نیک بیوی! جو میری پیاری بچّی کی ماں بنی . . . اور پھر فلم اسٹار بنا . . . اور اب

ایک بڑے فلمساز کی بیوی ہے " اُس کی آواز جیسے بہت دُور سے آرہی تھی ـــــ اور یہ میری بیٹی ہے۔ ایک شریف ڈاکٹر کی باوفا بیوی . . . ایک چاند سی بچّی کی مہربان ماں۔ دیکھو، اِسے پہچانو ـــــ !"

اُس نے ایک اور تصویر میری طرف بڑھادی اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میرے ہاتھ میں فلمی دُنیا کی حسین ترین نئی فلم اسٹار فیروزہ کی تصویر تھی جسے پہلی فلم ہی سے مُلک گیر شہرت مل گئی تھی۔ مجھے کاکا کے وجود پر، اُس کی باتوں پر، اِن تصویروں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کاکا شراب کے نشے میں بہک رہا ہے ۔ میں نے سوچا۔

" فیروزہ میری بیٹی . . . میرا خون . . . میری محبت کا تاج محل . . . میری آخری اُمید " بُوڑھا کاکا ڈرامائی انداز میں کہہ رہا تھا " میری بیٹی، جسے میں اب اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتا . . . میری بیوی شیشم جو اب میری بیوی نہیں ہے . . . لیکن میں اب بھی شیشم سے محبت کرتا ہوں . . . اب بھی ـــــ شیشم کے شہر اور فلمی دُنیا سے دُور رہتے ہوئے بھی . . . میں اُس سے محبت کرتا ہوں . . . اِس لئے کہ وہ میری بیٹی فیروزہ کی ماں ہے . . ." وہ دیوانوں کی طرح بڑبڑانے لگا " یہ شہر میرا اپنا شہر ہے۔ میں اِسی خاک سے پیدا ہوا اور اِسی خاک میں ملنے کے لئے پھر اِس شہر میں آگیا ـــــ " وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کھوئے کھوئے لہجے میں کہنے لگا " میری بیوی شیشم نے میری خواہش کا احترام کیا اور میری بچّی کو فلم لائن سے دُور رکھا۔ فیروزہ بڑی ہوئی تو اُس کی شادی ایک شریف اور نوجوان ڈاکٹر سے کردی اور پھر میری بیٹی ماں بنی۔ میں کتنا خوش تھا . . . کتنا خوش " وہ پاگلوں کی طرح چیخ کر بولا " لیکن فیروزہ اپنی ماں کے نقشِ قدم پر چل پڑی۔ وہ بھی فلم اسٹار بن گئی۔ اُس نے اپنے شوہر سے طلاق لی اور اب ایک مشہور ہدایت کار کی بیوی ہے ـــــ فیروزہ میری بیٹی ـــــ !" وہ بُجھے بُجھے سے لہجے میں کہنے لگا " یہ دوسرا داغ ہے میرے دل پر۔ یہ میری دوسری موت ہے۔ میں بار بار مرنا نہیں چاہتا۔ میرے دل میں زندگی کی کوئی خواہش نہیں۔ اب زندہ رہنا حماقت ہے "

ٹوٹتے ہوئے شیشوں اور بُجھتے ہوئے انگاروں کی آوازوں سے میرے کان بج رہے تھے ـــــ میری نگاہیں کاکا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ حسرت و غم میں ڈُوبا ہوا وہ چہرہ مجھے دُنیا کا سب سے زیادہ غمگین اور اُداس چہرہ معلوم ہوا۔ میں نے اُس کی دلجوئی کی اور اُسے اپنے ساتھ شہر لے آیا۔ اُسے اُس کے تنگ و تاریک مختصر سے مکان پر چھوڑ کر جب میں واپس چلنے لگا تو کاکا نے کہا۔

" آپ نے مجھے خودکشی سے بچالیا۔ بہت بہت شکریہ . . . اب مجھے نیند آرہی ہے . . . میں سوجانا چاہتا ہوں . . . میرے محسن خدا حافظ !"

اُس شام کاکا سے ملنے کے لئے میں ہوٹل تاج پہنچا تو وہاں [illegible] کاکا موجود نہیں تھا۔ ہوٹل کے اُس مخصوص گوشے میں جہاں اُس کی نشست تھی، ساتی فضا چھائی ہوئی تھی اور کاکا کے دوستوں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ [illegible] بابو میاں [illegible] کے نشے میں [illegible] بار بار کہہ رہا تھا۔

" کاکا مرگیا ـــــ نیند کی گولیاں اور گلاس بھر [illegible] پانی اور بس . . .
کاکا مرگیا ـــــ ہم غریبوں کا باپ مرگیا ـــــ اب وہ یہاں نہیں [illegible] آئے گا"

" تو ـــــ کاکا مرگیا ـــــ واقعی ؟"

میرے سر پر جیسے ایکدم ساتوں آسمان گر پڑے اور زمین پیروں تلے سے نکل گئی۔ سینے میں تیز بھڑکتی ہوئی آگ اور آنکھوں میں بے شمار آنسو لئے میں دم بخود کھڑا رہ گیا !!

طفیلؔ ہوشیارپوری مدیر "محفل" لاہور

کنول بیٹی کے نام!

مدیر "بیسویں صدی" کی لختِ جگر عزیزہ کنول کی شادی کے موقع پر برادرم حضرت طفیلؔ ہوشیارپوری نے اپنے جریدہ "محفل" لاہور میں "کنول بیٹی کے نام!" ایک پُردرد دعائیہ نظم لکھی ہے جو عزیزی یزدانی جالندھری (جو رنگِ جہاں کی طرح مدیر "بیسویں صدی" کے قریب ہیں) کے محبت آمیز نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس نظم میں ایک درد ہے، محبت ہے، اور غالباً پہلی بار اپنی بھتیجی کی شادی کے موقع پر دلی نہ پہنچنے کے صدمے کا پُرسوز الفاظ میں اظہار ہے۔ طفیل بھائی کے خلوص اور محبت میں کتنی شدت اور گہرائی ہے وہ اس نظم کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ بلاشبہ یہ نظم جذبات و احساسات کی ایک دنیا اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ...... ہم نے اسے کئی بار پُرنم آنکھوں سے پڑھا۔ عزیزہ کنول اور اُس کی والدہ کو بھی سنایا۔ ہمیں ہر بار احساس ہوا کہ ملک تقسیم ہوا ہے، دل تقسیم نہیں ہوئے۔

خوشتر گرامی

تری شادی کا خط دلی سے آیا اور پڑھا بیٹی!
مسرت اور غم کا دل میں اک طوفاں اُٹھا بیٹی

میں اپنے ہاتھ سے آکر بٹھاتا تجھ کو ڈولی میں
مرے ہاتھوں میں ہوتا رُخ اگر حالات کا بیٹی

بھتیجی کی ہو شادی اور چچا شامل نہ ہو پائے
مری تقدیر میں لکھا تھا یہ بھی حادثہ بیٹی

نگاہوں میں اِدھر بچپن کی وہ معصومیت تیری
اُدھر پیشِ نظر خوشترؔ گرامی کی وفا بیٹی

رہا محروم اُس کو بھی مبارکباد دینے سے
نہ تجھ کو بھی دمِ رُخصت دُعائیں دے سکا بیٹی

مجھے جب یہ خیال آیا "پرائی ہو رہی ہے تُو"
مری آنکھوں سے اشکوں کا نہ ٹوٹا سلسلہ بیٹی

پڑی ہیں اِس طرح پاؤں میں مجبوری کی زنجیریں
کہ میرے دل کا ہر ارمان دل میں رہ گیا بیٹی

سجاتا تیری پیشانی پہ سہرا اپنے ہاتھوں سے
تمنا تھی تجھے دُلہن بنی میں دیکھتا بیٹی

بچشمِ نم دُعائیں ہی تجھے اب بھیج سکتا ہوں
نہیں ہے بس میں اپنے اور کچھ اِس کے سوا بیٹی

جواں بیٹی کو اپنے گھر میں رکھ سکتا نہیں کوئی
یہ دستورِ جہاں ہے شوق سے گھر اپنے جا بیٹی

نیا گھر اور نئے گھر کی خوشی تجھ کو مبارک ہو
مگر میری نصیحت کو نہ ہرگز بھولنا بیٹی

سُسر اور ساس کا ماں باپ سے بڑھ کر ادب کرنا
پتی کو جاننا سنسار میں پرماتما بیٹی

بڑوں کے ساتھ جیتے جی کنول! عزت سے پیش آنا
جو چھوٹے ہوں محبت سے دل اُن کے جیتنا بیٹی

رہے پیشِ نظر ہر حال میں کردار سیتا کا
ستی ساوتری کا دھرم دل سے پالنا بیٹی

ہوئی لاہور میں پیدا پلی دلی کی گلیوں میں
بھلا لاہور اور دلی کا ہر دم مانگنا بیٹی

سہیلی کی طرح قسمت تری تجھ پر نچھاور ہو
سُکھی رکھے تجھے سنسار میں پرماتما بیٹی

مرے اشعار میں دل کی دُعائیں بھی ہیں آنسو بھی
طفیلِ بے نوا رکھتا ہے کیا اِس کے سوا بیٹی



سرگرم لوگوں کے لیئے - ہمیشہ تشفی بخش!
انتخابی ہلچل
تم پر ترس آتا ہے۔
آؤ چائے پلائیں۔
یہ لو سیزرز لیجیو،
میں بھی یہی پیتا
ہوں - اس
کے بغیر
میرا کام
نہیں
چلتا۔
آپ انتخاب کی باتیں کر رہے ہیں؟
یہاں تو دھوپ میں پھرتے پھرتے
بخار آگیا ہے۔
اخبار کے
رپورٹر جو ٹھہرے۔
آہا! سیزرز۔
میں بھی تو یہی
پیتا ہوں۔
لاجواب
سگریٹ ہے۔
بالکل! اور کسی
دوسری سگریٹ
میں یہ خوبی کہاں؟
سیزرز
ہمیشہ مزیدار۔
SCISSORS
۱۰ میں ۳۰ پیسے
سیزرز
کے سواد میں ایک
خاصیت ہے۔ یہ
ہمیشہ مزیدار
JWTS 3050

خواجہ احمد عباس سے انٹرویو

نریش کمار شاد

۱۵۔ الیف موتی باغ ۲ نئی دہلی

یکم جولائی ۶۶ء

نوشتہ ہے قلم تسلیم و نیاز

"بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر نظر نواز ہوا جسے اُمید نمبر کیا زریں افسوں افسانہ ہے۔ اُردو کی بہبودی و خوشنودی کے لئے آپ کی کوششیں واقعی مستحق مبارکباد ہیں۔ آئندہ شمارے کے لئے خواجہ احمد عباس سے انٹرویو ارسال کر رہا ہوں

نیاز مند .... نریش کمار شاد

شاد: خواجہ صاحب! آپ سے انٹرویو کا آغاز میں آپ کے متعلق کرشن چندر کی اس رائے کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں جس میں کرشن چندر نے آپ کے افسانے پڑھتا ہوں اور عصمت، بیدی اور منٹو کے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایک خوبصورت رتھ میں بیٹھے چلے جا رہے ہیں اور احمد عباس ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں شعریت ہے، خوبصورتی ہے، پیچ ہے، نقش ہیں، گھونگھرو ہیں، گھنٹیاں ہیں لیکن چال میں قیامت کی سست رفتاری ہے۔ رتھ جگہ جگہ ہچکولے لگتے ہیں۔ لیکن عباس کی تحریر دل میں تجدید ... اس کے قلم میں ربڑ کے ٹائر لگے ہوئے ہیں۔ ہوائی روانی اور سپاری تیز رفتاری دونوں اس میں موجود ہیں ——— کیا خیال ہے آپ کا۔ اپنے مخصوص شاعرانہ انداز سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کرشن یہی کہنا چاہتے ہیں نا کہ آپ کا آرٹ موجودہ مشینی دور کا ہم قدم ہے یا آپ کا فن صحافت سے زیادہ قریب ہے۔

عباس: جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔

شاد: کرشن جی نے جیسا کہ آپ کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہا ہے وہ اپنے بیشتر افسانوں میں بھی ایسی ہی شعریت سے کام چلاتے ہیں۔ اُن کی اس روش کو آپ کس حد تک مستحسن خیال کرتے ہیں؟ کیا نثر نگاری میں یہ شعریت داری کمی یا چھپانے کے لئے ایک پردے کا کام نہیں دیتی؟ شاید اسی لئے کرشن کے اکثر افسانوں کے اگر کئی پیراگراف حذف کر دیئے جائیں جب بھی کسی افسانے کے کسی خیال اور بنیادی میلان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

عباس: PI RFECTION تو یہی ہے کہ آپ افسانہ نگار کے افسانے سے ایک لفظ تک نہ نکال سکیں اور افسانہ نگار دریا کو کوزے میں بند کرنے کا معجزہ دکھائے لیکن کرداروں کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں اور گرد و پیش کا احوال بعض افسانوں میں بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتے ہوئے بھی ضروری ہوتا ہے اور افسانے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ نثر میں شاعری اگر قرینے سے کی جائے تو اُس سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ کرشن نثر میں شاعری رائے شاعری کرتے ہیں جو کبھی کامیاب ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ اپنے ناول "شکست" میں کچھ لوگوں کو گھاس کاٹتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے بڑا پیارا جملہ لکھا ہے۔

وہ گھاس نہیں کاٹ رہے بلکہ مصور اپنا شاہکار تخلیق کر رہا ہے۔

یہاں انھوں نے انسانی محنت کو نہایت بلند درجہ عطا کیا ہے اس لئے اس قسم کی شاعری کبھی کبھی کارآمد بھی ہوتی ہے تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہر افسانہ نگار کو ایک ہی فارمولے سے نہیں لکھنا چاہیئے۔

شاد: ... آپ صحافت اور ادب میں بنیادی طور پر کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

عباس: اچھی صحافت اونچے درجے تک پہنچ کر ادب بن جاتی ہے اور بُرا ادب صحافت محض بن کر رہ جاتا ہے۔

شاد: بہت خوب۔ اچھا جناب! اب یہ بتائیے کہ فلم اور صحافت اور خاص طور پر صحافت سے وابستگی نے آپ کی ادبی تخلیقات پر کیا اثر ڈالا؟

عباس:- فلم نے میری ادبی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں میری مدد کی ہے۔ صحافت نے نسبتاً زیادہ اثر ڈالا ہے۔ کیونکہ جرنلسٹ کی حیثیت سے زندگی کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اِس سے تجربے میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ صحافت سے متعلق ہو کر ایک ادیب اپنے اندر سے جو کچھ نکالتا ہے وہ بیرونی زندگی کے تاثرات ہی کا ردِ عمل ہوتا ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ پورا ادب ہی اِسی نوعیت کا ہو۔ بہت ممکن ہے بہت اچھا ادب اخبار پڑھے بغیر بھی تخلیق ہو سکتا ہو لیکن ایک صنف یہ بھی ہو سکتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔

شاد: آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کیوں کر ہوا ؟

عباس:- ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانے میں جرنلزم سے ہوا۔ جب قومی تحریک زوروں پر تھی اور میں اور میرے ساتھیوں نے ALIGARH OPENION شائع کرنا شروع کیا تھا۔

شاد:- اور آپ فلمی دنیا میں کب اور کن حالات میں داخل ہوئے ؟

عباس:- جب میں فلم میں کام کیا کرتا تھا FILM CRITIC کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ میری تنقیدیں کسی قدر سخت ہوا کرتی تھیں اور اکثر پروڈیوسر اِس اخبار میں اشتہار دینے کے لئے یہی شرط عائد کرتے تھے کہ عباس کو ایسی تنقیدیں لکھنے سے روکا جائے کیونکہ اُسے یہ معلوم ہی نہیں کہ فلمی کہانیوں پر اعتراض کرنا جتنا آسان ہے فلموں کے لئے لکھنا اُتنا ہی مشکل ہے۔ چنانچہ بعد میں جب اِس اخبار کے صرف سنڈے ایڈیشن کی تدوین کا کام میرے سپرد کیا گیا تو میں نے پروڈیوسروں کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے "نیا سنسار" کے نام سے ایک فلمی کہانی لکھی جسے بمبئی ٹاکیز نے پروڈیوس کیا۔

شاد:- اُس کہانی کا موضوع کیا تھا ؟

عباس:- یہ کہانی ایک آزادی پسند اور بیباک جرنلسٹ سے متعلق تھی اور کسی حد تک میری مالی صورت حال کی ترجمان تھی۔

شاد:- فلمی کہانیاں لکھتے لکھتے آپ فلموں کے ڈائرکٹر کیسے بن گئے ؟

عباس:- ڈائرکٹروں نے جب میری لکھی ہوئی کہانیاں توڑ مروڑ کر پیش کیں تو میں نے احتجاج کیا کہ میری کہانیاں مسخ شدہ صورت میں فلمائی جا رہی ہیں۔ اِس مقام پر ڈائرکٹروں نے بھی چیلنج کیا کہ فلمی کہانی لکھنے کی طرح فلموں کی ڈائرکشن سہل نہیں ہے چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سے فلمیں ڈائرکٹ بھی خود ہی کیا کروں گا۔ چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۴۶ء میں پیپلز تھیٹر کی طرف سے دھرتی کے لال میں ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیئے۔

شاد:- اپنے ہم عصر فلمی کہانیاں لکھنے والوں میں کون کون سے لوگ آپ کو پسند ہیں ؟

عباس:- راجندر سنگھ بیدی، اندر راج آنند اور آغا جانی کاشمیری۔

شاد:- اور فلموں کے ڈائرکٹروں میں ؟

عباس:- بنگال کے مرنال سین، ستیہ جیت اور تپن سنہا اور بمبئی میں جو بھارتی فلمیں [illegible] طریقے سے بناتے ہیں اُن میں رشی کیش مکرجی اور راج کپور۔ اگرچہ اُن کی [illegible] پسند نہیں لیکن اُن کی اکثر فلمیں اچھی ہیں۔

شاد:- فلم کو ہمارے یہاں عام طور پر انڈسٹری کہا جاتا ہے کیا آپ بھی فلم کو انڈسٹری ہی سمجھتے ہیں ؟

عباس:- ہرگز نہیں۔ فلم کو انڈسٹری کہنے میں سخت خلاف ہوں۔ [illegible] ہندوستان ہی میں فلم کو انڈسٹری سے موسوم کیا جاتا ہے ورنہ باقی دنیا [illegible] فلم آرٹ ہی کا نام دیا ہے۔

شاد:- آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے ؟

عباس:- ۷ رجون ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں۔

شاد:- تعلیم کہاں سے اور کہاں تک حاصل کی ؟

عباس:- مڈل اسکول تک پانی پت میں۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں بی [illegible] ایل ایل بی کیا۔

شاد:- سب سے پہلا افسانہ آپ نے کب اور کونسا لکھا اور یہ کہاں شائع ہوا ؟

عباس:- پہلا افسانہ ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ اُس کا عنوان تھا "ابابیل"۔ پہلے جامعہ میں اور بعد ازاں بہت سی جگہ اُس کا ترجمہ شائع ہوا۔

شاد:- آپ افسانے کیوں لکھنے لگے ؟

عباس:- اپنے آپ کا اظہار کرنے کے لئے۔

شاد:- اور آپ افسانے لکھتے کیوں کر ہیں ؟

عباس:- ہیئت تو نہیں لیکن [illegible] واقعے [illegible] متاثر ہو کر۔ اگرچہ افسانہ کسی واقعے کی محض رپورٹ نہیں ہوتا [illegible] دینے کے لئے واقعہ ایک STARTING POINT [illegible] بن جاتا ہے۔

شاد:- افسانہ لکھنے کے لئے عموماً آپ کو کیسا ماحول درکار ہوتا ہے ؟

عباس:- چاروں طرف زندگی کا شور ہو مگر اُس وقت ملاقاتی میری طرف مخاطب نہ ہوں بھرے کمرے یاروں کے بیچ میں بیٹھ کر بھی لکھ سکتا ہوں بشرطیکہ کوئی براہِ راست مجھ سے ہم کلام نہ ہو اور مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔

شاد:- کیا افسانہ لکھنے سے پہلے افسانے کا خاکہ آپ کے ذہن میں موجود ہوتا ہے ؟

عباس:- مبہم اور مختصر سا خاکہ ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ اگرچہ لکھتے لکھتے اُس کی صورت بالکل تبدیل بھی ہو جاتی ہے۔

شاد:- اور کیا افسانہ لکھنے سے پہلے اُس [illegible] آپ سوچتے ہیں ؟

عبّاس :- جی ہاں ضرور سوچتا ہوں۔

شاد :- مختصر افسانے کی آپ کے نزدیک مختصر ترین تعریف کیا ہے ؟

عبّاس :- اصلی یا خیالی مختصر واقعے کا مختصر بیان جو تخیّل کی مدد سے مرتب کیا گیا ہو

شاد :- آپ کی نظر میں آپ کے چند بہترین افسانے کون سے ہیں ؟

عبّاس :- اِس کا فیصلہ تو پڑھنے والوں یا ناقدوں کو کرنا چاہیے کیونکہ لکھنے والا تو اپنی ہر چیز کو پسند کرتا ہے۔

شاد :- کیا آپ اپنی کسی ادبی تخلیق پر نادم بھی ہیں !

عباس :- جی نہیں۔

شاد :- آپ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ جس نے آپ کی افسانہ نگاری پر غیر معمولی اثر ڈالا ہو۔

عبّاس :- جب میں سات آٹھ برس کا تھا تو ایک بار پکنک کے طور پر ایک گاؤں میں گیا تھا وہاں جو حالات دیکھے اُن سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ بعد میں پریم چند کے افسانوں کے مطالعے نے اِس تاثر کو اور زیادہ گہرا کر دیا اور مجھے عوام کی زندگی اور اُن کے مسائل سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور میں نے قطعی طور پر طے کر لیا کہ جب تک عوام کی زندگی بہتر نہیں ہو گی ہم بھی چین کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ اسی فیصلے کا اثر ہے کہ میرے افسانوں میں رُومانیت کم اور حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔

شاد :- کن کن ملکی اور غیر ملکی افسانہ نگاروں سے آپ شعوری طور پر متاثر ہیں ؟

عبّاس :- بہت سے افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے۔ پریم چند کے طبع زاد افسانوں کے علاوہ ٹیگور کے افسانوں کے کافی تراجم بھی نظر سے گزرے ہیں۔ غیر ملکی افسانہ نگاروں میں او ہنری، موپاساں، چیخوف، گورکی اور ہیمنگ وے بھی خاص طور پر زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ لیکن میں کسی سے بھی براہِ راست متاثر نہیں ہوا اور اُن میں کسی کی ٹکنیک کو بھی شعوری طور پر اپنانے یا اُسے اپنا ماڈل بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن لاشعوری طور پر ضرور کوئی نہ کوئی اثر قبول کیا ہو گا۔

شاد :- ہم عصر افسانہ نگاروں میں آپ کے پسندیدہ افسانہ نگار کون کون سے ہیں ؟

عبّاس :- زندوں میں کرشن، بیدی، عصمت اور قرۃ العین حیدر اور تھوڑے دنوں سے رام لعل۔ اگرچہ اسے فائنل جج منٹ قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن بلا شبہ میرے نزدیک یہ لوگ اچھے افسانے لکھ رہے ہیں۔

شاد :- اور مرحوم ہم عصر افسانہ نگاروں میں ؟

عبّاس :- سعادت حسن منٹو۔

شاد :- پریم چند کے بعد آپ اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کسے مانتے ہیں ؟

عبّاس :- کوئی ایک افسانہ نگار نہیں بلکہ تین چار افسانہ نگار ہیں جو آج سب سے اچھے افسانہ نگار کہے جا سکتے ہیں اگرچہ اُن میں کوئی پریم چند کے درجے تک نہیں پہنچا۔

شاد :- اِس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارا کوئی بہترین افسانہ نگار پریم چند کے درجے تک نہیں پہنچا۔

عبّاس :- بات یہ ہے کہ پریم چند کی عظمت اُن کے دو تین افسانوں پر نہیں بلکہ زندگی میں اُن کے کئی کام پر مبنی ہے۔ اُن کے اور قومی زندگی کے درمیان جو براہِ راست تعلق تھا اپنے افسانوں میں وہ اُس کی ترجمانی کرتے تھے۔ موجودہ افسانہ نگاروں میں اِس حد تک کوئی ترجمان نہیں ہے۔

شاد :- کیا خیال ہے آپ کا تقسیم وطن کے بعد سے اُردو افسانے کی ٹکنیک میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی ہے یا نہیں ؟

عبّاس :- جی ہاں میرے خیال میں ہوئی ہے۔ بہت سے لوگ مغربی افسانہ نگاروں سے متاثر ہو کر تجربے کر رہے ہیں جن میں کچھ دلچسپ اور عمدہ ہیں اور افسانوں میں گہرائی اور وسعت پیدا کرتے ہیں انھیں میں پسند کرتا ہوں لیکن وہ تجربے جو افسانے میں ابہام پیدا کرتے ہیں مجھے پسند نہیں

شاد :- آپ کے خیال میں اُردو کا نیا افسانہ نگار فراریت اور یاسیت کا شکار کیوں ہے ؟

عبّاس :- اِس لئے کہ آج کے نوجوانوں کی زندگی میں یہ چیزیں پائی جاتی ہیں لیکن ایک افسانہ نگار کو اُن چیزوں کا شکار نہیں بلکہ اُن پر حاوی ہونا چاہیے کیونکہ اُس کا فرض زندگی کو آئینہ دکھانا ہی نہیں بلکہ اِسے بہتر بنانا بھی ہے۔

شاد :- اچھا یہ فرمایئے کیا اُردو افسانہ اِس قابل ہے کہ اسے دنیا کی دوسری متمدن زبانوں کے افسانوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکے ؟

عبّاس :- بے شک اُردو میں ایسے افسانے ہیں جنھیں بہ آسانی دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

شاد :- مثلاً ؟

عبّاس :- مثلاً طویل افسانوں میں راجندر سنگھ بیدی کا "ایک چادر میلی سی" اور "یادوں کے چنار" ... یادوں سے متعلق کرشن چندر کے افسانے اور منٹو کے کئی افسانے۔

شاد :- افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے علاوہ آپ کو ادب کی دوسری اصناف سے کس حد تک دلچسپی ہے ؟

عبّاس :- اچھی شاعری پڑھنا اور سُننا بہت مرغوب ہے لیکن اِتنا وقت نہیں ملتا جتنا جی چاہتا ہے اور میں فلمیں لکھنا بھی میں ادب ہی کا ایک حصّہ سمجھتا ہوں۔

شاد :- کیا ہمارا موجودہ ادب جمود کا شکار ہے ؟

عبّاس :- جمود کا تو نہیں البتہ موجودہ ادب افراتفری کا شکار ہے۔ لکھنے کو تو بہت کچھ لکھا جا رہا ہے بہت سے نئے نئے تجربے بھی ہو رہے ہیں جن میں بعض اچھے اور بعض ۔

بڑے بھی ہیں۔

شاد :- تو پھر یہ جمود کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا ۔

عباس :- کیونکہ ادبی تحریک کی کوئی واضح منزل نہیں ہے ۔ ادب آج ذہنی افلاس ہے جس کا ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ مجموعی طور پر ادب میں لو ناشی زیادہ اور ٹولی ٹولی ہو گئی ہے اور بعض لوگ اس لئے بھی ادب پر جمود کا الزام لگاتے ہیں کہ اُن کے محبوب ادیبوں نے لکھنا بند کر دیا ہے ۔

شاد :- آپ ادب میں مقصدیت اور افادیت کے کس حد تک قائل ہیں ؟

عباس :- بہت حد تک قائل ہوں لیکن اس حد تک نہیں کہ ادبی قدروں کو نظر انداز کر کے ادب کو محض پروپیگنڈہ بنا دیا جائے ۔

شاد :- اور ادب کی ترقی پسند تحریک سے آپ کہاں تک متاثر اور متعلق ہیں ؟

عباس :- اگرچہ ۱۹۳۶ء کی پہلی کانفرنس میں شریک نہیں تھا تاہم اس تحریک سے شروع ہی سے وابستہ رہا ہوں

شاد :- کیا اب یہ تحریک ختم ہو چکی ہے ؟

عباس :- تنظیم ختم ہو چکی ہے لیکن تحریک نہیں، جب تک لکھنے والے موجود ہیں تحریک بھی باقی رہے گی۔

شاد :- آپ کے نزدیک اس تحریک نے ادب میں کیا رول ادا کیا ہے ؟

عباس :- جب یہ تحریک وقتی سیاسی گروپ بندی سے پاک تھی تو اس نے بہت سے اچھے لکھنے والوں کو پیدا کیا اور اُن سے بہت اچھی چیزیں لکھوائیں ۔

شاد :- آپ کا سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر کیا ہے ؟

عباس :- سوشلزم پر اعتقاد رکھتا ہوں لیکن سوشلزم کی کسی تھیوری یا اس کے کسی نظریہ کو اپنا ایمان نہیں سمجھتا ہوں ۔ مذہب کو ہر انسان کا ذاتی مسئلہ خیال کرتا ہوں یعنی پبلک مذہب کے سخت خلاف ہوں اور دنیا کے جتنے بڑے مذاہب ہیں اُن کی رُوح کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ انسان کی بہبودی کے لئے ہیں لیکن انھیں غلط ڈھنگ سے استعمال کیا گیا ہے ۔ میں عوام میں مذہب کی نمائش کو نہایت مذموم خیال کرتا ہوں اور جو مذہب انسان کو انسان سے جُدا کرے اُسے بھی نہیں مانتا ہوں ۔

شاد :- تخلیقِ ادب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے ادیب کو یک گونہ ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے ۔ آپ اس پہلو کو کہاں تک اہمیت دیتے ہیں ؟

عباس :- بہت بڑی حد تک اہمیت دیتا ہوں کیونکہ اچھی چیز لکھنا ہی بذاتِ خود ادیب کی محنت کا انعام ہوتا ہے ۔ لکھنے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے وقت اور اپنی قابلیت کو اچھے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے لیکن صرف ادیب ہی کو کیوں ؟ سننے والوں کو بھی تخلیق کا لطف حاصل ہوتا ہے جیسے کسی خوبصورت لڑکی کا لباس آرائش سے مزین ہو ۔۔۔ ولی ہی ۔۔۔ انھیں بھی تاثر ہوتا ہے ۔

شاد :- آپ کی رائے میں ہمارا نصب العین کیا ہونا چاہیے ؟

عباس :- انسان کی سماجی اور ذاتی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم انسانی نفسیات اور سماج کے اصول دونوں کو سمجھ سکیں ۔

شاد :- آخر میں صرف یہ اور بتا دیجئے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اُردو ادب کا مستقبل کیا ہے ؟

عباس :- میرے خیال میں اُردو زبان کا مستقبل تو ایسا ہی ہے جیسا ہندوستان کی دوسری زبانوں کا ۔ البتہ رسم الخط کا مستقبل تاریک ہے ۔ موجودہ رسم الخط کچھ برسوں میں ختم ہو جائے گا اور اس وقت تک اُردو ادب ہندوستانی ادب کا کافی اہم حصہ بن جائے گا ۔

افسانہ

بہروپ

م۔ صبوحی

ورنگل دروازہ ۳-۱۲-۸۵، راجگور (؟) ...

۱۲ مئی ۶۶ء

محترمی!

میرے بیٹے کو نور رتنا کی تصویر کرکے اپنی بگڑتی ہوئی تقدیر پہ ہنستا ہوں میں

کچھ ایسا ہی دور ہے۔ ایسا ہی [illegible] ہے جو اس "بہروپ" میں سمٹ آیا ہے۔ آپ کو کیسی معلوم ہوئی

یہ کہانی؟ پسند نہ آئے تو واپس بھیج دیجئے۔ [illegible] لئے لکھ رہی ہوں کہ یہ کہانی کس لئے ہے۔ مجھے اب تک آپ کی

رائے یا رسید نہیں ملی ہے ...

م۔ صبوحی

ٹرین پلیٹ فارم پر رُکی ہی تھی کہ اُس نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ اُف! [illegible] شور و شر! اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر جیسے سوچنے لگی۔ زندگی کے سفر میں کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں آتا کہ انسان اتنے ہنگاموں سے گھبرا جائے لیکن یہ ...

لیکن نہیں، اُس نے [illegible] سوچا۔ زندگی تو ساری انہی پر ہنگامہ لمحات کا [illegible] اور بات ہے کہ آج اِس سکوت [illegible] خودشی کے احساس کو اُس کے ذہن سے مٹا دیا تھا اُس نے [illegible] جھٹک کر اِن خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہا۔ کھڑکی کے شیشے پر اپنی پیشانی ٹیک دی [illegible] یکایک اُس کا دل کانپ کانپ کر اُس [illegible] قدم [illegible] کوشش کرنے لگا جس کے پیروں کی چاپ [illegible] دروازے کے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی [illegible] اُن آوازوں سے پوچھا۔

"میرے دل کی زمین پر جن قدموں نے نشان چھوڑے تھے [illegible] یہاں سے چرالئے؟ کہاں سے چرالئے؟" اُس کا دل دھڑک دھڑک کر جیسے تھم گیا۔ [illegible] حرکت میں آگئی اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ٹرین کی [illegible] گڑگڑاہٹ اُس کے [illegible] پر ہتھوڑے برسا رہی ہو۔ وہ اپنے آپ میں کھوئے ہوئے [illegible] آہستگی سے داخل ہوا تھا۔ دروازہ بند کیا اور سامنے ہی کی برتھ پر بیٹھ گیا ٹِک لگا کے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ اُس نے کسی طرف دیکھا بھی تو نہیں۔ کسی پر ایک نظر بھی تو نہ ڈالی۔

"رضوان!" جیسے اُس کے لب کپکپا سے اُٹھے لیکن اُس کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

اُس کا جی چاہا رضوان کو پکڑ کر جھنجھوڑ دے۔ اُس کی گود میں سر رکھ کے۔ ایک بار پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ برسوں سے جو غبار اُس کے دل پر چھایا ہوا ہے وہ دھو ڈالے۔ لیکن رضوان، وہ نہ جانے کن خیالوں کو ہم سفر بنائے اپنے سر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے یوں بے حس و حرکت بیٹھا تھا جیسے پیک شدہ سامان ہو۔ اُس کے بال گردن تک [illegible] بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ چہرے پر شہر کی ساری سڑکوں کا غبار چھپا ہوا تھا۔ [illegible] کپڑوں میں ملبوس وہ رضوان ہرگز نہ تھا۔ وہ تو کوئی اور تھا [illegible] رضوان کا [illegible] ہو [illegible]۔

[illegible] بچے کو لحاف اُڑھایا اور اُس کے منہ سے نکل گیا۔

[illegible] چاروں طرف جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اور پھر [illegible] رضوان [illegible] ساکت ہو گئیں۔

وہ [illegible] میں ... میں ... دراصل ... میرا یہ بچہ ہے جس کا نام ...

تو [illegible] رضوان احمد کہتے ہیں!" رضوان کے لہجے کی [illegible] یوں بدل جانے کے باوجود تم رضوان [illegible] جیسے بہت کچھ ضبط کر رہی ہو اور بہت آہستگی سے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے رضوان!" رضوان نے سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ

بڑے بھی ہیں۔

شاد:۔ تو پھر یہ جمود کا مسئلہ پیدا کیوں ہوا؟

عباس:۔ کیونکہ ادبی تحریک کی کوئی واضح شکل نہیں ہے۔ [illegible] جس کا ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ [illegible] ہو گئی ہے اور بعض لوگ اس لئے بھی ادب پر جمود کا الزام لگاتے ہیں کہ اُن کے محبوب ادیبوں نے لکھنا بند کر دیا ہے۔

شاد:۔ آپ ادب میں مقصدیت اور افادیت کے کس حد تک قائل ہیں؟

عباس:۔ بہت حد تک قائل ہوں لیکن اس حد تک نہیں کہ ادبی قدروں کو نظر انداز کر کے ادب کو محض پروپگینڈہ بنا دیا جائے۔

شاد:۔ اور ادب کی ترقی پسند تحریک سے آپ کہاں تک متاثر اور متعلق ہیں؟

عباس:۔ اگرچہ ۱۹۳۶ء کی پہلی کانفرنس میں شریک نہیں تھا تاہم اس تحریک سے شروع ہی سے وابستہ رہا ہوں

شاد:۔ کیا اب یہ تحریک ختم ہو چکی ہے؟

عباس:۔ تنظیم ختم ہو چکی ہے لیکن تحریک نہیں، جب تک لکھنے والے موجود ہیں تحریک بھی باقی رہے گی

شاد:۔ آپ کے نزدیک اس تحریک نے ادب میں کیا رول ادا کیا ہے؟

عباس:۔ جب یہ تحریک وقتی سیاسی گروپ بندی سے پاک تھی تو اس نے بہت سے اچھے لکھنے والوں کو انسپائر کیا اور اُن سے بہت اچھی چیزیں لکھوائیں۔

شاد:۔ آپ کا سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر کیا ہے؟

عباس:۔ سوشلزم پر اعتقاد رکھتا ہوں لیکن سوشلزم کی کسی تھیوری یا اس کے کسی نظریہ کو اپنا ایمان نہیں سمجھتا ہوں۔ مذہب کو ہر انسان کا ذاتی مسئلہ خیال کرتا ہوں یعنی پبلک مذہب کے سخت خلاف ہوں اور دنیا کے جتنے بڑے مذاہب ہیں اُن کی رُوح کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ انسان کی بہبُودی کے لئے ہیں لیکن انھیں غلط ڈھنگ سے استعمال کیا گیا ہے۔ بین عوام میں مذہب کی نمائش کو نہایت مذموم خیال کرتا ہوں اور جو مذہب انسان کو انسان سے جُدا کرے اُسے بھی نہیں مانتا ہوں۔

شاد:۔ تخلیقِ ادب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے ادیب کو ایک گونہ ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ آپ اس پہلو کو کہاں تک اہمیت دیتے ہیں؟

عباس:۔ بہت بڑی حد تک اہمیت دیتا ہوں کیونکہ اچھی چیز لکھنا ہی بذاتِ خود ادیب کی محنت کا انعام ہوتا ہے۔ لکھنے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے وقت اور اپنی قابلیت کو اچھے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے لیکن صرف ادیب ہی [illegible] ہوتا ہے جیسے کسی ڈاکٹر کو مریض [illegible] آپریشن کرنے [illegible] بچ [illegible] ہوتے ہیں

شاد:۔ آپ کی رائے میں [illegible] ادب کیا ہونا چاہیئے؟

عباس:۔ انسان کی سماجی اور ذاتی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے والا [illegible] وقت ممکن ہے جب ہم انسانی نفسیات اور سماج کے اصول دونوں کو سمجھ سکیں۔

شاد:۔ آخر میں صاف صاف [illegible] بتائیے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

عباس:۔ میرے خیال میں اُردو زبان کا مستقبل تو ایسا ہی ہے جیسا ہندوستان کی دوسری زبانوں کا۔ البتہ رسم الخط کا مستقبل تاریک ہے۔ موجودہ رسم الخط کچھ برسوں میں ختم ہو جائے گا اور اُس وقت تک اُردو ادب ہندوستانی ادب کا کافی اہم حصہ بن جائے گا۔

بہروپ

م۔ صبوحی

نورنگ دروازہ ۳-۲-۸۵، رائچور (میسور)

۱۲ مئی ۶۶ء

محترمی!

میرے بیٹے کو تو … بنا ہی تصور کرنے … اپنی بگڑی ہوئی تقدیر پہ ہنستا ہوں میں

کچھ ایسا ہی [illegible] … جو اس "بہروپ" میں … آپ کو کیسی معلوم ہوئی یہ کہانی؟ پسند نہ آئے تو … دیکھئے … اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ بہاں … مجھے اب تک آپ کی رائے یا رسید نہیں ملی ہے۔

—— م۔ صبوحی

ٹرین پلیٹ فارم پر رکی ہی تھی کہ اس نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ اف! اتنا شور و شر! اس نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر جیسے سوچنے لگی۔ زندگی کے سفر میں کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں آتا کہ انسان اتنے ہنگاموں سے کھو جائے لیکن … نہیں نہیں، اس نے فوراً سوچا۔ زندگی تو سب انہی پر ہنگامہ لمحات کا … اور … کہ آج اس سکوت … خوشی کے … احساس کو اس کے ذہن سے … اس نے سر جھٹک کر ان خیالوں سے پیچھا چھڑانا چاہا … کے شیشے پر … پیشانی ٹیک دی … یکبارگی اس کا دل کاسپ کانپ کر … کوشش کرنے لگا جس کے … دروازے کے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی … ان آوازوں سے پوچھا۔

"میرے دل کی زمین پر جن قدموں نے نشان چھوڑے تھے … انہوں نے یہاں سے چرا لئے؟ کہاں سے چرا لئے؟" اس کا دل … کر جیسے تھم گیا۔ ٹرین حرکت میں آ گئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے ٹرین کی … گڑگڑاہٹ اس کے سر پہ ہتھوڑے برسا رہی ہو۔ وہ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی … داخل ہوا تھا۔ دروازہ بند کیا اور سامنے ہی کی برتھ پر بیٹھ گیا "ٹیک لگا کے۔ آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے کسی طرف دیکھا بھی تو نہیں۔ کسی پر ایک نظر بھی تو نہ ڈالی۔

"رضوان!" جیسے اس کے لب کپکپا سے اٹھے لیکن اس کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

اس کا جی چاہا رضوان کو پکڑ کر جھنجھوڑ دے۔ اس کی گود میں سر رکھے۔ ایک بار پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ برسوں سے جو غبار اس کے دل پر چھایا ہوا ہے وہ دھو ڈالے۔ لیکن رضوان … وہ نہ جانے کن خیالوں کو ہم سفر بنائے اپنے سر کے پیچھے دونوں ہاتھ باندھے … جیسے پیک شدہ سامان ہو۔ اس کے بال گردن تک … چہرے پر شہر کی ساری سڑکوں کا … وہ رضوان ہرگز نہ تھا۔ وہ تو کروتی اور … اور … نہیں۔

"رضوان!" … بچے … آنکھیں اٹھایا اور اس کے منہ سے نکل گیا۔ … چاروں طرف جیسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اور پھر … ہو گئیں۔

… میں … دراصل … میرا بچہ … جس کا نام …

"… رضوان احمد کہتے ہیں!" رضوان کے لہجے کی … اور … یوں بدل جانے کے باوجود تم رضوان … جیسے بہت کچھ ضبط کر رہی ہو اور بہت آہستگی سے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے رضوان!" رضوان نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ

سُرخ ساڑی میں ملبوس تھی۔ کندھوں پر قیمتی سیاہ شال تھی۔ گلے میں جڑاؤ نکلس جگمگا رہا تھا۔ جُوڑے میں سُرخ گلاب کِھلا تھا۔ ہونٹوں پر اُس سے گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا لیکن آنکھیں۔۔ شاید یہاں ابھی ابھی ماضی کی یادوں کے بُجھے ہوئے دیپ کہیں جھلملائے تھے۔ بہت اُداسی لرزاں تھی ــــــ رضوان نے مُنہ پھیر لیا۔

"اگر میں یہ پُوچھوں رضوان کہ آپ اب بھی اِتنے غمگین کیوں ہیں تو ــــ؟"

اُس نے رضوان کی تلخیوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"اوہ!" رضوان ہنس دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو: غمگین کہاں میں تو ہنس رہا ہوں ــــ کہنے لگا۔

"اگر میں پوچھوں کہ آپ سراپا مسرت نظر آرہی ہیں کیوں؟ تو آپ کے پاس اِس کا کیا جواب ہے؟"

✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚

- جنھیں خدا کی ذات پر پُورا بھروسہ اور کامل اعتماد ہے، وہ کسی مصیبت سے نہیں گھبراتے۔ (گورو گرنتھ صاحب)
- گدھے کو چندن سے بھر دو لیکن وہ اِس سے اِتنا خوش نہیں ہوگا جتنا دھُول مٹّی میں لوٹ کر خوش ہوتا ہے۔ دُنیا پرست آدمی اِس سے بھی گیا گزرا ہے کہ وہ فانی نعمتوں ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ (گورو گرنتھ صاحب)
- جو اپنی خطا کا اقرار کرے اور آئندہ اُس سے بچتا ہے تو اُس کے گُناہ کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ (گوتم بُدھ)
- دل سے یا بے دلی سے، جیسے بن پڑے۔ زمین پر بکھرے ہوئے سبھی دانے اُگ آتے ہیں۔ (بابا تُلسی داس)

✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚✚

"میرے پاس اِس کا جواب ہے رضوان! کیا تم نے محسوس نہ کیا کہ ہم سب بہرُوپیے ہیں۔"

"لیکن میں اپنی زندگی کے تمام خدوخال آپ کے سامنے عریاں کئے بیٹھا ہوں محترمہ! میرے پاس کوئی بہرُوپ، کوئی نقاب، کوئی لیبل نہیں ہے سمجھیں؟"

"مگر۔۔ میری سُنئے تو آپ کو اب تک سب کچھ بُھلا دینا چاہئے تھا۔ اِتنا غم نہیں کرنا چاہئے۔۔"

"آپ کے کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ بے حد اُداس ہوں۔ اِتنا کہ شاید کوئی احساس نہ کر سکے۔"

"لیکن۔۔۔ تم بھُولتے کیوں نہیں رضوان! مجھے دیکھو ــــ جی کھول کر قہقہے لگاتی ہوں، مُسکراتی ہوں، زندگی کی ساری رعنائیوں کے ساتھ ہوں اور۔۔"

وہ بات ختم نہ کر سکی شیشے کے پار اُسے جیسے کچھ نظر آگیا ہو۔ اُس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ ٹرین کسی پُل پر سے گزر رہی تھی۔ ٹھاٹھیں مارتا پانی چاندنی میں چمک رہا تھا، اُبل رہا تھا۔ جیسے اُس سے کہہ رہا تھا ــــ قہقہے لگانے کی چیز نہیں، مُسکراہٹیں بکھیری نہیں جاتیں یہ تو اپنے آپ اُبلتے ہیں۔ یہ تو خود ہیں۔۔"

"شاید ہم حسین ساگر کے پُل پر سے گزر رہے ہیں۔ کتنا شور ہے پانی میں!" رضوان نے باہر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُنگلیوں کا سگریٹ باہر پھینک دیا۔

"سوچتی ہوں رضوان! انسان کے دل میں یہ جو شور ہے نا! ٹھاٹھیں مارتا ہوا غم کا جذبہ ہے نا! کاش یہ بھی محسوس کیا جا سکتا، دیکھا جا سکتا۔ لیکن ہم نہ جانے اِس غم پر کتنے بلند بلند اور اونچے اونچے پُل بنا لیتے ہیں کہ اوپر سے کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔"

"مجھے دیکھئے نا! میں نے اپنے غموں پر کوئی پُل بنایا ہی نہیں ہے ضرورت ہی کیا ہے جیسا بھی ہوں سامنے ہوں۔" رضوان نے جیسے اپنی شناسائی۔

"یہ تمھاری نادانی ہے رضوان! تمھیں چاہئے تھا کہ تم کسی سے۔۔"

"رُک جایئے۔۔۔ مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنے والی ہیں۔ اِتنا ناسمجھ بھی نہیں ہوں کہ یہ نہیں جانتا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے ــــ میں نے اپنی اِس گزری زندگی میں آج تک سب کچھ کر لیا ہے اب کوئی حسرت باقی نہیں ہے"

"تم نے کچھ نہیں کیا، تم نے کچھ نہ کیا رضوان!"

"غلط ہے" ــــ رضوان نے برتھ پر اپنے پیر پھیلا دیئے سگریٹ جلا کر ایک طویل کش لیا، دھُواں اُڑایا۔ کچھ بَول گیا اور بہت آہستگی سے کہنے لگا "میں نے سب کچھ کر لیا ہے یقیناً! میں نے محبت کی ہے، میں نے پیار کیا ہے، میں نے۔۔"

"نئی بات نہیں۔ یہ سب مجھے معلوم ہے رضوان کہ تم نے مجھ سے محبت کی تھی۔۔" وہ اپنے بچّے کو گرم شال سے ڈھانکنے لگی۔

"کی تھی، کیا مطلب؟ ــــ اب بھی کرتا ہوں بیٹی! تم گھبراؤ نہیں۔ اگر میں کہہ دوں کہ اب مجھے تم سے محبت نہیں ہے تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا وہ یادیں، وہ جذبات جو دل و دماغ کے ہر گوشے میں جاگ رہی ہیں دفن ہو سکتی ہیں؟ محبت کے یہ جذبے تو دل کی دُنیا میں خضر کی عمر لے کر آتے ہیں بیٹی! اِن کی موت کیسی، خاتمہ کیسا؟ ــــ لیکن کیا کروں کہ تم بے وفا نکلیں"

"رضوان! اگر وفا کا مطلب اپنے محبوب سے شادی کر لینا ہی ہے تو یقیناً میں بے وفا ہوں ورنہ میں تو وہ وفا پرست ہوں رضوان کہ آج۔۔"

"کہ آج میری گود میں یہ بچّہ ہے جس کا نام میں نے رضوان رکھ دیا ہے تاکہ مجھ سے کہہ سکو کہ دیکھو میرے لبوں پر اب بھی تمھارا نام ہے، چاہے کسی شکل میں کسی

خیال میں کیوں نہ ہو، ہے نا ۔۔۔۔۔" رضوان نے بڑی تضحیک اور بڑے طنزیہ انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں رضوان! یہ نام میں نے نہیں رکھا تھا۔ میں نے تمھاری ہر شے اپنی دُنیا سے نکال دی۔ سب کچھ اپنے سینے میں دفن کر لیا۔ یہ نام رکھ کر کیوں ایک کسک پیدا کر لیتی۔ یہ تو سعید نے رکھا ہے۔"

"شاید اُس بیچارے کو معلوم نہیں کہ یہ نام تمھارے دل کا جاگتا درد ہے۔"

"اسی کو کیا دُنیا میں تمھارے اور میرے سوا اور جانتا ہی کون ہے کہ ہم نے کیا چاہا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے نیشی! دُنیا جان گئی تھی، جان سکتی تھی لیکن تم نے چھپا دیا۔ تاکہ تمھیں ایک انجینئر شوہر مل سکے۔"

"رضوان تم . . ."

"اب کچھ نہ کہو نیشی! میں جانتا ہوں تمھیں ایک انجینئر شوہر کی تلاش تھی جو قیمتی پتھر اور نگینے کا نکلس تمھارے گلے میں پہنا سکے۔ تم نے تو یوں ہی ہانپتی کانپتی میرے ویرانوں میں دم لیا تھا۔ اپنی سانسوں سے مسکراہٹوں کے ہزاروں پھول کھلا دئے اور پھر چپکے سے ایک دن اپنا دامن سمیٹا اور چل دیں ۔۔۔۔۔ تمھیں کیا معلوم کہ میں اپنے جلتے آشیانے کو کب تک دیکھا کیا۔ تمھیں کیا پتہ کہ اپنی یادوں کی محرابوں میں کب تک آنسوؤں کے دیپ جلاتا رہا ۔۔۔۔۔ اب ۔۔۔۔۔ اب میری آنکھوں میں آنسو نہیں پتھر ہیں نیشی! تم نے محبت نہ کی کوئی کھیل کھیلا تھا! میں نے بھی آنسو بہانے چھوڑ دئے اور آج . . ."

"تم سمجھتے کیوں نہیں رضوان! . . . میں نے تو . . . میں نے تو . . ."

"رُک جاؤ نیشی! آگے کچھ نہ کہو۔ میں نہیں چاہتا کہ جہاں تمھارے ہزاروں خوبصورت گناہ ہیں وہاں ایک جھوٹ کا اضافہ بھی ہو جائے۔ سُنا ہے کہ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ اُس کے پاس بہت کچھ ہے تمھیں دینے کے لئے۔ دولت کے وہ جیٹ جہاز جو تمھارے ایک اشارے پر پرواز کر کے آسمان سے ستارے توڑ کر لا سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ تمھارے خیالوں کا جیون ہے یا نہیں لیکن ایک عام سی لڑکی کے عام سے سپنوں کی تعبیر ضرور ہے۔"

"لیکن میں وہ تو نہ تھی . . . میرے خیالات وہ تو نہ تھے . . ."

"تم وہ نہ تھیں، تمھارے خیالات وہ نہ رہے ہوں لیکن تم عورت ضرور ہو۔ اور عورت جس کا دامن ہمیشہ نمائشی زندگی اور دکھاوے کے لئے داغدار ہوا ہے۔"

"ہوگا رضوان! یہ باتیں چھوڑو۔ تم پروفیسر ضرور بن گئے ہو لیکن تم صرف کتابوں کو سمجھ سکتے ہو انسان کے دل کو نہیں۔ انسان کا دل تو ایک ایسی کتاب ہے جہاں وقت الفاظ کو متحرک کر دیتا ہے۔ متحرک چیزوں کی اصلیت کو تم کیسے پا سکوگے؟ لیکن تمھیں چاہئے کہ اب اپنی زندگی کو سنوار لو۔ میرے غم میں یوں تباہ کب تک رہ سکوگے؟"

"اوہ!" رضوان ہنسنے لگا "تمھارا غم اور تباہی؟ یہ غلط فہمی اب ٹھیک نہیں نیشی! ویسے جی بہت چاہتا ہے کہ تمھاری طرح مُسکرا مُسکرا کر دُنیا کی خوشیوں سے لپٹ لپٹ جاؤں لیکن سوچتا ہوں یہ کام تم سے محبت نہ ہوتی تب ہی ہو سکتا تھا۔ کس نے کہا تھا مجھ سے کہ تمھیں اپنی زندگی تصور کر لوں اور تم میرے جیون کے لق و دق راستے پر اپنی مہک لُٹاتی چلی جاؤ اور پھر میں تمھیں اپنے خوبصورت ماضی کا خوبصورت تصور بنا لوں۔ تمھاری حسین یادوں کو رختِ سفر بنا کر صحرا نوردی سے رشتہ جوڑ لوں ۔۔۔۔۔ اگر ایسے میں کوئی روک کر مجھ سے پوچھتا کہ تم میری کون تھیں؟ تمھارا

- مُسکراؤ، جب بھی موقع ملے۔ موقع کی مُسکراہٹ ہی جیت ہے۔
(ڈاکٹر مارڈن)
- کامیابی اور ناکامی کے مابین صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ کامیاب انسان بالکل صحیح طریقے استعمال کرتا ہے اور ناکام منزل تک پہنچنے کے صحیح راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ (ای۔سی۔سیمونس)
- کامیابی عموماً انسان کے اِس علم پر منحصر ہوتی ہے کہ اُسے منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ (مون ٹیگو)
- ناکامی سے محفوظ رہنے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ انسان کامیاب ہونے کا عزمِ صمیم کر لے۔ (شیریڈان)

اور میرا کیا رشتہ تھا۔ کیا کوئی کھیل تھا جو ختم ہو گیا تب؟ ۔۔۔۔۔ تب کیا کہتا میں نیشی! کیا تمھاری طرح کہہ دیتا کہ "میں کسی نیشی کو نہیں جانتا چلے جاؤ یہاں سے؟"

"رضوان! یوں زخم گہرے تو نہ کرو۔ تمھیں کیا معلوم کہ میرا سینہ ایک قبرستان بن گیا ہے۔ کتنے بھیانک راز یہاں دفن ہیں۔ اگر کہہ دوں تو کانپ کانپ جاؤ گے!"

"یہی راز نا کہ تم نے اپنے بھابی کے بھائی سے شادی کر لی۔ دُنیا میں اِس سے بڑھ کر اور کوئی راز نہیں نیشی جو مجھے جلا کر رکھ دے۔ میں پوچھتا ہوں تم نے ایسا کیوں کیا نیشی! ۔۔۔ کیوں کیا؟"

"مجھے بے وفا سمجھ کر تمھارے لئے جینا آسان ہے رضوان! اگر تمھیں اِس بات پر یقین آ جائے۔ اگر میں کہہ دوں کہ میں نے تمھارے ساتھ کوئی بیوفائی نہیں کی ہے

اگر میں وہ راز اُگل دوں تو تم مجھ سے نفرت کر سکو گے نہ محبت ـــــ تم پاگل ہو جاؤ گے رضوان !"

"مجھے معلوم ہے تم باتیں بہت اچھی کر لیتی ہو، لفاظی میں ماہر ہو ـــ ہنھ ! بے وفا !" رضوان نے دانت کٹکٹاتے ہوئے اُگلا۔

"رضوان !" وہ کانپ گئی۔ اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ جیسے سِسک پڑی۔ رضوان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ غم و غصہ سے اُن کی سانسیں تیز چل رہی تھیں۔ اپنی مٹھیوں کو جکڑے وہ کہنے لگا۔

"میرے دل کا یہ عالم ہے نیشی ! کہ چیخ چیخ کر تمھاری محبت کا اقرار کرتا ہوں۔ اور پھر رو رو کر کہتا ہوں کہ تم نے بے وفائی کی ہے، تم نے بے وفائی کی ہے ــــ اور پھر چاہتا ہوں کہ دُنیا کے ہر راگ رنگ میں ڈوب کر تم سے کہہ دوں، تمھیں بتا دوں کہ تمھیں کھو کر مجھے کوئی رنج نہیں، کوئی غم نہیں، تمھیں احساس دلا دوں کہ تم نے میری زندگی سے پلٹ کر مجھے کسی خسارہ میں نہیں ڈالا ہے اور سچ مچ میں نقصان میں نہیں۔ تم نے میرے سینے کو جب داغ دے دیئے نا تو اُن داغوں کو مٹانے کے لئے میں نے خوشیوں کے ہر دیوتا کو اپنی زندگی کے مندر میں نصب کر لیا ہے۔ مجھے تمھارا کوئی غم، کوئی دُکھ نہیں۔ تمھاری بے وفائی کا بدلہ قہقہے لگا کر لے رہا ہوں ـــــ"

"تو ... تو ... پھر ٹھیک ہے ... اچھا ہی ہے ... میں بھی یہی چاہتی ہوں ... لیکن آج کی یہ شکل ... یہ ہیئت ... یہ بے ترتیبی ... یہ سب کیا ہے ؟"

اُس نے رُک رُک کر اپنی بات پُوری کی۔

"اگر اِس سے میرا غم جھلکتا ہے تو اِس کا باعث تم یا تمھاری ٹھکرائی محبت نہیں ہے محترمہ ! یہ تو میری زندگی کا وہ درد ہے جس کی ٹیسیں نے مجھ سے خون کے آنسو رُلائے ہیں۔ یہ غم تمھاری محبت کا غم نہیں کہ برداشت کر لوں۔ یہ تو میری حیات کا درد ہے۔ شاید تم نہیں جانتیں کہ میں نے سیما سے بیاہ کر لیا تھا . . ."

وہ چونک پڑی ایک بیک اُسے محسوس ہوا جیسے رضوان اُس کے قریب سے اُٹھ کر کہیں دُور جا بیٹھا ہے، کہیں دُور نکل گیا ہے۔ آج اِسی لمحہ جیسے وہ اپنے سے بیگانہ بن گیا ہے۔ اُس کی ہر شے جس پر اُس کا اختیار نہ تھا لیکن جسے وہ لاشعوری طور پر نہ چاہتی تھی کہ کسی کے اختیار میں چلی جائے، آج پرائی ہو گئی ہے۔ اُس کے سینے میں کچھ چبھنے لگا۔ بہت تیزی سے اُس نے کھڑکی کے شیشے چڑھا دیئے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اُس کے بال بکھیر دیئے۔ اُس نے تھرماس نکالا اور کافی پیالوں میں اُنڈیل کر ایک کپ رضوان کی طرف بڑھا دیا۔ ایک کپ بہت تیزی سے اپنے حلق میں اُنڈیل لی۔ رضوان کی طرف سے مُنہ پھیرے، وہ اپنے بچے کو بے وجہ تھپکنے لگی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا کہ اُس کے ذہن میں کیا ہے۔ غم یا خوشی ـــــ وہ دُکھ محسوس کر رہی ہے یا خوش ہو رہی ہے۔ رضوان کو مبارکباد دینا چاہیئے یا . . .

رضوان نے کپ برتھ پر اپنے سامنے ہی رکھ لیا۔ اُسے گھماتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"سیما نے میری اُجڑی ہوئی، گری پڑی ہر چیز سمیٹ کر سجا دی ہے۔ میرے قدموں کے آگے پھیلی ہوئی راہ کو ہموار کر دیا ہے اور میں نارمل انسان کے مانند چُپ چاپ لگے بندھے اصولوں کے تحت جی رہا ہوں۔ ایک حد تک اُس نے تو اپنی زندگی کی تعمیر کر لی ہے لیکن آٹھ روز پہلے سیما کا پیر پھسل گیا۔ گہری چوٹ لگی۔ میں نے اُسے روحانی طور پر تو کوئی درد نہ دیا۔ تمھاری یاد میں کبھی اپنی آنکھیں نم نہ کیں لیکن جسمانی ضرب برداشت نہ کر سکی اور میکے جانے لگی۔ اُس رات جس کی صبح وہ یہاں سے جا رہی تھی، وہ بہت پریشان تھی۔ درد اور تکلیف میں ڈوبے ڈوبے کہہ رہی تھی۔ صبح گھر سے نکلنا ہو تو گلے میں مفلر ڈال لیا کرنا رضی ! سردی لگ جائے گی۔ زکام نہیں برداشت نہیں کر سکتے۔ دستانے میں نے نیلے ٹرنک میں رکھ دیئے ہیں۔ رکھا ہوا کھانا نہ کھایا کرنا۔ شیونگ کا سامان میز پر ہے۔ ہر دوسرے روز کپڑے بدل لیا کرنا۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گی۔ تمھارے لئے جو سوئیٹر بُن رہی تھی وہ ادھورا رہ گیا ہے . . ."

رضوان کہتا کہتا جیسے ڈوب سا گیا۔ پھر اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا : جیسے اتنی محبت اس قدر پیار شاید وہ اور کیا یاد رکھ سکے گا۔ ماں بننے کے غرور نے اُسے صحت و تندرستی کی ساری نعمتیں دے دی تھیں لیکن وقت سے پہلے پہنچی اُس ضرب نے غرور و فخر کے ہر جذبے کو توڑ دیا۔ وہ اب اچھی ہے۔ اپنے میکے میں ہے۔ مجھے ایک دن کے لئے بُلایا تھا چھٹی نہ ملی تھی۔ کل اتوار ہے ایک دن۔ ہوں گا اور لوٹ آؤں گا۔ یہ اُسی کا غم ہے جو مجھ پر بکھرا پڑا ہے۔ یہی تو درد ہے جو مجھے کھائے جا رہا ہے۔ وہ میرے پاس ہوتی تو پھر مجھے کوئی غم کوئی دُکھ نہیں ـــــ"

"میں نے غلط سوچا تھا، میں نے . . ." اُس نے کچھ کہنا چاہا۔

"تم نے ہمیشہ غلط سوچا اور غلط چاہا ہے۔ تم جیسی ہستی کو معلوم ہی کیا کہ انسان جس سے شدید محبت کرنے لگتا ہے۔ اگر وہ بچھڑ جائے تو زندگی کیسی ہو جاتی ہے۔ تم نے تو محبت کی ہی نہیں۔ تم نے تو پیار جانا ہی نہیں . . ."

"رضوان ! ـــــ ہر انسان اپنے حالات سے مجبور ہوتا ہے۔ میں . . ."

"مجبور ؟ ہنھ ! ـــــ مجبوریاں جب گلے کا پھندا ہوتی ہیں تو ہر احساس ہر جذبے کو جکڑ کر رکھا جاتا ہے سمجھیں ؟ . . . اوہ ! . . . شاید سکندر آباد آگیا ! سیما میری راہ دیکھ رہی ہو گی ـــــ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے نا ! اُس کے لئے جی چاہتا ہے اپنی جان لُٹا دوں ـــــ تم . . . تم . . ." ٹرین رُکتے ہی وہ تیزی سے اُترا اور چلا گیا۔ وہ

[redacted]

کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ سمجھا نہ سکی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ اُس کا دامن پکڑ کر آج اُس سے کہہ دے کہ اگر وہ رضوان سے شادی کر لیتی تو اُس کے بھائی کی زندگی تباہ ہو جاتی۔ جس لڑکی کو اُس نے بھابی بنالیا ہے اُسے اپنے گھر لانے، اپنے بھائی کی محبت کی لاج رکھنے کے لئے اُسے سعید سے شادی کرنی پڑی۔ سعید کے والدین نے یہی شرط رکھی تھی۔ کیسے وہ اپنی خوشیوں کی خاطر اپنے بھائی کی محبت کو اُجڑنے دیتی ——— لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس نے اپنا سامان قُلی کے حوالے کیا۔ نیچے اُترتے ہوئے جیسے رضوان کو ڈھونڈنے لگی: کیا سچ مچ تم مجھے بھول گئے ہو رضی؟ کیا اب تمھیں میری یاد کچھ نہیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا میری بے وفائی کے خیال نے تمھیں سکون دے دیا ہے؟ تو پھر— تم ایک بار ——— ایک بار مجھے مل جاؤ رضی! ——— مجھے مل جاؤ تو میں تم سے کہہ دوں کہ میں نے تم سے بے وفائی کی ہے۔ چیخ چیخ کر کہہ دوں کہ میں بے وفا ہوں!"

جب دوسرے دن اُسی راستے، اُسی ٹرین سے رضوان واپس ہو رہا تھا اُس کا جی چاہا۔ کاش! ایک بار ——— صرف ایک بار مجھے نیشی کہیں مل جائے ——— کہیں مل جائے تو میں کہہ دوں کہ وہ سب جھوٹ تھا نیشی! میں اپنے آپ کو دھوکا دے کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری حیات کے درد سے میری محبت کا غم بہت گہرا ہے۔ بہت گہرا ہے۔ میں قہقہے لگا کر بھی روتا ہوں۔ تم نے وفا کی ہو یا بے وفائی لیکن تمھاری یاد مجھے جینے نہیں دیتی۔ تم نے ٹھیک کہا ہے نیشی! یہ سچ ہے کہ ہم سب بہروپئے ہیں!!

جواب طلب امور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے۔ ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی دہلی)

غزلیں

عرش صہبائی

محبت میں حیاتِ نَو کی یُوں تشکیل ہوتی ہے
اُدھر ارشاد ہوتا ہے، اِدھر تعمیل ہوتی ہے

نہ دو لب ہائے نازک کو عبث تکلیف جُنبش کی
نگاہوں سے بھی اکثر بات بالتفصیل ہوتی ہے

وجُودِ حق میں مِل جاتی ہے ایسے ہستیٔ باطل
سحر میں جس طرح تاریک شب تحلیل ہوتی ہے

چھلک جاتی ہے چشمِ شوق سے ہر آرزُو دل کی
کبھی اس طرح بھی جذبات کی تکمیل ہوتی ہے

مرے غم خانۂ دل میں وہ تیری یاد کا عالم
فروزاں جس طرح ظُلمت میں اک قندیل ہوتی ہے

یہی جی چاہتا ہے عرش اُن میں غرق ہو جائیں
وہ آنکھیں ہیں کہ جیسے نیلگُوں سی جھیل ہوتی ہے

چندر پرکاش جوہر بجنوری

جب بھی اُن سے کلام ہوتا ہے
ہر سخن ' ناتمام ہوتا ہے

کوچۂ دوست کا ہر اِک ذرہ
قابلِ احترام ہوتا ہے

عشق، جس کے ہزار معنی ہیں
ایک سادہ پیام ہوتا ہے

وہ نفس جس میں تیری یاد نہ ہو
زندگی پر حرام ہوتا ہے

غم کو نفرت سے دیکھنے والو
غم کا بھی اِک مقام ہوتا ہے

عالمِ بے خودی میں اے جوہر
اُن سے اکثر کلام ہوتا ہے

مہدی پرتاب گڈھی

جو ظلم وستم کو بھی ترے پیار کہے ہے
ہر ایک اُسے صاحبِ کردار کہے ہے

خلوت میں بھی جو بات کوئی کہہ نہیں سکتا
دیوانہ ترا اُس کو سرِ دار کہے ہے

دراصل اسی حُسنِ چمن کی ہے دہی آنکھ
ہر آنکھ جسے نرگسِ بیمار کہے ہے

دیکھو تو ذرا سنگِ درِ یار سے بڑھ کر
کچھ اور بھی اب وقت کی رفتار کہے ہے

میرے دلِ خوں گشتہ کی تفسیر ہے مہدی
دُنیا جسے رنگینیٔ افکار کہے ہے

طنزیہ

اُوٹ پٹانگ

فکر تونسوی

کوّا اور پتنگ

سامنے بجلی کا ایک کھمبا ہے، جہاں ایک پتنگ اٹکا ہوا ہے۔ وہ برقی تاروں پہ جھول رہا ہے۔ اُس کے پہلو میں اٹکا ہوا ایک مُردہ کوّا بھی جھول رہا ہے۔ —— دونوں مُردہ ہیں۔ دونوں کی لاشیں ایک ساتھ جھول رہی ہیں۔ موت نے دونوں کو ایک ہی قبرستان عطا کر دیا ہے۔ جب کوّا زندہ تھا تو پتنگ سے اُس کا کوئی ناطہ نہیں تھا۔ جب پتنگ زندہ تھا تو کوّے نے اُس کے ساتھ بیٹھ کر کبھی ڈنر نہیں کھایا تھا۔ نہ اُن کا قبیلہ ایک تھا نہ مذہب نہ زبان —— تو اُنھیں مشترکہ قبرستان کیوں ملا؟

کیا اس لئے کہ لاش کا کوئی قبیلہ نہیں ہوتا؟ کوئی مذہب نہیں ہوتا، کوئی مزاج نہیں ہوتا؟ کیا اس لئے کہ لاشیں ایک دوسرے کی گردن نہیں کاٹ سکتیں، ایک دوسرے کا گوشت نوچ نہیں سکتیں؟

میں بھی کیا اُوٹ پٹانگ سوچ رہا ہوں۔

گردن اور ماچس

دراصل میری آنکھوں میں نقص ہے۔ میری آنکھوں کو وہی گردن حسین لگتی ہے جو انسان کے دھڑ پر لگی ہوئی ہو۔ جو گردن دھڑ سے الگ ہو کر چوراہے پر پڑی ہو وہ پولیس کے لئے تو دلفریب ہو سکتی ہے، میرے لئے نہیں۔

ایک ماچس جب خالی ہو جاتی ہے تو لوگ اُسے سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ سڑک پر ماچس پڑی ہو یا انسانی گردن۔ دونوں میں صرف ایک چیز مشترک ہے "خالی پن"۔ ہم بھی کتنے سنگ دل ہیں۔ انسان کو خالی ماچس سمجھ کر سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ ایک بار میں نے ایک کٹی ہوئی گردن سے پوچھا "اے سابق حسینہ! تمھیں دھڑ سے کیوں الگ کر دیا گیا؟"

وہ بولی "میں کیا جانوں؟ ایک آدمی تلوار لے کر آیا اور کہنے لگا: اب تم خالی ہو گئی ہو۔ اب دُنیا کو تمھاری ضرورت نہیں رہی" یہ کہہ کر اُس نے مجھے کاٹ کر پھینک دیا۔"

پھر اچانک بہت سے لوگ آ گئے اور کٹی ہوئی گردن کی آرتی اُتارنے لگے، اُس پر گلاب کے پھول پھینکنے لگے، اُس کے آگے ماتھا ٹیکنے لگے اور پھر ایک بہت اُونچے، لمبے بانس پر اُس گردن کو لٹکا دیا گیا۔ آگے آگے کٹی ہوئی گردن، پیچھے پیچھے ایک بہت بڑا جلوس، جو نعرے لگا رہا تھا

"شہیدِ قوم مرلی چند زندہ باد!"

"خونِ شہیداں! امر رہے"

تو کیا گردن جھوٹ کہتی تھی کہ دُنیا کو اُس کی ضرورت نہیں رہی؟ شاید اُس بیچاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ مُردہ گردن، زندہ گردن سے زیادہ پیاری اور ضروری ہو جاتی ہے۔ دوسری صبح کے اخباروں میں خبر چھپی۔ کٹی ہوئی گردن کے جلوس پر شدید فساد ہو گیا، جس میں ایک درجن آدمی مارے گئے۔ درجن بھر مزید گردنیں کاٹ کر زمین پر پھینک دی گئیں۔ درجن بھر مزید گردنیں غیر ضروری قرار دے دی گئیں۔ درجن بھر مزید گردنیں خالی کر دی گئیں۔

صدیوں سے یہ اُوٹ پٹانگ کھیل جاری ہے۔ تھیٹر کا جو کھیل پاپولر ہو جاتے اُسے لوگ بار بار دیکھتے ہیں۔ گردن اگر دھڑ پر لگی رہے تو یہ انتہائی اُکتا دینے والا کھیل ہے۔ کون دیکھتا ہے؟

بھوں بھوں اور میاؤں

لیکن گردنیں تو کبھی کبھی کٹتی ہیں ورنہ عام طور پر تو دُنیا میں سالم انسان گھومتے ہیں۔ سالم اور اُکتا دینے والے انسان۔ ہر روز وہی "روٹین" —— ہر روز ہمارے محلّے کا بوڑھا چرن داس کھانستا ہے۔ ہر روز "ڈبل روٹی، مکھن" کی صدا لگانے والا چھوکرا آ جاتا ہے۔ ہر روز میری بالکنی کے سامنے والی سیاہ فام دوشیزہ انگڑائی لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ہر روز ملک ڈپو پر لوگ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ کاش! ایسا ہو جائے کہ ملک ڈپو والے گالیاں دینے کی بجائے انگڑائیاں لیا کریں اور

سیاہ فام دوشیزہ صدا لگایا کرے: "ڈبل روٹی لے لو" ــــ اور بوڑھا چرن داس کھانسنے کی بجائے دوشیزہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرے تاکہ دوشیزہ کو اپنی انگڑائی کا جواب مل جائے۔ کاش اسی طرح چیزیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں تاکہ ہر چیز کی اُکتاہٹ ختم ہو جائے۔ اگر ملک ڈپو پر تمھیں دودھ کی بوتل نہیں ملتی تو بوتل مت لو۔ سامنے کے اکھاڑے میں چلے جاؤ اور ڈنڑ پیلنا شروع کر دو ــــ مجھے تو اُس سیاہ فام دوشیزہ پر رحم آتا ہے، "اے بے وقوف لڑکی! اگر تمھاری انگڑائی کا جواب کسی طرف سے محبت کے ساتھ نہیں آتا تو انگڑائی لینا چھوڑ دو اور بوڑھے چرن داس کی طرح کھانسنا شروع کر دو۔ لوگ تمھیں کھانستے دیکھیں گے تو ضرور عشق کریں گے۔ ضرور تمھاری طرف متوجہ ہوں گے کیونکہ دوشیزاؤں کی کھانسی بڑی انوکھی چیز ہوتی ہے اور پھر ممکن ہے، اکھاڑے کا کوئی پہلوان تمھیں کندھے پر بٹھا کر اغوا کر کے لے جائے اور تمھاری انگڑائی کے سوال کا جواب مل جائے۔

لیکن آہ! لوگ ایسا نہیں کرتے۔ وہ "روٹین" کے چکّر میں گرفتار ہیں۔ اُن میں ہمت ہی نہیں کہ جہاں انھیں بٹھا دیا گیا ہے وہاں سے ایک آدھ انچ بھی سرک جائیں۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر یہاں سے سرک گئے تو دنیا کہے گی، بزدل تھے بھاگ گئے۔ میں نے ایک کُتے سے کہا "یار! تم ہمیشہ صرف بھونکتے کیوں ہو۔ کیا بھونکنے سے تم بور نہیں ہو جاتے؟"

"ہو جاتا ہوں" وہ بولا۔

"تو پھر کبھی کبھی بلّی کی طرح میاؤں میاؤں کیا کرو"

"ہی ہی ہی! لوگ مذاق اُڑائیں گے"

آہ بے چارہ کُتا! کتنا بے بس ہے۔ لوگ لاج کا مارا ہوا ہے۔ صرف کُتا نہیں، بلّی کا بھی یہی حال ہے۔ سیاہ فام دوشیزہ کا بھی یہی حال ہے۔ ہم سب کا یہی حال ہے۔ چور چوری ہی کرتا رہتا ہے، بھگت بھجن ہی گاتا رہتا ہے۔ وکیل جھوٹ ہی بولتا رہتا ہے۔ اُلّو ہمیشہ اُلّو ہی رہتا ہے۔

صرف کبھی کبھی کوئی اُلّو آ کر اس سلسلے کو توڑ دیتا ہے۔ یعنی یونیورسٹی کا پروفیسر بن جاتا ہے تو سبھی نگاہیں اُس پر اُٹھ جاتی ہیں اور آہ بھر کر کہتی ہیں۔ "کاش! ہم بھی ایسا کر سکتے، ہم اُلّو کے اُلّو ہی رہے"

خدا اور سانپ ــــ •

"کاش! ہم بھی ایسا کر سکتے" ــــ یہ فقرہ ہر دل میں ایک ٹھنڈی آہ بن کر بسا ہوا ہے۔ اگر دنیا بھر کی ان دبی ہوئی ٹھنڈی آہوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے

اور اُنھیں ایک میمورنڈم کی طرح خدا کی خدمت میں پیش کر دیا جائے تو خدا بھی شرمندہ ہو جائے اور وہ بھی اِن ٹھنڈی آہوں کے ہجوم میں اپنی ایک ٹھنڈی آہ بھی شامل کرے اور کہے "میں نے یہ کیسی دُنیا بنا ڈالی؟ ناکمل تمنّاؤں کی دُنیا۔ دوستو! مجھے معاف کر دو! مجھے سزا دے دو۔"

لیکن خدا کو سزا دینا کچھ بُرا سا لگتا ہے، کچھ ان کا ڈر سا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم صرف شکایت کر دیتے ہیں، شکایت دُور نہیں کر واسکتے۔ مگر سُنا ہے، کچھ لوگ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کے لئے خدا کو رشوت بھی دیتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ مندر کے لئے دان دیتے ہیں، یتیم خانے کھول دیتے ہیں، بیواؤں کو سلائی مشینیں عطا کرتے ہیں —— لیکن خدا کے متعلق عام طور پر یہی مشہور ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) بے حد کائیاں ہے۔ دان اور رشوت کے فرق کو بھانپ لینے میں بڑا ہی ہوشیار ہے۔ ایسے ہی ایک دانی کے متعلق مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ جب وہ ایک ودھوا آشرم کو پانچ ہزار روپے دان دے کر باہر نکلا تو دروازے پر ایک سانپ نے اُسے کاٹ کھایا۔ کسی نے کہا۔ وہ سانپ خود بھگوان کا رُوپ تھا۔ کوئی بولا، اُس سانپ کے بھیس میں شیطان تھا۔ جو اِس دانی سے بے حد نالاں تھا۔ بہرکیف وہ سانپ خدا تھا یا شیطان، اِس کا علم صرف خدا کو ہوگا اور خدا اپنا خفیہ علم کسی کو نہیں بتاتا۔ جو لوگ خدا کے راز داں بننے کے دعوے کرتے ہیں، وہ یا تو فراڈ ہیں یا جاہل!!

بھینس اور مکان ——●

یہی وجہ ہے کہ لوگ اجتماعی طور پر اپنی ٹھنڈی آہوں کا میمورنڈم پیش نہیں کرتے۔ بلکہ انفرادی طور پر خدا کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ ہر آدمی اپنی تجارت آپ کرتا ہے، اپنی عرضی آپ لئے پھرتا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ خدا اِن انفرادی عرضیوں کو اکثر ٹال دیتا ہے۔

لیکن کبھی کبھی کسی کسی کی ایک آدھ تمنّا پُوری بھی کر دیتا ہے۔ میں ایک چپراسی کو جانتا ہوں، جو پچیس برس تک اِس تمنّا کو پالتا رہا کہ وہ اپنا ایک ذاتی مکان بنائے اور اُس کے باہر ایک بھینس باندھ لے۔ پچیس برس بعد اُسے ایک بھینس مِل گئی مگر اُسے باندھنے کے لئے مکان نہ ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی بھینس آوارہ ہو گئی۔ اور آوارہ مویشیوں کے قانون کے تحت اُس کا چالان کر دیا گیا اور اُس کے چند سال بعد جب چپراسی مذکور نے اپنا مکان بنا لیا تو وہ اِس قدر بُوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا کہ اُس کے بیٹوں اور بہوؤں نے اُسے دھکّے مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔

خدا نے اُس کی دونوں تمنّائیں پُوری کر دیں بھینس بھی دلا دی اور مکان بھی۔

لیکن اُسے دونوں کے لُطف سے محروم رکھا۔ اِسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ آرزو کو ہمیشہ تشنہ اور برقرار رکھو۔ آرزو جب تک نامکمل رہتی ہے، بے حد خوبصورت اور دلآویز دکھائی دیتی ہے مگر اپنی تکمیل کے بعد نہایت بھونڈی اور بدوضع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اِس میں کیا ہرج ہے کہ دُنیا کے کسی آدمی کی کوئی بھی آرزو پُوری نہ ہو۔

مجھے اپنے شہر کے سیٹھ ٹھاکر داس پر بہت رحم آتا ہے۔ جس کی تمنّا تھی کہ وہ ایک آٹھ منزلہ بلڈنگ بنائے اور اُس کی سب سے اونچی منزل پر کھڑے ہو کر وہ بلند آواز سے پکارے "دیکھو لوگو! میں ٹھاکر داس ہوں۔ تم سب سے بلند، سب سے عظیم۔ میں ہمالیہ ہوں۔"

لیکن جس دن یہ بلڈنگ تیار ہو گئی، اُس وقت تک لالہ ٹھاکر داس کے کینسر کا پھوڑا ناسُور بن چکا تھا۔ اُسے لفٹ کے ذریعے آٹھویں منزل پر لے جایا گیا۔ وہ ہمالیہ پربت بن گیا۔ ہمالیہ پربت کو اگر کینسر ہو جائے تو اُس کی بلندی اور پستی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ آٹھویں منزل سے کُود کر خودکشی نہیں کر سکا۔ ورنہ کینسر کے پھوڑے کا یہ نادر علاج تھا۔ ایک اور موقع اُس نے کھو دیا اور صرف یہ سوچ کر کھو دیا کہ خودکشی کے بعد نہ جانے دوبارہ انسانی جنم ملے یا نہ ملے۔

انسانی جنم چاہے کینسر زدہ ہی کیوں نہ ہو، بے حد عزیز ہوتا ہے۔ جینے کی تمنّا ایک ایسی تمنّا ہے، جو خدا کی سب سے عظیم اور لازوال شرارت ہے۔

بندر اور وزیر ——●

ابھی ابھی جب میں یہ سطور لکھ رہا تھا، میرا بچّہ بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔

"ڈیڈی! ڈیڈی!! مجھے بھی ایک موٹر لے دو۔ پڑوسی کے بیٹے پپّو کے پاس بھی ایک موٹر ہے"

"پپّو بندر ہے" میں نے اُس سے کہا۔

"ہاں، میں بندر ہوں۔ مگر مجھے موٹر لے دو۔"

"پپّو بھی بندر ہے" میں نے مزید تشریح کی۔

وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ کیونکہ اگر پپّو بندر ہے تو اُسے موٹر مل گئی۔ لہٰذا اِسے بھی موٹر مِل جائے گی۔ پپّو کے پاس اگر موٹر نہ ہوتی تو میرا بچّہ خاموش رہتا۔ اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مصیبت یہ ہے کہ پپّو موٹر لے آیا ہے۔ کیونکہ پپّو نے گِردھر کے پاس موٹر دیکھی تھی، گِردھر نے رادھے کے پاس موٹر دیکھی تھی، رادھے نے شیام کے... موٹر کے چراغ سے ہر چراغ جلتا آ رہا ہے۔ ہر چراغ اپنی تاریک اور خاموش لَو کو جلتے ہوئے چراغ کی طرف اُبھار رہا ہے۔ جیتن آنند کلرک کے پاس سکوٹر ہے، جس نے رام پرشاد کلرک کی نیند حرام کر رکھی ہیں —— میں بھی سکوٹر

خریدوں گا۔" وہ در در دیوانے کہتا پھرتا ہے ——— "سپیا کرپلانی وزیر بن گئی ہیں۔" سپیتا مکرجی نے اعلان کیا۔" میں بھی وزیر بنوں گی۔" اٹھارہ سالہ دوشیزہ رکمنی نے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔ کیونکہ اُس کے باپ کے پاس جہیز کے پیسے نہیں تھے۔ اُنیس سالہ دوشیزہ اُرملا کے دل میں بھی ہُوک اُٹھی کہ میں بھی خودکشی کرلوں گی۔ افلاس کا علاج خودکشی ہے۔ سستا اور ڈائرکٹ اور موثر۔

پپی، رادھے، گِردھر، رام پرشاد، سپیتا، سبیتا اور چیتن آنند ——— ہر انسان بندر ہے۔ خود کچھ نہیں کرتے۔ دوسروں کو کرتے دیکھ کر وہی کچھ کرتے ہیں جو کرنا نہیں چاہتے۔ ہر آدمی اپنے چھوٹے کندھے کو کھینچ تان کر دوسرے کے کندھے کے برابر اُبھارنا چاہتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم دوسروں کی نقل کرتے وقت اپنے کندھے کا قدرتی سائز بھول جاتے ہیں۔

ڈکشنری اور ہم ———●

سائز کی بات چلی ہے تو آیئے ایک دو اُوٹ پٹانگ باتیں اور کرلیں۔ ویت نام ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ امریکہ ایک بہت بڑا مُلک ہے۔ اگر ویت نام والے امریکہ پر حملہ کردیتے تو ہم کہتے، کیا پدّی کیا پدّی کا شوربہ۔ کم از کم ایک محاورہ استعمال کے قابل ہوجاتا۔ مگر امریکہ نے محاورے کو غلط ثابت کرنے کے لئے ویت نام پر حملہ کردیا۔

اب اگر ہم ایک دوسرا محاورہ استعمال کریں کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے تو اگرچہ اس سے امریکہ کا تو کچھ نہیں بگڑتا مگر ہمیں ذلّت کا احساس ہونے لگتا ہے کہ صرف ایک محاورے کو صحیح ثابت کرنے کی خاطر ہم یہ برداشت کرلیں کہ ویت نام کے کنوارے کھیت بانجھ ہوجائیں، بچے بھُون کر کھائے جائیں اور ننگے اور شعلہ ور گھنگھور ٹینکوں کے نیچے کُچلے جائیں۔

تو کیا ہم محاوروں کی خاطر ساری حماقتیں کرلیتے ہیں۔ محاورے اگر ڈکشنری میں سے نکال دئے جائیں تو کیا ہم حماقتیں بند کردیں گے۔ میرا خیال ہے تجربہ کرکے دیکھ لینا چاہیئے کہ جب محاورے ڈکشنری میں سے غائب ہوجاتے ہیں تو کیا چالیس برس کا انسان چار برس کے ایک ننھے بچّے کو زناٹے کا طمانچہ رسید کرتا ہے یا نہیں۔ چالیس اور چار کے سائز کے فرق کو اگر ڈکشنری نہیں مٹا سکتی تو سمجھ لینا چاہیئے کہ قصور ڈکشنری کا نہیں اُن کا ہے جنھوں نے پہلے حماقتیں فرمائیں اور اس کے بعد اپنی حماقتوں کو ایک جگہ اکٹھا کردیا اور اُس کا نام ڈکشنری رکھ دیا۔

ہمیں معصوم بچّوں کی بجائے اپنی حماقتوں پر بمباری کرنی چاہیئے شاید اس سے ڈکشنری کی معصومیت محفوظ رہ سکے۔

نفرت

سیّد مظفّر سعید

۲۱-۱۴۱ گلی قاسم جان - دہلی ۶

۳۱ مارچ ۶۶ء — محترمی: آداب و نیاز

پہلی بار ایک کہانی لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اس کو میں نے صرف "بیسویں صدی" کے لئے لکھا ہے۔ اگر یہ آپ اور قارئین حضرات کی کسوٹی پر پوری اتری تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں ہوئی . . .

آپ کا ——— مظفّر سعید

باہر تیز ہوا کچھ اور گہری ہوگئی ہے۔ اندھیرے کا تاریک پردہ اور زیادہ دبیز معلوم ہونے لگا ہے۔ برآمدہ کے ٹین پر ہوا کے ساتھ بارش کی پھوار پڑنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہزاروں روحیں ایک ساتھ سسک رہی ہوں۔ میں شمع کی اُداس لَو پر نظر جمائے بیٹھی ہوں۔ نہ جانے کون سا غم اس کی جان کو پگھلائے دے رہا ہے اور یہ خاموش جلتی ہوئی اپنا وجود ختم کئے دے رہی ہے۔ میرے سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے لیکن نہ جانے کتنی دیر سے اس کا ایک صفحہ بھی نہیں پڑھ سکی ہوں۔ نہ جانے کیا کیا سوچے جا رہی ہوں۔ کتاب پر الفاظ کی تاریک مجہول بھول بھلیوں میں سے تمہارا چہرہ اُبھر آتا ہے۔ ارے! تم بھی میری ہی طرح غمگین ہو! تمھیں کیا غم ہے؟ میں تو وہ تہی داماں نصیب ہوں جس نے سب کچھ پا کے کھو دیا ہے لیکن نہیں! تم تو مُسکرا رہے ہو! ایک طنز بھری مسکراہٹ! تمہارے مُسکراتے ہوئے لب جیسے کہہ رہے ہیں "اب رونے سے کیا ہوتا ہے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں۔ کچی زمین پر اُن کے قدموں کے نشان رہ جاتے ہیں اور جلد ہی وہ بھی مٹ جاتے ہیں لیکن جانے والے لوٹ کر نہیں آتے۔" میری آنکھوں میں جلن ہونے لگتی ہے۔ تمہارا چہرہ دُھندلا جاتا ہے۔ باہر بارش تیز ہوگئی ہے۔

ایسی ہی ایک رات تھی جب تم مجھے غم اور دُکھوں کی دُنیا کے سپرد کر کے کسی نئی منزل کی طرف چل دیئے تھے اور میں تمہارے قدموں کے نشان ڈھونڈتی رہ گئی تھی لیکن مجھے نشانوں کے بجائے ایک رِستا ہوا ناسُور مل گیا جو نہ جانے کب تک رِستا رہے گا۔

تمھیں تو اب کیا یاد ہوگا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ جب کالج میں داخلہ ہو جانے کے بعد ہم فیس جمع کرنے کے لئے لائن میں کھڑے ہوئے تھے۔ تم میرے پیچھے تھے۔ اس لئے کہ میرا رول نمبر تمہارے نمبر سے ایک ہی نمبر زیادہ تھا۔ میرا رول نمبر بیاسی اور تمہارا تراسی تھا۔ ہمارے مضامین بھی ایک ہی تھے۔ تم نہ جانے کیوں اتنا قریبی تعلق پیدا ہو جانے پر اتنے خوش تھے کہ پہلے ہی دن تم نے ساتھ چائے پینے کی پیشکش کر دی۔ مجھے تمہاری یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ میں نے انکار کر دیا اور مُنہ پھیر کر چل دی۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ میرے انکار سے تمہارے اوپر کیا اثر ہوا ——— پھر کلاسیں شروع ہوئیں۔ پروفیسر صاحب نے حاضری کا رجسٹر کھولا اور رول نمبر پکار کر حاضری بھرنے لگے۔ وہ اتنا تیز بولتے تھے کہ ایک رول نمبر کہہ کر اُس کا جواب آنے تک دوسرا نمبر بول پڑتے تھے: "اکیاسی! بیاسی!! تراسی!!! ——— "یس سر!" دو آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتی، وہ تمہارا نمبر پکار چکے تھے اور تم شاید اُن سے بھی تیز تھے۔ پروفیسر صاحب کو شک ہوا۔ انھوں نے دوبارہ پکارا "بیاسی!" اس بار پھر ہم دونوں ہم آہنگ ہو گئے۔ تم اپنا نمبر سمجھ کر دوبارہ بول پڑے تھے اور کلاس قہقہوں میں ڈوب گیا۔ میں پسینہ پسینہ ہوگئی۔ تمہاری یہ بے ارادہ حرکت مجھے بہت ناگوار گزری تھی۔ میری نظر تمہاری طرف اٹھی۔ تم شوخی سے مُسکرا رہے تھے۔ میں نے بیزاری سے مُنہ پھیر لیا۔ اور پھر جب ایسا اتفاق دو تین بار ہوا تو ہم پورے کالج میں ایٹی ٹو کمپنی (Eighty two Company) کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لڑکیاں تمہارا رول نمبر میرے نام کے ساتھ لگا کر مجھے چھیڑتیں اور لڑکے تمہارے نام کے ساتھ میرے رول نمبر کو جوڑ دیتے۔

اور پھر وہ طلباء کی یونین کا سالانہ تقریری مقابلہ! اُس میں میرا اور تمہارا

تام دو حریفوں کی حیثیت سے رکھا گیا تھا۔ موضوع تھا —— "بے وفائی کا عنصر مرد کی بنسبت عورت میں زیادہ ہوتا ہے"۔ مجھے اُس کی مخالفت میں بولنا تھا۔ اُس کے لئے میں نے بہت محنت کی۔ رات کو دو دو بجے تک مطالعہ کرکے بڑے بڑے مفکروں اور دانشوروں کے شاہ پارے جو عورت کی وفا کا دم بھرتے تھے، جمع کئے۔ ہر روز گھنٹوں تقریر کی مشق کی۔ کیونکہ میں کالج کی ساری لڑکیوں کی طرف سے نمائندہ چُنی گئی تھی اور یہی حیثیت تمھاری بھی تھی۔ میری یا تمھاری شکست یا فتح سارے لڑکے یا لڑکیوں کی شکست یا فتح تھی۔ آخر مقابلہ کا دن آپہنچا اور صدر صاحب نے افتتاحی تقریر کے بعد میرا نام پُکارا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈائس پر پہنچی اور حواس مجتمع کرکے تقریر شروع کردی۔ میری محنت کام آئی۔ میں پُورے جوش کے ساتھ بول رہی تھی۔ تقریر ختم ہونے پر ہال تالیوں سے گُونج اُٹھا۔ لڑکیوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے اور لڑکوں پر شکست کے احساس سے پژمردگی چھا گئی۔ کیونکہ میری تقریر اتنی زوردار تھی کہ اب ہارنے کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا —— پھر تم اپنی مخصوص مُسکراہٹ کے ساتھ مائک کے سامنے آئے اور ایک طنزیہ مُسکراہٹ کے ساتھ تقریر شروع کردی اور ہال میں سنّاٹا چھا گیا۔ ایک لمحہ کے لئے میں بھی تمھاری سحر طراز آواز اور دلکش انداز میں کھو گئی۔ تم نے میری ایک ایک بات کا مدلّل اور مکمّل جواب دیا اور پھر معاملہ برعکس ہوگیا۔ لڑکے خوشی سے اُچھلنے لگے اور لڑکیوں کی تیز نگاہیں مجھ پر پڑنے لگیں۔ مجھے اپنا دَم رُکتا ہوا محسوس ہوا۔ اب صرف جج صاحب کے فیصلہ کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے اپنا فیصلہ سُنا دیا۔

"دونوں حریف اپنی اپنی قابلیت کے لئے مستحقِ مبارکباد ہیں۔ مقابلہ میں دونوں برابر رہے ہیں۔ اِس لئے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اِس لئے انعام دونوں کو مساوی طور پر دیا جارہا ہے۔"

جج صاحب کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی تم اسٹیج پر پہنچ چکے تھے۔ تم نے شانِ بے نیازی سے کہا۔

"جج صاحب کا فیصلہ مجھے منظور ہے لیکن میں پُورا انعام اپنی طرف سے مِس شیریں کو پیش کرتا ہوں!"

میرا رُواں رُواں سُلگ اُٹھا۔ میں نے انعام ٹھکرا دیا اور اِس طرح انعام کسی کو بھی نہ ملا لیکن میرے دل میں تم سے شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ پھر تم نے میرے قریب ہونے کی جتنی کوشش کی میری بے زاری بڑھتی ہی گئی لیکن تم میری نفرت سے بیزار اور بد دل نہ ہوتے۔ تم بہت جذباتی تھے۔ اپنے دل کی بات فوراً زبان پر لے آتے تھے۔ ہم دونوں ساتھ پڑھتے تھے، بات چیت کرتے تھے لیکن کسی محفل میں اگر تم میری طرف توجّہ زیادہ کرتے تو میرا موڈ یکلخت بگڑ جاتا اور میں تمھاری معقول باتوں کا جواب ایسے طنزیہ انداز میں دیتی کہ تم کچھ دیر کے لئے اُداس ہوجاتے لیکن تھوڑی دیر بعد تم پھر اُسی جوش و خروش کے ساتھ باتوں میں شریک ہوجاتے۔ کسی بات کی پروا کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا تم نے!

اور پھر کالج کے طلباء نے پکنک کا پروگرام بنایا۔ تم ایسا موقع کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ اِس لئے میں نے جانے سے انکار کردیا لیکن پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ تم کسی وجہ سے نہ جاسکو گے تو مجھے یقین نہ آیا۔ پھر بھی لڑکیوں کے اصرار پر چلی گئی۔ موسم بھیگا بھیگا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا کے ساتھ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے آسمان کی وسعتوں پر محوِ خرام تھے۔ پکنک کے لئے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہ اتنی پیاری تھی کہ مجھے بے اختیار تم سے ہمدردی پیدا ہوگئی کہ تم ایسی جگہ نہ آسکے۔ ہم سب خوب کھیلے کُودے اور سہ پہر کو کھانے کے بعد پیڑوں کی چھاؤں میں محفل جمی اور گانے بجانے کا پروگرام شروع ہوا تو تم نہ جانے کہاں سے آ کُودے! میں تمھیں وہاں پاکر محفل سے بیزار ہونے لگی تھی اور پھر ساتھیوں کے اصرار پر تم نے گانا شروع کیا ؎

تُو پیار کرے یا ٹھکرائے ہم تو ہیں تیرے دیوانوں میں
تُو چاہے ہمیں اپنا نہ بنا لیکن نہ سمجھ بیگانوں میں

میرے چہرے پر جمی ہوئی تمھاری مُسکراتی نیم وا آنکھوں نے اُس وقت نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکن تیز کردی تھی لیکن مجھے تو اُن سے سخت نفرت تھی۔ میں جھنجھلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے واپس چلی آئی۔ پوری محفل کے قہقہے دُور تک میرا پیچھا کرتے رہے۔

اور اُسی دن شام کو جب سب لوگ واپس آکر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے، تم نے میرے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر اندر آنے کی اجازت مانگی۔ شام کے ہلکے دھندلکے کے پس منظر میں تم بکھرے بال اور اُداس آنکھوں کے ساتھ کتنے پُراسرار اور کتنے حسین معلوم ہو رہے تھے۔ میں ایک لمحہ کو تمھیں دیکھتی رہ گئی۔ پھر ایک دم سنبھل کر سر جھٹک دیا اور دل نہ چاہتے ہوئے بھی ازراہِ اخلاق تمھیں خوش آمدید کہا۔ تمھیں اِس سے پہلے میں نے کبھی اتنا اُداس اور پریشان نہ دیکھا تھا اور اُس وقت مجھے ایک عجیب سی مسرّت محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں نے کوئی بڑی فتح پالی ہو۔ تم نے مجھ سے معافی مانگی۔ آج تمھیں میری سچّی نفرت کا احساس ہوگیا تھا۔ تم نے بہت سنجیدگی سے اپنی ایک ایک حرکت کی معافی چاہی۔ اُس وقت تمھارے چہرے پر اتنی معصومیت اور بھولپن تھا کہ میں کچھ نہ بول سکی اور پھر نہایت خندہ پیشانی سے "معاف" کردیا۔ اُس وقت میں بہت خوش تھی۔ آج میں نے اپنے حریف کو اپنے سامنے جُھکنے پر مجبور کردیا تھا اور تم شکست کھا کر بھی اِس طرح مُسکراتے ہوئے چلے گئے تھے جیسے کوئی پُجاری دیوتا کے چرنوں میں اپنے سارے گناہوں کا میل دھوکر

شوخ، چنچل ماحول امتحان کی تیاریوں میں ڈوب گیا۔ ہر وقت کی چہل پہل نے خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیا اور ہم سب کچھ بھول کر کتابوں میں کھو گئے — یہ فائنل کا امتحان تھا۔ امتحان کے بعد گھروں کو روانگی شروع ہوئی۔ سب ہی اُداس تھے۔ تین سال کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔ اب نہ جانے کبھی ملنا بھی ہو یا نہیں۔ خصوصاً وہ لڑکیاں جن کی گھر پہنچتے ہی شادی ہونے والی تھی، بہت ہی اُداس تھیں۔ جن لوگوں کو مزید تعلیم حاصل کرنے کا موقع نصیب تھا، صرف وہی آئندہ پھر ملنے کے یقین کے ساتھ رخصت ہو رہے تھے۔ میری اور تمہاری گاڑیاں ایک ہی وقت میں مختلف سمتوں کی طرف روانہ ہوتی تھیں۔ میں تم سے دُور ہونے پر ایک طرح کی خوشی محسوس کر رہی تھی، ساتھ ہی کسی چیز کے کھونے کی کسک بھی دل میں محسوس ہو رہی تھی۔ گارڈ نے وسل بجائی اور ہم آہستہ آہستہ دُور بہت دُور ہوتے چلے گئے۔ تمہاری گاڑی اُفق کے دھندلکوں میں غائب ہوگئی اور اسی طرح میرے ذہن سے تمہارا خیال دھندلا پڑتا گیا۔

گھر پر ابّا حضور کو بسترِ مرگ پر پایا۔ میری پریشانی کے خیال سے کسی نے مجھے خبر نہیں دی تھی اور پھر ایک ہفتہ تک موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ایک رات ابّا حضور خاموشی سے ایک نئی منزل کی طرف گامزن ہوگئے اور اکیلی کوٹھی پر ویرانیوں نے بسیرا کر لیا۔ گھر کے صرف چار افراد میں سے ابّا حضور کی کمی نے جیسے ساری رونقیں چھین لی تھیں۔ بھائی صاحب جاگیر کے کاموں میں اکثر باہر رہتے۔ میں ہوتی اور ابّا حضور کی لائبریری جس میں نہ جانے کیسی کیسی نادر کتابیں تھیں۔ میں نے اُسی دنیا کو اپنا لیا۔ امّی جان اور بھائی جان نے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ امّی جان کو میری شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اور پھر ایک دن ناشتہ کی میز پر اُنھوں نے تمہارا پیغام میرے سامنے رکھ دیا۔ تمہارا تعلق بھی ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ امّی جان اور بھائی صاحب نے تمہیں پسند کر لیا تھا۔ امّی جان کا خیال تھا کہ ہم دونوں نے ایک ساتھ پڑھا ہے اِس لئے ایک دوسرے کے مزاج سے بھی واقف ہوں گے۔

تمہارا خط ایک شعلہ تھا جس نے میرے دل و دماغ میں آگ لگا دی۔ تم سے نفرت کا لاوا ایکدم اُبل پڑا اور میں نے قطعی انکار کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ خط بھیج کر تم نے مجھے پھر چڑایا ہو۔ امّی جان نے میرے فیصلہ کو حیرت سے سُنا اور پھر خاموش ہوگئیں۔ تمہیں جواب لکھ دیا گیا۔ پھر تمہارے خطوط براہِ راست میرے پاس آنے لگے، آتے رہے اور میں بغیر پڑھے اُنھیں آتشدان کی نذر کرتی رہی لیکن کیا

ظاہری آب و تاب، باطنی خوش فکری اور تیسری چیز اِس میں "بیسویں صدی" کے مدیرِ شہیر حضرتِ خوشتر گرامی کو شامل کر لیجئے۔ اِن سہ گونہ خوبصورتی اور خوب سیرتی کا نام "بیسویں صدی" کا ۱۹۶۶ء کا افسانہ نمبر ہے جو اِس وقت ہماری میز کی زینت ہے۔

ہندوستان کے ادبی رسائل میں فنِ افسانہ کا شستہ مزاق اور تاریخ ساز معیار قائم رکھنے اور اُسے برابر بڑھاتے رہنے میں "بیسویں صدی" نے جو رول ادا کیا ہے، اُسے آنے والا ادبی مورخ رہنمایانہ حیثیت کی جگہ دینے پر مجبور ہو جائے گا۔ خوشتر صاحب کے مرتب کئے ہوئے خاص نمبروں میں وہی شان ہوتی ہے جو کسی اعلیٰ خاندان کے فرد کی ورثہ میں ملی ہوئی خوبیوں اور صلاحیتوں میں ہوتی ہے۔ "بیسویں صدی" کی ادبی روایات ایک اعلیٰ خاندان کی سی روایات ہیں۔ اِس لئے ہم جب زیرِ نظر افسانہ نمبر کی شاہکار تخلیقات پڑھتے ہیں تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ مسرت ہوتی ہے اور بے اختیار ہمارا جی چاہتا ہے کہ اپنے قارئین کو اِس افسانہ نمبر کے مطالعہ کی دعوت دیں اور اس کے ساتھ اُن برگزیدہ افسانہ نگاروں کو بھی مبارکباد دیں جنھیں خوشتر صاحب نے اِس گلدستہ میں ایک ساتھ اکٹھا کر کے شائقینِ فن کی تسکینِ نگاہ و دل کی ہے۔

روزنامہ "ملاپ" دہلی

میں واقعی مطمئن اور خوش تھی؟ نہ جانے یہ کون سا غم تھا جو میری روح کو گھلائے جا رہا تھا۔ یہ کیسا احساسِ ناکامی تھا، جس نے میرے مستقبل کے متعلق خوش آئند خواب مٹا دیئے تھے۔ کتنے ہی اچھے اچھے پیغام آئے اور امّی جان نے مجھ سے رائے طلب کی لیکن نہ جانے کیوں میں نے سب کو ٹھکرا دیا اور سرے سے شادی ہی کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر اُنھوں نے اِس مسئلہ پر بات کرنی ہی چھوڑ دی۔ گھر کی تنہائیاں مجھے کاٹنے کو دوڑتیں۔ تنگ آکر میں نے بجنور کے ایک اسکول میں ملازمت کر لی اور خدا کی اُس ننھی منی معصوم مخلوق میں اپنے دل کی ویرانیاں سمو دینے کی کوشش کی۔ آدھا دن اسکول میں گزر جاتا اور باقی وقت لائبریری میں مشغلہ کے طور پر میں نے قلم کو ساتھی بنایا۔ میرے مضامین اور افسانے رسالوں میں چھپنے اور داد و تحسین پانے لگے اور روزانہ تعریفی خطوں کے پلندے آنے لگے۔ رفتہ رفتہ تنہائی کا احساس ختم ہونے لگا۔

پھر سُنا کہ تم فوج میں بھرتی ہوگئے۔ ایک لمحہ کو دل دھڑکا اور پھر اپنی مصروفیتوں میں کھو گیا۔ پھر معلوم ہوا کہ تم ٹی۔ بی کے مریض ہو کر گھر واپس آگئے۔ دل میں ایک کسک ہوئی۔ اُمیدوں کا طوفان سا اُٹھا اور تھوڑے سے مدوجزر کے بعد ختم ہو گیا۔ تمہارے لئے میرے دل میں جگہ ہی کتنی تھی! لیکن تم نے تو انجانے میں

سامنے ہی دل پر قبضہ کر لیا تھا۔

اور پھر وہ ایسی ہی اندھیری رات تھی۔ کئی دن سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ فضا میں کچھ اُداسی اور بڑھ گئی تھی۔ میں لیمپ کی روشنی میں اپنی پُرانی کتابوں کو اُلٹ پلٹ رہی تھی کہ ایک کتاب میں سے تمہاری تصویر نکل پڑی۔ ارے! یہ میرے پاس کہاں سے آئی؟ میں نے حیرانی سے اُلٹ کر دیکھا تو پُشت پر لکھا تھا ؎

مرنے سے ہمیں انکار نہیں جیتے ہیں مگر اِک حسرت میں
بھولے سے ہمارا نام کبھی آجائے ترے افسانوں میں!

اُس کے نیچے تمہارے دستخطوں کے ساتھ تین سال پہلے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ اوہ! تو تم نے مجھ سے معافی مانگتے ہوئے یہ ناقابلِ معافی کام بھی کر دیا تھا! اور معافی مانگنے کے لئے میرے کمرے میں آکر کتاب میں یہ تصویر رکھ دی تھی۔ تصویر میرے سامنے پڑی ہوئی تھی اور تم اُداس مُسکراہٹ لبوں پر لئے ہوئے مجھ سے کہہ رہے تھے۔ ”مجھے معاف کر دینا شیریں! میں نے تمھیں بہت پریشان کیا ہے لیکن صرف یہ سوچ کر معاف کر دینا کہ زندگی کے سفر میں اچھے ساتھی بھی ملتے ہیں بُرے بھی۔ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یاد دل میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ جاتی ہے اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر ایک سرسری نظر ڈال لینا ہی کافی ہوتا ہے اور اُن کی صورت ذہن پر کوئی نقش چھوڑے بغیر محو ہو جاتی ہے۔ شیریں رانی! تم مجھے بھی دوسری قسم کے لوگوں میں شمار کر کے اگر کبھی میرا خیال بھی آئے تو جھٹک دینا۔ گُم کردہ راہ مسافر ایک اور راستہ پر چل پڑا ہے۔“ تمہارا ہیولیٰ تصویر سے نکل کر ہوا میں بلند ہوتا گیا۔ تم نے رخصتی سلام کیا اور مجھے در و دیوار گھومتے ہوئے معلوم ہونے لگے اور پھر جب آنکھ کھلی تو سرہانے بیٹھی امی جان کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔ اُنھوں نے متشکرانہ نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک نرس میرے اوپر جُھکی ہوئی انجکشن لگا رہی تھی۔ امی جان نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں نے دو دن کی بے ہوشی کے بعد آنکھ کھولی تھی اور پھر جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی تو امی جان نے تمہارا وصیت نامہ دکھایا۔ تم نے اُسی رات اِس بے وفا دُنیا کو خیرباد کہا تھا جس رات میں نے تمہاری تصویر پائی تھی۔ تم نے وصیت میں اپنے حصّہ کی کُل جائداد کا مالک مجھے بنا دیا تھا ساتھ ہی تمہارا لکھا ہوا ایک چھوٹا سا پرچہ تھا۔ جس میں صرف یہ جُملہ لکھا ہوا تھا ”میں اپنی زندگی میں اپنے آپ کو تمھیں پیش کرنے کے قابل نہ بنا سکا لیکن میرے بعد اگر تم نے یہ ناچیز حقیر ہدیہ قبول نہ کیا تو میری روح ہمیشہ بے چین رہے گی۔“

مجھے زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے تم سامنے کھڑے ہوئے کہہ رہے ہو ——— ”جج صاحب کا فیصلہ مجھے منظور ہے لیکن میں پُورا انعام اپنی طرف سے مس شیریں کو پیش کرتا ہوں۔“ تم نے ایک بار پھر مجھے شکستِ فاش دی تھی اور تم ہمیشہ کے لئے دور اور لنک کا انعام جیتے کر سکون کی زندگی اختیار کر چکے تھے۔ میں نے تمہاری جائداد غریب اسکولوں اور یتیم خانوں کے نام وقف کر دی اور خود اپنی کوٹھی بھی چھوڑ کر ایک دُور دراز علاقے کے اسکول میں ملازمت [illegible] جس گھر میں تمہاری یاد کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا وہاں میں کیسے رہ سکتی تھی۔ دُنیا کی رونقوں سے دُور اِس دیہات میں کتنا سکون ہے لیکن میرے دل کا سکون تو نہ جانے کہاں غائب ہو چکا ہے۔ تم نے اپنی یادوں کی دولت مجھے سونپی ہے۔ یہی یادیں اب میرا سرمایۂ حیات ہیں۔ دن بھر اسکول میں مشغول رہنے کے بعد جب رات کو تھک کر بستر پر لیٹتی ہوں تو دماغ کے کسی پوشیدہ دریچے سے تم نکل آتے ہو۔ دل کی ویرانیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ محرومیوں کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔

اُف! تم نے معافی مانگنے کے بعد بھی کتنی بڑی سزا دی ہے لیکن میں اِس سے بھی بڑی سزا کی مستحق ہوں! باہر ہوا کا زور کچھ کم ہو گیا ہے کہیں دُور سے ایک اُداس آواز اُبھر رہی ہے ؎

تقاضا ہے یہی دل کا وہاں چلئے وہیں چلئے
وہ محفل، ہائے جس محفل میں دُنیا لٹ گئی اپنی

مزاحیہ

راجہ مہدی علی خاں کے محبوب مشغلے

شفیقہ فرحت۔ ایم، اے

گرلز کالج۔ بھوپال

قبلہ و کعبہ محترم خوشتر گرامی صاحب!

معاف کیجئے گا۔ القاب کچھ ہیں کاڑی کے زمانے کا ہوگیا ہے۔ لکھنا یوں چاہئے ——

روس و نیویارک محترم خوشتر گرامی صاحب!

(کہ آج کل روس و امریکہ کو کعبہ و کاشی کا درجہ ملا ہوا ہے!!) تو قبلہ ادھر کچھ عرصے سے ہند و پاک کے شاعروں اور ادیبوں میں کھلبلی مچی ہے۔ سراسیمگی، خوف و ہراس کا یہ عالم ہے کہ اہل قلم اپنے قلم (کہ جس میں خریدے، مانگے اور چرائے سب ہی شامل ہیں ——!!) چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں کہ صاحب آن گئی تو گئی اور بلا سے یہ چار آٹھ آنے کا قلم بھی چلا جائے لیکن جان تو بچ جائے اور جان سلامت تو نوکریاں ہزار! —— بعضے رو رو کر گڑگڑا کر خدا کے حضور میں فریاد کر رہے ہیں اور مندروں اور مسجدوں میں جا جا کر قسم کھا رہے ہیں کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لکھنے سے توبہ کرتے ہیں اور حلف اٹھاتے ہیں کہ آنے والی سات پشتوں میں سے بھی کسی کو ادیب نہیں بننے دیں گے؛ بلکہ ممکن ہوا تو اپنے آباؤ اجداد کی کتابیں بھی جلا دیں گے۔ تاکہ وہ ہز ہائی نس راجہ مہدی علی خاں کے عتاب سے محفوظ رہ سکیں! سو قبلہ! آپ کی امن پسند مملکت میں یہ اندھیر —— یہ ظلم —— یہ قتل عام!! —— ستم یہ کہ یہ راجہ صاحب کسی کو اُن کا قصور بتاتے ہیں نہ صفائی کا موقع دیتے ہیں۔ نہ فیصلے کے لئے کسی عدالت کسی کمیٹی سے مشورہ کرتے ہیں۔ بس آپ کا ذہن ہی کمیشن جو لکھے سو برحق!! —— اور قبلہ! یہ تو بتائیے، یہ ہیں کس ریاست کے راجہ؟ اور یہ کہ جب ہندوستان کی خورد و کلاں تمام ریاستیں جام شہادت نوش کر چکی ہیں تو آپ کی ریاست "ڈرائی ایریا" میں آکر کیسے بچ گئی؟ —— بہرحال یہ اگر وہی راجہ صاحب ہیں جو لاہور کے علاقہ مچھر ماراں میں پائے جاتے تھے اور جنھیں پندرہ بیس سال پہلے ہنسنے ہنسانے کے جرم میں تخت سے اُتار کر شہر بدر کر دیا گیا تھا اور جو آج کل بمبئی کے باندرہ جیل میں (جسے وہ اپنا گھر کہتے ہیں) حبس دوام کی سزا کاٹ رہے ہیں، تو اُن کے محبوب اور غیر محبوب مشغلوں سے یہ خاکسار خوب واقف ہے —— ذرا میری بھی سُن لیجئے۔ تاکہ ہم سب مظلوموں کے دل ٹھنڈے ہوں، اور حسرت پہلے اپنی داد کو پہنچیں . . .

شفیقہ فرحت ——

۱

تو اب ملاحظہ فرمائیں ہز ہائی نس راجہ مہدی علی خاں والیٔ ریاست مچھر ماراں کے محبوب و غیر محبوب مشغلے ——

روایت ہے کہ آپ کی ریاست کا نام پہلے کچھ اور تھا لیکن روز ولادت سے مار دھاڑ آپ کا مشغلہ رہا ہے۔ اس لئے ہوتے ہوتے ریاست کا نام پہلے "ماراں"

اور مہدی گو "پتھر باراں" ہو گیا۔ سب سے پہلے آپ ہاتھ پیر مارا کرتے تھے، پھر کلکاریاں مارنے لگے۔ اس کے بعد گرگٹ، کوّے، چڑیوں کی شامت آئی۔ عہدِ شباب میں پتھر اور مکھیاں مارتے رہے۔ آج کل مستقل طور پر ادیبوں اور شاعروں کو مارنے کا شغل اختیار کر رکھا ہے۔ مزاج بچپن سے عاشقانہ رہا ہے۔ اِس لئے آنکھیں مارنے کا عمل ہر زمانے اور ہر دَور میں بڑی شد و مد سے جاری رہا۔ (ریاست کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری تاریخوں میں یہ بات دبا دی گئی کہ مارنے کے اِس مخصوص مشغلے کے نتیجے میں اکثر اوقات آپ خود پٹ جایا کرتے تھے!) پہلے روزانہ تیس پتھر اور تیس مکھیاں مار مار کر تیس مار خاں کا خطاب حاصل کیا تھا اور اب سال میں تیس ادیب مارا کرتے ہیں تاکہ یہ خطاب تاحینِ حیات جاری رہے!

اِس درجہ گپیں مارنا کہ سُننے والا ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ایک دلچسپ بات اِس سلسلے میں سُن لیجئے۔ جب لوگوں کو آپ کی اِس ہابی کا علم ہوا تو آپ کی باتوں کو چار سے تقسیم کر کے حاصل مطلب نکالا جانے لگا۔ آپ نے فوراً آٹھ سے ضرب دینا شروع کر دیا اور اب آپ حساب میں چوکھی کا امتحان دینے والے ہیں تاکہ وقتِ ضرورت سولہ اور بتّیس کی ضرب تقسیم کا استعمال کیا جا سکے ——!!

دشمنوں کے نام ہزار ہزار صفحے کے خط لکھنا تاکہ خط پڑھ پڑھ کر اُن کی آنکھیں بیکار ہو جائیں "انھیں ہائی بلڈ پریشر ہو جائے"۔ دل کے دَورے پڑنے لگیں اور جب وہ [illegible] بیمار ہو جائیں تو جھوٹی ہمدردی دکھانے کے لئے تار بھیج بھیج کر خیریت دریافت کرنا اور اگر دشمن اِس سلسلے میں چارہ جوئی کی دھمکی دیں تو دشمنوں کے بجائے اُن کے گھر کی میز کرسیوں، کتّے بلّیوں، بکریوں اور مرغیوں کے نام اُس سے دُگنے تگنے لمبے خط لکھنا۔ دشمنوں کے اِس اعتراض پر کہ میز کرسیاں، کتّے اور بلّیاں آپ کے خط نہیں پڑھ سکتے۔ آپ کا یہ کہنا کہ مجھے ہوائی جہاز کا کرایہ دیجئے میں خود آ کر انھیں خط سناؤں گا۔

خود اپنے نام فرضی محبوباؤں کی طرف سے عشقیہ خط لکھ لکھ کر اپنی سیدھی سادی بھولی بھالی بیگم کو جلانا اور اُن پر رعب جمانا اور بیوی کے نام فرضی عاشقوں کی طرف سے خط لکھ کر اُسے پریشان کرنا!

غم اور قسم کے علاوہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا۔ غم اِس لئے نہیں کھاتے کہ غم کا نعم البدل یعنی بیگم صاحبہ کی ڈانٹ صبح و شام باقاعدگی سے کھاتے رہتے ہیں۔

رہی قسم —— سو اُس کے کھانے کی گنجائش ہوتی تو ایک آدھ کباب، ایک آدھ پراٹھا اور نہ کھا لیتے ——!

کھانے کا شغل اِس درجہ بڑھ گیا ہے کہ سارے گھر والے، محلّہ پڑوس والے اور دوست احباب سب پریشان ہیں۔ خانساماں مُنہ اندھیرے یعنی آدھی رات سے اُٹھ کر آپ کے لئے سالم بکرا بھونتا ہے، درجنوں مُرغ تلتا ہے اور انڈے اُبالتا ہے۔ آپ کے اُٹھنے سے پہلے دو مرغ اور ایک درجن انڈے مسہری سے لٹکائے جاتے ہیں۔ آنکھ کھولتے ہی لیٹے لیٹے بیڈ ٹی کے بجائے آپ مُرغ اور انڈے نوش فرماتے ہیں۔ تب کہیں بستر سے نکلنے کی سکت آتی ہے۔

ہاتھ مُنہ دھو کر بکرے پر نظرِ عنایت ہوتی ہے۔ بکرا کھانے کا یہ طریقہ ہے کہ آپ کے کمرے میں چھت سے بکرا لٹکا دیا جاتا ہے۔ آپ باتیں کرتے جاتے ہیں، لکھتے جاتے ہیں، ٹہلتے جاتے ہیں اور تھوڑی تھوڑی دیر میں چھری سے کاٹ کاٹ کر ایک ایک ٹکڑا کھاتے جاتے ہیں —— رات کو جب خانساماں کانی کاٹ کاٹ کر آتا ہے تو اُسے صرف چند ہڈیاں ملتی ہیں! (خیال رہے کہ لنچ اور ڈنر سے اِس بکرے کا کوئی رشتہ نہیں ——!)

مستقبل کی اُس گھڑی میں جب مہدی کو جنبش نہ ہوگی مگر آنکھوں میں دم ضرور رہوگا، آپ مستقل طور پر اپنا پلنگ کھانے [illegible] اور کھانے کی میز کا دکھینا وصیت لکھوائیں [illegible] جائے گا اور جو وصیت آپ لکھوائیں گے۔ اُس کا دالفقرہ کچھ اِس طرح کا ہوگا ——

[illegible] مہدی علی خاں [illegible]

بہ عالمِ کیف و سرور یہ وصیت [illegible]

اِس عالمِ مُرغ و ماہی سے شکم [illegible]

تو میرے غم میں احباب کھانا پینا ہرگز [illegible]

کھائیں اور کھا کھا کر ماتم کریں —— [illegible]

پھول چڑھانے کے بجائے پاپڑ بھیجے [illegible]

کے بجائے عمدہ عمدہ کھانوں [illegible]

سالانہ عرس کے موقع پر انواع و اقسام [illegible]

چیزوں کی دوکانیں لگائی جائیں اور [illegible]

میرا فاتحہ دیا جائے ——!!

دوستوں کی دعوت کرنا۔ اُن کے [illegible]

ایک آدھ لقمہ دے کر باقی خود کھا جانا اور [illegible]

فوائد اور زیادہ کھانے کے نقصانات [illegible]

اپنی خوا[illegible]

خاص موٹر کے [illegible]

کے لئے اُس وقت [illegible]

عام موٹروں کے آگے پیچھے چاروں پہیئے کبھی آپ کے بیٹھتے ہی اور کبھی میل آدھ میل چل کر پنکچر ہو جاتے ہیں! اور ایک بار آپ ٹم ٹم میں بیٹھے تھے۔ آپ کے احترام میں گھوڑا ابھی بیٹھا اور ایسا بیٹھا کہ پھر اُٹھ نہ سکا! ان تمام ناخوشگوار واقعات کے بعد آپ نے وہ خاص گاڑی بنوائی جو ٹنوں وزن اُٹھا سکتی ہو۔ لیکن بظاہر کار نظر آئے اور جس کا دروازہ چھ فٹ چوڑا ہو!

اطلاعاً یہ بھی عرض ہے کہ آپ کے گھر کا سارا فرنیچر بلکہ فرش تک اسی ایک نکتے کو ذہن میں رکھ کر بنوایا گیا ہے۔ اور اوّل تو آپ باہر نکلتے ہی نہیں اور جو کبھی نکلیں تو اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کمزور زمین پر پیر نہ پڑ جائے۔ ورنہ بے خزانہ قارون کا سا حشر ہوگا ـــــــ!!

ہر وقت بے تحاشا قہقہے لگانا اور دوسروں کو لگوانا۔ قہقہوں کے اس مسلسل عمل سے گھر کے آس پاس نہ صرف دیوارِ قہقہہ بلکہ قلعۂ قہقہہ تعمیر ہو چکا ہے۔ بمبئی کارپوریشن اس غیر قانونی تعمیرات سے سخت پریشان ہے اور قانونی چارہ جوئی کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھاتے ہوئے اس لئے ڈرتی ہے کہ فٹ پاتھ کی وہ ساری جن سنگھ جو اس "دیوارِ قہقہہ" کے زیرِ سایہ کچھ دیر جی لیتی ہے وہ کہیں جوش میں آ کر ہڑتال وڑتال نہ کر دے!

روزانہ رات کو ساڑھے گیارہ سے ساڑھے بارہ تک قہقہہ لگانے کی کلاس چلانا! جس میں آپ کبھی لطیفے سنا کر، کبھی نقلیں کر کے اور کبھی ڈانٹ پھٹکار سے قہقہے لگانا سکھاتے ہیں۔ اس قہقہہ اسکول کی فیس صرف سات اور سات چودہ درشنی سلام ہے ـــــ!

فلموں کے لئے گانوں کے بجائے نثر لکھنا اور اپنی زبان کی قسمیں دے دے کر میوزک ڈائرکٹر سے یہ اصرار کرنا کہ ان کی دُھنیں بنایئے۔

رسالوں کے لئے مضمون کے بجائے خط لکھنا اور خطوں کے بجائے نظمیں لکھنا!

فلمی اور غیر فلمی دُنیا میں اپنے آپ کو سب سے حسین سمجھ کر "شری جمال الدین" کا رول ادا کرنا۔ خانساماں سے خوشامد کر کر کے چنگاریاں مانگنا۔ اور جہاں جہاں بھُس کے ڈھیر نظر آئیں اُن پر ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ڈالنا۔ پھر تماشا دیکھنے کے بجائے فائر بریگیڈ کو بلانے دوڑنا! اور جب بھُس نہ ملے تو چنگاریاں رکھ کر اس پر بھُس ڈالنا کہ "ایک ہنگامے پہ موقوف ہے ـــــ!"

انتہائی ذوق و شوق سے قسطوں میں تصویریں اُتروانا۔ آپ کا طول و عرض گزشتہ سن کے خاصے بڑے حصے میں پھیلا ہے اور ایک ہی بار میں آپ کے جسم کا تمام علاقہ [illegible] کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے آپ کی ایک تصویر تین چار قسطوں میں کھینچی جاتی ہے! اور پھر انہیں جوڑ کر مکمل کر لیا جاتا ہے ـــــ!!

شہر کے تمام دھوبیوں کے نام دعوت نامے بھیج کر سنگیت کا ریاض کرنا۔

قلم اور زبان کے علاوہ کسی اور چیز کو ہلانا گُناہ سمجھنا۔

پنڈتوں اور نجومیوں کو بُلا کر ہاتھ دکھانا۔ جنم کنڈلیاں بنوانا اور اُن کے بالکل برعکس کام کر کے پنڈتوں اور نجومیوں کو جھوٹا ثابت کرنا اور بغیر پیسے دئے مار مار کر بھگا دینا!

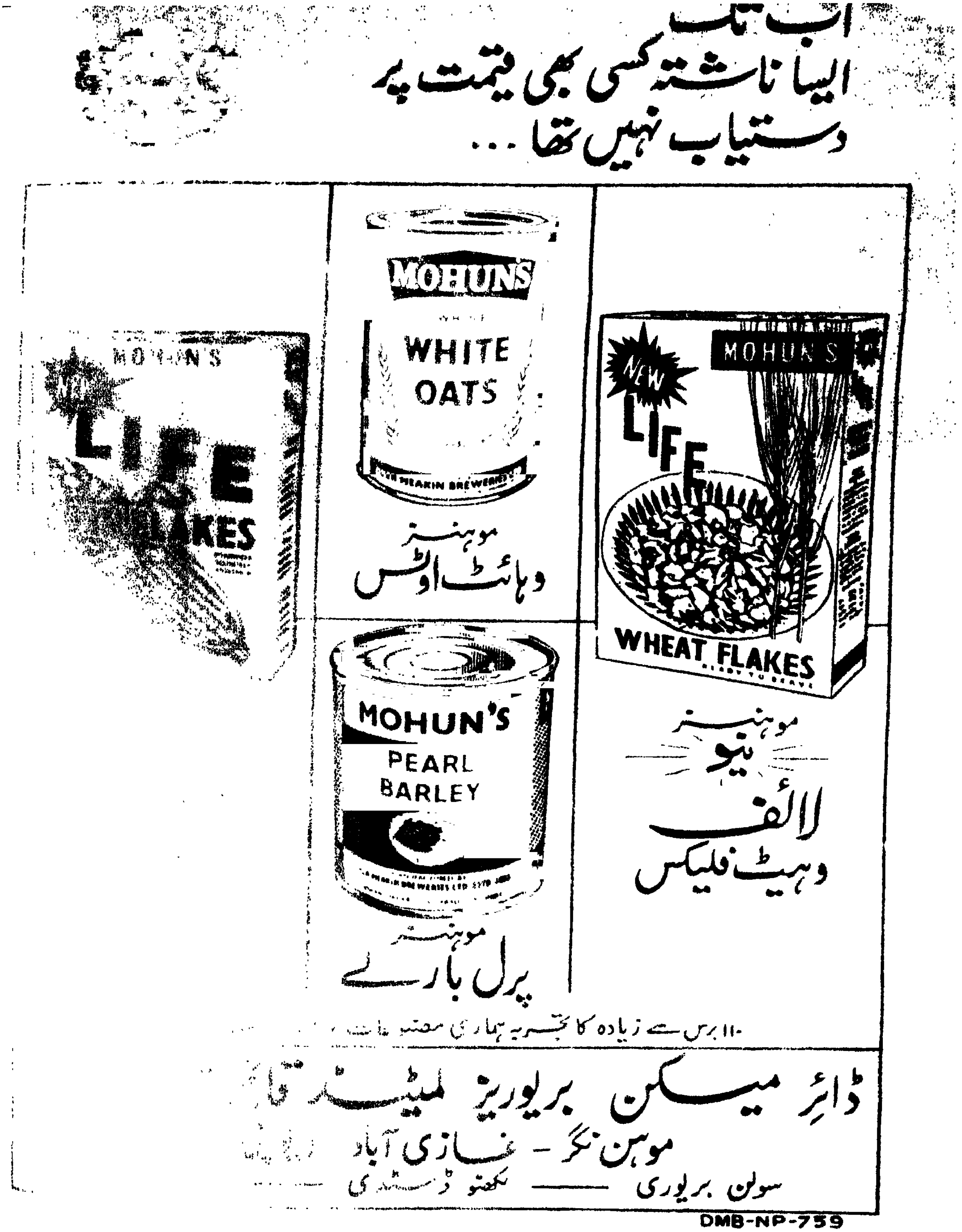
روزانہ رات کو ڈراپر سے ساڑھے چار قطرے برانڈی حلق میں ٹپکا کر یہ مصرع پڑھنا ؎

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

وہ تو اس کے قریب بھی نہیں جاتے۔ (ادارہ)

اور پھر یہ کہہ کر سو جانا ـــــــ

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!"


اب تک
ایسا ناشتہ کسی بھی قیمت پر
دستیاب نہیں تھا...
MOHUN'S
WHITE
OATS
موہنز
وہائٹ اوٹس
MOHUN'S
NEW
LIFE
WHEAT FLAKES
MOHUN'S
PEARL
BARLEY
موہنز
پرل بارلے
موہنز
نیو
لائف
وہیٹ فلیکس
۱۱۰ برس سے زیادہ کا تجربہ
ڈائر میکن بریوریز لمیٹڈ
موہن نگر - غازی آباد
سولن بریوری
DMB-NP-759



زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱۔ جامن ــــ ایک ارزاں اور مفید پھل

جامن ہند و پاکستان کا مشہور پھل ہے۔ یہ برسات کے موسم میں آم کے ساتھ [illegible] دیہات میں خصوصاً کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ذائقہ میں ترش اور [illegible] اور غذائی خصوصیات کا حامل ہے۔ جامن کو آم کا مصلح [illegible] جامن کھانے سے وہ جلد ہضم ہو جاتے ہیں [illegible] قسم کی گرانی محسوس [illegible] جامن بھی مقوی باہ، مقوی معدہ [illegible] جگر ہے۔

[illegible] اس کا مزاج سرد خشک [illegible] ہاضم اشتہا آور اور مقوی [illegible] موافق ہے [illegible] اور [illegible] کو کم کرتی ہے اور [illegible] اس میں بہت سے غذائی اجزا [illegible] خاص طور پر [illegible] حیاتین جو صحت کی حفاظت [illegible] کی وجہ سے [illegible] بہت کم [illegible]

[illegible] والے ہوں تو یہ بہت کام کا پھل ہے۔

[illegible] اور صفرا کی زیادتی میں [illegible]

[illegible] خرابیوں یا دوسرے فاسد مادوں [illegible] پیدا [illegible] استعمال سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں [illegible]

[illegible] صفرا کی زیادتی کے [illegible] جامن بے حد مفید ہے۔

[illegible] اور [illegible] پیدا ہونے والی [illegible] زیادتی میں اس کا استعمال حیرت انگیز [illegible]

جامن اشتہا آور ہے۔ اس کے کھانے سے کھل کر بھوک لگتی ہے [illegible] پیاس کی شدت دور ہو جاتی ہے۔ جامن کو نمک کے ساتھ یا نمک ملا کر کھانا چاہئے ورنہ درد شکم [illegible] گرانی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

جامن [illegible] یا خالی پیٹ ہرگز نہ کھائیں۔ خلوئے معدہ کی حالت میں اس کا استعمال [illegible] پیدا ہو [illegible] کے ساتھ [illegible] گرانی [illegible]

[illegible] قوت [illegible] بہت [illegible] کارآمد

[illegible] استعمال کرنا چاہئے [illegible] جامن [illegible] کو [illegible]

[illegible] جامن کا [illegible]

[illegible] مشہور [illegible]

[illegible] جامن کا [illegible] نمک اور [illegible] ہے [illegible] اجزا پائے جاتے ہیں جن سے جسم فربہ ہوتا ہے اور [illegible] یہ خون کے فاسد اور زہریلے مادوں کو پیشاب کے



زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کار آمد اشارات

۱۔ جامن ..... ایک ارزاں اور مفید پھل

جامن ہند و پاکستان کا مشہور پھل ہے۔ یہ برسات کے موسم میں آم کے ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ دیہات میں خصوصاً کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ذائقہ میں ترش اور فوائد کے لحاظ سے بہت سی دوائی اور غذائی خصوصیات کا حامل ہے۔ جامن کو آم کا مصلح سمجھا جاتا ہے۔ آم کھا کر جامن کھانے سے وہ جلد ہضم ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی گرانی محسوس نہیں ہوتی۔ آم کی طرح جامن بھی مقوی باہ، مقوی معدہ و جگر ہے۔

اطبا کی رائے میں اس کا مزاج سرد خشک ہے۔ ہاضم اشتہا آور اور مقوی معدہ ہے۔ گرم مزاجوں کو بے حد موافق ہے۔ معدے اور جگر کی گرمی کو کم کرتی ہے اور معدے اور جگر کو قوت بخشتی ہے۔ اس میں بہت سے غذائی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ایسے معدنی اجزاء اور نمکیات، جو صحت کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں، جامن سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ لاعلمی کی وجہ سے شہروں میں اس کا استعمال بہت کم ہے لیکن اگر ہم اس کے فوائد سے واقف ہوں تو یہ بہت کام کا پھل ہے۔

معدے کی حدت اور صفرا کی زیادتی میں جامن بہت مفید ہے۔ ایسے لوگ جن کے معدے میں غذائی خرابیوں یا دوسرے فاسد مادوں کی وجہ سے تیزابیت پیدا ہو گئی ہو، جامن کے استعمال سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ معدے کی تیزابیت، ضعف ہضم، حدت اور صفرا کی زیادتی کے لئے جامن بے حد مفید ہے۔

جامن معدے اور خون کی حدت سے پیدا ہونے والی شکایتوں کو دور کرتی ہے۔ جگر کی کمزوری اور صفرا کی زیادتی میں اس کا استعمال حیرت انگیز فوائد کا حامل ہے۔

جامن اشتہا آور ہے۔ اس کے کھانے سے کھل کر بھوک لگتی ہے اور پیاس کی شدت دور ہو جاتی ہے۔ جامن کو نمک کے ساتھ یا نمک ملا کر کھانا چاہئے ورنہ درد شکم یا گرانی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

جامن نہار منہ یا خالی پیٹ ہرگز نہ کھائیں۔ خلوئے معدہ کی حالت میں اس کا استعمال مضر ہے۔ پیٹ میں درد اور بد ہضمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے احتیاط کے ساتھ نمک لگا کر کم مقدار میں کھانا چاہئے کیونکہ یہ قبض پیدا کرتی ہے۔ قابض ہونے کی وجہ سے اس کا رس دستوں اور پیچش کی حالت میں بہت مفید ہے۔

جامن کا سرکہ گوناگوں دوائی فوائد کا حامل ہونے کی وجہ سے بہت کار آمد چیز ہے۔ اسے برسات کے موسم میں کھانے کے ساتھ پیاز وغیرہ ملا کر استعمال کرنا چاہئے۔ یہ معدے اور جگر کی بیماریوں میں خاص طور پر مفید ہے۔ جسم کو ہیضہ کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ ضعف ہضم کو دور کرتا ہے، بھوک بڑھاتا اور غذا کو جلد ہضم ہونے میں مدد دیتا ہے۔

تلی کی بیماریوں میں جامن کا سرکہ بے حد مفید ہے۔

سرکہ بنانے کے لئے جامنوں کو اچھی طرح گھول کر ان کا رس نچوڑ لیتے ہیں اور اسے کسی باریک کپڑے میں چھان کر مٹی یا شیشے کے صاف ستھرے برتن میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ ترشی پیدا ہو جانے پر اسے دوبارہ چھان کر بوتلوں میں بھر لیا جاتا ہے۔

جامن آم کی مصلح ہے۔ یہ بات بہت مشہور ہے اور شاید قدرت نے اسی لئے جامن کو آم کے موسم میں پیدا کیا ہے۔ آم کھانے کے بعد اگر تھوڑی سی جامنیں کھالی جائیں تو نہ صرف آم جلد ہضم ہو جاتے ہیں بلکہ پیٹ میں گرانی بھی پیدا نہیں ہوتی۔

جامن زیادہ مقدار میں نہیں کھانے چاہئیں۔ جامن کا مصلح نمک اور اجوائن ہے۔

جامن میں کچھ ایسے غذائی اجزاء پائے جاتے ہیں، جن سے جسم فربہ ہوتا ہے اور خون کی پیدائش بڑھ جاتی ہے۔ یہ خون کے فاسد اور زہریلے مادوں کو پیشاب کے

راستے خارج کر دیتی ہے۔ مثانہ کی کمزوری اور پیشاب کی کمی میں اِن کا استعمال خصوصیت سے ساتھ مفید ہے۔ اِن کے استعمال سے پیشاب کھُل کر آتا ہے۔ پیشاب کی زیادتی اور پیشاب کے ساتھ شکر آنے (ذیابیطس) کی مہلک بیماری میں قیمتی دواؤں سے زیادہ سود مند ہیں

جامن بطور پھل تو مفید ہے ہی لیکن اس کی گٹھلی، اِس کے درخت کے پتے اور چھال بھی اکثر دواؤں میں کام آتے ہیں۔

جامن کی گٹھلی کا سفوف بنا کر تین تین ماشے صبح شام نیم گرم دودھ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس سے مثانہ کی کمزوری دُور ہو جاتی ہے۔ یہ سفوف مردانہ قوّت میں اضافہ کرتا ہے اور بے حد مغلظ منی ہے۔

ایک ماشہ جامن کی گٹھلی کا سفوف، نصف ماشہ کشتہ فولاد میں ملا کر سونف کے عرق کے ساتھ صبح شام استعمال کرنے سے ذیابیطس کے مریضوں کو بہت جلد فائدہ ہو جاتا ہے۔ جامن کا سفوف مغلظ منی ہے اور پیشاب کی زیادتی کو روکتا ہے۔

جامن کے پھول بھی گراں قدر دوائی افادیت رکھتے ہیں۔ ایک تولہ جامن کے پھولوں کو دو چھٹانک عرقِ گاؤ زباں میں پیس کر چھان لیں۔ اِسے دن میں تین چار مرتبہ استعمال کریں۔ ذیابیطس کے مریضوں کے لئے بید مفید دوا ہے۔

کچی جامنوں کو خشک کر کے اُن کا باریک سفوف بنائیں اور اُس میں ہم وزن مصری پیس کر ملا دیں۔ سیلان الرحم یا لیکوریا کی مریض عورتوں کے لئے چھ چھ ماشہ صبح و شام پانی یا دودھ کے ساتھ اِس کا استعمال قیمتی دواؤں سے زیادہ سود مند ہے۔

جامن کے ایک تولہ پتّوں کو پانی میں پیس چھان کر اور اُس میں حسبِ ضرورت مصری ملا کر صبح شام استعمال کرنا خونی بواسیر کے لئے مفید ہے۔ پرانی بواسیر میں ایک تولہ جامن کے پتوں کو پاؤ بھر گائے کے دودھ میں پیس چھان کر ہفتہ عشرہ تک مسلسل استعمال کریں۔ یہ بواسیر کی بہت مفید اور زود اثر دوا ہے۔

جامن کی چھال کو پانی میں جوش دے کر غرارے کرنا مسوڑھوں اور دانتوں کی بہت سی بیماریوں میں نافع ہے۔ اِس سے مسوڑھوں کا ورم اور خون نکلنا بند ہو جاتا ہے۔ دانت بھی مضبوط ہوتے ہیں۔

جامن کی لکڑی کا کوئلہ باریک پیس کر اس میں کالی مرچ اور نمک ملائیں اور اِسے بطور منجن استعمال کریں۔ اِس سے دانت صاف اور مضبوط ہو جاتے ہیں اور اُن کی چمک میں اضافہ ہوتا ہے۔

گنج کے مقام پر جامن کی گٹھلی کا لیپ کرنے سے گنجاپن دُور ہو جاتا ہے اور جلد ہی بال نکل آتے ہیں۔ اِس کے استعمال سے چند ہی روز میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔

جامن بے شمار فوائد کی حامل ہے۔ یہ بہت سستی اور کم قیمت شے ہے اور قیمتی دواؤں سے زیادہ مفید ہے۔

۲ • مسرت کا راز

آپ کے گرد و پیش مسرت اور خوشی بکھری ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو اُن سے اپنا دامن بھر لیں اور نہ چاہیں تو اپنا دامن خالی رہنے دیں ـــــ زرتشت نے کہا ہے ـــــ دوسروں سے نیکی کرنا آپ کا فرض نہیں ہے، یہ ایک خوشی ہے یہ آپ کی مسرت اور خوشی کو بڑھاتی ہے ـــــ اس حقیقت کو اور واضح طور پر جاننا چاہیں تو ڈیل کارنیگی کے اِن خیالات سے آپ کو کافی روشنی ملے گی۔

آپ کی زندگی چاہے کتنی ہی غیر دلچسپ اور رُوکھی پھیکی کیوں نہ ہو، آپ یقیناً ہر روز کچھ لوگوں سے ضرور ملتے ہوں گے۔ آپ اُن کے متعلق کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ انھیں ٹکٹکی باندھ کر محض دیکھنے پر اکتفا کرتے ہیں یا کبھی یہ جاننے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ یہ اُدھار لیتے ہیں تو کون سی ضرورت انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے؟ اپنے پوسٹ مین ہی کو لیجئے ـــــ وہ ہر سال سینکڑوں میل پیدل چلتا ہے، آپ کے گھر پر ڈاک پہنچاتا ہے۔ مینہ ہو یا آندھی، وہ اپنا فرض پُورا کرتا ہے لیکن کبھی آپ نے یہ دریافت کرنے کی تکلیف گوارا کی کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ اُس کی زندگی کیسے گزر رہی ہے؟ اُس کے بچوں کا کیا حال ہے؟ کیا آپ نے کبھی اُس سے یہ پُوچھا ـــــ تم تھک تو نہیں گئے؟ تمھیں اپنے کام سے اکتاہٹ تو محسوس نہیں ہوتی؟

پرچون فروش چھوکرا، اخبار فروش لونڈا اور وہ لڑکا جو آپ کے جُوتوں پر پالش کر رہا ہے، یہ سب انسان ہیں ـــــ انھیں بھی مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آتی ہیں۔ اُن کی بھی اُمیدیں ہیں، آرزوئیں ہیں، اُمنگیں ہیں۔ انھیں بھی ایسے مواقع کی تلاش ہوتی ہے کہ کوئی ان کا دُکھ سُکھ بٹائے، اِن کے ساتھ ہمدردی اور اخوّت کا اظہار کرے۔ لیکن کیا آپ کبھی انھیں موقع دیتے ہیں؟ کیا آپ ان کی زندگیوں میں مخلصانہ اور پُر شوق دلچسپی لیتے ہیں؟ دُنیا کی بھلائی کرنے اُس کی بہتری سوچنے کے لئے آپ کو مصلح یا ریفارمر بننے کی ضرورت نہیں۔ آپ اُن لوگوں سے آغاز کر سکتے ہیں جن سے آپ ملیں!

اِس سے آپ کو کیا ملے گا؟ بے اندازہ مسرت! اور اِس سے بھی بڑ تسلی اور اپنے آپ پر ناز! زرتشت کے الفاظ میں "دوسروں سے نیکی کرنا فرض نہیں ہے، یہ ایک خوشی ہے۔ کیونکہ یہ آپ کی خوشی اور مسرت کو بڑھاتی

اور بنجمن فرینکلن نے نہایت سادہ الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔
"جب آپ دوسروں پر مہربان ہوتے ہیں، اپنے اوپر مہربان ہوتے ہیں"
مسرت اور خوشی کا یہ راز کتنا سادہ ۔۔۔ کتنا روشن ہے !!

۳ • اِملی ـــــ وٹامن سی کا خزانہ

دال، سبزی اور چٹنیوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا مزاج سرد و
خشک ہے۔ اس لئے گرم مزاج والوں کے لئے اس کا استعمال بہت مفید ہے۔ بخار اور
صفرا کے غلبہ کو تسکین دیتی ہے اور صفرے کو پاخانہ کے ذریعہ خارج کرتی ہے۔
گرمیوں میں املی کا شربت پینے سے لوؤں کی مضرت سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔ چار پانچ
تولے املی کا گودا لے کر اُسے آدھ سیر پانی میں سھگو رکھیں اور تین چار گھنٹے کے بعد
صاف پانی نتھار کر مصری یا چینی سے میٹھا کر کے پئیں۔
املی آلو بخارا سے زیادہ لطیف ہے۔ قبض کشا ہے۔ صفرا کو پاخانہ کے
ذریعہ خارج کرتی ہے۔ دل کی گرمی کو دُور کرتی ہے۔ بد ہضمی، بے چینی، پیاس،
جوشِ خون میں بہت مفید ہے۔ طبیعت کو فرحت بخشتی ہے۔ گرمیوں میں سورج کی
تپش اور لُو سے محفوظ رہنے کے لئے اِس کا استعمال بہت مفید ہے۔ رات کو پانی
میں بھگو کر صبح مصری یا چینی مِلا کر موسم گرما میں نافع ہے۔ کھانسی میں مضر ہے۔ حلق
میں خراش پیدا کر کے کھانسی بڑھاتی ہے۔ پھیپھڑوں کے لئے نقصان دہ ہے۔
صفراوی بخاروں میں جبکہ گرمی کی وجہ سے پیاس شدید ہوتی ہے، قے
اور متلی ہوتی ہے، املی کا شربت پلانے سے بخار کی گرمی کم ہو جاتی ہے۔ متلی اور
قے بند ہو جاتی ہیں اور گرمی کے باعث اختلاجِ قلب ہو تو وہ بھی رفع ہو جاتا ہے۔
جدید تحقیقات کے مطابق املی میں وٹامن سی بکثرت پائے جاتے ہیں اور عجیب
بات یہ ہے کہ یہ وٹامن املی میں سبز ہونے کی حالت میں مِلتے ہیں اور خشک
ہو جانے پر بھی موجود رہتے ہیں۔
غذا میں وٹامن سی کی موجودگی جلدی بیماریوں اور فسادِ خون سے
محفوظ رکھتی ہے۔ خون کی کمزوری، دانتوں اور مسوڑھوں کے امراض سے بچنے
کے لئے وٹامن سی ضروری ہے۔
بنگال، مدراس، مہاراشٹر اور اڑیسہ میں چاول کے ساتھ املی کا رس
پیتے ہیں۔ مرطوب آب و ہوا کی خرابی سے پیدا ہونے والے اثرات سے محفوظ رہنے
کے لئے سمندر کے کنارے کے علاقوں میں املی بکثرت استعمال ہوتی ہے۔
جس طرح پکوڑیاں اور آلو ڈال کر دہی کا رائتہ بنایا جاتا ہے، اسی طرح
اِملی کے رس میں پکوڑیاں اور آلو مِلا کر رائتہ کے طور پر دہلی اور یو۔پی میں عموماً

"بیسویں صدی" کا حسین و دل نواز افسانہ نمبر بیسویں صدی کی ۔۔۔
روایتی خوبیوں کا حامل ہے۔ اکثر افسانے بہت جم کر اور جی لگا کر لکھے گئے ہیں۔
"بیسویں صدی" کا اپنا ایک مخصوص رجحان ہے جس نے اُردو افسانہ نگاری میں
ایک سکول کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ "بیسویں صدی" نے جو نام پایا ہے وہ
خوشتر گرامی کی غیر معمولی مدیرانہ صلاحیتوں کی مرہونِ منّت ہے۔ یہ حسین و جمیل
جریدہ خوشتر گرامی کی پوری شخصیت کا پرتو ہے۔ خدا کرے اُردو صحافت کو
خوشتر جیسے ہزاروں نہیں سینکڑوں ـــــ سینکڑوں نہیں تو ایک ـــــ درجن ہی
مدیران جرائد نصیب ہو جائیں تو اُردو زبان و ادب کے رُوئے تاباں پر کچھ اور
جلا ـــــ کچھ اور نکھار آ جائے۔ "بیسویں صدی" کے زیرِ نظر افسانہ نمبر کو کم از کم
ایک نظر نہ دیکھنا بڑی بد ذوقی اور محرومی کی بات ہوگی ۔۔۔
روزنامہ "ملک و ملت" دلّی

کھایا جاتا ہے۔

۴ • زکام میں غفلت نہ کیجئے

عام طور پر زکام کو ایک معمولی مرض سمجھا جاتا ہے لیکن دراصل یہ ایک
خطرناک مرض ہے۔ جب اِس کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے تو اِس کا علاج مشکل
ہو جاتا ہے اور نتیجے میں کئی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ زکام کے ساتھ کھانسی کا ہو
لازمی ہے۔ اِس کے علاوہ شدید مہلک امراض پلیورسی اور نمونیہ تک نوبت پہنچ
جاتی ہے۔ نزلہ شدت اختیار کر لیتا ہے تو سامعہ پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض
اوقات اِس کی وجہ سے کان کے پردے میں مواد پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کے گل جانے
سے مریض بالکل بہرہ ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ناک، کان کی جھلّی سے
التہاب بڑھ کر دماغی جھلّیوں تک پہنچ جاتا ہے اور سرسام ہو جاتا ہے۔
عام حالات میں نزلہ و زکام کی وجہ سے دردِ سر، دورانِ سر، ضعفِ
دماغ اور تکان پیدا ہونا تو معمولی بات ہے۔ اِسی وجہ سے آنکھوں کی بینائی
کمزور ہو جاتی ہے۔ دانت کمزور ہو کر جلد ہی گر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اِس کی وجہ
سے معدہ اور آنتیں بھی ماؤف ہو جاتی ہیں۔ بعض مریض اِس کے باعث سِل و دق
جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔
سردی لگنا، بارش میں بھیگنا، گرما گرم یا تیز مسالہ دار کھانا کھا کر فوراً
سرد پانی پینا، ترش چیزیں کثرت سے استعمال کرنا، اِس مرض کے عام اسباب ہیں
ہیں۔ جو لوگ ضعفِ دماغ اور ضعفِ اعصاب میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن کی ناک

راستے خارج کر دیتی ہے۔ مثانہ کی کمزوری اور پیشاب کی کمی میں اِن کا استعمال خصوصیت کے ساتھ مفید ہے۔ اِن کے استعمال سے پیشاب کھُل کر آتا ہے۔ پیشاب کی زیادتی اور پیشاب کے ساتھ شکر آنے (ذیابیطس) کی مہلک بیماری میں قیمتی دواؤں سے زیادہ سود مند ہیں۔

جامن بطور پھل تو مفید ہے ہی لیکن اِس کی گٹھلی، اِس کے درخت کے پتے اور چھال بھی اکثر دواؤں میں کام آتے ہیں۔

جامن کی گٹھلی کا سفوف بنا کر تین تین ماشے صبح شام نیم گرم دودھ کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس سے مثانہ کی کمزوری دُور ہوجاتی ہے۔ یہ سفوف مردانہ قوت میں اضافہ کرتا ہے اور بے حد مغلظ منی ہے۔

ایک ماشہ جامن کی گٹھلی کا سفوف، نصف ماشہ کشتۂ فولاد میں ملا کر سونف کے عرق کے ساتھ صبح شام استعمال کرنے سے ذیابیطس کے مریضوں کو بہت جلد فائدہ ہوجاتا ہے۔ جامن کا سفوف مغلظِ منی ہے اور پیشاب کی زیادتی کو روکتا ہے۔

جامن کے پھول بھی گراں قدر دوائی افادیت رکھتے ہیں۔ ایک تولہ جامن کے پھولوں کو دو چھٹانک عرق گاؤزباں میں پیس کر چھان لیں۔ اسے دن میں تین چار مرتبہ استعمال کریں۔ ذیابیطس کے مریضوں کے لئے بیحد مفید دوا ہے۔

کچی جامنوں کو خشک کرکے اُن کا باریک سفوف بنائیں اور اُس میں ہم وزن مصری پیس کر ملا دیں۔ سیلان الرحم یا لیکوریا کی مریض عورتوں کے لئے چھ چھ ماشہ صبح و شام پانی یا دودھ کے ساتھ اِس کا استعمال قیمتی دواؤں سے زیادہ سود مند ہے۔

جامن کے ایک تولہ پتوں کو پانی میں پیس چھان کر اور اُس میں حسب ضرورت مصری ملا کر صبح شام استعمال کرنا خونی بواسیر کے لئے مفید ہے۔ پرانی بواسیر میں ایک تولہ جامن کے پتوں کو پاؤ بھر گائے کے دودھ میں پیس چھان کر ہفتہ عشرہ تک مسلسل استعمال کریں۔ یہ بواسیر کی بہت مفید اور زود اثر دوا ہے۔

جامن کی چھال کو پانی میں جوش دے کر غرارے کرنا مسوڑھوں اور دانتوں کی بہت سی بیماریوں میں نافع ہے۔ اِس سے مسوڑھوں کا ورم اور خون نکلنا بند ہوجاتا ہے۔ دانت بھی مضبوط ہوتے ہیں۔

جامن کی لکڑی کا کوئلہ باریک پیس کر اس میں کالی مرچ اور نمک ملائیں اور اسے بطور منجن استعمال کریں۔ اِس سے دانت صاف اور مضبوط ہوجاتے ہیں اور اُن کی چمک میں اضافہ ہوتا ہے۔

گنج کے مقام پر جامن کی گٹھلی کا لیپ کرنے سے گنجا پن دُور ہوجاتا ہے اور جلد ہی بال نکل آتے ہیں۔ اِس کے استعمال سے چند ہی روز میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔

جامن بے شمار فوائد کی حامل ہے۔ یہ بہت سستی اور کم قیمت شے ہے اور قیمتی دواؤں سے زیادہ مفید ہے۔

۲● مسرت کا راز

آپ کے گرد و پیش مسرت اور خوشی بکھری ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو اُن سے اپنا دامن بھر لیں اور نہ چاہیں تو اپنا دامن خالی رہنے دیں ـــــ زرتشت نے کہا ہے ـــــ دوسروں سے نیکی کرنا آپ کا فرض نہیں ہے، یہ ایک خوشی ہے۔ یہ آپ کی مسرت اور خوشی کو بڑھاتی ہے ـــــ اس حقیقت کو اور واضح طور پر جاننا چاہیں تو ڈیل کارنیگی کے اِن خیالات سے آپ کو کافی روشنی ملے گی۔

آپ کی زندگی چاہے کتنی ہی غیر دلچسپ اور رُوکھی پھیکی کیوں نہ ہو، آپ یقیناً ہر روز کچھ لوگوں سے ضرور ملتے ہوں گے۔ آپ اُن کے متعلق کیا کرتے ہیں؟ کیا آپ انھیں ٹکٹکی باندھ کر نظر دیکھنے پر اکتفا کرتے ہیں یا کبھی یہ جاننے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ یہ کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ یہ اُدھار لیتے ہیں تو کون سی ضرورت انھیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے؟ اپنے پوسٹ مین ہی کو لیجئے ـــــ وہ ہر سال سینکڑوں میل پیدل چلتا ہے، آپ کے گھر پر ڈاک پہنچاتا ہے۔ مینہ ہو یا آندھی، وہ اپنا فرض پُورا کرتا ہے لیکن کبھی آپ نے یہ دریافت کرنے کی تکلیف گوارا کی کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ اُس کی زندگی کیسے گزر رہی ہے؟ اُس کے بچوں کا کیا حال ہے؟ کیا آپ نے کبھی اُس سے یہ پوچھا ـــــ تم تھک تو نہیں گئے؟ تمھیں اپنے کام سے اکتاہٹ تو محسوس نہیں ہوتی؟

پرچون فروش چھوکرا، اخبار فروش لونڈا اور وہ لڑکا جو آپ کے جُوتوں پر پالش کر رہا ہے، یہ سب انسان ہیں ـــــ انھیں بھی مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آتی ہیں۔ اُن کی بھی امیدیں ہیں، آرزوئیں ہیں، اُمنگیں ہیں۔ انھیں بھی ایسے مواقع کی تلاش ہوتی ہے کہ کوئی اِن کا دُکھ سُکھ بٹائے، اِن کے ساتھ ہمدردی اور اخوت کا اظہار کرے۔ لیکن کیا آپ کبھی انھیں موقع دیتے ہیں؟ کیا آپ کبھی اِن کی زندگیوں میں مخلصانہ اور پُرشوق دلچسپی لیتے ہیں؟ دُنیا کی بھلائی کرنے اور اُس کی بہتری سوچنے کے لئے آپ کو مصلح یا ریفارمر بننے کی ضرورت نہیں۔ آپ کل ہی اُن لوگوں سے آغاز کر سکتے ہیں جن سے آپ ملیں!

اِس سے آپ کو کیا ملے گا؟ بے اندازہ مسرت! اور اس سے بھی بڑھ کر تسلّی اور اپنے آپ پر ناز! زرتشت کے الفاظ ہیں "دوسروں سے نیکی کرنا آپ کا فرض نہیں ہے، یہ ایک خوشی ہے۔ کیونکہ یہ آپ کی خوشی اور مسرت کو بڑھاتی ہے"

اور بنجمن فرینکلن نے نہایت سادہ الفاظ میں اِس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے
"جب آپ دوسروں پر مہربان ہوتے ہیں، اپنے اوپر مہربان ہوتے ہیں"
مسرّت اور خوشی کا یہ راز کتنا سادہ ــــ کتنا روشن ہے !!

۳ • اِملی ــــ وٹامن سی کا خزانہ

دال، سبزی اور چٹنیوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اِس کا مزاج سرد و خشک ہے۔ اِس لئے گرم مزاج والوں کے لئے اِس کا استعمال بہت مفید ہے۔ خون اور صفرا کے غلبہ کو تسکین دیتی ہے اور صفرے کو پاخانہ کے ذریعہ خارج کرتی ہے۔
گرمیوں میں املی کا شربت پینے سے لُو کی مضرت سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔ چار پانچ تولے املی کا گُودا لے کر اُتنے آدھ سیر پانی میں بھگو رکھیں، دو تین چار گھنٹے کے بعد صاف پانی نتھار کر مصری یا چینی سے میٹھا کرکے پئیں۔
املی آلو بخارا سے زیادہ لطیف ہے۔ قبض کشا ہے۔ صفرا کو پاخانہ کے ذریعہ خارج کرتی ہے۔ دل کی گرمی کو دُور کرتی ہے۔ بدہضمی، بے چینی، پیاس، جوشِ خون میں بہت مفید ہے۔ طبیعت کو فرحت بخشتی ہے۔ گرمیوں میں سورج کی تپش اور لُو سے محفوظ رہنے کے لئے اِس کا استعمال بہت مفید ہے۔ رات کو پانی میں بھگو کر صبح مصری یا چینی مِلاکر موسمِ گرما میں نافع ہے۔ کھانسی میں مضر ہے۔ حلق میں خراش پیدا کرکے کھانسی بڑھاتی ہے۔ پھیپھڑوں کے لئے نقصان دہ ہے۔
صفراوی بخاروں میں جبکہ گرمی کی وجہ سے پیاس شدید ہوتی ہے، قے اور متلی ہوتی ہے، املی کا شربت پلانے سے بخار کی گرمی کم ہو جاتی ہے۔ متلی اور قے بند ہو جاتی ہیں اور گرمی کے باعث اختلاجِ قلب ہو تو وہ بھی رفع ہو جاتا ہے۔
جدید تحقیقات کے مطابق املی میں وٹامن سی بکثرت پائے جاتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ وٹامن املی میں سبز ہونے کی حالت میں ملتے ہیں اور خشک ہو جانے پر بھی موجود رہتے ہیں۔
غذا میں وٹامن سی کی موجودگی جلدی بیماریوں اور فسادِ خون سے محفوظ رکھتی ہے۔ خون کی کمزوری، دانتوں اور مسوڑھوں کے امراض سے بچنے کے لئے وٹامن سی ضروری ہے۔
بنگال، مدراس، مہاراشٹر اور اڑیسہ میں چاول کے ساتھ املی کا رس پیتے ہیں۔ مرطوب آب و ہوا کی خرابی سے پیدا ہونے والے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے سمندر کے کنارے کے علاقوں میں املی بکثرت استعمال ہوتی ہے۔
جس طرح پکوڑیاں اور آلو ڈال کر دہی کا رائتہ بنایا جاتا ہے، اسی طرح املی کے رس میں پکوڑیاں اور آلو مِلا کر رائتہ کے طور پر دہلی اور یو۔پی میں عموماً کھایا جاتا ہے۔

"بیسویں صدی" کا حسین و دل نواز افسانہ نمبر "بیسویں صدی" کی ساری روایتی خوبیوں کا حامل ہے۔ اکثر افسانے بہت جم کر اور جی لگا کر لکھے گئے ہیں۔ "بیسویں صدی" کا اپنا ایک مخصوص رجحان ہے جس نے اُردو افسانہ نگاری میں ایک اسکول کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ "بیسویں صدی" نے جو نام پایا ہے وہ خوشتر گرامی کی غیر معمولی مدیرانہ صلاحیتوں کی مرہونِ منّت ہے۔ یہ حسین جریدہ خوشتر گرامی کی پوری شخصیت کا پرتو ہے۔ خدا کرے اُردو صحافت کو خوشتر جیسے ہزاروں نہیں سینکڑوں ــــ سینکڑوں نہیں تو ایک درجن ہی مدیرانِ جرائد نصیب ہو جائیں تو اُردو زبان و ادب کے رُوٹھے دن پھر آئیں، پھلے پھولے اور جِلا ــــ کچھ اور نکھار آجائے۔ "بیسویں صدی" کے زیرِ نظر افسانہ نمبر کو کم از کم ایک نظر نہ دیکھنا بڑی ہی بدذوقی اور محرومی کی بات ہوگی . . .
روزنامہ "ملک و ملت" دِلّی

۴ • زکام میں غفلت نہ کیجئے

عام طور پر زکام کو ایک معمولی مرض سمجھا جاتا ہے لیکن دراصل یہ ایک خطرناک مرض ہے۔ جب اِس کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے تو اِس کا علاج مشکل ہو جاتا ہے اور نتیجے میں کئی امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ زکام کے ساتھ کھانسی کا ہونا لازمی ہے۔ اِس کے علاوہ شدید مہلک امراض پلیورسی اور نمونیہ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ نزلہ شدت اختیار کرلیتا ہے تو سامعہ پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس کی وجہ سے کان کے پردے میں مواد پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کے گل جانے سے مریض بالکل بہرہ ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ناک، کان کی جھلی کا التہاب بڑھ کر دماغی جھلیوں تک پہنچ جاتا ہے اور سرسام ہو جاتا ہے۔
عام حالات میں نزلہ و زکام کی وجہ سے دردِ سر، دورانِ سر، ضعفِ دماغ اور تکان پیدا ہونا تو معمولی بات ہے۔ اِسی وجہ سے آنکھوں کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ دانت کمزور ہو کر جلد ہی گر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی اِس کی وجہ سے معدہ اور آنتیں بھی ماؤف ہو جاتی ہیں۔ بعض مریض اِس کے باعث سل و دق جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔
سردی لگنا، بارش میں بھیگنا، گرما گرم یا تیز مسالہ دار کھانا کھا کر فوراً سرد پانی پینا، ترش چیزیں کثرت سے استعمال کرنا، اس مرض کے عام اسباب ہوتے ہیں۔ جو لوگ ضعفِ دماغ اور ضعفِ اعصاب میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن کی ناک

اور حلق کی جھلی میں قوت مدافعت کم ہو چکی ہے، وہ ذرا سی بے احتیاطی سے اِس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جن کا معدہ خراب ہوتا ہے، بدہضمی میں مبتلا رہتے ہیں انھیں یہ مرض جلد جلد ہوتا رہتا ہے۔

اِس مرض کا زیادہ تر زور اُس وقت ہوتا ہے جب گرمیاں ختم ہو کر سردیاں شروع ہوتی ہیں یا سردیاں ختم ہونے کے بعد گرمی کا موسم شروع ہوتا ہے۔ نومبر اور مارچ کے مہینوں میں نزلہ اور زکام زیادہ ہوتا ہے۔

یہ مرض شروع ہوتے ہی کسی اچھے معالج سے رجوع کر کے اِس کے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اِسے معمولی مرض سمجھ کر اِس کے علاج کی طرف سے غفلت ہرگز نہ برتنی چاہئے۔

نزلہ و زکام میں علاج کے ساتھ مناسب غذا کا استعمال اور مضر چیزوں سے پرہیز بہت اہمیت رکھتا ہے اور یہ بے حد ضروری ہے۔

اگر مریض کوئی علاج نہ کرے صرف غذا اور پرہیز کا پُورا خیال رکھے تو اِس مرض سے شفایاب ہو جاتا ہے۔ ابتدائے مرض میں اگر دو وقت غذا چھوڑ دی جائے تو اِس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ جب بھوک ناقابلِ برداشت ہو جائے تو ہلکی غذا کھائیں۔ ٹھنڈا پانی بالکل نہ پئیں۔ جب تک مرض کی شدت رہے نیم گرم پانی پینا چاہئے۔

زکام کی حالت میں دودھ، گھی، دہی، چھاچھ اور ترش چیز ہرگز استعمال نہ کرنی چاہئے۔ ثقیل، دیرہضم، قابض اور بادی چیزیں بالکل نہ کھانی چاہئیں۔

۵● چنا ——— قوت اور غذائیت کا خزانہ!

چنا ایک غلّہ ہے۔ غذائیت کے اعتبار سے یہ گیہوں سے دوسرے درجہ پر ہے۔ یہ بدن کو غذائیت ہی نہیں بخشتا بہت سے دوائی فوائد بھی رکھتا ہے۔ کتنے لوگ اِس بات پر چونک اُٹھیں گے کہ چنے سے طرح طرح کی لذیذ غذائیں ہی نہیں بنتیں یہ بہت سے دوائی فائدے بھی رکھتا ہے؟

چنا قبض کشا ہے اور اجابت با فراغت لاتا ہے۔ اِس سے انسانی دیریج اور دودھ پلانے والی ماؤں کا دودھ بڑھتا ہے۔ پھیپھڑے کے لئے چنا ایک بے مثل غذا ہے۔ کمر کو قوت دیتا ہے اور بدن کو فربہ بناتا ہے۔

دو تولہ چنوں کو رات کے وقت دو تین چھٹانک پانی یا دودھ میں بھگو رکھیں اور صبح کو خوب چبا چبا کر کھائیں اور اوپر سے اُس کا پانی یا دودھ شہد سے میٹھا کر کے پئیں۔ اِس آسان ترین اور ارزاں ترین نسخہ سے جسمانی قوت میں حیرت انگیز اضافہ اور قوتِ باہ بڑھتی ہے۔

بہت سے لوگ اِس معمولی نسخہ سے غیر معمولی طاقتور اور تن دمند ہو جاتے ہیں۔

اُن کی ساری جسمانی قوتیں قوی ہوجاتی ہیں۔ یہ بدن کو موٹا کرتا اور قوتِ باہ میں اضافہ کرتا ہے۔

چنے کی روٹی ترکھانسی، نزلہ و زکام، اسہال اور جریان میں مفید ہے۔ قدرے قابض ہے۔ جس کی اصلاح انار دانہ یا گھی بلا دینے سے ہوجاتی ہے۔

چنے کا شوربہ زود ہضم اور طاقت بخش ہے۔ سفید چنے کی نسبت سیاہ چنے کا شوربہ زیادہ مفید ہے۔ ڈاکٹر کمزور مریضوں کو اس کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں۔

چنا مصفّیٔ خون بھی ہے اور مقوی بھی۔ تلی، جگر اور گردے کی بیماریوں میں مفید ہے۔

چنے کے بیسن میں ہلدی، سرسوں کا تیل اور ضرورت کے مطابق پانی ملاکر چہرے اور بدن پر ملنے سے رنگت نکھر آتی ہے۔

چنے کا بیسن پانی میں بھگوکر رکھ لیں اور دن میں کئی بار پینے سے پیشاب کی جلن دُور ہوجائے گی۔

اِس تکلیف کے ازالہ کے لئے چنے کی دال کا چھلکا بھی رات کو پانی میں بھگوکر صبح کو پانی چھان کر پینا مفید ہے۔

۶● کارزارِ حیات میں کامرانی کا راز!

بہت سے لوگ کارزارِ حیات میں ناکام ہوکر ہمیشہ کے لئے حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں اور حالات کی ناسازگاری کو الزام دیتے ہیں لیکن درحقیقت ایسا کرکے وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں اور قدرت کو ناحق الزام دیتے ہیں۔

آپ میں ناقابلِ شکست عزم و استقلال ہو تو آپ ناسازگار حالات کو سازگار بنا سکتے ہیں اور جب یہ نہ ہو تو سازگار حالات ناسازگار ہوجاتے ہیں۔

ایک دانشور نے لکھا ہے — "جس طرح جنگ کے میدان میں فتح و شکست کا فیصلہ سپاہی کی تلوار نہیں، اُس کی استقامت اور ثابت قدمی کرتی ہے، اُسی طرح کارزارِ حیات میں استقامت اور ثابت قدمی کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جو شخص ثابت قدم رہتا ہے اور زندگی کی جنگ میں آخر تک شریک رہتا ہے، وہ کامیاب ہے۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (مینیجر رسالہ بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی نمبر ۶)

مرگِ راجہ مہدی علی خاں

بسمل سعیدی

خبرِ مرگِ راجہ مہدی علی — کتنی غمناک ہے، خدا کی پناہ
ایک سکتہ ہے رُوح پر طاری — چشمِ غمگیں میں منجمد ہے نگاہ
دُھند ہی دُھند ہے دُھواں ہی دُھواں — از زمیں تا فلک تمام سیاہ
بیگم اور اُن کی والدہ کا خیال — کس قدر جاں رُبا ہے اور جانکاہ
جُنبشِ چشمِ خونچکاں اشک ہی اشک — سلسلہ سانس کا تسلسلِ آہ
ہے یہ اک صدمۂ عظیم و الیم — اُن کو توفیقِ صبر دے اللہ
کتنے مخلص تھے وہ خلوص نواز — خُلق خصلت میں تھا مزاج میں چاہ
اُن کی فطرت کا جزوِ لاینفک — دوستی اور دوستی کا نباہ
وہ اور احباب کی دل آزاری — جیسے جبریل سے صدُورِ گناہ
طبع سادہ، مزاج درویشی — طمعِ زر نہ اُن کو خواہشِ جاہ
فکر میں اُن کی تھے صنم ہی صنم — ذہن میں اُن کے تھا فقط اللہ
عشق کی بارگاہ کی رونق — حُسن کی روشن اُن سے جلوہ گاہ
موجزن اُن کے دل میں شعر و ادب — جیسے قُلزم ہوں وہ عمیق، اتھاہ
قہقہہ زارِ قلب اُن کی طنز — زعفران زارِ رُوح اُن کا مزاح
نہ رہا لُطف اب لطیفوں کا — ہے ظرافت کی بزم آج تباہ
اُن کے مجمُوب مشغلے پڑھ کر — دل سے بے ساختہ نکلتی واہ
اُن کے ماتم کا آہ و زاری سے — حق ادا ہو سکا نہ خاطر خواہ
مغفرت اُن کی ہو، ملے اُن کو — دامنِ رحمتِ خدا میں پناہ
یوں ہی چلتا رہے گا صبح و شام — کارواں زیست کا عدم کی راہ
سچ تو ہے، کُلُّ مَن عَلَیہَا فَان
بجز اک، لا الٰہ اِلّا اللہ


گھر میں دُھلی
سَرف
سے دُھلی
Surf

میرا مہدی علی خاں

۲۷ جولائی کی منحوس دوپہر کو "بیسویں صدی" کی آخری کاپی پریس جا رہی تھی کہ بمبئی سے میری بہن طاہرہ بیگم (بیگم صاحبہ راجہ مہدی علی خاں) کا تار مجھے ملا کہ "تمھارا بھائی مہدی علی خاں اس جہانِ فانی سے چل بسا" تار پڑھتے ہی مجھے بجلی کا شدید جھٹکا سا محسوس ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ دل ڈوب گیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ اراکینِ اسٹاف پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا اور دفاتر بیسویں صدی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔۔۔

آہ میرا مہدی علی خاں! انھیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انھیں مرحوم کون کہہ سکتا ہے۔ وہ زندہ ہیں اور جب تک اردو زبان بولی جاتی ہے وہ زندہ رہیں گے۔ میرے بھائی نے اردو زبان و ادب میں بہت سی لافانی چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔

وہ متحدہ ہندوستان کے شہرۂ آفاق ادیب و شاعر حضرت مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے خاندان کے چشم و چراغ اور انھیں کے حقیقی بھانجے تھے۔ مہدی علی خاں کی [illegible] والدۂ محترمہ [illegible] صاحبہ پاکستان کی نامور شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ وہ آج لاہور میں اپنے لختِ جگر کی جدائی میں خون کے آنسو بہا رہی ہیں۔ میرا مہدی گزشتہ ۲۵ سال سے ہندوستان میں مقیم تھا۔ اِس طویل عرصے میں اُس نے محض ایک بار اپنی والدۂ محترمہ کی قدم بوسی کی۔ شعر و شاعری اُسے ورثہ میں ملی تھی اور اُس کی رگ رگ میں سموئی ہوئی تھی۔ انھوں نے پہلا شعر چھ برس کی عمر میں کہا۔ چھٹے درجے کے وہ طالبِ علم تھے کہ انھیں اخبار نویسی کا شوق ہوا۔ وہ اپنے قلم سے پورا اخبار لکھ کر اسکول کے نوٹس بورڈ پر چسپاں کر دیا کرتے تھے۔ اُن کی اِس خداداد قابلیت کو دیکھ کر اُن کے اُستاد محوِ حیرت تھے ـــــــ تعلیم سے فارغ ہو کر انھوں نے برسوں لاہور کے روزناموں اور دارالاشاعت لاہور کے "پھول" اخبار میں اپنی قابلیت کے جوہر دِکھائے اور دیکھتے ہی دیکھتے مُلک کے ادبی حلقوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ برسوں وہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے وابستہ رہے اور اب وہ ایک طویل عرصے سے بمبئی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ جہاں انھوں نے کئی سلور جوبلی فلموں کے گیت اور گانے لکھے جو زبانِ زدِ عوام ہوئے۔ انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ طنز و مزاح میں وہ منفرد درجہ رکھتے تھے اور ایک عظیم فنکار کی حیثیت سے انھوں نے مُلک میں قابلِ رشک نام پایا۔ ایک دُنیا اُن کے زورِ قلم اور منفرد اسلوبِ نگارش سے متاثر ہے۔ اُن میں ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک بار لکھ کر کاٹا نہیں کرتے تھے۔ جو لکھ دیا سو لکھ دیا۔ وہی اُن کا حرفِ آخر ہوتا تھا۔ وہ فی البدیہہ شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بہت صاف گو، نیک دل اور مخلص انسان تھے۔ دوستوں کے مخلص دوست، بہت مرنجان مرنج اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ میرے شفیق دوست اور عزیز بھائی تھے۔ میں انھیں پیارسے مہدی کہا کرتا تھا اور اکثر اُن کی گالیاں مزے لے لے کر سنا کرتا تھا۔ اب مجھے گالیاں کون دے گا۔ آہ! مجھے گالیاں دینے والا میرا شفیق بھائی اب اِس دُنیا میں نہیں رہا۔ میں ایک بہت بڑی خوشی سے محروم ہو گیا ہوں۔ اِس المناک حادثے کے اثرات تاحیات میرے دل و دماغ پر قائم رہیں گے۔ مہدی کے انتقال سے میں زندہ درگور ہو گیا ہوں۔ برادرم مولانا عبدالمجید خاں سالک مرحوم کی موت کے بعد یہ دوسرا المناک حادثہ ہے جس سے میرا دل و دماغ متاثر ہوا ہے۔ میں کن الفاظ میں اپنی عزیز بہن طاہرہ بیگم اور مہدی کی والدۂ محترمہ سے اظہارِ ہمدردی کروں اور میں اپنا درد کسے دکھاؤں۔ مجھ سے ہمدردی کرنے والا وہ بے لوث انسان اب اِس جہانِ فانی میں کہاں ہے۔ میرا سب سے بڑا ہمدرد، بہی خواہ اور میرا سب سے بڑا محسن اِس دُنیا سے چل بسا۔ خدا اُسے آغوشِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور مجھے بھی جلد اُس کی قربت نصیب ہو۔ آمین!

سوگوار ـــــــ [illegible]

قطعہ تاریخِ وفات

ادیبِ طنز و مزاح نگار راجہ مہدی علی خاں

شہِ اقلیمِ طنز و میرِ تنقید
حسیں شاعر، ادب آگاہ و فن داں
جو کل تک ہم میں تھے موجود اَلْوَر
امامِ حلقۂ پختہ نگاراں
دلِ خوشتر کو دے کر صدمۂ مرگ
گئے ہنستے ہوئے تا باغِ رضواں
ہوئے ہیں آج وہ دنیا سے ـــــ معدوم
ادیبِ خوش بیاں مہدی علی خاں

(معدوم = ۱۹۰)

۱۸۰۶ + ۱۹۰ = ۱۹۶۶ء

از مابر

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات شائع کئے جائیں گے۔ غیر اخلاقی، تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو بیک وقت صرف دو تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب تحریر نہیں کیا جا سکے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

قیس کبیر انصاری شیب پور ہوڑہ

س۔ مرد عورتوں کو ایک کھلونا کیوں سمجھتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ مرد بوڑھا ہو جانے کے بعد بھی اپنے آپ کو پیر نابالغ یعنی بچہ سمجھتا ہے۔

س۔ فیض احمد فیض اور ساحر لدھیانوی میں کون اچھا شاعر ہے؟

ج۔ دونوں اچھے شاعر ہیں۔

س۔ فیض کا کوئی حسین شعر سنایئے۔

ج۔ سُنئے ؎

بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ فیض آج
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

محمد ثقلین لاری۔ رسڑا بلیا

س۔ انسان زندگی میں کب ناکام ہوتا ہے؟

ج۔ جب کامیابی کی اُمید کھو بیٹھتا ہے۔ جب حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ اگر بیوی کی زبان تیز ہو تو...

ج۔ بیوی کی زبان تیز ہو تو شوہر کو نرم گفتاری سے پیش آنا چاہیئے تاکہ بیوی بھی نرم گفتاری

سیکھ جائے۔

ہیبت اللہ۔ کھام گاؤں

س۔ وہ کیا کرے جسے کوئی اُمید ہی نہ ہو؟

ج۔ مایوسی کے اندھیرے میں اُمید کی شمع روشن رکھے۔ روشنی دیکھ کر ایک دن اُمید پھر لوٹ آئے گی۔

س۔ سنجیدگی کو کس طرح توڑا جائے؟

ج۔ سنجیدگی کا دامن چھوڑ کر! لیکن یہ اچھا نہیں۔

اے، رشید۔ شری پور

س۔ آج کی مہنگائی؟

ج۔ آج کی مہنگائی کا سب سے بڑا سبب سرمایہ داروں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف سخت کارروائی نہ کرنا ہے۔

س۔ دُکھ میں سُکھ کیوں پوشیدہ ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ دُکھ بھی سُکھ کا ایک رُوپ ہے۔

س۔ اُمید کی کرن...؟

ج۔ مایوسیوں کے اندھیرے میں اُمید کی کرن بھی

بہت بڑی چیز ہے۔

نصرت اللہ امتیاز۔ بنگار پیٹ

س۔ کہتے ہیں زندگی ایک راز ہے جو فاش نہیں؟

ج۔ زندگی ایک روشن حقیقت ہے!

س۔ غالب کا کوئی درد بھرا شعر سنایئے۔

ج۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

س۔ کیا انسانیت سے بڑھ کر کوئی چیز ہے؟

ج۔ انسانیت پرست و انسانیت نواز انسان جس پر انسانیت ناز کرتی ہے۔

شیخ عبد القیوم۔ گاندربل۔ کشمیر

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟

ج۔ جو انسانیت کی قدروں کا سب سے زیادہ احترام کرے۔

س۔ دُنیا میں آکر انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ سب سے پہلے اچھا انسان بننے کی کوشش کرنی چاہیئے، اس کے بعد سب کچھ!

رحیلہ خالد۔ بھوپال

س۔ محترم خوشتر بھائی! کیا میں "بیسویں صدی" کے سرورق کے لئے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصویر بھیج سکتی ہوں اور کیا اُسے پینٹ بھی کرنا چاہیئے؟

ج۔ آپ بصد شوق تصویر بھیج سکتی ہیں۔ شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور اگر خوبصورت اور "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہوئی تو شائع بھی کی جائے گی۔

س۔ یہ جانتے ہوئے کہ خواہشات دکھوں کا گھر ہیں ہم اپنے دل میں خواہشوں کی ایک دنیا لئے پھرتے ہیں ایسا کیوں؟

ج۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔

محمد فخرالدین انصاری، موسیٰ بنی مائنس

س۔ لفظ قمیض صحیح ہے یا قمیص؟

ج۔ قمیص۔

س۔ شاد عظیم آبادی کا پورا نام کیا ہے؟

ج۔ سید علی محمد۔

عارف شاد۔ پٹنہ

س۔ اپنی پسند کا کوئی خوبصورت سا لیکن غم آمیز شعر سنائیے۔

ج۔ حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک شعر سنئے ؎

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے
اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے

اے۔ آر مصطفیٰ۔ بیرور

س۔ خوشتر گرامی! کرشن چندر کو کیوں زیادہ پسند کرنے لگے ہیں؟

ج۔ ادبا، باذوق و اربابِ بصیرت ہمیشہ سے کرشن چندر کو پسند کرتے ہیں۔

س۔ بھیا! بتایئے دکن کی ملکہ چاند بی بی اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی میں کیا فرق ہے؟

ج۔ ملکہ چاند بی بی کے عمائد اور امراء کمالِ خلوص اور دیانت داری سے امورِ سلطنت کی انجام دہی میں ملکہ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کے عمائد خود اقتدار حاصل کرنے کے لئے انھیں ناکام بنانے کی فکر میں ہیں۔

بھگوت دیال شرما۔ کانپور

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں آج سے پچیس سال پہلے غلہ کا کیا نرخ تھا؟

ج۔ ۱۹۴۵ء میں گیہوں ۱۵ سیر فی روپیہ، چاول ۱۲ سیر فی روپیہ، چنا ۲۰ سیر فی روپیہ تھا۔

آہ، راجہ مہدی علی خاں

ضیا فتح آبادی۔ ایم، اے

دیئے بجھتے ہیں اور بڑھتی ہے ظلمت — تجھے آئے گی اے اجل کب ندامت
بُری یہ خبر آئی ہے بمبئی سے — ہوئے راجہ مہدی علی خاں بھی رخصت
کہاں چھپ گیا روزِ روشن میں دیکھو — وہ انسانِ مخلص، وقارِ محبت
نظر آئے گی اب کہاں اہلِ غم کو — وہ آنکھوں میں لہراتی موجِ مسرت
قلم کا دھنی تھا، زباں پر تھا قادر — زمانے کو تھی اُس کی عظمت پہ حیرت
وہ محسن تھا شعر و علم و ادب کا — یہ اُردو کے حق میں ہے روزِ قیامت
وہ مٹ کر بھی مٹتا نہیں اِس جہاں میں — جسے مل گئی نیک نامی کی دولت
ہر اک لفظ میں اُس کی فطرت نے بھر دی — ادا، بانکپن، ناز، شوخی، شرارت

ضیا صرف تو ہی نہیں آج غمگیں
کہ خوشتر کے دل میں بھی ہے دردِ فرقت

ضیا فتح (...)

ہماری روزمرّہ کی ضرورُیات پُوری کرنے کا ذریعہ ۔ تیل

بازاروں میں رکھی ہوئی ہری بھری ترکاریاں کتنی دلکش معلوم ہوتی ہیں ۔ یہ ترکاریاں، ریلوں، ٹرکوں اور نقل و حمل کے دیگر ذرائع سے بازاروں تک پہنچتی ہیں۔ نقل و حمل کا کوئی بھی ذریعہ ہو۔ تیل ہی اُسے حرکت میں لاتا ہے۔

جب اِن ترکاریوں کا ذائقہ دار کھانا اسٹوو پر پکتا ہے، تب بھی تیل ہی ۔۔ جیوتی مارکہ، مٹّی کا تیل ۔ ایک اہم ضرورت کو پُورا کرتا ہے۔

روزمرّہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں آسانی مہیا کرنے والے سب ہی پٹرولیم (معدنی تیل) کی مصنوعات اِنڈین آئل بہم پہنچاتا ہے۔

۔ اقتصادی خوشحالی کے لئے قومی ٹرسٹ

اِنڈین آئل کارپوریشن لمیٹڈ



کلدیپ سنگھ۔ لدھیانہ

س۔ خوشتر صاحب! سُنا ہوں آپ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ بتائیے انسان کے سر پر کتنے بال ہوتے ہیں؟

ج۔ بادشاہو! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ جو بات جاننا آپ کے لئے مشکل ہو وہ ہم سے پُوچھئے۔ آپ کے پاس پڑوس میں کتنے لوگ گنجے ہوں گے۔ آپ خود دو چار سروں کے بال گن لیں۔ ویسے آپ بہت جاننا ہی چاہتے ہیں تو مبصّرین کا اندازہ ہے کہ انسان کے سر پر کم و بیش ایک لاکھ چالیس ہزار بال ہوتے ہیں۔

محمد احسان انصاری۔ ناگور

س۔ دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں فرانسیسی، روسی وغیرہ کے ہوتے ہوئے یہ کہاں تک درست ہے کہ اُردو زبان دُنیا کی تیسری زبان ہے؟

ج۔ اب سے کچھ دن پہلے مجلس اقوام متحدہ نے جو اعداد و شمار شائع کئے تھے، اُس کی رُو سے یہ سو فیصدی درست ہے کہ دُنیا میں بولی جانے والی ۲۲ ہزار زبانوں میں اُردو کا درجہ تیسرا ہے۔

سلطان بیگ۔ امروہہ

س۔ سائنس داں کہتے ہیں تارے ڈوبتے نہیں۔ پھر دن کو تارے کیوں نظر نہیں آتے؟

ج۔ معاف کیجئے! آپ کی بینائی کمزور ہوگی۔ ورنہ اِس ہولناک گرانی کے دَور میں سب کو دن میں تارے نظر آ رہے ہیں!

محمد نجم الدین انجم۔ گاچھ پارہ۔ پورنیہ

س۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو لوگ چچا کہتے تھے۔ کیا اندرا گاندھی کو دیدی کہیں گے؟

ج۔ شوق سے کہئے۔

س۔ کیا اندرا گاندھی ہندوستان کی پانچویں پرائم منسٹر ہیں؟

ج۔ جی نہیں! تیسری۔

ہدایت علی ساحل چھبری تلمیا

س۔ مشہور شاعر فراق گورکھپوری کا اصل نام بتانے کی زحمت گوارا کریں۔

ج۔ رگھوپتی سہائے۔

س۔ سماج میں عورت کا مقام؟

ج۔ بہت بلند ہونا چاہئے۔

س۔ تعلیم کا معیار پست کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ ہمارے محترم وزیرِ تعلیم کو درسگاہوں کے نام بدلنے سے اِتنی فرصت کہاں کہ تعلیم کے معیار کی طرف توجہ فرمائیں۔

مظاہر ہندوی۔ بسورجگرہا

س۔ ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر؟

ج۔ ہندوستان میں بہت سے بڑے شاعر ہیں۔

س۔ حضرتِ مجاز کا کوئی درد بھرا شعر سنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

اللہ اللہ وہ پیشانیِ سیمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات

محمد عمر پہلوان۔ عادل آباد

س۔ گناہ رات کے اندھیرے میں پھیلتا ہے یا دن کے اُجالے میں؟

ج۔ کبھی رات کے اندھیرے میں پھیلتا تھا۔ اب رات کے اُجالے میں پروان چڑھتا ہے۔ اب تو نئی روشنی نے رات کو بھی دن بنا دیا ہے۔

س۔ امیر اور غریب میں کس کی زندگی چین سے گزرتی ہے؟

ج۔ آپ نے بھی کیا سوال پُوچھا ہے ـــ غریب کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔

س۔ جس آدمی کو شراب یا جُوا اور دوسری بُری عادتیں پڑ گئی ہوں، کیا وہ ترقی کر سکتا ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔

شکیل راہی۔ گیا

س۔ ایک شاندار سا شعر سُنائیے۔

ج۔ جو دیے ہیں گردشِ وقت نے، کوئی اور ہوں گے وہ ہم نہیں
جو ہجومِ غم ہے بہت تو ہو، طلبِ حیات تو کم نہیں

س۔ دوستی، فرض، محبت، دولت سامنے ہو تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ محبت کی دیوانگی اور دولت کے نشّے سے سرشار ہو کر دوستی کے حق اور فرض کی انجام دہی سے پہلوتہی نہ کرنا چاہئے۔

زہرہ بیگم۔ بھیونڈی

س۔ آج کل کے نوجوان اتنے جذباتی کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ نئی تہذیب کی رنگینیوں نے انھیں ایسا بنا دیا ہے۔

س۔ جس بچّہ کی ماں گونگی ہو اُس بچّہ کا مستقبل؟

ج۔ باپ فرض شناس ہو تو ماں کی کمی پُوری کر سکتا ہے۔ بچّے کے مستقبل کو روشن و تابناک بنا سکتا ہے۔

ریاض الحسن بہار۔ میرٹھ

س۔ خواجہ آتش کس کے شاگرد تھے؟

ج۔ مصحفی کے۔

س۔ آتش کا پُورا نام کیا تھا؟

ج۔ خواجہ حیدر علی۔

د۔م۔ کشمیر

س۔ کچھ سنائیے ...؟

ج۔ لوگ لوگوں کو تلخ و ترش سناتے ہیں کھری کھری سناتے ہیں لیکن کسی کو سنانا ہماری عادت نہیں۔ آپ ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔

س۔ اُردو کی خدمت کیونکر کی جاسکتی ہے؟

ج۔ اُردو اداروں کی اعانت کرکے، اُردو جرائد و صحائف کی توسیع اشاعت میں حصّہ لے کر۔

س۔ آپ ممبئی جاتے ہیں، کبھی کشمیر بھی آیئے تو آپ کو دیکھیں۔

ج۔ کسی بڑے انسان کو دیکھنے کی آرزو کرنی چاہئے۔ اور ہم تو کچھ بھی نہیں۔ بڑے ہیں نہ چھوٹے!

عتیق احمد، یقینی۔ حیدر آباد

س۔ اِس چار دن کی زندگی میں اگر انسان کو غم ہی غم ملے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے کہ
غم ہے بڑی خوشی جو گوارا کرے کوئی

س۔ کسی اجنبی لڑکی کا محبت بھرا خط موصول ہو تو کیا سمجھنا چاہئے؟

ج۔ کوئی لڑکی ایسا نہیں کرتی۔ یہ حماقت مرد ہی کرتے ہیں۔

س۔ محبت کی آخری منزل کیا ہے؟

ج۔ تباہی!

ایم، اکرم۔ گریڈیہہ

س۔ سکونِ خاطر اور خوشگوار زندگی کے لئے ایک شکستہ دل انسان کو پہلا قدم کس طرف اٹھانا چاہئے؟

ج۔ سب سے پہلے اُسے اپنے دل سے مایوسی کو دور کرنی چاہئے۔ سب سے پہلے اپنے دل میں اُمید کی شمع روشن کرنی چاہئے۔ اگر اُمید کی شمع بجھ نہیں گئی ہے، روشن ہے تو اُس کی لَو تیز کرنی چاہئے۔

س۔ مثالی معاشرے کے قیام میں عدلیہ کیا رول ادا کرسکتی ہے؟

ج۔ اُسے اپنی ذمہ داری کا پُورا احساس ہو تو بہت کچھ کرسکتی ہے۔ معاشرہ بہت بلند ہوسکتا ہے۔

چنچل بھٹکلی۔ بھٹکل

س۔ ہم بھارت کے بھلے بھارتی اور اِس دیش کے اچھے شہری کب بن سکتے ہیں؟

ج۔ خود اچھا بن کر، دوسروں کو اچھا بنا کر!

س۔ لوگ زندگی سے کب بیزار ہوتے ہیں؟

ج۔ جب اپنی کوتاہی اور کمی سے زندگی کا حُسن، زندگی کی رعنائیاں کھو دیتے ہیں۔

س۔ اِس وقت آپ کیا سوچ رہے ہیں؟

ج۔ یہی کہ چنچل بھٹکلی کتنا خوبصورت نام ہے!

محمد اسمٰعیل۔ احمد آباد

س۔ خوشتر بھائی! اسکندر اور سکندرِ اعظم کیا ایک ہی آدمی کا نام تھا؟

ج۔ جی ہاں!

احمد ابراہیم سیتوڑہ۔ رتناگری

س۔ اگر آپ کو صرف دو ماہ کے لئے ہندوستان کا وزیرِ دفاع بنا دیا جائے تو آپ کیا کریں گے؟

ج۔ یہ عہدہ ملتے ہی بصد ادب سابق وزیرِ دفاع کرشنا مینن کو اپنا عہدہ پیش کردیں گے! اِس لئے کہ سارے ملک میں اِس منصب کے موزوں وہی سزاوار ہیں۔

س۔ چچا جان! آپ کے بعد بیسویں صدی کا مستقبل؟

ج۔ وقت ہر مسئلہ کا حل پیدا کردیتا ہے۔

دلشاد واموری۔ مدراس

س۔ جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے ---- لیکن میرا تجربہ ہے کہ یہ غلط ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں اِس بارے میں؟

ج۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔

س۔ خوشتر بھیا! آپ کے مذہب میں پیار جائز ہے یا نہیں۔

ج۔ ہمارے مذہب میں پیار جائز ہی نہیں ضروری ہے۔ بھائیوں بہنوں سے۔ مجبوروں اور بیکسوں سے پیار، ملک و وطن سے پیار!

حسام الدین۔ نظام آباد۔ آندھرا

س۔ ہندوستان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲ کروڑ ۳۳ لاکھ ۲۳ ہزار لوگ اُردو بولتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں ننانوے فیصدی لوگ اُردو بولتے ہیں! کتنے لوگ آدمی کو "مانو"، آسمان کو "آکاش"، درد کو "پیڑا"، خون کو "رکت"، ہوا کو "وایو" کہتے ہیں۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: دِلّی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر: برائٹ پریس صدر بازار دہلی —— پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج۔ دہلی ۶

ڈکشنریاں، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

...ن صدی کی کشیدہ کاری	شنا ماری ایم اے	چار روپے
...ین کشیدہ کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
...ی	″	چار روپے ۵۰ پیسے
...شیدہ کی ″	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
...ن ″	زینب انور	دو روپے ۵۰ پیسے
...ین ″	″	دو روپے ۵۰ پیسے
...ن ″	قدسیہ انور	ایک روپیہ
...سیہ ″	″	ایک روپیہ
...باب درزی خانہ	زینب انور	دو روپے
...ے اشعار	شرف بانو عفران	دو روپے
...ینت کرشیا ڈیزائن بک	زینت کوثر	پانچ روپے

انگریزی اردو میں اپنی قابلیت بڑھایئے

اردو انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

...آکٹ ڈکشنری۔ انگریزی سے اردو ہندی		چار روپے
...انگریزی اردو ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		دس روپے
...اردو انگریزی ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		گیارہ روپے
...سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری	عبدالحق	تیس روپے
...سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری	″	بیس روپے
...سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری	″	بارہ روپے
...اردو انگریزی ڈکشنری		گیارہ روپے
...انگریزی اردو ڈکشنری		دس روپے
...آکسفورڈ ڈکشنری انگریزی سے اردو ہندی		تین روپے
...اردو اول لغت		آٹھ روپے
...اللغات جدید کلاں		بارہ روپے
...ہنگ عامرہ		سات روپے ۵۰ پیسے
...اللغات عکسی خورد		چھ روپے ۷۵ پیسے

صنعت و حرفت

الیکٹریکل انجینئرنگ بک	نریندر ناتھ	بارہ روپے
الیکٹرک گائیڈ (نیا ایڈیشن)	″	آٹھ روپے
الیکٹرک وائرنگ	″	چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ	″	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک بیٹریز	″	تین روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک لائٹنگ	″	چھ روپے
الیکٹرک وائرمین امتحان کے پیپرز (پنجاب)	″	چھ روپے ۷۵ پیسے
آئل و گیس انجن گائیڈ	″	دس روپے
آئل انجن گائیڈ	″	چھ روپے
کروڈ آئل انجن گائیڈ	″	چار روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائیڈ	″	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک)	″	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ٹانکا لگانے کا ہنر	″	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹر بنانا	″	تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی ڈی سی)	″	ستر روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائیڈ	نریندر ناتھ	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
برہ ریڈیو گیان	″	پندرہ روپے
ٹرانسفارمر گائیڈ	″	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز	″	آٹھ روپے
خراد شکشا یعنی ٹرنر گائیڈ	″	تین روپے
ورکشاپ گائیڈ (فٹر ٹریننگ)	″	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	″	چھ روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی	رام اوتار دیپ	چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپئرنگ	″	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	تین روپے
رضیہ کا دسترخوان	رضیہ سلطانہ تحسین	دو روپے ۵۰ پیسے
رنگ سازی	یدھ ویر نریندر ناتھ	دو روپے ۵۰ پیسے
پلاسٹک گائیڈ	″	دو روپے ۵۰ پیسے
اپٹوڈیٹ بوٹ پالش سازی	″	دو روپے ۵۰ پیسے
اپٹوڈیٹ انک میکر و روشنائیاں بنانا	″	دو روپے ۵۰ پیسے
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا)	″	دو روپے ۵۰ پیسے
ہیئر آئل (خوشبودار تیل)	″	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکری بہار (بسکٹ ڈبل روٹی کیک)	″	دو روپے ۵۰ پیسے
پینٹری کا کام	″	چار روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (چیز کاری)	″	چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر	″	دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)	″	دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار	″	دو روپے ۵۰ پیسے
اچار، مربہ، چٹنی	چمپی رانی گپتا	دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر	چندر بھان مبتل	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دکان)	″	دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دکان	″	دو روپے ۵۰ پیسے
چھپائی پارچہ جات کیلیکو پرنٹنگ	″	تین روپے ۵۰ پیسے
انڈو یورپین ککری بک دیسی انگریزی کھانے	کمال چرن	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	″	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	″	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	″	چار روپے

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج، دہلی نمبر ۶



تجھ کو اُداس دیکھ کر اے جانِ سرخوشی
شادابیِ بہار کا دل ٹوٹ جائے گا



آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی — سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی
رنگِ طلوعِ صبح، رُخِ لالہ فام میں — چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں
انساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں — ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

جوش ملیح آبادی

فوٹو: شاہ علی حیدرآباد



ودس اسلاد ممبئی میں کوئی بہت بڑا ادبی جشن منانے کی تیاری میں ممبئی کے زندہ دلوں کا ایک اجتماع ۔ چونکہ عظیم افسانہ نگار کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی انتظامیہ کمیٹی کے اہم ترین رُکن ہیں ۔ اس لئے نشستند و گفتند و برخاستند والی بات نہیں ہے ۔ عنقریب کوئی عملی اقدام کرنے کے لئے انتظامیہ کمیٹی کی پوری مجلس سرگرم عمل ہے ۔



اس مجلس میں نامور شاعر علی سردار جعفری، فلمی دنیا کے ایک نہایت اہم ادیب دیوان شرر سے مصروفِ گفتگو ہیں اور کرشن چندر اور سالک صدیقی ہمہ تن گوش ہو کر گفتگو سن رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ع

باتوں باتوں میں نکل آتی ہیں باتیں کام کی



اور واقعی جب کوئی کام کی بات نکل آئی تو کرشن چندر نے سردار جعفری کو اُس کے بعض ایسے پہلوؤں پر غور کرنے کا مشورہ دیا جنھیں سُن کر سلمیٰ اور شرر بے اختیار مُسکرا دئیے جیسے کہہ رہے ہوں ع

باتوں میں بھی مذاق اڑاتا ہے، مسافات سے اس نے دلوانے کی



نامور افسانہ نگار رئیس امروہوی کی شادیٔ خانہ آبادی کی تقریب میں دوستوں اور ادیبوں کے اجتماع کا ایک منظر۔ رئیس صاحب کے بائیں طرف میونسپل کمیٹی امروہہ کے ایگزیکٹو آفیسر جناب قمرالدین اور افسانہ نگار ماسٹر مدثر حسین صاحب اور دائیں جانب خوشتر گرامی اور ڈاکٹر جمال الدین جسے خوشتر نے 'جمال ہمنشیں' کا لقب دے رکھا ہے۔ ان کی اوٹ میں آدھے چھپے بدلی کے چاند ہیں افسانہ نگار جے پال نیئر ھا اور ان کے ساتھ پاک طینت انسان میاں صالح الدین سابق ڈپٹی ڈائرکٹر انکم ٹیکس کھڑے ہیں۔۔۔۔ رئیس صاحب جب سے اپنی بیوی کی زلف گرہ گیر میں گرفتار ہوئے ہیں افسانہ لکھنا بھول کر خود ایک افسانہ بن کر رہ گئے ہیں ۔

جلد — ۳۰ شمارہ — ۱۱

ٹیلیفون دفتر ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش ۶۱۹۹۲۷



قیمت فی پرچہ

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر۶

[redacted]

"عوام سے کئے گئے وعدوں کو پورا کیا جائے گا" کانگریس الیکشن مینی فیسٹو میں اعلان ——— اِس شرط کے ساتھ کہ پچھلے وعدے بھلا دئے جائیں اور نیا کھاتہ کھولا جائے۔

"ایک سمگلر گرفتار" ایک خبر ——— بیوقوف کہیں کا۔ کسی وزیر کے بیٹے سے مل جاتا اور مزے کرتا۔

"افسران عوامی شکایات کی بے خوف ہو کر جانچ کریں" امورِ داخلہ کے وزیرِ مملکت کی تقریر ——— اور اگر شکایات وزیروں کے خلاف ہوں تو؟

"جب تک کانگریسیوں کے دل نہ بدلیں اتحاد ممکن نہیں" ایک عنوان ——— اور دل بدلنا اب کچھ مشکل نہیں۔ مصنوعی دل لگانے کے کئی تجربات کامیاب ہو چکے ہیں۔

"مذہب سیاست کا مرہونِ منت بنا ہوا ہے" ایک تبصرہ ——— اِس کی آڑ میں لوگ کرسیاں حاصل کرتے ہیں مگر جونہی کرسیاں ملتی ہیں وہ مذہب کو زینتِ طاقِ نسیاں بنا دیتے ہیں۔

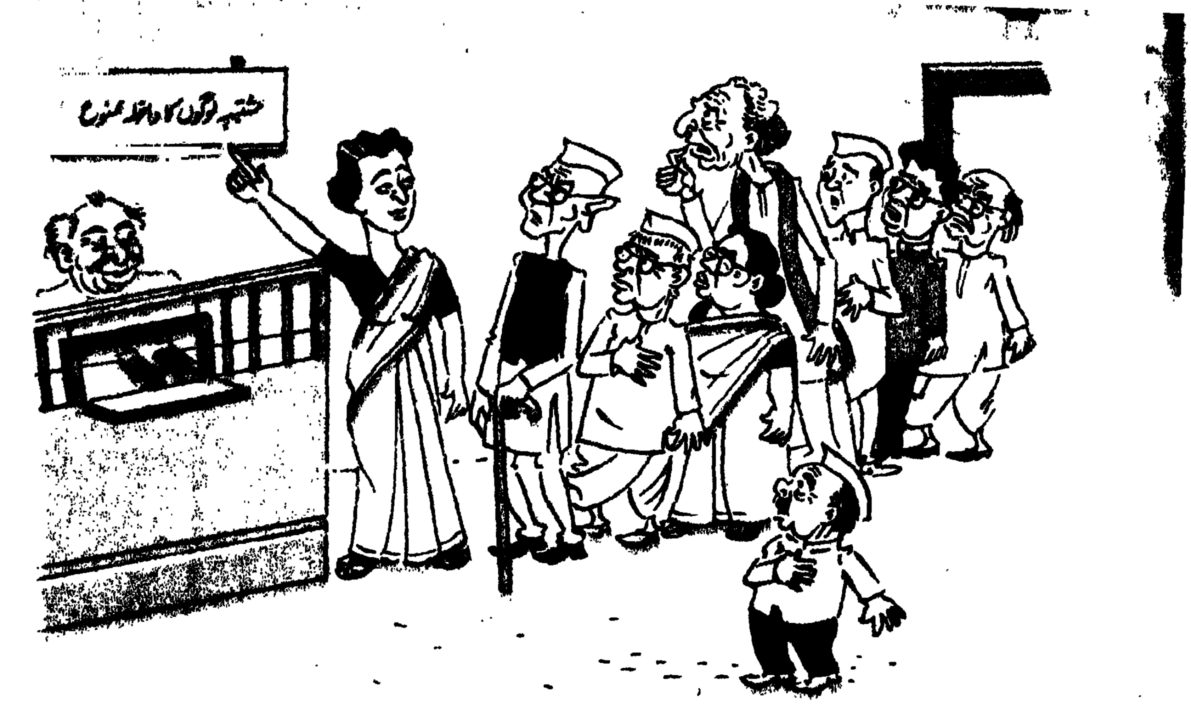
"کانگریس اور عوام کے درمیان خلیج" ایک عنوان ——— کانگریسیوں کے عمل نے پیدا کی۔

"راجہ جی کو مکمل آرام کا مشورہ" ایک خبر ——— یعنی نہ بیان دیں نہ تقریر کریں۔

"مرکزی وزراء اپنے حلقوں میں" ایک عنوان ——— یہ سیزن ہی حلقوں میں جانے کا ہے۔



"چوتھے پلان میں ہاؤسنگ کے لئے فنڈ۔ شری مہر چند کھنہ کی کامراج سے شکایت" ایک عنوان



"مشتبہ لوگوں کو کانگرس کے ٹکٹ نہیں ملیں گے" اندرا گاندھی

"حکومت پر بے بنیاد الزام عاید کرنے سے کانگرس کمزور نہیں ہوگی"
اندرا گاندھی ـــــ بلکہ کانگرسیوں کے اپنے کرموں سے کمزور ہوگی۔

"آئندہ الیکشن میں کانگرس ہی برسرِ اقتدار آئے گی" صدر کانگرس کی
توقعات ــــــ تو پھر آپ ٹکٹوں کے ساتھ ساتھ انھیں عہدوں کے ٹکٹ بھی
ابھی سے دے دیں۔

"سودیشی کی نئی تحریک" ایک عنوان ــــــ جس کا تقریروں میں ذکر
بے عمل صفر۔

"گرام سیوکاؤں کو مرغبانی کی ٹریننگ" ایک خبر ــــــ انڈے دینے،
انڈے سینے کا کام شامل۔

"ہمارے قومی مقاصد" ایک عنوان ــــــ
۱۔ ہڑتال اور بند
۲۔ ریلیں اور بسیں روکنا
۳۔ تار اور ٹیلیفون کے تار کاٹنا
۴۔ ریلوں کی پٹریاں اکھاڑنا
۵۔ پولیس سے تصادم اور پتھراؤ
۶۔ التوا کی تحریکیں
۷۔ باہمی جھگڑے، فسادات

"امریکہ اور زیادہ جنگی جہاز تیار کرے گا" ایک خبر ـــ قیامِ امن کے لئے۔

"مخالف پارٹیاں امن و انتظام کے قیام میں تعاون کریں" ایک عنوان ــــ
یعنی وہ پارٹیاں خودکشی کرلیں یا پھر دیوالیہ ہونے کا اعلان کردیں۔

"ڈاکٹروں کو دیہات میں بھیجنے کی کوشش کی جائے گی" ایک خبر ــــــ
تاکہ وہاں جائیں اور لوگوں کو مریض بنائیں۔

"مل جل کر کام کرنے اور جمہوری سوشلزم پر زور" شاستری نگرمیں شری کامراج کی تقریر ——— یعنی وزارتوں کے لئے جھگڑے نہ کئے جائیں۔ برابر برابر بانٹ لی جائیں۔

• "دُنیا میں گیہوں کی فصل اچھی ہوگی" ایک خبر ——— ہمیں صرف امریکہ کی فصل سے دلچسپی ہے۔

• "دِلّی کا موسم" ایک عنوان ——— الیکشن کے بادل چھائے ہیں ٹکٹوں کے طلب گار دُور دُور سے آرہے ہیں۔

"روپے کی قیمت کم ہونے سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوا" ایک عنوان ——— بلکہ خریداروں کی جیب میں روپیہ کم ہوگیا ہے۔

"گندی فلموں کی نمائش بند کی جائے۔ عوام کا اخلاق تباہ ہورہا ہے" ایک مقالہ ——— اور گندی سیاسی پارٹیوں کو بھی خلافِ قانون قرار دیا جائے جو عوام کو ہلڑبازی سکھا رہی ہیں۔

• "تعلیمی کمیشن کی سفارشات" ایک عنوان ——— ———

۱۔ طالب علموں کو ٹیڈی پتلونیں اسکول کی طرف سے سپلائی کی جائیں۔

۲۔ انھیں ہڑتالیں کرنے اور پولیس سے بھڑنے کا آرٹ سکھایا جائے۔

۳۔ ماسٹروں کو طلباء کا ادب کرنا چاہیے۔

۴۔ طلباء ماسٹروں سے بازپرس کرسکیں۔

۵۔ پکنک پارٹیوں اور سینما کے پروگرام بنائے جائیں۔

• "سرکاری کھاد بلیک میں" ایک عنوان ——— کیا حرج ہے۔ اُس کا رنگ کالا نہیں ہوگا۔

"کرشنا مینن کو بجلی کا جھٹکا" ایک خبر ——— یعنی شاک ٹریٹ مینٹ۔



• "قیمتوں میں اضافہ روکنے کی تمام سرکاری کوششیں ناکام" ایک عنوان



"کرپشن اور مہنگائی دو سگی بہنیں ہیں" : ایک عنوان

"کامن ویلتھ کانفرنس میں برطانیہ کو کھری کھری" : ایک عنوان ——— برطانیہ نے ایک کان سے سنی دوسرے سے اڑا دی۔

"چور اپنا دل پسند مال لے گیا اور خراب چیزیں پھینک گیا" : ایک خبر ——— ایمانداری کا بے نظیر مظاہرہ۔

"جن سنگھی ممبر کا قابلِ اعتراض طرزِ عمل" : ایک عنوان ——— کبھی قابلِ تعریف بھی ہوتا ہے کیا، جو شکایت کر رہے ہو۔

"وزیرِ انصاف یو۔پی سید علی ظہیر کو ٹکٹ کی سفارش میں نظر انداز کر دیا گیا" : ایک خبر ——— بڑی ناانصافی کی۔

"اپنی طاقت تعمیری کاموں میں لگائیں" : اندرا گاندھی ——— جیسے کملاپتی اور سی۔بی گپتا لگا رہے ہیں۔

"فرقہ پرستوں کے ساتھ انتخابی گٹھ جوڑ نہ ہوگا" : صدر پنجاب کانگرس ——— اکالیوں اور جن سنگھیوں کو مایوسی۔

"چین میں اقتدار کی رسہ کشی زوروں پر" : ایک عنوان ——— ڈاکوؤں میں مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت یہی عالم ہوتا ہے۔

"دواؤں کی گراں فروشی کی روک تھام" : ایک عنوان ——— مریضوں کے دارالبقا سدھارنے کے بعد ہوگی۔

"بزمِ شفا کا مشاعرہ" : ایک عنوان ——— صحت کے خواہش مند شعراء شرکت کریں۔

"قومی آمدنی میں کمی" : ایک عنوان ——— کوئی حرج نہیں، سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور تاجروں کی آمدنی میں کمی نہ ہونی چاہیئے۔

"نہرو جی کانگرسی وزیروں کی طرف سے بدگماں تھے" ایک عنوان ——— آپ چپکے سے پوچھئے تو نہرو کی بیٹی کا تاثر بھی یہی ہوگا۔ بلکہ شاید نہرو سے زیادہ تلخ۔

"ملک سے چیچک کی منحوس بیماری کو ختم کرنے کے لئے تعاون کی اپیل"۔ ایک خبر ——— اِس سے بھی زیادہ منحوس اور مہلک بیماری سیاستدانوں کی آپس کی لڑائی ہے۔

"کانگرس الیکشن میں عورتوں کو زیادہ ٹکٹ دے گی" وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کی عورتوں کو یقین دہانی ——— اب وقت آگیا ہے کہ عورتیں مردوں سے پچھلی ناانصافیوں کا بدلہ لیں۔

"کوئلوں کی پیداوار میں اضافہ" ایک خبر ——— دلالوں کے ہاتھ بھی زیادہ کالے ہوئے ہوں گے۔

"کانگرسی ورکروں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونا چاہیئے" ایک عنوان ——— احساس ہوتا تو جوتوں میں دال کیوں بانٹتے۔

"خیالی اندازوں پر چوتھا پلان" ایک عنوان ——— غنیمت ہے خواب کی باتوں پر مبنی نہیں ہے۔

"اُردو سے دیش کو یکجہتی اور ڈیموکریسی کو تقویت حاصل ہوگی" ایک عنوان ——— ۱۹ برس بعد یاد آیا ؎

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

"شراب کی چلتی بھٹی پکڑی گئی" ایک خبر ——— چلتے پھرتے پوسٹ آفس کی طرح ہوگی۔ جا بجا کھڑی ہو کر تازہ بتازہ سپلائی کرتی ہوگی۔

"یو۔ پی ودھان سبھا میں کانگرس کی طاقت بڑھ گئی" ایک عنوان ——— کملاپتی، گپتا اور سچیتا کی پنجہ آزمائی کا نتیجہ۔



"ہند اور پاکستان کے وزرائے خارجہ کی ملاقات" ——— چاؤ ماؤ کے دل پر چھریاں

لمبا چہرہ، لمبی نوکیلی ناک، بڑی بڑی مضطرب آنکھیں، دُبلا پتلا دھان پان اور چنچل جسم۔ مُلک کے اندر کھدر کا لمبا کُرتہ، گلے میں کھدر کا ٹپکا اور کھدر کی دھوتی اور مُلک سے باہر کوٹ پتلون ——— ایسے ہیں ہندوستان کے سابق وزیرِ دفاع



تقریروں کے سمندر کے ماہر ہیں۔ اپنی تقریروں سے مجلس اقوامِ متحدہ میں ہندوستان کا مقدمہ تو نہ جیت سکے مگر مسلسل تقریر کرنے، تقریروں کے درمیان ۲، ۲ چائے کی پیالیاں خالی کرنے اور ڈرامائی انداز میں تقریر کرتے کرتے بے ہوش ہوجانے میں ایسے ریکارڈ قائم کئے ہیں کہ آنے والی نسلِ انسانی صدیوں اُسے توڑ نہ سکے گی۔

کشمیر لینے کی کوشش میں نیفا اور لداخ کا کچھ حصّہ اپنے یارِ غار چو۔ این۔ لائی کو چینی ہندی بھائی بھائی کے سہانے نعروں کے درمیان دے بیٹھے۔ وزیرِ دفاع تھے۔ مُلک کا دفاع تو کیا اپنا دفاع نہ کرسکے۔ کمیونسٹ نوازی میں وزارت ہی گنوا بیٹھے مگر ہمّت نہیں ہارے۔ تقریروں کے سہارے جی رہے ہیں۔ کھوئی ہوئی عزت بحال کرنے کے لئے جنتا کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں اور لبوں پر یہ مصرع ہے ؎

افسانہ

موضوعِ شاعری!

کوثر چاندپوری

ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی

۳ر اگست ۱۹۶۶ء   خوشتر صاحب! تسلیم

راجہ مہدی علی خاں اپنی تمام قہقہہ سامانیوں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس خبر پر وہ لوگ بھی رو رہے ہیں جو ہنسنے کے خوگر ہیں۔ راجہ ایسا باغ و بہار انسان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے، یہ بڑا غمناک سانحہ ہے۔ خدا راجہ کی روح پر رحمتیں نازل کرتا ہے۔ طاہرہ بیگم نقوی سے مجھے گہری ہمدردی ہے۔ تعزیت کا پیام آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ ہی اُن کی مسکراہٹوں کے امین ہیں ——— وینگر والی پرسوں کی دعوت بہت شاندار تھی۔ جے پال غریب کو بھی آپ نے پرہیز توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عزیز کرشن کی سعادتمندی کا تذکرہ آپ بہت میٹھی زبان میں کر رہے تھے۔ ایک شفیق اور دردمند باپ کا لہجہ ازل ہی سے یہ لب و لہجہ رہا ہے۔ اُس وقت وینگر کے دروازے پر جہاں ہم بہار برنی کے منتظر تھے اچانک کرشن مل گئے۔ اُنھوں نے آپ کے پاؤں چھوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ اُس وقت ایک شہنشاہ سے بھی اونچے ہو گئے ہیں۔ آپ کے رخسار فخر اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے چمک اٹھے تھے۔ میں سوچ رہا تھا باپ بیٹے دونوں خوش نصیب ہیں، اور میں بھی جس نے یہ اثر انگیز نظارہ اتنے قریب سے دیکھا ——— ڈاکٹر کمار (آئی اسپیشلسٹ) سے آپ کی آنکھ کے متعلق بات ہو گئی ہے . . .

سدا آپ کا ——— کوثر چاندپوری

وہ پتلی دُبلی اور دراز قامت لڑکی تھی۔ اُس کا رنگ بہت صاف نہ تھا۔ بس سانولا سمجھ لیجئے۔ آنکھیں بڑی تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکیں سایہ فگن رہتی تھیں۔ ابرو سچ مچ ہلالی تھے۔ جسم میں ایک عجیب قدرتی تناسب تھا۔ ساڑی اُس کا پسندیدہ لباس تھا۔ اُس وقت بھی وہ رنگین پھولدار ساڑی پہنے صوفے پر بیٹھی چپلوں سے کھیل رہی تھی۔ دونوں پیروں کی انگلیاں آہستگی سے چپلوں کو آگے پیچھے سرکا رہی تھیں۔ چہرے پر غازہ لگانے کی وہ بالکل خوگر نہ تھی۔ اُس کے پتلے ہونٹ یوں ہی رنگین تھے۔ لپ اسٹک وہ کبھی نہ لگاتی تھی۔ ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ مسکراہٹوں کو مہکاتا رہتا تھا۔ سامنے رکھی ہوئی سنگار میز کے آئینے میں وہ آسانی سے اپنا چہرہ دیکھ سکتی تھی اور کبھی کبھی پرویز کی نگاہیں بچا کر دیکھ بھی رہی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اُس کے رخساروں اور لبوں پر کسی مصنوعی رنگ کی کارفرمائی نہیں۔ پھر بھی وہ لالہ گوں نظر آتے ہیں۔ پرویز دیر سے کرسی پر بیٹھا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے شعور پر ایک رومانی نظم یوں چھائی ہوئی تھی جیسے ساون بھادوں کی گھٹائیں آسمان پر محیط ہو جاتی ہیں۔ اشعار نرم رو آبشار کے مانند بہتے اور گنگنانے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا نظم کتنی ہی حسین تکنیک میں کیوں نہ ڈھل جائے وہ ساجدہ سے زیادہ دلکش نہیں ہو سکتی۔ تصویر اصل کے مقابلہ میں کسی طرح نہیں آ سکتی۔ کاش اُس میں وہی حسین توازن نمایاں ہو جائے جو ساجدہ کی آنکھوں، ہونٹوں اور رخساروں سے نمایاں ہے۔ کاش! وہ ساجدہ کے ہلالی ابروؤں سے زیادہ خوبصورت تخلیق پیش کر سکتا! اشعار مسلسل ذہن میں گونج رہے تھے۔ ذہنی خلاؤں میں ترنم سا بکھرا ہوا تھا۔ اُس میں مہک بھی تھی اور گویائی بھی۔ وہ چاہتا تھا ابھی انھیں کاغذ پر منتقل نہ کرے۔ ہو سکتا ہے نظم کی ہیئت میں ساجدہ کے قد کا تناسب نہ ہو۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ اُس کا

بے تکلف دوست عارف آگیا۔ پرویز استقبال کو کھڑا نہیں ہوا۔ اُسے دیکھ کر صرف مسکرا دیا اور چند لمحے توقف کرنے کے بعد بولا ۔۔۔ "سوال یہ ہے کہ بلند قامت خواتین کے جسم پر ساڑی زیادہ جچتی ہے یا شلوار؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ جو عورتیں دراز قد ہوں اور زیادہ موٹی نہ ہوں اُنھیں ساڑی کے سوا کوئی اور لباس نہ پہننا چاہئے۔"

وہ براہِ راست ساجدہ سے مخاطب نہ تھا۔ عارف کو خطاب کرکے یہ سب کچھ کہا گیا تھا لیکن ساجدہ شرما گئی۔ اُس کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ لمبے قد کی اشاریت میں اُسی کا وجود لپٹا ہوا ہے۔ اُس نے ساڑی کے گل بوٹوں پر نگاہیں جما دیں۔ عارف نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر اُس کے سراپا کو دیکھا۔ وہ کلوپیٹرا کے مرمریں مجسمے کی طرح بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ اُس کی لمبی پلکیں جلدی جلدی جھپک رہی تھیں۔ آنکھوں میں خمار کی سی کیفیت تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ جیسے ہلکا بخار چڑھ آیا ہو۔

"میری رائے میں" عارف نے کہنا شروع کیا "حسن کو محدود کرنا اچھا نہیں۔ اُسے ہر رنگ میں جلوہ دکھانے کی آزادی ہونی چاہئے۔ وہ مہک، طوفان اور روشنی کے مانند اُگنے، بہنے اور چمکنے کا خوگر ہے۔ کسی دوشیزہ کو ایک ہی لباس کا پابند کر دینا بالکل ایسا ہے جیسے کسی سہانے نظارے کی تصویر ایک ہی رُخ سے حاصل کر لی جائے جبکہ ہر رُخ اور ہر انداز سے تصویریں لی جا سکتی ہوں اور اُن میں سے ہر ایک خوبصورت اور جاذبِ نظر بھی ہو سکتی ہو۔"

پرویز غور سے عارف کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے دماغ میں اشعار اُسی طرح گونج رہے تھے۔ نظم اُسی طرح سانچے میں ڈھلتی جا رہی تھی جیسے آرٹسٹ سادہ کاغذ پر اپنے موقلم سے سبز، سُرخ اور نیلے نقوش اُبھار رہا ہو۔ جو ایک دوسرے میں گھُل کر کوئی دلکش تصویر مکمل کرتے جا رہے ہوں۔

"میری رائے ہے عارف! کہ تم مجھ سے بڑے اور حقیقت پسند فنکار ہو۔"

"میں یہ الزام قبول کرنے کو تیار نہیں پرویز! شاعر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو میری رائے میں حقیقت پرست نہیں ہو سکتا۔ تخلیق کا اضطراب اُسے کسی نہ کسی وقت حقائق کے راستہ سے ہٹا ہی دیتا ہے۔ جذبہ شعر کے لئے ضروری ہے۔ اُس کا اظہار کرنے کے لئے حقیقت کی شاہراہ کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔"

"عارف!" پرویز نے پہلو بدل کر کہا "یہ بہت غلط الزام ہے شاعری پر۔ میں اِس کی پُرزور تردید کرتا ہوں۔"

"یہ تردید سراسر جذباتیت کا آئینہ ہو گی۔"

"ایسا نہیں ہے عارف! تم ابھی تسلیم کر لوگے کہ میں شاعر ہو کر بھی واقعیت کی ترجمانی کرتا ہوں۔ سُنو ایک تازہ نظم میں نے ابھی ابھی کہی ہے۔"

ساجدہ گھبرا گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے پرویز اُس کی کوئی ایسی تصویر میز پر رکھنے کا ارادہ کر رہا ہو جسے وہ عارف کو دکھانا پسند نہیں کرتی۔

"میں کہتی ہوں نظم و رزم رہنے دی جائے۔ ضروری نہیں کہ آدمی ہر وقت شاعری بنا رہے۔"

"نہیں ساجدہ!" عارف نے اصرار کرتے ہوئے کہا "نظم نہ پڑھی گئی تو ہونٹنگ کرنے کی اُمنگ دم توڑ دے گی۔"

عارف کا اشارہ پاتے ہی پرویز نے نظم شروع کر دی۔ وہ بڑے دلنشیں ترنم سے رُک رُک کر ایک ایک شعر پڑھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ساجدہ کا مجسمہ اشعار میں ڈھلتا جا رہا ہو! اُس کے سامنے خط و خال نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ پنڈلیوں کی چمک دمک، پلکوں کی درازی، لبوں کی سُرخی، غرض ہر چیز! نظم خاصی طویل تھی۔ ساجدہ کے قد و قامت سے کچھ چھوٹی! اُس میں کوئی جھول اور مبالغہ نہ تھا۔ جذباتیت ضرور تھی لیکن اُس کی آنچ اِتنی تیز نہ تھی کہ خیالات کو جلا کر خاکستر کر دے۔ وہ تخیل کو بہت دھیمی آنچ پر پکا رہی تھی۔ جلاؤ اسلوب کی مہک تیز نہ تھی۔ عارف عجیب عالم میں تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے پوری توجہ سے سُن رہا تھا۔ پرویز خاموش ہوا تو چونک کر بولا۔

"واللہ! لاجواب نظم ہے۔ برجستہ گوئی کی تاریخ میں اِس مختصر مثنوی کی مثال نہیں مل سکتی! اب مجھے یقین ہوا کہ شاعروں کی دُنیا میں حقائق سے کام لینے کا رواج بھی ہے۔ یہ الزام غلط ہے کہ شاعر جذبات کی رَو میں بہہ جاتا ہے۔"

ساجدہ خاموش تھی۔ وہ بالکل مسحور ہو چکی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سنگار میز کے لمبے آئینے میں اُس کا پُورا مجسمہ منعکس ہو گیا ہے۔ اُس کی زبان میں جنبش کی طاقت ہی باقی نہ رہی تھی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سُن ہوتے جا رہے تھے۔ اُسے اپنی تعریف کبھی پسند نہ آئی تھی۔ آج ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کانوں کے راستے دماغ میں بہت ہی میٹھا اور لطیف رس پیوست ہو رہا ہے۔

ذرا دیر بعد پرویز اور عارف چلے گئے۔ ساجدہ تنہا رہ گئی۔ وہ دیر تک کیف و سرور کی اُسی گلپوش وادی میں رنگین تتلی کے مانند اُڑتی رہی جس میں پرویز نے اُسے چھوڑ دیا تھا۔

پرویز ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ کالج میں فلسفہ پڑھاتا تھا اور چند ہی ماہ پہلے باہر سے تبدیل ہو کر آیا تھا۔ ساجدہ نے اُسی سال فلسفہ پڑھنا شروع کیا تھا۔ اُسے ادب اور تنقید سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ پرویز کے آنے سے پہلے ہی اُس کی شہرت یہاں پہنچ گئی تھی۔ جلد ہی بزمِ ادب کے سکریٹری نے اُسے ایک مشاعرے کی صدارت کے لئے مدعو کر لیا۔ وہ مشاعرے میں آیا۔ صدارت بھی کی۔

کلام سُننے سے بالکل انکار کر دیا۔ اُس نے نہایت صفائی سے کہہ دیا کہ میں فلسفہ کا آدمی ہوں شاعر نہیں۔ حالانکہ اُس کی تخلیقات رسائل میں آتی رہتی تھیں۔ ساجدہ مشاعرہ میں موجود تھی۔ سب سے پہلے وہیں اُس نے پرویز کو دیکھا اور اُس کی وارفتہ مزاجی سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی سے بالکل طفلانہ انداز سے کھیل رہا تھا۔ بار بار تسمہ کھولتا اور پھر باندھ لیتا۔ ساجدہ اور اُس کی سہیلیاں پرویز کی اُس حرکت پر مُسکراتی رہیں۔ پرویز کی شخصیت میں دل کشی کے ساتھ ہی وقار بھی تھا۔ یہی وقار لڑکیوں کی مُسکراہٹوں کو قہقہوں میں تبدیل ہونے سے روک رہا تھا۔

عارف نے پرویز سے ساجدہ کا تعارف کرایا۔ پروفیسر یہ سُن کر خوش ہوا کہ ساجدہ نے فلسفہ ہی میں داخلہ لیا ہے۔ عارف ایک مقامی اسکول میں ٹیچر تھا۔ وہ ساجدہ کا اُستاد بھی رہ چُکا تھا۔ پرویز عارف کے ساتھ ساجدہ کے یہاں آنے جانے لگا۔ رفتہ رفتہ اِس آمد و رفت نے ہلکی سی بے تکلفی کا رنگ اختیار کر لیا۔ پرویز کبھی کبھی ساجدہ کے لباس اور اُس کے جسمانی تناسب پر نہایت شائستگی کے ساتھ تنقید بھی کر دیتا۔ اِسی سے ساجدہ کو اندازہ ہوا کہ اُس کے جسم میں کون سے زاویے اور گوشے توجہ کے مستحق ہیں۔ کچ پرویز نے اُس کے سراپا پر پُوری نظم ہی کہہ ڈالی۔ اُس کا عنوان ساجدہ نہ تھی لیکن موضوع ضرور تھی۔ اُس نظم سے پرویز کا ذوقِ جمال صاف نمایاں تھا۔ اُس کی قوتِ مشاہدہ بھی جھلک رہی تھی۔ ساجدہ جانتی تھی کہ زندگی کی منزل میں پرویز تنہا ہے لیکن وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اُس کے اور پرویز کے درمیان کسی ایسے رشتے کا امکان پیدا ہو سکتا ہے جسے منزلی زندگی کا چراغ کہہ سکیں۔ نظم کی رومانیت نشاندہی کر رہی تھی کہ یہ شمع روشن ہو سکتی ہے۔ اگرچہ معاملہ اِس نوعیت کا نہ تھا کہ پرویز نظم کہہ دے اور ساجدہ اُس کی ہو جائے۔ لیکن عارف کو یقین ہو گیا کہ اِن دونوں کے درمیان ایسے روابط جنم لے چکے ہیں جو انھیں کسی نئی دُنیا کی سمت لے جا سکتے ہیں۔ ایک دن پرویز اور عارف مصروفِ گفتگو تھے۔ رفتہ رفتہ بات حُسن و عشق تک پہنچ گئی۔ دفعتہً عارف نے پُوچھ لیا۔

"ساجدہ کے متعلق کیا خیال ہے پرویز؟"

"وہ بہت جینیس ہے۔"

"اور کچھ نہیں؟"

"بہت زیادہ حسین ہے۔ اُس کے حُسن میں اجنتا اور ایلورا کا آرٹ جھلکتا ہے۔ وہ ایسا مجسمہ ہے جو ہزاروں سال میں مکمل ہوا ہے!"

"تم اُسے پسند کرتے ہو؟"

"کیوں نہیں، میں شاعر ہوں، حسن کا دلدادہ رہا ہے۔ ساجدہ میری پسندیدہ لڑکی ہے۔"



"کیا اُس سے شادی کا ارادہ بھی رکھتے ہو؟"

"منزلی زندگی کے متعلق میرا نظریہ بہت عجیب بلکہ مضحکہ خیز ہے۔ میں ذوقِ جمال رکھتے ہوئے بھی کسی خوبصورت لڑکی کو بیوی بنانے کا قائل نہیں۔ میں ایک خاص ضابطۂ رومان پر عامل ہوں۔ غالب کی زبان میں یوں سمجھ لیا جائے کہ عورت میری راہ میں مصری کی ڈلی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" عارف نے تیور بدل کر سوال کیا۔ "تم ساجدہ کو اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتے ہو؟"

"نہیں۔ یہ بدگمانی کیوں ہوئی تمہیں؟"

"تم اُس سے بے حد دلچسپی لے رہے ہو۔"

"دلچسپی ضرور لے رہا ہوں لیکن اِس میں ہوس کا رنگ نہیں۔ میں اُس سے شادی نہیں کروں گا۔ اپنی ہوس کا نشانہ نہیں بناؤں گا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ تم اِس شاعرانہ عہد پر قائم رہ سکو گے۔"

"عارف! افسوس ہے کہ تم میرے نقطۂ نظر کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔"

"ایسا وقت بھی آسکتا ہے پرویز جب یہ فلسفہ پستی میں جا پڑے۔"

پرویز خاموش رہا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی یہ خاموشی عارف کی بدگمانی کو دُور نہ کر سکی۔ بلکہ وہ اور گہری ہوگئی۔ اُسے یقین آچکا تھا کہ ساجدہ تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے۔ پرویز نے اُس کی دوشیزگی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اُسے پرویز سے شدید نفرت ہوگئی۔ دونوں کی ملاقاتیں بھی جاری نہ رہ سکیں۔ عارف ساجدہ سے بھی برہم ہوگیا۔

دو تین مہینے یوں ہی گزر گئے۔ اچانک عارف نے سُنا کہ ساجدہ اور انیس مرزا کی شادی ہو رہی ہے۔ پرویز اِس رشتے میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ عارف اُسی روز پرویز کے یہاں گیا۔ اس نے پوچھا۔

"یہ شادی تمھاری منشا سے ہو رہی ہے پرویز؟"

"بالکل! انیس مرزا میرا شاگرد ہے۔ اُس نے میرے ہی مشورے سے یہ تحریک کی تھی۔"

"سچ؟"

"اِس قدر حیرت کی کیا بات ہے عارف؟ ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ساجدہ کو میں نے بڑی کوشش سے رضامند کیا ہے۔ وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ میں اُسے رفیقۂ حیات بنانے کے منصوبے بنا رہا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمھیں پسند ضرور کرتا ہوں لیکن ہر پسند کا انجام شادی نہیں۔ مجھے اجنتا، تاج محل اور نہ جانے کیا کیا چیزیں پسند ہیں۔ اُنھیں بیوی بنانا کسی طرح ممکن نہیں۔ تمھارے اطمینان کے لئے اِتنا کافی ہے کہ تم میری شاعری کا موضوع بن چکی ہو——— عارف! ایک نظم اور کہی ہے میں نے۔ اُس کا عنوان ہے "ساجدہ شادی کے بعد!" آئندہ بھی اُسے تصور میں بٹھا کر میں نظمیں کہتا رہوں گا۔ اُن میں میرا درد، غم، سوز غرض سب کچھ ہوگا۔ عارف! مجھے ساجدہ سے محبت ہی نہیں عشق ہے لیکن میں فن کو دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ ساجدہ کو بیوی بنا کر فن کو زندہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ انیس میرا شاگرد، بیٹا اور بھائی ہے۔ وہ ساجدہ کے ساتھ ایک انجانی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ سفر جاری رہے اور دونوں مستقبل کے اُن رنگوں میں جذب ہو جائیں جو قوسِ قزح سے زیادہ جاذبِ نگاہ، رنگِ گُل سے زیادہ نازک اور سورج کی کرن سے زیادہ شوخ اور چمکدار ہیں!!"

غزل

——— بیتاب پیلی بھیتی، ایم۔ اے ———

ہر راہگزرِ شہرِ تمنّا کی بھلی ہے
اے حُسن مگر تیری گلی تیری گلی ہے

آغوش میں جو نکہت و نُزہت کے پلی ہے
تُو باغِ تمنّا کی وہ رنگین کلی ہے

جب عشق و محبت کی کوئی بات چلی ہے
اک شمع شبستانِ محبت میں جلی ہے

شوخی ہو، شرارت ہو، حیا ہو کہ تبسم
سانچے میں قیامت کے ہر اِک چیز ڈھلی ہے

خوشبو تری یادوں کی گزرگاہِ وفا میں
ہر ایک قدم ساتھ رہی ساتھ چلی ہے

آنا ہے تو آغوشِ تمنّا میں چلا آ
پلکیں بھی ہیں نم رات بھی اب بھیگ چلی ہے

اِس دشتِ محبت میں مجھے چھوڑ کے تنہا
اے حُسن کی دیوی تو کہاں رُوٹھ چلی ہے

یہ اشک کا قطرہ ہے مری نوکِ مژہ پر
یا شمع کوئی گورِ غریباں پہ جلی ہے

ملتی ہی نہیں بُوئے وفا اب کسی گُل میں
یہ کیسی ہوا گلشنِ عالم میں چلی ہے

بیتاب نہ جا اُن کی عنایت کی نظر پر
پردے میں مُروّت کے کوئی چال چلی ہے

شادی کا دھندہ

پروفیسر زکی انور، ایم۔ اے

شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور۔ ۱

۲۰ جولائی ۶۶ء

بھائی جان! تسلیم

میں گرمیوں کی چھٹی میں یہاں نہیں تھا۔ ایک ہفتہ ہوا آیا تو آپ کا گرامی نامہ ملا —— لیجئے سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ "شادی کا دھندہ" ارسالِ خدمت ہے۔ اس افسانے میں میں چاہتا تو یہ میرے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا (اس لئے کہ میں بائیں ہاتھ سے نہیں لکھتا) کہ میں اپنے ہیرو کو چھ ہزار سات سو روپے کی چپت سے بچا لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تاکہ اس افسانے سے عشق کرنے والے میرے دوست عبرت حاصل کریں اور یہ افسانہ "عبرت ناک" ہو جائے! اور یہ میں نے اپنے ایک کرم فرما کے خط سے عبرت حاصل کر کے کیا ہے، جنھوں نے مجھے "تلقین" کی ہے کہ میں "عبرت ناک" افسانے لکھا کروں! اگر اس افسانے کو اُنھوں نے عبرت ناک نہ سمجھا تو اب وحشت ناک افسانے لکھوں گا۔ . . وہ تو خیر سے محض ایک پڑھنے والے آدمی ہیں، بے چارے نے، جو اُن کی سمجھ میں آیا لکھ دیا۔ حد سے زیادہ وحشت ناک ہنسی تو اس وقت آتی ہے جب بعض "لکھنے والے" اور افسانے کے فن سے واقف لوگ بھی تعمیری افسانے کا نعرہ لگاتے ہیں اور افسانے کو روسی ناول یا مذہبی کتابوں کی تفسیر دیکھنا چاہتے ہیں —— تفریحی افسانے بہرحال تفریحی ہوں گے۔ ان میں اگر کچھ اور شامل کیا گیا تو اچار سچر بگا ہو کر رہ جائیں گے اور اچار اور ادب میں بہرحال فرق ہے (اگر نہیں ہے تو ہونا چاہئے) —— گھبرایئے نہیں میرا موڈ بالکل اچھا ہے۔ ایک دلچسپ بات سُنئے "پسِ پردہ" کی اشاعت کے بعد میرے پاس جو خطوط آئے اُن میں بعض بہت دلچسپ تھے اور ایک تو حد درجہ دلچسپ تھا —— ایک صاحب نے بڑے تیکھے انداز میں شکایت کی ہے کہ میں اپنے افسانوں میں کچھ حقیقی خطوں کو بھی "چانس" دیتا ہوں تو پھر میں نے اُن کے خط کو کبھی کیوں نہیں "چانس" دیا۔ اس سلسلے میں اور بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ میں ایڈیٹر "بیسویں صدی" کے خط کو کیوں "چانس" دیتا ہوں جب کہ ایڈیٹر "بیسویں صدی" اُنھیں اور اُن جیسے سیکڑوں "طلوع ہوتے ہوئے آفتاب" کو چانس نہیں دیتے۔ بھائی جان! یہ تو سچ مچ ظلم ہے۔ پروا نہ کیجئے کہ "بیسویں صدی" کا معیار غروب ہو جائے گا لیکن طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کو ضرور چانس دیا کیجئے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے گا۔ آپ کو ثواب ہوگا۔ بہرحال میں تو ثواب کما رہا ہوں اور طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کچھ کرنیں اس افسانے میں استعمال کر رہا ہوں۔ ثواب کا کچھ حصّہ آپ کے ہاتھ آئے گا اور کچھ محترم . . . "خوش نویس" "بیسویں صدی" کے یا ابھی رہنے دیجئے "ثواب کا یہ بٹوارہ ہم قیامت میں کر لیں گے —— آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے اور اب تو بہتر بار سلام کرنے کے بعد چوبیس گھنٹے کی Casual Leave حاصل کرنے کی لعنت بھی ختم ہو چکی ہے۔ بس صرف موڈ کی بات ہے۔ میرا خیال ہے دسمبر کی چھٹی میں ضرور موڈ بناؤں گا —— گرمی اب بھی ہے اور بہت شدید ہے۔ اس لئے کہ اس شہر کا نام ایک بزرگ برتر کے نام پر جمشید پور ہے۔ اُس عظیم خدا ترس بزرگ کا مجسمہ بھی لوہے کا ہے اور شہر بھی! میں کوشش

کر رہا ہوں کہ میرا دل بھی لوہے کا ہو جاتے اور ہزاری باغ کی حسین یادوں سے پگھلا نہ کرے اور یہیں کا ہو کر رہ جاتے —— ہزاری باغ کی یاد آگئی - حیرت ہو رہی ہے کہ ایک عظیم شاعر نے اپنا شاندار مصرع لکھتے ہوئے کیا تھا "اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے! . . .

آپ کا اپنا —— تیک انور

اپنی صدی - دہلی

۳ر جون ۹۵ء   برادر عزیز! تسلیم

ایک طویل عرصے کے بعد آپ کی تحریر دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔

"افسانہ نمبر" میں آپ کا افسانہ آ رہا ہے - اب آپ کو یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہئے۔

محترمہ بھابی صاحبہ کی خدمت میں میری طرف سے تسلیمات پیش کیجئے اور بچوں کو پیار اور دعائیں - خدا کرے آپ لوگ بخیر ہوں اور آپ کو آپ کی زندگی کا نیا دور راس آئے۔

آپ کا —— مدیر اپنی صدی

ساحر

۲۴ر جولائی ۹۵ء   برادر محترم! بہت بہت سلام

ایک مدت کے بعد "اپنی صدی" میں آپ کو پا کر کس قدر مسرت ہوئی میں بیان نہیں کر سکتی - آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے اور بھی خوشی ہوئی کہ آپ اب اپنی زندگی کے نئے دور کا آغاز کر چکے ہیں - خدا کرے اس کا یہ مطلب ہو کہ آپ نے پھر لکھنا چاہنے والوں سے ایک عہد کیا ہے کہ ہر ماہ اپنی عمر سے ملاتے رہیں گے! اور جب آپ نے لکھنا شروع کر دیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ نے افسانوں اور ناولوں کے علاوہ خط بھی لکھنا شروع کر دیا ہوگا اور اب آپ کی پیاری بہن یہ ناچیز ظہیرہ بھی یاد آنے لگی ہوگی مگر آپ "عمر پیاری" کو ایک ماہ ۲۶ دنوں میں چھ خطوط کے جواب میں سات خط لکھ سکتے ہیں تو پھر مجھے تو ہرگز مایوس نہ کریں گے - کیونکہ بعض لوگوں کے قیاس کے مطابق (برا نہ مانئے گا) اگر عمر کبھی آپ کی محبوبہ رہی تھی (یا آپ کے کہنے کے مطابق محبوبہ بننے کی کوشش کرتی رہی تھی) تو دوسری طرف میں آپ کی بہت ہی عزیز بہن ہوں اور آپ ہی تو کہتے ہیں کہ "بہن کے پیار کا تقدس اور مقام ہی اور ہے اور محبوبہ کے پیار سے اس کا موازنہ ہی حماقت ہے - وہ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ جس میں ایک دوسرے کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کی لہریں ہیں لیکن محبوبہ کا پیار ایک سراب کے سوا اور ہے ہی کیا؟" بہرحال مجھے یقین ہے آپ صرف گفتار کے غازی تو ہرگز نہیں۔

اس لئے جلدی سے مجھے خط لکھئے اور اس خط کے مطالعے کے طور پر جو آپ نے ابھی نہیں لکھا ہے، ایک خوشخبری وصول فرمائیے کہ آپ کے بھانجوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ ہو گیا - ننھے میاں کے لئے کوئی ایسا نام بھیجئے کہ وہ بھی بڑا ہو کر آپ کی طرح عزت، شہرت اور نام حاصل کرے۔

ایک بات اور . . . آپ ساگر تو خوب ہی ملتے رہے - اب ہمارے ملنے کی ایک بڑی اچھی صورت نکل آئی ہے - بخشی صاحب کے ایک بہت ہی عزیز دوست نریندر کمار کے چھوٹے بھائی کی شادی ہو رہی ہے - یہ لوگ کلکتے میں رہتے ہیں - ہم سب کلکتے جا کر اس شادی میں شریک ہوں گے - آپ بھی بھابی اور بچوں کے ساتھ کلکتے آئیے نا - آئندہ خط میں تاریخ وغیرہ کی تفصیل لکھوں گی۔

بھابی اور بچوں کو بہت بہت پیار!

آپ کی بہن —— ظہیرہ بخشی

پونم ولا - دارجلنگ

یکم جولائی ۹۵ء   میری بہت پیاری بہن! بہت سی دعائیں

کل ہی تمہارا ایکسپریس خط ملا اور کل میرا موڈ بہت اچھا رہا - سارا دن جیسے چہکتا رہا - تمہارا شکریہ!

مدیر "اپنی صدی" کا بھی یہی حکم رہتا ہے کہ میں عمر کی چھیڑ چھاڑ نہ چھوڑوں - تم بھی یہی چاہتی ہو - میرے پڑھنے والے بھی اور خود میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ اس دلچسپ (لیکن عبرت ناک) کردار کے سر پر سوار رہوں لیکن بات یہ ہے ظہیرہ کہ اب کسی کام میں بھی سختی سے پابندی مجھ سے نہیں ہو پاتی - جہاں پابند ہوا ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ خدا نخواستہ میں اب بھی سرکاری ملازم ہوں اور جا رہا ہے گھر میں آگ لگی ہوئی ہو لیکن ۹ بجے دفتر کی طرف بھاگ رہا ہوں! مثلاً میں نے سوچا کہ صبح پانچ بجے جاگنے کی عادت ڈالوں - تین چار دن تک بہت پابندی سے پانچ بجے تک تو کیا چار ہی بجے سے جاگتا رہا لیکن ایک دن دل نے کہا . . "اسے بے وقوف انسان! کیا اب بھی تجھے صبح کی ٹرین سے پہلے کسی افسر کے لئے جاتے اور حاضری دینے کو جانا ہے" مجھے حیرت ہوئی اور اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا ہوا سو گیا اور پھر ایسا سویا، ایسا سویا کہ تمہاری بھابی نے دن کے دو بجے پریشان ہو کر ڈاکٹر کو فون کرنا اور مجھے جگایا - وہ کھانا کھا کر سیدھا یہاں آگیا تھا اور گھر والے خوش تھے کہ ڈاکٹر اس لئے بھوت بنگلے پر وہ سو گیا - کم بخت نے مجھے بڑی گہری نیند سے جگا دیا تھا جب

وہ جاگنے کے لئے کمبل سے لگتا میں اُسے چمپی کرتے تھک جاتا اور اس طرح میں نے اُس کی شام کی پریکٹس ضائع کرا دی اور اُسے اُس وقت جگایا جب مجھے سونے کے لئے پلنگ خالی کرانے کی ضرورت ہوئی! تب سے آج تک یہی دستور ہے، دن کے دو بجے ڈاکٹر مجھے جگا کر سو جاتا ہے اور رات کے دس بجے میں اُسے جگا کر خود سو جاتا ہوں! تم ہی کہو سونے سلانے کے اِس چکر میں عصمہ کے لئے کہاں سے وقت نکالوں۔ پریس کا منیجر بڑا شاندار آدمی بن گیا ہے۔ اُسے میں موہنجو داڑو کے آثارِ قدیمہ کے بُتوں میں سے چُن کر لایا ہوں۔ اِس لئے کم بخت ایک پیسے کی بھی بے ایمانی نہیں کرتا۔ خوشامد کر کر کے تھک گیا کہ بھیا کچھ تو بے ایمانی کرتا کہ میں پابندی کے ساتھ پریس کے دفتر میں بیٹھنے کی ضرورت محسوس کروں لیکن ایک دن میرے ڈبے سے سگریٹ کا نصف حصّہ بلیڈ سے کاٹ کر لے لینے کے سوا آج تک وہ کوئی بے ایمانی نہ کر سکا۔ سوچتا ہوں اُسے نکال دوں اور کوئی بے ایمان آدمی رکھوں تاکہ ڈاکٹر کی چمپی کرنے سے تو نجات ملے۔

قصّہ مختصر یہ کہ جیسی تم پیاری بہن ہو ویسے ہی پیاسے بھائی مدیر اپنی صدی کا خط ۶ جون کو ملا تھا لیکن اب تک میں سلسلہ جاری رکھنے کے لئے عصمہ کی چُٹیا نہ پکڑ سکا۔

اپنے ننھے بھانجے کے آنے کی اطلاع پا کر بے حد خوشی ہوئی لیکن تمہارے خط میں یہ پڑھ کر بڑا غم ہوا کہ تم اُس بے چارے کے لئے عزّت، شہرت اور نام کی تمنا کر رہی ہو۔ کیا تباہ کرو گی اُس کی زندگی۔ عزّت، شہرت اور نام پر تو نیم پلیٹ لگا کر اِس کے اندر رہا جا سکتا ہے، نہ عزّت، شہرت اور نام میں پٹرول ڈال کر ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے انہیں دوڑایا ہی جا سکتا ہے۔ یہ واہیات چیزیں کھانے پینے ہی کی ہیں۔ میں تو اُس کے لئے کل سے ایک ایسا نام تجویز کرتا رہا تھا جس کے اثر سے اُسے بلڈنگیں، کاریں، عیش و عشرت اور بدنامی مل سکے۔ اِس لئے دو تین سگریٹ جلانے کے بعد دماغ نے کام کیا اور میں چار نام سوچنے میں کامیاب ہو گیا۔ گھر کے لوگوں کی اکثریت جس نام کے لئے رائے دے وہی نام رکھو۔ نام یہ ہیں ــــــ عبدالقرض، امام المجبور، لیڈر الزماں اور عبدالزر۔ (میری رائے، مجھے لیڈر الزماں بہت پسند ہے کیونکہ اِس میں تمام خوبیاں موجود ہیں)

کلکتے آ سکتا ہوں اور اِس سلسلے میں مزے کی بات یہ ہے کہ جلد ہی میرے ایک دوست کے سالے کی شادی بھی وہیں ہونے والی ہے اور دوست کے سالے کی بہن نے مجھے خط میں یہاں سے وہاں تک صرف "ضرور" لکھنے کے بعد لکھا ہے "آیئے"!

بختی بھائی کو آداب۔ بچّوں کو پیار۔ تمہارا بھائی ــــــ فیروز

کلکتہ

۲ جولائی ۶۵ء فیروز بھائی! تسلیم

میرے پتروں کا جواب تو آپ بے شک دیتے رہے ہیں لیکن کسی خط سے بھی یہ نہیں پتہ چلتا ہے کہ آپ لوگ شادی میں آ رہے ہیں یا نہیں۔ مجھے آپ سے کوئی غرض نہیں۔ اگر دکھو نہ آئی اور بچّے نہ آئے تو میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ شادی رکوا دوں گی اور سارے کلکتے میں ڈھنڈورہ پیٹ دوں گی کہ ایک مسلمان کی وجہ سے شادی میں گڑبڑ ہو گئی اور پھر آپ جانتے ہیں؟ اتنی سی بات پر بھی ہندو مسلم فساد ہو سکتا ہے۔ فساد میں جتنے آدمی اور جتنے ہندو مسلمان مارے جائیں گے سب کا خون آپ کی گردن پر ہوگا! بس میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ آپ کی وندنا تجھے لکھوا رہی ہے۔

آپ کی بھوجی ــــــ نرملا

کلکتہ

۳ جولائی ۶۵ء مکرمی فیروز صاحب! تسلیم

پہلے تو میں نے سُنا تھا لیکن 'اپنی صدی' کے افسانہ نمبر میں دیکھا بھی کہ آپ نے میرے ایک دوست کا خط ہوبہو اپنے افسانے میں سمونے کی کرم فرمائی کی ہے۔ اسی طرح کتنوں کے خط آپ کے افسانوں کی بدولت 'اپنی صدی' میں چھپنے کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ ایک بدنصیب ہوں تو میں خدا جانے آپ کس جنم کی دشمنی کا بدلہ لے رہے ہیں کہ اب تک میں اکیس خط لکھ چکا ہوں لیکن کسی خط کا تذکرہ تک آپ کے کسی افسانے میں نہیں۔

میرے محبوب افسانہ نگار! کم سے کم اِس بہانے تو یہ عزّت بخشئے کہ میں فخر سے سینہ تان کر کہہ سکوں کہ میری تحریر کو بھی 'اپنی صدی' میں شائع ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے خط میں کوئی افسانہ لکھوں جب ہی آپ چھاپیں گے تو لیجئے میں ایک لڑکی کی سو فیصدی سچی کہانی لکھ رہا ہوں۔ یہ لڑکی کلکتے میں رہتی ہے اور ایک نرالے قسم کا دھندہ کرتی ہے یعنی شادی کا دھندہ۔ شادی کرتی ہے طلاق لیتی ہے اور کورٹ میں مقدمہ دائر کر کے اپنے خاوند سے رقم وصول کرتی ہے۔ یقیناً یہ لڑکی آپ کے لئے ایک نئی عصمہ کا کام کرے گی۔ اسی خط کے ساتھ اُس لڑکی کی داستان منسلک کر رہا ہوں۔ پڑھئے اور آپ کو بڑا ثواب ہوگا۔ میرا خط اور میرا نام چھپوا دیجئے۔

آپ کی ترقی کے لئے میں دعا کرتا رہوں گا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

آپ کا پُرانا پرستار ــــــ عبدالستار خنجر

پونم وِلا۔ دارجلنگ

۴ جولائی ۶۵ء خنجر صاحب! تسلیم

آپ کا کرم نامہ ملا۔ بے شک آپ مجھے ہمیشہ خط لکھتے ہیں لیکن خدا گواہ ہے میں نے ہر ایک کا جواب دیا ہے۔ رہی بات یہ کہ میں نے آپ کا کوئی خط اب تک اپنے افسانے میں نہیں شامل کیا۔ جب کہ ہر افسانے میں دو تین خط بچّے ضرور ہوتے ہیں بھائی خنجر صاحب!

افسانے میں دو ہی طرح کے خطوط شامل ہوتے ہیں یا اُن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ایک تو وہ جن میں مجھے گالیاں دی جاتی ہیں (لیکن جب سے افسانے کی ہیروئن کا نام عسمہ ہو گیا ہے یہی اور دھرم خطرے سے باہر ہو گئے ہیں اور اب گالیاں نہیں ملتیں) دوسرے وہ خط ہوتے ہیں جن کا تعلق میرے افسانے کی تخلیق میں مدد کرتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اب سے پہلے آپ کا کوئی بھی خط ان دو میں سے کسی معیار پر پورا نہیں اُترا ـــــــ اِس خط کے ساتھ آپ نے ایک افسانہ تو ضرور بھیجا ہے اور افسانہ ہے بھی دلچسپ میں ایک ضرورت سے کلکتے آرہا ہوں آپ سے ملوں گا۔ اگر آپ کا افسانہ افسانہ نہیں حقیقت نکلا تو آپ کی دیرینہ تمنا ضرور پوری کروں گا (ویسے 'بیسویں صدی' میں چھپنے کا ایک سہل اور تیر بہدف نسخہ یہ بھی ہے کہ آپ کوئی ادبی قسم کا اشتہار اُجرت دے کر چھپوالیں)

آپ کا پرانا پاپی ـــــــ فیروز

پونم وِلا۔ دارجلنگ

۹ر جولائی ۹۵ء بھوتی ڈیر انشے

آج ہی آپ کا خط ملا ہے اور میں اس لئے فوراً جواب دے رہا ہوں کہ آپ کہیں جواب نہ دینے کے جُرم میں بھی فساد نہ کروادیں۔ بھئی آپ عورتوں سے بہت ڈرنا چاہیے۔ آپ لوگوں نے آدم کو جنت سے نکالا، وشوامتر جی کی تپسیا بھنگ کی، راون پر شدید کی سے پھر انور دی کرائی اور پتہ نہیں کیا کیا اُلم غلم کام آپ لوگ کرتی رہتی ہیں (سب سے بڑا اُلم غلم کام ہے یہ کہ آپ لوگ مردوں کو بے وقوف بنایا کرتی ہیں حالانکہ ہم لوگ تو ماشاء اللہ سے بنائے ہوتے ہیں)

بھوجی! ہم لوگ بیمارانی کو چھوڑ کر سب کے سب آئے ہیں۔ جن کا امتحان ہے اور وہ ہے بھی میری پکی جانشین۔ اُسے کلکتے اور جمشید پور کے نام ہی سے وحشت ہوتی ہے۔ لیجئے اب تو آپ خوش ہو گئیں ـــــــ آپ کے خط کے ایک جملے نے طبیعت خوش کر دی۔ یعنی آپ بھی آدمی اور ہندو مسلمان میں فرق محسوس کرتی ہیں۔ بے شک آدمی، آدمی ہوتا ہے اور ہندو مسلم سکھ عیسائی تو ہندو مسلم سکھ عیسائی ہوتے ہیں۔

آج ایک مشاعرے میں شرکت کرنی ہے اِس لئے ابھی سے جی کڑا کرنے کی ریاضت کرنی ہے لہٰذا خط ختم کرتا ہوں۔ ذکیہ علیحدہ خط لکھیں گی۔ بچے سلام کہتے ہیں۔

آپ کا ـــــــ فیروز

ساگر

۱۲ر جولائی ۹۵ء میرے بھیا! آداب

آج میں خوشی سے پاگل ہوا ٹھی ہوں کہ کلکتے میں آپ سے ملاقات ہوگی، پیاری بھابی سے ملاقات ہوگی اور اپنے ننھے ننھے بھتیجوں سے۔ آپ اپنے دوست کے سالے کی شادی میں جائیں یا اپنے بہنوئی کے دوست کی شادی میں۔ آپ سے ملاقات بہرحال ہوگی یہی بہت بڑی بات ہے۔

کہئے، آج کل ڈاکٹری کیسی چل رہی ہے؟ میرا خیال ہے اب آپ اِس فن میں بھی ماہر ہو چکے ہوں گے!

ہاں! میں جس شادی میں جا رہی ہوں وہ ۳ر اگست کو ہے اور پتہ ہے ـــ ۲۱۔ جلابرجی اسٹریٹ۔ آپ کے دوست کے سالے کی شادی کب ہے اور پتہ کیا ہے اُن کا، ضرور لکھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کریں . . . ننھے کے لئے ناموں کا بہت بہت شکریہ۔ دو اور اچھے نام ہیں۔ ابن الوقت اور رشوت بیگ!

بھابی کو آداب، بچوں کو پیار۔ اُمید ہے آپ لوگ خیریت سے ہوں گے۔

آپ کی بہن ـــــــ ظہیرہ بخشی

پونم وِلا۔ دارجلنگ

۲۰ر جولائی ۹۵ء ظہیرہ! دعائیں

تمھارا خط پرسوں ہی مل گیا تھا لیکن بروقت جواب اِس لئے نہ دے سکا کہ آخر کار میں نے اُس نمک حرام ایمان دار منیجر کو نکال دیا۔ دوسرا منیجر ماشاء اللہ کافی بے ایمان ہے اِس لئے صبح سے شام تک میں پریس ہی میں رہتا ہوں۔ دوپہر کو ذکیہ سر پر کھانے کی ٹوکری اور ہاتھ میں لوٹا لئے مٹکاتی، پاؤں کے گھنگھرو بجاتی ہوئی آتی ہے اور دفتر کا پنکھا بند کر دیتی ہے اور ہاتھ کے پنکھے سے پنکھا جھل جھل کھانا کھلاتی ہے تو بس مزہ آجاتا ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ زور زور سے پیا یا ملہار گانا شروع کر دوں۔ اِس لئے آج کل میری صحت بہت اچھی ہو گئی ہے۔ اگر ہر پانچ سال کی طرح اِس بار بھی نئے منیجر کو پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے الیکشن ہارنے کا شوق نہ ہوا تو اب اِسی بے ایمان کو رکھ لوں گا کیونکہ اِس نے آتے ہی دو ہزار سات سو روپے کا حساب گول مال کر دیا ہے اور مجھے حساب چیک کرنا پڑ رہا ہے۔ اِس طرح اکاؤنٹس کے کام میں بھی ماہر ہو جاؤں گا۔

بے شک میں چھپی کرنے میں ماہر ہو گیا ہوں اور کبھی کبھی بڑی سنجیدگی سے سوچتا ہوں کہ پریس بیچ کر چھپی کا دھندہ کروں۔ کیونکہ پریس میں اُسی وقت فائدہ ہے جب کوئی "بے ہنگم" یا "سوئنگ کم" یا "سرگرم" قسم کا اخبار بھی نکالا جا سکے، اُس کا ایڈیٹر بنا جائے (ویسے پہلے بیک کسی اور کا ہو) پھر اُلم غلم خبریں اور گھاس پھوس اداریے چھاپا جائے۔ پھر جیل جایا جائے اور بس ایک ہی چھلانگ میں فرسٹ کلاس فرقہ پرست لیڈر بن جایا جائے۔ یہ سب کچھ لئے بغیر پریس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اِس لئے عنقریب یا تو پریس بیچ دوں گا یا پھر

[illegible] پیدا ہو [illegible]
[illegible] کر اُن کے بیاہ میں چلی جائے گی
[illegible] اور وہاں کے رہوں گا [illegible] ہیں پھر واپس اگر ایکشن
[illegible]

[illegible] ایک دن شکایت کی کہ آج کل تم بہت بگڑ گئے ہو۔ میں
[illegible] ایمان دار محقق ہے۔ اُس کی تحقیق غلط نہیں۔ اِس لئے
[illegible]

[illegible] ہیں ہم ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کریں لیکن اِس
[illegible] ایک طرف سے تم میرے دوست کے سالے کے ہاں آؤ اور
[illegible] میں تمہارے ہاں ہو کے دوست کے ہاں جاؤں اور اسی آنے جانے
[illegible] بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ہم ۴ اگست کو چڑیا خانے
[illegible] کا انتظار کریں (وہاں بخشی بھائی کے لئے کچھ خطرہ تو نہیں؟ ویسے بھی تو کوئی
[illegible] کا خاص انتظام رہتا ہے)
[illegible] عرض ہے کہ نریندر کمار جی میرے دوست کا سالا
[illegible] بھی وہیں جا رہے ہیں یعنی ۲۱۔ بملا بنرجی اسٹریٹ!
[illegible] بچوں کے لئے نام تجویز کرنے میں تم بھی ماہر ہو۔ ابن الوقت اور
[illegible] پیارے نام ہیں۔ بہت خوب!
[illegible] تم سب بخیر ہو گے۔ بخشی بھائی کو آداب، بچوں کو پیار۔

خیر طلب ——— فیروز

[illegible]

[illegible] خوش رہو
[illegible] پرسوں تک تو شادی کے ہنگامے رہیں
[illegible] رہے تمہاری چاچی اور ساگر والی پھوپھی بضد ہیں
[illegible] پیسے اکٹھے ہونے سے بچ
[illegible] جائیں گے اور جو پیسے ضائع ہو جاتیں
[illegible] زمانہ ایسا ہے کہ ایک ایک پیسے کو دانت سے پکڑا
[illegible]

[illegible] کریں کیونکہ تم حساب
[illegible]
[illegible]

[illegible] سے اپنے [illegible] دکھائے [illegible]
[illegible] چاہیے وہی اُسے دے دو۔
امتحان کا زمانہ ہے زیادہ نہ پڑھو ورنہ دماغ فرش نہیں رہے گا۔
خدا کرے تم بخیر ہو۔ ہاں صحت کا خاص خیال رکھنا۔ والسلام

خیر طلب ——— [illegible]

(ایک پُرزہ)

نریندر بابو! میں بہت دیر سے آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہا ہوں [illegible]
اِس لئے یہ پُرزہ بھیج رہا ہوں۔ آپ کے ہاں دارجلنگ سے کوئی مہمان فیروز صاحب آئے ہوئے [illegible]
انھیں ذرا باہر بھیج دیجئے میں اُن کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔ انھیں ایک بہت ضروری [illegible]
دینی ہے۔ عبدالحمید خنجر ۱-۸-[illegible]

ایک تار۔ دارجلنگ سے : ۲ اگست ۶۵ء : ۹ بجے صبح
جناب فیروز معرفت نریندر کمار، ۲۱۔ بملا بنرجی اسٹریٹ۔ کلکتہ
"اپنی صدی کا تار آیا ہے۔ افسانہ جلد [illegible]"

[illegible]

۲۱۔ بنرجی اسٹریٹ، کلکتہ
۲ اگست ۶۵ء برادرِ گرامی قدر! تسلیم
ابھی ابھی آپ کا تار تو نہیں لیکن آپ کے تار سے متعلق میری بچی [illegible]
کہانی بس تیار ہی سمجھئے۔ آج رات کو ضرور لکھ لوں گا اور کل پوسٹ کر دوں گا۔
آپ کو یاد ہو گا میں نے ایک صاحب عبدالحمید خنجر کے بارے میں آپ کو ایک
دلچسپ خط لکھا تھا کہ اُن کی دلی تمنا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اُن کا خط بھی میرے [illegible]
میں شائع ہو۔ اِس شوق میں خنجر صاحب نے ایک بہت ہی حیرت انگیز [illegible]
لکھا تھا کہ انھوں نے ایک ایسی عورت کا پتہ لگایا ہے جو شادی کا [illegible]
تو دنیا کی شادی شدہ عورتوں کا یہی ایک محبوب ترین دھندہ ہے۔ لیکن اُس عورت کے
بارے میں خنجر صاحب نے لکھا تھا کہ وہ نقلی ماں باپ بنا کر [illegible] شادی [illegible]
اور پھر لڑکے [illegible]
میں نے خنجر صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible]

میں اُن کے شاعر ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قیاس آرائی کرنے کو تھا کہ صاحبِ خانہ یعنی میرے دوست نے خنجر صاحب کا ایک پُرزہ دیا جس میں لکھا تھا کہ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ باہر گیا تو خنجر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بال وال کچھ ایسے تھے کہ میں بہت خوفزدہ ہوگیا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ وہ کوئی سہرا تو نہیں لکھ لائے ہیں لیکن یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ لمبے بے ترتیب بال، مُنہ میں ایک آدھ سو گرام پان اور سو فیصدی شاعروں کا حلیہ رکھنے کے باوجود وہ شاعر نہیں تھے اور تب میں اُن سے بے تکلف ہوگیا اور انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اپنے خط میں جس شادی کے دھندے کا قصہ لکھا تھا وہ اُسی سلسلے میں آئے تھے اور جب وہ اُس عورت کا جو شادی کا دھندہ کرتی تھی اتا پتہ بتانے لگے تو میں بہت حیرت سے اُن کا مُنہ تکنے لگا اور جب وہ سب کچھ بتا چکے تو میں نے انھیں نہایت ہی رازدارانہ انداز میں کہا کہ وہ جلدی سے گھر چلے جائیں اور بچوں بیوی کو سمیٹ کر گھر کے اندر بند ہو جائیں۔ کیونکہ بہت جلد کلکتے میں ہندو مسلم فساد ہو جانے کا خدشہ تھا۔ اب وہ میرا مُنہ تکنے لگے۔ جب وہ اِتنی دیر تک میرا مُنہ تک چکے جتنی دیر تک میں نے اُن کا مُنہ تکا تھا تو میں نے انھیں بتایا کہ میرے دوست کی بیوی نے جس کے بھائی کی شادی میں گیا تھا، مجھے لکھا تھا کہ اگر میری بیوی شادی میں شریک نہ ہوئی تو وہ شادی کا پروگرام ہی ختم کر دے گی اور ڈھنڈورہ پیٹ دے گی کہ ایک مسلمان نے شادی بھنگ کرادی اور اس طرح ہندو مسلم فساد کرادے گی۔ بہرحال میری بیوی کی شرکت تو ہوگئی تھی لیکن اب ایک دوسری وجہ سے شادی کا پروگرام ختم کرنا ضروری ہوگیا ——— بھائی جان! آپ بھی میرا مُنہ تکئے کہ خنجر صاحب نے جس عورت کا پتہ وغیرہ دیا، اُسی عورت سے میرے دوست کے سالے میاں دھرمیندر سلمہٗ شادی کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ یہ شادی لَو میرج تھی۔ یعنی دھرمیندر سلمہٗ اور وہ عورت (جسے لڑکی ہی کہنا پڑے گا) پہلے لَو کرتے رہے تھے، اب کل اُن کی میرج ہونے کو تھی لیکن میں نے اپنی بھابی اور گھر کے دوسرے بزرگوں کو ساری باتیں بتاکر شادی کی تاریخ بڑھوا دی ہے اور تفتیش ہو رہی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ افسانہ بس تیار ہی سمجھئے۔ وہ لڑکی، شادی کا دھندہ کرنے والی وہی عورت ہو یا نہ ہو اور اونٹ کسی کل بھی بیٹھے افسانہ مکمل!... دیکھئے اونٹ کی کس کل کا افسانہ ہوتا ہے!

بھابی کی خدمت میں آداب، بچوں کو دعاء۔
اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا اپنا ——— فیروز

(ایک پُرزہ)

مینا! تم نے دانش مندی کی جو نہیں آئیں۔ تمھارا پیغام ملا۔ گھبراؤ نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ فی الحال تم جلدی سے ایک خط دھرمیندر کو لکھو۔ خط کا مضمون نیچے درج ہے۔ اور اگر وہ تمھارے ساتھ فرار ہونے پر رضامند ہو جائے تو فرار ہو جاؤ اور کلکتے سے باہر نکلتے ہی کسی کورٹ میں جاکر شادی کر لو۔ گھبراؤ بالکل نہیں۔ تمھاری یہ شادی بھی ضرور کامیاب اور سود مند ہوگی۔ دھرمیندر ایک بڑے آدمی کا بھائی ہے اُسے آسانی سے چھوڑ دینا حماقت ہے۔ میرا خیال ہے دھرمیندر کے بھائی کو تمھاری اصلیت معلوم ہوگئی ہے اسی لئے شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔

———ع

دھرمیندر کو مندرجہ ذیل مضمون کا خط لکھو:-

میرے دھرمیندر! میری جان، میری دُنیا، میرے
سب کچھ! بھگوان کرے جنم جنم تک ہمارا ساتھ رہے میرے پیارے!
زمانہ دردِ محبت کی داد کیا دے گا

چلو یہاں سے کہیں دُور جائیں ہم دونوں!
اگر یہ سچ ہے کہ تم کو بھی پاسِ اُلفت ہے
تو کیوں نہ زیست کو رنگیں بنائیں ہم دونوں

میرے دیوتا! میں نے کہا تھا نا کہ تمھارے بھائی صاحب
جب ہماری محبت کو ناپسند کرتے ہیں تو ہماری شادی کو وہ کیسے
گوارا کریں گے۔ تم نے دیکھا نا، ابھی تو شادی کی شبھ گھڑی ٹال دی گئی
ہے ایک دن شادی ہی ٹال دی جائے گی۔ لیکن ہمارا جُرم کیا ہے؟
کچھ پتہ نہیں۔ کہنے کو تو تمھارے بھائی صاحب نے یہ کہا ہے کہ کسی بہت
بڑے رِشی نے تاریخِ مقررہ خطرناک بتائی ہے لیکن میرا دل کہتا ہے
شادی کی تاریخ کا آگے بڑھ جانا ہی خطرناک ہے۔

آہ! ———

کتنا نازک ہے دل یہ نہ جانا
ہائے ہائے یہ ظالم زمانہ!

میرے پیارے! میرے جیون ساتھی! یہ دُنیا والے ہمیں
جِینے بھی نہیں دیتے اور مرنے بھی نہ دیں گے ——— دو دلوں کو یہ
دُنیا ملنے ہی نہیں دیتی۔ آشاؤں کی کلیوں کو کھِلنے ہی نہیں دیتی...
لیکن میں ایسا ہونے نہ دوں گی۔ ہم ایسا ظلم ہونے نہ دیں گے!
ہماری آشاؤں کی کلیاں کھِلیں گی اور پیار کے اِس کومل پودے میں

ننھے ننھے پھول بھی لگیں گے۔ آؤ دھرمیندر آؤ۔۔۔ آؤ میرے ساتھی مجھے گلے لگالو۔۔۔ آؤ میرے ہم سفر! ہم اپنا نیا سفر شروع کردیں۔ آؤ میری جان۔۔۔ محبت کی طویل راہ ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ آؤ پیارے آؤ ———

زمانہ دردِ محبت کی داد کیا دے گا
چلو یہاں سے کہیں دور جائیں ہم دونوں

آؤ دھرمیندر پیارے! ہم بھاگ چلیں۔ تم جو چاہو تو بھی ضد کروا دی ملازمت معرفت مطلع کردو۔ میری زندگی تمھیں پیاری ہے تو آؤ مجھے اپنالو اور اگر میری موت چاہتے ہو تو۔۔۔ نہیں، تم اتنے ظالم نہیں ہو سکتے!

تمھاری اپنی ——— مینا

(ایک پرزہ)

مینا میری آتما! میں آرہا ہوں۔ آج رات کے بارہ بجے اسٹیشن پہنچ جاؤ۔ تفصیل آتے ہی۔ آج رات کو کہیں بھی جانے والی ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ہوں گی۔

تمھارا ہی

دھرمیندر ۵۔۸۔۶۵ء

۲۔ بلا بنرجی اسٹریٹ۔ کلکتہ

۴ اگست ۶۵ء

پیاری ذکیہ! خوش رہو

تمھارا خط ملا۔ دھرمیندر کی خیریت ہی تو لکھنی ہے جو میں اس وقت جوابی کا ثبوت دے رہی ہوں۔ ورنہ بچوں اور سب سے بڑے بچے تمھارے بھیا جی کے ہنگاموں میں مرنے کی تو فرصت نہیں ملتی، وقت پر خط کیسے لکھ سکتی ہوں۔

دھرمیندر کی خیریت لکھنے کے لئے جی چاہتا ہے ایک پُرزور قہقہہ ٹیپ کر کے تمھارے پاس بھیج دوں۔ کل رات حضرت واپس آگئے ہیں۔ فیروز بھیا کا خیال ٹھیک ہی نکلا مینا وہی شادی کا دھندہ کرنے والی عورت ثابت ہوئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب کے اُس نے شادی اور پھر طلاق اور پھر مقدمہ کی طویل راہ طے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بابو دھرمیندر کمارجی کے بکس میں چھ ہزار سات سو روپے تھے۔ اپنی نازک اُنگلیوں سے دھرمیندر کے بالوں سے کھیل کر مینا نے انھیں سُلا دیا اور پھر طاقت ور ہاتھوں سے بڑا سا بکس لے کر پتہ نہیں کس اسٹیشن پر اُتر گئی۔

فیروز کو سلام، بچوں کو پیار

تمھاری ——— نرملا

غزل

اختر واصفی

گھٹائیں اُٹھی ہیں جھوم کر آب تو عام دورِ شراب کردے
نظر ملا کر ہر ایک ذرّے کو ساقیا! آفتاب کردے

دُعا یہ نکلی ہے میرے دل سے خدا اسے مستجاب کردے
مری خرابی پہ ہنسنے والو! کوئی تمھیں بھی خراب کردے

بغیر سوچے بغیر سمجھے کسی کو چاہا ہے تُونے اے دل!
مری دُعا ہے یہ تیرے حق میں، خدا تجھے کامیاب کردے

میں بھول کر آگیا ہوں مسجد میں سے چلے مجھ کو میکدے تک
کوئی ہے ایسا خدا کا بندہ جو اِتنا کارِ ثواب کردے؟

نہ زُہد و تقوے پہ اپنے اِتنا غرور کر زاہدا، عجب کیا تو
گناہ گاروں پہ روزِ محشر وہ رحمتِ بے حساب کردے

چھپی ہے مکر و ریا کے پردوں میں سب تری طاعت و ریاضت
مجھے یہ ڈر ہے نہ رند کوئی تجھے کہیں بے نقاب کردے

گھروں سے باہر پھرو نہ یوں بن سنور کے حوّا کی بیٹیو تم!
کہیں نہ برہم نظامِ عالم تمہارا حُسن و شباب کردے

نظر اُٹھاتا ہوں جس طرف بھی ہے ایک سے اِک حسین چہرہ
کسے میں چاہوں کسے نہ چاہوں کوئی مجھے انتخاب کردے

بُتوں کا عہدِ شباب توبہ ہے اہلِ دل کے لئے قیامت
کسی کی نیندیں حرام کردے، کسی کا جینا عذاب کردے

سکوں یہ کیسا ہے یاالٰہی نہ موت ہے اور نہ زندگی ہے
کوئی تڑپ دے جو ہر رگ و پے کو وقفِ صد اضطراب کردے

اُمم کے حق میں ہے میرے نزدیک زہرِ قاتل وہ بادشاہی
جو صاحبِ خنجر و سناں کو غلامِ چنگ و رباب کردے

دُرست ہی یہ سہی کہ ثانی نہیں ہے کوئی تمہارا لیکن
کہوں جو میں آئنے سے پیدا ابھی تمہارا جواب کردے

مرے گُناہوں کی ہے وہ کثرت کہ یہ فرشتے تو کیا ہیں اختر
خدا کو بھی مان جاؤں گا میں اگر وہ اِن کا حساب کردے

پونڈز کولڈ کریم کی کرامات شیلا پر ظاہر ہو کر رہی

۷ ہی دن میں
جِلد زیادہ صاف، مُلائم اور دلکش نظر آنے لگی

ایسا لگتا تھا کہ میری قسمت میں کنواری رہنا ہی لکھا ہے۔ شادی بیاہ کی بات میرے لئے خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھی۔

آخر مجھ میں خرابی کیا تھی؟ کالی کالی چمکدار آنکھیں، موتیوں جیسے دانت... مگر جلد؟ نہایت بے رونق، غیر دلکش۔ میں نے سوچا کہ جلد ہی کچھ کرنا چاہئے!

میں نے پونڈز کا ۷ دن والا حسن پلان شروع کر دیا۔ ہر رات، دوبار پونڈز کولڈ کریم لگائی۔ پہلی بار میں میک اپ بالکل صاف ہو جاتا۔







دوسری بار میں مسامات کا وہ میل کچیل بھی چھٹ جاتا جس پر صابن اثر نہیں کرتا۔ پونڈز کولڈ کریم سے میری جلد دن بدن نرم و نازک ہونے لگی

کمال کی بات کہ صرف ۷ دن میں میری جلد نہایت حسین نظر آنے لگی۔ اور اب تو میری منگنی بھی ہو چکی ہے!

آئندہ بھول کر بھی میں رنگ روپ کی طرف سے بے پروائی نہیں برتوں گی۔ پونڈز کی بدولت میرا حسن نکھر آیا اور میری دلکشی سدابہار ہوگی۔







ہمارا مفت ملنے والا کتابچہ '7 DAYS TO BEAUTY' صرف ڈاک خرچ کے لئے ۱۵ پیسے کا ٹکٹ بھیج کر
اِس پتے سے منگوائیے: چیزبرو پونڈز انکارپوریٹڈ، ڈیپارٹمنٹ ۲۱، ۱۳ گن بو اسٹریٹ، بمبئی ۱

رقصِ شرر!

سحر اُمید بنگلوری

نمبر ۱۲۵۔ بابا لین، میسور روڈ، بنگلور نمبر ۲

۴ جولائی ۶۶ء — برادرِ محترم خوشتر صاحب، السلام مسنون

افسانہ نمبر باصرہ نواز ہوا۔ تعریف و تحسین کے لئے نئے الفاظ کہاں سے لاؤں!؟ ـــ افسانہ نمبر میں ڈھونڈھ کر سب سے پہلے محترمی عندلیب شادانی کی غزل پڑھی تھی۔ بہت دنوں سے آنسہ صاحب کا مجموعۂ کلام تلاش کر رہا ہوں لیکن اب تک نظر نہ آیا۔ آپ کے علم میں اگر ہو تو مہربانی فرمائیے۔ ملنے کا پتہ بھی۔ ممنون ہوں گا ـــ "رقصِ شرر" حاضرِ خدمت ہے بطوالت کے باوجود یقین ہے قارئین کے ذوق پر پورا اترے گا۔ اس طرح ان صاحبان کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی جو مجھے بیسویں صدی میں لکھنے پر اکساتے رہتے ہیں خصوصاً برادرم پرشکر ناتھ کی شکایت دور ہو جائے گی اور یہ میرے لئے باعثِ مسرت بات ہوگی ـ ـ ـ افسانہ نمبر میں شرکت کے لئے بہت کوشش کی تھی میں نے! لیکن مجبوریوں نے دل کا ساتھ نہ دیا ـــ "رقصِ شرر" کے لئے آپ کی زریں رائے اور قارئین کرام کے خیالات کا منتظر رہوں گا۔ ۔ ۔

آپ کا اپنا ـــ سحر اُمید بنگلوری

نازک نازک قدموں کے ساتھ وہ چرچ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

لیکن کوئی اندرونی قوت تھی جو اُسے مُڑ کر دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک ـــ موہوم انجانی سی کشش اُسے مجبور کر چکی تھی۔ ورنہ وہ دوسری تمام راہباؤں سے پیچھے یوں رہ جاتی۔ اپنے اِس احساس کو دبا کر اُس نے دُزدیدہ و خشمگیں نگاہوں سے اُس نوجوان کو پھر دیکھا جو سیڑھیوں کے نیچے چند گز کے فاصلے پر یوکلپٹس کے چھوٹے سے پیڑ تلے کھڑا اب بھی اُسے گھور رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی آنکھوں سے شرارے نکل کر جولیا کی خشمگیں نگاہوں کو جھلس رہے ہوں۔ جولیا کے بدن میں ایک جھرجھری سی ہوئی۔ جب آتشیں نگاہوں کے ساتھ نوجوان نے اپنے لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول بکھیر دئے۔ وہ نوجوان کی نگاہوں کا صحیح جائزہ تک نہ لے سکی۔ وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں برسوں پہلے دفن کئے ہوئے طوفان کو اُبھرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ ایک لمحے میں کیا سے کیا ہو گیا تھا؟ ایک لمحہ صرف ـــ!! اُس کی برسوں کی ریاضت بس ایک لمحے میں کسی تیز آنچ سے جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

وہ گھبرا گئی اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی چرچ کے بڑے ہال میں چلی گئی۔ مقدس باپ نے ابھی ابھی بائبل کھولی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی نشست پر گھٹنے ٹیک کر عبادت کے لئے تیار ہو گئی۔ پھر اُس نے سر جھکا کر ڈیسک پر رکھی ہوئی اپنی بائبل کھولی اور ۔ ۔ ۔ اور اُس کی نگاہیں الفاظ پر مرکوز تھیں لیکن ہر حرف کی گولائی میں اُس کے حدود و قطر میں وہ نوجوان نظر آ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے لب اور آگ برساتی نگاہیں۔ یہ آگ ـــ! کس قدر سرد تھی! کتنی ٹھنڈی تھی۔ یہ آگ جو محض ایک شرارے سے پھیلی تھی۔ ایک چنگاری جو بھڑک بھڑک کر اُس کے وجود کو، اُس کی ہستی کو جلا رہی تھی۔ چاروں جانب آتشیں لہریں اُسے اپنی سُرخ سُرخ زبانوں سے چاٹنے لگی تھیں۔ پیانو کی مدھر آواز بڑے ہال میں پھیل رہی تھی اور نہ جانے مقدس باپ کیا دعا کر رہے تھے۔ جولیا تو سر جھکائے دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے لگائے بیٹھی تھی۔ آنکھیں بند کرنے کی ہمت وہ خود میں نہیں محسوس کر رہی تھی کہ آنکھیں بند کرتے ہی سیڑھیوں سے چند گز کے فاصلے پر بڑھتا ہوا یوکلپٹس کا وہ چھوٹا سا پیڑ نظر آ جاتا۔ پھر اُس کی شاخوں سے، پتوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے تھے اور اُن شعلوں کے درمیان وہ نوجوان ـــ مسکراتا ہوا نوجوان !!


پونڈز کولڈ کریم کی کرامات شیلا پر ظاہر ہو کر رہی
۷ ہی دن میں
جلد زیادہ صاف، مُلائم اور دلکش نظر آنے لگی
ہمارا مفت ملنے والا کتابچہ '7 DAYS TO BEAUTY'
اِس پتے سے منگوایئے: چیسبرو پونڈز انکارپوریٹڈ، ڈیپارٹمنٹ ۲۱، ۱۳ اگن بو اسٹریٹ، بمبئی

رقصِ شرر!

سحر امتیاز بنگلوری

نمبر ۲۵! بابالین، میسور روڈ، بنگلور نمبر ۲

۳؍جولائی ۶۶ء   برادرِ محترم خوشتر صاحب! سلام مسنون

افسانہ نمبر باصرہ نواز ہوا۔ تعریف و تحسین کے لئے نئے الفاظ کہاں سے لاؤں!؟ ۔۔۔ افسانہ نمبر میں ڈھونڈھ کر سب سے پہلے محترمی عزیز نسیب شادانی کی غزل پڑھی تھی۔ بہت دنوں سے ڈاکٹر صاحب کا نمبر کلام تلاش کر رہا ہوں، لیکن اب تک نظر نہ آیا۔ آپ کے علم میں اگر ہو تو ضرور مطلع فرمایئے۔ ملنے کا پتہ بھی۔ ممنون ہوں گا ۔۔۔ "رقصِ شرر" حاضرِ خدمت ہے۔ طوالت کے باوجود یقین ہے قارئین کے ذوق پر پورا اترے گا۔ اس طرح ان صاحبان کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی جو بیسویں صدی میں لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ خصوصاً برادرم مشتاق رزناتھ کی شکایت دور ہو جائے گی اور یہ میرے لئے باعثِ مسرت بات ہوگی ۔۔۔ افسانہ نمبر میں شرکت کے لئے بہت کوشش کی تھی میں نے! لیکن مجبوریوں نے دل کا ساتھ نہ دیا۔ ۔۔۔ "رقصِ شرر" کے لئے آپ کی زریں رائے اور قارئین کرام کے خیالات کا منتظر رہوں گا . . .

آپ کا اپنا ۔۔۔۔۔۔ سحر امتیاز بنگلوری

نازک نازک قدموں کے ساتھ وہ چرچ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

لیکن کوئی اندرونی قوت تھی جو اُسے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک موہوم انجانی سی کشش اُسے مجبور کر چکی تھی۔ ورنہ وہ دوسری تمام راہباؤں سے پیچھے کیوں رہ جاتی۔ اپنے اِس احساس کو دبا کر اُس نے دُزدیدہ و خشمگیں نگاہوں سے اُس نوجوان کو پھر دیکھا جو سیڑھیوں کے نیچے چند گز کے فاصلے پر یوکلپٹس کے چھوٹے سے پیڑ تلے کھڑا اب بھی اُسے گھور رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی آنکھوں سے شرارے نکل کر جولیا کی خشمگیں نگاہوں کو جھلس رہے ہوں۔ جولیا کے بدن میں ایک جھرجھری سی ہوئی۔ جب آتشیں نگاہوں کے ساتھ نوجوان نے اپنے لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول بکھیر دیئے۔ وہ نوجوان کی نگاہوں کا صحیح جائزہ تک نہ لے سکی۔ وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں برسوں پہلے دفن کئے ہوئے طوفان کو اُبھرتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ ایک لمحے میں کیا سے کیا ہو گیا تھا؟ ایک لمحہ صرف ۔۔۔!! اُس کی برسوں کی ریاضت جیسے ایک لمحے میں کسی تیز آنچ سے جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

وہ گھبرا گئی اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرتی ہوئی چرچ کے بڑے ہال میں چلی گئی۔ مقدس باپ نے ابھی ابھی بائبل کھولی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی نشست پر گھٹنے ٹیک کر عبادت کے لئے تیار ہو گئی۔ پھر اُس نے سر جھکا کر ڈیسک پر رکھی ہوئی اپنی بائبل کھولی اور . . . اور اُس کی نگاہیں الفاظ پر مرکوز تھیں لیکن ہر حرف کی گولائی میں اُس کے ہر دو نقطے میں وہ نوجوان نظر آ رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے لب اور آگ برساتی نگاہیں۔ یہ آگ ۔۔۔ کس قدر سرد تھی! کتنی ٹھنڈی تھی۔ یہ آگ جو محض ایک شرارے سے پھیلی تھی۔ ایک چنگاری جو بھڑک بھڑک کر اُس کے وجود کو، اُس کی ہستی کو جلا رہی تھی۔ چاروں جانب آتشیں لہریں اُسے اپنی سُرخ سُرخ زبانوں سے چاٹنے لگی تھیں۔ پیانو کی مدھر آواز بڑے ہال میں پھیل رہی تھی اور نہ جانے مقدس باپ کیا دعا کر رہے تھے۔ جولیا تو سر جھکائے دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے لگائے بیٹھی تھی۔ آنکھیں بند کرنے کی ہمت وہ خود میں نہیں محسوس کر رہی تھی کہ آنکھیں بند کرتے ہی سیڑھیوں سے چند گز کے فاصلے پر بڑھتا ہوا یوکلپٹس کا وہ چھوٹا سا پیڑ نظر آ جاتا۔ پھر اُس کی شاخوں سے، پتّوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگتے تھے اور اُن شعلوں کے درمیان وہ نوجوان ۔۔۔ مسکراتا ہوا نوجوان!!

عبادت ختم ہونے کے بعد وہ چرچ کے ہال سے باہر نکلنے کے لئے اپنے آپ کو دوسری راہباؤں کے درمیان چھپانے لگی۔ یہی ایک راستہ اُس کے ذہن میں آسکا تھا۔ جب وہ ہال سے باہر نکلی تو غیر اختیاری طور پر اُس کی نگاہیں پیڑ کے نیچے پھیل پھیل گئیں۔ اُس نے ٹھنڈی مطمئن سانس لی لیکن ـــــ نہ جانے وہ کیا درد تھا کہ وہ بے چینی سی محسوس کرنے لگی اور پھر اُس کی نگاہیں اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کرنے لگیں۔ دُور تقریباً سو گز دُور چرچ کے کمپاؤنڈ کے پاس وہ نوجوان سر جھکائے جدا جا رہا تھا۔ پھر پھاٹک سے گزر کر وہ اوجھل ہو گیا۔ مکمل اطمینان! مکمل سکون ـــــ!! جولیا نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر جیسے ہی آنکھیں کھلیں وہ چونک پڑی۔ جیسے پھر وہ طوفان میں گھر گئی ہو! اُس نے دیکھا۔ نوجوان اب بھی پھاٹک سے نکل رہا ہے۔ وہ رُک کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ چل رہا تھا۔ چل رہا تھا۔ پھاٹک سے باہر نکل رہا تھا۔ باہر جا رہا تھا لیکن ـــــ یہ چار قدم کا فاصلہ ـــــ! وہ باہر نکل نہیں پا رہا تھا۔ وہاں کی زمین گردش کر رہی تھی یا جولیا کی قسمت ـــــ!؟ آخر کیا ہو رہا ہے۔ وہ رُکتا نہیں ہے۔ چل رہا ہے لیکن چار قدم پُورے نہیں ہوتے۔ یہ چار قدم کا فاصلہ۔ وہ! ـــــ وہ آنکھیں پھاڑے اُس نوجوان کی پُشت پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ اُسے دیکھتی ہی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نوجوان اب کبھی اُس پھاٹک سے باہر نہ نکل سکے گا۔ قیامت تک وہ چلتا رہے لیکن یہ چار قدم کا فاصلہ طے نہ کر پائے گا۔ قیامت تک نہیں ـــــ!!

"جولی ـــــ آپ رُک کیوں گئیں ـــــ؟" ایک راہبہ نے اُسے آواز دی اور وہ چونک پڑی۔ نوجوان کا کہیں کوئی پتہ نہ تھا اُس نے پھر کتنی ہی بار کمپاؤنڈ کی زمین کو اور پھاٹک کو گھور گھور کر دیکھا لیکن نوجوان کا کوئی پتہ نہ تھا ـــــ! وہ اپنی ہم عمر راہبہ کے ساتھ تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر اُس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ گُناہ کے اِس احساس پر کبھی غور نہ کرے گی اور نہ اپنی سوچوں میں کوئی احساس بیدار ہونے دے گی جس سے اُس کی مقدس ماں مریم اور عیسیٰؑ کے بُت کے آگے کھائی ہوئی قسموں پر کوئی حرف آئے! جس احساس کو اُس نے دو برس کی سخت ریاضت کے بعد دل و دماغ سے نکال کر فنا کی پستیوں میں دھکیل کر اُس تاریک غار کا دہانہ بند کر لیا تھا۔ جہاں وہ دُنیا اور دُنیا پرستی کی ہَوس کے علاوہ کچھ بھی نہ پا سکی تھی ـــــ اور پھر تین برس پہلے کی زندگی نے اُسے دیا ہی کیا تھا۔ بے عزتی، دُکھ اور ذہنی اذیت کے سوا ـــــ! تین سال پہلے وہ بھی اپنی زندگی میں مستقبل کے حسین خواب دیکھا کرتی تھی۔ ایک حسین بنگلہ، خوبصورت باغیچہ، حسین فضا، حسین ماحول اور حُسن کا ایک شہزادہ ـــــ! اُس کا شوہر، ایک مرد۔ حسین اور خوبصورت ـــــ معصوم اور خوبصورت بچّے! دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ بس یہی اُس کا خواب تھا۔ لیکن اُنھیں دنوں ایک زبردست طوفان آگیا اور اُس طوفان کی زد میں آکر اُسے اپنے خوابوں کی دُنیا کو بھول کر اپنے دل کی ہر اُمنگ کو مٹا کر راہبہ بن جانا پڑا۔ اور کوئی راستہ بھی تو نہ تھا جس پر چل کر وہ سکون قلب حاصل کر پاتی ـــــ محض چار دن۔ اس کی زندگی کے وہ چار دن جو شاید دُنیا کے نظام کو بدل نہ سکے ہوں لیکن اُس کی انفرادی زندگی تو اتنی بدل گئی کہ وہ سترہ برس کی عمر میں راہبہ بن گئی ـــــ سترہ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے کہ وہ دُنیا اور دُنیا کی رنگینی، جوانی اور اس کے نشہ کو تج کر دل کی ان گنت اُمنگوں کو دبا کر ایک راہبہ بن جائے!!

وہ راہبہ بن ہی گئی ـــــ! اور اسی رہبانیت نے اُسے سکون دیا، عزت دی اور زندگی کو ایک خاص ڈگر پر ڈال دیا۔ ورنہ سارے محلّے میں لوگ اُسے کیسی بھوکی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ کچھ غنڈے تو آوازے بھی کسنے لگے تھے اور کوئی پُرسانِ حال بھی تو نہ رہا تھا۔ رشتہ دار بھی اُس کی بہن اور ماں کی حالت کو دیکھ کر دُور ہو گئے تھے۔ اور کرتے بھی کیا؟ اُس کی ایک ہی بہن تھی جینا ـــــ! جولیا اور جینا جُڑواں بہنیں تھیں۔ کتنا بڑا تضاد تھا دونوں بہنوں میں۔ ایک ہی قد، ایک ہی ناک نقشہ۔ ایک ہی صورت اور ایک ہی جسامت لیکن کاش! دونوں کے ذہن اور دل بھی ایک ہی طرح کے ہوتے! لیکن ایسا نہ تھا۔ جولیا جتنی شریف النفس اور باحیا تھی اُتنی ہی بے شرم اور رنگین مزاج جینا تھی۔ جولیا کسی مرد کی قربت کے احساس سے ناآشنا تھی اور جینا بالکل اُس کے برعکس تھی۔ اور جب جینا کے ڈیڈی کو احساس ہوا تو اُنھوں نے جینا کو خوب ڈانٹ پلائی تھی اور اُسی رات جینا گھر سے بھاگ کر نہ جانے کس کے ساتھ اور کہاں چلی گئی تھی۔ اُس نے ایک خط چھوڑا تھا جس میں اپنی آزادی اور محبت کی خاطر گھر اور والدین کو چھوڑ جانے کا حال درج تھا ـــــ خط پڑھ کر اُس کے ڈیڈی صرف "ارے" کہہ سکے تھے پھر اُن کے دل کی حرکت رُک گئی تھی۔ ڈیڈی کی موت پر جولیا بہت روئی تھی، بہت تڑپی تھی۔ جولیا کو اپنی ماں سے نفرت سی تھی کیونکہ جینا کی آزادی اُس کی ماں کی رنگین زندگی کی دین تھی۔ اُس کی ممّی بھی ڈیڈی کے ہوتے ہوتے اپنے مرد دوستوں کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارتی تھیں اور ڈیڈی کے پُوچھنے پر جھگڑنے لگتی تھیں۔ ڈیڈی تو شریف النفس انسان تھے۔ لڑائی کو اپنی بے عزتی تصوّر کرتے ہوئے چُپ ہو جاتے ـــــ۔ بات ختم ہو جاتی لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ جولیا کو یہ دیکھ کر حیرانی بھی نہ ہوئی تھی کہ ڈیڈی کی موت پر اُس کی ممّی نے دو آنسو بھی نہ بہائے تھے اور دوسرے ہی دن جب اُس کی ممّی بھی شہر چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئیں تو جولیا تنہا رہ گئی تھی۔ چند ہی دنوں میں محلّے والوں کے آوازے اور رشتہ داروں کے طعنے سُنتے سُنتے اُس کے کان پک گئے اور روح بُری طرح مجروح ہو گئی۔ وہ سکون کی خاطر ہر روز چرچ

جانے لگی تھی اور ایک دن چرچ میں مدر الزبتھ سے ملی تو اُن کی پُر شفقت باتیں اور انداز ہمدردانہ رویے نے اُسے اپنا دُکھڑا سُنانے پر مجبور کر دیا۔ مدر الزبتھ دوسرے شہر سے چند دن کے لئے یہاں آئی تھیں۔ واپسی پر جولیا کو ساتھ لے لیا اور جولیا راہبہ بن گئی۔ نن بن گئی ۔۔۔ سکون اور عزت کی خاطر ۔۔۔ اُس نے اپنی جوانی اور جوانی کی تمام اُمنگوں کو قربان کر دیا!

لیکن آج ۔۔۔! آج وہ ایک نوجوان کی آتشیں نظروں سے اپنی رہبانیت کو جل کر خاکستر ہوتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ روزانہ کتنے ہی مرد چرچ میں آیا کرتے تھے نوجوان مرد! لیکن آج تک کسی مرد نے اُسے ایسی آتشیں نگاہوں سے نہ دیکھا تھا ہر کسی نے اسے احترام اور اکرام سے بھرپور نظروں سے دیکھا تھا۔ آج کے اس نوجوان کے سوا جو آتشیں نظریں بھی رکھتا تھا اور چہرے پر مُسکراہٹوں کے پھول بھی!

سارا دن وہ مقدس بائبل پڑھتی رہی۔ کمرے کی صفائی کرتی رہی۔ اِدھر کی چیزیں اُدھر اور اُدھر کی چیزیں اِدھر رکھ کر اپنے آپ کو مصروف بنائے رہی۔ لیکن رات ۔۔۔! یہ رات اُس کی ساری محنت کو رائیگاں بنا گئی۔ مدت کے بعد وہ اس رات کو حسین محسوس کر رہی تھی۔ دس بجے جب وہ بستر پر لیٹنے کی تیاری کرنے لگی تو اُس نے اپنا جائزہ لیا اور یہ ایک راہبہ کے لئے گناہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھنے لگی۔ سر میں بندھا ہوا کپڑا اُتار کر اپنی لانبی لانبی سیاہ زُلفیں شانوں پر بکھیر کر وہ اپنے سراپا کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

کتنی حسین تھی وہ!! آئینے میں دیکھ کر وہ مُسکرانے لگی دفعتہ جیسے چرچ کا بڑا گھنٹہ چیخنے لگا۔ وہ کھٹی کھٹی آنکھوں سے چھت کو گھورنے لگی۔ اُس نے محسوس کیا یہ گھنٹہ چرچ کا گھنٹہ نہیں۔ اُس کے اپنے کمرے کی چھت میں جیسے ایک بڑا گھنٹہ لگا ہوا ہو اور کسی اَن دیکھے ہاتھ سے جھول رہا ہو ...... ٹن ٹن۔ ٹن ٹن ۔۔۔ جولیا نے دونوں ہاتھ چھت کی جانب بلند کر دیئے جیسے گھنٹے کو جھولنے سے روک دینا چاہتی ہو۔ لیکن گھنٹہ اُس کے ہاتھوں کی پہنچ سے دُور بلند ہوتا چلا گیا۔ پھر ایکایک لاکھوں گھنٹے ایک ساتھ جھولنے اور بجنے لگے ۔۔۔ ٹنا ٹن ۔۔۔ ٹنا ٹن ۔۔۔ ٹن ۔۔۔ ٹن ۔۔۔ نن نہیں ۔۔۔ نن نہیں! تم نن نہیں ہو ۔۔۔ نن نہیں ۔۔۔ ڈاٹن ۔۔۔ ڈاٹن ۔۔۔ ڈاٹن ۔۔۔ ٹن ٹن ۔۔۔ ٹن ٹن ۔۔۔!! گھنٹے جیسے جولیا سے کہہ رہے تھے!

"نہیں ۔۔۔!" جولیا نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو دبا لیا اور بڑے زور سے چیخ پڑی۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی اور بے تحاشہ بھاگتی ہوئی مدر الزبتھ کے کمرے میں گھس گئی۔ بغیر اجازت وہ اس طرح نہ جا سکتی تھی۔ مدر الزبتھ ایک ہفتے سے بیمار تھیں اور بستر پر پڑی رہتی تھیں۔ جولیا بھاگتی ہوئی جا کر اُن کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ مدر الزبتھ نے بائبل بند کر دی اور کنارے لگی ہوئی چھوٹی سی میز پر رکھ کر آنکھوں سے چشمہ اُتارتے ہوئے جولیا کو دیکھنے لگیں۔

"کیا بات ہے جولی ۔۔۔؟" اُنھوں نے جولیا کی پریشان زُلفوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

"ماں! ماں!! مجھے روشنی دو ماں! میں ... میں گُناہ کے راستے پر بھٹکنے لگی ہوں ماں! مجھے بچا لو ۔۔۔ مجھے بچا لو!" جولیا کی آواز میں نہ جانے کس طرح اِتنا درد پیدا ہو گیا تھا کہ مدر الزبتھ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"بات کیا ہوئی آخر ۔۔۔؟ مقدس باپ اور اُس کے بیٹے کی رحمتوں سے نااُمید نہ ہونا چاہئے۔" مدر الزبتھ اُٹھ کر بیٹھ گئیں ۔۔۔ جولیا اُن کے کھسک کر اُن کے بالکل قریب چلی گئی۔

"تم ابھی زیرِ تربیت ہو جولی۔ ابھی تمھیں راہبہ کا وہ درجہ نہیں حاصل ہوا ہے کہ تم خود کو مقدس باپ کے بیٹے سے منسوب کر سکو ۔۔۔" وہ شفقت کے ساتھ کہہ رہی تھیں "یہ تربیت تمھارے کردار کا امتحان ہے۔ تم ہر راہ پر ثابت قدم رہ سکو گی تو یسوع مسیح سے اپنی ہستی کو منسوب کر سکو گی ورنہ . . . لیکن ایسی کیا بات ہو گئی ہے کہ تم خود کو گُناہ گار کہہ رہی ہو ۔۔۔؟"

جولیا نے روتے روتے اُس نوجوان کا ذکر کیا۔

اور ماں! اب جبکہ میں اپنے آپ کو بھول کر آئینہ دیکھ رہی تھی تو یوں محسوس ہوا جیسے لاکھوں گھنٹے یکلخت میرے کمرے میں بجنے لگے ہوں۔ میں گھبرا گئی اور اسی حال میں یہاں چلی آئی ماں!"

"یہ قدرت کا اشارہ ہے جولی۔ یقیناً تم اُس نوجوان سے اپنی روح کو وابستہ کرنے لگی تھیں تو مسیح نے تمھیں گُناہ کے راستے سے ہٹانے کے لئے یہ گھنٹے بجائے ہیں۔ مقدس باپ تم پر اپنی رحمتیں نازل کریں جولی ۔۔۔! تم خوش نصیب ہو کہ تمھیں مسیح نے آواز دی ہے۔" مدر الزبتھ نے کہا۔

"لیکن ماں! میں کیا کروں۔ میرے ذہن میں ایک طوفان سا اُبلنے لگا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں۔ ایک انجانا احساس، موہوم اُمنگ سی کروٹیں لینے لگتی ہے ۔۔۔" جولی روتی ہی رہی۔

"ابھی سے تم اِتنی کمزور ہونے لگیں جولی تو تم راہبہ نہ بن سکو گی اور تمھاری یہ تعلیم اور ریاضت رائیگاں جائے گی۔ ایک بار زندگی نے تمھیں رُسوائی اور گُناہوں کے عمیق سمندر میں پھینک دیا تھا اور آج تم خود کو اُس گھناؤنے سمندر میں ڈوبنے پر تُلی ہوئی ہو؟ اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر ہی تمھیں مسیح حاصل ہو سکیں گے ورنہ

ہرگز نہیں۔ کسی نوجوان کو صرف ایک بار دیکھ لینے سے جذبات میں اتنی تبدیلی نہیں ہو سکتی بھولی۔ اُٹھو! شیطان تمہیں بہکانے کی پوری کوشش کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی مسیح بھی تمہیں آواز دے رہے ہیں۔ جاؤ! شیطان نے ہمیشہ مسیح سے شکست کھائی ہے اور اب بھی شکست ہی کھائے گا۔ بےفکر رہو اور مسیح کو ذہن میں رکھ کر سو جاؤ۔ جاؤ میری بچی! جاؤ مقدس باپ تم پر اپنی رحمتیں نازل کرے گا۔ جاؤ——!"

اور جولیا اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بکھری ہوئی زُلفوں کو لپیٹ کر ایک رومال سے باندھا اور پھر انجیل مقدس کھول کر لیٹ گئی۔ ہاتھ میں انجیل کھلی ہوئی تھی اور اُس کی زبان مسیح کے نام کا وِرد کر رہی تھی۔ اُس نے انجیل کو سینے پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے دبالیا اور آنکھیں بند کرکے زور زور سے کہنے لگی: "مقدس باپ کے عظیم بیٹے! مسیح! یسوع مسیح! مسیح!!" اور پھر آنکھوں کے اندر دُور بہت دُور بادل چھٹنے لگے۔ چھٹتے گئے۔

"مسیح! یسوع مسیح!!" اور بادلوں کے درمیان یوکلپٹس کا پیڑ نظر آیا—— اور پھر—— وہی نوجوان۔ "مسیح! مسیح!!" وہ چلّانے لگی اور آنکھیں کھول کر اُٹھ بیٹھی—— سامنے دیوار پر ایک تصویر آویزاں تھی جس میں ایک بڑا سا یوکلپٹس کا درخت تھا۔ یکایک درخت چھوٹا ہونے لگا اور پھر ایک چھوٹا پیڑ بن کر رہ گیا جس کے تنے سے دُھواں سا نکل رہا تھا اور دھوئیں کے بادلوں کے درمیان—— وہی نوجوان!

"مقدس باپ! اے مسیح!!" وہ تڑپ اُٹھی اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ چند لمحوں کے بعد وہ کچھ سوچ کر سُرعت سے اُٹھی اور میز کی دراز کھولنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے اُس کے ہاتھ میں مریم کا چھوٹا سا سنگِ مرمر کا بُت آگیا——"ماں! ماں! مجھے سہارا دو ماں!" وہ کہہ رہی تھی: "مجھے اِس احساسِ گناہ سے بچالو ماں! مجھے بچالو۔ مجھے!" وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ روتی رہی اور مریم کا بُت آنسوؤں سے تر ہوتا رہا۔

دو گھنٹے گزر گئے اور وہ یونہی روتی رہی۔ حلق سُوکھنے لگا اور آنکھیں سُوج گئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئی تھیں۔ اب وہ نڈھال ہوگئی تھی اور مریم کا چھوٹا بُت مُسکرا رہا۔ ہاتھ اُٹھائے دعا دیتا رہا——!! آخر ایک لمحہ کسی اجنبی سے آنکھیں ملا کر وہ پاگل کیوں ہوئی جا رہی ہے؟ جولیا نے سوچا۔ وہ ایک راہبہ ہے۔ مقدس خداوند اور اُس کے بیٹے سے وابستہ ہونے والی راہبہ! کل اگر وہ نوجوان پھر نظر آیا تو وہ اُسے روک کر پُوچھے گی کہ وہ اُسے کیوں گھور رہا ہے؟ یقیناً وہ احترام سے جواب دیگا۔ کیونکہ وہ دوسری راہباؤں ہی کے درمیان تو رہتی ہے۔ اِس خیال کے بعد اُسے یک گونہ سکون محسوس ہوا اور وہ نڈھال نڈھال سی بستر پر گرگئی۔ پھر اُس کی آنکھ کب لگی اُسے احساس نہ رہا۔

حسبِ معمول صبح وہ جاگی تو کلیسا کا گجر بج رہا تھا۔ ٹن ٹن کی آواز چاروں طرف سناٹے میں پھیل رہی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور اپنے آپ کو عبادت کے لئے تیار کرنے لگی۔ جب وہ کلیسا کی سیڑھیوں کے پاس پہنچی تو غیر ارادی طور پر آنکھیں نگاہیں یوکلپٹس کے پیڑ کے سائے میں اُس نوجوان کی جستجو کرنے لگیں لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ یوکلپٹس کا پیڑ تنہا کھڑا جھوم رہا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور مسیح کو یاد کرتے ہوئے مسرور ہو کر سیڑھیاں طے کرتے ہوئے دوسری راہباؤں کے ساتھ بڑے ہال میں داخل ہوگئی۔ آج کی عبادت بڑی پُرسکون رہی۔ دعا میں اُس نے مدر الزبتھ کے حق میں دعائیں کیں کہ بہت خوش اسلوبی سے اُنھوں نے اُسے بھٹکنے سے بچالیا تھا۔

عبادت کے بعد جیسے ہی وہ باہر آئی تو سارا سکون درہم برہم ہوگیا اور پھر وہ طوفان میں گھِر گئی۔ آفتاب کی سُنہری کرنیں یوکلپٹس کے پتوں سے کھیل رہی تھیں اور جھومتے ہوئے پیڑ کے تنے سے لگا ہوا وہی نوجوان اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہی آتشیں نظریں، وہی انگارے، وہی شرارے اور وہی لبوں پر مُسکراہٹوں کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ جولیا نے رُک کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایک ہی لمحے میں اُس کی نگاہیں تھک سی گئیں۔ نڈھال سی ہوگئیں اور اِدھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ ایک خیال اُس کے ذہن میں اُبھرا کہ اُس نوجوان سے پُوچھ لے کہ وہ اُسے کیوں دیکھ رہا ہے؟ لیکن دل کے اندر کوئی چیخ رہا تھا۔ ایک دھڑکتا ہوا لوتھڑا—— اُس کے احساسات پر چھا گیا۔ اس نے محسوس کیا وہ بات کرنے کی قوت کھو چکی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے بھاری قدموں کے ساتھ زینے سے اُترنے لگی۔ دوسری تمام راہباؤں نے اُس نوجوان کو نظرانداز کر دیا اور آگے بڑھ گئیں۔ لیکن جولیا—— وہ تھکے قدموں سے اُس کے قریب ہوتی گئی۔ دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ سارے جسم سے پسینہ پھُوٹ پڑا تھا۔ گوری سفید پیشانی پر موتیوں جیسے قطرے اُبھر اُبھر کر پھیل رہے تھے۔ ایک آگ سی اُس کے اندر بھڑک رہی تھی—— دفعتاً گھنٹے چیخ اُٹھے۔ پھر چیختے ہی چلے گئے۔ جولیا نے مُڑ کر گرجا گھر کے اوپر نگاہیں ڈالیں لیکن یہ گھنٹہ تو گرجا گھر کا نہ تھا۔ پھر یکایک آسمان کی وسیع چادر پر اتنے گھنٹے نظر آنے لگے کہ نیلاہٹ معدوم ہوگئی اور بے تحاشا بجنے والے لاکھوں گھنٹے اُس کے ذہن پر ہتھوڑے برسانے لگے اور وہ گھبرا گئی۔ پھر دونوں ہاتھوں سے کانوں کو دبائے وہ اپنے کوارٹر کی جانب دوڑنے لگی لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے نوجوان اُس کے پیچھے دوڑتا چلا آرہا ہو۔ وہ اور تیزی سے دوڑنے لگی جیسے وہ نوجوان کے لمبے لمبے ہاتھوں سے ڈر کر بھاگ رہی ہو، کہیں اُس کے پنجے میں نہ آجائے—— اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ بجلی کی سی سُرعت سے سٹکنی چڑھا کر دروازے سے پُشت لگا کر ہانپنے لگی۔ یکایک سامنے اپنے پلنگ پر وہی نوجوان نظر آیا۔ وہی مُسکراہٹ، انگارے، شرارے اور آگ——!!

"ماں! ماں!" وہ چیخ اُٹھی اور پھر وہیں گر پڑی۔ ایک پردہ سا اُس کی آنکھوں کے آگے پھیل رہا تھا۔ پھر اندھیرا چھانے لگا ——— اندھیرا بڑھتا گیا اور وہ اندھیرے میں ڈوب گئی!

اُسے ہوش آیا تو سورج ڈوب رہا تھا۔ چرچ کے میدان میں سورج کی سُرخ کرنیں پھیل رہی تھیں۔ وہ اُٹھی اور ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی ہوئی اندرونی کمرے میں جا کر واش بیسن پر جھک گئی۔ کسی نہ کسی طرح اُس نے مُنہ دھویا اور کچھ چُستی کا احساس پیدا کرتے ہوئے اپنا لباس درست کرنے لگی۔ سر میں درد کی ٹیسیں اُبھر رہی تھیں۔ نہ جانے اُسے کیا ہو رہا تھا۔ دل و دماغ پر اِس طرح کوئی خیال زندگی میں کبھی نہ چھایا تھا جو اُس کی سانسوں کو اتنی گراں بنا سکا ہو۔ اُسی وقت اُس نے خود کو سکون کی آغوش میں محسوس کیا فضا میں پیانو کی ہلکی ہلکی موسیقی پھیل پھیل کر بہہ رہی تھی۔ یہ موسیقی اُسی وقت پیانو سے نکلتی تھی، جب کسی کی شادی ہوا کرتی تھی۔

تو کیا آج چرچ میں کسی کی شادی ہو رہی ہے؟ اُس نے سوچا اور یکایک اُس کا ذہن پھر بہک گیا۔ وہ دُلہن کے سفید لباس میں کیسی معلوم ہو گی؟ کیوں نہ وہ آج ہونے والی اُس دُلہن کو دیکھے!؟ پھر وہ چونک پڑی۔ وہ خود دُلہن نہ بن سکے گی!! یہ احساس، یہ جہنمی احساس اُس کے ذہن میں کیسے آگیا؟ اِتنا عظیم گُناہ اُس کے خیالات میں کیسے آبسا؟ وہ گُناہ گار ہے! اُس نے یہ کیسی آرزو کر ڈالی؟ نہیں، نہیں! ایک خطرناک خوف کے احساس سے اُس کا جسم کانپ اُٹھا۔ اُس نے لباس تبدیل کیا اور مدر الزبتھ کے کمرے میں چلی گئی۔

"آج وہ نوجوان پھر وہیں کھڑا تھا ماں!" اُس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہیں ——— درخت کے نیچے؟" الزبتھ نے انجیل بند کرتے ہوئے اُسے ٹٹولتی نگاہوں سے دیکھا۔

"جی ہاں! وہیں۔ اور اُس کے بعد میں نے پھر گھنٹے بجنے کی آوازیں سُنیں اور کمرے میں آ کے بے ہوش ہو گئی تھی۔" جولیا نے تفصیل بیان کر دی۔

"خداوند کی رحمتیں تم پر نازل ہو رہی ہیں جولی!" مدر نے خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ تمہاری بچھڑی ہوئی بہن جینا سے کبھی متعلق رہا ہو۔ اِسی لئے تمھیں دیکھ کر دیکھتا ہی رہ جاتا ہے!"

"جینا ———؟ لیکن ماں! جینا تو نہ جانے کب کی بھاگی ہوئی ہے اب تک اُس کا کوئی پتہ ہی نہیں چلا ہے!" جولیا بولی۔

"ہاں! یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہاں سے بھاگ کر وہ اِسی شہر میں آ گئی ہو!" مدر الزبتھ نے کہا۔

"لیکن ماں! میں ——— میں یہ محسوس کرتی رہی ہوں کہ وہ مجھی کو دیکھتا ہے۔ کوئی بات ہے جو اُس کی آنکھوں سے صاف ظاہر نہیں ہو پاتی ———" جولیا نے کہا۔

"تم اُس کے خیال کو ذہن سے نکال دو جولیا اور آرام کرو تمھارا چہرہ بہت اُترا ہوا ہے ———" جولیا اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

دس بجے وہ سونے لگی تو کسی کی خلافِ معمول دستک سے وہ چونک پڑی۔ پھر آہستگی سے چل کر اُس نے دروازہ کھول دیا۔ شاید مدر الزبتھ ہو ——— لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔

"کون ہے ———؟" اُس کی آواز خموش راہداری میں گونج کر پھیل گئی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ راہداری کا بلب روشن تھا لیکن ستونوں کے اُن گوشوں میں روشنی نہیں تھی اور وہاں ایک ستون کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ مُسکراتا ہوا چہرہ اور سُرخ سُرخ انگاروں جیسی آنکھیں!!

"کون ہے؟" جولیا نے پُرہمت سے آواز دی ——— اور دوسرے ہی لمحے سارا جسم پسینے پسینے ہو گیا۔ ہر ستون کے پاس ایک ایک شخص کھڑا تھا ——— درجنوں سُرخ انگاروں جیسی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔ درجنوں ہونٹ مُسکرا رہے تھے۔ جولیا نے محسوس کیا اُس کی جسمانی قوت سلب ہو گئی ہے۔ قوتِ گویائی بند ہو گئی ہے اُس نے زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر لیا اور پُشت ٹیک کر ہانپنے لگی۔ اور سر جھکا کر سوچنے لگی۔ کیا واقعی ستونوں کے پاس وہ کھڑا ہے؟ لیکن وہ تو ایک ہے! صرف ایک!! پھر اِتنے سارے؟ کیا وہ باہر نکل کر مدر الزبتھ کے پاس چلی جائے؟ لیکن وہ تو راہداری میں کھڑا ہے۔ کیا وہ اُسے پکڑ لینے کی ہمت کر سکے گا؟ کیوں نہ وہ مدر کے پاس چلی جائے۔ ہاں! یہی بہتر ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ اُس کا وہم ہو! نہیں وہ کہیں نہ جائے گی۔ اُس نے بڑی ہمت سے سر اُٹھایا اور پھر چیخ اُٹھی "ماں ———"

سامنے پلنگ پر وہ نوجوان بیٹھا تھا۔ وہ پلٹی اور دروازہ کھول کر باہر بھاگ نکلی ——— مدر الزبتھ کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ جولیا نے ہر شے کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا اور رونے لگی۔

"ماں! ماں! اب وہ میرے کمرے میں آنے لگا ہے ماں! وہ میرے کمرے میں بیٹھا ہے! میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟" وہ بستر پر ہی سر پٹکنے لگی۔ پھر چونک کر اُس نے مدر الزبتھ کو اپنی پُشت پر جُھکے ہوئے دیکھا۔ وہ گھبرا کر بستر پر دیکھنے لگی۔ بستر خالی ہی تھا اور مدر اُس کی پُشت پر کھڑی عجیب نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔

"اُٹھو!" مدر کی آواز میں حکم تھا۔ اور جولیا مشین کی طرح حرکت کرنے لگی اور سر جُھکا کر احترام سے کھڑی ہو گئی۔

"تم اِس کسوٹی میں پُوری نہیں اُتریں جولی ——— مجھے افسوس ہے خیر چلو! تمھارا کمرہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ جولیا پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

[illegible] اور جولیا کے بستر [illegible] کے پیچھے [illegible] دیکھا۔

"[illegible] جولی!" مدر کہہ رہی تھیں۔ "کل صبح میں اس نوجوان سے ملوں گی۔ اگر [illegible] جانے پر راضی ہو گیا تو سمجھو تم اِس زندگی سے نکل جاؤ اور اُسی کے ساتھ [illegible] کر دو۔ خداوند کی یہی مرضی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"لیکن ماں ——" جولیا نے کچھ کہنا چاہا لیکن مدر نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے [illegible]۔

"نہیں جولی! اب کچھ نہ کہو۔ جاؤ۔ سو جاؤ۔" مدر نے کہا اور تیز تیز قدم [illegible] کمرے سے نکل گئیں۔

"تم اِس زندگی سے نکل جاؤ اور اُسی کے ساتھ . . ." جولیا کے دل میں خوشی کا [illegible] اُمڈ پڑا۔ نہ جانے کیوں وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے آج اُس کے سر سے [illegible] پہاڑ ٹل گیا ہو۔ ایک بوجھ سا روح پر سے اُتر گیا ہو وہ خود کو پھول کی طرح ہلکا محسوس کر رہی تھی —— اُس نے محسوس کیا نوجوان کی آنکھوں میں انگارے نہ تھے۔ [illegible] تھی۔ پیار کی ٹھنڈک، محبت کی ٹھنڈک —— وہ جھوم اُٹھی۔ دفعتہً [illegible] پیانو کی مدھر تان رس گھولنے لگی۔ جیسے آج شام کسی کی شادی میں [illegible] ہو۔ وہ سوچنے لگی۔ دُلہن —— کتنی خوبصورت معلوم ہو گی وہ سفید [illegible] —— سوچتے سوچتے وہ آگے بڑھ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ نوجوان [illegible] سفیدی میں مسکرا رہا تھا اور آنکھیں —— وہ آنکھیں تو نہ تھیں۔ [illegible] پیار کی ٹھنڈی چھاؤں، محبت کی دلفریب ٹھنڈک جیسے اُس کی [illegible] —— اور انہیں دل خوش کن خوابوں کے بوجھ میں اُس کا ذہن [illegible] نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دوسری صبح پھر وہ طوفانوں میں گھِر گئی۔ مدر الزبتھ تندرست ہونے کے [illegible] آ گئی تھیں۔ جولیا اُن کے ساتھ ساتھ ہی تھی لیکن یوکلپٹس کا پیڑ تنہا [illegible] اور نوجوان کا کوئی پتہ نہ تھا۔ جولیا عبادت کے بعد گڑگڑا کر [illegible] کے آگے سجدہ ریز نگاہوں سے دعا کرتی رہی کہ نوجوان سے وہیں [illegible]۔ جب وہ مدر الزبتھ کے ساتھ واپس ہوتی ہو۔ تاکہ مدر اُس [illegible] باتیں کر لیں اور پھر —— "ماں! ماں!!" —— اُس کی آنکھوں سے نہ جانے [illegible] نکلے تھے۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو سیڑھیوں کے نیچے مدر کے سوا کوئی اُس کا [illegible] صرف پیڑ ہی تنہا کھڑا ہوا تھا۔ دس بجے تک وہ اور مدر وہیں ٹہلتی رہیں۔ [illegible] پریشان اور شرمندہ سی تھی۔ وہ کبھی اجنبی نے جس کا آنا پتہ بھی [illegible]

[illegible] اب کیا ہو سکتا تھا۔ اُس کی زندگی میں بہار آ کر [illegible] واپس تاریکی آ گئی تھی۔ اُس نے خود کو حالات کے دھارے پر بہا دیا اور [illegible] میں چلی آئی۔

اب دوسری صبح کا انتظار تھا۔ دوسری صبح —— اگر جب بھی وہ نہ آیا تو؟ وہ تڑپ اُٹھی اور مریم کا چھوٹا سا بت مٹھی میں بند کرتے ہوئے وارفتگی سے اُسے چومنے لگی۔ "میری مدد کرو ماں! میری مدد کرو! مجھے راستہ دکھاؤ!" وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ دعائیں کرتی رہی۔

ڈوبتے سورج کی کرنیں آج پھر میدان میں اُتر آئی تھیں۔ اُس نے صبح سے جانے کتنی ہی بار دریچے سے جھانک کر پیڑ کے تنے کو پُرجستجو انداز میں دیکھا تھا لیکن شام تک کوئی نظر نہ آیا —— اور شام ہوتے ہی پھر پیانو کی مدھر تان فضا میں پھیل گئی۔ آج بھی کسی کی شادی ہو رہی تھی —— دُلہن —— دُلہن —— وہ دُلہن بن سکے گی؟؟ اُس نے سوچا اور پھر دُلہن کو دیکھنے کے لئے کمرے سے نکل کر چرچ کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ پیانو کی لَے تیز ہو گئی تھی۔ فضا میں ایک پُرسکون مدھرتا رچی ہوئی تھی۔ چرچ کے ہال میں بڑے دروازے سے ہوتے ہوئے وہ آگے بڑھ کر دائیں جانب کے چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ پیانو خاموش ہو گیا۔ شادی کی رسم ختم ہو چکی تھی۔ دولہا اور دُلہن ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور بہت سے لوگ پیچھے کھڑے تالیاں بجا رہے تھے۔ مبارکباد دے رہے تھے۔ یکایک ایک کوندا سا لپکا اور بجلی سی چمک اُٹھی۔ ایک زلزلہ سا آ گیا اور آسمان جیسے زمین سے ٹکرا گیا —— جولیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اُس نے دیکھا دولہا وہی نوجوان ہے اور دُلہن۔ اُس کی اپنی بہن بینا ——! جولیا کا سر چکرانے لگا۔ اُسی لمحے ہزاروں گھڑیال بج اُٹھے۔ ٹن ٹن! ٹن ٹن! ٹن ٹن!! جولیا نے ایک ستون کا سہارا لیا اور پھر ستون ہی سے لپٹ کر کھڑی رہ گئی۔ جب تمام لوگ ہال سے باہر نکل گئے تو جولیا گرتی پڑتی مریم کے بت کے پاس گھسٹتی چلی گئی اور پھر بت کے قدموں سے لپٹ گئی۔ گھنٹے اب بھی بج رہے تھے۔ بجتے چلے جا رہے تھے۔

"مجھے معاف کر دو ماں! مجھے معاف کر دو ماں!!" جولیا کہہ رہی تھی۔

دوسری صبح چرچ میں مدر الزبتھ نے جولیا کو مریم کے پیروں سے الگ کیا تو یہ محسوس کر کے چونک پڑیں کہ جولیا بھی مریم کے بت کی طرح سرد ہو چکی ہے ——!!

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے۔ بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ [illegible]

غزل

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، ایم۔ اے

زندگی عالمِ کیف و کم ہے — تیری آنکھوں پہ کیا کیا بھرم ہے
عشق کی ذات و اوقات اے دل — حُسن کے اک بہانے سے کم ہے
کھا گئی یہ کسی جھوٹ کی چوٹ — زندگی ہے کہ تیری قسم ہے
اے نگاہِ کرم میری جانب — کم کم اب دیکھنا بھی تو کم ہے
موت کیا؟ تیرا مُنھ پھیر لینا — زندگی کیا؟ ترا دم قدم ہے
سربسر وجد میں ہیں نُہہ افلاک — نغمۂ عشق ہے سازِ غم ہے
شعر کیا وہ کہ گرمی تو اتنی — روشنی کو جو پوچھو تو کم ہے
میکشو جام ہاتھوں میں لے لو — آخری دَور ہے رات کم ہے
وہ صحیفہ ہے دل کا کہ جس میں — کیفیت ہر صدی کی رقم ہے
اُٹھ گیا آہ عشقِ سیہ بخت — پرچمِ آفتاب آج خم ہے
آہ کیا زاویئے بن رہے ہیں — دیدنی گیسوئے خم بہ خم ہے
نام ہی اِس کا ہے دارِ امکاں — جو نہ ہو جائے دنیا میں کم ہے
غم کی مُہلت نہ فرصت خوشی کی — صرف ذکرِ نشاط و الم ہے
بحر و بر پر دیئے جل اُٹھے ہیں — زندگی کس کا نقشِ قدم ہے
ہم سے پُوچھو کہ ہم جانتے ہیں — حاصلِ دانش و علم غم ہے
آج کس کو میں خط لکھ رہا ہوں — ہاتھ میں آنسوؤں کا قلم ہے

جیسے دھڑکے فراق اُس کا سینہ
میرے نغموں میں وہ زیر و بم ہے


آپ کی آنکھیں راز سے آگاہ ہیں!
ہاں! آپ کے چہرے کی دلکشی کے راز کو وہ بخوبی جانتی ہیں۔ وہ ٹھنڈی افغان سنو سے پوری طرح مانوس ہیں — آپ کی پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔ آپ کی آنکھیں آپ کے صحیح انتخاب کی معترف ہیں۔
افغان سنو
آپ کے چہرے میں خوشگوار تبدیلی لاتی ہے۔ ملاحت سے بھرپور افغان سنو آپ کے چہرے کے داغوں کو صاف کرتی ہے۔ جھریوں اور کیلوں کی الجھنیں ختم ہوجاتی ہیں۔ افغان سنو کا شکریہ — کہ اس کے استعمال سے آپ کا چہرہ دن بھر تر و تازہ اور جاذب نظر رہتا ہے۔
افغان سنو آپ کی پسندیدہ بیوٹی ایڈ۔
ای۔ ایس۔ پاٹن والا — بمبئی۔ ۷۷

افسانہ

خونِ جگر ہونے تک...

س۔ش مشہدی

ارریہ کورٹ۔ پورنیہ (بہار)

۲ر جولائی ۶۶ء

مکرمی! سلام و نیاز

... ایک افسانہ "خونِ جگر ہونے تک" ارسالِ خدمت ہے۔ اسے میں نے اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے (گو کہ تحریر سبز ہے) یہ افسانہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ اِس افسانے کی ہیروئن کلثوم ایک نفسیاتی کردار ہے اور اسی کردار کے گرد میں نے افسانے کے تانے بُنے ہیں۔ اِس افسانے میں جنسی تہیّجات، انسانی جبلتوں اور کردار پر لاشعور کے بے پناہ اثر کا تجزیہ عام فہم الفاظ میں کیا گیا ہے۔ کلثوم اور شاہد کا کردار ہماری روزانہ زندگی کا چلتا پھرتا کردار ہے لیکن کلثوم کا کردار اُس ذہنی اُلجھن اور رجحان کی نمائندگی کرتا ہے جس میں اِن دنوں صنفِ نازک کی ایک خاص تعداد اسیرِ نظر آتی ہے۔ یہ ذہنی اُلجھنیں جو ماحول کا عطیہ ہیں، بعض وقت انسانی شخصیت کے گرد ایک ایسا مصنوعی حصار قائم کر دیتی ہیں جن کا توڑنا کلثوموں اور شاہدوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اگر یہی حصار زیادہ دنوں تک قائم رہے تو اِس کا لازمی نتیجہ جنسی بے راہ روی (Perversion) اور اعصاب زدگی ہے۔ یہ روگ تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی انسانی تاریخ میں رچ بس گیا ہے اور اسی لئے میں نے اِس افسانے کا آغاز یونانی دیومالاؤں سے کیا ہے جن کے پسِ پردہ ہماری ذہنی نشوونما کی ایک تاریخ پنہاں ہے ــــ یہ افسانہ تحلیلِ نفسی (Psycho-analysis) کے اصولوں پر کردار کا تجزیہ ہے۔ پتہ نہیں میں اِس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اِس کا فیصلہ تو آپ کی دُور رس نگاہوں اور قارئین کی پسند پر منحصر ہے ــــ افسانہ آپ کے معیار پر اُترے تو اِسے "بیسویں صدی" میں جگہ دے کر مجھے ممنون فرمائیں...

خلوص کیش ــــ ش۔ مشہدی

"یونانی دیومالاؤں میں بتایا جاتا ہے کہ زمین ابتداء میں ایک ایسی مخلوق سے آباد تھی جس کا ہر فرد آدھا مرد اور آدھی عورت تھا۔ اور اِس طرح وہ مخلوق اپنے آپ میں گُم دیوتاؤں سے بے نیاز تھی۔ اِس بے نیازی کی بنا پر وہ دیوتاؤں کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ بالآخر خداوند زیوس کا قہر نازل ہوا اور دیوتائے اعظم نے ہر فرد کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ یعنی مرد علیحدہ اور عورت علیحدہ۔ اُسی روز سے ایک حصّہ دوسرے حصّہ کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اسی تلاش کو دُنیا محبت کے نام سے یاد کرتی ہے..." شاہد سگریٹ کے مرغولے اُڑاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"پھر...؟" کلثوم نے شاہد کو دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

"اور یہ تلاش اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک دونوں حصّے مِل نہیں جاتے۔ میں بھی اسی تلاش میں سرگرداں ہوں لیکن تم میرا ساتھ نہیں دے رہی ہو۔ تم شادی کے لئے تیار ہو جاؤ تو..." شاہد بات پُوری نہ کر سکا۔

"پھر وہی لغویات... تم جسے تلاش اور تکمیل کہتے ہو، میں اُسے ہَوس سمجھتی ہوں۔ جذباتی ہَوس! جو ایک بہیمانہ خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں..." کلثوم حقارت آمیز لہجہ میں کہہ رہی تھی۔

"یہ ہَوس نہیں کلثوم! یہ دیومالائیں حقیقت..." شاہد کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کلثوم نے روک دیا۔

[illegible]

"جسے تم محبت کہتی ہو وہ ایک خوشگوار حقیقت ہے لیکن تم نے اپنے اوپر سنجیدگی اور متانت کا جو خول چڑھا رکھا ہے۔۔۔" شاہد کہنے لگا۔

"بس کرو شاہد!... میں نے تم سے ہزاروں بار کہا ہے کہ ہم بہترین دوست ہیں اور بہترین دوست رہیں گے۔ اِس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ شادی بھی کی جائے۔" کلثوم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"لیکن آخر کیوں؟ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتی ہو؟ آخر شادی کے موضوع سے تمھیں اِس قدر نفرت کیوں ہے...؟" شاہد نے سوال کیا۔

"اِس لئے کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔ تم نے جسم اور اُس کی وحشیانہ تسکین کو جو اہمیت دے رکھی ہے، مجھے اُس سے نفرت ہے۔ تم مادی قدروں کے اسیر ہو اور میں... کیا ہم دوست رہ کر زندگی نہیں گزار سکتے؟" کلثوم نے بھی سوال کیا۔

"نہیں! ہرگز نہیں! ہم قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ ہم انھیں توڑ کر خوش نہیں رہ سکتے۔" شاہد بھی آج اُلجھنے کے موڈ میں تھا۔

"اصول بنائے جاتے ہیں شاہد صاحب! خود بخود بن نہیں جاتے۔" کلثوم کا لہجہ طنز آمیز تھا۔

"ایک کہانی سنو گی؟" شاہد نے موضوع بدلا۔

"سناؤ..." کلثوم نے بے پروائی سے کہا۔

"ہزاروں سال پہلے یونان میں ایک خوبصورت بچے نے جنم لیا تھا۔ اُسے بنانے میں خالق نے اپنی صناعی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ ایک شاہکار تھا۔ اُس کی خوبصورتی کے آگے چاند مصنوعی دکھائی دیتا تھا۔ یہ بچہ جس کا نام نارسیس (Narcissus) تھا پھولوں کا رنگ رس لے کر جوان ہوا۔ ایک دن ایکو نامی ایک پری اُس پر فریفتہ ہو گئی مگر نارسیس اپنے خیالوں میں مست اُسے نظر انداز کرتا رہا۔ وہ اپنے آپ میں گم ایکو کی شیدائی نگاہوں اور اُس کی رعنائیوں سے بے نیاز پھولوں کو ٹھوکر مارتا رہا۔ روزانہ اُس کے قریب سے گزر جاتا۔ ایکو نے اِس بے نیازی کو اپنی توہین سمجھا اور خداوند کیوپڈ سے اِس توہین کا انتقام لینے کی دعا کی۔ دعا مقبول ہو گئی۔" شاہد نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے قصہ جاری رکھا۔

"ایک دن نارسیس تالاب کے کنارے اپنی ذات میں گم بیٹھا تھا کہ اچانک اُس کی نظر پھولوں سے لدے ہوئے تالاب کے پانی پر پڑی جس میں اُس کا عکس جھلملا رہا تھا۔ وہ عکس کو تکتا رہ گیا۔ وہ اپنا عکس دیکھتے [illegible]

[illegible] میں کھو جاتا اور [illegible] اور اُس کی رعنائیوں میں گم ہو جاتا اور یہاں تک کہ گھڑیاں گھنٹوں میں اور دن مہینوں میں بدلتے رہے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور روح جسدِ خاکی سے آزاد ہو گئی۔ مگر وہ پتھرائی ہوئی آنکھیں جیسے اب بھی عکس کو تلاش کر رہی تھیں۔ دیوتاؤں نے اُس کے دیوانے پن پر رحم کھا کر اُسے ایک پھول بنا دیا جسے اپنا نظارہ کرنے میں جنبشِ مژگان بھی بار تھی۔ آج بھی دنیا اُس پھول کو نرگس (نارسیس) کے نام سے یاد کرتی ہے۔" شاہد نے ایک طویل سانس لی۔

"تمھارا مطلب...؟" کلثوم کی انا کو دھچکا سا لگا تھا۔

"میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں ہزاروں سال پرانی کہانی آج دہرائی تو نہ جائے گی۔ کہیں اِن رنگ برنگ کے پھولوں میں کلثوم کے پھول کا اضافہ تو نہیں ہونے والا ہے؟" شاہد کا لہجہ افسوس ناک تھا۔

"پھول بن جانا تو انسان کی معراج ہے لیکن تمھیں پھول کی خوشبو سے زیادہ اُس کے رس سے بنا ہوا شہد عزیز ہے۔ تم میں ذوقِ لطیف کی کمی ہے۔ تم پھول کو دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتے بلکہ اُسے ہاتھوں میں لے کر مسل دینا چاہتے ہو..." کلثوم کو غصہ آ گیا تھا۔ فضا ناخوشگوار ہوتی جا رہی تھی۔

"اچھا چھوڑو اِس دیرینہ ٹاپک کو۔ بولو چائے پیو گی یا کافی؟" شاہد نے بات کو بدلنے کی کوشش کی۔

"ہاں! اب تم نے بھلے آدمیوں کی طرح بات کی ہے۔" کلثوم کا موڈ بدل گیا۔

"موسم ابر آلود ہے اِس لئے میں کافی پیوں گی۔" کلثوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"موسم ابر آلود ہے اِس لئے یا کافی تلخ ہوتی ہے اِس لئے؟" شاہد نے پھر چٹکی لی۔

"میں تمھاری طرح تلخیوں سے فرار نہیں چاہتی۔ تلخیاں تو زندگی کی حقیقت ہیں۔" کلثوم نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"پھر تم نے فلسفیوں کے انداز میں گفتگو شروع کی۔ فلسفے سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔" شاہد نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور فلسفہ میرا محبوب ترین موضوع ہے۔" کلثوم ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔

"تب تو تمھیں ارسطو سے بھی عقیدت ہو گی۔" شاہد نے بات کو آگے بڑھایا۔

"یقیناً! ارسطو تو فلسفے کا دیوتا ہے۔" کلثوم نے فخریہ انداز میں کہا۔

"[illegible] گیلری میں ایک [illegible] تصویر ہے۔" [illegible] سگریٹ جلایا، ایک کش لیا اور [illegible]

بھی مجھے ہی دکھانا ہے، ارسطو گنگون کے نقش قدم پر چل رہا ہے اور ایک عورت آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے..." شاہد نے بات پوری کی۔

"مطلب...؟" کلثوم کا لہجہ بدل گیا۔

"مطلب صاف ہے۔ تمہارا یہ محبوب فلسفی بھی عورت کی ضرورت کو نظر انداز نہ کر سکا اور اسی لئے میں تم سے کہتا ہوں..." لیکن کلثوم نے شاہد کو بات پوری نہ کرنے دی اور پرس اٹھاتے ہوئے بولی۔

"میں جا رہی ہوں۔ تمہیں کافی نہ پلانی ہو تو نہ پلاؤ لیکن مجھے یوں بور کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔" وہ صوفے سے اٹھنے لگی۔

"اوہو! تم تو بات بات پر روٹھ جاتی ہو۔ خدا کی قسم تم مجھے جینے نہ دو گی۔ بیٹھو میں ابھی کافی پلاتا ہوں۔" شاہد نے ہنستے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف منہ کر کے آواز لگانے لگا۔

"رشو... رشو!"

"کیا بات ہے بھائی جان!" پندرہ سولہ سال کی ایک نوخیز لڑکی دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آگئی اور کلثوم کو دیکھتے ہی مسکرا کر کہنے لگی۔

"اچھا تو کلثوم آپا یہاں ہیں اور میں سمجھ رہی تھی آپ کب کی گھر جا چکی ہیں۔"

"میں تو کب کی چلی گئی ہوتی لیکن تمہارے بھائی جان میری جان چھوڑیں تب نا۔" کلثوم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب یہ آپ کی جان نہیں چھوڑ سکتے کلثوم آپا!" رشو نے معنی خیز انداز میں کہا اور کلثوم جھینپ گئی۔

"رشو! تم بہت اچھی لڑکی ہو!" شاہد نے خوشامد کی۔

"چائے چاہئے یا کافی!" رشو نے برجستہ پوچھا جو شاہد کے خوشامدانہ جملوں کا مفہوم سمجھتی تھی۔

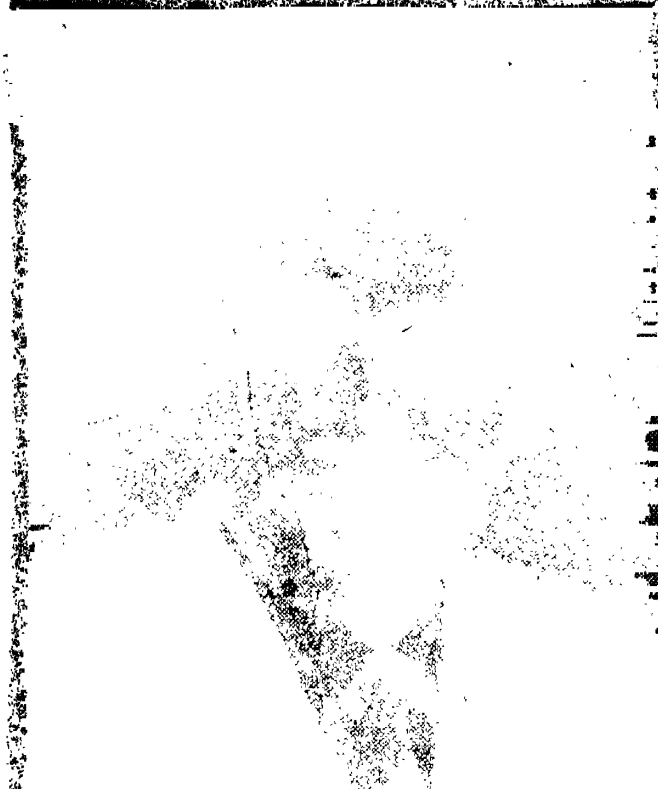
"کلثوم کو کافی پسند ہے!" شاہد نے کہا۔

"اور تمہیں...؟" کلثوم نے سوال کیا۔

"تمہاری پسند!"

شاہد اور کلثوم کی یہ نوک جھونک کوئی نئی نہ تھی۔ ہمیشہ ہی یہ ایک دوسرے پر طنزیہ جملوں کی بارش کیا کرتے تھے لیکن پچھلے ایک سال سے شادی کے موضوع پر دونوں میں اکثر جھڑپیں ہوا کرتی تھیں اور ہمیشہ شاہد ہی کو شکست ماننی پڑتی تھی۔ اس لئے کہ کلثوم نے شکست تسلیم کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔

شاہد اور کلثوم بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے ابتدائی درجوں سے لے کر



ایم اے تک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ شاہد نے فلسفہ میں اور کلثوم نے نفسیات میں ایم اے کر لیا تھا اور کلثوم نے فلسفہ میں۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتی تھی اور سب یہی سمجھتے تھے کہ یہ ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ شاہد تو واقعی کلثوم سے والہانہ پیار کرتا تھا مگر کلثوم اپنی عادت کے مطابق اس معاملے میں بھی اس قدر سنجیدہ تھی کہ اس نے اتنی قربت کے باوجود اس تعلق کو دوستی کی حد سے آگے نہ بڑھنے دیا تھا۔ وہ قربت کی اس آنچ سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی لیکن اس شعلے سے دامن بچائے رہتی تھی جس میں شاہد جل جانا چاہتا تھا۔ شاہد جب بھی کبھی رومانی گفتگو کا آغاز کرنا چاہتا، کلثوم اسے روک دیتی۔ وہ کہتی "ہم دوست ہیں اور رہیں گے! اس سے زیادہ تم مجھ سے توقع نہ رکھو۔ اس لئے کہ مجھے فلسفہ میں ریسرچ کرنا ہے اور میں ان فضولیات میں پڑنا نہیں چاہتی۔" شاہد اسے لاکھ سمجھاتا کہ یہ ریسرچ تم شادی کے بعد بھی کر سکتی ہو لیکن اس کی ضد کے آگے ایک نہ چلتی۔ وہ اس موضوع پر زیادہ گفتگو کرنے کو بھی تیار نہ تھی۔

کلثوم پروفیسر عابدی کی اکلوتی بیٹی تھی، اس لئے باپ کی چہیتی تھی۔ ماں کا انتقال اس کی پیدائش ہی کے وقت ہو چکا تھا۔ باپ نے بیٹی کی محبت میں دوسری

شادی بھی نہ کی اور بیٹی کو ماں بن کر پالا تھا۔ انھوں نے کلثوم کو بڑے لاڈ سے پالا تھا اور اُس کی ہر ضد کو اپنے لئے فرض کا درجہ دیا تھا۔ یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفیات کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہونے کے علاوہ موروثی جائداد بھی کافی تھی۔ گھر میں دولت کی فراوانی تھی لیکن بیوی کی موت نے انھیں بھی بے حد تنہائی پسند بنا دیا تھا۔ کُتب بینی کے علاوہ اگر انھیں کوئی کام تھا تو وہ کلثوم کی ناز برداری کرنا تھا۔ دولت کی فراوانی کے باوجود کلثوم نے سادگی ہی کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔ وہ خود بھی بہت کم لوگوں سے مِلا کرتی تھی۔ شاہد کے سوا شاید اُس کا کوئی دوسرا دوست بھی نہ تھا۔ دونوں باہم بے حد بے تکلّف تھے۔ اگر ایک دن بھی شاہد نہ آتا تو کلثوم اُس کے فون کا نمبر ڈائل کرنے لگتی۔ اُس سے ملاقات نہ ہوتی تو وہ بے چین سی ہو جاتی۔ شاہد تو اُسے والہانہ چاہتا تھا لیکن کلثوم پھر بھی ریزرو رہنے کی کوشش کرتی۔ وہ جس قدر ریزرو رہنا چاہتی، شاہد کی محبت اُسی قدر بیقرار ہو جاتی۔ کلثوم دوستی کے بعد کے فاصلے کو برقرار رکھنا چاہتی تھی اور شاہد اِس آہنی دیوار کو گرا دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بچپن کی یہ بے لوث دوستی، ازدواجی بندھنوں میں بندھ جائے لیکن کلثوم اسے لغویات کہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاہد اُس کا بہترین دوست ہے اور شادی کے بعد بھی وہ اُس کا دوست رہ سکتا ہے۔

پروفیسر عابدین بھی چاہتے تھے کہ کلثوم کی شادی، شاہد سے ہو جائے۔ شاہد کے گھر والے بھی یہی چاہتے تھے مگر کلثوم کی اپنی ضد تھی۔ شاہد کو تو وہ تلخ و ترش کہہ دیا کرتی تھی۔ ایک دو بار عابدین صاحب نے اُسے شادی کے لئے آمادہ کرنا چاہا تو کلثوم نے اُنھیں بھی یہ کہہ کر ٹال دیا۔

"پاپا! آپ مجھے مجبور نہ کریں۔ مجھے ریسرچ کرنا ہے اور میں اِن لغویات میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کے اور میرے درمیان کوئی تیسری ہستی آئے۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ شاہد میرا دوست ہے، مجھے عزیز ہے لیکن میں شادی نہیں کر سکتی۔ دوستی کے لئے شادی ضروری تو نہیں ...." اور بے چارے عابدین صاحب بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر خاموش رہ جاتے۔

کلثوم کی شخصیت پر سنجیدگی کچھ اِس طور سے طاری تھی اور اُس نے اپنے گرد ایک ایسا دائرہ بنا لیا تھا جس کے اندر کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی اور خود وہ اُس دائرہ سے باہر جانے کو تیار نہ تھی۔ شاہد اسی اُمید پر جئے جا رہا تھا کہ کبھی اُس بُت کے سینے میں بھی دل دھڑک اُٹھے۔

شاہد کے گھر والے شادی کے لئے زور دے رہے تھے اور کلثوم اُس سے دُور رہنا چاہتی تھی۔ ایک عجیب کشمکش تھی جس نے شاہد کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ اب سوگوار رہنے لگا تھا۔ اِسی عالم میں وہ ایک شام کو اپنے محبوب اُستاد ڈاکٹر باسط کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر باسط نفسیات کے پروفیسر تھے اور شاہد کے اُستاد رہ چکے تھے۔ وہ شاہد کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔

شاہد جب اُن کے بنگلے پر پہنچا تو وہ باہر لان میں کرسی پر آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ شاہد خاموشی سے اُن کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور میز پر سے تحلیل نفسی کی ایک کتاب اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ دفعتہً ڈاکٹر باسط چونک اُٹھے اور سامنے شاہد کو بیٹھا دیکھ کر بولے۔

"ارے شاہد! تم کب آئے۔ کیسے ہو؟ کلثوم کیسی ہے؟ تم دونوں کی شادی کب ہو رہی ہے؟" اُنھوں نے سوالات کی بوچھار کر دی۔

"اچھا ہوں سر...." شادی کے نام پر شاہد مغموم ہو گیا۔

"کیا بات ہے۔ تم اُداس ہو۔ کلثوم سے جھگڑا ہو گیا ہے کیا؟ کوئی بات نہیں۔ بچّوں میں جھگڑے ہوا ہی کرتے ہیں۔ تم اُداس کیوں ہوتے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

عادت کے مطابق ڈاکٹر باسط نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہہ دیں۔ وہ کلثوم اور شاہد کے تعلّقات سے اچھی طرح واقف تھے۔

ڈاکٹر باسط کے ہمدردانہ لہجے نے شاہد کے زخم ہرے کر دئے اور اُس نے اپنی ناکامیوں اور کلثوم کی ضد کا سارا ماجرا اُنھیں سُنا دیا۔ ساری باتیں باسط صاحب غور سے سُنتے رہے اور مُسکراتے رہے اور تب اُنھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ نفسیات کے ذہین طالبِ علم ہونے کے باوجود تم نے کلثوم کی شخصیت کو نہیں سمجھا۔"

"وہ کیسے؟" شاہد چونکا۔

"دیکھو کلثوم نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے وہاں اُسے ماں کا پیار نہیں مِل سکا ہے۔ اُس نے باپ کی فلسفیانہ زندگی سے پیار کیا ہے۔ اُس نے ازدواجی زندگی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی ہے۔ طبیعتہً سادہ مزاج ہونے کے باوجود لاڈ اور پیار نے اُس کے اندر جذبۂ انا کو بے حد اُجاگر کر دیا ہے۔ اُس نے اپنی ایک دُنیا بنائی ہے جو اُس کے گھر اور باپ کی شخصیت تک محدود ہے۔ اُس کی شخصیت اسی خود ساختہ حصار میں مقیّد ہے جس کی پاسبانی اُس کی انا کے سپرد ہے۔ وہ اِس دائرہ سے باہر آتے ہوئے لاشعوری طور پر خوف کھاتی ہے، ڈرتی ہے۔ تم سے اِتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ اِس حصار کو توڑنے کی ہمّت نہیں رکھتی ہے" ڈاکٹر باسط اُسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"لیکن کیا اُسے اِس حصار سے باہر لایا جا سکتا ہے ڈاکٹر صاحب؟" شاہد کا لہجہ پُراُمید تھا۔ اُس کی تاریک راہوں میں ایک کرن پھوٹی تھی۔

"یقیناً اِٹ اِز ویری سمپل۔ اِس کا بہترین علاج شاک ہے۔ ایک ایسا جذباتی صدمہ جو اُس کے لاشعور میں پڑی ہوئی گِرہ کھول دے اور اُس کی شخصیت پر چڑھے ہوئے خول کو ریزہ ریزہ کر دے" ڈاکٹر باسط نے معالج کے انداز میں کہا۔ اور کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد شاہد وہاں سے چلا آیا۔

پچھلے پندرہ دنوں سے شاہد کلثوم کے گھر نہیں آیا تھا اور کلثوم ایک عجیب سی کمی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے کئی روز شاہد کے گھر فون بھی کیا لیکن ہمیشہ رشو نے یہی جواب دیا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ کرسمس کا دن تھا۔ اِس لئے آج سویرے ہی سے کلثوم شاہد کے گھر جا کر اُس کی خبر لینے کا ارادہ کر رہی تھی۔ اُس نے سوچ رکھا تھا کہ ملتے ہی وہ شاہد کی ایسی خبر لے گی کہ وہ یاد کرے گا۔ آخر پندرہ دن سے اُس نے کلثوم کی کوئی خبر کیوں نہ لی تھی؟ ایسی کون سی مصروفیت ہو سکتی ہے جو اُسے اُس سے ملنے سے بھی باز رکھ سکتی ہے۔ وہ ایک عجیب سی اضطراری کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ اِسی اُدھیڑ بُن میں وہ غسل کرنے چلی گئی اور شاہد ہی کے متعلق سوچتی ہوئی غسل خانے سے اپنے کمرے میں واپس آئی۔ اُس کے گیلے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ اُن میں کنگھی کرتی ہوئی آئینے کے قریب آ گئی۔ آئینے میں اُس نے اپنا عکس دیکھا اور دم بخود رہ گئی۔ رُخِ تاباں کو سیاہ زُلفیں چُوم رہی تھیں اور اُس کی بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں میں سُرخ ڈورے پڑ گئے تھے۔ وہ اپنا عکس دیکھتی رہی اور اُس میں گُم ہوتی رہی۔ یکایک وہ اپنی آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اُس کی آنکھیں نہ ہوں دو پھُول ہوں... پھُول... کلثوم کے پھُول! اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے شاہد سرگوشیوں میں اُس سے کہہ رہا ہو۔ "کلثوم کے پھُول..." وہ گھبرا سی گئی اور اپنی زلفوں کو جھٹکتی ہوئی آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ دفعتہً میز پر رکھے ہوئے ایک خوش رنگ لفافے نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ تیزی سے بڑھ کر اُس نے لفافہ اُٹھا لیا اور اُسے غور سے دیکھنے لگی جس پر اُس کا نام خوشنما حرفوں میں لکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ لفافہ اُسے کس نے بھیجا ہے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اُس نے لفافہ کھولا اور کارڈ نکالا۔ یہ دعوت نامہ تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"۲۸ دسمبر کو شاہد جمال ایم۔ اے کی شادی رخسانہ یاسمین ایم۔ اے

سے ہونا قرار پائی ہے۔ آپ سے شرکت..."

اِس سے زیادہ وہ نہ پڑھ سکی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے بجلی کے تاروں نے اُسے چھُو لیا ہو۔ اُس کے دل کی دھڑکن جیسے رُک گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا اور اِس اندھیرے میں کارڈ کے حروف دھُندلا گئے۔ اُس نے کارڈ کو پھر پڑھنا چاہا لیکن حروف کیڑے مکوڑوں کی طرح کارڈ پر رینگتے نظر آئے اور اُسے کپکپی سی آ گئی۔ اُس کے دل کو کوئی چٹکیوں سے مسل رہا تھا اور دماغ میں پن چکیاں چل رہی تھیں۔ سارا کمرہ گھوم رہا تھا۔ ہر شے جیسے رقص کر رہی تھی۔ وہ لڑکھڑائی لیکن اُس نے کرسی کا سہارا لے لیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوئی وہ مسہری کی طرف بڑھی۔ سامنے کی میز پر شاہد کی تصویر رکھی تھی جس میں وہ ہاتھ میں ریکٹ لئے ہمیشہ کی طرح لاابالی پن سے مُسکرا رہا تھا۔ کلثوم کا جی چاہا وہ اِس تصویر کو اپنے سینے میں چھپا لے۔ اُس کی مُسکراہٹوں کو اپنے ہونٹوں میں ضم کر لے... وہ قریب آئی اور فریم کو اٹھانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ دفعتہً اُس کے ہاتھ میں دعوت نامہ تھرتھرایا اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کالے ناگ نے اُسے ڈس لیا ہو۔ اُس نے جھٹک کر کارڈ کو دُور پھینک دیا اور شاہد کی تصویر کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ شاہد کی مُسکراہٹ میں اُسے ایک طنز کا احساس ہوا جو اُس کی بےبسی پر مُسکرا رہا تھا۔ اُس کی کنپٹیوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا اور دفعتاً اُس نے تصویر کو اُٹھا کر فرش پر دے مارا۔ ایک چھناکے کی آواز ہوئی اور سارا کمرہ گونج اُٹھا... اِس گونج سے اُس کا وجود لرز اُٹھا۔ وہ تصویر کی طرف دیکھنے لگی جو فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ فریم کا شیشہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ شیشے کے کچھ ٹکڑے فریم میں اب بھی لگے ہوئے تھے لیکن شاہد پھر بھی مُسکرا رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ بکھرے ہوئے ٹکڑے شیشے نہ ہوں، اُس کے دل کے ٹکڑے ہوں اور اُس کے دل کا حصہ اب بھی شاہد کی تصویر سے چپکا ہوا ہو۔ اُس نے بڑھ کر فریم کو اُٹھا لیا اور اپنی ہتھیلیوں اور سینے کے درمیان اِس زور سے بھینچا کہ شیشہ اُس کی ہتھیلیوں میں پیوست ہو گیا۔ خون کی لکیریں اُبھر آئیں... خون رِس رِس کر اُس کے کپڑوں میں جذب ہونے لگا۔ اُس نے اپنی جِلد پر خون کے لمس کو محسوس کیا اور اُسے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ دفعتہً اُسے اپنی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوا۔ جیسے یہ سکون طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ تصویر کو سینے سے لگائے وہ مسہری پر گِر پڑی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ تصویر اُس کے سینے پر دبی ہوئی تھی اور وہ مُنہ کے بَل گری ہوئی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ سارا جسم لرز رہا تھا۔ کمرہ کی فضا اُس کی سِسکیوں سے لرز رہی تھی۔ نہ جانے وہ کب تک یونہی روتی رہی کہ معاً اُسے اپنی زلفوں میں کسی کی اُنگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ کوئی اُس کے بالوں سے کھیلتا ہوا تھپکیاں دے رہا تھا... اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو شاہد مُسکراتا ہوا اُس کے بالوں سے کھیل رہا تھا... چند لمحے وہ شاہد کو دیکھتی رہی اور اُس کی آنکھوں نے آنسو بہانا بند کر دیا... پھر اچانک وہ اُٹھ کر شاہد سے یوں لپٹ گئی جیسے اپنے وجود کو شاہد میں سمو دینا چاہتی ہو۔ وہ شاہد کے سینے سے لگی ہوئی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور شاہد اُسے تھپکیاں دے دے کر ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کہئے فلسفی صاحب! بس مذاق میں اِتنا رونا؟ ارے وہ کارڈ تو ایک مذاق تھا ڈاکٹر باسط کا بتایا ہوا..."

کلثوم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے چاہا کہ وہ شاہد سے الگ ہو جائے لیکن الگ نہ ہو سکی۔ شاہد نے کلثوم کی ہتھیلیوں کو جن سے خون رِس رہا تھا، اپنے ہونٹوں سے لگا لیا!!

خد و خال

مخمور سعیدی

دَر و دیوار کی خموشی نے — خیر مقدم کے گیت گائے ہیں
آج کس کے قدم، یہ کس کے قدم — عشق کے غمکدے میں آئے ہیں

سینۂ رہگزر میں گام بہ گام — لہر خوشبو کی دوڑتی جائے
اُس کے قدموں کا لمس مٹی کو — غنچہ و گُل کی طرح مہکائے

دیدنی ہیں خرامِ ناز کے وقت — کروٹیں ریشمیں غرارے کی
ساقِ سیمیں کو گُدگُداتی ہیں — سلوٹیں ریشمیں غرارے کی

طاق و محراب و سقف و بام پہ ہے — اِک انوکھی شگفتگی طاری
غنچہ و گُل ہیں اُس کے نقشِ قدم — گُلستاں، گھر کی چار دیواری

بام و در جس سے جگمگا اُٹھے — روشنی اُس کے نقشِ پا کی ہے
گھر کے آنگن کو اُس کے قدموں نے — اِک نئی زندگی عطا کی ہے

اثر اندازِ ہر دو عالم ہے — حُسن کی قُربتِ جنوں انگیز
ذرّے ذرّے میں دل دھڑکتا ہے — قطرہ قطرہ ہے آج طوفاں خیز

نُورِ معصومیت کے حلقے میں — یہ اچھوتا سا نازنیں چہرہ
حُسن، دوشیزگی کی قید میں ہے — شوخیوں پر ہے شرم کا پہرہ

ہے بہ فیضِ تبسّمِ گُلگوں — نزہتِ نوبہار چہرے پر
جوت دوشیزگی کی آنکھوں میں — کمسِنی کا نکھار چہرے پر

روشنی انگ انگ سے اُس کے — پھُوٹ پڑنے کو یوں مچلتی ہے
جس طرح بے قرار ہو ہو کر — چاند سے چاندنی نکلتی ہے

اُس کی خوشبو ہی جاں نواز نہیں — دل فروز اُس کا رنگ رُوپ بھی ہے
عنبریں گیسوؤں کے سائے میں — عارضوں کی گلابی دھوپ بھی ہے

افسانہ

اجنبی

مختار الرحمٰن راہی۔ بی، اے۔ ایل، ایل، بی

ماسٹر منیر منزل۔ گلزار مسجد گھاٹ گیٹ۔ جے پور

۱۲ر جولائی ۱۹۶۶ء

برادرِ محترم حضرت خوشتر گرامی صاحب! تسلیم

تقریباً ایک سال سے ٹورنگ لائف گزار رہا ہوں۔ زندگی سفر میں ہے اور سفر ذریعۂ معاش کے ساتھ ساتھ زندگی بن کے رہ گیا ہے۔ یہ شاید میرے تخلص ہی کا اثر ہے۔ کبھی میں نے ہی کہا تھا ؎

مجھے شوق ہے رہ نوردی کا راہی   مرے سامنے میری منزل نہ آئے

آل انڈیا ایڈیٹرز کانفرنس میں جب آپ جے پور تشریف لائے اور غریب خانے کو رونق بخشی تھی تو آپ نے کس خلوص سے کہانی کی فرمائش کی تھی اور میں نے جلد کوئی کہانی بھیجنے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن ؏

سیاہی ہوگئی نایاب اگر ہم نے قلم پایا!

اور بقول آتش شوق کا سامان بہم نہ ہو سکا ــــــ زیرِ نظر کہانی "اجنبی" کو لکھے ہوئے تقریباً پانچ ماہ ہوگئے لیکن اتنی فرصت نہ مل سکی کہ اسے فیئر کرکے آپ کی خدمت میں بھیج سکتا۔ اب محکمۂ جاگیر سے میرا تبادلہ غذا اور رسد کے محکمے میں ہوا اور ٹورنگ لائف سے کچھ دنوں کے لئے نجات ملی تو افسانہ فیئر کرکے ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ افسانہ قدرے طویل ضرور ہے اس کا مجھے احساس ہے لیکن افسانے میں ٹھہراؤ کے لئے یہ طوالت ضروری تھی جو آپ کو اور قارئینِ کرام کو محسوس نہ ہوگی۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ "اجنبی" آپکی پسند کی حدود کو ضرور چھولے گا... چشمِ التفات اور توجہاتِ خوشتر کا خواہاں

مختار الرحمٰن راہی

شیریں ٹیلیفون کے پاس بیٹھی "بیسویں صدی" کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اُس وقت اُسے کسی کے ٹیلیفون کا شدید انتظار تھا۔ بار بار وہ اپنی کلائی پر بندھی ہوئی رسٹ واچ کی طرف دیکھتی پھر جھلاہٹ میں رسالے کے کئی اوراق اُلٹ دیتی۔ کئی بار اُس کا ہاتھ ٹیلیفون کی طرف بڑھا لیکن رُک گیا۔ جب رسالے کو کئی بار اُلٹ چکی تو اُس نے میز پر رکھے ہوئے گلاس کا پانی اپنے حلق میں اُنڈیل لیا۔ دفعتہً ٹیلیفون دلآویز موسیقی کے ساتھ گنگنا اُٹھا۔

"شیریں!" وہ ماؤتھ پیس میں بولی: "آپ کون صاحب فرما رہے ہیں؟"

"پہچانئے!" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"میں آپ کو نہیں پہچان سکی۔ میرے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔"

"آشنا؟ کون کس کا آشنا ہے ...؟ اچھا چھوڑئے اِس مسئلے کو... حیرت تو یہ ہے کہ ایک رومال کی چار تہہ ماؤتھ پیس پر رکھ کر بولنے سے کیا میری آواز میں اتنی تبدیلی ہوگئی کہ تم پہچان بھی نہ سکیں؟"

"تو یہ تم ہو جاوید؟" شیریں نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

"نہیں ڈیر! اور سوچو، آواز کو غور سے سنو اور پہچانو تو۔" فاتحانہ انداز میں کہا گیا۔

"اوہ! اب پہچانی... انور! مجھے اتنا پریشان کرتے ہو۔ کب سے میں تمہارے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔ تم جانتے ہو آج کالج میں ڈرامے کا ریہرسل کرنا ہے۔ پرفارمینس میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔"

"سوری! نہ میں جاوید ہوں اور نہ انور... آواز پہچانو اور بتاؤ۔" دوسری طرف سے دبی دبی ہنسی کے ساتھ آواز آئی۔

"پھر تم کون ہو؟ میں نہیں جانتی۔ نام بتاؤ ورنہ ٹیلیفون بند کرتی ہوں۔"
شیریں کی آواز غصے سے بھرا گئی تھی۔

"مجھے اجنبی کہتے ہیں۔ آپ بھی اسی نام سے پکار سکتی ہیں۔ یہ میرے تخلص ہی کا اثر ہے کہ مجھے میرے اپنے بھی اجنبی سمجھتے ہیں۔ اور آپ کے لئے تو خیر میں..."

"آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو میرا تخلص پسند آیا؟ حالانکہ اس میں جاوید اور انور جیسے ناموں کی سی حلاوت اور کشش تو ہے نہیں۔"

"شٹ اپ" وہ چیخی "بند کر دیجئے۔"

"اتنی زور سے نہ چیخئے کہ بزر پھٹ جائے اور..."

اور شیریں نے جھلا کر ٹیلیفون بند کر دیا۔ اُس کی پیشانی پر غصے کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی اور اپنے شانوں کو جنبش دیتی ہوئی غصے کے عالم میں ٹہلنے لگی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتی رہی... کہیں وہی اجنبی نہ ہو۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پھر اُس نے ایک جھٹکے کے ساتھ رسیور اُٹھالیا۔

"ہلو!" وہ ماؤتھ پیس میں دہاڑی۔

"آپ کی آواز بتا رہی ہے کہ ابھی تک آپ کے انور نہیں آتے۔"

"لیکن آپ سے مطلب؟" شیریں کے لہجے میں حقارت تھی نفرت تھی۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے انور صاحب کسی دوسرے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہوں اور آپ سے کیا ہوا وعدہ بھول گئے ہوں۔"

"بند کیجئے اپنی بکواس۔ آوارہ۔ لفنگے کہیں کے۔"

"آپ بھول رہی ہیں میڈم مجھے اجنبی کہتے ہیں۔"

اور شیریں نے کھٹاک سے ٹیلیفون بند کر دیا۔ اِس وقت شیریں نہایت ہی غم و غصہ کے عالم میں تھی۔ اُسے انور پر بھی غصہ آنے لگا۔ اور پھر اجنبی کا وہ جملہ اُس کے کانوں میں گونجنے لگا ——— "ہو سکتا ہے انور صاحب کسی دوسرے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف ہوں اور..."

اور وہ تیزی سے کالج کے لئے روانہ ہو گئی۔ جب شیریں ریہرسل روم میں پہنچی تو ڈرامہ انچارج واسطی نے بتایا کہ انور اپنی ماں کی شدید علالت کا تار ملنے پر آج ہی وطن چلا گیا ہے۔ اِس لئے ہیرو کا رول اب انور کی بجائے سراج ادا کریں گے۔ شیریں نے دیکھا کہ سراج ایک بے پروا، کھوئی کھوئی سی آنکھوں والا خوبرو نوجوان تھا۔

"یہ ہیں مسٹر سراج جو ڈرامہ نویس بھی ہیں اور اپنے ڈرامہ میں ہیرو کا رول بھی ادا کریں گے۔"

مسٹر واسطی نے شیریں سے سراج کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "اور مسٹر سراج! یہ ہیں مس شیریں جو ڈرامے میں ہیروئن کا رول ادا کر رہی ہیں۔"

اور سراج نے گردن کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ صرف "گڈ!" کہا تو شیریں جل کر رہ گئی تھی۔

"اب آپ لوگ ریہرسل کریں۔" واسطی نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو مس شیریں!" سراج نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ "پہلے یہ بتائیں کہ آپ مسٹر انور سے اظہارِ محبت کر چکی ہیں یا...؟"

"کیا مطلب؟" شیریں کے ابرو تن گئے۔ چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا تھا۔

"برہم ہونے کی بات نہیں شیریں صاحبہ... مطلب یہ کہ ڈرامہ کے پارٹ میں آپ کہاں تک ریہرسل کر چکی ہیں۔ یعنی ہیروئن نے جہاں ہیرو سے محبت کا اظہار کیا ہے آپ نے وہاں تک ریہرسل کر لی ہے یا نہیں؟"

"جی نہیں۔" وہ بے رُخی سے بولی۔

"تو پھر اب اُس کا ریہرسل شروع کر دیا جائے۔" سراج نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"میں آپ کے ساتھ اِس ڈرامے میں حصّہ نہ لوں گی۔" شیریں نے برہم ہو کر کہا۔

"میں نے کب مجبور کیا ہے آپ کو۔" سراج نے بھی رُوکھے پن سے جواب دیا۔

"جو کچھ کہنا ہے آپ واسطی صاحب سے کہیں۔"

شیریں پیر پٹکتی ہوئی واسطی کے پاس گئی اور کچھ دیر بعد واسطی کو لئے ہوئے ریہرسل روم میں داخل ہوئی۔

"بات یہ ہے مس شیریں!" مسٹر واسطی نے کہا: "اِس وقت کالج میں مسٹر سراج سے بہتر کوئی لڑکا نہیں ہے جو ہیرو کا رول کامیابی کے ساتھ ادا کر سکے، اِس لئے انہیں منتخب کیا گیا ہے اور یہی حال ہیروئن کا ہے۔ اگر آپ اپنا رول ادا نہ کریں گی تو ڈرامہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔ کالج اور یونیورسٹی کی بڑی بدنامی ہوگی۔ اِس لئے آپ دونوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ یہ ڈرامہ اسٹیج کیجئے۔ کالج اور یونین کی عزت کی خاطر کیونکہ اِس کی آمدنی انڈین ڈیفنس فنڈ میں دی جائے گی۔"

"مجھے تو مسرت ہوگی یہ ڈرامہ کامیابی کے ساتھ اسٹیج کر کے۔" سراج نے جواب دیا۔

"لیکن اِن سے کہہ دیجئے واسطی صاحب کہ یہ مجھ سے غیر ضروری باتیں نہ کریں۔" شیریں نے دھیمے لہجہ میں کہا۔

"میں خود غیر ضروری باتیں پسند نہیں کرتا... اور نہ اب تک میں نے کوئی غیر ضروری بات کی ہے اِن سے واسطی صاحب" سراج نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا تو ریہرسل شروع کر دیجئے۔ وقت بہت کم ہے"

اور جب ریہرسل کے بعد شیریں گھر کے لئے روانہ ہوئی تو وہ سراج کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اُس نے آج کے ریہرسل سے اندازہ لگایا تھا کہ سراج انور کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اچھا آرٹسٹ ہے... اِس کی آواز میں کشش ہے، اثر ہے... لوچ ہے اور سب سے بڑھ کر مکالموں کی ادائیگی میں حالات اور واقعات کی نزاکت کے مطابق حقیقی لب ولہجہ اور چہرے کے تاثرات... وہ سراج سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور اب اُسے سراج کے ساتھ اپنے برتاؤ پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ سارے راستے سراج کے متعلق سوچتی رہی۔ جب وہ گھر پہنچی اور ٹیلیفون پر نظر پڑی تو بے ساختہ "اجنبی" اُس کی زبان سے نکل گیا۔ اور اچانک گھنٹی بج اُٹھی۔

"Think of devil and devil is There" شیریں نے اِس اعتماد کے ساتھ ماؤتھ پیس میں کہا جیسے دوسری طرف اجنبی ہی ہو سکتا ہے۔

"چلو یہ تو آپ نے تسلیم کیا کہ اِس وقت آپ میرے متعلق سوچ رہی تھیں۔ ایک اجنبی کے لئے یہی کیا کم ہے"

"آخر آپ گفتگو کا مقصد کیوں نہیں بتاتے؟"

"لب ولہجہ بتا رہا ہے کہ آپ اِس وقت بے حد مسرور ہیں۔ شاید ڈرامے کا ریہرسل کامیاب رہا ہے اور مقصد کے متعلق عرض ہے کہ میں نے پہلی بار اپنی اُنگلی پانچ بار ڈائل پر گھمائی تھی۔ نمبر ذہن نشین کرتا گیا تھا اور دوسری طرف کنکشن آپ سے مِل گیا۔ بھلا اِس میں مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اگر آپ مجھ سے برہم ہیں تو لیجئے میں ٹیلیفون بند کئے دیتا ہوں" اور دوسری طرف خاموشی چھا گئی لیکن فون بند نہیں کیا گیا۔

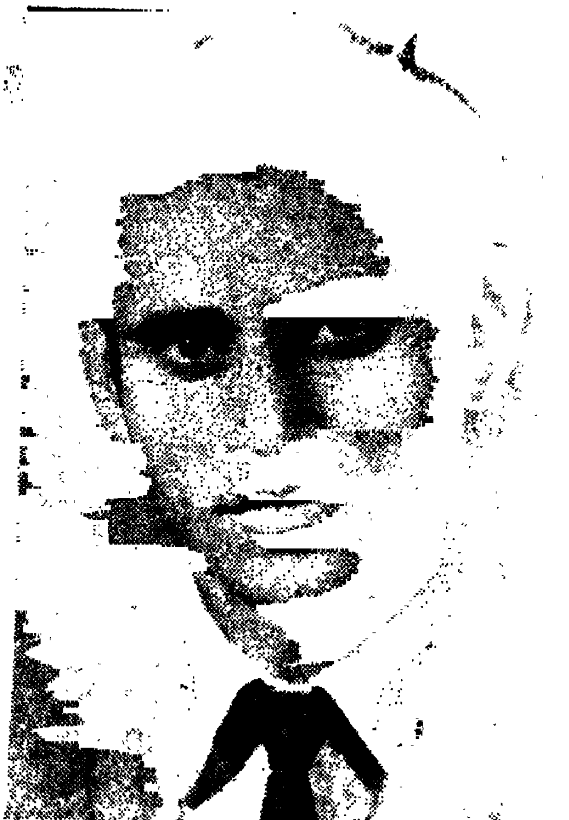
"اجنبی صاحب! میں نے آپ کو کبھی کسی مشاعرے میں نہیں سُنا" شیریں نے گفتگو کا سلسلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس کا دل چاہا تھا کہ وہ اجنبی سے باتیں کرے۔

"میں مشاعروں میں کبھی نہیں پڑھتا کیونکہ میں گلے باز نہیں ہوں۔ اور مشاعروں میں صرف وہی شاعر کامیاب ہوتے ہیں جو مترنم ہوں" اجنبی کی آواز میں محرومی کا درد تھا۔

"لیکن..."

"میں آپ کو پھر کبھی اپنا کلام سُناؤں گا۔ اِس وقت آپ چائے پیجئے کیونکہ ریہرسل کے باعث تھک گئی ہوں گی۔ اچھا بائی بائی!"

اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔



اُس کے بعد سارا دن اجنبی کا فون نہیں آیا۔ وہ سارے دن سراج اور اجنبی کے بارے میں سوچتی رہی۔ ٹیلیفون کی ہر گھنٹی پر وہ بے تابانہ ریسور اُٹھا کر آواز سُنتی اور مایوس ہو جاتی۔ اور پھر سراج اُس کے خیالوں کے دریچوں سے جھانکنے لگتا۔

دوسرے دن بھی کالج جانے تک اجنبی کے ٹیلیفون کا انتظار کرتی رہی لیکن اپریٹس (Apparatus) خاموش رہا۔ اُس نے کئی بار آنکھیں بند کر کے پانچ بار ڈائل پر اپنی اُنگلی کو حرکت دی اور جب غیر مانوس آواز سُنی تو رانگ نمبر کہہ کر ٹیلیفون بند کر دیا۔

اور جب وہ کالج جانے لگی تو چند لمحے دروازہ پر رُک کر ٹیلیفون کی طرف دیکھا۔ شاید وہ بج اُٹھے۔ لیکن ٹیلیفون اُس ستار کی طرح خاموش تھا جس کے سب تار ٹوٹ گئے ہوں۔ اور پھر ریہرسل کے لئے کالج روانہ ہو گئی۔ کالج گیٹ پر ایک اُلجھے اُلجھے بالوں والا نوجوان اُسے شریر آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے شیریں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ کہیں یہی تو وہ اجنبی نہیں؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُسے اپنا خیال بدل دینا پڑا کیونکہ اُس کے کسی ساتھی نے اُسے پرشوتم کہہ کر پکارا تھا اور وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی تھی۔ ریہرسل روم میں سراج کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا سگریٹ کے دھوئیں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

نگاہیں

بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اِس کے بعد کوئی انقلاب آ نہ سکا ———— سیماب اکبرآبادی

ہیں دو عالم کی نگاہیں اُس طرف
جس طرف اُن کی نگاہِ ناز ہے ———— شفق سیمابی

ساتھ اُن کے مری نگاہ گئی
جب نگہ تھک گئی تو آہ گئی ———— داغ

نگاہوں میں چلتے ہیں سب کام اُن کے
بہت سخت جن کی نگہبانیاں ہیں ———— نامعلوم

نگاہیں جانے شکلِ یا ڈنک کیا چیز لے آئیں
مجھے دردِ محبت کرکے میں نے دل میں رکھا ہے ———— خیال

مرسلہ:۔ ایس۔ ایس ہتکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

"آپ کب سے انتظار کر رہے ہیں؟" شیریں نے اپنا پرس میز پر رکھتے ہوئے دلآویز تبسم سے پوچھا۔

"کس کا انتظار...؟ آپ کا...؟" سراج نے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے سوال کیا۔

"ظاہر ہے ریہرسل ہم دونوں کو ہی کرنا ہے۔"

"دیکھئے یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ آیئے ریہرسل شروع کیا جائے۔"

"اوہ!" شیریں کی آواز میں زخم خوردہ دل کی کراہ تھی۔

اور جب وہ ریہرسل کے بعد گھر پہنچی تو بے حد تکان محسوس کر رہی تھی۔ اُس کا ذہن بھی پراگندہ تھا۔ اُس نے خود کو صوفے پر گرا دیا تھا۔ سراج اُس کے لئے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ اُلجھے اُلجھے خیالات، کسی گہری سوچ اور فکر میں ڈوبی ہوئی کھوئی ہوئی آنکھیں۔ بے ترتیب بال، پُرکشش خد و خال ———— شیریں نے محسوس کیا جیسے وہ اُسے بہت پہلے سے جانتی ہو۔ جیسے وہ اُس سے بارہا مِل چکی ہو۔ شیریں کا دل چاہتا تھا وہ سراج سے ڈرامے کے ریہرسل کے علاوہ بہت سی باتیں کرے۔ لیکن سراج نے اُسے موقع نہیں دیا۔ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی نے اُسے چونکا دیا۔ اُسی لمحہ اجنبی کے خیال نے اُس کے دل کے دروازے پر دستک دی۔ وہ تیزی سے اُٹھی اور ریسیور اُٹھاتے ہوئے بولی۔

"شیریں" اُس کی آواز پھولی ہوئی تھی۔ دل کی دھڑکن تیز تھی۔

"میں نے سُنا ہے کہ آج کل آپ انور کی بجائے کسی سراج کے ساتھ ناٹک رچا رہی ہیں... ناٹک وہی ہے صرف ہیرو بدل گیا ہے۔"

لیکن آپ اِن باتوں میں دلچسپی رکھنے والے کون ہیں؟ شیریں نے سخت لہجہ میں کہا۔

"جس سے پہلی بار ملاقات ہو وہ اجنبی کہلاتا ہے۔ اُس کے بعد کی ملاقاتوں میں وہ شناسا ہو جاتا ہے لیکن... میں ایک ہزار بار ملاقات کے بعد بھی اجنبی ہی رہوں گا... پھر میری دلچسپیوں سے آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جبکہ میں آپ کی دلچسپیوں میں سدِّراہ نہیں بن رہی ہوں" اجنبی کی آواز سنجیدہ تھی۔

"تو پھر آپ مجھے بور کیوں کرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ اِس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں بتاتی کہ آپ کی دلچسپیاں کس حد تک آپ کی تفریح کا باعث ہیں۔"

"تو پھر کسی دن چائے پر بُلا لیجئے... لیکن ایک شرط ہے۔ اُس دن سراج صاحب یا اور کوئی صاحب نہ ہوں۔ ورنہ آپ میری دلچسپیوں سے لُطف اندوز نہ ہو سکیں گی اور آپ کی چائے جوشاندہ ہو کر رہ جائے گی!"

"گستاخ! بدتمیز!!"

"یہ ٹیلیفون ہی پر آپ نے ریہرسل شروع کر دیا... لیکن میں سراج نہیں اجنبی ہوں... پھر بھی جواب سُن لیجئے ———— کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ———— گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا"

"آپ حد سے تجاوز کر رہے ہیں مسٹر!" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"تو پھر حد مقرر کر دیجئے نا!"

"میں آپ جیسے گستاخ اور بدزبان سے بات کرکے اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی" اُس نے برہمی کا اظہار کیا اور ٹیلیفون بند کر دیا۔

دوسرے دن ڈرامہ اسٹیج ہونے والا تھا۔ وہ کالج بہت جلد پہنچ گئی۔ کالج کی لڑکیوں نے اُسے گھیر لیا۔

"سُنا ہے سراج کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہو کر تم اُس کی طرف جھکتی جا رہی ہو" رضیہ نے شیریں کو چھیڑا۔

"لیکن فرہاد ۶۶ء کا کیا ہوگا؟" شگفتہ نے تشویش ظاہر کی۔

"بے چارہ انور..." شکنتلا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اگر غیرت مند ہوگا تو اپنے ہی آنسوؤں کی نہر میں غرق ہو جائے گا ورنہ کسی اور شیریں کا ہاتھ تھام کر ویرانہ آباد کر لے گا!" ڈرواتہ چہکی۔

اور شیریں اِن فقرے بازی سے گھبرا کر ریہرسل روم میں چلی گئی

ڈرامہ بے حد کامیاب رہا۔۔۔۔۔ حاضرین نے بے حد پسند کیا۔
بہترین اداکاری کے لئے پہلے انعام کی شیلڈ سراج کو دی گئی اور دوسرا انعام شیریں کو ملا۔ داد و تحسین اور تالیوں کے شور میں جب شیریں ڈرامہ ہال سے باہر آئی تو بہت سے کیمروں نے سراج کے ساتھ شیریں کے کئی فوٹوگراف لئے۔
وہ ہر مبارکباد کا اپنی دلآویز مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتی رہی۔
اور جب وہ گھر جانے لگی تو اُس نے سراج سے کہا۔
"اگر آپ کل صبح غریب خانے پر میرے ساتھ چائے پئیں تو مجھے مسرت ہوگی۔"
"کوشش کروں گا" سراج نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا۔
"جی نہیں وعدہ کیجئے!" شیریں نے اپنی بھرپور مُسکراہٹ کے ساتھ اصرار کیا۔
"اچھا وعدہ رہا!"
اور وہ مسرور و شاداں جب اپنے گھر پہنچی تو ٹیلیفون کی گھنٹی نے اُس کا خیر مقدم کیا۔
"کیا آپ ڈرامہ ہال میں مبارکباد نہیں دے سکتے تھے اجنبی صاحب!" شیریں نے رسیور اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"اوہ! تو آپ کو یقین تھا کہ اس وقت میں ہی آپ کو فون کر سکتا ہوں۔ زہے نصیب! اب رہا سوال مبارکباد دینے کا تو عرض ہے کہ میں نے وہاں گلا پھاڑ پھاڑ کر داد دی تھی لیکن آپ کی نظریں تو کسی اور کی طرف تھیں اور میری آواز دلواروں اور پردوں سے ٹکراتی رہی۔"
"اچھا تو اجنبی صاحب کل صبح یہاں آجایئے سراج صاحب بھی آرہے ہیں۔" شیریں گنگنائی۔
"مجھے افسوس ہے شیریں صاحبہ! میں سراج صاحب کی موجودگی میں نہ آسکوں گا۔ میں تنہائی میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی سوچئے بھلا سراج صاحب اور میں۔۔"
"آپ شکی مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ تنگ دل اور کوتاہ نظر بھی ہیں۔"
"کچھ بھی سمجھ لیجئے۔ پھر میں نے آپ کے ساتھ چائے پینے کی خواہش کب ظاہر کی تھی۔ میں آپ کی کامیاب اداکاری پر تجھے تجھے دل سے مبارکباد دینے کے بعد اتنا عرض کروں گا کہ اِس اداکاری کو قطعی ترک کر دیجئے۔ ورنہ آپ صرف اداکارہ بن جائیں گی۔۔"
"مشورہ کے لئے شکریہ! میں اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ اور کچھ کہنا ہے؟" شیریں نے خشک لہجے میں کہا۔ "شاید آپ میری کامیابی سے جل گئے ہیں۔"
"یوں ہی سمجھ لیجئے لیکن کبھی فرصت ہو تو میری حقیر رائے پر سنجیدگی سے غور کیجئے۔" اور اجنبی نے فون بند کر دیا۔

محفل

ہمیں اُٹھ گئے جب تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ جگرؔ مرادآبادی

اُٹھئے تو کہاں جایئے، جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر تری محفل سے تو دُنیا ہے نہ دیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ شہاب مجددی (علیگ)

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے۔۔۔۔۔۔۔ غالبؔ

رقیبوں کا تری محفل میں کیا کام
جہنم اِن سے بھر جائے تو اچھا۔۔۔۔۔۔۔ داغؔ

نہ وہ مُنکر خدا کے ہیں نہ جنت کے نہ دوزخ کے
یہ کیا کچھ دیکھ آئے تیری محفل دیکھنے والے۔۔۔۔۔۔۔ نامعلوم

مرسلہ:۔ ایس۔ ایس ہتکاری، ایم۔ اے کلکتہ

دوسرے دن سراج جب شیریں کے گھر گیا تو اُسے کمرے کے دروازے ہی پر پردے کے قریب رُک جانا پڑا۔ شیریں دروازے کی جانب پُشت کئے انور سے کہہ رہی تھی۔
"اے وہ سراج۔ وہ بھلا مجھ سے اچھی اداکاری کیسے کر سکتا ہے۔ میں نے تو پہلے ہی اُس کے ساتھ ڈرامے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن۔۔"
"لیکن بعد میں جب یہ علم ہوا کہ وہ مجھ سے ہر طرح اچھا اداکار ہے تو تم نے اُسے اپنی زندگی کے ڈرامے کا ہیرو تسلیم کر لیا!" انور کی آواز میں طنز کے تیز نشتر تھے۔
"یہ سراسر غلط ہے۔ تم مجھ پر الزام لگاتے ہو انور!" شیریں رو دینے والے انداز میں بولی۔
"تم سراج سے دلچسپی نہیں لے رہیں؟ وہ تمھیں پسند نہیں؟" انور نے سوالیہ نظریں اُس پر گاڑ دیں۔
"قطعی نہیں! وہ خود مجھ سے دلچسپی لے رہا ہے یہ اور بات ہے لیکن میں نے اُسے کبھی لفٹ نہیں دی۔"
اُسی لمحے سراج پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔
"شیریں صاحبہ درست فرما رہی ہیں انور صاحب! انھوں نے مجھے کبھی لفٹ نہیں دی۔ اور اِس وقت بھی چائے پر میں بن بُلائے آگیا ہوں!" سراج کے

[illegible]ں پہ تلخ مسکراہٹ تھی۔ شیریں حیرت زدہ اُسے اِس طرح گھور رہی تھی جیسے اُس کا آنا نہایت ناگوار گزرا ہو۔

"مِس شیریں! آپ نے مجھے اپنے گھر بُلاکر بیٹھنے کو کبھی نہیں کہا۔ اِس لئے میں [illegible]رہا ہوں" اور سراج تیزی سے باہر چلا گیا۔ شیریں کے مُنہ سے کچھ بھی نہ نکلا۔ وہ بے جان مُورتی کی طرح بیٹھی دیکھتی رہی۔

"شیریں!" کچھ دیر بعد انور نے کہا "تمھارے متعلق جو کچھ میں نے سُنا تھا وہ سچ ہی نکلا۔ میرے کچھ دن باہر رہنے پر ظاہری پردے اُٹھ گئے۔ اِس لئے اب مجھے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر کوئی افسوس نہ ہوگا" اور انور بھی شیریں کے جواب کا انتظار کئے بغیر باہر چلا گیا۔

شیریں میز پر اپنا سر رکھ کر سِسکنے لگی۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر ساری کے آنچل اور میز پوش کو بھگو رہے تھے۔ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی وقت کی بھیروی الاپنے لگی۔

"فرمایئے!" سِسکیوں کے درمیان وہ بولی۔

"کسی ڈرامے کا ریہرسل کر رہی ہیں یا واقعی آپ اِس وقت اُداس اور غمگین ہیں؟"

"اجنبی! تم بھی میرے زخموں پر نمک پاشی کرنا چاہتے ہو تو اُڑا لو میری ناکامیوں اور شکستوں کا مذاق!"

"ایسا نہیں ہے شیریں صاحبہ! آپ نے مجھے سمجھا ہی نہیں ورنہ میں تو آپ کا ہمدرد ہوں"

"اس زمانے میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں اجنبی! مجھے اپنی قسمت پر آنسو بہانے دو"

"اچھا پھر کسی وقت رِنگ کروں گا۔ اِس وقت تمھیں تنہائی کی ضرورت ہے"

"سُنئے!" وہ جلدی سے بولی "کیا تم یہاں آسکتے ہو۔ ابھی اِسی وقت؟"

"وعدہ کیجئے کہ وہاں آنے پر میری گستاخیوں کی سزا تو نہ دی جائے گی"

"نہیں اجنبی تم آجاؤ۔ اِس وقت میں بے حد اُداس ہوں۔ اِس وقت اجنبی، تم مجھے اجنبی محسوس نہیں ہو رہے ہو"

"اچھا انتظار کیجئے میں ابھی آرہا ہوں۔ لیکن سراج تو وہاں نہ ہوں گے؟"

"نہیں" وہ بولی "اب وہ یہاں نہیں آسکتے"

اور پھر اُس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

وہ اجنبی کے انتظار میں ٹہلنے لگی۔ کبھی کبھی دروازے پر بھی آکر کھڑی ہو جاتی۔

کچھ دیر بعد اُس نے دیکھا سراج اپنے ہاتھوں میں ڈرامے میں ملی ہوئی شیلڈ لئے کھڑا تھا۔

"آپ پھر آگئے؟" وہ سخت لہجے میں بولی "چلے جایئے یہاں سے فوراً۔ میں آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی!"

"یہ شیلڈ۔۔"

"میں کچھ سُننا نہیں چاہتی۔ آپ یہاں سے چلے جایئے!" وہ گرج کر بولی۔

اور سراج شیلڈ لئے واپس چلا گیا۔

شیریں بے تابی سے اجنبی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اُس کی آواز سے وہ اجنبی کے چہرے کے نقوش اپنے تصوّرات کے پردے پر اُتار رہی تھی! اب تک اُس نے اجنبی کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن وہ ٹیلیفون پر اُس کی گفتگو سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ وہ اجنبی سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ اور اِسی طرح پندرہ منٹ بیت گئے۔ وہ دروازے پر کھڑی ہوئی اُس کا انتظار کرنے لگی۔ اچانک کمرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔

"ہلو!" اُس کے مُنہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔

"مِس شیریں!" اجنبی کی غم میں ڈوبی ہوئی آواز سُنائی دی "میں آپ کے پاس آہی رہا تھا کہ والد صاحب کا تار آگیا۔ چھوٹی بہن کی حالت تشویشناک حد تک نازک ہے اِس لئے میں ابھی اجمیر جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد ٹرین جے پور ریلوے پلیٹ فارم چھوڑ دے گی۔۔۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو اسٹیشن پر آکر مل لیں" اجنبی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں ضرور ملوں گی اسٹیشن پر!" اُس کی آواز مایوسیوں میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن اُس کے لہجے میں عزم کی پختگی تھی۔

"لیکن" وہ پھر بولی "میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟"

"میرے ہاتھ میں سُرخ گلاب کا پھول ہوگا۔ اور میں آپ کو بخوبی پہچانتا ہوں"

اور جب شیریں پلیٹ فارم پر پہنچی تو گاڑی روانہ ہونے میں پانچ ہی منٹ باقی تھے۔ وہ اجنبی کو تلاش کر رہی تھی لیکن سُرخ گلاب والا اجنبی اُسے نظر نہ آیا۔ وہ مسافروں کی بھیڑ میں سُرخ گلاب تلاش کر رہی تھی۔ یکایک گاڑی نے سیٹی دے دی۔

"مِس شیریں!" کسی نے اُسے پیچھے سے آواز دی۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ سراج کھڑا مُسکرا رہا تھا۔

"تم یہاں بھی آگئے؟" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ "مجھے برباد کر کے میری زندگی تباہ کر کے تمھیں کیا ملے گا۔ چلے جاؤ میرے قریب سے۔ میری نظروں سے دُور ہو جاؤ!"

اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ٹرین رینگنے لگی لیکن اجنبی نہ ملا۔ سراج شیریں کے پاس سے گزرا اور اُس کے ہاتھ میں سُرخ گلاب تھما تا ہوا ایک کمپارٹمنٹ میں چڑھ گیا۔

"مِس شیریں!" سراج کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑا کہہ رہا تھا: "اب تمھیں وہ صورت نظر نہ آئے گی جس سے تمھیں نفرت ہے۔ کیونکہ سراج تمھارے شہر سے پورے جا رہا ہے۔ اور نہ ٹیلیفون پر وہ آواز سُن سکوگی جو تمھیں ہر وقت بور کرتی رہتی تھی۔ اس لئے کہ اُس اجنبی کی آواز سراج کے ساتھ جا رہی ہے! خدا حافظ!!"

شیریں پہلی بار سراج کی زبان سے اجنبی کی آواز سُن کر متحیّر رہ گئی۔ ٹرین کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔

"سراج اجنبی!" شیریں بے اختیار چیخ اُٹھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ ڈھانپ کر سِسکنے لگی۔ جب اُس نے نمناک آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا تو ٹرین بہت دُور جا چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر وہ تنہا کھڑی تھی۔ اُس راہی کی طرح جو منزل کی جستجو میں منزل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہو اور اب سوچ رہا ہو کہ کہاں جائے... کس طرف جائے...؟ ہر طرف صرف راستہ ہی راستہ ہے! اجنبی راستہ!!

مثلث

رشمی پٹیالوی

جن کے جلووں سے ہر سمت تھی روشنی   اُن کے جاتے ہی کیا ہوگئی
ہم پُکارا کئے روشنی روشنی

خود نظر، بار ہو جائے گی دید پر   اور کچھ دن اگر وہ نہ
میری آنکھوں سے چھن جائیگی روشنی

حق پرستی کے حق میں اندھیرا ہوا   ظُلمتِ کفر میں اور اضافہ
جس طرف کو بڑھی یہ نئی روشنی

جلوہ افروز ہے لاکھ نُورِ سحر   سب کو تسلیم کرنا پڑا ہے مگر
دُور ہے روشنی سے ابھی روشنی

یہ دلیل آپ کے مُنہ چھُپانے کی ہے   اُجڑی اُجڑی سی ہر پھیکی پھیکی سی ہے
ماہ کی چاندنی، مہر کی روشنی

دُور ہونے پہ بھی پاس آتے گئے   وہ کچھ ایسے نظر میں سماتے گئے
دل میں گویا اُترتی گئی روشنی

حُسن کی جلوہ فرمائیاں دیکھ کر   بول اُٹھے یک زباں ہو کے اہلِ نظر
روشنی، روشنی، روشنی، روشنی

اُن کی نظروں سے نظریں مِلاؤ ذرا   اُن کے جلووں پہ ایمان لاؤ ذرا
اے رشمی دل میں ہوجائیگی روشنی

ب خوشتہ صاحب تسلیم

…یار "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں۔ اِس افسانے میں …ف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا...

— شہناز ہاشمی

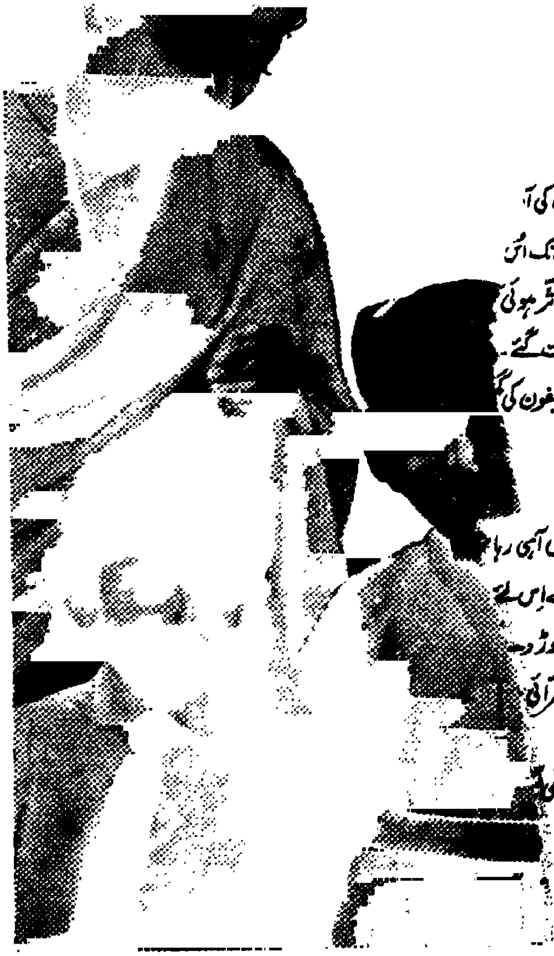
بھرا رہتا تھا۔ اُن پریشانیوں کی ذمّے دار ہمیشہ کوئی نہ کوئی عورت ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت فکر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن یہ اندازِ فکر اور اندازِ بے نیازی ایسے ہتھیار تھے جن کے ذریعے وہ صنفِ نازک کی ہمدردی حاصل کرتا تھا۔ عورت اُس کی زندگی کی سب سے اشد ضرورت اور سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اکثر کلاس میں لیکچر دیتے دیتے اُسے عورت کا خیال آجاتا تو اُس کا جسم کانپنے لگتا اور الفاظ بے ترتیب کاغذوں کی طرح بکھرنے لگتے اور وہ یکایک گھڑی دیکھ کر کسی ضروری میٹنگ کا بہانہ کر کے لیکچر ختم کر دیتا۔ عورت اُس کے اعصاب پر سوار تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا اُس کے اندر ایک ایسی حریص روح تڑپ رہی ہے جس کی پیاس کسی صورت نہ مٹ سکتی ہو۔

جو لڑکی ابھی پروفیسر کے پاس سے اُٹھ کر گئی تھی اُس کی زندگی کی ساتویں لڑکی تھی۔ ویسے تو اُس کی زندگی میں اب تک ایک سو ساٹھ لڑکیاں آچکی تھیں لیکن اُن سب سے اُس کی ملاقات ایک گھنٹہ سے لے کر چوبیس گھنٹے تک رہی تھی۔ اِس کے بعد وہ انھیں بالکل بھول جاتا تھا۔ صرف چھ لڑکیاں ایسی تھیں جن کی دوستی کا عرصہ چھ مہینے تک پھیل گیا تھا اور جنھوں نے اُس کے دماغ پر عارضی طور پر تھوڑا بہت اثر چھوڑا تھا۔ لیکن یہ ساتویں لڑکی بھی عجیب تھی کہ پروفیسر کو اِس سے ملتے ہوئے پانچ سال ہو چُکے تھے لیکن ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ تھا۔

"یہ چُڑیل کسی طرح قابو میں نہیں آتی!"

پروفیسر غصّے سے بے قابو ہو کر جلتا ہوا سگریٹ پھینک کر اپنے آپ سے کہتا۔

روز شام کو پروفیسر سیاہ سُوٹ، سُرخ ٹائی اور سیاہ جوتوں سے آراستہ ہو کر اُس



بھیرو باہر چلا گیا۔

شیریں میز پر اپنا سر رکھ کر سسکنے لگی۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر ساری کے آنچل اور میز پوش کو بھگو رہے تھے۔ یکایک ٹیلیفون کی گھنٹی وقت کی بھیرویں الاپنے لگی۔

"فرمایئے!" سسکیوں کے درمیان وہ بولی۔

"کسی ڈرامے کا ریہرسل کر رہی ہیں یا واقعی آپ اِس وقت اُداس اور غمگین ہیں؟"

"اجنبی! تم بھی میرے زخموں پر نمک پاشی کرنا چاہتے ہو تو اُڑا لو میری ناکامیوں اور شکستوں کا مذاق!"

"ایسا نہیں ہے شیریں صاحبہ! آپ نے مجھے سمجھا ہی نہیں ورنہ میں تو آپ کا ہمدرد ہوں۔"

"اِس زمانے میں کوئی کسی کا ہمدرد نہیں اجنبی! مجھے اپنی قسمت پر آنسو بہانے دو۔"

"اچھا پھر کسی وقت رِنگ کروں گا۔ اِس وقت تمھیں تنہائی کی ضرورت ہے۔"

"سُنئے!" وہ جلدی سے بولی "کیا تم یہاں آسکتے ہو۔ ابھی اِسی وقت؟"

"وعدہ کیجئے کہ وہاں آنے پر میری گستاخیوں کی سزا تو نہ دی جائے گی۔"

"نہیں اجنبی تم آجاؤ۔ اِس وقت میں بے حد اُداس ہوں۔ اِس وقت اجنبی، تم مجھے اجنبی محسوس نہیں ہو رہے ہو۔"

"اچھا انتظار کیجئے میں ابھی آرہا ہوں۔ لیکن سراج تو وہاں نہ ہوں گے؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "اب وہ یہاں نہیں آسکتے۔"

اور پھر اُس نے ٹیلیفون بند کر دیا۔

وہ اجنبی کے انتظار میں ٹہلنے لگی۔ کبھی کبھی دروازے پر بھی آکر کھڑی ہو جاتی۔

افسانہ

ساتویں لڑکی

شہناز ہاشمی۔ ایم، اے

۶۔ شبلی روڈ۔ علی گڑھ

۲۷ جون ۱۹۶۶ء جناب خوشتر صاحب تسلیم

"ساتویں لڑکی" کے ساتھ پہلی بار "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں۔ اس افسانے میں عورت اور مرد کی نفسیات کے فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا . . .

شہناز ہاشمی

سیاہ فام پروفیسر چارمینار سگریٹ کا ایک کش لے کر سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کو روایتی انداز کی نیم باز آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ یہ لڑکی کئی سال ہوئے تعلیم سے فارغ ہو کر یونیورسٹی میں لیکچرر ہو چکی تھی اور یونیورسٹی کے باذوق اور پڑھے لکھے طبقے میں خاصی مقبول تھی۔ ہر شخص اُس سے بات کرنے کا خواہش مند رہتا لیکن وہ سب سے الگ تھلگ اپنے کام میں مشغول رہتی۔ سوشیالوجی کا چالیس سالہ ہونہار پروفیسر آج کل اُس لڑکی کی شخصیت پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے مواد جمع کر رہا تھا لیکن شخصیت سے زیادہ وہ اُس کے خط و خال کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ لڑکی پروفیسر کی نگاہوں کی تاب نہ لاکر اُٹھ کھڑی ہوئی اور سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے معذرت کر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

سوشیالوجی کا سیاہ فام پروفیسر عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ ایک طرف تو اُس کی رنگین طبیعت ہر خوش رنگ اور خوشبودار چیز کو دیکھ کر مچل اُٹھتی تھی۔ دوسری طرف سیاہ رنگ اُس کا پسندیدہ رنگ تھا۔ وہ ہمیشہ سیاہ سُوٹ پہنتا اور اور اُس کے سیاہ نوکیلے جوتے چمکتے رہتے تھے۔ وہ پستہ قد تھا اِس لئے ایک اِنچ اونچی ایڑی کے جوتے پہنتا تھا اور یہ جوتے اُس کے دراز قامت دوستوں کی محفل میں اکثر چھیڑ چھاڑ کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ اُس کے رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی اور آنکھیں چھوٹی اور چمکیلی تھیں۔ اُس کے موٹے موٹے ہونٹوں میں ہر وقت ایک سگریٹ دبا رہتا تھا۔

اِس حلیے کے ساتھ پروفیسر کا دماغ طرح طرح کی اُلجھنوں اور پریشانیوں سے بھرا رہتا تھا۔ اُن پریشانیوں کی ذمے دار ہمیشہ کوئی نہ کوئی عورت ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت فکر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن یہ اندازِ فکر اور اندازِ بے نیازی ایسے ہتھیار تھے جن کے ذریعے وہ صنفِ نازک کی ہمدردی حاصل کرتا تھا۔ عورت اُس کی زندگی کی سب سے اشد ضرورت اور سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اکثر کلاس میں لیکچر دیتے دیتے اُسے عورت کا خیال آجاتا تو اُس کا جسم کانپنے لگتا اور الفاظ بے ترتیب کاغذوں کی طرح بکھرنے لگتے اور وہ یکایک گھڑی دیکھ کر کسی ضروری میٹنگ کا بہانہ کر کے لیکچر ختم کر دیتا۔ عورت اُس کے اعصاب پر سوار تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا اُس کے اندر ایک ایسی حریص روح تڑپ رہی ہے جس کی پیاس کسی صورت نہ مٹ سکتی ہو۔

جو لڑکی ابھی پروفیسر کے پاس سے اُٹھ کر گئی تھی اُس کی زندگی کی ساتویں لڑکی تھی۔ ویسے تو اُس کی زندگی میں اب تک ایک سو ساٹھ لڑکیاں آچکی تھیں لیکن اُن سب سے اُس کی ملاقات ایک گھنٹہ سے لے کر چوبیس گھنٹے تک رہی تھی۔ اِس کے بعد وہ اُنھیں بالکل بھول جاتا تھا۔ صرف چھ لڑکیاں ایسی تھیں جن کی دوستی کا عرصہ چھ مہینے تک پھیل گیا تھا اور جنھوں نے اُس کے دماغ پر عارضی طور پر تھوڑا بہت اثر چھوڑا تھا۔ لیکن یہ ساتویں لڑکی بھی عجیب تھی کہ پروفیسر کو اِس سے ملتے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے لیکن ہنوز روزِ اوّل والا معاملہ تھا۔

"یہ چڑیل کسی طرح قابو میں نہیں آتی!"

پروفیسر غصّے سے بے قابو ہو کر جلتا ہوا سگریٹ پھینک کر اپنے آپ سے کہتا۔

روز شام کو پروفیسر سیاہ سُوٹ، سُرخ ٹائی اور سیاہ جوتوں سے آراستہ ہو کر اُس

ساتویں لڑکی کے گھر [illegible] دیتا لیکن لڑکی کا انداز بے نیازی پروفیسر کے انداز بے نیازی سے بڑھ چڑھ [illegible]۔ وہ ہر وقت اپنے خیالات میں کھوئی رہتی۔ پروفیسر کو یہ کھویا کھویا انداز ناگوار بھی معلوم ہوتا اور خوشگوار بھی۔ ساتویں لڑکی ایک پہیلی بنی ہوئی تھی اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کس طرح کی لڑکیوں میں شمار کرے۔ شریف یا غیر شریف، سرد یا گرم، خشک یا دلچسپ، سنجیدہ یا شوخ؟ غرض اِس پہیلی کو حل کرنے میں پروفیسر ہر روز دو سو سگریٹ پھونکتا اور مییں بیر کی بوتلیں چڑھانے کے بعد بھی جہاں سے چلا تھا وہیں رہتا اور ساتویں لڑکی کے دماغ تک رسائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی۔ ساتویں لڑکی پروفیسر سے ہر موضوع پر اطمینان سے گفتگو کرتی لیکن جیسے ہی پروفیسر اُس کی شخصیت کے تاروں کو چھونا چاہتا وہ فوراً پہلو بدل کر کوئی دوسرا ذکر چھیڑ دیتی یا کسی کام کا بہانہ کر کے کمرے سے باہر چلی جاتی۔

- بُرائی کو بھلائی سے رفع کرو۔ (قرآن پاک)
- ایمان والو اپنے معاہدات پُورے کرو۔ (قرآن پاک)
- زمین پر اترا کر نہ چلو۔ (قرآن پاک)
- جس نے خاموشی اختیار کی وہ سلامت رہا جس نے سلامتی پائی اُس نے نجات پائی۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جو خدا سے محبت کا مدعی ہے اور اُسے اپنے بھائی سے نفرت ہے، وہ اپنے دعویٰ میں سچا نہیں۔ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام)
- جب لوگوں کی نیتیں فاسد ہو جاتی ہیں تو دُنیا سے برکتیں اُٹھ جاتی ہیں۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)

زندگی میں پہلی بار پروفیسر کے دل میں یہ احساس پیدا ہو رہا تھا کہ عورت محض کھیلنے کی چیز نہیں۔ سمجھنے اور پرکھنے کی چیز بھی ہے لیکن یہ ساتویں لڑکی تو ایک ایسا تجربہ بن گئی تھی جس نے پروفیسر کے برسوں کے مشاہدے اور تجربے کو شکست دے دی تھی۔ اُس کے دل میں ساتویں لڑکی کے لئے کبھی احترام، کبھی حیرت اور کبھی محبت کے جذبات پیدا ہوتے۔

"محبت!"

اِس جذبے کا خیال آتے ہی پروفیسر چونک پڑا اور اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس نے طے کر لیا تھا اب محبت کا نقشہ جما کر اُس لڑکی کے قریب آنے کی کوشش کی جائے گی کیونکہ اُسے سالہا سال کے تجربے نے سکھایا تھا کہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری محبت ہے۔

شام کو حسبِ معمول وہ ساتویں لڑکی کے گھر پہنچا۔ وہ چھوٹے سے خانہ باغ میں تنہا بیٹھی تھی۔ سامنے ایک کتاب کھلی ہوئی تھی لیکن نگاہیں بادلوں سے اُلجھ گئی تھیں۔ اُن کی نیلاہٹ میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ پروفیسر اُس کے سامنے بیٹھ کر بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا۔

"میں نے تم جیسی عورت آج تک نہیں دیکھی۔ میرا ایک آئیڈیل تھا جس پر تم پُوری اُترتی ہو۔ تمھاری آنکھیں، تمھارے ہونٹ مجھے مسحور کر دیتے ہیں۔ تمھاری صورت میرے دل میں اُترتی جاتی ہے اور مجھے تم سے بے انتہا محبت ہو گئی ہے۔"

ساتویں لڑکی چونک پڑی۔ اُس کے چہرے پر سُرخی کی ایک لہر آئی اور کتاب بند کر کے وہ غور سے سامنے بیٹھے ہوئے اُس انسان کو دیکھنے لگی جس کی تصویر بادلوں میں کہیں نظر نہ آتی تھی لیکن اِس مرتبہ لڑکی نے موضوع بدلا نہ کام کا بہانہ کر کے بھاگنے کا قصد کیا، خاموشی سے سنتی جا رہی تھی۔ پروفیسر بولے جا رہا تھا۔

"مجھے کبھی کسی سے محبت نہیں ہوئی لیکن تم پہلے دن سے میرے دل و دماغ میں سما گئی ہو۔ تم پہلی عورت ہو جس سے میں نے محبت کی ہے۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا! میں بہت اُداس ہوں اور اِس دُنیا میں بالکل تنہا! میں نے بہت مصیبت جھیل کر اپنی زندگی بنائی ہے۔ اِس زندگی میں دُنیاوی کامیابی تو بہت ملی لیکن ذہنی سکون اور سچی خوشی کبھی نہ ملی۔ میری بے چین روح کو تمھاری، صرف تمھاری ضرورت ہے۔ تم مجھے سب کچھ دے سکتی ہو۔ تمھارا ساتھ ہو جائے تو زندگی کا لطف آجائے۔"

اِس تقریر کے بعد پروفیسر کو ایک سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوئی اور لڑکی اُس موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں!" پروفیسر نے ہمت کر کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اِس وقت تمھیں کہیں نہ جانے دوں گا۔ تمھیں میری بات کا جواب دینا پڑے گا!"

لڑکی بیٹھ گئی اور آہستہ سے بولی۔

"اِس وقت آپ اِتنے جوش میں ہیں کہ آپ سے کوئی سنجیدہ گفتگو نہیں ہو سکتی۔ پھر کبھی سہی۔"

"تم ہمیشہ پھر کبھی کہتی ہو۔" پروفیسر جھنجلانے لگا۔ "کیا تمھیں مجھ سے اِتنی نفرت ہے۔ تم مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتیں؟ مجھے غلط نہ سمجھنا۔ میں تمھیں کبھی دھوکا نہ دوں گا۔"

"لیکن مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت تو دیجئے۔" لڑکی نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔

"اور کتنا وقت چاہئے؟ پانچ سال سے ایک ہی بات کہہ رہا ہوں۔ اب تو حضور چھتا بن چل رہا ہے! میرے سامنے سینکڑوں لڑکیاں آتی ہیں لیکن میں کسی

کو گماس نہیں ڈالتا۔ ہر وقت تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ تمہارے بغیر ایک لمحہ چین نہیں۔ دن رات میں جو کچھ سکون ملتا ہے بس اتنی دیر جتنی دیر تمہارے پاس بیٹھتا ہوں! تمھیں اپنے دل کی بات بتا دی تو اُس کا تم نے یہ انعام دیا کہ بات ہی ختم کردی۔"

اِس وقفے میں لڑکی پروفیسر کی طرف دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

"آدمی تو ایسا بُرا نہیں۔ سیاہ فام ہے لیکن سیاہ قلب نہیں۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ ہونٹ موٹے ہیں مگر اُن کے اوپر چھوٹی چھوٹی مونچھیں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔"

یہ سوچتے سوچتے لڑکی بے خیالی میں مُسکرانے لگی اور پروفیسر بھی اپنی خفگی بھُول کر مُسکرانے لگا۔ لڑکی نے پھر سوچا۔

"اِس شخص کی ہنسی کتنی اچھی ہے۔ بہت صاف سُتھری اور دلکش۔ لیکن یہ اتنا کم کیوں ہنستا ہے؟ کیا یہ سچ مچ تنہائی اور اُداسی کا شکار ہے؟ پھر کیوں نہ میں اِس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دوں تاکہ یہ ہر وقت ہنستا رہے۔"

ساتویں لڑکی نے یکایک پروفیسر سے کہا۔

"آپ نے بات ادھوری ہی رکھی۔ پوری بات تو کیجئے۔ یہ تو کہئے ——— میں تمہاری یاد میں ساری رات تارے شماری کرتا ہوں۔ چار مینار کے تمباکو سے اپنا کلیجہ جلاتا ہوں۔ جلتے سگریٹوں سے تکیے جلاتا ہوں اور تمہارے خیال میں کھو کر گلاس ہاتھ سے چھُوٹ جاتا ہے تو بستر پر بیئر کی بارش کرکے، گریباں چاک کرکے چاندنی رات میں سڑک پر نکل جاتا ہوں۔ میرا کتا بھونکتا ہے تو لیلیٰ کا کتا سمجھ کر اُس کا مُنہ سہلاتا ہوں اور۔ ۔"

"بس بس!" پروفیسر نے تنگ آکر کہا۔ "آپ میرے جذبات کی توہین کر رہی ہیں۔"

اب ساتویں لڑکی نے موضوع بدل کر دو چار اوٹ پٹانگ باتیں اُڑائیں جنھیں سُن کر پروفیسر بے اختیار ہنسنے لگا اور لڑکی اُس کی ہنسی کی دلکشی میں کھو گئی۔ پروفیسر کی مخالفت میں کہی ہوئی ساری باتیں اُسے غلط معلوم ہونے لگیں۔ وہ اپنی اتنی طویل بے رُخی اور بے حسی پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی اور پروفیسر کی آنکھوں کی روشنی میں اپنے دل کا افسانہ پڑھنے لگی۔

باغ میں تاریکی پھیلنے لگی تھی اور بارش کے آثار بھی تھے اِس لئے دونوں اُٹھ کر کمرے میں چلے آئے۔ لڑکی نے ایک بار پھر پروفیسر کی طرف دیکھا اور اب وہ اور بھی اچھا معلوم ہوا۔

کتنے صاف دل کا انسان ہے یہ! کتنا سچا اور نیک! اور میری کتنی عزت کرتا ہے ایسا مخلص اور ہمدرد دوست اِس دُنیا میں کہاں ملتا ہے۔ مجھے اِس کے بارے میں اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ کیوں میں اب تک اِتنے اچھے انسان سے تغافل برتتی رہی؟ آخر کیوں؟"

خیالات کا سلسلہ جاری تھا کہ اُس کے دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلی۔

"کاش یہ انسان ہمیشہ خوش رہے!"

پروفیسر ایک چلتا پُرزہ تھا، سب کچھ بھانپ گیا۔ آج اُس نے بڑا معرکہ سر کر لیا تھا۔ اُس نے فاتحانہ انداز سے اپنی ٹائی کی گرہ پر ہاتھ پھیرا، گھڑی پر نظر ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"باقی آئندہ!" کہہ کر مُسکراتا ہوا چلا گیا۔

اِس کے بعد وہی ہوا جو ہر کہانی میں ہوتا ہے لیکن ایک کہانی دوسری سے کچھ مختلف بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر اور ساتویں لڑکی کی ملاقاتیں زیادہ طویل ہونے لگیں۔ اب لڑکی کی باری تھی کہ وہ ہر وقت اُسی "اچھے انسان" کے خیال میں کھوئی رہے۔

- جو شخص تمہاری خوشیوں میں شریک ہوتا ہے لیکن تکلیفوں میں ساتھ نہیں دیتا وہ جنت کی سات کُنجیوں میں سے ایک کُنجی کھو بیٹھتا ہے۔

(سوامی سارشبدانند جی)

- اولاد، روٹی، کپڑے، روزی اور اقتدار کی بھُوک کی خاطر نہ جانے انسان کیا کیا کرتا ہے لیکن روح کی بھُوک کی خاطر کچھ نہیں کرتا۔

(سوامی سارشبدانند جی)

- جب ہر تصویر اپنے مصوّر کی عظمتوں کا آئینہ ہوتی ہے تو پھر کائنات بنانے والا کتنا عظیم ہے۔ (سوامی سارشبدانند جی)

- جب ہم کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو طاقت خود ہی آجاتی ہے۔ (پریم چند)

اُدھر پروفیسر اِس فکر میں مبتلا تھا کہ یہ بات تو پُرانی ہوئی۔ اِس لئے اب اپنی زندگی کی ایک سو باسٹھ ویں یا آٹھویں لڑکی پر نظر ڈالی جائے۔ اُس نے یہ کام شروع بھی کر دیا تھا۔ یوں تو اُس کے دفتر کے کمرے میں ہر وقت چار پانچ لڑکیاں بیٹھی رہتی تھیں اور کافی کے تلخ گھونٹوں کے درمیان شیریں گفتگو چلتی رہتی تھی لیکن آج کل ایک لڑکی اُس کے پاس زیادہ بیٹھنے لگی تھی۔ یہ پروفیسر کی نگرانی میں ایک طویل مقالہ لکھ رہی تھی جس کی کامیابی کے لئے پروفیسر سے دوستی ضروری تھی۔ یہ لڑکی بھی پروفیسر کی طرح پستہ قامت تھی اور چُست شلوار اور چُست ترین قمیص پہنتی تھی۔ برائے نام ایک دوپٹہ گلے میں پڑا رہتا تھا۔ شاید اِس لڑکی کو ڈیپارٹمنٹ میں کوئی کام

تھا کیونکہ وہ صبح نو بجے ... سے پانچ بجے تک پروفیسر کے کمرے میں اُس کے دائیں ... والی کرسی پر بیٹھی زیرِ لب مُسکراتی رہتی تھی۔ دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد پروفیسر اُسے گھر تک پہنچانے جاتا اور راستے میں اُس کی چُست قمیص اور زیرِ لب مُسکراہٹ کی تعریف بھی کرتا رہتا۔

پروفیسر کی نگاہ کئی مہینے پہلے اُس لڑکی پر پڑ چکی تھی لیکن برا ہو اُس کمبخت منحوس ساتویں لڑکی کا جس کی پُراسرار شخصیت کے تانے بانے میں اُلجھ کر پروفیسر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا لیکن اِس آٹھویں لڑکی نے اپنا سارا وقت پروفیسر کو دے کر اپنی جگہ بنالی تھی۔ داسی اپنے مالک کے قدموں میں گر چکی تھی اور اِس بات سے پروفیسر کی انا کو بہت تسکین ملتی تھی۔ اب کچھ کہنے سُننے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی پھر بھی پروفیسر اپنی عادت سے مجبور تھا اور آخر کار ایک دن اُس نے پھر وہی آزمودہ نسخہ استعمال کیا اور آٹھویں لڑکی کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

"میں نے تم جیسی عورت آج تک نہیں دیکھی۔ تم میرے آئیڈیل پر پوری اُترتی ہو۔ میں بہت اُداس اور تنہا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے محبت ہے۔"

لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ اگرچہ یہی الفاظ پروفیسر گذشتہ بیس سال میں ایک سو باسٹھ بار دُہرا چکا تھا لیکن آج یہی الفاظ کہتے ہوئے اُس کے دل میں درد اُٹھا اور زبان لڑکھڑا گئی ـــــ کیا اُس ظالم ساتویں لڑکی کا سحر اب بھی قائم تھا؟ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ ساحرہ اُس کی روح میں سمائی ہوئی تھی اور اُس کے جادو کا توڑ اِس زندگی میں ممکن نہ تھا!!

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ "رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۲" لکھنا کافی ہے۔ منیجر

غزلیں

بسمل کپور تھلوی

غمِ فرقت دور کو ہنس ہنس کے گزارا ہم نے
عمرِ رفتہ کو بھی سو بار پکارا ہم نے

اپنے جذبات کو اشکوں سے نمایاں نہ کیا
کر لیا یہ بھی ترے غم میں گوارا ہم نے

آج تک زیست مسرت سے گریزاں ہی رہی
غم کے چہرے کو بہ ہر طور سنوارا ہم نے

تیری ہلکی سی توجہ کا سہارا لے کر
آج ہر نقشِ تمنا کو اُبھارا ہم نے

وہی اُلجھن ہے وہی غم ہے ابھی تک اے دوست
بارہا گیسوئے دوراں کو سنوارا ہم نے

کچھ مداوا نہ ہوا جب غمِ تنہائی کا
شب کے سناٹے میں پھر تم کو پکارا ہم نے

زندگی پائی ہے طوفانِ بلا میں رہ کر
کر لیا راحتِ ساحل سے کنارا ہم نے

لالہ زاروں پہ بھی احسان ہے اپنا بسمل
خونِ دل سے رُخِ گلشن کو نکھارا ہم نے

سید حباب ترمذی

جہاں خلوص کا فقدان پا رہا ہوں میں
محبتوں کے خزانے لُٹا رہا ہوں میں

غمِ حبیب میں آنسو بہا رہا ہوں میں
لگی ہے آگ جو دل میں بُجھا رہا ہوں میں

ہجومِ درد میں بھی مُسکرا رہا ہوں میں
حیاتِ عشق کو رنگیں بنا رہا ہوں میں

شبِ فراق غزل خواں ہیں دھڑکنیں دل کی
نہ ہے نصیب اُنھیں یاد آ رہا ہوں میں

مآلِ زندگیٔ مختصر یہی تو نہیں
برنگِ شمعِ سحر جھلملا رہا ہوں میں

کسی کی آمدِ رنگیں کا خیر مقدم ہے
تصورات کی محفل سجا رہا ہوں میں

غمِ فراق اگرچہ ہے جاں گُسل لیکن
یہ بارِ دوشِ وفا پر اُٹھا رہا ہوں میں

مقامِ دیدہ و دل بے مقام ہے شاید
ورائے دیر و حرم اُن کو پا رہا ہوں میں

ازل سے مجھ کو ملا ہے حباب ذوقِ سلیم
خلوصِ فکر کے دریا بہا رہا ہوں میں

طنزیہ

مُلازمت کی تلاش

وجاہت علی سندیلوی۔ بی، اے۔ ایل، ایل، بی

نصرت منزل۔ سندیلہ (اُتر پردیش)

۱۸ر جولائی ۶۶ء مکرمی و محترمی خوشتر صاحب اخلاص و نیاز

"گیہوں کی تلاش" پر میری جو حوصلہ افزائی ہوئی اُس نے مجھے دوسری "تلاشوں" پر مجبور کر دیا۔ "ملازمت کی تلاش" اسی سلسلے کی ایک دوسری کڑی ہے۔ روپے کا ڈی ویلویشن صرف ۳۶ فیصدی ہوا ہے لیکن غالباً ہماری اخلاقی اقدار کا ڈی ویلویشن ۹۰ فیصدی ہو چکا ہے۔ رشوت خوری کو ہم نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایسے ہی قبول کر لیا ہے جیسے دودھ میں پانی۔ کچھ دنوں بعد شاید اس کے خلاف آواز اُٹھانا بھی مضحکہ خیز ہو جائے۔ اس لئے براہِ کرم مضمون کی اشاعت میں عجلت ہی فرمایئے گا ـــــ اُمید ہے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے . . .

راقم ـــــــــ وجاہت علی

ہماری یونیورسٹی نے جیسے ہی ہمارے گریجویٹ ہو جانے کا اعلان کیا ہمارے بہت سے عزیزوں اور خیر خواہوں نے ہمارے مستقبل کو ایک ساجھے کی ہانڈی بنا لیا اور اُٹھتے بیٹھتے ہمیں اپنے مشوروں سے ایسا لادنے لگے جیسے کسی دھوبی کا اکلوتا گدھا میلے کپڑوں سے لادا جاتا ہے۔ کسی نے کہا "ہمیں فوراً ولایت چلا جانا چاہئے"، کسی نے کہا "نہیں تھانیدار بن جانا چاہئے کیونکہ اُس میں اختیارات زیادہ اور بالائی آمدنی لامحدود ہوتی ہے"، کسی نے بتایا "ہمیں اسمبلی کی ممبری کے لئے اُمیدوار ہو جانا چاہئے کیونکہ بیشتر ممبران ناخواندہ ہوتے ہیں اس لئے ہمارے منسٹر بن جانے کا امکان بہت زیادہ ہے"۔ کسی نے سمجھایا "ایڈیٹر بن کر ایک چٹ پٹا سا اخبار نکال دینا چاہئے"۔ نخچیر صاحب اور کفگیر صاحب نے اُس میں ایک ایک غزل روزانہ چھپوانے کا فی البدیہہ وعدہ بھی کر لیا۔ ایک صاحب جو ہماری صلاحیتوں کا غالباً اچھا اندازہ رکھتے تھے مشورہ دیا کہ ہمیں نخاس میں کباڑئے کی دوکان کھول دینا چاہئے کیونکہ اُس کام میں اکثر تاریخی چیزیں ہاتھ لگ جاتی ہیں یا خود بخود بن جاتی ہیں اور چند روپوں سے ہزاروں کے وارے نیارے کئے جا سکتے ہیں۔

بھوپندر چچا جن کا نام تخفیف ہو کر یا ٹیڈی بن کر صرف بھولو چچا رہ گیا تھا اور جو ہم جیسے محلہ بھر کے بے روزگار نوجوانوں کے خود ساختہ گارجین تھے انھیں اپنی فہم اور فراست کا بڑا غرہ تھا اور بندر نچانے سے لے کر منسٹر کو اپنانے تک کے نسخے منہ زبانی یاد تھے۔ وہ مجھ سے بہت دنوں پہلے کہہ چکے تھے "برخوردار! یہ تلاشِ ملازمت تمھارے بس کا روگ نہیں۔ میری مانو تو اس چکر چھوڑ کر تم دودھ دو بھینسیں پال لو اور پھر پانی بیچ بیچ کر بہت جلد دو سے چار اور چار سے آٹھ غرض کہ بھینسوں کا پورا ڈیری فارم کھول دینا۔ پھر دیکھنا کہ چٹکی بجاتے تم پیسہ بٹورنے میں سیٹھ مالا رام کے بھی کان کاٹ لوگے۔ وہ تو کالی مرچ اور پسی ہوئی مرچ کے ایک ایک بورے میں صرف آدھے پپیتے کے بیج اور اینٹ کی سُرخی ملاتا ہے اور تم دودھ میں پانی ملانے کے بجائے صرف پانی میں دودھ ملانا!"

"اور جو دھر لیا افسروں نے چچا!"

"دھریں گے تو بھریں گے۔ اجی آٹھ دن کی آمدنی نہ سہی۔ میں تو کہتا ہوں ڈیری فارم کے کنڈوں کی آمدنی تم پہلے ہی سے ہیلتھ آفیسر کے نام پر علیحدہ جمع کرنا۔ دودھ تمھارا کنڈے اُن کے۔ تم دودھوں نہاؤ وہ کنڈوں پھلیں!"

ہم نے ان تمام مشوروں کو اپنی بساط سے کہیں اونچا سمجھا اس لئے ستّو باندھ کر صرف کلرکی کے پیچھے پڑ گئے۔ ستّو باندھ کر پیچھے پڑنا محاورہ ہو تو ہوا کرے، ہم نے واقعی اپنی ایک جیب میں ستّو بھر کر ایک تھیلی رکھ لی تھی کہ اگر سند نہ بھی رہے،

وقت ضرورت کام آسکے۔

دراصل ہم کلرکی سے مرعوب بہت تھے۔ ہمارا دوست چھیل بہاری سپلائی کے محکمے میں صرف ایک سو تیس روپے پر چھوٹا بابو تھا لیکن وہ ہر مہینے ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ہزار تین سو روپوں سے کم نہیں خرچ کرتا تھا۔

تاہم بیکاری کے باعث ملازمت کی تلاش میں ہماری پہلی کوششیں کچھ بیکار قسم کی تھیں۔ جہاں کوئی اشتہار دیکھا بے ساختہ درخواست اڑادی۔ کبھی مقابلے کے امتحان کی خبر پائی فوراً بیٹھ گئے۔ کہیں انٹرویو کی اطلاع ملی دوڑ کر پہنچ گئے۔ آج محکمۂ جنگلات جانے کے لئے تنکے چن رہے ہیں، کل کسی پولٹری فارم کے لئے مرغ زریں بنے جارہے ہیں تو پرسوں ایک ممبر پارلیمنٹ سٹھانی کے پرائیویٹ سکریٹری (درخواستوں کے ساتھ فوٹو بھیجنا بھی لازمی تھا) بن جانے کی اُمید میں "بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے" گنگنا رہے ہیں لیکن آخر میں وہی ڈھاک کے تین پات! ایک جیب میں ستو کی تھیلی، دوسری میں سند اور ہم بے روزگار!

وال کچھ گلتی نظر نہ آئی تو مجبوراً ہمیں بھی اپنی تکنیک میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اب درخواست کے ساتھ ہی ساتھ ہم خود بھی ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ یا بڑے صاحب کے پاس دوڑ جاتے اور خوب روتے گاتے۔ کہیں اپنے والد کی علالت کا (جو اگرچہ بہت دن ہوئے اللہ کو پیارے ہوچکے تھے) رقت انگیز ذکر چھیڑ دیتے۔ کہیں اپنے بے ماں کے بچوں کی بے سروسامانی کا (حالانکہ صاحبِ اولاد ہونا تو درکنار ہم شادی شدہ بھی نہیں تھے) عبرت انگیز افسانہ سُنا ڈالتے۔ کہیں اپنے آپ کو ایسا لُٹا ہوا رفیوجی ظاہر کرتے جس کے پاس سے رفیوجی ہونے کے کاغذات بھی ضائع ہوچکے تھے۔ کہیں اپنے آپ کو کسی سورگ باشی نیتا کا بھتیجا یا بھانجا گرداتے لیکن صاحبِ اختیار حضرات ہماری یہ داستانیں سُنتے تو اظہارِ ہمدردی کے بجائے ہم پر ہنستے۔ کسی بنگلے پر ڈانٹے گئے، کسی دفتر سے نکالے گئے، کسی صاحب نے ملنے ہی سے انکار کردیا اور ایک آدھ بار بابوؤں کا تو ذکر ہی کیا، اُنھیں تو جیسے ہماری صورت ہی سے پیدائشی نفرت تھی، اردلی اور چپراسی تک سے ہاتھاپائی کی نوبت آگئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہماری تکنیک بے ہودہ ہونے کے علاوہ انتہائی بوسیدہ بھی تھی۔ ہم سے بہت پہلے بہت سے لوگ اسے اتنی بار آزما چکے تھے کہ اب وہ دفتری زبان میں "بلی کی لاش" ہوچکی تھی جسے دیکھتے ہی لوگ عبرت پکڑنے یا ہمدردی کرنے کے بجائے ناک پر رومال رکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔

مایوسیاں گہری ہوتی جارہی تھیں اور ہم نے سنجیدگی سے بھولو چاچا کے بھینس پالنے کے پروگرام پر غور کرنا شروع کردیا تھا۔ یہاں تک کہ ہم جب کبھی کسی سرکاری نل سے پانی بہتے دیکھتے تو ہمیں قومی دولت کے نقصان کا بڑی شدت سے احساس ہونے لگتا کہ ہائے کس آسانی سے یہ پانی دودھ بنایا جاسکتا تھا۔ ایسے ہی نازک زمانے میں ہمارے ایک لال بجھکڑ دوست نے جو مختلف دفتروں میں "مخصوص بیٹھے" کی حیثیت رکھتے اور تھوڑے سے کمیشن پر بابوؤں سے "بات طے کرادیتے" ہمیں یہ اطلاع دی

"سرکار نے اب اپنی پوری طاقت سے رشوت خوری ختم کرنے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ اس لئے مقامی گھوس وناش کاریالیہ میں چھ کلرکوں کی نئی جگہیں بڑھائی گئی ہیں۔ یوں تو مقابلے کا امتحان بھی ہوگا اور انٹرویو کی بھی شرط لگی ہوئی ہے لیکن سارا معاملہ 'بڑے صاحب' کے اختیار میں ہے۔ اور بڑے صاحب کی ناک کا بال ہیں ہیڈ کلرک صاحب۔ وہ اُنھیں کے ہاتھ سے 'گولی' کھاتے ہیں اس لئے سیاہ اور سفید کا مالک اُنھیں کو سمجھنا چاہئے۔ چار اُمیدواروں نے ہیڈ کلرک صاحب اور اُن کی معرفت بڑے صاحب کا دانا چارہ فراہم کرکے اپنی بات پکی کرلی ہے۔ ایک اُمیدوار ایگزیکیوٹو آفیسر کا داماد ہے اور ایگزیکیوٹو آفیسر ابھی حال میں بڑے صاحب کے بہنوئی کے بھتیجے کو اکزائز انسپکٹر بنا چکے ہیں اس لئے اُس کی بات بھی قریب قریب طے ہی سمجھنا چاہئے۔ بس ایک جگہ باقی رہ جاتی ہے اُس کے لئے تم ہاتھ پیر مار سکو تو مار لو ـــــــ اصل کام جگادری مل ہیڈ کلرک کو بوتل میں اُتار لینا ہے۔"

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے ہی ہم جگادری مل سے ملنے کے لئے روانہ ہوگئے۔ بہت مشکل سے ان کے گھر کا پتہ چلا۔ دروازہ ایک گلی میں تھا۔ ہم نے کئی بار ہانک لگائی۔ پھر کنڈی کھٹکھٹائی لیکن اندر سے جواب دینا تو درکنار کسی نے سانس اور ڈکار تک نہ لی۔ دروازے سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے دروازے کے قریب ایک شخص ننگے بدن، کمر کے گرد صرف ایک انگوچھا باندھے پاس ہی بندھی ہوئی بھینس کی ناند میں سانی کررہا تھا۔ گھر والوں سے مایوس ہوکر ہم اُس سے مخاطب ہوئے "کیوں جی بھینس والے! کیا جگادری مل ہیڈ کلرک زندہ ہیں؟"

بھینس والے نے خلافِ توقع گستاخی سے جواب دیا "کیا کام ہے تمھارا؟ کہیں رشوت لیتے پکڑے گئے ہو جو ہیڈ کلرک کی دُہائی دیتے آئے ہو؟"

اُس کی جسارت پر سخت غصہ آیا "تمھیں ساتھ لئے بغیر اکیلا کیا پکڑا جاؤں گا؟" اور پھر یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ کیا خاک سمجھے گا، کچھ جولانیٔ طبع بھی دکھادی "اے برادرِ سند باز جہازی، رکندۂ ناتراش!"

بھینس والے نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا "کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ کہ عقل بڑی کہ بھینس؟ تمھاری عقل موٹی اور بھینس چھوٹی ہے"

"ابھی تمھارا پتلون بنتا لنگوٹی ہے! تمھاری شامت ہی آگئی ہے تو ابھی ہیڈ کلرک کو بلا کے لئے آتا ہوں"

وہ ہیڈ کلرک کے مکان کے دروازے میں جاتے جاتے کہہ گیا تو بات

[illegible] جیب سے نکال کر اُسے ایک چونّی دکھائی: "اے بھینس والے بابو! میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ خفا نہ ہونا۔ البتہ ہیڈ کلرک سے ملوا دو تو یہ رہا تمہارا انعام!"

بھینس والا دروازہ کھولتا اور پھر بند کرتا مکان میں چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد دروازہ پھر کھلا اور اُس میں وہی شخص نظر آیا، جو اب ایک کرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھا: "ہاں کیا بکواس کر رہے تھے تم؟"

"یہی کہ ہیڈ کلرک سے ملوا سکتے ہو یا نہیں؟"

"پہلے اپنا کام اور نام بتاؤ؟"

"تم اپنی بھینس کے دام بتاؤ؟ معلوم ہوتا ہے کہ ہیڈ کلرک گھر پر نہیں ہیں اور میری جیب کی چونّی تمہاری قسمت میں نہیں لکھی ہے۔"

"اجی ٹھیک سے اپنا کام اور نام کیوں نہیں بتاتے؟ اور یہ ہر بات کے درمیان تم بھینس کیوں ہنکا لاتے ہو؟"

"بھینس کے آگے بین بجانے کے لئے! اجی اب تم کو اپنا شجرۂ نسب کیا بتاؤں؟ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!"

"بس! بس! خوب آنکھیں کھول کر دیکھ لو میں جگا دری مل ہیڈ کلرک زندہ اور تمہارے سامنے کھڑا ہوں! سویرے سے دماغ چاٹ رکھا ہے اور ایک چونّی دکھانے کے سوا مطلب کی بات ایک نہیں۔ کس محکمے کے اصطبل سے گھاس کھا کر بھاگے ہو جو راستہ چلنے سے زیادہ دولتیاں جھاڑتے ہو؟"

ہم پر تعجب کی ایک ایسی بجلی گری کہ دانت بجنے لگے۔ ہاتھ جوڑ کر ایک دو بار نہیں، مسلسل سلام کرتے اور ہکلاتے ہوئے بولے: "نمستے ہیڈ کلرک صاحب نمستے! تو آپ ہی جگا دری مل جی ہیں۔ نمستے! شریمان جی نمستے! معاف کیجئے گا میں پہچان نہیں پایا آپ کو، آپ کے ورزش کرنے کے لباس میں! واہ واہ بھینس کی سانی کرنا بھی کتنے پُن کی بات ہے۔ مطلب یہ کہ نمستے ہیڈ کلرک صاحب! مہاتما گاندھی نے کہا تھا اپنا کام خود اپنے ہاتھوں کرنا چاہئے اور پھر بے زبان جانور کی سیوا! میرا مطلب یہ کہ آپ کی بھینس کتنی بھولی اور پیاری ہے۔ نمستے شریمان جی نمستے!"

"بہت ہو چکا نمستے! اندر آکر اپنا حال بتاؤ!"

ہم نے اپنی داستان کا آغاز کمرے میں جا کر اور جگا دری مل کے سامنے کسی چور کی طرح بیٹھتے ہوئے یوں کیا: "بات اصل یہ ہے ہیڈ کلرک صاحب کہ میں آپ ہی کی برادری کے ایک شریف خاندان کا لڑکا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چشم و چراغ ہوں۔ کبھی پرماتما کی دیا سے ہمارے گھر میں بھی دھن برستا۔ چالیس گاؤں کے تعلقہ دار تھے میرے دادا۔۔"

"چھٹ! پتی کی لاش! مطلب کی بات کہو۔ باپ دادا کی امارتیں گنتا ہو تو میرا وقت مت برباد کرو۔ زبان کی اِس قسم کی ورزشوں کے لئے چنڈو خانہ زیادہ مناسب رہے گا۔" جگا دری مل نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آج کل میرے گھر میں سب کو ایک سرے سے ایک پاگل کتّے نے کاٹ کھایا ہے۔ تیمار داری کرتے کرتے میں کچھ ہواس باختہ ہو رہا ہوں۔"

"تو مجھے کاٹنے آئے ہو کیا؟" وہ غرّائے۔

"جی ہاں! میں عرض یہ کر رہا تھا کہ میرے گھر میں بکری کا ایک بچّہ ہے جس کی ماں کے اچانک مر جانے سے اُس کی دیکھ بھال مجھے کرنا پڑتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ کسی چھوٹے بچّے کی پرورش۔۔۔"

"گھوم پھر کر پھر وہی پتی کی لاش! باپ اندھا ہے، ماں لنگڑی ہے، بیوی معذور ہے۔ بچّے پاگل ہیں۔ زمین داری اُجڑ چکی۔ گھر نیلام ہو گیا۔ کان پک چکے اِس طرح کی داستانیں سُنتے سُنتے۔ اِس طرح ہمدردی کی تلاش کو پتی کی لاش کہا جاتا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں اُگلتے کہ کس محکمے میں تھے اور کتنی رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے؟"

"شریمان جی! ابھی رشوت لینے کا موقع ہی کہاں نصیب ہوا! فکرِ معاش کے سلسلے میں میرے تجربے اِتنے دل خراش ہیں کہ انھیں سنتے ہی آپ کا دل پاش پاش،

"میرا دل ہو کر پاش پاش، کرے گا یہ راز فاش، کہ تم پھر اٹھا لاسے بِلّی کی لاش! جی آوٹی ہو یا گمن چکر۔ مطلب کی بات کرو ورنہ تو دو گیارہ ہو کر اپنا راستہ ناپو۔"

"میں آپ کے محکمے بِلّی کی لاش، اجی توبہ کیجیے گا گموس وِناش میں ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو کون سا شیر مار رہے ہو؟ بہت سے لوگ یہی خواب دیکھتے ہیں۔"

"مجھے آپ کی ہمدردی بلکہ سرپرستی کی ضرورت ہے۔"

"کس خوشی میں؟ تم سے زیادہ میری بھینس کو میری ہمدردی اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔"

"جی ہاں! بس یہی مطلب ہے میرا کہ آپ مجھے بھی اپنی ایک بھینس ہی سمجھ لیجیے اور میرے واسطے چارے کا انتظام کر دیجیے۔"

"لیکن میری بھینس تو مجھے دودھ دیتی ہے۔" اب جگا دری مل کی آنکھوں میں بیزاری کے بجائے وہ چمک پیدا ہو رہی تھی جو شکاری کی آنکھوں میں شکار کے مارنے سے پہلے اُسے اپنی زد میں لے آنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

"جی! جی! بھینس! دودھ! میں بھی آپ کی سیوا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"جواب بِلّی کی لاش کی صورت میں نہیں بلکہ روپے اور پیسوں میں ہونا چاہیے!" اور پھر میری بوکھلاہٹ پر اپنا لہجہ کچھ نرم کرتے ہوئے بولے "اِس قسم کے معاملوں میں دفتر کے کچھ بندھے ٹکے اصول ہیں۔ تم اُن سے ناواقف ہو تو درخواست لے کر دفتر آجاؤ میں تمھیں چورن بابو سے ملوا دوں گا وہ تمھیں سب بتا دیں گے۔ بس اِتنا سمجھ لو کہ تمھاری جگہ کے لئے ڈیڑھ ہزار تو پہلے ہی لگ چکا ہے۔ اُس سے آگے بڑھ سکنے کی ہمت ہو تو آنا ورنہ کچھ کھا کر گھر ہی پر سو رہنا۔"

گموس وِناش وِبھاگ کے دفتر پہنچے تو اُس کے چاروں طرف اپنی ہی طرح کے بہت سے اُمیدواروں کو لیلائے ملازمت کے فراق میں اسی طرح مجنونانہ حرکتیں کرتے ہوئے دیکھا جن کے لئے کوچۂ جاناں نہ صرف قابلِ دست اندازی پولیس بلکہ محکمۂ صحتِ عامّہ کے لئے بھی ایک مستقل خطرہ بن چکا ہے۔ ہمارے شاعرانِ باکمال نے روایتی معشوق کے ہتھکنڈوں کا رونا روتے روتے دیوانوں پر دیوان تھوپ کر رکھ دئے ہیں لیکن یقین جانئے اگر اُن کا سابقہ لیلائے ملازمت سے پڑ جاتا تو دیوان مرتب کرنا تو دُور رہا اُنھیں اپنے قطعات وفات لکھنے کی بھی توفیق نصیب نہ ہوتی۔

ایک صاحب دفتر کے برآمدے کے سامنے زینے پر بڑی بے تکلفی سے لیٹے ہوئے تھے اور ہر تین منٹ کے بعد ایک نئی بیڑی سُلگا لیتے۔ ایک چھوٹے قد کے صاحب ایک کھڑکی کے سامنے اُچک اُچک کر دفتر کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے اور جب تک دفتر کے اندر سے آتی ہوئی ایک پکیسے اُنھیں لالہ زار نہ بنا دیا وہ

اپنی مصروفیت پر کافی خوش نظر آتے۔ ایک صاحب دفتر کے لان پر کھڑے آسمان پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت دن میں تارے تو خیر کیا گن رہے ہوں گے غالباً اُڑتی ہوئی چیلوں پر مسمریزم کر رہے تھے۔ دو صاحبوں کی دفتر کے ایک چپراسی سے باقاعدہ تُو تُو مَیں مَیں ہو رہی تھی۔ بحث کا موضوع غالباً چپراسی کا 'حق' تھا کیونکہ وہ بار بار کہہ رہا تھا "اب ایک روپیہ نہیں دو روپے ملتے ہیں۔ آپ کو یقین نہ آئے تو چلئے بڑے بابو سے پوچھ لیجئے!" ایک صاحب ایک بابو کو دفتر کے اندر سے باہر برآمدے میں بلانے کے لئے طرح طرح کی شکلیں بنا کر ہاتھ سے اشارے کر رہے تھے۔ چپراسی اُنھیں بار بار گھسیٹ کر برآمدے کے نیچے لان پر بہت دُور تک دھکیل آتا لیکن چند ہی لمحوں کے بعد وہ نہ معلوم کیسے پھر دروازے کے سامنے نمودار ہو جاتے۔ ایک صاحب دو بابوؤں کی گردنوں میں اپنے دونوں ہاتھ "میرے دونوں بیٹے" کے انداز سے ڈالے کچھ دیر تو لان کے ایک کنارے ٹہلتے رہے، پھر اُنھیں لئے ہوئے سڑک کے اُس پار چائے کی دُکان پر چلے گئے۔

دفتر کے برآمدے کے ایک موڑ پر کچھ لوگ ایک بینچ اور چند کرسیوں پر بیٹھے دفتر کے کچھ چھوٹے بابوؤں سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ جب 'معاملہ' 'پکنے' کے قریب آجاتا تو صاحبِ معاملہ متعلّقہ بابو کو لے کر لان کے کسی کونے کی تنہائی میں چلا جاتا اور پھر وہاں سے دونوں چائے خانے کی طرف چلے جاتے۔ ایک اُمیدوار سے پتہ چلا کہ یہ وہ خوش قسمت لوگ ہیں جنھیں ملازمت مِل گئی تھی لیکن اب بیچارے رشوت خوری میں دھر لئے گئے ہیں اِس لئے کھائی ہوئی رقم یہاں دفتر میں اُگلنے اور اِس طرح اپنا معاملہ اِسی صورت سے ٹھیک کرانے آتے ہیں جیسے کوئی بڑا آدمی بحالیٔ صحت کے لئے کسی سینی ٹوریم چلا جاتا ہے۔

ہر طرف چپراسی پھدک رہے تھے اور اُن کی مٹھی گرم کئے بغیر دفتر کے اندر قدم رکھنا مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ دفعتہً جگا دری مل ہیڈ کلرک خود ہی ایک شخص سے باتیں کرتے ہوئے دفتر کے باہر برآمدے میں نکل آئے۔ ایک چپراسی نے ہم کو پکڑنے کی کوشش کی پھر بھی ہم تیر کی طرح اُن کے پاس پہنچے اور جیسے ہی اُنھوں نے کوئی بات سمجھاتے ہوئے اپنا ہاتھ پھیلایا ہم نے اپنی درخواست اُنھیں پکڑا دی۔ وہ ایسے بلبلا کر چونکے جیسے کوئی جلتا ہوا انگارہ پکڑ لیا ہو اُنھوں نے۔

"یہ کیا؟ یوں دی جاتی ہے درخواست؟" اُنھوں نے بڑی خشونت سے ہمیں دیکھا اور پھر انتہائی بیزاری سے بولے "اور پھر یہ درخواست تو بالکل خشک ہے اِس کے ساتھ کوئی سرکاری کاغذ تو ہے نہیں۔ ایسے ہی درخواست جھونکنا ہے تو باہر لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دو۔" اُنھوں نے ہماری درخواست حقارت سے پھینک دی اور ایک چپراسی کو ہاتھ کے اشارے سے بُلا کر کہا "ذرا چورن بابو سے

کہہ دو کہ ... صاحب جانتے کہ یہاں دفتر کے طور طریقے سمجھا دیں۔ یہ تو آج سویرے سے میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔"

اتنی دیر میں چپراسی چورن بابو کو بُلانے گیا ہم نے اپنی درخواست زمین سے اٹھا کر ڈبکس میں ڈال دی۔ میرے دریافت کرنے پر کہ یہ کب کھولا جاتا ہے ایک دوسرے چپراسی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "پندرھویں روز مہتہ صاحب کھولے جاتے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے کاغذوں کو جلا کر بڑے مزے کی چائے بنا تا ہے۔"

اتنے میں چورن بابو ہنستے اور پان کی جگالی کرتے ہوئے آ گئے۔ چھوٹے سے گول چہرے پر انھوں نے اتنے موٹے فریم کی عینک لگا رکھی تھی کہ وہ انسان کم اور عینک زیادہ نظر آتے۔ اُنھوں نے آتے ہی مجھ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا اور پان والے کی دکان پر پہنچ کر بیک وقت چار پان اپنے منہ میں ٹھونسے اور ایک ڈبی سگریٹ لے کر جیب میں ڈالی اور اس سب خریداری کے دام ادا کرنے کے لئے مجھے اشارہ کیا میں نے اپنا جیب ٹٹول کر اپنی معذوری ظاہر کی تو ہنستے ہوئے اُکڑ گئے "جیب میں نہیں دانے، اماں چلیں بھنانے! پھر کس مسخرے پن کے شوق میں یہاں سرکاری دفتر میں نحوست پھیلا رہے ہو؟" پان والے سے اُنھوں نے پیسے اپنے حساب میں لکھ لینے کو کہا اور میرے ساتھ قریب کے سوراج پارک میں جا کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"تم نے خالی خولی درخواست ہیڈ کلرک صاحب کو تھما کر کمال ہی تو کر دیا! ہر درخواست کے ساتھ انھیں سو روپے کا ایک سبز نوٹ دیا جاتا ہے۔"

"اور اگر نہ ہو کسی کے پاس؟"

"تو سبز باغ دیکھے! ملازمت کے لئے یہاں کیوں آئے؟"

"لیکن یہاں بورڈ پر تو لکھا ہے گھوس وِناش وِبھاگ"

چورن بابو کچھ اس بے ساختگی سے ہنسے کہ اُن کے منہ سے پیک کا ایک فوارہ چھوٹا "یہ نہیں معلوم لوگ گھوس وِناش کا مطلب کیوں غلط سمجھتے ہیں۔ ہمارا محکمہ کھولنے سے سرکار کی غرض صرف اس قدر ہے کہ دوسرے دفتروں میں جو گھوس لی جاتی ہے اُس کے پکڑے جانے پر اُن دفتر والوں سے اینٹھ کر ہمارے دفتر والوں میں بانٹ دی جائے تاکہ اس گھوس کی رقم کا فوراً وناش ہو جائے۔ گھوس وِناش کے معنی یہ نہیں ہیں کہ گھوس لی ہی نہ جائے، بلکہ یہ کہ جو لی جائے اسے فوراً کھا پی کر ختم کر دیا جائے۔"

"میں نے تو ابھی کسی دفتر میں گھوس نہیں لی ہے پھر مجھ سے کیوں انشی جا رہی ہے؟"

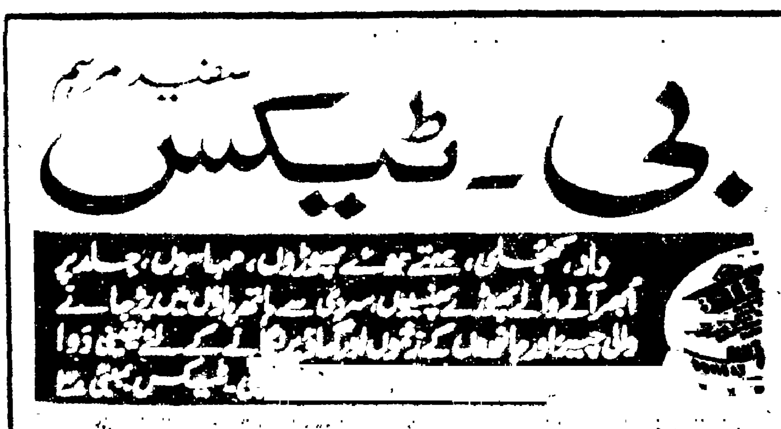
"انشی نہیں جانتی تو انشو گے کیسے؛ یہ تو محکمے میں داخل ہونے سے پہلے تمھاری ٹریننگ کی جا رہی ہے۔"

"تو بس درخواست میں سو روپے کا نوٹ نتھی کر دینے سے سب کام بن جائے؟"

"بچے دبو! صرف سینما کا ٹکٹ خرید لینے سے کوئی ہیروئن کا شوہر نہیں بن جاتا۔ خود میں پورے تین ہزار روپے خرچ کر کے چورن لال آفس کلرک بنا ہوں! ایک ایک جگہ کے لئے نیتاؤں، اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبروں، سرکاری افسروں یہاں تک کے منتروں کے بیسیوں بھتیجے، بھانجے، سالے اور کیا الم غلم سفارش کے کھتر بھر خط دبائے گدھوں کی طرح منہ کھولے دفتر کے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ ایک منتر صاحب کے باورچی مہراج نے تو یہاں تک دھمکی دی ہے کہ اگر اُن کے داماد کو یہ ملازمت نہ ملی تو وہ اپنے صاحب سے کہہ کر یہ دفتر کیا سارا محکمہ تہس نہس کرا دیں گے! ایسے مضبوط جبڑوں سے ملازمت نکال کر تمھاری جھولی میں ڈال دینا کوئی ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں۔"

"تو پھر سو روپے کے علاوہ کچھ اور بھی دینا پڑے گا؟"

"معاف کرنا تم تو کچھ انقلاب زندہ باد قسم کے اُلٹی کھوپڑی کے انسان معلوم ہوتے ہو!" چورن بابو کچھ کیا بہت چڑھ کر بولے "بھئی یہ سو روپیہ تو ایک طرح کی بانگی ہوتی ہے جو شگون کے طور پر چٹنی کی صورت میں ہم بابوؤں میں بٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد ہیڈ کلرک صاحب کے کمیشن، سپرنٹنڈنٹ صاحب کے حق اور پھر بڑے صاحب کی ڈالی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ملازم ہو جانے کے بعد پچیس روپے ماہوار تنخواہ سے کٹانا پڑتے ہیں تاکہ تمھاری عارضی جگہ تمھارے مستقل ہو جانے سے پہلے تخفیف میں نہ آ جائے۔ ہیڈ کلرک صاحب تم پر مہربان ہیں اس لئے پہلے پہل صرف دو ہزار روپے سے کام چل سکتا ہے۔" اور پھر اپنا منہ میرے کان کے



…ب ڈکر" اور پرماتما نے چاہا تو چٹکی بجاتے جو کچھ اِس ہاتھ سے دوگے وہ اُس ہاتھ سے …ل مع سود در سود وصول کر لینا۔ ہیڈ کلرک صاحب کی سفارش پر سپرنٹنڈنٹ صاحب …نے جہاں کسی موٹے اسامی کی رشوت خوری کا کوئی معاملہ تمھارے سپرد کیا بس اُسی وقت سے …بارے ہیں۔ پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں!"

چورن بابو ایک دوسرے اُمیدوار کو دُور سے دیکھ کر اُس کی طرف لپکے اور …م کان دبا کر اپنے گھر کی طرف بھاگے۔ ملازمت گئی چولھے بھاڑ میں گھوس وِناش …ے دفتر سے اپنے بدن کے کپڑے ہی بچا لے جانا بہت غنیمت تھا۔

سُنتے آئے تھے کہ اکثر پتھر میں بھی جونک لگ جاتی ہے اِس لئے دوسرے …ن ہیڈ کلرک جگادری مل کے مکان پر ہم پھر منہ اندھیرے پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ …نگ دھڑنگ صرف انگوچھا باندھے گھر سے برآمد ہوئے تو اُنھوں نے ہمیں اپنی …بھینس کی مالش کرتے ہوئے پلیا۔ اپنی گھنی مونچھ کے سائے میں کچھ مُسکرائے …کن پھر تیوریاں چڑھا کر کسی شک کے ماتحت اُس کے تھن دیکھنے لگے۔ ہمیں اپنی سادگی …ر ندامت ہوئی کہ اِس اِمکان پر خود ہم نے کیوں نہیں پہلے غور کیا تھا۔

اُس کے بعد وہ بھوسا اور دانا چارہ لاکر بھینس کی سانی میں مصروف ہو گئے …ور ہم نے شروع کر دی اپنی فریاد ——— بیچ بیچ وہ لقمہ دیتے جاتے "بلی کی لاش!" …ور ہم اُن باتوں سے زبان روک لیتے جن سے انسانیت یا شرافت کا کوئی جذبہ …بیدار ہو سکے یا جس سے رشوت کے مقررہ نرخ میں کوئی کمی ہو جانے کا اندیشہ پیدا …ہو سکے۔

دوسرے اور تیسرے دن پھر قریب قریب یہی ہوا۔ اب ہیڈ کلرک صاحب …ہماری باتوں سے انتہائی بور بلکہ بیزار ہو چکے تھے اور صورت دیکھنے تک کے روادار …تھے۔ انھوں نے ہمیں سختی سے منع کر دیا کہ اُن کی بھینس کو ہاتھ لگانا تو دُور رہا اُسے …پنی صورت تک نہ دکھائیں۔ کیونکہ سویرے سویرے ہماری منحوس صورت دیکھتے ہی …سے اُس کا دودھ روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔

ہم اپنی ناکامیوں کا کچا چٹھا آتے دن اپنے غمگسار جیون پھوپھا کو سُناتے …ہتے۔ یوں تو ہم گھوس وِناش دفتر کی ملازمت کے لئے مقابلے کے امتحان میں بھی …بیٹھے تھے اور گھِس پِٹ کر اُس کے اِنٹرویو میں بھی شریک ہو گئے تھے لیکن اُس کی طرف …سے ہمیں بالکل مایوسی ہو چکی تھی۔ اچانک ایک دن شام کو پھوپھا گیندے کے …پھول کی طرح کھِلتے ہوئے آئے اور مارے خوشی کے مجھے لپٹاتے ہوئے بولے: "کِھلاؤ …مٹھائی اپنے چچا کو! اُس نے بلی کی لاش سے واقعی ایک جیتا جاگتا بِلّا بنا دیا جو جگادری مل …کی بھینس کا سارا دودھ پئے بغیر دم نہ لے گا!"

اب مجھے چچا کی عقل کا بلب فیوز ہو جانے میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔

کچھ دیر دم لینے کے بعد وہ پھر چہکے: "تمھاری بہن یعنی میری لڑکی کملا کے ساتھ جگادری مل کی لڑکی بملا بھی پڑھتی ہے اور دونوں میں بڑا بہناپا اور دانت کاٹی روٹی ہے۔ کملا نے بملا سے تمھاری بڑی سفارش کی کہ اپنے بابوجی سے کہہ کر میرے بھائی کو نوکری دلوا دو۔ پہلے تو وہ ٹالتی رہی پھر ایک دن جب کملا نے رُوٹھ کر اُس سے بات کرنا چھوڑ دیا تو خود ہی گلے میں بانہیں ڈال کر بولی تمھارے بھائی کو نوکری ملنے کی صرف ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔ ابھی ایک جگہ میری شادی کی بات چلی تھی تو بابوجی پندرہ ہزار تک دینے پر آمادہ تھے لیکن لڑکے والوں نے بیس ہزار سے نیچے سانس ہی نہیں لی، اِس لئے بات ختم ہو گئی۔ اُس کا بابوجی کو بہت دُکھ ہوا۔ اب اگر تمھارا بھائی میرے ساتھ شادی کرنے کی جھوٹ موٹ حامی بھر لے تو بابوجی اُسے فوراً نوکری دلا دیں گے۔ پھر اُسے نوکری مل جانے کے بعد جب بابوجی مجھ سے پوچھیں گے تو میں صاف انکار کر دوں گی کہ مجھے تمھارا بھائی جسے ایک دن میں نے بھینس کی مالش کرتے ہوئے دیکھا تھا، سخت ناپسند ہے۔ بُرا نہ ماننا اُس کی پھلوری جیسی ناک، بٹن جیسی آنکھیں اور بوچے بوچے کان کے خیال ہی سے مجھے گھِن آتی ہے۔"

ہمیں اپنی صورت کے متعلق یہ ذِلّت آمیز الفاظ، ریڈیو سیلون کے کسی نغمے سے بھی زیادہ سُہانے معلوم ہوئے۔ بملا دیوی کی ایک جھلک ایک دن ہم نے بھی دیکھی تھی۔ وہ کیسی تھیں؟ یہ ہم کیا اور کیوں بتائیں؟ صنفِ نازک کے کسی فرد کو بھی خوبصورت نہ سمجھنا ہم ایک سنگین بدذوقی سمجھتے ہیں۔ البتہ اِتنا ضرور عرض کریں گے کہ وہ ہمارے دیش ہندوستان کی نہیں، صرف افریقہ کے جوجو کا قبیلے کی حسینہ کہی جا سکتی تھیں۔ پھوپھا ہمیں پٹی پڑھا کر ہماری شادی کی مہم سر کرنے جگادری مل سے ملنے چلے گئے اور ہم بملا دیوی کی خدا ترسی اور مردُم شناسی پر مارے خوشی کے قلابازیاں کھانے لگے۔

چار دن کے بعد ایک سُہانی صبح کو ہیڈ کلرک صاحب اور چورن بابو ہمارے مکان پر نمودار ہوئے۔ سانس ہیڈ کلرک صاحب کی پھُولی ہوئی تھی لیکن مٹھائی اور پھلوں کی ایک وزنی ٹوکری چورن بابو سنبھالے ہوئے تھے۔ بیٹھک میں قدم رکھتے ہی ہیڈ کلرک صاحب نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر ہمارے ہاتھ میں دے دیا: "یہ ہے تمھاری تقرری کا پروانہ! سپرنٹنڈنٹ صاحب کی سفارش پر بڑے صاحب نے اسپیشل گریڈ دیا ہے تمھیں۔ اب آج ہی سے جوائن کر لو۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ ہیڈ کلرک صاحب ہی ایسے جیوٹ کے تھے جنھوں نے اکیلے اِتنا سخت مورچہ سر کیا تمھارے لئے۔ اب اُس شُبھ کام میں بھی دیر نہ ہونی چاہئے۔ شگون کے لئے بابوجی یہ مٹھائی اور پھل بھی لیتے آئے ہیں" چورن بابو نے گویا جگادری مل کے کہے ہوئے شعر کا مطلب بیان کیا۔

میں نے ریشہ خطمی بنتے ہوئے کہا: "میں کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں بابو جی کا۔ انھوں نے تو میرے ساتھ وہ کیا جو میرے باپ بھی نہ کرتے! رہا وہ کچھ کام تو اُس کیلئے میں بالکل تیار ہوں۔ آپ میرے چاچا جی سے باتیں طے کر لیجئے۔ سچ پُوچھئے تو اِس رشتے ہی کی خاطر میں نے ملازمت کے یہ سب پاپڑ بیلے تھے ورنہ آپ بزرگوں کی دعا سے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جائیداد میرے جیسے ایک کیا دس کے لئے کافی ہے! البتہ ایک بات ضرور ہے!"

ہماری باتوں سے جگا دری مل کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں لیکن دفعتہً ہمارے آخری جملے سے انھیں بجلی کا کرنٹ سا لگا اور اُن کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا۔

"وہ کیا؟ وہ کیا؟" انھوں نے بوکھلا کر پُوچھا۔

"وہ صرف یہ کہ اِس رشتے کے متعلق آپ اپنی صاحبزادی کی رائے ضرور لے لیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہر معاملے میں اپنی بھی رائے رکھتی ہیں۔"

"ہاں! ہاں! بالکل!" جگا دری مل پھر اپنی طبعی عمر کو لوٹ آئے اور بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوشی خوشی پھدکتے چلے گئے۔

چار دن کے بعد ــــ اور اسی عرصے میں ہم دفتر میں باقاعدہ ملازم ہو چکے تھے اور چورن بابو نہ صرف ہمیں روزانہ چائے پلاتے اور ناشتہ کراتے بلکہ اکثر تنہائی میں "دولہا بابو" کہہ کر ہمیں ورغلاتے کہ ہم جگا دری مل سے کہہ کر بعض پکّی اور رسیلی مسلیں اُن کے سپرد کرا دیں اور ہمارے اور اُن کے درمیان معاملہ ففٹی ففٹی کا رہے گا ــــ کملا نے بملا کو اپنے گھر بلایا اور پھوپو جان نے ہمیں زبردستی ایک پردے کے پیچھے چھپا دیا جہاں سے ہم اُن کی باتیں سُن سکیں۔

کملا بولی: "بملا! میں تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ تم نے میرے بھائی کو نوکری دلا کر..."

بملا نے بات کاٹ کر کہا: "چھوڑو بھی اِس بات کو۔ تمھارے بھائی ہیں تو آخر میرے بھی تو کچھ ہوئے۔"

"بابو جی نے تم سے پُوچھی وہ بات؟"

"ہاں بھابی کے ذریعے پُچھوائی تھی!"

"پھر کیا کہا تم نے؟ بہت بگڑے ہوں گے تم پر؟"

"بگڑتے کیوں آخر؟ میں نے کہا جو آپ کی رائے وہ میری رائے!"

"یعنی منظور کر لیا رشتہ تم نے؟" کملا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پُوچھا۔

"اور کیا کرتی؟" بملا نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"تمھیں تو میرے بھائی کی پھلوری جیسی ناک، بٹن جیسی آنکھیں اور بوچے کان کے خیال ہی سے گھن آتی تھی؟" کملا تو جیسے لڑنے پر تُل گئی۔

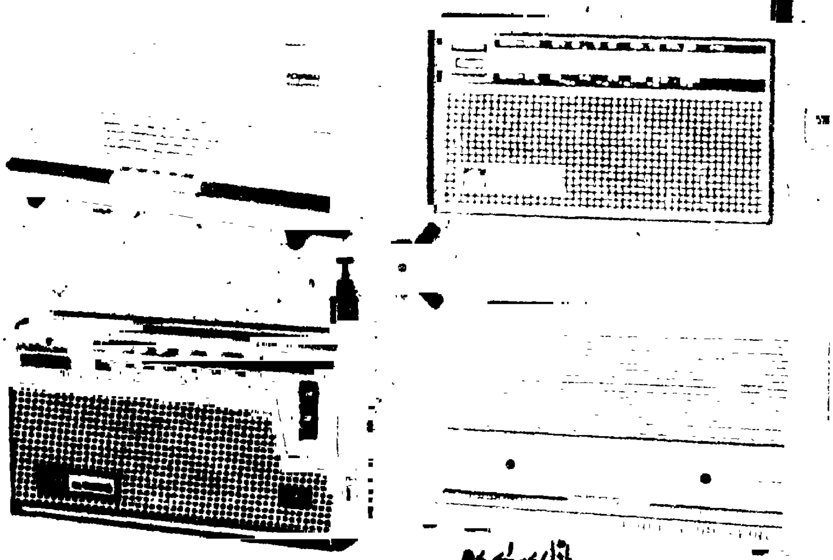
"ہاں جب وہ ایک بے روزگار کے چہرے پر لگے ہوئے تھے! لیکن تم کتنی ناسمجھی کی باتیں کرتی ہو کملا؟ شوہر کی ناک کان اور آنکھیں نہیں دیکھی جاتیں اُس کے ہاتھ دیکھے جاتے ہیں۔ بھینس کی شکل کو کون دیکھتا ہے اُس کے تھنوں کا دودھ دیکھا جاتا ہے!"

"کیا مطلب؟"

"جو ہاتھ مجھے سونے کی چمپاکلی، جوشن اور پازیب پہنائیں گے انھیں میں کیسے بدصورت کہہ سکتی ہوں!" اور پھر وہ بچوں کی طرح اِس بیساختگی سے کھلکھلا کر ہنسی کہ اُس وقت وہ ہمیں بھی ایک دو کیا دس بیس حسینوں میں ایک نظر آئی!

پردے سے باہر نکل کر اُس کی ہنسی میں شریک ہوتے ہوئے ہم نے کہا: "بملا دیوی جی! آپ کے پتا رشوت خوری کے سلسلے میں کسی سزا کے بھی مستحق ہوں لیکن آپ جیسی بقراط لڑکی پیدا کرنے کے صلے میں انھیں پدم بھوشن کا خطاب ضرور مل جانا چاہئے!"

دن رات، ہر وقت



ماڈل ۳۶-ایل ۵
۵ ٹیوب ۴ بینڈ اے سی سیٹ
مختلف ٹون کنٹرول
۲۵۰ روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۳۰ روپیہ علاوہ ٹیکس

ماڈل بی زیڈ-۹۰۳ (پورٹیبل سیٹ)
۹ ٹرانسسٹر-۴ بینڈ
فائن ٹیوننگ
۲۷۵ روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۳۰ روپیہ علاوہ ٹیکس

ماڈل بی ایکس ایس ۳۸۰ (پورٹیبل سیٹ)
۸-ٹرانسسٹر ۲-بینڈ
ٹون کنٹرول
۲۲۵ روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۲۰ روپیہ
علاوہ ٹیکس

ماڈل ۷-ایل ۵۷
۲-ٹون کنٹرولز
۵ بینڈ ۷-ٹیوب
۲ اسپیکر ہائی فائیڈیلٹی اے سی
۵۷۵ روپیہ
ایکسائز ڈیوٹی ۳۴ر۹۳
علاوہ ٹیکس

شارپ ریڈیو آپ کی زندگی کو پُرمسرت بناتا ہے

طاقت ور اور قابلِ اعتماد، شارپ ریڈیو گھروں کے پسندیدہ ہیں۔ ہر سمجھدار سننے والے کے پسندیدہ ہیں۔
مناسب قیمتوں میں عالیشان اسٹائل کے باعث یہ اُن اصحاب کی قدرتی پسند ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کارکردگی بھی چاہتے ہیں۔
یاد رکھیں! شارپ جھنکار ریڈیو جاپان کی ہایاکاوا الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ کی تکنیکی تال میل کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں جو بہترین کوالٹی کا مال تیار کرنے میں دنیا بھر میں مشہور ہے۔

SHARP RADIO

انڈین پلاسٹکس لمیٹڈ۔ ٹوکس ہاؤس۔ بمبئی ۱

[redacted]

میں نے ریشہ خطمی بنتے ہوئے کہا: "میں کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں بابوجی کا۔ انھوں نے تو میرے ساتھ وہ کیا جو میرے باپ بھی نہ کرتے! رہا وہ شبھ کام تو اُس کیلئے میں بالکل تیار ہوں۔ آپ میرے چاچا جی سے باتیں طے کر لیجیے۔ سچ پُوچھیے تو اِس رشتے ہی کی خاطر میں نے ملازمت کے یہ سب پاپڑ بیلے تھے ورنہ آپ بزرگوں کی دعا سے باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جائیداد میرے جیسے ایک کیا دس کے لئے کافی ہے! البتہ ایک بات ضرور ہے!"

ہماری باتوں سے جگادری مل کی باچھیں کِھلی جا رہی تھیں لیکن دفعتہً ہمارے آخری جملے سے اُنھیں بجلی کا کرنٹ سا لگا اور اُن کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا۔

"وہ کیا؟ وہ کیا؟" انھوں نے بوکھلا کر پُوچھا۔

"وہ صرف یہ کہ اِس رشتے کے متعلق آپ اپنی صاحبزادی کی رائے ضرور لے لیجیے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہر معاملے میں اپنی بھی رائے رکھتی ہیں۔"

"ہاں! ہاں! بالکل!" جگادری مل پھر اپنی طبعی عمر کو لوٹ آئے اور بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوشی خوشی پھُدکتے چلے گئے۔

چار دن کے بعد ۔۔۔ اور اسی عرصے میں ہم دفتر میں باقاعدہ ملازم ہو چکے تھے اور چورن بابو نہ صرف ہمیں روزانہ چائے پلاتے اور ناشتہ کراتے بلکہ اکثر تنہائی میں "دولہا بابو" کہہ کر ہمیں ورغلاتے کہ ہم جگادری مل سے کہہ کر سبھی پکی اور کچی مسلیں اُن کے سپرد کرا دیں اور ہمارے اور اُن کے درمیان معاملہ ففٹی ففٹی کا رہے گا ۔۔۔ کملا نے بملا کو اپنے گھر بُلایا اور بھولو چاچا نے ہمیں زبردستی ایک پردے کے پیچھے چھپا دیا جہاں سے ہم اُن کی باتیں سُن سکیں۔

کملا بولی: "بملا! میں تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی تم نے میرے بھائی کو نوکری دلا کر . . ."

بملا نے بات کاٹ کر کہا: "چھوڑو بھی اِس بات کو۔ تمھارے بھائی ہیں تو آخر میرے بھی تو کچھ ہوئے۔"

"بابوجی نے تم سے پُوچھی وہ بات؟"

"ہاں بھابی کے ذریعے پُچھوائی تھی!"

"پھر کیا کہا تم نے؟ بہت بگڑے ہوں گے تم پر؟"

"بگڑتے کیوں آخر؟ میں نے کہا جو آپ کی رائے وہ میری رائے!"

"یعنی منظور کر لیا رشتہ تم نے؟" کملا نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پُوچھا۔

"اور کیا کرتی؟" بملا نے بڑی بے نیازی سے کہا۔

"تمھیں تو میرے بھائی کی پھلوری جیسی ناک، بٹن جیسی آنکھیں اور بوچے بوچے کان کے خیال ہی سے گھن آتی تھی؟" کملا تو جیسے لڑنے پر تُل گئی۔

"ہاں جب وہ ایک بے روزگار کے چہرے پر لگے ہوئے تھے! لیکن تم کتنی ناسمجھی کی باتیں کرتی ہو کملا؟ شوہر کی ناک کان اور آنکھیں نہیں دیکھی جاتیں اُس کے ہاتھ دیکھے جاتے ہیں۔ بھینس کی شکل کو کون دیکھتا ہے اُس کے تھنوں کا دودھ دیکھا جاتا ہے!"

"کیا مطلب؟"

"جو ہاتھ مجھے سونے کی چپاکلی، جوشن اور پازیب پہنائیں گے اُنھیں میں کیسے بدصورت کہہ سکتی ہوں!" اور پھر وہ بچوں کی طرح اِس بیساختگی سے کھلکھلا کر ہنسی کہ اُس وقت وہ ہمیں بھی ایک دو کیا دس بیس حسینوں میں ایک نظر آئی!

پردے سے باہر نکل کر اُس کی ہنسی میں شریک ہوتے ہوئے ہم نے کہا: "بملا دیوی جی! آپ کے پتا رشوت خوری کے سلسلے میں کسی سزا کے بھی مستحق ہوں لیکن آپ جیسی بقراط لڑکی پیدا کرنے کے صلے میں اُنھیں پدم بھوشن کا خطاب ضرور مل جانا چاہئے!"

ادیب کی محبوبہ

راجہ مہدی علی خاں مرحوم

تمہاری اُلفت میں ہارمونیم پہ میرؔ کی غزلیں گا رہا ہوں
بحران میں چھپے ہیں نشترؔ، جو سب کے سب آزما رہا ہوں

بہت دنوں سے تمہارے جلوے خدیجہ مستورؔ ہو گئے تھے
ہے شکرِ باری کہ سامنے اپنے آج پھر تُم کو پا رہا ہوں

لحافِ عصمتؔ کا اوڑھ کر تم فسانے منٹوؔ کے پڑھ رہی ہو
پہن کے بیدیؔ کا "گرم کوٹ" آج تم سے آنکھیں مِلا رہا ہوں

تمہارے گھر ن۔م۔راشدؔ کا لے کے آیا سفارشی خط
مگر تعجب ہے پھر بھی تم سے نہیں میں کچھ فیضؔ پا رہا ہوں

بہت ہے سیدھی سی بات میری نہ جانے تم کیوں نہیں سمجھتیں
قسم خدا کی کلامِ غالبؔ نہیں میں تم کو سُنا رہا ہوں

تمہاری زُلفِ سیہ پہ تنقید کس سے لکھواؤں تم ہی بولو
شری عبادتؔ بریلوی کو میں تار دے کے بُلا رہا ہوں

میں تم پہ ہوں جاں نثار اخترؔ، قسم ہے مُنشی فداؔ علی کی
بہت دنوں سے میں تم پہ ساحرؔ سے جادو ٹونے کرا رہا ہوں

اگر ہو تم ہاجرہ تو پھر مجھ سے مِل کے مسرورؔ کیوں نہیں ہو؟
تمہارے آگے اوپندرناتھ اشکؔ بن کے آنسو بہا رہا ہوں

حسین ہو زہرہؔ جمال ہو تم، مجھے سَتا کر نہال ہو تم
تمہارے یہ ظلم قرۃ العینؔ کو بتانے میں جا رہا ہوں

مری محبت کی داستاں سُن کے رو پڑے جوشؔ ملسیانی
شکھا کے پنکھے سے اُن کے آنسو ابھی وہاں سے میں آ رہا ہوں

پِلا دو آنکھوں سے، تاکہ مجھ کو کچھ آلِ احمد سُرورؔ آئے
بہت ہیں غم مجھ کو عاشقی کے، پیئے بِنا ڈگمگا رہا ہوں

مری تباہی پہ چھاپ دیں گے، نقوشؔ کا ایک خاص نمبر
طفیلؔ صاحب کے پاس، سارے مسودے لے کے جا رہا ہوں

وزیر آغاؔ پٹھان ہیں، ساتھ ساتھ یاروں کے یار بھی ہیں
پکڑ کے وہ تم کو پیٹ دیں گے، میں کل انھیں ساتھ لا رہا ہوں

حکیم یوسف حسنؔ نے جب میری نبض دیکھی تو رو کے بولے
جگر ہے زخمی، تباہ گُردے، یہ بات تم سے چھپا رہا ہوں

ملیح آباد آج جا رہا ہوں، میں جوشؔ لاؤں کہ آم لاؤں؟
ہیں دونوں چیزیں وہاں کی اچھی، میں لاؤں کیا تِلمِلا رہا ہوں

جو حکم دو واجدہ تبسمؔ کا کچھ تبسم میں تم کو لادوں
تمہارے ہونٹوں پہ غم کی موجوں کو دیکھ کر تلملا رہا ہوں

فسانۂ عشق مختصر ہے، قسم خُدا کی نہ بور ہونا
فراقؔ گورکھپوری کی غزلیں نہیں میں تم کو سُنا رہا ہوں

مری محبت کی داستاں کو گدھے کی مت سرگزشت سمجھو
میں کرشن چندر نہیں ہوں، ظالم یقین تم کو دلا رہا ہوں

غالب قاتلانِ انبہ کے نرغے میں

پروفیسر غلام احمد فرقت کاکوروی ایم۔اے

۵-۱۷۰، پہاڑی بھوجلہ۔ دلّی

۲۸ جولائی ۶۶ء

ڈیر خوشتر گرامی!

تم تو بڑے چھپے رستم نکلے! ادیبوں کا مہنگائی الاؤنس بڑھانے میں تم نے یو۔پی سرکار کی دُم پر پیر رکھ دیا اور ساری سرکاروں سے سبقت لے گئے! خدا کرے بغیر جنس بدلے یو۔پی کے چیف منسٹر ہو جاؤ اور تمھارے خلاف کبھی عدم اعتماد کا ووٹ نہ آئے۔ اِس بیسویں صدی میں کیسی کیسی ادائیں دکھاتے ہو اور پھر ——

یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

اِس بار دلّی اور لکھنؤ میں وہ قیامت کی گرمی پڑی ہے کہ دوزخ کا سارا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا۔ میر انیس نے اب سے سو برس پہلے جو بات کہی تھی وہ تم نے جمنا میں اور میں نے گومتی کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھ لی ع

ماہی جو سیخِ موج پہ آئی کباب تھی

اور کباب بھی کہاں کے، لکھنؤ کے مشہور و معروف کبابی ٹنڈے کے جسے دُور دُور سے خلقت کھانے لکھنؤ آتی ہے —— کیا کیا آگ پر لوٹنا پڑا ہے اِس دو مہینے میں اور کیسی کیسی کروٹیں لے کر راتیں گزاری ہیں

کباب سیخ تھے ہم کروٹیں ہر سُو بدلتے تھے
جو جل اُٹھتا تھا یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے تھے

میرے وطن یو۔پی کی راجدھانی میں ارزانیوں کی فراوانی اگر دیکھنا ہو تو ایک دن کے لئے چلے آؤ۔ اِس سال آموں کی ارزانی کے ساتھ ساتھ اِتنی بہت سی ارزانیاں دیکھنے میں آئیں کہ آنکھیں اب تک خیرہ ہیں — ہڑتالوں کی ارزانی، پولیس فائرنگ کی ارزانی، لاٹھی چارج کی ارزانی، پکڑ دھکڑ کی ارزانی، بھوک ہڑتال کی ارزانی —— یو۔پی کے سرکاری ملازمین کے گرانی الاؤنس کی مانگوں کی گرما گرمی میں جب لاٹھی چارج کے خُنک جھونکے چلتے تھے تو کانگریس کے لئے در و دیوار سے آوازیں بلند ہوتی تھیں ع

تم سلامت رہو ہزار برس!

اگر گرانی کی ہائی جمپ کا مزہ لوٹنا ہو تو اُس مقام سے دیکھو جہاں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کے حساب سے نیتا اپنی سالگرہ مناتے ہیں! —— یہاں امین آباد سے چوک تک بارہ آنے سواری کا کھلا بھاؤ ہے۔ رکشا والوں کی یومیہ آمدنی دیکھ کر بار بار دل چاہتا تھا کہ معلّمی پر لات مار کر رکشا کشی شروع کر دو اور زندگی کے سارے مزے لوٹ لو۔ جس روز سیکریٹریٹ کے اندر لاٹھی چارج ہوا اُس دن تمھاری یاد نے بار بار دل کو ٹہوکے دئے کیونکہ اُردو کی حمایت میں میں نے دلّی میں مشعلوں کی روشنی میں ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کرتے تمھیں دیکھا ہے اور تم میں وہ سارے جراثیم بدرجۂ اتم موجود ہیں

جن سے ایک تھیں اچھا بھلا انسان وزیر بن جاتا ہے۔ تمھیں اندازہ ہوگا کہ انھیں ڈنڈوں کے سہارے بہت سے لوگ وزارت کے کوٹھے پر پہنچ گئے۔ تمھیں یاد ہوگا، سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے سلسلے میں جو ڈنڈے بازی ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی، سنہیں نہیں کر کے جس نے گردن پر ڈنڈے کھائے تھے وہ چیف منسٹر ہو گیا۔ اِس لئے تم بھی دو ایک مُٹھی ڈنڈے کھا کر دیکھو تو مزہ نہ ہو تو دام واپس! ——— یہ مضمون آموں سے متعلق ہے جس کے نرغے میں غالب آگئے ہیں۔ ہائے جس وقت یہ کانفرنس ہو رہی تھی میری نگاہیں تمھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ خیر ذکر العیش نصف العیش! ——— اُردو کے ساتھ جو الطاف کریمانہ ہو رہے ہیں انھیں دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔ یہ ریڈیو پر جو نو گھنٹے یومیہ کا اُردو پروگرام شروع ہوا ہے وہ ناگپور یونیورسٹی میں اُردو کو اختیاری مضامین سے خارج کر کے اور اُس کا عرق نکال کر عوام کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

سیاست کی اِس عرق ریزی کی داد دو ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے — دونوں کی طلب گار ہے سرکار ہماری

جس طرف نظر اُٹھتی ہے گرمی ہی گرمی نظر آتی ہے۔ آفتابِ سیاست کی ایک اور گرما گرمی دیکھو کہ مسلمانوں نے جن سنگھ میں شامل ہونا شروع کر دیا ؎

یہی وہ دھوپ ہے جس میں کہ ہوتے ہیں ہرن کالے

مخلص ——— غلام احمد فرقت کاکوروی

مولانا تحیر بہوروی کی تحریک پر مولانا محمد حسین شمس پروپرائٹر انوار بک ڈپو لکھنؤ نے اپنے دولتکدے واقع نعمت اللہ روڈ پر پروفیسر احتشام حسین کے اعزاز میں آموں کی دعوت کی اور اُس دعوت کا عنوان "غالب اور آم" تجویز کیا۔ مولانا شمس آموں کے اِس درجہ شوقین ہیں کہ سال بھر دونوں وقت اُن کا دسترخوان آموں کی مختلف البطن چٹنیوں، مربّوں اور اچاروں سے مزیّن رہتا ہے۔ آموں کی فصل شروع ہونے سے پہلے جب آم کے درخت میں بَور آنا شروع ہوتا ہے تو یہ "بَور" کی پھنکی بنوا کر صبح و شام پھانکنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب اُس میں ننھی ننھی کیریاں آنے لگتی ہیں تو انھیں چھالیا کی طرح کتروا کر پان میں کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ جب کیریوں میں گٹھلیاں پڑ جاتی ہیں تو اُن کی سخت گٹھلیوں کو تڑوا کر اُبلواتے ہیں اور ہاضمہ درست کرنے کے لئے کھاتے ہیں۔ اُس کے خول کو سر گھٹوا کر چندیا پر رگڑواتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِس سے سر کی ساری خشکی بھوسی بن کر نکل جاتی ہے۔ بڑی کیریوں کی پال ڈلوا کر سویرے شام آم کھانے کا ریہرسل فرماتے ہیں اور جب سیپ ٹپک جاتی ہے تو اُس کی چھیپی سے دانت مانجھ کر فرماتے ہیں کہ "دانتوں کے کیڑے مارنے کی اِس سے بہتر کوئی دوا حکیم ڈاکٹر آج تک تیار نہ کر سکے" اور پھر دن میں دو دو تین تین بار آموں پر اِس طرح یورش کرتے ہیں جس طرح ہمارے ملک کے نیتا عہدوں پر اور دیش کی جنتا راشن پر۔

راقم الحروف نے بارہا مولانا کو اُن کی عاقبت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ دیکھو یار! کسی بے زبان پر اِتنا ظلم نہیں کرتے کیونکہ خدا ناکردہ اگر میدانِ حشر میں اِن آموں میں جان پڑ گئی تو ہر آم داورِ محشر سے فریاد کرے گا کہ ہر محفل میں مولانا نے ہمارا چرسا اِس طرح کھینچا ہے کہ کانگریسی دَور میں جنتا اپنی چرسا کھنچوانی بھول گئی تھی۔ اِس پر مولانا پر "جوں" تک نہ رینگی۔ اور اُنھوں نے ہماری نصیحت کی طرف سے اِس طرح منہ پھیر لیا جس طرح ملک کے اربابِ حل و عقد جنتا کی مشکلات اور عام گرانی کی طرف سے منہ پھیرے ہوتے ہیں! ہم نے کہا: "یار دیکھو مولانا! میدانِ حشر میں آم تم پر وہ گھونسے بازی کریں گے کہ یو۔ پی اسمبلی کے ممبران اپنی جوتم پیزار اور گھونسہ بازی بھول جائیں گے۔ مگر ؎

کون سُنتا ہے فغانِ درویش

اِس جلسے میں پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل، ڈاکٹر شجاعت سندیلوی، ضیا عظیم آبادی، منظر سلیم، پروفیسر نجم الدین نقوی، عادل رشید، مولانا شبیر احمد غوری اور دوسرے قاتلانِ انبہ شریک تھے اور صدارت کے فرائض مقبول احمد لاری انجام دے رہے تھے جو جسمانی اعتبار سے "یا مالدہ" کی تلاوت کرتے جا رہے تھے۔ غرض شرکا میں کچھ فجری کچھ کچوری، کچھ تخمی، کچھ قلمی، کچھ پال کے، کچھ ڈال کے اور کچھ بھدیاں قسم کے انبہا ادیب شریک تھے۔

ان میں صوفی مولانا شمس جنھوں نے آموں کی نسل کشی زمانے کا انتظام کیا تھا اور آم کھاتے کھاتے اِس درجہ ریشہ دار ہوگئے تھے کہ آموں کے ریشے اُن کے دونوں کلّوں کو پھاڑ کر داڑھی کی شکل میں باہر نکل آئے تھے اور یہ غالباً کسی تخمی آم کا صبر تھا جو اُن کے چہرے پر اِس شکل میں نمودار ہوا تھا۔ اِس بزم میں جسے آموں کی رزم گاہ یا قتل گاہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، خیر صاحب، پروفیسر احتشام حسین اور مابدولت کو غالب اور آم کے موضوع پر تقریریں کرنا تھیں۔

مولانا خیر نے غالب کو تمام عمر اِس کثرت سے استعمال کیا تھا اور اِس قدر پڑھا تھا کہ اُنھیں آخر عمر میں مجبوراً بنارس میں ایک فیکٹری غالب اکیڈمی کی شکل میں قائم کرتے بن پڑا۔ غالب کی نادر تحریریں پڑھتے پڑھتے وہ غالب کی اُس تصویر سے ملنے لگے تھے جس میں وہ سوالیہ جملے کا نشان بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے پاس غالب کی قلمی تصاویر، اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط، ان کے اعضائے جسمانی کی نشست و برخاست کے اوقات، داڑھی مونچھوں کی بناوٹ، ان کے دہانے کی ناپ، ان کی کمر کی چوڑائی، شب میں سونے والے انگوچھے کے دھاگے اور اُن کے جام سفال کے ٹکڑے تک محفوظ ہیں جو وہ بہت کم لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ کیا عجب ہے جو حضرت آدم کی منگنی کے خط کی نقل، بی حوّا کی رخصتی کی تفصیل، اُن کی اولادوں کے عشقیہ خطوط اور داورِ محشر کے اُس حکم کی نقل بھی موجود ہو جس کے تحت آدم کو جنّت سے نکالا گیا تھا۔ غرض خیر صاحب کی جھولی میں اِس دُنیا کی تشکیل سے پہلے اور مابعد کی اِتنی چیزیں محفوظ ہیں کہ اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ آدم جنّت سے بجائے خوشۂ گندم کے ثمرِ بہشت لے کر بھاگے تھے تو کسی میں اِتنی جرأت نہیں کہ وہ اِن کے اِس دعوے کی تردید کر سکے کیونکہ اُن کے پاس یقیناً اِس کا بھی تحریری ثبوت موجود ہوگا۔

اِس بزم میں مولانا خیر نے اپنی تقریر آموں کی وجہِ تسمیہ سے شروع کی اور بتانا شروع کیا کہ راماین اور مہابھارت کے زمانے میں آم، امر کہلاتا تھا بلکہ راماین میں بھی اِس کا ذکر موجود ہے۔ اُنھوں نے اور پُران اور ویدوں کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اُس زمانے میں کس کس قسم کے آم پائے جاتے تھے کن کن دیوتاؤں کو آم پسند تھے۔ کتنے دیوتا قلمی آم کھاتے تھے اور کتنوں کو تخمی مرغوب تھے۔ وہ آم گھلا کر کھاتے تھے یا کاٹ کر۔ بیٹھ کر کھاتے تھے یا کھڑے کھڑے۔ امیر خسرو آم کھا کر گٹھلیاں پھینک دیتے تھے یا اُنھیں نظام الدین اولیاء میں کنوئیں یا حوض کے قریب بو دیتے تھے۔ غرض وہ جس وقت تقریر کر رہے تھے تو میری نگاہ اُن کونڈوں، ٹبوں اور دیگوں کی طرف تھی جس میں برف کے پانی میں مختلف البطن اور حسب نسب سے درست آم بھیانک ہو ہو کر اور پانی سے مُنہ نکال نکال کر خیر صاحب اور دوسرے قاتلانِ انبہ کی طرف دیکھ رہے تھے جو ادیبوں کی بھگل بنائے آموں کے بارے میں تقریریں سُن رہے تھے۔ تمام آم یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیے کب ان تقریروں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور کب سارے ادیب چاقو لے کر اُن کی گردن پر اِس طرح سوار ہو جاتے ہیں جس طرح بقرعید کی نماز پڑھنے کے بعد ہر قصائی بکرے پر چڑھ بیٹھتا ہے اور وہ غریب "بھیں" کر کے رہ جاتا ہے۔

ایک دسہری آم جو خاصا لیم شحیم تھا مسٹر نجم الدین نقوی کے دیو پیکر اور سُرخ و سفید جسم اور ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر بار بار پانی میں مُنہ چھپائے لے رہا تھا کہ کہیں وہ اُسی سے بسم اللہ نہ شروع کر دیں۔ وہ دیگ کی تہہ میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ کُل مجمع میں سب سے بڑا پہلوان یہی شخص ہے۔

کچھ لنگڑے جو کونڈوں میں تیر رہے تھے وہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی پر نگاہیں گڑوئے ہوئے تھے اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ کاش بجائے آموں کے اِس وقت ہم بکرے ہوتے جنھیں عام طور پر لنگڑا ہونے کی صورت میں شرعاً ناقابلِ قربانی سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے مگر وہ ڈاکٹر صاحب کے نحیف الجثہ ہونے کے سبب زیادہ خوفزدہ نہ تھے اور اِس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ شخص معدے کی کمزوری کا بہانہ کر کے کسی آم پر دستِ ستم دراز نہ کرے گا۔ اور تقریریں ختم ہوتے ہی شربت کا گلاس پی کر مولانا کے سامنے سلام کرائی کی رسم ادا کرتا ہوا چل دے گا۔

"تواریخ وفاتِ طوطیٔ ہند مہدی علی"

۱ ۹ ۶ ۶ ء

"از گلشنِ معنی اختر واصفی"

۱ ۹ ۶ ۶ ء

دل پہ اختر کے ہوا کیا مرگِ مہدی سے اثر
کیا بتاؤں تجھ کو میں اے خوشترِ اندوہگیں!
ہائے وہ رنگیں نوا شاعر ادیبِ زندہ دل
جس کا ثانی ڈھونڈنے سے بھی نہ پائیں گے کہیں
کونسے حاسد کی اُس کو کھا گئی وائے نظر
بزمِ یاراں کی ابھی کل تک وہ رونق تھا یہیں
آج "آوازِ حزیں" سے کہہ دیا ہاتف نے یہ
"ہو گیا مہدی علی خاں عازمِ خلدِ بریں"

۱۹۶۶ء = ۹۰ + ۱۸۷۶

اختر واصفی ڈگو جرانوالہ، مغربی پاکستان



ایک مالدہ جو کامراج کے نکالے ہوئے وزیروں سے بھی زیادہ کھسیا ہٹ محسوس کر رہا تھا دل ہی دل میں احساسِ کمتری محسوس کرتے ہوئے "مقبول احمد لاری" کی طرف ٹکٹکی جمائے دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ یہ شخص مجھے اپنا نوزائیدہ بچہ سمجھ کر چھری کا رُخ دوسرے آموں کی طرف پھیر دے گا اور اُس کی جان بچ جائے گی۔

ایک سفیدہ آم بیک وقت ڈاکٹر خلیل اور ڈاکٹر شجاعت سندیلوی کی طرف دیکھ دیکھ کر دانت پیس رہا تھا اور چپکے چپکے کہہ رہا تھا جن کی بدولت یہ آج سُرخ و سفید بنے ہوئے ہیں، اُسی پر دانت تیز کر رہے ہیں۔ ان کی حیثیت آموں کی نظر میں اُن باغی کانگریسی لیڈروں سے کم نہ تھی جو کانگریس کی بدولت بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر راجہ پورس کے ہاتھیوں کی طرح اب اپنی ہی فوج کو روندنے پر آمادہ ہیں اور جس برتن میں کھاتے ہیں اُسی میں چھید کرتے ہیں اور ایسے بھولے بھالے بنے ہیں کہ ہمہ تن گوش بنے تقریریں سن رہے ہیں لیکن ہم خوب سمجھتے ہیں ع

بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

ایک آم جس کی ولدیت خود اُسے یاد نہ تھی مولانا شبیر احمد خاں غوری کو بغور دیکھ رہا تھا کہ یہ بے چارے اِن قاتلوں میں کیسے پھنس گئے کیونکہ یہ تو اِس رشوت ستانی کے دَور میں بھی رشوت کی طرف سے پیٹھ کر کے "اللہ ہُو، اللہ ہُو" کے عادی ہیں اور اب سے تیرہ سو برس پہلے کے مسلمان معلوم ہوتے ہیں جنھیں فرشتوں کی فروگزاشت کے تحت غلط موقع پر اور غلط جگہ پیدا کر دیا گیا ہے۔ ایسے صوم و صلوٰۃ کے پابند معصوم صفت انسان روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں جو زبان درازوں پر ہاتھ اُٹھانا نہیں جانتے بھلا وہ ہم بے زبانوں پر کیا ہاتھ اُٹھائیں گے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ غوری صاحب تخمی آم سے زیادہ نرم اور گداز دل والے انسان معلوم ہوتے تھے اسی لئے آموں کو یقین تھا کہ جس وقت اشقیا اُن پر ہر چہار طرف سے ہلّہ بولیں گے اُس وقت خدا اور رسول کا واسطہ دیتے ہوئے یہ پُورے مجمع کا رُخ کلام پاک کی آیتیں پڑھ پڑھ کر دوسری جانب موڑ دیں گے چنانچہ وہ دوسرے گھبرائے ہوئے آموں پر خندہ زنی کر رہا تھا۔

ضیاء عظیم آبادی اور عادل رشید ندوی کی طرف کچھ سُرخے اور کچھ بمبئیا گھبرا گھبرا کر دیکھ رہے تھے اور اِس سوچ میں تھے کہ کہیں یہ آل انڈیا قتلِ انبہ کانفرنس تو نہیں ہے جس میں بمبئی اور بہار اور ندوے تک کے قصّاب شریک ہیں! انھیں یقین ہو چلا تھا کہ یقیناً بمبئی اور پٹنہ میں بھی آموں کی قتل گاہ کی کوئی شاخ کھلنے والی ہے۔ اِس لئے اِس سلسلے میں مشورہ کرنے کی خاطر انھیں دعوت دی گئی ہے۔ عظیم آبادی صاحب پستہ قد اور دُبلے پتلے آدمی تھے اور آموں کا خیال تھا کہ دو ہی ایک بار میں اُن کا ننّا سا معدہ جھُول جائے گا اور وہ اِس طرح آموں کے قتلِ عام سے تائب ہو جائیں گے جس طرح کانگریسی گاندھی جی کی نصیحتوں سے تائب ہیں کیونکہ یہ بے چارے چہرے سے بھی اہنسا کے مریض معلوم ہوتے تھے۔ اِسی لئے اُنھوں نے مقبرۂ عالیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ البتہ عادل رشید صاحب کے آگے ندوے کا لفظ لگا ہوا تھا۔ اس لئے ہر آم اُنھیں اندر سے مولوی سمجھے ہوئے تھا اگرچہ اُنھوں نے بظاہر اپنی مولویانہ "حرکات" مُدّت سے چھوڑ رکھی تھیں اور اُن دونوں آموں کو یہ اندیشہ کھائے جا رہا تھا کہ مولویوں کے ٹخنوں میں بھی معدے کی شاخیں گھر کر لیتی ہیں اگرچہ عادل صاحب کی مخمور آنکھیں پکار پکار کر اُن کے مولوی ہونے کی تردید کر رہی تھیں۔ پھر بھی اُس وقت ان بے زبان آموں کو ہر شخص قاتل نظر آ رہا تھا۔

آموں کے پُورے مجمع میں ایک حیرت انگیز بات یہ دیکھنے میں آئی کہ ہر آم منظر سلیم سے حد درجہ خوفزدہ اور متنفر تھا اور ایک دوسرے کو انتہائی یتیمانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سراسیمگی میں یوں حق بجانب تھے کہ منظر سلیم آموں کا زیادہ سے زیادہ خونی منظر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ "قومی آواز" میں اُنھیں ایک بہت بڑے قتلِ عام کی خبر لکھنے کو مل جائے۔ اِسی لئے کیا قلمی اور کیا تخمی سبھی آم چاہتے تھے کہ شخص زیادہ سے زیادہ اپنا کلام سامعین کو سُنا کر واہ واہ سے پیٹ بھر لے اور کم سے کم اُن پر دستِ ستم دراز کرے۔ جب اُن سے دوسری غزل پڑھنے کی فرمائش کی گئی تو تمام آموں نے اطمینان کی سانس لی اور اُن کے ہر شعر پر "لبیک" کہا۔ اُنھیں دوسری غزل پر پہلی غزل سے زیادہ داد ملی اور تمام تخمی اور قلمی آموں نے ایک مالدے کے خلاف سازش کر کے طے کیا کہ منظر سلیم صاحب کے اوّلین وار کو روکنے کے لئے مالدے کو قربانی کا بکرا بنایا جائے۔

لیکن مولانا شمس کو آموں کا پُورا مجمع اِس وجہ سے بآوازِ بلند صلواتیں سُنا رہا تھا کہ اُنھیں کے زیرِ اہتمام یہ مقتل بپا ہونے والا تھا اور ہر آم یہ طے کئے بیٹھا تھا کہ مولانا جس آم کی گٹھلی چوسیں وہ بلا رو رعایت اپنی گٹھلی مولانا کے حلق میں جام کر دے تاکہ مولانا آم کھانے کے لئے لوگوں سے زیادہ اصرار نہ کریں۔

پروفیسر احتشام حسین جب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اُنھوں نے تقریباً پینتالیس منٹ ایسی عالمانہ تقریر کی کہ تمام قاتلانِ انبہ یہی بھُول گئے کہ اُنھیں آم کھانے کی دعوت دی گئی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے معلومات کے دریا بہاتے ہوئے غالبؔ اور آموں سے متعلق غالبؔ کے ایسے خطوط کے حوالے دئے کہ مولانا تخیر کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرت سے بڑھنا شروع ہو گئیں وہ بار بار آنکھوں تک رومال لے جا کر اُنھیں اپنی جگہ لانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ اُنھوں نے اپنی تقریر میں غالبؔ کے ایسے ایسے خطوط کے

حوالے ملتے جن میں یہ تک درج تھا کہ غالب نے کن کن لوگوں کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں آموں کی سپلائی کرانے اور آموں کو اُن کے آموں کی شکارگاہ تک لانے کے لئے تعینات کر رکھا تھا اور آموں کی فصل شروع ہونے سے کتنے عرصے پہلے وہ لوگوں کو خطوط لکھنا شروع کرتے تھے کہ

اِس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے!

اُنھوں نے یہ بھی بتایا کہ کتنے لوگ آموں کے ٹوکرے جوڑ بٹور کر بھیجتے تھے کتنے ٹوکرے آم بذریعہ ٹرین آتے تھے اور کتنے ریلوے والے آج کل کی طرح آموں کی جگہ پوری دیانتداری سے آموں کی پیٹیوں میں کنکر پتھر بھر دیا کرتے تھے یا یہ کہ غالب کی زندگی میں آموں کے کتنے دانے راستے میں سڑ کر ضائع ہو جاتے تھے اور کتنے اُنھیں ثابت و سالم پہنچتے تھے۔

احتشام صاحب کو قلمی اور تخمی آم بحیثیت چوٹی کے تنقید نگاروں کے جانتے تھے اِس لئے اُنھیں خیال تھا کہ سب سے پہلے وہ الٰہ آباد کے امرودوں اور ملیح آباد کے آموں کو سائنٹفک تنقید پر کسیں گے اور بحیثیت پھل دونوں کی افادیت پر ترقی پسندانہ انداز میں روشنی ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ مارکسی ترقی پسند دونوں پھلوں میں سے کس پھل کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ روس والے امرودوں اور آموں کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ دونوں پھلوں میں کون سا پھل کمیونسٹوں کو مرغوب ہے۔ اور اُس کے بعد بتائیں گے کہ آم کا چھلکا زیادہ ترقی پسند ہے یا اُس کا گودا۔ مزدوروں کو موجودہ کانگریسی دَور میں آم کی گٹھلی پر زندگی بسر کرنا چاہیئے یا اُس کے چھلکوں پر۔ سماجی قدریں آم کی گٹھلی میں زیادہ پائی جاتی ہیں یا اُس کے چھلکے میں۔

احتشام صاحب کی تقریر جتنی زیادہ طویل ہوتی جاتی تھی آم اُتنے ہی زیادہ مگن تھے اور پانی میں غوطے لگا لگا کر داد دے رہے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ دیر تک اُنھیں اِس دُنیا میں سانس لینے کا موقع مل جاتے۔ احتشام صاحب کا چہرہ گول ہے اس لئے جو آم ذرا گول تھے، وہ یہ سوچ کر مطمئن تھے کہ احتشام صاحب گولائی کی رعایت سے اُن پر ہاتھ نہ ڈالیں گے اور دو ایک آم کھا کر اور روس کی مثال دے کر امن کا پرچم لہرا دیں گے۔ اور نفیس قسم کے آم کھانے کو سرمایہ دارانہ ذہنیت قرار دیں گے۔ اِن معرکتہ الآرا تقریروں کے بعد جب خاکسار نے دیکھا کہ آم اور غالب کے موضوع پر جو کچھ کہنا تھا وہ سب کچھ یہ دونوں صاحبان کہہ چکے تو اس کے بعد بغلیں جھانکنے کے سوا اِس خاکسار کے پاس رہ ہی کیا گیا تو راقم الحروف نے کہا ——————

"حضرات! میں اِس حقیقت سے ہرگز ہرگز روگردانی نہ کروں گا کہ جہاں تک آموں کے قتلِ عام کرانے کا تعلق ہے، غالب اپنے دَور میں ہلاکو اور چنگیز خاں سے کسی طرح کم ظالم نہ تھے لیکن اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پروفیسر احتشام حسین جن کے اعزاز میں آموں کا یہ قتلِ عام ہونے جا رہا ہے، اِن کے مقابلے میں غالب کی حیثیت ایک طفلِ مکتب سے زیادہ نہ تھی۔ نہ صرف آموں کا مقتل بپا کرنے میں غالب ہمارے معزز مہمان سے میلوں پیچھے تھے بلکہ دوسری صلاحیتوں میں بھی اِن کا اور غالب کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ آپ حضرات نے غالب کے خطوط کا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان کی "دربارِ مغلیہ" اور "دربارِ رام پور" سے وابستگی کی تفصیلات بھی پڑھی ہیں لیکن آپ حضرات میں سے کوئی صاحب کوئی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں جس میں غالب کو اُن کی زندگی میں کسی ایک رئیس یا مولانا نے اِتنی گرانی کے زمانے میں اِتنے نفیس اور لحیم شحیم آموں پر اِتنے لوگوں کے ساتھ مدعو کیا ہو؟ اور اپنے ہاتھوں سے حسین سے حسین اور قیمتی سے قیمتی آم کے قتل کی آنکھ بند کر کے اجازت دے دی ہو۔

غالب پروفیسر احتشام حسین سے زیادہ معمر ہونے کے باوجود بیکار رہے۔ لے دے کر ایک مرتبہ دلّی کالج میں معلمی کے لئے درخواست لکھ کر فینس میں تشریف لے گئے تھے لیکن جب بھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہے اور جیسے گئے تھے ویسے اپنے گھر واپس آ گئے جب پروفیسر احتشام حسین نے ایم۔ اے کرتے ہی لکھنؤ یونیورسٹی میں اُردو لکچرر کی جگہ حاصل کر لی اور اب الٰہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ غالب نے تمام عمر فارسی اُردو، حکمت اور نجوم پڑھا مگر ایم۔ اے تو بڑی چیز ہے ہائی اسکول بھی تھرڈ ڈویژن نہ پاس کر سکے۔ غالب نے اگرچہ زندگی بھر مکتوب نگاری اور شاعری کی لیکن زندگی میں اُنھیں وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو پروفیسر احتشام حسین نے ۴۵ سال کی عمر میں حاصل کر لی۔ غالب نے اِتنی بڑی عمر میں صرف چند کتابیں اور لے دے کر ایک دیوان مرتب کیا۔ وہ بھی اُن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا لیکن پروفیسر احتشام حسین کی درجنوں کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ غالب اُردو فارسی کے شاعر تھے یا زیادہ سے زیادہ مکتوب نگار لیکن پروفیسر احتشام حسین بیک وقت شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ ادیب بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ انگریزی میں بھی مضامین لکھ سکتے ہیں اور ہندی میں بھی۔ اِس معاملے میں بھی غالب اِن سے سبقت نہ لے جا سکے۔ غالب اپنی عمر میں زیادہ سے زیادہ رامپور، لکھنؤ، کلکتہ یا زیادہ سے زیادہ اکبر آباد سے دِلّی اور دلّی سے اکبر آباد آتے جاتے رہے اور اِس سفر میں بھی اُنھیں بیل گاڑی یا زیادہ سے زیادہ فینس مل سکی لیکن پروفیسر احتشام حسین کو جس سفر کے لئے جیسی سواری کی ضرورت ہوئی اُنھیں ملتی رہی۔ گھر سے یونیورسٹی جانے کے لئے رکشا، تانگہ اور سائیکل لکھنؤ سے دِلّی، الٰہ آباد

سرینگر، ناگپور، کلکتہ اور بمبئی وغیرہ جانے کے لئے ہوائی جہاز یا فرسٹ کلاس کا ریل کا ڈبّہ۔ ہندوستان کی شاید ہی کوئی یونیورسٹی ہو جہاں اِنھیں ماڈریشن یا وائیوا کے سلسلے میں نہ بُلایا گیا ہو۔ لیکن غالبؔ کو زندگی بھر وائیوا تو بڑی چیز کسی انٹرویو تک میں نہیں بُلایا گیا۔ پروفیسر احتشام حسین نے درجنوں مشاعروں کی صدارت اور سینکڑوں کانفرنسوں کا افتتاح کیا مگر غالبؔ کو کانفرنس تو بڑی چیز کسی محلّہ کی پنچایت تک میں بحیثیت صدر دعوت نہیں دی گئی۔ پروفیسر احتشام حسین امریکہ، لندن اور نہ جانے کتنے مغربی ممالک میں ہوائی جہاز کا دَورہ کر آئے لیکن غالبؔ کو ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ تک جانے کے لئے معمولی اُڑن کھٹولہ تک میسّر نہ ہوسکا۔ اِسی طرح بہ حیثیت انسان کے پروفیسر احتشام حسین نے زندگی بھر اپنے خاندان اور اپنے کُنبہ کی کفالت کی۔ لیکن غالبؔ کسی زمانہ میں خود اپنے کفیل نہ بن سکے۔ اِنھوں نے کبھی شراب پی نہ جوئے کے سلسلے میں جیل بھیجے گئے اور نہ کسی والیِ ریاست کی قصیدہ خوانی کی اور نہ کسی بغاوت کے الزام میں ماخوذ ہوئے۔ برخلاف اس کے غالبؔ کی تمام عمر اِس طرح کی فضول باتوں میں گزُر گئی۔ احتشام حسین کے سامنے ۴۲ء کا اندولن بھی ہوا۔ کمیونسٹوں کی پکڑ دھکڑ بھی ہوئی لیکن وہ ہمیشہ ایک شریف شہری کی حیثیت سے یہی کہتے رہے کہ میرا حصّہ دُور کا جلوہ!

مولانا شمس آموں سے خوب سیر ہوکر مہمانوں کو رخصت کرنے لگے تو آموں کے چھلکوں پر اُن کا پیر پھسل گیا۔ اِس پر ایک صاحب نے کہا حضرت اِتنا کھانے کے بعد بھی آپ آموں پر پھِسلے پڑ رہے ہیں! اِس پر مولانا کے پیٹ کی طرف دیکھ کر پروفیسر نجم الدین نقوی نے کہا ؎

یارب اِس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی!

اور قاتلانِ انبہ کی یہ کانفرنس قہقہوں کی گونج میں برخاست ہوگئی!!

غزلیں

رضا رامپوری

اگر ربطِ جبین و آستاں کچھ اور بڑھ جاتا
تو پھر یہ زندگی کا کارواں کچھ اور بڑھ جاتا

وہ اک موہوم سا بھی آسرا دیتے اگر دل کو
عجب کیا تھا مرا عزمِ جواں کچھ اور بڑھ جاتا

نگاہوں سے نگاہیں تو ملیں لیکن یہ حسرت ہے
جو دل ملتے حسابِ دوستاں کچھ اور بڑھ جاتا

جلا کر خاک کر دیتی اگر میرے نشیمن کو
تو میرا حوصلہ برقِ تپاں کچھ اور بڑھ جاتا

جنوں محدود رہتا یوں نہ دامن سے گریباں تک
اگر تھوڑا سا دستِ ناتواں کچھ اور بڑھ جاتا

رضا وہ میرے اشکوں کو سجا لیتے جو دامن پر
مری نظروں میں حُسنِ کہکشاں کچھ اور بڑھ جاتا

پروفیسر اختر نظمی، ایم۔اے۔بی۔ٹی

ہر خوشی ہر غم سے بیگانے رہے
ہم تو دیوانے تھے دیوانے رہے

گردشِ دوراں رہی سہمی ہوئی
جب تلک گردش میں پیمانے رہے

ہم تو بس اِک بات کہہ کر اُٹھ گئے
دیر تک محفل میں افسانے رہے

ہوش میں کم ہی رہے وہ بھی اِدھر
اِن دنوں کچھ ہم بھی دیوانے رہے

زندگی کے رازداروں میں تھے ہم
زندگی سے ہم ہی بیگانے رہے

ہم تھے نظمی میکدے سے دُور دُور
جن دنوں گردش میں پیمانے رہے

زہیر کنجاہی

کسی کی ہر ادائے جانستاں کو یاد کرتے ہیں
ستم جس نے کئے اُس مہرباں کو یاد کرتے ہیں

بس اب اِتنا تعلق رہ گیا ہے اپنا گلشن میں
قفس میں ہیں مگر ہم آشیاں کو یاد کرتے ہیں

مُبارک شیخ کو کعبہ، صنم خانہ برہمن کو
مرے سجدے تُمہارے آستاں کو یاد کرتے ہیں

پریشاں پھُول، آوارہ ہوائیں، دم بخود غنچے
یہ سب جیسے ہمارے آشیاں کو یاد کرتے ہیں

نظر آتی ہے خاک اُڑتی ہوئی جب آشیانے کی
تو ہم بے ساختہ برقِ تپاں کو یاد کرتے ہیں

زہیر اُس آستانے کی زیارت کو چلو تُم بھی
جہاں بندے خدائے دو جہاں کو یاد کرتے ہیں

بشیر احمد مستور صابری

دیکھ کر حُسنِ در و بامِ بُتاں گزرے ہیں
ہم ترے شہر سے اے جانِ جہاں گُزرے ہیں

جن کی خاطر تُو سرِ راہ گزر بیٹھا ہے
وہ ابھی اے دلِ بیتاب کہاں گُزرے ہیں

جو تری بزم میں تھے باعثِ صد کیف و سرُور
اب وہ نغمات سماعت پہ گراں گُزرے ہیں

چھین لی کِس نے وہ رنگینیٔ صحنِ گُلشن
دن بہاروں کے بہ اندازِ خزاں گزرے ہیں

سُونی راہ

وسیم سرنگری

معرفت جناب ظہیر الحسن ٹریسر، دفتر مہتمم آبپاشی۔ ضلع کھمم (آندھرا پردیش)

یکم جولائی ۱۹۶۶ء   خوشتر بھائی! تسلیم

ایک "سُونی راہ" پر چل کر بزم "بیسویں صدی" تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ یہ کاوش آپ کے معیار پر پُوری اتر جائے تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ عنایت فرما دیجئے۔ آپ کی قیمتی رائے اور قارئین کرام کے مخلصانہ مشورے موجبِ مسرت و مشعلِ راہ ہوں گے ...   خلوص آگیں ———— وسیم سرنگری

"پرویز کاٹیج" گیٹ کے ایک طرف پتھر آویزاں تھا، جس پر یہ کندہ تھا۔ وہ بے جھجک اندر داخل ہوگیا۔ ہریالی اور پھولوں سے بھرے لان کا چکر کاٹ کر پورچ میں پہنچ گیا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد دو چار قدم چل کر بیرونی برآمدے میں داخل ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھ بھال کر صدر دروازے کی طرف بڑھا، جو بند تھا۔ چوکھٹ پر ایک جانب اوپر کی طرف ننھا سا کال بل کا بٹن تھا۔ ماتھے کا پسینہ خشک کرنے کے بعد اس نے ہونٹوں کو زبان کی نوک سے تر کیا اور بڑھ کر بٹن پریس کیا۔ کہیں دُور گھنٹی بجنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی ———— ایک منٹ گزر گیا۔ اس نے پھر یہی عمل دہرایا۔ گھنٹی پھر بجی اور سناٹا چھا گیا۔ جیسے اس خوبصورت بنگلے میں کوئی مکین ہی نہ ہو۔ "عجیب بات ہے!" اس نے بڑبڑا کر، جھلا کر تھوڑے سے توقف کے بعد تیسری بار گھنٹی بجائی اور بٹن کو مسلسل دبائے رکھا۔ اندر گھنٹی گونجتی رہی۔ اس نے آستین ہٹا کر کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

چار بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔

"کھٹاک!" ایک آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور دوسرے ہی لمحے اُسے اچھل کر پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ اچانک ایک سفید سفید سی، نرم نرم سی بلائے ناگہانی اس پر ٹوٹ پڑی تھی۔ بوکھلا کر جو پیچھے بھاگا تو برآمدہ کی چکنی سطح پر پیر پھسل گیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سیڑھیوں سے پورچ میں آگرا۔ چند ثانئے وہیں پڑا اِس اچانک حادثے کے متعلق سوچتا رہا۔

"اوہ!" اس نے اپنے کاندھے پر کسی کا لمس محسوس کیا۔ گھبرائی ہوئی مہین سی، میٹھی سی آواز سنائی دی: "معاف کیجئے گا میں سمجھی تھی شاید سروجنی ہو۔ اِسی لئے میں نے بڑی بے تکلفی سے اپنی منّو اچھال دی۔ شاید آپ کے زیادہ چوٹ آگئی ہے؟" جیسے فضا میں ایک ساتھ کئی ساز بج اٹھے ہوں۔ وہ اِن کی مدھرتا میں کھو گیا۔ اُسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ اس کے پیروں میں واقعی چوٹ آگئی ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سازوں کے اس آرکسٹرا کی طرف دیکھنے لگا اور دیکھتا ہی رہا۔ مجسّم حُسن اپنی رعنائیوں اور حجاب آلود شباب کے مرغولے میں پشیمان سا، محجوب سا کھڑا تھا۔ پلکوں کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ جیسے کسی خاموش پُرسکون جھیل پر کالے کالے بادل چھا گئے ہوں۔ تمتماتے ہوئے رخسار، شفاف جبین پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اور گھبرا گھبرا کر دوپٹے کے آنچل کو انگلیوں کے گرد لپیٹنا اور کھولنا ———— اِس ارضی حور کی پریشانی پر دلالت کر رہے تھے۔ لباس کی نفاست، حُسن کی جاذبیت، کندن کی طرح چمکتے وجود کی نزاکت کئی سکنڈ اس کے دماغ پر حاوی رہی۔

"آیئے اندر چلیے۔" مدھم سُروں میں کوئی لَے سی بجی اور فضا پھر خاموش ہو گئی۔

وہ چونک پڑا اور جلدی جلدی اپنی فلٹ اور دستی اٹھا کر اُس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے جو بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ دونوں کوچ پر بیٹھ گئے۔

"دیکھیے! مجھے آپ کی خاموشی سے اِس بات کا گمان ہو رہا ہے کہ ایسا نہ ہو

آپ مجھ سے ناراض ہیں ؟"

"اوہ! نہیں نہیں ... " وہ پہلی بار بولا پھر جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرا نام رعنا پروین ہے اور انور احمد صاحب میرے بھائی ہیں۔"

"اچھا تو آپ انور کی بہن ہیں۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ میرا نام سلیم رشید ہے اور میں روزنامہ "پرواز" کا نامہ نگار ہوں اور ... "

"اور آپ شاعر بھی ہیں! پریشان نہ ہوں۔ مجھ سے بھائی جان نے کہا تھا کہ آپ سے حال ہی میں دوستی ہوئی ہے۔ وہ آپ کی سادگی سے بے حد متاثر ہیں۔ ورنہ وہ کبھی دوست احباب والے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے۔" وہ ہنس پڑی۔ جیسے جلترنگ بج اٹھا ہو۔ "آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟ دیکھئے میں ایک بار

- لباس ایسا پہننا چاہئے جسے دیکھ کر عوام حسد نہ کریں اور اعلیٰ طبقہ والے حقیر نہ سمجھیں۔ (حکیم ابن الدولہ)
- بد قسمتی محض بہتان ہے جو کاہلوں کی طرف سے خدا پر لگایا جاتا ہے۔ (ایک مشرقی مفکر)
- جس ملک میں رعیت بادشاہ سے تنگ ہو اس سرزمین میں آسودگی نہیں ہوتی۔ (کسریٰ)
- خواہشوں پر ضبط اچھے نتائج کا حامل ہے۔ خواہشوں کو آزاد چھوڑ دینا برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ (افلاطون)
- رنج و غم سے بڑھ کر انسانی زندگی کا دشمن کوئی نہیں۔ (ایک مشرقی مفکر)

اور معافی چاہوں گی۔ مجھے سرو جینی کا انتظار تھا جس نے ساڑھے چار بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے سو فیصد یہی یقین تھا کہ یہ سرو جینی ہوگی اور دیر سے آنے کی سزا دینے کے لئے اس پر لہنی پلی پھینکی تھی۔ ویسے رشید صاحب! آپ سے میری منتو سے بے حد پیار ہے۔" وہ بڑی بے تکلفی سے کہتی جا رہی تھی اور رشید کا دل "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے..." گنگنا رہا تھا۔

"آپ شاید بھیا کے پاس آئے ہیں؟" وہ اچانک استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"جی ـــــ جی ہاں!!" وہ بوکھلا کر ہکلانے لگا۔

"وہ نہا رہے ہیں۔ سیدھے یہیں آئیں گے۔"

تھوڑی دیر کمرے کی فضا بوجھل خاموشی تلے دبی رہی۔ وہ بار بار بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رشید کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کاش یہ لمحے تھم جائیں، یہ ساعتیں جاوداں ہو جائیں!!

"رشید صاحب! آپ کس طرح کی شاعری کرتے ہیں؟" وہ یکایک پوچھ بیٹھی۔ "میرا مطلب ہے، غزل کہتے ہیں آپ یا نظم، یا پھر ــــ قصیدہ وغیرہ۔"

"میں دیکھئے رعنا صاحبہ غزل کو دوسرے تمام اصناف پر ترجیح دیتا ہوں۔ شاعری کے تصور سے غزل ہی پیش پیش آتی ہے۔"

"میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔"

"چھوڑئیے بھی ـــــ! میرے خیال میں جہاں بحث دوستانہ فضا میں ہو رہی ہو اور اختلاف رائے ہو جائے تو اس بحث کو فوراً ختم کر دینا چاہئے۔" رشید نے جلدی سے کہا اور پھر موضوع بدل کر پوچھا۔ "یہ تو بتائیے آپ پڑھ کیا رہی ہیں؟ کون سے سال کی طالبہ ہیں؟؟ آئندہ کیا ارادے ہیں؟؟؟ ــــ میرا خیال ہے آپ کو بتانے میں اعتراض بھی نہ ہوگا۔ آپ کے بھائی کا دوست ہونے کے ناطے اتنا حق تو مجھے ملنا ہی چاہئے۔"

"اوہ! تو آپ میرا انٹرویو لے رہے ہیں!" وہ کھلکھلا پڑی۔ "اجی جناب کہیں اپنے اخبار میں شائع کرنے کا تو ارادہ نہیں ــــ؟"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں۔" وہ بے ساختہ بولا۔

وہ پھر ہنس پڑی۔ آبدار موتی پوری آب و تاب سے چمک اٹھے۔

"آپ کے دانت خوبصورت ہیں۔" طویل خاموشی کو توڑنے کے لئے اس نے ایک بے تکا سا جملہ کہا۔

"صرف دانت ــــ؟؟؟" جیسے وائلن پر ایک رنگین سی لے بج کر تھم گئی۔

وہ پہلے تو بہت سٹپٹایا، پھر سنبھل کر کچھ جواب ڈھونڈنے لگا۔ اسے یہ جان کر دکھ ہوا کہ لاکھوں عورتوں کی طرح یہ لڑکی بھی مردوں سے اپنے حسن کی تعریف کی خواہش مند ہے۔ شعروں میں تو اپنے محبوب کی تعریف میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے ذرا بھی گریز نہ کرتا لیکن اس حسین اور بے باک ساحرہ کے آگے وہ خود کو بے بس پا رہا تھا۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟" اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ اب پانچ بجنے میں صرف سات منٹ باقی ہیں اور انور صاحب ہیں کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتے!" بات بدلتے ہوئے اس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھہرئیے میں ابھی کہہ آتی ہوں۔" وہ اٹھی اور گلاب کی شاخ کی طرح بل کھاتی چلی گئی۔

وہ پردے پر کاڑھے ہوئے پھولوں کو دیکھتا گیا جو ابھی تک ہلے ہلے

رہے تھے۔ جیسے نسیم بہار اُن کے کانوں میں کچھ سرگوشی کر گئی ہو۔

"بھائی جان کچھ ہی دیر میں آرہے ہیں" پردہ زور سے ہلا اور وہ اندر داخل ہوتے بولی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اُس کے قریب بیٹھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگی "شیدا صاحب! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ میں کیسی لگتی ہوں؟"

"آپ؟" اُسے اپنا وجود دہکتے ہوئے فولاد میں ڈھلتا محسوس ہوا اور اُس نے ... دریچے سے باہر نظر دوڑائی۔ دُور آسمان پر دو پرند اُڑ رہے تھے۔ درختوں پر ... ہوئے امرود کی ڈالیاں بے اختیار زمین کو چوم لینے کی تمنا میں جھکے جا رہی تھیں۔

"آپ شاید مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے؟"

"نہیں نہیں رعنا! ــــ تمہارے دانت . . ."

"اُفوہ! جانے آپ کیسے شاعر ہیں۔ چھوٹے بھی" وہ تنک کر بولی۔ "ویسے ... کی شخصیت بڑی دلچسپ ہے شیدا صاحب۔ اچھا اب میں چلوں۔ پھر آپ سے مل کر ... خوشی ہوگی۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"اوئی!" جونہی اُس نے دروازہ سے باہر قدم رکھا، گھبرا کر پیچھے ہٹ آئی۔ ... ایک نوجوان سی لڑکی ہاتھ سے پیشانی رگڑتی ہوئی داخل ہوئی۔ اُس کے ... ہاتھ میں بہت ہی خوبصورت پرس تھا۔ اُس کے کپڑے رعنا کے کپڑوں سے ... زیب تھے۔

"اری کمبخت! اب ساڑھے چار بجے ہیں تیری گھڑی میں؟" رعنا نے آنکھیں ... کر پوچھا۔ "میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ ابھی ہمیں آسیہ اور واجدہ کے ... بھی تو جانا ہے نا؟"

"سوری!" مدھم سی آواز آئی۔ "لیکن انتظار تو بہت پُرلطف رہا ہوگا؟" ... شوخی سے آنکھیں شیدا پر گاڑتی ہوئی بولی۔

"ہاں بھئی سروج! یہ ہیں شیدا صاحب۔ بھائی جان کے دوست بڑی دلچسپ ... سیت کے مالک ہیں۔ ایک اچھے شاعر بھی ہیں کلام پھر سُن لیں گے اور شیدا صاحب! ... یہ ہیں سروجنی ہے جس کا میں انتظار کر رہی تھی اور یہ میرے ساتھ پڑھتی ہے۔ ... جناب اب ہم چلتے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ آئندہ ملاقات پر اپنے اشعار سے ... محروم نہ رکھیے گا ــــ ٹاٹا!"

پہلے سروجنی دروازہ سے نکل گئی اور پھر رعنا بڑھی۔ دروازے پر جھولتے ... نے پردے کو تھامے وہ مُڑ کر چند لمحے شیدا کو دیکھا کی پھر ایک دلآویز تبسم ... ساتھ اپنی دستی ہوا میں لہراتی نکل گئی۔

شیدا مسحور سا کئی لمحے رعنا کی بکھری ہوئی مسکراہٹوں کو سمیٹتا رہا۔ اُسے ... ہوا کہ یہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے کہیں [illegible] خواب تو نہیں؟؟؟ اُس نے جلتا ہوا سگریٹ ہتھیلی پر رکھ دیا پھر فوراً ہی اُسے اپنا ہاتھ جھٹک دینا پڑا۔ وہ باہر نکل آیا۔ اُس کا جی کچھ گنگنانے کو چاہ رہا تھا۔ درختوں کے سائے طویل ہو چلے تھے۔ پیلی پیلی ٹھنڈی دھوپ دل و دماغ کو رنگینیوں سے معمور کر رہی تھی ــــ "رعنا!" خاموش فضا مرتعش ہوئی۔ ہولے سے جیسے کسی نے پانی کی پُرسکون سطح پر ننھی سی کنکری مار دی ہو! اُمید کی کلیاں جیسے اُس کے دل کے چمنستان میں چٹک چٹک کر شگفتہ پھولوں میں بدلنے لگیں۔

اُسے پھر بالکل یہ یاد نہ رہا کہ وہ انور سے ملنے آیا تھا۔ وہ اپنی دُھن میں گیٹ سے نکل کر سڑک پر چلنے لگا ــــ اُس کا وجود طائر کی طرح فضاؤں میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔ نیا پُل، افضل گنج، مارکیٹ، عابد، لال بہادر اسٹیڈیم، ٹینک بنڈ ہوتا ہوا وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف، ہر سُو زندگی اپنی تمام

- اخلاق اُس روحانی صلاحیت کا نام ہے جو دردِ انفسی کی شکستگی کو نظر انداز کر کے اُس کے پار کھِلے ہوئے صحن میں پھولوں کو دیکھ لیتی ہے۔ (ہنری کلے وزنر)
- اپنی میز پر صرف وہی کاغذات رکھیے جو فوری توجہ کے مستحق ہوں۔ غیر ضروری چیزیں اُٹھا دیجیے۔ (ڈیل کارنیگی)
- حُسن کے بغیر جوان ہونا بے فائدہ ہے۔ اسی طرح جوانی کے بغیر حُسن بے سود ہے۔ (فرانکوسے فوکالڈ)
- میں اس طرح زندگی گزارتا ہوں جیسے آج کا دن میری زندگی کا پہلا دن ہے اور یہی آخری دن بھی۔ (فلپس)
- آدمی کی تہذیب کی آزمائش تحمّل سے ہوتی ہے۔ (وکٹر ہیگو)

رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ عابد پر کافی چہل پہل اور رونق تھی کئی بار تو وہ ٹکراتے ٹکراتے بچا ــــ ٹینک بنڈ پر نظارہ بے حد دلکش تھا۔ حسین ساگر کی طرف سے آتی ہوئی سرد، لطیف اور خوشگوار ہوائیں دل میں گدگدی سی پیدا کر رہی تھیں۔ جیسے ساری بہاریں یہیں سمٹ آئی ہو۔ یہاں ہر کوئی اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ محوِ خرام تھا۔ کالجوں کے لڑکے ٹولیوں کی شکل میں قہقہے پر قہقہے لگاتے گزر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ٹینک بنڈ گزر گیا۔ رانی گنج، راشٹراپتی روڈ ہوتا ہوا وہ "ٹیولی سنیما" میں گھُس گیا۔ منزل پر پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ وہ پیدل ہی پیدل چھ سات میل چلا آیا ہے۔ آج یہاں ایم جی ایم کی نئی تصویر لگی تھی۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ وہ اپر کلاس کا ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوا۔ ساری سیٹیں پُر تھیں۔ بمشکل ایک کرسی

آپ مجھ سے ناراض ہوں؟"

"اوہ! نہیں نہیں ... " وہ پہلی بار بولا پھر جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرا نام رعنا پروین ہے اور انور احمد صاحب میرے بھائی ہیں۔"

"اچھا تو آپ انور کی بہن ہیں۔ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ میرا نام سلیم رشید ہے اور میں روزنامہ "پرواز" کا نامہ نگار ہوں اور..."

"اور آپ شاعر بھی ہیں! پریشان نہ ہوں۔ مجھ سے بھائی جان نے کہا تھا کہ آپ سے حال ہی میں دوستی ہوئی ہے۔ وہ آپ کی سادگی سے بے حد متاثر ہیں۔ ورنہ وہ کبھی دوست احباب والے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے۔" وہ ہنس پڑی۔ جیسے جلترنگ بج اٹھا ہو۔ "آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟ دراصل میں ایک بار

- لباس ایسا پہننا چاہئے جسے دیکھ کر عوام حسد نہ کریں اور اعلیٰ طبقہ والے حقیر نہ سمجھیں۔ (حکیم ابن الدولہ)
- بدقسمتی محض بہتان ہے جو کاہلوں کی طرف سے منھ پر لگایا جاتا ہے۔ (ایک مشرقی مفکر)
- جس ملک میں رعیت بادشاہ سے تنگ ہو اس سرزمین میں آسودگی نہیں ہوتی۔ (کسریٰ)
- خواہشوں پر ضبط اچھے نتائج کا حامل ہے۔ خواہشوں کو آزاد چھوڑ دینا بُرے نتائج پیدا کرتا ہے۔ (افلاطون)
- رنج و غم سے بڑھ کر انسانی زندگی کا دشمن کوئی نہیں۔ (ایک مشرقی مفکر)

اور معافی چاہوں گی۔ مجھے سروجنی کا انتظار تھا جس نے ساڑھے چار بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے سو فیصد یہی یقین تھا کہ یہ سروجنی ہو گی اور دیر سے آنے کی سزا دینے کے لئے اس پر ابھی بلی پھینکی تھی۔ ویسے رشید صاحب! آپ میری متوسے بے حد پیارے ہے۔" وہ بڑی بے تکلفی سے کہتی جا رہی تھی اور رشید کا دل "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے..." گنگنا رہا تھا۔

"آپ شاید بھیا کے پاس آئے ہیں؟" وہ اچانک استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"جی ــــ جی ہاں!" وہ ہڑبڑا کر ہکلانے لگا۔

"وہ نہا رہے ہیں۔ سیدھے یہیں آئیں گے۔"

تھوڑی دیر کمرے کی فضا بوجھل خاموشی تلے دبی رہی۔ وہ بار بار بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رشید کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کاش یہ لمحے تھم جائیں، یہ ساعتیں جاوداں ہو جائیں!!

"رشید صاحب! آپ کس طرح کی شاعری کرتے ہیں؟" وہ یکایک پوچھ بیٹھی۔ "میرا مطلب ہے، غزل کہتے ہیں آپ یا نظم، یا پھر ــــ قصیدہ وغیرہ؟"

"میں دیکھئے رعنا صاحبہ غزل کو دوسرے تمام اصناف پر ترجیح دیتا ہوں۔ شاعری کے تھوڑے غزل ہی پیش پیش آتی ہے۔"

"میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔"

"چھوڑئیے بھی ــــ! میرے خیال میں جہاں بحث دوستانہ فضا میں ہو رہی ہو اور اختلاف رائے ہو جائے تو اس بحث کو فوراً ختم کر دینا چاہئے۔" رشید نے جلدی سے کہا اور پھر موضوع بدل کر پوچھا "یہ تو بتائیے آپ پڑھ کیا رہی ہیں؟ کون سے سال کی طالبہ ہیں؟؟ آئندہ کیا ارادے ہیں؟؟؟ ــــ میرا خیال ہے آپ کو یہ بتانے میں اعتراض بھی نہ ہوگا۔ آپ کے بھائی کا دوست ہونے کے ناطے اتنا حق تو مجھے ملنا ہی چاہئے۔"

"اوہ! تو آپ میرا انٹرویو لے رہے ہیں؟" وہ کھلکھلا پڑی۔ "ابھی جناب کہیں اپنے اخبار میں شائع کرنے کا تو ارادہ نہیں ــــ؟"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں۔" وہ بے ساختہ بولا۔ وہ پھر ہنس پڑی۔ آبدار موتی پوری آب و تاب سے چمک اٹھے۔

"آپ کے دانت خوبصورت ہیں۔" طویل خاموشی کو توڑنے کے لئے اس نے ایک بے تکا سا جملہ کہا۔

"صرف دانت ــــ؟؟؟" جیسے وائلن پر ایک غمگین سی لے بج کر تھم گئی۔ وہ پہلے تو بہت سٹپٹایا، پھر سنبھل کر کچھ جواب ڈھونڈنے لگا۔ اسے یہ جان کر دکھ ہوا کہ لاکھوں عورتوں کی طرح یہ لڑکی بھی مردوں سے اپنے حسن کی تعریف کی خواہش مند ہے۔ شعروں میں تو اپنے محبوب کی تعریف میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے ذرا بھی گریز نہ کرتا لیکن اس حسین اور بے باک ساحرہ کے آگے وہ خود کو بے بس پا رہا تھا۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟" اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ اب پانچ بجنے میں صرف سات منٹ باقی ہیں اور انور صاحب ہیں کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتے!" بات بدلتے ہوئے اس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھہرئیے میں ابھی کہہ آتی ہوں۔" وہ اٹھی اور گلاب کی شاخ کی طرح لچکھاتی چلی گئی۔

وہ پردے پر کاڑھے ہوئے پھولوں کو دیکھا کیا جو ابھی تک ہلے ہلے

م رہے تھے۔ جیسے نسیمِ بہار اُن کے کانوں میں کچھ سرگوشی کر گئی ہو۔

"بھائی جان کچھ ہی دیر میں آرہے ہیں" پردہ زور سے ہلا اور وہ اندر داخل
تے ہوئے بولی۔ دوسرے ہی لمحے وہ اُس کے قریب بیٹھ کر آنکھوں میں آنکھیں
کر پوچھنے لگی "شیدا صاحب! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ میں کیسی لگتی ہوں؟"

"آپ؟" اُسے اپنا وجود تپتے ہوئے فولاد میں ڈھلتا محسوس ہوا اور اُس نے
کر دریچے سے باہر نظر دوڑائی۔ دُور آسمان پر دو پرند اُڑ رہے تھے۔ درختوں پر
ہوئے امرود کی ڈالیاں بے اختیار زمین کو چوم لینے کی تمنا میں جھکے جا رہی تھیں۔

"آپ شاید مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے؟"

"نہیں نہیں رعنا! ـــــ تمھارے دانت . . ."

"اُفوہ! جانے آپ کیسے شاعر ہیں۔ چھوڑیئے بھی" وہ تنک کر بولی "ویسے
کی شخصیت بڑی دلچسپ ہے شیدا صاحب۔ اچھا اب میں چلوں۔ پھر آپ سے مل کر
ت خوشی ہوگی" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"لو ئی!" جونہی اُس نے دروازہ سے باہر قدم رکھا، گھبرا کر پیچھے ہٹ آئی۔
ں ایک نوجوان سی لڑکی ہاتھ سے پیشانی رگڑتی ہوئی داخل ہوئی۔ اُس کے
سرے ہاتھ میں بہت ہی خوبصورت پرس تھا۔ اُس کے کپڑے رعنا کے کپڑوں سے
کر رہے تھے۔

"اری کمبخت! اب ساڑھے چار بجے ہیں تیری گھڑی میں؟" رعنا نے آنکھیں
ل کر پوچھا "میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ ابھی ہمیں آسیہ اور واجدہ کے
بھی تو جانا ہے نا؟"

"سوری!" مدھم سی آواز آئی "لیکن انتظار تو بہت پُرلطف رہا ہوگا؟"
شوخی سے آنکھیں شیدا پر گاڑتی ہوئی بولی۔

"ہاں بھئی سروجنی! یہ ہیں شیدا صاحب۔ بھائی جان کے دوست۔ بڑی دلچسپ
صیت کے مالک ہیں۔ ایک اچھے شاعر بھی ہیں کلام پھر سُن لیں گے اور شیدا صاحب!
یری سہیلی سروجنی ہے جس کا میں انتظار کر رہی تھی اور یہ میرے ساتھ پڑھتی ہے۔
جناب اب ہم چلتے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ آئندہ ملاقات پر اپنے اشعار سے
ں محروم نہ رکھیے گا ـــــ ٹاٹا!"

پہلے سروجنی دروازہ سے نکل گئی اور پھر رعنا بڑھی۔ دروازے پر جھولتے
ئے پردے کو تھامے وہ مُڑ کر چند لمحے شیدا کو دیکھا کی پھر ایک دلآویز تبسّم
ساتھ اپنی دستی ہوا میں لہراتی نکل گئی۔

شیدا مسحور سا کئی لمحے رعنا کی بکھری ہوئی مسکراہٹوں کو سمیٹتا رہا۔ اُسے
ں ہوا کہ یہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے کہیں خواب تو نہیں؟؟؟ اُس نے جلتا ہوا سگریٹ

ہتھیلی پر رکھ دیا پھر فوراً ہی اُسے اپنا ہاتھ جھٹک دینا پڑا۔ وہ باہر نکل آیا۔ اُس کا جی
کچھ گنگنانے کو چاہ رہا تھا۔ درختوں کے سائے طویل ہو چلے تھے۔ پیلی پیلی ٹھنڈی
دھوپ دل و دماغ کو رنگینیوں سے معمور کر رہی تھی ـــــ "رعنا!" خاموش فضا
مرتعش ہوئی۔ ہولے سے جیسے کسی نے پانی کی پُرسکون سطح پر ننھی سی کنکری مار دی ہو!
اُمید کی کلیاں جیسے اُس کے دل کے چمنستان میں چٹک چٹک کر شگفتہ پھولوں میں
بدلنے لگیں۔

اُسے پھر بالکل یہ یاد نہ رہا کہ وہ انور سے ملنے آیا تھا۔ وہ اپنی دُھن میں
گیٹ سے نکل کر سڑک پر چلنے لگا ـــــ اُس کا وجود طائر کی طرح فضاؤں میں تیرتا
چلا جا رہا تھا۔ نیا پُل، افضل گنج، مارکیٹ، عابد، لال بہادر اسٹیڈیم، ٹینک بنڈ
ہوتا ہوا وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ہر طرف، ہر سُو زندگی اپنی تمام

- اخلاق اُس روحانی صلاحیت کا نام ہے جو درد و الم کی شکستگی کو نظر انداز کر کے اُس کے پار کھلے ہوئے صحن میں پھولوں کو دیکھ لیتی ہے۔ (ہنری کلے وزنر)
- اپنی میز پر صرف وہی کاغذات رکھئے جو فوری توجہ کے مستحق ہوں۔ غیر ضروری چیزیں اُٹھا دیجئے۔ (ڈیل کارنیگی)
- حُسن کے بغیر جوان ہونا بے فائدہ ہے۔ اسی طرح جوانی کے بغیر حُسن بے سود ہے۔ (فرانکوسے فوکالڈ)
- میں اِس طرح زندگی گزارتا ہوں جیسے آج کا دن میری زندگی کا پہلا دن ہے اور یہی آخری دن بھی۔ (فلپس)
- آدمی کی تہذیب کی آزمائش تحمّل سے ہوتی ہے۔ (وکٹر ہیگو)

رعنائیوں کے ساتھ رواں دواں تھی۔ عابد پر کافی چہل پہل اور رونق تھی کئی بار
تو وہ ٹکراتے ٹکراتے بچا ـــــ ٹینک بنڈ پر نظارہ بے حد دلکش تھا۔ حسین ساگر
کی طرف سے آتی ہوئی سرد، لطیف اور خوشگوار ہوائیں دل میں گدگدی سی پیدا
کر رہی تھیں۔ جیسے ساری بہاریں یہیں سمٹ آئی ہو۔ یہاں ہر کوئی اپنے اپنے ساتھیوں
کے ساتھ محوِ خرام تھا۔ کالجوں کے لڑکے ٹولیوں کی شکل میں قہقہے پر قہقہے لگاتے
گزر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے اُسے اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ اُس نے اپنی رفتار
تیز کر دی۔ ٹینک بنڈ گزر گیا۔ رانی گنج، راشٹراپتی روڈ ہوتا ہوا وہ "ٹیولی سینما"
میں گھس گیا۔ منزل پر پہنچ کر اُسے احساس ہوا کہ وہ پیدل ہی پیدل چھ سات
میل چلا آیا ہے۔ آج یہاں یم جی یم کی نئی تصویر لگی تھی۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ وہ
اپر کلاس کا ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوا۔ ساری سیٹیں پُر تھیں۔ بمشکل ایک کرسی

جالی مل گئی۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ وہ سیٹ سنبھال کر دستی ٹٹولنے لگا پسینہ خشک کرتے ہوئے اچانک اُس کے ہاتھ تھم گئے۔ سامنے کی سیٹ سے جانی پہچانی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ یقیناً یہ رعنا اور سروجنی تھیں۔ وہ باتوں میں ایسی مشغول تھیں جیسے یہی شغل اُنھیں یہاں آکر انجام دینا تھا۔

"نہیں رعنا تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا" سروجنی کی سرگوشی اُس نے صاف سُنی۔

رعنا ہنسی پر قابو پاکر بولی "تو تو دیوانی ہے۔ اگر میں اُس بے وقوف شاعر پر اپنے ڈرامے کا ریہرسل کر بیٹھی تو کون ایسا بھونچال آگیا۔ ارے بھئی کالج ڈے والے کل کے ڈرامے میں میرا یہی تو پارٹ ہے نا کہ ایک بے وقوف کو اپنے سچے پیار کا یقین دلا کر اُسے ستاروں کی دُنیا سے ہمکنار کرنا ـــ ویسے شیدا صاحب بھی کچھ ..."

اِس سے زیادہ وہ نہ سُن سکا۔ اسکرین پر ہیروئن طمانچے لگا کر اپنے ایک پرستار کو گھر سے نکال رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ طمانچے رعنا اُس کے لگا رہی ہے۔ اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ وہ تیزی کے ساتھ تھیٹر سے باہر نکل آیا۔ باہر کی تیز اور یخ بستہ ہوا اُس کے جسم پر آرے کی طرح چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ٹھیک بندرہ پر لائٹ فیل ہوگئی تھی۔ چہل پہل بھی مفقود ہو کر رہ گئی تھی اور ... ہی دیر پہلے کا ٹھیک بندرہ اب گورِ غریباں کی طرح سُنسان سا تھا۔ وہ سوچ رہا ... پیار کی دلفریب وادیاں کیا اُن کی آن میں کانٹوں سے بھری راہ میں بھی بدل سکتی ہیں ... عابد تک پہنچ کر اُسے پیروں میں شدید درد کا احساس ہوا۔ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ ... گی فاؤنڈری سے عابد سرکل تک کی راہ کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے کی پُربہار ... اُسے سُونی سُونی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا زندگی کی یہ سُونی راہ ... کہاں لے جائے گی؟؟؟

غزلیں

نریش ایم۔اے

ج حسن ہو برہم مجھے پسند نہیں
یں ستائے مرا غم مجھے پسند نہیں

یہ گلستاں ہے کہیں اور جا کے رو بلبل
چمن میں گریہ و ماتم مجھے پسند نہیں

ا کہ خوئے ستم ان کو زیب دیتی ہے
ر یہ فن مرے ہمدم مجھے پسند نہیں

شباب جس نے نوازا دلوں کو اُلفت سے
اُسی شباب کا ماتم مجھے پسند نہیں

نرؔیش بندۂ عاصی سہی مگر یارب!
ذلیل و خوار ہو آدم مجھے پسند نہیں

اخگر مشتاق رحیم آبادی

محبت میں اگر حاصل محبت کی زباں ہوگی!
محبت ہی محبت داستاں در داستاں ہوگی

کوئی پردہ نہ رہ جائے گا جب حائل محبت میں
محبت کی نظر پھر خود حجابِ درمیاں ہوگی

خدا جانے اجل کو لوگ کیوں بے مہر کہتے ہیں
یہی بے مہر اِک دن دیکھ لینا مہرباں ہوگی

دمِ رخصت اُنھیں حدِ نظر تک دیکھتے جاؤ
میسر پھر بہارِ جلوۂ جاناں کہاں ہوگی

ادا ہوگا اُسی دن سجدۂ اُلفت کا حق اخگرؔ
جبینِ عشق جس دن مٹ کے خاکِ آستاں ہوگی

رئیس رامپوری

آرائشِ بہار کا ساماں کہاں سے آئے
آخر جنوں میں روزِ گریباں کہاں سے آئے

بچ بچ کے لاکھ بادِ بہاراں چلے، مگر
اُن کی سی وہ ادائے گریزاں کہاں سے آئے

ہر چند کہہ رہے ہیں کہ اُس بزم سے نہیں
چہرے سے ہے ہمارے نمایاں کہاں سے آئے

جوشِ جنوں بخیر اب اس غم سے چھُٹ گئے
دامن کہاں سے آئے گریباں کہاں سے آئے

اتنا بھی کوئی پُوچھنے والا نہیں رئیسؔ
حیراں کہاں سے آئے پریشاں کہاں سے آئے

کرشن کمار طورؔ

حسرتِ پائمال کیا کہیئے
آپ سے دل کا حال کیا کہیئے

کون آ آکے دل میں بستا ہے
اے طلسمِ خیال کیا کہیئے

ہم نے تم کو تمھیں سے مانگا ہے
سادگیٔ سوال کیا کہیئے

کوئی سُنتا بھی ہو کسی کی یہاں
اہلِ دنیا سے حال کیا کہیئے

کس طرح دل سا آئینہ ٹوٹا
اے نگاہِ جمال کیا کہیئے

دل سی ناپائیدار چیز کی طورؔ
اِس قدر دیکھ بھال کیا کہیئے

خالی مل گئی۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ وہ سیٹ سنبھال کر دستی ٹٹولنے لگا پسینہ خشک کرتے ہوئے اچانک اُس کے ہاتھ تھم گئے۔ سامنے کی سیٹ سے جانی پہچانی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ یقیناً یہ رعنا اور سروجنی تھیں۔ وہ باتوں میں ایسی مشغول تھیں جیسے یہی شغل انھیں یہاں آکر انجام دینا تھا۔

"نہیں رعنا تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا" سروجنی کی سرگوشی اُس نے صاف سُنی۔

رعنا ہنسی پر قابو پاکر بولی "تُو تو دیوانی ہے۔ اگر میں اُس بے وقوف شام پر اپنے ڈرامے کا ریہرسل کر بیٹھی تو کون ایسا بھونچال آگیا۔ ارے بھئی کالج ڈے والے کل کے ڈرامے میں میرا یہی تو پارٹ ہے نا کہ ایک بے وقوف کو اپنے سچے پیار کا یقین دلاکر اُسے ستاروں کی دُنیا سے ہمکنار کرنا ــــ ویسے قیدا صاحب بھی کچھ . . ."

اِس سے زیادہ وہ نہ سُن سکا۔ اسکرین پر ہیروئن طمانچے لگاکر اپنے ایک پرستار کو گھر سے نکال رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ طمانچے رعنا اُس کے لگا رہی ہے۔ اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ وہ تیزی کے ساتھ تھیٹر سے باہر نکل آیا۔ باہر کی تیز اور یخ بستہ ہوا اُس کے جسم پر آرے کی طرح چلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ٹیگ بنڈ پر لائٹ فیل ہوگئی تھی۔ چہل پہل بھی مفقود ہوکر رہ گئی تھی اور ابھی دیر پہلے کا ٹیگ بنڈ اب گورِ غریباں کی طرح سُنسان سا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا پیار کی دلفریب وادیاں کیا آن کی آن میں کانٹوں سے بھری راہ میں بھی بدل سکتی ہیں۔ عابد تک پہنچ کر اُسے پیروں میں شدید درد کا احساس ہوا۔ وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا فاؤنڈری سے عابد سرکل تک کی راہ کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے کی پُر بہار سڑکیں اُسے سُونی سُونی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا زندگی کی یہ سُونی راہ اُسے کہاں لے جائے گی؟؟؟

غزلیں

نریش ایم۔اے

راج حسن ہو برہم مجھے پسند نہیں
یں ستائے مرا غم مجھے پسند نہیں

یہ گلستاں ہے کہیں اور جا کے رو بلبل
چمن میں گریہ و ماتم مجھے پسند نہیں

اکہ خوئے ستم ان کو زیب دیتی ہے
ریف مرے ہمدم مجھے پسند نہیں

شباب جس نے نوازا دلوں کو اُلفت سے
اُسی شباب کا ماتم مجھے پسند نہیں

نریش بندۂ عاصی سہی مگر یارب!
ذلیل و خوار ہو آدم مجھے پسند نہیں

اخگر مشتاق رحیم ابادی

مُحبت میں اگر حاصل محبت کی زباں ہوگی!
مُحبت ہی مُحبت داستاں درد استاں ہوگی

کوئی پردہ نہ رہ جائے گا جب جائل محبت میں
مُحبت کی نظر پھر خود حجابِ درمیاں ہوگی

خدا جانے اجل کو لوگ کیوں بے مہر کہتے ہیں
یہی بے مہر اِک دن دیکھ لینا مہرباں ہوگی

دمِ رُخصت اُنھیں حدِ نظر تک دیکھتے جاؤ
میسّر پھر بہارِ جلوۂ جاناں کہاں ہوگی

ادا ہوگا اُسی دن سجدۂ اُلفت کا حق اخگر
جبینِ عشق جس دن مٹ کے خاکِ آستاں ہوگی

رئیس رامپوری

آرائشِ بہار کا ساماں کہاں سے آئے
آخر جنوں میں روز گریباں کہاں سے آئے

بچ بچ کے لاکھ بادِ بہاراں چلے، مگر
اُن کی سی وہ ادائے گریزاں کہاں سے آئے

ہر چند کہہ رہے ہیں کہ اُس بزم سے نہیں
چہرے سے ہے ہمارے نمایاں کہاں سے آئے

جوشِ جنوں بخیر اب اس غم سے چھُٹ گئے
دامن کہاں سے آئے گریباں کہاں سے آئے

اتنا بھی کوئی پُوچھنے والا نہیں رئیس
حیراں کہاں سے آئے پریشاں کہاں سے آئے

کرشن کمار طوؔر

حسرتِ پائمال کیا کہیئے — آپ سے دل کا حال کیا کہیئے
کون آ آ کے دل میں بستا ہے — اے طلسمِ خیال کیا کہیئے
ہم نے تم کو تمھیں سے مانگا ہے — سادگیٔ سوال کیا کہیئے
کوئی سُنتا بھی ہو کسی کی یہاں — اہلِ دنیا سے حال کیا کہیئے
کس طرح دل سا آئینہ ٹوٹا — اے نگاہِ جمال کیا کہیئے

دل سی ناپائیدار چیز کی طوؔر
اس قدر دیکھ بھال کیا کہیئے


میرے رنگ رُوپ کیلئے
میرا پسندیدہ صابن
لکس
کلپنا کہتی ہیں
LUX
TOILET SOAP
دلفریب رنگ رُوپ آپکے لئے بھی اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کلپنا کے لئے... اس کی دیکھ بھال بھی ویسی ہی ہونی چاہیئے۔
فلمی حسینہ کلپنا کہتی ہیں: "عورت کا اصلی حُسن اُسکا بیداغ رنگ رُوپ ہے۔ یہ آپکے لئے اُتنا ہی ضروری ہے جتنا میرے لئے۔ اپنے رنگ رُوپ کی دیکھ بھال میں لکس سے کرتی ہوں۔ اسکا ملائم جھاگ اور اس کی دلنواز خوشبو مجھے بیحد پسند ہے۔" لکس سے آپ کا رنگ رُوپ بھی کھل اُٹھے گا۔
سفید اور دھنک کے چار رنگوں میں
لکس ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا خالص، ملائم حسن بخش صابن
ہندوستان لیور کا تیار کردہ
LTS. 199-140-45 UD لنٹاس

شانِ نزول

_________ نریش کمار شاد

۱۵ ایف۔موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۱۵؍اگست ۶۶ء

خوشتر صاحب قبلہ تسلیم ونیاز

حسبُ الطلب بلکہ حسبُ الحکم "شانِ نزول" کی نئی قسط حاضر ہے۔ عبدالمجید سالک مرحوم کے بعد راجہ مہدی علی خاں کی موت سے آپ نے جو نہایت گہرا اثر قبول کیا ہے اُسے میرے علاوہ آپ کے سبھی نیاز مند محسوس کرتے ہیں۔ خدا آپ کو صبر کی توفیق دے۔ اِس رسمی سے جملے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ؎

کیا اِسی کو حیات کہتے ہیں؟ آدمی کیا اِسی پہ مرتا ہے ؟؟

آپ کا اپنا _________ نریش کمار شاد

جگر مرادآبادی کا یہ شعر ؎

محوِ خرام ناز ہیں صحنِ چمن میں وہ
گستاخیٔ نسیمِ سحر دیکھتا ہوں

جب نیاز فتح پوری نے سُنا تو کہنے لگے کہ معشوق صحنِ چمن میں محوِ خرام ہے یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن یہ کیونکر سمجھ لیا جائے کہ نسیمِ سحر گستاخی کر رہی ہے کیونکہ اِس کا ثبوت شعر میں پیش نہیں کیا گیا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد بولے کہ اگر یوں کہا جائے تو شعر صاف اور صحیح ہو سکتا ہے ؎

آنچل سنبھالتے ہیں وہ گلشن میں بار بار
گستاخیٔ نسیمِ سحر دیکھتا ہوں میں

اختر انصاری جب لندن میں تھے تو مہاتما گاندھی اور ٹیگور کے خاص دوست سی۔ ایف۔ انڈروز (C.F. ANDREWS) سے بھی ملے۔ دَورانِ گفتگو میں جب انڈروز نے یہ کہا کہ مجھے ہندوستان کے دریاؤں، سمندروں اور پُراَسرار راتوں نے بہت متاثر کیا ہے تو پُراَسرار راتوں کے ذکر سے اختر صاحب پہلے تو چونکے اور پھر کھو سے گئے اور عالمِ وارفتگی میں یہ قطعہ کہہ دیا ؎

کس قدر آن بان کی راتیں
اک جداگانہ شان کی راتیں
تیرہ و تار اور پُراَسرار
آہ ہندوستان کی راتیں

جوش ملسیانی کے ایک شاگرد نے نکودر میں اُنھیں اپنا کلام اصلاح کی غرض سے بھیجا تو جوابی لفافے کی بجائے جواب کے لئے ٹکٹ بھیج دئے۔ جوش صاحب نے جواب میں اُسے یہ شعر لکھ کر بھیج دیا ؎

ٹکٹ آپ کیوں بھیجتے ہیں مجھے
نکودر میں سادہ لفافے کہاں

ریاض خیرآبادی نے اپنے اُستاد امیر مینائی کو جب اپنی یہ غزل سُنائی ؎

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی اور کعبے میں
بھلے کو ہم دبا لاتے تھے ناقوسِ برہمن کو

تو امیر نے کہا اُستاد اِس غزل کا مطلع نہیں ہو رہا۔ مطلے کے لئے البتہ ایک مصرع ضرور کہا ہے کہ

جوانی گود میں اپنے کِھلاتی ہے لڑکپن کو

امیرؔ نے اِس مصرعے کو مطلع بنانے کے لئے چار مصرعے موزوں کئے لیکن خود ہی کسی مصرعے سے مطمئن نہ ہوئے اور ریاضؔ سے کہنے لگے تم خود ہی کوئی مصرع کہہ کر مجھے خوش کرو۔ آخر کچھ فکر کے بعد ریاضؔ کی زبان سے نکلا ؎

لئے آغوش میں محرم ہے اُن کے اُٹھتے جوبن کو
جوانی گود میں اپنے کِھلاتی ہے لڑکپن کو

جب اکبرؔ الٰہ آبادی کے صاحبزادے سیّد عشرت حسین کی شادی سیّد احمد حسین مذاقؔ کی صاحبزادی سے ہو گئی تو رخصتی عشرت کے لندن سے واپس آنے پہلے پائی جو وہاں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ عشرت لندن کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں کچھ ایسے کھو گئے کہ اکبرؔ کے اصرار کے باوجود لندن کو چھوڑنے کا نام تک نہ لیتے تھے۔ آخر مجبور ہو کر اکبرؔ نے یہ قطعہ کہا اور عشرت کے پاس لندن بھیج دیا ؎

لندن کو چھوڑ لڑکے اب ہند کی خبر لے
بنتی رہیں گی باتیں آباد گھر تو کر لے
انگلش کی کر کے کاپی دُنیا کی راہ ناپی
دینی طریق میں بھی اپنے قدم کو دھر لے
واپس نہیں جو آتا، کیا منتظر ہے اِس کا
ماں خستہ حال ہو لے، بے چارہ باپ مر لے
مغرب کے مُرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ
پیرانِ مشرقی سے اب فیض کی نظر کر لے
میں بھی ہوں اک سخنور، آ سُن کلامِ اکبرؔ
اِن موتیوں سے آ کر دامن کو اپنے بھر لے

دہلی کے سابق چیف کمشنر شنکر پرشاد کے یہاں ایک مخصوص ادبی نشست تھی، وہاں کسی شاعر نے جب علّامہ اقبال کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا کہ اقبال کی شاعری، شاعری نہیں بلکہ پیغمبری ہے تو جوشؔ ملیح آبادی نے چیں بہ جبیں ہو کر اسی وقت یہ شعر کہہ کر سُنا دیا ؎

یہ شاعری ہے عرش کی رفعت گری نہیں
یعنی خدا نخواستہ پیغمبری نہیں

کئی سال پہلے علی جواد زیدی کے ایک دوست جو زیدی صاحب ہی کی طرح لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک طالبِ علم تھے، اپنی محبوبہ سے برہم ہو گئے۔ اِس محبوبہ کے ساتھ جلد ہی اُن کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ لیکن یہ برہمی کشیدگی کی شکل اختیار کر گئی۔ اِس نازک صورتِ حال میں زیدی صاحب نے درمیان میں پڑ کر علیٰحدہ علیٰحدہ دونوں سے گفتگو کی۔ پھر دونوں کو ایک جگہ جمع کیا اور اِس طرح باہمی تمام غلط فہمیاں رفع کر دیں اور اپنی کامیابی سے مسرور ہو کر زیدی صاحب نے یہ مطلع کہا ؎

چُبھ گئے تھے جتنے کانٹے زندگی کے پاؤں میں
بیٹھ کر ہم نے نکالے گفتگو کی چھاؤں میں

کسی یونیورسٹی کا ایک نوجوان پروفیسر جس نے حال ہی میں ڈاکٹریٹ کیا تھا، جب ادیبوں کی ایک محفل میں کسی ادبی مسئلے پر اظہارِ خیال کرنے کے بعد اپنی علمیت کا پول خود ہی کھول چکا تو بسمل سعیدی نے یہ شعر کہہ کر اُس کی نذر کر دیا ؎

تعلیم تیرے جوہرِ ذاتی کو کھا گئی
آبِ حیات پی کے تجھے موت آ گئی

۱۹۲۵ء میں جب گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی غازی آباد میں مقیم ہوئے۔ اُس وقت وہاں شعر و سخن کا کوئی ماحول نہیں تھا۔ شعر و ادب کی اِس کسادِ بازاری میں کسی پُرانے شناسا سے جب اچانک امنؔ صاحب کی ملاقات ہوئی تو اُس واقف کار نے خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد امنؔ صاحب سے شعر گوئی کا حال پوچھا اور اُن سے کچھ تازہ اشعار سُنانے کی فرمائش کی۔ اُس وقت امنؔ صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ دیا ؎

جب کسی بستی میں آباد ہوں ہر سُو بنئے
کیوں وہاں ذکرِ سخن چھیڑ کے اُلّو بنئے

جرأتؔ نے جب شہزادہ سلیمان شکوہ کو اپنا یہ مطلع سُنایا ؎

کب تک ایّامِ جُدائی میں رہوں من مارے
کٹئے اسے کاش وہ آ کر مجھے گردن مارے

تو شہزادے نے بھی طبیعت پر زور دیا اور یہ مطلع موزوں کیا ؎

کاش اک کھینچ کے تیشہ دمِ رفتن مارے
نام جانے کا نہ لے اور مجھے گردن مارے

اِن دونوں مطلعوں کو سُن کر انشاء اللہ خاں انشاؔ نے بھی فی البدیہہ

یہ مطلع کہا ؎ کیوں نہ وہ شوخ مجھے کھینچ کے سمن مارے
پھول میں نے بھی کسی جانب چلمن مارے

ایک مشاعرے میں کسی شاعر نے کوئی شعر پڑھا جس کا دوسرا مصرع تھا ؏

جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

پہلا مصرعہ مُہمل سا تھا۔ شعر سنتے ہی پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی نے کہا کہ دوسرا مصرع خوب ہے لیکن پہلا مصرع ٹھیک نہیں ہے حضرت! یہ سُن کر شاعر صاحب جھلا کر کہنے لگے کہ پنڈت جی! اگر یہ بات ہے تو آپ ہی اِس سے بہتر مصرع کہہ کر دکھایئے۔ نسیم نے اُسی وقت نیا مصرع کہہ کر شعر سُنا دیا ؎

تیرہ دل کی بزم میں جامِ شراب آتا نہیں
جانبِ ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

ایک بار تلوک چند محروم علاّمہ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی سے ملنے گئے تو کیفی صاحب اُس وقت عینک کے بغیر لکھ پڑھ رہے تھے۔ اِس منظر کو دیکھتے ہوئے محروم صاحب نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد کہا ؎

دہلی میں دم ہے حضرتِ کیفی کا مغتنم
مرزا وہی ہیں اور وہی آج میر ہیں
اُن کی نظر سے ذوقِ ادب فیض یاب ہے
گرویدہ اُن کے کودک و برنا و پیر ہیں
ستّر برس کی عمر میں عینک بغیر آپ
لکھتے ہیں اور پڑھتے ہیں کتنے بصیر ہیں

ایک بار سردی کے موسم میں نواب محمد خاں کے مختار نے قلندر بخش جرأت کو سرمائی پوشاک دینے میں کچھ تاخیر کی تو جرأت نے کھڑے کھڑے یہ رباعی کہہ کر پوشاک حاصل کی ؎

مختاری پہ کچھ آپ نہ کیجے گا گھمنڈ
کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیخ ارنڈ
سرمائی دلایئے ہماری ورنہ
تم کھاؤ گے گالیاں جو ہم کھائیں گے ٹھنڈ

میرزا داغ دہلوی کے ایک شاگرد ممتاز علی خاں نے ایک بار اُستاد سے

قطعۂ تاریخِ انتقال راجہ مہدی علی خاں

حکیم سید یوسف پھلواری

راجۂ مہدی علی خاں چل بسے دنیا سے آہ — ناگہاں کانوں میں پہنچی یہ صدائے جاں گسل
اُٹھ گیا بزمِ ادب سے وہ ادیبِ بذلہ سنج — جس سے رہتی تھی شگفتہ سب کی طبعِ مضمحل
سب میں گھُل مِل کر رہے بچہ ہو بوڑھا یا جواں — کم ہی دنیا میں مِلا کرتے ہیں ایسے زندہ دل
جس قدر بھی ہو سکے اُردو کی خدمت کیجیے — مشغلہ اُن کا پسندیدہ یہی تھا مستقل
حادثہ گو سخت ہے چارہ نہیں اس کے سوا — صبر کی اہلِ ادب سینے پہ رکھیں اپنے سل
سب ہی اپنا وقت پورا کر کے اِک دن جائیں گے — ہے اِسی آئین پر قائم نظامِ آب و گِل

یہ حقیقت ہے جو لکھا تم نے یوسف سالِ نحو
راجۂ مہدی علی خاں تھے بہت ہی زندہ دل

۱۹ ء ۶۶

پوچھا کہ آپ گھنٹہ بھر میں کتنے شعر کہہ لیتے ہیں۔ میرزا صاحب نے جواب دیا کہ مصرعِ طرح دے کر ابھی اندازہ کر لو۔ چنانچہ ممتاز علی خاں نے یہ مصرع دیا ؏

تیر ہیں تیری ادائیں سب کی سب

داغ نے مصرع سُنتے ہی گرہ لگائی ؎

عشوہ ہو یا غمزہ ہو یا ناز ہو
تیر ہیں تیری ادائیں سب کی سب

اور اِس کے بعد تقریباً پندرہ منٹ میں بیس اشعار کی ایک مُرصّع غزل کہہ دی۔

سلطانِ عالم واجد علی شاہ اختر اِس دُنیا سے کوچ کرنے سے پہلے جب آخری ہچکیاں لیتے ہوئے کراہ رہے تھے تو اُنھیں کراہتے دیکھ کر سرہانے کھڑی ہوئی تمام بیگمات نے مشترکہ طور پر کہا کہ آپ کا کراہنا کوئی اچھا شگون نہیں۔ واجد علی شاہ نے یہ سُنا تو کچھ دیر بعد یہ شعر کہہ کر آہستہ سے سُنا دیا ؎

آہ کرنے سے تو سب لوگ خفا ہوتے ہیں
اے نسیمِ سحری! ہم تو ہوا ہوتے ہیں

اور اِس کے بعد اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

انجمن ترقی اُردو دہلی کی طرف سے منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کے لئے میں طرحی غزل کہنے کی فکر میں تھا۔ طرح غالب کا یہ مصرع تھی ؏

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

اتفاق سے اُن دنوں کہیں سینٹ سائمن کا یہ جملہ میری نظر سے گزرا۔

The golden age is before us, not behind us.

اسے پڑھتے ہی غیر اختیاری طور پر یہ شعر موزوں ہوگیا ؎

اپنے ماضی کو نہ رو اے دل کہ حُسنِ زندگی
تیرے ماضی میں نہیں ہے تیرے مستقبل میں ہے

ایک محفلِ شعر میں کچھ پُرانے دوستوں کی موجودگی سے کنول پرشاد کنول کے ذہن میں بہت سی پُرانی صحبتوں کی یاد تازہ ہوگئی اور انھیں شدت سے اِس حقیقت کا احساس ہونے لگا کہ اب نہ وہ والہانہ دوستیاں ہیں نہ وہ بے پایاں خلوص! اور آج نہ وہ صاف ستھری محفلیں ہیں نہ محفلوں کا وہ رکھ رکھاؤ۔ چنانچہ اِن تاثرات کو اُنھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اِن دو شعروں میں منتقل کردیا ؎

اب نہ وہ مجمع ہے یاروں کا نہ وہ بزمِ جنوں
لُٹ گئی ہے کیا کہیں بیداد پرستی دوستو!
ہر تبسم پر جہاں جلتے تھے دل میں سو چراغ
چھوڑ آئے ہیں بہت پیچھے وہ بستی دوستو!

جب اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے اپنے دارالسلطنت فیض آباد کا دربار بھی شیراز اور اصفہان کے درباروں کا ہم پلّہ بنانے کی غرض سے مرزا محمد رفیع سوداؔ کو دہلی سے بُلا بھیجا۔ اُس وقت دہلی میں سوداؔ کی اچھی خاصی بسر اوقات ہورہی تھی۔ اِس لئے وہ دہلی چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے اور جواب میں یہ رباعی کہہ کر نواب کی خدمت میں بھیج دی ؎

سوداؔ پئے دُنیا تُو بہر سُو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ باں کُو کب تک
حاصل یہی اِس سے نا کہ دُنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تُو کب تک

طنزیہ

اُوٹ پٹانگ

فکر تونسوی

اِس مرتبہ اوٹ پٹانگ باتیں کرنے کی تکنیک بدل رہا ہوں۔

اِس تبدیلی کی وجہ وہ صاحب ہیں جنھوں نے ایک دن میری گردن ناپ لی اور کہا کہ تم ہمیں مسلسل دھوکا دے رہے ہو کیونکہ تم اوٹ پٹانگ باتوں کے پردے میں کوئی نہ کوئی مفہوم چھپا کر رکھ لیتے ہو۔ جو چوری چھپے ہمارے اندر داخل ہو کر ہمیں تنگ کرتا ہے۔ حالانکہ اوٹ پٹانگ باتیں وہ ہوتی ہیں جو واقعی اوٹ پٹانگ ہوں، جن کا کوئی سر ہو نہ پیر۔ اوٹ پٹانگ باتوں میں مفہوم پیدا کرنا تو شرارت ہے۔

مجھے انتہائی افسوس ہے کہ لاعلمی میں میرے قلم سے ایسی اوٹ پٹانگ باتیں نکل گئیں جن سے کوئی نہ کوئی مفہوم اُبھرتا رہا۔ اِس مرتبہ اِس نقص سے بچنے کے لئے باتوں کی تکنیک بدل رہا ہوں۔

ہمارے یہاں ایک ترکیب مستعمل ہے "کھانا پینا"۔ کھانا حیوانوں کا فعل ہے۔ حیوانوں میں انسان بھی شامل ہیں۔ انسان کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اُلّو، گدھا، لومڑی، ہاتھی، چمگادڑ ——— چمگادڑ دن کو اندھا ہو جاتا ہے۔ ایک بار ایک چمگادڑ کو اندھ ودیالیہ میں داخل کر لیا گیا تو سمجھ کے لوگوں نے شور مچا دیا کہ ہمارے دان کے پیسے واپس کرو۔ ہمیں چمگادڑوں سے کیا لابھ؟ شور مچانے والوں میں ایک لابھ سنگھ بھی تھا، جو ایک فرنگی حسینہ کو یہ کہہ کر اغوا کر لایا تھا کہ میں مغلیہ خاندان کا آخری شہزادہ ہوں۔ حالانکہ حقیقت صرف اِتنی تھی کہ اُس نے صرف "خاندان" فلم میں ایک چپراسی کا رول ادا کیا تھا اور آجکل چپراسیوں سے پانچ پانچ روپے قرض لیا کرتا تھا۔ چپراسی ہمیشہ سُود کے لالچ میں قرضے دے دیتے ہیں اور اصل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ لالچ بُری بلا ہے چاہے چپراسی کو ہو چاہے وزیر کو۔ وزیروں میں شطرنج کا وزیر سب سے اچھا ہوتا ہے جو بادشاہ کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ کچھ بادشاہ ایسے بھی پیدا ہو گئے ہیں، جو جمہوری بادشاہ کہلاتے ہیں۔ اُن کے پیچھے کوئی نہیں چلتا بلکہ وہ خود جمہور کے پیچھے چلتا ہے۔ جیسے مرد کے پیچھے عورت چلتی ہے۔ بادشاہ اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اگرچہ آج کل لڑائیاں بغیر وجہ کے بھی ہوتی ہیں۔ جیسے ایک ملک کے وزیرِ اعظم نے دوسرے مُلک کے وزیرِ اعظم کو بطور تحفہ کے نسوار بھیجی جس سے اُسے چھینک آگئی تو ٹینک اور توپیں میدان میں آگئے۔ توپیں اور ٹینک صرف اِس لئے پیدا کئے جاتے ہیں تاکہ کوئی چھینک مارے اور قتلِ عام کر دیں۔ حالانکہ چھینک زکام سے آتی ہے یا نسوار سے آتی ہے۔ نسوار کی خاطر تلوار نکالنا جہالت ہے لیکن تلوار اگر میان میں رہے تو فولاد کے کارخانے بنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہم نے ایک کارخانہ دیکھا جس میں کاریں بنتی تھیں۔ کئی ماڈل کی کاریں مثلاً بدکار، صلاح کار، کلاکار، چمتکار، بیکار، سرکار ——— سرکار صرف بیکار لوگ بناتے ہیں۔ کیونکہ جنھیں کوئی اور کام نہیں ہوتا وہ اپنی بیکاری دُور کرنے کے لئے سرکار بنا لیتے ہیں اور جو بیکار بچ جاتے ہیں وہ انقلابی بن جاتے ہیں اور سرکار کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں اور انقلاب زندہ باد کہتے ہوئے کاروں کے کارخانے پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ انقلاب ہمیشہ زندہ باد ہوتا ہے۔ مُردہ باد وہ ہوتے ہیں جو انقلاب کو حرام کی کمائی سمجھ کر کھاتے ہیں۔ کمائی صرف ایمان کی ہونی چاہئے۔ ایک بار کا ذکر ہے ایمان کو کمائی کرنے کی سُوجھی۔ وہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے دفتر میں گیا اور کہا۔ میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ میرا نام درج کیجئے۔ اُسے دھکے مار مار کر باہر نکال دیا گیا۔ ایسے فعل کو دھکا شاہی کہتے ہیں۔ دھکا شاہی سے شاہی محل بنتے ہیں، شاہی باغ بنتے ہیں، شاہی حلوے بنتے ہیں۔ ایک بار میں نے شاہی حلوہ کھایا تھا۔ انکم ٹیکس افسر کے دستر خوان پر۔ اُس میں سے انسانی خون کی بُو آتی تھی۔ مجھے اُبکائی آگئی۔ پھر ایک شاہی ڈاکٹر بلایا گیا۔ جس نے کہا کہ تمھارا معدہ کمزور ہے۔ انسانی خون ہضم کرنے کے لئے مضبوط معدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ڈاکٹر لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں، مرض کو نہیں دیکھتے مریض کو دیکھتے ہیں کہ اُس کا بنک بیلنس کتنا ہے؟ ساری میڈیکل سائنس بنک بیلنس کی غلام بن گئی ہے۔ جتنے بنک فیل ہوتے ہیں ڈاکٹروں کی غلط تشخیص سے ہوتے ہیں۔ تشخیص چاہے سیاسی ہو، سماجی ہو، ادبی ہو، بڑی گڑبڑ کرتی ہے۔ چور کو جج بنا دیتی ہے، گدھے کو موٹر کار پر سوار کر دیتی ہے اور افسانے کو ناول قرار دے دیتی ہے۔ ناولوں میں جاسوسی ناول سب سے اچھا ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ جاسوسی ناول جس کا جاسوس آلوؤں اور بینگنوں کی طرح ترازو میں تُل کر بِک جاتا ہو۔ ایسے جاسوسوں کو تھالی کا بینگن بھی کہتے ہیں مگر اِس میں قصور بینگن کا نہیں تھالی کا ہے۔ تھالی میں لڑھکانے کی صلاحیت ہوتی ہے اِس لئے

[illegible] جاتے ہیں۔ اِس لئے جو دانش مند ہوتے ہیں، وہ خود نہیں لڑھکتے بلکہ [illegible] کو ہی لڑھکا دیتے ہیں یعنی ایسی سلطنت پر بھی لات مار دیتے ہیں جس میں بھرشٹاچار ہو اور کچھ بھرشٹاچاری جو اپنی لات بچانے کے لئے سلطنت کو کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ سداچار سمتی بنالیتے ہیں اور لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ضمیر کی آواز ہے۔ ضمیر کی آواز کو اگر ٹیپ ریکارڈ کر لیا جائے تو بڑے بڑوں کے پول کھُل جائیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ٹیپ ریکارڈنگ مشین صرف بڑے بڑے لوگوں ہی کے پاس ہوتی ہے اِس لئے وہ اپنے ضمیر کا پول ریکارڈ نہیں کرتے۔ بلکہ صرف چھوٹے چھوٹے لوگوں کے پول کھولنا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ چھوٹے لوگوں کے پول کھُل جائیں تو سماج کا اخلاق قائم رہتا ہے۔ چنانچہ اخلاق قائم ہوجاتا ہے مگر سماج اُکھڑ جاتا ہے۔

ایک سماج اُکھڑ جاتا ہے تو دوسرا سماج آجاتا ہے۔ آریہ سماج اُکھڑ جائے تو دیو سماج آجاتا ہے، بھارت سیوک سماج آجاتا ہے حتیٰ کہ سادھو سماج تک آجاتا ہے۔ جس میں سادھو کم اور سماج اُس سے بھی کم ہوتا ہے۔ لیکن سماج میں چاہے کچھ کم ہوجائے یا زائد ہوجائے سماج سُدھار برابر جاری رہتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سماج ہمیشہ سُدھرتا رہتا ہے اور اِس سے بھی زیادہ بے معنی بات یہ ہے کہ سماج سماج کو سُدھارتا رہتا ہے جیسے چوری چور کو چوری سے منع کرنے لگے۔ اسے عرفِ عام میں چور کی ہیرا پھیری کہا جاتا ہے۔ کیونکہ چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ جیسے اکثر آپ نے دیکھا ہوگا کہ کئی لوگ دو گز لمبا تلک لگا کر مندر میں جاتے ہیں اور بھگوان سے کہتے ہیں اے بھگوان! ہمیں پاپ کی ترغیب سے نجات دلا اور پھر بھگوان کی نظر بچا کر بھگوان کی مورتی سے تھوڑا سا سونا توڑ کر جیب میں ڈال لیتے ہیں اور وہ سونا بیچ کر اینٹیں خریدتے ہیں۔ اُن میں سے آدھی اینٹیں اپنے بنگلے پر لگاتے ہیں اور آدھی اینٹیں بھگوان کے مندر کو دان میں دے دیتے ہیں۔ بھگوان کے ساتھ یہ سوشلزم برت کر وہ بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہمیں پاپ کی ترغیب سے نجات دلا۔

مگر بھگوان اُنہیں نجات نہیں دلاتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے بھگتوں کو نجات دلا دی تو وہ میرا نام لینا ترک کردیں گے۔ لہٰذا وہ چُپ رہتا ہے۔ اِس چُپ سے مندر کی رونق قائم رہتی ہے اور بھگتی اور بھجن اور دھرم کا بازار گرم رہتا ہے۔ کیونکہ بازار پر یا بھگوان کے اُن کی رونق مارکیٹ میں بیچی جانے والی چیزوں سے ہی قائم رہتی ہے۔ چیزیں جو بکتی رہیں۔ سستی کم اور مہنگی زیادہ بکتی رہیں۔ اگر صبح ایک بھجن کا ریٹ پانچ روپے ہو تو شام تک چھ روپے ہوجائے تاکہ کچھ لوگ بھجن خرید سکیں، کچھ نہ خرید سکیں۔ جس طرح کچھ لوگ انڈے خرید سکتے ہیں کچھ نہیں خرید سکتے۔ نہ صرف مرغی کے انڈے بلکہ چڑیا کے انڈے تک نہیں خرید سکتے۔ انڈے

اور بھجن میں طبعی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ صرف دونوں کی ساخت اور ڈیزائن کا فرق ہوتا ہے مگر دونوں کی مینوفیکچرنگ کمپنی ایک ہی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ فیکٹری کے سوال پر دُنیا بھر میں جنگ و جدل جاری رہتی ہے۔ ایک کہتا ہے فیکٹری کو چنے کی دال بنانی چاہئے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں، فیکٹری صرف انگور بنائے گی۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ انگور سے شراب بن سکتی ہے۔ چنے کی دال سے کچھ بھی نہیں بنتا۔ چنانچہ چنے کی دال اور انگور کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ دُنیا کی ساری تاریخ چنے کی دال اور انگور کی شراب کی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ کبھی کبھی ایسا حادثہ بھی ہوجاتا ہے کہ جنگ کی بجائے امن آجاتا ہے جس سے لوگ کاہل ہوجاتے ہیں اور عیاشی کے سامان تیار کرنے لگتے ہیں۔ یعنی لپ سٹک بناتے ہیں اور کتھا کلی ڈانس اور دیک [illegible] اور ریشمی جھالروں والے نفیس اور جمیل پردے اور شیشوں کے جھومر اور محل اور نارنجی اور گلابی اور قرمزی پھولوں کے گلستان جن میں حسین جوڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ حمائل کرکے سَیر گشت کرتے ہیں ــــــ اور پھر دُنیا کے سبھی عیاش اور امن پسند اور کاہل اور آرٹسٹ لوگ زور شور سے ڈھنڈورا پیٹنے لگتے ہیں کہ ہم بڑے مہذب ہوگئے ہیں اور یہ ڈھنڈورا اتنے زور شور سے پیٹا جاتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ طبلِ جنگ میں بدل

جاتا ہے اور پھر وہی امن پسند، مہذب لوگ ایک دوسرے کے گلے چیرنے لگتے ہیں۔ زمانۂ امن میں جو گلستان اور محالیں اور ڈانس اور بنگلے بناتے ہیں، انھیں مسمار کر دیتے ہیں۔ جس چیز کو خود بناتے ہیں اُسے خود ہی برباد کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ رو رو کر یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ تہذیب کی بربادی ہے۔ کچھ لوگ اِسے مگرمچھ کے آنسو بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر بڑے خوش ہوتے ہیں کہ تہذیب کی بربادی میں کتنی لذت ہوتی ہے اور مگرمچھ کے آنسوؤں میں بھی ایک پُراسرار لُطف ہوتا ہے۔ چند ثانیوں، چند مہینوں، چند برسوں کی لذت کے لئے اگر ایک پُوری تہذیب برباد کر دی جائے تو اِس میں کیا بُرائی ہے۔ ہمارے باوا آدم نے پَل بھر کی لذت کے لئے دانۂ گندم چکھ لیا تھا اور اپنے اوپر پوری جنت حرام کر لی تھی اور سچ پُوچھا جائے تو جنت اور دوزخ ڈکشنری کے دو لفظ ہیں اور یہ لفظ ہم نے خود ایجاد کئے ہیں اِس لئے ہم اِن لفظوں کو مسخ بھی کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ پوری کی پوری ڈکشنری کو اُٹھا کر سمندر سا گر میں پھینک سکتے ہیں۔ ایک ڈکشنری مر جائے گی تو ہم دوسری ڈکشنری کو زندہ کر دیں گے جن میں دوسرے الفاظ ہوں گے اور دوسرے مفہوم۔

مثلاً ہم نے ایک لفظ ایجاد کیا تھا "گلابی ہونٹ"۔ ہمارا جب تک جی چاہا اِن گلابی ہونٹوں کو چُومتے رہے لیکن جب چُومتے چُومتے تھک گئے، اُکتا گئے تو اِن ہونٹوں پر سیاہ رنگ تھوپ دیا، اُن پر زہر کا لیپ کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اِن ہونٹوں کو جو بھی چُومے گا مر جائے گا۔ ہونٹ وہی رہے، مفہوم بدل گیا۔ گلاب، زہر بن گیا اور گلابی رُخساروں نے خودکشی کر لی۔ جو حُسن کل تک لذت کے شیریں گھونٹ عطا کرتا تھا، وہ چھت کی رسّی سے لٹکتا ہوا پایا گیا۔ اندھے اور غلیظ کنوئیں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پڑا دیکھا گیا۔ بلکہ کبھی کبھی تو جب حُسن کو غصہ آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ اپنے ننھے ننھے معصوم بچّوں کو بھی آغوش میں لے کر کنوئیں میں چھلانگ لگا دیتا ہے ——— "معصوم بچّوں کو اِس ڈائن ماں نے کیوں مار دیا؟" ہم کفِ افسوس مَلتے ہوئے کہتے ہیں ——— لیکن پھر اچانک تقدیر کا ایک فرشتہ برآمد ہو جاتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک رجسٹر ہوتا ہے اور وہ ہمیں دکھاتا ہے کہ یہ نوشتۂ تقدیر تھا۔ معصوم بچّوں کو بھی اِسی طرح خودکشی کرنی تھی ——— چنانچہ ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور شکر کا لمبا، گہرا سانس بھر کر کہتے ہیں ——— "سچ ہے۔ موت تو سب کو آنی ہے۔ چھوٹوں کو بھی، بڑوں کو بھی۔ لہٰذا مزید سوچنے کی ضرورت نہیں۔ آیئے، ریستوران میں چل کر چائے کا ایک کپ پی لیں اور بھول جائیں کہ مرحومہ نے چنے کی دال نہ ملنے کی وجہ سے خودکشی کی تھی۔ یہ تو نصیب کی بات ہے۔ کسی کو انڈے ملتے ہیں کسی کو چنے کی دال اور جب کسی کو چنے کی دال بھی نہیں ملتی تو وہ چھت کی رسّی سے لٹک جاتا ہے۔ چھت کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ ایک تو سایہ دیتی ہے دوسرے جسم اور روح کو الگ کرنے کا کام کرتی ہے۔ دُنیا میں ہر شے کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ کرسی ہے، اِس پر انسان بیٹھ کر آرام بھی کرتا ہے۔ اُسے اُٹھا کر کسی کا سر بھی پھوڑ دیتا ہے اور اگر یہ کرسی حاکم کی ہو تو اُس سے دو اور کام لئے جا سکتے ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں

رئیس مینائی بنگلوری

آشفتگانِ زیست کا چہرہ اُتر گیا ۔۔۔ اے موت آج تیرا مقدّر سنور گیا
جو رہسپارِ مسلکِ اخلاص و عشق تھا ۔۔۔ بزمِ سخن سے آج وہ اہلِ ہُنر گیا
وہ کیا ڈرے گا قبر کی تاریکیوں میں بھی ۔۔۔ راہِ وفا میں جس کا اُجالا بکھر گیا
اب محفلِ حیات ہے سُونی پڑی ہوئی ۔۔۔ بزمِ جہاں سے کون صاحب نظر گیا
اِک عمر جس کے ہجر میں رُوئیں گے یار سب ۔۔۔ احباب کو الم میں وہ کیوں چھوڑ کر گیا

پہلے مجید[1] و سالک[2] و شوکت[3] چلے گئے
وہ بھی قضا کے دوش پہ احسان دھر گیا

[1] مجید لاہوری [2] مولانا عبدالمجید سالک [3] شوکت تھانوی

یعنی حاکم سے انصاف بھی لیا جا سکتا ہے اور اُسے کرپٹ کر کے اُس سے ناانصافی بھی کرائی جا سکتی ہے۔ اِسے فوٹوگرافی کی اصطلاح میں نیگیٹو اور پازیٹو کہا جاتا ہے۔ نیگیٹو بھیانک ہوتا ہے مگر اُسی بھیانک نیگیٹو سے نہایت دلآویز پازیٹو تیار کر لیا جاتا ہے۔ ہم میں سے ایسے کئی ڈراؤنے چہرے والے انسان دیکھے ہیں جنھیں دیکھتے ہی بدن کانپ اُٹھتا ہے اور جی چاہتا ہے بھاگ جائیں اور ریلوے لائن کے اوپر جا کر اپنا سر رکھ دیں۔ لیکن جونہی ہمارا سر ریلوے لائن پر رکھنے کے لئے جُھکتا ہے، وہی ڈراؤنے چہرے والا انسان اپنا شفیق ہاتھ بڑھاتا ہے اور ہمیں بچا لیتا ہے۔ ہمیں اپنی محبت بھری آغوش میں جھولا جھلانے لگتا ہے اور ہمیں پھلوں کا جُوس پلاتا ہے اور ہم تعجب سے سوچتے ہیں، یہ تو بے حد پیارا اور حسین انسان ہے، ہم خواہ مخواہ ڈر رہے تھے۔ اس کے مکروہ بدن کے اندر تو نہایت رسیلا اور شیریں دل دھڑک رہا ہے۔ یہ دھڑکن ہم نے پہلے کیوں نہیں سُنی؟

مگر دل انتہائی مشکوک چیز ہے۔ میرے دل میں کیا ہے، تمھارے دل میں کیا ہے؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اُس کے اندر بہت سی چیزیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا رہتی ہیں۔ محبت اور نفرت ایک دوسرے میں کچھ یوں گڈمڈ رہتی ہیں کہ ہم نہ صحیح طریقے سے محبت کر سکتے ہیں نہ نفرت۔ اِس لئے ہم سب ایک دوسرے کی محبت پر بھی شک کرتے ہیں اور نفرت پر بھی۔ جس دن دل میں سے یہ شک نکل گیا، دل مر جائے گا۔ ایسی مشکوک چیز پر بھروسہ کر کے ہم سب زندگی گزار رہے ہیں۔ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے؟


ماں کی مامتا
اعلیٰ ترین کی
کسوٹی ہے...

حُسنِ طلب

پروفیسر عبدالرب عرفانؔ ایم۔اے

ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف پرشین
ودربھ مہاودیالیہ، امراوتی (مہاراشٹر)

یکم اگست ۱۹۶۶ء

محترم خوشتر! اے ادیبِ شہیر! — عظمتِ فکر و فن ادب کے وقار
رہبرِ کاروانِ علم و ہنر — اے صحافت کے قافلہ سالار
عالمِ دوستی، جہانِ وفا — روحِ اخلاص، پیکرِ ایثار
آپ کے نامۂ گرامی سے — دل کو حاصل ہوا سکون و قرار
حوصلے پھر بڑھے تجسس کے — فکرِ خوابیدہ پھر ہوئی بیدار
آج پھر ارمغانِ "حُسنِ طلب" — لے کے حاضر ہوا ہے نذر گذار
گو حقیقت نہیں یہ پوشیدہ — میں ہوں کیا اور کیا مرے افکار
جانے کیوں پھر بھی ہے مجھے اُمید — میری محنت نہ جائے گی بے کار
ہے یہ زیرِ نظر جو مجموعہ — اس میں ہیں وہ لطائف و اشعار
شعرا کی ہوئی ہے نظم اِن میں — شوخیٔ طبع و ندرتِ افکار
ہیں یہ وہ آئنے کہ ہیں جن میں — منعکس اُن کی صورتِ کردار
یادگارِ زمانۂ شاہی — ہیں یہ سارے لطائفِ دربار
جنسِ حُسنِ طلب کے ماضی میں — کیا رہی ہوگی گرمیٔ بازار
بچ سکا اِس سے جب نہ غالب سا — شاعرِ خوش کلام و خوش گفتار
اُس کو کہنا پڑا حضورِ ظفر — وقت ایسا بھی آپڑا اِک بار
"آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار"
قصہ کوتاہ نذرِ بندہ نواز — ہیں یہ تازہ لطائف و اشعار
کرکے شامل کسی اشاعت میں — مجھ کو فرمائیے گا شکر گذار
ہے دُعا آپ کی ترقی کے — یوں ہی قائم رہیں یہ لیل و نہار

"تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

اخلاص کوش ——— عبدالرب عرفان


گھر میں دھلی
سرف
سے دھلی
Surf
AMAZING BLUE POWDER
FOR THE WHITEST WASH!

شاعر حیدری تبریزی نے ہندوستان کے مغل شہنشاہوں میں سے کسی کی شان میں ایک بلند بانگ قصیدہ لکھ کر پیش کرنا چاہا۔ شہنشاہ نے اُس کے کلام پر کوئی توجہ نہ کی۔ اپنی اُمیدوں اور تمناؤں کے اِس دلشکن انجام سے شاعر قدرے مایوس ہوا لیکن حوصلہ نہ ہارا۔ اُس نے خواجہ حافظ شیرازی کے ایک شعر کی تضمین لکھ کر شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کردی ؎

در مدحِ پادشاہِ سخن سنجِ ملکِ ہند　　گفتم قصیدۂ کہ پسندید ہر کہ دید
اما چو روزگار مددگارِ من نبود　　زاں شاخِ گُل بپائے دلم خارِ غم خلید
نشنیدہ شاہِ عقدہ کشا مصرائے زمن　　نکشودہ قفلِ آرزوئے من ازاں کلید
بودم در آبِ دیدۂ خود غرقِ بحرِ خوں　　کز غیب ایں ترانہ بگوشِ دلم رسید
حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس　　در بندِ آں مباش کہ نشنید یا شنید"

(کی مدح پادشاہِ سخن سنجِ ہند کی　　آیا پسند اُسے یہ سخن جس نے بھی سُنا
لیکن زمانہ چونکہ نہ تھا میرا سازگار　　اُس شاخِ گُل سے خارِ الم دل میں چُبھ گیا
مصرع نہ شاہِ عقدہ کشا نے سُنا کوئی　　میری کلیدِ قفلِ تمنا نہ وہ بنا
میں اپنے اشکِ چشم سے تھا غرقِ بحرِ خوں　　ناگاہ گوشِ دل نے سُنی غیب سے صدا
معروضِ دعائے خیر ہی حافظ ہے تیرا فرض　　اُس نے نہیں سُنی کہ سُنی اِس سے تجھ کو کیا؟)

شاعر کی اِس غیر معمولی جرأت اور بیباکی سے شہنشاہ بہت خوش ہوا اور اُسے انعام و خلعت عطا کرنے کا حکم صادر کردیا۔ لیکن خازن نے شہنشاہ کے اِس حکم کی تعمیل میں تاخیر کی۔ کچھ روز انتظار کرنے کے بعد حیدری نے مجبور ہوکر شہنشاہ کی خدمت میں یہ اشعار پیش کردیئے ؎

مشکلے دارم شہا خواہم کنم پیشِ تو عرض　　زاں کہ زیں مشکل مرا صد داغِ حسرت بر دل است
سیم و زر انعام کردی لیک از خازن مرا　　ہم گرفتن مشکل و ہم ناگرفتن مشکل است

(ہر اک مشکل مری اے شاہ مجھ کو عرض کرنے دے　　کہ یہ مشکل نہیں صد داغہائے حسرتِ دل ہے
مجھے انعام سیم و زر دیا تُو نے پہ خازن سے　　جو لیتا ہوں تو مشکل ہے نہ لیتا ہوں تو مشکل ہے)

اِس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ شاعر کو انعام فوراً مل گیا۔

مشہور قصیدہ گو شاعر سلمان ساؤجی نے اپنے مربّی اور ممدوح اتابک امیر حسن فرمانروائے آذربائیجان سے ایک لباس کی درخواست کی اور عرضِ مدعا کے طور پر قطعۂ ذیل خدمت میں ارسال کیا ؎

اے ز استغنی ز احوالِ ما!　　بر شما احوالِ ما پوشیدہ نیست
بر تنم پوشیدنی نیست و بس　　بندہ را ہیچ از شما پوشیدہ نیست

(اے کہ مجھ جیسوں سے تُو ہے بےنیاز　　تجھ سے یہ حالات پوشیدہ نہیں
بس یہی پوشش ہے میرے جسم پر　　میری کوئی بات پوشیدہ نہیں)

اتابک نے اپنا ایک ذاتی لباس اِس جواب کے ساتھ بھیج دیا ؎

ہر چند ترا جامۂ ما پوشیدن　　عیب است ولیکن ایں عیب بپوش

(پوشاک مری زیبِ بدن کرنا تجھے　　ہر چند ہے عیب پہ یہ عیب چھپا)

شیخ الاسلام تبریزی نے شاعر ملا محمد عصار کو اپنا ایک استعمال شدہ لباس بخشا۔ ایک عالمِ دین کی اِس بخشش کو متبرک سمجھ کر استعمال کرنے کی بجائے کسی وجہ سے شاعر نے اُس کہنہ اور فرسودہ لباس کو پہننا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ معذرت کے طور پر شیخ الاسلام کو یہ اشعار لکھ بھیجے ؎

جامۂ بخشید شیخ اسلامِ اعظم بندہ را　　دہ مبارک جامۂ سال فراواں یافتہ
رشتہ حوا از برائے آدمش در بدو حال　　مریمش در کارگاہ از بہرِ عیسیٰ بافتہ
وانگہ از مفتولِ پشمِ ناقۂ پیغمبرش　　فاطمہ گشتہ رفوگر ہر کجا بشگافتہ
من چہ حد دارم کہ پوشم جامۂ را کاندرو　　آفتابِ طلعتِ چندیں پیمبر تافتہ

(بخشی اک پوشاک شیخ اسلامِ اعظم نے مجھے　　وہ مبارک جامہ جس نے پائی اک عمرِ دراز
جس کو حوا نے کیا تیار آدم کے لئے　　بہرِ عیسیٰ جس کو مریم نے بُنا با عزّ و ناز
پھر نبیٔ آخریں کی اونٹنی کے بال سے　　فاطمہ نے کردیئے جس کے رفو چاک دراز
میری کیا ہستی کہ پہنوں اُس لباسِ پاک کو　　جس میں چمکے ہیں کئی پیغمبروں کے مہرِ ناز)

خراسان کے فاضلوں میں سے ایک شخص نے عمرو ابن لیث سے اپنی کسی حاجت کو روا کرنے کی درخواست کی اور رقعہ میں لکھ دیا: "امیر ہزار سال جئے"۔ عمرو نے جواب رقعہ کی پُشت پر تحریر کیا کہ "بزرگوں کے سامنے ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے جو حقیقت سے بعید ہو۔ تُو نے لکھا کہ امیر ہزار سال جئے یہ بات قطعی ناممکن اور غلط ہے۔ ہم نے رقعہ میں لکھی ہوئی دوسری باتوں کو بھی اِسی پر قیاس کرلیا ہے۔"

جب اِس فاضل کو عمرو کے اعتراض کی اطلاع ہوئی تو فوراً ہی وہ خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا معروضہ پیش کیا: "امیر اپنے اعتراض کا جواب عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائے تو عرض کروں کہ انسان کی بقا کا انحصار اُس کے جسمانی اور مادّی وجود پر نہیں ہے بلکہ اُس کی شہرت اور نیک نامی پر ہے اور یہ بات امیر کے ذہنِ رسا سے پوشیدہ نہیں۔ جیسا کہ کسی خوش فکر شاعر نے کہا ہے ؎

زندہ است نامِ فرخِ نوشیرواں بعدل　　گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند

(زندہ ہے نامِ فرخِ نوشیرواں بعدل　　گزرے اُسے اگرچہ زمانہ گزر گیا)

عمرو کو اِس فاضل کا طرزِ استدلال بہت پسند آیا اور اُس نے اُس کی حاجت پوری کردی۔

ایک رات سلمان ساوجی اپنے مُربّی اور ممدوح سُلطان اویس کے ساتھ بیٹھا ہوا فروغِ بادہ سے دیدہ و دل روشن کر رہا تھا۔ جب کافی رات گزر گئی تو وہ اُٹھا اور سلطان سے اجازت لے کر گھر کی راہ لی۔ رات کی تاریکی کا خیال کرتے ہوئے سلطان نے ایک غلام کو حکم دیا کہ وہ ایک شمع روشن کر کے سلمان کو اُس کے گھر تک پہنچا آئے۔ گھر پہنچ کر سلمان نے شمع اپنے پاس ہی رکھ لی۔ تاکہ دوسری شمع روشن کرنے کی زحمت سے بچ جائے۔ چونکہ شمعدان سونے کا بنا ہوا تھا، دوسرے دن سلطان کا غلام اُسے طلب کرنے کے لئے آ پہنچا۔ لیکن سلمان نے مطالبے کے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

شمع خود سوخت بزاری شبِ دوشم افروز   گر لگن را طلبد شاہ زمن، من سوزم

(شمع خود جلتی، روتی رہی شب تا صبح   شمعداں شاہ گر اب مانگے تو میں جلتا ہوں)

سلطان نے شعر پڑھ کر ایک قہقہہ لگایا اور کہا سونے کی بنی ہوئی کوئی شے کسی شاعر کو دے کر واپس لے لینا تقریباً ناممکن ہے اور وہ شمعدان سلمان کو بخش دیا۔

رشید الدین وطواط اپنے عصر کا ایک معروف شاعر گزرا ہے۔ اُسے شاہِ سنجر کے دربار میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ایک مرتبہ دربار میں اُسے ایک ایسی نشست دی گئی جو کسی طرح اُس کے مرتبۂ علم و فضل کے شایانِ شان نہ تھی۔ اِس کے برعکس کئی کم ہنر اور کم مرتبہ افراد کو وہ نشستیں حاصل تھیں جو مسندِ شاہ سے بہت قریب تھیں۔ نازک مزاج شاعر کے دل پر اِس ناقدری کا گہرا اثر ہوا اور اُس نے اپنے محسوسات کو اِن الفاظ میں ادا کر کے بادشاہ کو اُسی وقت اِس ناقدری کی طرف متوجہ کیا ؎

شاہا مدارِ چرخِ فلک در ہزار سال   چوں من یگانہ ننماید بصد ہنر
گر زیر دستِ ہر کس و ناکس نشستہ ام   اینجا لطیفہ ایست بدانم من ایں قدر
بحر است مجلسِ تو و در بحر بے خلاف   لؤلؤ بزیر باشد و خاشاک برزبر
(پیدا کیا نہ دورِ فلک نے ہزار سال   اے شاہ کوئی مجھ سا یگانہ بصد ہنر
بیٹھا ہوں میں جو ہر کس و ناکس کے زیرِ دست   میں جانتا ہوں اس میں لطیفہ ہے اِس قدر
مجلس ہے مثلِ بحر تری اور بحر میں   ہوتا گہر ہے تہ میں تو خاشاک سطح پر)

(نوٹ:۔ یہ لطیفہ بعض تذکرہ نویسوں نے امیر شاہی سبزواری سے منسوب کیا ہے، جو تُرک بادشاہ بایسنغر کے دربار میں تھا)۔

سلمان ساوجی کے مُربّی نے ایک موقع پر اُسے ایک سیاہ گھوڑا از راہِ کرم بخشا۔ شاعر کو وہ گھوڑا کسی وجہ سے پسند نہ تھا۔ اُس نے گھوڑے کی تبدیلی کے لئے بادشاہ سے اِن الفاظ میں التماس کی ؎

شاہا اُمید بود کہ خواہم بدولتت   بر مرکبے بلند و جوان و رواں نشست
اسپیم پیر و کاہل و کوتہ ہمی دہند   اسپے نہ آنچناں کہ توانم بر آں نشست
چوں کلکِ مرکبے سیہ و سست و لاغر است   جہلِ مرکّب است بدانسی چناں نشست
از بندہ مہتر است بسی سال راستی   گستاخی است بر زبرِ مہتراں نشست
(اے شاہ تھی اُمید مجھے تیرے دَور میں   ہوں گا سوار اسپِ بلند و جواں، مگر
حیران ہوں کہ بیٹھوں تو میں بیٹھوں کس طرح   گھوڑا ملا مُعمّر و کوتاہ اِس قدر
ہے وہ کسی قلم کی طرح لاغر و سیاہ   جہلِ مرکّب اس پہ سواری ہے، مختصر
بندے سے عمر میں ہے بڑا تیس سال وہ   توہین بیٹھنا ہے بزرگوں کی پُشت پر

خواجہ حافظ شیرازی نے شاہِ یزد کی شان میں چند اشعار کہے اِس توقع پر کہ کچھ صلہ ہی جائے گا۔ لیکن اُس کی اُمیدوں کے برخلاف شاہِ یزد نے سکوت اختیار کیا۔ اب حافظ کے لئے سوائے صبر کے کوئی چارہ کار نہ تھا چنانچہ اُس نے بھی یہ کہہ کر خاموشی اختیار کرلی ؎

شاہِ ہرموزم ندیدہ بے سخن صد لطف کرد   شاہِ یزدم دیدہ مدحش گفتم و ہیچم نداد
کارِ شاہاں ایں چنیں باشد تو اے حافظ مرنج   داورِ روزی رساں توفیق و نصرت شاں داد
(شاہِ ہرمز نے کئے بے مدح لُطفِ بے شمار   مدحِ شاہِ یزد کی لیکن نہ کچھ پایا وہاں
ہے یہی شاہوں کی فطرت حافظ اِس کا غم نہ کر   دے اُنھیں توفیق نصرت داورِ روزی رساں)

عبدالرحیم خانِ خاناں کی علم دوستی اور ادیب پروری تاریخ ادب کا وہ روشن باب ہے جسے دنیائے علم و فن کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ موصوف کی داد و دہش کا شہرہ ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر دُور دراز کے مُلکوں تک پہنچ چکا تھا۔ اُس کی محفل شعرائے عصر کے لئے کعبۂ اُمید تھی۔

شاہ عباس صفوی کے عہد کا ایک شاعر کوثری اپنے وطن شیراز کے اُمراء اور اربابِ جاہ و ثروت کی قدر ناشناسی کا شکار تھا۔ خانِ خاناں کی داد و دہش کی شہرت سُن کر اُس نے بادشاہ اور اُمراء کے قہر و عتاب کا خیال کئے بغیر اشعارِ ذیل کی شمولیت کے ساتھ ایک قصیدہ خانِ خاناں کی خدمت میں روانہ کردیا ؎

کہ در ایراں کسے ناید پدیدار   کہ باشد جنسِ معنی را خریدار
در ایراں تلخ گشتہ کامِ جانم   بیاید شد سوئے ہندوستانم

چو قطرہ جانبِ عمّاں فرستم — متاعِ خود بہ ہندستاں فرستم
کہ نبود در سخن دانانِ دَوراں — خریدارِ سخن جُز خانِ خاناں

(نظر آتا نہیں ایراں میں کوئی — جو ہو قیمت شناسِ جنسِ معنی
مری قسمت یہاں ہے تلخ کامی — نہ کیوں میں راہ لوں ہندُستاں کی
رواں ہو جیسے قطرہ سوئے دریا — کیا سرمایۂ ہند اپنا روانہ
نہیں کوئی سخن فہموں میں زنہار — سخن کا خانِ خاناں سا خریدار)

مرزا عبدالقادر بیدل اپنے منفرد طرزِ سخن کے لئے دنیائے شعر و ادب میں ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ اُن کے مزاج میں بذلہ سنجی اور مزاح کا عنصر بھی بدرجۂ اُتم موجود تھا۔ جس سے وہ کبھی کبھی اپنے مقاصد کی تکمیل کا کام بھی لے لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک کابلی سوداگر زیادہ منافع کے لالچ میں انار فروخت کرنے ہندوستان چلا آیا۔ بدقسمتی سے اُس کے بیشتر انار گل کر خراب ہوگئے۔ چند انار جو کسی طرح محفوظ رہ گئے تھے وہ اُس نے حضرت بیدل کی نذر کردیئے۔ اور انھیں اپنی بد نصیبی کی داستان کہہ سنائی۔ مرزا صاحب نے قدرے تامّل کے بعد کاغذ کے ایک پُرزے پر مندرجہ ذیل شعر لکھا اور سوداگر کے ہاتھوں نواب لُطف اللہ خاں کی خدمت میں رواہ کردیا ؎

بخیۂ کفشم اگر دنداں نما شد عیب نیست
خندہ دارد چرخ ہم بر ہرزہ گردی ہائے من

(کفش کے بخیئے ہوئے دنداں نما تو عیب کیا
چرخ بھی ہے خندہ زن آوارہ گردی پر مری)

نواب صاحب نے اُسے مرزا کے حُسنِ طلب پر محمول کیا۔ انھیں خیال گزرا کہ شاید مرزا صاحب کی کفش (جوتی) ٹوٹ گئی ہے۔ اُسی وقت ازراہِ لُطف ایک لاکھ روپیہ مرزا صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ لیکن حضرت بیدل نے وہ رقم انار فروش کو عطا کرکے اپنے اہلِ ہمت ہونے کا ثبوت دیا۔

فیملی پلاننگ کیا ہے؟

یہ ایک ذریعہ ہے، جس سے

- آپ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ کے یہاں بچے کب اور کتنے ہونے چاہئیں
- آپ اپنی بیوی کی صحت کو ٹھیک رکھ سکتے ہیں
- آپ اپنے بچوں کی پرورش، اُن کی صحت اور اُن کی تعلیم پر زیادہ دھیان دے سکتے ہیں
- آپ بغیر کسی فکر یا اندیشے کے اپنی ازدواجی زندگی خوشی خوشی بسر کر سکتے ہیں

فیملی پلاننگ کے کئی طریقے ہیں۔ آپ اُن میں سے کوئی ایک طریقہ اپنا سکتے ہیں

مُفت مشورے اور خدمت کے لئے
کسی فیملی پلاننگ سینٹر میں
تشریف لائیے

DA 66/307

ع ہم نہ ہوں گے تو بہت یاد کرے گی دُنیا

◆ یوں تو راجہ بہت نیک دل انسان تھا۔ انتہائی خاموشی سے اپنے غریب دستوں
وائوں اور یتیموں کی مدد کرتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا تھا۔ دستور کے
ات اُس نے آج تک اپنے کسی دوست کی کاٹ نہیں کی۔ غیبت اور تکرّم سے اُسے سخت
رت تھی۔ اپنے اچھے دنوں میں وہ کبھی مغرور نہیں ہوا اور بُرے دنوں میں کبھی تنگ نظر نہ
۔ غرضیکہ اِس طرح کی اور بھی بہت سی بُرائیاں مرحوم میں تھیں جو موجودہ زمانے میں کسی بھی
سان کو کامیاب بننے سے روک سکتی ہیں۔ مرحوم کو اپنی زندگی میں جو کچھ ملا اُس نے اُسے
دونوں ہاتھوں سے اپنی زندگی ہی میں لُٹا دیا اور کبھی کسی سے اُس کا تذکرہ نہ کیا۔ آج کل
کے پبلسٹی زدہ زمانے میں مجھے اُس کا یہ وصف بہت بہت یاد آتا ہے۔ اُنکی اونچی بے باک معصوم
ہنسی یاد آتی ہے۔ اُس کی فنطاسی کی حد تک پہنچی ہوئی ظرافت نگاری اور کھلنڈراپن۔
وہ ایک بچہ تھا ابھی۔ اور جب موت کسی بچے کو ہمارے بیچ میں سے اُٹھا کر لے جاتی ہے تو
اِس کائنات کی معصومیت میں ضرور کہیں پر کوئی کمی ہو جاتی ہے۔

——— کرشن چندر (بمبئی)

◆ اگر ایک زور دار قہقہہ بلند ہو اور آناً فاناً ختم ہو جائے تو کیا اِس سے دل دھک
ہو کر نہیں رہ جائے گا؟
اگر شاخ پر ایک
شگفتہ پھول نظر آ رہا ہو — اور
یک لخت کُمھلا کر، خاک میں گر کر
پامال ہو جائے تو ذہن کو دھکّا
نہیں لگے گا؟
اگر اُفق پر ایک ستارہ طلوع ہو کر اپنی روشنی بکھیرے اور اچانک ہمیں احساس ہو
کہ یہ ستارہ ڈوب گیا ہے تو قلب و نظر میں ایک زلزلہ نہیں آ جائے گا؟
اب میں کیا کہوں کہ قدرت نے راجہ مہدی علی خاں کو ہم سے چھین کر ہم سے کیا
کچھ چھین لیا ہے۔
راجہ مہدی علی خاں، اُردو ادب کا راجہ مہدی علی خاں، ہمارا راجہ مہدی علی خاں
——— سب کا راجہ مہدی علی خاں!

کہاں ہے مہدی علی خاں ——— کہاں ڈھونڈیں مہدی علی خاں؟
کوئی تو اُسے آواز دے۔ کوئی تو اُسے پکارے۔ کوئی تو اُسے بتلائے!
مگر جانے والا کب لوٹا ہے؟؟

پیارے خوشتر بھائی! راجہ کی موت کے صدمے میں میں تمھارا شریک ہوں۔

——— میرزا ادیب (لاہور) مغربی پاکستان

◆ ... کئی دن تو یہی سوچتے گزر گئے کہ راجہ صاحب کی وفات پر آپ کو کیا لکھوں؟
وہ دُکھ جس نے روح تک کو گھائل کر دیا ہے، اُس کا اظہار ——— بعض احساسات ایسے بھی
ہوتے ہیں، جن کا اظہار الفاظ میں مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے۔ میرا یہ حال ہے تو
آپ ——— آپ کا تو مُدّت العُمر کا ساتھ تھا۔ جنم جنم کی دوستی تھی ——— چچا جان! کہہ دیجئے
کہ میں نے جو کچھ سُنا ہے، جھوٹ ہے۔ راجہ صاحب اور موت سے ہار جائیں نہیں نہیں ———
"بیسویں صدی" میں اپنے قہقہوں کے پھول بکھیرنے والا یوں مُرجھا جائے گا، کبھی سوچا بھی
نہ تھا ——— چچا جان! دوسروں کے محبوب مشغلے بتانے والا خود کس مشغلے میں کھو گیا ہے؟
آپ ہی روک لیتے۔ طاہرہ بھابی ہی روک لیتیں ——— آنکھوں میں آنسو ہیں اور قلم میرا ساتھ
نہیں دے رہا ——— اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا کرے۔ ایسے دوست اِن دُنیا میں کہاں ملتے ہیں...
آپ کی بھتیجی ——— اعجاز نسرین (لائلپور) مغربی پاکستان

◆ برادرم راجہ مہدی علی خاں کے اچانک انتقال پُرملال کی خبر سُن کر دل دھک سے
ہو کر رہ گیا! اِس خبر پر یقین کرنے کو جی نہ چاہا لیکن اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی ہوئی یہ منحوس
خبر نظروں کے سامنے سے کسی طرح ہٹتی ہی نہیں تھی۔ جیسے آنکھوں میں گھس گھس کر کہہ رہی
ہو یہ سچ ہے! یہ سچ ہے!! یہ سچ ہے!!!

ابھی ۲۵ جولائی کو
میں نے اُنھیں ایک خط بھیجا تھا
جو شاید اُن تک پہنچ بھی نہ سکا
ہوگا! اُنھوں نے بمبئی سے
میرے بچوں کے لئے اپنی کتابوں
کا ایک سیٹ بھیجا تھا جن پر اُنھوں نے عجیب عجیب سی تحریریں لکھ بھیجی تھیں ——— شیل،
ونود اور پولی، تینوں آپس میں خوب لڑا کرو، سینما دیکھو۔ الماری میں رکھی ہوئی اچھی اچھی
چیزیں چُرا کر کھاؤ ——— پیارے ونود، شیل میری زندگی کی دعا کر رہی ہے، تم میرے
مرنے کی دعا کرو۔ دیکھیں اِس مقابلے میں جیت کس کی ہوتی ہے؟ ——— میں بچوں کی دُنیا کا
بادشاہ ہوں۔ شیل، ونود، پولی میری رعایا ہیں۔ بادشاہ بھی خوش، رعایا بھی خوش ———!
شیل، ونود، پولی! تمھیں خدا کی قسم آج سے جھوٹ بولنا شروع کر دو بہت ترقی کرو گے!
——— شیل بیٹی! اپنے انکل کی صحت کے لئے دعا کرو۔ اگر نہیں کرتیں تو میری کتاب
واپس کر دو۔ (نوٹ) انکل سے مراد راجہ مہدی علی خاں! کسی اور انکل کے لئے دعا نہ کر دینا!
نیلی جادوگرنی، لنگڑی کتاب، پرستان کی شہزادی، شاہی نجومی وغیرہ کتابوں
پر یہ تحریریں بکھری پڑی ہیں۔ میرے بچے مجھ سے یہ اُردو میں لکھی ہوئی تحریریں اور کہانیاں
سُن سُن کر مجھ سے اصرار کیا کرتے تھے کہ میں اُنھیں اُردو پڑھانے کا انتظام کر دوں۔ اِس
سال چھٹیوں میں شیل نے خود ہی مجھ سے پُوچھ پُوچھ کر اُردو سیکھ لی اور راجہ مہدی علی خاں
کی ساری کتابیں پڑھنے کے قابل ہو گئی۔ میں نے مذکورہ بالا خط میں راجہ صاحب کو یہی

اطلاع دی تھی کہ اُن کی ایک بھتیجی اُنہی کی وجہ سے اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ گئی ہے۔ میرا خیال تھا وہ یہ سُن کر بہت خوش ہوں گے اور بچّوں کو ہنسانے کے لئے ایک بھرپور خط لکھیں گے جیسا کہ اکثر وہ لکھا کرتے تھے۔ لیکن افسوس! اب اُن کا خط کبھی نہیں آئے گا۔ کبھی کبھی وہ اپنے خطوں میں اِتنے دلکش چٹکلے لکھا کرتے تھے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بَل پڑ جاتے تھے۔ آج آپ بھی اُن کی یاد میں خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔ وہ آپ کے دل کے بہت قریب تھے۔ آپ کے دُکھ کا مجھے اندازہ ہے۔ مجھے آپ سے اُن کی دلی عقیدت کا علم تھا۔ وہ اپنے خطوط میں اکثر آپ کا ذکر کرتے تھے۔ روتوں کو بے دریغ ہنسانے والا وہ خوش باش، خوش طبع خوش خلق اور خوش خوراک انسان آج زمین کی کتنی تہوں کے نیچے پڑا ہوا بھی ہماری بے بسی پر قہقہے لگا رہا ہوگا اور مصنوعی غصّے سے کہہ رہا ہوگا ——— "جاؤ میں تم میں سے کسی سے نہیں بولتا۔ آج سے ہماری بول چال کا فُل اسٹاپ!!"

——— رام لعل (لکھنؤ)

◆ ہمارا مخلص دوست اور بھائی رُوٹھ کر ہمیں چھوڑ گیا ہے۔ میں اُسی وقت سے صدمے سے نڈھال ہوں۔ دل رویا اور آنکھیں برسی ہیں۔ اِس اچانک رنج بھری اطلاع نے میرے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا ہے۔ راجہ صاحب کی موت کی اطلاع جیسے میرے بھائی کی موت کی خبر ہے اور خود میری حالت مُردہ کی سی ہے۔ اُن کے انتقال سے میری یہ دلی حالت اُس تعلق اور سچائی کا اعتراف ہے جو راجہ صاحب کو مجھ سے تھا اور جس خلوص سے خود میں نے اُنھیں چاہا ہے ——— قسمت نے ہم سب کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کر کے ہمیں آنسوؤں کی سزا دی ہے۔ ہم سے زیادہ قابلِ رحم حالت طاہرہ بھابی کی ہے جن کی مانگ اُجڑ گئی ہے۔ خدا اُنھیں ہمّت اور حوصلہ عطا کرے۔ اِتنا بڑا صدمہ وہ کیسے برداشت کریں گی۔ اِس تصوّر سے ہی روح لرز رہی ہے ——— راجہ صاحب نے مجھ سے بے حد پیار کیا ہے اور مجھے اِس بات کا قلق اور رنج ہے کہ آخری سفر اختیار کرنے پر میں اُن کے جنازہ کو کندھا تک نہ دے سکا۔ ایک پردیسی کی بے بسی کو پھولوں کی شکل میں لپیٹ کر الوداعی نذرانۂ عقیدت و خلوص طاہرہ بھابی کو بھیجا ہے اور لکھ دیا ہے کہ یہ پھول میرے دل کے آنسو ہیں جو راجہ صاحب کی قبر پر بہا دینا۔

خود آپ راجہ صاحب کو کتنا عزیز رکھتے تھے، اِس حقیقت کا مجھے علم ہے۔ آپ نے جو پُر خلوص خطوط راجہ صاحب کو لکھے اُن میں کئی میرے پاس ہیں۔ طاہرہ بھابی کے نام بھی آپ کا ایک خط ہے اور آپ کے صاحبزادے وجے نے جو خط بمبئی سے دِلّی پہنچ کر راجہ صاحب کو لکھا تھا وہ بھی اُن میں شامل ہے ——— اِس وقت راجہ صاحب کی تصویریں حسرت سے دیکھ رہا ہوں۔ آپ کے اُن کے نام خطوط میرے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ اُنھیں پڑھ کر بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ آپ کے یہ خطوط میرے پاس راجہ صاحب کی امانت کے طور پر محفوظ ہیں اور اُنھیں یادگار کے طور پر اُن کی حفاظت کروں گا ———

راجہ صاحب کی موت سے جتنا دُکھ اور رنج مجھے ہوا ہے، بے شک یہ صدمہ آپ کو اس سے بھی سوا ہوا ہوگا۔ آپ سے غم کا اظہار کر کے جہاں میں اپنا درد بانٹ رہا ہوں، وہاں اِس صدمہ میں آپ کا شریکِ درد بھی ہوں ——— آج راجہ صاحب ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کی یاد ہمارے دلوں سے محو نہ ہوگی۔ راجہ صاحب کی تعظیم بھی میرے دل میں بہت تھی اور اُن کے آپ سے تعلق کے احترام کے تقاضے کے مطابق میں راجہ صاحب ہی کی طرح آپ کی عزت و تکریم کا بھی عہد کر رہا ہوں۔ کیونکہ اِسی طرح مرحوم کی روح کو ثواب پہنچایا جا سکتا ہے۔

ہم دو دوست، بھائی کے غم میں ایک دوسرے کے برابر کے شریک ہیں۔ کیونکہ راجہ صاحب سے ہمارے رشتے نے ہمیں ایک ہی دُکھ کی لڑی میں پرو دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اِس صدمہ کے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو راجہ صاحب کی موت سے آپ کو اور مجھے ہوا ہے ——— راجہ صاحب کی موت سے ادبی دُنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ بھی آسانی سے پُر نہیں ہوگا۔ راجہ صاحب کو آپ "بیسویں صدی" میں جو خراجِ عقیدت پیش کریں، مجھے اُس کی کاپی خصوصاً احتیاط سے بھیج دیجیے گا۔

میں راجہ صاحب کے لئے دعائے مغفرت کر رہا ہوں۔ خدا اُنھیں جنّتِ فردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

آپ کا شریکِ غم ——— بشیر ریاض نیوکاسل (یو۔کے)

◆ راجہ مہدی علی خاں کے اچانک انتقال کی خبر سُن کر مجھ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا ہے۔ میں راجہ صاحب کی موت سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی حالت تو واقعی غیر ہوگی۔ آپ کے لئے تو راجہ صاحب کی موت ایک شدید ذاتی صدمہ ہے۔ خدا ہم سب کو صبرِ کامل عطا کرے۔ آمین!

وہ ایک عظیم شاعر، عظیم مزاح نگار اور ایک عظیم انسان تھے۔ اُن کا غم آپ کو اور ہمیں ہمیشہ رُلاتا رہے گا۔ وہ یاد آئیں گے تو آنکھ بھر آئے گی کتنے مخلص دوست تھے۔ کس محبت اور خلوص سے وہ خط لکھتے تھے۔ اُن کے خطوں کا ایک انبار جمع ہو گیا ہے۔ اُن کی موت سے ہم ایک بہت ہی مخلص دوست سے محروم ہو گئے ہیں...

——— حامدی کاشمیری (سری نگر)

◆ ...شدید درد کی ٹیس کم نہیں ہو پاتی۔ محترم راجہ بھائی کی وفات میری زندگی کا سب سے بڑا المناک و پُر درد حادثہ ہے۔ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا ہوں۔ لکھنا پڑھنا تو در کنار ——— اپنے روز[illegible] بھی میرے لئے غیر اہم اور فضول سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ میرے چاروں طر[illegible] اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے میرے اپنے ہی زخمی جذبات منڈلاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ——— ایک آپ ہی دکھائی دیتے ہیں جنھیں میں اپنا غم بیان کر سکتا ہوں۔ میرے لئے اب آپ کا درجہ اور بھی

[illegible] آپ ہی [illegible] خلوص و محبت اور
[illegible] ادیبوں کی تمام تر شفقتوں اور راہبری کی
[illegible] آپ کے بے پناہ غم کا اندازہ مجھے ہے لیکن
آپ تو [illegible] بھی کہوں کہ ایں [illegible] ناممکن ہے! ...

[illegible] ——— (ڈاکٹر) کیول دھیر (فیروز پور)

● راجہ مہدی علی خاں کا انتقال پرملال واقعی ایک شدید حادثہ ہے جسے
آپ کی طرح ہر شاعر، ہر ادیب اور ہر فرد و دوست نے محسوس کیا ہے۔ "بیسویں صدی" ایک
بہت بڑے طنز و مزاح نگار کے قلمی تعاون سے محروم ہو گیا اور خوشتر گرامی ایک
مخلص اور عزیز دوست سے۔ آپ نے "بیسویں صدی" میں فوری اپنے رنج و غم کا اظہار
فرما کر دوستی کا حق ادا اس صورت میں کیا ہے کہ ہر شاعر، ہر ادیب اور ہر فرد و دوست
کو اپنے رنج و ملال میں شریک کر لیا ہے۔ خدا "راجہ" کو آغوشِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے
اور آپ کو راجہ کے نام لیواؤں کی صورت میں (کئی) بہت سال تک سلامت رکھے۔ آمین!

——— رشی پٹیالوی (چنڈی گڑھ)

● ... ریڈیو سے ایک روح فرسا اور منحوس خبر سنی۔ کہا گیا کہ ہمارے دلوں کے راجہ،
ہمارے [illegible] شاعر اور ہمارے صاحب طرز ادیب راجہ مہدی علی خاں ہم سے رُوٹھ کے
چلے گئے ہیں۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ کیوں ہو گیا؟ یہ منحوس خبر سن کر دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔
کچھ بھی نہیں آتا کیا کروں؟ کیسے یقین کروں؟ اس منحوس خبر نے تو جیسے گلا [illegible]
دیا ہے ——— یہ خبر سن کر جو آپ پر بیتی ہوگی، وہ میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔ آپ کی سال
زندگی کے [illegible] میں گزار چکے ہوں گے۔ ہم سب آپ کے اس بے پناہ غم میں برابر کے
شریک ہیں ——— خدا مرحوم (راجہ) کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

آپ کے غم میں برابر کا شریک ——— [illegible] (جموں)

● راجہ صاحب سے متعلق [illegible] خبر معلوم ہو کر دل کو بے حد صدمہ پہنچا۔ وہ
آپ کے عزیز دوستوں میں تھے، اس لئے ان کے سانحۂ ارتحال پر آپ کا دل جس قدر مغموم ہوگا اس کا
مجھے اندازہ [illegible] آپ کے غم میں شریک ہوں اور خدا سے دست بدعا
ہوں کہ آپ کو اس [illegible] برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

[illegible] ——— [illegible] رضوی (امروہہ)

● راجہ صاحب کی [illegible] سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ آپ کی اعلیٰ
[illegible] کہ دنیا سے کوئی دوسرا ہوتا تو چھپ کر باہر آ جاتا۔
آپ [illegible] کو ان کی [illegible] اس غم کو [illegible]
[illegible] الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

[illegible] ——— [illegible] (لگاسگ، پونچھ)

● ... راجہ مہدی علی خاں ابدی نیند سو گئے [illegible]
[illegible] ہیں۔ [illegible] سب کو [illegible]
[illegible] تماشا [illegible] ——— بیسویں صدی کے [illegible]
گے خوشتر صاحب! ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible] (بھیونڈی)

● ... راجہ مہدی علی خاں کے انتقال پرملال کی جگر سوز خبر نے اُردو شعر و
ادب کی محفل کو محفلِ ماتم بنا دیا ——— "بیسویں صدی" میں "تیر و نشتر" سے لطف اندوز
ہونے کے بعد راجہ صاحب کی مزاح نگاری کے رنگ لینے والے اب "بیسویں صدی" کی
ورق گردانی کرتے رہ جائیں گے لیکن ان کی مزاح نگاری کے شاہکاروں کو نہ پا کر انہیں کو
بے حد مایوسی ہوگی۔ راجہ صاحب اگرچہ لاہور کے رہنے والے تھے لیکن مرحوم اللہ آباد بھی
کو انھوں نے اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا اور اس لحاظ سے اہلِ بہار خصوصاً ان کی رحلت سے
صدمۂ عظیم ہوا ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آپ کو رنج ہے اور ہوگا کہ آپ سے جو بے پناہ محبت تھی اور بے لوث دوستی تھی
اس کو قارئین "بیسویں صدی" اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ نے "بیسویں صدی" کی محفل کو آراستہ
کرنے کے لئے [illegible] کو اپنایا ہے وہ گویا ایک ہی ادبی خاندان کے افراد ہیں اور اس
لحاظ سے آپ کو جو روحانی صدمہ پہنچا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ اس کا صحیح ترجمانی کسی اور شخص کا قلم
کبھی اور شخص کی زبان نہیں کر سکتی۔ راجہ صاحب کے انتقال سے آپ کو اپنے عزیز ترین دوست
اور "بیسویں صدی" کو بہترین مزاح نگار سے محروم کر دیا۔

——— بشیر احمد [illegible] (ہیڈ ماسٹر عثمان آباد ہائی اسکول، اکولہ، مہاراشٹر)

● ... راجہ صاحب کی بے وقت موت سے بے حد صدمہ ہوا [illegible]
[illegible] پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ہندوستان میں [illegible]
[illegible] ادبی و [illegible] شخصیت کے [illegible]
اور [illegible] اب یہی اُن [illegible]
ایک مرتبہ [illegible] اس ملاقات کے نقوش آج بھی ذہن میں تازہ ہیں۔ آپ ہم
انھیں ایک جان سے قریب محسوس کرتے تھے۔ آپ پر کیا گزری ہوگی، میں اس غم اور
آپ کے دُکھ میں برابر کے شریک ہیں ...

——— کرشن ادیب (لدھیانہ)

● ... خوشتر صاحب! آپ راجہ صاحب کے انتہائی پیارے دوستوں میں تھے
آپ سے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے ——— واللہ راجہ جیسا دوست نواز دوست بھی
آپ کو میسر نہیں آئے گا۔ خوشتر بھائی! آپ ان کے خاص دوستوں میں [illegible]

ناردرن ریلوے

مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے ناردرن ریلوے ٹائم ٹیبل میں عام ترمیم ہوگی۔ اہم تبدیلیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ عام تبدیلیاں

(i) سنٹرل ریلوے کی ٹرینیں نمبر ۱۱۱ اَپ/۱۰۹ ڈاؤن جو اِس وقت ۱۱۲ اَپ/۱۱۱ ڈاؤن باندہ اور کانپور سنٹرل کے مابین بطور لکھنؤ ٹرینوں کی بجائے لکھنؤ تک سیدھی چلیں گی اور ۱۱۲ اَپ/۱۱۱ ڈاؤن کانپور سنٹرل پر ختم کر دی جائیں گی۔

(ii) نمبر ۲۔ ایس ٹی ڈی/۱۔ ایس ٹی ڈی جو شکوہ آباد اور دہلی کے درمیان چلتی ہیں ان کا الحاق ۲۔ ایس ایف/۳۔ ایس ایف کے ساتھ کر دیا جائے گا اور بطور بطور ٹرین نمبر ۲۔ ایف ٹی ڈی/۱۔ ایف ٹی ڈی دہلی اور فرخ آباد کے درمیان چلیں گی۔

۲۔ جن ٹرینوں میں توسیع کی گئی

(i) ۲۔ ڈی کے ایس جو دہلی صفدر جنگ اور شکور بستی کے درمیان چلتی ہے اس میں بہادر گڑھ تک توسیع کر دی جائے گی۔

۳۔ جن ٹرینوں کی رفتار تیز کی گئی

ٹرین نمبر	مابین	ٹائم
(ا) ۱۔ اَپ	دہلی۔ کالکا	۲۰ منٹ
(ب) ۵۔ اَپ	مغلسرائے۔ امرتسر	۱۴ منٹ
(ج) ۶۔ ڈاؤن	امرتسر۔ مغلسرائے	۱۵ منٹ
(د) ۲۰۔ ڈاؤن	دہرہ دون۔ دہلی	۱۰ منٹ
(ہ) ۳۱۔ اَپ	دہلی۔ امرتسر	۲۵ منٹ

ٹرین نمبر	مابین	ٹائم
(f) ۳۲-ڈاؤن	امرتسر-دہلی	۲۰ منٹ
(g) ۳۷-اَپ	دہلی-فیروزپور	۱۵ منٹ
(h) ۳۸-ڈاؤن	فیروزپور-دہلی	۲۰ منٹ
(i) ۴۲-ڈاؤن	دہرہ دون-دہلی	۲۰ منٹ
(j) ۴۵-اَپ	دہلی-امرتسر	۲۵ منٹ
(k) ۵۶-ڈاؤن	امرتسر-دہلی	۲۰ منٹ
(l) ۵۳-اَپ	انبالہ-ننگل ڈیم	۱۰ منٹ
(m) ۵۵-اَپ	مرادآباد-دہلی	۱۰ منٹ
(n) ۵۸-ڈاؤن	پٹھانکوٹ-نیو دہلی	۱۵ منٹ

۴۔ نئے اسٹیشن کھولے گئے

اسٹیشن	سیکشن
(i) رام گنج	فیض آباد - الہ آباد
(ii) ننگل پٹھانی ہالٹ	ریواڑی - بھٹنڈہ
(iii) بدھائی بالم گڑھ ہالٹ	کوٹ کپورہ - فاضلکا
(iv) کالے مجرا ہالٹ	راجپورہ - دھوری

۵۔ نئے اسٹاپ مہیا کئے گئے

ٹرین نمبر	اسٹیشن
(i) ۳-بی ایس آر	نوسریا
(ii) ۴-جے ایل کے	ڈوڈونڈی
(iii) ۱-یو-آر-این	کیرت پور صاحب
(iv) ۲۵۱-اَپ/۲۵۲ ڈاؤن	گڑھی مانک پور اور پیاوان

۶۔ نئے کنکشن مہیا کیے گئے

(i) ۱۔ ڈی یو کے کا ۸۔ اَپ کے ساتھ انبالہ چھاؤنی پر

(ii) ۲۷۔ اَپ کا ۶ بے آر جے کے ساتھ سپگواڑہ پر

(iii) ۱۔ جے ایم ایم کا ۴ جے ایم بی کے ساتھ میرٹا روڈ پر

(iv) ۹۶۔ ڈاؤن کا ۲ جے بی جے کے ساتھ جودھپور پر

(v) ۱۔ بی آر ایس کا ۹۲۔ اَپ، ۳۰۷ اَپ، ۲۰۹۔ اَپ، ۹۱۔ اَپ اور ۲۰۱ اَپ کے ساتھ ریواڑی پر

(vi) ۲۔ بی آر بی کا ۲۔ بی آر ایس اور ۳ بی بی کے ساتھ بھٹنڈہ پر

۷۔ جو اسٹاپ منسوخ کیے گئے

(i) ۳۔ ایل سی کانپور برج اور گنگی

(ii) ۱۰۸۔ اَپ کانپور برج

(iii) ۴۔ پی بی جے جگت پور

۸۔ ٹرینوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں

(ا) ۱۔ اَپ ہوڑہ۔ کالکا میل اب کالکا ۵۰۔۶ بجے کی بجائے ۲۵۔۶ بجے پہنچے گی۔

(ب) ۵۔ اَپ ہوڑہ۔ امرتسر میل مغلسرائے کو ۱۰۔۹ بجے کی بجائے ۲۲۔۹ بجے چھوڑے گی اور امرتسر ۲۵۔۹ بجے کی بجائے ۱۵۔۸ بجے پہنچے گی۔

(ج) ۶۔ ڈاؤن امرتسر۔ ہوڑہ میل امرتسر سے ۴۰۔۱۹ بجے کی بجائے ۲۰۔۲۱ بجے چھوڑے گی اور مغلسرائے ۵۵۔۱۹ بجے کی بجائے ۳۰۔۲۰ بجے پہنچے گی۔

(د) ۲۔ ڈاؤن/۲۱۔ اَپ فرنٹیئر میل امرتسر ۱۰۔۸ بجے کی بجائے ۴۵۔۷ بجے پہنچے گی۔

(ه) ۲۳۔ ڈاؤن/۲۴۔ اَپ [illegible] ۰۰۔۷ بجے کی بجائے ۴۰۔[illegible] بجے پہنچے گی اور [illegible] کی بجائے ۲۰۔۸ بجے چھوڑے گی۔

(و) [illegible] ۵ بجے پہنچے گی۔

(ز) [illegible] کی بجائے ۴۵۔۵ بجے پہنچے گی۔

(ح) [illegible] ۵۔۱۲ بجے کی بجائے [illegible]

اور دہلی ۲۰-۶ بجے کی بجائے ۴۰-۵ بجے پہنچے گی۔

(و) ۴۵-اپ جنتا ایکسپریس امرتسر ۰۵-۱۲ بجے کی بجائے ۳۰-۱۱ بجے پہنچے گی۔

(ز) ۴۶-ڈاؤن جنتا ایکسپریس دہلی ۴۰-۶ بجے کی بجائے ۲۰-۶ بجے پہنچے گی۔

(ح) ۶۰-ڈاؤن سرینگر ایکسپریس پٹھانکوٹ سے ۴۵-۱۱ بجے کی بجائے ۰۰-۲۲ بجے چھوٹے گی اور نیو دہلی ۵۵-۷ بجے کی بجائے ۰۰-۱ بجے پہنچے گی

(ط) ۳۴۲-اپ امرتسر ۲۵-۷ بجے کی بجائے ۱۰-۷ بجے پہنچے گی۔

(ی) ۱-پی، ایل پانی پت سے ۱۰-۶ بجے کی بجائے ۲۰-۵ بجے چھوٹے گی۔

(ک) ۲-ڈی پی پانی پت سے ۴۵-۶ بجے کی بجائے ۴۵-۵ بجے چھوٹے گی اور دہلی ۲۵-۹ بجے کی بجائے ۲۵-۸ بجے پہنچے گی۔

(ل) ۴-ڈی پی پانی پت سے ۱۵-۷ بجے کی بجائے ۴۵-۶ بجے چھوٹے گی اور دہلی ۱۵-۱۶ بجے کی بجائے ۲۵-۹ بجے پہنچے گی۔

(م) ۲-ڈی ڈی دنکور ۴۰-۱۳ بجے کی بجائے ۵۵-۱۲ بجے پہنچے گی۔

(ن) ۱-ڈی ڈی دنکور سے ۰۵-۱۴ بجے کی بجائے ۲۰-۱۳ بجے چھوٹے گی اور دہلی ۱۰-۱۶ بجے کی بجائے ۲۰-۱۵ بجے پہنچے گی۔

(س) ۱-ایس این دہلی ۴۰-۲ بجے کی بجائے ۳۵-۲ بجے چھوٹے گی اور سونی پت ۵۵-۴ بجے کی بجائے ۰۵-۵ بجے پہنچے گی۔

(ع) ۲-ایس ڈی شکور بستی سے ۵۵-۹ بجے کی بجائے ۲۵-۹ بجے چھوٹے گی اور دہلی ۲۰-۱۰ بجے کی بجائے ۱۵-۱۰ بجے پہنچے گی۔

(ف) ۱-بی آر ایف بھٹنڈہ سے ۱۵-۱۴ بجے کی بجائے ۰۰-۱۳ بجے چھوٹے گی اور ریواڑی ۲۰-۱ بجے کی بجائے ۳۰-۲۱ بجے پہنچے گی۔

(ص) ۳-بی آر بھٹنڈہ سے ۳۵-۲۲ بجے کی بجائے ۰۰-۱۶ بجے چھوٹے گی اور ریواڑی ۲۰-۲۱ بجے کی بجائے ۲۰-۱ بجے پہنچے گی۔

(ق) ۲-بی آر آر ریواڑی سے ۴۵-۱۸ بجے کی بجائے ۴۵-۱۷ بجے چھوٹے گی اور رتن گڑھ ۴۰-۴ بجے کی بجائے ۱۵-۲ بجے پہنچے گی۔

(ر) ۱-بی کے آر ریواڑی سے ۵۵-۱۱ بجے کی بجائے ۴۰-۱۲ بجے چھوٹے گی۔

(ش) ۲-[illegible] سے ۳۰-۱۹ بجے کی بجائے ۳۰-۲۰ بجے چھوٹے گی اور لوہارا ۵-۲۳

بجے کی بجائے ۵۵ .. بجے پہنچے گی۔

۹۔ جن ٹرینوں سے ایرکنڈیشنڈ ہٹالی گئی

(i) ایرکنڈیشنڈ نشستیں ۴۱۔ اَپ اور ۴۲۔ ڈاؤن مسوری ایکسپریس گاڑیوں سے دہلی اور دہرہ دون کے درمیان مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے ہٹالی جائیں گی۔

(ii) ایرکنڈیشنڈ نشستیں ۹۲۔ اَپ اور ۹۳۔ ڈاؤن جودھپور میل گاڑیوں میں ہفتہ میں تین بار کی بجائے ہفتہ میں دو بار حسب ذیل طریق پر مہیا کی جائیں گی۔

از دہلی	بروز	پیر	اور	جمعہ
از جودھپور	بروز	اتوار	اور	جمعرات

۱۰۔ تھرو سیکشنل ڈبوں میں تبدیلیاں

(i) ۱۔ اَپ/۲۔ ڈاؤن میل گاڑیوں میں ایک فسٹ کلاس بوگی دہلی اور کالکا کے درمیان تھرڈ کلاس کوچ میں تبدیل کی جائے گی۔

(ii) لکھنؤ کانپور سیکشن پر ۱۱۱۔ اَپ اور ۱۱۲۔ ڈاؤن ٹرینیں منسوخ کرنے کی وجہ سے ایک تھرڈ کلاس کوچ جو لکھنؤ اور مانک پور کے درمیان ۵۲۳/۱۱۲ اور ۱۱۱/۵۲۲ ڈاؤن ٹرینوں کے درمیان چلتی تھی کانپور سنٹرل اور مانک پور کے درمیان چلے گی۔

(iii) دو فسٹ کلاس اور ایک تھرڈ کلاس ایڈیشنل کوچیں دہلی اور بمبئی سنٹرل کے درمیان ۴۔ اَپ/۳۔ ڈاؤن فرنٹیر میل گاڑیوں کے ساتھ لگائی جائیں گی۔

(iv) ایک تھرڈ کلاس کوچ جو سمدری اور پالن پور کے درمیان (M.G.) ۲۔ جے ایس بی/۶۶ اور ۶۵/۲۔ جے ایس بی گاڑیوں کے ہمراہ چلتی ہے احمد آباد سے اور احمد آباد تک انہی گاڑیوں کے ہمراہ چلے گی۔

مفصل تفصیلات متعلقہ ٹرینوں کے اوقات انٹروڈکشن تھرو/سیکشنل ڈبوں کا اجراء یا منسوخی، گاڑیوں میں نشستوں وغیرہ کے درجوں کی ترتیب وغیرہ کے لئے ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے جاری ہونے والا ٹائم ٹیبل ملاحظہ فرمائیں جو ریلوے بکنگ، ریزرویشن، انکوائری دفاتر اور اہم ریلوے اسٹیشنوں کے بک اسٹالوں سے خریدا جاسکتا ہے۔

چیف اوپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ

ناردرن ریلوے۔ نیو دہلی



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

● کھیرا ——— وٹامنز کا خزانہ

کھیرے کا مزاج سرد تر ہے۔ جتنا کچا ہوتا ہے اُتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ کھیرا بہت سی خوبیوں اور خواص کا حامل ہے۔ قبض کو دُور کرتا ہے۔ رُک رُک کر پیشاب آنے کی شکایت رفع کرتا ہے، صفرا کی خرابی کو دُور کرتا ہے، گرمی کے جملہ امراض و عوارض میں مفید ہے، پیاس کو بجھاتا ہے، حرارت کو رفع کرتا ہے، معدہ اور جگر کی حرارت اور جلن کو رفع کرتا ہے۔ یرقان، پیشاب کی جلن کی شکایت کو دُور کرتا ہے۔ موسم گرما میں گرم مزاج والوں کے لئے مفید ہے۔ پیاس بجھاتا ہے، پیشاب کھول کر لاتا ہے۔ پیشاب کی جلن، پیشاب کا رُک رُک کر آنا وغیرہ شکایات میں مفید ہے۔ دل و جگر کی گرمی دُور کرتا ہے۔ صفرا اور خون کی گرمی اور تیزی کو دُور کرتا ہے۔ کھیرا دیر ہضم ہے۔ ریاح پیدا کرتا ہے۔ سیاہ مرچ اور نمک اس کا مصلح ہے۔

جدید تحقیق کی روشنی میں کھیرا گوناگوں خواص کا حامل ہے۔ اس میں وٹامن بی اور سی پائے جاتے ہیں۔ کیمیاوی تجزیہ کرنے پر اس میں کیلشیم، پوٹاشیم، فولاد اور دوسرے مفید نمکیات پائے گئے۔

کھیرا کھانے اور اس کی قاشیں یا اس کے کٹ کو پیشانی پر ملنا دردِ سر کے لئے نافع ہے۔

کھیرے کے تازہ چھلکے کو ۴ تولہ کی مقدار میں لے کر تھوڑے پانی میں جوش دیں۔ اسے چار دن متواتر پینے سے یرقان رفع ہوجاتا ہے۔

کھیرے کے پتوں کو کچل کر پانی نچوڑ لیں۔ ایک تولہ کی مقدار میں یہ پانی لے کر اس میں چھ ماشہ آب ادرک ملاکر پینے سے ورم طحال رفع ہوتا ہے۔

خام یا پختہ کھیرے کے مغز کو کھانا، صفرا کی حرارت اور تیزی کو رفع کرتا ہے۔

اس سے پیاس بجھتی ہے۔ پیشاب کھل کر آتا ہے۔

سرد مزاج والوں کے لئے کھیرا مضر ہے۔ اس کا زیادہ استعمال، معدہ میں گاڑھے بلغمی مواد پیدا کرتا ہے۔ معدے میں نفخ و ریاح پیدا کرتا ہے۔ پیڑو میں درد پیدا کرتا ہے۔ کھیرا ایک سے زیادہ نہیں کھانا چاہئے۔

گرم مزاج والوں کے لئے اس کا مصلح سکنجبین ہے اور سرد مزاجوں کے لئے مویز منقیٰ، اجوائن، شہد۔

کھیرا چھیل کر، نمک اور مرچ سیاہ لگاکر کھانا چاہئے۔ کھیرا کھاکر پانی نہ پینا چاہئے ورنہ ہیضہ ہوجانے کا خطرہ ہے۔

۲ ● مسرت کی محبوبہ!

غریب ہو یا امیر ہر انسان مسرت پانے کے لئے اپنے دل میں محرومی کا احساس لئے سرگرداں ہے۔ آپ کے دل میں بھی مسرت کی چاہ یقیناً ہوگی ——— مسرت کی محبوبہ آپ سے بھی آنکھیں ملاکر مسکرا سکتی ہے۔ چاہے آپ امیر ہوں یا غریب!

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ——— "میں نے اپنی پچاس سالہ زندگی کے دَوران میں صرف ایک سبق سیکھا ہے ——— تمہارے اپنے سوا تمہیں کوئی بھی خوشی نہیں دے سکتا۔"

دوسرے عظیم مفکر ایمرسن نے لکھا ہے ——— "کوئی بڑی سیاسی کامیابی، ملازمت کے مشاہرہ میں اضافہ، علالت سے صحت یابی، تمہارے کسی عزیز کی دُور دیس سے واپسی یا کوئی ایسا ہی دوسرا خارجی واقعہ تمہارے عزائم بلند کردیتا ہے اور تم سمجھتے ہو تمہارے اچھے دن آرہے ہیں۔ ایسا مت خیال کرو۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ تمہارے سوا کوئی بھی تمہیں خوشی نہیں دے سکتا۔"

بجے کی بجائے ۵۵ ۔۔ بجے پہنچے گی۔

۹۔ جن ٹرینوں سے ایرکنڈیشنڈ ہٹائی گئی

(i) ایرکنڈیشنڈ نشستیں ۴۱۔ اَپ اور ۴۲۔ ڈاؤن مسوری ایکسپریس گاڑیوں سے دہلی اور دہرہ دون کے درمیان مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۶ء سے ہٹالی جائیں گی۔

(ii) ایرکنڈیشنڈ نشستیں ۹۳۔ اَپ اور ۹۴۔ ڈاؤن جودھپور میل گاڑیوں میں ہفتہ میں تین بار کی بجائے ہفتہ میں دو بار حسب ذیل طریق پر مہیا کی جائیں گی۔

از دہلی بروز پیر اور جمعہ

از جودھپور بروز اتوار اور جمعرات

۱۰۔ تھرو سیکشنل ڈبوں میں تبدیلیاں

(i) ۱۔ اَپ/۲۔ ڈاؤن میل گاڑیوں میں ایک فسٹ کلاس بوگی دہلی اور کالکا کے درمیان تھرڈ کلاس کوچ میں تبدیل کی جائے گی۔

(ii) لکھنؤ۔کانپور سیکشن پر ۱۱۱۔ اَپ اور ۱۱۲۔ ڈاؤن ٹرینیں منسوخ کرنے کی وجہ سے ایک تھرڈ کلاس کوچ جو لکھنؤ اور مانک پور کے درمیان ۵۲۳/۱۱۲ اور ۱۱۱/۵۲۲ ڈاؤن ٹرینوں کے درمیان چلتی تھی کانپور سنٹرل اور مانک پور کے درمیان چلے گی۔

(iii) دو فسٹ کلاس اور ایک تھرڈ کلاس ایڈیشنل کوچیں دہلی اور بمبئی سنٹرل کے درمیان ۴۔ اَپ/۳۔ ڈاؤن فرنٹیر میل گاڑیوں کے ساتھ لگائی جائیں گی۔

(iv) ایک تھرڈ کلاس کوچ جو سمدری اور پالن پور کے درمیان (M. G.) ۲۔ جے ایس بی/۹۶ اور ۹۵/۲ جے ایس بی گاڑیوں کے ہمراہ چلتی ہے احمد آباد سے اور احمد آباد تک اپنی گاڑیوں کے ہمراہ چلے گی۔

مفصل تفصیلات متعلقہ ٹرینوں کے اوقات انٹروڈکشن تھرو/سیکشنل ڈبوں کا اجراء یا منسوخی، گاڑیوں میں نشستوں وغیرہ کے درجوں کی ترتیب وغیرہ کے لئے ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے جاری ہونے والا ٹائم ٹیبل ملاحظہ فرمائیں جو ریلوے بکنگ، ریزرویشن، انکوائری دفاتر اور اہم ریلوے اسٹیشنوں کے بک اسٹالوں سے خریدا جاسکتا ہے۔

چیف اوپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ

ناردرن ریلوے۔ نیو دہلی



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

کھیرا ـــــ وٹامنز کا خزانہ

کھیرے کا مزاج سرد تر ہے۔ جتنا کچا ہوتا ہے اُتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ کھیرا بہت سی
یوں اور خواص کا حامل ہے۔ قبض کو دُور کرتا ہے۔ رُک رُک کر پیشاب آنے کی شکایت
رفع کرتا ہے، صفرا کی خرابی کو دُور کرتا ہے، گرمی کے جملہ امراض و عوارض میں مفید
، پیاس کو بجھاتا ہے، حرارت کو رفع کرتا ہے، معدہ اور جگر کی حرارت اور جلن کو
ع کرتا ہے۔ یرقان، پیشاب کی جلن کی شکایت کو دُور کرتا ہے۔ موسمِ گرما میں گرم
ج والوں کے لئے مفید ہے۔ پیاس بجھاتا ہے، پیشاب کھول کر لاتا ہے۔ پیشاب کی
ن، پیشاب کا رُک رُک کر آنا وغیرہ شکایات میں مفید ہے۔ دل و جگر کی گرمی دُور
ا ہے۔ صفرا اور خون کی گرمی اور تیزی کو دُور کرتا ہے۔ کھیرا دیر ہضم ہے۔ ریاح
ا کرتا ہے۔ سیاہ مرچ اور نمک اِس کا مصلح ہے۔

جدید تحقیق کی روشنی میں کھیرا گوناگوں خواص کا حامل ہے۔ اِس میں
امن بی اور سی پائے جاتے ہیں۔ کیمیاوی تجزیہ کرنے پر اِس میں کیلشیم، پوٹاشیم، فولاد
ر دوسرے مفید نمکیات پائے گئے۔

کھیرا کھانے اور اُس کی قاشیں یا اُس کے کٹ کو پیشانی پر ملنا دردِ سر
لئے نافع ہے۔

کھیرے کے تازہ چھلکے کو ۲ تولہ کی مقدار میں لے کر تھوڑے پانی میں جوش
ں۔ اِسے چار دن متواتر پینے سے یرقان رفع ہو جاتا ہے۔

کھیرے کے پتوں کو کچل کر پانی نچوڑ لیں۔ ایک تولہ کی مقدار میں یہ پانی
کر اُس میں چھ ماشہ آبِ ادرک مِلا کر پینے سے ورمِ طحال رفع ہوتا ہے۔

خام یا پختہ کھیرے کے مغز کو کھانا، صفرا کی حرارت اور تیزی کو رفع کرتا ہے۔
اُس سے پیاس بجھتی ہے۔ پیشاب کھُل کر آتا ہے۔

سرد مزاج والوں کے لئے کھیرا مضر ہے۔ اِس کا زیادہ استعمال، معدہ میں گاڑھے بلغمی مواد پیدا کرتا ہے۔ معدے میں نفخ و ریاح پیدا کرتا ہے۔ پیڑو میں درد پیدا کرتا ہے۔ کھیرا ایک سے زیادہ نہیں کھانا چاہئے۔

گرم مزاج والوں کے لئے اِس کا مصلح سکنجبین ہے اور سرد مزاجوں کے لئے مویز منقیٰ، اجوائن، شہد۔

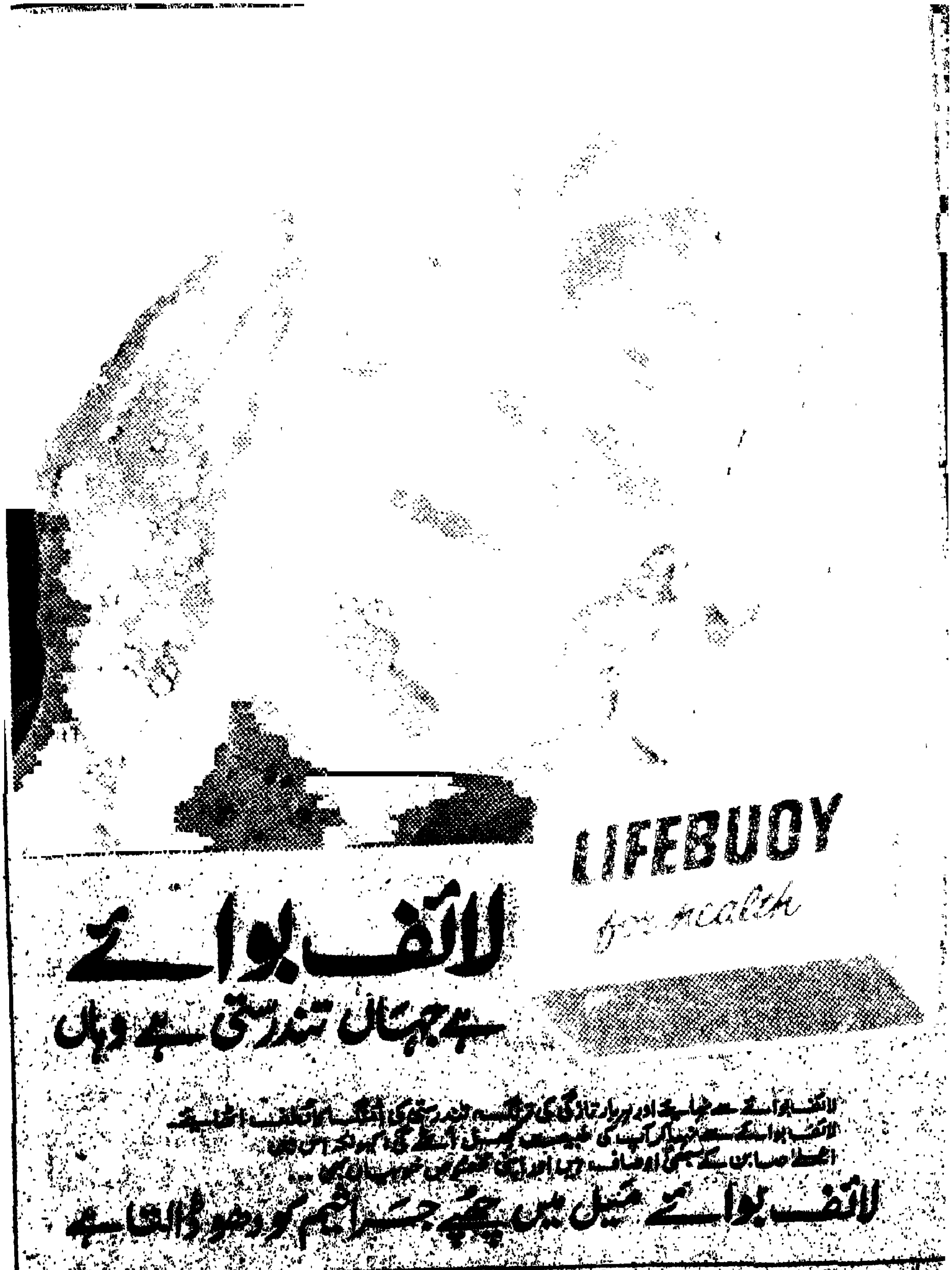
کھیرا چھیل کر، نمک اور مرچ سیاہ لگا کر کھانا چاہئے۔ کھیرا کھا کر پانی نہ پینا چاہئے ورنہ ہیضہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔

۲ ● مسرت کی محبوبہ!

غریب ہو یا امیر ہر انسان مسرت پانے کے لئے اپنے دل میں محرومی کا احساس لئے سرگرداں ہے۔ آپ کے دل میں بھی مسرت کی چاہ یقیناً ہوگی ـــ مسرت کی محبوبہ آپ سے بھی آنکھیں ملا کر مُسکرا سکتی ہے۔ چاہے آپ امیر ہوں یا غریب!

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــــ "میں نے اپنی پچاس سالہ زندگی کے دَوران میں صرف ایک سبق سیکھا ہے ـــــ تمہارے اپنے سوا تمہیں کوئی بھی خوشی نہیں دے سکتا۔"

دوسرے عظیم مفکر ایمرسن نے لکھا ہے ـــــ "کوئی بڑی سیاسی کامیابی ملازمت کے مشاہرہ میں اضافہ، علالت سے صحت یابی، تمہارے کسی عزیز کی دُور دیس سے واپسی یا کوئی ایسا ہی دوسرا خارجی واقعہ تمہارے عزائم بلند کر دیتا ہے اور تم سمجھتے ہو تمہارے اچھے دن آ رہے ہیں۔ ایسا مت خیال کرو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہارے سوا کوئی بھی تمہیں خوشی نہیں دے سکتا۔"


LIFEBUOY
for health
لائف بوائے
ہے جہاں تندرستی ہے وہاں
لائف بوائے میل میں چھپے جراثیم کو دھو ڈالتا ہے

ایک دوسرے دانشور نے لکھا ہے ـــــ "یہ حقیقت ہے اِس زندگی میں مسرتوں کی ارزانی ہے اور اُس میں آپ کا بھی حصہ ہے۔ بات صرف اِتنی ہے کہ آپ اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کریں"

ایک یونانی فلسفی نے لکھا ہے ـــــ "اگر کوئی انسان مسرت سے محروم ہے تو اُسے جاننا چاہیئے اپنی ناخوشی، اپنی محرومی کا سبب وہ خود ہے"

سرولیم اوسلر کہتا ہے ـــــ "یہ زندگی محدود ہے لیکن اِس میں قدرت کی فیاضیاں لامحدود ہیں۔ اُن سے آپ خوشی کے خزانے سمیٹ سکتے ہیں۔ مسرت کے پھولوں سے اپنا دامن بھر سکتے ہیں۔ سورج کی روشنی کائنات کی ہر شے کو منور کرکے یہ بتاتی ہے کہ آپ کے اِرد گرد کتنا حُسن بکھرا پڑا ہے۔ اُس سے لطف اندوز ہونا، مسرت حاصل کرنا، مسرت کے پھولوں سے اپنا دامن بھر لینا آپ کا کام ہے۔ مسرت کی محبوبہ آپ سے بھی آنکھیں ملاکر مُسکرا سکتی ہے۔ چاہے آپ امیر ہوں یا غریب!

۳ • خوف سے خوف نہ کھایئے

ایسا کون ہوگا جس کے دل میں خوف اور دہشت جیسے الفاظ سُنتے ہی خوف کی لہر نہ دَوڑ جاتی ہو لیکن ماہرینِ سائنس کے سینکڑوں تجربات نے یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ خوفناک چیزوں اور باتوں سے خوفزدہ ہوجانے والوں کی تعداد دُنیا میں جتنی زیادہ ہے، اُتنا ہی آسان اِس کا علاج ہے۔

حال ہی میں نیویارک اکاڈمی آف میڈیسن کے سائنسدانوں نے دریافت کیا ہے کہ خوف انسان کے جسم میں ایک کیمیائی زہر پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے جو خون میں شامل ہوکر فوری طور سے اعضائے رئیسہ پر نہایت ہی ناخوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ تجربات سے ظاہر ہوتا ہے خوف سے پیدا شدہ امراض کی سو فیصدی ذمہ داری اُس عجیب اور انوکھے "کیمیائی زہر" پر عائد ہوتی ہے جو خالص خوف کی پیداوار ہے اور جو اُس کیفیت کے ختم ہونے کے بعد فوراً غائب بھی ہوجاتا ہے۔ موجودہ طبی تحقیقات کی رُو سے انسان کے امراض کی طویل فہرست اختلاجِ قلب، ذیابیطس، بلڈ پریشر اور دمہ وغیرہ میں "خوف" کا اہم حصہ ہوتا ہے۔

آنکھ کے امریکی معالج کہتے ہیں، آنکھ کے ناکام آپریشنوں کی نوّے فیصدی ذمہ داری مریض کے خوف پر عائد ہوتی ہے۔ نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں امتحانِ چشم کے ایک تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ خوف سے بینائی بھی متاثر ہوتی ہے۔

معمولی ذہانت کے لوگ بہت آسانی سے خوف کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اُن کے اندر خوف کا تانا بانا الگ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اِس لئے وہ اُس کے مضر اثرات سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔ ذہین آدمی خوف کا تانا بانا الگ کرکے اُس کی بے بُنیادی حقیقت سے واقف ہوجاتا ہے۔

ماہرین نے لکھا ہے ـــــ خوف کو کبھی راز دار نہ بننے دیں کیونکہ یہی پوشیدہ خوف مستقبل میں فکر کا رُوپ دھار لیتا ہے جو خوف سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

بہت سے واقعات اُس وقت تک خوفناک ہوتے ہیں جب تک وہ آپ کے ذہن کی تاریک کوٹھری میں ہیں۔ روشنی میں آنے پر وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں اور اس طرح آپ کی کوفت دُور ہوجاتی ہے۔

خوف کے عظیم مفکر پروفیسر ڈولارڈ نے لکھا ہے ـــــ ہر اُس کام کو بے تامل کیجئے جس سے ڈر لگتا ہو۔ کوئی خوفناک حادثہ ہوتے ہی وہاں سے بھاگنے کی عادت ترک کردیجئے۔ بھاگنے کے بجائے اُس کا تجزیہ کیجئے اور تجزیہ کے نتیجے میں اگر آپ خوف کی کوئی معقول وجہ نہ پاتے ہوئے بھی خوفزدہ ہیں تو خود کو کسی کام میں لگا دیجئے۔

مفکّرین و ماہرین کے اِن مشوروں پر عمل کرکے آپ خوف سے یقیناً چھٹکارا پاسکتے ہیں۔

۴ • زندگی کی دَوڑ میں

مشہور مفکر ڈاکٹر ڈوگلس لرٹن نے لکھا ہے ـــــ "زندگی کی ہر دَوڑ میں صرف وہی مرد یا عورت پیش پیش ہوتی ہیں جو ٹھوس قوتِ فیصلہ کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر بھی حیرت ہے کہ لوگ قوتِ فیصلہ کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ حالانکہ کسی چیز، کسی بات کے بارے میں فیصلہ کرنا اِتنا بڑا دشوار کام نہیں ہے۔ اِس اصول پر عمل کرنا بے حد آسان ہے۔ یہ وہی اصول ہے جس پر بڑے بڑے کاروباری منصب دار، فوجی حکام، طبیب، قائد، سیاستداں عمل کرتے ہیں لیکن عام طور سے کسی خاص شعبے کی جو اہم شخصیتیں ہوتی ہیں وہ اِس اصول کو اپنی روزمرّہ کی زندگی میں استعمال کرتی ہیں اور اُن کا طریقۂ استعمال حد درجہ قطعی اور تعمیری ہوتا ہے۔

آپ کو بہت سے غیر معمولی قوتِ فیصلہ رکھنے والے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ کِسی بات کا فوری فیصلہ کرنا اُن کی عادت بن گئی ہے۔ ایک اخبار کا مدیر دن بھر میں سینکڑوں فیصلے کرنے پر مجبور ہوتا ہے یہاں تک کہ فیصلہ کرنا اُس کی عادت بن جاتا ہے۔

فیصلہ کُن بننے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ فیصلہ کُن بننے کی مشق کی جائے ـــــ ہر معقول موقع کو "نہیں" کی بجائے "ہاں" کہہ کر بلایئے۔ جہاں کہیں آپ کو فیصلہ کرنے کا کوئی موقع ملے، آپ اُسے ہاتھ سے

دبا نے دیں بلکہ ٹھوس طریقے سے فوراً فیصلہ کیجیے۔

فیصلہ کُن ہونا، اپنی عادت، اپنا شغل بنا لیجیے۔ اگر آپ نے جواں مردی اور استقامت کے ساتھ ایسا کیا تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ کو روحانی طور پر کوئی بہت بڑی نعمت حاصل ہوگئی ہے۔

اِس طرح کچھ ہی دنوں میں آپ ٹھوس انداز کے انسان بن جائیں گے۔ تلوّن اور پس و پیش کے جالوں سے باہر نکل آئیں گے۔

۵ • اگر تم کامیاب و کامراں بننا چاہتے ہو!

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "اگر تم کامیاب و کامراں بننا چاہتے ہو تو ہر اعلیٰ و ادنیٰ سے میل محبت سے پیش آؤ۔ اپنے کمزور قوی کو اِس قدر حرکت دو کہ وہ طاقت ور ہو جائیں۔

تم جانتے ہو تمھاری زندگی ایسی معمولی اور تمھاری قابلیتیں اِتنی کم کیوں ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ تم اپنی قابلیتوں کو کمتر سمجھتے ہو اور اپنے کارناموں کو بہت تنگ دائرے میں محدود کر دیتے ہو۔

ہمارے شکوک، ہمارے ڈر اور خوف۔ ہماری خود اعتمادی کی کمی۔ زندگی کی اچھی چیزوں کو جن کے لئے ہم کوشش کیا کرتے ہیں، ہم سے دُور کر دیتی ہے۔ سنگ تراش کے دماغ میں پتھر کے بُت کا جیسا ماڈل، جیسا نقشہ ہوگا بُت اُس سے حسین کبھی نہیں بن سکتا۔ سنگِ مرمر کا بُت مجسمہ ساز کے آئیڈیل سے بہتر کبھی نہیں بن سکتا۔ اِس لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے دل میں ایک عالی شان تصویر کا تصور جمالے۔ اُس کے بعد پتھر سے وہ ایسی ہی تصویر تیار کر سکے گا۔

۶ • آپ کے خیالات

عظیم فلسفی مارکس اوریل نے ایک عظیم حقیقت کو اِن چند الفاظ میں سمو دیا ہے ——— "ہماری زندگی ہمارے خیالات سے بنتی ہے۔"

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ——— "ہماری زندگی ہمارے خیالات سے عبارت ہے۔ اگر ہم خوشی اور مسرت کے خیالات سوچیں گے تو ہم خوش اور مسرور رہیں گے۔ اگر ہمارے خیالات افسردہ اور پژمردہ ہیں تو ہم پر بھی افسردگی اور پژمردگی چھا جائے گی۔ بزدلانہ خیالات ہمیں بزدل بنا دیں گے اور بیمار خیالات شاید ہمیں بیمار بنا دیں۔ اگر ہم ناکامی کے متعلق سوچیں گے تو ہم یقیناً ناکام رہیں گے۔"

نارمن ونسنٹ کے الفاظ میں ——— "آپ وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو سوچتے ہیں۔"

رابرٹ لیکن سٹاٹ کی سُنئے ——— "اگر ہم سکون، جرأت ا... کے خیالات کو اپنا لیں تو ہم تختۂ دار کی طرف بڑھتے ہوئے، اپنے کفن پر... مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ بھوک اور برف باری میں مرتے ہوئے... سینوں کو خوشی اور مسرت کے نغموں سے معمور کر سکتے ہیں۔"

۷ • ایک قیمتی نسخہ

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "خود کو پہچانو... کامیاب بنانے کے لئے یہی ایک قیمتی نسخہ ہے۔"

ایمرسن نے کہا ہے ——— "بہت کم لوگ موت سے پہلے خود... پاتے ہیں۔"

خود کو پہچاننا اپنے خدا کو جاننا ہے۔ نئی زندگی کا تصور یہی ہ... ہے۔ خدا کی دی ہوئی روحانی قوت کی یہ کرنیں انسان کی زندگی کو زیاد... زیادہ بامقصد اور عظیم بنانے میں پوری پوری مدد دیتی ہیں۔

جو کچھ آپ اب کر رہے ہیں، اِس سے سو گنا زیادہ کام کرنے کی... میں ہے۔ درحقیقت اہمیت اِس کی نہیں جو آپ اب کر رہے ہیں۔ بلکہ اُس ک... آپ مستقبل میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید آپ کے سمندر جیسے باطن میں... کی ایسی کانیں پوشیدہ ہوں جنھیں آپ جانتے بھی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے ک... اندر ایک عظیم انسان بننے کی صلاحیت سو رہی ہو؟

اگر آپ اپنی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانا چاہتے ہیں تو آپ کو ترقی ہی کی راہ پر بڑھتے رہنا ہوگا۔ ہمیشہ نئی نئی معلومات سے ذہن کو روشن... جیسے جیسے انسان خود کو زیادہ پہچانتا ہے، بتدریج ترقی کرتا جاتا ہے۔ ہم اپنی... کا جتنا زیادہ استعمال کریں گے ہماری صلاحیتیں اُتنی ہی زیادہ بڑھیں گی۔

کوئی اپنے آبا و اجداد کی جائداد ہی سے اپنی زندگی کو کامیاب ب... سکتا۔ اُسے سب سے پہلے اپنے باطنی سرمائے کو تلاش کرنا ہوگا اور یہ چیز... ورثہ میں نہیں ملتی۔ اِس کے لئے اُسے خود کوشش کرنی ہوتی ہے۔

ہمیشہ ایسے موقعے کی تلاش میں رہیے جو آپ کی پوشیدہ صلاحیتوں... کرنے والا اور روشنی میں لانے والا ہو!

۸ • آپ کا لباس

آج کی بیشتر خواتین اور نوجوان فیشن ایبل لباس کے والہ و شیدا بنتے جا... تنگ لباس مضحکہ خیز ہی نہیں، طبّی نقطۂ نظر سے صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ اِ...

خواتین کو خاص توجہ دینی چاہئے۔ تنگ اور چست لباس زیب و زینت کا باعث ہو تو ہو صحت کے اصولوں کے بالکل منافی ہے۔ طب میں صحت کے اعتبار سے لباس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے تنگ لباس مضر ہے۔ اِس لئے کہ اُس سے سینہ پوری طرح نہیں پھیل سکتا اور جسم کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ اِس طرح جسم پوری مقدار میں آکسیجن جذب نہیں کرتا۔ جس سے خون کی صفائی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اِس لئے ہمیشہ کشادہ لباس ہی پہننا چاہیئے۔

ہلکے اور سبک کپڑے جسمانی صحت کے لئے بہتر مانے گئے ہیں۔ شب خوابی کے کپڑے بہت مختصر اور کشادہ ہونے چاہئیں تاکہ جسم کو خاطر خواہ آرام پہنچا سکیں۔

لباس جسم کا محافظ ہے۔ لباس کے استعمال میں اِس حقیقت اور ضرورت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

گرمیوں میں سفید کپڑے پہننے چاہئیں۔ گرمیوں میں سیاہ رنگ کے کپڑے استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ اِن سے حرارت بڑھتی ہے۔ رات کو سوتے وقت شوخ رنگ کے کپڑے استعمال کرنے سے پرہیز کریں۔ جو شوخ رنگ دن میں زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے، وہی رنگ رات میں آنکھوں اور ذہن پر گراں گزرتا ہے اور نیند میں خلل ڈالتا ہے۔ جس طرح شب خوابی کے کپڑے ہلکے ہونے چاہئیں، کپڑوں کا رنگ بھی ہلکا ہونا ضروری ہے۔

۹• آپ کی یہ تھکن!

تھکن کئی طرح کی ہوتی ہے اور ہر طرح کی تھکن کے خاص اسباب ہوتے ہیں۔ معمولی طور پر تھکنے اور درحقیقت خستہ اور درماندہ ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ اگر آپ کو نیند کم آئی ہے یا آپ نے جسمانی محنت کا کام زیادہ کیا ہے تو آپ کی تھکن بجا ہے، اُس سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر آپ بلا وجہ اور بغیر کسی سبب کے تھکن اور خستگی محسوس کرتے ہیں تو اُس پر توجہ دینا بے حد ضروری ہے۔ اُس کی طرف سے ہرگز غفلت نہ برتنی چاہیئے۔ جسمانی خستگی سے دماغی خستگی زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ دماغی خستگی کا ایک بڑا سبب موجودہ طریقِ زندگی ہے، جس میں گہما گہمی، جذباتی ہیجان، آگے بڑھ جانے کی تگ و دو، خوف و تشویش اور خاص کر مالی پریشانی ہے۔ یہ سب باتیں نظامِ عصبی کو وقت سے پہلے خستہ و پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔

انتہائی خستگی خواہ دماغی ہو یا عضلی، انسان کا مزاج بدل دیتی ہے۔ وہ چڑچڑا اور بے قابو ہو جاتا ہے۔ جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں جسمانی تھکن سے عضلات میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ آنتوں اور معدے کی حرکتوں میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے اکثر کھانا کھانے کے بعد گرانی اور بے مزگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

تھکن کا بہترین تدارک یہ ہے کہ تھکن پیدا کرنے والے اسباب کو رفع کیا جائے۔ عصبی تھکن کا سبب تقریباً ہمیشہ غیر معتدل طریقِ زندگی ہوتا ہے۔ اِس لئے طبعی زندگی اختیار کی جائے۔ بے شک زیادہ کام کیجئے۔ محنت کے بعد خاطر خواہ آرام کیجئے، دم لیجئے، لوازماتِ زندگی کی طلب میں جان قربان نہ کیجئے۔

ثقیل اور ناقص غذاؤں سے ایک دیرپا خستگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ شراب اور تمباکو کی کثرت، کھانے میں بے قاعدگی، تغذیہ بخش غذاؤں سے محرومی اِس حالت کے خاص اسباب ہیں۔ جسمانی ساختوں کی برقراری اور اُن ساختوں کی صحیح کارکردگی کے لئے اور جسمانی حرارت کے قیام اور جسم کے بہت سے کیمیائی اعمال کے مناسب طور پر پُورا ہونے کے لئے زود ہضم اور طاقت بخش غذا ضروری ہے۔

۱۰• عظیم الشان سبق!

یہ کائنات ایک کھلا ہوا صحیفہ ہے، جس کے ہر صفحے پر حکمت و بصیرت کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اُن سے اپنا دامن بھر لیں یا اُنھیں نظر انداز کر دیں۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــــ "اگر آپ اِس کائنات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا اِسے منظّم کرنے میں خالقِ کائنات نے کتنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے لے کر بڑے بڑے سیاروں تک میں ایک خاص نظم نظر آتا ہے۔ کیا یہ چاند، یہ تارے اور یہ آفتاب اِس حقیقت کے شاہد نہیں کہ اِن کی گردش کسی بہت بڑے نظم کا نتیجہ ہے۔"

یہ صحیفۂ فطرت کا سب سے نمایاں باب ہے اور انسان اِس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ انسان خوش نصیب ہے جو فطرت کے اِس عظیم الشان سبق سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور اِس سے اپنے دیدہ و دل کو روشن کر کے اپنی زندگی کی راہ کو بھی روشن کر لیتا ہے۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

لطیف محمد۔ نلگنڈہ۔ حیدرآباد دکن

س۔ طالب علم کو کیا کرنا چاہیئے؟
ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنی ساری توجہ تعلیم کی تکمیل پر صَرف کرنی چاہیئے۔
س۔ اگر ہندوستان میں رشوت کو بند کر دیا جائے تو کیا ہوگا؟
ج۔ رشوت کھا کر موٹے ہو جانے والے بے شمار لوگ اِتنے دُبلے ہو جائیں گے کہ پہچانے نہ جائیں گے!

عبدالرشید خاں ...

س۔ عورت چراغِ خانہ ہے یا شمعِ محفل؟
ج۔ چراغِ خانہ!
س۔ عورت اولاد کو کیسے مطیع بنا سکتی ہے؟
ج۔ اچھی تربیت کرکے۔

سیّد سیادت علی ہاشم۔ حیدرآباد

س۔ "بیسویں صدی" کی تاریخِ پیدائش؟
ج۔ نُبّا صدی سے بھی پانچ سال زیادہ!

س۔ بھائی جان! سُنا ہے غصّے میں حُسن اور نکھرتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟
ج۔ آپ نے بجا ہی سُنا ہے ؎

طلوعِ جام بھی دیکھا ہے خندۂ گُل بھی
حسین کوئی نہیں اُن کی برہمی کے سوا

ایم۔ اے امان۔ بارسوئی۔ پورنیہ

س۔ دُنیا میں دوسری پوزیشن کس زبان کی ہے؟
ج۔ چینی زبان کی۔
س۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اِس دَور میں جو جتنا بڑا سیاستداں ہے وہ اتنا ہی بڑا فریب کار ہے؟
ج۔ یہ سو فیصدی سچ ہے!

سیّد حلیم الدّین احمد۔ محبوب نگر۔ آندھرا

س۔ بھیّا! سچّی دوستی کا راز کیا ہے؟
ج۔ دوستی کے دامن پر خود غرضی کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا جائے۔
س۔ مایوس زندگی میں جان ڈال دینے والا کوئی شعر سُنایئے۔
ج۔ ایک ہی کیوں دو شعر سُنئے ؎

خزاں نصیب گُلوں کی فسردگی پہ نہ جا
چھڑے گا رزمِ بہاراں یہاں کبھی نہ کبھی
اثر دکھائے گا عزمِ جواں کبھی نہ کبھی
جُھکے گا در پہ مِرے آسماں کبھی نہ کبھی

سیّد معین احمد۔ جاموریا۔ بردوان

س۔ اُداسی اور غم ساتھ نہ چھوڑیں تو؟
ج۔ آپ اُن کا ساتھ چھوڑ دیں۔
س۔ غمزدہ انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟
ج۔ خوش رہنے کی کوشش!

عُبید صیفی۔ بنگلور

س۔ اصولوں کی رسائی جسم تک تو ہے خیالوں تک کیوں نہیں ——؟
ج۔ اصولوں کی رسائی جسم تک کم ہوتی ہے، خیالوں تک زیادہ!
س۔ دُنیا میں سب سے پاک اور پوتر کیا چیز ہے؟
ج۔ بقولِ ایک مفکّر —— عورت کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو!

دے جانے دیں بلکہ ٹھوس طریقے سے فوراً فیصلہ کیجیے۔

فیصلہ کُن ہونا، اپنی عادت، اپنا شغل بنا لیجیے۔ اگر آپ نے جواں مردی اور استقامت کے ساتھ ایسا کیا تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ کو روحانی طور پر کوئی بہت بڑی نعمت حاصل ہوگئی ہے۔

اس طرح کچھ ہی دنوں میں آپ ٹھوس انداز کے انسان بن جائیں گے۔ تلوّن اور پس و پیش کے جال سے باہر نکل آئیں گے۔

۵● اگر تم کامیاب و کامران بننا چاہتے ہو!

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ۔۔۔۔ "اگر تم کامیاب و کامران بننا چاہتے ہو تو ہر اعلیٰ و ادنیٰ سے میل محبت سے پیش آؤ۔ اپنے کمزور قویٰ کو اس قدر حرکت دو کہ وہ طاقت ور ہو جائیں۔

تم جانتے ہو تمھاری زندگی ایسی معمولی اور تمھاری قابلیتیں اتنی کم کیوں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تم اپنی قابلیتوں کو کمتر سمجھتے ہو اور اپنے کارناموں کو بہت تنگ دائرے میں محدود کر دیتے ہو۔

ہمارے شکوک، ہمارے ڈر اور خوف۔ ہماری خود اعتمادی کی کمی۔ زندگی کی اچھی چیزوں کو جن کے لئے ہم کوشش کیا کرتے ہیں، ہم سے دُور کر دیتی ہے۔
سنگ تراش کے دماغ میں پتھر کے بُت کا جیسا ماڈل، جیسا نقشہ ہوگا بُت اُس سے حسین کبھی نہیں بن سکتا۔ سنگِ مرمر کا بُت مجسمہ ساز کے آئیڈیل سے بہتر کبھی نہیں بن سکتا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے دل میں ایک عالی شان تصویر کا تصوّر جمالے۔ اُس کے بعد پتھر سے وہ ایسی ہی تصویر تیار کر سکے گا۔

۶● آپ کے خیالات

عظیم فلسفی مارکس اوریل نے ایک عظیم حقیقت کو ان چند الفاظ میں سمو دیا ہے ۔۔۔۔ "ہماری زندگی ہمارے خیالات سے بنتی ہے۔"

مشہور مفکر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ۔۔۔۔ "ہماری زندگی ہمارے خیالات سے عبارت ہے۔ اگر ہم خوشی اور مسرّت کے خیالات سوچیں گے تو ہم خوش اور مسرور رہیں گے۔ اگر ہمارے خیالات افسردہ اور پژمردہ ہیں تو ہم پر بھی افسردگی اور پژمردگی چھا جائے گی۔ بزدلانہ خیالات ہمیں بزدل بنا دیں گے اور بیمار خیالات شاید ہمیں بیمار بنا دیں۔ اگر ہم ناکامی کے متعلق سوچیں گے تو ہم یقیناً ناکام رہیں گے۔"

نارمن ونسنٹ کے الفاظ میں ۔۔۔۔ "آپ وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو سوچتے ہیں۔"

رابرٹ لیگلن بسکاٹ کی تحقیق ہے ۔۔۔۔ "اگر ہم سکون، جرأت اور علم کے خیالات کو اپنا لیں تو ہم تحفظ داری کی طرف بڑھتے ہوئے، اپنے کٹھن پریشان کُن مناظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ جھکڑ اور برف باری میں مرتے ہوئے بھی سینوں کو خوشی اور مسرت کے نغموں سے معمور کر سکتے ہیں۔"

۷● ایک قیمتی نسخہ

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ۔۔۔۔ "خود کو پہچانو اور زندگی کامیاب بنانے کے لئے یہی ایک قیمتی نسخہ ہے۔"

ایمرسن نے کہا ہے ۔۔۔۔ "بہت کم لوگ موت سے پہلے خود کو پہچان پاتے ہیں۔"

خود کو پہچاننا اپنے خدا کو جاننا ہے۔ نئی زندگی کا تصور بھی یہی [illegible] ہے۔ خدا کی دی ہوئی روحانی قوت کی یہ کرنیں انسان کی زندگی کو زیادہ بلند، زیادہ بامقصد اور عظیم بنانے میں پوری پوری مدد دیتی ہیں۔

جو کچھ آپ اب کر رہے ہیں، اس سے سَو گنا زیادہ کام کرنے کی قوت آپ میں ہے۔ درحقیقت اہمیت اس کی نہیں جو آپ اب کر رہے ہیں۔ بلکہ اُس کی ہے جو آپ مستقبل میں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ شاید آپ کے سمندر جیسے باطن میں صلاحیتوں کی ایسی کانیں پوشیدہ ہوں جنھیں آپ جانتے بھی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کے اندر ایک عظیم انسان بننے کی صلاحیت سو رہی ہو؟

اگر آپ اپنی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانا چاہتے ہیں تو آپ کو ہمیشہ ترقی ہی کی راہ پر بڑھتے رہنا ہوگا۔ ہمیشہ نئی نئی معلومات سے ذہن کو روشن کرنا ہوگا۔ جیسے جیسے انسان خود کو زیادہ پہچانتا ہے، بتدریج ترقی کرتا جاتا ہے۔ ہم اپنی قابلیتوں کا جتنا زیادہ استعمال کریں گے ہماری صلاحیتیں اتنی ہی زیادہ بڑھیں گی۔

کوئی اپنے آباؤ اجداد کی جائداد ہی سے اپنی زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ اسے سب سے پہلے اپنے باطنی سرمائے کو تلاش کرنا ہوگا اور یہ چیز اُسے ورثہ میں نہیں ملتی۔ اس کے لئے اُسے خود کوشش کرنی ہوتی ہے۔

ہمیشہ ایسے موقعے کی تلاش میں رہئے جو آپ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے والا اور روشنی میں لانے والا ہو!

۸● آپ کا لباس

آج کی بیشتر خواتین اور نوجوان ٹیڈی لباس کے والہ و شیدا بنتے جا رہے ہیں۔ تنگ لباس مضحکہ خیز ہی نہیں، طبی نقطۂ نظر سے صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ اس طرح

خواتین کو خاص توجہ دینی چاہئے۔ تنگ اور چست لباس زیب و زینت کا باعث ہو تو ہو صحت کے اصولوں کے بالکل منافی ہے۔ طب میں صحت کے اعتبار سے لباس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ طبی نقطۂ نظر سے تنگ لباس مضر ہے۔ اِس لئے کہ اُس سے سینہ پوری طرح نہیں پھیل سکتا اور جسم کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ اِس طرح جسم پوری مقدار میں آکسیجن جذب نہیں کرتا۔ جس سے خون کی صفائی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اِس لئے ہمیشہ کشادہ لباس ہی پہننا چاہئے۔

ہلکے اور مہین کپڑے جسمانی صحت کے لئے بہتر مانے گئے ہیں۔ شب خوابی کے کپڑے بہت مختصر اور کشادہ ہونے چاہئیں تاکہ جسم کو خاطر خواہ آرام پہنچا سکیں۔

لباس جسم کا محافظ ہے۔ لباس کے استعمال میں اِس حقیقت اور ضرورت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔

گرمیوں میں سفید کپڑے پہننے چاہئیں۔ گرمیوں میں سیاہ رنگ کے کپڑے استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ اِن سے حرارت بڑھتی ہے۔ رات کو سوتے وقت شوخ رنگ کے کپڑے استعمال کرنے سے پرہیز کریں۔ جو شوخ رنگ دن میں زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے، وہی رنگ رات میں آنکھوں اور ذہن پر گراں گزرتا ہے اور نیند میں خلل ڈالتا ہے۔ جس طرح شب خوابی کے کپڑے ہلکے ہونے چاہئیں، کپڑوں کا رنگ بھی ہلکا ہونا ضروری ہے۔

۹• آپ کی یہ تھکن!

تھکن کئی طرح کی ہوتی ہے اور ہر طرح کی تھکن کے خاص اسباب ہوتے ہیں۔ معمولی طور پر تھکنے اور در حقیقت خستہ اور درماندہ ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ اگر آپ کو نیند کم آتی ہے یا آپ نے جسمانی محنت کا کام زیادہ کیا ہے تو آپ کی تھکن بجا ہے، اُس سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر آپ بلا وجہ اور بغیر کسی سبب کے تھکن اور خستگی محسوس کرتے ہیں تو اُس پر توجہ دینا بے حد ضروری ہے۔ اُس کی طرف سے ہرگز غفلت نہ برتنی چاہئے۔ جسمانی خستگی سے دماغی خستگی زیادہ قابلِ توجہ ہے۔ دماغی خستگی کا ایک بڑا سبب موجودہ طریقِ زندگی ہے، جس میں گہما گہمی، جذباتی ہیجان، آگے بڑھ جانے کی تگ و دو، خوف و تشویش اور خاص کر مالی پریشانی ہے۔ یہ سب باتیں نظامِ عصبی کو وقت سے پہلے خستہ و پارہ پارہ کر دیتی ہیں۔

انتہائی خستگی خواہ دماغی ہو یا عضلی، انسان کا مزاج بدل دیتی ہے۔ وہ چڑچڑا اور بے قابو ہو جاتا ہے۔ جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں جسمانی تھکن سے عضلات میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ آنتوں اور معدے کی حرکتوں میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے اکثر کھانا کھانے کے بعد گرانی اور بے مزگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔

تھکن کا بہترین تدارک یہ ہے کہ تھکن پیدا کرنے والے اسباب کو روکا جائے۔ عصبی تھکن کا سبب تقریباً ہمیشہ غیر معتدل طریقِ زندگی ہوتا ہے۔ اِس لئے طبعی زندگی اختیار کی جائے۔ بے شک زیادہ کام کیجئے۔ محنت کے بعد ذرا سُستا لیجئے، آرام کیجئے، دم لیجئے، لوازماتِ زندگی کی طلب میں جان قربان نہ کیجئے۔

ثقیل اور ناقص غذاؤں سے ایک دیرپا خستگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ شراب اور تمباکو کی کثرت، کھانے میں بے قاعدگی، تغذیہ بخش غذاؤں سے محرومی اِس حالت کے خاص اسباب ہیں۔ جسمانی ساختوں کی برقراری اور اُن ساختوں کی صحیح کارکردگی کے لئے اور جسمانی حرارت کے قیام اور جسم کے بہت سے کیمیائی اعمال کے مناسب طور پر پُورا ہونے کے لئے زود ہضم اور طاقت بخش غذا ضروری ہے۔

۱۰• عظیم الشان سبق!

یہ کائنات ایک کھلا ہوا صحیفہ ہے، جس کے ہر صفحے پر حکمت و بصیرت کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اُن سے اپنا دامن بھر لیں یا اُنھیں نظر انداز کر دیں۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــــــ "اگر آپ اِس کائنات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا اِسے منظم کرنے میں خالقِ کائنات نے کتنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ذرّوں سے لے کر بڑے بڑے سیاروں تک میں ایک خاص نظم نظر آتا ہے۔ کیا یہ چاند، یہ تارے اور یہ آفتاب اِس حقیقت کے شاہد نہیں کہ اِن کی گردش کسی بہت بڑے نظم کا نتیجہ ہے۔

یہ صحیفۂ فطرت کا سب سے نمایاں باب ہے اور انسان اِس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ انسان خوش نصیب ہے جو فطرت کے اِس عظیم الشان سبق سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور اِس سے اپنے دیدہ و دل کو روشن کرکے اپنی زندگی کی راہ کو بھی روشن کر لیتا ہے۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسیؔ معاشی تمدنی علمی ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

لطیف محمد۔ نلگنڈہ۔ حیدرآباد دکن

س۔ طالب علم کو کیا کرنا چاہیئے ؟

ج۔ تعلیم کی تکمیل سے پہلے اپنی ساری توجہ تعلیم کی تکمیل پر صرف کرنی چاہیئے۔

س۔ اگر ہندوستان میں رشوت کو بند کر دیا جائے تو کیا ہوگا ؟

ج۔ رشوت کھا کر موٹے ہو جانے والے بے شمار لوگ اِتنے دُبلے ہو جائیں گے کہ پہچانے نہ جائیں گے !

عبدالرشید خاں ...

س۔ عورت چراغِ خانہ ہے یا شمعِ محفل ؟

ج۔ چراغِ خانہ !

س۔ عورت اولاد کو کیسے مطیع بنا سکتی ہے ؟

ج۔ اچھی تربیت کر کے۔

سیّد سیادت علی ہاشم۔ حیدرآباد

س۔ "بیسویں صدی" کی تاریخِ پیدائش ؟

ج۔ نئی صدی سے بھی پانچ سال زیادہ !

س۔ بھائی جان! سُنا ہے غصّے میں حُسن اور نکھرتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

ج۔ آپ نے بجا ہی سُنا ہے ؎

طلوعِ جام بھی دیکھا ہے خندۂ گُل بھی
حسین کوئی نہیں اُن کی برہمی کے سوا

ایم۔ اے امان۔ بارسوئی۔ پورنیہ

س۔ دُنیا میں دوسری پوزیشن کس زبان کی ہے ؟

ج۔ چینی زبان کی۔

س۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اِس دَور میں جو جتنا بڑا سیاستداں ہے وہ اتنا ہی بڑا فریب کار ہے ؟

ج۔ یہ سو فیصدی سچ ہے !

سیّد علیم الدین احمد۔ محبوب نگر۔ آندھرا

س۔ بھیا! سچی دوستی کا راز کیا ہے ؟

ج۔ دوستی کے دامن پر خود غرضی کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا جائے۔

س۔ مایوس زندگی میں جان ڈال دینے والا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ ایک ہی کیوں دو شعر سُنیئے ؎

خزاں نصیب گُلوں کی فسردگی پہ نہ جا
چھڑے گا رزمِ بہاراں یہاں کبھی نہ کبھی
اثر دکھائے گا عزمِ جواں کبھی نہ کبھی
جُھکے گا در پہ ترے آسماں کبھی نہ کبھی

سیّد معین احمد۔ جاموریا۔ بردوان

س۔ اُداسی اور غم ساتھ نہ چھوڑیں تو ؟

ج۔ آپ اُن کا ساتھ چھوڑ دیں۔

س۔ غمزدہ انسان کو کیا کرنا چاہیئے ؟

ج۔ خوش رہنے کی کوشش !

عُبید صیفی۔ بنگلور

س۔ اصولوں کی رسائی جسم تک تو ہے خیالوں تک کیوں نہیں ——— ؟

ج۔ اصولوں کی رسائی جسم تک کم ہوتی ہے، خیالوں تک زیادہ !

س۔ دُنیا میں سب سے پاک اور پوتر کیا چیز ہے ؟

ج۔ بقول ایک مفکّر ——— عورت کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو !

زرینہ خاتون۔ لال باغ۔ پٹنہ

س۔ آج کل نوجوان عورت کو سیرت پر کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ آج کل کے نوجوان بصیرت سے محروم ہوگئے ہیں۔

س۔ آج کل کی نازک اندام لڑکیاں دولت کو تعلیم پر کیوں ترجیح دیتی ہیں؟

ج۔ سب لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں۔

ایس حسنین شیدا۔ رانچی ہل

س۔ فن کیا ہے ——؟

ج۔ ایک مفکر نے فن کی یہ تعریف کی ہے —— فن وہ ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔

س۔ ادب کا مقصد؟

ج۔ آج کے دور میں ادب کا مقصد صرف ذہنی تفریح سمجھا جاتا ہے۔

ایم، جے احمد بھٹکلی۔ گنٹور

س۔ مرد عورت کی نظر سے کب گر جاتا ہے؟

ج۔ جب کسی دوسری عورت کے لئے اُس کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت ایک تجربہ گاہ ہے؟

ج۔ جی نہیں۔ عورت کی آغوش، ماں کی گود تجربہ گاہ نہیں، تربیت گاہ ہے۔

ایس، یو صدیقی۔ بھوپال

س۔ ایک عرصہ ہوا محترم شاکر چچی کو نہیں دیکھا۔ اُن کی خاموشی کا سبب؟

ج۔ لوگ کہتے ہیں اب اُن کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ اِس لئے خاموش ہیں۔ حقیقت کیا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

مس چاند بیگم صدیقی۔ میسور

س۔ چچاجان! زندگی میں ہر موڑ پر ناکامی ہو تو کیا کریں؟

ج۔ زندگی کے کسی موڑ پر اِس حقیقت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں کہ ناکامیاں ہی کامیابی کا زینہ بنتی ہیں۔

س۔ کیا انسان کو تقدیر کے ساتھ تدبیر سے بھی کام لینا چاہیے؟

ج۔ بے شک! حُسنِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے۔

س۔ زندگی سراب ہے —— آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ زندگی سراب نہیں، بحرِ بیکراں ہے!

ایم عثمان بیگ۔ بسواکلیانی۔ کرناٹک

س۔ فانی کا کوئی تاثر انگیز شعر سنائیے۔

ج۔ رسمِ وفا سے بے خبر ہم بھی نہیں، مگر حضور!
بس بھی تو آنسوؤں پہ ہو، دیدۂ تر سے کیا کہیں

س۔ خوشتر بھیا! آپ کی نظر میں آج کا سب سے بڑا غزل گو کون ہے؟

ج۔ جو کمال خوبی و خوش اسلوبی سے دوسروں کی غزلیں اپنی بنالے!

س۔ صحیح معنوں میں لیڈری کیا ہے؟

ج۔ اِس دور کا سب سے نفع بخش پیشہ!

محمد عبدالجبار خورشید۔ حیدرآباد دکن

س۔ خوشتر بھیا! انسان زندگی پر موت کو کب ترجیح دیتا ہے؟

ج۔ جب وہ بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب اُس کی آنکھیں زندگی کا حُسن دیکھنے سے عاری ہو جاتی ہیں۔

س۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہے تو موت؟

ج۔ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے۔

ابوالفیض بھلائی نگر۔ مدھیہ پردیش

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو مشکوک نظر سے کیوں دیکھا جاتا ہے؟

ج۔ متعصب اور تنگ نظر لوگ ہی مسلمانوں کو مشکوک نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہند و پاک کی حالیہ آویزش میں بھی مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ وطن پرستی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مجاہدِ وطن عبدالحمید کی سرفروشی اِس حقیقت کا غیر فانی ثبوت ہے!

اے، آر راہی۔ بنگلور

س۔ حُسن کا درجہ بلند ہے یا محبت کا؟

ج۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا!
کہئے گُل و بُلبل کے فسانے کب تک
یہ عشق و محبت کے ترانے کب تک!

س۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ کیا میں کسی اچھی لڑکی کو بہن بنا کر نباہ کر سکتا ہوں؟

ج۔ جب آپ محبت کے ساتھ حُسن کا درجہ ناپ رہے ہیں تو کیسے کہا جائے کہ آپ کسی اچھی لڑکی کو بہن بنا کر نباہ کر سکیں گے۔

مولوی عالم خاں۔ موتی ہاری چمپارن

س۔ پھول کی حفاظت کانٹے کرتے ہیں اور حُسن کی ——؟

ج۔ اُس کی بلندی!

س۔ بھیا! دیوانے اور مستانے میں کیا فرق ہے؟

ج۔ دیوانہ مستانہ بھی ہوتا ہے لیکن ہر مستانہ دیوانہ نہیں ہوتا۔

شکیل الرحمٰن پروانہ۔ بھاگل پور

س۔ دورِ حاضر نے انسان کو کیا دیا؟

ج۔ بہت کچھ! کیا ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کا نام آپ نے نہیں سنا؟

س۔ کردار کے غازی ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ کردار نے گفتار کی جگہ لے لی ہے۔

مسعود رومانی ٹکٹاردی۔ ٹکٹار

س۔ خوشتر صاحب! نئے لکھنے والوں کے متعلق اظہارِ خیال فرمایئے۔

ج۔ نئے لکھنے والوں میں خود اعتمادی اچھا وصف ہے لیکن خود اعتمادی اور خود فریبی میں فرق ہے۔ نئے لکھنے والوں کو چند چیزیں لکھ کر خود کو بڑا فنکار نہ سمجھ بیٹھنا چاہئے۔ کسی استاد سے استفادہ کرتے رہنا چاہئے۔ کسی منزل آشنا کا دامن پکڑ کر منزل کی طرف بڑھنا چاہئے۔

س۔ خود ستائی کب کرنی چاہئے؟

ج۔ کبھی نہیں۔

س۔ حضرت جمیل مظہری؟

ج۔ اچھے شاعر ہیں۔

منور احمد۔ سری نگر۔ کشمیر

س۔ "بیسویں صدی" کے سرورق پر عورت کی تصویر ہوتی ہے۔ آخر آپ نے کبھی عورت ہی کا سہارا لیا؟

ج۔ بے شک عورت مرد کا سب سے بڑا سہارا ہے ... سب سے بڑی طاقت ہے ... جب عالم وجود میں آیا ہے عورت اسی وقت سے ... دیتے آئی ہے۔

س۔ غلام محی الدین ... کراچی کو اب زیادہ رسوا کرنے سے کیا آپ کو وہ ہزاروں روپے واپس مل سکتے ہیں؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے ہزاروں روپے تو واپس نہیں مل سکتے لیکن اس روسیاہ ڈاکو سے لوگوں کو ہوشیار و خبردار کرتے رہنے سے دوسرے لوگ اس کا شکار ہونے سے بچ سکتے ہیں۔

مصطفےٰ کمال جانوی۔ پٹنہ

س۔ آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے لیکن دل میں اُمڈتے ہوئے طوفان کا اندازہ کس طرح لگایا جائے؟

ج۔ دل میں اُمڈتے ہوئے طوفان کا اندازہ بھی آنکھوں کے آنسو ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ آنکھیں دل کی ترجمان ہوتی ہیں۔

س۔ اگر دل کی سرسبز و شاداب دُنیا میں خزاں آجائے تو؟

ج۔ بددل نہ ہونا چاہئے۔ ہر خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔

احمد لطیف ابن شیخ۔ ایلینر

س۔ چچا جان! انسان کھانے کے لئے زندہ رہتا ہے یا زندہ رہنے کے لئے کھاتا ہے؟

ج۔ آج کا انسان کھانے کے لئے زندہ رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

س۔ اگر زندگی زندہ دلی کا نام ہے تو موت؟

ج۔ موت جدید مذاقِ زندگی کا نام ہے!

س۔ سُنا ہے چکی پیسنے سے صحت اچھی ہو جاتی ہے تو چوروں سے جیل میں چکی اس لئے پسوائی جاتی ہے کہ ان کی صحت اچھی ہو جائے اور وہ اور زیادہ چوری کر سکیں؟

ج۔ بُرا انسان ہمیشہ بُرا ہی نہیں رہتا۔ چوروں کی اصلاح کی طرف توجہ دی جائے تو وہ اچھے انسان بن کر ملک اور معاشرہ کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

محمد عزیز فاروقی۔ علی گڑھ

س۔ بھیا! "صحت اور زندگی" معلوماتی فیچر کون لکھتا ہے؟ آپ یا کوئی اور؟

ج۔ ہم خود بھی لکھتے ہیں اور باہر سے معیاری اور معلوماتی مضامین آجائیں تو وہ بھی شائع کئے جاتے ہیں۔

س۔ شادی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کتنی عمر میں کرنی چاہئے؟

ج۔ سن بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد شادی کرنی چاہئے۔ ۲۵ سال لڑکے کی اور ۲۰ سال لڑکی کی عمر شادی کے لئے مناسب عمر ہے۔ اس سے کم عمر میں ہرگز شادی نہ کرنی چاہئے۔

شانتی سنہا۔ مدراس

س۔ بھیا! آپ بتا سکتے ہیں ریڈیو کس نے ایجاد کیا ہے اور وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟

ج۔ اس کا نام جی مارکونی تھا۔ وہ اٹلی کا رہنے والا تھا۔

(باقی صفحہ ۹۵ سے آگے)

اور مجھ پر بھی اُن کی کم شفقت نہ تھی۔ اب راجہ صاحب کی شخصیت کو آپ ہی میں تلاش کرنے پر کامیابی ہو سکتی ہے ——— اُن کی بیماری کا زمانہ، اُن کی موت، کفن دفن سب میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ خدا کی قسم جب بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے بے اختیار روح کی گہرائیوں تک تکلیف پہنچتی ہے۔

آپ کے راجہ کا دوست

آپ کا مداح و نیاز مند ——— باقی صدیقی (بمبئی)

جب آپ ٹارچ خریدیں
تو کیا ایسی ٹارچ طلب
کرتے ہیں جس کی ایک بڑی
تنوع شعاع ہو۔ قابل اعتماد
سوئچ ہو اور مضبوط زنگ نہ
لگنے والا بیرل ہو
یا صرف GEEP ٹارچ
ہی طلب کرتے ہیں!



جیپ فلیش لائٹ
انڈسٹریز لمیٹڈ
۲۸ ہسٹنگز روڈ الٰہ آباد

STERLING — GF —

ڈاکٹر حسین زیدی۔ شملہ

س۔ غذائی قلت کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ آبادی بہت بڑھ گئی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کتنی آبادی بڑھ گئی ہے؟

ج۔ حقیقت کیا ہے؟ یہ تو ہمارے وزیرِ خوراک شری سبرامنیم جی ہی بتا سکتے ہیں۔ حال ہی میں ہم نے پڑھا ہے مرکزی وزیرِ صحت ڈاکٹر سوشیلا نیر نے اعداد و شمار بتاتے ہوئے کہا ہے، مُلک کی آبادی میں ہر روز تیس ہزار کا اضافہ ہو رہا ہے۔

محمد ہارون۔ حاجی محمد اکبر

س۔ خوشتر بھائی! یہ شعر کس کا ہے ؎

جامہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب وہ شمعِ بزم ہے پہلے چراغِ خانہ تھی

ج۔ یہ شعر حضرتِ اکبر الہ آبادی کا ہے۔ دوسرا مصرع اِس طرح ہے ؎

اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

کے، جی، محی الدین۔ چندرا پورم

س۔ مسلمان کتنے رشتوں سے شادی کر سکتا ہے؟ کیا میں اپنی بھانجی کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہوں؟

ج۔ دینی مسئلہ تو آپ کو کسی مفتی سے پوچھنا چاہیئے۔ اخلاقی اعتبار سے ہمارا پُرخلوص مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنی بھانجی کی بیٹی کے لئے کوئی اور بہتر رشتہ تلاش فرمائیں۔

پروین بانو۔ گنگا نگر

س۔ میرے پانچ بھائی ہیں اور پانچوں میں بالکل نہیں بنتی۔ سب مجھے پریشان کرتے ہیں۔ ایک چائے کی فرمائش کرتا ہے تو دوسرا دودھ کی اور تیسرا کافی کی —— جسے پہلے چیز مل گئی وہ تو خوش ہو گیا، باقیوں نے شکایت شروع کر دی —— کیا تم پہلے مجھے نہیں دے سکتی تھیں؟ تمھارا بھائی تو وہ ہے، میں تو دشمن ہوں! —— لیکن میرے دل میں سب کی عزت، سب کا احترام برابر ہے۔ اپنے بھائیوں کو یہ کیسے سمجھاؤں؟

ج۔ آپ ہی نہیں، اکثر بہنیں اِس صورتِ حال سے دوچار رہتی ہیں۔ آپ کو زیادہ فکرمند نہ ہونا چاہیئے۔ آپ کے دل کے سکون کے لئے آپ کا اپنا خلوص کافی ہے۔

س۔ ایک لڑکی کی زندگی گھر تک محدود ہو تو اُس کا مستقبل؟

ج۔ ایسی لڑکی کا مستقبل مسرت بکنار ہوگا۔

جان عالم۔ جاہل بتیادی۔ بتیا

س۔ آپ کی نظر میں قرآنِ پاک کیا اہمیت رکھتا ہے؟

ج۔ اِس مقدس صحیفہ کی اہمیت و عظمت احاطۂ تحریر میں نہیں آ سکتی —— ایک انگریز عالم اشٹین گاس نے لکھا ہے: "قرآن میں ایک ہمہ گیر سچائی ملتی ہے"۔ ایک اور انگریز فاضل جارج سیل نے لکھا ہے۔ (اُس نے قرآنِ پاک کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے) قرآنِ پاک ایسا معجزہ ہے جسے انسان نہیں لکھ سکتا۔ یہ مُردوں کو زندہ کرنے سے بھی بڑا معجزہ ہے۔

س۔ سکون کس مذہب میں مل سکتا ہے؟

ج۔ اُن کی تعلیمات پر سچائی سے عمل کیا جائے تو ہر مذہب میں سکون مل سکتا ہے۔ دُنیا کے سارے مذاہب نے نیک اطواری و نیکوکاری کی تعلیم دی ہے اور نیکی و نیکوکاری سکونِ خاطر بخشتی ہے۔

جعفر خاں منصور خاں۔ پونہ

س۔ میرا ایک دوست مصنف بننا چاہتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اُس کی کوئی خاص تعلیم ہے اور نہ ڈگری ہی ہے۔ ایسا کوئی ذریعہ بتائیے کہ میرا دوست مصنف بن سکے۔

ج۔ مصنف بننے کے لئے ڈگری یافتہ ہونا ضروری نہیں۔ ہاں، تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے —— آپ کے دوست مصنف بننا چاہتے ہیں تو جناب آسی رام نگری سے استفادہ کریں۔ اُن کا پتہ یہ ہے:-
جناب آسی رام نگری بنگلہ سرائے (بنارس)

س۔ ناول اور فلمی کہانی میں کیا فرق ہے؟

ج۔ بہت فرق ہے۔ "سرگوشیوں" میں تفصیل سے بتانا ممکن نہیں ہے۔

سعیدہ ناز۔ کانپور

س۔ علامہ اقبال کا کوئی شعر سُنائیے۔

ج۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اِس کی یہ گلستاں ہمارا

سنیل راہی۔ گیا

س۔ محبت میں جب انسان برباد ہو جاتا ہے تو لوگ اُسے افسانہ بنا دیتے ہیں۔ کیوں؟

ج۔ ایسی فضول چیز کا دوسرا مصرف بھی کیا ہے۔

س۔ دولت اور عورت میں کیا رشتہ ہے جبکہ دونوں بے وفا ہیں؟

ج۔ عورت بے وفا نہیں ہے۔ دولت بے وفا ہے۔ لیکن عورت اور دولت کو بے وفا کہنے والے مرد سے زیادہ نہیں۔

ہربنس لال ساہنی۔ دہلی

س۔ ساری دنیا کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ اِس وقت دُنیا کی آبادی تقریباً تین ارب ہے۔

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
شکست کے بعد	کرشن چندر	چار روپیہ پچاس پیسے
طوفان کی کلیاں	〃	چار روپے
گدھے کی واپسی	〃	تین روپے
الٹا درخت	〃	دو روپے پچہتر پیسے
دروازہ	〃	دو روپے پچیس پیسے
سسرال	شوکت تھانوی	دو روپے
مسٹر ۵۸	〃	تین روپے پچاس پیسے
بقراط	〃	دو روپے پچاس پیسے
جی ہاں پٹے ہیں	〃	تین روپے پچیس پیسے
جوڑ توڑ	〃	پانچ روپے
داماد	〃	دو روپیہ پچیس پیسے
گوشۂ عافیت	پریم چند	پانچ روپے
چوگان ہستی مکمل	〃	گیارہ روپے
دودھ کی قیمت	〃	تین روپے
خاک پروانہ	〃	تین روپے
صبح زندگی	راشد الخیری	دو روپے
شب زندگی	〃	ایک روپیہ پچیس پیسے
شام زندگی	〃	ایک روپیہ پچاس پیسے
ستیہ کی بیٹی	رازق الخیری	تین روپے
سمن پوش	مجنوں گورکھپوری	ایک روپیہ پچاس پیسے
اقبال	〃	چار روپے
گرد کارواں	کنھیا لال کپور	تین روپے
سنگ و خشت	〃	دو روپیہ پچاس پیسے
سونا گاچھی	جمنا داس اختر	چار روپے پچاس پیسے
شعلۂ سنگ	کرتار چاند پوری	تین روپے پچاس پیسے
شمع	اے آر خاتون	پانچ روپے
چشمہ	〃	دس روپے پچہتر پیسے
شکیلہ	مسعود جاوید	چار روپے پچیس پیسے

کتاب	مصنف	قیمت
شکست ظلمت	قمر جالندھری	ایک روپیہ پچہتر پیسے
آرزو کی کلیاں	〃	ایک روپیہ پچہتر پیسے
پہلی محبت	〃	ایک روپیہ پچیس پیسے
خواب گاہیں	〃	تین روپے پچاس پیسے
دنیا کے مشہور سائنسداں	〃	دو روپے پچیس پیسے
شائستہ	نادرہ خاتون	چار روپے پچاس پیسے
ظالم	سعید امرت	دو روپے پچاس پیسے
فتح خیبر	صادق حسین	چار روپے
مقابلہ	خان محبوب طرزی	تین روپے
نیلوفر	〃	تین روپے
اکبری دروازہ	〃	چار روپے
دوشیزۂ روم	〃	تین روپے
دیوانہ	〃	تین روپے
دو دیوانے	〃	دو روپے پچاس پیسے
سیلاب	〃	تین روپے
گناہ	دت بھارتی	دو روپے پچاس پیسے
اندھیرے اجالے	عادل رشید	تین روپے
بہار آنے تک	〃	تین روپے پچاس پیسے
دو پھول	〃	تین روپے پچانوے پیسے
مغرور	رئیس احمد جعفری	چار روپے پچاس پیسے
قیامت	ذکی انور	دو روپے پچاس پیسے
سازش	〃	دو روپے پچاس پیسے
گورا	ٹیگور	چار روپے پچاس پیسے
لٹ گئی بہار	ضیا عظیم آبادی	تین روپے پچاس پیسے
دل ہی تو ہے	〃	چار روپے پچیس پیسے
ممتاز	ایم اسلم	آٹھ روپے
آخری رات	〃	پانچ روپے
ریحانہ	〃	سات روپے

کتاب	مصنف	قیمت
وعدہ	مہندر ناتھ	چار روپے پچہتر پیسے
گلی گلی	رام لعل	چار روپے
فردوس گوش	حضرت جوش ملیح آبادی	چھ روپے
کفر و ایمان	ہری چند اختر	چار روپے
وسکی کی بوتل	موہن یاور	دو روپے
لنکن نے کہا	منور لکھنوی	تین روپے
موٹر میکینک گائڈ	شیو ناتھ تسکین	چار روپے
موٹر ڈرائیونگ	کرشنا نند شرما	چار روپے پچاس پیسے
کیا خوب آدمی تھا		ایک روپیہ پچیس پیسے
عجیب لڑکی	اوم پرکاش نامی	تین روپے
ہمارا نپیل (بچوں کیلئے)	خوشتر گرامی	پچاس پیسے
ہمارا سبھاش	〃 ہندی 〃	پچاس پیسے
اجالے سے پہلے	ابراہیم جلیس	دو روپے پچاس پیسے
ابھرتے جوبن	اظہار اثر	دو روپے
آندھی میں چراغ	غلام الثقلین	سات روپے پچاس پیسے
اقوال زریں	مصطفیٰ احسن زیدی	پچاس پیسے
انارکلی	امتیاز علی تاج	دو روپے پچاس پیسے
آشا دیپ بجھ نا	ست پرکاش سنگر	دو روپیہ
ابراہیم لنکن	چندر موہن لانبہ	ایک روپیہ پچہتر پیسے
انسانیت موت کے دروازے پر	مولانا ابوالکلام آزاد	تین روپیہ پچاس پیسے
اصلی مکمل باورچی خانہ	جے سی داس ساجد	تین روپے پچاس پیسے
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	دو روپیہ پچاس پیسے
چھبیس سال بعد	امرتا پریتم	ایک روپیہ پچیس پیسے
حادثہ	قیسی رامپوری	پانچ روپے پچاس پیسے
خون	شہزادہ تبسم	چار روپے
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	دو روپے پچاس پیسے
رسیلی	شہزادہ تبسم	دو روپے پچاس پیسے
زمین کے چھالے	آزاد ملیح آبادی	تین روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ :- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲، دہلی

عبدالرشید انصاری۔ ناگپور

س۔ میری زندگی خوشیوں سے بھرپور ہے لیکن اِس بات کا ڈر ہمیشہ ستاتا رہتا ہے کہ کہیں یہ خوشیاں چھن نہ جائیں۔ بتایئے اِنھیں ہمیشہ برقرار رکھنے کے لئے کیا کروں؟

ج۔ اپنے دل پر ایسے بے بُنیاد اندیشوں کا سایہ بھی نہ پڑنے دیجئے۔

محمد عبدالرحیم خاں رحیم۔ نظام آباد

س۔ یہ مشہور ہے عروج کی انتہا زوال کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور مہنگائی کی انتہا کس کی ابتداء ہوتی ہے؟

ج۔ جب مہنگائی کی انتہا ہوگی اُس وقت یہ پُوچھئے گا۔ ابھی آپ یہ کہنے کے لئے تو زندہ ہیں ؎
زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں!

س۔ ترس ترس کر مرنا اچھا ہے یا آج کے دَور میں ایک دم مرجانا اچھا ہے؟

ج۔ آپ نے نہیں سُنا ــــ؟
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا!

قدیر لکھنوی۔ اجمیر شریف

س۔ مجھے اچانک راجہ مہدی علی خاں سے محبت ہوگئی ہے، کیا کروں؟

ج۔ آپ لکھنوی ہیں۔ نوابوں کے گہوارہ لکھنؤ میں آپ نے آنکھیں کھولی ہیں۔ آپ ہم سے زیادہ نوابوں اور راجہ مہاراجہ سے محبت کرنے کے آداب و انجام کو جانتے ہوں گے۔

نسیم الدین گھاتل۔ پیٹریا

س۔ عورتیں راستہ چلتے وقت نیچی نگاہ کر کے کیوں چلتی ہیں کسی گاڑی یا مرد سے ٹکرا جائیں تو؟

ج۔ ایسا نہیں ہوتا۔ روح کی آنکھیں جسم کی آنکھوں سے زیادہ دیکھتی ہیں۔

س۔ جانی دشمن کو کس طرح دوست بنایا جاسکتا ہے؟

ج۔ کبھی حُسنِ سلوک دشمن کو دوست بنانے کا اچھا طریقہ تھا لیکن موجودہ حالات نے اِسے غلط ثابت کر دیا۔

اسرارالحق لاری۔ میونا تھ بھنجن

س۔ آنجہانی لال بہادر شاستری اور صدر ایوب خاں کی ملاقات کس حد تک کامیاب ثابت ہوئی؟

ج۔ اِس کا انحصار تو آنے والے حالات اور عمل ہی پر ہے۔

س۔ ایسے لوگوں کا انجام جو آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے ہیں؟

ج۔ افسوسناک ہوتا ہے۔

ساجد اسلم۔ نانڈیروی

س۔ کیا وجہ ہے "بیسویں صدی" پر جس مہینہ کا نام ہوتا ہے اُس سے پندرہ بیس دن پہلے ہی منظرِ عام پر آجاتا ہے؟

ج۔ ایسا اِس لئے کیا جاتا ہے کہ "بیسویں صدی" پڑھنے والوں کو یہ بتایا جائے کہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑنا چاہیئے!

س۔ آدمی کب انسان بنتا ہے؟

ج۔ جب انسانیت کی قدروں کا احترام کرتا ہے۔

کبیر احمد۔ برہانپور

س۔ "بیسویں صدی" میں جو تصویریں شرماتے صفحوں پر ہوتی ہیں وہ "بیسویں صدی" کے خریدار ہی بھیج سکتے ہیں یا دوسرے لوگ بھی؟

ج۔ تصویریں بھیجنے کے لئے "بیسویں صدی" کا خریدار ہونا ضروری نہیں ہے۔

س۔ کھانے کے درمیان پانی پینا چاہیئے یا کھانا کھانے کے بعد؟

ج۔ کھانا کھانے کے بعد۔

عاشق ابراہیمی۔ ہزاری باغ

س۔ ہمارے پسندیدہ ادیب کرشن چندر اور پسندیدہ شاعر اقبال ہیں۔ اور آپ کے؟

ج۔ یہ ہماری اور آپ ہی کی پسند نہیں۔ ہزاروں کی یہی پسند ہوگی۔

س۔ اِن میں آپ کسے عظیم انسان سمجھتے ہیں؟ ــــ سائنسداں، ادیب، سیاست داں، فوجی، پروفیسر۔

ج۔ اب سے پہلے ہم سائنسداں، ادیب اور سیاست داں ہی کو عظیم انسان سمجھتے تھے لیکن مُلک کے حالیہ حالات نے بتایا کہ مُلک کی حفاظت کرنے والا سپاہی بھی عظیم انسان ہوتا ہے، بلکہ سب سے عظیم!

س۔ میری تحریر ناقص ہے۔ بتایئے اُسے کیسے سُدھاروں؟

ج۔ کسی جاننے والے کو اپنی تحریریں دکھایئے۔ اُس کی اصلاح اور ہدایات پر عمل کیجئے۔

ناصرہ اختر۔ راج محل

س۔ کیا آپ وجہ بتا سکتے ہیں کہ مجھے تنہائی میں کیوں سکون مِلتا ہے۔ میں اندھیرے اور ویرانے کو کیوں پسند کرتی ہوں؟

ج۔ آپ کے دل کی بات ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ ہاں، قیاس یہ بتاتا ہے کہ آپ اندھیرے کو پسند کرتی ہیں۔ اِس لئے زندگی کے حُسن کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اِسی لئے تنہائی اور ویرانی کو پسند کرتی ہیں۔

ریاض راہی۔ کٹک

س۔ ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم تاج محل کے ان دو اشعار میں کون سا شعر صحیح ہے؟

دامنِ دہر پہ اُس رنگ کی گلکاری ہے
جس میں شامل ہے ترے اور مرے اجداد کا خوں

سینۂ دہر کے ناسُور ہیں کہنہ ناسُور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

ج۔ دوسرا شعر صحیح ہے۔

ایم ایم نثار احمد نثار۔ وانم باڑی

س۔ جو گناہ کرکے خجل و منفعل ہو، ایسے انسان کو آپ کیا کہیں گے؟

ج۔ اُس انسان سے اچھا انسان جو عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

س۔ اگر میں افسانہ بھیجوں تو کیا آپ شائع کریں گے؟

ج۔ افسانہ "بیسویں صدی" کے معیار کا ہوگا تو بے شک شریکِ اشاعت کیا جائے گا اور گستاخی معاف! اگر ابھی آپ نو مشق ہیں تو "بیسویں صدی" کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔ "بیسویں صدی" پر مشقِ ستم نہ فرمائیں۔ پہلے کسی اُستاد سے استفادہ کریں۔

معین احمد عبدالجلیل۔ پونہ

س۔ "بیسویں صدی" کے کسی گزشتہ شمارے کی "سرگوشیاں" میں میں نے پڑھا تھا کویت کے ندیم صاحب کسی بھی بہن سے بھائی سے خط و کتابت کے متمنی ہیں۔ کیا آپ اُن تک میرا پتہ پہنچا دیں گے؟ تاکہ وہ مجھ سے خط و کتابت کر سکیں۔ میرا پتہ یہ ہے:۔

۲۳۶۔ ناناپیٹھ۔ پونہ نمبر ۲

ج۔ آپ کا پتہ درج کیا جا رہا ہے۔ طلیق صاحب توجہ فرمائیں۔

عبدالباری۔ وانمباڑی

س۔ بھیّا! بتایئے اگر انسان گناہ کرنے کا ارادہ کرے اور کسی وجہ سے وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے تو وہ گنہگار ہے کہ نہیں؟

ج۔ وہ اُس گناہ کے ارتکاب کا گناہ گار تو نہ ہوگا لیکن اقدامِ گناہ کا گناہ گار بے شک ہوگا۔

گیان چند کشتواڑ۔ ڈوڈہ۔ کشمیر

س۔ "بیسویں صدی" کا معیار؟

ج۔ "بیسویں صدی" آپ کے سامنے ہے۔

س۔ خودکشی اور لیڈری میں کیا فرق ہے؟

ج۔ معاف کیجئے گا آپ کا یہ سوال بالکل بے ربط اور بے معنی ہے۔ بھلا لیڈری اور خودکشی سے کیا واسطہ؟ ہاں، ایسے بہت سے لیڈر ہیں جن کی تقریریں سن کر سننے والے خودکشی کر لینا چاہتے ہوں گے۔

س۔ کیا آپ خوشامد پسند ہیں؟

ج۔ ہم خوشامد پسند ہوتے تو بغیر خوشامد کے آپ کے اِس سوال کا جواب ہرگز نہ دیتے۔

رکن الدین سعید۔ بھٹکل

س۔ اشتعال انگیز بیانات اور اتحاد شکن خیالات کی موجودگی میں قومی یکجہتی کا محل تعمیر ہونا ناممکن ہے؟

ج۔ کاش! ہمارے ناعاقبت اندیش سربراہ اِس حقیقت کو سمجھ سکیں۔

س۔ بعض مرکزی وزراء امورِ مملکت کے لئے جو قنطیوں کی خدمات حاصل کرکے توہم پرستی کا شکار کیوں ہوتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ ایسے اربابِ حکومت کی تجوریاں بھری ہوتی ہیں لیکن اُن کے ذہن فہم و فراست سے خالی ہوتے ہیں۔

س۔ ترقیاتی منصوبوں کی بھرمار ہے لیکن یہ مکروہ اشیاء کی گرانی آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور عوام زندگی سے بیزار ہو رہے ہیں۔ یہ کیسی شعبدہ بازی ہے؟

ج۔ رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!

حبیب احسن۔ گورکھپور

س۔ جب اپنے پرائے ہو جائیں، جب زندگی کا آخری سہارا آنکھوں سے اوجھل ہو جائے اور ہر طرف یاس و ناامیدی نظر آنے لگے تو ایسے میں انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اِس حقیقت پر یقین رکھنا چاہئے ——

ناخدا جس کا نہ ہو اُس کا خدا ہوتا ہے

س۔ میں جب بھی پھولوں کو گلے کا ہار بنانا چاہتا ہوں تو مجھے کانٹوں سے اُلجھنا پڑتا ہے۔ بتایئے میں کیا کروں!

ج۔ پھولوں کو پانے کے لئے کانٹوں سے اُلجھنا لازمی ہے۔ آپ نے کبھی گلاب کے پھول نہیں دیکھے؟

محمد عبدالسلیم۔ نارائن کھیڑ

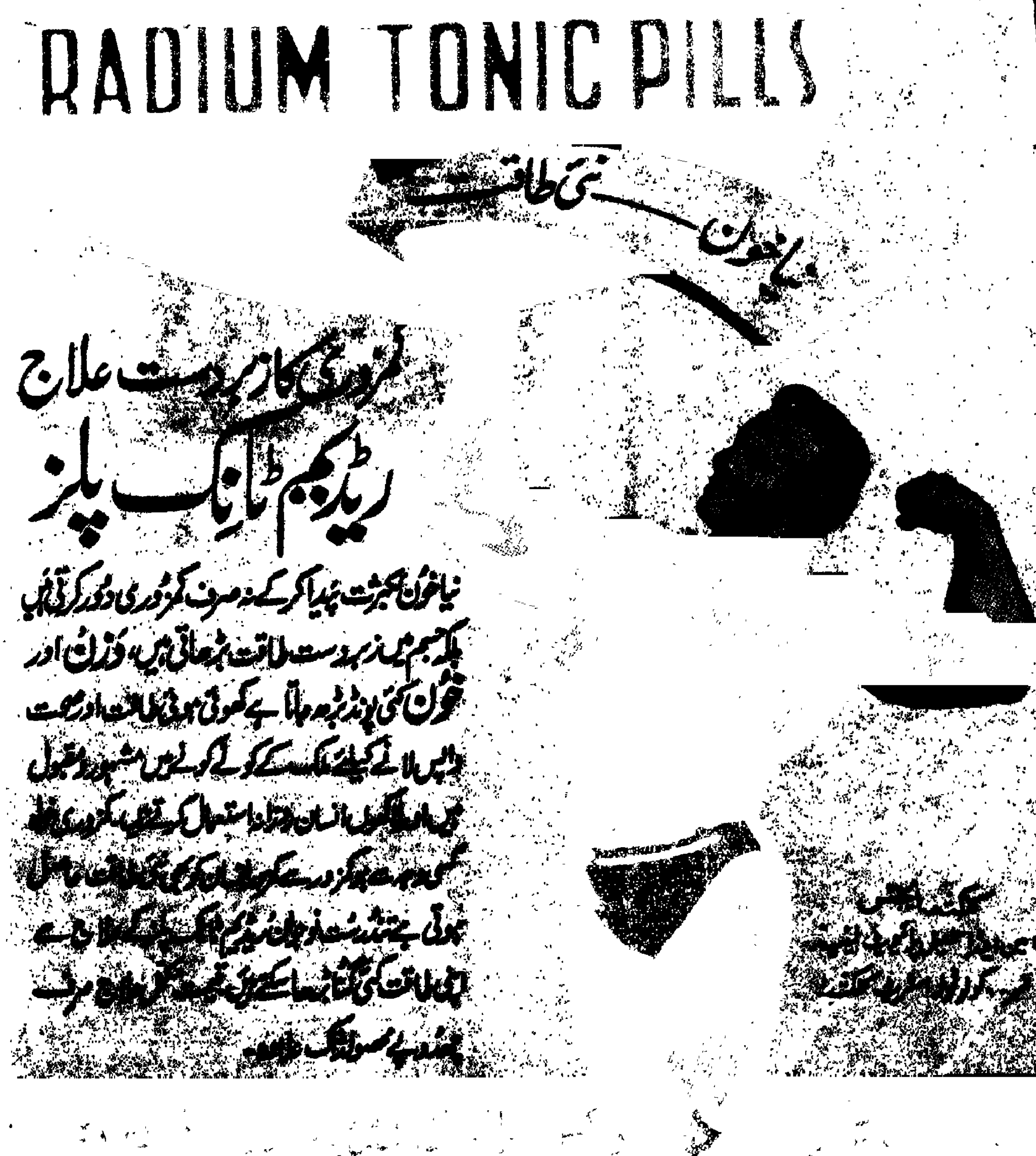
س۔ زندگی میں ایک نیا انقلاب لانے کے لیے کیا کیا جائے؟

ج۔ یقینِ محکم کے ساتھ جہدِ پیہم!

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی —— مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائیٹل و تصاویر: برنٹ پریس صدر بازار دہلی —— پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج دہلی


RADIUM TONIC PILLS

B
BISWIN SADI
20 TH YEAR OF PUBLICATION
Telephones Office 271637 Residence 619927



دسمبر



برقِ نگاہِ ناز کا رُخ ہے تری طرف

اے آسمان تیرے فرشتوں کی خیر ہو ——— بسمل سعیدی

فوٹو: ایس شاہ علی، حیدرآباد



آپ ہیں اُردو کے محبوب شاعر حضرت ساغر نظامی جن کی جادو بھری شاعری کی نغمگی اور روانی اپنا جواب آپ ہے۔ حضرتِ ساغر نے اُردو شاعری کے پیکر میں جو سرمستی اور جوانی سموئی ہے وہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جو اُردو شاعری کی تاریخ میں ساغر کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ سُنیئے ساغر صاحب نغمہ سرا ہیں اور جناب عابد علی جعفری ممبر پارلیمنٹ، جنرل شاہنواز اور جناب گوپی ناتھ آمن ہمہ تن گوش ہیں ؎

ہاں راز وہی ہے جو عیاں ہونے نہ پائے — وہ لاکھ کہیں اور بیاں ہونے نہ پائے
جس نے ترے سینے کو کیا جنتِ آغوش — یہ پھول کبھی نذرِ خزاں ہونے نہ پائے
جس دل پہ زمانے کی جفا بیت گئی ہے — وہ دل ابھی بیتاب و تواں ہونے نہ پائے
رُسوائی ہے آنکھوں سے لہو بن کے ٹپکنا — آنسو تو وہی ہے جو رواں ہونے نہ پائے
جو رمزِ وفا مجھ سے عیاں ہونے نہ پائے — اے کاش وہ اُن سے بھی بیاں ہونے نہ پائے
گر ہو نہ تری چشمِ غزالیں کا سہارا — یہ جائزۂ کون و مکاں ہونے نہ پائے
معصوم تمنا سے مرے خواب ہیں زندہ — اے کاش تمنا یہ جواں ہونے نہ پائے
یہ جبر ہے اے عشق کہ آدابِ محبت — اِک حرفِ تمنا بھی بیاں ہونے نہ پائے
نفرت ہی پہ موقوف نہیں ظرف تو یہ ہے — آنکھوں سے محبت بھی عیاں ہونے نہ پائے

جو لفظ ہے افسانۂ افسوں کا خلاصہ
افسوس وہی لفظ بیاں ہونے نہ پائے



برقِ نگاہِ ناز کا رُخ ہے تری طرف
اے آسمان تیرے فرشتوں کی خیر ہو ——— بسملؔ سعیدی

فوٹو : ایس شاہ علی۔ حیدر آباد



آپ ہیں اُردو کے محبوب شاعر حضرت ساغر نظامی جن کی جادو بھری شاعری کی نغمگی اور روانی اپنا جواب آپ ہے۔ حضرت ساغر نے اُردو شاعری کے پیکر میں جو سرمستی اور جوانی سموئی ہے وہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جو اُردو شاعری کی تاریخ میں ساغر کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ سُنئے ساغر صاحب نغمہ سرا ہیں اور جناب عابد علی جعفری ممبر پارلیمنٹ، جنرل شاہنواز اور جناب گوپی ناتھ آمن ہمہ تن گوش ہیں ؎

ہاں راز وہی ہے جو عیاں ہونے نہ پائے — وہ لاکھ کہیں اور بیاں ہونے نہ پائے
جس نے ترے سینے کو کیا جنتِ آغوش — یہ پھول کبھی نذرِ خزاں ہونے نہ پائے
جس دل پہ زمانے کی جفا بیت گئی ہے — وہ دل ابھی بیتاب و تواں ہونے نہ پائے
رُسوائی ہے آنکھوں سے لہو بن کے ٹپکنا — آنسو تو وہی ہے جو رواں ہونے نہ پائے
جو رمزِ وفا مجھ سے عیاں ہونے نہ پائے — اے کاش وہ اُن سے بھی بیاں ہونے نہ پائے
گر ہو نہ تری چشمِ غزالیں کا سہارا — یہ جائزۂ کون و مکاں ہونے نہ پائے
معصوم تمنا سے مرے خواب ہیں زندہ — اے کاش تمنا یہ جواں ہونے نہ پائے
یہ جبر ہے اے عشق کہ آدابِ محبت — اِک حرفِ تمنا بھی بیاں ہونے نہ پائے
نفرت ہی پہ موقوف نہیں ظرف تو یہ ہے — آنکھوں سے محبت بھی عیاں ہونے نہ پائے

جو لفظ ہے افسانہ و افسوں کا خلاصہ
افسوس وہی لفظ بیاں ہونے نہ پائے



غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ

نامور افسانہ نگار سلمیٰ صدیقی ، مشہور پولش فلم سٹار بی آنا ، عظیم افسانہ نگار کرشن چندر ، مس ای وا



بمبئی میں ادیبوں کے ساتھ

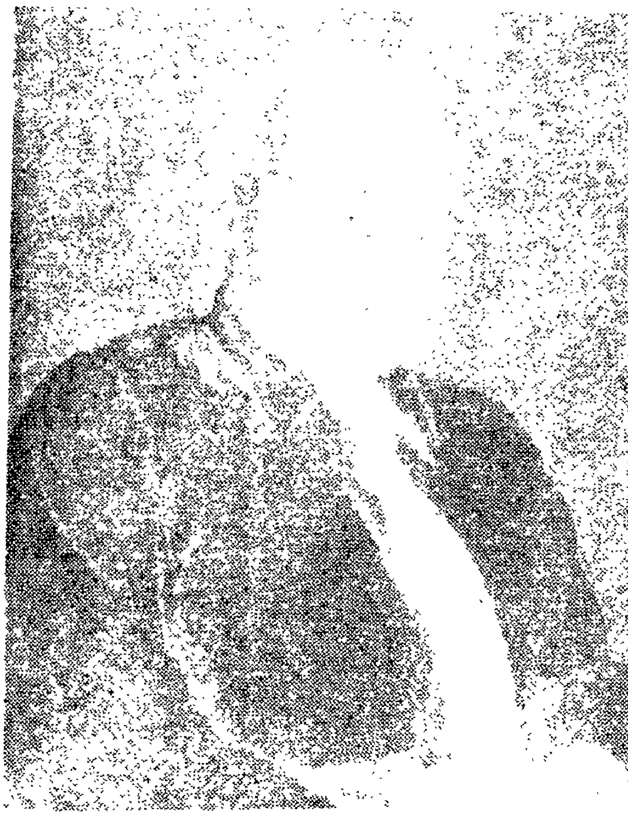
مہندر ناتھ :- حال ہی میں ایک اچھی فلم محض اِس لئے فیل ہوگئی کہ وہ عوامی زبان اُردو کی بجائے ثقیل ہندی میں لکھی گئی۔ اُردو کی مقبولیت کا یہ بیّن ثبوت ہے ؞

اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" :- انتخابات سے پہلے اگر اُردو کے حقوق تسلیم نہ کئے گئے تو بعد میں بہت دشواری ہوگی ؞

خوشتر گرامی :- اُردو کو جائز مقام دلانے کے لئے میں اور جناب جمنا داس اختر مدیر "سویرا" دہلی زیادہ سے زیادہ قربانی دینے کے لئے تیار ہیں ؞

ضیا فتح آبادی :- جب تک سرکاری دفاتر میں اُردو کی حوصلہ افزائی نہ ہوگی، اُردو ترقی نہیں کر سکتی ؞

ڈاکٹر سید حسین حیدر کا انتقالِ پُر ملال



۱۱؍اکتوبر کی شب کو نو بجے میں اپنی بیوی کے ہمراہ بمبئی میں اپنی عزیزہ بہن طاہرہ بیگم بیگم صاحبہ محترم راجہ مہدی علی خاں مرحوم کے ہاں بیٹھا تھا کہ دہلی سے بنیجر "بیسویں صدی" کا تار ملا کہ "آپکے عزیز بھائی ڈاکٹر سید حسین حیدر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے" ——— یہ رنجیدہ سطور پڑھتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ دل ڈوب گیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ راجہ بھیا کی جدائی کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ایک اور مخلص عزیز مجھے ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گیا ———

ڈاکٹر سید حسین حیدر خلوص و اخلاق کے پیکر، بہت نیکدل اور خدا پرست انسان تھے۔ دوستوں کے وہ جاں نثار مخلص دوست تھے۔ اُن کا انتقال میرے لئے ایک المناک سانحہ اور اُن کی جدائی ایک ناقابلِ برداشت صدمہ ہے۔ وہ اب اِس دنیا میں نہیں رہے۔ اُن کی یاد مجھے ہمیشہ رُلاتی رہیگی ؎ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مرحوم میسرز اے۔ ایچ۔ وھیلر اینڈ کو الہ آباد کے کاروبار کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لئے عمر بھر اپنی تمام تر کوششوں کو جانفشانی سے بروئے کار لاتے رہے۔ اردو علم و ادب کی جتنی خاموش خدمت میرے بھائی ڈاکٹر سید حسین حیدر نے کی اور کوئی کیا کریگا۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ آج ویلر ریلوے بکسٹالوں پر ہندی، انگریزی او دوسری زبانوں کے لٹریچر کے علاوہ لاکھوں روپے ماہوار کی سیل اُردو رسائل و کتب کی ہے جو محترم ڈاکٹر صاحب کی شب و روز محنت اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اُردو علم و ادب سے عشق کے درجہ تک محبت تھی۔ وہ اُردو اور انگریزی کے ادیب بھی تھے۔ اخبارات، رسائل اور ناشرین سے اُن کے بہت قریبی اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ مدیر "بیسویں صدی" سے اُن کے ہم سالہ برادرانہ تعلقات کچھ اس قسم کے تھے جیسے ہم دونوں ایک ہی کنبے اور ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔ وہ ایک معمولی ٹائپسٹ کلرک کی حیثیت سے اپنی محنت اور نیک نیتی کی بدولت ترقی کرتے کرتے جنرل منیجر کی پوزیشن تک پہنچ گئے ——— وہ کاروبار کے سلسلہ میں ۱۱؍اکتوبر کی صبح الہ آباد سے دہلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے ٹیکسی میں سوار ہو کر جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے تو اُن پر اختلاجِ قلب کا حملہ ہوا اور طبی امداد ملنے سے پہلے ہی حرکتِ قلب بند ہونے سے اُن کی موت ہو گئی۔ رات کو اُن کی لاش بے کسی کی حالت میں دلی سے الہ آباد پہنچائی گئی ——— خدائے برتر کی رضا کے سامنے انسان بالکل بے بس اور لاچار ہے مگر پے در پے ہولناک صدمات سے مدیر "بیسویں صدی" کی کمر ٹوٹ گئی ہے اور وہ اب بے یار و مددگار، شکستہ دل اور بے پر ہو کر رہ گیا ہے ——— میں خداوندِ کریم سے دست بدعا ہوں کہ وہ میرے بھائی ڈاکٹر سید حسین حیدر کو آغوشِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے فرزند عزیزی سید عباس حسینی مدیر "روحانی دنیا" الہ آباد اور اُن کے دوسرے صاحبزادوں اور تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

سوگوار ——— خوشتر گرامی

... جن کی قیمت دو روپے فی پرچہ ...

ایڈیٹر، خوشتر گرامی

دسمبر ۱۹۶۶ء

جلد ۳ — شمارہ ۱۲

ٹیلیفون دفتر ۲۶۱۶۳۷

ٹیلیفون رہائش ۶۱۹۹۲۷



سالانہ قیمت ...

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ پچیس پیسے



"لیڈر طلباء کے سامنے صاف ستھری مثال پیش کریں" ڈاکٹر رادھا کرشنن ——— کیا خوب۔ عہدوں کے لئے لڑنے اور ناجائز طریقوں سے کمانے کھلانے کی تمام بھونڈی مثالیں ترک کر دیں۔

"برتھ کنٹرول کے ذریعہ آبادی میں کمی" ایک عنوان ——— اس کی کیا ضرورت ہے۔ ویتنام کی طرز کی دو چار لڑائیاں شروع کرا دی جائیں بس مسئلہ حل ہو جائے گا۔

"پنجاب کے حلوائیوں پر پابندی" ایک عنوان ——— کہ وزیروں کی دعوتوں میں مٹھائی سپلائی نہ کریں۔

"خوراک کا مسئلہ" ایک عنوان ——— روٹی نہ کھانے سے حل ہو سکتا ہے۔

"الہ آباد کے دیہات میں گھاس کی چپاتیاں" ایک خبر ——— ہندوستان میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی۔ امریکہ اور روس پیروی کریں۔

"بمبئی کے ساحل پر دو لاکھ کی چاندی پکڑی گئی" ایک خبر ——— جہاز میں سوار ہو کر بھاگ رہی ہوگی۔

"۲۵ برس میں دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچ جائے گی" ایک مقالہ ——— جیسے اِس وقت بڑی خوشحالی کی منزل پر ہے۔

"شام کی ترقی کے لئے سوویت روس کی امداد" ایک عنوان ———

صبح کی ترقی کے لئے امریکہ سے
دوپہر کی ترقی کے لئے برطانیہ سے
تیسرے پہر کی ترقی کے لئے مغربی جرمنی سے
اور رات کی ترقی کے لئے جاپان سے

امداد حاصل کی جائے۔

"یو۔پی میں اناج کی پیداوار دگنی کی جائے گی" ایک عنوان ——— ہو جائے گی بشرطیکہ لیڈروں کے جھگڑے تگنے نہ ہو گئے۔

"کیا یہی حب الوطنی ہے" ایک عنوان ——— کہ جسے دیکھو عہدوں کے لئے لڑ رہا ہے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" ایک عنوان ——— کم سے کم ایک وزارت —— باقی کچھ ہم خود پیدا کرلیں گے، اور کچھ حاشیہ بردار، چاپلوس اور مفاد پرست فراہم کر دیں گے۔

"امریکہ قیام امن کے لئے اپنی تمام قوتیں بروئے کار لائے گا" ایک عنوان ——— مگر بذریعہ ایٹم بم۔

"ٹیچروں کی بھوک ہڑتال" ایک خبر ——— خوراک میں خود کفالتی کی مہم میں رضاکارانہ تعاون۔

"ہندوستان کے مختلف اداروں میں غیر ملکی ماہرین کام کر رہے ہیں" ایک عنوان ——— اور ہندوستانی ماہرین دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

"بہار میں خشک سالی" ایک عنوان ——— لیڈری کے میدان میں نہیں غذائی معاملے میں۔

"حکومت یو۔پی نے تعلیمی اداروں کی امداد بند کر دی" ایک خبر ——— اور وزیر تعلیم کو تنخواہ ملتی رہے گی۔ وہ بند نہیں ہوگی۔

"طلباء کی بدنظمی مایوسی کا نتیجہ ہے" ایک عنوان ——— جی ہاں، ۷۰۔۸۰ سال کے لیڈر بھی لیڈری کا میدان نہیں چھوڑتے۔

"دواؤں کے لئے سمندروں کی تلاش" ایک عنوان ——— تاکہ پانی آسانی سے ملایا جا سکے۔

"۱½ کروڑ کی لاگت سے کشمیر میں پل" ایک خبر ——— کیا خواجہ غلام محمد صادق اور بخشی غلام محمد کو ملانے کے لئے۔

"تشدد سے ملک کو بھاری خطرہ" پنڈت سری رام شرما کا بیان ——— اور آپ کی لیڈری سے کیا ہلکا خطرہ ہے۔



"بھارت پہلے سے زیادہ طاقتور ہے" ایک عنوان ——— اِس لئے کہ اب مسٹر کرشنا مینن ڈیفنس منسٹر نہیں ہیں۔



مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے جن سنگھی اخباروں میں جن سنگھ اور مسلمانوں کے عنوان سے مضامین کی بھرمار

"تنگ نظری میں سب سے آگے" ایک عنوان ـــــــ اگر خلائی تحقیقات اور سائنسی ایجادات میں آگے نہ نکل سکیں تو کیا تنگ نظری میں پیچھے رہیں۔

"موجودہ تعلیمی نظام میں تبدیلی کی ضرورت" ایک عنوان ـــــــ اور ایسا بنایا جائے جس میں اُستاد پڑھیں اور طلباء پڑھائیں۔

"امریکہ ہندوستان کو مزید اناج مہیا کرنے کے لئے تیار" ایک خبر ـــــــ صرف خبر نہیں خوشخبری۔ اب کہئے زور سے۔ اے امریکہ! تیرا شکریہ۔

"آئندہ انتخابات میں وزیر سے جانی واکر کا مقابلہ ہوگا" ایک خبر ـــــــ اور کیا وسکی، جن، رم وغیرہ صرف ووٹ ڈالیں گی؟

"لال کنویں پر آگ لگنے کا حادثہ" ایک خبر ـــــــ اور کنواں اُسے نہیں بجھا سکا۔

"پرانی دُنیا مٹ رہی اور نئی دُنیا نمودار ہو رہی ہے" ڈاکٹر رادھا کرشنن ـــــــ مگر پرانی لیڈر شپ نہیں ہٹ رہی اور نئی لیڈر شپ مایوس ہو رہی ہے۔

"طلباء کی بے چینی کیسے دُور کی جاتے؟" ایک مسئلہ ـــــــ انھیں آزادی ہو کہ:-

جب چاہیں کلاس میں آئیں جب چاہیں چلے جائیں۔
ماسٹر، پروفیسر، پرنسپل اور وائس چانسلر کو دھمکا سکیں۔
ضرورت ہو تو اُستادوں کی داڑھی پکڑ سکیں۔
ہڑتال کر سکیں، مظاہرہ کر سکیں، جلسہ کر سکیں، فرنیچر توڑ پھوڑ سکیں۔
ماں باپ سے فیس، کتابوں، کاپیوں، یونیفارم، پک نِک ـــ اور آؤٹنگ کے نام پر رقم اینٹھ سکیں۔
اور ـــ سال کے آخر میں ڈگری مل جایا کرے۔

"پانچ جانیں ضائع ہوگئیں" ایک خبر —— نہیں صاحب! پانچ آدمی اس دَور کی بُرائیاں دیکھنے سے بچ گئے۔

"یو۔پی میں اناج کی پیداوار" ایک عنوان —— لیڈروں کی پیداوار سے کم ہے۔

"اب بندروں کی شامت آنے والی ہے" ایک عنوان —— انسان اپنی باری دے چکے ہیں۔

"منجن پورہ میں مٹھائی کی دوکانیں لُوٹی گئیں" ایک خبر —— تو کیا وہاں منجن کی دوکانیں نہیں تھیں؟

"کانگریس کے بعد جن سنگھ ہی مُلک میں ایک جمہوری اور مضبوط حکومت قائم کرسکتی ہے" مدھوک کا دعویٰ —— یہ مُنہ اور مسور کی دال۔

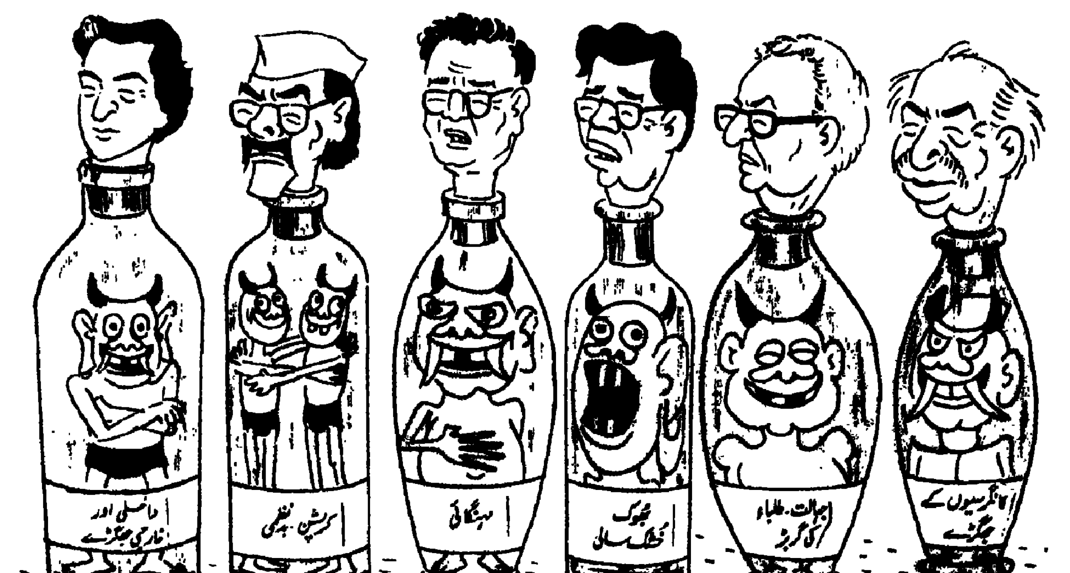
"یو۔پی میں امن" ایک عنوان —— جی نہیں۔ ایک زمانہ گزرا کہ انھوں نے یو۔پی کو چھوڑ دیا۔ اب امن دِلّی میں ہیں اور اسی لئے یو۔پی بد امنی کا شکار ہے۔

"سہ طاقتی کانفرنس کامیاب رہی" ایک خبر —— جامع مسجد کی مچھلی، انڈا، مرغی مارکیٹ گواہ ہے جہاں سے مُرغ اور مچھلیاں سپلائی ہوئیں۔

"انتخابی سمجھوتے" ایک عنوان —— ساجھے کی ہانڈی —— جو چوراہے میں پھُوٹے۔

"جن سنگھ اور مسلمان" ایک عنوان —— دونوں میں کوئی جوڑ نہیں۔

"خشک دودھ کا تحفہ" ایک عنوان —— جو خشک گائیوں نے دیا۔



"پرانے مسائل" ایک عنوان —— مگر نئی بوتلوں میں

پنجاب ایک سے دو ہوئے اور دو سے تین ۔ تیسرے پنجاب کی چیف منسٹری کا قرعہ فال جس کے نام پر پڑا وہ سروقد، دوہرے جسم، بڑی بڑی آنکھوں اور کھدر ہی کی طرح سفید داڑھی والا صوفی منش، کھدر پوش پنجاب کا جانا پہچانا ——————

ہے ۔ ادھوالی ضلع کیمبل پور میں پیدا ہوا ۔ سیاست کے خارزاروں سے گزرتا ہوا ایک دن چنڈی گڑھ پہنچا تو سردار سورن سنگھ نے اِس کے سر پر پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ کا تاج رکھ دیا اور سب پنجابی لیڈروں نے واہ واہ کر کے اتفاق رائے سے اِس کی تصدیق کر دی ۔ میٹھا ہے بہت میٹھا ۔ ملنے والا بات کر کے مطمئن لوٹتا ہے ، ہونٹ چاٹتا ہوا ۔ سیلف میڈ، قابلِ تعریف، نیک دل انسان ۔ اپنی زندگی اور شخصیت کی خود تعمیر کی ۔ فیکٹری ورکر کی حیثیت میں آغاز کیا ۔ ٹیچر بنے ۔ اکالی دل اور شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سکریٹری رہے ۔ اکال تخت میں جتھیداری کی ۔ ممبر پارلیمنٹ رہے ۔ اخبار نویسی فرمائی ۔ کہانیاں اور افسانے لکھے ۔ افکار کو شعر کے قالب میں ڈھالا ۔ دو بار پنجاب کانگریس کے صدر رہے اور —————— اب نظم و نسق سنبھالا ہے ۔ خدا خیر کرے ع



پُرانی رسم

رضاء الجبار، ایم۔کام، ایل۔ ایل۔ بی

یونیورسٹی ہاسٹل "بی" روڈ، چرچ گیٹ، میرین ڈرائیو۔ بمبئی نمبر ا

۱۲ اگست ۱۹۶۶ء   ڈیر خوشتر بھائی! تسلیمات

... راجہ مہدی علی خاں کے انتقال پُرملال پر آپ نے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اُس سے آپ کے رنج و غم کی گہرائیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مجھے بے اختیار وہ آخری ملاقات یاد آرہی ہے جو اُن کی موت سے تقریباً ایک ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اُس ملاقات میں بار بار آپ کا ذکر آیا تھا اور میں نے اُس سے بھی اندازہ لگایا تھا کہ آپ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بہت قریب کی راہ ہے۔ راجہ صاحب کا خلوص اور برتاؤ بے حد دل موہ لینے والا تھا۔ چند ہی ملاقاتوں نے مجھ پر بہت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ لوگوں کو ہنسانے والے مہدی نے اپنی موت کے سانحے سے سب کو رُلایا ہے۔ اُن کی باغ و بہار شخصیت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اِس کا پُر ہونا اب کوئی آسان بات نہیں ہے ــــــ ایک تازہ افسانہ "پُرانی رسم" جو ایک مقصد کو لے کر لکھا ہے بھیج رہا ہوں ــــــ گزشتہ افسانہ نمبر میں حنیف چودھری (ملتان، مغربی پاکستان) کے افسانے "رُسوائی" کے بارے میں مجھے کچھ خطوط ملے تو میں نے اُس جانب توجہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ موصوف کا افسانہ میرے ڈیڑھ برس پہلے شائع ہوئے افسانہ "پندرہ سال بعد" (جنوری ۱۹۶۵ء) کی نقل ہے۔ واقعات کا تسلسل وہی ہے، پس منظر کی باتیں وہی ہیں اور افسانے کا اختتام بھی وہیں ہوتا ہے۔ کرداروں کے نام کی تبدیلی اور کچھ الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ اکثر جملے بھی میرے اپنے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے ــــــ سالنامہ جنوری ۱۹۶۵ء کے صفحہ ۶۲ پہلے کالم اور بائیسویں سطر میں میں نے لکھا ہے "پندرہ سولہ برس بہت طویل وقفہ ہے سوچو بھیا! اِس عرصہ میں کیا نہیں ہوجاتا۔ زمانہ بدل جاتا ہے، حکومتیں بدل جاتی ہیں، لوگوں کی صورتیں تک تبدیل ہوجاتی ہیں۔ وقت ماضی کے نشانوں کو کھُرچ کھُرچ کر مٹا دیتا ہے" ــــــ اب افسانہ نمبر جولائی ۱۹۶۶ء کے صفحہ ۱۳۱ پر دسویں سطر سے قابل افسانہ نگار حنیف چودھری (بی۔اے) لکھتے ہیں: "پندرہ سال کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوتا۔ حکومتیں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے۔ لوگوں کی صورتیں تک بدل جاتی ہیں۔ وقت ماضی کے نشانوں کو کھُرچ کھُرچ کر مٹا دیتا ہے" ــــــ یہ سب میں آپ کو محض اطلاعاً لکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مُلک کی تقسیم کے بعد سے ایسے ذہین لوگ بہت اُبھر رہے ہیں لیکن حیرت ہے کہ یہ افسانہ اُنھوں نے "بیسویں صدی" ہی کو بھیجا ہے۔ ظفر اوگانوی کے الفاظ میں اپنی آواز ملا کر میں بھی سوچ رہا ہوں "اس دھاندلی کا سدِّ باب ہونا چاہئے" ایسی دھاندلیوں کی مزید تفصیلات آئندہ لکھوں گا ...

آپ کا بھائی ــــــ رضاء الجبار

تحریر کے آئینے میں میں نے اُس خط لکھنے والی نوجوان عورت کی تصویر دیکھی تو تڑپ کر رہ گیا۔ وہ تحریر نہیں تھی، سماج کی نبض پر رکھی ہوئی حساس انگلیاں تھیں! منظر عام پر آنے ہوئے میرے افسانوں پر قارئین کے بہت سے خطوط آیا کرتے ہیں جنہیں میں کبھی دلچسپی سے اور کبھی بے پروائی سے دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن وہ خط دوسرے خطوں سے کتنا مختلف تھا۔ میری روح کے اُس نے یوں ٹکڑے کر دیئے جیسے آرے سے لکڑی کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ اپنی اُداس کہانیوں میں بے انتہا کوشش کے باوجود میں نے کبھی وہ تاثیر پیدا نہیں کی جو اُس خط میں آشا نے پیدا کر دی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میری کہانیاں میرے ویران دل میں گرنے والے خزاں زدہ پتّوں کی آوازیں ہوتی ہیں۔ یہ آوازیں حقیقت سے مشابہت رکھتی ہیں۔ لیکن آشا رانی کی تحریر مشابہت کو نہیں حقیقت کو چھو رہی تھی۔ حقیقت ایک جامع اور ٹھوس کیفیت کا نام ہے۔ اس لئے میں نے اُس حقیقت کو دیکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ اُن حساس انگلیوں کے لمس کو اپنا کر سماج کی نبض کی حرکتوں کو سمجھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ آشا رانی کے خط کے کچھ الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔

"۔۔۔ جب میں اٹھارہ برس کی تھی تو میرے ماں باپ نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دی تھی۔ ایک برس کے بعد وہ بھگوان کو پیارے ہو گئے اور ڈیڑھ برس کے بعد میرے پتی بھی چل بسے۔ اب میں نصیب کی کھوٹی اس گاؤں میں چھوٹے بچّوں کو پڑھا کر اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں لیکن آپ آکر دیکھئے کہ میں کتنی مجبور ہوں۔ میرے نہ چاہنے پر بھی میرے اردگرد بہت سی کہانیاں دھڑکتی اور سسکتی ہیں۔ میری خوبصورتی جسے میں نے بھگوان سے نہیں مانگا تھا بہت سے فتنوں کو جگاتی ہے۔ بھیا! میں آپ سے قسم کھا کر کہتی ہوں میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ نرک کی آگ میں جل رہی ہوں۔ آپ کو یہاں بہت سی کہانیاں ملیں گی۔۔۔"

اُس حقیقت کو دیکھنے کے لئے میں اُس سفر پر چل نکلا۔ کچے اور ناہموار راستوں کو طے کر کے، پتلی پتلی پگڈنڈیوں کو پھلانگ کر میں بس اسٹینڈ سے پیدل چل کر آشا کے بتائے ہوئے پتے پر آگیا۔ اُس گاؤں کو پہچاننے میں مجھے دیر نہ لگی کیونکہ آشا نے لکھا تھا، جہاں وہ رہتی ہے وہ گاؤں اونچی اونچی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں بہت سے گڑھے ہیں۔ آڑے ترچھے راستوں پر نوکدار پتھر پڑے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ آشا ہی کا گاؤں تھا جہاں آشا رہتی ہیں وہاں کے گاؤں ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مسلسل چلنے کے باعث اور ٹھوکریں کھاتے کھاتے میں بہت تھک گیا تھا۔ میرے ساتھ کوئی سامان نہ تھا۔ ایک چھوٹا سا بیگ میرے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ مجھے وہ بھی بے انتہا وزنی محسوس ہونے لگا لیکن آشا سے ملنے کی خوشی میری رگ و پے میں دوڑ کر مجھے ایک قوت دے رہی تھی۔ اس لئے میں اپنے ہی بوجھ کو نہیں، اُس چھوٹے سے بیگ کو بھی سنبھال رہا تھا۔ پھر دُور سے مجھے ایک بھینس آتی ہوئی دکھائی دی۔ فاصلہ کسی قدر کم ہوا تو معلوم ہوا وہ بھینس نہیں ہے، ایک کالا کلوٹا آدمی کالے کپڑے پہنے بڑا سا پیٹ سنبھالے ڈولتا ہوا آرہا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ آدمی تھا کیونکہ آشا کا پتہ پوچھنے کے لئے مجھے کسی آدمی کی رہنمائی چاہیئے تھی۔ وہ قریب آگیا تو میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"میں راجا ہوں۔ کہانی کار راجا ہوں۔ مجھے آپ کی تھوڑی سی رہنمائی چاہیئے۔"

وہ آدمی ایک دم غصّے سے بھڑک گیا اور چلّا کر بولا۔

"میں اس علاقے کا پٹواری ہوں۔ اپنے پٹے میں پٹواری ہی راجا ہو سکتا ہے اور کوئی نہیں۔"

میں تھکن سے بوجھل ہو گیا تھا اور اس غیر متوقع غصّے سے بوکھلا گیا۔ اس لئے نرمی سے بولا "میری بات بُری لگی ہے تو معاف کر دیجئے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ کیا آپ آشا بہن کا پتہ بتائیں گے؟"

"کون آشا؟" پٹواری نے پوچھا۔ میری نرمی سے اُس کا غصّہ کم ہو رہا تھا۔

"وہی آشا رانی۔" میں نے اپنا بوجھ زمین پر رکھ کر کہا۔ "جس کا بیاہ اُس کے اٹھارہویں برس میں ہوا تھا اور ڈیڑھ برس کے بعد وہ بیوہ ہو گئی۔ تب سے وہ چھوٹے چھوٹے بچّوں کو پڑھا کر اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ دو برس سے اسی گاؤں میں بچّوں کو پڑھا رہی ہے۔"

"اوہ آشا! استانی کہو!" پٹواری زور سے ہنسا اور پوچھا "آپ کون ہوتے ہیں اُس کے؟"

"میں آشا کا بھائی ہوں۔ آشا کا کہانی کار بھائی۔"

"اوہ آشا کے بھائی ہو!" پٹواری بڑی دلچسپی سے بولا "تو چلئے آپ میرے گھر چلئے۔ میں کوئی غیر نہیں ہوں۔ یہ سامنے میرا گھر ہے۔ تھوڑا آرام کیجئے تب میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر آشا رانی سے ملانے لے چلوں گا۔"

پٹواری کی بات میں ٹال نہ سکا کیونکہ میں بہت تھک گیا تھا۔ پٹواری کا گھر چند ہی قدم کے فاصلے پر تھا۔ گھر لے جا کر اُس نے میری خاطر تواضع کی اپنے گھر کا سامان دکھانے لگا۔ اُس نے بتایا اُس کے پاس اصلی گھی سے بھرے ہوئے کتنے مٹکے ہیں، کتنا بڑا ذخیرہ چاولوں کا ہے اور کتنے زیورات اور پیسے ہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ آشا رانی

کے نام کا کیسا جادو ہے کہ یہ پٹواری مجھ پر یکایک مہربان ہی نہیں ہو گیا اپنی تمام پوشیدہ دولت بھی بتا رہا ہے۔ لیکن میری حیرانی یکایک ختم ہو گئی جب پٹواری نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"بہت لوگ دُنیا میں ایسے ہوتے ہیں جنھیں ایک دن کا کھانا حاصل کرنے کے لئے تین تین دن تک محنت کرنی پڑتی ہے۔ لوگوں کی خوشامد کرنا اور ہاتھ جوڑنا پڑتا ہے لیکن ایک میں ہوں کہ ہر روز چار چار آدمیوں کو کھانا کھلا دیا کروں تو کوئی کمی نہ ہو۔ پھر بھگوان کی دیا سے میرے ہاں تین گھر ہیں۔ شہر میں ایک، اگلے گاؤں میں دوسرا اور یہ تیسرا!"

پھر پٹواری نے زور سے نوکر کو آواز دی: "ابے اوئے کتنی دیر لگائے گا! پوری لے آ پوری! بڑے ڈبے کا اصلی گھی لگانا!"

نوکر نے جواب دیا، وہ لا رہا ہے۔ پٹواری نے اسی رازدارانہ انداز میں کہا۔

"میں نے آشا رانی سے ایک بار کہا تھا کہ وہ اگلے گاؤں کے میرے گھر میں چل کر رہے۔ راج کرے گی۔ اب تو نام کی رانی ہے تب سچ مچ رانی بن جائے گی۔ نوکر چاکر ہوں گے، سب ہی آرام ہوگا۔"

نوکر پوری لے کر آیا تو پٹواری تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا اور نوکر چلا گیا تو کہنے لگا۔

"بھیا جی! دوسری شادی کرنا کوئی پاپ تو نہیں ہے۔ میری پہلی عورت سے ایک بھی اولاد نہیں ہوئی۔ اولاد دیکھنے کی کسے خواہش نہیں ہوتی۔ اب رہا یہ کہ وہ وِدھوا ہے تو مجھے اِس بات کی پروا نہیں ہے۔ اگلے گاؤں میں میرے گھر میں رہے گی تو یہاں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ میرا وہاں بھی بڑا رعب چلتا ہے۔"

پٹواری نے اشارے سے مجھے بتایا کہ میں پوری کھاؤں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں یہ پوری نہیں کھا سکوں گا۔ یہ میرے وجود میں جا کر زہر بن جائے گی میرا جسم جل جائے گا۔ پٹواری نے میری کلائی پکڑ کر بہت عاجزی سے کہا۔

"آشا رانی سے میرا ذکر ضرور کرنا لیکن اِس طرح کہ اُسے پتہ نہ چلے کہ میں نے کہا ہے۔ اپنی طرف سے کہہ دینا جیسے کہ آپ مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔"

"مجھے معاف کرنا پٹواری جی" میں کھڑا ہو گیا۔ اپنا بیگ اُٹھا لیا اور جوتا پہنتے ہوئے میں نے کہا: "میں آپ کے کوئی کام نہ آسکوں گا۔"

پٹواری نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے چیتے کی طرح اُچھل کر میری بوٹیاں نوچ لے گا لیکن میں کسی بات کی پروا کئے بغیر گھر سے باہر نکل گیا۔ سامنے کا گڑھوں والا راستہ آبادی کی طرف جا رہا تھا۔ میں بہت تھک گیا تھا حالانکہ سورج نے ابھی ڈھلنے کا نام نہیں لیا تھا۔

میں نے ایک دروازے پر ایک آدمی کو دیکھا جو شاید اپنے کسی ملاقاتی کو رخصت کر رہا تھا۔ دروازے پر نام کی تختی تھی جس پر لکھا تھا: "رمیش. سی. شاہ، سوشل ورکر" جب وہ آدمی اپنے ملاقاتی کو رخصت کر چکا تو میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"مسٹر رمیش شاہ سوشل ورکر کون ہیں؟"

"میں ہی ہوں" انھوں نے جواب دیا۔

تب میں نے کہا: "میں اِس گاؤں میں مسافر ہوں۔ آشا رانی اُستانی سے ملنے آیا ہوں۔ میں اُن کا بھائی ہوں لیکن اِتنا تھک گیا ہوں کہ اب چل نہیں سکتا۔ مجھے تھوڑا آرام چاہیے اور پیاس بجھانے کے لئے تھوڑا پانی چاہیے۔"

"اِس میں تکلف کی کیا بات ہے" مسٹر رمیش نے بے تکلفی سے کہا: "آپ اندر آجایئے یہ میرا دیوان خانہ ہے۔"

میں اندر جا کر ایک کپڑے کی کرسی پر گر گیا۔ کمرے کی دیواروں پر کئی طرح کی تصویریں تھیں۔ مسٹر رمیش جلسوں میں تقریریں کر رہے تھے۔ ایک جگہ غریب بچوں کو کپڑے بانٹ رہے تھے۔ ایک جگہ اناج تقسیم کر رہے تھے۔ میری پیاس بجھانے کے لئے وہ اندر سے لسی کا ایک بڑا گلاس لے کر آئے۔ سُلجھے ہوئے دماغ کے آدمی تھے۔ اچھی باتیں کرتے رہے۔ اچانک انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"ابھی جو آدمی یہاں سے گیا ہے اُسے آپ جانتے ہیں کیا؟"

"نہیں۔ مجھے خیال نہیں ہے کہ میں نے انھیں پہلے کہیں دیکھا ہو۔"

"نہیں؟" انھوں نے تعجب سے پوچھا: "وہ بھی تو شہر سے آئے ہیں۔ سوشل ورکر ہیں۔ شہر میں بیواؤں کے مسائل پر وہ لوگ ایک سیمینار کر رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں اصرار ہے کہ میں بھی کوئی مقالہ پڑھوں۔"

"پھر آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال؟" وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسے اور بولے: "اپنا خیال بتانے کے لئے آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہوں گی۔ دیکھئے صاحب! میں زندگی کو ایک موج کے مانند سمجھتا ہوں۔ ہر موج اپنی روانی چاہتی ہے اور اُس روانی میں اُتار چڑھاؤ کا رقص چاہتی ہے۔ اپنا ایک مزاج اور شعور چاہتی ہے۔ اس کی آزادی کو قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔ اِسی طرح سماج کی وہ نوجوان بیوائیں جن کے پاس زندگی کا شعور ہی نہیں، اُمنگ اور ترنگ ہے، انھیں زندگی کے دھارے میں بہہ جانے کا اُتنا ہی حق ہے جتنا کہ ایک موج کو دریا کی روانی میں ہے۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن لوگ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں صرف باتونی آدمی ہوں۔ صرف کہتا ہوں خود اُس پر عمل نہیں کرتا۔ لوگوں کا مُنہ توڑ جواب دینے کے لئے اور سماج کی ساری

تُو تُوں سے ٹکر لینے کے لئے میں نے بہت سوچ کر یہ تہیہ کر لیا ہے کہ میں آشا رانی سے شادی کروں گا۔ آپ سوچئے یہ میری کتنی بڑی قربانی ہے۔"

میری زبان بند ہو گئی۔ رمیش کہنے لگا۔

"میں آشا رانی کو سوشل بورڈ کے اراکین کے سامنے پیش کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ایک بیوہ سے شادی کی ہے۔ اُسے نئے ماحول اور نئے لوگوں سے متعارف کر کے اُس کی اُمڈتی ہوئی خوشیوں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ اِس سلسلے میں ایک مقالہ لکھوں اور بہت سی بیواؤں کا فائدہ ہو۔"

میں خاموش تھا۔ وہ کہتے جا رہے تھے۔

"آپ سمجھ دار آدمی ہیں اِس لئے اِس سلسلے میں میری مدد کیجئے۔ آشا رانی سے کہہ دیجئے کہ میں نئی روشنی اور نئے خیالات کا آدمی ہوں۔ پُرانے خیالات والے لوگ عورت کو میز کرسی فرنیچر کی طرح ایک جائداد سمجھتے ہیں اور اپنی ملکیت کا حق جتاتے ہیں لیکن میں عورت کو زندگی کے راستے پر دوش بدوش چلنے والا ساتھی سمجھتا ہوں۔"

"میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں شادیاں کرانے کا ذمّہ لے کر نہیں آیا۔ میں آشا رانی کے دُکھوں پر مرہم رکھنے اور اُن کی دلجوئی کرنے آیا ہوں۔"

"اچھا؟" رمیش نے بڑے طنز سے کہا۔ "ہمارے گاؤں کے لوگوں کی دلجوئی گاؤں سے باہر سے آنے ہوئے لوگ کرتے ہیں!"

رمیش کو سُنانے کے لئے میرے پاس بہت سے جُملے تھے لیکن آشا رانی سے ملنے سے پہلے میں کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ میرا مقصد صرف آشا سے ملنا تھا۔ اِن سب لوگوں سے مجھے کیا کام ہے۔ اِس لئے میں کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے نکل گیا۔ دو تین گلیوں میں سے ہو کر گزرا تو ایک آدمی سر پر لکڑیوں کا گٹھا لئے جاتا ہوا نظر آیا۔ میں نے آہستہ سے پُوچھا۔

"آشا رانی کہاں رہتی ہیں؟"

اُس آدمی نے اشارہ سے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ بار بار پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ میں اُس کے پیچھے آ رہا ہوں؟ میں نے سوچا اب یہ اچھا آدمی مل گیا ہے۔ بغیر کوئی بحث کئے وہ مجھے راستوں پر لئے جا رہا تھا۔ ایک کچّے سے گھر کے پاس آ کر رُک گیا۔ پھر اشارہ کیا کہ میں اندر آؤں۔ جوں ہی اندر داخل ہوا گھر کا آنگن نظر آیا۔ بھوسے بُنی ہوئی کھاٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ سامنے آ کر اُس نے کہا۔

"آپ جس کے پیچھے چلے آئے وہ میرا بہرہ اور گونگا نوکر ہے۔ کوئی بھی اُس سے کچھ پُوچھتا ہے تو وہ اشارہ سے اُسے میرے پاس لے آتا ہے۔ بتایئے میں کیا کر سکتا ہوں۔ ویسے آپ اِس گاؤں میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں آج صبح شہر سے آیا ہوں اور ابھی تک بھٹک رہا ہوں۔ آپ کا گاؤں کیسا ہے۔ یہاں مسافروں کی کوئی مدد نہیں کرتا کیا؟"

"کیوں نہیں کرتا۔" اُس آدمی نے بڑی خوش مزاجی سے کہا۔ "اِس گاؤں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں۔ خصوصاً مجھے تو لوگ مثال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ آپ آ ہی گئے ہیں تو چائے پئے بغیر نہ جائیں گے۔ آپ جہاں جانا چاہتے ہیں وہ جگہ میں اپنے ملازم کو سمجھا دوں گا۔ وہ آپ کو وہاں تک پہنچا دے گا۔"

بات ختم کر کے اُس آدمی نے گھڑی دیکھی اور کہا۔

"پانچ بجنے میں پندرہ منٹ ہیں۔ آیئے اِس کمرے کی کھڑکی میں سے آپ کو گاؤں کی ایک خاص شخصیت بتاؤں۔"

اُس آدمی نے ایک کمرے کے اندر آنے کے لئے مجھے اشارہ کیا اور اندر جاتے ہوئے کہنے لگا۔

"آپ میری بے تکلفی پر توجہ نہ کیجئے گا۔ اب یہ میری عادت سی بن گئی ہے۔ میری طبیعت میں کسی قدر رنگینی بھی ہے۔ شاید اِس لئے کہ میری پرورش شہر میں ہوئی ہے۔ میں اِس گاؤں کے جنگل کا چوکیدار ہوں۔ جنگل میں میں ناچتی ہوئی مورنی دیکھتا ہوں، چوکڑیاں بھرتا ہوا ہرن اور خوبصورت جنگلی پھول! لیکن ایک عورت جو اِس کھڑکی سے نظر آنے والی سڑک پر سے ہوتی ہوئی کچھ ہی دیر میں مندر کو جائے گی، اُس کی بات اور چال ہی نرالی ہے۔ جو بات اُس میں ہے وہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ اِس لئے چاہے کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو اُسے چھوڑ کر میں پہلے اِسے دیکھتا ہوں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔ "آپ اُسے ہر روز دیکھتے ہیں کیا؟"

"ہاں۔" چوکیدار نے بڑی دلچسپی سے کہا۔ "نہیں تو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ کھڑکی میں سے چُھپ کر دیکھتا ہوں۔ دروازے میں آ کر دیکھوں گا تو وہ بہت دُور سے چلی جائے گی۔ ساڑی کے دامن سے اپنے چہرے کو چُھپا کر چلی جائے گی۔"

میں نے گھبرا کر پُوچھا۔ "اُس کا نام کیا ہے؟"

"اُس کا نام آشا رانی ہے۔ صرف ایک بار وہ جنگل میں سانپ اور گرگٹ کی لڑائی دیکھنے آئی تھی۔ صرف ایک بار! تب سے میں ہر روز اُس کا انتظار کرتا ہوں۔ ایک بار وہ آ جائے تو اُس کا ہاتھ پکڑ لوں گا اور اُس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر جی بھر کے اُسے دیکھوں گا..."

چوکیدار دیوانوں کی طرح کہتا چلا جا رہا تھا اور اُس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر تھیں۔ میں آہستہ سے اُس کمرے کے باہر آ گیا اور سڑک پر آ کر میں نے لوگوں سے آشا رانی کا پتہ پُوچھنے کی بجائے مندر کا پتہ پُوچھا جو مجھے فوراً مل گیا۔ میں نے چوکیدار کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ آشا رانی پانچ بجے کے لگ بھگ مندر آتی ہے۔

اِس لئے اب اُنھیں ڈھونڈ لینے کے لئے مجھے کوئی دشواری نہ ہوگی۔

مندر کے سامنے ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا۔ اُس کی چھاؤں میں پھیلا ہوا ایک بڑا چبوترہ تھا۔ میں اُس چبوترے پر بیٹھ گیا تو ایک سکون کا احساس ہوا۔ اب مجھے کسی کی بکواس سُننی نہیں پڑے گی، مجھے کوئی اپنی غرض کے لئے استعمال نہ کرے گا۔ چبوترے کے ایک طرف مندر کا دروازہ تھا اور دوسری طرف ایک چھوٹی سی جھیل جس میں میلا پانی تھا اور بیچ میں کِھلا ہوا کنول کا خوبصورت پھول!

چبوترے پر بیٹھا تو مجھے بے انتہا تھکن کا احساس ہوا۔ اپنا بیگ سرہانے رکھ کر میں لیٹا تو میری آنکھ لگ گئی۔ شاید ایک گھنٹہ میں سوتا رہا۔ اچانک بیدار ہوا تو دیکھا کہ میرے سرہانے ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ مجھے بیدار ہوتا ہوا دیکھ کر کہنے لگی۔

"تم سانپوں کا تماشا دکھلانے والے ہو نا؟ جب تم گاؤں آئے تھے تو میں بیمار ہوگئی تھی۔ تمھارا تماشا نہیں دیکھ سکی۔ تم نے ماں سے کہا تھا نا کہ میں اچھی ہو جاؤں گی تب تم پھر آؤگے۔ اِس لئے اب تم مجھے تماشا دکھلانے آئے ہو کیا ——؟"

لڑکی کے بھولے پن سے خوش ہوتے ہوئے میں نے اُس سے بہت سی باتیں کیں اور اُس سے کہا وہ مندر کے اندر جا کر آشا رانی کو ڈھونڈ کر لائے اور کہے کہ شہر سے اُن کا کہانی کار بھائی آیا ہے۔ لڑکی چلی گئی تو میں اُس گاؤں کے ماحول اور آشا رانی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میری پیاس میں جب کسی قدر شِدّت کا احساس ہوا تو میں نے سوچا جھیل کے پانی سے اپنی پیاس بُجھاؤں۔ چبوترے سے اُتر کر جھیل کے کنارے آیا اور کچھ دیر تک یوں ہی سوچتا رہا۔ پانی لینے کے لئے میں نے ہاتھ کا چلّو بنایا اور اُسے پانی سے بھر کر اپنے مُنہ کی طرف لے جا رہا تھا کہ پیچھے سے ایک نسوانی آواز آئی۔

"یہ پانی گندا ہے!"

چلّو کا پانی جھیل میں گرا کر میں پلٹا۔ میں نے دیکھا تو اُس چھوٹی سی لڑکی کے ساتھ ایک بڑی عورت سفید ساڑی میں ملبوس اپنے سارے جسم کو چُھپائے میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ میں نے بھی ہاتھ جوڑ دئے۔ کچھ دیر تک عجیب سی مسرّت کے باعث ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے جیسے کسی بات کا یقین چاہتے ہیں۔ میں بولا۔

"اِتنا گندا تو نہ ہوگا جتنا کہ آپ کا گاؤں اور اِس گاؤں کے لوگ ہیں۔ آپ یہاں کیسے رہتی ہیں آشا بہن؟"

آشا رانی کی آنکھوں میں یکایک آنسو آگئے۔ اُنھوں نے کہا "وقت پر کسی کا اختیار نہیں ہے بھائی۔ اچھے دنوں کی طرح بُرے دن بھی کٹ جاتے ہیں۔ بس ذرا صبر چاہئے۔"

ہم دونوں چبوترے پر آگئے۔ وہ ایک کنارے پر یُوں بیٹھیں جیسے بہت ڈری ہوئی ہوں اور بولیں۔

"میں نے آپ کو یہاں بُلایا تو آپ چلے آئے۔ آپ کو لکھتے وقت یقین نہیں آرہا تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔"

"اگر یقین آجاتا تو ——؟" میں نے پُوچھا۔

"تو نہ بُلاتی" آشا رانی نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا "یہ میری مجبوری نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ بھائی بن کر مجھ سے ملنے آئے ہیں لیکن پھر بھی میں آپ کی خاطر نہیں کر سکتی، آپ کے ٹھہرنے اور آرام کرنے کا انتظام نہیں کر سکتی۔ یہ احساس مجھے بہت تکلیف دے گا۔"

آشا رانی کو تسلّی دینے کے لئے میں بولا۔

"میں ٹھہر بھی نہیں سکتا کیونکہ کل صبح مجھے ایک ضروری کام ہے۔ اِس لئے آج رات ہی میں مجھے شہر پہنچ جانا ہے۔ بس چند منٹوں کے لئے آپ سے ملنے چلا آیا۔ یہ بہت کافی ہے۔ اِس گاؤں میں آپ ایسی ہیں جیسے اِس گندے پانی میں کنول!"

آشا رانی نے ساڑی کے پلّو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں اگر کنول ہوں تو سُنئے کہ ساحل سے دُور اِس کیچڑ میں پھنسے ہوئے کنول کے سر پر آگ ہے! وہ آگ میں جل رہا ہے لیکن اُس کا جِسم بھسم ہونے نہیں پاتا!"

میں نے بات کا رُخ بدل کر پُوچھا۔

"آپ کا گھر یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"وہ دیکھئے!" شمال کی جانب اُنگلی سے بتاتے ہوئے اُنھوں نے کہا "وہ اونچا سا درخت جو نظر آرہا ہے اُس کے نیچے کا وہ کچّا گھر جس کی دیوار پر کدّو کی بیل پھیلی ہوئی ہے، میں اور سلوچنا وہیں رہتے ہیں۔ سلوچنا بھی پڑھاتی ہے اور یہاں وہی میری ایک غمخوار ہے۔"

اُسی طرف دیکھتے ہوئے آشا رانی اچانک کھڑی ہوگئیں اور گھبرا کر بولیں "میں اب جاؤں گی۔ وہ پوسٹ مین ہے۔ اِسی طرف آرہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ سیٹی بجائے گا۔ میرے خطوط اُس کے ہاتھ میں آتے ہیں تو وہ چار دنوں تک مجھے دیکھ کر سیٹی بجاتا ہے اور پانچویں دن خط دیتے ہوئے میری کلائی پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ بتائیے فریاد کرنے کے لئے اب میں کہاں جا سکتی ہوں۔"

میں نے اُس طرف دیکھا کہ بہت دُور سے ایک آدمی اِسی طرف آرہا ہے۔ لمحے بھر رُک کر آشا نے کہا "بھیّا! لوگ کہتے ہیں کہ ستی کی پُرانی رسم ہمارے سماج سے ختم ہوگئی ہے۔ نہیں! وہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ہاں فرق اِتنا ہوگیا ہے کہ عورت پہلے آگ میں جل کر مر جاتی تھی لیکن اب آگ میں جل جل کر بھی زندہ رہنا پڑتا ہے۔ اُس پُرانی رسم نے اب زیادہ بھیانک رُوپ کو اپنا لیا ہے۔"

آنسو پونچھتی ہوئی آشا رانی مندر میں چلی گئیں۔ کئی بار میری طرف پلٹ کر دیکھا تھا۔

فوراً مجھے یاد آیا کہ اگر میں واپسی کی تیاری اسی وقت نہ کروں گا تو شہر جانے والی آخری بس مجھے نہ ملے گی اور مجھے رات یہیں گزارنی ہوگی۔ میں رات سے پہلے اُس گاؤں کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

بس اسٹینڈ تک جانے کے لئے مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ مجھے بس مل گئی لیکن کچھ ہی دُور چلنے کے بعد وہ خراب ہوگئی۔ صبح تک اُس کے ٹھیک ہونے کی کوئی توقع نہ تھی۔ اِس لئے طے یہ ہوا کہ جسے جہاں جگہ مل جائے وہ وہاں سوکر رات کاٹ دے۔ مجھے بس کی ایک سیٹ پر جگہ مل گئی۔ ایک غنودگی کا عالم تھا اور میرے سارے حواس پر چھائی ہوئی آشارانی تھیں۔ میں نے اُن کی چیخیں سُنیں جیسے وہ "بچاؤ! بچاؤ!!" چیختی میری طرف دَوڑ رہی ہیں۔ میں نے کنول کے پھول کے اوپر سُلگتی ہوئی آگ کو دیکھا۔ کئی بار میری نظروں کے سامنے آشارانی کا وہ بھولا چہرہ آیا اور اُنھوں نے التجا کی کہ میں انھیں اِس گاؤں کے ماحول سے نکالوں۔

صبح میری آنکھ کھُلی تو میں نے سوچا، آشارانی کو اِس گاؤں میں نہیں رہنا چاہئے۔ شہر میں بھی وہ بچّوں کو پڑھا سکتی ہیں۔ وہاں بھی اُن کے گزر بسر کا انتظام ہوسکتا ہے۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ آشارانی کو میں اِس گاؤں سے نکالوں گا اور اُن کی ہر طرح مدد کروں گا۔ کچھ دیر بعد شہر سے گاؤں جانے والی بس وہاں سے گزری تو اُسے ٹھہرا کر میں اُس کے ذریعہ پھر گاؤں آگیا۔ اب یہ گاؤں مجھے نیا نہیں معلوم ہوا۔ اب میں یہاں کی اونچ نیچ سے واقف ہو چکا تھا۔ مجھے راستے معلوم تھے اور وہ راستہ بھی جو آشارانی کے گھر تک پہنچا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اب پہنچتے پہنچتے شام نہ ہوگی۔ میں ۱۲ بجے سے بہت پہلے پہنچ جاؤں گا۔ اب میں راہبر کا لبادہ اوڑھے کسی راہزن سے نہ ملوں گا۔ لیکن آدھا فاصلہ طے ہوا تو ایک پہچانا ہوا راہزن مل گیا۔ یہ وہی جنگل کا چوکیدار تھا۔ میرے سامنے آکر کسی قدر رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"جس غیر متوقع طور پر میرے گھر آئے تھے اُسی طرح اچانک میرے گھر سے آپ کیوں چلے گئے؟ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ آپ آشارانی سے ملنا چاہتے تھے؟"

"کہتا تو شاید آپ بھی چاہتے کہ میں آشارانی سے آپ کی سفارش کروں" پھر میں نے بڑی نفرت سے کہا۔ "اس گاؤں میں کُتّے رہتے ہیں۔ یہاں پر گِدھوں کا غول ہے جو اپنی حرص کی بھوک مٹانے کے لئے زندہ لاش کی طرف جھپٹتے ہیں۔"

"آشارانی سے میں نے خاموش محبت ضرور کی تھی لیکن بھگوان کی سوگند کھاکر کہتا ہوں کہ کھڑکی میں سے جھانک کر اُسے ہر روز دیکھنے کے سوا میں نے کبھی اُسے کچھ نہیں کہا تھا۔ اُسے دیکھتا تو مجھے سکون ملتا تھا۔ بتاؤ اب میں کسے دیکھوں گا؟"

چوکیدار کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو میں نے بے چین ہوکر پُوچھا "کیا ہوا آشارانی کو؟"

"آپ کو نہیں معلوم ہوا؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "میں کل شام کو یہاں سے چلا گیا تھا۔ اب واپس آیا ہوں تاکہ آشارانی کو اپنے ساتھ اِس گاؤں سے باہر لے جاسکوں۔"

"بہت دیر کردی!" اُس نے آنسوؤں کی روانی میں کہا۔ "کل رات کو مندر کے سامنے چبوترے پر پنچایت بیٹھی تھی۔ سب نے ایک آواز ہوکر پُوچھا کہ آشا دِ دھوا سے ملنے ایک غیر آدمی اِس گاؤں میں کیوں آیا تھا؟ آشارانی اُس کے ساتھ ڈر ڈر کر کیوں بات کر رہی تھی؟ اِس گاؤں کو ہم نے پاپ سے بچاکر رکھا ہے کیونکہ یہ ہمارا گاؤں ہے لیکن آشا اِس گاؤں پر پاپ کا داغ لگانے کی کیوں کوشش کر رہی ہیں؟ سب لوگ انھیں پنچایت کے درمیان لے آئے۔"

"آشارانی نے کیا کہا؟"

"بس روتی رہیں اور کہا کیوں ناحق لوگ اُسے پریشان کر رہے ہیں۔ اُس کا دل صاف ہے اور وہ بے قصور ہے۔ لیکن پنچایت نے اِس بات کو نہیں مانا اور طے کیا کہ آشا اپنے پاپ کا پرائشچت کرے گی۔ وہ اچھا کہہ کر چلی گئی اور صبح پتہ چلا کہ اُس نے زہر کھالیا!"

"آشارانی مر گئیں کیا ——؟" میں نے چیخ کر پُوچھا۔

"ہاں مر گئیں۔ ایک کہانی ختم ہوگئی! اِس گاؤں کی رونق اُڑ گئی۔"

میرا جی بھر آیا۔ چوکیدار کو وہیں چھوڑ کر میں آشارانی کے گھر کی طرف بھاگتا ہوا آیا۔ ایک نوجوان عورت دروازے پر کھڑی اپنے بالوں کو کھولے پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ سلوچنا ہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ شام کو میرے جانے کے بعد رمیش سوشل ورکر، چوکیدار، پٹواری اور تین چار دوسرے لوگ چھُپ چھُپ کر آشا سے ملنے آئے تھے اور اُنھوں نے کہا تھا کہ وہ پنچایت میں آشا کو بچائیں گے لیکن اِس شرط پر کہ وہ اُن کا ہاتھ تھام لے۔ آشا نے سب کو پھٹکار دی تھی۔ تب پنچایت بڑے زور اور شور سے ہوئی۔ فیصلہ سُن لینے کے بعد آدھی رات تک آشا روتی رہیں۔ اُس کے بعد کیا ہوا سلوچنا کو معلوم نہیں کیونکہ آشا نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ صبح آشا کی لاش ملی۔ اُن کا سارا جسم نیلا ہو گیا تھا۔ سرہانے زہر کی خالی شیشی پڑی تھی۔ سلوچنا نے کہا۔

"ابھی ابھی اُن کی ارتھی گئی ہے۔ آپ شمشان گھاٹ چلے جائیے گا تو آخری بار اُنھیں دیکھ سکیں گے۔"

میں تیزی سے شمشان گھاٹ پر آیا۔

ارتھی رکھی ہوئی تھی۔ پنڈت اور برہمن شاستر کے اَوراق اُلٹ رہے تھے کیونکہ ایک بڑی مشکل بات جو اُن کے سامنے سوالیہ نشان بن گئی تھی وہ یہ کہ ایسی وِدھوا

...ی ارتھی کو آگ کون لگائے گا جس کا اِس گاؤں میں کوئی رشتہ دار نہیں، جس نے اپنی جان ...شی کر کے دی تھی اور جس نے اپنے پاپ کا پرائشچت نہیں کیا تھا۔

میں لاش کے قریب آیا تو ساری آنکھیں میری جانب مرکوز ہوگئیں۔ میں نے دیکھا ...تا بہن کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے اُنھیں میرا ہی انتظار تھا، جیسے زہر کھا لینے کے بعد بھی اُنھیں اندھیرے میں کسی روشنی کے رمق کو دیکھ لینے کی اُمید تھی!

میں نے پنڈتوں سے کہا: "میں آشا رانی کا بھائی ہوں۔ اُن کی ارتھی کو آگ میں لگاؤں گا!" اور اُن کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے دیا سلائی سے آگ روشن کی ...ور اُسے ارتھی میں لگا دیا۔ آشا کی لاش پر کسی نے صندل کی لکڑی نہیں لگائی تھی کسی نے ...س پر اصلی گھی نہیں ڈالا تھا۔ جنگل کی لکڑیاں اور گھاس پھوس تھا۔ اچانک شعلے لپک لپک کر اُٹھے۔ آگ کی تپش سے مُردہ جسم میں ذرا سی حرکت آئی۔ لاش نے سر اُٹھا لیا جیسے آشا بہن یہ دیکھنے کے لئے اُٹھ رہی ہیں کہ میں آگیا ہوں اور وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہیں ——— میں اِس نئے دَور میں ایک راجہ رام موہن رائے کو ڈھونڈ نکالوں جو ستی کی رسم کے اِس بھیانک رُوپ کو مٹا سکیں!

اِس واقعے کو گزرے بہت دن ہوگئے ہیں لیکن اب بھی میں اپنے وجود کے بہت قریب بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے محسوس کر رہا ہوں۔ رونے اور سسکنے کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی ہیں۔ مجھے آشا بہن کی آواز سُنائی دے رہی ہے اور اُن کی اِس مُسلسل اور بھرّائی ہوئی آواز کا سہارا پا کر میں شہر شہر بھٹک رہا ہوں لیکن مجھے راجہ رام موہن رائے کا کوئی کھوج نہیں مل رہا ہے۔ میں تلاش میں سرگرداں ہوں۔ کوئی میری مدد کرے۔ کوئی میری رہنمائی کرے ——— اے کاش!!

شاعر واعظ اور چندہ

عمرآن انصاری

کرتا ہی نہیں واعظ کچھ بات بِلا چندہ
جب ہم نے کہا حضرت! تو اُس نے کہا چندہ

شاعر بھی تو اللہ کا بندہ ہے مگر دیکھو
شاعر کی دُعا شہرت، واعظ کی دُعا چندہ

اِک واہ پہ جیتا ہے ہر شاعرِ بے پروا
اور حضرتِ واعظ کی خدمت کا صِلہ چندہ

سُنتے ہی غزل سب نے دی دادِ سخن لیکن
اور وعظ کے سُنتے ہی فی الفور ہُوا چندہ

غم قوم کا کھاتے ہیں، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
شاعر کی غذا فاقہ، واعظ کی غذا چندہ

کِس کِس کی سُنیں باتیں، کِس کِس کو دیں خیراتیں
ہر بار نیا واعظ، ہر بار نیا چندہ

یہ وعظ و نصیحت تو بس کہنے کی باتیں ہیں
مقصد ہے فقط اِتنا کر دیجے عطا چندہ

اربابِ دُوَل کچھ بھی انصاف نہیں کرتے
شاعر سے کیا وعدہ، واعظ کو دیا چندہ

انعام یہ قُدرت نے دونوں کو دیا آخر
شاعر کو ملی چندرو، واعظ کو ملا چندہ

بیمار اگر دونوں پڑ جائیں تو پھر دیکھو
شاعر کی دوا بادہ، واعظ کی دوا چندہ

مر جائیں اگر دونوں بیماری کی حالت میں
تو ہم نے یہ دیکھا ہے دونوں کا ہوا چندہ

دائرے

م۔ک۔ مہتاب، ایم۔ اے

ای جی ۹۸/۴، پریم نگر۔ جالندھر

۲۲ اگست ۶۶ء

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

... "بیسویں صدی" جس شان سے اپنی راہ پر گامزن ہے، اُردو کیا دوسری زبانوں کے ادبی حلقوں میں بھی اُس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اِس کامیابی میں شاید لکھنے والوں کا بھی کچھ حصّہ ہو لیکن میں تو سمجھتا ہوں یہ سب آپ کی محنت اور خدمتِ ادب کی لگن کی بدولت ہے۔ کبھی ملاقات ہوئی تو اِس ضمن میں مزید بات کروں گا ــــ

ایک افسانہ "دائرے" ارسال ہے۔ اُمید ہے "بیسویں صدی" کے بلند ذوق قارئین اِسے قبول فرمائیں گے . . .

خیر اندیش ـــــــ م۔ک۔ مہتاب

یوں تو امرت نے دفتر میں آنے سے پہلے ہی اُن سب کی توجّہ اپنی جانب کھینچ لی تھی لیکن نریندر پر امرت کا نشہ آہستہ آہستہ طاری ہو رہا تھا۔ لڑکی کیا تھی مصری کی ڈلی تھی، شہد کی بُوند تھی، برف کی ایک قاش تھی جس کا رس قطرہ قطرہ اُس کے حلق میں ٹپکنے لگا تھا۔ نہ جانے سیٹھ رادھومل جیسا کور ذوق بلکہ بد ذوق انسان جسے نہ خدا نے خوبصورتی دی تھی نہ خوبصورتی کی پرکھ کا احساس، ستاروں کی اِس چمک کو کہاں سے ڈھونڈ لایا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تو روشنی کے ذرّے اُس سے ٹکرا کر آئینوں کی طرح جگمگانے لگتے۔ اُجالا بڑھ جاتا اور جب وہ ہال میں سے گزر کر اپنے کمرے میں جا بیٹھتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے سورج پہاڑ کے پیچھے غروب ہو گیا ہو لیکن شفق کی لالی اب بھی کلرکوں کے چہروں سے پھُوٹ رہی ہو!

سرو قد اور بھرے بھرے اعضاء کی یہ لڑکی دوسری سٹینو گرافر لڑکیوں سے کتنی مختلف تھی۔ کسی طرح کا میک اَپ نہیں کرتی تھی۔ سفید ریشمی لباس پہن کر آتی جس میں سے اُس کی گلابی رنگت یوں چمک اُٹھتی جیسے برف کے نیچے سے شفق جھانک رہی ہو۔ اُس کی بوجھل بوجھل سُرمئی آنکھیں سکون کا پیغام دیتیں اور اُس کے چمکتے ہوئے ریشمی بالوں کی لمبی سی چوٹی اُس کے سینے سے لٹکتی ہوئی سیاہ و سفید کا ایک ہوش رُبا امتزاج پیدا کر دیتی۔ اُسے دیکھ کر احترامِ حُسن سے نگاہیں جھک جاتیں۔ قدرت نے حُسنِ صورت کے ساتھ ساتھ اُسے سادگی اور سلیقہ بھی کیا عطا کیا تھا۔ بات کرتی تو جیسے سچے موتی کانوں سے دل میں اُتر جاتے۔ ٹائپ رائٹر پر بیٹھتی تو اُس کے کیبن میں سے یوں آواز آتی جیسے دبی دبی ہنسی ہنس رہی ہو۔

لیکن نریندر کے لئے سب سے بُرا اور ناقابلِ برداشت منظر وہ ہوتا جب امرت سیٹھ رادھومل کے سامنے بیٹھی نوٹس لیا کرتی۔ رادھومل جو اُس کا باس تھا لیکن جس کی بدصورتی کے باعث وہ اُسے بدمانس کہا کرتا تھا۔ اُس کے منہ سے کئی بار بے اختیار نکل جاتا ع

حُور کے پہلو میں لنگور خدا کی قدرت

لیکن وہ اپنی اِس بات پر خود ہی ہنس دیا کرتا کہ یہ خدا کی قدرت ہی سب سے بڑی سچائی ہے۔ ورنہ دفتر کے اِس وسیع ہال میں قریباً ایک سو کلرک، اسسٹنٹ اور چھوٹے افسر بیٹھتے ہیں جو ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت، وجیہہ اور عقل مند ہیں لیکن امرت کی یہ بُوند اِس بندر ہی کے لئے مخصوص ہے جو مینڈک کی طرح ٹرّاتا ہے اور جس کی شکل دیکھ کر اُبکائی آتی ہے۔

نریندر ہر روز امرت کو آتے جاتے دیکھتا۔ وہی نہیں ہال میں بیٹھے سب لوگ اُسے دیکھا کرتے اور رعبِ حُسن کے باعث خاموش ہو جاتے لیکن کچھ روز بعد شاید سب سے پہلے اُسی کو یہ خیال آیا تھا کہ کاش امرت اُس کی سٹینو ہوتی۔ پھر زندگی زندگی نہ رہتی مجسّم مسرت بن جاتی۔ دفتر کا کام بوجھ کی بجائے امرت محسوس ہوتا۔ وہ امرت کو

سامنے بٹھاتے اُس کی آنکھوں کی نیلگوں جھیلوں میں ڈوب جایا کرتا۔ اُس کی نشست گاہ امرت کے بالوں میں لگے ہوئے چنبیلی کے پھولوں کے چھوٹے سے گچھے کی مہک سے مہک اُٹھتی اور وہ ہمیشہ خوشبو کے اِس ہالے میں گھِرا رہتا۔

"کاش امرت اُس کی سٹینو ہوتی!" یہ فقرہ ایک آہ بن کر اُس کے ہونٹوں سے پھسل جاتا۔ اُس کے میز پر رکھی فائلیں منوں بھاری ہو جاتیں جنھیں اُٹھانے کی سکت اُس کے ہاتھوں سے مفقود ہو جاتی اور وہ ایسی تدبیریں سوچنے لگتا جن سے وہ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بن سکتا ہو۔ جسے سٹینو کو اپنے پاس بُلانے کا اختیار ہے، بلکہ خود سٹینوگرافر جس کی میز کے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔

نریندر کے سامنے اب امرت کا ایک اور رُخ آیا۔ وہ آہستہ آہستہ دفتر کے چھوٹے افسروں اور اسسٹنٹوں کے ساتھ راہ و رسم استوار کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی نریندر کو بھی اس سے بات کرنے کا موقع مل جاتا۔ آفس کلب کا چُناؤ ہوا تو امرت اتفاق رائے سے اُس کی سکریٹری چُن لی گئی اور یہاں امرت نے جس حُسنِ انتظام کا مظاہرہ کیا اُس نے کئی اور لوگوں کو بھی اُس کا گرویدہ بنا دیا۔ نریندر پر امرت کا تاثر اور گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کلب کی نئی کینٹین کا افتتاح بھی امرت ہی نے کیا۔ یہاں نریندر کو نہایت قریب سے امرت کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ظاہری دلکشی کے ساتھ ساتھ حُسنِ سیرت کی جھلک بھی دیکھی تھی۔ یہیں امرت اور نریندر کے درمیان حائل اجنبیت کا پردہ کچھ ہٹ گیا تھا۔ جب امرت نے اپنے ہاتھوں سے چائے کا پیالہ بنا کر نریندر کو پیش کیا تو اُسے چائے کے ایک ایک گھونٹ میں امرت کی زبان کی مٹھاس ملی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔ اِس پیشکش کے عوض نریندر کے پاس دل کے سوا دینے کے لئے اور کون سی چیز بہتر ہو سکتی تھی۔ اِس کے بعد امرت کسی نہ کسی کام سے ایک دو بار اُس کے پاس آنے لگی تھی اور وہ بھی کسی نہ کسی بہانے امرت کے کیبن کا چکر لگا آتا تھا۔

امرت نے اپنے کیبن کو از سرِ نو آراستہ کیا تھا۔ اُس کا رنگوں کا انتخاب، دیواروں کی آرائش، پردوں کی ترتیب کتنی لاجواب تھی۔ جیسے کمرے میں ایک نئی روح آگئی ہو۔ اور نریندر اب سوچنے لگا تھا۔

'کاش وہ شادی کے لئے اِتنی جلد بازی نہ کرتا۔ سونے کے زیورات، بنارس اور کانجی ورم کی ساڑیوں میں لپٹی ہوئی اُس گُڑیا کی بہ نسبت امرت کچھ اور ہی چیز ہوتی۔ جسے پاکر زندگی، زندگی نہیں امرت کا ایک پیالہ بن جاتی۔ جس کے کناروں سے اُس کے لب کبھی جُدا نہ ہوتے'۔

جس طرح امرت اُس کی طرف جُھک رہی تھی، اُس کے قریب آرہی تھی، اُسے دیکھتے ہوئے امرت کا یہ پیالہ پانا ناممکن نہ تھا۔ ہر اچھی چیز کو پانے کے لئے انتظار لازم ہے۔ اگر اُس نے ماں باپ کے کہنے پر شادی کرنے کی بیوقوفی نہ کی ہوتی تو شاید بہشت کا یہ



میوہ اُس کی جھولی میں آہی جاتا۔

لیکن اب تو ان سوچوں کا نتیجہ بس یہ تھا کہ گھر پر اُسے بیوی کی باتیں ناگوار لگتیں۔ اُس کے کام کاج میں سلیقے کی کمی اور چال ڈھال میں پھوہڑ پن نظر آنے لگا تھا اور وہ امرت کے رسیلے بول سُننے اور اُس کی خوشبو سے ذہن کو مہکانے کے لئے وقت سے پہلے ہی دفتر چلا آیا کرتا تھا۔ جب امرت کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اُس کے سامنے سے اُٹھ جاتی تو وہ اپنے خُشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سوچنے لگتا ——

'اگر امرت میری بیوی ہوتی ...؟'

'اگر امرت اُس کی بیوی ہوتی تو وہ اکثر دفتر لیٹ آتا۔ نہیں نہیں۔ اتنی گرمی میں دفتر آنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ چُھٹی لے لیتا اور یہاں دھوپ سے تپتی سڑکوں پر چلنے کی بجائے اُسے لے کر کہیں گلمرگ میں گھومتا ہوتا، مسوری میں قدرت کی گود میں ٹہلتا ہوتا، کبھی سرد مُلک کی سیر کو نکل جاتا۔ اُس کی زبان پر امرت، امرت کے سوا کوئی لفظ نہ ہوتا۔ وہ ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان بنواتے۔ اُس پر اپنی محبت کی بیلیں چڑھاتے۔ آگے خانہ باغ لگاتے جس میں شوخ رنگ کے پھول اور پودے لگا کر مکان کو رنگوں کی قوسِ قزح بنا دیتے۔ گھنے درختوں میں جھولے ڈال کر ساون کی پھواروں میں جھولا کرتے۔

وہ ایک سرد آہ بھر کر پھر کہتا: "کاش امرت میری بیوی ہوتی!" اور پھر پُر مسرت ازدواجی زندگی کے کسی اور حسین منظر کے تصوّر میں کھو جاتا۔

سوچوں کا یہ دائرہ اُس وقت ٹوٹتا جب امرت کے کیبن میں لگے بزر کی آواز سیٹھ رادھومل کی آواز کے مانند گونجتی اور امرت کاپی اور پنسل اُٹھائے سیٹھ کے کمرے میں داخل ہو جاتی۔ نریندر کے حسین خواب آئینے کے ٹکڑوں کی طرح بکھر جاتے اور اُن کی جگہ ایک سیاہ رُو بدمانس چمپئی کی ایک کلی کو اُنگلیوں میں دبائے ناچنے لگتا۔

اب اُس کی زندگی تصوّرات کے اِن دائروں میں اسیر ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہر روز امرت سے ملاقات کے بعد وہ دل کی دُنیا کے گرد ایک اور دائرے کا اضافہ کر لیتا تھا۔ 'اگر وہ میری بیوی ہوتی' کے الفاظ اُس کے لبوں پر تھرکتے اور رومانی دُنیا کا کوئی نیا گوشہ اُس کے ذہن میں بے نقاب ہو جاتا۔

اب وہ امرت سے کھُل کر باتیں کرنے لگا تھا لیکن اُسے کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اُس کی زندگی تو بس ایک تمنّا بن کر رہ گئی ہے کہ "اگر وہ اُس کی بیوی ہوتی" پھر بھی وہ ذہنی طور پر امرت کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرتا جا رہا تھا جیسے امرت تصوّراتی زندگی میں اُس کی بیوی ہو جس کے درمیان اُس کے وجود کا پردہ حائل ہو۔

جس روز امرت بیمار ہوتی، چھٹی پر ہوتی یا دیر سے آتی تو اُسے دفتر میں ایک عجیب بے کلی اور گھٹن اور خلاء سا محسوس ہونے لگتا۔ کام کرنے کو جی نہ چاہتا اور سوچوں کے دریچے کھُل جاتے۔

کل پھر وہ لیٹ تھی اور نریندر سگریٹ کے دھوئیں کی لہریں فضا میں بکھیرتا ہوا کہہ رہا تھا: "بالکل ایسی ہی لطیف ہیں اُس کی زُلفیں! اگر وہ میری بیوی ہوتی تو یہ ابریشمی گیسو اُس کے شانوں پر جھُولا کرتے۔" اُسے قرار نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مروڑا اور قریب بیٹھے ایڈمنسٹریٹو اسسٹنٹ سے پُوچھا۔

"آج امرت کی چھٹی ہے کیا؟"

"کیا آپ کو معلوم نہیں؟" گیان چند نے حیرت سے پُوچھا۔

"کیا؟" نریندر کو خیالی خوف سے پسینہ آ گیا۔

"لوگ کہتے ہیں پرسوں سینیچر کو تنخواہ لینے کے بعد امرت سیٹھ صاحب کے پی اے مسٹر آہوجہ کے ساتھ کہیں فرار ہو گئی ہے!"

گیان چند کی بات سُن کر نریندر اپنی کرسی پر یُوں ڈھیر ہو گیا جیسے گیان چند نے اُس کے اندر موجود امرت کے خیالی شوہر کے سینے میں چھُرا گھونپ دیا ہو!

جب اُس کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا ہٹا تو وہ پھر سگریٹ سُلگا کر اپنے آپ سے سوال کرنے لگا۔

'اگر وہ میری بیوی ہوتی۔۔۔'

'تو۔۔۔؟'

'تو میں نے خودکشی کر لی ہوتی!'

'تو۔۔۔؟'

'پولیس میری لاش دریا سے نکال کر لاتی۔'

'اگر وہ میری بیوی ہوتی۔۔۔'

'تو۔۔۔؟'

'دفتر میں میری کھِلّی اُڑ رہی ہوتی۔'

'تو۔۔۔؟'

'میں آج دفتر نہ آتا۔ پولیس میں رپورٹ درج کروانے جاتا۔ پولیس انسپکٹر کہتا۔ میں نہیں مانتا کہ امرت تمھاری بیوی تھی۔ اگر ہوتی تو وہ کسی اور کے ساتھ کیوں بھاگ جاتی۔ سب سپاہی ہنسنے لگتے اور وہ ہاتھوں میں مُنہ چھُپائے شرمسار لَوٹ آتا۔'

سوچتے سوچتے وہ پسینے میں شرابور ہو گیا۔ سر بوجھل ہو گیا۔ کمر ٹُوٹنے لگی۔ جیسے سینے کے اِس گھاؤ سے اُس کے جسم کا تمام خون بہہ گیا ہو اور اُس کے ہاتھوں میں قلم تک پکڑنے کی سکت نہ رہی ہو۔

وہ باقی وقت کی چھُٹی کی درخواست میز پر رکھ کر باہر نکل آیا اور دروازے پر کھڑا ہانپنے لگا جیسے دائرے اب بھی اُس کا تعاقب کر رہے ہوں!!

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراؔق گورکھپوری، ایم-اے

غزل

جھلملاتے دِیئے تہہِ داماں
اُس بدن کا تبسّمِ پنہاں

اُس پہ دنیا کے میکدے قرباں
انکھڑیوں کا تری خمارستاں

گنگناتا ہُوا خرامِ جمال
گونج گونج اُٹھتی ہے رہِ جاناں

اُن نگاہوں نے کچھ کہا بھی نہیں
بات پہنچی مگر کہاں سے کہاں

ڈھونڈھیئے اور اصطلاح کوئی
نہ نُمایاں ہی ہے نہ وہ پنہاں

زندگی کی ہے اور ہی آواز
نغمۂ سرخوشی نہ شورِ فغاں

کون عالم ہے کیف سے خالی
بزمِ ماتم میں بھی ہے ایک سماں

اُف نواہائے راز کی جھنکار
جیسے کُھل جائے خامُشی کی زباں

تاقیامت ترا پتہ نہ لگا
ڈھونڈھتے ہی رہے زمان و مکاں

جب ملے اُس سے رہ گزر میں کہیں
ہو گئے کچھ اشارۂ پنہاں!

رُوکشِ حُسنِ شبنمستاں ہے
یہ پسینے کی تیری کاہکشاں

سانس، موجِ نسیمِ صبحِ چمن
جسم، سرتاقدم بہارستاں

پھیل جاتا ہے مثلِ سایۂ شام
تیری زُلفوں کی خوشبوؤں کا دُھواں

بیقراری سی بیقراری ہے
دل ہے پہلو میں یا ہے برقِ تپاں

میرے خوابِ گراں بھی بیداری
میری بیداریاں بھی خوابِ گراں

کاش اِس کا بھی کوئی مرہم ہو
ہم بھی رکھتے ہیں ایک زخمِ نہاں

زندگی کو ہیں اور بھی کچھ کام
کچھ تو فرصت دے اے غمِ دوراں

ہر غزل میری ایک شہرِ نگار
ہر رُباعی مری جمالستاں

سُن رہا ہوں فراقؔ کے اشعار
یہ زباں تو ہے زندگی کی زباں


ہندوستان کا
پہلا بلب جو دُنیا
کے بہترین
بلبوں سے مقابلہ
کر سکتا ہے۔
جدید تکنیکی تجربات اور شدید
کوالیٹی کنڑول نے بنگال لیمپ کو
لاجواب بنا دیا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں
کم بجلی پر صاف اور تیز روشنی اور پائیداری
بنگال لیمپ کی خصوصیت ہے۔ بنگال
لیمپ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے
پیشِ نظر فی الحال ۱۰ لیمپ فی
سکنڈ کی رفتار سے ۳۰۰ سو مختلف
قسم کے لیمپ تیار کئے جا رہے
ہیں۔
بنگال
لیمپ
قوم کی سب سے بہترین بتی
دی بنگال الیکٹرک لیمپ ورکس لیمٹڈ
۷ اولڈ کورٹ ہاؤس اسٹریٹ کلکتہ ۱
BE 2 U

افسانہ

ریچھ

اقبال صدیقی، ایم۔ اے

آل انڈیا ریڈیو۔ الہ آباد

۱۲ اگست ۱۹۶۶ء مکرمی و محترمی! عقیدتیں

حاضر ہے اپنی طویل غیر حاضری کا یہ تاوان "ریچھ!" جس کے آگے ساجدہ . . . لیکن میں کیوں کہوں؟ آپ خود ملاحظہ فرمائیں اور قارئین "بیسویں صدی" یہ فیصلہ کریں کہ جو کچھ ہوا اُس کا ذمّے دار کون ہے؟ محبت یا انسانی فطرت کا یہ مثلّث فکر انگیز ہے . . .

خلوص کیش ——— اقبال صدیقی

قدموں کی چاپ ہی سے میں اُسے پہچان لیتی ہوں۔ دھب، دھب، دھب کرتا ہوا قدم جما کر وہ زینہ چڑھتا ہے۔ اُس کے تلوے چپٹے ہیں اور وہ زمین پر سیدھے قدم گراتا ہے گھٹنوں سے نیچے اس کی ٹانگیں چھوٹی ہیں اور گھٹنوں سے اوپر نسبتاً لمبی۔ کمر سے اوپر شانوں تک چوڑائی قریب قریب یکساں ہے۔ شانے چوڑے ہیں اور شانوں سے ٹخنوں تک سیاہ گھنے بالوں کے جنگل ہیں (مجھے کیسے معلوم یہ بعد کو بتاؤں گی) اُس کی گردن نسبتاً پتلی اور سر کافی چھوٹا ہے جس پر بالکل سیدھے بال ہیں جن میں وہ تیل نہیں ڈالتا۔ اُس کی شکل مربع نما ہے جس میں حبشیوں جیسی چوڑی ناک اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں عجیب بد ہیئت معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے بد وضع انسان کو اگر ریچھ کہا جائے تو کیا غلط ہے؟ اُس کا رنگ بھی تو ... ہے۔

پہلے ہی دن جب وہ ہمارے بغل کے فلیٹ میں آیا مجھے ایک ناگہانی خوف نے ڈس لیا جیسے اچانک کوئی زہریلا سانپ پھن پھیلائے میرے سامنے کھڑا ہو گیا ہو! میں اُس کی استفسار تو نہیں کرسکتی لیکن نہ معلوم کیوں پہلی ہی نظر میں میں نے یہ فیصلہ کرلیا۔

"اب میں یہاں نہیں رہ سکتی!"

اپنا سامان وغیرہ اپنے فلیٹ میں رکھوا کر اُس نے ہمارے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ!"

"وحشی!"

میرے مُنہ سے نکلا۔

"کوئی شریف آدمی اتنے زور سے کواڑ پیٹتا ہے؟"

"کون ہے؟"

میرے شوہر نے قدرے رکھائی سے بغیر نظریں اُٹھائے پوچھا۔ رات کے کھانے کے بعد حسبِ معمول ہم کافی پیتے پیتے ریڈیو سُن رہے تھے۔

"میں ہوں جی آپ کا پڑوسی آغا!"

اُس نے بلا تامّل دروازے کا پردہ سرکا دیا اور پھر اندر آتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

"ابھی ابھی آپ کے بازو کے فلیٹ میں منتقل ہوا ہوں۔ آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ پروفیسر زاہدی ہیں نا؟ اور آپ مسز زاہدی۔ بازو والے ہی؟ مالک مکان نے مجھ سے آپ لوگوں کا غائبانہ تعارف کرا دیا تھا۔ شاید میرے متعلق بھی انھوں نے بتا دیا ہوگا۔"

اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گیا اور اپنا سگریٹ کیس میرے شوہر کو پیش کرتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔

"تھینک یو!"

میرے شوہر نے سگریٹ قبول کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں بتایا تھا۔ آپ کسی میڈیکل فرم کے . . ؟"

"جی ہاں، میں ڈے اینڈ کمپنی کا برانچ منیجر ہوں۔"

میرے شوہر کے مُنہ سے جملہ اُچک کر وہ پھر جاری ہو گیا۔

"الہ آباد، وارانسی اور لکھنؤ میرا ریج ہے۔ مجھ سے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ بالکل تنہا ہوں۔ مہینے میں پندرہ بیس دن ٹور پر رہوں گا۔ باقی دن ملاقات ہوجایا کرے گی۔ ہوٹل میں کھانا اور یہاں آکر سو جانا۔ سونے کے لئے ایک کمرہ اور ملاقاتیوں کے لئے ایک ڈرائنگ روم کافی ہے میرے لئے۔ میرا ہال کمرہ تو بے مصرف پڑا رہے گا۔ آپ چاہیں تو شوق سے استعمال کرسکتے ہیں۔ آپ کے بچے وغیرہ۔۔۔"

توبہ! آدمی ہے کہ ٹیپ ریکارڈر! بولتا ہے تو سانس بھی نہیں لیتا۔ بس بولتا ہی جاتا ہے جیسے ریڈیو کا کامنٹیٹر! اور اس کی بے تکلفی تو ملاحظہ فرمایئے۔ محض منٹوں میں اس نے اپنی تنہا حیات سے لے کر ہماری زندگی تک گردان ڈالی!!

"آپ کے بچے۔۔۔"

اس نے استفساریہ انداز میں سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ یہ جملہ میری طرف اچھال دیا۔

"فی الحال نہیں ہیں۔"

میرے شوہر نے اس کی بے باکی پر قدرے حیران ہوکر جواب دیا۔

"گڈ!"

اس نے ایک لمحے کے لئے کچھ سوچ کر کہا اور پھر کامنٹری شروع ہوگئی۔

"عقل مند لوگ بال بچوں کے معاملے میں عجلت سے کام نہیں لیتے۔ ملک بحرانی دور سے گزر رہا ہے جناب! اگر ہم نے فیملی پلاننگ نہیں کی تو ہمارا معیارِ زندگی ہرگز بلند نہیں ہوسکتا۔ میں نے تو یہی سب سوچ سمجھ کر شادی ہی نہیں کی اب تک۔ میرا خیال ہے پروفیسر صاحب! فی زمانہ شادی خالصاً اقتصادی مسئلہ ہوکر رہ گئی ہے لیکن میری امی کچھ نہیں سمجھتیں نا۔ جب میں گھر جاتا ہوں تو درجنوں لڑکیاں کھڑی کر دیتی ہیں اور کہتی ہیں ——

"چن لے۔۔۔ میں کہتی ہوں چن لے! اب کے میں تجھے باندھ کر ہی رہوں گی!! بہت دن آزاد رہ لیا۔"

ہی ہی ہی ہی!

وہ نہایت غیر سنجیدگی سے ہنسا لیکن سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا گیا۔

"اور میں جناب اچھی سے اچھی لڑکی پر سیکڑوں اعتراضات گھڑ کر بہ مشکل پیچھا چھڑا کر بھاگ آتا ہوں۔ اب ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ جہاں تیس سال گزر گئے وہاں چند سال اور سہی۔ کرلیں گے کبھی شادی۔ بہرکیف!"

اس نے معاً بات پلٹ دی۔

"آپ چاہیں تو میرا ہال کمرہ۔۔۔"

اور اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا جیسے اچانک بجلی فیل ہوجانے سے ریڈیو کا نشریہ یکلخت بند ہوگیا ہو۔ اور پھر وہ غیر معمولی طور پر خاموش اور سنجیدہ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں میرے شوہر کا اور پھر میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرے شوہر نے خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ ویسے بھی وہ نہایت سنجیدہ اور خاموش فطرت انسان ہیں اور سنتے زیادہ اور بولتے کم ہیں۔ تھوڑی دیر تک جیسے سینما کا سٹل شاٹ چلتا رہا۔ وہ مجھ سے قریب بیٹھا منہ سے دھواں کھینچتا اور ناک سے خارج کرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی قمیص کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور میں نے اس کے سینے پر اگے ہوئے بالوں کے جنگل دیکھ لئے تھے اور اسی لمحے میں نے نہ جانے کیوں یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک خوفناک ریچھ ہے جو کسی دن مجھ پر جھپٹ پڑے گا۔

"اوئی ماں!"

اور پھر ایک ناقابلِ بیان خوف اور ناقابلِ فہم نفرت کے تحت میرے منہ سے نکل گیا ——

"ریچھ!"

اور مجھے محسوس ہوا تھا جیسے ریچھ کے پنجے میرے جسم کو نوچ رہے تھے۔

ریڈیو پر گائیڈ کا وہ گانا چل رہا تھا ——

پیا توسے نینا لاگے رے
جانے اب کیا ہو آگے رے
کیا ہو آگے رے، کیا ہو آگے رے

بالکل غیر ارادی طور پر یہ الفاظ میری زبان پر بھی آگئے۔ اور اسی وقت ریچھ نے کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور سڑ سڑ کرکے ختم کرتا ہوا یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھی بات ہے پروفیسر صاحب! اب اجازت چاہوں گا۔ بڑی گرمی ہو رہی ہے۔ بھئی الہ آباد میں تو قیامت کی گرمی پڑتی ہے۔ توبہ توبہ! میں ابھی غسل کروں گا اور تب کہیں مجھے نیند آئے گی۔ گڈ نائٹ!"

اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ دھب، دھب، دھب! میں اس کے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔ پھر اس نے بھڑاک سے دروازہ کھولا۔ پھر اس کی بھونڈی آواز آئی۔

"جانے اب کیا ہو آگے رے"

یہ آواز ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک آتی اور جاتی رہی۔ پھر یکایک بغل کے غسل خانے کا ٹیپ کھل گیا اور پانی کی تیز دھار فرش پر گرنے کی آواز آنے لگی۔ پانی کی تیز دھار کی چل چل کی موسیقی میں اس کی بھونڈی آواز کبھی ڈوبتی کبھی ابھرتی کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی اور میرا دھیان ریڈیو سے ہٹ کر ڈرائنگ روم سے ملحق اس کے غسل خانے تک چلا گیا۔ اب اس نے اپنے جسم کو صابن کے جھاگ سے

لپیٹ دیا ہوگا۔ صابن کے سفید جھاگ میں لپٹا اُس کا تانبئی جسم کیسا لگتا ہوگا؟ اُس کے
بال جھاگ میں بھیگ چکے ہوں گے اور اب وہ پانی کی تیز دھار اپنے جسم پر ڈال رہا ہوگا۔
چل چل اور صابن کے جھاگ تحلیل ہو کر نالی سے بہہ رہے ہوں گے۔

چھل چھل چھل!

جانے اب کیا ہو آگے رے!!

اور مجھے محسوس ہوا جیسے اُس گندے ریچھ نے پانی کی دھار میری گردن کے پیچھے شرارت سے ڈال دی ہو اور وہ میری گردن سے میری ریڑھ کی ہڈیوں میں اُترتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے ایک نامعلوم خنکی سی محسوس ہوئی اور میں کانپ اُٹھی۔

اور جبھی میں نے اپنے شوہر کے قریب سمٹتے ہوئے کسی انجانے خوف سے بچنے کی غرض سے کہا۔

"اب میں یہاں نہیں رہ سکتی!"

ایک ثانیہ کے لئے میرے شوہر نے ریڈیو کا سوئچ آف کر دیا اور مجھے حیران نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"کیوں؟"

وہ میرے چہرے کے بدلے ہوئے خطوط کا بغور مطالعہ کر رہے تھے لیکن کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔

"مجھے اِس شخص سے وحشت ہوتی ہے۔"

"حیرت ہے۔ تمھیں اُس سے کیا لینا ہے؟"

میرے شوہر نے اپنے شانے سکیڑتے ہوئے کہا۔ پانی چھل چھل کرتا برابر گر رہا تھا اور اُس کی ہر دھار کے ساتھ میری شریانوں میں یخ بستہ ہواؤں کی خنکی جذب ہوتی جا رہی تھی اور اُس پر کانچ کے ایک نوکیلے ٹکڑے کی طرح میرے شوہر کا یہ جملہ کھُرچ رہا تھا۔

"تمھیں اُس سے کیا لینا ہے؟"

واقعی مجھے اُس سے کیا لینا تھا۔ وہ ایک نووارد پڑوسی تھا اور بس! میں اپنے بے معنی خوف کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور میرے شوہر کہہ رہے تھے۔

"یہ اچھا ہے کہ وہ تنہا ہے۔ اگر کوئی بیوی بچے والا ہوتا تو واقعی کوفت ہوتی۔ اکثر تو وہ باہر ہی رہے گا۔ اور پھر اُس نے ایک کمرے کی پیشکش کی ہے۔

"کمرے کی پیشکش؟"

میری زبان پر یہ الفاظ آئے اور پھر شدتِ جذبات سے جیسے مغلوب ہو کر میں نے احتجاج کیا۔

"نہیں نہیں میں کیوں جانے لگی اُس کے کمرے میں؟"

میں نے اپنے شوہر کے شانوں پر اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔

"اگر واقعی اُس نے وہ کمرہ دے دیا تو میری ایک بہت بڑی پریشانی دُور ہو جائے گی۔ میں اُس میں اپنی لائبریری منتقل کر دوں گا۔ پھر میں اپنے ریسرچ کا کام بہت اطمینان سے کر سکوں گا۔ یہ دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہمارے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ بڑا مکان ہم لے نہیں سکتے۔ مکانوں کا کرایہ اِتنا بڑھ گیا ہے کہ آدھی تنخواہ اِسی میں نکل جاتی ہے۔"

بات معقول تھی لیکن پھر بھی مجھے اپنے شوہر کی خود غرضی اچھی نہیں لگی۔

"ہم کسی کا احسان کیوں لیں؟"

"احسان کی کیا بات ہے؟ اُس نے خود ہی پیشکش کی ہے۔ اگر اُسے کوئی تکلیف نہ ہو اور وہ بضد ہو تو مجھے اِس میں کہیں کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آتی۔"

"لیکن مجھے یہ شخص اچھا نہیں۔"

"کیوں؟"

"تو یہ انسان ہے کہ ریچھ؟"

"تمھیں اِس سے کیا لینا؟ ہوا کرے ریچھ!"

میرے شوہر پروفیسر ہیں نا۔ اِس لئے اُن کی باتوں میں بہت برجستگی ہوتی ہے۔

"ہوا کرے ریچھ۔ ہمیں اِس سے کیا؟"

میں نے اپنے شوہر کے خیال سے اتفاق کر لیا۔ لیکن بہت جلد ہی یہ ثابت ہو گیا کہ میرا یہ اتفاق محض وقتی تھا اور میں اُس ریچھ سے لاتعلق نہ ہو سکی۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کھٹکنے والی چیز ہر وقت آپ کی نظروں کے سامنے ہو اور آپ اُس سے بالکل بے نیاز ہوں۔ خواہ آپ اُس سے باضابطہ کوئی ربط نہ رکھیں لیکن پھر بھی آپ کے ذہن میں کچھ ردِ عمل ضرور ہوتا ہے۔ آنکھیں صرف دیکھتی ہی نہیں بولتی بھی ہیں اور آنکھوں کی زبان ہی درحقیقت انسان کی فطری زبان ہوتی ہے۔ مُنہ کی زبان تو سماج اور معاشرے کی زبان ہوتی ہے۔

اور پھر پڑوسی کے لئے ردِ عمل ہونا تو فطری بات ہے خصوصاً اُس بے ہنگم پڑوسی کے لئے جو رات کے گیارہ بجے گھر آ کر زور زور سے سیٹیاں بجائے، پانی کی تیز دھار میں خوب جھاگ اُڑا اُڑا کر غسل کرے، صرف نیکر پہن کر کمرے کی تیز روشنی میں تنہا ٹوئسٹ کرے اور کسی شادی شُدہ عورت سے ایسی باتیں کرے۔

"آپ پکچر نہیں دیکھتیں؟ کلب وغیرہ جانے کا شوق نہیں آپ کو؟ ابھی آپ کی فیگر تو وحیدہ رحمان کی طرح ہے۔ آپ اگر قاعدے سے میک اپ کریں تو بالکل وحیدہ رحمان معلوم ہوں گی!"

بے باکی کی حد ہو گئی۔ میں کیا کرتی ہوں، کیسی لگتی ہوں، اِن سب باتوں سے

اُس کا کیا تعلق ؟ ریچھ کہیں کا! وہ جب ریڈیو گرام پر کوئی مغربی دھن بجا کر ٹوئسٹ کرتا ہے تو میری شریانوں میں خون کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ناگن بن کر اُس کے جسم سے لپٹ جاؤں اور اُسے مار ڈالوں۔ مجھے اِتنی کوفت آج تک کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ میری شادی کو چھ سال گزر چکے ہیں۔ ہماری ازدواجی زندگی نہایت پُرسکون ہے۔ مجھے ایک متین، شہرت یافتہ، محبت کا پیکر شوہر ملا ہے جو مجھے اچھا کھلاتا اور اچھا پہناتا ہے۔ انھیں میری تفریحات کا بھی خیال رہتا ہے۔ اکثر میں اُن کے ساتھ پکچر جاتی ہوں۔ تعطیلوں میں نئے نئے شہروں کی سیر کرتی ہوں۔ گرمیوں میں پہاڑ کا لطف اُٹھاتی ہوں۔ مجھے اور کیا چاہیے ؟ پھر یہ ریچھ مجھے کیوں کسی کمی کا احساس دلاتا ہے؟؟

میری فیگر وحیدہ رحمان کی طرح ہے۔ بدتمیز! کتنا غیر سنجیدہ ہے۔

ایک دن زینے پر وہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ شام کا وقت تھا۔ میں شاپنگ کے لئے نیچے اُتر رہی تھی۔ ایسا اندھیرا نہ تھا اِس لئے میں نے زینے کا زیرو بلب روشن نہیں کیا تھا۔ میں زینے اُتر رہی تھی کہ اچانک کھٹ کھٹ کرتا ہوا وہ تیزی سے دائیں ہی سمت سے اوپر چڑھتا چلا آیا اور اِس سے پہلے کہ میں سنبھلتی وہ میرے جسم کو رگڑتا ہوا دو زینے چڑھ چکا تھا۔ میں جھلا اُٹھی۔ میرا تنفس تیز ہو گیا اور غصّے میں جو پلٹ کر میں نے دیکھا تو وہ ٹھٹک کر کھڑا تھا اور قدرے مجوب سا کہہ رہا تھا۔

"آئی ایم ساری بھابی جان!"

اُس نے اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں پھنسا دیں۔ معاً مجھے محسوس ہوا جیسے کسی شریر لڑکے نے شیشے کی سطح پر سے آفتاب کی تیز شعاعیں میری آنکھوں پر منعکس کر دی ہوں۔ میں نے جھٹ اپنی آنکھیں پھیر لیں اور بغیر ایک لفظ بولے سیڑھیاں اُتر گئی۔ اُس کے جسم سے جو بُو نکلی تھی وہ میرے لئے ایک عجیب و غریب تجربہ تھی۔ اُس کا زہر میرے دل و دماغ میں بُری طرح پھیل گیا۔ میں مفلوج سی ہو گئی۔ اُس ریچھ کی بُو میں کچھ ایسی تلخی تھی کہ دماغ پر خواب آور گولیوں کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک زہرناک نشہ سا طاری ہو گیا۔ اِس واقعے نے ایک بار پھر شدت سے مجھے اُس خوف و نفرت میں مبتلا کر دیا جس کے تحت میں نے رات کو اپنے شوہر سے پھر التماس کی۔

"کوئی دوسرا مکان تلاش کرو نا۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی!"

جس کا جواب میرے شوہر نے جو عادتاً ایک صلح پسند انسان تھے کس قدر جھلا کر دیا۔

"میں تمھیں سمجھنے سے قاصر ہوں ساجدہ! تم اُس کے لئے خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

"سنہرہ میں پریشان ہوتی ہوں یا وہ مجھے پریشان کرتا ہے؟"

کوئی بغل کے کمرے میں لڑکیوں کے ساتھ بہک بہک کر پیتے اور مغربی دھنوں پر بہک بہک کر رقص کرے تو پریشانی نہ ہو گی؟ اکیلا تو وہ پھر بھی غنیمت تھا لیکن اِدھر کچھ دنوں سے وہ جب ٹُور پر نہیں جاتا تو نہ معلوم کہاں سے یہ لڑکیاں آ جاتیں۔ بیک وقت تین چار۔ سب کی سب نیم برہنہ۔ کُتیاں! وہ سب کی سب پیتیں، گاتیں اور ناچتیں۔ اور جب اُن کے قہقہے بلند ہوتے تو میرا خون کھول جاتا۔ اُنہی دنوں نہ معلوم کیسے میرے اندر ایک بھوکی شیرنی اپنے پنجے تیز کرنے لگی۔ غرّانے لگی۔ میرے ایک اشارے کی دیر تھی اور وہ بیک وقت اُن سب کا صفایا کر دیتی۔

'میں اِس ریچھ کا صفایا کر کے رہوں گی! ایک دن میں اُس شیرنی کو للکار دوں گی اور پھر دیکھوں گی اس گندے، بدبودار ریچھ کی کس مپرسی! ریچھ اور شیرنی کی جنگ کیسی رہے گی؟ شیرنی جو بھوکی ہے ہفتوں سے، مہینوں سے شاید برسوں سے۔ ایک ہی جھپٹ میں ریچھ کا صفایا ہو جائے گا۔'

'پروفیسر! اِس ریچھ کو ہٹا دو میری نظروں سے ورنہ یہ خون تمھارے سر ہو گا!'

اور ایک دن جب مست فیل کی طرح آسمان پر بادلوں کے غول دوڑنے لگے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بارش ہونے لگی میرے آہنی ہاتھوں نے دروازہ کھول دیا۔ ریچھ پلٹا۔ سگریٹ کا باقی حصہ مروڑ کر اُس نے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ اپنی آنکھیں تیز کر کے میری طرف بڑھا۔ میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں پھنسا دیں اور میرے تنفّس میں اپنی بُو ڈال دی۔ میرے دماغ میں زہر پھیل گیا۔ میرے ہونٹ بھنچ گئے۔ مٹھیاں سخت ہو گئیں۔

'میں تیری گردن مروڑ دوں گی!'

شیرنی لپکی۔ ریچھ کی گردن اُس کے پنجوں میں آ گئی۔ ریچھ کی آنکھیں اُبلیں۔ شیرنی کا تنفس تیز تر ہو گیا۔ اُس کے دل کی دھڑکن صاف سُنائی دے رہی تھی۔ تاگہاں اُس کے سخت ہاتھوں کی ساری طاقت جیسے سلب ہو گئی۔ پھر وہ ہاتھ ریچھ کی گردن میں حمائل ہو گئے ——!!

غیر مطبوعہ مضامین واپس منگوانے کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

غزلیں

ایم۔ اے حفیظ بنارسی، ایم۔ اے

اک چشمِ عنایت کا بندہ بھی سوالی ہے
اے لطف و کرم والے دامن مرا خالی ہے

اُس حسنِ مجسم کا ہر وصف مثالی ہے
صورت بھی نرالی ہے سیرت بھی نرالی ہے

دنیا کے خزانے میں ملنے کی نہیں یارو
ہم نے لبِ لعلیں سے جو چیز چرالی ہے

ہر شام چراغاں ہے پلکوں کی منڈیروں پر
اشکوں کی عنایت سے ہر رات دوالی ہے

گلشن کا یہ عالم ہے اس فصلِ بہاراں میں
مسلی ہوئی کلیاں ہیں ٹوٹی ہوئی ڈالی ہے

صیاد سے سازش ہے گلچیں سے ہے یارانہ
گلزار کا دشمن خود گلزار کا مالی ہے

زاہد ہی کو کیوں کہیئے، زاہد ہی نہیں تنہا
ہر شخص کے دل میں اک فردوسِ خیالی ہے

میخانے کی حرمت پر اب آنچ نہ آئے گی
ساغر کی جگہ ہم نے شمشیر اٹھالی ہے

کیا جانے حفیظ اُس کو کب اس کی ضرورت ہو
واعظ کے لئے ہم نے تھوڑی سی بچالی ہے

ڈاکٹر سلام سندیلوی، ایم۔ اے

شام کو جب کسی کی یاد، دل میں مرے مچل گئی
باغ میں پھول کھل گئے، بزم میں شمع جل گئی

رات جو ایک گرم آہ منھ سے مرے نکل گئی
آگ کہیں سلگ اٹھی برف کہیں پگھل گئی

عشقِ فریب خوردہ کو اب بھی ہے اُن کا انتظار
بجھ گئے تاروں کے چراغ، رات بھی کب کی ڈھل گئی

دار و رسن تک آگئی، کاکلِ زلف کی حدیث
میرا تو یہ خیال تھا، بات ہنسی میں ٹل گئی

گزری چمن کے دل پہ کیا اہلِ چمن سے پوچھیے
اُن کے خرامِ ناز سے، پنکھڑی سب کچل گئی

حسن کی زلفِ عنبریں خود ہے بہار آفریں
باغ میں جب وہ آگئے باغ کی رت بدل گئی

کانٹے سحر سے شام تک منتظرِ کرم رہے
پھولوں کو چھیڑتی ہوئی، بادِ صبا نکل گئی

ہونٹوں پہ آگیا سلام جب کسی عشوہ گر کا نام
چاند کا نور بڑھ گیا، شمع کی لَو سنبھل گئی

سیدہ حجاب ترمذی

اک حسن بے پناہ ہے میری نگاہ میں
جنت بھی گردِ راہ ہے میری نگاہ میں

ہر منظرِ جمال مرے ساتھ ساتھ ہے
شاید تری نگاہ ہے میری نگاہ میں

میری نگاہ زہرہ جبینوں پہ کیا اٹھے
اک بنتِ مہر و ماہ ہے میری نگاہ میں

بے رہ روی پہ وقت نے مجبور کر دیا
انسان بے گناہ ہے میری نگاہ میں

اب کیا کہوں کہ اہلِ محبت کا ہر یقین
ہم شکلِ اشتباہ ہے میری نگاہ میں

ترکِ طلب میں حسنِ طلب پا رہا ہوں میں
عرضِ طلب گناہ ہے میری نگاہ میں

اوجِ فلک پہ سب جسے کہتے ہیں کہکشاں
وہ تیری گردِ راہ ہے میری نگاہ میں

منصور کی نوا ہو کہ سرمد کی ہو صدا
توحیدِ لاالٰہ ہے میری نگاہ میں

یہ نسبتِ جگر کا کرشمہ ہے اے حجاب
روشن چراغِ راہ ہے میری نگاہ میں

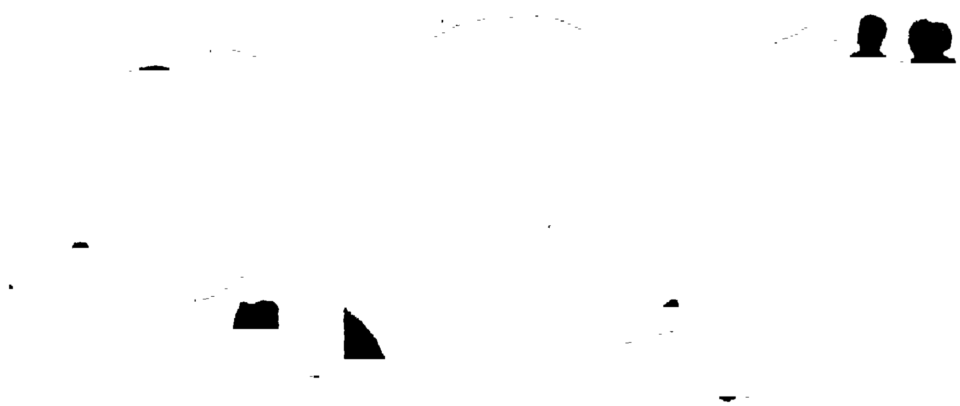
پونڈز کولڈ کریم کی کرامات شیلا پر ظاہر ہو کر رہی

۷ ہی دن میں
جِلد زیادہ صاف، مُلائم اور دلکش نظر آنے لگی

ایسا لگتا تھا کہ میری قسمت میں کنواری رہنا ہی لکھا ہے۔ شادی بیاہ کی بات میرے لئے خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھی۔

آخر مجھ میں خرابی کیا تھی؟ کالی کالی چمکدار آنکھیں، موتیوں جیسے دانت... مگر جلد؟ نہایت بے رونق، غیر دلکش۔ میں نے سوچا مجھے جلدی کچھ کرنا چاہیئے!

میں نے پونڈز کا ۷ دن والا حسن افزا پروگرام شروع کر دیا۔ ہر رات، دو بار پونڈز کولڈ کریم لگائی۔ پہلی بار میں میک اپ بالکل صاف ہو جاتا۔



دوسری بار میں مسامات کا وہ میل بھی چھٹ جاتا جس پر صابن اثر نہیں کرتا۔ پونڈز کولڈ کریم سے میری جلد دن بہ دن نرم و نازک بننے لگی۔

کمال کی بات کہ صرف ۷ دن میں میری جلد نہایت حسین نظر آنے لگی۔ اور اب تو میری منگنی بھی ہو چکی ہے!

آئندہ بھول کر بھی میں اپنے رنگ روپ کی طرف سے لاپرواہی نہیں برتوں گی۔ پونڈز کی بدولت میرا حسن نکھر آیا اور میری دلکشی سدا بہار ہو گئی۔







ہمارا مفت معلومات والا کتابچہ '7 DAYS TO BEAUTY' صرف ڈاک خرچ کے لئے ۵۰ پیسے کا ٹکٹ بھیج کر

اس پتے سے منگوایئے: چیسبرو پونڈز انکارپوریٹڈ، ڈیپارٹمنٹ ۲۱، ۱۳ اکن بو اسٹریٹ، بمبئی ۱

افسانہ

نیک نامی کی واپسی

پروفیسر زکی انور، ایم۔ اے

کریم سٹی کالج۔ جمشید پور

۲۰ ستمبر ۶۶ء

بھائی جان! تسلیم

... راجہ صاحب کی موت قومی سرمائے کے لُٹ جانے کے برابر ہے اور یقیناً ہم راجہ صاحب کو برسوں رویا کریں گے اور ہمیشہ اُن کے آخری فلمی گانے کے عین مطابق دُکھ میں سُکھ میں اُنھیں سائے کی طرح اپنے ساتھ ساتھ محسوس کریں گے۔ اُن کی مقبولیت عام تھی اور وہ اِس دَور کے سب سے زیادہ ہردلعزیز صاحبِ قلم تھے جس کا اندازہ اِس سے بھی ہوتا ہے کہ یہاں بھی کئی اور شہروں کی طرح "راجہ سوسائٹی" نام کی ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جس کے سکریٹری جناب سورج سنگھ کرن ہیں۔ انجمن نے اسکیم تو کافی طویل اور مفید بنائی ہے اور سب سے پہلے وہ انجمن راجہ صاحب کی ایک لائف اُن کی کچھ چیزوں کے ساتھ شائع کر رہی ہے (اِس سلسلے میں کرن صاحب آپ کو خط لکھیں گے مجھے یقین ہے آپ اُن کی اور ہماری مدد کریں گے) ——— "بیسویں صدی" کے قارئین اکثر آپ سے ایک سوال کیا کرتے ہیں کہ آپ کا کس مذہب سے تعلق ہے؟ اور آپ ہمیشہ جواب دیا کرتے ہیں "انسانیت"؟ جو لوگ آپ سے واقف ہیں اُنھیں آپ کا یہ جواب پڑھ کر کوئی حیرت نہیں ہوتی ——— تازہ "بیسویں صدی" میں راجہ صاحب کے لئے آپ کا غم کچھ اِس انداز میں پرچے کے صفحات پر بکھر گیا ہے کہ آپ کے مذہب "انسانیت" کی بات بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ کاش ہم سب اِس فطری اور پیدائشی مذہب کے نام لیوا ہوتے! ...

آپ کا ——— زکی انور

آگرہ: ۲۷ فروری ۶۳ء

میری پیاری رینو! سدا سہاگن رہو

ابھی کچھ دیر قبل تمھارا خط ملا ہے۔ شادی تمھاری ہوئی ہے اور خوشی میں ناچ اُٹھی ہوں میں! ——— تم بڑی خوش قسمت ہو رینو کہ تمھارا محبوب تمھیں مل گیا میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کرو!

کالج کے زمانے یاد دلا کر تم نے رُلا دیا۔ کتنے حسین دن تھے وہ! اب پھر وہ زمانے کہاں سے لَوٹ کر آسکتے ہیں؟ ——— اُف! وہ رنگین زمانے!!

میرے حالات کیا پُوچھتی ہو؟ بس جوں کی توں ہوں۔ فرق اگر ہے تو صرف اِس قدر کہ اب میں بہت سنجیدگی کے ساتھ شادی کر لینے کے بارے میں سوچنے لگی ہوں۔ ممّی سے تو کئی جگہ بات بھی چلا رکھی ہے یہ اور بات ہے کہ خود میری پیاری ممّی نے ہی مجھے جس راہ پر لگا دیا ہے اب وہ پُرپیچ راہ مجھے شاید شادی کے منڈپ تک نہیں لے جاسکے گی۔

یہ سب کچھ جو میں کہہ گئی معمّہ نہیں ہے بلکہ تمھارے اُس سوال کا جواب ہے جو تم نے یقیناً ڈرتے ڈرتے اور بہت ہمت کر کے کیا ہے۔

ہاں رینو ہاں ——— ناول "اپنے دیس کی کیلر" کی ہیروئن اگر سو فیصدی نہیں تو بہت زیادہ فیصدی میں ہی ہوں!

قصّہ ہے یہ رینو کہ ایک بار میری اَن بَن ایک سرپھرے، بدتمیز اور بدمعاش افسانہ نگار سے ہو گئی ——— اَن بَن ہو گئی اور میں نے سمجھا بات ختم ہو گئی لیکن خدا غارت کرے اِن افسانہ نگاروں کو۔ کم بختوں کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو، نہ سہی لیکن آن اور ہٹ کی بات مت پُوچھو۔ شہنشاہوں کی آن اور راج ہٹ بھی ماند پڑ جاتے۔ اُس افسانہ نگار کے بچّے نے میرے دوست مسٹر اقرار سے مجھے پیغام بھجوایا کہ عمہ اگر مجھ سے

معافی نہیں مانگی تو نتیجے کی ذمّے دار وہ خود ہوگی۔ میں نے مُسکرا کر بات ختم کر دی اور کہلو بھیجا کہ عصمہ نے مَردوں کو اپنے سامنے جُھکانا سیکھا ہے، کسی مرد کے آگے جُھکنا نہیں۔ اور مسٹر اقرار نے غضب یہ کر دیا کہ اُلٹے اُس افسانہ نگار ہی کو میری طرف سے ڈرا دھمکا دیا۔

نتیجہ یہ ہوا ریتو کہ اُس کم بخت نے جانے کہاں سے میرے کچھ ڈھکے چھپے راز حاصل کئے اور اُردو کے ایک بہت مشہور ماہنامے "اپنی صدی" میں میری کہانی شائع کرا دی۔ افسانے کا عنوان "پاکدامن" تھا اور وہ افسانہ براہِ راست میرے کیرکٹر پر حملہ تھا۔

یہ اُن دِنوں کی بات ہے ریتو جب اپنی ممّی محترمہ کی دِکھائی ہوئی راہ پر میں اِس قدر آگے بڑھ چکی تھی کہ مجھے اُس افسانے کی اشاعت پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن یہ تو انسانی فطرت ہے کہ اندھا بھی اپنے آپ کو اندھا کہا جانا پسند نہیں کرتا۔ مجھ سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ میں اُس افسانہ نگار پر مقدمہ دائر کرنے کی تیاریاں کرنے لگی اور وہ اور بھی چڑ گیا۔

اُس کے دوسرے افسانے کی اشاعت کے بعد میں نے ایک تیسری غلطی کی اور وہ یہ کہ میں نے اُس پر اپنی پُرشباب نسوانیت کا جادو چلانا چاہا لیکن میرا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ کم بخت کیسا ہی نیچ اور ذلیل سہی لیکن کیرکٹر کا عجیب و غریب ہے اور اپنی بیوی کا فرہاد!

مجھ سے برابر غلطیاں سرزد ہوتی گئیں۔ مثلاً یہ کہ میں نے اُسے بدنام کرنا شروع کیا اور اُس کی ادبی صلاحیت کے خلاف پرچار شروع کیا وغیرہ۔ اور میری ہر ایک غلطی ایک نئے افسانے کو جنم دیتی رہی۔

یہاں تک آ پہنچی ہے ریتو کہ اُس نے ایک ضخیم ناول لکھ مارا ہے —— "اپنے دیس کی کیلر" —— لیکن میں اب تھک گئی ہوں۔ سوچتی ہوں کچھ دیر سستا لوں تو پھر سوچوں گی کہ اب کیا کروں؟

عین ممکن یہ ہے کہ میں اُس سے سمجھوتہ کر لوں چاہے سمجھوتے کی شرطیں کیسی ہی کیوں نہ ہوں! اُس بدمعاش کے افسانوں اور ناولوں نے مجھے بہت زیادہ بدنام کر دیا ہے۔ یہ بدنامی میری آئندہ زندگی پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ لہٰذا میرے لئے بہتر تو یقیناً یہی ہو سکتا ہے کہ اُس سے سمجھوتہ کر لینے کے بعد اُسے اِس بات پر راضی کر لوں کہ اب وہ اِس بات کی تشہیر کرے کہ گُمراہ عصمہ راہِ راست پر آ گئی۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میں اِس قدر گر کر سمجھوتہ کر سکوں گی؟

لو ریتو! آج پتہ نہیں میں کیسے موڈ میں تھی کہ بات ہی بات میں تمھیں اِس قدر طویل خط لکھ ڈالا۔ اب تو تم شکایت نہیں کرو گی؟

اپنے "اُن" کو میرا آداب کہنا۔

تمھاری ——

آگرہ: ۲ مئی ۶۳ء

مخدومی فیروز صاحب! تسلیم

آج میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کروں گی۔ میں خودکشی کے بارے میں کچھ زیادہ سنجیدگی سے سوچنے سے پہلے آپ سے صرف اور صرف اس قدر دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ میرا گناہ قابلِ عفو ہے یا نہیں؟

جانتے ہیں آپ؟ آپ نے مجھے اِس قدر مشہور کر ڈالا ہے کہ شہر میں کوئی بھی ایسی ویسی بات ہوتی ہے لوگ سب سے پہلے مجھ پر ہی شک کرتے ہیں۔ آپ بھی تو اِسی شہر میں رہتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ مقامی ہفتہ وار ہندی اخبار میں جن کرسٹن کیلر اور ڈاکٹر وارڈ کی خبریں شائع ہوئی ہیں، وہ کرسٹن کیلر کون ہے لیکن میری سہیلیاں مجھ پر شک کر رہی ہیں —— جیلر صاحب کے ساتھ ایک لڑکی برابر دیکھی جا رہی ہے اور میرے ملاقاتی، میری سہیلیاں یہاں تک کہ ممّی کو بھی شُبہ ہے کہ وہ میں ہی ہوں لیکن آپ کو تو علم ہوگا ہی کہ وہ لڑکی، لڑکی نہیں دو بچّوں کی ماں ایک عورت ہے جس کا خاوند کسی فرم میں اونچے عہدے پر ملازم ہے —— یہ تو بڑا اچھا کیا آپ نے، مجھے اِس قدر بدنام کر ڈالا کہ شہر کی تمام تر بدنامیاں میرے ہی ساتھ منسوب کی جا رہی ہیں۔ اب اِس زندگی سے کیا حاصل؟

براہِ کرم یہ بتانے کی زحمت گوارا کیجیے کہ آپ مجھے معاف فرما سکتے ہیں یا نہیں؟

حدِ ادب!

بدنصیب —— عصمہ

آگرہ: ۳ مئی ۶۴ء

بہن عزیز! سلام و رحمت

تمھارا خط ملا۔ اگر پہلے کی طرح اپنے وکیل کے مشورے پر مجھے پھانسنے کے لئے یہ خط تم نے نہیں لکھا ہے تو یقین کرو مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ ویسے میں خود بھی یہ سوچتا ہوں کہ اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن اِس کے لئے تمھاری رضامندی کی بھی ضرورت تھی۔ تم نے پیش قدمی کی ہے تو انشاء اللہ اب یہ سلسلہ ختم ہی سمجھو۔ یہ تو واقعتہً بہت ہی بُری بات ہے کہ شہر کی کوئی بھی بدکردار عورت تمھاری آڑ لے کر بدنامی سے بچ جائے اور اُس کی جگہ تم ہدفِ ملامت بنو! —— گھبراؤ نہیں عصمہ میں نے تمھیں بہن لکھا ہے اور اپنی بہن کے ماتھے پر لگی غلط بدنامی کا داغ دھونے کے لئے میں کرسٹن کیلر، ڈاکٹر وارڈ اور جیلر صاحب کے ساتھ گھومنے والی اُس عورت کا نقاب وقت آیا تو ضرور اُلٹ دوں گا۔

لیکن تم سے بھی میری ایک درخواست ہے —— آنے والی نسلوں کو

تباہی سے بچانے کے لئے اب تو تم سنبھل جاؤ۔ اب تو نئی زندگی شروع کرو۔ جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا ہوتا رہا۔ اب وہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ شادی نہ بھی کرنا چاہو تو اتنا ضرور کما سکتی ہو کہ عزت آبرو کے ساتھ زندگی گزرتی چلی جائے۔

تمھیں یاد ہوگا ایک بار پہلے بھی میں نے تمھارے سر پہ برادرانہ شفقت کا ہاتھ رکھنا چاہا تھا لیکن تم نے میرے ہاتھ کا بوجھ گوارا نہ کیا۔

پھر کہتا ہوں ——— میری بہن لوٹ آؤ!

اُمید ہے تم میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کروگی۔ خدا تمھیں نیک ہدایت دے!

تمھارا بھائی ——— فیروز

آگرہ: ۱۷ر مئی ۶۳ء

مائی ڈیر کمل!

تم جذباتی تو ہو ہی، گستاخ بھی ہو اور جلد باز بھی۔ ہر ایک کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ تمھاری جذباتیت اور جلد بازی سے کام خراب ہو سکتا ہے، بن نہیں سکتا۔

اجنتا اور الورا کی کیا بات ہے، میری جان! میں تو تمھارے ساتھ ساری دُنیا کی سیر کرنے کو تیار ہوں بلکہ کہو گے تو جہنم میں بھی تمھارے ساتھ گھوموں گی۔ لیکن ابھی کچھ روز تک پلیز مجھے دق نہ کرو۔ تمھارے ہی جیسے ایک احمق دوست کی بدولت میں ایک بار ہوسٹل سے نکالی گئی تھی لیکن تب کی بات اور تھی۔ وہ اسٹوڈنٹ لائف تھی اور آج کی بات اور ہے۔ ایک زنانہ کالج میں میری تقرری کی بات چل رہی ہے اور میرے کیرکٹر کے بارے میں چھان بین ہو رہی ہے۔ وہ تو خدا بھلا کرے اُس افسانہ نگار کے بچے فیروز چشتی کا (حقیقت تو یہ ہے کہ میں اُس بدمعاش کے لئے کبھی بھلائی کی دعا نہیں مانگ سکتی لیکن محاورہ یہی ہے!) کہ کل وہ میری بدنامی کراتا پھرتا تھا آج میرے کیرکٹر سے تقریباً مطمئن ہو چکا ہے اور اُسی نے کالج کے سکریٹری سے میری سفارش کی ہے۔ ——— فیروز چشتی فرسٹ کلاس چغد ہے اُس سے بس ایک کام نکالنا ہے۔ وہ کام ہولے پھر میں ہمیشہ کے لئے پہلے کی طرح تمھاری ہوں۔ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

ممی دعا کہتی ہیں۔ ——— تمھاری

آگرہ: ۵ر جولائی ۶۳ء

عصمہ! خوش رہو

آج دلّی سے واپس آیا تو تمھاری بھابی نے بتایا کہ تم آئی تھیں اور اُن کا دل جیت کر چلی گئیں۔ غالباً تم نے دیدہ و دانستہ طور پر میری غیر موجودگی میں آنا پسند کیا۔ احمق ہو تم۔ مجھ سے شرمانے کی کیا بات ہے۔ اب وہ پہلی عصمہ تم نہیں ہو۔ وہ عصمہ مر گئی



تم ایک نئی عصمہ ہو جو میری بہن ہے۔ آؤ میں تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ اور آؤ تو مٹھائی لے کر آؤ۔ کالج کا کام ہو گیا ہے۔ تم وہاں لی جا رہی ہو۔

سُنو عصمہ! میں جسے بھی اپنی بہن بناتا ہوں اُسے اپنی طرف سے کوئی نِک نیم (اس لئے کہ خطاب کا زمانہ لد گیا!) عطا کرتا ہوں۔ اور میں اب تمھیں مُنّی کہنا پسند کروں گا۔ پسند آیا نا یہ نِک نیم؟

بہن تو میں نے تمھیں آج سے کئی ماہ پیشتر بنا لیا تھا لیکن اُسی وقت میں نے تمھیں نِک نیم سے اِس لئے نہیں نوازا کہ مجھے اطمینان نہیں ہو سکا تھا کہ تم اپنے بھائی کے اِس مقدّس تحفے کو پانے کے قابل ہو بھی یا نہیں؟

لیکن اب میں مطمئن ہوں لہٰذا اِس نِک نیم کے علاوہ میں تمھیں ایک اور تحفہ دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں ——— زندگی بھر کا تحفہ! لیکن اُس تحفے کے بارے میں تم سے نہیں تمھاری ممی سے خط و کتابت کرنی ہوگی۔

جواباً عرض ہے کہ ——— میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ایک خاص مدّت تک تمھارے ہاں نہیں آسکوں گا۔

ایک خط تمھاری ممی کے نام کل لکھوں گا اُنھیں بغیر پڑھے دے دینا۔

تمھارا بھائی ——— فیروز

آگرہ: ۱۰ جولائی ۶۳ء

عزیزی فیروز سلمہٗ ! دعائیں

عصمہ کے ذریعہ تمھارا خط ملا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ تم میرے ہاں آنا نہیں چاہتے۔ میں تم پر زور بھی نہیں دوں گی۔ بہرحال اگر کہو تو میں خود تمھارے ہاں آکر باتیں کروں۔ ویسے جب تم نے سچے دل سے اِس بدنصیب لڑکی کو بہن بنالیا ہے تو پھر اِس کے ہاتھ پیلے کرنے کی تم فکر تو کر ہی سکتے ہو۔ میری اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو میرے لئے انتہائی خوشی کی بات ہے۔ خدا تمھیں کامیاب کرے۔

دعاگو ——— والدہ عصمہ

کلکتہ: ۱۲ ستمبر ۶۳ء

مائی ڈیر چشتی !

تمھارا طویل ترین خط ملا۔ لیکن پڑھنے کے بعد اِس نتیجے پر پہنچا کہ تم نے بکواس کی ہے۔ یار اُس لڑکی عصمہ کے بارے میں میں بہت کچھ سُنتا رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار خود تم نے بھی بہت کچھ بتایا تھا۔ حیرت ہے کہ آج تم اُسے میری بیوی بنانا چاہ رہے ہو؟ ——— لیکن یقین کرو میں بھی کوئی ایسا دقیانوسی ذہن نہیں رکھتا۔ وہ کیسی ہی کیوں نہ رہی ہو۔ تمھارا خیال درست ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اب کیسی ہے؟ ——— یہ بھی یقین کرو فیروز کہ میرے دل میں تمھارے لئے جو مقام ہے۔ اُسے دیکھتے ہوئے میں سوچتا ہوں اِس قدر طویل خط لکھ کر تم نے جھک مارا ہے۔ تمھیں التجا اور درخواست نہیں کرنی تھی۔ مجھے حکم دینا تھا کہ میں عصمہ سے شادی کرلوں۔

لیکن ایک بات عرض کروں فیروز؟ ——— سُنو میرے دوست ! وہ لڑکی حد سے زیادہ رنگین مزاج اور وغیرہ وغیرہ قسم کی لڑکی رہ چکی ہے۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ اب وہ سچ مچ راہِ راست پر آگئی ہے؟

میری رائے ہے کہ اِس سلسلے میں کچھ اور سوچو۔ عصمہ اگر تمھاری بہن ہے تو خاکسار چھوٹا بھائی ——— ایسا نہ ہو کہ تم ایک کو تباہی سے بچانے کی دُھن میں دوسرے کو تباہ کردو ——— اور اگر تم سچ مچ مطمئن ہو تو میں رضامند ہوں۔

بھابی کو آداب کہہ دو، بچّوں کو پیار !

تمھارا ——— نیاز

آگرہ: ۱۸ ستمبر ۶۳ء

برادرم ! سلام و محبت

حضور کا خط ملا۔ آپ گدھے ہیں۔ یار بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔ عصمہ نے جیسی بھی زندگی گزاری ہو اب وہ اُس زندگی سے گھبرا چکی ہے۔ اور اگر انسان کی پچھلی زندگی اُس کی ساری زندگی کے ساتھ چپکا نا ہی درست ہے تو بسم اللہ ——— خود بھی اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو۔ کہو تو میں اُن تمام لیڈی ڈاکٹروں، نرسوں یہاں تک کہ فرینڈز وائیوں تک کی ایک فہرست مرتب کردوں جو تم سے فیض حاصل کرتی رہی ہیں۔

یار ! سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ خطاکاروں کے لئے خدا نے بھی درِ توبہ ہمیشہ کھلا رکھا ہے اور تم حقیر انسان ہو کر بھی ایک انسان کو معاف نہیں کرسکتے۔ کیسا اندھیر ہے؟ پھر تم ہی کہو ڈاکٹر گنہ گار لوگ گناہ سے توبہ کرنے کی کبھی ہمت کریں گے؟ میرے بھائی ! جُرم اور گناہ ایک مرض ہے جس کا علاج سزا نہیں ہے، ہمدردی ہے۔ عفو ہے، پیار ہے !

سُنو نیاز ! اگر خدانخواستہ عصمہ اب بھی ویسی ثابت ہوجائے جیسی پہلے تھی تو جو سزا چاہو مجھے دے لینا۔ لیکن ابھی میرا دل نہ توڑو۔

مہربانی کرکے ایک دن کے لئے آجاؤ۔ میں تمھیں عصمہ سے ملا بھی دوں گا اور پھر اُس کی ماں سے باتیں بھی پختہ کرلی جائیں گی۔

اُمید ہے تم ایک بار پھر سنجیدگی سے میری باتوں پر غور کروگے اور مناسب فیصلہ کروگے۔

تمھارا اپنا ——— فیروز

آگرہ: ۱۹ ستمبر ۶۳ء

عزیزی کمل ! دعائیں

جب سے تم ڈپٹی کلکٹر ہوئے ہو، بے شک تم نے ہمیشہ یہ تمنا کی ہے کہ میں تم سے کوئی کام لوں۔ لیکن میں تم سے کام بھی کیا لے سکتا ہوں۔ نہ مقدمہ باز ہوں، نہ ٹھیکہ دار !

بہرحال آج تم سے ایک کام لینا ہے اِسی لئے یہ خط لکھ رہا ہوں لیکن یہ کام مجھے اُس کمل سے نہیں لینا ہے جو ڈپٹی کلکٹر ہے۔ بلکہ اُس کمل سے جو میرے سگے بھائی جیسے دوست کا چھوٹا بھائی ہے۔

تمھارا عزیز ترین دوست ڈاکٹر نیاز احمد ہے نا؟ وہ پرلے درجے کا احمق ہے۔ میں اُس کی شادی اپنی ایک رشتے کی بہن سے کرانا چاہتا ہوں۔ میری وہ بہن کبھی زمانے میں گمراہ ہوگئی تھی لیکن اب سو فیصدی ہندوستانی لڑکی ہے لیکن ڈاکٹر نیاز اُس لڑکی کی پچھلی زندگی کے پیچھے لٹھ لے کر پڑا ہے۔ لڑکی اچھی خاصی خوبصورت ہے۔ خوبصورت اگر نہیں تو بدصورت بھی نہیں ——— تندرست ہے اور تاریخ میں ایم۔ اے ہے۔ آجکل مقامی زنانہ کالج میں لکچرر ہے۔ ممکن ہے تم اُسے جانتے ہو کیونکہ تم جس زمانے میں یونیورسٹی کے طالبِ علم تھے اُسی زمانے میں وہ بھی تھی۔ اور چونکہ وہ ایک بہت اچھی اوریٹر تھی اِس لئے ساری یونیورسٹی میں کافی مشہور تھی۔ بھئی اُس کا

نام عصمہ ہے۔

تم سے یہ کام لینا ہے کہ تم ڈاکٹر نیاز کو سمجھاؤ کہ وہ عصمہ سے شادی کرنا منظور کرلے۔

خدا کرے تم بخیر ہو۔ تمہارا بھائی ——— فیروز

حیدرآباد: ۲۸ ستمبر ۶۳ء

بھائی صاحب! آداب

آپ کا خط ملا۔ اور پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ آپ نے مجھے کچھ اس قدر نامناسب کام کرنے کو لکھا ہے جو میں ہرگز نہیں کر سکوں گا۔

اس گستاخی کی تفصیل کے طور پر میں کچھ اور لکھنے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔ ساری تفصیل آپ کو اس خط سے مل جائے گی جو میں منسلک کر رہا ہوں۔ یہ خط عصمہ کا ہے جو اس نے مجھے ۱ مئی ۶۳ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے مجھے کئی خط لکھے ہیں لیکن آپ میرے بڑے بھائی ہیں اس لئے وہ خطوط میں نہیں بھیج سکتا۔

ایک پرارتھنا ہے۔ ایشور کے لئے اس خط کا تذکرہ میرے بھائی صاحب سے نہ کیجئے گا۔

بھابی جی کو میرا پرنام، بچوں کو پیار

آپ کا عزیز ——— کمل

آگرہ: ۵ اکتوبر ۶۳ء

عصمہ!

وعدے کے مطابق آج مجھے تمہارے ہاں آنا تھا لیکن حالات بھی کیسے کیسے تماشے کرتے رہتے ہیں۔ اب میں تمہارے ہاں نہیں آسکتا۔

یقیناً تم حیران ہوگی اور جاننا چاہو گی کہ یکایک میں پھر کیوں بدل گیا؟ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے عصمہ کہ کوئی آدمی، چاہے وہ کیسا ہی سادہ لوح کیوں نہ ہو اپنی سادہ لوحی کی سزا بہت دنوں تک نہیں بھگت سکتا ہے۔ خدا کو اپنے اس احمق بندے پر رحم آہی جاتا ہے اور وہ اُسے معاف کر دیتا ہے۔

میری اس اچانک تبدیلی کے بارے میں اگر تم اور بھی تفصیل سے جاننا چاہتی ہو تو میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ کوئی اجنتا اور الورا کی غاروں میں تمہارے نام کی مالا جپ رہا ہے اور تمہارے ساتھ ساری دُنیا بلکہ جہنم تک کی سیر کرنے کی اُپاسنا میں دھونی رمائے بیٹھا ہے!

عصمہ —— میں نے جو نک نیم تمہیں عطا کیا تھا آج واپس لیتا ہوں —— وہ نک نیم" نہیں تھا عصمہ" نیک نام" تھا جو مجھے مجبوراً واپس لینا پڑا ہے۔

کاش تم میرے مقدس عطیے کو سنبھال کر رکھنے کے قابل ہوسکو!

——— فیروز چشتی

غزل

مس زبیدہ اسلام صوفی ایم۔اے (علیگ)

رنج و اندوہ کی انتہا ہوگئی | بات سوچی تھی کیا! اور کیا ہوگئی
ہائے تقدیر نے کتنے دھوکے دیئے | ہم تو سمجھے تھے قسمت رسا ہوگئی
کس سے اب کوئی رکھے اُمیدِ وفا | ساری دنیا ہی جب بے وفا ہوگئی
زندگی تجھ سے اب کیا شکایت کروں | موت بھی میری مجھ سے خفا ہوگئی
مالکِ زندگی اِتنا برہم ہے کیوں | کون سی ایسی مجھ سے خطا ہوگئی
قیدِ ہستی سے کردے رہا اے اجل | ختم میعاد، پوری سزا ہوگئی
کتنی صبر آزما ہیں یہ محرومیاں | آسماں! جور کی انتہا ہوگئی
تُو نے آساں کیں مشکلیں اے اجل | تُو علاجِ غمِ لا دوا ہوگئی
اُن کے نقشِ قدم پر جھکا دی جبیں | یُوں نمازِ محبت ادا ہوگئی

صوفیؔ خستہ جاں کیا اسے خوفِ غم
جس کی فطرت ہی غم آشنا ہوگئی



افسانہ

اِک داغِ نہاں اور...

نعیم اقبال، بی۔ایس۔سی

انجمن اشاعت اردو۔ دودھ پیر مکان۔ عیدگاہ۔ میسور

۹ اگست ۱۹۶۶ء مکرمی خوشتر صاحب! اسلام مسنون

... ادب کے ناطے شاید میں آپ کے لئے اجنبی نہیں ہوں لیکن "بیسویں صدی" کی محفل میں پہلی بار ایک کہانی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی نگاہ بلند ادب کی کسوٹی ہے جس پر اچھے اور بُرے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ اگر میری کہانی آپ کو پسند آگئی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی... نیازمند ——— نعیم اقبال

سبھی اُس کی بُرائیاں کرتے تھے اور سچ مچ وہ بہت بُرا تھا۔ دُنیا کی کوئی بُرائی نہ تھی جو اُس میں نہ پائی جاتی ہو۔

وہ شرابی بھی تھا اور جُواری بھی۔ اکثر اُسے ایسے کوچوں میں جاتا دیکھا گیا تھا جہاں کے دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں۔

وہ نہ جانے کہاں رہتا تھا اور کیسے رہتا تھا لیکن تقریباً ہر بڑے ہوٹل اور کیفے میں اس کے دوست موجود تھے! مہذب اور سوسائٹی میں MOVE کرنے والے بہترین دوست!! شاید وہی اُس کا بار اُٹھاتے تھے، اس کی ضروریاتِ زندگی بھی بہت محدود تھیں۔ اکثر کوئی ڈنر یا لنچ پر مدعو کر لیتا یا پھر ایک پیالی کافی یا چائے پر دن نکل جاتا۔

اُسے پہلے پہل اپنی کوٹھی پر دیکھ کر بیگم بخشی متحیر رہ گئی۔ ٹخنوں سے کچھ اوپر شلوار کے پائنچے چڑھائے دوپٹہ کمر کے گرد لپیٹے ہزارہ ہاتھ میں لئے وہ اپنے پائیں باغ کے پھولوں کی آبیاری کرنے جا رہی تھی لیکن اُسے دیکھ کر جلدی جلدی لباس درست کیا اور ستون سے ٹیک لگا کر آڑ میں کھڑی ہو گئی۔

پھر بخشی کے اور دوست آگئے۔ قہقہے اُڑنے لگے۔ بخشی اتنی آزادی کے کسی طرح قائل نہ تھے کہ وہ اپنے دوستوں کے سامنے اپنی بیوی کو بھی لائیں۔ ویسے وہ لڑکیوں اور اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی مرضی سے جہاں چاہے جا سکتی تھی۔

اُنھیں مسز بخشی سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ خاندان بھر کی حسین لڑکی بھی جانی تھی۔

اُنھیں دنوں بخشی امریکہ سے لوٹے تھے اور جلد ہی کسی پلاننگ کے سلسلے میں پھر لوٹ جانے والے تھے۔ اُن کی آمد کی خوشی میں ایک جشن اُن کی امّی نے منعقد کیا تھا۔ وہ کسی مہمان کو سی آف کر کے باہر سے اندر رہا تھے اور اُسی وقت اُنھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ اُداس لیکن سوگوار حُسن کا ایک شاہکار! جیسے کسی مصوّر کا حسین ماڈل ہو!

بخشی کو دیکھ کر اُس نے اپنی گھنی پلکیں جھکا لیں اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی اندر چلی گئی۔ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ اُن کے خاندان کی تو ہرگز نہ تھی۔

لیکن یہ اِس وقت اِتنی اُداس کیوں تھی؟ جبکہ سب مہمان اونچی آوازوں میں ہنس رہے تھے۔ پھر وہ سب سے الگ تھلگ کھڑی کیا سوچ رہی تھی؟ اُن کی خوشی کافور ہو گئی! چند لمحے پہلے جہاں وہ کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی وہیں اب بخشی کھڑے خیالوں کے پیچ و خم میں اُلجھ رہے تھے!

بخشی جلد ہی فارن جا رہا تھا۔ اُس کی امّی چاہتی تھیں وہ شادی کر کے جائے۔

"امّی! گستاخی ضرور ہے لیکن یہ بتا دیجئے کہ اُس دن جشن میں گلابی لباس میں جو لڑکی آئی تھی وہ کون تھی، اُس کا نام کیا تھا؟"

گلابی لباس؟ اُس کی امّی سوچ میں پڑ گئیں۔ اُس دن تو کتنی ہی لڑکیاں گلابی کپڑوں میں ہوں گی۔

وہ پھر مایوس ہونے لگا۔

"تم ایر کمانڈر خالد صاحب کی بچی اسماء کو تو نہیں کہتے؟"

"مجھے اُس کا نام معلوم نہیں ہے امّی!" وہ شرما گیا۔

"ہاں وہ بہت خوبصورت ہے! سارے خاندان میں اُس جیسی کوئی لڑکی

مے کدہ

مَے کدے میں بھی آ کبھی واعظ
ایک دنیا یہاں بھی بستی ہے ——— ساحر ہوشیارپوری

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو ——— غالب

پینے والے ایک ہی دو ہوں تو ہوں
مُفت سارا میکدہ بدنام ہے ——— جگر مرادآبادی

یہ مے کدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں ——— ساغر نظامی

شبِ جمعہ ہے آج امیر کہاں
مے کدے میں کہیں پڑے ہوں گے ——— امیر مینائی

مرسلہ :- ایس۔ ایس۔ ہتکاری ایم۔ اے، کلکتہ

نہیں ہے۔ کئی جگہ سے اُس کے پیغام آئے ہیں لیکن خالد صاحب نہایت جابر باپ ہیں! اِس سلسلے میں وہ اپنی بیٹی کی پسند پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی پسند کی شادی کریں گے۔"

"اگر اُنھوں نے مجھے بھی پسند نہ کیا؟"

"واہ! تم جو لاکھوں میں ایک ہو! خالد صاحب تمھارے باپ کے گہرے دوستوں میں سے ہیں۔"

'پھر ہوسکتا ہے وہی ہو' بخشی نے سوچا تھا اور ماں کی مرضی پر سر جھکا دیا۔

اور پھر جب اُنھوں نے اپنی نئی نویلی دُلہن کو دیکھا تو چند لمحوں کے لئے انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اُن کے حسین خوابوں کی تعبیر اسماء کے روپ میں دُلہن بنی سجی سنوری سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

لازوال خوشی میں وہ اپنے شب و روز بھی بھول گئے۔ اور اُسی انہماک اور جوشش میں اُنھیں اسماء کے کردار و عادات کے مطالعے کی بالکل مہلت نہ ملی۔ وہ مہر و وفا، خلوص و محبت کی دیوی تھی۔

"اسماء! یہاں دل گھبرا رہا ہے؟" اُنھوں نے بڑے پیار سے پُوچھا: "دیکھو تو صرف تمھاری محبت میں میں نے فارن جانا بھی قربان کر دیا۔ اگر تم کہو تو ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔"

"مجھے چھوڑ کر؟" وہ سہم کر پُوچھتی

"نہیں جاناں! بھلا تمھیں چھوڑ کر کہیں جا سکتا ہوں۔ تم یہاں گھبراتی ہو؟"

"نہیں تو۔ میں یہاں کیوں گھبراؤں گی۔ یہاں تو میرا سب کچھ ہے۔"

"کیا کیا کچھ ہے یہاں؟"

"آپ!!"

اور اُن کا دل چاہا، وفورِ محبت میں وہ اپنی زندگی تک لُٹا دیں۔

لاکھ لاکھ وہ خوش رہنے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتے لیکن اسماء کا انجانا بے بوجھا روگ اُسے چُپکے چُپکے کھاتے جا رہا تھا۔

کون سا غم، کون سا دُکھ! بعید از قیاس وہموں کو وہ لعنت ملامت کر کے ذہن کی عمیق ترین گہرائیوں سے نکال چُکے تھے اور خود پر نفرین کی تھی۔

"کیا یہ کسی گناہ کی ناپاکیوں سے آلودہ ہو سکتی ہے؟"

اُن کی پیشانی شرم سے بھیگ جاتی۔

"بتایئے، آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ آپ کیوں اِتنے خاموش رہنے لگے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں اسماء!!"

وہ لہجہ ہی ایسا ہوتا کہ اُنھیں اپنے اوپر غصّہ اور اُس پر پیار آجاتا۔

وہ خاموش کچھ سوچتی رہتی یا پھر طویل طویل مکتوب لکھتی۔ ایک دردمند اور مہجور محبوبہ کے دلی احساسات ... مجبوری کی سوگواری ... ملن کی بے قراری اور روح کو برما دینے والی ایسی باتیں جنھیں پڑھ کر پتھر کا دل بھی کانپ اُٹھے۔

یہ سب دیکھ کر کرنل بخشی کا دل بھی تڑپ اُٹھتا۔ اسماء بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی تھی۔

اور محبت کا سیلاب دل کی ساری کدورتوں کو بہا دیتا۔

"تم مجھ سے اِتنی محبت کرتی ہو اسماء؟"

"بے اندازہ" وہ شرما جاتی۔

لیکن اُس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائی میں احساس کوئی اور ہوتا جیسے وہ کسی خیالی پیکر کو پیکرِ محسوس کا درجہ سمجھ کر پُوج رہی ہو ... جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے لبوں پر اپنے لب رکھتے ہوئے کسی اور کا تصوّر کر لے اور اپنے آپ شرما کر جلدی سے اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں سے ہٹا لے!

اور پھر اُسے خاموش اور اُداس اُداس دیکھ کر وہ اُسے لے کر فارن چلے گئے۔ نئے زمین و آسمان۔ اُداسی کا وہ گہرا لبادہ جو وہ ہر وقت اپنی بشاشت کے جسم پر ڈالے رکھتی تھی اُتار پھینکا۔ جیسے کسی خوفناک تصوّر، بھیانک سائے سے اُس کا پیچھا چھوٹ گیا ہو۔

پھر کرنل بخشی کو محسوس ہوا وہ جنّت بداماں ہیں! اُنھیں اپنی تقدیر پر رشک آتا!

کرنل بخشی سات سال بعد وطن لوٹے۔ اب اُن کے ساتھ محسن اور تبسّم بھی تھے۔

ننھے مُنّے سے بچے... بخشی ضرور اُن کے باپ معلوم ہوتے تھے لیکن اسماء اُن کی ماں نہیں اُن کی بڑی بہن معلوم ہوتی تھی۔ ویسی ہی شاداب اور ویسی ہی حسین جیسے وہ کرنل بخشی سے پہلی ملاقات کے وقت تھی۔

اور اب کرنل بخشی بارہا کے تجربات اور خاموش آزمائشوں میں اسماء کو سو فیصدی پُوری اُترتی دیکھ کر اپنے پچھلے احساس کو قطعی طور پر فراموش کر چکے تھے۔ اب اُن کے دل میں کوئی مہمل خیال آہی نہ سکتا تھا۔

اُس کے لئے کسی طرح کی کوئی بات سوچتے ہوئے انھیں اپنی شرافت پر شک ہونے لگتا اور وہ متحیر رہ جاتے۔ ایسا رکیک اور گھناؤنا خیال اُن کے ذہن میں کیسے آیا؟ احساسِ گناہ اور پشیمانی تلافی کے طور پر اگلی محبت سے کہیں زیادہ خلوص اور محبت بلکہ جاں نثاری کا جذبہ دے جاتی۔

وقت سات سال آگے بڑھ چکا تھا۔

جوں جوں وطن کی سرزمین قریب آتی گئی کرنل کا دل ایک ماں کے دل کی طرح اپنے آغوش وا کرنے لگا تھا اور اسماء کے چہرے کا رنگ پھر اُڑنے لگا۔ جیسے اُس کا بچہ اُس سے دُور بہت دُور ہوتا جا رہا ہو!

کرنل کی نظریں جو اسماء میں ذرا بھی تغیر گوارا نہ کر سکتی تھیں، بھانپ گئیں کہ اِس مسلسل اُداسی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے اور گہری وجہ ہے!

پھر وہ پہلے ہی کے سے کرب میں مبتلا ہو گئے۔ آخر اُسے فکر کس بات کی تھی۔ اچھا شوہر، معصوم پیارے پیارے بچے، آراستہ و پیراستہ عالیشان کوٹھی پھر اُن کی نیندیں اُڑنے لگیں، کاروبار سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ گھر سے بے پروائی برتنے لگے۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی خامی اُنہی میں تھی۔

وہ ہنستی تھی لیکن کھوئی ہوئی سی ہنسی! جیسے کوئی اور ہی خیال میں گم صرف ہنسنے کی خاطر ہنس رہا ہو۔

'مجھے بتادو اسماء! تمھیں کیا دُکھ ہے۔ کون سا غم ہے!؟'

'کوئی دُکھ نہ غم! آپ کے ہوتے مجھے کس چیز کی کمی ہے'

'سچ سچ بتادو۔ کیا کوئی ایسا راز ہے جو تم مجھ سے کہتے ہوئے ڈرتی ہو؟'

'میری زندگی کھلی کتاب ہے جہاں سے جی چاہے پڑھ لیجئے'

کرنل پھر مطمئن ہو گئے۔ اُداسی اُس کی فطرت ہو تو اُس سے انھیں کیا نقصان پہنچتا تھا

لیکن اِتنی سی کھوج نے اسماء کو مضطرب کر دیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ کرنل کو اُس کی دل گرفتگی کا علم نہیں تھا جب پتہ چلا تو وہ اپنے آپ پریشان ہو گئی۔

سوتے جاگتے کے وہ خواب اور حسین تصورات جبکہ اُس کا جسم یہاں اور ذہن اُس کے میکے کے باغ میں پہنچ جاتا ــــــ اناروں کے خوبصورت پیڑوں تلے ــــــ جہاں سر پر سُرخ سُرخ کلیوں کے یاقوت جگمگا رہے تھے۔ سامنے رنگ رنگ کے پھولوں کی حسین کیاریاں تھیں! وہ اپنے آرٹسٹ دوست کے ہاتھ میں ہاتھ دئے محبت کے عہد و پیماں کر رہی تھی۔ وہ اُس کی سحر انگیز آواز اور ملکوتی فریبِ حُسن سے متاثر تھی جس نے اُس کی راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ عمر کے ابتدائی ماہ و سال میں وہ عارضہ اسے لاحق ہو گیا تھا جس نے اُس کی تمام زندگی کو ایک مسلسل تپ میں تبدیل کر دیا تھا!!

وہ ایک کروڑپتی تاجر کی اکلوتی بیٹی تھی ــــــ

اور وہ اُس کے کالج کا ایک گمنام سا فنکار جسے علم سے زیادہ فن سے پیار تھا جو آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا! جسے کالج کے فنکشن میں پہلی بار اسماء نے دیکھا اور جس نے زین کی صف میں سب سے پہلی قطار میں اسماء کو دیکھا... فنکار کی اُنگلیاں تاروں سے کھیلنے لگیں۔ لوگوں نے بہت حیرت سے اُسے دیکھا۔ جو فنکار ابھی ابھی کوئی ملکوتی دُھن بجانے میں محو تھا جس کا دل یہاں تھا اور وہ خود کہیں اور!

پہلی ہی ملاقات آخری ملاقات بھی ثابت ہوئی! ایک جاوداں اور ابدی ملاقات ــــــ جس میں حُسن کے قدموں میں عشق نے اپنا سارا اثاثہ قربان کر دیا۔ جب خیام نے ایک خط اُسے بھیجا اور اپنے سارے راز۔ ساری بے تابیاں۔ وہی روح کی

حُوریں

حُور ہے یارب جو مومن کے لئے
بھیج دے دُنیا میں دو دن کے لئے ــــــ امیر مینائی

جس میں لاکھوں برس کی حُوریں ہوں
ایسی جنّت کا کیا کرے کوئی ــــــ غالب

حُوریں نہیں مومن کے نصیبوں میں جو ہوتیں
بُت خانے ہی سے کیوں یہ بدانجام نکلتا ــــــ مومن

حُوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں ــــــ داغ

خدا کے سامنے حُوروں میں تم بھی مل جانا
تمھیں کو مانگنا ہے انتخاب کر کے مجھے ــــــ مضطر خیرآبادی

مرسلہ:- ایس۔ ایس۔ ہنکاری، ایم۔ اے، کلکتہ

جاذبِ نظر
حُسن
افغان کریم کیک

مکمل میک اپ ہے۔ کیونکہ آپ کی شباہت میں
فوراً دلکشی پیدا کرنے کے لئے کریم اور پاؤڈر
کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ نہایت خوبصورت
ڈبیہ میں بند۔ یہ ایک جما ہوا پاؤڈر ہے۔
جو ہر عورت کے لئے اشد ضروری
ہے خصوصاً ملازمت پیشہ
خواتین کے لئے۔ یہ آسانی سے
پرس میں رکھا جا سکتا ہے۔
اور آسانی سے لگایا
جا سکتا ہے۔





افغان سنو
بیوٹی ایڈز



ای۔ایس پاٹن والا ——— بمبئی ———

پکار اور لیک کر بناک تیغ کو الفاظ میں سمو دیا تھا۔ یہ خط خالد صاحب کو مل گیا جیسے انہیں کے لئے لکھا گیا تھا۔

انھوں نے اُس خط کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے یہ بچپن کی محبت ـــــ جو اپنے اندر دودھ کا سا اُبال رکھتی ہے لیکن درحقیقت ہوتی کچھ نہیں۔ اور اُسی زمانے میں اتفاقاً کرنل بخشی کی اتی اُن کا پیغام لے کر پہنچ گئیں۔۔۔ انھوں نے پیغام قبول کر لیا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب کرنل بخشی نے اپنے ہاں جشن میں اسماء کو سوگوار دیکھا تھا۔ وہ سمجھ بیٹھی تھی کہ خیام اُسے بھول گیا۔ وہ تو فنکار تھا، بھونرے کے مانند۔ کلی کلی پھول پھول سے رس اکٹھا کرنے والا۔ اُس کے تغافل کا گہرا صدمہ تھا اور اپنے ٹھکرائے جانے کا بے حد قلق۔۔۔ خالد صاحب نے اُسے جان بوجھ کر کرنل کی دعوت میں بھیجا تھا اور اُس کی عدم موجودگی میں خیام کو بلا بھیجا۔

"صاحبزادے! یہ خط آپ ہی نے تحریر کیا ہے؟" خالد صاحب کے بُشرے سے نرم دلی اور ہمدردی عیاں تھی۔ خیام کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"میں صرف دریافت کر رہا ہوں۔ آپ سے کسی قسم کی پُرسش نہیں کرتا۔ آپ اگر چاہیں تو یہ خط مجھ سے لے سکتے ہیں۔ میں اِسے رکھ کر کیا کروں گا جبکہ آپ ایسے محبت نامے جتنے چاہیں لکھ سکتے ہیں۔

پھر اُنھوں نے خط خیام کے سامنے میز پر ڈال دیا۔

"امارت و غُربت لاکھ اپنے معاشرے کی پیداوار ہوں لیکن اُن کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ ہم سب انسان ہیں! کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی لیکن یہ بھی روا نہیں کہ کسی کو روحی اذیت دی جائے۔ آپ کے جذبات کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ یقیناً آپ میں اچھا فنکار بننے کی پُوری صلاحیتیں موجود ہیں لیکن جب تک آپ ایک فنکار بن کر اپنے پاؤں پر نہیں کھڑے ہو جاتے، یہ محبت آپ کے گُزر بسر کا انتظام کیسے کر سکے گی۔ کیا صرف محبت ہی کے بل پر آپ ضروریاتِ زندگی سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ آپ کا خیال غلط ہے۔ میری بچّی آپ کے قابل نہیں ہے۔ بفرضِ محال وہ آپ کی اِس پیشکش کو قبول کرلے تو یہ بتلایئے آپ اُس کے معیار کے مطابق اُسے رکھ بھی سکیں گے؟ یہ میری بڑائی نہیں اظہارِ حقیقت ہے۔ اُس کا ماہانہ خرچ ہزاروں سے زیادہ ہے! اُسے اپنی یہ عادت ترک کرتے کرتے مُدّت گُزر جائے گی۔ آپ نالاں ہوں گے، وہ اپنی بھول پر پشیمان ہوگی۔ دونوں کی زندگی تلخ ہو جائے گی اور پھر یہ محبت جو آپ سے اِس وقت خودکشی کرا رہی ہے، اُس وقت نفرت بن کر قاتل بنا دے گی! ــــ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے مالی مدد لے لیجئے۔ آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جایئے۔ اُس وقت تک میں بھی انتظار کروں اور آپ بھی۔ اگر یہ صورت منظور ہو تو بسم اللہ! کتنی رقم کا چیک لکھوں؟"

اگر وہ اُسے مارتے پیٹتے، ذلّت و رُسوائی سے اپنے ملازموں سے دھکّے دلوا کر اُسے کوٹھی سے نکلوا دیتے تو شاید وہ اِتنی شرم و ندامت محسوس نہ کرتا۔ لیکن یہ سلوک اُس کے لئے باعثِ خجالت بھی تھا اور باعثِ حیرت بھی!!

وہ شہر سے چلا گیا اپنی برباد محبت کو سینے سے لگائے۔ پھر اُس نے سُنا کہ بڑی دھوم دھام سے مِس خالد کی شادی کرنل بخشی سے ہو گئی تھی۔

پھر اُس کا فن غم کی آبیاری سے نکھرتا گیا، سنورتا گیا۔ بڑی بڑی سوسائٹیوں میں وہ بیٹھتا تھا لیکن کھوکھلے قہقہوں اور بے سود فلسفیانہ بحثوں کے پیچھے اُس کا غم کسی نے نہ جانا۔ پھر وہ برسوں بعد اپنے وطن واپس آیا لیکن دل کی جگہ ماضی کا کھنڈر تھا۔ وہ خود کھنڈر تھا۔

کبھی اپنے برباد کرنے والے کا نام بھول کر بھی نہ لیا۔ انسان خود برباد ہوتا ہے اپنے دل کے ہاتھوں، جذبات کے ہاتھوں!! اُسے کوئی برباد نہیں کرتا۔

ایک شاندار محفلِ رقص و سرود میں کرنل بخشی اُس سے متعارف ہوئے۔ اس کی زندگی کی خاکستر میں کچھ ایسی تپش زا چنگاریاں بھی تھیں کہ کرنل بخشی کا ذہن گرما گیا۔ بے اختیار اُن کا دل اُس کی طرف کھنچ گیا۔

'وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ اِتنا ماہر فنکار! اور ایسی بدترین حالت ہو!' اُنھوں نے سوچا۔ 'وہ اُسے رفتہ رفتہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کی طرف واپس پھیر لیں گے'

کرنل بخشی اُس کے خلوص سے متاثر تھے اور وہ کرنل بخشی کی معصومیت پر متبسّم! دونوں بے تکلّف دوست تھے اور اِس طرح وہ اُن کے گھر آنے جانے لگا۔ اُن کے بچّوں سے اُسے والہانہ پیار تھا لیکن وہ اُن کے ہاں جب تک رہتا۔ کمپاؤنڈ یالان ہی کی بچھی ہوئی نشستوں پر بیٹھا رہتا۔ کبھی اندر نہ گیا اور نہ بیگم بخشی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

بیگم بخشی اپنی جگہ جس زندہ موت سے ہمکنار تھی اُس کا احساس اُسے بھی نہ تھا۔ وہ یہ سوچ چُکی کہ اب اُس کی زندگی کے دن بہت کم ہیں۔ وہ غمناک موت مرے گی۔ یقیناً خیام نے اُن سے سب کچھ کہہ دیا ہوگا۔۔۔ یا پھر کہہ دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ اندر ہی اندر کوئی اسکیم اور بنا رہا ہو۔ کرنل کو اپنے اعتماد میں لے لے۔۔۔ شاید وہ اِسی وجہ سے بے پروائی اور بے انصافی برت رہے ہیں۔ اُن کی محبت اور پُرخلوص آنکھوں میں بے اعتنائی کی لہریں دیکھ رہی تھی۔ یہ احساس اُس کے جُرم کا غمّاز تھا۔ حالانکہ کرنل کا دل صاف تھا۔ وہ یہ نہ سوچ سکے تھے کہ کوئی گہرا تعلق یا رسمی شناسائی بھی خیام اور اسماء کے درمیان ہے یا ہو سکتی ہے۔ یہ تو اُس کا اپنا احساسِ ضمیر تھا جو ندامت اور جُرم کی نئی نئی شکلیں بنا کر اُسے ڈرا رہا تھا۔ چڑا رہا تھا۔

وہ شب و روز کے اِس اضطراب میں اپنی روزمرّہ کی زندگی سے بیگانہ بننے لگی۔ بس وہ آتے جاتے ہر وقت ہر گھڑی کرنل کا مُنہ دیکھتی رہتی جس پر اُس کے

خیال میں نہایت ہی خشونت اور تنفر کی جھلکیاں ہوتی تھیں! اور کرنل بخشی اسماء کو دیکھ کر سوچتے تھے اب مرض علاج کی حد سے گزر گیا ہے۔

اسماء دیکھ رہی تھی، سالہا سال کا بنا بنایا گھر محض اُس کی ایک ہنگامی غلطی سے جہنم بن رہا ہے جس کا مداوا صرف اُسی کے پاس ہے۔ یہی کہ وہ رو رو کر اور اپنے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر صاف کہہ دے کہ شادی سے پہلے خیام کی محبت صرف ایک دھوکا اور ناسمجھی تھی جس کا کوئی اثر اب اُس پر نہیں ہے!! خیام جو کچھ کہتے ہیں وہ جھوٹ ہے، غلط ہے!

پھر وہ سہم جاتی۔ سوچتی — ہو سکتا ہے خیام نے ابھی تک کرنل سے کچھ بھی نہ کہا ہو تو وہ کیوں اپنی رُسوائی اپنے ہاتھوں مول لے۔

ایک دن اُس نے تہیہ کر لیا کہ وہ یا تو کرنل سے کہہ کر اپنی بے چینیوں کا خاتمہ کر دے گی یا پھر خیام سے کہہ دے گی وہ اُس پر رحم کرے۔ چاہے وہ دن اُس کی زندگی کا آخری ہی دن کیوں نہ ہو!! اِس فیصلہ کے بعد وہ خود بخود پُرسکون ہوتی گئی۔

ابھی کرنل نہیں آئے تھے۔ وہ اُن کے انتظار میں کھڑی تھی۔ وہ لان سے واپس مڑ رہی تھی کہ اُسے انار کی روشوں پر خیام نظر آیا۔ ننھی تبسم کا ہاتھ پکڑے وہ اُسی طرف آ رہا تھا۔ یک بیک اُس کی نظروں میں تاریکی چھا گئی۔ یہی وقت کرنل کے آنے کا ہے۔ اگر اُنھوں نے دونوں کو باتیں کرتے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟"

آن کی آن میں ہزاروں ہیبت ناک خیال آئے اور گزر گئے۔ خیام اُسے بُرا بھلا کہے گا۔ جھوٹے عہد و پیمان پر لعن طعن کرے گا۔ دلخراش طعنے دے گا اور شاید اُسے بدلہ لینے کی دھمکی بھی دے، یا یہ کہہ دے کہ اُس نے کرنل سے سب کچھ کہہ دیا ہے یا کہہ دے گا۔

لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ تو اسماء کو اُسی دن معاف کر چکا تھا۔

اور اب وہ بخشی کا دوست تھا جس کے دل میں کوئی کدورت کوئی عداوت نہ تھی۔

وہ اُس کے پاس آیا۔ وہی دلفریب و پُرمحبت مُسکراہٹ اُس کے خشک ہونٹوں پر بکھری ہوئی تھی۔ اشتیاقِ دید میں اُس کا سارا جسم ایک آنکھ بن گیا تھا۔

"آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی!"

"میری خوشیاں برباد کر کے!؟ آپ مجھ سے بدلہ لے کر خوش نہ رہیں گے!"

"آپ کی خوشیاں برباد کر کے؟ آپ سے بدلہ لے کر!؟" وہ ہنسا۔ "آپ سے بدلہ لینے کا خیال تو ایسا ہی ہے جیسے میں اپنے دل پر بندوق رکھ کر گولی چلا دوں۔ آپ دوسرے کی ہو گئیں لیکن میں نے آپ کو ویسے ہی چاہا ہے جس طرح میرے دل نے چاہا۔ آپ کی ہستی میرا معبد ہے۔ کیا یہ سجدہ گاہ میں اپنے ہاتھوں تباہ کر دوں گا؟"

پھر دیرینہ محبت نے اسماء کے دل میں ہلچل مچا دی۔ یقیناً وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ ناقابلِ فہم حد تک بلند اور عظیم!!

"اب مجھے بھول جایئے۔ اِس زندگی سے کیا حاصل جو کسی کے کام نہ آ سکے!"

"میرے لئے کوئی لائحہ عمل... کوئی نصب العین بتا دیجئے!" وہ پھر ملتجی ہوا۔

"آپ شادی کر لیجئے!" بے ساختہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"کیا اِس طرح آپ کو اطمینان ہو جائے گا؟"

"میری خوشیاں مجھے واپس مل جائیں گی!"

"اگر آپ کی خوشی میری آخری بربادی میں پنہاں ہو تو یہ بھی سہی بیگم بخشی! خدا حافظ!!"

اُس شام خیام نہیں آیا۔ آج جیسے کسی نے اُسے سالہا سال کی لاعلاج بیماری سے صحت یاب کر دیا تھا۔

اُس رات کرنل دیر سے لوٹے۔ وہ خاموش تھے۔

دفعتہً اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کہیں خیام نے عہد شکنی تو نہیں کی!!

"میں ایسا نہیں سمجھتا تھا خیام کو!" کرنل نے آرام چیئر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا ہوا اُنھیں؟"

"آج ہی شام کلب میں سب اکٹھا تھے۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ نہایت بھونڈے مذاق ہو رہے تھے۔ خیام بہت دیر سے یہ سب دیکھ رہے تھے اور پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ جیسے ہی وہ تینوں دوست لڑکی کے ساتھ اُٹھنے لگے یہ بھی اُٹھ گئے اور لپکا ایک لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا!! پھر اُن سے بحث کرنے لگے۔ میں نہیں کہہ سکتا وہ کتنے پُرجوش معلوم ہو رہے تھے۔ لڑکی حالات کی ستائی ہوئی تھی۔ وہ رو رو کر کہنے لگی: اُس کی اندھی بیوہ ماں ہے۔ چھ سات بھائی بہن ہیں۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ وہ سب کو اپنی آنکھوں کے سامنے بھوکوں مرتے نہیں دیکھ سکتی تھی — یہ کہتے کہتے لڑکی کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔"

"پھر اسماء!" کرنل آگے جھک آئے۔ "میری آنکھوں نے ایک تماشا دیکھا۔ خیام اُس لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے، اُسے سہارا دینے کا وعدہ کیا۔ وہ لوگ جو اُس لڑکی کو اپنی دلبستگی کا سامان سمجھتے تھے، گواہ بنے اور کلب ہی میں نکاح ہو گیا۔ پھر وہ اُس لڑکی کو لئے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔"

اسماء بُت بن گئی۔

"خدا کی دُنیا میں سب ہی شیطان نہیں!" کرنل نے کہا۔ "بعض انسان بھی ہیں!!"

غزلیں

سعادت نظیر ایم اے

مجھ سے وہ دور ہیں، قریب کہاں
میرے دل کو سکوں نصیب کہاں

اُن کے آنے کی آس باقی ہے
شبِ فرقت ابھی مہیب کہاں

کیوں نہ سمجھوں خوشی کو غم کا مآل
غم نہ ہو تو خوشی نصیب کہاں

عشق والوں کو عشق سے ہے غرض
عشق میں ہے کوئی رقیب کہاں

حادثے ایسے روز ہوتے ہیں
حادثہ دل کا اب عجیب کہاں

آپ ہی کا ہے یہ کرم ورنہ
غم کہاں، اور غم نصیب کہاں

محرمِ رازِ زندگی ہوں نظیر
مجھ سا دنیا میں خوش نصیب کہاں

کرشن کمار طوؔر

فروغِ شمعِ شبستاں تلاش کرتا ہوں
ترا جمالِ فروزاں تلاش کرتا ہوں

یہ سادگی کہ فراموش کارِ دنیا میں
نشاطِ وعدۂ جاناں تلاش کرتا ہوں

تو مجھ سے عظمتِ یزداں کی بات رہنے دے
میں آج عظمتِ انساں تلاش کرتا ہوں

سیاہ خانۂ ہستی کہ اِن مکینوں میں
جمالِ ماہِ درخشاں تلاش کرتا ہوں

ترے جمالِ دلآرا، ترے شباب کی خیر
میں اپنے عشق کا عنواں تلاش کرتا ہوں

یہ دورِ نو ہے جنوں کا ہے اب نیا رُجحان
نئے سلاسل و زنداں تلاش کرتا ہوں

شراب ریز اُن آنکھوں میں ڈوب کر اے طوؔر
سکونِ روح کا ساماں تلاش کرتا ہوں

کیف احمد صدیقی

حُسن کے عشرت کدے میں عشق کا ماتم ہوا
کل جو تھا شہرِ مسرت، آج شہرِ غم ہوا

اب وفورِ غم میں یہ احساس بھی مجھ کو نہیں
دردِ دل کچھ بڑھ گیا، یا دردِ دل کچھ کم ہوا

میرا ہر اک اشک اِک پانی کا قطرہ تھا مگر
خونِ دل کا رنگ پاکر شاہکارِ غم ہوا

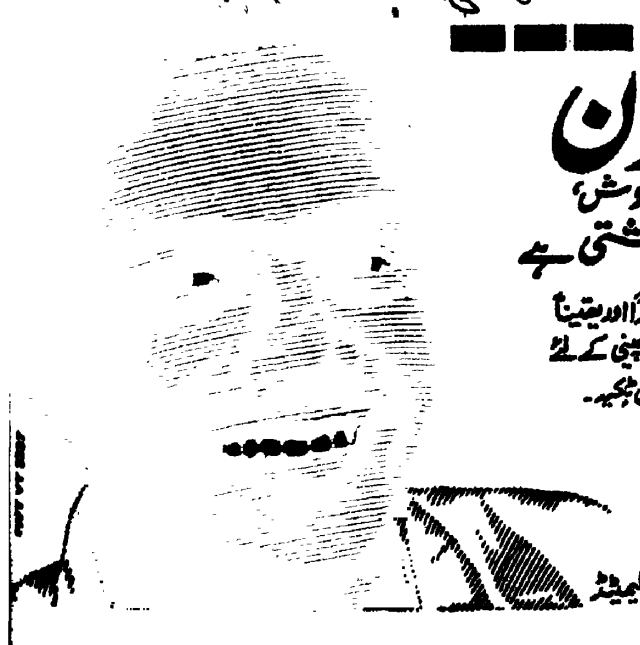
وہ یقیناً رو رہے ہیں آج میری یاد میں
دفعتہً کیوں میرا دامانِ تصور نم ہوا

صرف شبنم ہی نہیں صحنِ چمن میں غمزدہ
خندۂ گل سے بھی اکثر انکشافِ غم ہوا

میرے نالے سن کے دنیا خوابِ غفلت سے اٹھی
میرا رونا باعثِ بیداریٔ عالم ہوا

کیف تیری ہر غزل ہے آیتِ قرآنِ دل
تیرا ہر اک شعر پیغامِ خدائے غم ہوا


ایک اہم میچ کھیلنا ہے اور راج کی کمر میں درد ہے!
آج شام کو ہاکی میچ ہے مگر میں نہیں کھیل سکوں گا۔ میری کمر میں سخت درد ہے۔
ایک ٹکیہ سیریڈون کی لے لو۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔
راج سیریڈون لیتا ہے
اور پھر...
ارے واہ! میری کمر کا درد تو غائب ہو گیا! سیریڈون بہت عمدہ چیز ہے۔



افسانہ

آنسو جو بجھ گیا

یم۔ یوسف ہستی

انڈسٹریز اینڈ کامرس ڈیپارٹمنٹ۔ چراغ علی لین۔ حیدرآباد سٹی (آندھرا پردیش)

۱۹ اگست ۱۹۶۶ء مکرمی و معظمی خورشید صاحب! تسلیم

... ایک کہانی "آنسو جو بجھ گیا" مرسلِ خدمت ہے۔ زیرِ نظر کہانی ذرا طویل ہو گئی ہے لیکن زندگی کے بعض حقائق بھی تو طویل تر ہوتے ہیں نا؟ —— پوری کوششوں کے باوجود میں اِس کے کسی حصّے یا جُز کو حذف کرنے سے معذور رہا کیونکہ ایسی قطع بُرید کسی انسانی جسم سے عضو یا حصّے کو کاٹ دینے کے برابر ہوتی —— اب آپ ہی غور فرمایئے کوئی اپنے جسم کے کسی حصّے یا عضو کو کاٹنا پسند کرتا ہے؟ . . .

خلوص آگیں —— یم۔ یوسف ہستی

میں کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ میں ایک خاموش سمندر کے مانند جس کی تہہ میں ہزاروں بے چینیاں اور بے قراریاں چھُپی رہتی ہیں، زندگی گزار دینا چاہتی تھی۔

میں چاہتی تھی کہ میری خاموشیاں میری زندگی کا لوازمہ بنتی چلی جائیں اور لوگ یہی محسوس کرتے جائیں کہ میں کم سخن ہوں —— کم آمیز ہوں —— یہاں تک کہ مغرور ہوں —— خود پسند ہوں!!

ایک طویل مُدّت سے میرے جاننے پہچاننے مجھ سے اِنہی ناموں، القابوں سے مخاطب ہیں اور میں اِن ناموں سے بڑی حد تک مانوس بھی ہو گئی ہوں اور پُوری سعی و مستعدی سے اِن خطابوں کو نبھا رہی ہوں۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کبھی کبھی حالات بلا سوچے سمجھے بھاری بھاری ذمّے داریاں سروں پر ڈال دیتے ہیں اور ایک فرض شناس، محنتی و ذہین انسان ان کی بجا آوری کی کوشش کرتے ہوئے پُوری طرح عہدہ برآ ہو کر اپنے آپ کو "ذمّے دار لوگوں" کی فہرست میں شامل کروا لیتا ہے۔

کچھ یہی حالت میری بھی رہی کہ میں چہکنے نہ پائی تھی کہ خاموش کر دی گئی —— کِھلنے نہ پائی تھی کہ سنجیدہ کر دی گئی۔ زندگی سے یہ نامُراد سمجھوتہ میں نے اِس لئے کر رکھا تھا کہ لاکھ مجھے احمد سے جذباتی لگاؤ نہ سہی پھر بھی اُس سے ہمدردی ضرور تھی۔

اُس سے مجھے محبت نہ سہی لیکن اُس کی نیک نامی ضرور عزیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے اوپر سنجیدگی کی چھاپ لگا رکھی تھی۔ اپنے قہقہوں پر تالے ڈال رکھے تھے، اپنی مچلتی آرزوؤں کو مُقیّد کر رکھا تھا تاکہ کسی دن خود میرے دل کا چور پکڑا نہ جائے اور یہ سب کچھ اُس ہمدردی کے تحت تھا کہ میں احمد کی دل آزاری پسند نہ کرتی تھی۔ دُنیا کو اُس کی زندگی کا وہ رُخ نہیں دکھانا چاہتی تھی جو داغدار تھا۔

میں چاہتی تھی وہ ہمیشہ کی طرح بولتا رہے۔ میں اُس کی چمکدار آنکھوں کو دیکھ کر اور پُرکشش باتوں کو سُن کر دل ہی دل میں نشہ سا محسوس کرتی تھی۔

لیکن —— اب شاید یہ سمندر خاموش نہ رہ سکے —— یہ زندگی کی اداکاری کا چربہ اُتار پھینکے اور میں وہ سب کچھ کہہ گزروں جو اب تک ایک راز کی طرح میرے سینے میں دفن رہا۔

اُف! کتنی تکلیف ہوتی ہے کسی کے راز کو افشا کرنے میں!! کتنی بے چینی اور اذیت پہنچتی ہے اپنی زندگی کے اُس رُخ کو پیش کرنے میں جس پر دُنیا کی کبھی نظر نہ پڑی ہو! جس پر عرصۂ دراز تک ہم مصلحت کے پردے ڈالتے رہے ہیں!

احمد سے پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ ہمارے ہاں ایک تقریب میں آیا تھا۔ اُس وقت میں عمرِ شعور کی بس اٹھارویں منزل میں داخل ہو رہی تھی اور وہ تعلیم سے فارغ ہو کر ایک مشہور فرم میں کام کر رہا تھا۔ اُس کے بات کرنے کا انداز بہت ہی دلآویز تھا اِس لئے پہلی ہی ملاقات میں باتوں کا سلسلہ اِتنا طویل ہوا اور یوں محسوس

ہونے لگا جیسے یہ پہلی ملاقات نہ ہو برسوں کی بچھڑی ملاقات کی تجدید ہو!

اُس کے لئے باتوں کو دلچسپ اور طویل کرنے کے لئے TOPICS کی کمی نہیں رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دل نشین انداز میں مُردہ TOPIC پر بھی کچھ کہا جائے تو سُننے والا محو سا ہو جاتا ہے۔ کچھ یہی حالت میری بھی رہی اور ——— پھر میری عمر و فکر ایسی کوئی سی تازہ اور بلند سطح کے TOPIC کو تلاش کر سکتی!!

مجھے اندازِ بیان بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا اور میں بہت دیر تک سُنتی رہی اور شاید پہلی ملاقات میں کوئی اتنی دیر کسی کو کہنے اور سُننے کا موقع نہ دیتا ہوگا۔

بہت رات گئے جب وہ جانے کے لئے اُٹھا تو مجھے اُس کے دیکھنے کی ادا اور الوداعی انداز بھی پسند آیا تھا۔

"اچھا تو اب اجازت دیجئے۔ یوں پہلی ہی ملاقات میں کُھلی کتاب بن جانا کسی کو

- اگر دشمن صلح کر لینے کی خواہش ظاہر کرے تو تم بھی صلح کر لو۔ (قرآن پاک)
- جب رشوت دروازے سے داخل ہوتی ہے تو امانت کھڑکی کی راہ سے نکل جاتی ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جو قدرتِ انتقام کے باوجود غصہ ضبط کر جائے، خدا اُس کے قلب کو طمانیت سے معمور کر دیتا ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- گناہ کو چھوڑ کر باقی تمام معاملات میں لوگوں سے اتفاق کرنے کا نام حُسنِ خلق ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- عقل مند وہ ہے کہ اگر خیر و شر کی کشمکش میں مبتلا ہو تو بہتر راستہ اختیار کرے۔ (حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ)

معیوب نظر آئے لیکن میں فطرتاً اسی انداز کو پسند کرتا ہوں ——— انشاء اللہ پھر ملوں گا خواہ آپ کسی دعوت کا انتظام بھی نہ کریں کیونکہ مجھے آپ سے مل کر رسمی ہی خوشی نہیں ہوئی بلکہ پُوری حد تک آپ کی ضیافت، آپ کا خلوص اور آپ کا ماحول پسند آیا۔"

اُس کے جانے کے بعد بھی دیر تک اُس کا لہجہ، اُس کے الفاظ فضا میں جیسے گُونجتے رہے۔ دوسرے دن جب فرصت ملی تو اُس کی دلآویز باتوں کا خیال آتا رہا لیکن تعلیمی اور دوسری مصروفیتوں نے اِس خیال کو کچھ اُبھرنے نہ دیا۔

رات اور دن کی گردشیں چلتی رہیں اور اُس دوران احمد سے دو تین مرتبہ پھر ملاقاتوں کا موقع ملا۔ وہی میٹھا لہجہ اور وہی دلآویز اندازِ گفتار!

میں اس دوران انٹرنس میں کامیاب ہو گئی تو اُس نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

"میں فصیحہ، رسمی طور پر اگر مبارکباد دوں تو شاید آپ اسے بداخلاقی پر محمول کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں رسمی باتوں کا قائل ہی نہیں ——— اگر ہم مسرتوں اور خوشیوں کو الفاظ میں پیش کریں تو جذبات و احساسات میں وہ گرمجوشی قائم نہیں رہتی جو اُن کا حصہ ہیں۔ اگر میرے مسرت انگیز جذبات کو آپ کے جذبات محسوس کر لیتے ہیں تو سمجھئے میری پیشکش پُر خلوص ہے ورنہ ——— اِن بے کیف لفظوں میں رکھا کیا ہے!؟"

اِن لفظوں کو سُن کر اِس بار مجھے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی اور ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی مبارکباد کو میں نے اپنے دل میں جذب کر لیا ہے اور ——— بہت دیر تک تنہائی میں اِس انوکھے انداز پر مسرور ہوتی رہی لیکن ——— ساتھ ہی ایک انجانے جذبے نے کچھ ایسا خوف سا طاری کیا کہ میری روح یکدم سہم سی گئی۔

"نہیں! اِس مبارکباد میں کسی اور جذبے کا ہرگز دخل نہیں۔ نہ اُس کی نیت میں کچھ کھوٹ نظر آتا ہے نہ اُس کی باتوں میں پیچ۔ دانتوں سے اللہ بچائے ——— چپ!"

طبیعت کی بےکیفی کو دُور کرنے کے لئے میں نے ریڈیو کو آن کیا اور نغموں سے سرشار ہو کر جانے کب سو گئی۔

چند دنوں بعد مجھے کالج میں داخلہ مل گیا۔ اُس نئی فضا میں سانس لیتے ہوئے میں بے حد خوش تھی اور دل ہی دل میں کہہ لیا کرتی۔

"کتنی آسودگی ملتی ہے کالج کی زندگی میں! اِس تعلیم میں جو ذہن کی تربیت میں پُورا پُورا حق ادا کرتی ہے اور آدمی کو انسان بنا کر ہی دم لیتی ہے ——— انسان!"

پھر نئے نئے دوست بنتے گئے۔ راج لتا، سادھنا، روزی اور رضیہ۔ اِن چاروں کو پا کر میں یوں مسرور تھی جیسے ایک خوش رنگ و خوبصورت گلدستہ میرے ہاتھ آ گیا ہو!

ایک دن رضیہ نے چُہل کیا۔

"فصی! کتنا خوش نصیب ہوگا وہ جو تیری صندلیں بانہوں کی خوشبو ہمیشہ..."

"رضو! دیکھ جو پھر کبھی ایسی بات کی! بولنا بند کر دوں گی ہاں! ہم یہاں ذہن و قلب کی پاکیزگی بھی سیکھنے آتے ہیں، ذہن میں گندگی پیدا کر لینے نہیں!" میں نے پُوری سنجیدگی سے کہا۔

رضو سہم گئی تھی میری اِس سنجیدگی پر! اور پھر اُس کی زبان اِس بات میں کبھی نہ کُھلی۔ اُس دن میں خوش خوش گھر لوٹی دل میں یہ خیال لئے!

"کتنی پیاری ہے میری رضو! جیسے میری بات کو بزرگانہ نصیحت سمجھ کر چُپ ہو گئی! سچ پُوچھو تو دوستی کی ناک ہے رضو!!"

گھر پہنچی تو ممی نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

"باجی! آپ کا خط ــــ"

"میرا خط ــــ!؟" میں نے حیرت سے کہا اور خط کھول کر پڑھنے لگی۔

ایک ایک سطر پر میرے ابرو تنتے گئے اور خون میں حیا اور غصّے سے روانی بڑھتی گئی لیکن زبان سے کچھ کہہ نہ سکی۔

آخر کہتی بھی تو کیا ــــ؟ اور کس کے آگے ــــ؟ کس رومانٹک انداز میں مخاطب کیا تھا احمد نے۔ جیسے میں نہ ہوتی سنگِ مرمر کی کوئی مورتی ہوئی کہ کچھ محسوس بھی نہ کر سکوں!

میں غصّے سے بھری باورچی خانے کی طرف چل پڑی اور سب کی نظریں بچا کر اُس خط کو چولہے میں جھونک آئی۔

نجمی سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

پھر جب ذرا دل سے غبار چھٹا تو چائے کی چسکی لیتے ہوئے غور کرنے لگی۔

"کتنے جذباتی ہوتے ہیں یہ مرد؟ آخر احمد نے کیا سمجھ کر ایسی حرکت کی؟ کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو؟ میں کوئی فلم کی ہیروئن ہوں کہ ایسی قصیدہ سرائی سے خوش ہو جاؤں!"

نان سنس ــــ منہ پھٹ!!"

رات بہت دیر تک رضیہ کا دیا ہوا ناول "سنگ اور سنگدل" پڑھتی رہی اور جب سونے لگی تو ایسا محسوس ہوا جیسے دل پر ایک بوجھ سا ہے لیکن یہ بوجھ لاکھ نیا سہی پھر بھی خوشگوار محسوس ہوا اور ــــ میں سکون سے سو رہی۔

پھر جب میں فرسٹ ایر سے بی۔ اے فائنل میں آگئی تو احمد کے خطوط بھی اکثر ملنے لگے۔ اُن دنوں میرا دھیان صرف اُس طرف تھا کہ فائنل اچھے نمبروں میں نکالوں لیکن یہ خطوں کی بوچھار، ذہنی انبساط سے زیادہ انتشاری کیفیت کی تخلیق کر رہی تھی اِس لئے میں نے یوں آئے دن خطوں کو پڑھ کر چُپ رہنے کے بجائے ایک تُند و تُرش جواب لکھ بھیجنے کی ٹھان لی تاکہ نجات ہی ملے!

ایسا ارادہ باندھنے کے دوسرے دن میں کالج سے جلد ہی لوٹ رہی تھی کہ احمد سائیکل پر جاتا ہوا نظر آیا۔ تھوڑی دیر کے لئے غصّے کی چند تیز تیز لہریں میرے دل میں اُٹھیں اور ــــ پھر سنجیدگی کی تہہ میں ڈوب گئیں۔ میں اگر رکشا میں نہ ہوتی تو شاید اُس سے ذہنی آزار دینے والی حرکتوں کی باز پُرس کرتی۔

اور وہ سائیکل میرے رکشا سے آگے لے کر نکل گیا۔

کاش اُسے معلوم ہو جاتا کہ اُس کے خیالوں کی ملکہ رکشا میں بیٹھی اُس سے ذہنی جنگ لڑ رہی تھی۔ میں نے پھر تہیہ کر لیا کہ گھر پہنچتے ہی آج ضرور لکھ ایک ایسا خط لکھ ڈالوں کہ وہ ساری زندگی میرا نام دھرلے!

میں ابھی رکشا سے اُتر کر گھر میں قدم رکھ ہی رہی تھی کہ نجمی نے فرطِ مسرت سے کہا۔

"ارے آپ آگئیں باجی! امّی خود آپ کو آج ذرا جلدی لوٹ آنے کے لئے فون کرنے والی تھیں۔ آج احمد بھائی کے ہاں دعوت جو ہے ہم سب کی! آپ بھی چلیں گی نا؟ چلئے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لیجئے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ احمد بھائی نے تو آپ کو خاص طور پر لانے کے لئے کہا ہے۔"

میں نجمی کی باتوں پر ہنس پڑی لیکن اندر ہی اندر بل کھا کر رہ گئی۔

"کاہے کی دعوت ــــ؟ کون جاتا ہے اُن کے ہاں؟ اور کیوں جائیں؟ پوچھتی ہوں نا امّی سے!"

- خدا کی عظیم طاقت تیز و تُند طوفان میں نہیں ہلکی نسیم میں ہے۔ (ٹیگور)
- اندر کی آنکھ روشن کرنا چاہتے ہو تو باہر کی آنکھوں کو بُرائی دیکھنے سے روک لو۔ (سوامی سار شبدانند جی)
- بچوں کے لئے دولت چھوڑنا چاہتے ہو اُن کے لئے سداچار کی دولت چھوڑو۔ (ٹھاکر سری چند جی)
- علم پڑھ کر عمل نہ کرنے والا اُس بھڑ کی طرح ہے جو ڈنک تو مارتی ہے لیکن شہد نہیں بناتی۔ (سوامی سار شبدانند جی)
- جو کسی کو حقیر نہیں جانتا اُسے کوئی بھی حقیر کہنے کی جراٴت نہیں کر سکتا۔ (سوامی سار شبدانند جی)

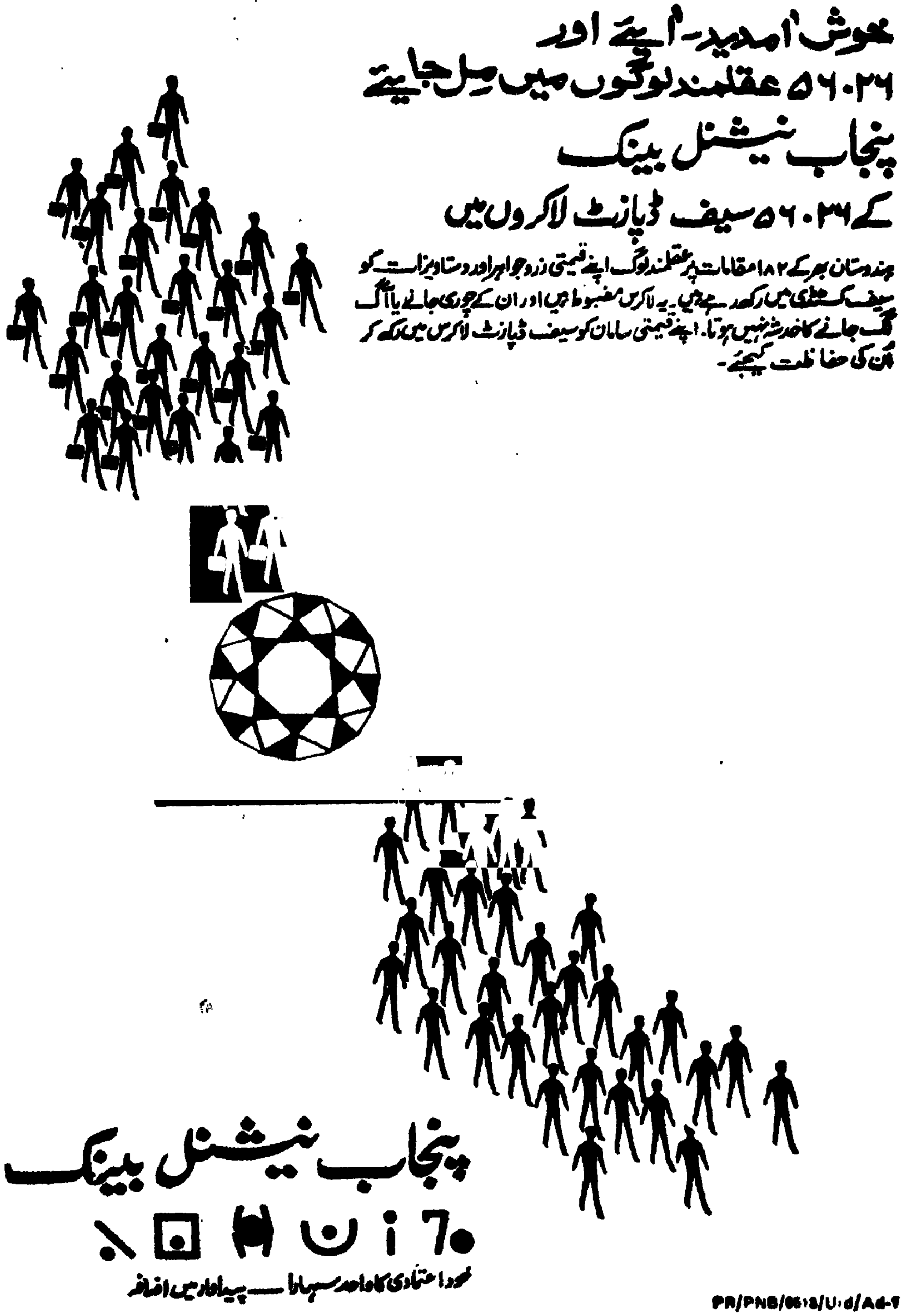
میں نے دالان میں قدم رکھا ہی تھا کہ امّی نے وہی دُہرایا جو ابھی نجمی نے کہا تھا۔

"یہ اچانک کاہے کی دعوت تہنیت کی ہے احمد صاحب نے؟" میں نے جلے بُھنے انداز میں کہا۔

"اچانک ــــ! ہاں اچانک ہی دعوت دی گئی ہے! ترقی جو اچانک ــــ ملی ہے احمد کو ــــ! منیجر ہو گیا ہے اپنی فرم میں! محنتی اور دیانت دار جو ٹھہرا!!"

"رومانٹک اور باتونی جو ٹھہرا۔۔" میں زیرِ لب بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

کپڑے تبدیل کرنے تک کئی خیال اور جذبے حبابوں کی طرح اُبھرتے اور ڈوبتے گئے۔ بالآخر جب سب تیار ہو کر بیٹھے اور چلانے لگے تو میں ایک ہلکی شلوار



خوش آمدید - آیئے اور
۵۶۰۲۶ عقلمند لوگوں میں مل جایئے
پنجاب نیشنل بینک
کے ۵۶۰۲۶ سیف ڈپازٹ لاکروں میں
ہندوستان بھر کے ۱۸۲ مقامات پر عقلمند لوگ اپنے قیمتی زر و جواہر اور دستاویزات کو
سیف کسٹڈی میں رکھ رہے ہیں۔ یہ لاکرس مضبوط ہیں اور ان کے چوری جانے یا آگ
لگ جانے کا خدشہ نہیں ہوتا۔ اپنے قیمتی سامان کو سیف ڈپازٹ لاکرس میں رکھ کر
اُن کی حفاظت کیجئے۔
پنجاب نیشنل بینک
خود اعتمادی کا واحد سہارا ــــ پیداوار میں اضافہ
PR/PNB/66-8/U-6/A6-7

شرٹ پہن کر، زرین اوڑھنی کاندھوں پر ڈالے، سینڈل کا تسمہ لگائے بغیر، بھاگ کر اُس موٹر میں سوار ہوگئی جو دعوت میں جانے والوں کو لے جانے کے لئے اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

موٹر میں بیٹھی، سینڈل کا تسمہ لگا کر یہی سوچتی رہی۔

'کاش آج مجھے تھوڑا سا موقع مل جائے اور میں بادلوں کی طرح احمد پر ٹوٹ پڑوں تاکہ وہ پھر کبھی چھیڑنے کی جرأت تک نہ کر پائے!'

اور۔۔۔ موٹر اپنی منزل پر آکر رُک گئی۔ سب اُترنے لگے۔ سب سے آخر میں میں اُتری تو احمد کی والدہ نے بہت ہی پیار بھرے لہجہ میں سلام کا جواب دیا اور ایک ساتھ کئی دعائیں بھی دے ڈالیں۔ میں یوں تو بظاہر مُسکرا رہی تھی لیکن میری غصّے سے بھری آنکھیں تو اُس کی تلاش میں تھیں جسے مزہ چکھانے کی نیت سے میں یہاں چلی آئی تھی لیکن میں پُوچھ نہ سکی کہ وہ کہاں ہے کیونکہ ایسا سوال کرتے ہوئے خود مجھے ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔

ماحول اگر محبت خیز و تسکین آمیز ہو تو نفرت و غصہ جیسے سنگین جذبے بھی آپ ہی آپ سرد ہو جاتے ہیں۔ کچھ یہی حالت میری اپنی بھی ہو رہی تھی۔

جب سب کھانا کھا چکے اور ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول ہوگئے تو میری نظریں ٹارچ لائٹ کی طرح اِدھر اُدھر گردش کرنے لگیں۔

پُختہ مکان کے آخری سرے والے کمرے سے احمد چند دوستوں کے ساتھ نکلتا ہوا نظر آیا۔ ٹارچ جیسے اُس پر آکر رُک سی گئی۔ دوستوں کو رخصت کرنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے کی طرف لَوٹا تو میں اُس کی نظروں کی زد سے بچ نہ سکی لیکن وہ تیزی سے اپنے کمرے میں داخل ہوگیا اور۔۔۔ مجھے نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرا ہی منتظر ہو! جیسے وہ میری ہی خاطر تنہائی پانے کے لئے اپنے دوستوں کو چھوڑ آیا ہو!!

میری کبیدگی اور بے چینی بَل کھانے لگی اور میں آہستہ آہستہ اُس کمرے کی جانب بڑھتی گئی اور۔۔۔ کمرے میں داخل ہو کر رُک سی گئی۔

ایک نرم آواز لہرا اُٹھی۔۔۔

'مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گی۔۔۔ تشریف رکھئے!'

میری بے چینی کو اِن لفظوں نے جیسے آنچ سی پہنچائی اور میں۔۔۔ ذہن میں سرد جنگ کا نقشہ بنا کر صوفے میں دھنس سی گئی فرش پر نظریں جھکائے۔

جانے کیوں میری زبان میرے ذہن کا ساتھ دینے سے معذور سی نظر آنے لگی اور بمشکل نظریں اُٹھا کر کمرے کی سجاوٹ کا جائزہ لینے لگی۔ دیواروں کی رنگ آمیزی، حسین مناظر کی تصویریں، نئے نئے نقش و نگار کے قالین، اُس کی سلیقہ مند طبیعت کا اظہار کر رہے تھے۔

پھر چند لمحے بعد وہ خود ہی بولا۔

"مجھے یقین ہے آپ مجھ سے ناراض ہوں گی۔ سچ پُوچھئے تو یوں خط لکھنا مجھے خود بھی پسند نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لکھنے کے لئے میں مجبور ہوا۔ اگر آپ میری جگہ بیٹھ کر غور کریں تو خود معلوم ہو سکتا ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اور کس جذبے کے تحت؟ میری باتیں لاکھ جذباتی سہی لیکن وہ خلوص سے عاری نہیں اور شاید ایسا نہ ہوتا تو آپ یوں کشاں کشاں چلی نہ آتیں!۔۔۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں خطوں سے نکل کر کُھلی کُھلی باتیں کروں!"

دفعۃً ایک زوردار آواز فضا میں بلند ہوئی اور یکدم ساری روشنیاں بُجھ گئیں اور احمد میرے بالکل قریب آکر اپنے ہاتھ میں میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہنے لگا۔

"ٹھہرئے! میں آپ کو دالان تک چھوڑ آؤں۔ نئی جگہ ہے کہیں آپ اندھیرے میں ڈر نہ جائیں!"

اور وہ مجھے دالان تک چھوڑ کر اپنے کمرے میں لَوٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اُسی کمرے نے پھر سارے گھر کو روشن و منور کر دیا۔

لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ساری بجلی میرے بدن میں دَوڑ گئی ہو!

چند لمحوں تک میں عجیب حالت میں گرفتار رہی اور میری ذہنی بے چینی اندر ہی اندر بَل کھاتی رہی لیکن روایتی رسم و رواج کو نبھاتے ہوئے میں اپنی امّی اور نجمی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں شریک ہوگئی تاکہ ذہن کا بار ہلکا سا ہو جائے اور۔۔۔ میرے اضطراب کو کوئی پڑھ نہ سکے۔ سمجھ نہ سکے۔

آدھی رات گزر جانے کے بعد ہم لوگ اپنے گھر لَوٹ آئے۔

میں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد لائٹ آف کر کے بستر پر دراز ہوگئی۔ نیند کیا آتی بھلا جبکہ قلب و ذہن پر انتہائی بار تھا۔ رہ رہ کر اپنی سہمی ہوئی خاموشی پر بار بار غصّہ آ رہا تھا۔ اپنے گُم سُم ہو جانے پر جی کُڑھ رہا تھا۔

'اُس نے کس بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے مُنہ سے اُف تک نہ نکلی!'

جانے کیوں کبھی کبھی حواس قابو میں رہ کر بھی بے بس ہو جاتے ہیں! جانے کیوں؟ وہ کیا کچھ نہ سمجھا ہوگا اُس خاموشی کو۔۔۔؟ میری بے بسی کو سپردگی سمجھا تو؟ مجھے یوں خاموشی اختیار نہ کرنی چاہئے تھی! لعنت ہے اپنی بزدلی پر جو دوسرے کے حوصلوں کی رہنمائی کرتی ہے! اب وہ کل سے میرے ہاں آنا شروع کر دے تو۔۔۔؟ اس تصور سے مجھے ایک طرح کی خوشی بھی محسوس ہوئی اور۔۔۔ پھر ایک انجانا خوف بھی طاری ہوگیا جو صبح بیدار ہونے تک مُسلّط رہا!

دو تین دن گزر گئے مگر احمد نہ آیا۔ مجھے اُس کا انتظار تو نہ تھا پھر بھی نہ جانے کیوں میں اُس کی منتظر سی رہی۔

کالج جانے کے لئے میں تیار ہوکر بس نکلنے ہی والی تھی کہ احمد سیدھا میرے کمرے کی طرف چلا آیا۔ میں یکبارگی ٹھٹک سی گئی۔ پھر جی ہی جی میں خوش بھی ہوئی کہ چلو بس ایک دو منٹ بات کرکے، کالج جانے کا وقت تو ہو ہی چکا ہے اسی بہانے جلد ہی گلو خلاصی کر لوں گی۔

وہ صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولا۔

"تو آپ کالج تشریف لے جارہی ہیں؟ اور مجھے آج چھٹی لینے کی سوجھی! چھٹی کی عرضی بھجوا کر آپ سے ملنے کے لئے چلا آیا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ اپنا تھوڑا سا تعلیمی وقت میرے لئے وقف کریں گی ——— وہ دوست ہی کیا جس میں ایثار اور مروّت کے جذبات نہ ہوں؟"

خاموشی کے منہ میں زبان سی آگئی اور انتقامی جذبہ بڑھنے لگا تو دوسری طرف ان لفظوں کی گرمی نے میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو جیسے پگھلا سا دیا اور کہہ اٹھی۔

"جب وقت کا خون کرنا ہی ٹھہرا تو۔۔۔"

میں ابھی آگے جملہ پورا نہ کر پائی تھی کہ درمیان ہی میں احمد نے کہا۔

"تو گویا آپ میری باتوں کو وقت کا خون کرنا تصوّر کرتی ہیں؟"

میں سٹپٹا سی گئی اور ——— پھر نہ جانے کیوں ایسی بات ہی نہ کہہ سکی جو میری خاموشی کا ردِعمل کہلا سکتی۔

اِس طویل ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔

مختلف عنوان سے تفریحی پروگرام بنتے گئے۔ تنہائیاں نصیب ہوتی گئیں۔ احمد کی شوخی، طرّاری، ذہانت، خوش گفتاری اور سلیقہ مندی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔

اور میں اُس کی شخصیت سے متاثر ہوتی گئی۔

میں محبت نہ کرنے کے باوجود اُس سے محبوبانہ سلوک کرتی رہی اور وہ مجھ پر نچھاور ہوتا رہا۔

جیسا کہ زمانے کا دستور چلا آرہا ہے، تھوڑے دنوں بعد ہمارے گھرانوں میں ہم دونوں کے نام ایک ساتھ لئے جانے لگے۔

جیسے جیسے میرا امتحان قریب آتا گیا احمد کا تصوّر بھی گہرا ہوتا گیا۔

چند ہفتوں کے بعد میں بی۔ اے میں کامیاب ہوگئی۔

اِس بار احمد نے شخصی مبارکباد دینے کے بجائے ایک طویل خط لکھا جس کا اختتام یوں تھا۔

"۔۔۔اب وہ لمحے ختم ہوگئے تھے! جو انتظار سے عبارت تھے۔

انتظار! ایک اذیتِ مسلسل جو شب و روز کی گردش کی طرح میری زندگی کا لازمہ بن چکی تھی ——— اب اس اذیت سے نجات ملنی ہی چاہئے تھی! تم میری روح میں تو سما ہی چکی ہو اب جلدی سے فیصلہ کر ڈالو کہ ہم جسمانی طور پر بھی ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں! ——— مجھے یقین ہے تم اب مزید انتظار نہ کرواؤ گی"

مستقبل کا تصوّر جیسے یکدم ابھر کر پیکر سا بن گیا اور دل نے جھٹ فیصلہ کر دیا۔

"ہمیں ایک ہو جانا چاہئے!"

عملی زندگی میں ایک لڑکی اس سے بڑھ کر اور کیا چاہتی ہے کہ اُس کا جیون ساتھی اُس پر مر مر جائے اور ——— مادّی طور پر وہ تمام خوشگواریاں میسّر ہوں جو مرد کے توسط سے ملتی ہیں۔

احمد منیجر ہے ——— مالی طور پر آسودہ حال ہے اور پھر ——— اُس کی وہ یکطرفہ محبت! ہوسکتا ہے کبھی نہ کبھی مجھے بھی بے اختیار چاہنے پر مجبور کر دے۔

لڑکی کے لئے خود اُس کا چاہنا اِتنا ضروری نہیں ہوتا جتنا چاہا جانا!

اب جو میں بے طرح اُس پر مہربان ہوں کیا اس میں کہیں محبت کا شائبہ نہیں؟ ہاں! اُس میں شاید وہ وحشیانہ پن نہیں جو جذباتی محبت کا خاصہ ہوتا ہے۔

میری محبت نما مہربانیوں نے میرے تصوّرات کو ایک نیا موڑ دیا ——— اور میں احمد کو اپنا محبوب نہ سہی مگر "اپنا مونس" ضرور سمجھنے لگی۔

انسان کی زندگی میں کبھی ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب اُس کا دل چاہتا ہے کوئی اُس سے پیاری پیاری باتیں کرے ——— اُس کی خوبیوں کے گُن گائے ——— اُس کی گفتار، رفتار، صورت، رنگت پر قصیدے کہہ سنائے اور کانوں میں مدبھرے گیت گونجتے رہیں اور ——— کوئی اپنی گرم گرم سانسوں کو اُس کے چہرے اور سینے پر پھیلا دے!

ایک سہ پہر میں اِنھیں لمحات میں کھوئی ہوئی تھی کہ ایسے میں احمد چلا آیا۔ میں نے نہایت گرمجوشی سے اُس کا استقبال کیا اور وہ اُس گرمجوشی سے فائدہ اٹھا کر بڑی ہی بے تکلفی سے میری کمر کے گرد ہاتھ ڈالے مجھے کمرے تک لے آیا اور میں کچھ نہ بول سکی!

پھر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے مجھے اپنے قریب کھینچ لیا۔

وہ خود بھی شاید رومانٹک موڈ میں تھا اِس لئے بہت دیر تک رومانٹک باتیں کرتا رہا اور بالآخر جذباتی ہو گیا۔

پھر اپنے اُس خط کا جواب مانگنے لگا جس میں فوری یکجا ہونے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔

میں نگاہوں سے کہہ تو رہی تھی لیکن وہ تو جیسے ہونٹوں کے ہلنے کا مشتاق تھا۔ میں نیم تشنہ گویا زبان کھولتی ——؟ کیا کہہ سکتی ——؟

جب اُس کی ضد نے اِس رومانٹک ماحول کو بدلنا چاہا تو میں جواب دینے کی بجائے اپنے ہونٹوں کو اُس کی آنکھوں سے مَس کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور —— مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اُسے "اپنا جواب" دے دیا ہو! خدا جانے وہ میرے اِس "جواب" کو سمجھ بھی پایا تھا کہ نہیں؟

دفعتہً نجمی کمرے میں آپہنچی اور "امی بُلاتی ہیں" کہہ کر احمد کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔

دھیرے دھیرے رات کی سیاہیاں ابر کی طرح چھانے لگیں۔ فضا میں حد سے زیادہ خُنکی تھی لیکن میرا جسم جیسے دہک رہا تھا —— پھر بھی میں "سیلنگ فین" آن کرکے سوگئی۔

ابھی میرے تصوّرات پُورے طور پر قلب و ذہن پر گہرے نہ ہو پائے تھے کہ ایک دن گھر آکر احمد نے انتہائی مایوسانہ لہجے میں یہ خبر سُنائی کہ اُس کا تبادلہ بنگلور کر دیا گیا ہے جہاں ایک نیا "شوروم" اُس کی نگرانی میں کام کرے گا اور اُسے چند ہی روز میں بنگلور کے لئے روانہ ہو جانا ہے۔

یہ سُن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا۔

"تو ترقّی پر ترقّی مِل رہی ہے اور تم مُنہ لٹکائے پھر رہے ہو؟ مقام ضرور دُور ہے اور نیا بھی لیکن بُرا نہیں! بلکہ بہت ہی صحت افزا اور خوبصورت ہے۔ اور تم بھُول ہی جاؤگے کہ تم وہاں کے لئے نئے تھے یا وہاں کی فضا ناموافق تھی۔"

میں کہنے کو تو یہ بات کہہ گزری لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خود میرا اعتماد بدل گیا ہو!

"میں اِس لئے ہراساں اور بے چین نہیں ہوں فہمی کہ بنگلور بھیجا جا رہا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں یہ بے قراریاں جو تھوڑا سا تمھارا قُرب پاکر قرار پا رہی تھیں پھر سر اُٹھانے لگیں تو کیا ہوگا؟ پھر کیا ہوگا ——؟ تم جانتی ہو میں کس حد تک جذباتی ہوں! تو پھر کس طرح اپنے آپ پر قابو پاسکوں گا؟

اِتنا کہہ کر وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

میری "طویل خاموشی" کا کوئی مطلب نہ نکال کر بوجھل بوجھل قدم اُٹھاتا ہوا کمرے کے صدر دروازے سے یوں نکل گیا جیسے کسی کے غمزدہ آنسو پلکوں پر آہستہ آہستہ جمع ہو کر بے آواز انداز میں ڈھلک جاتے ہیں!

اُس کے جانے کے بعد میں بے اختیار تکیہ میں مُنہ چھپا کر رونے لگی تھا کہ تکیہ میں جذب میرے آنسو میرے اِس غم اور صدمے کے گواہ رہیں جو اُس کی جُدائی کی خبر سُن کر آنکھوں میں اُبل آئے تھے۔

خدا جانے احمد کی یک جائی کی خواہش پُرخلوص تھی یا پھر خدا کو اُسے بے چین اور بے قرار رکھنا ہی منظور تھا کہ ہم "یک جان دو قالب" نہ ہو سکے۔

بنگلور جانے کے چند ہی ہفتوں بعد یہ خبر ملی کہ احمد کی شادی اُس کے گھر والوں نے فرم کے مالک کی لڑکی حُور بانو سے کر دی اور —— یہ تازہ ترقّی اور تبادلہ اِسی غرض و غایت سے تعلّق رکھتے تھے۔

مجھے اِس بات کا پُورا احساس ہے کہ احمد نے اِس شادی پر کتنا سر نہ پیٹا ہوگا۔ ایک ایسا پیاسا جس کے دونوں ہاتھوں میں امرت کا پیالہ تھا اور —— وہ صرف اِس لئے نہ پی سکا کہ اُس کی پیاس صرف آنکھوں ہی سے دیکھنے سے بجُھ جاتی تھی اور —— یہ خیال کہ ایک خاص وقت پر امرت پئے گا اگر —— وقت کی گردش دفعتہً ایسے پیاسے کو ایک قیمتی اور خوبصورت پیالے میں زہر آگیں امرت دے اور وہ پینے کے لئے مجبور کر دیا جائے تو اُس کی مجبوری کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے —— احمد بھی تو اِنہی حالات سے دوچار ہوا ہوگا!

لیکن —— نہ جانے کیوں دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے احمد نے امرت نہ پی کر مجھے دھوکا دیا ہو! میرے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہو! میری زندگی کا ایک خاکہ بنا کر خود ہی اُس پر سیاہی اُنڈیل دی ہو! میری خاموش محبت کو نیا موڑ دے کر خود بے مُروّت و بے وفا ہو گیا ہو!!

اِن احساسات کے ساتھ ہی ایک کرب ناک خیال میرے دل میں اُبھرا اور یوں محسوس ہوا جیسے یہ خیال یہ تصوّر میرے پلکوں کی آگ میں جل رہے تھیں اور میری نوُمیدہ خواہشیں، میری نوخیز کلیوں میں اُس آگ کی لپیٹ میں آگئی ہیں اور —— دسمبر کی اُس رات میں میرا رُواں رُواں کسی ریگستان کی تپتی ہوئی ریت میں جلتا ہوا —— جُھلستا ہوا محسوس ہوا!

اور —— جب میں نے نڈھال ہو کر تکیہ پر سر رکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے شبنم کے موٹے موٹے قطرے اُس میں ابھی ابھی جذب ہوئے ہوں!

شادی کے بعد بھی احمد کے خطوط برابر ملتے رہے جن میں اُس کی زندگی کا نیلام اور مجبوریوں کا دردناک انداز میں بیان ہوتا اور پھر لُطف یہ کہ وہ پھر اپنی "لازوال اور والہانہ محبت" کا یقین بھی دلاتا۔

میں اُن خطوں کو پڑھ کر مُسکرا لیتی اور اُس مُسکراہٹ کے پیچھے زہر ہوتا!
"محبت! محبت اور احمد کی ——؟ دوستی اور بچھو کی ——؟ محبت! جذباتی انسانوں کی ——؟"

میں کسی خط کا بھی جواب نہ دیتی جیسا کہ میرا ابتدا سے رویہ رہا اور پھر اِن خطوں کا کیا جواب دیتی جو ایک بار پھر "گھر توڑ کر منڈوا بنانے" کا مشورہ دیتے تھے۔

میں اِسی ملال اور نامُرادی کے محور پر گردش کرتی رہی۔ مجھے بار بار یہی خیال آتا رہتا کہ یوں صرف چاہے جانے پر اِتنا ملال گزر رہا ہے اگر —— میں بھی دل و جاں کی پُوری گہرائیوں سے احمد کو چاہتی تو زندہ رہ سکتی ——؟
دل ٹُوٹ کر —— کٹ کٹ کر بہہ نہ جاتا؟

ایک دوپہر جب میں دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ سُستانے کی سوچ رہی تھی کہ اچانک احمد میرے کمرے میں داخل ہو کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔
میرے دل میں غم و غصّہ کی کئی لہریں یکدم اُبھر اُٹھیں —— پھر نہ جانے کیوں احمد کی زردی مائل اور بُجھی بُجھی آنکھوں کو دیکھ کر یہ لہریں خود دب سی گئیں اور میری انسانیت اور مہربانی نے کہلوایا۔
"اے یہ اچانک کدھر نکل آئے تم ——؟ خیریت تو ہے نا ——؟ کیا ہیولیٰ بنا رکھا ہے یوں لگتا ہے جیسے دواخانے سے ابھی ڈسچارج لے کر آ رہے ہو!"
وہ کچھ نہ بولا۔ بس ٹکٹکی میری طرف ہی دیکھتا رہا
پھر چند لمحے بعد جانے کیا سُوجھی، دفعتہً مجھ سے لپٹ گیا اور بچّوں کی طرح پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔
میں نے پُوری کوشش کی کہ اُسے پرے دھکیل دوں لیکن اِن آنسوؤں کی لڑیوں نے جیسے مجھے جکڑ لیا!
بہت دیر تک اُس کے آنسوؤں میں بھیگنے کے بعد میری بھی پلکیں نم ہونے لگیں۔

میں سچ کہتی ہوں میرے آنسو احمد کی جُدائی کے غم میں نہ تھے۔ اُس کی بے بسی پر دلاسے کی چلمن تھے۔ اُس کی آنکھوں کا سیلاب روکنے کے لئے دیوار تھے! جب طوفان تھما تو وہ کچھ کہے بغیر یوں چلا گیا جیسے کوئی بھُولے سے کسی کے در پر آ کر احساسِ مایوسی اور پشیمانی لے کر گزر جاتا ہے۔
اور میں خلاؤں میں گھُور گھُور کر اپنی آنکھوں کو سُرخ کرتی رہی اور —— پھر نہ جانے کب نیند نے غلبہ پا لیا۔
جب میں سو کر اُٹھی تو اندھیرے دبے پاؤں صحن میں داخل ہو رہے تھے۔

کئی ماہ گزر گئے احمد کا کوئی خط نہ مِلا۔ میں اب مطمئن سی ہو گئی تھی کہ چلو آخر اُسے قرار مل ہی گیا جس کی غالباً اُسے شدید ضرورت تھی۔
اِدھر میں آہستہ آہستہ اب اُس "نسبت" کی طرف غور کرنے لگی تھی جس کی طرف میرے گھر والے پُوری طرح جھُکے ہوئے نظر آ رہے تھے اور —— صرف میری "ہاں" کے منتظر معلوم ہوتے تھے۔
اب میری زندگی میں کون سا غیر معمولی ارمان یا رومان باقی رہ گیا تھا جس کی طرف جھُکتی؟ دوسری لڑکیوں کی طرح میں نے بھی اِسی میں بھلائی سمجھی جو اپنے ماں باپ کی ناک بھی رکھ لیتی ہیں اور —— اپنی آرزوؤں اور تمنّاؤں کی خوبصورت طور پر پردہ پوشی کر کے اپنی سعادت مندی کا لوہا منواتی ہیں۔
میری نظروں میں جتنی لڑکیوں کی شادیاں ہوئی تھیں وہ زیادہ تر ایسی ہی تھیں جو اپنے ماں باپ کی مرضی ہی کو مقدّر سمجھتی تھیں۔ ایک دو ایسی شادیاں بھی ضرور ہوئیں جہاں لڑکیوں نے احتجاج کیا اور اپنے باپ ماں کو ہموار بنا لیا۔ لیکن خود اپنی مرضی کی صلیبوں پر قربان ہو گئیں اور اُف تک نہ کر سکیں!
میری نسبت طے ہو گئی۔ میں نے کافی سوچنے کے بعد حامی بھر دی تھی۔ میری "ہاں" کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی!
نہ جانے کیوں یہ دُنیا والے محبت کی داستانوں یا شادی کی خبروں کو اِس طرح اُچھالتے ہیں جیسے دوسروں

کو ترغیب ورغبت دلاتے ہوں!

اور ——— ایک چنگاری بنگلور میں جا گری!

احمد جیسے مجلس ہی تو گیا اِس چنگاری سے!

نہ جانے اِن ہَوس پرست مَردوں کے دل و دماغ میں کیا بسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر آسودگی پا لیتے ہیں پھر بھی اُن کا دل نہیں بھرتا!

اور خواہ مخواہ کسی نہ کسی خلش کو پیدا کر کے یا کسی معمولی سی بھول چوک کو بہانہ بنا کر اچھی خاصی زندگی سے مُنہ پھیر لیتے ہیں اور دوسری طرف نظریں دَوڑا لینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور ———

اُس ہستی یا زندگی کو جسے بہت چاؤ، پیار اور ناز سے اپنا لیا تھا یوں بھُولنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے کوئی رسٹ واچ، رومال یا فونٹن پن کو کھو کر بھُولنے کی کوشش کرتا ہو!

یک عورت کی زندگی کسی رومال، پن یا گھڑی سے مماثلت رکھتی ہے ——!!

ہاں تو —— ایک چنگاری نے احمد کے دل و دماغ کو جیسے بھک سے اُڑا دیا اور اُس نے پھر ایک طویل خط لکھا لیکن پہلے سے بالکل مختلف!

آدمی وہی تھا —— لیکن ذہن جیسے اپنی جگہ سے ہٹ چُکا ہو —— چاہت وہی تھی —— لیکن جیسے زنگ لگ گیا ہو!

خط کے آخر میں میرے چاہنے والے اور مجھ پر مرمٹنے والے احمد نے یوں وار کیا تھا ——

میری زندگی!

اگر تُو میری رفیق اور زندگی کی ہمسفر نہ بن سکی تو کیا عجب میری دیوانگی تجھے حاصل کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالے جس کی شاید اخلاق و تہذیب اجازت نہ دیں —— میں تجھے حاصل کرنے کی آخری لمحوں تک کوشش کرتا رہوں گا۔ میں تیرے بغیر شاید ہی قرار پاؤں، شاید ہی زندہ رہ سکوں۔ میں ہر اُس کوشش کو مخالفانہ و منافقانہ سمجھوں گا جو تجھے مجھ سے دُور لے جاتی ہے خواہ وہ کسی فرد سے ہو، گروہ سے یا جماعت سے اور —— تم جانتی ہو کسی مخالف یا دشمن سے کوئی کیا سلوک کرتا ہے؟ اور —— پھر میں تو ایک پاگل ہوں۔ صرف پاگل ——!!

خط پڑھنے کے بعد ———

میرے وہ تمام جذبات و احساسات جو کسی نہ کسی انداز میں احمد سے ہمدردی پر مائل تھے یکلخت نفرت کا زہر بن کر میری رگوں میں گردش کرنے لگے اور —— احمد میری آنکھوں سے آخری قطرۂ اشک بن کر زمین پر گر گیا —— اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بُجھ گیا!!

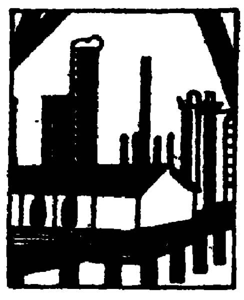
آپ کی خدمت کرتے کرتے

دس برس بیت گئے

لائف انشورنس کارپوریشن کا جو پہلی ستمبر ۱۹۵۶ کو بنا اس کے قیام کا مقصد تھا ؛ بیمہ زندگی کے پیغام کو ملک کے کونہ کونہ تک پہونچانا ؛ عام لوگوں کی بچتوں کو قومی معیشت کی ترقی کے لئے استعمال کرنا ؛ سماجی فلاح و بہبود اور قومی ترقی کے کاموں پر خاص توجہ دینا ؛ دیکھنا یہ ہے کہ ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی رہی۔

پالیسیوں کی تعداد تگنی اور بزنس چار گنا بڑھ گیا

کارپوریشن کے قیام سے پہلے ۵۰ لاکھ پالیسیاں تھیں جن پر کل بیمہ ۱۲۲۰ کروڑ روپیوں کا تھا۔ اور آج ایک کروڑ ۵۰ لاکھ پالیسیاں ہیں جن پر بیمہ ۴۲۸۷ کروڑ روپیوں کا ہے۔ چونکہ کارپوریشن کے دفاتر ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے زیادہ سے زیادہ لوگ بیمہ کرا رہے ہیں۔ ایل آئی سی نے اپنی نان میڈیکل (بلا ڈاکٹری معائنہ) تنخواہ سے بچت، گروپ انشورنس اور سپر انیولیشن اسکیموں کو جاری کر کے یہ سہولت مہیا کر دی ہے کہ لوگ آسانی سے بیمہ کرا سکتے ہیں۔



قومی ترقیاتی کاموں میں ہاتھ بٹانا۔

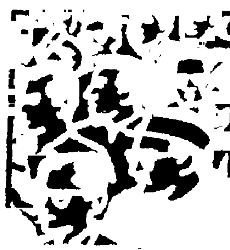
۱۹۵۶ء میں مختلف کاروبار میں جو سرمایہ لگایا جاتا تھا وہ ۳۴۹ کروڑ ۲۹ لاکھ روپیوں کا تھا اور اب ۱۹۶۶ء میں جو سرمایہ لگایا جاتا ہے وہ بڑھ کر ۹۶ کروڑ ۴ لاکھ روپئے ہو گیا ہے۔ عوام کی بچتوں کو بتدریج بڑھا کر صنعت اور زراعت میں لگایا جاتا ہے جس سے عوام اور ملک کو فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

سماجی بہبودی کی اسکیموں کے لئے قرض۔

مکانات کی تعمیر، واٹر ورکس اور ڈرینیج اسکیموں، کوآپریٹو شوگر فیکٹریوں، صنعتی اداروں، ریاستی بجلی کے اداروں وغیرہ جیسے سماجی بہبودی کے کاموں کے لئے قرض دیئے جاتے وقت خاص رعایتیں دی جاتی ہیں۔ یوں تو بہت کیا گیا ہے لیکن ہندوستان کے رہنے والے ہر شہری کو سلامتی اور دماغی سکون پہنچانے کے لئے ایل آئی سی اپنی کوششوں میں مصروف ہے۔



۱۹۵۶ء
۱۹۶۶ء



لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

شانِ نزول

نریش کمار شاد

۱۵ ایف۔ موتی باغ ۲۔ نئی دہلی

۲۰ ستمبر ۶۶ء مخدومی خوشتر صاحب قبلہ!

لیجیے "شانِ نزول" کی ایک اور قسط ملاحظہ فرمائیے۔ "شانِ نزول" کے سلسلے کو "بیسویں صدی" کے قارئین اگرچہ بہت زیادہ پسند کر رہے ہیں لیکن میرے بعض "شاعر" دوستوں نے مجھے یہ بھی مشورہ دینا شروع کر دیا ہے کہ شاعری کی طرف توجہ کیجیے یہ "شانِ نزول" میں کیا رکھا ہے۔ حالانکہ کسی نہ کسی رنگ میں دوسرے شاعروں کے ساتھ ساتھ میں خود بھی اپنی شاعری کے ساتھ "شانِ نزول" میں "رکھا" ہوا ہوں۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

والی بات نہیں ہے یا خدانخواستہ کہیں یہ بات تو نہیں ؎

وہ جو شاعر تھا میرے پیکر میں کھا چکا ہے، غمِ معاش اُسے

آپ کا نیازمند ــــــ نریش کمار شاد

شہزادہ سلیمان شکوہ انشاؔ اللہ خاں انشاؔ اور سعادت یار خاں رنگینؔ کو ہمراہ لے کر فتح علی خاں کے باغ کی سیر کو گیا تو وہاں جابجا ہریالی اور رنگارنگ پھولوں کو دیکھ کر شہزادے نے یہ مطلع کہا ؎

نہ تو سیرِ گُل کا دماغ ہے نہ جہاں سے رنگِ فراغ ہے
وہ جو اپنے سینے کا داغ ہے یہی گُل ہے اور یہی باغ ہے

جس خوبی اور چستی سے مطلعے میں چار قافیے ادا کیے گئے تھے۔ انشاؔ اور رنگینؔ دونوں نے اس کی بہت تعریف کی اور جب شہزادے نے اِس مطلعے کے جواب میں فکر کرنے کی فرمائش کی تو انشاؔ نے قافیے کی تبدیلی سے فوراً یہ مطلع موزوں کر دیا ؎

نظر اپنی اُس سے جو لڑ گئی تو وہ چتون آنکھوں میں گڑ گئی
مژہ دل میں ایسی ہی گڑ گئی کہ جو بات تھی سو بگڑ گئی

اور رنگینؔ نے اِسی بحر میں یہ دو شعر فی البدیہہ کہے ؎

یہ دل اپنا جس کا غلام ہے اِسی قاتل اُس کا ہی نام ہے
اُسے ہم سے چھیڑ مدام ہے ہمیں کام اپنے سے کام ہے

مرا دم تو آیا ہے ناک میں نہیں باقی ذرّہ ہلاک میں
مجھے یوں مِلا دیا خاک میں اے عشق تجھ کو سلام ہے

بہادر شاہ ظفرؔ کے اُستاد حضرتِ ذوقؔ دہلوی پالکی میں بیٹھے کہیں جا رہے تھے کہ میرزا غالبؔ کی نظر اُن پر پڑ گئی۔ چونکہ اُن سے معاصرانہ چشمک تھی۔ اُسی وقت طنزاً یہ مصرع کہہ دیا ؎

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا

ذوقؔ نے بھی اِسے سُن لیا اور ظفرؔ سے شکایت کی لیکن جب غالبؔ کو طلب کیا گیا اور اُن سے پوچھا گیا کہ آپ نے ایسی کون سی غزل کہی ہے جس کا یہ مصرع ہے تو غالبؔ نے پوری غزل سُنا دی اور مقطعے میں اُس مصرع کو اِس صورت سے اپنی ذات پر منطبق کر دیا ؎

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

میرزا داغ دہلوی نے ایک بار اپنی محبوبہ منی بائی حجاب کے فوٹو کھنچوانے کا اہتمام کیا۔ داغ چاہتے تھے کہ وہ اپنا اور حجاب کا فوٹو ایک ساتھ کھنچوائیں لیکن حجاب اس کے لئے رضامند نہیں ہو رہی تھیں۔ فوٹو گرافر نے اشاروں ہی اشاروں میں داغ کو کچھ سمجھا دیا اور وہ حجاب کی کرسی سے ہٹ کر کچھ پیچھے بیٹھ گئے۔ حجاب یہی سمجھیں کہ داغ کا فوٹو اُن کے ساتھ نہیں کھینچا جا رہا لیکن فوٹو گرافر نے اپنے کمالِ فن سے حضرتِ داغ کی خواہش پوری کر ہی دی۔ اُس فوٹو کو دیکھ کر داغ نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ؎

تم گر فلکِ حُسن پہ ہو مہرِ منیر
سائے کی طرح ساتھ ہے داغِ دل گیر
خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اِس کا
بے داغ نہ کھینچ سکی تمہاری تصویر

اکبر الٰہ آبادی جن دنوں آگرے میں وکالت کرتے تھے، اُن کے مولانا ثاقب کے ایک ملاقاتی تھے جنھیں اپنے حسب نسب اور اپنے خاندان کی بڑائی کا بڑا دعویٰ تھا۔ اُنھیں بتایا کہ میں نے آگرے میں "جوتا سازی" کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ اکبر نے اُن کے بلند بانگ دعوؤں کے پیشِ نظر یہ سُنتے ہی ازراہِ مذاق یہ تین شعر کہہ دیئے ؎

شُومیکری شروع ہے کی اِک عزیز نے
جو سلسلہ مِلاتے ہیں "بہرام گور" سے
پُوچھا کہ بھائی! تم تو تھے تلوار کے دھنی
مورث تمہارے آئے تھے "غزنی و غور" سے
کہنے لگے ہے اِس میں بھی اِک بات نوک کی
روٹی ہم اب کماتے ہیں جُوتے کے زور سے

لکھنؤ میں کسی غریب بُڑھیا کے بوسیدہ سے مکان کو خرید کر ایک امیر آدمی نے اُسے مسمار کرا دیا اور وہاں اپنی ایک عالیشان کوٹھی تعمیر کرا لی۔ وہ بُڑھیا جب تک زندہ رہی بلا ناغہ اُس کوٹھی کی دیوار سے لگ کر چند گھنٹے روزانہ بیٹھتی رہی۔ بیخود موہانی نے ان بُڑھیا کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ شعر کہا ؎

نشیمن پھُونکنے والے! ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

گوپی ناتھ امن لکھنوی جب دسویں جماعت کے طالبِ علم تھے۔ اُن کے والدِ بزرگوار مہادیو پرشاد آسی ایک رات امن صاحب کو میرزا غالب کی وہ غزل پڑھا رہے تھے ؎

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

کہ امن صاحب کی والدہ کو یہ مصرع سُن کر ایک دم نہ جانے کیا خیال آیا کہ مداخلت کرتے ہوئے بولیں کہ ہمارے گھر میں بھی گھی بالکل ختم ہو چکا ہے۔
آسی صاحب یہ سُن کر ایک لمحے کے لئے چیں بہ جبیں ہوئے اور دوسرے ہی لمحے اُنھوں نے جل کر یہ شعر کہہ دیا ؎

سچ کہا تم نے اگر گھی تیل یا لکڑی نہیں
پھُونک دوں گا میں تمہاری سب گرہستی ایک دن

میرزا محمد رفیع سودا جب حالتِ نزع میں تھے تو اُن کی زبان سے بے اختیار یہ مطلع نکلا ؎

آج سودا جہاں سے اُٹھتا ہے
شور و غل ہر مکاں سے اُٹھتا ہے

شیخ امام بخش ناسخ ایک دن نواب نصیر الدین حیدر کے حضور میں تھے جو اُس وقت حقّہ پی رہے تھے۔ اُنھوں نے ناسخ سے فرمائش کی کہ شیخ صاحب اِس حقّے پر کوئی شعر کہیئے۔ ناسخ نے تعمیلِ ارشاد میں اُسی وقت یہ دو شعر کہہ دیئے ؎

حقّہ جو ہے حضورِ معلّٰی کے ہاتھ میں
گویا کہ کہکشاں ہے ثریّا کے ہاتھ میں
ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تُو عرض کر
بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

شاہ ابوظفر کی سرکار میں میاں محبوب علی خاں خواجہ سرا اختارِ کُل تھے لیکن تھے بڑے قمار باز۔ ایک دفعہ شاہ جب اُن سے ناخوش ہوئے تو میاں صاحب نے افسردہ ہو کر حج کا ارادہ کر لیا۔ ذوق کو جب اُن کے اِس ارادے کا علم ہوا تو اُنھوں نے برجستہ یہ مطلع کہا ؎

جو دل قمار خانے میں بُت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے

آتش لکھنوی نماز روزے کے بہت زیادہ پابند نہ تھے۔ ایک بار جب

کے دن اُن کے ایک شاگرد نے استدعا کی کہ حضرت! آج مجتہد العصر امامت فرما رہے ہیں آج تو آپ بھی نماز میں شریک ہو جائیے۔ آتشؔ نے یہ سُن کر فی البدیہہ کہا ؎

ہر جمعہ کو ظہور کا رہتا ہوں منتظر
مشتاق ہوں امام کے پیچھے نماز کا

بے خوابی اور تنہائی میں ایک روز جب رات کچھ ہی بھیگ چُکی تھی، فراقؔ گورکھپوری نے فانیؔ بدایونی کے اِس مشہور مطلعے سے ؎

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

تحت الشعوری طور پر متاثر ہو کر غزل کہنی شروع کی۔ مطلع یہ کہا ؎

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی
زندگی اُچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

غزل کہتے کہتے ہی ساری رات کٹ گئی اور جب فراقؔ مقطع پر آنے والے تھے تو پَو پھوٹتی نظر آئی۔ اِس منظر کو دیکھتے ہوئے بے اختیار اُن سے یہ مقطع موزوں ہو گیا ؎

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحرِ ہجر فراقؔ
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

تلوک چند محرومؔ کے کسی پرستار نے جب اپنے اخبار میں اُنھیں "خدائے سخن" کا خطاب دیا تو محرومؔ صاحب نے قطعۂ ذیل اور شکریے کے ساتھ وہ خطاب واپس کر دیا ؎

لُطف و کرم سے اپنے خدائے کریم نے
پیدا کیا اگرچہ برائے سخن مجھے
ناچیز ہوں میں بندۂ درگاہِ شاعری
لِکھّا کریں نہ آپ "خدائے سخن" مجھے

جوشؔ ملسیانی شعر کہنے کے علاوہ شطرنج اور چوسر کھیلنے کے بھی بے حد شائق ہیں اور اِس شوق سے اُن کی شاعری پر بھی کافی اثر پڑا ہے۔ چنانچہ اپنی ایک نظم "آنسو" میں کہتے ہیں ؎

مجھ سے جاں باز کو غربت ہے بساطِ شطرنج
جو نہ واپس کبھی پلٹے وہ پیادا ہوں میں

اور وی۔ بے پٹیل کی وفات پر اُنھوں نے جو نظم کہی ہے، اُس میں فرماتے ہیں ؎

عدم کو سدھارے بہت نامور   یہ دفتر کا دفتر ہوا گاؤ خورد
حبث زندگی کی صف آرائیاں   گھڑی بھر پہ شاطر کی بازی ہے بُرد

اور اُن کے یہ تین غزلیہ اشعار بھی اِسی شوق کی دین ہیں ؎

سمجھتے خوب تھے ہم شاطرِ دَوراں کی چالوں کو
مگر نقشہ پڑا ایسا کہ بازی ہار بیٹھے ہیں

؎

بازی کہیں مات ہو نہ جائے   ایسی تو نہ چال کیجئے گا

؎

موت کی زد کا خطر ہر نرد کو ہر گھر میں ہے
یہ بڑا اِک عیب اے دُنیا تری چوسر میں ہے

فروری ۱۹۵۷ء میں جب مزارِ غالبؔ پر یومِ غالبؔ منایا گیا تو وہاں غالب سوسائٹی کے منتظمین کے اصرار پر پنڈت ہری چند اخترؔ نے میرزا غالبؔ کے ایک شعر پر یہ فی البدیہہ تضمین لکھ کر سُنائی جو اُس تقریب کا حاصل تھی ؎

فضل و کمال سرنگوں، خامیاں ارجمند ہیں
گُم ہے صحیفۂ ادب، علم کے باب بند ہیں
بے بصری و جاہلی شہرِ عیارِ برتری
جہل پہ شورِ مرحبا، عقل پہ زہر خند ہیں
"آدمیاں چو گم شدند مُلکِ خدا را خر گرفت"
پختہ ہیں خامیوں میں جو اب وہی سربلند ہیں
بے ہنری کی شان ہے خودنگری و خودسری
جتنی ہے بے بضاعتی اُتنے ہی خودپسند ہیں
دیکھ کے یہ سہولتیں، کہتا ہوں دل سے بار بار
"غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں"

جب مولانا حسرتؔ موہانی پہلی بار حج کر کے بخیر و عافیت ہندوستان واپس پہنچ گئے اور ان کی واپسی کی خبر بعض اخباروں میں دردؔ نکودری کی نظر سے گزری تو دردؔ صاحب سے بے اختیار یہ شعر کہہ دیا ؎

حج ہو گیا تو مل گئیں دُنیا کی نعمتیں
حسرت کے دل میں اب کوئی حسرت نہیں رہی

حیرت الہ آبادی کسی زمانے میں کافی متمول اور فارغ البال تھے لیکن جب انقلابِ زمانہ کا شکار ہو کر بالکل فاقہ مست بن کر رہ گئے تو اُن کا کوئی نہایت پرانا دوست اُنھیں ملا اور حیرت صاحب کو دیکھتے ہی بڑی حیرت سے کہا ؎

حیرت! وہ تیری چاند سی تصویر کیا ہوئی
پہلے جو زرفشاں تھی وہ تقدیر کیا ہوئی

تو حیرت بے اختیار اشک بار ہو گئے اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولے ؎

ہر شے کو انقلابِ زمانہ نگل گیا
کیا جانے مجھ غریب سے تقصیر کیا ہوئی

میں اور فکر تونسوی کسی ناشر کے لئے ۱۹۵۱ء کے شعری ادب کا انتخاب کر رہے تھے۔ فکر صاحب نے کہا کہ ایسی نظمیں جو مُلکی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں یا شاعر کی ذات کا احاطہ کئے ہوتے ہیں اُن کے واسطے "اپنے گھر کی" اور بین الاقوامی مسئلوں سے متعلق نظموں کے لئے "دُنیا بھر کی" کے عنوانات دئے جائیں لیکن منتخب غزلوں کے لئے بھی اِنھیں عنوانات کی رعایت سے کوئی عنوان ہونا چاہئے۔ میں نے جب اِس حصّے کے لئے "قلب و نظر کی" عنوان تجویز کیا تو فکر صاحب نے اِسے بخوشی قبول کر لیا۔ بعد میں یہی تین عنوان میرے اِس قطعے کی تخلیق کے محرک ثابت ہوئے ؎

نقّاد ہمارے شعروں کے اِن رنگا رنگ اشاروں میں
قلب و نظر کی، اپنے گھر کی، دُنیا بھر کی باتیں ہیں

ہندوستان سے ایران جاتے ہوئے بہت سے دوسرے باکمالوں کے ساتھ نادر شاہ سنھا بائی اور سلونا بھانڈ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور ایک رات رقص و سرود کی ایک محفل میں جب بائی پر بہت مہربان ہوا تو اُس سے دریافت کیا کہ مانگ تو کیا مانگتی ہے۔ بائی نے دست بستہ ہندوستان واپس جانے کی اجازت مانگی تو نادر شاہ نے بخوشی اِسے منظور کر لیا۔ اِس کے کچھ دن بعد ایک اور محفل میں جب سلونا نے بھی اپنے کمالِ فن کے جوہر دکھا کر نادر شاہ کو محظوظ کیا تو نادر شاہ نے اُس سے بھی ایسا ہی سوال کیا۔ جواب میں سلونا نے بے اختیار یہ شعر پڑھ دیا ؎

خواہش یہ مختصر سی ہے قصّہ تو طول ہے
بائی نہیں رہی تو سلونا فضول ہے

اور نادر شاہ نے اُسے بھی ہندوستان واپس بھیج دیا۔

ایک جام اور...

رفیعہ شبنم منیجری، بی۔اے (آنرز)

۱۶/۰ بی۔آئی۔ٹی بلاک، ابراہیم رحمت اللہ روڈ۔ بمبئی نمبر ۳

۵ر اگست ۶۶ء

محترمی خوشتر صاحب! تسلیمات

"تمنا دبی رہی" کی اشاعت نے میری تمناؤں کو جس خوبصورتی سے اُبھارا ہے، اُس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اِس میں بہت اہم حصّہ "بیسویں صدی" کے قارئین کے اُن خطوط کا بھی ہے جو مجھے ہند و پاک کے مختلف گوشوں سے سینکڑوں کی تعداد میں موصول ہوئے۔ اُن خطوط سے جہاں یہ اندازہ ہوا کہ "بیسویں صدی" کے قارئین تعلیم یافتہ، باذوق اور ادب نواز ہیں، وہیں یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ "بیسویں صدی" کس قدر مقبول صحیفہ ہے۔ قارئین کے خطوط بہت دلچسپ ہیں۔ کسی نے روایتی رومانس سے قطعِ نظر محبت کے اچھوتے انداز کو پسند کیا۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ اگر محبت کی معراج یہی ہے تو پھر شاید ہی کوئی دُنیا میں محبت کرے۔ کسی نے یہ کہا کہ کہانی کا اختتام المیہ کیوں ہے؟ ہیرو اور ہیروئن کا ملاپ بھی تو ہوسکتا تھا۔ کسی نے کہا کہ "دردِ محبت" کے ساتھ ساتھ "دردِ زمانہ" کے متعلق بھی ہوتا۔ اِن سب کے اعتراضات سر آنکھوں پر لیکن میرے نزدیک شاد کا یہ شعر زیادہ اہم ہے ؎

دردِ محبت، دردِ زمانہ ایک ہی شے کے نام ہیں دو
اِن دونوں میں فرق سمجھنا فرقِ نظر کی باتیں ہیں

اور پھر میں نہیں کہ اس فلسفے کو کہاں لے جاؤں جو مجھے علامہ اقبال دے گئے ہیں ؎

محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ شے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

لیجئے اب کی بار آپ کی بزم میں "ایک جام اور..." لے کر حاضر ہو رہی ہوں۔ افسانے کے متعلق پھر فیض کا ایک شعر عرض ہے ؎

عشق ہے اُس طلب کا نام، جو نہ ہو عمر بھر تمام
وہ بھی تھے کتنے بدنصیب جو تجھے پاکے رہ گئے

گذشتہ دنوں راجہ مہدی علی خاں کی موت پر اقلیم ادب لاوارث ہو کر رہ گئی۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا ساری زندگی ہنسنے ہنسانے والا یہ انسان، اِس طرح خاموشی سے، چُپ چاپ سب کو روتا ہوا چھوڑ کر چلا جائے گا۔ خدا مرحوم کو جنّتِ فردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اُس کے متعلقین کو صبرِ جمیل سے نوازے . . .

مخلص ــــــ رفیعہ شبنم منیجری

گہری رات کے سائے کچھ اور بڑھ آئے ہیں۔ تاریکیوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اُجالے سمٹ کر بہت ایک نقطے میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ گھڑی نے تین بار چیخ کر رات کے گزرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ برگد کے بوڑھے پیڑ کی سوکھی ڈال پر بیٹھا ہوا وہ پرانا اُلّو ایک بار پھر چیخ اُٹھا ہے اور اُس کی چیخ رات کے سناٹے میں گونج کر رہ گئی ہے۔ گلی کے موڑ پر

تاریکی میں ایک سایہ بڑھتا چلا آرہا ہے۔ میں سوچتی ہوں یہ جاوید ہوں گے۔ دل کی دھڑکنیں اعتدال پر آنے لگتی ہیں۔ سایہ گلی میں بڑھتا چلا آرہا ہے۔ قریب اور قریب! قدموں کی آہٹ اور تیز ہوگئی ہے۔ جوتوں کی چاپ صاف سنائی دے رہی ہے۔ اچانک میری پلکیں بھیگ جاتی ہیں۔ سایہ اگلے موڑ پر غائب ہوجاتا ہے۔ کمرے کی خاموشی اور رات کا سناٹا کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ ماحول اور زیادہ خوفناک ہوجاتا ہے اور میں جھنجھلا اٹھتی ہوں "عجیب ہیں یہ جاوید بھی" میں دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہوں لیکن قریب ہی کے چرچ سے نئے سال کی آمد کی خوشی میں نہ جانے کتنے قہقہے ایک ساتھ گونج اٹھتے ہیں۔
پھر رات کی خاموشی میں ٹینی سن کی مشہور نظم "Death of the old year" کے خوبصورت بول گونج اٹھتے ہیں ——

Old year, you must not die;
you came to us so readily,
you Lived with us so steadily,
Old year; you shall not die.

جاموں کے ٹکرانے کی آواز آتی ہے۔ صراحیوں کی کھنک سنائی دیتی ہے اور میری نظروں کے سامنے بیک وقت کئی جام چھلک اٹھتے ہیں۔ آتشِ سیّال بھڑک کر دل کی وادی میں پھیل جاتی ہے اور اس کی تپش سے پھپھولے اٹھ آتے ہیں۔ دور رات کی تنہائی میں نشے میں چور کسی کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے "میں نے پینا سیکھ لیا۔ میں نے پینا سیکھ لیا!" اور میں جھنجھلا کر الماری میں سجی ہوئی اسکاچ کی دو بوتلوں کو زمین پر دے مارتی ہوں۔ شراب بہہ کر فرش پر پھیل جاتی ہے۔ بوتلیں ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتی ہیں جیسے جاوید کا نشہ ٹوٹا ہو مگر... مگر... الماری میں ایک جام اور باقی ہے۔ ایک جام اور —— شراب سے لبریز، حرارت سے پُر! اور میں خیالات میں گم ہوجاتی ہوں۔
"وہ لوگ بھی کتنے کم ظرف ہوتے ہیں جو غموں کو بھلانے کے لئے شراب جیسی گندی شے کا سہارا لیتے ہیں" میری اپنی آواز میرے کانوں میں گونج اٹھتی ہے اور میں چونک جاتی ہوں۔ جیسے عرفی نے کوئی بات جھک کر آہستہ سے میرے کانوں میں کہی ہو۔ عرفی! یہ آج کس کی یاد آگئی؟ یہ دل کے پھپھولے کیوں پھر سُلگ اُٹھے؟ یہ پلکیں کیوں بھیگ سی گئی ہیں؟ یہ پیشانی پر پسینے کے بے شمار قطرے کیوں جھلملانے لگے؟ یہ روح کی گہرائیوں میں کیسی آگ سی لگی ہے؟ کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں تو آپ ہی الجھ کر رہ جاتی ہوں۔ نگاہوں کے سامنے ایک دھند سی چھا جاتی ہے۔ ایک عجیب سا دھندلکا چاروں طرف نظر آتا ہے۔ دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگتی ہے۔ دھندلکا آہستہ آہستہ مٹنے لگتا ہے اور پھر ایک پیکر نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگتا ہے اور بے اختیار منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔
اس دن بھی ایسی ہی اندھیری رات تھی۔ میں اپنی مسہری پر لیٹے لیٹے ٹیبل لیمپ کی ہلکی زرد روشنی میں کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ اچانک کمرے میں ایک ہلکی سی چاپ گونجی جیسے کوئی ہولے ہولے میری مسہری کے قریب آرہا ہو۔ پھر مجھے اپنے سرہانے کسی ذی روح کا احساس ہوا۔ ایک تاریک سا سایہ میری کتاب پر پڑا اور میں نے گھبرا کر ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں "اُف! میرے خدا!" اتنی بھیانک صورت دیکھ کر میرے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل پڑی۔ امی دوڑ کر میرے پاس پہنچیں۔ میں ان کے سینے سے چمٹ کر رونے لگی۔
"کیا ہوا پگلی؟" وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "بھو... بھوت!" میری زبان لڑکھڑائی۔ اور پھر امی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میں حیران و پریشان انہیں دیکھنے لگی "یہ دیکھو۔ تیرا بھوت یہ رہا!!" امی نے اندھیرے کی گود سے گھسیٹ کر عرفی کو سامنے لا کھڑا کیا جو اپنے چہرے کی آدمی کا کالک صاف کر چکا تھا اور میں جھنجھلا کر رہ گئی "کیوں خالہ جان! یہ شوبی کی بچی بڑی بہادر بنتی تھی۔ دو چار جاسوسی ناول کیا پڑھ لئے گویا فریدی بن گئی!" وہ ستانے چڑھاتا ہوا بولا "ہوں! تمھیں کیا کرنا ہے" میں اسے منہ چڑا کر رہ گئی تھی لیکن کئی دنوں تک یہ بھوت میرے وجود سے سائے کی طرح چمٹا رہا۔ ہر وقت میرے سر پر سوار! میں پریشان سی ہوگئی۔ جہاں جاتی یہی خیال پریشان کئے رہتا کہ عرفی پھر کوئی نئی شرارت نہ کر بیٹھے!
لیکن یہ بھوت اس طرح میرے وجود سے چمٹا کہ آج تک اس سے دامن نہ چھڑا سکی۔ ایک بار عرفی نے خود کہا تھا "شوبی! اگر تم مجھ سے دامن چھڑاؤ گی تو جانتی ہو میں ایک بھوت کی شکل اختیار کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے دامن سے چمٹ جاؤں گا!" اور اس وقت میں ہنس دی تھی "تم جیسے بھوتوں کو راہ لگانے کے منتر میرے پاس موجود ہیں!" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا اور وہ چپ چاپ، خاموش میرے دوپٹے کے دامن سے کھیلتا رہا تھا۔
اس دن بھی برگد کی بوڑھی ڈالیوں سے لٹک کر میں جھول رہی تھی کہ عرفی پہنچ گیا۔ ہنستا اور مسکراتا ہوا۔ اور چپکے سے اس نے برگد کے موٹے تنے کے پیچھے سے ایک آواز لگائی۔ ایک عجیب، ڈراؤنی سی آواز! میں چونک گئی۔ اچانک اس نے میری چوٹی پکڑ کر گھسیٹ لی "ہائے اللہ!" میں درد سے چیخ اٹھی تو ہنستے ہوئے اس نے میری لمبی، بڑی گھنی چوٹی اپنے مضبوط ہاتھوں میں لپیٹتے ہوئے صرف اتنا کہا۔
"میں نے خود ہی اپنے آپ کو ان زنجیروں میں قید کرلیا ہے شوبی! اب اگر کوئی اور زنجیر میری طرف بڑھی بھی تو خدا کی قسم میں انکار کردوں گا۔ میں... میں تو صرف اسی آنگن کی بہار کا دیوانہ ہوں" اور پھر اسی انداز سے ہنستے ہوئے اس نے چوٹی کے بل کھول دئے۔ اپنے بکھرے بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ برگد کی ایک لمبی جٹا کو اپنی گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔ "اگر وہ حسین زنجیر لوگوں نے چھین لی تو میں پھر ان ڈالیوں سے لپٹ کر پھانسی لے لوں گا اور پھر میری جھولتی ہوئی سرد لاش سے لپٹ کر تم روؤگی، آنسو بہاؤگی، میرے قدموں پر سر رکھ کر اپنی بے رخی کی معافی مانگوگی۔ لیکن جانتی ہو شوبی! میں کیا کروں گا؟ میں اسی شان سے مسکراتا ہوا آسمان کی طرف دیکھوں گا اور تم جھنجھلا کر وہیں سر پٹخنے لگوگی۔ اور جب تھک کر روتے روتے تم تھک

جاؤگی تو۔۔۔" بند کرو یہ بکواس!" میں چیخ اُٹھی تھی۔ ایک عجیب سی لرزش میری رگ و پے میں دوڑ گئی تھی اور وہ ہنس دیا تھا۔ "خدا کرے تمھیں اِتنے غم ملیں، اِتنے غم ملیں کہ تم شراب کی نالیوں میں بہنے لگو۔" میں نے جل کر اسے بد دعا دی تھی۔ "شوبی!!" وہ چیخ اُٹھا تھا۔ "وہ لوگ بھی کتنے کم ظرف ہوتے ہیں جو غموں کو بھلانے کے لئے شراب جیسی گندی شے کا سہارا لیتے ہیں۔" عرفی کی آنکھیں شعلہ اُگل رہی تھیں۔ اُس کی زبان آگ برسا رہی تھی اور میں شرم سے گردن جھکائے کھڑی تھی۔ میری پلکوں سے آنسو رواں تھے! "تم نے یہ بھی نہ سوچا شوبی! کہ میں اِتنا کم ظرف نہیں۔ میں بہت بُرا سہی شوبی! لیکن اِتنا کم ظرف نہیں۔ یقین کرو میں اتنا کم ظرف نہیں!" لیکن میں جانتی تھی کہ میں نے یہ بد دعا اُسے صرف اِس لئے دی تھی کہ شراب اُس کی دُکھتی رگ تھی۔ اُسے شراب سے نفرت تھی۔ ازلی و ابدی نفرت! وہ اُس کا تصور بھی گناہ سمجھتا تھا۔ "آج تم نے مجھے گالی دی ہے شوبی! لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ اگر تمھارا سُہاگ شرابی ہو جائے تو؟؟" وہ صرف اتنا کہہ کر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا لیکن میری چیخ حلق ہی میں گھُٹ کر رہ گئی تھی۔ یہ بد دعا عرفی نے مجھے نہیں، اپنے آپ کو دی تھی۔ بھلا میری زندگی کا ساتھی، میرا سُہاگ عرفی کے سوا کوئی اور ہو سکتا تھا؟۔۔۔ میں تو صرف اپنی انانیت کی جھوٹی شان برقرار رکھنے کے لئے اُس سے تغافل آشنائی کرتی تھی۔ پھر میرے دل کی گہرائیوں میں چھُپے جذبوں کو عرفی کیسے پہچان سکتا تھا؟

شاید اِسی لئے وہ اُس دِن اُداس اُداس سا میرے کمرے میں چلا آیا تھا۔ بے ساختہ اُس نے میرے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے خبر نہ تھی کہ تم میری زندگی کا اِس طرح بھی مذاق اُڑا سکتی ہو۔ بہرحال۔۔۔ تم جہاں کہیں رہو، سُکھی رہو۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تم سے دُور، بہت دُور جا رہا ہوں۔ آج صرف آخری سجدہ کر لینے دو شوبی! تاکہ جبینِ نیاز کو کوئی شکوہ نہ رہ جائے۔" اور پھر وہ اُسی انداز سے چلتا ہوا واپس لَوٹ گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تھا میں سوچتی ہی رہ گئی تھی۔

لیکن دوسرے ہی دن جاوید کے گھر والے چلے آئے تو مجھ پر سارا راز عیاں ہو گیا۔ میں کچھ نہ سمجھ کر بھی بہت کچھ سمجھ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری تمناؤں کے آشیانے پر یاس کی بجلی گرا دی ہو۔ میری مانگ بہت جلد سجا دی گئی۔ کوٹھی برقی قمقموں سے جگمگا اُٹھی۔ ہر طرف محبت کے گیت گونج اُٹھے اور پھولوں میں لدے پھندے جاوید مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اِس گھر سے نکال لے گئے۔ برگد کی بوڑھی ڈالیاں سِسکتی رہ گئیں۔ کوئی عرفی اُن کی جٹاؤں سے لپٹ کر نہ رویا۔ آنگن کی بہار سُونی ہو گئی۔ کوئی سجُوت وہاں اپنا سایہ نہ ڈال سکا۔ اور میں پھولوں کی مہک میں بسی ہوئی جاوید کی عالیشان کوٹھی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منتقل ہو گئی۔

وہ شام مجھے آج بھی یاد ہے جب جاوید اپنی تمام خوشیاں سمیٹے میرے کمرے میں آئے تھے۔ میں سُرخ جوڑے میں ملبوس، سمٹی شرمائی بیٹھی تھی۔ اُنھوں نے میری پیشانی پر خود بندیا سجائی تھی۔ میری زلفوں کو از سرِ نو سنوارا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے میری آنکھوں میں کاجل کی لکیر تیز کی تھی اور پھر میرے ڈھلکے ہوئے آنچل کو سر پر ڈال کر دیر تک مجھے دیکھتے رہے تھے۔ پھر خود ہی میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ "شوبی! تمھاری ہتھیلیاں کتنی گرم ہیں۔ جی چاہتا ہے اِن ہاتھوں کی ساری گرمی اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔ محبت کی اِس گرمی کے لئے تو میں آج تک ترستا رہا تھا شوبی۔۔۔!" اور ایک آنسو میری پلکوں پر آکر رُک گیا تھا جی چاہا، جاوید سے کہہ دوں "تمھیں کیا معلوم جاوید؟ یہ محبت کی گرمی نہیں یہ میری رُوح کی تپش ہے جو آپ ہی آپ، اندر ہی اندر سُلگ رہی ہے۔ یہ اُس عرفی کی جُدائی کی سوزش ہے جو ایک پل بھی مجھے چین نہ لینے دے گی۔" لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔ صرف آنسو ڈھلک کر رخساروں پر سے ہوتا ہوا جاوید کی ہتھیلی میں جا کر پناہ گزیں ہوا تھا اور وہ چونک اُٹھے تھے۔

"شوبی! تم رو رہی ہو! میں جانتا ہوں، ہر لڑکی پہلے پہل ایسے ہی روتی ہے۔ لیکن یقین کرو شوبی! یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ میں اپنی ہر خوشی بیچ کر تمھیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔" کتنے عظیم ہیں جاوید! میں سر سے پیر تک لرز گئی تھی اور دل ہی دل میں قسم کھائی تھی کہ زندگی بھر جاوید کے لئے خوش رہنے کی کوشش کروں گی لیکن اِس دل کا بُرا ہو جس نے عرفی کی یاد کو ایک لمحے کے لئے بھی نہ بھلایا۔ اُٹھتے، بیٹھتے، ہنستے بولتے، گھومتے پھرتے ہر وقت عرفی کا خیال میرے ذہن پر چھایا رہتا اور لبوں پر ایک مُہرِ خموشی لگی رہتی۔ جاوید پریشان سے رہنے لگے۔ "یہ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے شوبی! کیا تمھیں میری محبت پر اعتبار نہیں؟" لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔ نہ جاوید کے اُس اندیشے کی تردید ہی کر سکی تھی اور نہ تائید! اور جاوید روز بروز اُداس رہنے لگے۔ زیادہ وقت دفتر میں اپنے کاموں میں گزارتے۔ جان بُوجھ کر دیر سے آتے۔ دانستہ گھر سے جلدی چل دیتے۔ خود ہی مجھ سے کم گفتگو کرتے۔ میں اُنھیں کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی۔ اُن کے اُس رویّے پر اُنھیں ٹوک بھی تو نہ سکتی۔ اندر ہی اندر سُلگتی رہتی، بھڑکتی رہی، تڑپتی رہی مچلتی رہی اور ایک دن یہ آتش فشاں بھی پھُوٹ پڑا جب جاوید لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے نشے میں چُور، شراب سے مدہوش کمرے میں چلے آتے تھے۔ اُن کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ اُن کے بال اُلجھے اُلجھے تھے۔ اُن کے قدموں میں لغزش تھی اور میں سر تا پا لرز کر رہ گئی تھی۔ مجھے بے ساختہ عرفی کا یہ جملہ یاد آ گیا تھا: "اگر تمھارا سُہاگ شرابی ہو جائے تو؟" آج عرفی کی بد دعا پوری ہو گئی تھی۔ اور پھر یہ بد دعا روز بروز شدید ہوتی گئی۔ جاوید دن رات شراب کے عادی ہوتے گئے۔ چوبیس گھنٹے نشے میں چُور رہتے۔ شراب کی بوتلوں سے الماری بھری رہتی۔ جام پر جام لنڈھائے جاتے۔ گھر میں شراب بہتی رہتی، جیسے میری آنکھوں سے آنسو!

لیکن ایک دن۔۔۔ جب میں اُداس اُداس سی کمرے میں بیٹھی تھی، جاوید چلے آئے۔ میں چونک سی گئی۔ آج اُن کے قدموں میں لغزش نہ تھی۔ آج اُن کی آنکھیں سُرخ نہ تھیں۔ آج اُن کے بال اُلجھے اُلجھے سے نہ تھے۔ آج وہ ویسے ہی حسین نظر آ رہے تھے جیسے شادی کے دن۔ اُنھوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور پھر عقیدت سے اُنھیں اپنی آنکھوں سے لگایا اور مُسکرا دیے۔ "کہو شوبی! آج تو خوش ہو؟" وہ خلافِ معمول محبت سے پُوچھ بیٹھے اور اِس استفسار پر میں پھُوٹ پھُوٹ کر رو دی۔ "پگلی! اب کیوں روتی ہو۔ دیکھو نا۔ اب تو میں نے پینا بھی چھوڑ دیا۔ آج سے میں نے قسم

کھالی ہے۔ اب کبھی شراب نہ پیوں گا!" — "قسم!؟" میں حیرت سے انھیں دیکھنے لگی۔ "ہاں شوبی! یقین کرو۔ یہ تغیر ایک فرشتے کی بدولت ہوا۔ ایک فرشتہ جو اچانک بھولا بھٹکا، پتہ نہیں کس وادی سے، کون سی بستی سے میری کمپنی میں چلا آیا۔ بہت دنوں تک میری حالت دیکھتا رہا، مجھے سمجھاتا رہا۔ اُس کے لہجے میں کچھ ایسی مٹھاس تھی۔ اُس کا انداز کچھ اِس قدر مسحور کن تھا کہ میں خود بخود اُس کی طرف جھکتا چلا گیا۔" ہاں شوبی! مجھے ایسا محسوس ہوا میں آج تک ایک بہت بڑا گناہ کرتا رہا ہوں۔ پھر اُسے جب یہ پتہ چلا کہ میری شادی ہو چکی ہے تو اُس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا: "گندی شراب اور اچھی عورت دو متضاد چیزیں ہیں۔ شاید تم نہیں جانتے کہ جب تم لڑکھڑاتے ہوئے گھر میں قدم رکھتے ہوگے تو اُس محبت کی دیوی کے دل پر کیا گزر جاتی ہوگی۔ تمھیں میری قسم ہے ایک دن بغیر پیئے اُس کے پاس جاؤ۔ تمھیں اُس کی آنکھوں کی پاکیزہ شراب میں وہ نشہ ملے گا جو اسکاچ اور وہسکی کی سینکڑوں بوتلیں بھی نہیں دے سکتیں۔" اور بس میں پھر وہاں سے قسم کھا کر ہی اُٹھا۔" جاوید اُس فرشتے کی داستان سناتے رہے اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ میرے ہونٹ اُسے دعا دیتے رہے۔

اِن دنوں جاوید سچ مچ بدل سے گئے ہیں۔ شراب مکمل طور پر ترک کر چکے ہیں۔ جلد ہی گھر لوٹ آتے ہیں۔ زیادہ تر وقت میرے پاس گزارتے ہیں۔ اُس دن بہت پیار سے کہنے لگے — "شوبی! سوچتا ہوں کیوں نہ ایک دن اُس فرشتے کو اپنے گھر بلا لاؤں۔ یقیناً تمھیں اُس سے مل کر خوشی ہوگی" — "ضرور —!" میں بھی اُس کی دید کے اشتیاق میں ہمہ تن انتظار بنی رہی۔ شام بیتتی گئی۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوتی گئیں۔ اچانک زینے پر قدموں کی چاپ سی گونج اُٹھی۔ میں دوڑ کر وہاں پہنچی۔ جاوید عرفی کو ساتھ لئے زینہ چڑھ رہے تھے۔ اور میرے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ عرفی کی نگاہیں مجھ سے ٹکرائیں۔ ایک بار اُٹھیں پھر جھک گئیں۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی تھی۔ جیسے کوئی صدیوں کے خواب سے جاگا ہو۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ چپ چاپ جاوید کے پیچھے ایک قدم اور بڑھایا اور میرا سر چکرا سا گیا۔ مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں رہا۔ جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا شام ہو چکی تھی۔ اندھیرے بڑھ آئے تھے۔

اور آج — پھر ویسی ہی اندھیری رات ہے۔ تاریکی بڑھتی جا رہی ہے۔ ماحول اور سنسان اور ویران ہو گیا ہے۔ حدِ نگاہ تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ خاموشی اور سناٹا۔ دور کسی کلب میں بجتے ہوئے ریکارڈ پر محمد رفیع کی نشے میں ڈوبی آواز آ رہی ہے "میں نے پینا سیکھ لیا۔ میں نے پینا سیکھ لیا —" اور پھر جاموں کی کھنک گونج اُٹھتی ہے۔ شراب سے لبریز ارغوانی ساغر! اور میری نظروں کے سامنے ایک چھلکتا ہوا ساغر رقص کرنے لگتا ہے۔ شراب اُبلنے لگتی ہے اور یہ شراب فرش پر چھلکنے کی بجائے عرفی کے حلق میں ٹپک جاتی ہے۔ "عرفی!" میں چیخ اُٹھتی ہوں۔ فرشتے کو کس نے شیطان بنا دیا؟ جواب ملتا ہے "وہی حسین لیکن بھیانک ہستی جسے عورت کہتے ہیں" — "عرفی کو کس نے جنت سے جہنم میں لا پھینکا؟" — "وہی نازک سا وجود جسے دُنیا صنفِ لطیف کہتی ہے" — "مگر... مگر... تم تو شراب سے نفرت کرتے تھے عرفی؟" "مجھے خود حیرت ہے شوبی" "پتہ نہیں اُس دن شام کو اُس پر کیا گزری کہ اُس نے ایک ساتھ بہت سارے جام چڑھا لئے۔ وہ فرشتہ جو شراب سے نفرت کرتا تھا، شراب میں نہا گیا اور پہلی بار جام پہ جام چڑھاتا رہا۔ جیسے زہر پی رہا ہو اور یہ زہر دھیرے دھیرے اُس کے جسم میں سرایت کر گیا۔ یہاں تک کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ اُس فرشتے کا وجود خاک ہو گیا اور مرتے دم تک اُس کے ہونٹوں پر ایک ہی جملہ رہا: "مسٹر جاوید ایک جام اور — ایک جام اور! آج اِس ساقی کے نام پر پی لینے دو جس نے زندگی بھر پیاسا رکھا۔ جس نے میخانے کے در پہ بلا کر میری تشنگی کا مذاق اُڑایا۔ مسٹر جاوید! تمھیں میری ازلی تشنگی کی قسم! بس ایک جام اور — ایک جام..." اور پھر اُس کی سانسیں ٹوٹ گئیں۔ جاوید میرے کانوں میں زہر انڈیل کر عرفی کے جنازے میں چلے گئے ہیں۔ اور رات کی تاریکی بڑھ گئی ہے۔ اب تک گلی سنسان ہے۔ قدموں کی آہٹوں سے محروم راہ کا گرد و غبار رو رہا ہے۔ میرے سینے میں آگ سُلگ رہی ہے اور میں جھنجھلا کر الماری میں رکھے ہوئے آخری جام کو تھام لیتی ہوں۔ لو عرفی! آج عمر بھر کی پیاس کا خاتمہ ہو جائے! بس یہ آخری جام میرے حلق سے اُتر جائے پھر مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ اچانک — پھر قریب کے گرجے سے "Death of the old year" کے بول گونج اُٹھے ہیں۔

His race is growing sharp a thin,
Alack our friend and is gone.
Close up his eyes; tie up his chin,
Step from the corpse, & let him in,
That standeth there alone,
And waiteth at the door
There's a new foot on the floor my friend,
A new face at the door.

اچانک زینے پر جاوید کے قدموں کی آہٹ گونج اُٹھی ہے اور میں زیرِ لب ٹینی سن کی نظم کا آخری مصرعہ گنگنا رہی ہوں ——

there's a new foot on the floor, my friend a new face of the door.

اور میں نے جام فرش پر دے مارا ہے جو چکنا چور ہو گیا ہے۔ جیسے عرفی کی یادوں کا ساغر ٹوٹا ہو۔ عرفی، جو عظیم تھا! اور میرے قدم جاوید کے استقبال کے لئے دروازے کی جانب بڑھتے جا رہے ہیں۔ جاوید، جو عظیم ہیں! — باہر چرچ سے اب بھی ٹینی سن کی نظم کے آخری بول سنائی دے رہے ہیں!!

یادوں کے مُرجھائے گُلاب

ڈاکٹر کیول دِھیر

میڈیکل آفیسر، جیتو منڈی۔ بھٹنڈہ

۲۲ر ستمبر ۶۶ء

بھائی جان!

... لگاتار دو ماہ تک "بیسویں صدی" نہیں ملا تھا۔ میں نے آپ کو لکھ دیا تھا۔ یقیناً پرچہ ڈاک میں چوری ہوتا رہا ہے۔ میں نادم ہوں کہ آپ کے لئے پریشانی کا باعث بنا ــــ آپ کے الفاظ ــــ "آپ کے نام رسالہ میری زندگی میں تو بند نہیں ہو سکتا" ــــ مجھے آپ کی بے پناہ محبت اور خلوص کا احساس دلاتے ہیں۔ میں احسانمند ہوں ــــ راجہ بھائی کے انتقال سے اُن کی چاہت میں دھڑکنے والی نہ جانے کتنی دھڑکنوں کا خون ہو گیا ہے۔ آج دو ماہ ہو رہے ہیں انہیں ہم سے رُخصت ہوئے لیکن زخم اس قدر گہرے ہیں کہ درد کے احساس کے سوا دل میں کوئی جذبہ زندہ نہ رہا۔ زندگی موت جیسی اُداس اور ویران ہو کر رہ گئی ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ مسرتوں کا خالق ساری مسرتیں اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے ــــ لیکن آپ کا درد تو اور بھی شدید ہے۔ میں اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں کہ راجہ بھائی آپ کو کتنا چاہتے تھے۔ اکثر مواقع پر وہ آپ کا ذکر بہت ہی فخر کے ساتھ کرتے تھے۔ دوست اور بھائی کے علاوہ وہ آپ کو اپنا بزرگ بھی سمجھتے تھے۔ آپ کے لئے کتنی عقیدت اور چاہت تھی اُن کے دل میں! مجھے یاد ہے کسی بات پر آپ کا ذکر چل نکلا تھا تو راجہ صاحب نے کہا تھا "خوشتر گرامی اُس چیز کا نام ہے جو راجہ مہدی علی خاں کی ہر دھڑکن میں۔ رگ رگ میں رس بس چکی ہے۔"

چند روز ہوئے بمبئی سے طاہرہ دیدی نے بھی اپنے خط میں آپ کا ذکر کیا تھا کہ مجھے اپنے سگے بھائی کے نہ ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا ــــ آپ نے بروقت ہی مجھے یہ اطلاع دے دی تھی کہ آپ اپنے پیارے بھائی کی قبر پر پھول چڑھانے ۱۳ر اگست کو فرنٹیئر میں سے بمبئی جا رہے ہیں لیکن کتنا بدقسمت ہوں میں کہ میں شریک نہ ہو سکا ــــ آپ نے لکھا ہے راجہ صاحب کے انتقالِ پُرملال پر میں شکستہ دل ہو کر رہ گیا ہوں۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ دفتر سے ریٹائر ہو جانے کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔ دل ہر وقت بُجھا بُجھا سا رہتا ہے۔"

بھائی جان! میں آپ کا درد سمجھتا ہوں۔ آپ سے چھوٹا ہوں اِس لئے گستاخی ہوگی اگر میں کوئی بات کہوں ــــ خدا کے لئے آپ یہ ہرگز نہ سوچیں میری درخواست ہے یہ۔ آپ ہی کوئی ایسا قدم اُٹھالیں گے تو طاہرہ دیدی کو ڈھارس کیسے ملے گی؟ میرا دل اور بھی ٹوٹ جائے گا۔ بھیا! نہ جانے بجھے بجھے سے کتنے دل، کتنی غمزدہ نگاہیں آپ ہی پر مرکوز ہیں ــــ آپ سے ہمت اور حوصلہ مانگ رہی ہیں کہ راجہ بھائی کی وفات کا یہ غم وہ برداشت کر سکیں۔ ایسا نہ کیجئے گا بھائی جان ــــ کبھی نہ کیجئے گا! اردو ادب اور زبان کے لئے بھی یہ بات کتنا بڑا حادثہ ہوگی، میں اِس کا تصوّر نہیں کر سکتا۔ جن ستونوں پر اردو کا وجود قائم ہے اُن میں آپ ایک بڑا اور مستحکم ستون ہیں!

’سِسکتی یادوں کے مُرجھائے گُلاب‘ ارسال کر رہا ہوں۔ یہ نہ تو افسانہ ہے اور نہ مضمون ہی۔ یہ میرے سوگوار جذبات کے آنسو ہیں۔ مناسب سمجھیں تو اسے ”بیسویں صدی“ کی کسی قریبی اشاعت میں شریک کریں۔ اگر کوئی بات نامناسب ہو تو کم کر دیں۔ جذبات کی رَو میں بہہ کر نہ جانے کیا کیا لکھ گیا ہوں ——

نالہ پابندِ نَے نہیں ہے !...

آپ کا چھوٹا بھائی —— کیول دھیر

وہ معصوم مُسکراہٹیں ——

وہ کھنکتے ہوئے قہقہے ——

حیات کی وہ جلوہ سامانیاں ——

شوخ تبسّم کی وہ سرمستیاں ——

کہاں ہیں آج ؟ ——

کل تک بزمِ ظرافت جس باغ و بہار شخصیت کے دم سے زعفران زار بنی ہوئی تھی وہی آج اُس نوجوان بیوہ جیسی ہو گئی ہے، گھونگھٹ اُلٹنے سے پہلے ہی جس کا سُہاگ لُٹ گیا ہو۔

راجہ مہدی علی خاں ہنستی مُسکراتی شادمانیوں سے بھرپور صحت مند زندگی کی دھڑکن تھے۔ لیکن آج یُوں محسُوس ہوتا ہے زندگی کی یہی دھڑکن اچانک ہی جیسے خاموش ہو گئی ہے۔ اپنی مُسکراہٹوں کی معصومیت، قہقہوں کی کھنک اور تبسّم کی شوخیوں کو سمیٹ کر اُن کا یوں اچانک ہی چل دینا بھلا کس کے لئے باعثِ غم نہ ہوگا !

زخم بے حد گہرا ہے۔ ٹیس شدید ہے اور آنکھوں کی نمی ابھی خُشک نہیں ہوئی ہے۔ اپنے مشفق بھائی، پیارے دوست اور اُس عظیم انسان کی موت پر کچھ لکھوں تو بھلا کیسے ! ڈوبتے اُبھرتے ہوئے جذبات اِس قدر مجروح ہو گئے ہیں کہ مضطرب دل درد سے بھر گیا ہے —— دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔

یہ المناک حادثہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ غم مجھے صرف اِسی بات کا نہیں ہے کہ اُردو زبان و ادب سے ایک متاعِ بے بہا چھن گئی ہے، اِس سے کہیں زیادہ غم یہ ہے کہ ظالم موت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھ سے میری زندگی کا سرمایہ ہی چھین لیا ہے۔ ایسے عظیم بھائی کی محبت ہی میری زندگی کا سرمایہ تھی —— بے لوث، بے تکلف اور پاک محبت !

جناب خوشتر گرامی کے اِن الفاظ میں اُن کے بچپن کے دوست کی جُدائی کا غم ہے —— درد سے بھیگے جذبات کی کسک ہے —— میری سِسکتی یادوں کا اضطراب ہے —— اور اُن بیشمار بھیگی آنکھوں کی اُداسی ہے —— جنھیں اُس عظیم انسان سے والہانہ محبت تھی ——”... میں اپنا درد کیسے دکھاؤں۔ مجھ سے ہمدردی کرنے والا وہ بے لوث انسان اب جہانِ فانی میں کہاں ہے۔ میرا سب سے بڑا ہمدرد، بہی خواہ اور سب سے بڑا محسن اِس دنیا سے چل بسا.... اب مجھے گالیاں کون دے گا۔ آہ ! مجھے گالیاں دینے والا میرا شفیق بھائی اب اِس دُنیا میں نہیں رہا۔ میں ایک بہت بڑی خوشی سے محروم ہو گیا ہوں“

راجہ مہدی علی خاں واقعی ایک ایسی ’خوشی‘ تھے جو اُن کے بے شمار چاہنے والوں کے دلوں میں برسوں مچلتی رہی ہے لیکن آج دلوں کی چاہت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اِس ’خوشی‘ سے محروم ہو کر رہ گئی ہے۔

جناب احمد جمال پاشا نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ”ایوانِ ظرافت میں راجہ مہدی علی خاں کا قہقہہ سب سے بُلند تھا“ راجہ مہدی علی خاں مسرّتوں کے شہنشاہ تھے۔ وہ ہر جگہ —— ہر لمحہ مسرّتوں کے شگوفے کھِلاتے، برساتے نظر آتے تھے۔ کتنے ہی اُداس دل اُن کی باتوں سے چونچال بنے تھے۔ کتنی ہی مضمحل شامیں اُن کی خوش نوائی کی بدولت مُسکرا مُسکرا اُٹھی تھیں۔ اُن کی فطرت میں شوخی تھی، طنز کی ایک نرالی ادا تھی —— اور تھا اَلھڑ بانکپن۔ میدانِ ادب میں اور اپنے ماحول میں نہ جانے اُنھوں نے مسرّت کے کتنے پھُول کھِلائے تھے اور کتنے دلوں کو گُلنار کیا تھا!

ماضی کی سِسکتی یادوں کا درد لئے میں سوچ میں غرق ہوں۔ ایسی یادیں جو راجہ صاحب کی ذات سے وابستہ ہیں ! ماضی کے دُھندلکوں میں قید ایک تصویر میرے تصوّر میں اُبھر آئی ہے —— راجہ بھائی کی تصویر ! لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ دوسروں کے دامن میں مسرّتیں بھر دینے والا یہ انسان خود اپنے آپ پر ہنس رہا ہے —— بے تحاشا ہنسے جا رہا ہے —— اور اِسی ہنسی کی اوٹ میں درد کے کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔ اُس کی ہنسی میں طنز کی جو آمیزش ہے شاید اِن کانٹوں ہی کی کسک ہو۔ ٹھیک اِسی لمحے نہ جانے کس طرف سے ایک تیر کلیجے کو پار کر گیا ہے اور چونک اُٹھا ہوں میں ! اب میری نظروں کے سامنے وہ منظر آ گیا ہے، جب یہ انسان عالمِ بیہوشی میں ہسپتال میں پڑا زندگی کی آخری منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اُس کے ہونٹ بڑبڑا رہے ہیں۔ سانسوں کا تسلسل ٹوٹ رہا ہے۔ کچھ کہہ رہا ہے وہ۔ آواز مدھم ضرور ہے لیکن صاف ! یہی بات شاید

ئی بار وہ کہہ چکا ہے ——— "طاہرہ! میں نے تمہارے لئے کچھ نہیں کیا"

تیز نشتر جیسی چبھن کا احساس میرے سینے میں جاگا ہے۔ یقیناً زخموں کا پھیلاؤ بڑھ گیا ہے۔ ٹیس کی شدت میں اضافہ ہو گیا ہے ——— لیکن میرا ذہن پھر اُسی تصویر کی جانب منتقل ہو گیا ہے ——— یہ انسان خود اپنے ہی پر ہنس رہا ہے ——— قہقہے لگا رہا ہے۔ میں نے چاہا ہے کہ اس عظیم انسان کے قدم چوم لوں، لیکن جیسے ہی میں جھکا ہوں وہ تصویر غائب ہو گئی ہے۔ میرا اُلجھا تصور بھٹک گیا ہے..... نہیں میری نظروں کے سامنے وہی منظر ہے —— عالمِ بیہوشی میں ٹ! بڑبڑاتا ہوا وہ انسان۔ لیکن یہ کیا ——— ؟ آہ! یہ انسان منزل تک پہنچ چکا ہے۔ سانسوں کا تسلسل ٹوٹ چکا ہے۔ وہ ہنسی ——— وہ قہقہے خاموش ہو گئے ہیں۔ ——— موت کے مانند خاموش! سسکیاں ——— سسکیاں ——— ——— آہ !!!

کتنا عظیم انسان تھا وہ!

مسرتوں، مسکراہٹوں اور قہقہوں کا وہ خالق تھا لیکن اُس کے اپنے دامن میں مسرتیں اُتنی نہیں تھیں جتنی اُس نے دوسروں کے دامن میں بھر دی تھیں۔

قہقہوں کی اوٹ میں بکھرے کانٹوں ہی سے شاید مطمئن تھا وہ!

دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن میں اپنے آپ پر ہنسنے کی ہمت ہو؟

وہ بڑا انسان راجہ مہدی علی خاں تھا جس نے دوسروں کا دامن مسرتوں سے بھر دیا اور جب بھی اپنے دامن کے کانٹوں پر اس کی نظر پڑی تو بے اختیار وہ اپنے آپ ہی پر ہنسا۔ وہی ایسا انسان تھا جس نے اپنے دامن کے کانٹوں کا درد اپنے ہی قہقہوں کے شور کے نیچے دفن کر دیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کے قہقہے ہی لہولہان ہو گئے ہوتے!

۱۹۶۱ء کے اپریل کا مہینہ تھا ———

راجہ بھائی کی ہر بات ——— ہر تحریر زندگی کی مچلتی ہوئی شوخ دھڑکن کے مانند ہوتی تھی لیکن برف جیسے سرد ——— سنجیدہ الفاظ؟ "نہیں..... نہیں ———" لیکن یہ حقیقت ہی تھی۔ پہلا موقع تھا کہ راجہ صاحب کو میں نے پریشان اور اُداس محسوس کیا ———

"آجکل اِتنی پریشانیوں میں مبتلا ہوں کہ پناہ بخدا، ان پریشانیوں کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ آجکل میں ایسے بُرے دَور سے گزر رہا ہوں کہ عمر بھر ایسے وقت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ لکھنا بھی اب بند ہی ہو گیا ہے"

"لیکن کیوں؟" میرا ذہن اُلجھ گیا تھا۔

"بیمار ہوں اِس لئے بیکار بھی ہوں"

لیکن اُن کی شوخ فطرت کو قرار کہاں! شرارت نے سر اُبھارا اور مُسکراتے ہوئے الفاظ مچل اُٹھے۔

"فقیروں اور سادھوؤں کی سی زندگی ہے لیکن ایسے فقیروں اور سادھوؤں جیسی نہیں جو عورتیں یا زیور لے کر بھاگ جاتے ہیں ——— بلکہ ایسے فقیروں کی جو صرف رُوحانی غذا استعمال کرتے ہیں"

اچانک ہی کسی کا یہ شعر مجھے یاد آ گیا ———

مصائب میں اُلجھ کر مُسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

راجہ مہدی علی خاں لگاتار کئی برس تک بیمار رہے اور یہ سلسلہ اُس وقت تک قائم رہا جب تک وہ زندہ رہے۔ اُن کی زندگی گھر یا ہسپتالوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی لیکن اِن حالات میں بھی اُن کی طبیعت کی شوخی ماند نہیں پڑی۔

"راجہ صاحب! آخر ڈاکٹروں نے آپ کے مرض کی کوئی تشخیص تو کی ہوگی؟"

"میری بیماری طول پکڑ گئی ہے اور برابر کئی لاکھ ڈاکٹر مجھ پر 'ریسرچ' کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ مرض کیا ہے .... لیکن میرا مرض مرضِ عشق نہیں ہے"

راجہ صاحب اکثر ایسا ہی جواب دیتے تھے اور کبھی دوسروں کو اِس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ واقعی بیمار ہیں۔

یہ معمول ہی بن چکا تھا کہ میں راجہ صاحب کو ہفتے میں ایک خط ضرور لکھتا تھا اور فوراً ہی وہ میرے خطوط کا جواب دیتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اُنہیں تین چار خطوط ارسال کر چکا تھا لیکن ایک کا بھی جواب نہ آیا۔ آخر میں نے راجہ صاحب کی بیگم طاہرہ بہن کے نام ایک خط لکھا کہ راجہ بھائی کی اس طویل خاموشی کی آخر وجہ کیا ہے؟ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اُن کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو۔ دیدی نے اپنے خط میں جو تفصیل مجھے ارسال کی اس سے میرے اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ لیکن دو ہی تین دنوں کے بعد راجہ صاحب کا خط بھی مجھے مل گیا۔ اُنھوں نے لکھا تھا ———

"..... ایک ماہ ایک نرسنگ ہوم میں رہنے کے بعد صحت کچھ ٹھیک ہوئی تھی کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ایک پھوڑا نکلا جس سے ہاتھ سُوج گیا اور چند دنوں میں ایٹم بم بن گیا۔ بمبئی کے کچھ بڑے ڈاکٹروں کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُنھوں نے پیغام بھجوایا کہ تم ذیابیطس کے مریض ہو۔ سُنا ہے تمہیں پنسلین وغیرہ سے فائدہ نہیں ہو رہا

موسم سرما کی سبزیاں
اب لگائیے



آپ یہ سبزیاں اپنے کھیت میں، گھر کے پچھواڑے میں یا چھت پر گملوں میں لگا سکتے ہیں۔

ٹماٹر، پھول گوبھی، بند گوبھی اور گانٹھ گوبھی کی پنیری تیار کرنے کے لیے بیج بونے اور پنیریاں لگانے کا یہی موسم ہے۔

شلجم، مولی، گاجر، چقندر اور پالک جیسی سبزیاں بھی اس مہینے میں بوئی جانی چاہئیں۔

گھر کے آنگن میں سبزیاں لگائیے

اس سے اناج کی کمی پوری ہوگی

DA-66/300

ہمارے پاس فوراً چلے آؤ۔ ورنہ اگر پھوڑا ہتھیلی کے آر پار ہو گیا تو ہاتھ کاٹنے کے سوا تمہارا کوئی علاج نہ ہو گا ——— میں نے کہا "سالو! نہیں آتا! کٹنے دو ہاتھ!" لیکن اُنھوں نے دو چار غنڈے ادیب بھیج کر زبردستی مروا پٹوا کے مجھے ہسپتال کے سپیشل وارڈ میں بُلوا لیا۔ وہاں تین لاکھ ڈاکٹروں نے میرا ہاتھ کوئی بیس روز کی محنت کے بعد ٹھیک کر دیا ——— یہی وجہ تھی کہ میں تمہیں نہ لکھ سکا۔"

(خط ——— مورخہ ۲۹ر جون ۶۳ء)

ایک ایسا عام انسان جو کسی طویل بیماری کا شکار ہو گیا ہو اکثر اپنے آپ ہی سے اُوب جاتا ہے اور خوشی اُس کے لئے بیتی صدی کی گمنام کہانی بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن راجہ صاحب ایسے 'عام انسان' نہیں تھے۔ اُن کی شوخ فطرت مچلنے مُسکرانے کے لئے ہمیشہ بیتاب رہتی تھی چاہے وہ ہسپتال میں بسترِ علالت پر ہوں اور چاہے گھر کی چہار دیواری میں بند ہوں۔

ایسے مواقع بہت ہی کم آتے تھے جبکہ راجہ صاحب کا اندازِ بیان سنجیدہ ہوتا۔ بات کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو لیکن اِس تکلّف سے وہ کوسوں دُور رہتے تھے کہ اس کا اظہار بھی سنجیدگی ہی سے کیا جائے۔ اُن کا یقین عمل کی سنجیدگی میں تھا۔ لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا اکوئی درویش اپنا پیغام دے رہا ہو ———

".... ڈاکٹر اقبال کا شعر یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم بہت پیارا ہے ——— کہ تیری دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے قبول کرانے کی طاقت تجھ میں نہیں ہے لیکن اِس دُعا کو ٹھکرا دینا تیرے اپنے اختیار میں ہے ——— روپیہ اور دولت بہت اچھی چیزیں ہیں لیکن انسان کے لئے سب کچھ نہیں۔ جب کبھی اپنے بارے میں مجھے ایسا احساس ہوتا ہے تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے ہزاروں لوگوں سے بہتر حال میں رکھا ہے۔" (خط۔ مورخہ ۱۴ر ستمبر ۶۳ء)

راجہ بھائی کی طویل بیماری اُن کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھی۔ اپنے ایک خط میں اُنھوں نے اپنی بیماری کی تفصیل یوں لکھی تھی ——— "..... میں ذیابیطس کا مریض ہوں۔ کچھ دوسرے عوارض بھی ہیں۔ علاج میں بے پروائی اور بد پرہیزیوں کی وجہ سے میرے گُردے خراب ہو گئے ہیں۔ گُردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا جس سے ایک پنڈلی بازو اور پیر میں زہر پھیل گیا۔ تمام جسم میں پانی بھر گیا۔ سر، پاؤں، جسم، ہاتھ وغیرہ سُوج گئے ——— یہ خط تمہیں ایک نرسنگ ہوم ہی سے لکھ رہا ہوں۔ پانی دواؤں کے ذریعہ خشک کر دیا گیا ہے لیکن صحت ابھی تسلی بخش نہیں ہے۔"

اور اُن کی صحت سنبھلنے کے بجائے دن بدن گرتی گئی۔ بیماری اور دوائیں اُن کی روزمرّہ زندگی کا ایک حصہ بن کر رہ گئیں ——— اور حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ہر طرح کے علاج سے وہ مایوس سے ہو گئے۔ اُن سے ملنے والے اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ راجہ صاحب جیوتش اور جیوتشیوں میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔ گھر میں اُن کی میز پر پامسٹری کی موٹی موٹی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ جہاں کہیں کسی جیوتشی کا پتہ لگتا وہ فوراً روانہ ہو جاتے یا اُنھیں اپنے یہاں بُلوا لیتے۔ راجہ صاحب کا سب سے پہلا سوال ہوتا "میں کتنے برس زندہ رہوں گا؟" ظاہر ہے کہ زندگی سے اُنھیں بے پناہ محبت تھی ——— زندگی سے اُنھیں گہرا پیار تھا۔

"راجہ صاحب! آپ جوتشیوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں۔ آجکل کے نجومیوں کا مقصد صرف روپیہ کمانا ہے اس لئے کیوں آپ اپنا وقت اور روپیہ برباد کرتے ہیں"۔ ایک بار راجہ صاحب سے میں نے درخواست کی تھی لیکن جواب میں اُنھوں نے چند الفاظ لکھ کر مجھے خاموش کر دیا تھا ——— "اپنے بیہودہ الفاظ واپس لو ورنہ یہاں آکر تمہارے ختنے کر جاؤں گا"۔ دوسرے ہی دن راجہ صاحب کا ایک اور خط ملا جس میں اُنھوں نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا تھا (اُس کا نام لکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا) جس نے اُن سے جیوتش کے چکّر میں کئی ہزار روپے ہتھیا لئے تھے۔ اِس کے باوجود اپنے اِسی خط میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا تھا ——— "... جلد از جلد بمبئی آؤ۔ یہاں ہم ایک 'لکی چھایا شاستری' کے پاس چلیں گے ... اُنھیں جنم پتری کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ دُھوپ میں سایہ ناپ کر کُنڈلی بنا لیتے ہیں اور سب حالات بتا دیتے ہیں ——— یہ واقفیت حاصل کرنی بہت ضروری ہے کہ ابھی اور کتنی رقم ہمیں نجومیوں پر خرچ کرنی ہے تاکہ یہ رقم اُدھار لی جاسکے۔"

راجہ مہدی علی خاں نہایت بے تکلّف انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ایک بار اُن سے مل لیتا وہی اُن کا گرویدہ ہو جاتا اور اس بات کا فخر بھی محسوس کرتا۔ جب کبھی کوئی راجہ صاحب سے ملاقات کرنے جاتا تو اُس سے وہ یوں پیش آتے جیسے اُن کی برسوں پُرانی دوستی ہے۔ جہاں وہ اپنے دوستوں سے بے تکلّفی سے پیش آتے تھے وہاں اُنھیں خلوص و محبّت اور شفقت کی دولت سے بھی مالا مال کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں کو وہ 'گالیاں' بھی دیتے تھے لیکن سُننے والا یوں محسوس کرتا تھا جیسے اِن میں پیار کی ساری مٹھاس بھر دی گئی ہو۔

میرا ذہن ماضی کی اُن یادوں میں بھٹک رہا ہے جو میرے بھائی کی بے پناہ محبت، عقیدت، خلوص، ہمدردی، بیباکی، بے تکلّفی اور پیاری پیاری شوخ گالیوں کی مٹھاس کا شدید احساس دلاتی ہیں۔ یہی یادیں، تو اب میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں ——— راجہ صاحب سے میرے تعلقات کا آغاز محض رسمی ہی طور پر ہوا تھا۔ اُن دنوں میں ہفتہ وار "سوتنترتا" (پٹنہ) کا ایڈیٹر تھا

موسم سرما کی سبزیاں
آپ لگائیے



آپ یہ سبزیاں اپنے کھیت میں، گھر کے پچھواڑے
میں یا چھت پر گملوں میں لگا سکتے ہیں۔

ٹماٹر، پھول گوبھی، بند گوبھی اور گانٹھ گوبھی کی پنیری تیار کرنے کے لیے بیج بونے اور پنیریاں لگانے کا یہی موسم ہے۔
شلجم، مولی، گاجر، چقندر اور پالک جیسی سبزیاں بھی اس مہینے میں بوئی جانی چاہئیں۔

گھر کے آنگن میں
سبزیاں لگائیے

اس سے اناج کی کمی پوری ہوگی

88-66/388

تمہارے پاس فوراً چلے آؤ۔ ورنہ اگر پھوڑا ہتھیلی کے آر پار ہوگیا تو ہاتھ کاٹنے کے سوا تمہارا کوئی علاج نہ ہوگا ——— میں نے کہا "سالو! نہیں آتا! کٹنے دو ہاتھ!" لیکن اُنھوں نے دو چار غنڈے ادیب بھیج کر زبردستی مروا پٹوا کے مجھے ہسپتال کے سپیشل وارڈ میں بُلوالیا۔ وہاں تین لاکھ ڈاکٹروں نے میرا ہاتھ کوئی بیس روز کی محنت کے بعد ٹھیک کر دیا ——— یہی وجہ تھی کہ میں تمہیں نہ لکھ سکا۔"

(خط ——— مورخہ ۲۹؍ جون ۶۳ء)

ایک ایسا عام انسان جو کسی طویل بیماری کا شکار ہوگیا ہو اکثر اپنے آپ ہی سے اُوب جاتا ہے اور خوشی اُس کے لئے بیتی صدی کی گمنام کہانی بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن راجہ صاحب ایسے 'عام انسان' نہیں تھے۔ اُن کی شوخ فطرت مچلنے مُسکرانے کے لئے ہمیشہ بیتاب رہتی تھی چاہے وہ ہسپتال میں بسترِ علالت پر ہوں اور چاہے گھر کی چہار دیواری میں بند ہوں۔

ایسے مواقع بہت ہی کم آتے تھے جبکہ راجہ صاحب کا اندازِ بیان سنجیدہ ہوتا۔ بات کتنی ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو لیکن اِس تکلّف سے وہ کوسوں دُور رہتے تھے کہ اس کا اظہار بھی سنجیدگی ہی سے کیا جائے۔ اُن کا یقین عمل کی سنجیدگی میں تھا۔ لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی درویش اپنا پیغام دے رہا ہو ———

"....ڈاکٹر اقبال کا شعر یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم بہت پیارا ہے ——— کہ تیری دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے قبول کرانے کی طاقت تجھ میں نہیں ہے لیکن اس دُعا کو ٹھکرا دینا تیرے اپنے اختیار میں ہے ——— روپیہ اور دولت بہت اچھی چیزیں ہیں لیکن انسان کے لئے سب کچھ نہیں۔ جب کبھی اپنے بارے میں مجھے ایسا احساس ہوتا ہے تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے ہزاروں لوگوں سے بہتر حال میں رکھا ہے۔" (خط۔ مورخہ ۱۴؍ ستمبر ۶۳ء)

راجہ بھائی کی طویل بیماری اُن کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھی۔ اپنے ایک خط میں اُنھوں نے اپنی بیماری کی تفصیل یوں لکھی تھی ——— ".....میں ذیابیطس کا مریض ہوں۔ کچھ دوسرے عوارض بھی ہیں۔ علاج میں بے پروائی اور بد پرہیزیوں کی وجہ سے میرے گُردے خراب ہوگئے ہیں۔ گُردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا جس سے ایک پنڈلی، بازو اور سپیر میں زہر پھیل گیا۔ تمام جسم میں پانی پھر گیا۔ سر، پانوں، جسم، ہاتھ وغیرہ سُوج گئے ——— یہ خط تمہیں ایک نرسنگ ہوم ہی سے لکھ رہا ہوں۔ پانی دواؤں کے ذریعہ خشک کر دیا گیا ہے لیکن صحت ابھی سنبھلی نہیں ہے۔"

اور اُن کی صحت سنبھلنے کے بجائے دن بہ دن گرتی گئی۔ بیماری اور دوائیں اُن کی روزمرّہ زندگی کا ایک حصّہ بن کر رہ گئیں ——— اور حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ہر طرح کے علاج سے وہ مایوس سے ہوگئے۔ اُن سے ملنے والے اِس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ راجہ صاحب جیوتش اور جیوتشیوں میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔ گھر میں اُن کی میز پر پامسٹری کی موٹی موٹی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ جہاں کہیں کسی جیوتشی کا پتہ لگتا وہ فوراً روانہ ہو جاتے یا اُنھیں اپنے یہاں بُلوا لیتے ——— راجہ صاحب کا سب سے پہلا سوال ہوتا: "میں کتنے برس زندہ رہوں گا؟" ظاہر ہے کہ زندگی سے اُنھیں بے پناہ محبت تھی ——— زندگی سے اُنھیں گہرا پیار تھا۔

"راجہ صاحب! آپ جوتشیوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں۔ آجکل کے نجومیوں کا مقصد صرف روپیہ کمانا ہے اس لئے کیوں آپ اپنا وقت اور روپیہ برباد کرتے ہیں۔" ایک بار راجہ صاحب سے میں نے درخواست کی تھی لیکن جواب میں اُنھوں نے چند الفاظ لکھ کر مجھے خاموش کر دیا تھا ——— "اپنے بیہودہ الفاظ واپس لو ورنہ یہاں آکر تمہارے ختنے کر جاؤں گا۔" دوسرے ہی دن راجہ صاحب کا ایک اور خط ملا جس میں اُنھوں نے ایک ایسے آدمی کا ذکر کیا تھا (اُس کا نام لکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا) جس نے اُن سے جیوتش کے چکّر میں کئی ہزار روپے ہتھیا لئے تھے۔ اِس کے باوجود اپنے اِسی خط میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا تھا ——— "...جلد از جلد بمبئی آؤ۔ یہاں ہم ایک 'لکی چھایا شاستری' کے پاس چلیں گے ——— اُنھیں جنم پتری کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ دُھوپ میں سایہ ناپ کر کُنڈلی بنا لیتے ہیں اور سب حالات بتا دیتے ہیں ——— یہ واقفیت حاصل کرنی بہت ضروری ہے کہ ابھی اور کتنی رقم ہمیں نجومیوں پر خرچ کرنی ہے تاکہ یہ رقم اُدھار لی جاسکے۔"

راجہ مہدی علی خاں نہایت بے تکلّف انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ایک بار اُن سے مل لیتا وہی اُن کا گرویدہ ہو جاتا اور اس بات کا فخر بھی محسوس کرتا۔ جب کبھی کوئی راجہ صاحب سے ملاقات کرنے جاتا تو اُس سے وہ یوں پیش آتے جیسے اُن کی برسوں پُرانی دوستی ہے۔ جہاں وہ اپنے دوستوں سے بے تکلّفی سے پیش آتے تھے وہاں اُنھیں خلوص و محبت اور شفقت کی دولت سے بھی مالامال کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے دوستوں کو وہ 'گالیاں' بھی دیتے تھے لیکن سُننے والا یوں محسوس کرتا تھا جیسے اِن میں پیار کی ساری مٹھاس بھر دی گئی ہو۔

میرا ذہن ماضی کی اُن یادوں میں بھٹک رہا ہے جو میرے بھائی کی بے پناہ محبت، عقیدت، خلوص، ہمدردی، بیباکی، بے تکلّفی اور پیاری پیاری شوخ گالیوں کی مٹھاس کا شدید احساس دلاتی ہیں۔ یہی یادیں، تو اب میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں ——— راجہ صاحب سے میرے تعلقات کا آغاز محض رسمی ہی طور پر ہوا تھا۔ اُن دنوں میں ہفتہ وار "سوتنترتا" (پٹنہ) کا ایڈیٹر تھا

اور ایک خط لکھ کر اُن سے اپنا کلام بھیجنے کی میں نے درخواست کی تھی۔ اُن کی فلمی زندگی کی مصروفیات کے پیشِ نظر مجھے زیادہ اُمید نہ تھی کہ وہ میری درخواست قبول فرمائیں گے لیکن اُنھوں نے مجھے نا اُمید نہیں کیا تھا۔

ایک ماہ بعد اچانک ہی راجہ صاحب کا ایک خط مجھے ملا جس میں کسی رسالے میں شائع ہوئی میری ایک کہانی کے بارے میں اُنھوں نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا تھا ــــــ "..... افسانہ آپ کی محبوبہ (اگر واقعی کوئی ہے) جیسا ہی خوبصورت ہے لیکن افسانہ کے اختتام کو بھی کوئی خوبصورت موڑ دیجئے۔ یہ اختتام بے حد عامیانہ ہے اور آپ کی شان کے شایاں نہیں ہے۔ اگر آپ اِسے خوبصورت موڑ نہیں دے سکتے تو خودکشی کر لیجئے بشرطیکہ یہ قانونًا جائز ہو۔ ایسا کام کرنے سے پہلے دو چار چوٹی کے وکیلوں سے مشورہ کر لیجئے۔ میری طرف سے آپ کو کھُلی اجازت ہے!"

راجہ صاحب کا یہ بے تکلّف اندازِ تحریر مجھے بے حد پیارا معلوم ہوا اور میں اتنا متاثر ہوا کہ مجھے اُن سے تعلقات استوار کرنے کی شدید خواہش ہوئی۔ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا انسان یوں اچانک ہی مجھ سے اتنا بے تکلف بھی ہو سکتا ہے! اِس طرح چند ہی دنوں میں میں راجہ صاحب کے بے حد قریب آگیا حالانکہ عمر میں مَیں راجہ صاحب سے لگ بھگ چوبیس برس چھوٹا تھا۔ لیکن اُنھوں نے عمر کے فرق کو دوستی کے درمیان کبھی حائل نہ ہونے دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ راجہ صاحب کی کوئی عمر ہی نہ تھی۔ بیک وقت وہ پانچ سو برس کے 'درویش' اور پانچ برس کے 'ننھے بچے' بھی تھے اور یہی ان کی انسانی عظمت اور بے تکلفی کی بنیاد تھی جس پر ہمارے گہرے تعلقات کے محل کی تعمیر ہوئی تھی۔

"آپ عمر میں مجھ سے اتنے بڑے ہیں کہ میری خواہش آپ کو 'چچا' اور بھابی جان کو 'چچی' کہنے کی ہو رہی ہے ــــــ اطلاعًا عرض ہے"۔ ایکبار جان بوجھ کر میں نے اپنے خط میں انھیں چھیڑا۔ فورًا ہی مجھے جواب ملا ــــــ

"..... کیا میری عمر پچاس سال ہے؟ سالے! میری جوانی کی 'اِنسلٹ' کرتا ہے! میری 'انسلٹ' کا تو کوئی حرج نہیں تمہاری بھابی تم سے بے حد ناراض ہے جسے بریکٹ میں تم نے 'چچی' لکھا ہے اور اُسے 'بوڑھی' بنا دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں اپنے دیور کو پیٹنے جا رہی ہوں۔ میں تمہارا دوست ہوں اس لئے تمھیں اطلاع دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ خدا کے لئے ہسپتال کی نوکری چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ ہو سکے تو ہندوستان چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ بہت بڑی چھڑی لے کر وہ آ رہی ہے!"

(خط۔ مورخہ ۳ر فروری ۱۹۶۲ء)

پیار بھری گالیاں سُننے کے لئے اب میں کسے چھیڑوں گا! ــــــ اور کون اب مجھے ایسی باتیں کہہ سکے گا:۔

"..... تم میرے جاں نثار بھائی۔ عقیدت مند دوست اور بے حد چاہنے والے پجاری ہو۔ تم نے مار مار کر میرے دل کے مکان سے کرایہ دار بھگا دیئے ہیں اور اِس مکان پر قبضہ جما لیا ہے۔ جلد بمبئی آ جاؤ تاکہ کمرے میں بند کرکے لاتوں اور گھونسوں سے تمہاری ہڈی پسلی توڑ سکوں ــــــ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ ارادہ ہے کہ بذریعۂ پولیس تمھیں جنوری میں بُلاؤں"۔ (خط۔ مورخہ ۲۰ر نومبر ۶۵ء)

میرے بھائی! میرے دوست!! یُوں پیار سے محبت کا اظہار بھلا کون کر سکے گا اب؟ کون مسرتوں کا طوفان بن کے اب قہقہوں کا شور بلند کرے گا!

"..... اپنے خط میں تم نے بھابی (مسز دھیر) کا کوئی ذِکر نہیں کیا۔ کیا تمہاری بھی بیوی سے جنگ ہو گئی ہے؟ اس وقت میری حالت بے حد نازک ہے۔ میری بیوی سے سخت جنگ ہو گئی ہے اور اُس نے میری ٹانگ توڑ دی ہے۔ اگر تمہاری ٹانگ نہ ٹوٹی ہو تو فورًا آکر میرا علاج کرو۔ اگر ٹوٹ گئی ہے یا عشق کر رہے ہو تو فورًا ٹانگ جوڑنے کا نسخہ بھیجو۔ اُس نے بے خبری میں مجھ پر حملہ کیا۔ للکار کر حملہ کرتی تو تیرا دوست ہارنے والا نہیں تھا۔ مجھے اِس ظلم سے بچاؤ ــــــ بچاؤ ــــــ بچاؤ اور ہسپتال میں اپنا کمپاؤنڈر بنا لو۔ میں تمہارے مریضوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا"۔ (خط۔ مورخہ ۲۷ر مارچ ۱۹۶۳ء)

"..... اِس وقت ایشیا میں دو ہی پاگل ہیں۔ ایک ڈاکٹر کیول دھیر اور دوسرا شاعر راجہ مہدی علی خاں۔ دونوں ہی جہنّم میں چلے جائیں گے۔ انشاء اللہ!"

(خط۔ مورخہ ۱۷ر اپریل ۶۴ء)

اپنے بھائی کی خدمت میں بے حد پیار اور عقیدت کے ساتھ ایکبار میں نے نئے سال کی خوشی میں سنگترے اور موسمیوں کی پیٹی بھجوائی۔ موصول ہونے کی رسید اُنھوں نے اِس انداز میں مجھے بھیجی ــــــ "سنگترے سُونگھتا ہوں سنگترے چھیلتا ہوں، سنگترے کھاتا ہوں، سنگترے پیتا ہوں، سنگترے پلاتا ہوں سنگترے بانٹتا ہوں۔ کوئی دُشمن گھر میں آگھسے تو اُس کے مُنہ پر سنگترہ دے مارتا ہوں۔ وہ اُسے اُٹھا کر کھا جاتا ہے۔ مجھے بد دُعائیں اور تجھے دعائیں دیتا ہے۔ موسمیوں کی ابھی باری نہیں آئی ــــــ تمہارا۔ راجہ سنگترہ علی خاں"۔ (مورخہ ۲۳ر دسمبر ۶۵ء)

اور جب راجہ بھائی نے اپنا مجموعۂ کلام "اندازِ بیاں اور" مجھے ارسال کیا تو اس پر لکھا تھا۔

"۷۸۶ ــــــ اوم ــــــ ست سری اکال
دنیا ایک دھوکہ ہے۔

سب دھوکے باز ہیں!

راجہ مہدی علی خاں ہندو ہو کر لوگوں سے کہتا پھرتا ہے میں تو مسلمان ہوں حالانکہ یہ چھپ چھپ کر مندروں میں جاتا ہے۔

کیول دھیر عربی مسلمان ہو کر اپنے آپ کو ہندو ظاہر کر رہا ہے حالانکہ چند ہی سال پہلے اُس نے بغداد کی ایک مسجد میں 'اذان' دی تھی!

وہ ایسا کیوں کرتے ہیں خدا ہی جانتا ہے۔

ہزار ہزار لعنت اِن دونوں پر۔ آمین!

راقم

راجہ رام چندر

المعروف

راجہ مہدی علی خاں

یہ کتاب اول الذکر دھوکے باز نے مؤخر الذکر دھوکے باز کو پیش کی ——
بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ۔" (جولائی ۱۹۶۳ء)

یادیں —— یادیں —— اور بس! یادیں!!!

جو کبھی زندگی کی دھڑکن بن کر دھڑکتی تھیں اب خاموش ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ انھیں جنم دینے والا وہ عظیم انسان، شفیق بھائی اب اِس دنیا میں نہیں رہا —— اور جب اپنے بھائی کی مقدس ترین یاد اپنی عزیز بہن طاہرہ دیدی کے اِن الفاظ کو یاد کرتا ہوں تو دل تڑپ اٹھتا ہے ——

"..... صبر کے سوا کیا کر سکتے ہیں مگر دل کو کسی طرح صبر بھی تو نہیں۔ ایک لمحے کے لئے بھی مہدی کی یاد دل سے جدا نہیں ہوتی۔ باوجود سب کچھ دیکھنے کے یقین نہیں آتا کہ میرے مہدی اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یہی انتظار رہتا ہے کہ اب آتے ہوں گے —— باہر گئے ہوئے ہیں —— لیکن میرے مہدی مجھ سے روٹھ کر اس دنیا سے چلے جائیں گے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آہ افسوس! صد افسوس!! اللہ جانے یہ ہمیں ہمارے کس گناہ کی سزا ملی ہے کہ ہمارے مہدی کو چھین لیا گیا!"
(خط - ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء)

اے اجل! تُو ظالم ہے۔ بے رحم ہے!! کاش تیری اندھی آنکھیں دیکھ پاتیں اُن آنسوؤں کو جو میری بہن طاہرہ کی آنکھوں سے رواں ہیں —— جو خوشتر جیسے عزیز دوست کی آنکھوں سے رواں ہیں —— اور جو مجھ سی سوگوار اَن گنت آنکھوں سے رواں ہیں ——

—— لیکن تُو تو موت ہے۔ اندھی اور بہری موت! میں تجھ سے گلہ کیا کروں!

لیکن میرے دوست! میرے بھائی ——!!
گلہ تجھ سے ضرور ہے مجھے۔
اپنی خوشی میں —— اپنے غم میں ——
ہمیشہ ہی تم نے شریکِ حال رکھا —— لیکن ——
جب تو نے جنّت کی حسین وادیوں کی طرف قدم بڑھائے تو اکیلا ہی
چل دیا —— یوں خاموش اور چپ چاپ سا!
میرے یار!
آہستہ سے مجھے بھی آواز دے لی ہوتی —— مجھے بھی پکار لیا ہوتا ——
تمہاری جدائی کا صدمہ بھلا کیسے برداشت ہوگا؟

بُلبلِ رنگیں نوا خموش

(مرحوم راجہ مہدی علی کی رُوح کو خراجِ گلہائے خلوص و عقیدت)

راقم بُلند شہری

یُوں تو وہ ایک مردِ قلندر مزاج تھا — اُس کی ہر ایک دل پہ حکومت تھی راج تھا
انسانیت کا اُس کی نظر میں تھا احترام — غیروں کو بھی خلوص میں اُس کے نہ تھا کلام
ہندو سے تھی غرض نہ مسلمان سے غرض — انسان تھا وہ اُس کو تھی انسان سے غرض
حاصل یہ وصفِ نادر و نایاب تھا اُسے — ہر دم خیالِ خاطرِ احباب تھا اُسے
معجز رقم تھا، صاحبِ علم و کمال تھا — وہ اپنے فن میں آپ ہی اپنی مثال تھا
خوش خلق و بذلہ سنج ظرافت کا بادشاہ — جادو نگار، فن کی نزاکت کا بادشاہ
اُس نے لگائے حُسنِ ظرافت میں چار چاند — تھے جس قدر ادیب وہ سب پڑ گئے تھے ماند
نثار بھی وہ شاعرِ شیریں بیاں بھی تھا — ذی فہم و ذی شعور بھی تھا نکتہ داں بھی تھا
خوشتر کا اک رفیقِ عدیم النظیر تھا — وہ "بیسویں صدی" کا پرانا اسیر تھا
خالد کو طاہرہ کو زمانے کو چھوڑ کر — ہستی کے ناتمام فسانے کو چھوڑ کر
رخصت برائے منزلِ مُلکِ عدم ہوا — کس سے کہیں جو اُس کی جدائی کا غم ہوا

جو روحِ نغمہ زار تھی ہے وہ صدا خموش!
باغِ سخن کا بُلبلِ رنگیں نوا خموش!

غزلیں

عطا محمد شعلہ

بیگانہ وشی بھی تو اُنھیں کی ہے ادا ایک
عُشاق کے جُرموں کی ہے یہ بھی تو سزا ایک

کل غیر سے کرتے تھے وہ ہنس ہنس کے کوئی بات
ہوتی کہیں ایسے میں جو ہم سے بھی خطا ایک

اِک تم کہ ہر اِک لحظہ بدل جاتے ہو آنکھیں
اِک ہم کہ طریقہ تھا جو اپنا سو رہا ایک

ہر رنگ میں ہم نے تو نبا ہا ہے وفا کو
لے دے کے تمہیں یاد ہے بس طرزِ جفا ایک

شکوے جو کئے اُن سے تو گھبرا کے وہ بولے
کیا رٹ ہے کہ ہر دم ہے وہی ذکرِ وفا ایک؟

یُوں عام ہیں دنیا کے لئے آپ کے جلوے
مُنھ پھیر لیا دیکھ کے کیوں ہم کو ذرا ایک؟

کہتی ہے کہ پی آئے کہیں حضرتِ شعلہ!
رونق سی ہے آج اُن کی جو آنکھوں میں سوا ایک!

بیسویں صدی دہلی

یعقوب راہی، بی۔ اے (آنرز)

چشمِ تمنا پُرنم پُرنم
پھُول کی قسمت، شبنم شبنم

اُن کی جوانی، میری محبت
ساحل طوفاں، باہم باہم

چند اشارے، چند کنائے
بات نظر کی، مبہم مبہم

حُسن کی بخشش گاہے گاہے
دل کے تقاضے، پیہم پیہم

ساون ہو، یا رُت پھاگن کی
دل تو سُلگے، موسم موسم

سوز و سازِ دل کی بدولت
محفل محفل، سرگم سرگم

کاش کوئی آواز دے راہیؔ
سازِ نفس ہے مدھم مدھم

محمد نعمت علی ماجد

کس کا مقصود زندگانی ہے
یہ بھی اِک اُن کی مہربانی ہے

دردِ دل اور دردِ دل کا شباب
ایک بھُولی ہوئی کہانی ہے

آ گئے ہو تو کچھ ٹھہر جاؤ
دل کی حالت ابھی دکھانی ہے

کہہ رہے ہیں وہ میرے لاشے پر
ہائے کیا مرگِ ناگہانی ہے

وعدہ کر کر کے بھُولنے والے
آ بھی جا رُت بڑی سُہانی ہے

تیری باتوں میں کچھ نہیں واعظ
خوش بیانی ہی خوش بیانی ہے

عشق کی راہ پہ مت چل ماجد
مُفت کی ایک سرگرانی ہے

افسانہ

طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد

جی۔ آر سنتوش

معرفت کمار گیلری، سُندر نگر مارکیٹ۔ نئی دہلی

۲۵ر جولائی ۱۹۶۶ء

محترمی خوشتر صاحب! آداب

افسانہ نمبر نظر نواز ہوا۔ افسانہ نمبر کی تو بات ہی الگ ہے۔ اُردو ادب کی دنیا میں "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ ایک آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے ــــ "طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد" اُس خاموشی کی کہانی ہے، جو طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد چھا جاتی ہے۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ آپ کی پسند "بیسویں صدی" کے قارئین کی بھی پسند ہے۔ مجھے اُن کی رائے کا بھی انتظار رہے گا.....

آپ کا اپنا ــــ سنتوش

شمی سے وابستہ کہانی کے میں کئی رُوپ سُن چکا تھا۔ کیا سچ تھا کیا جھوٹ! میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی ــــ وہ ایک خاموش خاموش سی لڑکی تھی۔ سب لڑکے لڑکیوں سے الگ تھلگ رہتی۔ اُس کا یُوں الگ تھلگ رہنا مجھے پسند نہ تھا لیکن نہ جانے کیوں میری نظریں ہمیشہ اُس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ وہ چلتی ایسے تھی جیسے قدم اُٹھانے سے رکھنے تک اُسے کئی انجانی دُشواریوں سے گزرنا پڑتا ہو۔ بات کرتے کرتے وہ اپنی بات جیسے بھُول جاتی۔ اور کبھی کبھی اُس کی باتیں اِتنی بے ربط ہوتیں کہ اُن سے کوئی خاص مطلب نکالنا مشکل ہو جاتا۔

ہماری پہلی ملاقات اُس دن ہوئی جب وہ یونیورسٹی سے شہر جانے والی آخری بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس دن صبح ہی سے آسمان ابر آلوُد تھا۔ دن میں دو ایک بار چھینٹے بھی پڑے لیکن کھُل کر بارش نہیں ہوئی تھی۔

اُردو ڈیپارٹمنٹ کی اوپر کی منزل سے روز جو منظر دکھائی دیتا تھا، وہ آج بادلوں میں چھُپ گیا تھا۔ پر مکھ کی تابناک اور بُلند پیشانی پر ٹیالے برف کی لکیریں ایسی ہوتیں جیسے کسی سادھو کے ماتھے پر بھسم کا ترشول بنا رہتا ہے۔ اُس کے دامن میں وہ ہلکی اور گہری نیلے رنگ کی دھوپ چھاؤں، جو ہوا کے دھیمے دھیمے چلنے سے پیدا ہوتی ہے ایسی دکھائی دیتی جیسے کوئی رہ رہ کر آنکھیں جھپکا رہا ہو۔ ڈل جھیل کے بیچ میں "سونہ لانک" چار چناری کا ٹاپو، جیسے ڈل جھیل کوئی حسینہ ہو، جو اپنے بالوں کو سر کے اوپر باندھے ہوئے ہو۔ ڈل کے پانی کی سطح پر بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی کشتیاں، جیسے کسی کافر جمال کی زُلفیں چہرے پر بکھری ہوئی ہوں یہ خواب کا سا منظر آج بادلوں کی دبیز تہوں اور دُھند کی چادر میں چھپ گیا تھا۔

شمی ڈل کی طرف مُنہ کیے نہ جانے کن سوچوں میں ڈوبی تھی۔ شاید دُھند میں لپٹے ہوئے ڈل کو دیکھ رہی تھی۔ یا بادلوں کی اوٹ میں پر مکھ کی بلندیوں کو ڈھونڈ رہی تھی۔ میں بھی انجانے میں دُھند میں گھِرے ہوئے ڈل کو دیکھنے لگا ــــ اچانک زور کی آندھی چلی۔ ڈل کے بیچ میں ایک چھوٹی سی ناؤ تنکے کی طرح ڈل کی لہروں پر اُڑنے لگی۔ میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ چند لمحے بیہوشی کی سی حالت میں رہنے کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ناؤ کنارے کے قریب آپہنچی تھی اور دس بارہ سال کا ایک لڑکا ہماری طرف مُسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اُس کی مُسکراہٹ دیکھ کر چونک اُٹھا۔

"یہ آندھی۔ بیچ ڈل اور تم....؟"

وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔ میں کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ شمی، جواب تک سوچوں میں ڈوبی تھی، جیسے اپنے آپ سے بولی۔

"ڈل کے باسی ہیں۔ پانی ہی سے جنم لیتے ہیں اور ایک دن پانی ہی میں دفن ہوتے ہیں"

"ماناکہ پانی ہی سے زندگی ہے لیکن طوفان ۔۔۔؟!" میں نے شمی سے مخاطب ہوکر کہا۔

"یہ لوگ طوفانوں ہی میں پلتے ہیں ——— اور وہی اِن کی زندگی ہے!" شمی نے میری طرف مُنھ کرکے کہا۔

میں شمی سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا کہ اتنے میں بس آگئی۔ اور وہ بس میں سوار ہوکر چلی گئی۔

میں دیر تک اس مختصر سی ملاقات کو ذہن میں اُتارتا رہا۔ خاموشیوں میں ڈوبے ہوئے شمی کے خیالوں کی تہہ میں اُترنے کی کوشش کرتا رہا ——— ——— معصوم خوبصورت شمی!

اِس چھوٹی سی ملاقات نے جیسے شمی کی خاموشی کو اور گہرا بنا دیا۔ اور مجھ میں اُس خاموشی میں پلنے والی سوچوں میں ڈوبنے کی تمنا جاگ اُٹھی۔ میرے دل میں اُن باتوں کو جاننے کی تمنا جاگ اُٹھی جو دنیا سے پوشیدہ تھیں۔ جن باتوں کو سوچتے سوچتے وہ اچانک کھو سی جاتی جنھیں یاد کرکے وہ اپنی بات بھول جاتی ——— نہ جانے کیا بات تھی کہ شمی کے متعلق میرے خیالات صرف دوستانہ حد تک ہی رہے۔ حالانکہ مجھ جیسا کوئی بھی نوجوان اُس کا رنگ رُوپ دیکھ کر بہک سکتا تھا۔

شمی کافی ذہین اور پڑھی لکھی تھی۔ یہ مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوتا گیا۔ بہت دنوں کے بعد شمی نے مجھے بتایا کہ اُس کی شادی ہوچکی ہے۔ شمی اس اپنی شادی سے مطمئن تھی یا نہیں۔ میں نے کبھی اُس سے نہیں پوچھا۔ البتہ ایک بات مجھے ضرور شک میں ڈال دیتی جب وہ بات کرتے کرتے کبھی ٹھٹک سی جاتی۔ جیسے کوئی انجانی شے اُسے چھو رہی ہے۔ اس کے سارے جسم میں سرایت کر رہی ہے۔

ایک شام جب اُس دن کی طرح آسمان کالے بادلوں سے جھک سا گیا تھا۔ پرگھر کی بلندیاں ڈل میں ڈوب چکی تھیں۔ شمی نے اصرار کیا کہ ہم دونوں کشتی میں سوار ہوکر ڈل میں چلیں۔ ایسے موسم میں جبکہ تیز ہوا سے ڈل کا پانی بانسوں اُچھل رہا تھا ڈل میں جانا موت کے منھ میں جانا تھا! خدا جانے کس جذبے کے تحت میں شمی کے ساتھ ناؤ میں سوار ہوا۔ ناؤ اُسی لڑکے کی تھی جس کی ناؤ اُس دن آندھی میں تنکے کی طرح اُڑی تھی۔ ایک بار اُس چھوٹی سی ناؤ اور اُس کمسن لڑکے کو دیکھ کر میں نے چاہا کہ ناؤ سے اُتر جاؤں لیکن لڑکے کے معصوم چہرے پر وہی جانی پہچانی مسکراہٹ دیکھ کر میں اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور ہوگیا

ڈل کی اُچھلتی لہروں کو دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ ناؤ کے ہر ہچکولے پر میری جان نکل جاتی لیکن شمی ڈل کی لہروں سے بے خوف اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ کسی کشمیری گیت کے بول گنگناتے ہوئے چپّو چلا رہا تھا۔

"جانتے ہو؟" شمی جیسے بڑبڑانے لگی۔ "مجھے طوفان اور آندھیاں پسند ہیں!" چار چناری کے چنار تیز آندھی سے رہ رہ کر ایک دوسرے پر گرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ "میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو طوفان اور آندھیوں میں ڈال دیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ وہ مجھے اپنے اندر سمولیں گے لیکن ہر بار میں زندہ واپس نکل ہوں ——— یہ معمولی سی آندھی ہے جو ڈل جھیل کے سکون میں یونہی کچھ دیر کے لئے اُتھل پُتھل کرتی ہے۔"

ڈل کی اُن لہروں کو دیکھ کر میری تو جان نکلی جا رہی تھی۔

"یہ آندھی تو کچھ بھی نہیں۔ طوفان تو وہ تھا۔ جب مجھے نرمل سے ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا گیا۔ مجھ سے میری جان چھین لی گئی۔"

شمی کا یوں خود بخود اُس کہانی کے پردوں کو چاک کرنا جو دل کی گہرائیوں میں دفن تھی۔ مجھے عجیب سا معلوم ہوا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے شمی کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے کہانی کے کسی دھاگے کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کرشنا میری سہیلی تھی۔ ہمارے گھروں کے درمیان گھریلو تعلقات تھے۔ وہیں پر نرمل سے ملاقات ہوئی ——— باتونی کہیں کی! ——— شمی نے یہ اپنے آپ سے کہا۔ اِس ایک فقرے نے مجھ پر یہ بات واضح کردی کہ یہ نرمل ہی کی باتیں ہوں گی جنھوں نے شمی جیسی لڑکی کو جکڑ کر رکھ دیا۔

باتیں جو ایک زندگی کو اُلجھا سکتی ہیں!

باتیں جو زندگی کی دھارا بدل سکتی ہیں!

"ملاقاتیں، دوستی میں ڈھل گئیں اور ایک دن یہی دوستی پریم کا رُوپ دھار کر ہمارے دلوں میں آن بسی۔"

میں نے چاہا شمی سے کہوں، نرمل تو ہندو تھا۔ یہ محبت کیسی؟ ——— یہ بندھن کیسا؟ ——— لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی ہی سوچوں پر ندامت ہوئی اور میرا سر جھک گیا۔

ہماری ناؤ لہروں پر ڈول رہی تھی۔ مانجی لڑکا بہت اطمینان سے "ژوچہ نُو" کشمیری ٹکیہ کھا رہا تھا۔ جب میری نظریں لڑکے کی نظروں سے جا ٹکرائیں تو وہ مُسکرا دیا۔ میں مُنھ پھیر کر دُھندلاتے ہوئے یونیورسٹی کے اُردو ڈیپارٹمنٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ جس میں نہ جانے کتنی کہانیاں پل رہی تھیں۔ کتنی کہانیاں

بسسک رہی تھیں۔ اور جس کی ایک کہانی تھی...... !؟ شمی بہت اطمینان سے بیٹھی تھی "محبت ایک دھرم ہے مذہب ہے۔ وہ خود ہی بول اُٹھی " ہمارا مذہب اور دھرم ایک کچا دھاگا ہے۔ ہاتھ لگایا ٹوٹ گیا۔ ایک ایسا وقتی بندھن جسے ہم اپنے منشا کے لئے استعمال کر سکتے ہیں"

ہماری ناؤ ایک دائرے کی صورت میں ناچنے لگی۔ اور مجھے موت قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مانجی لڑکا پھر اطمینان سے "زدچوزُد" کھا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں دُعائیں مانگنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے دیکھا، شمی اپنی ہی کہانی کا تانا بانا بُن رہی ہے —— اچانک وہ ایک طرف کو جھکی اور اُس کا سر لہروں کو چھونے لگا۔ جیسے وہ ڈل کی لہروں کی دھڑکنیں سُن رہی ہو۔ جیسے اُن سے راز کی بات کر رہی ہو۔ میں خاموش نگاہوں سے کبھی اُسے، کبھی ناؤ کو جو برابر گھوم رہی تھی اور کبھی ڈل جھیل کی اُن لہروں کو جو مجھے نگلنے کے لئے بیتاب نظر آ رہی تھیں، دیکھ رہا تھا۔

"جانتے ہو زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ؟" شمی نے ایک لہر کو پکڑ کے جیسے ناؤ میں بھرنے کی کوشش کی۔ "جو ڈل کے پانی اور اِن لہروں کے درمیان ہے" اُس نے خود ہی کہا "ڈل کا پانی لہر ہے اور لہر پانی!" میں شمی کی اِس منطق پر ایک لمحے کے لئے اپنے اِردگرد کی آندھی کو بھُول گیا۔ شمی کھسک کر میرے نزدیک آئی اور ناؤ کے بیچ والے تختے پر بیٹھ گئی —— میری نظریں اُس کی آنکھوں میں اُس صحرا کو دیکھ رہی تھیں جس میں اَن گنت نقشِ پا اَن گنت منزلوں کا پتہ دے رہے تھے۔ شمی کی نظریں نہ جانے کس منزل کی متلاشی تھیں۔ کس نقشِ پا کو ڈھونڈ رہی تھیں؟!

مانجی لڑکا اُونگھتے اُونگھتے کہنیوں کے بل ذرا اوپر کو اُٹھا اور پھر لیٹ گیا۔ وہ جیسے ماں کی گود میں سو رہا تھا۔

شمی نے مُنھ پھیر کر لڑکے کو دیکھا اور کہا "یہ ڈل جھیل اِن کی ماں ہے۔ ماں کی طرح شانت اور ملائم دل لئے —— لیکن جب کبھی غصہ سے ماں کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں تو یہ لہریں اُٹھتی ہیں"

ایک لمحے کے لئے میں ڈل جھیل کی وُسعتوں میں کھو گیا۔

"نرمل" شمی جیسے دل ہی دل میں نرمل کو آواز دے رہی تھی۔ یا اپنے ہی دل کی کسی دھڑکن کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دیر تک آنکھیں بند کئے کچھ بُڑبُڑاتی رہی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے اور خواب ہی میں بڑبڑا رہی ہے —— " نرمل ایک اکیلی ذات تھا، جس کے ساتھ سماج کے بندھن اور دھرم کی زنجیریں نہیں تھیں۔ وہ نرمل تھا صرف نرمل —— میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ میں سماج کے مقابلے میں مخالفت پر اُتر آؤں گی۔ مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ میری زندگی نرمل کے بغیر ادھوری ہے"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارا باپ ایک اعلیٰ پولیس افسر ہے۔ جو ایک اُڑتی چڑیا کی قسمت کا بھی مالک ہوتا ہے" میں نے یونہی اپنے اِردگرد کے طوفانی تھپیڑوں کو بھول جانے کے لئے کہا "میرا وہ صرف باپ تھا اور میں اُس کی بیٹی لاڈلی اور اکلوتی تھی" شمی کے لہجے میں جتنا اعتماد تھا اتنا ہی اُس کے چہرے کا تاثر درد میں ڈوبا ہوا تھا۔

"نرمل کی باتوں میں توی کی پوترتا اور جہلم کی سی شانتی تھی۔ ڈل جھیل کا سا سکون تھا۔ شالیمار کی ہواؤں کی سی ٹھنڈک تھی۔ اُس کی ذات "سربند کا آئینہ تھی!

شمی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی۔

"میں نے جو کچھ چاہا، پایا"

"تمہیں یہ یقین ہے؟"

میرے اِس سوال پر وہ چونک سی گئی۔ مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی رہی۔ مجھے محسوس ہوا، اُس کی جانی پہچانی شے اُسے چھوڑ رہی ہے — اُس کے جسم میں سرایت کر رہی ہے — کچھ دیر کے بعد اس نے اپنی بانہیں پیچھے کی طرف کھینچ کر ہتھیلیوں پر سارا بوجھ ڈال کر تختے پر جما دیں۔ اور اپنے سر کو جھٹکا سا دے کر کہنے لگی۔

"میں اِس ڈل جھیل کو پہچانتی ہوں۔ اس طوفان کو بھی جو کبھی کبھی انجانا سا معلوم ہوتا ہے" چند لمحوں تک اُس کی نظریں مجھ پر مرکوز رہیں "جانتے ہو ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ جب ہمارے دلوں میں شکوک پیدا ہوتے ہیں تو اُس کے ردِّ عمل کے طور پر ڈل جھیل میں یہ آندھی آتی ہے۔ جیسے ہم چاندنی میں نہلائے ڈل جھیل کی پُرسکون تنہائیوں میں اس کی گہرائیوں کو بھُول جاتے ہیں طوفان بھی بھُول جائیں تو کبھی خوف محسوس نہ کریں گے۔ لیکن ہم ایسا نہیں سوچتے۔ انسان ہیں نا! پل میں گرم اور پل میں ٹھنڈا —— یہ انسانی فطرت ہے"

شمی نے اپنے آپ کو یوں چھوڑ دیا، جیسے وہ بہت تھک چکی ہو۔

اور میں اِن بے ربط باتوں کو اپنے ذہن میں ترتیب دینے کی سعی کرتا رہا۔ شمی کی گردن جُھک گئی اور اُس کی نظریں گود میں پڑے اپنے ہاتھوں پر بے مقصد جم گئیں۔

"میری اور نرمل کی محبت میں ویتستا کی سی روانی تھی، پہاڑی نالوں کی سی جلد بازی نہیں تھی"

وہ جیسے پُرانی یادوں میں کھو گئی۔

"ہیں اگر انتظار تھا تو اُس گھڑی کا جب میں جوانی کے آنگن میں قدم رکھتی۔" گردن اُوپر اُٹھا کر اُس نے میری حیران نظروں کو دیکھا اور کہا "تم کہتے ہو کہ میں سنِ شعور کو پہنچنے سے پہلے محبت کے لطیف احساسات اور جذبات سے کیسے آشنا ہوئی؟ محبت ایک ازلی دین ہے، جو ہمیں آدم اور حوا سے ورثے میں ملی ہے۔ اپنے جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لئے محبت جیسے پوتر بندھن کو زنجیروں میں جکڑنے کے لئے ہم نے ایک خود ساختہ ضابطہ بنا لیا ہے۔ اِس لئے کہ محبت مذہبی تفریق کو مٹا دیتی ہے۔ سماج کے جھوٹے اور کھوکھلے بندھنوں کو توڑ دیتی ہے۔ ہم نے یہ مختلف اور متضاد ذرائع اور ضابطے اِس لئے بنائے ہیں کہ انسان، انسان سے الگ رہے، دُور رہے۔ ہماری سربراہی کا سکّہ چلتا رہے۔ لیکن وہ فطرتاً ایک ہے۔"

میں ڈل جھیل کی آندھی بھول کر شمی کی آنکھوں میں اُٹھتے ہوئے اُس طوفان کو دیکھنے لگا، جو میں نے اِس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ میں نے کئی بار اُس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہاں شانت گہرائیاں ہوتیں، پُرسکون وسعتیں ہوتیں،

اُس دن معمول کی طرح میں کرشنا کے ہاں گئی۔ ایسا تو کئی بار ہوا تھا کہ میں گھر والوں کو بتائے بغیر ساری ساری رات وہاں رہی۔ کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میرے والد کو مجھ پر پُورا پُورا اعتماد اور بھروسہ تھا — لیکن —؟!"

شمی کی خوبصورت آنکھوں میں خوف اور دہشت کی پرچھائیاں ناچنے لگیں۔ اُس کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا "ایک چھوٹی سی بات کتنی خطرناک بن سکتی ہے۔ سوچتی ہوں تو کانپ اٹھتی ہوں۔ یہ زندگی ایک بے مقصد سی چیز محسوس ہوتی ہے — ایک ایسا لمحہ جو آنکھ جھپکتے ہی بیت جاتا ہے۔ ایک وہ لمحہ جب سانس تیز ہو کر ہمیشہ کے لئے ڈوب جاتی ہے۔ ایک وہ لمحہ جب ندی ساگر کی وسعتوں میں مل کر اپنا وجود کھو دیتی ہے — اور جب انسان اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔" مجھے شمی کی آواز ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ دیر تک اپنے آپ میں کھوئی رہی۔

اپنی سوچوں کو سمیٹ کر اس نے کہا "میرے بھائی صاحب نے کرشنا کے ہاں ٹیلی فون کیا — جو کرشنا کے چھوٹے بھائی نے اُٹھایا۔ اُس نے شرارتاً میرے بھائی صاحب سے کہا کہ میں یہاں نہیں ہوں۔" شمی پھر خاموش ہو گئی۔ میں نے اس کے چہرے پر اَن گنت آتے جاتے تاثرات دیکھے۔ وہ جیسے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ ہوا کے ایک زوردار تھپیڑے سے ہماری ناؤ اُچھل کر دُور جا پڑی۔ چند لمحے مجھے محسوس ہوا کہ ناؤ اُلٹ گئی ہے اور میں جھیل کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے ڈوب چکا ہوں۔ شمی کی آواز سُن کر میں نے آنکھیں کھولیں۔

"مرنے کا صرف ایک ہی دِن معیّن ہے۔ تم گھبراتے کیوں ہو؟ میرے ساتھ تم کبھی ڈوب نہیں سکتے — میں بہت سخت جان ہوں!"

میرے کھوئے ہوئے حواس بجا ہوئے اور شمی پھر کہنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں دہشت اور خوف مٹ چکا تھا۔ صرف ایک خلا سا باقی رہ گیا تھا۔

"والد صاحب کبھی ایسا نہ کرتے۔ خود پولیس کے افسر ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی بات پولیس تک نہ پہنچاتے — پولیس کو خبر میرے بھائی صاحب نے دی۔ پل بھر میں شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بات پھیل گئی کہ میں نرمل کے ساتھ بھاگ گئی! اور اس جھوٹے واقعے کو شہ دینے والے میرے والد کے قریبی دوست تھے — نہ جانے کس بات کا بدلہ لینے پر تُلے ہوئے تھے — میں نے کہا نا کہ میں ابھی سنِ شعور کو نہ پہنچی تھی۔ میں اگر ایسا کرتی تو نرمل کو قانون کی زَد سے کبھی بچا نہ سکتی — میں اُسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنی زندگی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ میں ساری عمر رونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی زندگی کو سسکیوں میں ڈبونا نہیں چاہتی تھی۔ میں ہنسنا چاہتی تھی۔ ڈل میں کھلے ہوئے کنول کی طرح! میں وقت کے کندھوں پر سوار ہو کر محبت کی انجانی وسعتوں میں اُڑنا چاہتی تھی۔ میں وہ بادِ نسیم بننا چاہتی تھی جو پھولوں کی مہک اُڑا کر ساری فضا کو معطر کرتی ہے۔ میں اپنی زندگی کو تپتا ہوا ریگ زار بنانا نہیں چاہتی تھی۔ چنار کی ٹھنڈی شیتل چھاؤں بنانا چاہتی تھی — زندگی سے پیار سبھی کرتے ہیں — لیکن —!؟"

شمی نے اچانک مجھ سے سوال کیا "کیا تم نے کبھی محبت کی ہے؟"

میں شمی کے اِس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ اس لئے کہ میری زندگی میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا تھا۔ اگر آیا بھی ہوگا تو اپنی بزدلی کی وجہ سے کترا کر نکل گیا ہوں گا۔ شمی اپنے سوال کا جواب پانے کے لئے اب بھی منتظر تھی۔

"محبت کی بھی ہے اور نہیں بھی!" میں نے یوں ہی محض سوال کا جواب دینے کی خاطر کہا۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"میں نے اپنی بیوی سے محبت کی ہے اور وہ بھی شادی کے بعد!"

شمی حیرت میں ڈوبی ہوئی مجھے دیکھتی رہی۔ دیر تک مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتی رہی۔ اور میں ساکت مجسمے کی طرح مبہوت سا اُسے بے مقصد دیکھے جا رہا تھا — کچھ دیر تک اس کے چہرے پر وہی جانے پہچانے تاثرات اُبھرتے مٹتے رہے۔

"بات اُس حد تک جا پہنچی تھی جہاں ہر باپ کے قدم ڈگمگا سکتے ہیں"

شمی نے ایک لمبی سانس لی۔ پھر چند لمحے مُنہ پھیر کر خاموش رہی۔ جب اُس نے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے بولنا چاہا۔ آواز جیسے گلے ہی میں اٹک کر رہ جاتی۔

"اُس دن میری زندگی کی ساری رعنائیاں ختم ہو کر رہ گئیں۔ مستقبل کے وہ رنگین خواب جو نرمل سے وابستہ تھے۔ اندھیرے [illegible] کی چار دیواری میں بکھر کر رہ گئے۔ ایک میں تھی بے بس چڑیا جیسی، جو دیواروں سے سر پھوڑ رہی تھی اور ایک [illegible] تھا جو ......!؟"

شمی پھر خاموش ہو گئی۔ میں جیسے کسی حادثے سے دوچار ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ مانجھی لڑکا دھیمے دھیمے چپّو چلا رہا تھا۔ سامنے پرشکمہ کی پہاڑی پر بادل اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ڈل جھیل کے اُدھر دھند کی چادر پھٹنے لگی تھی۔ اور اردگرد سارا منظر آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔

"ایک دن مجھے کمرے سے باہر نکالا گیا۔ ایک لاش کی طرح! مجھے غسل دیا گیا۔ نئے زرق برق کپڑے پہنائے گئے۔ زیوروں سے لاد دی گئی۔ اور مجھے دُلہن بنایا گیا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکی، کچھ بھی نہ کر سکی۔ البتہ ان اپنوں کو دیکھ کر ہنسی آئی جنھوں نے گرم آہنی سلاخوں کے داغ اور نشان حسین، قیمتی ملبوسات میں چھپا دیئے۔ لیکن وہ درد چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکے جو آنسو بن کر میری آنکھوں سے پھوٹ رہا تھا۔ وہ زخم نہ چھپا سکے جو ناسور بن کر میرے دل جگر میں رِس رہے تھے۔"

شمی کی نظریں جیسے دُھند کی سطح پر کچھ پڑھتی رہیں۔

"جانتے ہو وہ کونسا دن تھا؟ ---- یہ وہی دن تھا جس دن میں بچپن کی حدوں سے نکل کر سنِ شعور کو پہنچی تھی ---- یہ وہی گھڑی تھی جس کا ہم ایک جنم سے انتظار کرتے آئے تھے۔ جس گھڑی نہ پولیس افسر کا قانون اور نہ باپ کے مضبوط اور لمبے ہاتھ ہی مجھے اپنی گرفت میں لے سکتے تھے۔ لیکن ----!؟

اس دن میں نے اپنے والد کو پولیس افسر کی حیثیت سے جانا اور اس اعتماد کو پہچانا جو کبھی میرے والد کو مجھ پر تھا۔ اُس باپ کو جانا جس نے اپنے جھوٹے وقار کے لئے اپنی زندہ بیٹی کو گلی سڑی لاش کی طرح آگ میں جھونک دیا!"

شمی نے مُنہ پھیر کر آنسو پونچھ لئے۔ پھر میری طرف دیکھا اور پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی: "شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں نے نرمل کو دغا دی۔ نہیں ---- شاید تم نہیں جانتے ---- جانتے بھی کیسے! یہ بات میں یا میرے شوہر ہی جانتے ہیں کہ ہماری شادی کو تین سال ہو گئے لیکن ہم نے کبھی ایک دوسرے کو چھوا نہیں!"

قطعۂ تاریخ وفات راجہ مہدی علی خاں

اختر واصفی

آہ مہدی علی زمانے میں — شاعرِ خوش دماغ تھا نہ رہا
مئے طنز و مزاح پیتے تھے — جس کا وہ اِک ایاغ تھا نہ رہا
دہر میں منزلِ طرب کا جو — ایک باقی سراغ تھا نہ رہا
طنز کے پھول جس میں کھلتے تھے — وہ ظرافت کا باغ تھا نہ رہا

روشنی کس طرح ہو اخترؔ وہ
"بزم گر کا چراغ تھا نہ رہا"

۱۹۶۶ء

شمی نے پانی کا ایک چلو بھر لیا اور دور پھینک دیا۔ پھر ایک چلو بھر لیا اور پی لیا۔

"معبود ایک ہوتا ہے عابد چاہے جتنے ہوں ---- محبت صرف ایک بار کی جاتی ہے صرف ایک بار!"

شمی کے لہجے میں خلوص تھا۔ آنکھوں میں نفرت اور فتح کی تابناک چمک تھی ---- لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چمک رات کی سیاہی میں ڈوب گئی اور لہجے میں زہر کا بجھا ہوا طنز تھا۔

"میں جان چکی ہوں کہ نرمل کی محبت وقتی تھی۔ ڈل کی اُس آندھی کی طرح جو کچھ دیر کے لئے ڈل جھیل کے سکون کو اُتھل پتھل کر دیتی ہے۔ اُس خاموشی کی طرح جو طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد چھا جاتی ہے۔"

میں عجیب نظروں سے شمی کو دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ ایسی مُسکراہٹ، جس میں محبت کا لمس بھی تھا اور درد کی ٹیسیں بھی تھیں۔

"طوفان تھم چکا ہے!" میں نے اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے کہا۔

"طوفان ایک بار اُٹھنے کے بعد تھم نہیں جاتا۔ رُکتا ہے نئی سانس لینے کے لئے۔ تھمتا ہے نیا جوش پیدا کرنے کے لئے!"

شمی کی نظریں پرشکمہ کی بلندیوں کو چھو رہی تھیں۔ اور میں ڈل پر چھائی ہوئی خاموشی میں جیسے ڈوبتا گیا۔

غزلیں

سید خورشید اختر بسوانی

جب کبھی بیدار ہوا ہے کوئی دیوانوں میں
بستیاں کھنچ کے چلی آئی ہیں ویرانوں میں

ایک ہی طرح کے ہیں چاک گریبانوں میں
وضعداری کا خیال اب بھی ہے دیوانوں میں

جب سے اُن مست نگاہوں نے برسنا سیکھا
جام خالی نظر آتے نہیں میخانوں میں

قصۂ کوئے صنم کہئے تو کچھ بات بھی ہے
کیا دھرا ہے حرم و دیر کے افسانوں میں

اِک نہ اِک دن کوئی قدموں سے لپٹ جائے گا
اِس طرح آپ نہ آیا کریں دیوانوں میں

جب وہ گزریں گے تو ذرّوں سے شفق پھوٹے گی
ایک پہچان ہے یہ بھی کسی پہچانوں میں

سُرخیٔ خوں ہو کہ صہبائے شفق رنگ اختر
کچھ نہ کچھ روز ہی ڈھلتی ہے پیمانوں میں

[illegible]

معین کوثر

ستم ہو رہے ہیں جو پیہم تو کیا ہے
دلِ باوفا کو اُمیدِ وفا ہے

نہ حسرت رہے گی نہ ارماں رہے گا
رہیں آپ دل میں مکاں آپ کا ہے

مرا نام آیا تو کہنے لگے وہ
کہیں یاد آتا ہے میں نے سُنا ہے

رقیبوں کی حالت بھی اچھی نہیں ہے
کسی کا بُرا چاہنا بھی بُرا ہے

تمنّا ہے کیا اِس کو ہم کیا بتائیں
تمہیں پُوچھ لو دل سے کیا چاہتا ہے

خطاوار ہم ہیں، گنہگار ہم ہیں
شکایت تمہاری بجا ہے بجا ہے

ترے در سے اُٹھ کر کہاں جائے کوثر
یہ سارے جہاں کا ستایا ہوا ہے

ضیا فتح آبادی، ایم۔ اے

محبت جذبۂ ایثار بھی ہے
جنُوں کے ہاتھ میں تلوار بھی ہے

محبت کرنا، پھر اُس کو نبھانا
بڑا آساں، بڑا دشوار بھی ہے

میں جن گلیوں میں ٹھکرایا گیا ہوں
اُنھیں گلیوں سے مجھ کو پیار بھی ہے

ابھی تک ہے ترے آنے کی اُمید
ابھی تک حسرتِ دیدار بھی ہے

سُناؤں کس کو رُودادِ غمِ دل
زمانے میں کوئی غم خوار بھی ہے!

نظامِ میکدہ بدلا تو لیکن
وہی ساقی، وہی میخوار بھی ہے

ضیا کی شاعری انسان کا غم
ضیا کو شاعری سے عار بھی ہے



کتنی لاجواب دھلائی! جگمگاتی سفید! بیداغ صاف! آسان ترین دھلائی! اس لئے کہ سرف میں دھلائی
کی نائد قوت ہے اور ڈھیروں جھاگ! اپنی ساری دھلائی، بچوں کے لباس، قمیضیں، ساڑھیاں، سبھی
کپڑے سرف سے دھوئیے۔ جی ہاں، گھر میں دھوئیے، سرف سے دھوئیے!

سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں!

ہندوستان لیور کا تیار کردہ

SU. 46-140-46 UD

طنزیہ

بے زبانوں کی زبان

ناز انصاری

۵۲۰۔ مٹیا محل۔ دِلّی نمبر ۶

خوشتر صاحب! آداب

اب میں "بے زبانوں کی زبان" اور آپ "فریاد رساں" خوب گزرے گی جو . . یہ اُن دونوں خطوں کی اشاعت کے لئے کون کس کا شکر گزار ہو، یہ پڑھنے والوں پر چھوڑئے۔ لیکن اُن کی اشاعت کے بعد اب اپنی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی ہے ؎

زُلفِ خیال نازک و اظہار بےقرار
یارب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

بے شمار خطوط فاؤنٹین پین کی ٹیوب میں نظر بند پھڑک رہے ہیں اور "ڈیفنس آف پین رولز" کے خلاف آپ کی عدالت میں باری باری حبسِ بیجا کی درخواست گزارنے کے لئے "کیو" میں لگے ہیں ــــ اُمید ہے کہ آپ ان سب کو پیش ہونے کا موقع دیں گے۔ اچھا تو پھر اب ؎

جس کو ہم نے آشنا لُطفِ تکلّم سے کیا
اُس حریفِ بےزباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

آپ کا ــــــ ناز انصاری

بھوک کا خط مسٹر سبرامنیم کے نام!

اَن داتا!!

میں آپ کے حضور شرمسار ہوں، مُنہ دکھانے کے قابل نہیں۔ میری وجہ سے آپ کو دُنیا بھر کی رُسوائیاں مول لینی پڑ رہی ہیں۔ آپ پی ایل ۴۸۰ کے تحت اناج درآمد کرتے ہیں اور ۴۹ کروڑ کا یہ مُلک آئی پی سی ۴۲۰ کے تحت بہت سا حصّہ لے اُڑتا ہے اور پھر "بھوک بھوک" کا شور مچاتا ہے۔ یہ لکڑ ہضم پتھر ہضم چورن" کھانے والی قوم کبھی مطمئن نہ ہوگی۔ اِنھوں نے آپ جیسے کئی وزراءِ خوراک کا بستر گول کیا ہے۔ صرف رفیع احمد قدوائی تو اِن کی آئی پی سی ۴۲۰ کی زد سے بچے اور اُنھوں نے اُلٹا وزارتِ خوراک ہی کا بستر گول کر دیا تھا ورنہ جناب "ملا انوع" تو "بھوک بھوک" اور "لاؤ لاؤ" کا شور مچا کر کئی وزیروں کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے ــــ مگر یاد رکھئے اب غالب کا دقیانوسی زمانہ نہیں ہے کہ ؎

بُوئے گُل نالۂ دل دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نِکلا سو پریشاں نِکلا

وزیروں کی بزم سے نِکلنے والا ہر شخص مطمئن اور آسُودہ نکلتا ہے اور وزارتِ خوراک سے نِکلنے والا تو گورنر اور راشٹرپتی بنتا ہے۔ بیس برس کی تاریخ شاہد ہے۔ آپ آزاد ہندوستان کی تاریخ کے اَوراق پلٹئے، آپ پر میرے قول کی صداقت واضح ہو جائے گی۔

پیارے بھوج منتری! آپ میرے نام پر شور مچانے والوں سے بالکل نہ گھبرائیں۔ ان کو کھانے کو تو کچھ نہ کچھ مِلتا ہی رہتا ہے۔ غلّہ نہیں مِلتا تو یہ گولی کھا لیتے ہیں۔ لاٹھی کھاتے ہیں۔ اِنھیں کھانا بہرحال مل جاتا ہے اور میں تو یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر یہ غلّے کے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ اِنھیں چاہیئے کہ یہ سیب کھائیں، انار کھائیں، کیک اور رس گلّے کھائیں، انڈا اور مچھلی کھائیں۔ اِن چیزوں میں کتنے وٹامن ہوتے ہیں۔ یہ صحت کے لئے کتنی مفید چیزیں ہیں مگر یہ بے وقوف لوگ اقتدار سے محروم لیڈروں کے بہکانے میں

آگ، جلسے، جلوس، مظاہرے، غرضیکہ ہر چیز پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جب لیڈر رنگ بہ رنگ جیل پہنچ کر مکھن، توس اُڑاتے ہوتے ہیں تو یہ گلی کوچوں میں گولیاں کھا کر بھُوک مٹاتے ہیں۔ بلکہ یُوں کہیے کہ خود مٹ جاتے ہیں۔ بھلا کون مٹا سکتا ہے میں تو آدم علیہ السلام کو جنت سے لے کر آئی تھی اور جب تک انسان کا آخری بچہ باقی ہے میں اُس کا پیچھا نہ چھوڑوں گی۔

سیمرامنیم جی مہاراج! اکثر وہ لوگ جو وزیر نہ بن سکے مجھے اِس حد تک بدنام کرتے ہیں کہ بھُوک سے مر جانے کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ کوئی میری وجہ سے نہیں مرتا۔ آپ جانتے ہیں کہ ؂

موت کا ایک دن معین ہے

یہ لوگ مرتے ہیں کم غذائیت سے! گھی، دودھ، مکھن نہ کھانے کے باعث۔ یہ لوگ مرتے ہیں ہیضے سے، طاعون سے، چیچک سے، ملیریا سے، دِق سے۔ مگر یہ لوگ مجھے اور آپ کو بدنام کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اِس لئے وہ بھُکمری کے افسانے تصنیف کرتے اور اپنی اپنی پارٹی کا سکّہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں اور اب جوں جوں الیکشن قریب آئے گا وُوں تُوں میں اور آپ بدنام ہوں گے ——— لیکن ہمیں اِس زرّیں اصول کو اپنا لینا چاہیے ——— بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا! ——— تو پھر ہم سکون و اطمینان سے رہیں گے اور اُن لوگوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ وہ راتیں مظاہروں اور جلسوں کی تیاری میں اور دن میں گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے میں گزاریں گے۔ اچھا اجازت! رُخصت ہوتی ہوں۔ بھگوان آپ کو بھی گورنر بنائے۔

دُنیا بھر میں بدنام ——— بھُوک

پلان کا خط اشوک مہتہ کے نام!

مائی ڈیر اشوک!!

آپ تو مجھے ایسا جانتے ہیں جیسے خود کو جانتے ہیں لیکن یہ ہندوستانی جنتا جس کو پنڈت جواہر لال نہرو نے جمہوری آئین بنا کر اِس ملک پر راج کرنے کا حق دیا ہے، وہ مجھ سے گزشتہ پندرہ برس ہی سے واقف ہوئی ہے۔ اِس سے پہلے میں صرف ڈکشنری کی زینت تھا اور سی۔ اے۔ ٹی کیٹ میں بی اور آر۔ اے۔ ٹی ریٹ میں جو ہا پڑھنے والے لوگ ہی مجھ سے آشنا تھے۔ مگر وہ بھی بس اِتنا ہی جانتے تھے کہ پی۔ ایل۔ اے۔ این، پلان میں منصوبہ۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ بات تو اُن پر آزادی کے بعد ہی کھُلی کہ میں الہ دین کے چراغ اور عمرعیار کی زنبیل سے بھی زیادہ عجیب تر اور حیرت انگیز تر چیز ہوں اور ہندوستانیوں کی ہر ضرورت کا تکمیل اور ہر دُکھ درد کا مداوا کرنے والا ہوں۔ اب کوئی غالب یہ طعنہ نہیں دے سکتا ؂

ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

جنتا میرا استقبال جانے ... میرا نام اور شناسائی ... ہندو کو بھگوان کی قسم، مسلمان کو خدا کی، سکھ کو واہگورو اور عیسائی کو گاڈ کی قسم۔ وہ میرا مطالعہ گیتا، قرآن، بائیبل اور گرنتھ صاحب کی طرح پُورے ذوق و شوق اور یقین و اعتقاد کے ساتھ کرے جس طرح اُن پر نکتہ چینی گناہ سمجھتا ہے، اُسی طرح سے مجھ پر بھی اعتقاد رکھے اور پھر دیکھے کہ میں کیا ہوں ——— میں خوش حالی کا پیغام ہوں، بے روزگاری کا تدارک ہوں، ترقی کا زینہ ہوں۔ غربت کو مٹانے والا، دولت کو ہر جیب اور بٹوے تک پہنچانے والا ہوں۔ مختصر یہ کہ میری مُٹھی میں ہر ضرورت مند کی حاجت روائی کا سامان ہے۔ بچّوں کے لئے ہزاروں اسکول کالج ہیں، مریضوں کے لئے ہسپتال، ڈسپنسریاں، سینی ٹوریم اور ڈاکٹر نرسیں ہیں۔ کسانوں کے لئے کھاد کے کارخانے، اچھے بیجوں کے بھنڈار، تقاوی اور دوسرے قرضے، ٹریکٹر اور دوسرے جدید زرعی آلات ہیں۔ مزدوروں کے لئے کارخانے ہیں، چھوٹے بڑے بے شمار صنعتی یونٹ ہیں، لنگوٹیاں فراہم کرنے کے لئے کپڑے کے کارخانے ہیں۔ بجلی کی فراوانی کے لئے ڈیم اور پاور پراجیکٹ ہیں۔ شہر کے لوگ کُولر، ہیٹر اور فریج لگائیں گے، دیہات کی پگڈنڈیاں بقعۂ نُور بن جائیں گی کھیتیاں لہلہا اُٹھیں گی، باغوں میں ڈالی ڈالی پھُول کھِلیں گے۔ درخت پھلوں کے بوجھ سے جھُک جھُک کر پکارتے ہوں گے ؂

شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز!

پپیہا پی پی پکار رہا ہوگا، اَمبوا کی ڈال پر کوئلیا کُوک رہی ہوگی۔ نہروں میں کہیں دودھ بہہ رہا ہوگا تو کہیں شہد ہوگا۔ جنتا اِن سب سے شکم سیر ہو کر دُنیا ہی میں جنت کے مزے لے رہی ہوگی۔ آج کے پیلے پیلے زرد چہروں والے بچے سُرخ سفید ہوں گے۔ حور و غلماں اِن کی صحت و تندرستی کی قسمیں کھائیں گے۔ کہیں کوئی گھاس پھُوس کا جھونپڑا باقی نہ رہے گا۔ سیمنٹ، کنکریٹ کی کوٹھیاں کھڑی ہوں گی۔ ہر لڑکا ٹیریلین میں اور ہر لڑکی جارجیٹ اور نائیلون میں ملبوس نظر آئے گی ——— مگر اشوک جی! آپ کے اُس قلمِ مبارک کی قسم جس نے اِتنا شاندار، سُندر اور سُہانا منصوبہ تیار کیا ہے۔ اگر میں بھارت واسیوں سے چپکے سے کہوں کہ اِن سب چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے انھیں کچھ ایثار و قُربانی کرنی ہوگی۔ بہت زیادہ نہیں، سال بہ سال سو دو سو کروڑ کے ٹیکس دینے ہوں گے تو یہ بگڑ جائیں گے۔ آنکھیں لال پیلی کئے آستین سونت کر میدان میں آ جائیں گے۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر چلّانے لگیں گے ——— اور یہ بالکل نہ دیکھیں گے کہ آپ نے کس قدر ایثار و قربانی سے کام لیا ہے۔ اپنے لئے تو کیا اپنے ساتھی وزیروں کے لئے بھی منصوبے میں کوئی ایک پیسہ نہیں رکھا۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اُن میں کتنا گیلا وزیروں کی تعداد بڑھے گی، اُن کے آرام و آسائش پر زیادہ خرچ ہوگا۔ اُن کے لئے زرِ سنگ روم ہوں گے۔ غیر ملکی سیر و سیاحت کے انتظامات ہوں گے۔ اُن کے بچّوں کی تعلیم کا بندوبست ہوگا جب ۱۹۷۱ء کے بعد جنتا خوش حال ہوگی تو اِن بیچاروں کو کیا

کھل جائے گا ——— ورنہ اِن میں سے تو کسی کو بھی ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

میں ہوں آپ کے قلم کا شاہکار

(چوتھا پانچ سالہ) پلان

روپے کا خط وزیرِ خزانہ کے نام!

پیارے سچین بابو!!

آپ کے دَور میں جو میری عزت بڑھی، میرا جو چرچا ہوا اُس کے لئے سمجھ میں نہیں آتا انکل سام کا شکریہ ادا کروں، عالمی بنک کے صدر کو مبارکباد دوں، ہندوستان کو امداد دینے والے کنسرشیم کو خراجِ تحسین پیش کروں یا آپ کے جان و مال اور آل اولاد کو دعائیں دوں ——— بہرحال میں شکرگزار ہوں ؎

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی

ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

سچین بابو! یہ لوگ کہتے ہیں کہ قدرِ زر میں کمی ہوئی ہے اور میں کہتا ہوں کہ میری قدر و قیمت بڑھ گئی ہے۔ دُنیا کی منڈیوں میں لوگ مجھے مُنہ نہ لگاتے تھے، بات نہ کرتے تھے اور آج ہر منڈی میں میرا ہی چرچا ہے۔ مجھ سے تبادلے کا ہر سکّہ آرزومند ہے۔ آپ نے ۶ جون ۱۹۶۶ء کو آدھی رات میں ڈی ویلیوایشن Devaluation کا جو چمتکار دکھایا اُس نے آپ کو اور آپ کے ساتھ میرے نام کو دُنیا بھر میں روشن کر دیا ؎

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا

ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

لوگ مجھے بھُولتے جا رہے تھے۔ ڈالر کا ہر زبان پر چرچا تھا، اسٹرلنگ بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اب کرۂ ارض پر اقتصادیات کے ایک ادنیٰ طالبِ علم سے پُوچھ لیجئے وہ بھی میرے نام اور میری قدر و قیمت سے واقف ہے۔ آپ نہ مُلک کے بدخواہ نہ اپنے دشمن، پھر کوئی یہ کیوں کہے کہ آپ نے یا بھارت کی "لوک تنتری سرکار" نے جنتا سے کوئی "وِشواس گھات" کیا ہے۔ آپ نے جو کیا اچھا کیا، آئندہ جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ اِس کے بعد اگر ہماری برآمدی تجارت نہ بڑھے اور امریکہ یا عالمی بنک سے امداد نہ ملے تو اِس میں آپ کا قصور نہیں ہمارا مقدّر ہی کھوٹا ہے۔

پیارے سچین بابو! جو لوگ آپ پر طعنہ زن ہیں وہ کوئی فرشتے تو نہیں کہ اُن سے غلطی نہیں ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ مرزا غالب خوب کہہ گئے ہیں ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

اِنھیں تو کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کوئی اور سہی۔ اِس لئے کہ اِسی سے اُن کی سیاسی دُکانوں پر رونق رہتی ہے۔ جنتا مکھیوں کی طرح بھنبھناتی اِن کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اب تو میں کاغذ ہی کی صورت میں سہی مگر بہ افراط مِلتا ہوں۔ چاندی کا تھا تو اکثر کھوٹا نکل آتا تھا۔ اب جعلی بھی ہوتا ہوں تو کسی کی جیب میں نہیں ٹھہرتا۔ اِدھر آیا اُدھر گیا ——— اور لوگ گولڈ کنٹرول کے خلاف شور نہ مچاتے تو آپ سونا ضبط کر کے ایک دن سونے کا روپیہ چلا دیتے۔ ہمارے مُلک میں دولت کی کمی تھوڑا ہی ہے۔ دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے لوگ جسے روپے کی قیمت میں کمی کا نام دیتے ہیں، وہ دراصل اضافہ ہے۔ اِن لوگوں نے شاید ہمارے بھوج منتری کی تقریر نہیں سُنی اِن سے کہیے کہ اب وہ پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ نے کتابی صورت میں چھاپ دی ہے اُسے منگا کر اب پڑھ ہی لیں۔ اُنھوں نے کہا ہے ——— "آج مُلک میں بیس سال پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ دولت ہے"۔ اور آپ امریکہ اور عالمی بنک سے بوریاں بھر بھر کر ڈالر لاتے رہیں گے تو یہاں روپے کی ریل پیل ہو جائے گی۔ میں ہر جیب میں کھنکھنانے لگوں گا۔ اِس لئے سچین بابو! آپ اپوزیشن کے شور و غوغا سے بالکل متاثر نہ ہوں۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

میں ہوں آپ کا خانہ زاد کاغذ کا

"روپیہ"



افسانہ

ایک رُوپ

مختار شکیب

۹-پرائری مینشن، پرائری پارک روڈ۔ لندن۔ این، ڈبلیو نمبر ۶

۲۷ر جولائی ۱۹۶۶ء   خوشتر بھائی! اخلاص و آداب

ماں کی ہستی اتنی عظیم ہے اور اُس کا رشتہ اِتنا مقدس ہے کہ اُس کے دامن پر فرشتے نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن یہاں ماں کی قدر ہمارے یہاں سے مختلف ہے۔ وہ خود بھی اپنی اولاد کے لئے کیا ہے؟ یہ یہاں آکر معلوم ہوا ہے۔ یہ افسانہ ایک اخباری خبر سے متاثر ہوکر میں نے لکھا ہے۔ جو پسِ منظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ حقیقت سے دُور نہیں ہے۔ کوئی ماں بھی اپنے بچوں کو اِس لئے نہیں چھوڑ سکتی کہ اُس کے پاس کھانا اور رہنے کے لئے مکان نہیں ہے خاص طور پر ایسے مُلک میں جہاں عورت اور مرد سب کام کرتے ہیں اور کام نہ ملنے کی صورت میں بے روزگاری الاؤنس ملتا ہے۔ لیکن یہاں کا طرزِ معاشرت اِس طرح کا ہے لوگ ایسا کرنے کے لئے بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ دو سال پہلے کے ایک اخبار کا تراشہ بھی بھیج رہا ہوں۔ دو سال سے یہ حقیقت ذہن میں تھی جسے آپ افسانے کی صورت میں دیکھ رہے ہیں . . .

نیاز آگیں ———— مختار شکیب

اُس دن برائن بہت خوش نظر آرہا تھا۔ یوں تو وہ جب بھی آتا اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ ہی ہوتی تھی۔ لیکن اُس روز وہ غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ وہ بہت زندہ دل انسان تھا۔ اِسی بلڈنگ میں رہتا تھا جس میں میں رہتا تھا۔ پہلے اُس سے رسمی ملاقات ہوئی تھی اور پھر وہ اچھا خاصہ دوست بن گیا۔ انگریز باپ اور اسکاٹش ماں کا وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں باپ تو لنکا شائر کے ایک قصبے میں رہتے تھے اور وہ یہاں لندن میں ایک فرم میں ملازم تھا تیس سال کی عمر ہوگی۔ رقص و موسیقی کا بہت دلدادہ تھا۔ ہم اکثر ہفتہ کی شام کو رقص میں دونوں ساتھ ہی جاتے تھے۔ فلم اور دوسرے تفریحی پروگراموں میں بھی ہم اکثر ساتھ ہی ہوتے تھے۔

اُن دنوں میں کافی مصروف تھا۔ اِس لئے اُس سے کئی روز تک ملاقات نہ ہوسکی۔ پھر اُس اتوار کی صبح کو وہ مُسکراتا ہوا آیا۔ اپنی شریر نگاہوں سے وہ مجھے دیکھ کر خود بخود ہنسا۔ وہ اِسی طرح ہنسا کرتا تھا۔ پھر میں نے بھی اُسے چھیڑا۔

"برائن! آج بہت زیادہ خوش نظر آتے ہو۔ کیا کل شکار (رقص) میں کوئی حسین پرندہ ہاتھ آگیا ہے؟"

"ہاں پیارے! کل کی شام بہت پیاری تھی! بہت حسین ——!! تم بھی ساتھ ہوتے تو لُطف دوبالا ہو جاتا" وہ اب بھی مُسکرا رہا تھا۔

"میں کل بے حد مصروف رہا۔ اِس لئے تمہارا ساتھ نہ دے سکا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ لیکن اُس مہ جبیں کے بارے میں کچھ بتاؤ جسے کل شیشے میں اُتارا ہے!"

"بہت پیاری لڑکی ہے دوست! تم اُس کی آنکھیں دیکھو تو رقص کرنا بھول جاؤ۔ رخساروں کو دیکھو تو ٹیولپس (Tulips) یاد آئیں۔ باتیں کرو تو محسوس کرو کہ تم کسی عظیم شاعر سے ہمکلام ہو ——" اُس نے ایک ہی لمحے میں اُس کا تصور پیش کر دیا۔ اُسے صنفِ لطیف کے بارے میں باتیں کرنا بہت پسند تھا۔ میں اُسے اس طرح کے موضوعات پر بہت چھیڑا کرتا تھا۔

"لیکن بھئی کچھ یہ تو بتاؤ کہاں رہتی ہے، کیا کرتی ہے —— اور اب کب ملاقات ہو رہی ہے؟"

"کل پھر ملاقات ہو رہی ہے۔ میں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ شام کی کافی میرے ساتھ ہوگی!" اُس نے مجھے اِس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو میں نے اُس

شام اس کے ساتھ نہ جاکر بہت کچھ کھو دیا ہے ـــــ پھر وہ چلا گیا۔

دوسرے دن پھر اُس نے اُس لڑکی کے بارے میں باتیں کیں۔ وہ دونوں دوستی کی راہ پر چل نکلے تھے۔ وہ میری بلڈنگ کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ میں اُس لڑکی کو نہ دیکھ سکا۔ حالانکہ وہ ہفتہ میں کئی بار اُس سے ملنے آتی تھی۔ پھر ایک دن ہرائن نے مجھے اُس لڑکی کی تصویر دکھائی۔ میں نے تصویر دیکھی تو ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے اُسے حال ہی میں کہیں دیکھا ہے۔ میں اُس سے ملا ہوں۔ اور باتیں کی ہیں۔

"بھئی! میں نے اِسے کہیں دیکھا ہے!" میں نے اُس سے تصویر لے لی اور دو ہفتے پہلے کی اُس شام سے وابستہ یادیں ذہن میں اُتر آئیں اور جب میں اُس لڑکی سے ملا تھا، شاید ہفتے یا اتوار کا دن تھا اور میں ماربل آرچ (Marble Arch) کے ایک

• • • • • • • • • • • • •

- آدمی کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلاتا ہے۔ مانگنا ہے تو خدا سے مانگ۔

(گورو نانک دیوجی)

- محنت اور ایمانداری سے کماؤ، اُسے اکیلے نہیں بانٹ کر کھاؤ۔

(گورو نانک دیوجی)

- اگر آدمی کی نیت مَیلی (خراب) ہے تو تیرتھوں پر جاکر تن صاف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ (گورو نانک دیوجی)

- جس نے اپنی خواہشات پر قابو پالیا سمجھ لو کہ اُس نے دُنیا کو فتح کر لیا۔

(گورو نانک دیوجی)

- خالق خلق میں ہے۔ خالق کو پانا ہے تو خلق کی خدمت کرو۔ (گورو نانک دیوجی)

• • • • • • • • • • • • •

کیفے میں بیٹھا تھا۔ شیشے سے گرما دینے والی دھوپ میری میز پر آرہی تھی۔ اور اُس گوشے میں میں تنہا بیٹھا تھا کہ ایک بہت ہی خوبصورت خاتون اپنے پیارے اور ننھے منے بچوں کے ساتھ اسی گوشے میں میری میز کے قریب آ بیٹھی۔ اُس کی عمر کوئی چھبیس سال ہوگی۔ وہ بے حد حسین تھی اور اس کے بچے بھی جیتی گڑیوں کی طرح خوبصورت تھے۔ ایک بچی تھی جس کی عمر دو سال ہوگی ـــــ دوسرا لڑکا تھا جو اُس سے شاید دو سال بڑا ہوگا۔ اُن بچوں کو دیکھ کر میرے دل میں اُن کے لئے پیار اُمڈ آیا۔ اُن لوگوں نے کوکا کولا منگایا اور میں نے بچوں سے باتیں شروع کر دیں۔ دونوں سے نام پوچھے۔ لڑکی کا نام روزیتا تھا اور لڑکے کا نام ٹونی۔ اُس خاتون سے بھی باتیں کیں۔ اُسے بھی شاید اپنی اور بچوں کی خوبصورتی کا احساس تھا۔ میں نے اُس سے بہت دیر تک عام موضوعات پر بات کی۔ اُس کی باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ کبھی کبھی وہ کسی بات پر ہلکا سا قہقہہ لگا دیتی تو اور بھی خوبصورت معلوم ہوتی۔ پھر میں نے یونہی اُن بچوں کے والد کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔

"ان بچوں کے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟"

"جی ـــــ!" اُس خاتون کے چہرے سے مسکراہٹ سمٹ کر غائب ہو گئی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے اُداسی سی پھیل گئی۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھنا چاہا۔

"معاف کیجئے گا۔ شاید میں نے یہ سوال کرکے آپ کو دُکھ پہنچایا ہے۔"

"نہیں نہیں ـــــ ایسی کوئی بات نہیں ہے ـــــ" وہ جیسے اپنا غم چھپانے لگی "اِن بچوں نے اپنے ڈیڈی کو کبھی نہیں دیکھا۔ میں ہی اِن کی ممّی ہوں اور میں ہی ڈیڈی ـــــ!"

میں نے شاید اُس کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔ بچے بھی خاموش ہو گئے تھے مجھے افسوس تھا کہ میں نے اُس خاتون کے لمحات کو اُداس کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ چلے گئے۔ بچوں نے ننھے ننھے ہاتھ ہلا کر ٹاٹا کہا اور اُس خاتون نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے گڈ بائی!"

میں اُس تصویر کو اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ یہ تصویر یقیناً اُسی خاتون کی تھی جو اپنے بچوں کے ساتھ مجھ سے ملی تھی۔

"میں نے تمہیں تصویر دکھائی اور تم جیسے کھو گئے ہو۔ کیا اپنے لئے پسند کرنے لگے ہو؟" اُس کے مذاق نے میری سوچوں کا تسلسل توڑ دیا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اِس لڑکی سے میں دو ہفتے پہلے مِلا ہوں اور یہ دو بچوں کی ماں ہے جن کا کوئی باپ نہیں ہے، جس کا وہ نام بتا سکیں" میں جیسے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا" وہ خاموش ہو گیا۔ پھر کہنے لگا ـــــ "مسٹر رضوی! وہ اِتنی پیاری ہے اور اُس نے اِتنے دُکھ سہے، اِتنے دھوکے کھائے ہیں کہ مجھے اُس سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ میں اُس سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

"جی! آپ کو محبت ہو گئی ہے؟" میں چونک پڑا۔ "یورپ میں اِتنی جلدی کا محبت ہو جانا تو اچنبھے کی بات ہے۔ یہاں تو تم لوگوں کو محبت کرنے کے لئے ایک عرصہ چاہئے۔ پہلی نظر میں پیار تو ہندوستان میں ہوتا ہے۔"

"تو سمجھ لو کہ مجھے بھی ہندوستانی پیار ہو گیا ہے۔"

"لیکن میرے عزیز! یہ ایسے ہندوستانی گیت ہیں جو مغربی سازوں پر نہیں گنگنائے جا سکتے۔" میں نے پھر طنز کیا۔

"بس زیادہ تقریر نہ کرو۔" وہ بیزار سا ہو گیا تھا "مجھے لگتا ہے مغرب سا تہ

(Love at first sight) ہو گیا ہے۔ جو کم کبھی یورپ میں بھی ہو جاتا ہے۔"

مجھے اُس کی باتوں پر ہنسی سی آنے لگی تھی لیکن میں اُسے چھپا گیا۔ وہ پھر کہنے لگا۔

"میں اُس سے ابھی شادی نہ کروں گا۔ میں اُسے موقع دوں گا تاکہ وہ مجھے اچھی طرح سمجھ لے اور میں بھی اُسے اچھی طرح جان جاؤں تاکہ بعد میں کسی کو پچھتانا نہ پڑے۔"

"ہاں! اِس عرصے میں اُس کے کندھوں پر تیسرے بچے کا بوجھ بھی ڈال دینا اور پھر اُس کے بعد تمہارے خیالات میں تبدیلی آجائے گی تو پھر تم کسی اور کو تلاش کرنا اور وہ کسی اور کو ڈھونڈے گی ـــــ" میں ایسی باتیں کرنے لگا جو مجھے نہیں کرنی چاہئے تھیں۔ اُسے شاید میری باتیں ناگوار گزر رہی تھیں اِس لئے میں نے باتوں کا موضوع بدلا۔ وہ پھر بھی خاموش سا رہا۔ کچھ دیر بیٹھا اور چلا گیا۔ کچھ عرصے کے لئے اُس کے رویے میں فرق آگیا تھا۔ ایک ہفتے تک اُس سے ملاقات نہ ہوسکی تو میں ہی اُس کے گھر میں گیا۔ میں نے اُس دن کی ناخوشگوار گفتگو کے لئے معذرت چاہی اور افسوس کا اظہار کیا۔ ہماری دوستی پھر معمول پر آگئی۔ اِس کے بعد میں اُس خاتون سے بھی کئی بار ملا۔ کئی بار وہ دونوں بھی مجھ سے ملنے آئے۔

تقریباً چار ماہ بعد براتن نے مجھے اطلاع دی کہ وہ اُس خاتون سے شادی کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ پھر مجھ سے مشورہ کرنے لگا کہ اُن بچوں کا کیا کرے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بچوں کے چکر میں پڑے۔ اُسے بچوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ماں اور پھر باپ کے ہوتے ہوئے بچوں کو یتیم خانے میں بھی نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ اِس لئے وہ اُن کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں بھی اِس سلسلے میں کوئی مناسب مشورہ نہ دے سکا۔

براتن کی شادی میں دو روز رہ گئے تھے اور میں آکسفورڈ اسٹریٹ سے اُن کے لئے شادی کا تحفہ خریدتا ہوا پھر ماربل آرچ جا پہنچا۔ تھک گیا تھا۔ وہی کیفے سامنے تھا جس میں اُس خاتون سے ملاقات ہوئی تھی۔ کافی پینے کے ارادے سے میں اپنے پسندیدہ گوشے میں جا بیٹھا۔ کافی آچکی تھی اور میں شیشے سے ہائڈ پارک کے اسپیچ کارنر (Speech Corner) پر لوگوں کی بھیڑ دیکھ رہا تھا۔ جہاں مختلف سیاسی اور مذہبی قسم کے لوگ تقریریں کر رہے تھے۔ پھر میری نگاہ فٹ پاتھ پر اُن دونوں بچوں ٹونی اور روتھ پر پڑی جن کی ماں کی شادی براتن سے ہو رہی تھی۔ وہ کچھ پریشان سے نظر آرہے تھے جیسے وہ اپنی ماں سے بچھڑ گئے ہوں۔ میں نے جلدی سے کافی ختم کی اور اُن کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے پہچان گئے۔ میں نے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچے اور اُن کی ماں کہاں ہے تو ٹونی نے جواب دیا۔

"ممی ہمارے لئے ٹافیاں لینے گئی ہیں۔ لیکن بہت دیر ہو گئی۔ ابھی تک نہیں لوٹیں۔"

پھر میری نگاہ اچانک اُس چھوٹی سی پرچی پر پڑی جو روتھ کے ہاتھ میں تھی۔

میں نے وہ پرچی اُس سے لی اور پڑھنے لگا۔ اُس میں لکھا تھا۔

آپ یہ نہ سوچیں کہ مجھے اپنے بچوں سے پیار نہیں ہے۔ میں اِن کی ماں ہوں اور اِن سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ اِنہیں یہاں چھوڑتے ہوئے میں اپنے دل کے ٹکڑے کر رہی ہوں۔ میں نے خوشیوں کی تلاش کی لیکن وہ میرے لئے ناپید ہیں۔ میرے پاس اِتنا پیسہ نہیں ہے کہ میں اِن کے لئے اچھے کھانے اور اچھے کپڑے خرید سکوں۔ اِن کے باپ نے اِنہیں میرے پاس چھوڑ دیا۔ اور اِن کی پیدائش کے بعد مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں اِنہیں یہاں چھوڑ رہی ہوں اُن لوگوں کے لئے جن کے من میں یہ پھول نہیں کھِل سکے، یا پھر یتیم خانے کے لئے جہاں اِن کی پرورش اچھی طرح ہوسکے گی۔

- عورت سے جو بھی غلطی سرزد ہوتی ہے اُس کا سب سے اہم سبب مرد کا احمقانہ یا بد اثر ہوتا ہے۔ (مائیکلے)
- کوئی انسان اگر اپنے غصے پر قابو نہیں پاسکتا تو سمجھنا چاہئے کہ وہ دُنیا میں کسی کام کا نہیں ہے۔ (چیسٹر فیلڈ)
- دن کا کام رات پر، رات کا کام دن پر نہ اُٹھا رکھو۔ آئندہ کی فکر ابھی سے کرو۔ (فرینکلن)
- دوست کو اپنے حالات و معاملات سے اِتنا آگاہ نہ کرو کہ اگر وہ کسی وقت تمہارا دشمن ہوجائے تو تمہیں نقصان پہنچاسکے۔ (ہربرٹ اسپنسر)
- زندگی میں انسان کسی سے اِتنا دھوکا نہیں کھاتا جتنا خود سے۔ (گریول)

پرچی پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پورا ہائیڈ پارک گھوم رہا ہو!!

دو دن بعد وہی عورت شادی کے سفید لباس میں چرچ کے باہر براتن کے ساتھ تصویر کھنچوا رہی تھی اور اِس طرح مُسکرا رہی تھی جیسے ابھی کنواری ہو ـــــ!!!

غزلیں

پروفیسر عبدالرب عرفانؔ ایم۔اے

تیرے غم کو حیات کہتے ہیں
زہر کو ہم نبات کہتے ہیں

اپنی عادت نہیں گلے شکوے
بات نکلی تو بات کہتے ہیں

خوب کہتے ہیں، جو غمِ دل کو
اعتبارِ حیات کہتے ہیں

اصل میں حسنِ زندگی ہیں وہی
ہم جنہیں حادثات کہتے ہیں

اہلِ دل موت کی تمنا کو
آرزوئے حیات کہتے ہیں

حسن کی بے رخی کو ہم عرفانؔ
حسن کا التفات کہتے ہیں

پروفیسر آزاد گلاٹی ایم۔اے

کتنا پُرکیف ہے جاکر ترے آنے کا خیال
آہ! لیکن ترے آکر چلے جانے کا خیال

کتنے آنسو مری پلکوں پہ سلگ اٹھتے ہیں
جب بھی آتا ہے کبھی شمع جلانے کا خیال

اور شدت سے تری یاد ستاتی ہے مجھے
جب بھی آتا ہے تجھے دل سے بھلانے کا خیال

اشک آنکھوں سے بہے ضبط نے دم توڑ دیا
پھر مجھے آنے لگا گزرے زمانے کا خیال

کتنے سنگین حقائق سے نظر ٹکرائی
جب بھی آیا کسی رنگین فسانے کا خیال

ہم نے آزادؔ! کئی زخم اسی غم میں سہے
اُن کو آجائے کبھی دل نہ دُکھانے کا خیال

عابدؔ مناوری

عشق میں رنج و مصیبت کے سوا کیا ہوگا
اور یہ زہر بھی ہنستے ہوئے پینا ہوگا

تیری فریاد، ترے جور کا شکوا ہوگا
دیکھنا حشر کے دن حشر ترا کیا ہوگا

دل کے داغوں کو لگاتار جلانا ہوگا
جب کہیں تیرگیٔ غم میں اُجالا ہوگا

ہم پہ اے ناصحِ نافہم! اثر کیا ہوگا
تیری باتوں پہ بھروسا جنھیں ہوگا ہوگا

خونِ دل، خونِ جگر، خونِ تمنا ہوگا
کیا خبر تھی کہ یہ انجام دعا کا ہوگا

عابدؔ آغاز ہی انجام ہمارا ہوگا
یعنی مطلع ہی میں مقطع بھی غزل کا ہوگا

صغیر احمد سحرؔ سندیلوی

میری آنکھوں سے چھپے دل میں نہاں بیٹھے ہیں
میں کہاں ڈھونڈ رہا ہوں وہ کہاں بیٹھے ہیں

اس طرح بیٹھے ہیں رندوں میں جنابِ زاہد
کوئی دیکھے تو کہے پیرِ مغاں بیٹھے ہیں

کیا خبر تھی مجھے ارمان و تمنا بن کر
میرے ہی دل میں مرے دشمنِ جاں بیٹھے ہیں

سامنے جن کے نہ کھلتی تھی فرشتوں کی زباں
آج وہ بند کئے اپنی زباں بیٹھے ہیں

طنزیہ

اُوٹ پٹانگ

فکر تونسوی

سادھنا سے برلا تک

اچانک ایک ہزار سٹوڈنٹس اُٹھے اور اُنھوں نے تھانے کو آگ لگادی۔ کیا اُنھیں تھانیدار پسند نہیں تھا۔ اُنھیں تھانیدار کی کون سی چیز ناپسند تھی، کیا اُس کی ناک ؟ اُس کی مونچھیں ؟ اُس کی وردی ؟ سٹوڈنٹس ٹیگور کی شاعری پڑھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ٹیگور نے تھانیدار کی مونچھوں اور چابک کے خلاف کوئی نظم لکھی ہو۔ ٹیگور کی نظموں پر جلد از جلد ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنا چاہئے۔ بلکہ ہر شاعر پر تُلسی داس سے لے کر قمر جلال آبادی تک اور قمر جلال آبادی سے لے کر سادھنا اور سائرہ بانو تک اور سائرہ بانو سے لے کر سیٹھ برلا تک اور سیٹھ برلا سے لے کر شری رام سہائے انکم ٹیکس آفیسر تک جبتی کر رام سہائے کے چوکیدار شمبھو تک ہر ایک پر تحقیقاتی کمیشن بٹھایا جائے کہ ان میں سے کس کی شہہ پر یا سب کی ملی جلی شہہ پر سٹوڈنٹس نے تھانے کو آگ لگائی ؟ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تھانے کی اینٹوں کا سائز بھی وہی تھا جو شیوجی کے مندر کی اینٹوں کا تھا۔ اگر سٹوڈنٹس کو اینٹوں کے سائز پر اعتراض ہوتا تو وہ تھانیدار اور شیوجی دونوں کو پھونک دیتے۔ مندر اور تھانے کا آرکیٹیکٹ بھی ایک ہی تھا اور پھر جس چھاپے خانے میں گیتا اور قرآن کی پرنٹنگ ہوتی ہے، اُسی چھاپے خانے میں سادھنا اور سائرہ بانو کی فلموں کے پوسٹر چھپتے ہیں اور اُسی چھاپے خانے میں تھانے کا رجسٹر جرم و سزا چھاپا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک بار پھر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سٹوڈنٹس کو نہ اینٹوں کے سائز پر اعتراض تھا نہ آرکیٹیکٹ پر نہ چھاپے خانے پر، نہ اُس راج مستری پر جس نے تھانہ تعمیر کیا، مندر تعمیر کیا، فلم سٹوڈیو تعمیر کیا، تاج محل تعمیر کیا اور وہ ریسٹوران تعمیر کیا، جہاں وریندر کمار متعلم بی۔ اے اپنی گرل فرینڈ مس اوشا کو ساتھ لے جاکر کافی پلاتا ہے اور مس اوشا اپنے گلابی، عنابی، شہابی ہونٹوں کو فرطِ محبت سے کپکپاتے ہوئے کہتی ہے " آئی لو یو !"

ویریندر کمار کے گلابی ہونٹوں کو آگ کیوں نہیں لگاتا ؟ تحقیقاتی کمیشن واقعی بٹھانا چاہئے۔

مُرغی کھانے والا چیرمین

لیکن سوال یہ ہے کہ تحقیقات کون کرے گا ؟ کیسی کرے گا ؟ کیا تحقیقات کی بُنیاد سچائی پر ہوگی یا نیت کی خرابی پر ؟

میں نے ایک مُرغی چُرالی اور اُس آدمی کو ڈنر کی دعوت دے دی، جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ تحقیقاتی کمیشن کا چیرمین ہوگا۔ چیرمین مرغی کھانے کا بے حد شائق ہے۔ جو لوگ مُرغی کے شائق نہیں ہوتے وہ کبھی چیرمین نہیں بنائے جاتے۔ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جو اِتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ آلو زمین سے اُگتا ہے یا پیپل کے پیڑ پر لگتا ہے لیکن اُس نے آلوؤں کی پیداوار بڑھانے والی کمیٹی کی صدارت کی اور دھمکی دی کہ اگر آلوؤں کی پیداوار نہ بڑھائی گئی تو میں آتم ہتیا کرلوں گا۔ اِس ملک میں ایک ایک آلو پر آتم ہتیا کرلی جاتی ہے، کافی کے ایک ایک پیالے پر اپنا ایمان بیچ دیا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے گزشتہ دنوں صرف اس بات پر ریلوے لائن پر سر رکھ دیا کہ ڈبل روٹی کی قیمت دو پیسے کیوں بڑھا دی گئی ہے۔ لیکن ڈاکٹری تحقیقات پر ثابت ہوا کہ اُس کی بیوی اپنے چار بچوں کو لے کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اِس صدمے کا اثر ڈبل روٹی کی انڈسٹری پر جا پڑا اور کہتے ہیں کہ جب اُس کی ارتھی اُٹھائی گئی تو ہزاروں لوگ اُس کے ساتھ جلوس بناکر جارہے تھے اور نعرے لگارہے تھے : "شہیدِ اعظم شری کاشی رام جی زندہ باد ! اور ڈبل روٹی کی مہنگائی مُردہ باد !"

اور شہید کاشی رام کے لئے جب [illegible]

کرنے والی کمیٹی کا چیرمین ڈبل روٹی کی بیکری کا [illegible]

گلابی ہونٹوں کے بھکاری

بیکری کا مالک ڈبل روٹیاں بناتا ہے، [illegible]،

رام ناتھ درزی کپڑے سیتا ہے، فکر تونسوی ادب لکھتا ہے اور ڈبل روٹی

بنائی جاتی ہے۔ ڈبل روٹی شکل بدل کر جوتی بن جاتی ہے اور پھر جوتی سے قمیص تیار کی جاتی ہے اور قمیص گھومتی گھامتی جب فکر تونسوی کے پاس پہنچتی ہے تو وہ اُسے پھر ادب بنا دیتا ہے۔ عجیب چکر ہے، جو ختم ہی نہیں ہوتا۔ ہر شخص ایک دوسرے کا پیچھا کر رہا ہے، ہر شخص ایک دوسرے کے اندر گھسا ہوا ہے۔ ہر شخص کے اندر دوسرے شخص کا کوئی نہ کوئی حصہ موجود ہے۔ کسی کی ناک کے اندر دوسرے کی آنکھ داخل ہو گئی ہے۔ کسی کی آنکھ کے اندر دوسرے کی کرسی بیٹھی ہوئی ہے۔ جب ایک آدمی اپنی زبان سے ایک فقرہ نکالتا ہے تو اُس بیچارے کو اتنا بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اُس میں کتنے لفظ خالص اُس کے اپنے ہیں۔ کتنے لفظ اُس نے بھینس سے لئے ہیں۔ کون سا لفظ آسٹریلیا سے اُڑ کر آیا ہے اور کون سا لفظ سائبیریا سے چل کر براستہ چین اِس فقرے میں شامل ہو گیا ہے اور جیسا کہ میں نے دیکھا ہے، ہر شخص ایک دوسرے کا بھکاری ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی کی چیز چُرا کر بیٹھا ہوا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے شخص سے کچھ نہ کچھ لے رکھا ہے۔ چاہے چُرا کر لیا ہے، چاہے بھیک مانگ کر، چاہے پستول کی نوک پر، چاہے دھرم کے نام پر، چاہے پالیٹکس جتا کر اور اِس طرح ہر ہم خود اپنے آپ کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اگر چھان بین کی جائے، چھلنی میں ہر انسان کو چھانا جائے تو اُس میں سے کچھ جوتیاں باہر نکلیں گی، کچھ شعر، کچھ کپڑے کی کترنیں، کچھ نائی کے اُسترے، کچھ بال کالا کرنے والے تیل کی شیشیاں، کچھ سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے اور کسی کسی چھلنی سے سمگلنگ کا سونا اور کالے دھن کے کرنسی نوٹ اور زر خرید حسیناؤں کے گلابی گلابی ہونٹ بھی چھن چھن کر باہر نکل آئیں گے کیونکہ گلابی ہونٹ بھی کرنسی نوٹوں کے محتاج رہتے ہیں۔ اُن سے بھیک مانگ کر ہی وہ گلابی ہونٹ کہلاتے ہیں۔ بالکل اُسی طرح جس طرح فکر تونسوی کا ادب جوتیاں گانٹھنے والے رتّی رام اور ڈبل روٹی کی بیکری سے جذبے اور محسوسات کی بھیک مانگتا ہے اور جب جاکر ادب کہلاتا ہے۔

قسمت میں تھپڑ اور کار ———●

ایک مرتبہ میں نے پتلے ہونٹوں اور موٹی توند والے کروڑپتی سیٹھ مانگے رام تانگے رام سے کہا "سیٹھ جی! آپ بھی بھکاری ہیں"

"غلط! میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی۔ اپنے زورِ بازو سے کماتا ہوں"

"یہ زورِ بازو آپ میں کہاں سے آیا؟"

"میری قسمت میں لکھا تھا، مجھے مل گیا"

میں نے اطلاعاً اُسے ایک تھپڑ عرض کیا اور کہا "کیا یہ تھپڑ بھی آپ کی قسمت میں لکھا تھا؟"

اُس نے مجھے دو تھپڑ عرض کئے اور کہا "ہاں! جیسے آپ کی قسمت میں دو تھپڑ لکھے تھے"

میں اُسے بطور جواب الجواب چار تھپڑ عرض کرنے چاہے مگر اچھا طلاہاتھ کیونکہ دماغ نے کہا۔ سیٹھ مانگے رام تانگے رام کا میٹرک پاس داماد انسپکٹر پولیس ہے نقضِ امن میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دے گا۔ میرے پاس صرف ہاتھ ہی ہاتھ ہیں جن سے تھپڑ لگا سکتے ہیں لیکن سیٹھ مانگے رام کے قبضے میں جیل ہے، ہتھکڑی ہے، قانون ہے، بنک ہے اور یہ سب چیزیں میرے خالی خدا داد ہاتھ سے زیادہ طاقتور ہیں اور طاقت ہی ہے۔ "تقدیر آسمان سے کبھی نہیں اُترتی۔ وہ سیٹھ جی کی ٹیکسٹائل مل میں جنم لیتی ہے جبھی جا وہ اُس رام لیلا سوسائٹی کے دفتر میں جنم لیتی ہے جسے سیٹھ ہر سال دس ہزار چندہ دیتے ہیں۔ وہ اُس خوبصورت اور جگمگاتی کار کے فولاد میں موجود رہتی ہے سیٹھ جی سوار ہو کر شری راجیشور دیال وزیرِ انصاف کی کوٹھی پر جاتے ہیں اور تقدیر اُس بلڈاگ کی خونخوار آنکھوں میں شعلہ بن کر رہتی ہے جو وزیرِ انصاف کی کوٹھی باہر اپنی لال لال زبان باہر نکال کر کھڑا رہتا ہے اور صاف سمجھ جاتا ہے کہ یہ مانگے رام تانگے رام کی کار ہے، جس پر بھونکنا نہیں چاہئے اور یہ رتّی رام چمار کی بائیسکل جس پر جھپٹ کر اُس کے ٹائر ٹیوب پھاڑ دینے چاہئیں تاکہ رتّی رام چمار کو یہ احساس کہ بائیسکل اور کار کی تقدیر میں کیا فرق ہوتا ہے اور رتّی رام کے پاس جب تک ٹیکہ نہ ہو گُتّے بھی اُس کی قدر نہیں کریں گے۔

کُتّوں کی سوسائٹی ———●

مگر کُتّوں کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ بعض کُتّے بھونکتے ہیں تو اُن کی آواز ملی میٹر سے آگے نہیں جاتی۔ مگر بعض کُتّے جب بھونکتے ہیں تو کئی کئی میل تک لوگوں کو ہو جاتا ہے کہ کُتّا ناراض ہے۔ چنانچہ لوگ اُسے خوش کرنے کے لئے بھاگے بھاگے ہیں۔ کوئی گوشت کا ٹکڑا لے کر، کوئی پراٹھے لے کر، کوئی دودھ کا بھرا ہوا گلاس۔ اور یہ سبھی حضرات کُتّے کے پاس اپنا نام درج کرا جاتے ہیں تاکہ کُتّے کے آفس ریکارڈ میں یہ بات آ جائے کہ شہر میں کون کون سے آدمی کُتّے کے مدّاح ہیں، کُتّے درباری ہیں، کُتّے سے ڈرتے ہیں، کُتّے کے فرینڈز ہیں، کُتّے کے ایجنٹ ہیں۔

کُتّے کی یہ دو اقسام بُزدل کُتّے اور شیر کُتّے ہی نمایاں حیثیت رکھنے کُتّوں کی ساری تاریخ اِنہی دو اقسام کے اِرد گِرد گھومتی ہے لیکن اِن دونوں کے درمیان بھی انواع و اقسام کے کُتّے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بعض کُتّے ایسے ہوتے ہیں جنہیں میں ترقی کرنے کا شعور بالکل نہیں ہوتا۔ کسی نے روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا تو کھا لیا بھوکوں مرتے رہے۔ بعض کُتّے چھینا جھپٹی کرنا چاہتے ہیں مگر کر نہیں سکتے۔ لہٰذا سے کھڑے ہو کر بھونکتے رہتے ہیں۔ جنگ میں جو جیت جاتا ہے اُسی کے ساتھ ہو کر

…نے لگتے ہیں۔ اور دُم ہلاتی، ٹکڑے پاتے رہیں۔ بعض کُتّے انتہائی احمق ہوتے ہیں کس پر بھونکنا چاہئے، کب بھونکنا چاہئے اس کا انھیں شعور ہی نہیں ہوتا۔ نتیجے کے طور پر لڑائی میں گھائل ہو جاتے ہیں۔ کئی مر بھی جاتے ہیں مگر کوئی انھیں شہید تک نہیں کہتا۔ نہ ان کی کوئی سمادھ بنتی ہے۔ زخمی ہو جائیں تو کوئی ہسپتال اُن کی مرہم پٹی بھی نہیں کرتا۔ بالآخر یہ کہہ کر ہمالیہ کی طرف چیختے چلّاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں کہ اِس سماج میں شرفاء کی کوئی قدر ہی نہیں ہے (ہمالیہ پر جا کر خدا سے شکایت کریں گے)

اور بعض کُتّے بڑے چالتر ہوتے ہیں۔ دو کُتّوں کی جب لڑائی ہوتی ہے تو وہ تالیاں بجاتے ہیں۔ ہر تالی پر ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ تالی اُس کے حق میں بجائی گئی ہے۔ چنانچہ وہ لڑ کر اس دُنیا سے سدھار جاتے ہیں اور گوشت کی ہڈی زمین پر پڑی رہ جاتی ہے جسے وہ ڈپلومیٹ کُتّا یہ سمجھ کر اُٹھا لیتا ہے اور چچوڑنے لگتا ہے کہ اِن ہیروؤں کے بعد کوئی تو اِس یتیم ہڈّی کا وارث ہونا ہی چاہئے۔

اور وہ کُتّا جسے عرفِ عام میں وفادار کہا جاتا ہے، دُنیا کی نظروں سے غائب ہوا جا رہا ہے۔ اگر روٹی کی فکر کو وفاداری کہا جا سکتا ہے تو دُنیا کا ہر کُتّا وفادار ہے اور اگر نمک حلالی کو وفاداری کہا جاتا ہے تو یہ صرف ایک ڈھونگ ہے جو کُتّوں کو گمراہ کرنے کے لئے انسانوں نے ایجاد کیا تھا اور جسے کُتّوں نے اب یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان کی ایجاد سے ہمیں کیا واسطہ؟ اور یوں بھی انسان جس چیز کو اپنے لئے مناسب نہیں سمجھتا، وہ ہمارے لئے کیوں ایجاد کر دیتا ہے!

فکر تونسوی کی غلطی

اِس بار کی صحبت میں میں نے جو اُوٹ پٹانگ باتیں کی ہیں، اُن میں احتیاط برتنا بھول گیا۔ احتیاط بڑی لازمی چیز ہے ورنہ بغیر احتیاط کے جو بات کہی جائے۔ چاہے وہ کتنی سچی اور حسین کیوں نہ ہو، تیر کی طرح کلیجے میں جا لگتی ہے۔ کلیجوں میں تیر ہرگز نہیں لگنے چاہئیں۔ ہر کلیجے کو اُلجھاوے میں رکھنا چاہئے۔ بات جتنی اُلجھی ہوئی ہوگی، لوگ اُتنا زیادہ خوش رہیں گے کہ یہ بات شاید ہمارے متعلق نہیں کہی گئی، پڑوسی کے متعلق کہی گئی ہے۔ پڑوسی کا مکان اگر نیلام ہو جائے تو کتنی خوشی ہوتی ہے لیکن اگر بعد میں یہ معلوم ہو جائے کہ مکان آپ کا بھی نیلام ہوگا تو تلوؤں میں آگ لگ جاتی ہے۔ تھپڑ وہی جو دوسرے کے رخسار پر لگے۔ اِس لئے بہتر یہی رہتا ہے کہ رخسار کو علم ہی نہ ہونے دیا جائے کہ اُسے تھپڑ لگا ہے۔ میری اوٹ پٹانگ باتوں میں بس یہی نقص ہے کہ تھپڑ لگانے سے پہلے یہ احتیاط نہیں برتی جاتی کہ رام ناتھ کے رخسار کو شام ناتھ کا رخسار بتا کر تھپڑ لگایا جائے تاکہ رام ناتھ بھی خوش رہے اور شام ناتھ بھی۔

آئندہ مہینے احتیاط کا وعدہ کرتا ہوں۔

عظمت

راجہ مہدی علی خاں کی یاد میں

جمہوریت کے دَور میں بھی راج کر گیا
دامن ادب کا لعل و جواہر سے بھر گیا
ساتھ اپنے لے کے گردشِ شام و سحر گیا
اب کیا کوئی بتائے کہ راجہ کدھر گیا

ہوتے ہیں کتنے واقعے شام و سحر رقم
تاریخ لکھنے والے کا رُکتا نہیں قلم

ہے امتحان زندگی خوشتر کے واسطے
لینے بھی دیں گے چین کبھی اُس کو حادثے؟
سالک کے داغِ ہجر ہی مٹنے نہ پائے تھے
کچھ تازہ زخم دے دیئے راجہ کی موت نے!

یہ ایسے زخم ہیں کبھی بھرنے نہ پائیں گے
اِن روز صبح و شام گزرنے نہ پائیں گے

یا صبح کا اُجالا ہو رقصاں نظر نظر!
یا پھیل جائے رات کی ظلمت اِدھر اُدھر
ویران اور بھی نظر آئیں گے بام و در
آئے گی شدتِ غمِ فرقت سے چشم بھر

ہر وقت یاد آئے گا وہ یارِ باصفا
نظروں میں گھوم جائے گا وہ پیکرِ وفا!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر خوشخط لکھیں اور سطور کے درمیان کافی جگہ چھوڑا کریں۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس اپنے مضامین کی نقل ضرور رکھیں۔ کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ مضامین کے خاتمے پر اپنا پورا پتہ لکھ دیا کریں۔ نوآموز حضرات مضامین بھیجنے سے پہلے کسی اُستاد سے مشورہ لے لیا کریں۔ اگر وہ چاہیں کہ مُرسلہ مضامین ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں انھیں واپس کر دیئے جائیں تو مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال فرمائیں۔ ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ (ایڈیٹر)


!!! یہ سفیدی... یہ جگمگاتی سفیدی
میجک سے ایک بار دھونے کا یہ کمال ہے
نیلا
میجک
سفیدی جگمگانے کی یکتا خوبی والا
اور کیوں نہیں... دوسرے دُھلائی کے پاؤڈروں سے نرالا ہے۔ میجک کی سفیدی جگمگانے کی یکتا خوبی میل کے ذرّے ذرّے کو دھو ڈالتی ہے۔ از حد مؤثر میجک کا ہر ذرہ پانی میں فوراً گھل جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ڈھیروں کارگر جھاگ دیتا ہے جس سے کپڑوں میں ایک انوکھی جگمگاتی سفید چمک رونما ہوتی ہے۔ یہ میجک کا کمال ہے... جو گھر میں کپڑوں کی دھلائی کم خرچ میں بغیر کسی تکلیف کے کرتا ہے۔ میجک سے کپڑے صحیح سلامت رہتے ہیں۔ چاہے وہ سوتی ہوں کہ ریشمی، اونی ہوں کہ نائلن کی قسم کے
NEW
Wonder Washing Powder
Magic
ULTRA WHITENING
میجک کے
ہر ذرے
فوراً پانی میں
گھل جاتے ہیں
اور ڈھیروں
جھاگ دیتے ہیں
میجک سے سفیدی، چمک اور اُجلے
CMTM-1A UR
شاشا کی مصنوعات

گُل بُوٹے

مشتاق اعظمی

معرفت ڈاکٹر شاہ محمد صاحب (ہومیوپیتھ) پکّا بازار، آسنسول

۲۶ر ستمبر ۱۹۶۶ء

محترم!

"اگر انسان کی پرستش گناہ نہ ہوتی تو بخدا میں خوشتر کو سجدہ کرتا" یہ الفاظ راجہ مہدی علی خاں مرحوم کے ہیں۔ میرے ایک قریبی دوست گزشتہ سال بمبئی گئے تھے تو راجہ صاحب سے بھی ملے تھے۔ دورانِ گفتگو میں آپ کا تذکرہ ہوا تو مرحوم نے آپ کے حق میں مذکورہ بالا کلمات کہے۔ جس انسان کے دل میں آپ کے متعلق یہ جذبات ہوں اُس کی مفارقت پر آپ کے دل پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی۔ دیکھنے والوں نے تو بس آپ کی خونبار آنکھیں ہی دیکھیں۔ زخم جگر کی حالت کون دیکھ سکتا یا جان سکتا ہے ـــــ اُن کی وفات سے کوئی چار یا پانچ ماہ قبل جب میں کلکتے کے "فانوس ڈائجسٹ" سے وابستہ ہوا تو مجھے راجہ صاحب کو ایک خط لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ راجہ صاحب نے اُس کا جواب اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں نہایت محبت کے ساتھ دیا۔ اُس خط میں کچھ امور جواب طلب تھے۔ چنانچہ جواب دیتے ہوئے میں نے دانستہ اُن کے مزاحیہ اسلوب کی تقلید کی۔ جب خط پوسٹ ہو گیا تو مجھے خیال آیا کہ مبادا میری تحریر راجہ صاحب کی ناخوشی کا سبب نہ بنے۔ ہرچند کہ خط لکھتے وقت میں نے اُن کے احترامِ مراتب کا پورا پورا لحاظ رکھا تھا مگر مزاح پیدا کرنے کی کوشش میں عبارت کی سنجیدگی کہیں کہیں سے رخصت ہو گئی تھی۔ لیکن راجہ صاحب کا جواب آیا تو مجھے اطمینان و مسرت کا احساس ہوا۔ راجہ صاحب نے میری تحریر کو بے حد سراہا تھا۔ اُن کا توصیفی ریمارک آج میرے لئے سرمایۂ افتخار ہے ـــــ راجہ صاحب سے میں کبھی نہیں مل سکا۔ اُن کی وفات نے میری خاک شدہ آرزوؤں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا ہے ؏

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مُرتّبہ شدہ لطائف کی دوسری قسط بزمِ "بیسویں صدی" میں رسائی کی درخواست کے ساتھ پیش ہے۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔۔۔ بندۂ خلوص ـــــ مشتاق اعظمی

فیصلہ

ایک صاحب جو داغؔ کی مقبولیت اور شہرت کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بزعمِ خود بہت بڑے شاعر تھے۔ ایک دن داغؔ کو راہ میں ملے اور کہنے لگے "حضرت! آج میرا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے۔ فرمایئے میں اچھا شعر کہتا ہوں یا آپ؟"

داغؔ نے کہا "شعر تو بلاشبہ آپ ہی اچھا کہتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ لوگ میرے ہی شعروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں"

ساز اور آواز

علی گڑھ میں ڈاکٹر رشید جہاں کے یہاں مجازؔ لکھنوی اپنا کلام سُنا رہے تھے۔

سُننے والوں میں کچھ کم عمر بچّے بھی تھے جو قوّال کے ترنّم سے محظوظ ہو رہے تھے۔ دفعتاً ایک بچّے نے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولا تو دوسرے نے شش شش کر کے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا "چُپ رہو، بلجا بج رہا ہے۔"

تشبیہ

سعادت حسن منٹو کو ن۔م۔راشد کی بےقافیہ شاعری پسند نہ تھی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کے برآمدے میں جب ایک بار منٹو نے بغیر مڈگارڈوں کی ایک سائیکل دیکھی تو اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں ن۔م۔راشد سے کہا: "لو یہ تم ہو اور تمہاری شاعری۔"

تذکیر و تانیث

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی شادی ہوئی تو ایک دن احمد جمال پاشا نے نہایت فکرمند ہو کر اُن سے پوچھا: "جب آپ بیوی کو خط لکھیں گے تو "آپ کا اولاد" یا "آپ کی اولاد" کیا لکھیں گے؟"

خودداری

نواب آصف الدولہ اپنے کُتب خانے میں میر تقی میر سے محوِ گفتگو تھے۔ دونوں کے درمیان ایک کتاب اِس طرح رکھی تھی کہ وہ میر صاحب سے نزدیک اور نواب صاحب سے دُور تھی۔ نواب نے کہا: "میر صاحب! ذرا وہ کتاب تو اُٹھا دیجئے۔" میر فوراً ہی ایک خادم سے بولے "سُنو! تمہارے آقا کیا فرماتے ہیں۔" اِتنا سُننا تھا کہ نواب صاحب نے اُٹھ کر خود ہی کتاب اُٹھا لی۔

توجیہ

فصیح الملک میرزا داغ دہلوی کے ایک شاگرد اُن سے ملنے آئے تو اُنھیں نماز میں مشغول پا کر واپس چلے گئے۔ نماز سے فارغ ہونے پر ملازم نے اُن کو بتایا کہ فلاں صاحب آئے تھے۔ داغ نے ملازم کو دَوڑایا اور کہا فوراً بلا لاؤ۔ جب وہ صاحب آئے تو داغ نے پوچھا "کیوں جناب آپ واپس کیوں چلے گئے تھے؟" کہا: "آپ نماز جو پڑھ رہے تھے۔"

داغ نے کہا: "میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لاحول تو نہیں پڑھ رہا تھا۔"

مُدّعی

ایک بار نبوّت کا مُدّعی ایک شخص علّامہ اقبال کے پاس آیا اور بولا: "کل رات جب میں حضورِ اکرمؐ کے دربار میں حاضر تھا تو وہاں آپ کا بھی ذکر ہوا اور حضورؐ نے آپ کے متعلق بڑے اچھے الفاظ کہے۔"

اقبال ایک لمحے کے لئے بے حد سنجیدہ ہو گئے اور بولے: "صاحب آپکے بیان پر

مجھے بڑی حیرانی ہے۔ کیونکہ گزشتہ شب میں خود بھی حضورِ اکرم کی خدمت میں حاضر تھا تو وہاں میں نے آپ کو نہیں دیکھا؟"

انداز بیاں اور ———•

راجندر سنگھ بیدی نے روسی ناول نویس شولوخوف کے ناول "اینڈ کوئیٹ فلوز دی ڈاؤن" کے متعلق منٹو سے کچھ اس انداز میں تبصرہ کیا کہ مذکورہ ناول نہ پڑھنے کے باوجود منٹو کو ظاہر کرنا پڑا کہ ناول اُن کا پڑھا ہوا ہے۔ اشتراکی ادیب باری نے کچھ دیر تک دونوں کی گرما گرم بحث سنی۔ اس کے بعد گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے شولوخوف کی ناول نویسی پر ایک ایسا شاندار لکچر دیا کہ منٹو کے ساتھ بیدی کو بھی اعتراف کر لینا پڑا کہ زیرِ بحث ناول اُن کا پڑھا ہوا نہیں ہے۔

آخر میں باری صاحب نے یہ انکشاف کر کے سب کو اپنی ہنسی میں شریک کر لیا کہ لکچر محض اُن کی دماغی اختراع تھی۔ اور شولوخوف کا نام آج اُنھوں نے پہلی بار بیدی کے منہ سے سُنا تھا۔

روک ———•

باری صاحب کی آنکھوں کے سامنے لکھتے وقت کسی روک کا ہونا ضروری تھا۔ عموماً اُن کی میز دیوار کے ساتھ لگی ہوا کرتی تھی۔ ایک دن سعادت حسن منٹو کے گھر باری صاحب کو کچھ لکھنا تھا۔ منٹو نے دانستہ میز کا رُخ یوں بدل دیا کہ دیوار کی روک باقی نہ رہی۔

باری صاحب لکھنے بیٹھے تو بڑی بے چینی محسوس کرنے لگے۔ بالآخر اُنھوں نے ورلڈ اٹلس کھول کر سامنے رکھ لی اور لکھنا شروع کر دیا۔

فہمائش ———•

احمد جمال پاشا کے یہاں ایک صاحب اس طرح جم کر بیٹھے تھے کہ اُٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔ جس سے جمال صاحب کو کافی کوفت ہو رہی تھی۔ بمشکل اُنھوں نے چلنے کا ارادہ کیا اور پوچھا۔

"پاشا صاحب! ذرا گھڑی دیکھئے تو کیا بجا ہے؟" جمال صاحب جن کو اب تاب ضبط نہ تھی جھلا کر بولے "شریفوں میں گھڑی نہیں چہرہ دیکھا جاتا ہے"۔

مدیر بیسویں صدی کے نام خطوط لکھتے وقت ہمیشہ اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔



صحت و زندگی

زندگی بخش معلوماتی مقالات اور مفید کارآمد اشارات

۱• کھجور ——— طاقت کا بیش بہا خزانہ!

کھجور عرب کا ایک مشہور میوہ ہے جو پاکستان میں ملتان اور بہاول پور کے اضلاع میں بھی بکثرت ہوتی ہے۔ جس طرح ہندوستانیوں کی مرغوب غذا چاول اور گیہوں کی روٹی ہے اسی طرح عرب اور مصر کے لوگوں کی دل پسند اور مرغوب غذا کھجور ہے۔

کھجور کا مزاج گرم و تر ہے۔ بعض اطباء کے نزدیک معتدل ہے۔ دل، جگر اور معدہ کو تقویت پہنچاتی ہے۔ خون پیدا کرتی ہے اور خون کی شکایات کو رفع کرتی ہے۔ جسم کو موٹا کرتی ہے۔ قوتِ باہ کو خصوصیت سے تقویت دیتی ہے۔ خشک کھانسی اور دمے میں مفید ہے۔

بادی بلغم کو چھانٹتی ہے اور ریاح کو تحلیل کرتی ہے۔ کھجور کا گودا اپنی سست آنتوں میں حرکت پیدا کرتا ہے اور آنتوں کی غلاظت کو صاف کرتی ہے۔

کھجوریں ایک بیش بہا غذا ہیں۔ کیونکہ ان میں قدرتی کھانڈ وافر مقدار میں ہوتی ہے، جو جلدی ہضم ہو کر جسم میں جلدی ہی جذب ہو جاتی ہے۔

کھجور لذیذ میوہ ہی نہیں، یہ روزمرہ کی کسی ایک خوراک کی طرح مکمل غذا ہے۔ یہ کافی غذائیت رکھتی ہے۔ اس میں پروٹین، لوہے اور کیلشیم جیسے معدنی اجزاء بھی بکثرت موجود ہیں۔ ان دھاتوں کے علاوہ کھجور میں میگنیشیم، سوڈیم، پوٹاشیم اور فاسفورس وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ کھجوروں میں وٹامن اے کافی مقدار میں ملتا ہے اور وٹامن بی کمپلیکس بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔

موسم سرما میں کھجور کا استعمال بہت مفید ہے۔ دل، جگر اور معدے کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ خون بڑھتا ہے اور جسم فربہ ہوتا ہے۔ محنت اور مشقت کرنے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ کھجور کے استعمال سے قوتِ ہاضمہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ بھوک بڑھتی ہے اور قوتِ باہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

کھجور قدرے ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہے اس لئے کمزور معدہ والوں کو تھوڑی مقدار میں استعمال کرنی چاہئے۔ کھجور کھانے کے بعد پانی ہرگز نہ پئیں۔ اس سے فتورِ معدہ کی شکایت پیدا ہوتی ہے اور ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔

خون کی کمی کے مریضوں کے لئے کھجور بے حد مفید اور طاقت کا خزانہ ہے۔

پاؤ بھر کھجور کو دھو کر اور بیج نکال کر کڑاہی میں چھٹانک بھر گھی میں بھون لیں اور معجون سی تیار کر لیں۔ ذائقے کے لئے تھوڑی سی کشمش اور شہد بھی ڈال سکتے ہیں۔ یہ معجون خون کی کمی اور باہ کی کمزوری میں بہت مفید ہے اور اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

کھجور دانتوں اور مسوڑھوں کے لئے مضر ہے۔ کھانے کے بعد دانت پانی سے اچھی طرح صاف کر لینا بہت ضروری ہے۔

۲• کامیابی کا راز

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— ناکام انسانوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی پائی جاتی ہے، جنھیں اپنی قابلیتوں پر شک ہے۔ اپنی ذات پر بھروسا نہیں۔ جس وقت، جس لمحے تمھارے دل میں شک پیدا ہو جائے، اپنے آپ پر بھروسا نہ رہے سمجھ لو تم نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ جب تمھارے دل میں کمزوری پیدا ہو، مایوسی ہو یا نا اہلی کا خیال آئے، سمجھ لو کہ تم نے ذاتی اعتماد کھو دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ تم تمام کامیابیوں کی جڑ کھو رہے ہو۔

اگر کوہ ایلپس کا سلسلہ نپولین کو بھی ایسا ہیبت ناک معلوم ہوتا جیسا اس کے مشیروں اور دوسرے لوگوں کو نظر آتا تھا تو وہ شدید سردی میں اسے عبور نہ کرتا۔ وہ انسان جو اپنے مطمح نظر کو ہر وقت پیشِ نظر رکھتا ہے، جو راہ میں حائل ہونے

والی مشکلات کی پروا نہیں کرتا، ناکامی کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا جسے فتح وکامرانی کا یقینِ کامل ہوتا ہے وہی انسان فتح یاب ہوتا ہے اور فتح پاتا ہے۔

ذہنی قویٰ کے لشکر کا نپولین پشت یقین ہے۔ اُس کے حکم پہ اُس کے اشارے پر دوسرے قویٰ دو گونہ اور تین گونہ کام کرتے ہیں۔ ساری دماغی قوتیں اسی انتظار میں رہتی ہیں کہ یقین کب ہمیں حکم دے اور ہم تعمیل کریں۔ کب وہ ہماری فوج کا سپہ سالار بنے اور ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلیں۔

۳● صحت انسان کا پیدائشی حق ہے

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــــ صحت ہی روشن سچائی ہے، مرض یا بیماری فریب اور جھوٹ ہے۔ یہ یقین ہی سب سے بڑا علاج ہے۔ ہر ڈاکٹر، ہر معالج کی کامیابی کا راز بھی اسی خیال، اسی یقین میں مضمر ہے کہ صحت اور تندرستی انسان کا پیدائشی حق ہے۔

خود کو ہمیشہ خدا کی اشرف المخلوق سمجھو اور دل میں بیماری یا کمزوری کا خیال بھی نہ لاؤ۔ صحت کا یقین کبھی نہ چھوڑو۔ آہستہ آہستہ تمہارے یقین کا اثر جسم پر ہوگا اور سب مرض، تکلیفیں دُور ہو کر ایک طاقت ور اور صحت مند شخصیت ابھر آئے گی۔

خدا کی وہی قدرت جو ایک چھوٹے سے بیج کو ایک بڑا تناور درخت بناتی ہے جو چھوٹی سی کلی کو خوبصورت پھول میں کھلا دیتی ہے۔ وہی قدرت ساری زمین کے ذرّے ذرّے میں پوشیدہ ہے۔ ہماری یہ مختصر سی زندگی بھی اُسی خدا کی قدرت کا ایک معمولی جزو ہے۔ اُس سے الگ رہ کر ہم ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ زندگی بخش قوت ہمارے باطن میں قیام کرتی ہے۔ اُسی سے قوّت لے کر ہم ساری تکلیفوں اور آفتوں سے اپنی زندگی کی حفاظت کرتے ہیں۔ جس وقت بھی ہم اُس فاتح قوّت سے قربت محسوس کریں گے اُسی وقت ہمیں روحانی اور جسمانی صحت حاصل ہو جائے گی۔

۴● پودینہ ـــــ معدے کے لئے تریاق

یہ بہت مشہور خوشبودار چیز ہے اور بہت سے فوائد کی حامل ہے۔

اِس کا مزاج گرم و خشک ہے، یہ غذا کو ہضم کرتا ہے، معدے کو قوّت دیتا اور ریاح کو خارج کرتا ہے۔ گردے، معدے اور جگر کو تقویت دیتا ہے۔ اِس میں تریاقیت زہروں کے اثرات کو زائل کرنے کی تاثیر بھی ہے۔ اِس لئے بہت سے زہروں کے اثر کو دُور کرنے کے لئے اِسے استعمال کرتے ہیں۔ بدہضمی اور ہیضے میں پودینہ چھ ماشہ اور الائچی تین ماشہ کو آدھ سیر پانی میں جوش دے کر، چھان کر بار بار پلانے سے متلی اور قے کو تسکین ہوتی ہے۔ دردِ شکم بھی دُور ہو جاتا ہے اور پیاس کم ہو جاتی ہے۔

پودینہ بلغم کو خارج کرتا اور پیشاب لاتا ہے۔ ہچکی اور دمے کے لئے سُود مند ہے۔ پودینے کا رائتہ خوش ذائقہ، ہاضم اور طاقت بخش ہوتا ہے۔ قبل یا ا دوالی میں پودینے کو پیس چھان کر، تین ماشہ ملا کر دس تولے کے ساتھ کچھ عرصہ تک برابر استعمال کرتے رہنے سے یہ امراض دُور ہو جاتے ہیں۔ پودینے کو شراب میں پیس کر لگانے سے چہرے کے داغ دھبے اور چھائیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگوں کی آنکھوں کے نیچے جو سیاہ حلقے پڑ جاتے ہیں، وہ بھی اس کے برابر لگاتے رہنے سے مِٹ جاتے ہیں۔ بلی یا نیولے نے کاٹ لیا ہو یا بھڑ، بچھو نے ڈنک مار دیا ہو تو پودینہ پیس کر لگانے سے آرام ہو جاتا ہے۔

سبز پودینے کا پانی نکال کر ٹپکانے سے ناک کان اور دوسرے اعضا کے زخموں کے کیڑے مر جاتے ہیں۔

پودینہ ہچکی کے لئے مفید ہے۔ پودینہ سبز ایک تولہ اور اگر خشک ہو چھ ماشہ شکر سرخ دو تولہ پانی میں جوش دے کر پلانے سے یہ مرض دُور ہو جاتا ہے۔

۵● محکم دماغ انسان بنئے

ایک امریکی مفکر نے لکھا ہے ـــــ ہمارے گرد و پیش رہنے والے لوگوں میں سب سے زیادہ لاحاصل اور ناکارہ وہ لوگ ہیں جو ایسی چیزوں ایسی باتوں کے متعلق بلند بانگ انداز میں گفتگو کرتے ہیں جن کے متعلق انھیں نہیں معلوم ہوتا۔

ایسے لوگ بلند بانگ دعووں کے ساتھ دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسروں سے داد کے طالب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ شاید اپنے مسائل کو سمجھتے ہوں یا انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ وہ ہمیشہ اپنے مسائل پر پردہ ڈالنے کے لئے الفاظ کی بلند و بالا دیواریں چننے میں مصروف ہوتے ہیں۔

ایسے ناکارہ اور خود اعتمادی سے تہی دامن لوگ اسی طرح زندگی کے حسین جھنکاروں میں خود کو فریب دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ لوگ خود بھی محرومیوں کا کرب برداشت کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی فریب دے کر کرب میں مبتلا رکھتے ہیں۔ انھیں کے دوست جو ٹھوس اور محکم دماغ کے مالک ہوتے ہیں وہ زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرتے ہیں۔ محکم دماغ انسان ذہنی دھند کو چیر کر آگے بڑھتا ہے۔ وہ طوفان اور روشنیوں کے جھکڑ کو شق کرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی منزل کو پا لیتا ہے اور صرف باتیں بنانے والا انسان تاریکی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

۶ • قبض ——— بیماریوں کی ماں

قبض کو اطبّاء نے اُمّ الامراض یعنی بیماریوں کی ماں کہا ہے۔ قبض سے بے شمار چھوٹے بڑے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اکثر اعصابی امراض اِسی کے مرہونِ منّت ہیں۔ اختناق الرحم، مراق، مالیخولیا، وسوسے وغیرہ کے لئے قبض بنیاد کا حکم رکھتا ہے۔ قبض کی ابتدا میں دردِ سر، بواسیر، سر کے چکّر، بدہضمی، ریاح، دردِ شکم، نفخ، دل دھڑکنا وغیرہ شکایات پیدا ہوتی ہیں۔ جب مرض ترقّی کر جاتا ہے تو بدن میں پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں۔ آنتوں میں سُدّے پڑ جاتے ہیں۔ زہریلا مادّہ خون میں جذب ہو کر سمیّت پیدا کر دیتا ہے۔ کھانسی، دمہ، بخار اور دوسرے بے شمار امراض قبض ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

قبض ایسا مرض ہے جو نہایت آہستگی سے ترقی کرتا ہے۔ کبھی کئی ماہ اور کبھی کئی سال تک یہ صحت کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا۔ جس سے مریض اِس کی طرف توجّہ کرنے یا اِس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا مگر بعد میں اِس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو قبض کی شکایت نہ ہو تو اِس کا علاج اپنے باورچی خانے کے ذریعے کیجئے۔

میدہ اور باریک آٹے کی بجائے بغیر چھنا آٹا کھایئے۔ چاول ایسا کھایئے جس کا صرف موٹا چھلکا اتارا گیا ہو۔ اس کے علاوہ وہ بہت پُرانا نہ ہو۔ کھانے میں سبزی ترکاری کی مقدار اناج سے دوگنی رکھئے۔ دودھ تازہ یا صرف ایک بار جوش دیا ہوا پیجئے۔ ضرورت اور ہضم کے مطابق دودھ زیادہ پیجئے۔ گھی، تیل اور چکنائیاں بکثرت استعمال کیجئے۔ دیر ہضم، ثقیل اور قابض غذاؤں سے پُورا پُورا پرہیز کیجئے۔ گوشت کا کثرت استعمال قبض میں اضافہ کرتا ہے۔ اِسی طرح انڈے بھی قابض ہیں۔ اِس لئے زیادہ انڈے نہ کھانے چاہئیں۔ قبض کا اصل سبب نامناسب غذا ہے۔

کھانا کھانے کے درمیان یا اُس کے بعد ضرورت کے مطابق ضرور پانی پیا جائے۔ جو لوگ پانی نہیں پیتے یا ضرورت سے کم پیتے ہیں، انھیں قبض ہو جاتا ہے۔ کھانا کھانے کے دو گھنٹہ بعد ضرور پانی پیئں۔ بہت سے لوگوں کو اِس وجہ سے قبض ہوتا ہے کہ وہ پانی کم پیتے ہیں۔ ایسے لوگ مناسب مقدار میں پانی پیئں تو اُن کا قبض فوراً دُور ہو جائے گا۔ صبح بستر سے اُٹھتے ہی، رات کو سونے کے وقت۔ کھانا کھانے کے ایک گھنٹہ پہلے یا دو گھنٹہ بعد پانی پینا ایسے لوگوں کے لئے بے حد مفید ہے جنھیں دائمی قبض ہے۔

تازہ پھل قبض میں بخاص کر دائمی قبض میں خصوصیت سے مفید ہیں۔ ان کے رس اور محلول نمکیات قبض کو رفع کرتے ہیں اور ہضم میں مدد دیتے ہیں۔ آم، خربوزہ، انگور، امرود، پپیتہ، انجیر، ناشپاتی اور لوکاٹ وغیرہ کھانا کھانے کے بعد کھانے چاہئیں یا سہ پہر کو ناشتہ کیا جائے۔ سیب قابض ہے لیکن بغیر چھیلے کھایا جائے تو قبض نہیں کرتا بلکہ اِس طرح قبض رفع کرنے میں مدد دیتا ہے۔ قہوہ، چائے اور تمباکو کے استعمال سے اگرچہ قبض رفع ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے برابر استعمال سے آہستہ آہستہ قبض کا مرض مستقل طور پر گھر کر لیتا ہے۔

قبض کے ازالے کے لئے ورزش بہترین عمل ہے۔ سب سے اچھی اور آسان ورزش صبح و شام کی سیر ہے۔ سیر کم سے کم دو میل کی ہو اور روزانہ کی جائے۔ اِسے اپنا معمول بنا لیا جائے۔ اُچھلنا، کودنا، دوڑنا، گیند بلّا، فٹ بال، ٹینس بھی قبض کے ازالے کے لئے مفید ہیں۔

۷ • کیا آپ جانتے ہیں؟

- خربوزے کا چھلکا ایک تولہ لے کر تھوڑے پانی میں جوش دے کر صبح و شام پینے سے مثانہ کی پتھری نکل جاتی ہے۔
- لال سا گر کو کچل کر پانی نچوڑ لیں۔ اس پانی کو نیم گرم کر کے کان میں ڈالنے سے کان کا درد جاتا رہتا ہے۔ کان کے زخم خشک ہوتے ہیں۔ اگر کان میں کیڑے ہوں تو

آہ! راجہ مہدی علی خاں

نیّر قریشی گنگوھی

جس نے چھلکائے شعور و فکر کے زرّیں ایاغ — جس نے مہکائے شمیمِ شعر سے قلب و دماغ

جس کے دم سے باغِ اُردو میں بہاریں آگئیں — ہر کلی، ہر گُل کو جس سے ہو گیا حاصل فراغ

دامنِ اُردو کو جس نے لالہ و گُل سے بھرا — اپنے خوں سے جس نے اُردو کا کیا سرسبز باغ

ہمکنارِ کامیابی کر گیا، اُردو کو، جو — منزلِ عرفاں کا اُس کی فکر نے پایا سراغ

آج خوشتر ہی نہیں مہدی کے غم میں سینہ چاک — خونفشاں ہیں سب کی آنکھیں اور دلوں میں داغ داغ

جس کے دم سے شعر و نغمہ، فکر و فن پُرنور ہیں — بجھ گیا علم و ادب کا آج وہ روشن چراغ

مدّتوں رویا کریں گے جس کو نیّر اہلِ فن
اُٹھ گیا بزمِ سخن سے ہائے وہ عالی دماغ

مرجاتے ہیں۔

- چھوہارے کی گٹھلی کو جلاکر باریک کرلیں۔ اُسے زخموں پر چھڑکنے سے زخم خشک ہوتے اور بھرتے ہیں۔
- چیچک کے مریض کی آنکھوں میں آبِ کشنیز (دھنیے کا پانی) ڈالنے سے آنکھیں محفوظ رہتی ہیں اور آنکھوں میں دانے نہیں ہوتے۔ اِسی طرح جن لوگوں کی آنکھوں میں زردی آجاتی ہے اُن کی آنکھوں میں آبِ کشنیز ڈالنے سے زردی زائل ہوجاتی ہے۔
- آبِ کشنیز میں تھوڑا سا نمک ملاکر ناک میں ڈالنے سے نکسیر بند ہوجاتی ہے۔
- آبِ کشنیز ڈھائی تولہ میں شکر ملاکر پینے سے نیند آتی ہے، بھوک لگتی ہے اور بدہضمی دُور ہوتی ہے۔
- کھرنی کے بیج کو سُرمے کی طرح باریک کرکے آنکھوں میں لگانا، آنکھوں کے جالے، سفیدی اور خارش میں مفید ہے۔
- جلائی ہوئی ہلدی کا منجن دانتوں کو مضبوط کرتا ہے۔
- نیم کے پتّوں کی خاکستر نمک کے ساتھ چاٹنا بلغمی کھانسی میں بہت مفید ہے۔
- پھٹکری کو پانی میں حل کرکے پلانا ہیضے میں مفید ہے۔
- آبِ لیموں میں تھوڑا شہد ملاکر نیم گرم چاٹنے سے گلے کے درد کی شکایت جاتی رہتی ہے۔
- سُرمۂ سیاہ کی ڈلی کو کوئلے کی آگ میں سُرخ کرکے آبِ لیموں میں بجھا۔ اِسی طرح چار بار بجھانے کے بعد سُرمہ کی ڈلی کو خوب باریک حل کرلیں۔ یہ سُرمہ بینائی کو تیز کرتا ہے۔ دُھندھ اور جالے کے لئے بھی مفید ہے۔
- چائے کے پانی میں دودھ کی جگہ ایک چمچہ آبِ لیموں ڈال کر نیم گرم پئیں۔ دردِ سر کی شکایت جاتی رہتی ہے۔
- السی ایک تولہ تھوڑے سے پانی میں جوش دے کر پینے سے گُردے کی پتھری باہر آجاتی ہے۔ اِسے متواتر استعمال کرنا چاہئے۔
- چھال درخت فالسہ ۵ تولہ رات کے وقت ایک پاؤ پانی میں بھگو کر صبح چھان کر دو تولہ مصری میں ملاکے پینا پُرانے ذیابیطس میں مفید ہے۔
- نمک میں تھوڑا سرکہ ملاکر مُنہ میں رکھنے سے دانت کا درد جاتا رہتا ہے۔

سرگوشیاں

سوال و جواب

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کیے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھیے۔ ہر سوال کے بعد جواب کیلئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھیے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے ——— (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

کیفؔ مشرقی۔ جگدل

س۔ عورت شراب ہے یا سراب؟

ج۔ عورت شراب ہے نہ سراب! ——— عورت عورت ہے۔ مرد کی سب سے بڑی طاقت ——— قدرت کی سب سے حسین حقیقت!

س۔ عورتوں کا حقیقی زیور شرم و حیا ہے اور مردوں کا؟

ج۔ حُسنِ کردار! حُسنِ اخلاق!

س۔ فرض اور محبت؟

ج۔ مردِ فرض شناس فرض پر محبت کو قربان کر دیتے ہیں۔

عبدالسلام راہیؔ۔ بنارس

س۔ محبت کس کو راس آتی ہے؟

ج۔ کسی کو نہیں! جو لوگ محبوبہ کے سینڈل کی مار کو پھولوں کی مار سمجھتے ہیں انہیں بھی محبت راس نہیں آتی۔

س۔ گناہ کیا چیز ہے؟

ج۔ جو انسان کے دل کو سیاہ اور روح کو مجروح کر دیتی ہے۔

س۔ انسان اپنا وقار کب کھوتا ہے؟

ج۔ کسی نے کہا ہے ؎

مفلسی اعتبار کھوتی ہے
آدمی کا وقار کھوتی ہے

شیخ داؤد۔ گلبرگہ شریف

س۔ میں ہر کسی کے لئے خوشیوں کا پیغام بن کر آیا ہوں۔ لیکن میری اپنی زندگی میں خوشی کا نام و نشان بھی نہیں۔ آپ ہی بتایئے میں کیا کروں؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دینا کیا کم خوشی کی بات ہے۔

س۔ زندگی کو خوش حال بنانے کا کیا راز ہے؟

ج۔ خوشحال لوگوں کے حالات سے روشنی حاصل کرنا۔ اپنے حوصلہ کو بلند رکھنا۔ آرزوؤں کا دامن دراز نہ کرنا۔

س۔ آج کا غذائی بحران مستقبل میں کیا رنگ لائے گا؟

ج۔ آج کا غذائی بحران بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

محمد اصغر حسین۔ کلکتہ

س۔ دل کی کلی کب کِھل اُٹھتی ہے؟

ج۔ اچھے کام کر کے۔

س۔ دل اور دماغ میں اگر جنگ ہو تو کس کا کہنا ماننا چاہیئے؟

ج۔ دماغ کا۔

س۔ دولت کے آگے کیا حُسن سرنگوں ہوتا ہے؟

ج۔ کبھی دولت کے آگے حُسن سرنگوں ہوتا ہے، کبھی حُسن کے آگے دولت سرنگوں ہوتی ہے۔

اظہار کندھائی پوری۔ جمشید پور

س۔ دُنیا میں سُکھی کون ہے اور دُکھی کون ہے؟

ج۔ جو لوگ آرزوؤں کا دامن دراز نہیں ہونے دیتے وہ سُکھی ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی آرزوؤں کا دامن دراز ہوتا ہے وہ دُکھی ہوتے ہیں۔

س۔ کیا غم کی انتہا موت ہے؟

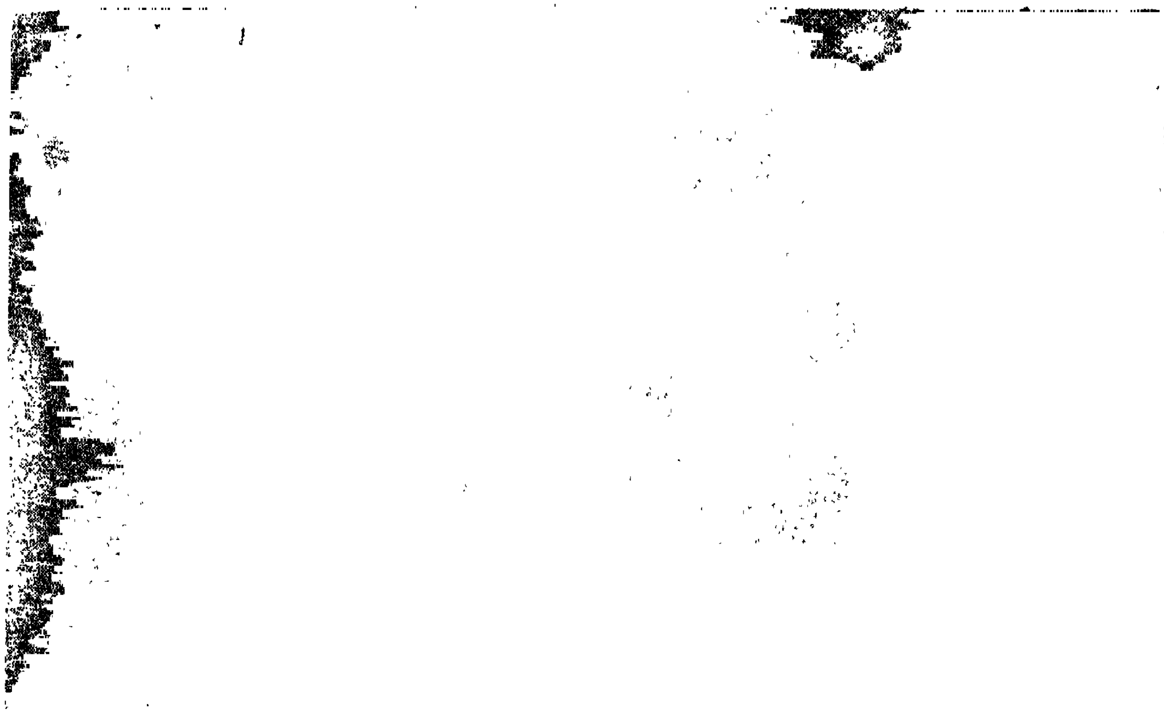
ج۔ جی نہیں ؎

موجِ غم کناروں سے ہمکنار کرتی ہے
کشتیٔ حیات اکثر ڈوب کر اُبھرتی ہے

س۔ موت کا راز؟

ج۔ جانتے ہیں اہلِ دل اس راز کو
موت بھی اِک زندگی کا نام ہے

جے سے ہر بار غسل کرنے پر...



آپ کا جسم پھول سا ملائم، دلفریب اور دلکش ہو جاتا ہے۔۔
چمیلی کی خوشبو میں شرابور ہے!

حُسن وجمال کیلئے جے صابن آپ کے انگ انگ کو صاف کرکے نکھار بخشتا ہے۔ جے سے ہر بار غسل کرنے پر آپ کا جسم پھول سا ملائم، دلفریب اور دلکش ہوجاتا ہے۔ جے میں بسی ہوئی چمیلی کی خوشبو ہمیشہ قائم رہتی ہے... کیونکہ یہ فائل ریپر کے ذریعے محفوظ کی جاتی ہے۔



خوبصورتی کے نکھار کے لئے

جے

حُسن وجمال کیلئے صابن

ٹاٹا کا تیار کردہ

شبنم ناز۔ دارجلنگ

س۔ "بیسویں صدی" کی دن دُگنی رات چوگنی ترقی دیکھ کر آپ سے زیادہ مجھے خوشی ہے۔ اس خوشی میں آپ کو کیا پیش کروں؟

ج۔ آپ کی پسندیدگی، آپ کی خوشی ہمارے لئے سب سے بڑا انعام، ہماری کاوش کا سب سے بڑا صلہ ہے۔

س۔ بھائی جان! کوئی اچھا سا شعر سنایئے۔

ج۔ کچھ بھی نہ ہو گر ذوقِ طلب ہو
آساں ہر مشکل بن جائے

رضیہ جمیل۔ سارن۔ بہار

س۔ بھائی جان! آپ بتا سکتے ہیں بہار میں اُردو بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ اُردو کے بدخواہوں کے بیان کے مطابق بہار میں کوئی اُردو نہیں بولتا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بہار میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۸۴ لاکھ ہے۔

سید احمد انصاری فیض آبادی

س۔ میں "بیسویں صدی" کا خریدار بننا چاہتا ہوں۔ سالانہ قیمت کتنی بھیجوں؟

ج۔ دو عظیم الشان خاص نمبروں سمیت (جن کی قیمت دو دو روپے ہوتی ہے) چودہ روپے۔

س۔ بھیا! اختر شیرانی کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ انہیں غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا
اندھیری رات کے پردوں میں دن کی روشنی بھی ہے

محمد وسیم قریشی۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ دنیا کا سب سے عظیم سیاست داں کون ہے؟

ج۔ جو سب سے زیادہ خوبصورت جھوٹ بول سکے جو سب سے زیادہ لوگوں کو حسین فریب دے سکے!

سید حسن تقی۔ بھوپال

س۔ "شادی" ایک تلخ تجربے کا نام ہے یا پُرلطف زندگی کے آغاز کا نام؟

ج۔ یہ تو اپنے اپنے کردار و عمل کی بات ہے۔ کوئی شادی کو ایک تلخ تجربہ بنا لے یا پُرلطف زندگی کا آغاز!

س۔ دَورِ جدید میں حقیقی دوست کی کیا پہچان ہے؟

ج۔ دَورِ جدید کا دوست اپنے مفاد کے لئے دوست کو فریبِ دوستی دے کر دوست کی پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیتا ہے! آپ کو یقین نہ ہو تو جبین کے گھاؤ کو دیکھ لیجئے۔

اعجاز انور۔ دلول گھاٹ۔ بلڈانہ

س۔ کیا قانون انصاف کرنے کے لئے خود جرم کرتا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ آج کل کی عدالتوں میں سو فیصدی یہی ہو رہا ہے۔

س۔ دُنیا کا ہر ملک عورت کے متعلق الگ الگ نظریہ کیوں رکھتا ہے؟

ج۔ خیال اپنا اپنا، نظر اپنی اپنی۔

جاوید احمد۔ کامٹی

س۔ بھیا! اگر کافی محنت اور جد و جہد کے بعد بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو تو؟

ج۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے جد و جہد جاری رکھنی چاہئے۔

س۔ سچی خوشی۔۔۔؟

ج۔ جھوٹی خوشی پر مرنے والوں کو سچی خوشی کبھی نہیں ملتی۔

اکھمت محمد خاں۔ قائم گنج۔ فرخ آباد

س۔ کیا دُنیا کے خوش ترین انسان حضرتِ خوشتر گرامی ہیں؟

ج۔ ادب اور انسانیت کی خدمت کر کے ہم اپنے کو بے شک خوش تر سمجھتے ہیں۔

س۔ انسانیت کی معراج کیا ہے؟

ج۔ غم کے ماروں کی غم خواری!

س۔ کیا وجہ ہے کہ لوگ قدرتی پھولوں سے زیادہ کاغذی پھولوں پر جان دیتے ہیں؟

ج۔ لوگ نہیں۔ کچھ کم سواد و کم نظر ایسے ہوتے ہیں۔

خورشید شیدائی۔ کلکتہ

س۔ کوئی حوصلہ افزا شعر سنایئے۔

ج۔ سنئے ؎
مصیبتوں سے اُلجھنے والو مصیبتیں ہیں نقیبِ عشرت
خزاں کا دامن اُلٹ کے دیکھو بہار کی تازگی ملے گی

س۔ دُنیا کے سب سے بڑے عجوبے کا نام بتایئے؟

ج۔ انسان! جس نے بے شمار عجوبوں کو جنم دیا ہے اور ابھی نہ جانے کتنے عجوبوں کو جنم دے گا۔

اعجاز احمد نرمل۔ عادل آباد

س۔ انسان کو اچھی زندگی گزارنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ اچھے کام۔

س۔ کوئی اچھا شعر سنایئے۔

ج۔ ہو وہ گبر یا مسلماں سبھی نظر میں میری یکساں
میرے دل میں دردِ انساں مرا دین درد مندی

محمد مصطفیٰ علی انصاری (ن) دیال گوڑہ

س۔ آج کی اہم ضرورت؟

ج۔ مزدور کی اہم ضرورت یہ ہے کہ غلّہ اور دوسری ضروریاتِ زندگی کے سامان سستے ہوں۔ ذخیرہ اندوز سرمایہ دار کی اہم ضرورت یہ ہے کہ غلّہ گراں ہو۔ دوسری چیزوں کی قیمتیں بھی چڑھیں۔ بلکہ آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔

س۔ دشمنی دوستی میں کب بدلتی ہے؟

ج۔ جب عقل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

س۔ "بیسویں صدی" میں وہ کون سی بات ہے کہ اِس کے مطالعے سے روحانی خوشی محسوس کرتا ہوں؟

ج۔ یہ ہم سے زیادہ آپ کو معلوم ہوگا۔

رحیم الدین راکیش۔ پٹنہ

س۔ کسی گزشتہ شمارہ میں مہیمہ بانو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ کے بجائے چار کروڑ بتائی ہے۔ کیوں؟

ج۔ وہ کتابت کی غلطی ہوگی۔ حکومتِ ہند کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ ہے۔

س۔ "بیسویں صدی" کی قیمت بڑھا کر آپ نے اِس کی قدر کم کر دی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

ج۔ اپنا اپنا خیال ہے۔ "بیسویں صدی" کے کتنے صاحبِ نظر پرستار تو اب بھی کہتے ہیں ؎

نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز !!

محمد حاکم علی خاں صدیقی۔ سکندر آباد

س۔ ذیل کا شعر کس کا ہے؟ ضرور بتایئے گا ؎

ہم خدا تھے گر نہ ہوتا دل میں کوئی مدعا
آرزوؤں نے ہماری ہم کو بندہ کر دیا

ج۔ کسی "بندے" کا ہوگا۔

نثار بھائی میاں مالیگانوی۔ مالیگاؤں

س۔ تقدیر کیا ہے؟

ج۔ اِن کالموں میں اِس سوال کا جواب کئی بار دیا جا چکا ہے۔ آج بھی سُن لیجئے ــــ تدبیر کے نتیجے کا نام تقدیر ہے۔

س۔ کامیابی کا راز؟

ج۔ منزل تجھے خود بڑھ کر آغوش میں لے لے گی
ہر جادۂ مشکل سے ہنس ہنس کے گزر پہلے

س۔ ساحر لدھیانوی کا کوئی اچھا سا شعر سنایئے۔

ج۔ جگمگاتے ہیں اُفق پار ستارے لیکن
راستہ منزلِ ہستی کا مہیب آج بھی ہے

محمد عبیداللہ شریف۔ حیدر آباد

س۔ علامہ اقبال کا کوئی حیات افروز شعر سنایئے۔

ج۔ تُو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

س۔ کیا آئندہ انتخابات میں کانگریس کو کامیابی حاصل ہوگی؟

ج۔ یہ تو وقت ہی بتا سکتا ہے۔ آثار و قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقابلہ سخت ہوگا۔

س۔ معمر سیاستداں کی کم عمر سیاسی پارٹی سوتنتر پارٹی کا کیا حال ہے؟

ج۔ ناگفتنی ہے حالت...

آصف انور کشن گنج۔ بہار

س۔ خوشتر بھائی! آپ ہمیشہ عورت کی تعریف کرتے ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اِس لئے کہ عورت تعریف کی سزاوار ہے۔

س۔ عورت کی خوبصورتی کا راز؟

ج۔ اچھی صحت ہے۔ صحت کے اصولوں کی پابند ہے۔

س۔ انسان خودکشی کیوں کرتا ہے؟

ج۔ حالات سے شکست کھاتے کھاتے ــــ حالات کو شکست دینے کے لئے۔

احمد لطیف املیز بشرقی خاندیس

س۔ آپ اِتنے سوالوں کا جواب دیتے ہیں اِس کے بدلے میں آپ کو کیا مِلتا ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر ہمیں خوشی مِلتی ہے۔

س۔ اِس زمانے میں رشوت خوری کب تک چلے گی؟

ج۔ جب تک رشوت دینے والے رشوت دینا بند نہ کریں گے۔

س۔ بزرگوں کا کہنا ہے ہائی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں بے پروا اور فیشن پرست ہو جاتی ہیں۔ یہ کہاں تک سچ ہے؟

ج۔ ساری لڑکیوں کے بارے میں ایسا کہنا غلط ہے اور جو لڑکیاں بے پروا اور فیشن پرست ہو جاتی ہیں اُن کی ذمہ داری بھی لڑکیوں سے زیادہ مردوں پر ہے۔

سلمہ فردوس نقاش۔ سرینگر کشمیر

س۔ مکمل سکون کہاں مِل سکتا ہے؟

ج۔ دامنِ فطرت میں!

س۔ حیات اپنے وجود میں اِس قدر تلخیاں بھی چھپائے ہوئے ہے۔ پھر بھی زندہ رہنے کی آرزو کیوں؟

ج۔ ہزار تلخیوں کے باوجود زندگی شیریں ہے، بہت ہی پیاری ہے ــــ کسی نے کہا ہے ؎

زندگی یوں تو زہر ہے، لیکن
زہر بھی کیا لذیذ ہے یارب

نصرت اختر۔ بنگلور

س۔ زندگی حسین ہوتی ہے یا موت؟

ج۔ کسی کی زندگی کسی کی موت!

س۔ کامیابی کا راز؟

ج۔ ناکامیوں سے بددل نہ ہونا۔

س۔ محبت بدنام کب ہوتی ہے؟

ج۔ جب ہوس بن جاتی ہے۔

عبدالستار خاں جوہر۔ پرتواڑہ

س۔ مضمون نگاری سیکھنے کے لئے کون سی کتاب کا مطالعہ بہتر ہوگا؟

ج۔ کچھ عرصہ ہوا نولکشور پریس لکھنؤ نے اس موضوع پر ایک مفید کتاب شائع کی تھی۔ اس کا نام "انشا پردازی" ہے۔ خط لکھ کر دیکھئے ہو سکتا ہے اب بھی ملتی ہو۔ ویسے مضمون نگاری سیکھنے کے لئے ادبی رسائل کا مطالعہ بھی بے حد مفید ہے۔ ان سے کافی روشنی ملتی ہے۔

محمد امین۔ سرینگر

س۔ خاموشی کو کیوں اچھا سمجھا جاتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ خاموشی دیوتاؤں کی صفت اور داناؤں کی عادت ہے۔

س۔ خود اعتمادی کیسے پیدا کی جاتی ہے؟

ج۔ اپنے اندر چھپی ہوئی قوتوں کو بیدار کرکے۔ اپنے دل سے احساسِ کمتری دور کرکے۔

عمر علی۔ انتولے (کرلا بمبئی)

س۔ "بیسویں صدی" کی عمر کیا ہے؟

ج۔ چوتھائی صدی سے بھی چار پانچ سال زیادہ!

س۔ اشک پینے کے لئے ہیں کہ بہانے کے لئے؟

ج۔ اپنے دکھ پر پینے کے لئے۔ دوسروں کے دکھ پر بہانے کے لئے۔

س۔ سر کٹانے کے لئے ہے یا جھکانے کے لئے؟

ج۔ کبھی کٹانے کے لئے کبھی جھکانے کے لئے۔

محمد عبدالجلیل۔ گلبرگہ

س۔ کیا شاعر مفلس ہوتے ہیں؟

ج۔ ہر شاعر مفلس نہیں ہوتا۔

س۔ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے جو دیکھی کبھی کبھی میں نے

فخر الزماں آذر۔ پشاور

س۔ اگر دنیا میں پروانوں کا وجود نہ ہوتا تو شمع پر کون نثار ہوتا؟

ج۔ پروانے شمع پر کب نثار ہوتے ہیں ع
پرائی آگ میں جلتا ہے کون دنیا میں
پتنگے آگ میں اپنی بنام شمع جلے

س۔ جب پروانے جلتے ہیں تو شمع پر کیا گزرتی ہے؟

ج۔ کچھ بھی نہیں۔ شمع پر کیا گزرے۔

س۔ پھول اور کانٹے کی تعریف؟

ج۔ آپ نے کتنے پھول، کتنے کانٹے دیکھے ہوں گے ع
شنیدہ کے بود مانند دیدہ!

محمد مصطفیٰ ابدالی۔ پٹنہ

س۔ کیا افسانے زندگی کی تصویر بھی ہیں، تفسیر بھی اور تعبیر بھی؟

ج۔ افسانے زندگی کی تعبیر ہوں نہ ہوں لیکن تصویر اور تفسیر ضرور ہوتے ہیں۔

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ افسانہ نگار کی انگلی وقت کی نبض پر ہوتی ہے؟

ج۔ ہاں! اگر افسانہ نگار حقیقی معنوں میں فنکار ہو۔

س۔ کیا افسانے کی کتابیں دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور مفید بھی؟

ج۔ جی ہاں۔ اگر کتابیں اچھے فنکاروں کی ہوں۔

مشتاق علی نصیر آبادی۔ ورنگل

س۔ طالب علم اپنی پہلی ناکامی پر شرمندہ کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ پست حوصلہ طالب علم اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتا ہے۔ بلند حوصلہ خجل و بددل نہیں ہوتا۔ ناکامی کو کامیابی کا زینہ بناتا ہے۔

س۔ ترقی کا راستہ؟

ج۔ عزمِ محکم، جہدِ پیہم!

ذاکر باشاہ۔ کرنول

س۔ خوشتر بھیا! خواب حقیقت کب بنتے ہیں؟

ج۔ جب انھیں حقیقت بنانے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہے۔

س۔ قوم کی اصلاح کے لئے لیڈر اور ایڈیٹر میں کون مفید ہے؟

ج۔ لیڈر اور سو فیصدی لیڈر!! ایڈیٹر کس شمار و قطار میں ہیں۔

س۔ آج کے ترقی پسند دور میں ہندوستانی عورت کا کیا مقام ہے؟

ج۔ اسٹیج پر بلند۔ گھروں اور دلوں میں پست!

محمد شمیم۔ کشن گنج

س۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

ج۔ ہم زندگی کے نقیب ہیں۔ ہم سے یہ نہ پوچھئے۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ ہم سے پوچھئے زندگی میں کیا کرنا چاہئے!

قابلِ مطالعہ منتخب شعری مجموعے

آتشِ گل	جگر مرادآبادی	پانچ روپے
کلیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال	چھ روپے
جنون و ہوش	جوش ملسیانی	چار روپے
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	تین روپے
آہنگِ حجاز	،	ایک روپیہ
سحرِ غزل	ساحر ہوشیارپوری	تین روپے
دستک	نرش کمار شاد	دو روپے ۲۵ پیسے
پھوار	،	دو روپے ۵۰ پیسے
فنکار	،	دو روپے ۲۵ پیسے
قاشیں	،	تین روپے
آیاتِ جنوں	،	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
سنگم	،	تین روپے
رباعیاتِ محروم	تلوک چند محروم	تین روپے ۷۵ پیسے
گنجِ معانی	،	سات روپے ۵۰ پیسے
رُوپ	فراق گورکھپوری	تین روپے ۵۰ پیسے
رمز و کنایات	،	تین روپے ۵۰ پیسے
مشعل	،	دو روپے ۷۵ پیسے
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	چار روپے ۵۰ پیسے
ستاروں سے ذروں تک	،	دو روپے ۷۵ پیسے
کلیاتِ اکبر الہ آبادی (اوّل)	اکبر الہ آبادی	پانچ روپے
، حصہ دوم	،	چھ روپے
کلیاتِ اختر شیرانی	اختر شیرانی	آٹھ روپے
رعنائیاں	شکیل بدایونی	تین روپے
صنم و حرم	،	دو روپے ۲۵ پیسے
گُلِ رعنا	جگّی رعنا	تین روپے ۵۰ پیسے
شبنم شبنم	کرشن موہن	پانچ روپے
دلِ ناداں	،	چھ روپے
خرابات	عبدالحمید عدم	چار روپے
رمِ آہو	،	چار روپے
گلنار	،	دو روپے ۲۵ پیسے
قول و قرار	،	تین روپے ۵۰ پیسے
گردشِ جام	،	دو روپے ۲۵ پیسے
بطِ مے	،	دو روپے ۲۵ پیسے
گجر	قتیل شفائی	تین روپے
رسالت مآب	رئیس احمد جعفری	چھ روپے
اسلام اور عورت	مولانا مظہر الدین	تین روپے
نماز کیا ہے	مولانا محمد علی	دو روپے ۲۵ پیسے
نیا نو دن	راشد سہسوانی	پانچ روپے ۷۰ پیسے
غم دے مستقل	انیس مرزا	چار روپے ۵۰ پیسے
شرارت	جمیل انجم	تین روپے
عشق اور خون	رائیڈر ہگرڈ	سات روپے
سوکھا ساون	انیس مرزا	دو روپے ۵۰ پیسے
محبت اور جرم	انور کمال حسینی	دو روپے ۷۵ پیسے
فن اور تنقید	،	نو روپے

آئینۂ اصلاح ابوالفصاحت جوش ملسیانی کی اصلاحات شاگردوں کے کلام پر مع توجیہہ اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ کتاب مبتدی اور فن نہ جاننے والے شعراء کے لئے رہنما کا کام دے گی۔ قیمت تین روپے۔

جوش ملسیانی کے مکمل حالات زندگی، انتخاب کلام شاگردوں کے حالات اور کلام، تصویروں کے ۸۴ صفحے۔ ضخامت ۵۰۰ سو صفحات۔ موجودہ دور کی بے مثل کتاب۔ قیمت دس روپے۔

مضراب شبِ الت کے ایک ایک شعر میں اُس کا اپنا دل دھڑکتا ہے اور ان دھڑکنوں میں اُس نے سارے جہان کے دکھ درد سمیٹ لئے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ جس میں تقریباً چار ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اِس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور ہندی کتاب کا ڈاکٹر راجندر پرشاد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کا نام نامی ہی اِس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری نے اِس کتاب کو اِس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ اُردو ایڈیشن دس روپے۔ ہندی ایڈیشن سات روپے ۷۵ پیسے۔

شاہنامۂ اسلام جناب حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام۔ چار حصوں میں جن میں تیرہ سو سالہ اسلامی تاریخ کو منظوم کیا ہے۔ ہر حصہ قریباً تین سو صفحات کا ہے تازہ ایڈیشن اصلاح کے بعد چھپا ہے۔ قیمتی سولہ روپے اب صرف نو روپے میں پیش کیا جارہا ہے۔ محصولڈاک ایک روپیہ ۵۰ پیسے الگ ہوگا۔

تلامذۂ غالب غالبیات کے مشہور ماہر مالک رام صاحب کی گرانقدر تصنیف۔ اِس کتاب میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کی مکمل سوانح حیات اور کلام درج ہیں۔ پورے صفحہ کی تقریباً تیس تصاویر بھی شاملِ کتاب ہیں۔ ہندوستان بھر کے ادیبوں کا فیصلہ ہے کہ یہ کتاب بہترین ادبی تحفہ ہے۔ قیمت فی جلد سات روپے ۵۰ پیسے۔

کفر و ایمان پنڈت ہری چند اختر کا مجموعۂ کلام حضرت اختر کا نام ہی اِس کتاب کی اہمیت و افادیت کا ضامن ہے کلام میں طنز کے نشتروں کے ساتھ دردمند دل کی گرمی بھی ہے قیمت چار روپے۔

کلامِ بے لگام این بی ناشاد دہلوی کا نادر مجموعۂ کلام جس کے ہر شعر میں اکبر الہ آبادی کا رنگ جھلکتا ہے طنز و مزاح کا رنگین گلدستہ ۱۵۲ صفحات پر مشتمل دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا قیمت مجلد چھ روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

سیدرکن الدین۔ بھٹکل

س۔ یورپ اور امریکہ میں مہارت، تجربہ اور صلاحیت واستعداد کی بنیاد پر عہدوں کی تقسیم ہوتی ہے اور یہاں ڈگریوں کو دیکھا جاتا ہے۔ ایسا تضاد کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ ہندوستان یورپ اور امریکہ نہیں ہے۔

س۔ طلباء میں ڈسپلن کا فقدان اور تخریب پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات موجودہ ناقص معیارِ تعلیم کا نتیجہ ہیں یا...؟

ج۔ ناقص معیارِ تعلیم کے ساتھ اساتذہ بھی بہت حد تک اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔

ایم، اے مخمور۔ پورنیہ

س۔ شادی والدین کی مرضی سے کرنی چاہئے یا اپنی مرضی سے؟

ج۔ والدین کی مرضی، والدین کی پسند سے۔ والدین جہاں دیدہ وتجربہ کار ہوتے ہیں۔

س۔ خوشتر صاحب! بیسویں صدی کے سرورق پر کسی حسین عورت ہی کی تصویر کیوں ہوتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ بیسویں صدی کے بیشتر پرستار یہی پسند کرتے ہیں۔

سید ثروت حسین۔ سیتاپور

س۔ کیا اپنی زندگی کو اجاڑ کر دوسروں کی زندگی کو سنوارنا گناہ ہے؟

ج۔ دوسروں کی زندگی سنوارنا گناہ نہیں، عین ثواب ہے۔ لیکن اپنی زندگی کا بھی حق ہوتا ہے۔

س۔ احساسِ گناہ...؟

ج۔ احساسِ گناہ، گناہ سے اجتناب کا باعث بنے تو مبارک ہے۔

س۔ انسان کو اپنی بُرائی کا احساس کب ہوتا ہے؟

ج۔ جب بیدار ہوجاتا ہے۔

نصرت اللہ امتیاز۔ بنگارپیٹ

س۔ اگر انسان کوشش کے باوجود اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ بددل ہوکر کوشش ترک نہ کردینی چاہئے۔ منزل پانے، منزل تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھنی چاہئے ؎

راہِ طلب میں شوقِ فراواں کی شرط ہے
جاتی نہیں ہے سعیِ طلب رائیگاں کبھی

س۔ دُنیا میں حسین شے کیا ہے؟

ج۔ یہ تو اپنی اپنی نظر، اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ کوئی چیز آپ کی نظر میں حسین ہے۔ دوسروں کی نظر میں غیر حسین!

ایم، سلیم شاہی۔ اسلام پور، مغلسرائے

س۔ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر روشنی ڈالیں۔

ج۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ عیاں راچہ بیان!

س۔ غمِ زندگی؟

ج۔ بے سہارا نہیں عالمِ زندگی
ہمدمِ زندگی ہے غمِ زندگی

نذرالاسلام انصاری۔ فوربس گنج

س۔ ہندوستان میں چھوت چھات کی لعنت کب ختم ہوگی؟

ج۔ قانونی طور پر تو ختم ہوگئی ہے لیکن عملی طور پر اُس وقت ختم ہوگی جب لوگوں کے خیالات اور بلند، دل اور فراخ ہوجائیں گے۔

س۔ علم کی اہمیت؟

ج۔ علم ہی تو پیکرِ انسانیت کی جان ہے
یہ نہ جس کے پاس ہو وہ آدمی، حیوان ہے

س۔ کیا آج کل کی تعلیم ناقص ہے؟

ج۔ جی ہاں! ابھی تو ہمارے بہت سے وزیروں اور منسٹروں نے اس سے اپنا دامن بچائے رکھا!

عبدالرشید قریشی۔ آکوٹ

س۔ اُردو ادب کے چار ستون کون کون سے ہیں؟

ج۔ چار ہی کیوں؟ اُردو ادب کے ستون بہت سے ہیں۔

س۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بیکاری کے علاوہ ہندوستان میں کون سی چیز زیادہ ترقی پر ہے؟

ج۔ اربابِ حکومت کی خودغرضی و فرض ناشناسی!

شیخ فرید۔ کھڑک پورہ۔ کھنڈوہ

س۔ میرے دوست کا کہنا ہے، وقت نہیں بدلتا انسان بدلتا ہے۔ میرا خیال ہے انسان نہیں بدلتا وقت بدلتا ہے۔ اب فیصلہ آپ پر ہے۔

ج۔ کبھی وقت بدلتا ہے کبھی انسان!

س۔ دُنیا کو جوان کیوں کہا جاتا ہے؟

ج۔ دنیا کو جوان نہیں پیرِ زال کہا جاتا ہے۔

س۔ اسلام کا دوسرا نام؟

ج۔ دینِ حق۔

محمد امان اللہ۔ رانی گنج

س۔ کیا دولت اندھی ہوتی ہے؟

ج۔ اندھی نہ ہوتی تو سرمایہ داروں کی تجوریوں میں قید کیوں رہتی!

ابراہیم انصاری۔ جمال پور

س۔ بھائی جان! اب تک "بیسویں صدی" میں جناب نریش کمار شاد نے جتنے لوگوں کے انٹرویو لکھے ہیں وہ کیا سو فیصدی سچ ہیں؟ (میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں)

ج۔ یقیناً! کیا اُن کے ایک فیصدی بھی جھوٹ ہونے کی اطلاع آپ کو ملی ہے؟

س۔ میں کوئی بات کھُل کر نہیں کہتا۔ زبان گُنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں یہ عادت بُری ہے۔ آپ کی رائے میں؟

ج۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں۔

بسنت کمار شاد۔ وانمباڑی

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ ہمارا امیر و غریب ہونا ہماری روح پر منحصر ہے؟

ج۔ صرف ہماری روح پر نہیں، ہمارے عزم و عمل پر موقوف ہے۔

محمد عارف۔ ایکل ڈھوڑھا

س۔ میری بیوی ہمیشہ خاموش رہتی ہے؟

ج۔ خدا کا شکر ادا کیجئے! خاموشی دیوتاؤں کی صفت ہے۔ اس لئے اپنی بیوی کو دیوی سمجھئے۔

س۔ خوبصورت لڑکیاں راستہ چلتے وقت اکثر پیچھے مُڑ مُڑ کر کیا دیکھا کرتی ہیں؟

ج۔ یہی کہ کوئی لڑکا اُن کے سینڈلوں کے آئینے میں اپنی صورت تو نہیں دیکھ رہا ہے۔

س۔ آج کل کی لڑکیاں کھُلی سڑک پر کیوں گھوما کرتی ہیں؟

ج۔ یہ جتانے کے لئے کہ مرد عورت کو اپنا محکوم سمجھتے ہیں تو غلط سمجھتے ہیں۔

سی، رحمت النساء بیگم۔ آمبور

س۔ میں بچپن سے آزادی میں پلی ہوں۔ شادی کے بعد بھی آزادی سے رہنا چاہتی ہوں لیکن میرے شوہر اس کے خلاف ہیں۔ کیا کروں؟

ج۔ اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتی ہیں تو اپنے شوہر کی پسند کو اپنی پسند بنا لیجئے۔

س۔ میرے شوہر شادی کے بعد اپنے ماں باپ کو بھول کر میرے پاس پڑے ہوتے ہیں۔ اُن کا یہ رویّہ ٹھیک ہے؟

ج۔ اُن کا یہ رویّہ اچھا نہیں۔

س۔ عورت کو پھول کہتے ہیں! اور مرد کو کیا کہنا چاہئے؟

ج۔ بعض کو کانٹا، بعض کو پتھر اور کچھ کو موم!

عبدالکریم کھرگاؤں مسجد روڈ۔ ہزاری باغ

س۔ قبلہ! آپ اکثر لوگوں کو بہترین شعر سنایا کرتے ہیں۔ ہمیں چند بدترین شعر سنایئے۔

ج۔ حضرت! آپ مسجد روڈ پر رہتے ہیں اور بدترین شعر سننا چاہتے ہیں؟ توبہ توبہ! شعر نہیں، ایک مصرع سنئے ؎

لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ!

آپ کے ذوق کی بات ہے۔ اسے بہترین سمجھئے یا بدترین!

124063
5.7.95

اشرف جمال۔ ہوڑہ

س۔ زندگی...؟

ج۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ــــ "زندگی جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں" لیکن یہ غلط ہے۔ زندگی قدرت کا سب سے بڑا انعام، سب سے بڑا عطیہ ہے۔ یہ اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے انسان اپنی زندگی کا دامن پھولوں سے بھر لے یا کانٹوں سے!

س۔ وقت...؟

ج۔ زندگی میں وہی لوگ کامیاب و کامراں ہوتے ہیں جو اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے۔

خورشید احمد ہارونی۔ کلکتہ

س۔ رحمت کب زحمت بن جاتی ہے؟

ج۔ جب انسان اپنی غلط کاری سے رحمت کو زحمت بنا لیتا ہے۔

س۔ زندگی کی اُداس راتوں میں کس کی یاد ستاتی ہے؟

ج۔ جس کی جیسی زندگی ہو۔

زیڈ پروین شکر نگر۔ نظام آباد

س۔ بھائی جان! خلوص و محبت کے عوض طنز کے نشتر ملیں تو؟

ج۔ یہ تو احساس کی بات ہے۔ آپ طنز کے نشتروں کو نشتر نہ سمجھیں، نشتر، نشتر نہ رہیں گے۔

س۔ تمنائیں اور ارمان آنسو بن کر بہہ جائیں تو آپ ہی بتائیں کوئی کیسے جیے؟

ج۔ اپنے سے زیادہ دکھی جینے والوں کو دیکھ کر۔

س۔ بھائی جان! اپنی پسند کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ جادۂ زیست میں بکھرے ہوئے کانٹے ہیں بہت
دیکھئے پھول بھی شاید انہیں خاروں میں ملیں

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ــــــ مطبوعہ: دلی پرنٹنگ ورکس چاوڑی بازار دہلی۔ ٹائٹل و تصاویر: برلنٹ پریس صدر بازار دہلی ــــــ پتہ: دفتر بیسویں صدی دریا گنج۔ دہلی نمبر ۲

ڈکشنریاں صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری

کشیدہ کاریاں وڈکشنریاں

صدی کی کشیدہ کاری	کرشناکماری ایم اے	چار روپے
کشیدہ کاری	زینت کوثر	پانچ روپے ۵۰ پیسے
"	"	چار روپے ۵۰ پیسے
کی "	رشیدہ خاتون	تین روپے ۵۰ پیسے
" "	زینب انور	دو روپے ۵۰ پیسے
" "	"	دو روپے ۵۰ پیسے
" "	قدسیہ انور	ایک روپیہ
" "	"	ایک روپیہ
درزی خانہ	زینب انور	دو روپے
اشعار	شرف بانو غفران	دو روپے
ار ڈشیا ڈیزائن بک	زینت کوثر	پانچ روپے

یزی اردو میں اپنی قابلیت بڑھایئے

اُردو انگریزی کی کامیاب ترین ڈکشنریاں

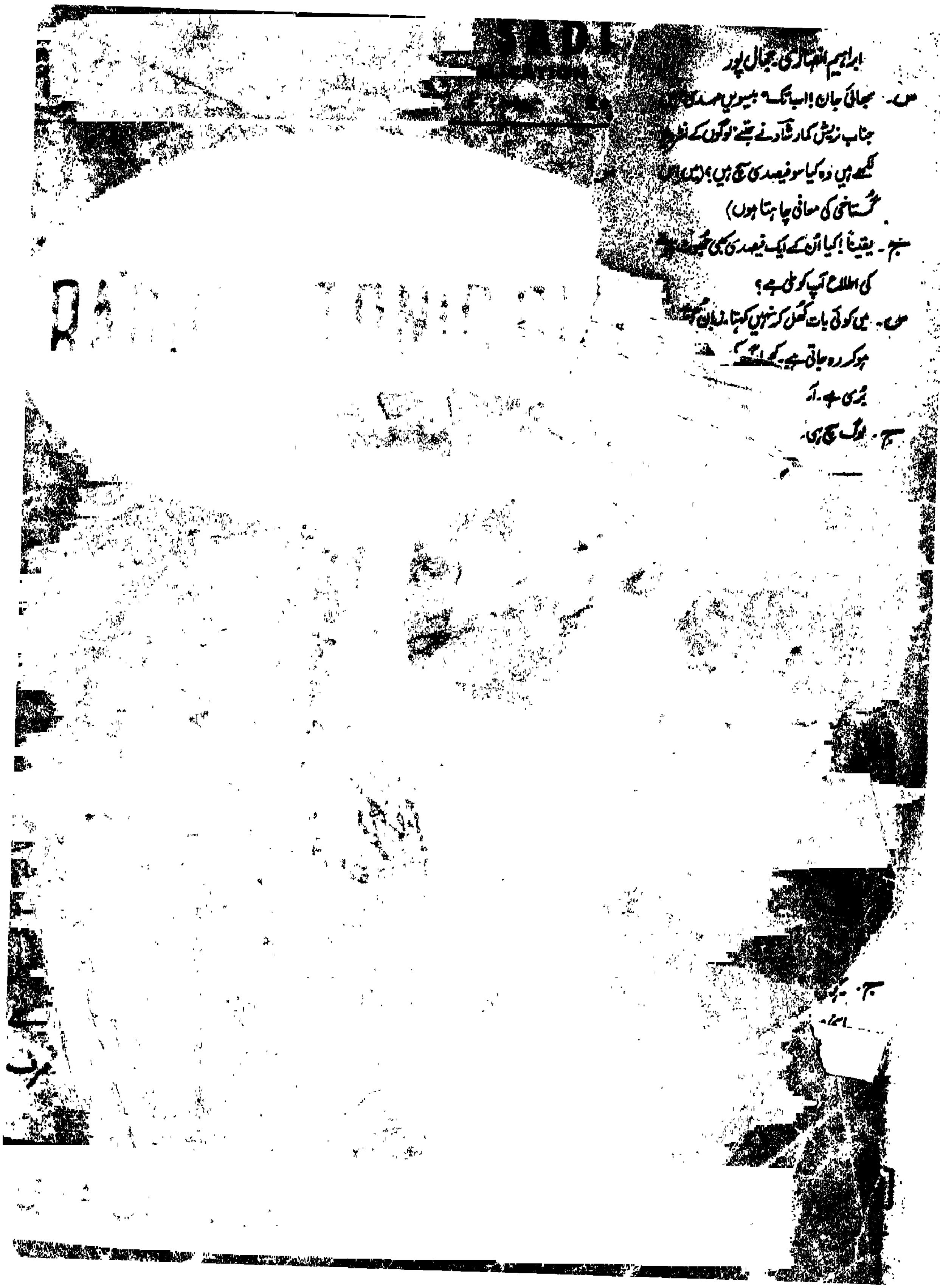
ٹ ڈکشنری۔ انگریزی سے اُردو ہندی		چار روپے
یزی اُردو ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		دس روپے
و انگریزی ڈکشنری (کلاں) رسالہ سائز قیمت مجلد		گیارہ روپے
انگلش اُردو ڈکشنری	عبدالحق	تیس روپے
انگلش اُردو ڈکشنری	"	بیس روپے
انگلش اُردو ڈکشنری	"	بارہ روپے
و انگریزی ڈکشنری		گیارہ روپے
یزی اُردو ڈکشنری		دس روپے
سفورڈ ڈکشنری انگریزی سے اُردو ہندی		تین روپے
لغت		آٹھ روپے
ات جدید کلاں		بارہ روپے
مالو		سات روپے ۵۰ پیسے
ات عکسی خورد		چھ روپے ۵۰ پیسے

صنعت وحرفت

الیکٹریکل انجینئرنگ بک	نرندر ناتھ	بارہ روپے
الیکٹرک گائڈ (نیا ایڈیشن)	"	آٹھ روپے
الیکٹرک وائرنگ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
موٹر کار وائرنگ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک بیٹریز	"	تین روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک لائٹنگ	"	چھ روپے
الیکٹرک سپروائزر امتحان کے پیپرز (پنجاب)	"	چھ روپے ۵۰ پیسے
آئل وگیس انجن گائڈ	"	دس روپے
آئل انجن گائڈ	"	چھ روپے
کروڈ آئل انجن گائڈ	"	چار روپے ۵۰ پیسے
وائرلیس ریڈیو گائڈ	"	چھ روپے
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو میکینک)	"	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
ٹانکا لگانے کا ہنر	"	دو روپے ۵۰ پیسے
چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹرز بنانا	"	تین روپے ۵۰ پیسے
پریکٹیکل آرمیچر وائنڈنگ (اے سی۔ ڈی سی)	"	سات روپے ۵۰ پیسے
ریفریجریٹر گائڈ	نرندر ناتھ	آٹھ روپے ۲۵ پیسے
بربار ریڈیو گیان		پندرہ روپے
ٹرانسفارمر گائڈ		چار روپے ۵۰ پیسے
الیکٹرک موٹرز		آٹھ روپے
خراد شکشا یعنی ٹرنر گائڈ	"	تین روپے
ورکشاپ گائڈ (فیٹر ٹریننگ)	"	تین روپے
خراد اور ورکشاپ گیان	"	چھ روپے
پریکٹیکل گھڑی سازی	رام اوتار ورما	چار روپے ۵۰ پیسے
سائیکل ریپئرنگ	"	دو روپے ۵۰ پیسے

خانہ داری

پلاسٹک گائڈ	"	
اپٹوڈیٹ بوٹ پالش سازی	"	دو
اپٹوڈیٹ انک ماسٹر روشنائیاں بنانا	"	
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں بنانا)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
ہیئر آئل (خوشبودار تیل)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
بیکری بہار (بسکٹ ڈبل روٹی کیک)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
پینٹری کا کام	"	چار روپے ۵۰ پیسے
فن مصوری (چترکاری)	"	چار روپے ۵۰ پیسے
پرفیومری ماسٹر	"	دو روپے ۵۰ پیسے
وارنش ماسٹر (وارنش سازی)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
آتش بازی کا کاروبار	"	دو روپے ۵۰ پیسے
اچار، مربہ، چٹنی	چھبی رانی گپتا	دو روپے ۵۰ پیسے
حلوائی ماسٹر	چندر بھان سہگل	دو روپے ۵۰ پیسے
تمباکو کا کاروبار (تمباکو کی دوکان)	"	دو روپے ۵۰ پیسے
پان کی دوکان	"	دو روپے ۵۰ پیسے
چھپائی پارچہ جات کیلیکو پرنٹنگ	"	تین روپے ۵۰ پیسے
انڈین روپین کُکری بُک دیسی انگریزی کھانے	کمال چرن	چار روپے
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	"	دو روپے ۵۰ پیسے
موم بتی کا کاروبار	"	دو روپے ۵۰ پیسے
ڈیری فارمنگ	"	چار روپے



ابراہیم انصاری۔ جمال پور

س۔ بھائی جان! اب تک بیسویں صدی [illegible]
جناب نریش کمار شاد نے جتنے لوگوں کے [illegible]
لکھے ہیں وہ کیا سو فیصدی سچ ہیں؟ (لیکن اس
گستاخی کی معافی چاہتا ہوں)

ج۔ یقیناً! کیا اُن کے ایک فیصدی کے بھی [illegible]
کی اطلاع آپ کو ملی ہے؟

س۔ میں کوئی بات کھل کر نہیں کہتا۔ زبان [illegible]
ہو کر رہ جاتی ہے۔ [illegible]
[illegible]

ج۔ لوگ سچ ہیں۔

ج۔ [illegible]